وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر: ۲۲)

تفسیرِ کبیر

مُصنّفہٗ

حضرت مرزا بشیر الدّین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود

رضی اللہ عنہٗ

جلد ہفتم

سُورۃ الشعراء۔ سُورۃ النمل۔ سُورۃ القصص۔ سُورۃ العنکبوت

***

نظارت نشر و اشاعت قادیان

نام کتاب : تفسیر کبیر جلد ہفتم۔ہشتم

تصنیف لطیف : حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ تعالیٰ عنہ

سن اشاعت : فروری ؍تبلیغ 2004

باہتمام : نظارت نشر و اشاعت قادیان

تعداد : 2000 (دو ہزار)

مطبع : پرنٹ ویل امرتسر

ISBN- 81-7912-051-1

نوٹ : تفسیر کبیر حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف ہے اس کے چار ایڈیشن ربوہ اور لندن سے شائع ہو چکے ہیں۔ایک عرصہ سے ہندوستان میں تفسیر کبیر کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ اب حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے ازراہ شفقت مکمل سیٹ کو پانچ جلدوں میں قادیان سے شائع کرنے کی منظوری عنایت فرمائی ہے۔الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اسے ہر لحاظ سے مبارک اور بابرکت کرے اور لوگوں کے ایمانوں کو جلا بخشنے کا باعث ہو۔آمین۔

ناظر نشر و اشاعت قادیان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

تعارف (بار اوّل)

تفسیر کبیر کی یہ جلد سورۃ النمل، سورۃ القصص اور سورۃ العنکبوت کی تفسیر پر مشتمل ہے۔* اِس سے پہلے نو جلدیں اِس تفسیر کی شائع ہو چکی ہیں اور میں بڑے وثوق سے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ہر وہ شخص جس نے اِس تفسیر کی کوئی جلد پڑھی ہے وہ اس کی افادیت کا انکار نہیں کرسکتا یہ تفسیر اپنی نوعیت کی ایک جدید تفسیر ہے اِس کے پڑھنے سے اِنسان کو قرآن مجید کے زندہ کلامِ الٰہی ہونے پر یقین حاصل ہوتا اور اس نکاتِ جدیدہ اور حقائقِ عجیبہ اور معارفِ لطیفہ پر اطلاع پاکر انسان کا قلب وجد میں آکر رقصاں ہوتا ہے اور اس کی رُوح آستانۂ الٰہی پر سجدہ ریز ہوکر شکریہ ادا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن کریم جیسی کامل و بے نظیر و بے مثال کتاب عطا فرمائی۔

تفسیر کبیر کا اثر

ہندوستان کے ایک مشہور اہلِ قلم اور محقق ادیب علامہ نیاز فتحپوری تفسیر کبیر سے متعلق اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"تفسیر کبیر جلد سوم آجکل میرے سامنے ہے اور مَیں اُسے بڑی نگاہِ غائر سے دیکھ رہا ہوں۔ اِس میں شک نہیں کہ مطالعہ قرآن کا ایک بالکل نیا زاویۂ فکر آپ نے پیدا کیا ہے اور یہ تفسیر اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلی تفسیر ہے جس میں عقل و نقل کو بڑے حُسن سے ہم آہنگ دکھایا گیا ہے۔ آپ کی تبحّرِ علمی، آپ کی وسعتِ نظر، آپ کی غیر معمولی فکر و فراست، آپ کا حُسنِ استدلال اس کے ایک ایک لفظ سے نمایاں ہے اور مجھے افسوس ہے کہ مَیں کیوں اِس وقت تک اِس سے بے خبر رہا۔ کاش کہ مَیں اس کی تمام جلدیں دیکھ سکتا۔ کل سورۃ ھود کی تفسیر میں حضرت لُوطؑ پر آپ کے خیالات معلوم کرکے جی پھڑک گیا اور بے اختیار یہ خط لکھنے پر مجبور ہوگیا۔ آپ نے ھٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ کی تفسیر کرتے ہوئے عام مفسّرین سے جُدا بحث کا جو پہلو اختیار کیا ہے اُس کی داد دینا میرے اِمکان میں نہیں۔ خدا آپ کو تا دیر زندہ سلامت رکھے۔"

اور ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "تفسیر کبیر برابر پیشِ نظر رہی اور رات کو تو بالالتزام اُسے دیکھتا ہوں مَیں نے اسے کیسا پایا یہ بڑی تفصیل طلب بات ہے لیکن مختصر یُوں سمجھ لیجئے کہ میرے نزدیک یہ اُردو میں بالکل پہلی تفسیر ہے جو بڑی حد تک ذہنِ اِنسانی کو مطمئن کرسکتی ہے ..... اِس میں شک نہیں کہ آپ کے ادارہ نے اِس تفسیر کے ذریعہ سے جو خدمت اسلام کی انجام دی ہے وہ اِتنی بلند ہے کہ آپ کے مخالف بھی اس کا اِنکار نہیں کرسکتے۔ وَذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔"

تفسیر کبیر کی اِس جلد کا مسودہ حضرت امیر المؤمنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے نظرِ ثانی کے بعد گذشتہ سال ہی عنایت فرما دیا تھا لیکن تفسیر کبیر جلد پنجم حصہ دوم کا حجم چونکہ زیادہ ہوگیا تھا اِس لئے ہم نے حضور سے یہ درخواست کی کہ یہ حصّہ تفسیر آئندہ سال شائع کیا جائے۔ حضور نے ہماری اِس درخواست کو منظور فرما لیا چنانچہ تفسیر کبیر کی یہ جلد اب شائع کی جا رہی ہے۔

آخر میں تمام قارئین کرام سے نہایت عجز و الحاح سے دعا کیلئے درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب محمود اور ہمارے پیارے امام کو کامل و عاجل شفا عطا فرمائے اور اس بے حد نافع الناس تفسیر کو مکمل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین اللّٰھم آمین۔ خاکسار **جلال الدین شمس** ربوہ ۱۵ نومبر ۱۹۶۰ء

* موجودہ ایڈیشن میں سورۃ الشعراء بھی اِس جلد میں شامل کر دی گئی ہے۔ سید عبدالحی

الفہرست

سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ شعراء - یہ سورۃ مکی ہے۔

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ مِائَتَانِ وَّثَمَانٍ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاَحَدَ عَشَرَ رُكُوْعًا

اور بسم اللہ سمیت اِس کی دو سو اٹھائیس (۲۲۸) آیتیں ہیں - اور گیارہ رکوع ہیں [۱]

[۱] زمانۂ نزول سورۂ شعراء اکثر مفسرین کے نزدیک مکی ہے مگر مقاتل کہتے ہیں کہ اس میں کچھ آیتیں مدنی بھی ہیں۔ جیساکہ وہ آیت جس میں شعراء کا ذکر ہے (آیت ۲۲۵) اِسی طرح وہ آیت جس میں ذکر ہے کہ کیا اُن کے لئے یہ نشان کم ہے کہ علماء بنی اسرائیل بھی اس قرآن کو پہچانتے ہیں یعنی سمجھتے ہیں کہ یہ قرآن انبیاء بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں کے مطابق ہے (آیت ۱۹۸)

ابن عباسؓ اور قتادہؓ کا قول ہے کہ اس میں سے صرف چار آیتیں مدنی ہیں باقی سب سورۃ مکی ہے - اور وہ چار آیتیں وہ ہیں جو وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ سے آخر تک چلتی ہیں - (آیت ۲۲۵ تا ۲۲۸) - لیکن اس قسم کی موشگافی کی وجہ یا تو یہ ہوا کرتی ہے کہ بعض مضامین کو مفسرین مدینہ یا مکہ کے مناسب حال سمجھ لیتے ہیں یا کسی ایسے واقعہ کو جو ان آیات سے مناسبت رکھتا ہے اپنے قیاس کا موجب بنا لیتے ہیں - ورنہ بلا کسی خاص دلیل یا تاریخی گواہی کے یہ تفریق پیدا کرنا درست نہیں - مثلاً مقاتل نے اَوَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ (آیت ۱۹۸) کو صرف اسلئے مدنی قرار دے دیا ہے کہ اِس میں علماء بنی اسرائیل کا ذکر ہے حالانکہ سورۂ مریم قطعی اور یقینی طور پر مکی ہے اور وہ ساری کی ساری عیسائیت اور یہودیت کے ذکر سے پُر ہے - اِسی طرح سورۂ طٰہٰ قطعی اور یقینی طور پر مکی ہے مگر وہ بھی بنی اسرائیل کے ذکر سے پُر ہے - اور ابن عباسؓ اور اُن کے دو شاگردوں نے آخری آیتوں کو صرف اس لئے مدنی قرار دے دیا ہے کہ اِن میں شعراء کا ذکر ہے - اور شعر پر زور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مدنی میں دیا گیا تھا - اس سے پہلے مسلمانوں میں شاعر نہ تھے اور اِن آیات میں یہ ذکر ہے کہ شاعر محض تُک بند ہوتے ہیں سوائے نیک شاعروں کے - مگر یہ استدلال درست نہیں کیونکہ بغیر کسی واقعہ کے بھی تو اصول بیان کئے جاتے ہیں - اگر اسی طرح دلائل قائم کئے جائیں تو شاید ارسطو کی کتب اور سقراط کی کتب سے اس کے عجیب و غریب سوانح زندگی تیار کر لئے جائیں - آخر انسان واقعات سے جُدا ہو کر بھی تو سوچتا ہے - پھر اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اگر قرآن خدا کا کلام نہیں تو بھی اِس میں جاری واقعات سے الگ ہو کر بھی کوئی مضمون آ سکتا ہے - سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ غلطی ابتداء میں خود مسلمانوں کو لگی ہے - پھر مسیحیوں نے اِسے اُچھالا ہے - مگر جس نے بھی غور کیا ہے باوجود دشمن کے اس استدلال کی غلطی کو سمجھ گیا ہے - چنانچہ ریورنڈ وہیری نے اپنی تفسیر میں اس قسم کے استدلال کو غلط قرار دیا ہے اور اس سورۃ کو یقینی طور پر مکی قرار دیا ہے - پس اس قسم کا اجتہاد قطعاً درست نہیں ہو سکتا خواہ مسلمان ایسا کریں یا عیسائی کریں - سورتوں کا زمانہ ہم صرف تاریخی شواہد سے متعین کر سکتے ہیں - اور وہ بھی محض اس حد تک کہ فلاں سورۃ یا اس کا

معتدبہ حصہ فلاں زمانہ میں اُترا ہے۔ اس سے زیادہ باتیں جو قیاس سے معلوم کی جائیں ہمیں غلطی کی طرف لے جا سکتی ہیں لیکن اِن سے فائدہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

ترتیبِ سُور سورۃ الفرقان کے آخر میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ خیال مت کرو کہ اللہ تعالیٰ اس نظام کو تباہ کر دیگا جو اس وقت دیر سے قائم شدہ مذہبوں کے ذریعہ سے دنیا میں جاری ہے بلکہ یہ سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو اپنی آواز پر لبیک کہنے اور اپنے اخلاق کو ظاہر کرنے کے لئے پیدا کیا تھا اگر وہ اس غرض کو پورا نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کو ایسے انسان یا اُس کے نظام کے قائم رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ اور اُسے اس کے تباہ کرنے کا غم کیوں ہو؟ اب اس سورۃ میں یہ بتایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی محبت اور بنی نوع انسان کی ہمدردی کی وجہ سے اِس پیش نظر خطرہ سے گھبراتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بجائے تباہی کے اگر انسان کو بچا لیا جائے تو اچھا ہے۔ یہ بے شک اُن کی محبت کا ثبوت ہے لیکن خدا تعالیٰ کی سکیم کے مطابق نہیں۔ کیونکہ خدائی سکیم یہ ہے کہ انسان کو علم و عرفان دے کر اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی مرضی اور اپنی کوشش سے خدا تعالیٰ کے قرب کا راستہ تلاش کرے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے طبعی نتائج بھگتے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا تو انسان ایک مشین تو بن جاتا مگر خدا تعالیٰ کی شکل پر بنایا ہوا وجود نہ ہوتا۔ پس باوجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمدردی اور محبت اور شدید خواہش کے، انسان کو خدائی سکیم کے مطابق چلنا ہوگا۔ اس کے بغیر وہ حقیقی نجات نہیں پا سکتا۔

اِس سورۃ سے مسیحیوں اور یہودیوں سے خطاب جو سورۂ یونس سے شروع تھا اُس کا رُخ بدل کر پھر مسلمانوں کی طرف کیا گیا ہے اور اسی وجہ مقطعات میں تبدیلی کی گئی ہے۔

اس سورۃ کا نام شعرآء اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس سورۃ کا مضمون بتاتا ہے کہ انسانی ترقی قول اور عمل میں یک رنگی سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ لوگ جو کہتے کچھ اَور ہیں اور کرتے کچھ اَور ہیں شعراء کی طرح وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ گویا بتایا کہ اِس زمانہ میں صرف مسلمان ہی ایسے ہونگے جن کا قول و فعل یکساں ہوگا۔ اس لئے وہی جیتیں گے۔ دوسرے لوگ مثالی طور پر شعراء کی طرح ہیں۔ یعنی دعوے تو بہت کرتے ہیں لیکن عمل کم ہے۔ اس وجہ سے وہ مسلمانوں کے مقابل پر نہیں جیت سکتے۔

سورۃ شعرآء کے مضامین کا خلاصہ اس سورۃ کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ اِس سورۃ اور اس کی تابع سورتوں میں اللہ تعالیٰ کی اِن تین صفات کی تشریح کی گئی ہے (۱) لطیف (۲) سمیع اور (۳) مجید۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مخفی سے مخفی رازوں کے واقف ہونے، دعاؤں کے سُننے اور اُس کے مجید ہونے پر یعنی ان قوانین پر جن سے اُسکی اعلیٰ شان ظاہر ہوتی ہے ظلم اور جبر ثابت نہیں ہوتا اِس سورۃ میں روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے دلائل دیئے گئے ہیں۔ (آیت ۱ و ۲)

یہ کتاب اپنے دعاوی کے دلائل خود دیتی ہے۔ کسی اَور کی مدد اور وکالت کی محتاج نہیں۔ (آیت ۳)

پچھلی سورتوں میں جو کفار کی تباہی کی خبر دی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ خدا اِن پر رحم نہیں کرے گا۔ اِس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی خیر خواہی کی وجہ سے سخت تکلیف پہنچی ہے مگر یہ غم بیکار ہے۔ کیونکہ اِن لوگوں کو خدا تعالیٰ جبراً ہی مومن بنا سکتا ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے (آیت ۴ و ۵)

ذاتی طور پر یہ لوگ حقائق کے ماننے سے دُور ہو چکے ہیں اور
ہر سچائی پر ہنسی اڑاتے ہیں۔ (آیت ۶ و ۷)

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر ضرورت کے سامان پیدا کئے
ہیں اور قسم قسم کے جوڑے بنائے ہیں پھر کیوں خدائی سلسلہ
میں بھی جوڑے نہ ہوں یعنی مثیلِ موسیٰؑ اور مثیلِ عیسیٰؑ پیدا نہ ہوں
اگر ایسا ہو تو قابلِ اعتراض امر نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طاقت اور
اُس کی رحمت ہی کا ثبوت ملتا ہے (آیت ۸ تا ۱۰)

کیا یہ لوگ موسیٰؑ کو نہیں دیکھتے کہ خدا نے اُسے فرعون
کی طرف بھیجا۔ اور اُس نے جانے سے بھی پہلے اپنے مُلکیوں کی
سنگدلی سے خوف کیا اور چاہا کہ عذر سُنکر اُسے معاف کیا
جائے اور ہارون کو مقرر کر دیا جائے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اُس کا
عذر نہ سُنا کیونکہ وہی سب سے بہتر وجود اس کام کیلئے تھا
ہاں ہارون کو اُس کے ساتھ ملا دیا۔ اور فرمایا کہ جاکر فرعون کو
ہمارا پیغام سُنا دو۔ ہم تمہارے ساتھ ہونگے اور اُس سے
کہہ دو کہ وہ بنی اسرائیل کو ملک سے نکلنے دے۔ (آیت
۱۱ تا ۱۸)

فرعون نے اس پر سابق احسان جتائے اور اُسکی زندگی
پر کچھ اعتراضات کئے۔ اور اُسے احسان فراموش قرار دیا۔
موسیٰؑ نے اس کے جواب دیئے اور کہا کہ اگر میں ایسا ہوتا
تو خدا مجھے اپنی رسالت کے لئے کیوں چن لیتا۔ (آیت ۱۹ تا ۲۲)

اور پھر کہا کہ تیرے احسان مجھ پر اس جرم کے مقابل کیا
ہیں کہ تو نے میری ساری قوم کو غلام بنا رکھا ہے (آیت ۲۳)

فرعون نے شرمندہ ہو کر بات بدلی اور خدا تعالیٰ کی
ہستی کے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔ حضرت موسیٰ
علیہ السلام نے جواب دیئے۔ آخر تنگ آکر اُس نے دھمکی
دی کہ میرے سوا کوئی اور معبود مانا تو قید کر دونگا۔ موسیٰؑ
نے کہا۔ خدا کے شواہد تو دیکھ۔ اُس نے کہا۔ اگر کچھ شواہد ہیں
تو لا۔ اس پر موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا جو فرعون کو ایک
اژدہا نظر آیا۔ اور موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ بغل سے نکالا تو
وہ چمک رہا تھا۔ فرعون نے ان اُمور کو سحر قرار دیا۔ اور
قوم کو بھڑکایا کہ یہ سیاسی فضیلت چاہتا ہے۔ انہوں
نے ساحروں سے مقابلہ کروانے کا مشورہ دیا۔ ساحر
بلوائے گئے تو وہ مغلوب ہوئے اور موسیٰؑ پر ایمان لے
آئے۔ (آیت ۲۴ تا ۵۲)

اس پر ہم نے موسیٰؑ کو اپنی قوم اس ملک سے نکال
لے جانیکا حکم دیا۔ (آیت ۵۳)

فرعون نے قوم کو غیرت دلائی۔ پیچھا کیا لیکن تباہ ہوا
اور جو نعمتیں اُسے حاصل تھیں ویسی ہی نعمتیں موسیٰؑ کو عطا کرنے
کی خدا نے تدبیر کی (چنانچہ شام کا علاقہ مصر سے بالکل مشابہ
کہا جا سکتا ہے بلکہ وہ علاقہ مصر سے بھی بہتر ہے۔)
(آیت ۵۴ تا ۶۰)

فرعون اپنے لشکروں سمیت آگے بڑھا تو موسیٰؑ
کی قوم ڈری۔ مگر موسیٰؑ نے تسلی دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے
معجزانہ طور پر موسیٰؑ کو سمندر میں سے خشک نکال کر لے گیا
اور فرعون کو غرق کر دیا۔ آیت ۶۱ تا ۶۹)

پھر ابراہیمؑ کو دیکھ۔ اُس نے اپنی قوم کو توجہ
دلائی کہ خدا تعالیٰ سُنتا ہے اور تمہارے بُت سُنتے نہیں
اور بے طاقت ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ کچھ ہو
ہم اپنے باپ دادا کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتے۔
ابراہیمؑ نے کہا کہ وہ سب حق کے خلاف تھے لیکن میں
تو اُسی خدا کو مانتا ہوں جو فعّال ہے اور دُنیا کے
کاموں میں اُس کا دخل جاری ہے۔ اُس کی طرف سے ہدایت
بھی آتی رہتی ہے۔ جسمانی رزق بھی آتا رہتا ہے۔ شفا
بھی آتی رہتی۔ موت کے بعد حیات بھی آتی رہتی ہے
اور مرنے کے بعد بھی اُسی پر اُمیدیں ہیں (آیت ۷۰ تا ۹۰)

اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سنت چلی ہوئی ہے
کہ وہ نیکوں کی مدد کرتا ہے اور بدوں کو سزا دیتا ہے۔
مجرم لوگ پہلے تو اکڑتے ہیں۔ لیکن پھر منت سماجت پر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

طٰسٓمّٓ ②

طاہر (اور) سمیع (اور) مجید (خدا اِس سورۃ کا نازل کرنیوالا ہے)

...ثر آتے ہیں۔ یہ سب باتیں خدا تعالیٰ کے بادشاہ اور رحمٰن ہونے پر دلالت کرتی ہیں (آیت ۹۱ تا ۱۰۵)

پھر نوحؑ کو دیکھو۔ اُس نے بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہونے کا دعویٰ کیا۔ نیکی کی تعلیم دی۔ اور بغیر کوئی بدلہ لئے خدمت کرنی چاہی۔ لیکن لوگوں نے اُس پر یہ اعتراض کیا کہ اِس کے ماننے والے ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں یہ کیونکر جیت سکتے ہیں۔ مگر نوحؑ نے کہا کہ ادنیٰ اور اعلیٰ کا معیار اعمالِ صالحہ پر ہے نہ کہ قوم اور حکومت پر (آیت ۱۰۶ تا ۱۱۶)

مخالفوں نے بجائے جواب کے دھمکیاں دینی شروع کردیں۔ اِس پر انہوں نے خدا سے فیصلہ چاہا۔ اور مخالفین کے دنیوی سامان سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اور وہی ہوا جو خدا نے چاہا تھا (آیت ۱۱۷ تا ۱۲۳)

پھر عاد کے رسول ہودؑ آئے۔ اُن سے بھی اِسی طرح ہوا۔ انہوں نے بھی قوم کو توجہ دلائی کہ ظاہری شان و شوکت سے قوم زندہ نہیں رہتی باطنی اخلاق سے زندہ رہتی ہے۔ اور وہ تم میں مفقود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ باتیں پہلے بھی لوگ کہتے رہے ہیں۔ مگر کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔ مگر آخر وہ بھی پکڑے گئے (آیت ۱۲۴ تا ۱۴۱)

پھر ثمود کی قوم کی طرف صالحؑ آئے۔ انہوں نے بھی بےبدلہ خدمت کا اعلان کیا اور بتایا کہ ظاہری شان و شوکت روحانی طاقت کے بغیر تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ مگر قوم نے انکار کیا کہ اپنے جیسے آدمی کی اطاعت کیوں کریں۔ آخر وہ بھی پکڑے گئے۔ (آیت ۱۴۲ تا ۱۶۰)

اِسی طرح لوطؑ آئے اور اُن کی قوم کے ساتھ بھی اِسی طرح کا معاملہ گذرا۔ وہ اخلاقی بدیوں کا شکار تھے۔ (آیت ۱۶۱ تا ۱۷۶)

پھر اصحاب الایکہ کا زمانہ آیا۔ اُن کے نبی شعیبؑ کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔ اور اُن کے مخالف پکڑے گئے وہ تجارتی بددیانتی کا شکار تھے۔ (آیت ۱۷۷ تا ۱۹۲)

یہ قرآن بھی خدائی کلام ہے اور اپنی دلیلیں خود دیتا ہے۔ پہلے نبیوں نے اِس کی پیشگوئیاں کی ہیں اور بنی اسرائیل کے علماء بھی اپنی کُتب کے ذریعہ سے اس کی صداقت جانتے ہیں۔ پھر وہ اپنی پہلی مخاطب قوم کی زبان میں آیا ہے۔ اگر غیر زبان ہوتی تو وہ اُسے سمجھ نہ سکتے مگر اب غور نہ کرنے کی کیا وجہ ہے۔ وجہ وہی ہے جو پہلے نبیوں کی قوموں کے نہ ماننے کی تھی۔ یہ عذاب کے منتظر ہیں مگر جب وہ آیا تو انہیں کیا فائدہ ہوگا؟ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعہ میں سچّے ہیں تو ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کا آنا اصلاح نہ کرنے والوں کے لئے عذاب کا اعلان ہے۔ (آیت ۱۹۳ تا ۲۱۰)

لوگ اِس کی تعلیم کو دیکھیں کہ کیا اِس میں شیطان کی تائید ہے؟ اگر نہیں تو شیطان نے خدا کی تائید کیوں کرنی تھی اور وہ اعلیٰ پُرمعارف کلام کس طرح کرسکتا تھا اِس میں تو نبیوں والی باتیں ہیں اور نبیوں والی باتوں کو شیطان سُن ہی نہیں سکتا۔ پس اے ہمارے رسولؐ! خدائے واحد کی تبلیغ کرتا چلا جا۔ اور سب سے پہلے

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۳﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ

یہ آیتیں اُس کتاب کی ہیں جو (اپنے مضامین کو) کھول کر بیان کرتی ہے۔ شاید تُو اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالیگا

اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۴﴾

کہ وہ کیوں نہیں مومن ہوتے۔ ۵۲

اپنی قوم کو تبلیغ کر۔ اور جو ایمان لائیں اُن کی تربیت کر اور جو نافرمانی کریں اُن سے برأت ظاہر کر اور عزیز و رحیم خدا پر توکّل کر۔ وہ تجھے دیکھتا ہے اور تجھکو طاقتور بنانے والا ہے۔ عنقریب مسلمانوں کا بکھرے ہوئے ہونا دُور ہو جائیگا۔ اور وہ ایسی جگہ پر جائیں گے جہاں اُنہیں اکٹھا رہنے کا موقعہ ملیگا۔ اور وہ خدائے واحد کی عبادت آزادی سے کریں گے۔ کیونکہ وہ فریادیں سُننے والا ہے۔

شیطان تو اُن لوگوں پر اُترتے ہیں جو جھوٹے اور گنہگار ہوں۔ وہ آسمانی باتیں سُننے کے لئے کان رکھتے ہیں اور اُن میں سے اکثر جھوٹے ہیں۔ اور شعراء کی پیروی آوارہ گرد لوگ کرتے ہیں جنہیں صرف زبان کا چسکہ ہوتا ہے۔ عمل نہ اُستاد کریں نہ شاگرد۔ لیکن مومن تو عبادت گذار اور سچ کے مبلّغ ہوتے ہیں۔ وہ سچ کی وجہ سے تکلیفیں بھگتتے ہیں اور مجبور ہو کر جواباً ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ لیکن اُن کے سچا ہونے کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ کمزور ہوتے ہوئے وہ اپنے دشمنوں پر غالب آجاتے ہیں (آیت ۲۱۱ تا ۲۲۸)

۵۲ حل لغات - مُبِیْنٌ اَبَانَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اَبَانَ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے یعنی کبھی اس کے معنے ظاہر کرنے کے ہوتے ہیں اور کبھی ظاہر ہونے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اقرب الموارد میں لکھا ہے۔ اَبَانَ الشَّیْءُ اِتَّضَحَ یعنی اَبَانَ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں فلاں چیز ظاہر ہوگئی اور اَبَانَ فُلَانٌ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں اَوْضَحَہٗ کسی بات کو خوب واضح اور نمایاں کیا۔

مُبِیْنٌ

۲ بَاخِعٌ

بَاخِعٌ: بَخَعَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور بَخَعَ الشَّاةَ کے معنے ہیں بَلَغَ بِذَبْحِهَا الْقَفَا۔ بکری کی گردن پر چھری چلاتے اور اُسے ذبح کرتے ہوئے کوئی شخص اُس کی گردن کے آخری حصّہ تک اپنی چھری لے گیا (اقرب) نیز اَلْبَخْعُ بَخَعَ کا مصدر ہے۔ اور اس کے معنے ہیں قَتْلُ النَّفْسِ غَمًّا اپنے نفس کو غم کی وجہ سے ہلاک کر دینا۔

تفسیر:- طٰسٓمّٓ جو حروفِ مقطعات میں سے ہیں اِن میں سے طٓ لطیف کا سٓ سمیع کا اور مٓ مجید کا قائم مقام ہے۔ گویا اِس سورۃ اور اِس کی تابع سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے محسنِ عظیم ہونے اُس کے مخفی سے مخفی رازوں سے واقف ہونے۔ اپنے بندوں کی دُعائیں سُننے اور اُس کے مجید ہونے پر یعنی اُن قوانین پر جن سے اُس کی اعلیٰ اور بلند شان ظاہر ہوتی ہے ظلم اور جبر ثابت نہیں ہوتا روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس کے دلائل دیئے گئے ہیں[1]

اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو امتیازی خصوصیات حاصل ہیں اُن میں سے ایک بڑی خصوصیّت یہ ہے کہ اسلام نے صفاتِ الٰہیّہ کا ایک ایسا مکمل نقشہ پیش کیا ہے جو پہلی الہامی کُتب میں سے کسی کتاب میں بھی

---

[1] مقطعات کی تفصیلی بحث کیلئے دیکھیں تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۱ تا ۱۲

نہیں پایا جاتا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک خُدا تعالیٰ کی ہستی کو پیش کرنے کا سوال ہے دُنیا کی ہر الہامی کتاب نے اُس کے وجود کو پیش کیا ہے اور اُس پر ایمان لانے کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ مذہب کا نقطۂ مرکزی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اگر کوئی مذہب اللہ تعالیٰ کو ہی پیش نہ کرے تو اُس کا وجود اور عدم برابر ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کہ خدا تعالیٰ اپنی ذات میں کیا صفات رکھتا ہے یا اپنے بندوں سے وہ کس رنگ میں تعلقات رکھتا اور اُن سے سلوک کرتا ہے۔ اِن اُمور پر اُن کُتب میں کوئی تفصیلی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ صرف یہ کہہ دینا کہ ہمارا خدا محبت ہے یا ہمارا خدا بڑا دیالو اور کرپالو ہے اُس کی صفاتِ حسنہ کا کوئی حقیقی اور صحیح نقشہ نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ اس قسم کی صفات کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا دنیوی خیالات اور رجحانات کا بھی نتیجہ کہلا سکتا ہے۔ مثلاً جب دیکھا کہ لوگ رحم کرنا پسند کرتے ہیں تو کہدیا کہ خدا تعالیٰ بھی بڑا رحم کرنیوالا ہے یا جب دیکھا کہ لوگ حسنِ سلوک کو بڑا اچھا وصف سمجھتے ہیں تو خدا تعالیٰ کے متعلق بھی کہہ دیا کہ وہ بڑا کرپالو ہے۔ پس محض چند صفات کے ذکر سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ پہلے مذاہب نے اِس مسئلہ پر کوئی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ پھر اگر بعض صفات کا اُن کتب میں ذکر ہو بھی تو اِن صفات کی تشریح اُن میں موجود نہیں اور نہ ہی صفاتِ الٰہیّہ کا باہمی تعلق واضح کیا گیا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ مَیں نے رُؤیا میں دیکھا کہ ایک جرمن نومسلم نے مجھ سے کوئی سوال کیا ہے جس کے جواب میں مَیں نے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات پیش کی ہیں جن میں سے ایک ربّ بھی ہے۔ اِس پر اُس جرمن نومسلم نے کہا کہ اِن صفات کا ذکر تو بائبل میں بھی آتا ہے۔ اِس فقرہ کے دونوں معنے ہو سکتے تھے۔ یہ بھی کہ چونکہ بائبل میں بھی بعض صفات کا ذکر ہے اِس لئے یہ دلائل عیسائیوں پر بھی اثر کر سکتے ہیں اور یہ معنے بھی ہو سکتے تھے کہ گویا قرآن کریم بائبل کی نقل کرتا ہے۔ مَیں نے اِن دونوں معنوں کا خیال کرکے دل میں سوچا کہ یہ نومسلم ہیں ایسا نہ ہو کہ اِن کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ قرآن کریم کی بہت سی تعلیم بائبل سے ملتی جلتی ہے پھر اِس کی فضیلت کیا ہوئی؟ اِس خیال کے پیدا ہونے پر مَیں نے بڑے جوش سے اُن کے سامنے تقریر شروع کی کہ بائبل میں جو یہ صفات آئی ہیں اُن سے قرآنی صفات کو امتیاز حاصل ہے۔ بائبل میں محض رسمی ناموں کے طور پر وہ صفات بیان کی گئی ہیں اور قرآن کریم نے ان صفات کی باریکیوں کو بیان کیا ہے اور ان مضامین میں وسعت پیدا کی ہے اور ان کے راز بیان کئے ہیں۔ چنانچہ مَیں نے کہا۔ دیکھو ربّ کا لفظ ہے بائبل نے بھی خدا تعالیٰ کو پیدا کرنے والا یا پالنے والا کہا ہے یا زمین و آسمان کا خالق کہا ہے۔ لیکن قرآن کریم یہ نہیں کہتا بلکہ قرآن کریم سورۂ فاتحہ میں خدا تعالیٰ کو رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کے طور پر پیش کرتا ہے اور لفظ ربّ اور لفظ عالمین دونوں اپنے اندر امتیازی شان رکھتے ہیں۔ ربّ صرف اِسی مضمون پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ پیدا کرنے والا ہے اور پالنے والا ہے بلکہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ وہ نہایت ہی مناسب طور پر انسان کی باریک در باریک قوتوں اور طاقتوں کو درجہ بدرجہ اور مناسبِ حال ترقی دیتا چلا جاتا ہے۔ اور عالمین کا لفظ محض زمین اور آسمان پر دلالت نہیں کرتا بلکہ زمین و آسمان کے علاوہ مختلف اصناف کی مختلف کیفیتوں پر بھی دلالت کرتا ہے اور یہ مضمون پہلی کتب میں بالکل بیان نہیں ہوا۔ مثلاً عالمین میں جہاں یہ مُراد ہے کہ اِس جہان کا بھی ربّ ہے اگلے جہان کا بھی ربّ ہے۔ آسمانوں کا بھی ربّ ہے اور زمینوں کا بھی ربّ ہے۔ وہاں اِس طرف بھی اشارہ ہے کہ عالمِ اجسام اور عالمِ ارواح اور عالمِ نساء

اور عالمِ رجال اور پھر عالمِ فکر اور عالمِ شعور اور عالمِ تصوّر اور عالمِ تقدیر اور عالمِ عقل اِن سب کا بھی وہ ربّ ہے یعنی وہ صرف روٹی ہی مہیا نہیں کرتا۔ وہ صرف اُنہی چیزوں کو مہیا نہیں کرتا جو جسموں کو پالنے والی ہیں بلکہ وہ ارواح کے پلنے کا بھی سامان کرتا ہے اور پھر مختلف تقاضے جو انسان کی فطرت میں پائے جاتے ہیں اُن میں سے ہر ایک کی نشو و نما کے لئے اُس نے قرآن کریم میں تعلیم دی ہے۔ چنانچہ اِسی قسم کے مضمون پر مَیں تفصیلی لیکچر اُنکے سامنے دے رہا ہوں اور خود مجھے بھی نہایت لذت اور سرور حاصل ہو رہا ہے اور مَیں محسوس کرتا ہوں کہ ایک نیا مضمون اور نئی کیفیت میرے اندر پیدا ہو رہی ہے۔ یہی لیکچر دیتے دیتے میری آنکھ کھل گئی۔

غرض اوّل تو ان کتب میں صفاتِ الٰہیہ پر نہایت اجمالی رنگ میں روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی حقیقی شان جلوہ گر نہیں ہوتی۔ اور پھر جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے اُن کی بھی تشریح نہیں کی گئی اور نہ ہی صفاتِ الٰہیہ کے باہمی ربط اور تعلّق کو واضح کیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے اِس بارہ میں ایک جامع تعلیم بنی نوعِ انسان کے سامنے پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اپنے اندر دو قسم کی جلوہ گری رکھتی ہیں۔ اس کا ایک جلوہ تو صفاتِ تنزیہی کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے جو اُس کو اُن تمام قسم کی کثافتوں سے جو مادیات میں پائی جاتی اور مخلوقات میں دکھائی دیتی ہیں منزّہ اور پاک ٹھہراتا ہے۔ اور ایک جلوہ صفاتِ تشبیہی کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے یعنی ایسی صفات کی شکل میں جو مخلوق کی صفات کے مشابہ نظر آتی ہیں چنانچہ وہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو تمام کائنات کا نقطۂ مرکزی ہے وہ اَحَدٌ یعنی اپنی ذات میں اکیلا اور منفرد ہے۔ وہ اَلصَّمَدُ یعنی ایسی ہستی ہے جس کے سب محتاج ہیں مگر وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ہے۔ یعنی نہ تو اس سے آگے کوئی اولاد پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ خود کسی کی اولاد میں سے ہے۔ وہ لَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ہے۔ یعنی نہ تو کوئی متوازی طاقت اُس کے ساتھ موجود ہے اور نہ اُس کے بالمقابل کوئی اور طاقت موجود ہے۔ وہ اوّل و آخر ہے۔ یعنی تمام اشیاء کی علّت العلل ہے۔ اور سب کی سب مخلوق اُسی کی طرف لوٹتی ہے۔ وہ قدیر ہے یعنی ہر اُس بات پر قادر ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ وہ اَلْحَیُّ ہے یعنی ہمیشہ زندہ رہنے والا اور دوسروں کو زندہ رکھنے والا ہے۔ وہ اَلْقَیُّوْمُ ہے یعنی اپنی ذات میں قائم اور سب کو قائم رکھنے والا ہے۔ وہ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ ہے یعنی سب جہانوں کو پیدا کرنے والا اور اُن کو پالنے والا ہے۔ وہ اَلرَّحْمٰنُ ہے یعنی بنی نوعِ انسان کو جس قدر ضروریات پیش آنے والی تھیں اُن تمام ضروریات کو اُس نے انسان کی پیدائش سے پہلے ہی محض اپنے فضل اور انعام کے طور پر مہیا کر دیا ہے۔ وہ اَلرَّحِیْمُ ہے یعنی تمام محنتوں اور کوششوں کے اعلیٰ نتائج پیدا کرنے والا ہے۔ وہ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ہے۔ یعنی ان نتائج کے علاوہ جو اس کی طرف سے طبعی قانون کے ماتحت نکلتے رہتے ہیں اُس نے ہر کام کی ایک انتہا مقرر کی ہے۔ جہاں پہنچکر اُس کا آخری فیصلہ صادر ہو جاتا ہے اور نیک انسان اپنے کاموں کا اچھا بدلہ اور بُرا انسان اپنی بُرائیوں کی سزا پا لیتا ہے۔ مگر یہ بدلے اور جزائیں اللہ تعالیٰ کی مالکیت کے ماتحت ہوتی ہیں۔ یعنی وہ صرف سزا ہی نہیں دیتا بلکہ اگر چاہتا ہے تو اپنے بندوں کو معاف بھی کر دیتا ہے۔ وہ عَلِیْمٌ ہے۔ یعنی ایک ایک ذرہ کا اُس کو علم ہے۔ بلکہ انسانی فطرت کے مخفی اسرار تک سے آگاہ ہے۔ وہ سَمِیْعٌ ہے۔

یعنی لوگوں کی دُعاؤں اور اُن کی التجاؤں کو سُننے والا ہے۔ وہ قہّار ہے یعنی ہر ایک چیز اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ جبّار ہے یعنی ہر فساد کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ وہّاب ہے یعنی بندوں کو اپنے انعامات سے وافر حصہ دیتا ہے وہ غَفُوْر ہے یعنی لوگوں کی خطاؤں سے چشم پوشی کرتا ہے۔ وہ مُھَیْمِن ہے یعنی ہر ایک چیز کا محافظ اور نگران ہے۔ وہ اَلسَّلَامُ ہے یعنی لوگوں کو سلامتی دینے والا ہے۔ وہ اَلْقَابِض ہے یعنی ہر ایک چیز کو ایک حد کے اندر رکھنے والا ہے۔ وہ اَلْبَاسِط ہے یعنی کشائش اور فراخی پیدا کرنے والا ہے۔ وہ اَلرَّافِع ہے یعنی پستی سے بلندی تک پہنچانے والا ہے۔ وہ اَلْحَفِیْظ ہے یعنی مخلوق کی حفاظت کرنے والا ہے۔ وہ اَلْمُتَکَلِّم ہے یعنی لوگوں سے کلام کرنے والا اور اُن پر اپنے الہامات نازل کرنے والا ہے۔

غرض اسلام ایک کامل الصفات خدا دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ عیسائیت کی طرح صرف یہ کہکر خاموش نہیں ہو جاتا کہ خدا محبت ہے۔ نہ تورات کی طرح صرف چند صفات بیان کرنے پر اکتفاء کرتا ہے بلکہ اُس نے اُن تمام صفات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے جن کا انسانی پیدائش کے ساتھ تعلق ہے۔ گویا سب آسمانی ڈیپارٹمنٹس کو اُس نے ننگا کر کے دکھا دیا ہے جو اُس کے مِنَ السَّمَاءِ ہونے کا ثبوت ہے۔

پھر اسلام نے صرف صفاتِ الٰہیّہ کا ایک جامع نقشہ پیش کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ اُس نے بنی نوع انسان کو یہ بھی بتایا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگین ہونے یعنی اُس کی صفات کی نقل کرنے کی کوشش کرو۔ وہ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ (اعراف ع ۲) یعنی ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں صورت بخشی اور پھر ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدمؑ کی اطاعت کرو۔ اس پر فرشتوں نے تو آدمؑ کی اطاعت کی مگر ابلیس نے نہ کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی دو پیدائشیں ہیں۔ ایک بشری اور ایک رُوحانی۔ بشری پیدائش کے متعلق تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ ہم نے تم کو پیدا کیا یعنی تمہیں ایک ذی حیات وجود بنایا۔ اور پیدائش رُوحانی کے متعلق فرمایا۔ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ پھر ہم نے تمہاری ایک روحانی شکل بنائی جس کے ذریعہ تم دوسری مخلوق سے ممتاز طور پر پہچانے جاتے ہو۔ اِسی کی طرف بائیبل میں بھی اِن الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ

" خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ " (پیدائش باب ۱ آیت ۲۷)

لیکن بائیبل نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں اُن سے خدا تعالیٰ کے جسمانی ہونے کا دھوکا لگتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں اُن سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہاں صورت سے روحانی شکل مُراد ہے جسمانی نہیں۔ کیونکہ جسمانی پیدائش کا اِس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ پس صَوَّرْنٰکُمْ کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے تمہارے اندر صفاتِ الٰہیّہ کا حامل بننے کی قابلیت پیدا کی یعنی پہلے تو ہم نے انسان کی جسمانی خلق کی۔ اُس کے ناک۔ کان۔ ہاتھ اور پاؤں وغیرہ بنائے اور پھر ہم نے اُس کے دماغ کی ایسی تربیت کی اور اُس کی قوتوں کا اِس طرح ارتقاء شروع کیا کہ وہ صفاتِ الٰہیّہ کو اپنے اندر جذب کرنے کے قابل ہو گیا اور اُس کے اندر اُن کے اظہار کی اہلیّت پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد ہم نے ملائکہ سے کہا کہ اب تم اس انسان کو سجدہ کرو۔ چونکہ قرآن کریم میں اِس بات پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ سجدہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لئے جائز نہیں اِس لئے اس سجدہ سے مجازی سجدہ ہی

مُراد ہے اور اِس کے معنی اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں۔ مگر مجازی سجدہ بھی تو مجازی خدا کے سامنے ہی ہو سکتا ہے اسی لئے فرمایا کہ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کہ پہلے تو ہم نے تمہارے اندر خدائی صفات پیدا کیں اور جب تم خدائی صفات کو جذب کرنے اور اُن کا اظہار کرنے کے قابل ہو گئے تو پھر ہم نے ملائکہ سے کہا کہ سجدۂ حقیقی تو بہر حال میرے سوا کسی اور کے سامنے ناجائز ہے لیکن ہم تم کو ایک مجازی سجدہ کا حکم دینے لگے ہیں اور اِس مجازی سجدہ کے لئے ایک مجازی خدا کی ضرورت تھی۔ سو وہ مجازی خدا وہ انسان ہے جس کے اندر الٰہی صفات پائی جائیں۔

لیکن اگر اُسْجُدُوْا سے ہر انسان کے آگے سجدہ کرنا مُراد لیا جائے تو اس کے معنے یہ بنیں گے کہ وہ چوری کرے تو تم بھی چوری میں اُس کی مدد کرو۔ وہ ڈاکہ مارے تو تم بھی ڈاکہ مارو۔ وہ قتل کرے تو تم بھی قتل کرو۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ سجدہ بہر حال اُسی آدم کے آگے ہو سکتا ہے جو کبھی چوری نہیں کر سکتا۔ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کبھی فریب نہیں کر سکتا۔ کبھی شرک نہیں کر سکتا۔ کبھی بد دیانتی نہیں کر سکتا۔ کبھی ظلم نہیں کر سکتا۔ اور کبھی کسی اور خرابی میں مبتلا نہیں ہو سکتا اور چونکہ وہ خود اُن صفات کا حامل ہو گا جو ملائکہ کی صفات سے بڑی ہیں اس لئے اگر ایسے آدم کی اطاعت کی جائے تو یہ بالکل درست ہو گا۔ جو شخص خدائی صفات کا مظہر ہو گا ملائکہ کی کیا طاقت ہے کہ وہ اُسکے خلاف چلیں۔ اُس کے متعلق تو اُن کا فرض ہو گا کہ وہ اُسکے ساتھ چلیں۔ پس ہر شخص کے اندر خدا تعالیٰ نے یہ طاقت پیدا کی ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بن سکے۔ اور اگر وہ اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ پیدا کر لے تو پھر ملائکہ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اُس کی مدد کریں۔ اِسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے کہ جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُس کے کسی بندے کی مقبولیت دنیا میں پھیلے تو وہ ملائکہ کو حکم دیتا ہے اور وہ اُس کی مقبولیت دنیا میں پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ (کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۲۲۲) پس ہر انسان کے اندر یہ قابلیت ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرے۔ اور جب وہ صفاتِ الٰہیہ اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے تو فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلیں کیونکہ وہ ایک خدا نما وجود بن جاتا ہے اور اُس کا خدا تعالیٰ کے ساتھ اتصال ہو جاتا ہے دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز دوسری چیز کے مشابہ بن کر ہی اُس سے پیوست ہو سکتی ہے ورنہ نہیں مثلاً لکڑی کے ساتھ ہم لوہے اور چمڑے کو تو پیوست کر سکتے ہیں کیونکہ ان دونوں میں ٹھوس ہونے کی مشابہت پائی جاتی ہے مگر لکڑی کے ساتھ ہم ہوا یا پانی کو پیوست نہیں کر سکتے کیونکہ اُن میں مشابہت نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح جو چیزیں روحانی ہوتی ہیں اُن میں بھی مشارکت کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ پس خدا سے ملنے کے لئے ضروری ہے کہ بندے اور خدا میں روحانی مشارکت ہو اور وہ مشارکت یہی ہے کہ انسان اپنے اندر الٰہی صفات پیدا کرے جب کوئی شخص اپنے اندر الٰہی صفات پیدا کر لیتا ہے تو وہ اپنے اندر الوہیت کا رنگ پیدا کر لیتا ہے اور جب اُس کے اندر الوہیت کا رنگ آجائے تو اُس کا خدا تعالیٰ سے اتصال اسی طرح ممکن ہو جاتا ہے جیسے لکڑی کا لوہے سے۔ اور گو وہ خدا نہیں بن جاتا مگر خدا نما ضرور ہو جاتا ہے جیسے لکڑی لوہا نہیں بن سکتی یا لوہا لکڑی نہیں بن سکتا مگر وہ آپس میں جڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ سے اتصال اور اسکے قرب کے حصول کا ذریعہ یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ الٰہیہ پیدا کرے اور اُسکی محبت کو اپنے اندر جذب کرے پھر جسطرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اسی طرح محبتِ الٰہی اسے خدا تعالیٰ کی طرف کھینچنے لگ جاتی ہے

یہ تعلیم جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے اتنی اہم ہے کہ اگر اس کے مطابق ہر انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بنانے کی کوشش کرے تو یقیناً اس دُنیا کا نقشہ پلٹ جائے اور ہر انسان نیکی کے ایسے بلند مقام پر کھڑا ہو جائے کہ جس سے اُس کا قدم کبھی منحرف نہ کیا جا سکے۔ یہی حقیقت ایک دفعہ مجھے رؤیا میں بھی بتائی گئی تھی۔ مَیں نے دیکھا کہ مَیں تقریر کر رہا ہوں اور میرے ہاتھ میں ایک آئینہ ہے۔ مَیں تقریر کرتے ہوئے لوگوں سے کہتا ہوں کہ دیکھو انسان کا دل خدا تعالیٰ نے ایک آئینہ کی مانند بنایا ہے جس طرح انسان آئینہ میں اپنا حسن دیکھتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ بھی اپنا حُسن انسان کے آئینۂ قلب میں دیکھنا چاہتا ہے۔ پس اگر انسان کا دل خدا تعالیٰ کی صفات کو اعلیٰ طور پر ظاہر کرنے والا ہو تو خدا تعالیٰ بھی اُس دل کی قدر کرتا اور اُسے ایک قیمتی متاع قرار دیتا ہے لیکن اگر انسان کا دل میلا اور داغدار ہو۔ اور اُس میں سے خدا تعالیٰ کا چہرہ نظر نہ آئے یا نظر تو آتا ہو لیکن غلط طور پر آتا ہو تو خدا تعالیٰ بھی ایسے دل کو پرے پھینک دیتا ہے۔ اور جب مَیں نے یہ الفاظ کہے تو وہ آئینہ جو میرے ہاتھ میں تھا اُسے مَیں نے زور سے زمین پر دے مارا اور کہا کہ ایسے دل کو خدا تعالےٰ بھی اُٹھا کر اسی طرح دے مارتا ہے اور وہ چُور چُور ہو جاتا ہے۔

اِس رؤیا میں یہی نکتہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو خدا تعالیٰ نے اِس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا نور ظاہر کرے۔ اور اُس کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی صفات کا ظہور ہو۔ پس ضروری ہے کہ ہر انسان اپنے دائرہ میں ربّ بھی ہو رحمٰن بھی ہو رحیم بھی ہو۔ مالکِ یوم الدّین بھی ہو۔ جبّار بھی ہو۔ ستّار بھی ہو۔ غفّار بھی ہو۔ علیم بھی ہو۔ شکور بھی ہو۔ حمید بھی ہو مجید بھی ہو۔ ودود بھی ہو۔ غرض خدا تعالیٰ کی ساری صفات کو وہ ظاہر کرنے والا ہو جن کے متعلق مشہور تو یہ ہے کہ وہ ننانوے ہیں مگر ہیں وہ اِس سے بھی زیادہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ اپنے مقصدِ حیات کو پورا کر لیتا ہے اور اگر اس کے آئینۂ قلب میں خدائی صفات کا انعکاس نہیں ہوتا تو وہ ایک ٹوٹا ہوا برتن ہے جو کسی کام نہیں آتا یا ایک میلا اور داغدار شیشہ ہے جس سے خدا تعالیٰ کا چہرہ نظر نہیں آ سکتا۔ اور جس طرح کوئی انسان میلا اور داغدار شیشہ اپنے پاس نہیں رکھتا اِسی طرح خدا تعالیٰ بھی ایسا آئینہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا جس کی غرض تو یہ تھی کہ وہ خدا نمائی کا آلہ بنے مگر میلا ہونے کی وجہ سے وہ خدائی حُسن کو ظاہر نہیں کر سکتا۔

غرض اسلام صفاتِ الٰہیہ پر خصوصیت سے زور دیتا اور بنی نوعِ انسان کو اِس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ تمہارا تمام حُسن اس امر پر منحصر ہے کہ تم صفاتِ الٰہیہ کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگین کرنے کی کوشش کرو۔ اور اس امر کو اچھی طرح یاد رکھو کہ جتنا جتنا کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرتا چلا جائیگا اُتنا ہی وہ اعلیٰ اخلاق کا حامل ہوگا اور اُسی نسبت سے اُسے اللہ تعالیٰ کا قرب بھی حاصل ہوگا۔ گویا اسلام نیکی اور بدی کی تعریف ایک جدید زاویۂ نگاہ سے پیش کرتا ہے اور اعلیٰ اخلاق کی بنیاد صفاتِ الٰہیہ کے انعکاس پر رکھتا ہے۔ یہ نظریّہ جو اسلام نے پیش کیا ہے اِتنا اہم ہے کہ اگر غور سے کام لیا جائے تو اس نے مذہبی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے اور اس نے نیکی اور بدی کی تعریف ہی بدل دی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو گہرے غور و فکر کے عادی نہیں

صرف اتنا ہی دیکھا کرتے ہیں کہ چونکہ فلاں کام کرنے کو ہمارا جی چاہتا ہے اِس لئے ہم وہ کام کرینگے یا فلاں کام کرنے کو چونکہ ہمارا جی نہیں چاہتا اس لئے ہم وہ کام نہیں کرینگے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک اچھے کام کی تعریف صرف یہی ہوتی ہے کہ جس کے کرنے پر اُن کا جی چاہے اور بُرے کام کی تعریف یہ ہوتی ہے کہ جس کے کرنے کو اُن کا جی نہ چاہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تعریف بالکل غلط ہے کیونکہ ہزاروں انسان ایسے ہوتے ہیں جن کا جی کسی کام کے کرنے کو آج تو چاہتا ہے مگر کل نہیں چاہتا۔ یا آج تو ایک شخص چاہنے والی بات کو نہیں چاہتا مگر کل وہ اُسے چاہنے لگتا ہے۔ اور اگر اُس سے کوئی شخص سوال کرے کہ تمہارے اُس وقت چاہنے اور اب نہ چاہنے یا اُس وقت نہ چاہنے اور اب چاہنے کی کیا وجہ ہے تو وہ کہدیتا ہے کہ اُس وقت میرے حالات اَور تھے اور اب اَور ہیں۔ یا بسا اوقات وہ کہدیتا ہے کہ جب مَیں نہیں چاہتا تھا تو اُس وقت میں غلطی کر رہا تھا اور اب جبکہ چاہنے لگا ہوں تو درست کر رہا ہوں۔ مگر اُس کی یہ بات بھی قطعی نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ عین ممکن ہو کہ کل وہ پھر اپنی چاہی ہوئی چیز سے نفرت کرنے لگ جائے پھر اگر کسی شخص کا کسی کام کو چاہنا ہی نیکی ہو سکتی ہے تو فرض کرو زید چاہتا ہے کہ بکر کے باپ کو قتل کر دے اور وہ اُسے قتل کر دیتا ہے تو کیا بکر اس لئے خاموش ہو جائیگا کہ وہ اِس کام کو چاہتا تھا؟ یا کسی شخص کا ملازم کام میں سُستی کرتا ہے تو کیا اُس کا آقا ملازم کے یہ کہنے پر کہ اس کام کا تعلق میری مرضی کے ساتھ ہے خاموش ہو جائیگا؟ اگر کسی شخص کا کسی کام کو چاہنا ہی نیکی ہو سکتا ہے تو بکر کا اپنے باپ کے قاتل کے خلاف مقدمہ دائر کرنا بے انصافی ہوگا۔ اِسی طرح آقا کا اپنے ملازم کو اُس کی سُستی پر سزا دینا ظلم ہوگا۔ کیونکہ زید چاہتا تھا کہ بکر کے باپ کو قتل کر دے اور ملازم چاہتا تھا کہ وہ کام میں سُستی کرے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہی شخص جو خود نیکی اور بدی کے متعلق ایک فارمولا تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جس چیز کو انسان کا جی چاہے وہ نیکی ہے۔ اور جس کو نہ چاہے وہ بدی۔ اُسی شخص کے باپ کو جب کوئی شخص قتل کر دیتا ہے تو وہ سخت غصہ میں آجاتا ہے اور کہتا ہے مَیں اِس سے بدلہ لے کر رہونگا۔ حالانکہ چاہیئے تھا کہ جب اُس کے باپ کا قاتل اُسی کے مجوزہ فارمولا پر عمل کر رہا تھا تو وہ خوش ہوتا کہ اُس نے نیکی کی ہے۔ اِسی طرح ملازم کے سُستی کرنے پر اور یہ کہہ دینے پر کہ میرا جی چاہتا تھا کہ مَیں سُستی کروں وہ خاموش ہو جاتا بلکہ خوش ہوتا کہ وہ نیکی کے راستہ پر گامزن ہے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ پس نیکی اور بدی کی یہ تعریف درست نہیں۔

پھر بعض لوگوں نے اس تعریف سے ذرا اَور ترقی کی ہے اور کہا ہے کہ جس کام کو سوسائٹی چاہتی ہے وہ نیک ہے اور جس کام کو سوسائٹی نہیں چاہتی وہ بد ہے۔ مگر اِس تعریف پر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندو سوسائٹی چاہتی ہے کہ گائے نہ کھائی جائے۔ اور مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ گائے کھائی جائے۔ یا سِکھ سوسائٹی چاہتی ہے کہ جھٹکا کھایا جائے اور مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ جھٹکا نہ کھایا جائے۔ اِسی طرح یوروپین سوسائٹی چاہتی ہے کہ شراب پی جائے۔ لیکن مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ شراب نہ پی جائے۔ اب جبکہ ہندو سوسائٹی یہ چاہتی ہے کہ گائے نہ کھائی جائے کیونکہ ایسا کرنا سخت گناہ ہے اور مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ گائے کھائی جائے کیونکہ اُس کا کھانا ہمارے مذہب میں جائز ہے۔ سِکھ سوسائٹی چاہتی ہے کہ جھٹکا کھایا جائے لیکن مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ جھٹکا نہ کھایا جائے کیونکہ جھٹکا کھانا حرام ہے۔ یوروپین سوسائٹی چاہتی ہو

کہ شراب پی جائے لیکن مسلمان سوسائٹی چاہتی ہے کہ شراب بالکل نہ پی جائے کیونکہ اس کا پینا حرام ہے تو ہم کونسی سوسائٹی کی خواہش کے مطابق فیصلہ کرینگے آیا ہم مسلمان سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کرینگے یا سکھ سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کریں گے یا ہندو سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کریں گے یا یورپین سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کرینگے۔ اگر ہم ہندو سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں کہ گائے کھانا سخت جُرم ہے تو مسلمان کہیگا گائے کھانا جائز ہے۔ اگر ہم سکھ سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کریں گے کہ جھٹکا کھانا چاہیئے تو ایک مسلمان کہیگا جھٹکا کھانا حرام ہے۔ اگر ہم یورپین سوسائٹی کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کرینگے کہ شراب پینی چاہیئے تو مسلمان کہیگا شراب پینا حرام ہے۔ غرض ہمیں کوئی ایک سوسائٹی بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کے چاہنے کے مطابق فیصلہ کردیا جائے تو اس پر باقی تمام سوسائٹیاں متفق ہو جائیں۔ ہزاروں ہزار نیکی اور عیب کی باتیں ایسی ہیں جن میں لوگوں کے اندر شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک سوسائٹی ایک کام کو بہت بڑی نیکی قرار دیتی ہے تو دوسری سوسائٹی اس کو بہت بڑا جرم قرار دیتی ہے یا ایک سوسائٹی ایک کام کو سخت گناہ سمجھتی ہے تو دوسری سوسائٹی اسی کام کو عین ثواب سمجھتی ہے۔ یورپین لوگ شراب کو بہت اچھا سمجھتے ہیں لیکن مسلمان شراب پینا سخت گناہ سمجھتے ہیں۔ آیا ہم شراب پینے کو یورپ کے معیار کے مطابق نیکی قرار دیں یا اسلام کے معیار کے مطابق بدی قرار دیں۔ ایک یورپین کسی مسلمان کو شراب کا گلاس پیش کرتا ہے اور مسلمان اس کے پینے سے انکار کرتا ہے تو کیا ہم یورپ کے معیار کے مطابق مسلمان کے شراب پینے سے انکار کو بدتہذیبی قرار دینگے یا اسلام کے معیار کے مطابق نیکی قرار دینگے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم مسلمان سوسائٹی کی بات مانیں اور عیسائی سوسائٹی کی بات کو ردّ کر دیں۔ یا عیسائی سوسائٹی کی بات مانیں اور مسلمان سوسائٹی کی بات ردّ کر دیں۔

پھر بعض لوگوں نے ایک اور قدم اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں نیکی وہ ہے جسے دنیا کے اکثر لوگ اچھا کہیں اور بدی وہ ہے جسے دُنیا کے اکثر لوگ بُرا کہیں۔ مگر یہ تعریف بھی کوئی معیّن تعریف نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ دنیا کی اکثریت کو اسی صورت میں نیکی اور بدی کی شناخت کا صحیح معیار قرار دیا جا سکتا ہے جب خود اکثریت ہمیشہ ایک بات پر قائم رہے۔ لیکن ہمیں تو ہر زمانہ اور ہر ملک بلکہ قوم کی اکثریت کے خیالات ایک دوسرے سے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں دنیا کی اکثریت کو نیکی اور بدی کی شناخت کا معیار کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر اگر اس تعریف کو درست سمجھا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اگر اکثریت کہتی ہو کہ خدا کوئی نہیں تو اسوقت خدا تعالیٰ کا انکار کرنا نیکی ہوگا۔ اور اگر اکثریت کہتی ہو کہ خدا ہے تو خدا کو ماننا نیکی ہوگا۔ لیکن دوسرے وقت وہی اکثریت ہستیٔ باری تعالیٰ کی قائل ہو جائے تو پھر خدا تعالیٰ پر ایمان لانا نیکی قرار پائیگا اور اس کا انکار کرنا بدی قرار پائیگا۔ گویا اکثریت کے عقائد بدلنے کے ساتھ نیکی اور بدی کی تعیین بھی مختلف ہوتی چلی جائیگی پس نیکی اور بدی کی یہ تعریف بھی کوئی معیّن تعریف نہیں کہلا سکتی۔

پھر بعض لوگ کہتے ہیں کہ نیکی وہ عمل ہے جس سے سب سے زیادہ خوشی حاصل ہو۔ اور بدی وہ عمل ہے جو انہی حالات میں اتنی خوشی پیدا نہ کرے۔ مگر یہ تعریف بھی صحیح نہیں کیونکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر ایک شخص کو ڈاکہ مار کر سب سے زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہو۔ تو

اُس کے لئے ڈاکہ مارنا ہی سب سے بڑی نیکی ہو گا حالانکہ اِسے کوئی بھی درست تسلیم نہیں کرتا۔

پھر بعض لوگ کہتے ہیں کہ نیکی وہ ہوتی ہے جس کا دُنیا کے سب سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ لیکن اِس تعریف کو صحیح سمجھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اگر فرانس بلجیم پر حملہ کرکے اُسے لُوٹ لے تو جائز ہو گا کیونکہ فرانس کے باشندے بلجیم کے باشندوں سے بہت زیادہ ہیں۔ بیشک بلجیم کے تھوڑے سے لوگوں کو نقصان پہنچیگا لیکن چونکہ فرانس کے بہت زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اِس لئے اُن کا بلجیم پر حملہ کرکے وہاں کے مال و متاع کو لُوٹ کر لے جانا نیکی ہو گا۔ اِسی طرح جو قوم بھی اکثریت میں ہو۔ اِس تعریف کے ماتحت اُس کے لئے جائز ہو گا کہ وہ اقلیت کو لوٹ لے اور کہے کہ یہ نیکی ہے۔ اور جب کوئی سوال کرے کہ یہ نیکی کس طرح ہوئی تو وہ کہدے کہ دیکھ لو کتابوں میں اِسی طرح لکھا ہے کہ نیکی وہی ہے جس کا دُنیا کے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ اِس کے مقابلہ میں اگر اقلیت رکھنے والی قومیں اکثریت پر حملہ کریں اور اُن کے مال و اسباب لوٹنا چاہیں تو اُن کا یہ فعل بدی کہلائیگا۔ کیونکہ اِس طرح تھوڑوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور بہتوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

پھر بعضوں نے کہا ہے کہ جس چیز کا زیادہ سے زیادہ اور لمبے عرصہ تک فائدہ پہنچے وہ نیکی ہے۔ مگر اِس تعریف کے ماننے سے بھی یہ لازم آتا ہے کہ اگر کوئی قوم سو سال تک لُوٹ مار کرتی ہے تو وہ کم نیکی کرتی ہے اور اگر وہ دو سو سال تک لوٹ مار کرتی تو یہ زیادہ نیکی ہوتی۔

پھر بعض لوگ کہتے ہیں۔ نیکی وہ ہے جس سے اپنی ذات کو زیادہ نفع پہنچے اور بدی وہ ہے جس سے اپنی ذات کو نقصان پہنچے۔ مگر اِس پر بھی یہ اعتراض پڑتا ہے کہ اگر جھوٹ بولنے سے کسی کی ذات کو زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہو تو اِس تعریف کے ماتحت جھوٹ بولنا بھی اُس کے لئے نیکی ہو گا۔ حالانکہ اِسے کوئی بھی درست نہیں سمجھتا۔

پھر بعض لوگوں نے کہا ہے کہ نیکی اور بدی کی فطرت پر بنیاد رکھنی چاہیئے۔ یعنی جس چیز کو فطرت نیک کہے وہ نیکی ہے اور جس چیز کو فطرت بد کہے وہ بدی ہے۔ یہ تعریف ایک حد تک تو درست ہے۔ مگر کلّی طور پر نہیں۔ مَیں نے بارہا ایک مثال بیان کی ہے کہ حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک چور کو مَیں نے سمجھانا شروع کیا کہ چوری بہت بُرا فعل ہے تمہیں محنت کرکے حلال کی کمائی کھانی چاہیئے۔ اُس نے کہا۔ مولوی صاحب ہم چوری کے لئے بڑی محنت کرتے ہیں اور ہمیں فلاں فلاں دشواریوں اور دِقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اِس لئے یہ فعل ہمارے لئے بالکل جائز ہے۔ آخر جب چور کو کہا گیا کہ اگر تم کچھ چُرایا ہوا سونا سُنار کے پاس لے جاؤ اور اُس کے پاس رکھ کر۔ دو چار دنوں کے بعد اُس سے واپس مانگو اور وہ دینے سے انکار کردے تو پھر کیا ہو؟ اِس پر وہ چور کہنے لگا کہ کیا ایسا بھی کوئی خبیث ہو سکتا ہے جو دوسرے کا مال کھا جائے۔ پس بے شک انسانی فطرت بعض باتوں کے متعلق بولتی تو ہے مگر محدود حد تک۔ کیونکہ انسانی فطرت بسا اوقات بُرے ماحول کے نتیجے میں مسخ بھی ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ پھر نیکی کس چیز کا نام ہے اور بدی کس چیز کا نام ہے۔ کیا نیکی وہ ہوگی جس کو مذہب نیکی قرار دیتا ہے اور بدی وہ ہوگی جس کو مذہب بدی قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر یہ درست ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسے مذہب کی نیکی

نیکی کہلائیگی اور کونسے مذہب کی بدی بدی کہلائیگی۔ اور یہ سوال ایسا ہے کہ اِس کا حل کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ دنیا میں کئی مذاہب پائے جاتے ہیں۔ اور اُن کی تجویز کردہ نیکیوں اور بدیوں میں آپس میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک مذہب ایک کام کو نیکی قرار دیتا ہے تو دوسرا مذہب اُسی کام کو بدی قرار دیتا ہے۔ اِس لئے اس تعریف سے بھی ہمیں نیکی اور بدی کا حقیقی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر کوئی چیز بغیر کسی حکمت کے صرف شریعت کے روکنے کی وجہ سے گناہ ہوتی ہے تو شریعت کا یہ فعل لغو قرار پاتا ہے۔ اور اگر بُرائی کی وجہ سے بُری ہوتی ہے تو پھر یہ دلیل نہ ہوئی کہ جس سے شریعت روکے وہ بُری ہو بلکہ یہ ہوئی کہ جو بُری شے ہو اُس سے شریعت روکتی ہے اور پھر اس حکم یا نہی کو اُس حکمت کی طرف منسوب کرنا پڑے گا۔ صرف یہ کہدینا کافی نہیں ہوگا کہ جس سے شریعت روکے وہ بُرائی ہے۔ اور جس کا حکم دے وہ نیکی ہے۔

اسلام اِن تمام نظریات کے خلاف دُنیا کو یہ بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات کی موافقت اختیار کرنا نیکی ہے اور اُس کی صفات کے خلاف کام کرنا بُرائی ہے۔ چنانچہ وہ اِس بارہ میں مومنوں کو ہدایت دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (بقرہ ع ۱۶) یعنی اے مومنو! تم اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے بہتر اور کون ہے جس کا رنگ اختیار کیا جاسکے یعنی جس طرح خدا رَبُّ الْعَالَمِیْن ہے۔ وہ الرَّحْمٰن اور الرَّحِیْم ہے۔ وہ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ہے اسی طرح تم بھی کو کوشش کرو کہ تم اُس کی ربوبیتِ عالمین کے مظہر بن جاؤ۔ تم اُس کی رحمانیت کے مظہر بن جاؤ اُس کی رحیمیت کے مظہر بن جاؤ۔ اُس کی مَالِکِیَّتِ یَوْمِ الدِّیْن کے مظہر بن جاؤ۔ اِسی طرح کوشش کرو کہ تم بھی ایک قسم کے سَتَّار بن جاؤ۔ ایک قسم کے غَفَّار بن جاؤ۔ ایک قسم کے قَہَّار بن جاؤ۔ ایک قسم کے حَمِیْد بن جاؤ۔ ایک قسم کے مَجِیْد بن جاؤ۔ ایک قسم کے شَکُوْر بن جاؤ۔ ایک قسم کے وَدُوْد بن جاؤ تاکہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے ایک رنگ کی مشارکت حاصل ہو جائے اور تم صفاتِ الٰہیہ کے مظہر بن کر اخلاق کا اعلیٰ مقام حاصل کرلو۔

پس اسلام کے نزدیک حقیقی خوبی وہ ہے جو حسنِ ازلی کے نقشہ میں ہو اور گناہ یا عیب ہر اُس فعل کا نام ہے جو صفاتِ الٰہیہ کے منافی ہو۔ اور چونکہ انسان کو خدا تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننے کی طاقت دی گئی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو۔ کہ خدا تعالیٰ اصل ہے اور انسان اُس کی تصویر ہے۔ اِس لئے تصویر کا حُسن اِسی میں ہے کہ وہ اصل کے مطابق ہو۔ اور اُس کا عیب یہ ہے کہ وہ اصل کے خلاف ہو۔ پس انسان جو عمل بھی ایسا کرتا ہے جو اُسے خدا تعالیٰ کی صفات کے موافق بناتا ہے وہ نیکی ہے اور جو عمل اُسے خدا تعالیٰ کی صفات سے دُور لے جاتا ہے وہ بدی ہے۔ گویا نیکی کی حقیقی تعریف اسلام نے یہ پیش کی ہے کہ نیکی اُس عمل یا خیال کا نام ہے۔ جو خدا تعالیٰ سے جو ایک کامل اور بے عیب ذات ہے مشابہت پیدا کرتا ہو۔ اور بدی اُس فعل یا خیال کا نام ہے جو اُس کامل اور بے عیب ذات کی پسندیدگی یا فعل کے خلاف ہو۔

بیشک ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ میں خدا تعالیٰ کو ہی نہیں مانتا۔ اُس صورت میں ہمارا فرض ہوگا کہ ہم اُس کو خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق دلائل دیں۔

لیکن خدا تعالیٰ کی ہستی ثابت کر دینے کے بعد اخلاقِ صحیحہ کی پہچان کا صحیح معیار یہی ہوگا۔ کہ جو کام الٰہی صفات کے مطابق ہو وہ اچھا ہے اور جو کام الٰہی صفات کے خلاف ہو وہ بُرا ہے۔ کیونکہ وہی ایک ایسی ہستی ہے جو ہر عیب سے پاک ہے اور ہر قسم کی اعلیٰ صفات رکھنے والی ہے۔ اِس تعریف کی تعیین کے بعد ہمارے لئے اخلاقِ فاضلہ اور اخلاقِ سیّئہ کی شناخت کچھ بھی مشکل نہیں رہتی کیونکہ جب ایک ماڈل مِل جائے تو خیالی تصویر کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہم اِس بات کو روزِ روشن کی طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ اپنے اندر ہر قسم کی اعلیٰ صفات رکھنے والی ایک ایسی ہستی موجود ہے جس کے نمونہ پر چل کر انسانی افعال درست ہو سکتے ہیں اور وہ ہستی اتنی حسین ہے کہ اُس کی نقل کرکے انسانی افعال بھی حسین ہو سکتے ہیں۔ پس اگر خدا تعالیٰ کی کوئی ہستی ہے اور ضرور ہے اور وہ اپنے اندر تمام قسم کی صفاتِ حسنہ رکھتی ہے۔ تو جو بھی اس ہستی کے افعال کی نقل کرے گا اپنے اندر اخلاقِ فاضلہ پیدا کرنے کے قابل ہو جائیگا۔

پس اخلاقِ فاضلہ وہ ہیں جو خدا تعالیٰ کی صفات اور اُس کے افعال کی نقل کرکے حاصل کئے جائیں اور اخلاقِ سیّئہ وہ ہیں جو اُسے خدا تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننے سے دُور لے جائیں۔ کیونکہ اصل منبع اور مبدء خدا ہے اور انسان درحقیقت اُس کی ایک تصویر ہے۔ پس جتنا زیادہ کوئی شخص خدا تعالیٰ کی صفات کی نقل کرے گا اُتنا ہی زیادہ اُس کے اندر اخلاقِ فاضلہ آتے چلے جائیں گے اور جتنا زیادہ کوئی شخص خدا تعالیٰ کی صفات سے دُور رہے گا اُتنا ہی زیادہ وہ اخلاقِ فاضلہ سے بھی دُور ہوتا چلا جائے گا یہی حکمت ہے جس کی بنا پر اسلام نے صفاتِ الٰہیہ پر خاص طور پر زور دیا ہے اور بار بار اُن کا ذکر فرمایا ہے تاکہ اگر ایک طرف یہ صفات اُس کے وجود کا ثبوت ہوں تو دوسری طرف انسان اُن کا مظہر بن کر ایک خدا نما وجود بن جائے۔ جس کے اندر حُسن ہی حُسن ہو اور کوئی عیب اور نقص اُس میں دکھائی نہ دے۔

سورۃ الشعراء کی ابتداء بھی اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ذکر سے کی گئی ہے جن میں سے پہلی صفت جس کی طرف اِس سورۃ میں توجہ دلائی گئی ہے صفتِ لطیف ہے۔

لطیف کے معنوں پر بحث کرتے ہوئے لُغت میں لکھا ہے کہ اِس کے معنے ہیں اَلْبَرُّ بِعِبَادِہٖ وَالْمُحْسِنُ اِلٰی خَلْقِہٖ بِاِیْصَالِ الْمَنَافِعِ اِلَیْھِمْ بِرِفْقٍ وَّ لُطْفٍ اَوِالْعَالِمُ بِخَفَایَا الْاُمُوْرِ وَ دَقَائِقِھَا (اقرب الموارد) یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے جب لطیف کا لفظ استعمال ہو تو اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ لوگوں کی خبر گیری کرنے والا اور محبّت اور احسان کے ساتھ اُن کو نفع پہنچانے والا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی مخلوق کی مخفی سے مخفی باتوں کو جاننے والا اور اُن کی تمام حاجات اور ضروریات کا علم رکھنے والا ہے۔ اِن معنوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اگر نظامِ عالم پر نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں یہ دونوں باتیں اپنے پورے کمال کے ساتھ دنیا میں دکھائی دیتی ہیں۔ اور اِس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ واقعہ میں ایک لطیف ہستی ہے جس نے اپنی مخلوق کو فائدہ پہنچانے اور اُس کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے اِس قسم کی نعمتوں سے اُسے نوازا ہے۔ اور اُس کی بقاء کے لئے اتنے بڑے سامان پیدا کئے ہیں کہ کوئی شخص اگر ساری عمر بھی اِن نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہے تب بھی وہ پوری طرح شکر ادا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ دیکھ لو۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ آسمان پر لاکھوں میل دُور سورج اور چاند اور ستارے اُس کے بندوں کے لئے

رات دن اپنے کام میں مشغول ہیں - اور زمین الگ اپنے کام میں معروف ہے - انسان تھوڑا سا بیج ڈال کر اپنے گھر چلا آتا ہے مگر تھوڑے ہی عرصہ میں اس چند سیر بیج کے بدلے ہزاروں من غلہ وہ اپنے گھر لے جاتا ہے - وہ اپنے گھر میں آرام سے سو رہا ہوتا ہے اور زمین اُس کے کام میں مصروف ہوتی ہے اور اُس کے لئے غلّہ اُگا رہی ہوتی ہے - سبزی اُگا رہی ہوتی ہے اور انواع و اقسام کے پھل اور پھول پیدا کر رہی ہوتی ہے - یہ سویا ہُوا اُٹھ کر آتا ہے اور اپنی ضرورت کے مطابق اُگا اُگایا اور پکا پکایا پھل لے کر چلا جاتا ہے - اسی طرح انسانی جسم پر نگاہ ڈالو - کان ایک چھوٹی سی چیز ہے مگر یہ بھی خدا کی عطا ہے - ہوا کی لہریں جن کے ذریعہ سے اُن میں آواز پہنچتی ہے وہ بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں گلے کے پردے جن سے آواز نکلتی ہے وہ بھی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں - ایک اچھا گویا انہی پردوں کے ذریعہ سے گاتا ہے جو خدا نے دیئے ہیں مگر لوگ کہتے ہیں فلاں گویا کتنا اچھا ہے - یا لوگ کہتے ہیں فلاں شخص کا حافظہ کتنا تیز ہے - مگر اُس کے حافظہ والی جگہ یعنی دماغ بھی خدا نے بنایا ہے - دماغ کے اندر جو سیلز ہوتے ہیں وہ بھی خدا نے بنائے ہیں - اسی طرح انسان نماز پڑھتا ہے تو زبان جس سے وہ الفاظ ادا کرتا ہے خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہوتی ہے جس مقام پر وہ ان الفاظ کو محفوظ رکھتا ہے یعنی دماغ وہ بھی خدا نے بنایا ہے - وہ رکوع کرتا ہے یا سجدہ کرتا ہے یا قیام کرتا ہے تو اُس کے لئے وہ جتنی قوتوں سے کام لیتا ہے وہ سب کی سب خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہوتی ہیں - انسان کا اُن کی پیدائش میں کوئی ہاتھ نہیں ہوتا - اسی طرح اگر وہ زکوٰۃ دیتا ہے تو زکوٰۃ کا روپیہ خدا تعالیٰ کا دیا ہُوا ہوتا ہے - جن طاقتوں سے اُس نے روپیہ کمایا تھا وہ بھی خدا تعالیٰ کی دی ہوئی تھیں جس ہاتھ سے اُس نے زکوٰۃ دی وہ بھی خدا کا دیا ہُوا تھا - پھر انسان روزہ رکھتا ہے تو اُس میں بھی اُس کا کیا ہے اگر خدا نے اُس کے اندر اتنی طاقت نہ رکھی ہوتی کہ وہ دس بارہ یا پندرہ گھنٹے بھوکا رہ سکے تو وہ کس طرح روزہ رکھ سکتا تھا - پس اگر وہ روزہ رکھتا ہے تو وہ بھی خدا تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کے نتیجہ میں ہی رکھتا ہے - اپنے زور اور بل پر نہیں رکھتا - یا مثلاً ایک لوہار اپنے پیشہ سے شہرت حاصل کرتا ہے تو وہ اپنے پیشہ میں جسقدر چیزیں استعمال کرتا ہے سب خدا تعالیٰ ہی کی عطا ہوتی ہیں - لوہے کو خدا نے پہلے پیدا کیا ہُوا ہے - کوئلہ اُس نے پہلے سے پیدا کر رکھا ہے - آگ جس پر وہ لوہے کو گرم کرتا ہے خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے - اعصاب جن سے وہ کام لیتا ہے خدا تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں غرض جتنی چیزوں سے وہ کام لیتا ہے سب خدا کی پیدا کی ہوئی ہوتی ہیں - اُس کا اپنا صرف ارادہ ہی ہوتا ہے اور کچھ نہیں ہوتا - لیکن اتنے بڑے انعامات کے باوجود کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے - اور اُس وقت وہ ایسا ناشکرا بن جاتا ہے کہ اُسے کوئی بھی نعمت دکھائی نہیں دیتی - کوئی بھی فضل نظر نہیں آتا - کسی رحمت سے بھی اُس کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا -

ہم نے بڑے بڑے مالداروں کو دیکھا ہے - وہ موٹروں میں پھرتے ہیں - دس دس کھانے اُنکے دسترخوانوں پر موجود ہوتے ہیں - مگر جب کھانے کے لئے بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں - یہ بھی خراب ہے وہ بھی خراب ہے کھانے کا کوئی مزہ ہی نہیں آتا - اس کے مقابلہ میں غریب آدمی کو دیکھو کہ وہ روٹی کا سوکھا ٹکڑا کس مزے سے کھاتا ہے

اور کس طرح وہی سوکھا ٹکڑا اُسے دُنیا کی تمام نعمتوں سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتا ہے ۔ مجھے یاد ہے ۔میری دو تین سال کی عمر تھی کہ میری آنکھیں دُکھنے آ گئیں ۔ ڈاکٹروں نے ایسی حالت میں مجھے روٹی کھلانی منع کر دی ۔ ایک دن صبح کے وقت مجھے آنکھوں میں سخت تکلیف محسوس ہوئی کیونکہ صبح کے وقت رات بھر آنکھ بند رہنے کی وجہ سے اندر پانی بھر جاتا ہے اور آنکھوں میں درد ہوتا ہے ۔اور اِس کی وجہ سے لازمی طور پر بچہ رونے لگ جاتا ہے ۔ بہرحال آنکھیں دُکھنے کی وجہ سے مجھے تکلیف ہوئی اور مَیں نے رونا شروع کر دیا ۔ ہمارے گھر کی ایک خادمہ نے یہ دیکھ کر مجھے اُٹھا لیا اور پچکارنا شروع کر دیا ۔اُسوقت وہ روٹی کا ایک باسی ٹکڑا ہاتھ میں پکڑے ہوئے بڑے مزے سے کھاتی جاتی تھی ۔ اور ساتھ ساتھ مجھے پچکارتی جاتی تھی ۔ مجھے ساری عمر میں کبھی کسی کھانے کا اتنا مزہ نہیں آیا جتنا مجھے اُس باسی ٹکڑہ کی خوشبو کا محسوس ہُوا ۔کیونکہ وہ اپنے دل کے اطمینان کی وجہ سے اُس باسی ٹکڑہ میں بھی اتنا لطف محسوس کر رہی تھی کہ اُس نے وہ لطف اور وہ لذّت کا احساس میرے اندر بھی پیدا کر دیا ۔ حالانکہ وہ بغیر کسی سالن کے اور بغیر کسی ایسی چیز کے کھا رہی تھی جو اس ٹکڑے کو نرم کر دے ۔ مگر جس مزے سے وہ کھا رہی تھی اور جس طرح وہ مچاکے مار رہی تھی ۔ وہ مچاکے محسوس کراتے تھے کہ اُسکے نزدیک دُنیا کا سب سے بڑا کھانا وہی ہے ۔ لطیفہ یہ ہے کہ تین چار سال کے بعد ایک دفعہ اماں جان رضؓ نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا کس چیز کو دل چاہتا ہے تو میری طبیعت پر اس کا اتنا اثر تھا کہ مَیں نے کہا ۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مَیں باسی روٹی کھاؤں ۔ تو جب انسان قناعت سے کام لے اور شکر گذاری کے جذبات کے ساتھ ہر چیز کو دیکھے تو اُسے معمولی سے معمولی چیز بھی دُنیا کی اعلیٰ ترین نعمت دکھائی دینے لگتی ہے ۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سُنایا کرتے تھے کہ ایک بڑھیا تھی جو بڑی نیک اور عبادت گذار تھی ۔ مَیں نے ایک دفعہ اس سے کہا کہ مائی مجھے کوئی خدمت بتاؤ ۔میں چاہتا ہوں کہ اگر تمہاری کوئی خواہش ہو تو اُس کو پورا کر کے ثواب حاصل کروں ۔ وہ کہنے لگی ۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ۔مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ۔ مَیں نے پھر اصرار کیا اور کہا کہ کچھ تو بتاؤ ۔ میری بڑی خواہش ہے کہ مَیں تمہاری خدمت کروں ۔ وہ کہنے لگی ۔ نورالدینؓ ! مجھے اور کیا چاہیئے ۔ کھانے کیلئے روٹی اور اوڑھنے کے لئے لحاف کی ضرورت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ مجھے دو روٹیاں بھجوا دیتا ہے ۔ ایک مَیں کھا لیتی ہوں اور ایک میرا بیٹا کھا لیتا ہے ۔ اور ایک لحاف ہمارے پاس موجود ہے جس میں ہم دونوں ماں بیٹا سو رہتے ہیں ۔ مَیں ایک پہلو پر سوئے ہوئے تھک جاتی ہوں تو کہتی ہوں ۔بیٹا ! اپنا پہلو بدل لے اور مَیں دوسرے پہلو پر لیٹ جاتی ہوں ۔ اُسکا ایک پہلو تھک جاتا ہے تو وہ مجھے کہتا ہے اور مَیں اپنا پہلو بدل لیتی ہوں ۔ بس بڑے مزے سے عمر گذر رہی ہے ۔ اور کسی چیز کی کیا ضرورت ہے ۔ مَیں نے پھر اصرار کیا ۔ تو کہنے لگی اچھا ۔ اگر تم بہت ہی اصرار کرتے ہو تو پھر مجھے ایک موٹے حرفوں والا قرآن لا دو ۔ میری نظر اب کمزور ہو گئی ہے اور باریک حروف نظر نہیں آتے ۔ موٹے حرفوں والا قرآن مل جائے تو مَیں آسانی سے قرآن پڑھ سکوں گی ۔ اب ایک طرف اس بڑھیا کی حالت کو دیکھو اور دوسری طرف اس امر کو سوچو ۔ کہ اب اگر کوئی چار سو روپیہ ماہوار کماتا ہے تو وہ بھی بےچین ہے ۔ پانچسو روپیہ ماہوار کماتا ہے تو

وہ بھی بے چین ہے۔ دو ہزار روپیہ ماہوار کماتا ہے تو وہ بھی بے چین ہے۔ حالانکہ مال حاصل کرنا اصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود راحت اور چین ہوتا ہے۔ اور اگر یہی حاصل نہ ہو تو روپیہ لے کر کسی نے کیا کرنا ہے لیکن اگر انسان اپنے دل میں شکر گذاری کا جذبہ پیدا کرے تو اُسے عالم کا ذرّہ ذرّہ اپنا محسن دکھائی دیتا ہے۔ اور چونکہ عالم کا ہر ذرّہ خدا تعالیٰ کے احسان کے نیچے ہے اس لئے اُسے خدا ہی اپنا محسنِ حقیقی نظر آتا ہے۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ دلّی کے ایک بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں۔ اُن کے متعلق لکھا ہے کہ انہیں لڈّو بہت پسند تھے۔ دلّی میں بالائی کے لڈّو بنتے ہیں جو بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ وہ اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کوئی شخص بالائی کے دو لڈّو اُن کے پاس ہدیۃً لایا۔ اُن کے ایک شاگرد غلام علی شاہ بھی اُس وقت پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے وہ دونوں لڈّو اُن کو دے دیئے۔ بالائی کے لڈّو بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اخروٹ کے برابر بلکہ اس سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایک دفعہ ہی وہ دونوں لڈّو اُٹھائے اور مونہہ میں ڈال لئے۔ جب وہ کھا چکے تو حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے اُن کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ میاں غلام علی! معلوم ہوتا ہے تم کو لڈّو کھانے نہیں آتے۔ وہ اُسوقت تو خاموش ہو گئے مگر کچھ دنوں کے بعد اُن سے کہنے لگے۔ حضور مجھے لڈّو کھانے سکھا دیجئے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے کہا کہ اگر اب کسی دن لڈّو آئیں تو مجھے بتانا۔ میں تمہیں لڈّو کھانا سکھا دونگا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر کوئی شخص اُن کے لئے بالائی کے لڈّو لایا۔ میاں غلام علی صاحب کہنے لگے۔ حضور! آپ نے میرے ساتھ وعدہ فرمایا ہوا ہے کہ مَیں تمہیں لڈّو کھانا سکھا دونگا۔ آج اتفاقاً پھر لڈّو آگئے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ لڈّو کس طرح کھائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنا رومال نکالا۔ اور اُس پر وہ لڈّو رکھ کر ایک لڈّو سے ذرہ سا ٹکڑہ توڑ کر اپنے مُنہ میں ڈالا اور سبحان اللہ! سبحان اللہ کہنے لگ گئے۔ پھر فرمانے لگے۔ واہ مظہر جان جاناںؒ تجھ پر تیرے ربّ کا کتنا بڑا فضل ہے۔ یہ کہکر پھر سبحان اللہ! سبحان اللہ کہنے لگ گئے اور اپنے شاگرد کو مخاطب کرکے فرمایا۔ میاں غلام علی! یہ لڈّو کن کن چیزوں سے بنتا ہے؟ انہوں نے چیزوں کے نام گنانے شروع کر دیئے کہ اس میں کچھ بالائی ہے۔ کچھ میٹھا ہے۔ کچھ میدہ ہے۔ یہ سُنکر انہوں نے پھر سبحان اللہ! سبحان اللہ کہنا شروع کر دیا اور فرمایا۔ میاں غلام علی! تمہیں پتہ ہے یہ میٹھا جو اس لڈّو میں پڑا ہے کس طرح بنا۔ انہوں نے بتایا کہ زمیندار نے پہلے گنّا بویا۔ پھر بیلنے میں اس کو بیلا۔ پھر رس تیار ہوئی اور اُس سے شکر بنائی گئی۔ حضرت مظہر جان جاناںؒ فرمانے لگے۔ دیکھو وہ زمیندار جس نے نیشکر کو بویا تھا وہ کس طرح اپنے بیوی بچّوں کو چھوڑ کر راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنے کھیتوں میں گیا اُس نے ہل چلایا کھیتوں کو پانی دیا اور ایک لمبے عرصہ تک محنت و مشقت برداشت کرتا رہا۔ صرف اس لئے کہ مظہر جان جاناںؒ ایک لڈّو کھالے۔ یہ کہہ کر وہ پھر اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں مشغول ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد فرمانے لگے۔ چھ ماہ زمیندار اپنے کھیت کو پانی دیتا رہا۔ پھر کس محنت سے اُس نے نیشکر کو بیلا۔ اُس سے رس نکالی اور پھر آگ جلا کر کتنی دفعہ وہ اس دنیا کے دوزخ میں گیا۔ محض اس لئے کہ مظہر جان جاناںؒ ایک لڈّو کھائے۔ اس کے بعد انہوں نے اسی طرح میدہ اور بالائی کے متعلق تفاصیل بیان کرنی شروع کر دیں۔ کہ کس طرح ہزاروں آدمی دن رات اِن کاموں میں مشغول رہے۔ انہوں نے

اپنی صحت کی پرواہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے آرام کو نہ دیکھا انہوں نے اپنی آسائش کو نظر انداز کر دیا۔ اور یہ سارے کام خدا تعالیٰ نے اُن سے محض اس لئے کرائے کہ مظہر جان جاناں ایک لڈو کھالے۔ یہ کہہ کر اُن پر پھر ربودگی کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ سبحان اللہ، سبحان اللہ کہنے لگ گئے۔ اتنے میں عصر کا وقت آگیا اور وہ اُٹھ کر نماز کے لئے چلے گئے۔ اور لڈو اُسی طرح پڑا رہا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی ہم نے دیکھا ہے۔ آپ کا یہ طریق تھا کہ جب آپ روٹی کھاتے تو روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر اپنے منہ میں ڈال لیتے اور اُس وقت تک کہ دانت اُس کو چبا سکیں اچھی طرح چباتے رہتے۔ آپ کی عادت بڑا لقمہ لینے کی نہیں تھی بلکہ آپ ہمیشہ چھوٹا لقمہ لیتے اور جہاں اُس پہلے لقمہ کو دیر تک چباتے رہتے وہاں روٹی کا ایک اور ٹکڑا لے کر اپنے ہاتھ میں ملتے چلے جاتے اور ساتھ ہی سُبحان اللہ سبحان اللہ کہتے جاتے۔ کچھ دیر کے بعد اُس میں سے کوئی ٹکڑا سالن لگا کر مُنہ میں ڈال لیتے اور روٹی کے باقی ٹکڑے دستر خوان پر پڑے رہتے دیکھنے والے بعض دفعہ کہا کرتے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام روٹی کے ٹکڑوں میں سے حلال اور حرام ذرّے الگ الگ کرتے ہیں اور چونکہ روٹی کے بہت سے ٹکڑے آپ کے دستر خوان پر جمع ہو جاتے تھے اسلئے جب آپ کھانے سے فارغ ہو جاتے تو لوگ تبرک کے طور پر اُن ٹکڑوں کو آپس میں تقسیم کر لیا کرتے تھے۔

تو اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں اتنی وسیع ہیں کہ اگر انسان غور کرے اور سوچے تو اُسے معلوم ہو کہ ہر قدم جو انسان اُٹھاتا ہے۔ ہر لمحہ جو انسانی زندگی پر گذرتا ہے۔ ہر ساعت جو اُس پر آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے بے انتہا فضلوں اور اُس کی بے انتہا برکات کو اپنے ساتھ لے کر آتی ہے اور پھر اگر انسان اور زیادہ غور کرے تو اُسے معلوم ہو کہ سارا جہان اُس کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ اور دن رات اللہ تعالیٰ کے فضلوں سے وہ حصّہ پا رہا ہے۔ ہر ہاتھ جو وہ لمبا کرتا ہے۔ ہر آنکھ جو وہ جھپکتا ہے۔ ہر آواز جو وہ سُنتا ہے۔ ہر تھوک جو وہ نگلتا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل اور اُس کے احسان کا ہی نتیجہ ہے۔ ورنہ خود انسان میں یہ کہاں طاقت تھی کہ وہ ایسا کر سکتا۔ اگر ڈاکٹر ہائیڈرو کلورک ایسڈ پلا پلا کر انسان کی قوتِ ہضم کو درست کرتے تو وہ چند دنوں کے اندر اندر مر جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک ایسی مشین لگا دی ہے کہ جونہی کوئی غذا استعمال میں آتی ہے وہ مختلف قسم کی تبدیلیوں کے بعد اُسے انسانی خون میں شامل کر دیتی ہے۔ اور پھر خون اُس غذا کو لے کر فوراً دل میں پہنچتا ہے جہاں اُس کی صفائی کے لئے اُسے پھیپھڑوں میں سے گذارا جاتا ہے۔ پھر صاف شدہ خون دل کے بائیں حصّہ میں آنے کے بعد ایک بڑی رگ کے ذریعہ دل سے باہر نکلتا ہے جو آگے چل کر دو حصّوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ ایک حصّہ سر کی طرف خون لے جاتا ہے اور دوسرا حصّہ دل کے مقام سے نچلے حصّہ کی طرف خون لے جاتا ہے۔ اور اِس طرح ہر عضو اپنی اپنی ضرورت کے مطابق غذا حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً دماغ کے وہ اعلیٰ حصّے جو عقل اور شعور کے مرکز ہیں وہ اُس سے اپنی غذا لے لیتے ہیں اور جسم کے مختلف اعضاء کو حرکت میں لانے والے مراکز اپنی غذا لے لیتے ہیں۔ اسی طرح آنکھ۔ کان۔ ناک۔ زبان اور دوسرے اعضاء اپنی غذا لے لیتے ہیں۔ غرض ایک عظیم الشان نظام ہے جو زندگی کو برقرار رکھنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جاری کیا ہوا ہے۔

لوگ کارخانے دیکھتے ہیں تو تعجب کرتے ہیں چکّیوں کو دیکھتے ہیں تو حیران ہو جاتے ہیں کہ یہ کس طرح آٹا پیس رہی ہیں۔ مگر انہیں کبھی احساس نہیں ہوتا کہ ان تمام مشینوں سے ایک بڑی مشین اللہ تعالیٰ نے خود انسانی جسم کے اندر پیدا کر رکھی ہے۔ جو پیس بھی رہی ہے۔ جو صاف بھی کر رہی ہے۔ جو طاقت بھی پہنچا رہی ہے۔ جس طرح بعض مشینیں ایسی ہوتی ہیں جو میدہ الگ نکالتی جاتی ہیں اور سبوس الگ نکالتی جاتی ہیں اِسی طرح انسانی جسم میں اللہ تعالیٰ نے جو مشین بنا رکھی ہے اُن میں سے کوئی خون صالح پیدا کرتی ہے۔ کوئی عقل کو طاقت دیتی ہے۔ کوئی سمع کو طاقت دیتی ہے۔ کوئی بصر کو طاقت دیتی ہے۔ کوئی قوتِ گویائی کو طاقت دیتی ہے۔ غرض ایک نظام ہے جو انسان کے اندر دن رات کام کر رہا ہے۔ اور بیسیوں چیزیں ہیں جو اُس سے پیدا ہوتی ہیں۔ اُن میں سے کوئی انسانی حِس کو طاقت دیتی ہے۔ کوئی قوتِ شامہ کو طاقت دیتی ہے۔ کوئی اعصاب کو طاقت دیتی ہے۔ اِسی طرح انسانی دماغ میں مختلف قسم کے ڈیپارٹمنٹ بنے ہوئے ہیں۔ اتنے بڑے ڈیپارٹمنٹ دنیوی گورنمنٹوں میں بھی نہیں ہوتے جتنے انسانی دماغ میں اللہ تعالیٰ نے بنائے ہوئے ہیں۔ مگر انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کے کیا کیا احسانات ہو رہے ہیں۔ وہ اندھے کی طرح گذر جاتا ہے اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے ہمیشہ خالی رہتا ہے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ آپ کھانا کھاتے تو بسم اللہ پڑھتے۔ کھانا کھا چکتے تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے۔ اِسی طرح کپڑے پہنتے تو خدا تعالیٰ کی حمد کرتے حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے ہی کیا تھے۔ بہت معمولی اور سادہ کپڑے ہوا کرتے تھے۔ آجکل ململیں اور لٹھے اور کئی قسم کے آرام دہ کپڑے لوگ پہنتے ہیں۔ اور اُن کے دلوں میں خدا تعالیٰ کے شکر کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ مومن کہلاتے ہیں وہ خدا اور اُس کے رسولؐ کو ماننے والے کہلاتے ہیں مگر انہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ خدا کا وہ رسول جس کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ لَوْ لَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ[1] اُسے اپنے پہننے کے لئے جو کپڑے نصیب ہوئے اُن سے ہزاروں گُنا زیادہ اعلیٰ اور زیادہ آرام دہ کپڑے آج ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کو نصیب ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کے شکر کے جو اعلیٰ ترین جذبات معمولی کپڑے پہن کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں پیدا ہوتے تھے وہ آج ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوتے۔ یہ تمنا اور خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ کاش یہ نعمتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتیں کیونکہ اِن نعمتوں کے اصل مستحق آپؐ ہی تھے۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دفعہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا۔ مَیں سیّد ہوں۔ میری بیٹی کی شادی ہے۔ آپ اس موقعہ پر میری کچھ مدد کریں۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ یُوں تو بڑے مخیّر تھے مگر طبیعت کا رجحان ہے جو بعض دفعہ کسی خاص پہلو کی طرف ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ مَیں تمہاری بیٹی کی شادی کے لئے وہ سارا سامان جہیز دینے کیلئے تیار ہوں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی فاطمہؓ کو دیا تھا۔ وہ یہ سُنتے ہی بے اختیار کہنے لگا۔ آپ میری ناک کاٹنا چاہتے ہیں۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تمہاری ناک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناک سے بھی بڑی ہے۔ تمہاری عزت تو سیّد ہونے میں ہے۔ پھر اگر اس قدر جہیز دینے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک نہیں ہوئی تو تمہاری کس طرح ہو سکتی ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آج ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان

---

[1] فوائد المجموعہ مصنفہ علامہ شوکانی ص۱۱۶ و موضوعات کبیر ص۵۹۔

بھی دنیوی نعمتوں کے لحاظ سے اس سے زیادہ نعمتیں رکھتا ہے جتنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پائیں مگر اُسکا دل محبت کے جذبات سے خالی ہوتا ہے۔ وہ ہزاروں گُنا زیادہ نعمتیں دیکھ کر بھی اپنے رب کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں خدا تعالیٰ کے شُکر کے جذبات اس قسم کے پائے جاتے تھے کہ آسمان سے جب بارش برستی تو وہ زمیندار جس کی کھیتیاں اُس بارش سے تیار ہوتیں خاموشی کے ساتھ گذر جاتا۔ اُسے پانی جمع کرتے ہوئے کبھی خیال بھی نہ آتا کہ یہ کہاں سے آگیا ہے۔ وہ شہر جن میں کنوئیں نہیں ہوتے اور جہاں کے رہنے والے بارش پر تالابوں میں پانی جمع کر لیتے ہیں تاکہ سال بھر اُن کی ضروریات پوری ہوتی رہیں وہ بھی اپنے لئے اور اپنے جانوروں کے لئے پانی جمع کرتے مگر اُن کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا نہ ہوتا کہ اُن کے رب نے اُن پر یہ کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ وہ سورج کی شعاعوں کے ذریعے سمندروں کا پانی بخارات کی صورت میں تبدیل کرتا اور پھر ہواؤں کے ذریعے اُن کے ملک میں لاکر برسا دیتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کے نہ تالاب تھے نہ کھیتیاں تھیں نہ جانور تھے بارش آتی تو آپؐ کمرہ سے نکل کر باہر صحن میں آجاتے۔ اپنی زبان باہر نکال لیتے اور جب اُس پر پانی کا قطرہ گرتا تو آپؐ فرماتے۔ یہ میرے رب کا تازہ احسان ہے۔ یہ محبت اور پیار کا کیسا دلفریب رنگ ہے۔ لوگ پلاؤ اور زردہ کھا کر بھی خدا تعالیٰ کی محبت کا جوش اپنے دلوں میں نہیں پاتے اور اُس کے فضلوں کے شکر گذار نہیں ہوتے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ سے محبت اس پایہ کی تھی کہ آپؐ اپنی زبان باہر نکال کر اُس پر بارش کا قطرہ لیتے اور خدا تعالیٰ کی اس تازہ نعمت کا شکر ادا کرتے۔ یہی وجہ ہے قرآن کریم میں بار بار اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ اور اُس کے احسانات کو ہمیشہ یاد رکھو۔ جب انسان ہر چیز کو خدا تعالیٰ کا انعام سمجھتا اور اُس کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے تو اُسے ایک ایسی سیڑھی مل جاتی ہے جو اُسے خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتی ہے۔ نہ شیطان اُس کی راہ میں روک بنتا ہے اور نہ اس کا نفس اُسے نیچے گرا سکتا ہے۔ وہ اُس سیڑھی پر چڑھتے ہوئے سیدھا خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ اُس کے دل میں خدا تعالےٰ کے احسانات کو دیکھ دیکھ کر شکر کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو اُسے اوپر ہی اوپر لے جاتا ہے نیچے گرنے سے اُسے کلّی طور پر محفوظ کر دیتا ہے۔

لطیف کے دوسرے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اَلْعَالِمُ بِخَفَایَا الْاُمُوْرِ وَدَقَائِقِھَا کے ہیں۔ یعنی ایسی ہستی جو تمام اُمور کے مخفی در مخفی پہلوؤں کو جاننے والی اور کائناتِ عالم کے تمام اسرار اور غوامض کا علم رکھنے والی ہے۔ اِن معنوں کے لحاظ سے اِس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کی نگاہ اپنے تمام علوم اور ایجادات کے باوجود صرف ظاہر تک محدود رہتی ہے۔ ان اُمور کے پسِ پُشت جو اللہ تعالےٰ کا عظیم الشان غیب کام کر رہا ہوتا ہے اور جو باریک در باریک حکمتیں اُن میں مخفی ہوتی ہیں اُن سے وہ آگاہ نہیں ہوتا۔ اور اگر کائناتِ عالم کے رموز اور اسرار اُس پر منکشف ہوتے ہیں تو اُسی وقت جب اللہ تعالیٰ اپنی صفتِ لطیف کے ماتحت اُسے اپنے حقائق سے آشنا کرتا اور اخفاء کے پردوں کو اُسکی آنکھوں سے دُور کرتا ہے۔ اِسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے یہ کہدے کہ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ (اعراف آیت ۱۸۹)

یعنی اگر میں غیب کا واقف ہوتا تو بھلائیوں میں سے اکثر اپنے لئے جمع کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچتی درحقیقت اگر غور سے کام لیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے علم غیب کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر انسان کیلئے دو برکتیں پیدا کر دی ہیں۔ ایک برکت تو پردۂ غیب کی وجہ سے اُسے حاصل ہوتی ہے اور ایک برکت کشفِ غیب کی وجہ سے اُسے حاصل ہوتی ہے۔ پردۂ غیب کی وجہ سے جو برکت اُسے حاصل ہے وہ تو اس سے ظاہر ہے کہ انسان کی ساری زندگی جدوجہد سے تعلق رکھتی ہے اور جدوجہد کی ساری بنیاد ہی غیب پر ہے۔ اگر غیب کا پردہ حائل نہ ہو تو سعی و عمل کا تمام سلسلہ ختم ہو جائے۔ مثلاً بچوں کو اُن کے والدین سکول میں پڑھنے کے لئے بھیجتے ہیں۔ اور وہ بھی اگر محنتی اور ذہین ہوں تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دنیا میں عزت حاصل کریں گے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب اُن کا امتحان قریب آتا ہے تو اُن میں سے بعض لڑکے بیماریوں یا اچانک حادثات کی وجہ سے وفات پا جاتے ہیں۔ اب اگر خدا تعالیٰ نے علم غیب اپنے ہاتھ میں نہ رکھا ہوتا اور ایک طالب علم کو یہ یقینی طور پر معلوم ہوتا کہ میں نے پندرہ سال کی عمر کو پہنچ کر مر جانا ہے! تو وہ اُسی وقت سے مغموم رہنا شروع کر دیتا۔ اور اُس کے والدین بھی رونے پیٹنے لگ جاتے اور وہ اپنی عمر کو بالکل ضائع کر دیتا۔ لیکن پردۂ غیب کے حائل ہونے کی وجہ سے وہ برابر محنت کرتا چلا جاتا ہے۔ اور گو بعد میں آکر وہ فوت ہو جاتا ہے مگر جس طرح ایک ٹوٹنے والے ستارے کی روشنی سے بھی کئی بھولے بھٹکے مسافر راہ پا لیتے اور کئی گڑھوں میں گرتے ہوئے سنبھل جاتے ہیں۔ اِسی طرح وہ دوسرے لڑکوں کے لئے ایسی روشنی چھوڑ جاتا ہے جو اُن کی ترقی کا موجب بن جاتی ہے۔ کیونکہ کئی لڑکے ایسے تھے جن کے سامنے اگر اُسکا وجود نہ ہوتا۔ تو وہ کبھی محنت نہ کرتے۔ انہوں نے اگر محنت کی تو اِسی لئے کہ اُس لڑکے کی محنت اور ذہانت کو دیکھ کر اُن کے دلوں میں بھی رشک پیدا ہوا۔ اور انہوں نے بھی تعلیم میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور رفتہ رفتہ وہ ترقی کر گئے۔

اِسی طرح انسان اپنے دوستوں اور رشتہ داروں میں پھرتا ہے جن میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی دوستی خود غرضانہ ہوتی ہے۔ یا وہ اپنے دل میں اُس کے خلاف کئی قسم کے منصوبے سوچتے رہتے ہیں۔ یا اُس کے رشتہ دار بظاہر اس سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے دلوں میں اُس کے بدخواہ ہوتے ہیں۔ اگر پردۂ غیب حائل نہ ہوتا اور انسان کو پتہ لگ جاتا کہ میرا فلاں دوست اپنے دل میں میرے متعلق اس قسم کے خیالات رکھتا ہے یا میرا فلاں رشتہ دار میرا بدخواہ ہے تو ایک قیامت برپا ہو جاتی۔ جس گھر میں دیکھو لڑائی ہو رہی ہوتی۔ ایک کہہ رہا ہوتا کہ تم نے میرے خلاف فلاں فلاں بات کیوں سوچی تھی۔ اور دوسرا کہہ رہا ہوتا کہ تمہارے دل میں میرے خلاف اِس قسم کے خیالات کیوں آ رہے تھے۔ بیوی خاوند سے ناراض ہوتی اور خاوند بیوی سے ناراض ہوتا۔ اور امن اور سکون دُنیا سے اُٹھ جاتا۔ پس پردۂ غیب جو اللہ تعالیٰ نے حائل کر رکھا ہے یہ اُس کی ایک بڑی رحمت ہے۔

پھر اگر پردۂ غیب نہ ہوتا تو لڑائیوں میں تمام دنیا تباہ ہو کر رہ جاتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ[1] یعنی لڑائی لڑنے کا سارا کمال اِس میں ہے کہ سب باتیں پردۂ اخفاء میں

---

[1] ترمذی ابواب الجہاد۔

رہیں اور لڑنے والے اپنی سیاست اور تدبیر پر اعتماد کریں لیکن اگر پردۂ غیب نہ ہوتا اور جنگوں میں ایک طرف والوں کو پتہ لگ جاتا کہ ہمارا دشمن اِس وقت فلاں جگہ پر ہے تو وہ اپنی توپوں کا مُنہ عین اُسی طرف کر دیتے جدھر دشمن ہوتا۔ اسی طرح دوسری طرف سے بھی توپوں کے گولے عین اُسی جگہ آکر گرتے۔ جہاں دشمن موجود ہوتا اور اس طرح کوئی متنفس بھی نہ بچ سکتا۔ اب تو ایسا ہوتا ہے کہ اگر ایک لاکھ فوج میدان میں جاتی ہے تو اُس میں سے چند ہزار مر جاتے ہیں اور باقی فوج صحیح و سلامت رہتی ہے۔ لیکن اگر پردۂ غیب نہ ہوتا اور فریقین کو ایک دوسرے کے حالات کا علم ہو جاتا۔ تو نشانہ عین دشمن پر بیٹھتا اور کوئی شخص بھی محفوظ نہ رہ سکتا۔ اسی طرح سائنس کی ترقی اور علومِ جدیدہ کے انکشاف کی بنیاد بھی غیب پر ہی ہے۔ اگر ہر چیز ظاہر ہوتی تو سعی و عمل اور ایجادات کا تمام سلسلہ ختم ہو جاتا اور انسان ایک ناکارہ وجود بن کر رہ جاتا۔ غرض دنیا کے تمام کاروبار غیب پر چل رہے ہیں اگر غیب نہ رہے تو دنیا کا تمام کارخانہ بھی ختم ہو جائے اسی طرح روحانی عالم میں جزا و سزا کی بنیاد بھی پردۂ غیب پر رکھی گئی ہے۔ اگر پردۂ غیب ہٹا دیا جائے تو نہ نیکی قابلِ جزا سمجھی جائے اور نہ بدی سے اجتناب قابلِ ثواب سمجھا جائے۔

ہم ایک دفعہ لکھنؤ گئے۔ وہاں ایک سرحدی مولوی عبدالکریم تھا۔ جو ہماری جماعت کا شدید مخالف تھا۔ اُس نے ہمارے آنے کے بعد ایک تقریر کی جس میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک واقعہ کو اُس نے نہایت تحقیر کے طور پر بیان کیا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام دِلّی گئے وہاں ہمارے ایک رشتہ دار کے ماموں مرزا حیرت دہلوی تھے۔ انہیں ایک دن شرارت سوجھی اور وہ جعلی انسپکٹر پولیس بن کر آ گئے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ڈرانے کے لئے کہنے لگے کہ مَیں انسپکٹر پولیس ہوں اور مجھے حکومت کی طرف سے اِس لئے بھیجا گیا ہے کہ مَیں آپ کو نوٹس دوں کہ آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں۔ ورنہ آپ کو سخت نقصان ہو گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو اس کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر جب بعض دوستوں نے تحقیق کرنی چاہی کہ یہ کون شخص ہے تو وہ وہاں سے بھاگ گئے۔

اِس واقعہ کو مولوی عبدالکریم سرحدی نے اِس رنگ میں بیان کیا کہ دیکھو وہ خدا کا نبی بنا پھرتا ہے مگر وہ دِلّی گیا تو مرزا حیرت انسپکٹر پولیس بن کر اُس کے پاس چلا گیا۔ وہ کوٹھے پر بیٹھا ہُوا تھا۔ (حالانکہ یہ بات بالکل جھوٹ تھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نیچے دالان میں بیٹھے ہوئے تھے) جب اُس نے سُنا کہ انسپکٹر پولیس آیا ہے تو وہ ایسا گھبرایا کہ سیڑھیوں سے اُترتے وقت اُس کا پَیر پھسلا اور وہ مونہہ کے بل زمین پر آگرا۔ لوگوں نے یہ تقریر سُن کر بڑے قہقہے لگائے اور ہنستے رہے۔ لیکن اُسی رات مولوی عبدالکریم کو خدا تعالیٰ نے پکڑ لیا۔ وہ اپنے مکان کی چھت پر سویا ہُوا تھا۔ کہ رات کو وہ کسی کام کے لئے اُٹھا اور چونکہ اُس چھت کی کوئی منڈیر نہیں تھی اور نیند سے اُس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اُسکا ایک پاؤں چھت سے باہر جا پڑا اور وہ دھڑم سے نیچے آگرا۔ اور گرتے ہی مر گیا۔ اب دیکھو اگر اُس کو غیب کا پردہ نہ ہونے کی صورت میں پتہ ہوتا کہ مجھے گستاخی کی یہ سزا ملے گی تو وہ کبھی گستاخی نہ کرتا بلکہ آپ پر ایمان لے آتا گو ایسا ایمان اُس کے کسی کام نہ آتا۔ کیونکہ جب غیب ہی نہ رہا تو ایمان کا کیا فائدہ۔ ایمان تو وہی کارآمد ہو سکتا ہے جو غیب کی حالت میں ہو۔ ثواب یا عذاب سامنے نظر آنے پر تو ہر کوئی ایمان لا سکتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ جب ایمان لائے تو یہ سمجھ کر ایمان لائے تھے

کہ مجھے دین کے راستہ میں قربانیاں کرنی پڑینگی اور اپنی جان دینی پڑیگی اور اگر پردۂ غیب نہ ہوتا۔ اور اُن کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ اُن کیلئے انعامات مقدر ہیں اور وہ ان انعامات کی لالچ میں ایمان لے آتے تو اُن کا ایمان کہاں رہتا۔ اِسی طرح حضرت عمرؓ جب ایمان لائے تو اُن کو یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ خلیفہ بنیں گے۔ بلکہ وہ تو اِس ارادہ سے نکلے تھے کہ مَیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دونگا۔ مگر جب اپنی بہن سے انہوں نے قرآن کریم کے چند اوراق لے کر پڑھے تو اُن پر حق کھل گیا۔ اور وہ ایمان لے آئے اور اُن حالات میں ایمان لائے کہ وہ جانتے تھے کہ مجھے مسلمان ہو کر اب اپنی جان قربان کرنی پڑے گی۔

اسی طرح حضرت عثمانؓ ایک خاموش طبع انسان تھے مگر اُن کی قربانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایسی عزت بخشی کہ صلح حدیبیہ کے وقت تمام صحابہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ یا رسول اللہ! اگر ہم میں سے کوئی شخص مکہ میں جانے کے قابل ہے تو وہ عثمانؓ ہی ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ مکہ گئے اور چونکہ اُن کی رشتہ داری مکہ میں بہت زیادہ تھی۔ رؤساء نے اُن سے کہا کہ آپ کعبہ کا طواف کرلیں مگر حضرت عثمانؓ نے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ جب تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم طواف نہیں کرینگے مَیں بھی نہیں کروں گا۔ حضرت عثمانؓ کو مکہ والوں سے بات چیت کرتے ہوئے دیر ہوگئی اور اندھیرا ہونے لگا۔ تو مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اِسی لئے وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو آپؐ نے تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور اُن سب سے بیعت لی وہ ایک ہی بیعت تھی جو آپؐ نے موت کے نام پر لی۔ اُس بیعت کے موقعہ پر آپؐ نے صحابہؓ سے یہ اقرار لیا کہ ہم دشمن کے مقابلہ سے پیچھے نہیں ہٹیں گے چاہے ہم سب کے سب مارے جائیں۔ جب سب صحابہؓ بیعت کر چکے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ اِس وقت عثمانؓ یہاں نہیں ہے۔ اور ممکن ہے وہ مارا گیا ہو۔ لیکن چونکہ اس کے زندہ ہونے کا بھی امکان ہے اِس لئے (آپؐ نے اپنا دوسرا ہاتھ اپنے ہاتھ پر رکھتے ہوئے فرمایا) مَیں عثمانؓ کی جگہ اپنا ہاتھ بیعت کے لئے رکھتا ہوں[1]۔ اب دیکھو عثمانؓ کے لئے یہ کتنا بڑا اعزاز تھا۔ اِس کے مقابلہ میں اگر اُن کی ہزار سالہ زندگی بھی قربان ہو جاتی تو ہیچ تھی۔ لیکن اگر حضرت عثمانؓ کو پتہ ہوتا کہ مجھے یہ اعزاز ملنے والا ہے اور میرے لئے فلاں فلاں انعامات مقدر ہیں اور وہ محض اُن انعامات کا لالچ کرتے ہوئے ایمان لے آتے تو اُن کے ایمان کی کیا حقیقت رہ جاتی۔

اِسی طرح حضرت علیؓ جب ایمان لائے تو وہ ابھی بچے ہی تھے اور وہ بھی یہ سمجھ کر ایمان لائے تھے کہ مجھے اسلام کے لئے ہر قسم کے مصائب برداشت کرنے پڑیں گے یہاں تک کہ اگر جان قربان کرنے کا وقت آیا تو مجھے اپنی جان بھی خدا تعالےٰ کی راہ میں پیش کرنی پڑے گی۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ابتدائی ایام میں ایک دعوت کی جس میں بنو عبدالمطلب کو بلایا۔ تاکہ اُن تک پیغام حق پہنچایا جائے۔ چنانچہ آپؐ کے بہت سے رشتہ دار اس دعوت میں شریک ہوئے۔ جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو آپؐ نے کھڑے ہو کر تقریر کرنا چاہی۔ مگر ابولہب نے اُن سب لوگوں کو منتشر کر دیا اور وہ آپؐ کی بات سُنے بغیر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ آپؐ بہت حیران ہوئے کہ یہ

---

[1] تاریخ الخمیس جلد ۲ صفحہ ۲۲ و سیرۃ ابن ہشام جلد سوم صفحہ ۱۵۸

اچھے لوگ ہیں جو دعوت کھا کر بھی بات نہیں سُنتے۔ مگر آپؐ مایوس نہیں ہوئے بلکہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ دوبارہ اِن کی دعوت کی جائے۔ چنانچہ دوبارہ اُن سب کو کھانے پر مدعو کیا گیا۔ جب وہ سیر ہو کر کھا چکے تو آپؐ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ کا یہ تم پر کتنا بڑا احسان ہے کہ اُس نے اپنا نبی تمہارے اندر بھیجا ہے۔ مَیں تمہیں خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ اگر تم میری بات مانو گے تو تم دینی اور دنیوی نعماء کے وارث قرار پاؤ گے۔ کیا تم میں سے کوئی ہے جو اِس کام میں میرا مددگار بنے؟ یہ سُن کر ساری مجلس پر سناٹے کی سی حالت طاری ہو گئی مگر یکلخت ایک کونے سے ایک نوعمر بچہ اُٹھا اور اُس نے کہا کہ گو مَیں ایک کمزور ترین فرد ہوں اور عمر میں سب سے چھوٹا ہوں مگر مَیں آپ کا ساتھ دونگا۔ یہ بچے حضرت علیؓ تھے جنہوں نے اُس وقت اسلام کی تائید کا اعلان کیا[1]۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کو یہ عظیم الشان قربانی کرنے کی توفیق عطا فرمائی کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے لئے رات کے وقت اپنے گھر سے نکلنا چاہا۔ تو آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تم میرے بستر پر لیٹ جاؤ تاکہ کفار اگر جھانک کر دیکھیں تو انہیں یہ دکھائی دیتا رہے کہ کوئی شخص بستر پر سو رہا ہے اور وہ تعاقب کے لئے اِدھر اُدھر نہ نکل کھڑے ہوں۔ اُس وقت حضرت علیؓ نے یہ نہیں کہا کہ یا رسول اللہ مکان کے اردگرد تو قریش کے چنیدہ نوجوان ہاتھ میں تلواریں لئے کھڑے ہیں اگر صبح کو انہیں معلوم ہوا کہ آپ کہیں باہر تشریف لے جا چکے ہیں تو وہ مجھ پر حملہ کر کے مجھے قتل کر دیں گے۔ بلکہ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر لیٹ گئے اور آپؐ نے اپنی چادر اُن پر ڈال دی۔ جب صبح ہوئی اور قریش نے دیکھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے حضرت علیؓ آپؐ کے بستر سے اُٹھے ہیں تو وہ اپنی ناکامی پر دانت پیس کر رہ گئے۔ اور انہوں نے حضرت علیؓ کو پکڑ کر مارا پیٹا۔ مگر اس سے کیا بن سکتا تھا۔ خدائی نوشتے پورے ہو چکے تھے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلامتی کے ساتھ مکہ سے باہر جا چکے تھے۔ اُس وقت حضرت علیؓ کو کیا معلوم تھا کہ مجھے اِس ایمان کے بدلے میں کیا ملنے والا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اِس قربانی کے بدلہ میں صرف حضرت علیؓ ہی عزت نہیں پائیں گے بلکہ حضرت علیؓ کی اولاد بھی عزت پائے گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ پر پہلا فضل تو یہ کیا کہ اُن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا شرف بخشا اور دوسرا فضل اللہ تعالیٰ نے اُن پر یہ کیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اُن کے لئے اتنی محبت پیدا کی کہ آپؐ نے بارہا اُن کی تعریف فرمائی۔ جب حضرت علیؓ بڑی عمر کو پہنچے ہونگے تو اُن کو اللہ تعالیٰ کے یہ فضل دیکھ کر کتنا فخر محسوس ہوتا ہوگا۔ اور اُن کو کتنی راحت ہوتی ہوگی۔ پھر ایک دفعہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی جنگ کے لئے باہر تشریف لے گئے۔ تو آپؐ نے حضرت علیؓ کو مدینہ میں رہنے کا حکم دیا۔ حضرت علیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! کیا آپؐ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ چلے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ اَلَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی (ترمذی جلد ۲ ابواب المناقب) یعنی اے علیؓ! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تمہاری مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔ یعنی ہارونؑ کو بھی تو موسیٰؑ اپنے پیچھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پھر کیا ہارون کی عزت کم ہو گئی تھی۔ اب دیکھو یہ اعزاز جو حضرت علیؓ کو حاصل ہُوا۔ اِس کے مقابلہ میں اُنکی قربانیاں

---

[1] السیرۃ الحلبیہ جلد اوّل صفحہ ۳۰۴۔

کیا چیز تھیں۔ اسی طرح اس امت کے اکثر اولیاء اور صوفیاء حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ہی تھے۔ اور پھر اُن کے ذریعے خدا تعالےٰ نے ایسے ایسے معجزات ظاہر کئے کہ اُن کو دیکھ کر حیرت آتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے مَیں نے ایک واقعہ سُنا ہُوا ہے کہ ہارون الرشید نے امام موسیٰ رضاؓ کو کسی وجہ سے قید کر دیا۔ اور اُن کے ہاتھوں اور پاؤں میں رسیّاں باندھ دی گئیں۔ اُس زمانہ میں سپرنگ دار گدیلے تو نہ تھے۔ عام روئی کے گدیلے ہوتے تھے۔ ہارون الرشید اپنے محل میں آرام دہ گدیلوں پر سویا ہُوا تھا کہ اُس نے خواب میں دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ اور آپؐ کے چہرہ پر غضب کے آثار ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہارون الرشید! تم ہم سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو۔ مگر تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم تو آرام دہ گدیلوں پر گہری نیند سو رہے ہو۔ اور ہمارا بچہ شدّت گرما میں ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے قید خانہ کے اندر پڑا ہے۔ یہ نظارہ دیکھ کر ہارون الرشید بیتاب ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ اور ایک کمانڈر کو ساتھ لے کر آپ جیل خانہ میں گیا اور اپنے ہاتھ سے اُن کے ہاتھوں اور پاؤں کی رسیّاں کھولیں۔ انہوں نے ہارون الرشید سے کہا۔ آپ تو اتنے مخالف تھے اب کیا بات ہوئی کہ خود چل کر یہاں آ گئے۔ ہارون الرشید نے اپنا خواب سُنایا اور کہا مَیں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مَیں اصل حقیقت کو نہ جانتا تھا۔ اب دیکھو اُس زمانہ میں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں کتنا بڑا فاصلہ تھا۔ ہم نے کئی بادشاہوں کی اولادوں کو دیکھا ہے کہ وہ دربدر دھکّے کھاتی پھرتی ہیں۔ مَیں نے خود دِلّی میں ایک سقّہ دیکھا جو شاہانِ مغلیہ کی اولاد میں سے تھا۔ وہ لوگوں کو پانی پلاتا پھرتا تھا مگر اُس میں اتنی حیا ضرور تھی کہ مانگتا کچھ نہ تھا۔ دوسری طرف حضرت علیؓ کی اولاد کو دیکھو کہ اتنی پُشتیں گذرنے کے بعد بھی خدا تعالیٰ ایک بادشاہ کو رؤیا میں ڈراتا ہے۔ اور اُن سے حُسن سلوک کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اگر حضرت علیؓ کو اِس اعزاز کا پتہ ہوتا اور اُن کو غیب کا علم حاصل ہوتا اور وہ محض اس عزّت افزائی کے لئے اسلام قبول کرتے تو اِن کا ایمان صرف سودا اور دوکانداری رہ جاتا۔ کسی انعام کا موجب نہ بنتا۔

اِسی طرح حضرت خدیجہؓ جب ایمان لائیں تو اُن کو کیا معلوم تھا کہ اِس ایمان کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے کیا کچھ برکات مقدر کر رکھی ہیں۔ بیشک انہوں نے اِسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لئے اپنا تمام مال قربان کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ مکّہ کی متموّل ترین عورت ہوتے ہوئے غربت اور تنگدستی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ اور پھر شعبِ ابی طالب میں متواتر تین سال تک انہوں نے ایسی ایسی تکالیف برداشت کیں کہ اُنہی کے نتیجہ میں آپؓ وہاں سے نکلتے ہی انتقال فرما گئیں مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کی قربانیوں کو ایسا نوازا کہ آج تک عالمِ اسلام اُن کا نام عزّت اور ادب کے ساتھ لے رہا ہے اور پھر اللہ تعالےٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اُن کی ایسی محبت ڈالی کہ جنگِ بدر میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص جو ابھی تک اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے قید ہو کر آئے تو آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے جو ابھی مکّہ میں ہی تھیں اُن کے فدیہ کے طور پر اپنے گلے کا ہار اتار کر بھیجدیا۔ یہ وہ ہار تھا جو حضرت خدیجہؓ نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس ہار کو دیکھا تو آپؐ کو حضرت خدیجہؓ یاد آگئیں۔ اور آپؐ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ پھر آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا۔ اگر تم چاہو تو خدیجہؓ کی یہ یادگار

اُن کی بیٹی کے پاس محفوظ رہے۔

اسی طرح حضرت خدیجہؓ کی وفات کے کئی سال بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ اپنے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ کہ حضرت خدیجہؓ کی بہن ہالہؓ آپؐ سے ملنے کے لئے آئیں اور دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے کہا۔ کیا میں اندر آسکتی ہوں۔ ہالہؓ کی آواز چونکہ اپنی بہن حضرت خدیجہؓ سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ اس لئے اِس آواز کے کان میں پڑتے ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت خدیجہؓ کی یاد تازہ ہوگئی۔ آپؐ بے تاب ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ آہ میرے خدا! یہ تو خدیجہؓ کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایسا احسان کیا کہ ابراہیمؓ کے سوا جو حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی تمام اولاد حضرت خدیجہؓ سے ہی پیدا ہوئی۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے آپؐ کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ لڑکے تو سب کے سب بچپن میں ہی وفات پا گئے۔ مگر حضرت زینبؓ حضرت رقیہؓ۔ حضرت اُم کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ چاروں لڑکیاں زندہ رہیں۔ اور اسلام میں داخل ہوئیں۔ حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے بطن سے ہی پیدا ہوئے تھے جو حضرت خدیجہؓ کی صاحبزادی تھیں۔ اور انہی کی اولاد آج سادات کہلاتی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کی تمام نسل کو اپنے غیر معمولی انعامات سے نوازا۔ لیکن اگر حضرت خدیجہؓ کو یہ معلوم ہوتا کہ انہیں ایک دن یہ اعزاز حاصل ہونے والا ہے کہ تمام عالم اسلام انہیں اُم المومنین کہیگا اور قیامت تک اُنکی نسل کو معزز اور مکرّم قرار دیا جائیگا اور وہ اللہ تعالےٰ کے لئے نہیں بلکہ محض اس عزت اور مقام کے حصول کے لئے ایمان لائیں تو اُن کا ایمان لانا اُن کے کس کام آتا۔ اسی طرح ابوجہل جو سمجھتا تھا کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے ساتھیوں کو مار ڈالونگا اور اسلام کو مٹا دونگا۔ اگر اُس کو یہ علم ہوتا کہ اُسکی مخالفانہ کوششوں کے باوجود اسلام دنیا میں پھیل جائیگا اور دُنیا میں اُس کا نام لعنت کے ساتھ لیا جائیگا بلکہ خود اُس کا بیٹا اسلام میں داخل ہو جائیگا اور وہ اسلام کیلئے دشمنوں سے لڑتا ہؤا مارا جائیگا تو وہ کبھی اسلام کے خلاف اپنی آواز بلند نہ کرتا۔ غرض اگر پردۂ غیب حائل نہ ہوتا تو نہ ابوبکرؓ ابوبکرؓ ہو سکتا۔ نہ ابوجہل ابوجہل بن سکتا لیکن جہاں دینی اور دنیوی کاروبار پردۂ غیب کی وجہ سے چل رہا ہے وہاں مومنوں کے ایمان کی ترقی انکشافِ غیب سے تعلّق رکھتی ہے۔ جب انبیاءؑ دنیا میں آتے اور لوگوں کو غیب کی خبریں سُناتے ہیں اور پھر مخالف حالات میں اُن کی بتائی ہوئی خبریں پوری ہو جاتی ہیں تو دلوں میں ایک نیا ایمان پیدا ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی ہستی اِس طرح عریاں ہو کر لوگوں کے سامنے آجاتی ہے کہ اُس کے وجود کا کوئی دیانتدار انسان انکار نہیں کر سکتا

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں ایک دفعہ کپورتھلہ کے احمدیوں اور غیر احمدیوں کا وہاں کی ایک مسجد کے متعلق مقدمہ ہو گیا جس جج کے پاس یہ مقدمہ تھا اُس نے مخالفانہ رویّہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ اِس پر کپورتھلہ کی جماعت نے گھبرا کر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دُعا کے لئے خط لکھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اِس کے جواب میں انہیں تحریر فرمایا کہ اگر میں سچّا ہوں تو مسجد تم کو مل جائیگی۔ مگر دوسری طرف جج نے اپنی مخالفت بدستور جاری رکھی اور آخر اس نے احمدیوں کے خلاف فیصلہ لکھ دیا۔ مگر دوسرے دن جب وہ فیصلہ سُنانے کے لئے عدالت میں جانے کی تیاری کرنے لگا تو اُس نے نوکر سے کہا مجھے بوٹ پہنا دو۔ نوکر نے ایک بوٹ پہنایا اور دوسرا ابھی پہنا ہی رہا تھا۔ کہ کھٹ کی آواز آئی۔ اُس نے اوپر دیکھا۔ تو جج کا

ہارٹ فیل ہوچکا تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد دوسرے جج کو مقرر کیا گیا۔ اور اُس نے پہلے فیصلہ کو بدل کر ہماری جماعت کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ جو دوستوں کے لئے ایک بہت بڑا نشان ثابت ہوا۔ اور اُن کے ایمان آسمان تک جا پہنچے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ اپنے انبیاء کے ذریعہ متواتر غیب کی خبریں دیتا ہے جن کے پورا ہونے پر مومنوں کے ایمان اَور بھی ترقی کر جاتے ہیں۔ یہ غیب کی خبروں کا ہی نتیجہ تھا کہ جو لوگ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اُن کے دل اِس قدر مضبوط ہوگئے کہ اور لوگ تو موت کو دیکھ کر روتے ہیں۔ مگر صحابہؓ میں سے کسی کو جب خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دینے کا موقعہ ملتا تو وہ خوشی سے اچھل پڑتا۔ اور کہتا فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ۔ ربّ کعبہ کی قسم! مَیں کامیاب ہو گیا۔ آخر یہ رُوح اُن کے اندر کہاں سے آگئی تھی۔ یہ وہی رُوح تھی جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی خبریں بتا بتا کر مومنوں کے اندر بھر دی تھی۔ اگر اُن پر انکشافِ غیب نہ ہوتا تو وہ اس اعلیٰ مقام پر کبھی کھڑے نہ ہو سکتے جس پر مسلمان پہنچے۔ پس یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ بنی نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہیں۔ غیب بھی اپنی جگہ فائدہ مند ہے اور انکشافِ غیب بھی اپنی جگہ نفع رساں ہے۔ ساری لذتیں غیب کے ساتھ ہیں اور ساری روحانیت کشفِ غیب کے ساتھ وابستہ ہے۔

خدا تعالیٰ کی دوسری صفت جس کی طرف اِن مقطّعات میں توجّہ دلائی گئی ہے وہ اسکی صفت سمیع ہے۔ اَلسَّمِیْعُ کے معنے ہیں کہ وہ لوگوں کی دُعائیں سُنتا اور انہیں نرالے طور پر قبول کرتا ہے اور یہ کہ اُس کے سوا نہ زندہ آدمی دوسروں کی دُعائیں سُن سکتے ہیں اور نہ مُردہ۔ صرف خدا ہی ہے جو لوگوں کی دُعائیں سُنتا اور اُن کو قبول فرماتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ کوئی یورپ میں دُعا مانگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی ایشیا میں دُعا مانگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی چین میں مانگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی جاپان میں مانگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی روس میں مانگ رہا ہوتا ہے۔ کوئی مصر، شام اور فلسطین میں مانگ رہا ہوتا ہے۔ مگر خدا اُن سب کی دُعائیں سُن رہا ہوتا ہے۔ پس اِس صفت کے ذریعے بنی نوع انسان کو اِس امر کی طرف توجّہ دلائی گئی ہے کہ تمہارا خدا وہ ہے جو تمہاری دُعاؤں کو سُننے والا اور تمہاری تمام ضروریات اور حاجات میں کام آنے والا ہے تمہیں جب بھی کوئی مشکل پیش آئے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے حضور جھکو۔ اور اس سے دُعا کرو۔ اس کے لئے کسی مال کی ضرورت نہیں۔ کسی ہنر کی ضرورت نہیں۔ کسی طاقت اور قوت کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی کے دونوں ہاتھ شل ہو چکے ہوں یا کوئی شخص اتنا نحیف اور کمزور ہو چکا ہو کہ وہ چارپائی سے اُٹھ کر نماز کی حرکات بھی ادا نہ کر سکے۔ تب بھی وہ دُعا کر سکتا ہے۔ کیونکہ دُعا اِن چیزوں کی محتاج نہیں۔ وہ بیشک لیٹا رہے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا چلا جائے۔ بلکہ اگر اُس کی زبان پر فالج گرا ہوا ہے اور وہ دُعا کے لئے اپنی زبان بھی نہیں ہلا سکتا۔ تو وہ دماغ میں ہی دُعائیہ فقرات کو دوہراتا رہے اور اگر اُس کا دماغ بھی کام کرنے سے رہ جائے تو پھر اُس کا زمانۂ عمل ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن جب تک ایک انسان دنیا میں رہتا ہے اور انسانیت کی حدود سے وہ اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ اُسوقت تک ایک معذور سے معذور انسان بھی اس میں حصّہ لے سکتا ہے یہانتک کہ وہ گونگا جس کی زبان نہیں وہ بہرہ جس کے کان نہیں۔ وہ مفلوج جس کے جسم کی حس ماری گئی ہو۔ اور وہ گوشت کا لوتھڑہ بن کر چارپائی پر پڑا ہوا ہو وہ بھی اُسی جوش و خروش سے اپنے ربّ سے دُعا کر سکتا ہے

جس طرح ایک تندرست اور طاقتور انسان ۔

غرض دُعا ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے تمام چھوٹوں اور بڑوں اور امیروں اور غریبوں کو ایک سطح پر لاکر کھڑا کر دیا ہے ۔ اور دُعا ہی وہ ہتھیار ہے جس کے متعلق خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ
اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ (نمل آیت ۶۳)
وہ کونسی ہستی ہے جو بندہ کی دُعائے مضطر سُن کر بیتاب ہو جاتی اور دوڑ کر اُس کے پاس آجاتی ہے ۔ فرمایا ۔ وہ مَیں ہوں ۔ پس یہ عمل سب اعمال سے زیادہ طاقتور ہے بیشک نماز بھی ایک ضروری چیز ہے ۔ روزہ بھی ایک ضروری چیز ہے ۔ زکوٰۃ بھی ایک ضروری چیز ہے ۔ حج بھی ایک ضروری چیز ہے ۔ جہاد بھی ایک ضروری چیز ہے ۔ مگر دُعا وہ عمل ہے جس کے متعلق خدا تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر کوئی مجھے سچے دل سے پکارے تو مَیں ضرور اُس کے پاس پہنچ جاتا ہوں ۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے ۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ۔ یعنی جب کبھی میرے بندے انسانی خداؤں سے نا اُمید ہو کر پوچھیں کہ ہمارا آسمانی خدا کہاں ہے ۔ ہم پر تو فرعون نے اور نمرود نے اور شدّاد نے اتنا تصرّف کر لیا ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کہاں جائیں اور کس طرح اُن کے مصائب اور آفات سے رہائی حاصل کریں تو تُو انہیں کہہ دے کہ تمہیں میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں ۔ اِنِّیْ قَرِیْبٌ مَیں خود تمہارے قریب آیا ہُوا ہوں ۔ اگر تمہارا باپ تمہارے کام آسکتا ۔ یا تمہارا چچا تمہاری مدد کر سکتا ۔ یا تمہارا اور کوئی رشتہ دار تمہارے قریب ہوتا تو تمہیں دوڑ کر اُس کے پاس جانا پڑتا ۔ مگر اب تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ۔ مَیں خود تمہارے قریب آیا ہُوا ہوں ۔ پس تمہاری فریاد سُنی جانے میں کوئی وقت نہیں لگ سکتا ۔ دُنیا میں تو تمہیں مدد حاصل کرنے کے لئے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس جانا پڑتا ہے ۔ مگر مَیں تو آپ دوڑ کر تمہارے قریب آچکا ہوں پھر تمہیں کیا مشکل پیش آسکتی ہے ۔

یہ پیغام جو اسلام نے دنیا کے ہر فرد کو دیا ہے اتنا اہم اور اِس قدر عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والا ہے کہ اِس کی موجودگی میں دنیا کا کوئی دُکھ انسان کو پریشان نہیں کر سکتا ۔ دشمن خواہ آسمان سے بھی اونچے چلے جائیں اگر کوئی شخص سچے دل سے اپنے ربّ کو پکارے تو اللہ تعالیٰ آسمان سے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُنکی گردنیں مروڑ سکتا ہے ۔ بیشک وہ چھان چھان کر پانی پئیں ۔ بیشک وہ رات اور دن پرہیز کرتے رہیں اگر خدا تعالیٰ اُنکی ہلاکت کا فیصلہ فرما دے تو وہ ہیضہ یا طاعون یا انفلوئنزا کے کیڑوں کو بھی حکم دے سکتا ہے کہ تم اتنی تعداد میں فلاں شخص کے اندر داخل ہو جاؤ ۔ کہ دنیا کی کوئی دوائی اُس پر اثر نہ کر سکے اور وہ تڑپ تڑپ کر ہلاک ہو جائے اور میرا مومن بندہ خوش ہو جائے کہ مَیں نے اُس کی مدد کی ہے ۔

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ اُنکے محلہ میں شاہی دربار کے بعض آدمی رات کو گانے بجانے کا شغل رکھتے تھے ۔ انہوں نے کئی دفعہ سمجھایا کہ لوگوں کی نیندیں اور نمازیں خراب ہوتی ہیں تم اِس شغل کو ترک کر دو ۔ مگر وہ نہ مانے جب انہوں نے بار بار کہا تو اِس خیال کے ماتحت کہ کہیں یہ محلہ والوں سے مل کر ہمیں روکنے کا تہیّہ نہ کر لیں ۔ انہوں نے شاہی پہرہ داروں کا انتظام کر لیا ۔ جب اِس بزرگ کو اطلاع ملی تو انہوں نے کہا اچھا انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے فوج بلا لی ہے تو ہم بھی رات کے تیروں سے ان کا مقابلہ کرینگے ۔ معلوم ہوتا ہے اِن لوگوں کے دل میں ابھی کچھ نیکی باقی تھی جونہی ان لوگوں کے کان میں یہ آواز پڑی کہ ہم رات کے تیروں سے مقابلہ کرینگے ۔ وہ دوڑتے ہوئے اُس بزرگ کے پاس آئے اور کہنے لگے ۔ اِن تیروں کے مقابلہ کی ہم میں طاقت

نہیں ہم اپنے شغل سے باز آئے پس دُعا ایک ایسا ہتھیار ہے کہ اگر کوئی شخص کامل یقین اور پختہ ایمان کے ساتھ اِس سے کام لے تو بظاہر ناممکن نظر آنے والی باتیں بھی اس کے لئے ناممکن ہو جاتی ہیں۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں دریا پر گیا۔ بھائی عبدالرحیم صاحب جو بچپن میں میرے اُستاد رہے ہیں اور کچھ اور دوست میرے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ جب ہم کشتی میں بیٹھے ہوئے دریا کی سیر کر رہے تھے تو میرے لڑکے ناصر احمد نے اپنے بچپن کے لحاظ سے کہا کہ ابا جان! اگر اِسوقت ہمارے پاس مچھلی بھی ہوتی تو بڑا مزہ آتا۔ میں نے کہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ پانیوں میں خواجہ خضر کی حکومت ہے۔ اگر خواجہ خضر کوئی مچھلی ہماری طرف پھینک دیں تو تمہاری یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ جب میں نے یہ فقرہ کہا۔ تو بھائی عبدالرحیم صاحب جھنجھلا کر کہنے لگے کہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں اِس بچے کی عقل ماری جائیگی میں نے کہا۔ ہمارے خدا میں تو سب طاقتیں ہیں وہ چاہے تو ابھی مچھلی بھجوا دے۔ میں نے یہ فقرہ ابھی ختم ہی کیا تھا کہ یکدم پانی کی ایک لہر اُٹھی اور ایک بڑی سی مچھلی کود کر ہماری کشتی میں آگری۔ میں نے کہا دیکھ لیجیئے خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت نمائی کر دی۔ اور ہمارے دل میں جو خواہش پیدا ہوئی تھی۔ وہ اُس نے پوری کر دی۔ خواجہ خضر بے شک وفات پا چکے ہوں مگر ہمارا خدا جو ہمارا خالق اور مالک ہے اور سَمِیْعُ الدُّعَا ہے وہ تو زندہ ہے اور وہ ہمارے جذبات کو جانتا ہے اُس نے اِس خواہش کو دیکھا اور میری بات کو پورا کر دیا۔

اِسی طرح ایک دفعہ بڑی تپش کے بعد بارش آئی جس کمرہ میں میں رہتا تھا۔ اُس کی کھڑکی میں نے کھولی اور بارش کا نظارہ دیکھنے لگا۔ چونکہ بڑی دیر کے بعد بارش آئی تھی۔ اِس لئے مجھے اس بارش کا بڑا مزہ آیا۔ مگر اُس روز مجھے پیچش کی شکایت تھی۔ میں ابھی بارش کا نظارہ دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے اجابت محسوس ہوئی جب میں جانے لگا تو بیساختہ میرے مُنہ سے نکلا کہ خُدایا! تو ایسا فضل فرما کہ خواہ درمیانی عرصہ میں یہ بارش بند ہو جائے جب میں واپس آؤں تو پھر بارش شروع ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جونہی میں گیا۔ بارش بند ہو گئی۔ اور جب میں کمرہ میں واپس آیا اور میں نے دوبارہ کھڑکی کھولی تو یکدم بارش شروع ہو گئی جو آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ تک جاری رہی۔ اب دیکھو بارش میرے اختیار میں نہیں تھی مگر خدا تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ اِدھر میں کمرہ میں پہنچا اور اُدھر بارش شروع ہو گئی۔ اِسی طرح حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک جماعت نے بڑے اصرار سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ جب میں واپس آ رہا تھا تو چلتے چلتے کسی آئندہ خرچ کے خیال سے میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک روپیہ کم تھا۔ اُسوقت میں نے اللہ تعالےٰ سے دُعا کی۔ کہ اللہ میاں مجھے ایک روپیہ بھیجیں۔ ابھی میرے دل سے یہ دُعا نکل ہی رہی تھی کہ قریب کے گاؤں سے ایک آدمی ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ جماعت کے دوست جلدی سے حفاظت کے لئے میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ میں نے کہا کیا ہُوا۔ کہنے لگے یہ ہمارے سلسلہ کا شدید دشمن ہے اور احمدیوں پر اکثر حملے کرتا رہتا ہے ہم آپ کے گرد اِس لئے کھڑے ہو گئے ہیں کہ وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ جب ہم اُس گاؤں کے قریب پہنچے تو وہ دوڑتا ہُوا آیا اور میرے ساتھیوں کو دھکا دیکر آگے بڑھا اور پھر اُس نے ادب کے ساتھ میری طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک روپیہ میرے ہاتھ پر رکھ کر چلا گیا۔ میں نے کہا۔ آپ لوگ تو کہتے تھے کہ یہ مارنے آیا ہے اور اُس نے تو ایک روپیہ نذرانہ کے طور پر دے دیا ہے پھر میں نے انہیں بتایا کہ ابھی میرے دل میں خیال آیا تھا

کہ خدا مجھے ایک روپیہ بھیجے۔ سو خدا نے اس شخص کو بھیجدیا اور اُس نے مجھے ایک روپیہ نذرانہ کے طور پر دے دیا۔ غرض انسان کو اگر خدا تعالیٰ پر کامل یقین ہو تو وہ اُسکے لئے بڑے بڑے نشانات ظاہر کر دیتا ہے۔

حدیثوں میں آتا ہے کہ سابقہ اُمتوں میں سے ایک اُمت کے تین آدمی ایک دفعہ ایک طوفان میں پھنس گئے اور وہ اُس طوفان سے پناہ لینے کے لئے ایک پہاڑ کی غار میں چھُپ گئے۔ اتفاقاً زور کی جو آندھی آئی تو پتھر کی ایک بڑی بھاری سِل لڑھک کر اُس غار کے مُنہ کے آگے آگئی اور نکلنے کا راستہ بند ہو گیا۔ وہ ایک چھوٹی مصیبت سے بچنے کے لئے پہاڑ کی غار میں گئے تھے مگر اُس سے بڑی مصیبت میں پھنس گئے۔ اُس جنگل میں جب کہ وہ ایک پہاڑ کی غار میں محبوس تھے کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو انہیں اس مصیبت سے نجات دلاتا وہ سخت گھبرائے اور جب انہیں اپنی نجات کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو ایک شخص کو دُعا کی تحریک ہوئی اور اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آؤ ہم نے اپنی عمر میں جو سب سے زیادہ نیکی کا کام کیا ہے اُس کا واسطہ دے کر خدا تعالیٰ سے کہیں کہ وہ اس پتھر کو ہٹا دے۔ تب اُن میں سے ایک نے کہا کہ اے خدا! تجھے معلوم ہے کہ ایک مزدور میرے پاس آیا۔ اُس نے میری مزدوری کی اور پھر پیشتر اِس کے کہ وہ مجھ سے اُجرت لیتا چلا گیا۔ میں نے اُس کی اُجرت کے پیسوں سے تجارت شروع کی اور اُس میں سے نفع اٹھاتے ہوئے ایک بکری خرید ی۔ اُس بکری سے اور بکریاں پیدا ہوئیں۔ یہاں تک کہ سینکڑوں بکریوں اور بھیڑوں کا گلہ میرے پاس ہو گیا۔ وہ کئی سال کے بعد میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ میری اٹھنّی رہتی ہے وہ مجھے دی جائے۔ میں اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اور سینکڑوں بکریوں اور بھیڑوں کا گلّہ اُسے دکھا کر کہا یہ تیری امانت ہے اسے لے جا۔ وہ کہنے لگا مجھ سے کیوں مذاق کرتے ہو۔ میری صرف اٹھنّی رہتی تھی وہ مجھے دیدو۔ میں نے اُسے کہا۔ اُس اٹھنّی سے ہی میں نے تجارت شروع کی تھی اور اب اِس قدر بھیڑیں اور بکریاں ہو گئی ہیں۔ وہ کہنے لگا۔ پھر تو یہ میری نہ ہوئیں۔ تمہاری ہوئیں۔ میں نے اُسے کہا۔ نہیں میں نے اپنے لئے نہیں بلکہ تمہارے لئے تجارت کی تھی۔ تب وہ نہایت ہی حیران ہوا۔ مگر میرے مجبور کرنے پر وہ بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں کو ہانک کر اپنے گھر لے گیا اے خدا اگر میں نے یہ کام تیری رضا اور خوشنودی کے لئے کیا تھا تو تُو مجھ پر رحم فرما اور یہ پتھر راستہ سے ہٹا دے۔ اِس دُعا کے نتیجہ میں زور سے آندھی کا ایک طوفان اُٹھا اور وہ پتھر ذرا سا لڑھک گیا۔ مگر ابھی اُن کے نکلنے کا راستہ نہ بنا۔ تب دوسرے نے کہا اے خدا تُو جانتا ہے کہ مجھے ایک لڑکی سے جو میری رشتہ دار تھی بڑی محبت تھی مگر وہ کسی طرح میرے قابو نہیں آتی تھی۔ ایک دفعہ ملک میں شدید قحط پڑا۔ اور وہ اور اُس کے رشتہ دار بھوکے مرنے لگے۔ آخر مجبور ہو کر وہ لڑکی میرے پاس مدد کے لئے آئی۔ میں نے اسے کہا کہ میں تمہاری مدد کے لئے تو تیار ہوں مگر پہلے تم میرے ساتھ ہمبستری کرو۔ وہ مجبوراً اس کام کے لئے رضامند ہو گئی جب میں اُس کے قریب گیا۔ تو اس لڑکی نے کہا۔ میں تمہیں خدا کا واسطہ دیکر کہتی ہوں کہ تُو مجھے گناہ میں مبتلا مت کر۔ یہ سُنتے ہی میں الگ ہو گیا۔ اور میں نے کہا۔ اب تُو نے ایک بڑی ذات کا مجھے واسطہ دیا ہے میں اُسی کی رضا کے لئے اس کام کو ترک کرتا ہوں چنانچہ وہ لڑکی اُٹھی اور اپنے گھر چلی گئی اور میں نے روپیہ بھی اُسے دے دیا۔ اے خدا! اگر میں نے یہ کام محض تیری رضا اور خوشنودی کے لئے کیا تھا تو تو اس پتھر کو ہمارے

راستہ سے ہٹا دے۔ تب پھر زور سے ایک طوفان اُٹھا اور پتھر تھوڑا سا اور سرک گیا۔ مگر راستہ پھر بھی نہ بنا کیونکہ چٹان بہت بڑی تھی اور ابھی وہ اتنی نہیں ڈھلکی تھی کہ اُن کے نکلنے کا راستہ بن جاتا۔ تب تیسرا شخص خدا تعالیٰ کے حضور جھکا۔ اور اُس نے کہا۔ اے خدا مجھے معلوم ہے کہ مَیں بکریاں چرایا کرتا ہوں اور دودھ پر میرا گذارہ ہے۔ ایک دن مجھے بکریاں چراتے چراتے دیر ہو گئی اور مَیں جلدی گھر نہ پہنچ سکا۔ میرے ماں باپ بہت بوڑھے تھے اور بچے چھوٹے چھوٹے۔ جب میں گھر پہنچا تو میرے ماں باپ سو چکے تھے اور بیوی بچے جاگ رہے تھے اور بھوک کی وجہ سے میرا انتظار کر رہے تھے جب میں پہنچا تو انہوں نے کہا لاؤ ہمیں دودھ پلاؤ۔ تاکہ ہم دودھ پی کر سو جائیں مگر مَیں نے کہا جب تک میرے ماں باپ دودھ نہ پی لیں کسی اَور کو دودھ نہیں دے سکتا۔ چنانچہ مَیں نے دودھ کا پیالہ بھرا اور اپنے والدین کی پائینتی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میری بیوی زاری کرتی رہی اور میرے بچے چیختے رہے مگر مَیں نے اُن کی چیخ و پکار کی کوئی پروا نہ کی اور دودھ کا پیالہ اپنے ہاتھ میں لئے برابر کھڑا رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اُسوقت میرے والدین اُٹھے تو مَیں نے انہیں دودھ پلایا اور پھر اپنی بیوی اور بچوں کو دودھ پلایا۔ اے خدا! اگر میرا یہ کام محض تیری رضاء اور خوشنودی کے لئے تھا اور دُنیا کی کوئی غرض اُس میں نہ تھی تو تو مجھ پر رحم فرما اور اِس پتھر کو راستہ سے ہٹا دے۔ تب پھر زور کا طوفان اُٹھا اور پتھر لڑھک کر نیچے گر گیا۔ اور وہ تینوں شخص غار سے باہر نکل آئے

(ریاض الصالحین ابواب الاخلاص والنیّۃ)

غرض دُعا ایک بہت بڑا ہتھیار ہے۔ جو ہر مصیبت میں انسان کے کام آتا۔ اور اُسے ہر قسم کی مشکلات سے رہائی عطا کرتا ہے۔ اتنے بڑے ہتھیار کے ہوتے ہوئے بڑا ہی نادان وہ شخص ہے جو مصیبت کے آنے پر کسی اَور کی طرف بھاگے اور اُس سے مدد مانگے۔ سچا مومن وہی ہے جو اپنی ہر ضرورت خدا تعالیٰ سے مانگے یہاں تک کہ اُسے اگر اپنی جوتی کے تسمہ کی بھی ضرورت ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مانگے اور اِس امر پر کامل یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ اُس کی ہر ضرورت کو پورا کرنے پر قادر ہے۔ اور وہ اُسے اپنے دروازے سے کبھی خائب و خاسر واپس نہیں لوٹائیگا۔ جب مومن کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ سب دنیا کو بھول جاتا اور صرف اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا حقیقی کارساز سمجھتا ہے۔

مَیں نے پہلے بھی کئی دفعہ بیان کیا ہے کہ ہماری جماعت کے ایک دوست مولوی امام الدین صاحب جو گولیکی ضلع گجرات کے رہنے والے اور قاضی اکمل صاحب کے والد تھے۔ اور اَب فوت ہو چکے ہیں وہ ایک صوفی منش آدمی تھے۔ اور مجھے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ وہ روحانی مقام احمدیت میں ہمیں نصیب نہیں ہو سکا جس کے متعلق ہم بہت کچھ سُنا کرتے تھے۔ مَیں نے ایک دفعہ اُن سے پُوچھا کہ وہ کیا مقام تھا جس کا آپ ذکر سُنا کرتے تھے کہنے لگے ہمارے پیر صاحب کہا کرتے تھے کہ جو شخص ہماری صحبت میں چند دن رہے اُسے ہم عرش پر سجدہ کرا سکتے ہیں۔ اور وہ خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے مَیں احمدیت کو اپنی پہلی حالت سے بالا تو تسلیم کرتا ہوں۔ مگر وہ نظارہ مجھے احمدیت میں نظر نہیں آتا۔ مَیں نے اُن کو ایک لطیفہ سُنایا کہ حضرت خلیفۃ اول رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک صوفی طرز کے پیر نے جب سُنا کہ مَیں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت کر لی ہے تو اُس نے اپنے ایک مرید کے ذریعہ مجھے کہلا بھیجا کہ مرزا صاحب کو مان کر اور اُن کی بیعت کر کے کیا حاصل ہو سکتا ہے اگر

آپ میری بیعت کریں تو مجھے اتنا کمال حاصل ہے کہ مَیں آپ کا پہلا سجدہ ہی عرش پر کروا دوں۔ جب اس کے مُرید نے مجھے صوفی کا یہ پیغام سُنایا تو مَیں نے کہلا بھیجا کہ مجھے عرش پر سجدہ کرنے سے جوتیاں نہ پڑیں گی۔ خدا تعالیٰ کہیگا۔ مَیں نے زمین پر سجدہ کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ اور تو آسمان پر سجدہ کرنے آ گیا ہے۔ اس پر مولوی امام الدین صاحب مرحوم کہنے لگے۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر اس سے میری تسلّی نہیں ہوئی۔ غرض وہ جب بھی مجھ سے ملتے اِسی قسم کی بات کرتے۔ اور مَیں کسی نہ کسی رنگ میں اُنکو جواب دیا کرتا۔ مگر اُن کے دل کی خلش دُور نہ ہوتی۔ آخر ایک دن مَیں نے اُن سے کہا۔ مولوی صاحب! کبھی آپ نے سوچا ہے کہ جس شخص کو خدا تعالیٰ نظر آ جائے اور اُسے اِتنے کمالات حاصل ہو جائیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے عرش پر سجدہ کرنے لگ جائے تو ایسے آدمی کی کیا حالت ہوتی ہے۔ ایسے آدمی کا کفیل خود خدا تعالیٰ ہو جاتا ہے اور اُسے بندوں کی کوئی احتیاج نہیں رہتی بلکہ وہ جو کچھ مانگتا ہے خدا تعالیٰ ہی سے مانگتا ہے۔ اور چاہے بندے اُس کی مدد کریں لیکن اُسکی حالت يَنْصُرُكَ رِجَالٌ نُّوْحِىْٓ اِلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ کی سی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ اُس کی مدد کرتے ہیں وہ خود محتاج ہوتے ہیں اِسی بات کے کہ اس کی مدد کریں۔ وہ اِس بات کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی اُس کی مدد کرے۔ ایسے شخص کو کچھ دینے والا سمجھ رہا ہوتا ہے کہ مَیں اس کی مدد کر رہا ہوں۔ مگر لینے والا سمجھ رہا ہوتا ہے کہ مَیں اس سے لیکر اس پر احسان کر رہا ہوں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دینے والا زید ہو یا بکر اُسے خدا تعالیٰ نے ہی میری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ مَیں کسی زید یا بکر کا ہرگز محتاج نہیں۔ ایسے شخص کو چاہے کسی ذریعہ کوئی چیز پہنچے وہ سمجھتا یہی ہے کہ یہ خدا نے مجھے بھیجی ہے اب آپ بتائیں کہ کیا آپ کے پیر صاحب کو بھی یہ مقام حاصل تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہو؟ جب مَیں نے اُن سے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئے اور کہنے لگے مَیں اب سمجھ گیا ہوں۔ ہمارے پیر صاحب جو کہتے تھے کہ ہم یوں نظارے دکھاتے ہیں اور عرش پر سجدہ کرا دیتے ہیں۔ جب کبھی فصل وغیرہ کا موقعہ آتا تو زمینداروں کے پاس جاتے اور اُن سے کہتے کہ ہمارا بھی خیال رکھنا۔ اب مَیں اِس بات کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ اگر فی الواقعہ اُن کا خدا تعالیٰ کے ساتھ سچّا تعلق ہوتا تو کسی بندے سے کیوں کہتے کہ میرا بھی خیال رکھنا۔ غرض خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ لینے والے کے سامنے صرف خدا تعالیٰ کی ہی ذات رہتی ہے اور وہ اُسی سے اپنی ہر ضرورت طلب کرتا اور اُسی کو حقیقی کارساز سمجھتا ہے۔ مگر جہاں ایک مومن کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے ہمیشہ دُعائیں مانگتا رہے وہاں اُس کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ لالچ اور حرص کے جذبات سے کُلّیۃً بالا رہے اور کبھی خدا تعالیٰ کا شکوہ اپنی زبان پر نہ لائے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کو اِس بارہ میں نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (سورۃ طٰہٰ آیت ۱۳۲)

یعنی تم اپنی گردن لمبی کر کر کے یہ نہ دیکھا کرو کہ فلاں کو جو کچھ ملا ہے وہ مجھے کیوں نہیں ملا۔ تمہیں کیا پتہ کہ اُس چیز کا ملنا تمہارے لئے فائدہ بخش تھا یا نہیں۔ اگر وہی کچھ تمہیں مل جاتا تو ممکن تھا تم تکلیف میں پڑ جاتے۔ بے شک اگر کسی کے پاس دس ارب روپیہ بھی موجود ہو تو وہ یہ دُعا کر سکتا ہے کہ خدایا میں تیرے مزید فضلوں کا محتاج ہوں لیکن اگر کسی کے پاس صرف دس روپے ہوں۔ اور وہ

ہر وقت کُڑھتا رہے اور ایک بے چینی اور اضطراب اُس میں پایا جائے اور وہ کہے کہ فلاں کے پاس تو سو روپیہ ہے۔ اور میرے پاس صرف دس روپے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کا شکوہ کرتا پھرے تو یہ درست نہیں ہوگا۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ کے فضلوں اور اُس کے انعاموں کو طلب کرو مگر ہمیشہ یہ عادت ڈالو کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں جس مقام پر رکھا ہے اُس مقام کے متعلق تمہارے دل میں کبھی خفگی پیدا نہ ہو۔ اور تم یہ نہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں گرایا ہوا ہے اور تمہارا غیر تم سے اچھا ہے۔

مثنوی رومی والوں نے ایک حکایت لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ایک سپیرا تھا جس نے ایک ایسا سانپ پکڑا جو کسی اور سپیرے کے پاس نہیں تھا۔ وہ سانپ اُس نے نہایت سنبھال کر رکھا ہُوا تھا۔ اُس کے دوست آشنا آتے تو وہ بڑے شوق سے وہ سانپ اُنکو دکھاتا۔ ایک دن جو وہ صبح کو اُٹھا تو اُس نے دیکھا کہ گھڑے میں سے سانپ نکل گیا ہے۔ اتفاقاً اُس کا ڈھکنا کھلا رہ گیا۔ اور سانپ نکل گیا۔ اب اُسے بڑی گھبراہٹ ہوئی۔ اور اُس نے خدا تعالیٰ کے حضور رونا اور چلّانا شروع کر دیا کہ خدایا میرا سانپ مجھے مِل جائے۔ خدایا میرا سانپ مجھے مِل جائے گھنٹہ دو گھنٹہ دُعا کرنے کے بعد وہ گھڑے کا مُنہ کھول کر دیکھتا کہ سانپ اُس میں واپس آگیا ہے یا نہیں۔ مگر سانپ کہاں آتا۔ وہ پھر دُعا میں مشغول ہو جاتا۔ اسی طرح وہ سارا دن اور ساری رات دُعا کرتا رہا۔ جب صبح ہوئی تو ایک شخص آیا اور اُس نے اُسے آکر کہا کہ فلاں گھر میں چلیئے۔ وہاں ایک نئی قسم کے سانپ نے ایک شخص کو کاٹا ہے اور وہ مرگیا ہے۔ سب سپیرے وہاں جمع ہیں سانپ پکڑا ہُوا ہے اور آپ کو بھی بلایا گیا ہے تاکہ آپ اُس سانپ کو دیکھ لیں۔ جب وہ گیا اور اُس نے سانپ دیکھا تو وہ وہی تھا جو اُس کے گھر سے بھاگا تھا۔ اور جس کے لئے چوبیس گھنٹے سے دُعائیں کر رہا تھا معلوم ہوتا ہے اُس کے اندر کوئی نیکی تھی جو اللہ تعالیٰ کو پسند آگئی۔ سانپ اُس کے گھر سے بھاگا اور دوسرے گھر میں چلا گیا۔ دوسرا شخص یہ سمجھکر کہ یہ نئی قسم کا سانپ ہے اُسے پکڑنے لگا تو سانپ نے اُسے ڈسا اور وہ مرگیا۔ جب اُس نے یہ نظارہ دیکھا تو وہ پھر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر گیا اور کہنے لگا۔ خدایا! میں تو سمجھتا تھا کہ تُو نے میری دُعا نہیں سُنی۔ مگر درحقیقت تُو نے میری دُعا سُن لی تھی۔ اور اس کا نہ ملنا ہی میرے لئے مفید اور با برکت تھا۔[۵] تو ہزاروں دفعہ انسان ایسی خواہشیں کرتا ہے جو مضر ہوتی ہیں اولادیں ہی بعض دفعہ ایسی گندی نکلتی ہیں کہ وہ انسان کے لئے بدنامی کا باعث بن جاتی ہیں اور اُن کو دیکھ دیکھ کر روتا ہے۔ آخر اتنا تو سوچو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کی جب شادی ہوئی ہوگی تو وہ بھی دُعا کرتے ہونگے کہ اللہ میاں! ہمیں اپنے فضل سے بیٹا دے۔ مگر ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ بھی ایک غریب گھرانے کی تھیں اور آپ کے والد بھی کوئی مالدار آدمی نہیں تھے اُن کی شادی بہت معمولی سرمایہ سے ہوئی ہوگی اور صرف چند آدمی ہونگے جو اس شادی میں شریک ہوئے ہونگے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ابوجہل کے باپ کی جب شادی ہوئی ہوگی تو کس دھوم دھڑکے سے ہوئی ہوگی۔ اور کسطرح سات سات آٹھ آٹھ دن تک اونٹ ذبح کر کر کے مکّہ والوں کی ضیافتیں کی گئی ہونگی۔ لیکن اِس دھوم دھڑکے کی شادی سے ابوجہل پیدا ہُوا۔ اور اِس چُپ چپاتے کی شادی سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ بظاہر ابوجہل کے باپ کی شادی پر دُنیا کہتی ہوگی کہ کیا برکت والا گھر ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۵] مثنوی مولانا رومؒ دفتر دوم۔

کے باپ کی شادی پر دُنیا کو رحم آتا ہوگا۔ اور لوگ کہتے ہونگے کہ کیسا غریب گھرانہ ہے۔ مگر اُس وقت کسی کے واہمہ اور گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ جسے یہ "برکت والا گھر" سمجھا جاتا ہے وہ عرب کو تباہ کرکے رکھ دیگا اور وہ جسے قابلِ رحم سمجھا جاتا ہے اُن کی شادی کے نتیجہ میں وہ وجود پیدا ہونے والا ہے جو نہ صرف عرب کو تباہی سے بچانے والا ہوگا بلکہ وہ ساری دنیا کے لئے رحمت اور برکت کا موجب ہوگا۔

غرض کوئی انسان نہیں جانتا کہ وہ جو کچھ اپنے لئے مانگ رہا ہے وہ اُس کے لئے مفید بھی ہوگا یا نہیں۔ اِس بات کا علم صرف خدا تعالیٰ کو ہی ہوتا ہے۔ اور جب انسان اِس قدر محدود علم رکھنے والا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے کسی سلوک کو یا اُس کی کسی عطا کردہ نعمت کو بُرا کیوں سمجھے۔ بیشک وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح یہ بھی کہے کہ الٰہی تیری طرف سے جو بھی خیر نازل ہو۔ اُس کا مَیں محتاج ہوں[۱]۔ اگر وہ دس کروڑ دے تو تم کہو الٰہی مَیں دس ارب کا محتاج ہوں۔ لیکن یہ نہ کہو کہ مجھ پر کتنی سختی ہوئی ہے۔ کتنا ظلم ہُوا ہے کتنی تکلیف میں مَیں مبتلا ہوں۔ کیونکہ اِس طرح خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری ہوتی ہے جو جائز نہیں۔

تیسری صفت جس کی طرف ان مقطعات میں توجہ دلائی گئی ہے وہ مجید کی صفت ہے۔ مجید کے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ بڑی بزرگی اور شان رکھنے والا ہے قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کی اِس صفت کی طرف ان الفاظ میں بھی اشارہ فرمایا ہے کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن ع ۲) یعنی تمہارا خدا وہ ہے جو ہر وقت ایک نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے اور ہمیشہ اپنے ایسے نشانات ظاہر کرتا ہے جن سے اُس کی اعلیٰ و ارفع شان دنیا پر ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیکھی ہوئی چیز کو دوبارہ دیکھنا انسان کو کوئی خاص لطف نہیں دیتا۔ انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے جدّت کا مادہ رکھا ہُوا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ نئے نئے جلوے اُس کے سامنے ظاہر ہوں۔ جب ریل گاڑی جاری ہوئی تو شروع شروع میں لوگ اسے عجوبہ سمجھتے ہوئے اُس پر پھولوں کے ہار ڈالتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اُن کا جوش ختم ہوگیا۔ پھر ہوائی جہاز اور دوسری سواریاں نکلیں تو اُن کی طرف متوجہ ہوگئے۔ غرض فطرت انسانی کو ہمیشہ نئی چیزوں سے لطف آتا ہے اور وہ نئی نئی چیزوں سے تسلّی پاتی ہے۔ کیونکہ جب وہ کوئی نئی چیز دیکھتا ہے تو ایک نئی اُمید اُس کے اندر پیدا ہوجاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ شاید کوئی نیا جلوہ مجھے نظر آنے لگا ہے۔ اِسی فطرت کے تقاضا کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسم بدلتے ہیں اور نئے نئے پھل پیدا ہوتے ہیں اور انسان بھی کبھی اپنے لباس میں تغیّر کرتا ہے کبھی مکان میں اور کبھی نئے نئے کھانے تیار کرتا ہے۔ کیونکہ نئی چیز سے انسانی فطرت تسکین پاتی اور ایک لطیف حظ محسوس کرتی ہے۔ اِسی فطری تقاضا کے مطابق مجھے قرآن پڑھ کر بھی بڑا مزہ آتا ہے۔ لیکن جب کبھی رات کو خدا تعالیٰ میرے کان میں کوئی بات کہتا ہے تو کچھ نہ پوچھو کہ اُس کا کیا مزہ ہوتا ہے کیونکہ وہ ایک نئی چیز ہوتی ہے۔ جو دل کو لذّت اور سرور سے بھر دیتی ہے۔ غرض اسلام بتاتا ہے کہ تمہارا خدا مجید ہے اور وہ ہمیشہ اپنی ایسی قدرتیں ظاہر کرتا ہے جن سے اُس کی اعلیٰ شان اور مجد کا اظہار ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیکھ لو۔ کسریٰ نے یہودیوں کی انگیخت پر گورنر یمن کو آرڈر بھجوایا کہ عرب میں جو ایک نیا مدعیٔ نبوت پیدا ہُوا ہے

[۱] سورۂ قصص آیت ۲۵

اُسے گرفتار کر کے میرے پاس بھجوا دیا جائے۔ گورنرِ یمن نے آپؐ کی گرفتاری کے لئے اپنے سپاہی بھجوا دیئے اور انہیں کہا کہ میری طرف سے انہیں پیغام دے دیا جائے کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ آپ کا کیا قصور ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ آ جائیں۔ ورنہ ممکن ہے کسریٰ کی فوجیں عرب پر دھاوا بول دیں۔ اور سارا ملک ایک مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ جب وہ پیغامبر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ تو آپؐ نے فرمایا ٹھہرو۔ مَیں تمہیں پھر جواب دونگا۔ چنانچہ وہ دو دن ٹھہرے اور پھر حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ایک دن اَور ٹھہر جاؤ۔ تیسرے دن جب وہ آپ سے ملے تو آپؐ نے فرمایا۔ جاؤ اپنے گورنر سے کہدو کہ آج رات میرے خدا نے تمہارے خداوند کو مار ڈالا ہے۔ وہ سخت حیران ہوئے کہ آپؐ نے یہ کیا بات کہی ہے۔ اور انہوں نے پھر آپ کے ساتھ چلنے کی درخواست کی۔ مگر آپ نے فرمایا۔ مَیں نے تمہیں جواب دے دیا ہے۔ جاؤ اور اپنے گورنر سے یہ بات کہہ دو۔ چنانچہ انہوں نے واپس جا کر گورنر سے یہی بات کہہ دی۔ گورنرِ یمن نے یہ بات سُنی تو وہ کہنے لگا کہ یا تو یہ شخص پاگل ہے اور یا پھر خدا کا سچا نبی ہے۔ ہم چند دن انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کی یہ بات سچی ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد یمن کی بندرگاہ پر ایک جہاز لنگر انداز ہوا اور اُس میں سے ایک سفیر اُترا۔ جو گورنرِ یمن کے نام ایک سربمہر لفافہ لایا۔ گورنرِ یمن نے لفافہ دیکھا۔ تو اُس پر ایک نئے بادشاہ کی مُہر تھی۔ اُس نے وہ مُہر دیکھتے ہی اپنے درباریوں سے کہا کہ عرب کے نبی کی بات سچ معلوم ہوتی ہے۔ پھر اُس نے خط کھولا تو وہ کسریٰ کے بیٹے شیرویہ کا تھا اور اُس کا مضمون یہ تھا۔ کہ ہمارا باپ سخت ظالم تھا اور اُس نے تمام ملک میں تباہی مچا رکھی تھی۔ مَیں نے اُسے فلاں رات قتل کر دیا ہے اور اَب مَیں اُس کی جگہ تختِ حکومت پر بیٹھا ہوں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنی مملکت کے تمام لوگوں سے میری اطاعت کا اقرار لو۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ اُس نے جو سفاکیاں کی تھیں اُن میں سے ایک یہ بھی سفاکی تھی کہ اُس نے عرب کے ایک مدعیٔ نبوت کے متعلق لکھا تھا کہ اُسے گرفتار کر کے میرے پاس بھجوا دیا جائے ہم اس حکم کو بھی منسوخ کرتے ہیں۔ (طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵۸۳ و صفحہ ۱۵۸۴) اب دیکھو۔ کسریٰ نے چاہا کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے آپکو سزا دے اور اِس طرح دنیا میں آپ کو ذلیل کرے مگر مجید خدا نے آپ کی بزرگی اور عظمت کو اَور بھی دوبالا کر دیا اور کسریٰ کو اُس کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل کروادیا۔

اِسی طرح حضرت نظام الدین صاحب اولیاءؒ جو دِلّی کے ایک بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں۔ اُن کے زمانہ کا بھی ایک بادشاہ غیاث الدین تغلق اُنکا مخالف ہو گیا۔ وہ اُس وقت بنگال کی طرف کسی جنگ پر جا رہا تھا۔ اُس نے کہا کہ جب مَیں واپس آؤنگا تو انہیں سزا دونگا۔ اُن کے مریدوں نے یہ بات سُنی تو وہ بڑے گھبرائے اور انہوں نے شاہ صاحب سے آکر کہا کہ حضور جو لوگ شاہی دربار میں رسوخ رکھتے ہیں اگر اُن کے ذریعہ بادشاہ کے پاس سفارش ہو جائے تو بہتر ہوگا آپ نے فرمایا۔ ہنوز دِلّی دُور است۔ ابھی تو اُس نے لڑائی کے لئے جانا ہے اور پھر دشمن سے جنگ کرنی ہے ابھی سے کسی فکر کی کیا ضرورت ہے۔ اِس وقت تو وہ دِلّی میں موجود ہے اور لڑائی کے لئے گیا بھی نہیں۔ پھر آٹھ دس دن اَور گذر گئے۔ تو مرید پھر گھبرائے ہوئے آپ کے پاس آئے۔ اور کہا۔ حضور اَب تو آٹھ دس دن گذر چکے ہیں اور بادشاہ لڑائی کے لئے جا چکا ہے۔ اَب تو کوئی علاج سوچنا چاہیئے۔ مگر آپنے پھر یہی جواب دیا

کہ ہنوز دِلّی دُور است۔ آخر جس جنگ پر وہ گیا تھا اُس کے متعلق خبر آگئی کہ اُس میں بادشاہ کو فتح حاصل ہوگئی ہے اور وہ واپس آ رہا ہے۔ مُرید پھر گھبرائے ہوئے آپ کے پاس پہنچے اور بادشاہ کی واپسی کی خبر دی۔ مگر آپ نے پھر یہی جواب دیا کہ ہنوز دِلّی دُور است۔ ابھی تو وہ دو چار سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ ابھی کسی فکر کی کیا ضرورت ہے۔ جب وہ آٹھ دس منزل کے فاصلہ پر پہنچ گیا تو وہ پھر آئے اور انہوں نے کہا کہ اب تو وہ بہت قریب آگیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہنوز دِلّی دُور است۔ جب وہ اور زیادہ قریب آگیا اور دو تین منزل تک پہنچ گیا تو پھر آپکے مرید سخت گھبراہٹ کی حالت میں آپکے پاس پہنچے مگر آپنے پھر یہی جواب دیا کہ ہنوز دِلّی دُور است۔ آخر ایک دن پتہ لگا کہ بادشاہ کی فوجیں فصیل کے باہر ٹھہر گئی ہیں۔ اُن کے مُرید یہ خبر سُنکر پھر آپکے پاس آئے اور کہا۔ حضور اب تو وہ دِلی کی فصیلوں تک آپہنچا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہنوز دِلّی دُور است ابھی تو وہ فصیل کے باہر ہے۔ اندر تو داخل نہیں ہوُا کہ ہمیں گھبراہٹ ہو۔ اُسی رات ولی عہد نے فتح کی خوشی میں ایک بہت بڑی دعوت کی اور شاہانہ جشن منایا ہزاروں لوگ اس دعوت اور رقص و سرود کی محفل میں شریک ہوئے ولی عہد نے اس دعوت کا انتظام ایک بہت بڑے محل کی چھت پر کیا تھا چونکہ چھت پر بہت زیادہ لوگ اکٹھے ہوگئے تھے اسلئے اچانک چھت نیچے آگری۔ اور بادشاہ اور اُس کے رفقاء سب دب کر ہلاک ہو گئے۔ صبح جب بادشاہ کی موت کی خبر آئی۔ تو انہوں نے کہا۔ کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ ہنوز دِلّی دُور است [1]

غرض ہمارا خدا بڑی بزرگ شان رکھنے والا ہے اور جو بھی اس کے ساتھ سچا تعلق پیدا کرتا ہے وہ اپنی اپنی روحانیت اور درجہ کے مطابق بزرگی حاصل کر لیتا ہے۔ اور جس طرح خدا تعالیٰ کی شان اور عظمت پر حملہ کرنے والا سزا پاتا ہے اِسی طرح وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے مقربین پر حملہ کرتے ہیں وہ بھی اپنے کئے کی سزا پائے بغیر نہیں رہتے۔

دُنیا میں ہزارہا انبیاء گذرے ہیں جن میں سے اکثر کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں۔ اُن کے جسم ہزاروں من مٹی کے نیچے مدفون ہیں اور اُن کی اپنی قائم کردہ جماعتیں بھی دنیا میں موجود نہیں۔ مگر چونکہ وہ ایک خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے اس لئے خدا نے انہیں ایسی بزرگی عطا فرمائی کہ آج بھی اگر اُن کی کوئی ہتک کرتا ہے تو خدا آسمان سے اُنکی مدد کے لئے دوڑا چلا آتا ہے اور اُن کی عزت اور شہرت پر لگایا جانے والا ہر داغ مٹا کر رکھ دیتا ہے۔

غرض طٰسٓمٓ میں اللہ تعالیٰ کی تین صفات لطیف۔ سمیع اور مجید کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس سورۃ میں خدا تعالےٰ کے عالم اسرار ہونے اُس کے محسنِ عظیم ہونے اور اُسکے سمیع الدُّعا ہونے اور اُس کے صاحب عظمت و جبروت ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اِن صفات کو واقعات کے رنگ میں ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں پہلی بات ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ یہ آیات ایک ایسی کتاب کی ہیں جو ہر ایک حقیقت کو خوب کھول کر بیان کرنے والی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کتاب کو نازل کرنے والا خدا انسان کی تمام ضروریات کو جانتا اور اُسکی فطرت کے مخفی اسرار تک سے آگاہ ہے۔

---

[1] "مشاہیر اسلام" شائع کردہ ادارہ صوفی ص ۱۵/۱۶ و تذکرۃ الاولیاء حصہ دوم مصنفہ رئیس احمد جعفری ص ۳۴۲

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مبین کا لفظ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے[1] نور کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے[2] فضل کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے[3] حق کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے[4]۔ اسی طرح اور کئی چیزوں کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے۔ مگر کسی الہامی صحیفہ کے متعلق سوائے قرآن کریم کے مبین کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے متعلق صرف ایک دفعہ یہ مضمون بیان ہوا ہے مگر وہاں مستبین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے نہ کہ مبین کا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اٰتَیۡنٰہُمَا الۡکِتٰبَ الۡمُسۡتَبِیۡنَ (الصّٰفّٰت ع۴) ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں کو ایک کامل کتاب دی جس میں تمام احکام بیان کئے گئے تھے۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم دونوں مضمونوں میں فرق کرتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اس کی نسبت بارہ دفعہ استعمال ہوا ہے۔ دس دفعہ کتاب کے ساتھ اور دو دفعہ قرآن کے لفظ کے ساتھ۔ پس ایک جگہ مستبین اور دوسری جگہ مبین کا لفظ استعمال کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک جگہ وضاحت اور دوسری جگہ وضاحت اور ایضاح کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ اِستبان کے معنے واضح ہو جانے کے ہیں اور اَبَانَ کے معنے واضح ہونے کے بھی ہیں اور واضح کر دینے کے بھی ہیں۔ پس قرآن کریم کے متعلق مبین کا لفظ استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ قرآن کریم کو دوسری کتب پر یہ ایک زائد فضیلت حاصل ہے۔ کہ وہ نہ صرف خود اپنے مطالب کے لحاظ سے واضح ہے اور ایسی صداقتیں بیان کرتا ہے جو ایک ثابت شدہ حقیقت ہوتی ہیں بلکہ وہ موضح بھی ہے یعنی وہ دوسری الہامی کتب کی صداقتوں کو بھی واضح کرتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی فضیلت قرآن کریم کو حاصل ہے جس میں اُس کے ساتھ اور کوئی کتاب شریک نہیں باقی جس قدر الہامی کتب ہیں اُن کا صرف اسقدر کام تھا کہ وہ اپنے مطالب کو واضح کر دیتیں اور اپنے مدعا کو ظاہر کر دیتیں۔ کیونکہ وہ صرف ایک ایک قوم کی ہدایت کے لئے نازل ہوتی تھیں انکو اِس سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ باقی کُتب جھوٹی ثابت ہوتی ہیں یا سچی۔ باقی انبیاء جھوٹے ثابت ہوتے ہیں یا سچے۔ باقی قومیں خدا تعالیٰ کے نور کی وارث ثابت ہوتی ہیں یا محروم ثابت ہوتی ہیں۔ وہ صرف اپنے ذکر کو لے بیٹھی تھیں یا اپنے حلقہ اور دائرہ تک محدود رہتی تھیں لیکن قرآن کریم چونکہ سب اقوام کو ایک نقطۂ مرکزی پر جمع کرنے کے لئے آیا ہے وہ نہ صرف بنی نوع انسان سے تعلق رکھنے والے تمام احکام کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اُن کے ہر گوشہ کو بے نقاب کرتا ہے بلکہ وہ پہلی کتابوں کی حقیقت کو بھی ظاہر کرتا ہے اور پہلے نبیوں پر عائد شدہ الزاموں کو دُور کرتا ہے اور پہلی کتب کی کوتاہیوں کو دلائل کے ذریعہ اعتراضات سے پاک کرتا ہے۔ مثلاً انسانی فطرت کے ارتقاء کی طرف اشارہ کر کے یا لوگوں کی دست اندازی کی طرف اشارہ کر کے یا لوگوں کے استنباط کو غلط بتا کر۔ غرض وہ پہلے نبیوں پہلی کتب اور پہلی اقوام کی خوبیوں کو بھی واضح کرتا ہے اور اُن پر عائد ہونے والے اعتراضات کو بھی ردّ کرتا ہے اِس طرح وہ گویا مستبین کے مقام سے نکل کر مبین کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ اِس کی مثال کے طور پر دیکھ لو بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر کنعان کی طرف آئے تو بائیبل بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل کے بیس سال سے زائد عمر کے لڑنے کے قابل مردوں کی تعداد بارھویں

[1] زخرف آیت ۳۰ [2] دخان آیت ۱۴ [3] نساء آیت ۱۷۵
[4] نحل آیت ۱۷ [5] نور آیت ۲۶ -

قبیلہ کو چھوڑ کر جن کی گنتی نہیں کی گئی چھ لاکھ تین ہزار پانچ سو پچاس تھی[1]۔ اگر بارھویں قبیلہ کا بھی اندازہ کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فوجی خدمات سرانجام دینے کے قابل مرد ساڑھے چھ لاکھ تھے۔ اگر عورتوں بچوں اور بوڑھوں کی تعداد معلوم کرنے کیلئے ہم اس تعداد کو دس گنا کریں کیونکہ عام طور پر چھ سے دس فیصدی تک ملک کی آبادی جنگی خدمت کے قابل سمجھی جاتی ہے تو یہ تعداد ساٹھ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر عقل اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ ہوں۔ کیونکہ اوّل تو اتنے آدمی مصر سے اتنے قلیل عرصہ میں نکل ہی نہیں سکتے تھے جتنے قلیل عرصہ میں وہ نکلے دوسرے یردن پار کی بستی جس میں وہ آکر بسے ہیں اس قدر آبادی کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اب بھی فلسطین کی آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ حالانکہ اب یہودیوں نے امریکہ کی مدد سے اسے آباد کیا ہے۔ پس اس ملک میں جو پہلے سے آباد تھا۔ ساٹھ لاکھ آدمیوں کا آکر بس جانا بالکل خلاف عقل بات ہے۔ پس بائیبل بنی اسرائیل کی جو تعداد بتاتی ہے وہ عقلی لحاظ سے کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں سمجھی جا سکتی مگر قرآن کریم نے آکر بتایا کہ یہ بات غلط ہے۔ وہ لوگ صرف چند ہزار تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ۔ (بقرہ آیت ۲۴۴) یعنی کیا تجھے اُن لوگوں کا حال معلوم نہیں جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے نکلے جبکہ وہ چند ہزار تھے۔ پس بائیبل نے تو یہ بتایا کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نکلے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے اِس غلطی کی اصلاح کی اور بتایا کہ وہ لاکھوں نہیں بلکہ ہزاروں تھے۔

اِسی طرح حضرت سلیمانؑ خدا تعالیٰ کے ایک مقدس نبی تھے مگر بائیبل نے اُن پر شرک کا الزام لگا دیا اور کہا کہ

"جب سلیمانؑ بڈھا ہو گیا تو اُس کی بیویوں نے اُس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اُس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا" (۱۔ سلاطین باب ۱۱ آیت ۴ و ۵)

پھر لکھا ہے:۔

"خداوند سلیمان سے ناراض ہوا کیونکہ اُس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے پھر گیا تھا۔"

پھر یہ شرک سلیمانؑ نے ایسی حالت میں کیا جبکہ خدا تعالیٰ نے "دوبار دکھائی دے کر اُس کو اِس بات کا حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے۔ پر اُس نے وہ بات نہ مانی جس کا حکم خداوند نے دیا تھا۔"

(۱۔ سلاطین باب ۱۱ آیت ۹ و ۱۰)

گویا سلیمانؑ نعوذ باللہ اتنا خطرناک کافر تھا کہ دو دفعہ خدا اُس پر ظاہر ہوا اور دو دفعہ اُس نے ظاہر ہو کر کہا کہ دیکھنا غیر معبودوں کی پرستش نہ کرنا۔ مگر پھر بھی وہ اپنی بیویوں کے حسن کو دیکھ کر ایسا فریفتہ ہوا کہ اس نے غیر معبودوں کے لئے مندر بنائے اور اُن کے آگے سجدہ کرنے لگ گیا مگر قرآن کریم نے آکر بتایا کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (بقرہ آیت ۱۰۳) سلیمان نے کفر کی کوئی بات نہیں کی بلکہ اُس پر الزام لگانے والے اور اُسے کافر اور مشرک قرار دینے والے خود کافر اور بے ایمان تھے چنانچہ تاریخی شہادتیں بھی یہی بتاتی ہیں کہ جو قرآن نے بات کہی ہے وہی ٹھیک ہے اور بائیبل کی بات غلط ہے۔

چنانچہ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا میں لکھا ہے:۔

"یہ بات تو صحیح ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی بہت سی بیویاں تھیں۔ کچھ اسرائیلی اور کچھ غیر اسرائیلی۔ لیکن نہ تو انہوں نے ان سب

[1] گنتی باب ۲ آیت ۳۲

کے لئے قربان گاہیں بنائی تھیں اور نہ انہوں
نے اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی عبادت کو کبھی
خدا تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ملایا تھا۔ آپ
خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے انکار کا کبھی تصوّر
بھی نہیں کر سکتے تھے۔"

گویا تاریخ نے تسلیم کر لیا کہ بے شک حضرت سلیمان
علیہ السلام کی کئی بیویاں تھیں کچھ یہودی اور کچھ غیر یہودی
مگر یہ غلط ہے کہ انہوں نے بت خانے بنائے اور پھر یہ بھی
جھوٹ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی بُت کو سجدہ کیا ہو۔
اب دیکھو بائیبل تو کہتی ہے کہ انہوں نے بتوں کو سجدے
کئے اور قرآن کہتا ہے کہ نہیں کئے۔ اور آج کا یہودی محقق
اور آج کا عیسائی محقق بھی کہتا ہے کہ بائیبل جھوٹ
کہتی ہے۔ سچی بات وہی ہے جو قرآن کہہ رہا ہے۔

پھر بائیبل میں حضرت ہارون علیہ السلام کے متعلق
کہا گیا ہے کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو بچھڑا بنا کر دیا اور
انہیں شرک کی راہ پر چلایا۔ چنانچہ بائیبل میں لکھا ہے۔

" اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے
پہاڑ سے اُترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون
کے پاس جمع ہو کر اُس سے کہنے لگے کہ اُٹھ۔
ہمارے لئے دیوتا بنا دے۔ جو ہمارے آگے
آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ
کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا
ہارون نے اُن سے کہا۔ تمہاری بیویوں اور
لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے
کی بالیاں ہیں اُن کو اتار کر میرے پاس لے
آؤ۔ چنانچہ سب لوگ اُن کے کانوں سے
سونے کی بالیاں اُتار اُتار کر اُن کو ہارون
کے پاس لے آئے اور اُس نے اُن کو اُن کے
ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا
جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔ تب
وہ کہنے لگے اے اسرائیل! یہی تیرا وہ دیوتا ہے
جو تجھکو ملک مصر سے نکال کر لایا؟"
(خروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۴)

مگر قرآن نے آکر بتایا کہ یہ بالکل غلط بات ہے۔
حضرت ہارونؑ نے اپنی قوم کو شرک سے بڑی سختی کے
ساتھ رد کا تھا اور کہا تھا کہ يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم
بِهِ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَٰنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا
أَمْرِي (طٰهٰ آیت ۹۱) یعنی اے میری قوم! اس
بچھڑے کے ذریعہ تمہارا ایمان خراب کر دیا گیا ہے اور
تمہارا رب تو رحمن ہے اور یہ ایک ذلیل اور بے جان بچھڑا
ہے۔ پس تم میری فرمانبرداری کرو۔ اور میرے پیچھے چلو
سامری کے پیچھے نہ چلو جس نے تمہیں اس شرک کی طرف
مائل کیا ہے۔ غرض بائیبل نے خدا تعالیٰ کے ایک مقدس
نبی ہارونؑ کو داغدار قرار دیا۔ مگر قرآن کریم جو مبین
کے مقام پر ہے اُس نے آکر بتایا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے
خدا تعالیٰ کا فرستادہ ہارونؑ اپنی قوم کو ہمیشہ توحید کا
ہی وعظ کرتا رہا۔ یہ قوم کی بدبختی تھی کہ وہ سامری کے
پیچھے چل پڑی اور اُس نے ایک بچھڑے کی پرستش شروع
کر دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی یہودیوں اور عیسائیوں
نے بعض خطرناک قسم کے الزامات لگائے تھے جن کی
قرآن کریم نے بڑے زور سے تردید کی اور بتایا کہ وہ تمام
الزامات دشمنوں کا افترا ہیں۔ مثلاً یہود کہتے تھے کہ
آپ کی پیدائش نعوذ باللہ بدکاری کے نتیجہ میں ہوئی
تھی۔ یعنی یوسف کے نطفہ سے بغیر شادی کے آپ
پیدا ہوئے (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۵ صفحہ ۱۰۲
زیر لفظ CELSUS) اسی طرح بعض یہودی یہ الزام
لگاتے تھے کہ آپ نعوذ باللہ ایک رومی سپاہی پنتھیرا

کے بیٹے تھے جن کا حضرت مریم صدیقہ سے ناجائز تعلق تھا (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۷ صفحہ ۱۷۰ کالم اول) مگر قرآن کریم نے حضرت مریمؑ کو اس الزام سے پاک ٹھہرایا اور یہ اعلان فرمایا کہ وَالَّتِیْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَاۤ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (انبیاء آیت ۹۲) یعنی مریم صدیقہ نے جو حضرت مسیحؑ کی والدہ مطہرہ تھیں اپنے تمام سوراخوں کو گناہ سے محفوظ رکھا تھا۔ اور ان کو جو حمل ہوا وہ ناجائز نہیں تھا بلکہ ایک پاک روح تھی جو ان کے اندر ہم نے داخل کی اور ہم نے اس کو اور اس کے بیٹے عیسیٰؑ کو تمام دنیا کے لئے ایک نشان بنا دیا۔

اسی طرح عیسائی آپ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ نعوذ باللہ صلیب پر لٹک کر لعنتی موت مرے۔ چنانچہ عہد نامہ جدید میں پولوس کہتا ہے:۔

"مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اس نے
ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا
کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا
وہ لعنتی ہے۔" (گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳)

گویا عیسائیوں نے خدا تعالیٰ کے ایک مقرب کو اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ملعون قرار دے دیا۔ مگر قرآن کریم نے اس الزام کو بھی رد کیا اور خود حضرت مسیحؑ کی زبان سے ان الفاظ میں تردید کی کہ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا۔ (مریم آیت ۳۴) یعنی جو لوگ مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میری پیدائش حرامکاری کے نتیجہ میں تھی وہ غلط کہتے ہیں۔ کیونکہ میری پیدائش پر خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی نازل ہوئی تھی اور جو لوگ یہ کہیں گے کہ میں لعنتی موت مرا وہ بھی غلط کہیں گے۔ کیونکہ میری موت بھی خدا تعالیٰ کی حفاظت میں ہو گی اور لعنت کی موت سے میں بچایا جاؤں گا۔ اور جو لوگ یہ کہیں گے کہ میں دوسروں کے گناہ اٹھا کر تین دن جہنم میں پڑا رہا۔ وہ بھی غلط کہیں گے کیونکہ میری دوبارہ حیات بھی خدا تعالیٰ کی سلامتی سے شروع ہو گی۔

غرض قرآن کریم ان تمام اعتراضات کو رد کرتا ہے جو بائبل میں لوگوں کی دست اندازی کی وجہ سے شامل ہو چکے تھے۔ اور اپنے فرستادوں کو ایک بے عیب شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اسی قسم کے الزامات ہندوؤں نے بھی اپنے بعض رشیوں اور اوتاروں پر لگائے ہیں۔ مثلاً حضرت کرشن کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی والدہ نے انہیں کہا کہ

" بیٹا! نو لاکھ گائیں میرے یہاں دودھ
دینے والی ہیں جتنا دودھ مکھن چاہئے کھایا
اور لٹایا کرو۔ دوسروں کے گھر مکھن کھانے
اور چرانے مت جایا کرو۔"

(شریمد بھاگوت پران اسکندھ ۱۰ نمبر ۹)

گویا حضرت کرشن نعوذ باللہ مکھن چرا چرا کر کھایا کرتے تھے حالانکہ ان کے اپنے گھر میں نو لاکھ گائے تھی۔

اسی طرح لکھا ہے کہ وہ غیر عورتوں کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول رہا کرتے تھے اور ایک عورت کا خاص طور پر نام لیکر لکھا ہے کہ حضرت کرشن نے رات کے وقت اُسے جگا کر کہا کہ

"اے سندری! نیند کو چھوڑ کر مجھ کو شرنگار
دان (یعنی داد عیش) دے۔"

(برہم وی ورت پران کرشن جنم کھنڈ ۴ ادھیائے ۲۸)

مگر قرآن کریم نے حضرت کرشن اور اسی طرح اور کئی انبیاء کا جن کے نام تک صفحۂ تاریخ میں محفوظ نہیں اجمالی طور پر ذکر کر کے فرمایا کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (انعام ع ۱۰) یعنی یہ سارے کے سارے

وہ لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی یعنی یہ سب کے سب منعم علیہ گروہ میں شامل تھے اور خدا تعالیٰ کے فضلوں اور اُس کی تائیدات کے مورد تھے پس اب تمہارا کام یہی ہے کہ تم انہی لوگوں کے راستہ پر چلو اور اُنہی کی تقلید کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم تمام انبیاء کو معصوم قرار دیتا اور ہر الزام کو رد کرتا ہے جو اُن پر لگایا گیا۔ خواہ وہ الزام منافقوں کی طرف سے لگایا گیا ہو یا مخالفوں کی طرف سے۔ وہ اُن کے حسین چہرہ پر سے ہر قسم کی گرد و غبار کو دور کرتا اور اُن کی نورانیت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتا ہے اور یہ قرآن کریم کا اتنا بڑا احسان ہے کہ جس کی نظیر دُنیا کی اور کوئی کتاب پیش نہیں کر سکتی۔

پھر قرآن کریم نے اپنے مبیّن ہونے کے مقام کو اس طرح بھی ظاہر کیا کہ اُس نے دُنیا کے ہر نبی کی عزت کو قائم کیا اور اُن کی صداقت پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کے جس ملک کے حالات سے بھی واقفیت حاصل کی جائے اُس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ کسی نہ کسی بزرگ کے ماننے والے ہیں۔ مگر وہ ساری بزرگی صرف اپنے اپنے بزرگوں تک محدود سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ اگر حضرت کرشن اور حضرت رامچندر جی کو خدا تعالیٰ کا اوتار مانتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اِن کے سوا اور کسی ملک میں کوئی اوتار نہیں ہوا۔ اِسی طرح عیسائی اور یہودی وغیرہ بھی یہی کہتے ہیں کہ صرف ہمارے بزرگ سچے تھے باقی سب جھوٹے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے بتایا کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (سورۂ فاطر آیت ۲۵) دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں خدا تعالیٰ کا کوئی مصلح اور ہادی مبعوث نہ ہوا ہو۔ چنانچہ جب ہم مختلف اقوام پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کی سب اِس بات کی قائل ہیں کہ اُن میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نہ کوئی مصلح آیا تھا۔ ہم ہندوؤں پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں اُن میں حضرت کرشن اور حضرت رام چندر جی کا وجود دکھائی دیتا ہے۔ ہم عیسائیوں پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں اُن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود نظر آتا ہے۔ ہم یہودیوں پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے کئی انبیاء نظر آتے ہیں۔ غرض دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس میں کوئی نبی نہ آیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جیسے عرب کا خدا ہے ویسے ہی وہ ہندوستان اور چین اور شام اور مصر اور ایران وغیرہ کا بھی خدا ہے۔ اُس نے ساری دُنیا کے لئے سورج اور چاند اور ستارے سب ایک جیسے بنائے ہیں۔ ایک ہی زمین سب کے لئے بنائی ہے۔ پھر جب اُس نے سب لوگوں کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کیا ہے تو روحانی ضرورتوں کو وہ کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا جبکہ رُوح کی حفاظت جسم سے بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ جسم فانی ہے اور رُوح غیر فانی۔ چنانچہ ایک مسلمان جب اِس آیت کو پڑھتا ہے تو اُس کے دل میں تصدیق کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہندوؤں کے پاس جاتا ہے اور ڈرتے ڈرتے اُن سے پوچھتا ہے کہ آپ کی قوم میں بھی کوئی نبی آیا تھا۔ وہ کہتے ہیں ہاں حضرت کرشن اور حضرت رام چندر جی اللہ تعالیٰ کا کلام لے کر آئے تھے وہ اپنے وقت کے اوتار تھے۔ یہ سُن کر اُس کا چہرہ بشاشت سے کھل جاتا ہے اور وہ کہتا ہے الحمد للہ! یہ بات سچی ثابت ہوگئی کہ ہر قوم میں نبی آئے ہیں۔ پھر وہ چین میں جاتا ہے۔ اور وہاں کے لوگوں سے پُوچھتا ہے کہ آپ کی قوم میں بھی کوئی نبی آیا ہے تو وہ کنفیوشس کا نام لیتے ہیں۔ اِس پر اُس کا دل اور بھی زیادہ مسرور ہو جاتا ہے کہ الحمد للہ چین میں بھی اللہ تعالیٰ کا نبی آیا ہے۔ پھر وہ ایران میں جاتا ہے اور وہاں کے لوگوں سے پوچھتا ہے کہ آپ کے پاس بھی کوئی نبی آیا ہے تو وہ حضرت زرتشت

کا نام لیتے ہیں۔ یہ سُنکر وہ خوشی سے اپنے جامہ میں پھولا نہیں سماتا۔ اور کہتا ہے کہ اب تو یہ بات اَور بھی پختہ ہوگئی۔ پھر وہ یونان میں جاتا ہے اور وہاں کے لوگوں سے دریافت کرتا ہے کہ تمہارے پاس بھی کوئی اللہ کا پیغام لے کر آیا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں۔ ہاں ہمارے ملک میں سقراط اس بات کا دعویدار تھا کہ اللہ تعالےٰ اُس سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اِسپر وہ اور زیادہ مسرور ہوتا ہے اور کہتا ہے الحمد للہ میرا قرآن یہاں بھی سچا ثابت ہوُا۔ غرض وہ جس ملک میں بھی جاتا ہے اُس کی گردن فخر سے اونچی ہو جاتی ہے۔ اور اُس کا دل اِس لذّت اور سرور سے بھر جاتا ہے کہ میری کتاب میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ حرف بحرف درست ثابت ہوُا۔ لیکن ایک عیسائی ایک ہندو اور ایک یہودی جس ملک میں بھی جاتا ہے۔ اس کا مُنہ غم سے کالا ہو جاتا ہے۔ وہ مڈل ایسٹ میں جاتا ہے اور سُنتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے نبی ہیں تو اُس کا دل جل جاتا ہے۔ برما میں جاتا ہے اور سُنتا ہے کہ بدھا نبی ہے تو وہ جلنے لگ جاتا ہے۔ ہندوستان میں سُنتا ہے کہ کرشن نبی ہے تو اُس پر جنون سوار ہو جاتا ہے۔ یونان میں جاتا ہے اور اُسے پتہ لگتا ہے کہ اس ملک میں سقراط گذرا ہے تو وہ چیخیں مارنے لگ جاتا ہے۔ غرض وہ جس ملک میں بھی جاتا ہے اُس پر مصیبت آجاتی ہے۔ مگر ایک مسلمان جس ملک میں بھی جاتا ہے اُسے خوشی پر خوشی نصیب ہوتی ہے اور ہر ملک میں یہ تعلیم اُس کی سربلندی اور سُرخروئی کا موجب ہوتی ہے۔ غرض یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے۔ لیکن اس چھوٹی سی آیت کو ہی لے کر ساری دنیا میں پھر جاؤ۔ کسی بزرگ کی بڑائی سُنکر تمہارے دل میں انقباض پیدا نہیں ہوگا اور تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن کریم نے یہ تعلیم پیش کرکے باقی تمام الہامی کُتب پر اپنی فضیلت کو ثابت کر دیا ہے۔

پھر خود انسانی وجود جو اللہ تعالیٰ کی وحی کا مہبط اور اُسکے انوار و برکات کا مورد تھا اُس کے متعلق بھی بعض مذاہب نے یہ غلط نظریہ پیش کیا کہ وہ طبعًا میلان گناہ رکھتا ہے۔ اور اُس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی وہ نافرمانی ہے جو آدم اور حوّا نے کی اور جس کی بنا پر وہ فطرتی طور پر گنہگار پیدا ہوُا۔ اِسی طرح بعض دوسرے مذاہب نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ انسان اپنی تمام کوششوں کے باوجود کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ اور اُس کی رُوح کو بار بار مختلف قسم کی جُونوں کے چکّر میں ڈالا جاتا ہے۔ اوّل الذکر نظریہ ہمیں عیسائیت کی طرف سے اور ثانی الذکر ہندو مذہب کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اور دونوں نے انسانی فطرت کو گندہ اور ناپاک قرار دیا۔ اور اس کا اتنا پروپیگنڈا کیا گیا کہ وہ انسان جو اس لئے پیدا کیا گیا تھا کہ اُسے اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل ہو اور اپنے اندر اعلیٰ اخلاق اور روحانیت پیدا کرکے اللہ تعالےٰ کے کلام اور اُسکے الہام کا مورد ہو اُس کا دل مایوسی کا شکار ہو گیا اور اُس نے سمجھا کہ جب میرے لئے ترقی کے تمام راستے بند ہیں اور جب مجھے فطری طور پر گندہ اور ناپاک ٹھہرایا گیا ہے تو پاکیزگی اور تقدس کا تصوّر میرے لئے ناممکن ہے۔ کیونکہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ جو بات متواتر اُس کے کان میں ڈالی جائے آہستہ آہستہ وہ اُس پر اثر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اگر کسی کو متواتر کہا جائے کہ تم بہت ہی بیوقوف اور جاہل ہو تو وہ رفتہ رفتہ اپنی عقل کو کھو بیٹھتا ہے۔ اگر کسی کو کہا جائے کہ وہ چور کا بیٹا ہے تو آہستہ آہستہ یہ خیال اُس کے دل پر ایسا راسخ ہو جائیگا کہ جب کبھی اُس کے دل میں لالچ پیدا ہوگا اور کسی کا مال ہتیانے کا ارادہ کرے گا تو وہ اپنے ارادہ کو روک نہیں سکیگا۔

بلکہ کہیگا کہ دنیا تو پہلے ہی مجھے چور کا بیٹا کہہ رہی ہے اور یہی جذبات نسلاً میرے اندر پائے جاتے ہیں۔ اَب مَیں ان کاموں سے کس طرح رُک سکتا ہوں۔ اِسی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اِس قسم کے امور کو سختی سے ناپسند فرمایا اور انہیں قومی ہلاکت اور بربادی کا اصل باعث قرار دیا ہے۔ کیونکہ انسانی ذہنیت اِس قسم کی ہے کہ جب اُس پر کوئی اثر ڈالا جائے اور اُس کے خیالات کسی خاص طرف مائل کئے جائیں تو آہستہ آہستہ وہ اُن اثرات کو قبول کر لیتا ہے۔ سائیکالوجی یا علم النفس کی ابتداء درحقیقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کے ذریعہ ہی ہوئی ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِذَا قَالَ الرَّجُلُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ۔[1] یعنی جب کوئی شخص یہ کہتا پھرتا ہے کہ قوم برباد ہوگئی قوم برباد ہوگئی تو درحقیقت اُس کی بربادی کا موجب وہی بنتا ہے۔ کیونکہ جب متواتر کسی قوم کے کان میں یہ ڈالا جائیگا کہ وہ ہلاک ہو چکی ہے تو لوگوں میں قوتِ مقاومت باقی نہیں رہے گی۔ اور اُس کا تنزل شروع ہو جائیگا۔ عیسائیت نے دنیا کو یہ تعلیم دی کہ آدمؑ نے گناہ کیا جو ورثہ میں اُس کی اولاد کو بھی ملا۔ اب دنیا اگر گناہ سے بچنا بھی چاہے تو نہیں بچ سکتی۔ اس عقیدے کے ہوتے ہوئے ایک عیسائی کیلئے یہ کتنا مشکل ہے کہ وہ گناہ کا خیال آنے پر اُس کا مقابلہ کرے وہ تو کہیگا کہ مَیں گناہ کا کیا مقابلہ کروں۔ مَیں تو اس سے بچ ہی نہیں سکتا اور جب وہ گناہ کا مقابلہ کرنے سے گریز کریگا تو لازماً گناہ میں مبتلا ہو جائیگا۔ مگر قرآن کریم نے بتایا کہ انسان کو فطرتِ صحیحہ عطا کی گئی ہے۔ اور خواہ وہ کیسی ہی حالت میں ہو اگر وہ کوشش کرے تو وہ ترقی کرکے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورہ ذاریات آیت ۵۷) یعنی مَیں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اِس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ مَیں نے آدمؑ کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ وہ میری عبادت کرے بلکہ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ چاہے فرمانبرداری کی طبیعت رکھنے والے انسان ہوں چاہے ناری فطرت رکھنے والے وجود ہوں دونوں کو مَیں نے عبادت اور اپنے قرب کیلئے پیدا کیا ہے۔ اِنْس ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اپنے اندر فرمانبرداری اور اطاعت کا مادہ رکھتے ہیں۔ اور جِنّ اُن لوگوں کو کہتے ہیں جن پر پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے یعنی جن کی فطرتِ صحیحہ پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ سے دُور ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جِنّی طبیعت والے نار سے پیدا کئے گئے ہیں۔ گویا ناری طبیعت والا انسان جو گناہ کی طرف مائل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُسے بھی مَیں نے عبادت کے لئے پیدا کیا ہے کیونکہ اُس کی ناری طبیعت طبیعتِ ثانیہ ہوتی ہے طبیعتِ اولیٰ نہیں ہوتی۔ درحقیقت طبیعتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک طبیعتِ اولیٰ جو فطرت میں رکھ دی گئی ہے اور ایک طبیعتِ ثانیہ جو ماحول کے اثرات کے ماتحت پیدا ہوتی ہے اور طبیعت اولیٰ پر غالب آ جاتی ہے۔ اِسی لئے اِس قسم کی طبیعت رکھنے والے کو جِنّ کہتے ہیں۔ جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اُس کی اصل فطرت پر پردہ پڑا ہوا ہے اور جب ہم اُسے جِنّ کہتے ہیں تو ہمارے مدّنظر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اُس کی فطرتِ اولیٰ نظر نہیں آتی۔ اور چونکہ اُس کی

[1] مسلم جلد ۲ کتاب البر والصلۃ والآداب باب النہی عن قول هَلَكَ النَّاسُ۔

فطرتِ اولیٰ نظر نہیں آتی اِس لئے وہ جنّ کہلاتا ہے۔ پس فرماتا ہے۔ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ سے محجوب ہوتے ہیں اور جنات میں شامل ہوتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی طبیعت میں نیکی رکھتے ہیں دونوں کو ہم نے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ جب لوگ ایک لمبے عرصہ تک نیکی کو قائم رکھتے اور اللہ تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت اپنی زندگیاں بسر کرتے ہیں تو وہ انس کہلاتے ہیں اور جب وہ نبی کی تعلیم سے غافل ہو جاتے ہیں تو وہ جنّ ہو جاتے ہیں کیونکہ اُن کی فطرتِ صحیحہ ایسی مخفی ہو جاتی ہے کہ وہ بھول جاتے ہیں اس بات کو کہ ہماری جماعت کا قیام کیوں ہُوا تھا۔ اور ہمارے نظام کی غرض کیا تھی یا نبی نے ہمیں کیا تعلیم دی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خواہ جنّات ہوں یا انسان یعنی خواہ ایسے لوگ ہوں جن کے دلوں میں محبتِ الٰہی کی چنگاری سُلگ رہی ہو اور خواہ ایسے لوگ ہوں جن کی فطرتِ صحیحہ پر پردہ پڑا ہُوا ہو فطرتِ ثانیہ غالب آچکی ہو اور سمجھا جاتا ہو کہ اُن کی طبیعتِ ثانیہ ہی اصل فطرت ہے دونوں کو ہم نے عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص کو ہم کیا سمجھائیں اُس میں تو نیکی کا مادہ ہے ہی نہیں۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا متعصب ہے وہ ہدایت پا ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تم ایسا مت کہو۔ اُس کی طبیعتِ اولیٰ نیکی کی طرف مائل ہے۔ یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم اُس کی طبیعتِ ثانیہ کو دیکھتے ہو اور ایک نتیجہ اخذ کر لیتے ہو۔ ہم نے تو سب کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اگر کسی کی فطرتِ صحیحہ پر پردہ پڑا ہُوا ہے تو یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص نیل کے مٹکے میں پڑ سے تو وہ نیلا ہو جاتا ہے مگر اِس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ آدمی نہیں رہا۔ یا بعض لوگ ریچھ کی کھال پہن لیتے ہیں اور دیکھنے والے ڈرنے اور بھاگنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ انسان ہوتے ہیں۔ اِسی طرح بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنکی فطرتیں ماحول کی خرابی کی وجہ سے مسخ ہو جاتی ہیں اور اُنکی ظاہری شکل جنّات والی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگ بھی جو غیر مرئی جنّات کے قائل ہیں اور ہم پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ یہ لوگ جنّوں کے قائل نہیں وہ بھی بعض دفعہ ایسے انسانوں کو جن کی فطرت پر پردہ پڑ چکا ہوتا ہے جنّ کہنے لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ شخص جس کے اخلاق بگڑے ہوئے ہوں اُسے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں یہ بھیڑیا ہے جس سے اُن کا یہ مطلب نہیں ہوتا۔ کہ وہ حقیقی معنوں میں بھیڑیا ہے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ اُس پر بھیڑیے والی خصلت غالب آگئی ہے۔ اِسی طرح کسی کے متعلق کہتے ہیں یہ تو سانپ ہے یعنی سانپ کی طرح لوگوں کو ڈستا پھرتا ہے۔ یا بچھو ہے یعنی بچھو کی طرح لوگوں کو ڈنگ مارتا ہے۔ تو بعض دفعہ فطرتِ ثانیہ فطرتِ اولیٰ پر غالب آجاتی ہے کہ یہ پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اِس شخص کی انسانیت کہاں ہے۔ لیکن جب اُس کی فطرتِ صحیحہ بول اُٹھتی ہے تب پتہ لگتا ہے کہ اِس کے اندر نیکی پائی جاتی ہے۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے کتنے شدید دشمن تھے۔ مگر پھر اُن میں کیسی تبدیلی پیدا ہوئی۔ نہ صرف اُنکی اِصلاح ہوئی بلکہ وہ روحانیت کے ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے کہ اُنکا پہچاننا بھی مشکل ہو گیا۔ حضرت عمرؓ جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لٹھ لئے پھرتے تھے جب انہیں اسلام لانا نصیب ہُوا تو اُن میں ایسی تبدیلی پیدا ہوئی کہ دُنیا کے فائدہ کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے لگے۔ اور دن رات اسلام کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ یہی حال عکرمہؓ کا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکّہ فتح کیا۔ تو عکرمہؓ اُس بُغض کی وجہ سے جو اُسے رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تھا مکہ چھوڑ کر چلا گیا اور اُس نے کہا۔ مَیں اس ملک میں بھی نہیں رہ سکتا جس میں ایسا شخص موجود ہو۔ اُس کے مظالم کی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اُسے معافی نہیں دی جا سکتی وہ جہاں مل جائے اُسے قتل کر دیا جائے۔ آخر اُس کی بیوی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ اور اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ! آپ بڑے رحیم و کریم ہیں۔ آپ نے کتنے ہی لوگوں کو معاف کر دیا ہے اگر عکرمہؓ کو بھی آپ معاف فرما دیں تو اس میں آپکا کیا حرج ہے۔ پھر اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ! کیا یہ بہتر ہے کہ عکرمہؓ کسی غیر ملک میں ذلیل ہو کر رہے یا یہ بہتر ہے کہ وہ آپ کے ملک میں آپ کی رعایا بن کر رہے اور آپ کا عفو اُس کے سر کو نیچا رکھے۔ آپ کو اُسکی یہ بات پسند آئی۔ اور آپؐ نے فرمایا۔ ہم نے عکرمہؓ کو معاف کر دیا۔ یہ سُنکر اُس کی بیوی اُسی وقت اُٹھی اور اپنے خاوند کی تلاش میں چل پڑی۔ وہ اُس وقت حبشہ جانے کے لئے کشتی میں بیٹھ چکا تھا۔ اُس کی بیوی اُس کے پاس گئی اور اُس نے کہا۔ تم کہاں جا رہے ہو۔ واپس میرے ساتھ چلو۔ مَیں نے تمہارے متعلق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی تھی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں معاف فرما دیا ہے۔ عکرمہؓ یہ سُنکر حیران ہوا۔ اور اُس نے کہا۔ مجھے کس طرح معافی مل سکتی ہے مَیں نے تو بڑے بڑے سخت مظالم کئے ہوئے ہیں۔ اُس نے کہا۔ تمہیں اُن کے وسعتِ حوصلہ کا کیا علم؟ مَیں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ مَیں تمہارے لئے معافی کی منظوری لے چکی ہوں۔ تم واپس میرے ساتھ چلو۔ عکرمہؓ کشتی سے اُترے اور واپس آ گئے۔ واپسی پر وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میری بیوی میرے پاس آئی تھی اور اُس نے کہا تھا کہ مَیں نے تمہارے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی لے لی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاں! بالکل سچ ہے ہم نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں سچے دل سے معاف کر دیا ہے تو اُس نے عرض کیا کہ کیا مَیں کافر ہونے کی حالت میں مکہ میں رہ سکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں تم رہ سکتے ہو۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے اور اُسکے باپ ابوجہل کے متواتر اور شدید ترین مظالم کے باوجود اُسے معاف فرما دیا اور معافی بھی اس رنگ میں دی کہ خواہ وہ اسلام نہ لائے اُسے مکہ میں آزادانہ رنگ میں رہنے کی اجازت ہوگی تو اُس کی طبیعت پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ! مَیں آپ پر ایمان لاتا ہوں کیونکہ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی معافی سوائے خدا کے راستباز انسان کے اَور کوئی نہیں دے سکتا۔ پھر یا تو اُس کے دل میں اتنا بغض تھا کہ وہ اس ملک میں بھی رہنا نہیں چاہتا تھا جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور یا پھر اُس کے دل میں اتنا تغیر پیدا ہؤا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عکرمہؓ ہم نے تمہیں معاف ہی نہیں کیا بلکہ ہم تمہیں انعام بھی دینا چاہتے ہیں مانگو جو کچھ مانگنا چاہتے ہو۔ تو وہ عکرمہؓ جو اتنا دُنیادار تھا اُس کے اندر فوراً ہی اتنی تبدیلی پیدا ہوگئی کہ اُس نے کہا کہ یا رسول اللہ! مَیں سوائے اِس کے اَور کچھ نہیں مانگتا کہ آپ میرے لئے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میرے پچھلے تمام گناہ معاف فرما دے۔ اب کُجا یہ کہ وہ مکہ سے بھاگ جاتا ہے اور کُجا یہ کہ مسلمان ہوتا ہے اور یکدم اُس میں ایسی تبدیلی پیدا ہوتی ہے کہ وہ سب مخالفانہ خیالات کو بھول جاتا ہے۔ پھر یہی عکرمہؓ تھا کہ یا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان لینے کے لئے

لڑائیاں کیا کرتا تھا اور پھر اسلام میں اُس کی فدائیت
یہاں تک پہنچ گئی کہ غزوۂ یرموک میں جب بہت سے
صحابہؓ مارے گئے تو عکرمہؓ اور چند اَور نوجوانوں نے مِلکر
حضرت ابوعبیدہؓ سے جو کمانڈر انچیف تھے کہا کہ ہم سے
صحابہؓ کی موت نہیں دیکھی جا سکتی۔ اگر یہ لوگ مارے گئے
تو اسلام کی اشاعت کون کرے گا۔ آپ ہمیں اجازت دیں
کہ ہم چند نوجوان اپنی جانوں کو قربان کرکے عیسائی کمانڈر
پر حملہ کرکے اُسے مار دیں اور لڑائی ختم ہو جائے۔ ابوعبیدہؓ
نے کہا کہ یہ تو بڑا مشکل ہے۔ دس لاکھ لشکر کے مقابلہ
میں میں تمہیں کس طرح بھیج سکتا ہوں۔ اِس میں تو تمہاری
یقینی ہلاکت ہے۔ مگر آخر دوسرے لوگوں نے کہا کہ جب
یہ لوگ قربانی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں قربانی کی اجازت
دے دیں۔ اور چونکہ اس جنگ میں بہت سے صحابہؓ
مارے جا چکے تھے ابوعبیدہؓ نے آخر اجازت دیدی۔ چنانچہ
عکرمہؓ اور چند دوسرے نوجوانوں نے مِلکر قلب لشکر پر
حملہ کیا اور وہاں تک پہنچ گئے جہاں اُن کا کمانڈر
ماہان تھا۔ وہ اسقدر گھبرایا کہ تخت سے اُتر کر بھاگ
پڑا۔ اور اُس کے بھاگتے ہی فوج میں بھاگڑ مچ گئی اور
لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ مگر اِس جدوجہد میں وہ قریباً
سب کے سب شہید ہو گئے۔ اِسی جنگ کا واقعہ ہے
کہ عکرمہؓ زخموں کی شدت اور پیاس کی وجہ سے تڑپ رہے
تھے کہ اُن کے پاس سے ایک سپاہی گذرا جس کے پاس
پانی کی ایک چھاگل تھی۔ اُس نے جب انہیں تڑپتے دیکھا
تو وہ قریب آیا۔ اور اُس نے پوچھا۔ کیا آپ کو پیاس
لگی ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ اُس نے اپنی چھاگل اُن کے
مُنہ کے قریب کی تاکہ آپ پانی پی لیں۔ مگر ابھی عکرمہؓ نے
چھاگل کو مُنہ نہیں لگایا تھا کہ اُن کی نظر فضل بن عباسؓ
پر پڑی جو اُن کے قریب ہی پیاس سے تڑپ رہے تھے
انہوں نے کہا۔ فضل مجھ سے زیادہ پیاسا معلوم ہوتا ہے
تم اُسے پانی پلاؤ۔ وہ فضل کے پاس پہنچا تو انہوں نے
اپنے قریب ایک اَور مسلمان کو تڑپتے دیکھا انہوں نے کہا
وہ مجھ سے زیادہ پیاسا معلوم ہوتا ہے تم پہلے اُسے
پانی پلاؤ۔ وہ تیسرے کے پاس پہنچا تو اُس نے چوتھے کی
طرف اشارہ کر دیا۔ اور چوتھے کے پاس پہنچا تو اُس
نے پانچویں کی طرف اشارہ کر دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ
وہ سات آدمی تھے اور ساتوں ہی تڑپ رہے تھے مگر
ہر ایک نے یہی کہا کہ مجھے پانی نہ پلاؤ بلکہ میرے ساتھی
کو پلاؤ۔ جب وہ آخری آدمی کے پاس پہنچا تو وہ مر چکا
تھا۔ اور جب وہ واپس مڑا تو اُس نے دیکھا کہ باقی چھ
بھی فوت ہو چکے تھے۔ اب دیکھو یہ کتنی بڑی قربانی ہے
جو عکرمہؓ نے کی۔ حالانکہ وہ اسلام کے شدید ترین دشمن
تھے۔ پس یہ کہہ دینا کہ فلاں کو ہدایت نصیب نہیں ہو
سکتی بہت بڑی غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب ہدایت دینا
چاہتا ہے تو آناً فاناً دے دیتا ہے۔ یہی مضمون اللہ تعالیٰ
نے اِس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ
وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات آیت ۵۷) اللہ تعالیٰ
نے ہر ایک کو ہدایت اور اپنے قرب کے لئے پیدا کیا ہے
پس بڑا ہی نادان وہ انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کی اس حکمت
کی ناقدری کرے اور سمجھے کہ انسان تو پیدائشی طور پر
گنہگار پیدا کیا گیا ہے اِس لئے وہ پاکیزگی اور تقدس
اختیار ہی نہیں کر سکتا۔

اسلام بتاتا ہے کہ یہ نظریہ قطعی طور پر غلط ہے
انسان فطرتی طور پر پاکیزہ قوٰی لے کر آیا ہے۔ اور
اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو اپنے قرب کے لئے پیدا کیا ہے
اِسی طرح وہ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے۔ وَ
نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۝
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔
(الشمس آیت ۸ تا ۱۱) یعنی ہم انسانی نفس کو اس امر پر شہادت

کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ اُسے ہم نے سب عیوب سے منزّہ
پیدا کیا ہے اور اُس کی فطرت میں نیکی اور بدی کی شناخت
کی قوّت رکھی ہے۔ چنانچہ جو شخص اپنی رُوح کو بیرونی ملونیوں
سے پاک رکھتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور جو شخص
اُس جبلّی پاکیزگی کو خراب کر دیتا ہے وہ ناکام ہو جاتا ہے۔
غرض اسلام انسان کو اُس مایوسی کا شکار نہیں
ہونے دیتا جس کا شکار اُسے دوسرے مذاہب بناتے
ہیں بلکہ وہ اُس کی رُوح میں بلند پروازی کی طاقت
پیدا کرتا اور اُسے فرش سے اُٹھا کر عرش تک لے جاتا ہے

پھر قرآن کریم اس لحاظ سے بھی کتابِ مبین ہے کہ
اُس نے ہزاروں ایسی صداقتیں بیان فرمائی ہیں جن کا پہلی
الہامی کتب میں کہیں ذکر تک نہیں۔ مثلاً قرآن کریم جو موسیٰؑ
اور فرعون کے قریباً بائیس سو سال کے بعد نازل ہوا ہے
اُس میں یہ لکھا ہے کہ فرعونیوں کے سمندر میں غرق ہونے
کے وقت فرعون تو بے شک ڈوب گیا تھا۔ مگر اُس کی
لاش محفوظ کر لی گئی تھی۔ تاکہ وہ آئندہ آنے والے لوگوں
کے لئے عبرت اور نصیحت کا باعث بنے (یونس آیت ۹۳)
چنانچہ اَب جو پُرانی ممیاں نکلی ہیں تو اُن میں فرعونِ موسیٰؑ
کی ممی بھی نکلی ہے۔ جو مصر کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے
جسے مَیں نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اَب دیکھو
یہ قرآن کریم کے کتابِ مبین ہونے پر کتنی زبردست شہادت
ہے۔ کہ بائیبل جو اُس زمانہ کی کتاب ہے جس زمانہ میں
فرعون ڈوبا تھا۔ اُس میں تو کہیں یہ ذکر نہیں کہ فرعون کی
لاش محفوظ کر لی گئی تھی مگر قرآن کریم نے بائیس سو سال
بعد نازل ہو کر اس سچائی کو بیان کر دیا اور پھر اِس
سچائی کے بیان کرنے کے چودہ سو سال بعد زمین میں سے
فرعونِ موسیٰؑ کی ممی نکل آئی۔ اور اِس طرح ثابت ہو گیا
کہ قرآن حقیقتاً اُس خدائے بلند و برتر کا کلام ہے جو تمام
اسرار کو جاننے والا اور تمام غیبوں سے آگاہ ہے۔

پھر قرآن کریم اِس لحاظ سے بھی کتابِ مبین ہے
کہ وہ اپنے دعاوی کے ثبوت کے لئے بیرونی دلائل کا محتاج
نہیں بلکہ وہ خود ہی اپنے دعاوی کے دلائل بھی مہیّا کرتا
ہے برخلاف دوسری الہامی کتابوں کے کہ وہ دعویٰ تو
کرتی ہیں مگر اُن کے دلائل نہیں دیتیں۔ چنانچہ تورات کو
شروع سے لے کر آخر تک پڑھ جاؤ۔ انجیل کو پڑھ جاؤ۔
وید کو پڑھ جاؤ۔ بس یہ معلوم ہوگا کہ فرض کر لیا گیا ہے
کہ اللہ تعالیٰ کو سب دنیا مانتی ہے اور اُس کی ذات میں
شک کی گنجائش نہیں۔ اُس کی صفات کے متعلق اتنی
قلیل روشنی ڈالی گئی ہے کہ انسانی نفس اُس سے قطعاً
تسلّی نہیں پا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ بیان ہُوا
ہے تو معجزات پر انحصار کر لیا گیا ہے اور اِس طرح اس
اصل الاصول کو جس پر مذہب کی بنیاد ہے بالکل مہمل
چھوڑ دیا گیا ہے۔ اِس کے مقابل پر قرآن کریم کو دیکھو۔
وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کے وجود کو پیش کرتا ہے بلکہ
اس کا ثبوت بھی دیتا ہے اور نہ صرف اس کا ثبوت
دیتا ہے۔ بلکہ اُس کی سب صفات کا ثبوت دیتا ہے
اور اِس طرح وہ ایک نیا اصل دنیا کے سامنے پیش کرتا
ہے جو یہ ہے کہ جس قدر صفاتِ الٰہیہ بندہ کے تعلق رکھنے
والی ہیں اُن کا الگ ثبوت بھی ضروری ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ
کا وجود تو ثابت ہو گا۔ مگر اس کی صفات کا وجود ثابت
نہیں ہو گا۔ اِس بارہ میں مثال کے طور پر یہ آیت لے لو
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ
يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ۔
(انعام آیت ۱۰۴) یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے کہ
انسانی نظریں اُس تک نہیں پہنچ سکتیں ہاں وہ خود اُنکی
نظروں تک پہنچتا اور اپنی طاقت اور قوت کے اظہار سے
اور اپنی صفات کے جلوہ سے اپنا وجود اُس پر ظاہر کرتا ہے
اور وہ بڑا لطیف اور خبیر ہے۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے

یہ بتایا ہے کہ اُس کا نظر نہ آنا اُس کے وجود کے منافی نہیں کیونکہ یہ اُس کی صفات میں سے ہے کہ وہ نظر نہیں آتا۔ لیکن وہ خود اپنے نشانات کے ذریعہ سے اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے اور بندوں کی نگہداشت رکھتا ہے اور اُن کی تمام جسمانی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور یہ اس امر کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ ہے لیکن لطیف۔ گویا اللہ تعالیٰ کی بعض صفات جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملکر اُس کے وجود کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً خبردار رہنا اور ادنیٰ سے ادنیٰ تغیّر کو بھی غائب نہ ہونے دینا۔ یہ کام ایک لطیف ہستی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یعنی ایسی ہستی کے بغیر جو موجودات کے ہر ذرّہ سے ایک کامل اتصال رکھتی ہو۔ پس خبیر کی صفت لطیف کے لئے بمنزلہ جوڑے کے ہے کہ اُس کے ذریعہ سے اِس کا بھی ظہور ہوتا ہے یا اِن دونوں کا آپس میں رُوح اور جسم کا تعلق ہے کہ ایک نہ ہو تو دوسری صفت بھی ثابت نہیں ہوتی اور دوسری نہ ہو تو پہلی صفت بھی ثابت نہیں۔ اگر خبیر کی صفت وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ سے ثابت نہ ہوتی تو لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ بھی ثابت نہ ہوتا بلکہ عدم ثابت ہوتا۔ اِس کے مقابلہ میں اگر لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ثابت نہ ہوتا یعنی اُس کا لطیف ہونا تو خبیر کی صفت بھی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ جو وجود کامل اتصال نہیں رکھتا وہ خبیر بھی نہیں ہو سکتا۔ غرض قرآن کریم اس لحاظ سے بھی مبین ہے کہ اُس نے صرف دعویٰ کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ وہ جو کچھ کہتا ہے اُس کے دلائل بھی دیتا ہے۔ تاکہ بنی نوع انسان ان احکام پر عمل صرف ایک چٹّی اور بوجھ سمجھ کر نہ کریں بلکہ اس بشاشت اور یقین کے ساتھ کریں کہ انہیں جو کچھ کہا گیا ہے اُن کے اپنے فائدہ اور ترقی کے لئے کہا گیا ہے۔

پھر قرآن کریم اِس لحاظ سے بھی مبین ہے کہ وہ تمام امور جو احکام یا اخلاق یا اعتقادات وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں ان سب کو اِس کتاب میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ کے قرب اور اُس کی محبت کے حصول کے لئے جسقدر اُمور کی ضرورت ہے اُن سب کو اِس کتاب میں داخل کر دیا گیا ہے۔ گویا قرآن کریم ایک جامع کتاب ہے جس میں توحید نبوت۔ دُعا۔ قضاء و قدر۔ بعث بعد الموت اور معاد وغیرہ کے متعلق پوری تفصیل موجود ہے جبکہ دوسری کُتب نے اِن اُمورِ ضروریہ سے قریباً خاموشی اختیار کر رکھی ہے اور اگر اُن میں کچھ ہے تو اِس قدر ناکافی ہے کہ گویا کچھ نہیں کہا۔ اِسی طرح نبی اور اُس کے فرائض اور نبوت اور اُس کی حقیقت کے متعلق بائبل اور وید اور ژند وغیرہ کُتب بالکل خاموش ہیں۔ قرآن کریم نے وجودِ باری تعالیٰ کے ثبوت اور اُس کی صفات پر بھی بحث کی ہے۔ انسان کی روحانی طاقتوں پر بھی بحث کی ہے۔ اُن رُوحانی اُمور کو بھی بیان کیا ہے جو انسان کی روحانی طاقتوں کی تکمیل اور امداد کیلئے ضروری ہیں۔ اِسی طرح اُس نے انسانی زندگی کے مآل پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اُسکے ثبوت پیش کئے ہیں اور پھر اُس نے اُن تمام اُمور میں نہ صرف علمی طور پر ایک نئی روشنی بخشی ہے بلکہ عملاً بھی اُس نے ایسے انسان پیدا کئے ہیں جنہوں نے قرآن کریم پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کا وصال حاصل کر لیا اور اُن کی روحانی طاقتیں اپنی تکمیل کو پہنچ گئیں۔ غرض قرآن کریم تمام سابق کُتبِ الٰہیہ پر اپنے مبین ہونے کے لحاظ سے ایسی نمایاں فوقیت رکھتا ہے کہ جس پہلو سے بھی دیکھیں قرآنی حسن انسانی آنکھوں کو خیرہ کئے بغیر نہیں رہتا۔

پھر قرآن کریم کو دوسری الہامی کُتب پر صرف اُنہی اُمور میں فضیلت حاصل نہیں جو اُس میں دوسری کتابوں سے زائد پائے جاتے ہیں یا جن میں اُس نے

دوسرے مذاہب کی خامیوں اور اُن کی کوتاہیوں کی اصلاح کی
ہے بلکہ جن احکام میں اُس کی پہلی کُتب سے مشابہت
دکھائی دیتی ہے اُن میں بھی قرآن کریم نے اُن سے بہتر اور
جامع تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی ہے مثلاً اگر اُن کتابوں
میں کھانا کھانے کا کوئی طریق بیان کیا گیا ہے تو اُس کا
کا بھی قرآن کریم نے اُن سے اچھا طریق پیش کیا ہے اور
اگر اُن میں کپڑا پہننے کا کوئی طریق بتایا گیا ہے ۔ تو
قرآن کریم نے اُن سے بھی بہتر اور اعلیٰ طریق کپڑے پہننے
کا دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے ۔ غرض کوئی معمولی سے
معمولی بات بھی ایسی نہیں جس میں قرآن کریم نے اُن کتابوں
سے زیادہ جامعیّت اور تفصیل کے ساتھ اپنی تعلیم
پیش نہ کی ہو اور جس میں اُس نے اپنے مبیّن ہونے کے
مقام کو ظاہر نہ کیا ہو ۔ مثال کے طور پر میں اِس وقت
امنِ عالم کا مسئلہ لے لیتا ہوں ۔ امن ایک ایسی چیز
ہے جس کے لئے دنیا ہمیشہ سے کوشش کرتی چلی آئی ہے
چنانچہ یا تو دُنیا بیرونی امن کے لئے جدوجہد کرتی ہے
اور یا جب بیرونی امن کے لئے جدوجہد نہیں کر رہی
ہوتی یا اُس میں کامیاب ہو چکی ہوتی ہے تو اندرونی امن
کے لئے جدوجہد کرتی ہے ۔ چنانچہ بڑے بڑے دولتمند
اور عالم و فاضل جب آپس میں ملتے ہیں تو اُن کی گفتگو
کا موضوع اکثر یہی ہوتا ہے کہ اَور تو ہمیں سب کچھ میسّر
ہے مگر دل کا امن نصیب نہیں ۔ پس امن صرف بیرونی
ہی نہیں ہوتا بلکہ دل کا بھی ہوتا ہے ۔ بلکہ حقیقت یہ
ہے کہ جب تک دل کا امن نصیب نہ ہو اُس وقت
تک ظاہری امن بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آجکل دنیا کے تمام لوگ امن
کے خواہشمند ہیں ۔ لیکن امن اُن کو میسّر نہیں اور اُسکی
وجہ یہ ہے کہ دُنیا میں اتنی مختلف الانواع مخلوق ہے
کہ جب تک کسی ایک قاعدہ کے ماتحت امن کا حصول
نہ ہو اُس وقت تک سب لوگ مطمئن نہیں ہو سکتے ۔
ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں انسانوں میں ہزاروں اختلافات
پائے جاتے ہیں ۔ ایک دوسرے کے مفاد مختلف ہوتے
ہیں ۔ ایک دوسرے کے جذبات مختلف ہوتے ہیں ۔
ایک دوسرے کی خواہشات مختلف ہوتی ہیں اور ایک
دوسرے کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں ۔ اِن متضاد
خواہشوں اور متضاد ضرورتوں کے ہوتے ہوئے دُنیا میں
امن کس طرح پیدا ہو سکتا ہے ۔ اسلام بتاتا ہے کہ
ایسے متضاد اور مخالف خیالات کی موجودگی میں بھی امن
قائم ہو سکتا ہے جب ساری دنیا ایک ایسی ہستی کی تابع
ہو ۔ جو امن دینے کا ارادہ رکھتی ہو ۔ اگر یہ بات نہ ہو
تو کبھی امن میسّر نہیں آ سکتا ۔ ہم روزانہ دیکھتے ہیں
کہ ایک گھر میں ماں باپ ذرا اِدھر اُدھر ہوتے ہیں تو
تھوڑی ہی دیر میں بچے لہولہان ہو جاتے ہیں ۔ کسی کے
گلے پر زخم ہوتا ہے کسی کے بال نوچے ہوئے ہوتے ہیں
کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوتے ہیں ۔ کسی کی آنکھ سُوجی
ہوئی ہوتی ہے ۔ مگر جب ماں باپ آتے ہیں تو اُن کے
سامنے ایسی نرم شکلیں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ گویا وہ لڑائی
جھگڑے کو جانتے ہی نہیں ۔ اِس لئے کہ ماں باپ کی
نیّت یہ ہوتی ہے کہ اُن کے بچے امن سے رہیں ۔
پس درحقیقت امن اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے ۔
جب دُنیا پر ایک ایسی بالا ہستی ہو جو امن کی متمنّی
ہو اور جو دوسروں کو امن دینا چاہتی ہو ۔ اور ایسے
قوانین نافذ کرنا چاہتی ہو جو امن دینے والے ہوں ۔
اور وہی شخص حقیقی امن دینے والا قرار پا سکتا ہے جو
اُس ہستی کی طرف لوگوں کو بُلائے ۔ یہ امن دینے والی
ہستی کی طرف توجہ دلانے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ہیں ۔ اور آپ ہی وہ انسان ہیں جن کے ذریعہ
دنیا کو یہ معلوم ہُوا کہ خدا تعالیٰ کے ناموں میں سے

ایک نام امن دینے والا بھی ہے ۔ چنانچہ سورۂ حشر میں
اللہ تعالیٰ کے جو نام گنائے گئے ہیں اُن میں سے ایک نام
یہ بھی ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ
السَّلٰمُ (سورۂ حشر آیت ۲۴) اے محمد رسول اللہ
(صلی اللہ علیہ وسلم) تُو لوگوں کو توجہ دلا اُس خدا کی طرف
جو بادشاہ ہے پاک ہے اور اَلسَّلٰمُ یعنی دنیا کو امن
دینے والا اور تمام سلامتیوں کا سرچشمہ ہے یعنی جس طرح
ماں باپ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ اُن کے بچے
لڑیں جھگڑیں یا فساد کریں ۔ بلکہ وہ امن شکن کو سزا
دیتے اور امن قائم رکھنے والے بچے سے پیار کرتے ہیں
اِسی طرح تمہارے اوپر بھی ایک خدا ہے وہ دیکھ رہا
ہے کہ تمہارے مفاد مختلف ہیں ۔ تمہارے ارادے مختلف
ہیں ۔ تمہاری ضرورتیں مختلف ہیں ۔ تمہاری خواہشیں مختلف
ہیں ۔ اور تم بعض دفعہ جذبات میں بے قابو ہو کر
امن شکن حالات پر تیار ہو جاتے ہو ۔ مگر یاد رکھو
خدا ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتا ۔ وہ سلام ہے ۔
جب تک کوئی سلامتی اختیار نہ کرے اُس وقت تک
وہ اُس کا محبوب نہیں ہو سکتا ۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خالی امن کی خواہش
امن پیدا نہیں کر دیا کرتی ۔ کیونکہ بالعموم امن کی خواہش
اپنے لئے ہوتی ہے دوسروں کے لئے نہیں ہوتی چنانچہ
جب لوگ کہتے ہیں ۔ دولت بڑی اچھی چیز ہے تو اسکے
یہ معنے نہیں ہوتے کہ دشمن کی دولت بھی اچھی چیز ہے
بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے لئے اور میرے دوستوں
کے لئے دولت بڑی اچھی چیز ہے ۔ اور جب وہ کہتے
ہیں صحت بڑی اچھی چیز ہے تو اس کے معنے بھی یہ
نہیں ہوتے کہ میرے دشمن کی صحت اچھی چیز ہے
بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے لئے صحت بڑی اچھی چیز
ہے ورنہ دشمن کے متعلق تو انسان یہی چاہتا ہے کہ
وہ نادار اور کمزور رہو ۔ اِسی طرح جب لوگ عزت و رتبہ
کے متمنی ہوتے ہیں تو ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ محض اپنے
لئے ۔ پس جب دنیا کا یہ حال ہے تو خالی امن کی خواہش
بھی فساد کا موجب ہو سکتی ہے کیونکہ جو لوگ بھی امن
کے متمنی ہیں وہ اس رنگ میں امن کے متمنی ہیں کہ صرف
انہیں اور ان کی قوم کو امن حاصل رہے ۔ ورنہ دشمن کے
لئے وہ یہی چاہتے ہیں کہ اُس کے امن کو مٹا دیں ۔ اب
اگر اِسی اصل کو رائج کر دیا جائے تو دُنیا میں جو بھی
امن قائم ہوگا وہ چند لوگوں کا امن ہوگا ۔ ساری دنیا
کا نہیں ہوگا ۔ اور جو ساری دُنیا کا امن نہ ہو وہ حقیقی
امن نہیں کہلا سکتا ۔ حقیقی امن تبھی پیدا ہو سکتا ہے
جب انسان کو یہ معلوم ہو کہ میرے اوپر ایک بالا ہستی
ہے جو میرے لئے ہی امن نہیں چاہتی بلکہ سارے ملکوں
کے لئے امن چاہتی ہے اور اگر میں صرف اپنے لئے یا
صرف اپنی قوم کے لئے یا صرف اپنے ملک کے لئے امن
کا متمنی ہوں تو اُس صورت میں مجھے اُس کی مدد اُس کی
نصرت اور اُس کی خوشنودی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی ۔
جب یہ عقیدہ دنیا میں رائج ہو جائے تبھی امن قائم
ہو سکتا ہے ورنہ نہیں ۔ پس اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ
السَّلٰمُ کہہ کر قرآن کریم نے انسانی ارادوں کو
پاک و صاف کر دیا ۔ اور یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ
جب تک ارادے درست نہ ہوں اس وقت تک
کام بھی درست نہیں ہو سکتا ۔ دُنیا میں اِس وقت
جتنے فساد اور لڑائیاں ہیں سب اِسی وجہ سے ہیں
کہ انسانوں کے ارادے صاف نہیں ۔ وہ مُنہ سے
جو باتیں کرتے ہیں اُن کے مطابق اُن کی خواہشات نہیں
اور اُن کی خواہشات کے مطابق اُن کے اقوال اور
افعال نہیں ۔ آج سب دُنیا کہتی ہے کہ لڑائی بُری
چیز ہے لیکن اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر

ہمارے خلاف کوئی لڑے تو یہ بُری بات ہے لیکن اگر اُنکی طرف سے جنگ کی ابتداء ہو تو یہ کوئی بُری بات نہیں سمجھی جاتی۔ اور یہ نقص اسی وجہ سے ہے کہ لوگوں کی نظر ایک ایسی ہستی پر نہیں جو سلام ہے۔ وہ سمجھتے ہیں جہاں تک ہمارا فائدہ ہے ہم اُن باتوں پر عمل کرینگے مگر جب ہمارے مفاد کے خلاف کوئی بات آئے گی تو اُسے ردّ کر دیں گے۔ مگر قرآن کریم میں جو خدا تعالیٰ کے نام بتائے گئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کا خدا ہے کسی ایک کا نہیں۔ اور یہی عقیدہ حقیقی امن کی طرف دُنیا کو لا سکتا ہے کہ دنیا کا ایک خدا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ سب لوگ امن سے رہیں۔ جب ہمارا یہ عقیدہ ہو گا تو اُسوقت ہماری خواہشات خود غرضی پر مبنی نہیں ہونگی۔ بلکہ دنیا کو عام نفع پہنچانے والی ہونگی اُس وقت ہم یہ نہیں دیکھیں گے کہ فلاں بات کا ہمیں فائدہ پہنچتا ہے یا نقصان بلکہ ہم یہ دیکھیں گے کہ ساری دنیا پر اس کا کیا اثر ہے۔ یوں تو دنیا ہمیشہ اپنے فائدہ کے لئے دوسروں کے امن کو برباد کرتی رہتی ہے لیکن اِس عقیدہ کے ماتحت ایسا کرنے کی جرأت اُس میں نہیں ہو گی کیونکہ وہ سمجھے گی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو ایک بالا ہستی مجھے کچل کر رکھ دیگی۔ جیسے ایک بچہ دوسرے کا کھلونا چھین لیتا ہے تو وہ اپنے لئے امن حاصل کر لیتا ہے لیکن اُس کے ساتھ ہی دوسرے کا امن چھینا جاتا ہے۔ اور ایک تو خوش ہو رہا ہوتا ہے اور دوسرا رو رہا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کیا تم سمجھتے ہو کہ ماں باپ یا اُستاد اگر وہاں موجود ہوں تو وہ اِس کھیل کو جاری رہنے دیں گے ؟ وہ کبھی اِس کو برداشت نہیں کرینگے۔ بلکہ جس بچہ نے کھلونا چھینا ہو گا اُس کا کھلونا واپس لے کر اُس کے اصل مالک کو دے دیں گے۔ اور جب وہ ایسا کرتے ہیں تب بچہ سمجھتا ہے کہ وہ امن جو دوسرے کے امن کو برباد کر کے حاصل کیا جاتا ہے وہ کبھی قائم رہنے والا نہیں ہوتا حقیقی امن وہی ہوتا ہے جو ایسی صورت میں حاصل ہو جب کہ کسی کے حق کو تلف نہ کیا گیا ہو۔

غرض حقیقی امن اُسوقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ایک بالا ہستی تسلیم نہ کی جائے اور یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ امن دینے والا ہے صرف اسلام نے ہی پیش کیا ہے اور اُس نے کہا ہے کہ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ۔

اِس کے بعد وہ پیغام ہے جو اُس ہستی کی طرف سے آتا ہے۔ کیونکہ جب ایک امن قائم رکھنے کی خواہشمند ہستی کا پتہ مل گیا۔ تو انسان کے دل میں یہ معلوم کرنے کی بھی خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ آیا اُس نے امن قائم کرنے کا کوئی سامان بھی کیا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اگر اُس نے امن قائم کرنے کا کوئی سامان نہیں کیا تو یہ لازمی بات ہے کہ اگر ہم خود امن قائم کرنے کی کوشش کریں گے تو اِس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ بجائے امن کے فساد پیدا کر دیں۔ پس محض امن قائم کرنے کی خواہش انسان کو صحیح راستہ پر قائم نہیں کر سکتی جب تک ایک بالا ہستی کی ایسی ہدایات بھی معلوم نہ ہوں جو امن قائم کرنے میں ممد اور معاون ہوں۔ کیونکہ اگر انسان کو اپنے بالا افسر کی خواہشات کا صحیح علم نہ ہو تو انسان باوجود اس آرزو کے کہ وہ اُس کے احکام کی اطاعت کرے اُسے پوری طرح خوش نہیں رکھ سکتا۔ پس اگر ہمیں اپنے بالا افسر کی خواہش تو معلوم ہو لیکن اُس خواہش کو پورا کرنے کا طریق معلوم نہ ہو۔ تب بھی ہمارا امن قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ ممکن ہے ہم کوئی اور طریق اختیار کریں اور اُسکا منشاء کوئی اور طریق اختیار کرنا ہو۔ پس ہمارے امن کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بالا ہستی ہمیں کوئی ایسا

ذریعہ بھی بتائے جو امن قائم کرنے والا ہو ۔ سو اس غرض کے لئے جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا اُس نے کوئی ایسا ذریعہ بتایا ہے یا نہیں تو سورۂ بقرہ میں اس کا جواب نظر آتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :- وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا (بقرہ آیت ۱۲۶) یعنی یہ جو آسمان پر سلام خدا کی خواہش ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو اس کے لئے ضروری تھا کہ ہم ایک مرکز قائم کرتے جو دنیا کو امن دینے والا ہوتا ۔ سو ہم نے بیت اللہ کو مدرسہ بنایا ۔ یہاں چاروں طرف سے لوگ جمع ہونگے اور امن کا سبق سیکھیں گے ۔ پس ہمارے خدا نے صرف خواہش ہی نہیں کی ۔ صرف یہ نہیں کہا کہ تم امن قائم کرو ورنہ میں تم کو سزا دونگا ۔ بلکہ اس دنیا میں اُس نے امن کا ایک مرکز بھی قائم کر دیا اور وہ خانہ کعبہ ہے ۔ فرماتا ہے ۔ یہاں لوگ آئیں گے اور اس مدرسہ سے لوگ امن کا سبق سیکھیں گے ۔

پھر یہ کہ اس مدرسہ کی تعلیم کیا ہو گی ۔ اس کے لئے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا سے خبر پا کر اعلان فرما دیا کہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (مائدہ آیت ۱۶-۱۷) یعنی اے لوگو! تم تاریکی میں پڑے ہوئے تھے ۔ تم کو یہ پتہ نہیں تھا کہ تم اپنے خدا کی مرضی کو کس طرح پورا کر سکتے ہو ۔ اس لئے دنیا میں ہم نے تمہارے لئے ایک مدرسہ بنا دیا ہے ۔ مگر خالی مدرسہ کام نہیں دیتا جب تک کتابیں نہ ہوں ۔ پس فرمایا قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۔ خدا کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور آیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اور اُس کے ساتھ ایک کتاب مبین ہے ۔ ایسی کتاب جو ہر قسم کے مسائل کو بیان کرنے والی ہے ۔ پس خدا تعالیٰ نے اسلام کے لئے امن کا مدرسہ بھی قائم کر دیا ۔ امن کا کورس بھی مقرر کر دیا اور مدرس امن بھی بھیج دیا ۔ مدرس امن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور امن کا کورس وہ کتاب ہے جو يَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ کی مصداق ہے ۔ جو شخص خدا کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ اُسے چاہیئے کہ اس کتاب کو پڑھے اس میں جس قدر سبق ہیں وہ سُبُلَ السَّلٰمِ یعنی سلامتی کے راستے ہیں ۔ اور کوئی ایک حکم بھی ایسا نہیں جس پر عمل کر کے انسانی امن برباد ہو سکے ۔

ایک بالا ہستی کا وجود ہی ہمارے ارادوں کو درست کرتا ہے ۔ مدرسہ کا قیام ہماری عملی مشکلات کو حل کرنے میں مدد دیتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اس کتاب کی عملی تفسیر ہے ۔ جیسا کہ آپ فرماتے ہیں کہ میرے ذریعہ خدا تعالیٰ نے وہ کتاب بھیجی ہے جس میں وہ تمام تفصیلات موجود ہیں جن سے امن حاصل ہو سکتا ہے ۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ یہ امن جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے کس کے لئے ہے ؟ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے ۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى (نمل آیت ۶۰) یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو کہدے الحمد للہ سب تعریف اُس اللہ کے لئے ہے جس نے دنیا میں امن قائم کر دیا اور انسان کی تڑپ اور فکر کو دُور کر دیا ۔ اور کہو وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى وہ بندے جو خدا تعالیٰ کے پسندیدہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو اُس کی راہ میں فدا کر دیں اُن کے لئے بھی امن پیدا ہو جائے گا اور وہ بھی با امن زندگی بسر کرنے لگ جائیں گے ۔ یہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا کہ تمام لوگ

جو آپ کی اتباع کرنے والے اور آپ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والے ہیں اُن کے لئے کامل امن ہے اور وہ اپنی زندگی کے کسی حصہ میں بھی بدامنی نہیں دیکھ سکتے۔

پھر سوال پیدا ہوتا تھا کہ جب خدا سلام ہے تو اُس کی طرف سے امن ساروں کے لئے آنا چاہیئے ۔ نہ کہ بعض کے لئے۔ کیونکہ اگر خالی اپنوں کے لئے امن ہو تو یہ کوئی کامل امن نہیں کہلا سکتا۔ اِس کا بھی اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں جواب دیتا ہے۔ فرماتا ہے۔ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَ قُلْ سَلٰمٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (زخرف آیت ۸۹-۹۰) یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی تعلیم لیکر آئے ہیں جو ساروں کے لئے ہی امن کا موجب ہے اور ہر شخص کے لئے وہ جنت کا خزانہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہے۔ مگر افسوس کہ لوگ اِس کو نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ اِس تعلیم کے خلاف لڑائیاں اور فساد کرتے ہیں جو اُن کے لئے نوید اور خوشخبری ہے یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی یہ کہنا پڑا کہ خدایا میں اپنی قوم کی طرف امن کا پیغام لے کر آیا تھا مگر اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ یہ قوم جس کے لئے میں امن کا پیغام لایا تھا یہ تو مجھے بھی امن نہیں دے رہی اٰمَنَ کے معنے ایمان لانے کے بھی ہوتے ہیں اور اٰمَنَ کے معنے امن دینے کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ میں اسی امر کا ذکر ہے کہ ہمارا نبی ہم سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ خدایا باوجود یکہ میں اپنی قوم کے لئے امن کا پیغام لایا تھا وہ اُس کی قدر کرنے کی بجائے میری مخالفت پر کمر بستہ ہو گئی ہے یہاں تک کہ ان لوگوں نے میرے امن کو بالکل برباد کر دیا۔ مگر فرمایا فَاصْفَحْ عَنْهُمْ ہم نے اپنے نبی سے یہ کہا ہے کہ ابھی اِن لوگوں کو تیری تعلیم کی عظمت معلوم نہیں اس لئے وہ غصہ میں آجاتے اور تیری مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں تو اُن سے درگذر کر۔ کیونکہ ہم نے تجھے امن کے قیام کے لئے ہی بھیجا ہے۔ وَ قُلْ سَلٰمٌ۔ اور جب تجھ پر یہ لوگ حملہ کریں اور تجھے ستائیں تو تو یہی کہتا رہ کہ میں تو تمہارے لئے سلامتی لایا ہوں فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ عنقریب دنیا کو معلوم ہو جائیگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے لئے امن لایا تھا۔ لڑائی نہیں لایا تھا۔ گویا وہ امن جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے وہ صرف مومنوں کے لئے ہی امن نہ رہا۔ بلکہ سب کے لئے امن ہو گیا۔

پھر صرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی نہیں بلکہ تمام مومنوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (سورۃ فرقان آیت ۶۴) وہ جاہل جو اسلام کی غرض و غایت کو نہیں سمجھتے جب مسلمانوں سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں تو مومن کہتے ہیں کہ ہم تو تمہاری سلامتی چاہتے ہیں چاہے تم ہمارا بُرا ہی کیوں نہ چاہو۔ جب دشمن کہتا ہے کہ تم کیسے گندے عقائد دنیا میں رائج کر رہے ہو۔ تو وہ کہتے ہیں یہ گندے عقائد اور بیہودہ باتیں نہیں۔ بلکہ سلامتی کی باتیں ہیں۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی سلامتی صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہی نہیں بلکہ مومنوں کے لئے بھی ہے۔ اور صرف مومنوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سلامتی عارضی ہے یا مستقل۔ کیونکہ یہ تو ہم نے مانا کہ السَّلٰمُ خدا نے امن لا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو دیا۔ مگر بعض امن عارضی بھی ہوتے ہیں جن کے نیچے بڑی بڑی خرابیاں پوشیدہ ہوتی ہیں جیسے بخار کا مریض جب ٹھنڈا پانی پیتا ہے تو اُسے بڑا آرام محسوس

ہوتا ہے - مگر دو منٹ کے بعد یکدم اُس کا بخار تیز ہو جاتا ہے - اور کہتا ہے "آگ لگ گئی" - پھر برف چبتا ہے - اور سمجھتا ہے کہ آرام آگیا مگر یکدم پھر اُسے بے چینی شروع ہو جاتی ہے - پس سوال ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو امن دے رہے ہیں یہ عارضی ہے یا مستقل؟ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے :-

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (یونس آیت ۲۶)

کہ دنیا فساد کی طرف لے جاتی ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ جو تعلیم دی گئی ہے وہ موجودہ زمانہ ہی کے لئے نہیں - بلکہ وہ ایک ایسا امن ہے جو مرنے کے بعد بھی چلتا چلا جاتا ہے اور جو اس دنیا کے بعد ایک ایسے گھر میں انسان کو پناہ دیتا ہے جہاں سلامتی ہی سلامتی ہے گویا یہ زنجیر ایک مکمل زنجیر ہے - اس کے ماضی میں ایک سلام ہستی کھڑی ہے - اس کے حال میں امن ہے کیونکہ ایک مدرسۂ امن جاری ہو گیا ہے اور ایک مدرس امن خدا تعالیٰ نے بھیج کر امن کا کورس بھی مقرر کر دیا - اور عملی طور پر ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا کی مصداق ہے - پس اس کے ماضی میں بھی امن ہے اور اُس کے حاضر میں بھی امن ہے - پھر اُس کے مستقبل میں بھی امن ہے - کیونکہ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ مرنے کے بعد وہ انسان کو ایک ایسے جہان میں لے جائیگا - جہاں سلامتی ہی سلامتی ہوگی - پس یہ ساری زنجیر مکمل ہو گئی اور کوئی جزو تشنۂ تکمیل نہ رہا -

اس کے بعد قیام امن کے ذرائع کا سوال آتا ہے - سو اس کے متعلق بھی قرآن کریم روشنی ڈالتا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان فرماتا ہے کہ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۘ (انعام آیت ۸۲) یعنی میرے دل کا امن ان بتوں کو دیکھ کر کس طرح برباد ہو جائے جن کو تم خدائے واحد کا شریک قرار دے رہے ہو - وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا حالانکہ تم اپنے دلوں میں جھوٹے طور پر مطمئن ہو خطرہ تمہارے ارد گرد ہے - پس اگر تم عدم علم اور جہالت کے باوجود مطمئن ہو اور تمہارا عدم علم تم کو امن دے سکتا ہے تو تم کس طرح سمجھ سکتے ہو کہ میرا کامل علم مجھے امن نہیں بخش سکتا - فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ تم بتاؤ ان دونوں میں سے کس کو امن حاصل ہوگا؟ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ - اگر تم حماقت کی باتیں نہ کرو اور عقل و خرد سے کام لو تو تم سمجھ سکتے ہو کہ کون مامون ہے اور کون غیر مامون -

اس جگہ امن کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو عظیم الشان گُر بیان کئے ہیں - اول یہ کہ توحید کامل کے قیام کے بغیر امن قائم نہیں ہو سکتا - کیونکہ جب تک توحید قائم نہ ہوگی اُس وقت تک لڑائیاں جاری رہیں گی شرک کا صرف اتنا ہی مفہوم نہیں کہ کوئی ایک کی بجائے تین خداؤں کا قائل ہو - بلکہ جب باریک در باریک رنگ میں شرک شروع ہوتا ہے تو کئی قسم کا شرک نظر آنے لگ جاتا ہے - اس کے علاوہ جب مختلف مذاہب کی تعلیمیں مختلف ہیں اُن کے خیالات مختلف ہیں تو اس حالت میں امن اس وقت تک قائم ہی نہیں ہو سکتا جب تک لوگوں کے اندر حقیقی مواخات پیدا نہ ہو اور حقیقی مواخات ایک خدا کے بغیر نہیں ہو سکتی - دنیا میں اس بات پر تو لڑائیاں ہو جاتی ہیں کہ ایک کہتا ہے میرا دادا فلاں عظمت کا مالک تھا اور دوسرا کہتا ہے

میرا دادا ایسا تھا۔ مگر کبھی تم نے بھائیوں کو اس بات پر
لڑتے نہیں دیکھا ہوگا کہ ایک دوسرے کو کہے کہ مَیں شریف
النّسب ہوں اور تم نہیں۔ اسی طرح جب دُنیا میں
توحیدِ کامل ہو گی۔ تبھی اس قسم کی لڑائیاں بند ہونگی
پس اخوت و مساوات کا جو سبق توحید سے حاصل
ہوتا ہے اَور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم کے متعلق
دشمن بھی یہ اقرار کرتا ہے کہ اخوّت کا جو سبق آپؐ نے
دیا اور کسی نے نہیں دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے اخوت کا سبق الگ کرکے نہیں دیا
بلکہ آپ نے اصل میں توحید کا سبق دیا جس کا لازمی
نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں اخوت پیدا ہو گئی۔ مثلاً
جب مَیں نماز میں کہوں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ
سب تعریف اُسی اللہ کی ہے جو عیسائیوں کا بھی ربّ
ہے۔ ہندوؤں کا بھی ربّ ہے۔ یہودیوں کا بھی ربّ
ہے۔ تو میرے دل میں ان قوموں کی نفرت کس طرح ہو
سکتی ہے۔ جبکہ مَیں رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کے لفظ کے نیچے
تمام قوموں اور تمام نسلوں کو لے آتا ہوں۔ مَیں جب
نماز میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہتا ہوں تو دوسرے
الفاظ میں یہ کہتا ہوں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْمَذَاھِبِ
کُلِّھَا۔ یعنی مَیں اُس خدا کی تعریف کرتا ہوں جو تمام مذاہب
کا ربّ ہے۔ اسی طرح جب مَیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ
رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہتا ہوں تو اس کے معنے یہ بھی ہوتے
ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْاَقْوَامِ کُلِّھَا یعنی مَیں
اُس خدا کی تعریف کرتا ہوں جو تمام اقوام کا ربّ ہے
اسی طرح جب مَیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہتا
ہوں تو اس کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ
رَبِّ الْبِلَادِ کُلِّھَا یعنی مَیں اُس خدا کی تعریف کرتا
ہوں جو تمام ملکوں کا ربّ ہے۔ اور جب کہ مَیں
تمام اقوام۔ تمام ملکوں اور تمام لوگوں میں حُسن تسلیم
کروں گا تو یہ ممکن ہی نہیں کہ مَیں اُن سے عداوت رکھ
سکوں۔ پس اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ میں بتا دیا
گیا ہے کہ اگر حقیقی توحید قائم ہو اور ربّ العالمین کی
حمد سے انسان کی زبان تر ہو تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی
قوم کا کینہ انسان کے دل میں رہے اور ایک طرف تو
وہ اُن کی بربادی کی خواہش رکھے اور دوسری طرف
اُنکو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد اور تعریف بھی کرے۔

دوسرا نکتہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے ذریعہ یہ نازل فرمایا ہے کہ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ عَلَیْکُمْ
سُلْطٰنًا یعنی دنیا میں امن تبھی برباد ہوتا ہے۔ جب
انسان فطرتی مذہب کو چھوڑ کر رسم و رواج کے پیچھے
چل پڑتا ہے۔ اگر انسان طبعی اور فطرتی باتوں پر قائم
رہے تو کبھی لڑائیاں اور جھگڑے نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے
کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام دینِ فطرت
ہے اور حقیقت یہی ہے کہ جو دینِ فطرت ہوگا۔ وہی
دنیا میں امن قائم کر سکیگا اور وہی مذہب امن پھیلا سکیگا
جس کا ایک ٹکڑا انسان کے دماغ میں ہو۔ آخر یہ ہو
کس طرح سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اُس تعلیم کی طرف
بلائے جس کا جواب ہماری فطرت میں نہیں اور جس کی
قبولیت کا مادہ پہلے سے خدا نے ہمارے دماغ اور
ہمارے ذہن میں نہیں رکھا۔ پس فرمایا مَا لَمْ یُنَزِّلْ
بِہٖ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا تم کہدو کہ تم ان تعلیموں کے پیچھے
چل رہے ہو جو فطرت کے خلاف ہیں اور مَیں تم کو اُن
باتوں کی طرف بلاتا ہوں جو تمہاری فطرت میں داخل ہیں
اب جوں جوں انسان اپنی فطرت کو پڑھنے کی کوشش
کرے گا اُس کا دل پکار اُٹھے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کے ہاتھ میں جو کتاب ہے وہ بالکل سچی ہے۔ کیونکہ
اُس کا دوسرا نسخہ میرے ذہن میں بھی ہے۔ اسی طرح

آہستہ آہستہ دنیا ایک مرکز پر آجائیگی اور ایک ہی خیال پر
متحد ہو جائیگی جس کے نتیجہ میں امن قائم ہو جائیگا۔

اب ایک اور سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ
بے شک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدرّسِ امن ہیں۔
بے شک آپؐ نے امن کا مدرسہ دُنیا میں جاری کر دیا
بے شک امن کا کورس خدا نے مقرر کر دیا۔ بیشک
اسلام نے تعلیم وہ دی ہے جو فطرت کے عین مطابق
ہے اور جسے دیکھ کر انسانی فطرت پکار اُٹھتی ہے کہ
واقعہ میں یہ صحیح تعلیم ہے۔ مگر کیا لڑائی بالکل ہی بُری
چیز ہے؟ قرآن کریم اِس کا بھی جواب دیتا اور فرماتا
ہے کہ امن کے قیام کے لئے بعض دفعہ جنگ کی بھی
ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:- وَلَوْلَا
دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ
الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ
(بقرہ آیت ۲۵۲) کہ بیشک امن ایک قیمتی چیز ہے۔
بے شک اس کی تعلیم خدا نے انسانی دماغ میں رکھی
ہے۔ مگر کبھی انسان کا دماغ فطرت سے اتنا بعید ہو
جاتا ہے اور انسانی عقیدے مرکز سے اتنے پرے ہٹ
جاتے ہیں۔ کہ وہ امن سے بالکل دُور جا پڑتے ہیں۔
اور نہ صرف امن سے دُور جا پڑتے ہیں بلکہ حریتِ ضمیر
کو بھی باطل کرنا چاہتے ہیں۔ فرماتا ہے ایسی حالت
میں امن کے قیام اور اُس کو وسعت دینے کے لئے
ضروری ہوتا ہے کہ جو شرارتی ہیں اُن کا مقابلہ کیا جائے
پس وہ جنگ امن مٹانے کے لئے نہیں بلکہ امن قائم
کرنے کے لئے ہوگی۔ جیسے اگر انسان کے جسم کا کوئی
عضو سڑ گل جائے تو فیس خرچ کر کے بھی انسان
ڈاکٹر سے کہتا ہے کہ اس عضو کو کاٹ دو۔ اسی طرح
کبھی ایسے گروہ دُنیا میں پیدا ہو جاتے ہیں جو سرطان
اور کینسر کا مادہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور ضروری ہوتا
کہ اُن کا اپریشن کیا جائے تا وہ باقی حصّہ قوم کو بھی
گندہ اور ناپاک نہ کر دیں۔ پس فرمایا وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ
النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ۔ اگر بعض کے ذریعہ اللہ تعالیٰ
بعض کی شرارتوں کو دُور نہ کرتا تو لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔
بجائے امن قائم ہونے کے فساد بڑھ جاتا۔ جس طرح
سپاہیوں کو بعض دفعہ لاٹھی چارج کا حکم دیا جاتا ہے
اسی طرح فرمایا۔ بعض دفعہ ہم بھی اپنے بندوں کو اجازت
دیتے اور انہیں کہتے ہیں جاؤ اور لاٹھی چارج کرو اسلئے
کہ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ اگر لاٹھی چارج نہ کیا جاتا۔ تو
ساری دُنیا کا امن برباد ہو جاتا۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ
عَلَى الْعٰلَمِيْنَ لیکن اللہ تعالیٰ صرف ایک قوم کو ہی امن
نہیں دینا چاہتا بلکہ وہ ساری دُنیا کو باامن دیکھنے کا خواہشمند
ہے۔ اور چونکہ اِن لوگوں سے دنیا کا امن برباد ہوتا ہے
اِس لئے ضروری ہوتا ہے کہ اُن کا مقابلہ کیا جائے۔ تا
ساری دنیا میں امن قائم ہو۔ بیشک اس کے نتیجہ میں
خود اُن لوگوں کا امن مٹ جائے گا۔ مگر دُنیا میں ہمیشہ
موازنہ کیا جاتا ہے۔ جب ایک بڑا فائدہ چھوٹے فائدہ
سے ٹکرا جائے تو اُس وقت بڑے فائدہ کو لے لیا جاتا
اور چھوٹے فائدہ کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ اِسی طرح
کثیر حصّۂ دنیا کے امن کی خاطر ایک قلیل گروہ سے جنگ
کی جاتی ہے اور اُس وقت تک اُسے نہیں چھوڑا جاتا
جب تک وہ خلافِ امن حرکات سے باز نہ آجائے

یہ ایک مختصر سا ڈھانچہ اس تعلیم کا ہے جو اسلام
نے قیامِ امن کے سلسلہ میں دی۔ اِس سے ہر شخص اندازہ
لگا سکتا ہے کہ اسلام نے کس جامعیت اور تفصیل
کے ساتھ اس مسئلہ کو بیان کیا ہے جب کہ باقی
مذاہب اس مسئلہ پر بالکل خاموش ہیں اور انہوں نے
نسلِ انسانی کی کوئی راہنمائی نہیں کی۔ صرف یہ کہہ
دینا کہ اگر کوئی شخص تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے

تو تم اپنا دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دو۔ اگر کوئی
شخص تم سے قمیص مانگے تو اُسے چوغہ بھی اُتار دو۔
اگر کوئی شخص تمہیں ایک کوس بیگار میں لے جانا چاہے
تو تم دو کوس چلے جاؤ۔ (متی باب ۵ آیت ۳۹ تا ۴۲)
بین الاقوامی مشکلات کا کوئی حل نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ
عیسائیت اور یہودیت صرف اس تعلیم پر عمل کر کے کبھی
دُنیا میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ بلکہ
حقیقت تو یہ ہے کہ اس تعلیم پر عمل امن نہیں بلکہ بدامنی
پیدا کرنے کا موجب ہے۔ اگر کوئی شخص ایک کوس
پر اپنے گھر کا سامان لے جانا چاہتا ہے۔ اور ایک مزدور
کو وہ زبردستی پکڑ لیتا ہے تو مسیحیت کہتی ہے کہ
اے مزدور پکڑا جا اور مقابلہ نہ کر۔ مگر جب اُس کا گھر
آجائے تو وہاں ٹھہر نہیں بلکہ ایک کوس اور آگے چلا جا
اب بتاؤ اس تعلیم پر عمل کر کے کس کو امن ملا۔ دوسرے
شخص کو خود اسباب اُٹھا کر واپس لانا پڑے گا اور
مزدور کو ایک کوس زائد بوجھ اُٹھانا پڑے گا۔ گویا
دونوں کو بدامنی ملی۔ امن نہ ملا۔

امن صرف اُسی تعلیم پر عمل کر کے قائم ہو سکتا ہے
جو اسلام نے پیش کی ہے۔ کیونکہ اسلام ایک کتاب مبین
پیش کرتا ہے جو اپنے تمام احکام پر بالتفصیل روشنی
ڈالنے والی ہے اور جس کا مقابلہ نہ تورات کر سکتی ہے
نہ انجیل کر سکتی ہے۔ نہ ژند واوستا کر سکتے ہیں اور
نہ دنیا کی کوئی اور کتاب یا صحیفہ کر سکتا ہے۔

کتابِ مبین کے ذکر میں اس امر کا بیان کر دینا
بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب مبین
کی شناخت کا انحصار صرف ظاہری دلائل اور
براہین پر ہی نہیں رکھا بلکہ اُس نے کتاب مبین کی سچائی
کے لئے ایک اور کتاب بھی تیار کی ہوئی ہے جسے قرآنی
اصطلاح میں کِتٰبٌ مَّکْنُوْنٌ (سورۃ واقعہ آیت ۷۹)
کہا جاتا ہے۔ کتاب مکنون کی مثال اُس پانی کی سی ہے جو
زمین کے اندر مخفی ہوتا ہے اور کتاب مبین کی مثال نہروں
دریاؤں اور چشموں کے پانی کی سی ہے جو ظاہر ہوتا ہے۔
جس طرح نہروں اور دریاؤں یا بادلوں کے پانی کی وجہ
سے کنوؤں کا پانی بھی چڑھ آتا ہے۔ اسی طرح
کتاب مبین کی آمد پر کتاب مکنون بھی اپنے خزانے اُگلنے
لگتی ہے۔ اور جب کتاب مبین کا پانی برسنا بند ہو
جائے تو کتاب مکنون بھی مخفی تر ہو جاتی ہے۔ کتاب
مکنون سے مراد فطرتِ صحیحہ اور ضمیر ہے اور کتاب مبین
خدا تعالیٰ کا تازہ الہام ہے۔ اور کتاب مبین کی سچائی
کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب مکنون کے مطابق ہو
گویا اصل میں یہ دونوں ٹکڑے ایک ہی کل کے ہیں جسے
کتابِ مطلق کہنا چاہیئے اور جب کتاب مکنون اور کتاب مبین
کا اتحاد ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کتاب مبین
اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آئندہ
لوگوں کو دھوکے سے بچانے کے لئے اپنی کتاب کا ایک
ٹکڑا اُن کے دلوں اور دماغوں میں بھی رکھ دیا ہے۔
تاکہ جو کتاب اُس کے مطابق ہو وہ اُس کی سمجھی جائے
اور جو اُس کے مطابق نہ ہو وہ جھوٹی قرار پائے۔ اسکی
ایسی ہی مثال ہے جیسے ۱۹۲۴ء میں میں جب ولایت سے
واپس آ رہا تھا تو جہاز کا ایک انجنیئر مجھے علیحدگی میں
لے گیا۔ اور کہنے لگا آپ کے ولایت جانے کے لئے
تبلیغ تو ایک بہانہ ہے آپ کسی اور اہم کام کو سرانجام
دینے کے لئے گئے ہونگے۔ میں نے کہا۔ ہم تو صرف تبلیغ
کے لئے ہی گئے تھے اس کے علاوہ اور کوئی کام ہمارے
مدنظر نہ تھا۔ مگر چونکہ اُس کے دل میں یہی جم چکا تھا کہ
کسی اور کام کے لئے گئے تھے اور تبلیغ کو آڑ بنا لیا تھا
وہ کہنے لگا کہ آپ تو انگریزوں کے خلاف کسی قسم کی کوشش
کرنے گئے ہونگے اور آپ کا یہ ظاہر کرنا کہ ہم تبلیغ کیلئے

گئے تھے ایک بہانہ ہے۔ میں نے پھر اُسے وہی جواب دیا کہ تبلیغ کے سوا ہمارا کوئی اور مدعا نہ تھا۔ مگر وہ اپنی دھن میں یہی کہتا رہا کہ تبلیغ تو صرف بہانہ ہے۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا۔ میں اپنی خدمات آپ کے پیش کرتا ہوں۔ آپ میرے سپرد کوئی کام کریں۔ اور اگر آپ نے اپنے نمائندوں کو کسی قسم کی مخفی ہدایات پہنچانی ہوں تو میں اس کام کو بخوبی سرانجام دے سکونگا اور بڑی حفاظت سے اُن تک پہنچا دیا کرونگا۔ اس کے بعد اُس نے مزید اعتبار جمانے کے لئے ایک وزیٹنگ کارڈ VISITING CARD نکالا اور اُسکے دو ٹکڑے پھاڑ کر کہا جب آپ مجھے اس قسم کی ہدایات پر مشتمل خط بھیجیں تو وزیٹنگ کارڈ کا نصف حصّہ اُس کے ساتھ مجھے بھیجدیں اور دوسرا نصف حصّہ اپنے اُس نمائندہ کو جس کو وہ خط پہنچانا ہو بھیجدیا کریں وہ نمائندہ جب وہ نصف وزیٹنگ کارڈ دکھا کر مجھ سے آپ کے مخفی خط کا مطالبہ کرے گا تو میں اُس کے نصف وزیٹنگ کارڈ کو اپنے والے نصف کے ساتھ ملا کر دیکھ لونگا۔ اور اگر وہ دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے تو میں سمجھ جاؤنگا کہ یہ خط اسی کو دینا ہے۔ پھر اُس نے مثال دی کہ فرض کرو میں آپکا خط لے کر وینس میں پہنچا اور وہاں دیکھا کہ ایک ہندوستانی شخص میرے انتظار میں کھڑا ہے وہ جب اپنی جیب سے وہ نصف کارڈ نکال کر مجھے دکھائیگا تو میں اپنے وزیٹنگ کارڈ سے ملا کر دیکھوں گا۔ اگر مل گیا تو آپ کا خط اُس کو پہنچا دونگا۔ یہ مثال تو اس انجنیئر نے اپنی اُس غلط فہمی کی بنا پر دی تھی کہ ہم انگریزوں کے خلاف کسی قسم کی سازش کرنے گئے تھے۔ لیکن اتنی بات بالکل درست ہے کہ جب کسی کارڈ کے دو حصّے آپس میں فٹ آجائیں تو اس کارڈ کے صحیح ہونے میں کسی قسم کے

شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کتاب مبین کا ایک حصّہ انسان کے ضمیر میں رکھدیا ہے اور جب وہ دونوں آپس میں مل جاتے ہیں تو کتاب مبین کی صداقت بالکل واضح ہو جاتی ہے مگر جس طرح بارش نہ ہونے پر کنوؤں کے پانی بھی سوکھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح کتاب مکنون اُس وقت تک کام دیتی ہے جب تک کتاب مبین کا پانی برستا ہے جب فترة کا زمانہ آجائے تو کتاب مکنون بھی مخفی تر ہو جاتی ہے۔ گویا دونوں کی مثال دو دوستوں اور محبتوں کی سی ہے کہ جب ایک قریب آتا ہے تو دوسرا بھی قریب آجاتا ہے اور جب ایک دُور چلا جاتا ہے تو دوسرا بھی دُور چلا جاتا ہے۔ جب کتاب مکنون کسی شخص کی اپنی جِلا کی وجہ سے نمایاں ہونے لگتی ہے اور اُس کا مالک اپنی ذکاوت کی وجہ سے اُس کے مطابق اعمال کر کے اُسے اور زیادہ مصفّٰی کر دیتا ہے تو معًا کتاب مبین یعنی الہام الٰہی اُس پر نازل ہونے لگتا ہے۔ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ یَکَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (النور آیت ۳۶) یعنی فطرتِ مبارکہ محمدیّہ ایسی مصفّٰی اور پاکیزہ تھی کہ قریب تھا کہ خود بخود بغیر آگ کے جل اُٹھتی یعنی بغیر اس کے کہ آسمانی آگ اُس کو چھوتی وہ آپ ہی آپ دقائق اور معرفت کو پالیتی۔ کیونکہ سُنت اللہ یہی ہے کہ جب اس اندرونی تیل میں التہاب پیدا ہونے لگے تو آسمانی آگ کو وہ خود بخود جذب کر لیتا ہے غرض ان دونوں کتابوں کا عجیب جوڑ ہے کہ ایک کے قریب ہونے سے دوسری بھی قریب ہو جاتی ہے۔ فطرت صحیح ہوتی ہے تو وہ الہام کو کھینچ لیتی ہے اور الہام کی روشنی کسی کو نصیب ہو جائے۔ تو

اُس کی فطرت کے صحیح جذبات اُبھر آتے ہیں۔ اور دونوں میں لازم و ملزوم والی لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب کتابِ مکنون مٹ جائے تو کتابِ مبین بھی نصیب نہیں ہوتی اور جب کتابِ مبین سے انسان محروم ہو جائے تو کتابِ مکنون بھی مٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمانِ کامل کبھی خالی فطرت کے غور سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ فطرت کامل ہو تو الہام کامل اُس سے جُدا ہی نہیں رہ سکتا۔ وہ فوراً اُس پر اُسی طرح آ گرتا ہے جس طرح وائرلیس کے صحیح آلہ پر خود بخود خبر گرنے لگتی ہے یا جواذبِ بجلی پر بجلی۔

غرض الہام اور فطرتِ صحیحہ ایک جوہر کے دو ٹکڑے ہیں اور اُن کو الگ الگ سمجھنا سخت نادانی اور بے وقوفی ہے۔ فطرتِ صحیحہ اور جذباتِ متناسب کے نتیجہ میں ہی عشقِ الٰہی کی آگ بھڑکا کرتی ہے جو کلام کو کھینچ لیتی ہے اور وصال کو آسان کر دیتی ہے پس صحیح اور آسمانی کلام وہی ہو سکتا ہے جس کو فطرتِ صحیحہ اور جذبات سے کامل اتصال ہو اور بجائے جذبات کو مارنے کے وہ اُن کو صحیح طور پر اُبھارے اور فطرتِ صحیحہ اُس کی تصدیق کرے کہ ہاں یہ کلام میرے جسم کا دوسرا ٹکڑہ ہے اور فوراً اُس کی طرف لپک پڑے۔ اُس کے مقابلہ میں جو کلام فطرتِ صحیحہ کو مارنے کی کوشش کرتا ہے وہ یقیناً کتابِ مکنون کے مخالف چلتا ہے اور خواہ مُنہ اُسکی کس قدر ہی تصدیق کریں دل اُس پر مطمئن نہیں ہو سکتے اور وہ ضرور اپنے مقصد کے پورا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ کیونکہ وہ نصف دھڑ کی طرح ہے یا مجرّد نر ہے کہ جو بغیر مادہ کے بچّہ نہیں دے سکتا۔ غرض قرآن کریم کو یہ ایک بہت بڑی فضیلت حاصل ہے کہ وہ کتابِ مبین بھی ہے اور فطرتِ صحیحہ انسانیہ میں بھی یہ کتاب موجود ہے۔ یعنی اس کا کوئی حکم انسانی فطرت کے مغائر نہیں۔ لیکن چونکہ بغیر آسمانی مدد کے فطرتِ صحیحہ کے باریک خزائن کا بھی اظہار نہیں ہو سکتا اس لئے اللہ تعالیٰ کتاب مبین اتارتا ہے تاکہ اُس کے ذریعہ سے کتابِ مکنون کا ظہور ہو۔ اور کتابِ مکنون کے ذریعہ سے کتابِ مبین کی لوگوں کو شناخت ہو۔ اسی حقیقت کو صلحاء نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ یعنی دقائقِ فطرت کو سمجھنے سے ہی انسان کو خدا ملتا ہے۔ مگر یہ فقرہ ناقص ہے اور شعر کا صرف ایک مصرعہ ہے حق وہی ہے جو قرآن کریم نے بتایا ہے کہ عرفانِ نفس سے خدا ملتا ہے لیکن خدا تعالےٰ کے کلام کے بغیر عرفانِ نفس بھی حاصل نہیں ہوتا۔ گویا انسان اپنی حقیقت کو سمجھنے کیلئے بھی کتابِ مبین کا محتاج ہے اور یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہیں۔

پھر فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اے محمد رسول اللہ! یہ عظیم الشان کلام جو ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے اسے لوگوں تک پہنچانے اور انہیں اس لازوال دولت سے متمتع کرنے کے لئے تیرے دل میں بنی نوع انسان کی ہدایت کی اتنی شدید تڑپ پائی جاتی ہے کہ شاید تو اپنی جان کو اسی غم میں ہلاک کر لیگا کہ کیوں یہ لوگ اس کتابِ مبین پر ایمان نہیں لاتے جو اُن کی دنیوی اور اُخروی بہبود کے لئے نازل کی گئی ہے اور جس میں ان کی تمام روحانی اور جسمانی ترقیات کے راز مضمر ہیں۔ بَخَعَ کے معنے ہوتے ہیں: اس طرح چھری پھیری کہ گردن کے پچھلے حصّے تک پہنچ گئی۔ گویا ذبح کرنے میں مبالغہ اور سختی سے کام لیا۔ اِن معنوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے

اِس آیت میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی نوع انسان سے اتنی شدید محبّت تھی کہ وہ اُن کے غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے تھے۔ اور اُن کے ہدایت نہ پانے کو اس طرح محسوس کر رہے تھے جس طرح جوش سے بھرا ہُوا انسان آگے سے چھُری پھیرنا شروع کرتا ہے تو گردن کے پچھلے حصّہ تک کاٹ جاتا ہے۔ دنیا میں اب تک ہزاروں انبیاء گذرے ہیں۔ مگر بنی نوع انسان کی محبّت کا یہ مقام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اَور کسی کو نصیب نہیں ہُوا حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جہاں ایک طرف عقل و خرد کی بہترین مثال ہے وہاں اس کے ذریعہ جذبات کا بھی نہایت پاکیزہ طور پر ظہور ہُوا ہے اور یہ جذباتی تمثال حقیقتاً اس نہایت لطیف شعر کا مصداق ہے کہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دنیا میں خالی عقل نے کبھی زندگی نہیں پائی۔ زندگی ہمیشہ عشق نے پائی ہے۔ جذبات نے پائی ہے۔ دُنیا میں بڑے بڑے فلاسفر اور عاشق گذرے ہیں لیکن جو حکومت عشاق نے لوگوں کے دلوں پر کی وہ فلاسفروں کو حاصل نہیں ہوئی۔ انبیاء میں حقیقی عشق کی جو مثالیں ہیں انہیں نظر انداز کر دو اور مجازی عشق ہی کو لے لو۔ کتنے آدمی ہیں جو ارسطو یا افلاطون کی باتوں کو جانتے ہیں یا اُن کا نام بھی جانتے ہیں۔ مگر کتنے ہیں جو مجنوں اور لیلیٰ کو جانتے ہیں اور کتنے ہیں جو اُن کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی شہر یا قصبہ ایسا نہ ہوگا جہاں شاعر نہ ہوں اور یہ شاعر کون ہیں۔ لیلیٰ اور مجنوں کے شاگرد۔ اور اُن میں سے اُن شاعروں کو الگ کرکے جن کو خدا تعالےٰ نے قرآن کریم میں علیحدہ کر دیا ہے اور جو دین کی خدمت یا خدا تعالیٰ کو یاد کرنے کے لئے شعر لکھتے ہیں۔ باقی تمام وہی ہیں جو لیلیٰ مجنوں کی نقل کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ وہ لیلیٰ اور مجنوں نہیں ہوتے لیکن تم جس وقت اُن کا کلام سُنو گے تو ایسا معلوم ہوگا گویا انہوں نے کبھی کھانا ہی نہیں کھایا۔ کبھی تکیہ سے سر نہیں اُٹھایا کہ ساری رات اُن کی آنکھیں نہ کھلی رہی ہوں اور اُن کی آنکھیں کبھی خشک نہیں ہوئیں۔ جگر اور دل اُن کے جسم میں ہے ہی نہیں۔ مدّتیں ہوئیں کچھ خون بن کر اور کچھ پانی بن کر بہہ چکا ہے اور وہ جیتا جاگتا وجود جو تمہارے سامنے بیٹھا ہوگا کئی دفعہ مرا اور دفن ہو چکا اور اُس کے معشوق نے آکر اُس کی قبر کو ٹھکرا دیا۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ لیلیٰ اور مجنوں کو بھی عشق میں پیچھے چھوڑنا چاہتا ہے۔ تو جتنے دلوں پر عشق نے قبضہ کیا ہے عقل نے نہیں کیا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف عقل کے میدان میں ہی اپنی برتری ثابت نہیں کی بلکہ جذبات کے میدان میں بھی وہ سب عاشقوں سے آگے بڑھ گیا حتیّٰ کہ کوئی بھی عاشق عشق میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خدا تعالیٰ کے عشق کو جانے دو کیونکہ وہ تمام لوگوں کی رسائی سے بالا ہوتا ہے۔ انسانی عشق کو لے لو۔ مجنوں کیا تھا ایک عورت کا عاشق تھا اُس کا عشق باغرض تھا وہ اُس سے متمتّع ہونا چاہتا تھا۔ اُس کے حسن سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا مگر اُس کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق جو دُنیا سے تھا وہ کسی فائدہ کی غرض سے نہ تھا۔ تمتّع کے خیال سے نہ تھا اور پھر وہ ایک دو سے نہیں۔ دوستوں اور پیاروں سے نہیں حسینوں سے نہیں بلکہ سب سے تھا اور بدصورتوں سے اَور بھی زیادہ تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :- لَعَلَّكَ

بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ - اے محمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) شاید تُو اپنی جان کو ہلاک کر دیگا اُن خوبصورتوں کے لئے نہیں جنہوں نے ابوبکرؓ اور عمرؓ کی طرح ایمان لاکر اپنے چہروں کو منوّر کر لیا تھا بلکہ اُن بدصورت اور بھونڈی شکل کے لوگوں کے لئے جنہیں دیکھ کر گھن آتی تھی جنہیں دیکھ کر روحانی شخص کو متلی ہونے لگتی تھی جیسے عتبہ اور شیبہ اور ابوجہل وغیرہ تو اُن کے عشق میں مرا جاتا تھا کہ کیوں اِن کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ مجنوں کا عشق اِس کے مقابلہ میں کیا ہے۔ اُس نے اس سے محبت کی جس کی شکل اُسے پسند تھی لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق اُن لوگوں سے بھی تھا جن کی روحانی شکل آپ کو ناپسند تھی۔ پھر اُس کا عشق کسی ایک سے نہیں ساری دنیا سے وابستہ تھا۔ صرف اس زمانہ کے لوگوں سے ہی نہیں بلکہ آئندہ زمانوں سے بھی جیسا کہ فرمایا۔ وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (جمعہ آیت ۴) یعنی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف اپنے زمانہ کے لوگوں کو ہی فائدہ پہنچانا نہیں چاہتا بلکہ اُن لوگوں کے لئے بھی جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اپنے دامنِ فیض کو ممتد کرنا چاہتا ہے پس غور کرو جذباتی دنیا میں اس کا وجود کتنا عظیم الشان ہے۔ اس کے عشق کی انتہا ہی نہیں۔ وہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ سُلگاتا ہے۔ پھر اُس سے آسمانوں کی طرف پرواز کرتا ہے اور اُس کی رُوح خدا کے آستانہ پر گر جاتی ہے اور اُس کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت سے چنگاری لیتی ہے گویا محدود محبّت غیر محدود محبّت کو کھینچتی ہے اور پھر دُنیا میں آتی ہے اور بعینہٖ اُسی طرح جس طرح مشرق سے نکل کر آفتاب کی شعاعیں روئے زمین پر پھیلنی شروع ہو جاتی ہیں اُسکی محبّت بھی پھیلتی ہے۔ مشرق و مغرب۔ گورے اور کالے خوبصورت اور بدصورت سب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ پھر وہ مکان کی حد بندیوں کو توڑتی ہوئی نکل جاتی ہے اور صدیوں کے بعد صدیاں گذرتی ہیں مگر وہ محبت ختم نہیں ہوتی اور نہ ہو گی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اِس دُنیا کی صف لپیٹ دے۔ اور بنی نوع انسان کو دُنیا سے اُٹھا لے۔

یوں تو ہر نیک بندے پر محبت کے ایّام کبھی کبھی آتے ہیں۔ حضرت نظام الدینؒ صاحب اولیاء کے متعلق ذکر آتا ہے کہ ایک دفعہ اپنے شاگردوں کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک خوبصورت لڑکا گذرا۔ آپ نے آگے بڑھ کر اُس کا مُنہ چُوم لیا۔ اِسپر شاگردوں نے بھی ایسا ہی کرنا شروع کر دیا کہ شاید اِس میں جلوۂ الٰہی ہو۔ ایک شاگرد جو آپ کے خاص منظورِ نظر تھے انہوں نے ایسا نہ کیا۔ باقیوں نے اِس پر چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ آگے چلے تو ایک بھٹیاری بھٹی میں آگ جلا رہی تھی اور پتّوں کی آگ کے شعلے نکل رہے تھے جو ایک خوبصورت نظارہ پیش کر رہے تھے۔ آپ کھڑے ہو کر اُسے دیکھتے رہے پھر جھکے اور شعلے کو بوسہ دیا۔ اُسوقت اُس شاگرد نے بھی شعلہ کو چُوما۔ جس نے لڑکے کو نہیں چُوما تھا لیکن باقی شاگرد کھڑے رہے اور کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ اِسپر انہوں نے کہا کہ تم لوگوں نے خوبصورت بچّے کو چُوما تھا کیونکہ چھوٹا بچّہ سب کو پیارا لگتا ہے۔ حالانکہ خواجہ صاحبؒ کو اِس میں خدا کا جلوہ نظر آیا تھا۔ اِس لئے انہوں نے اُسے چُوما تھا۔ لیکن مجھے چونکہ نظر نہ آیا۔ اِس لئے مَیں نے نہ چُوما۔ اب اِس آگ میں مجھے خدا کا جلوہ نظر آیا اور مَیں نے اسے چُوم لیا اور یہاں آپ کی اتباع کی۔ لیکن وہاں میری آنکھیں نہ کھلیں اسلئے

نہ کی بلکن تم نے ہوا و ہوس کے ماتحت بچہ کو چوما تھا تو وقتی طور پر ہر بزرگ پر ایسا وقت آتا ہے کہ بنی نوع انسان کی محبت سے وہ لبریز ہو جاتا ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وقتی نہ تھی اور آپ کی روح اور جسم کا ایک حصّہ تھی جس کا پتہ اس سے لگتا ہے کہ جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔ کہ لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَاءِھِمْ مَسَاجِدَ (مسلم جلد اوّل کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ) یعنی خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ گویا آپ کے دل میں تڑپ تھی کہ یہود اور نصاریٰ کیوں اپنے لئے جہنم خرید رہے ہیں اور پھر اپنے ماننے والوں کو تنبیہ کی کہ وہ ایسا نہ کریں۔ گویا سکرات موت کے وقت بھی آپؐ کے اندر مسلمانوں اور کفار دونوں کی محبّت کا جلوہ تھا۔ ایک طرف یہود اور نصاریٰ کو شرک سے بچانے کا درد تھا۔ دوسری طرف یہ درد تھا کہ یہی غلطی میرے ماننے والے بھی نہ کریں۔ غرض آپ کی ساری زندگی یہ ثابت کرتی ہے کہ آپ بنی نوع انسان کے ہر طبقہ کے لئے ہمدردی رکھتے تھے۔

احادیث میں آتا ہے کہ پہلے زمانوں میں خدا تعالیٰ کا دین قبول کرنے والوں کے سروں پر آرے رکھ کر انہیں چیر دیا جاتا تھا اور وہ اُف تک نہیں کرتے تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک سال نہیں دو سال نہیں تین سال نہیں دس سال نہیں متواتر وفات تک آرے چلتے رہے اور آپؐ نے اس قدر دُکھ اُٹھائے کہ زمین و آسمان کے خدا کو یہ کہنا پڑا کہ تُو تو اس غم میں اپنے آپ کو ہلاک کر رہا ہے کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح نے ایک دفعہ صلیب پر چڑھ کر سب گنہگاروں کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ مگر مسیح کو تو ساری عمر میں صرف وہی ایک واقعہ پیش آیا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں لوگوں کے لئے صلیب پر چڑھے اور آپ نے اُن کے لئے ہزاروں نہیں لاکھوں موتیں قبول کیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ الفاظ جو اسجگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں نہ نوحؑ کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ نہ ابراہیمؑ کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ نہ موسٰیؑ کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ نہ داؤدؑ اور سلیمانؑ کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ نہ عیسٰیؑ کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ کیونکہ دنیا کی اصلاح اور اُن کی ہدایت کا جو غم آپ کو تھا وہ دنیا میں اور کسی نبی کو نہیں تھا۔ چنانچہ جب ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ دعویٰ ایک حقیقت بن کر نظر آتا ہے اور ہمیں قدم قدم پر ایسے واقعات دکھائی دیتے ہیں جو آپ کی اس عظیم الشان محبّت اور شفقت کا ثبوت ہیں جو آپ کو بنی نوع انسان سے تھی۔ چنانچہ آپ کو خدائے واحد کا پیغام پہنچانے کے لئے سال ہا سال تک ایسی تکالیف میں سے گذرنا پڑا کہ جن کی کوئی حد ہی نہیں۔ ایک دفعہ خانہ کعبہ میں کفار نے آپؐ کے گلے میں پٹکا ڈال کر اتنا گھونٹا کہ آپؐ کی آنکھیں سُرخ ہو کر باہر نکل پڑیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے سُنا تو وہ دوڑتے ہوئے آئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تکلیف کی حالت میں دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ نے اُن کفار کو ہٹاتے ہوئے کہا خدا کا خوف کرو۔ کیا تم ایک شخص پر اس لئے ظلم کر

رہے ہو کہ وہ کہتا ہے خدا میرا ربّ ہے۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں ایک چٹان پر بیٹھے کچھ گہری فکر میں تھے کہ اچانک ابوجہل آنکلا۔ اور اُس نے آتے ہی آپؐ کو تھپڑ مارا اور پھر گندی سے گندی گالیاں آپ کو دینی شروع کر دیں۔ آپؐ نے تھپڑ بھی کھا لیا اور گالیاں بھی سُنتے رہے مگر آپ نے زبان سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ جب وہ گالیاں دے کر چلا گیا تو آپ خاموشی سے اٹھے اور اپنے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت حمزہؓ کی ایک لونڈی اپنے گھر میں سے دروازہ میں کھڑی یہ سارا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ حمزہؓ اُسوقت تک اسلام نہیں لائے تھے وہ سپاہی آدمی تھے اور سارا دن شکار میں لگے رہتے تھے اور شام کے وقت اپنے گھر آتے تھے اُس روز بھی وہ شام کے وقت سینہ تان کر بڑے زور زور سے پیر مارتے اور ہاتھ میں تیر کمان پکڑے اونچی بنے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ وہ لونڈی گھر کی پُرانی خادمہ تھی اور پُرانے نوکر بھی رشتہ داروں کی طرح ہوتے ہیں صبح سے وہ اپنا غصّہ دبائے بیٹھی تھی جب اُس نے حمزہؓ کو دیکھا تو بڑے جوش سے کہنے لگی۔ تمہیں شرم نہیں آتی تیر کمان لئے جانور مارتے پھرتے ہو تمہیں پتہ ہے کہ صبح تمہارے بھتیجے کے ساتھ کیا ہوا؟ حمزہؓ نے کہا کیا ہوا؟ اُس نے کہا۔ مَیں دروازہ میں کھڑی تھی۔ تمہارا بھتیجا سامنے پتھر پر آرام سے بیٹھا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ابوجہل آیا اور اُس نے پہلے تو اُسکو تھپڑ مارا۔ اور پھر بے تحاشا گالیاں دینی شروع کر دیں۔ پھر اُس نے اپنے زنانہ انداز میں کہا۔ اُس نے ابوجہل کو کچھ بھی تو نہیں کہا تھا۔ کوئی بات اُس نے نہیں کی تھی جس کی وجہ سے ابوجہل کو غصّہ آتا۔ مگر پھر بھی وہ گالیاں دیتا گیا اور دیتا گیا۔ اور تمہارا بھتیجا چپ کر کے سامنے کی طرف دیکھتا رہا۔ اور اُس نے اُن کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک عورت اور پھر خادمہ کی زبان سے یہ بات سُنکر حمزہؓ کی غیرت جوش میں آئی اور خانہ کعبہ کی طرف چل پڑے۔ رؤساء مکّہ کا طریق تھا کہ شام کے وقت وہ خانہ کعبہ میں بیٹھ کر اپنی بڑائیاں بیان کیا کرتے اور لوگ اُن کی تعریف کرتے تمام رؤساء بیٹھے ہوئے تھے اور ابوجہل بھی اُن میں موجود تھا کہ حمزہؓ گئے اور انہوں نے وہی کمان جو اُن کے ہاتھ میں تھی۔ ابوجہل کے مُنہ پر ماری اور کہا مَیں نے سُنا ہے تم نے محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مارا بھی ہے اور گالیاں بھی دی ہیں اور مَیں نے سُنا ہے محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کوئی لفظ تم کو نہیں کہا تھا جس کے بدلہ میں تم گالیاں دیتے۔ پھر حمزہؓ نے کہا تم بہادر بنے پھرتے ہو۔ اور جو چپ کر جاتا ہے اُس پر ظلم اور تعدّی کرتے ہو۔ اب مَیں نے سارے مکّہ کے سامنے تمہیں مارا ہے اگر تم میں ہمّت ہے تو مجھے مار کر دیکھو۔ مکّہ کے نوجوان حمزہؓ کو پکڑنے کے لئے اُٹھے۔ مگر ابوجہل پر اُن کا ایسا رُعب طاری ہوا کہ اُس نے کہا جانے دو۔ صبح مجھ سے ہی کچھ زیادتی ہو گئی تھی۔ (السیرۃ الحلبیہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۵)

ایک دفعہ آپ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے جب آپ سجدہ میں گئے تو بعض شریروں نے آپؐ کی پیٹھ پر اونٹ کی اوجھری لاکر رکھ دی اور چونکہ وہ بڑی بھاری تھی آپ سجدہ سے سر نہ اُٹھا سکے۔ حضرت فاطمہؓ کو اس بات کا علم ہوا تو وہ روتی ہوئی آئیں۔ اور انہوں نے آپؐ کی پیٹھ پر سے اوجھری ہٹائی (بخاری ابواب الوضوء باب اذا القی علی ظہر المصلّی قذر او جیفۃ لم تفسد علیہ صلوتہ) ایک دفعہ آپؐ بازار سے گذر رہے تھے کہ مکّہ کے اوباشوں کی ایک جماعت آپؐ کے گرد ہو گئی اور رستہ بھر آپ کی گردن پر یہ کہکر تھپّڑ مارتی چلی گئی۔

کہ لوگو! یہ وہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں۔
آپ کے گھر میں اردگرد کے گھروں سے متواتر
پتھر پھینکے جاتے تھے۔ باورچی خانہ میں گندی چیزیں
پھینکی جاتی تھیں جن میں بکریوں اور اونٹوں کی انتڑیاں
بھی شامل ہوتی تھیں۔ جب آپ نماز پڑھتے تو آپؐ کے
اوپر گرد و غبار ڈالی جاتی۔ حتیٰ کہ مجبور ہو کر آپؐ کو چٹان
میں سے نکلے ہوئے ایک پتھر کے نیچے چھپ کر نماز پڑھنی
پڑتی۔ مگر اس کے باوجود آپ خدائے واحد کا نام بلند
کرتے چلے گئے اور ان لوگوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ
سے دعائیں بھی کرتے رہے۔

جب مکہ والوں نے دیکھا کہ ہمارے یہ مظالم بھی
اس شخص کے پائے استقلال میں کوئی جنبش پیدا نہیں
کر سکے تو انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور
آپکے تمام ساتھیوں کا کلی طور پر مقاطعہ کر دیا۔ اور انہیں
شعب ابی طالب میں محصور کر دیا۔ اور فیصلہ کیا کہ کوئی
شخص ان کے پاس سودا فروخت نہ کرے اور نہ ان سے
لین دین کرے اور برابر تین سال تک انہوں نے آپ کا
مقاطعہ جاری رکھا۔ ان ایام میں صحابہؓ کو ایسی تکلیف
سے اپنے دن بسر کرنے پڑے کہ بعض دفعہ وہ درختوں
کے پتے کھا کر گذارہ کرتے تھے اور بعض دفعہ انہیں
کھجور کی گٹھلیاں کھانی پڑیں اور یہ سلسلہ صرف چند دن
یا چند ہفتے یا چند مہینے جاری نہیں رہا بلکہ تین سال تک
جاری رہا۔ تین سال کے بعد مکہ کے چند شرفاء کے دل میں
اس ظلم کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی اور انہوں نے اس
معاہدہ کو توڑ کر محصورین کو باہر نکال لیا۔ مگر ان تین سالہ
لمبے مظالم کا یہ نتیجہ نکلا کہ تھوڑے دنوں کے بعد ہی آپ
کی وفا شعار بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال
ہو گیا کیونکہ اس لمبے مقاطعہ نے اُن کی صحت پر بُرا اثر
ڈالا تھا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس مقدس خاتون کے بیسیوں
غلام تھے اور جو مکہ کے مالدار اشخاص میں سے تھیں جو بیسیوں
گھرانوں کو کھانا کھلا کر خود کھانا کھایا کرتی تھیں بڑھاپے
میں جب انہیں کئی کئی فاقے کرنے پڑے اور اگر کچھ کھانے
کو ملا بھی تو درختوں کے پتے یا کھجور کی گٹھلیاں تو اُسوقت
اُن کی صحت پر کیا اثر پڑا ہوگا۔ چنانچہ اس تکلیف کی
وجہ سے اُن کا انتقال ہو گیا اور پھر چند دن اور گذرے
کہ حضرت ابو طالب بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے
مگر اتنے لمبے ظلم کے باوجود آپؐ نے شعب ابی طالب سے
اپنا قدم باہر رکھتے ہی فیصلہ کیا کہ اگر مکہ کے لوگ
خدا تعالیٰ کی آواز سننے کے لئے تیار نہیں تو مکہ سے باہر
رہنے والوں کو مجھے خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانا چاہیئے
شاید اُن میں کوئی سعید روح ہو جو اللہ تعالیٰ کی
آواز پر لبیک کہے اور اُسے قبول کر کے اُس کی
برکات کی وارث ہو۔ چنانچہ آپ طائف تشریف لے
گئے جو مکہ سے قریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر ایک مشہور
شہر ہے اور لوگوں کو خدائے واحد کی طرف بلایا۔ مگر
بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو سنتے اور
اُسے قبول کرتے انہوں نے لڑکوں کو اُکسایا اور انہوں
نے پتھروں سے اپنی جھولیاں بھر لیں اور رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ آپؐ کے پاؤں
پتھروں کی بوچھاڑ سے لہو لہان ہو گئے اور حضرت زیدؓ
بھی جو آپ کے ساتھ تھے آپؐ کو بچاتے ہوئے سخت
زخمی ہوئے۔ مگر وہ برابر کئی میل تک آپ کو پتھر مارتے
چلے گئے۔ آپ واپس بھاگتے ہوئے کسی جگہ دم لینے
کے لئے ٹھہرے تو جسم اطہر سے خون پونچھتے اور ساتھ
ہی فرماتے۔ اے میرے رب! یہ لوگ نہیں جانتے کہ
میں کون ہوں تو انہیں معاف فرما۔ راستہ میں مکہ کے
ایک سردار کا باغ تھا۔ آپ وہاں ذرا سستانے کے
لئے ٹھہر گئے۔ اُس نے جب آپؐ کے کپڑوں کو خون سے

لت پت دیکھا تو اُس کے دل میں درد پیدا ہُوا اور اُس نے اپنے ایک غلام کو بُلایا اور اُسے انگور کے چند خوشے دیئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زیدؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دو آدمی جو درخت کے نیچے بیٹھے ہیں۔ اُن کے پاس جاؤ۔ اور انہیں یہ انگور کھلاؤ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُسوقت زخموں سے چُور چُور تھے اور بہت دیر تک دشمن کے آگے بھاگے آئے تھے۔ لیکن اِدھر یہ غلام آپ کے پاس پہنچا اور اُدھر آپ نے اُس غلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ اُس نے جواب دیا۔ میں نینوا کا رہنے والا ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا! تم میرے بھائی یونسؑ کے وطن کے ہو۔ آپؐ کا یہ فقرہ سُنکر اس غلام کے کان کھڑے ہوگئے کہ یہ عرب کا باشندہ ہونے کے باوجود نینوا کے رہنے والے یونسؑ کو اپنا بھائی تصوّر کرتا ہے۔ اُس نے آپ سے پُوچھا آپ کا کیا حال ہے اور لوگوں نے آپ سے ایسا سلوک کیوں کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ تم تو یونسؑ کے ملک کے ہو تم جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو مصلح دنیا میں آتے ہیں۔ اُن سے ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ میں نے اِن لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑا۔ میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ تم ایک خدا کی طرف آؤ اور بتوں کی پرستش نہ کرو اور میں تمہیں بھی یہی بات کہتا ہوں کہ تم خدا تعالیٰ کی باتوں پر عمل کرو۔ وہ غلام عیسائی تھا۔ اُسے آپ کی باتیں سُنکر یقین ہوگیا کہ یہ شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ چنانچہ جسطرح انجیل میں حضرت مسیحؑ کے متعلق آتا ہے کہ ایک عورت آپ کے پاس آئی اور اُس نے آنسوؤں سے آپکے پاؤں دھونے شروع کر دیئے اور بالوں سے آپکے پاؤں کی مٹی کو صاف کیا (لوقا باب ۷ آیت ۳۸) اِسی طرح وہ غلام بھی آپ کے قدموں میں گر گیا اور اُس نے اپنے ہاتھوں سے آپ کے پاؤں کی مٹی اور خون صاف کرنا شروع کر دیا۔ اور محبّت سے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ جب وہ واپس گیا تو باغ کے مالک نے اُسے ڈانٹا کہ تم نے یہ کیا کیا۔ مگر اس کا دل کُھل چکا تھا۔ اور وہ آپؐ پر ایمان لا چکا تھا۔ اور اب کوئی مخالفت اُسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے علیحدہ نہیں کر سکتی تھی۔

بنی نوع انسان کے لئے یہ کیسی عظیم الشان تڑپ ہے جو آپؐ کے سینہ و دل میں پائی جاتی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس ایک عورت آئی۔ اور اُس نے کہا۔ اے استاد! مجھے بھی وہ تعلیم سُنا جو تو اپنی قوم کو دیتا ہے۔ مگر انہوں نے کہا۔ میرے پاس تیرے لئے کچھ نہیں۔ یہ تعلیم صرف بنی اسرائیل کے لئے ہے جو میرے بیٹے ہیں۔ اور بیٹوں کی روٹی میں کُتّوں کے آگے کیسے پھینک سکتا ہوں (متی باب ۱۵ آیت ۲۶) مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا جو آپ کی قوم کا نہ تھا۔ ایسے وقت میں آیا جب آپ زخموں سے چُور چُور تھے اور خون سے لت پت دُور تک دشمن کے آگے آگے بھاگے چلے آئے تھے۔ اور ایک ایسی جگہ پر آیا جو آپ کے دشمن کی تھی۔ اور ذرا سی تبلیغ کرنے سے بھی ایک بڑی آفت آ سکتی تھی۔ وہ آتا ہے اور خود بھی نہیں کہتا کہ مجھے تبلیغ کرو۔ مگر اُسے دیکھتے ہی آپؐ تبلیغ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ آپؐ کے لئے عرب اور غیر عرب برابر تھے۔ آپؐ کے دُکھ اور آپؐ کی تکالیف صرف عرب قوم کے لئے ہی نہیں تھیں۔ بلکہ کالے گورے۔ عربی

مصری۔ ہندوستانی سب کے لئے تھیں اور آپ اپنی ایک ایک حرکت میں اس بات کا احساس رکھتے تھے کہ لوگوں کو ہدایت میسر آجائے اور وہ خدائے واحد کے آستانہ کی طرف لوٹ آئیں۔ آپ کا یہ سفر جو آپ کی قربانی اور ایثار کا ایک زندہ نمونہ ہے سر ولیم میور کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اُسے اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں یہ الفاظ لکھنے پر مجبور ہونا پڑا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طائف کے سفر میں ایک شاندار شجاعانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ اکیلا آدمی جس کی اپنی قوم نے اُس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور اسے دھتکار دیا خدا کے نام پر بہادری کے ساتھ نینوا کے یوناہ نبی کی طرح ایک بُت پرست شہر کو توبہ کی اور خدائی مشن کی دعوت دینے کے لئے نکلا۔ یہ امر اُس کے اس ایمان پر کہ وہ اپنے آپ کو کلی طور پر خدا کی طرف سے سمجھتا تھا ایک بہت بڑی روشنی ڈالتا ہے۔"

سفر طائف سے واپسی پر مکہ والوں نے پھر ایذا دہی اور استہزاء کے دروازے کھول دیئے۔ مگر آپ محبت اور پیار سے مکہ والوں کو بُت پرستی کے خلاف وعظ کرتے رہے۔ لوگ بھاگتے تو آپ اُنکے پیچھے جاتے۔ وہ مُنہ پھیرتے تو آپ پھر بھی باتیں سُناتے۔ آخر اُن کے متواتر مظالم کی وجہ سے رسول کریمؐ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا وطن، وہ وطن جس میں تیرہ سال تک آپؐ تبلیغ ہدایت کرتے رہے تھے۔ اور جس کے رہنے والوں کو آپؐ نے سب سے پہلے خطاب کیا تھا رات کے وقت چھوڑنا پڑا اور چھپتے چھپاتے آپ مدینہ پہنچے مگر دشمن نے وہاں بھی آپ کا پیچھا نہ چھوڑا اور متواتر مدینہ پر حملے ہوتے رہے۔ ایک سو میل کے قریب وہ لڑائیاں ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو لڑنی پڑیں اور اُن میں سینکڑوں صحابہؓ اور آپؐ کے عزیز ترین رشتہ دار مارے گئے۔ مگر آپؐ نے خدائے واحد کا نام بلند کرنے کے سلسلہ میں کبھی کسی مصیبت کو ایک پرکاہ کے برابر بھی نہیں سمجھا۔ آپ صبح بھی اور شام بھی اور دن کے اوقات میں بھی اور رات کی تاریکیوں میں بھی اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں کو پہنچاتے چلے گئے اور اس بارہ میں نہ آپ نے جانی قربانی سے دریغ کیا۔ نہ مالی قربانی سے دریغ کیا۔ نہ جذبات اور احساسات کی قربانی سے دریغ کیا اور نہ عزیزوں اور رشتہ داروں کی قربانی سے دریغ کیا۔ آپ کی دو بیٹیاں ابولہب کے دو بیٹوں سے بیاہی ہوئی تھیں اُس نے دھمکی دی کہ اگر آپ توحید کی تعلیم ترک نہیں کریں گے تو میں اپنے بیٹوں سے کہکر آپؐ کی دونوں بیٹیوں کو طلاق دلوا دونگا۔ مگر آپؐ نے پروا نہ کی اور اُس بدبخت نے اپنے بیٹوں سے کہکر آپؐ کی دونوں بیٹیوں کو طلاق دلوا دی۔ پھر ہر خطرے کے مقام پر دشمن کا اوّلین نشانہ صرف آپؐ کا وجود ہوتا تھا مگر جب بھی کوئی موقعہ آیا آپؐ نے اس بہادری سے اس خطرے کی آگ میں اپنے آپ کو پھینکا کہ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ اپنی جان کی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتے تھے۔ غزوہ اُحد کے موقعہ پر ایک پتھر آپ کے خود پر آ لگا اور اُس کے کیل آپؐ کے سر میں گھس گئے اور آپؐ بے ہوش ہو کر اُن صحابہؓ کی لاشوں پر جا پڑے جو آپؐ کے اردگرد لڑتے ہوئے شہید ہو چکے تھے اور اُس کے بعد کچھ اور صحابہؓ کی لاشیں آپؐ کے جسم اطہر پر جا گریں اور لوگوں نے یہ سمجھا کہ آپ مارے جا چکے ہیں۔ مگر جب آپؐ کو گڑھے سے نکالا گیا۔ اور آپ کو ہوش آیا تو آپؐ نے یہ خیال ہی نہ کیا کہ دشمن نے مجھے زخمی کیا ہے۔ میرے دانت توڑ دیئے ہیں

اور میرے عزیزوں اور رشتہ داروں اور دوستوں کو شہید
کر دیا ہے بلکہ آپ نے ہوش میں آتے ہی دُعا کی کہ :-
رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ - اے
میرے رب! یہ لوگ میرے مقام کو شناخت نہیں کر سکے
اس لئے تُو ان کو بخش دے اور ان کے گناہوں کو معاف
فرما دے - اسی طرح طائف میں جب آپ کو پتھروں سے
لہو لہان کیا گیا اور آپ وہاں سے دوڑتے چلے آ رہے
تھے تو احادیث میں لکھا ہے کہ یکدم آپ پر کشفی حالت
طاری ہوئی اور پہاڑوں کا فرشتہ آپ کی خدمت میں
حاضر ہوا - اور اُس نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو طائف
والوں پر ابھی اُن کے پہلو کے دونوں پہاڑ اُلٹا دیئے جائیں
مگر آپ نے فرمایا ایسا نہ کرنا - اِن لوگوں نے جو کچھ کیا
ہے جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے کیا ہے - مجھے اُمید
ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کی نسل میں سے وہ لوگ
پیدا کرے گا جو اسلام کے خدمت گذار ہوں گے -
(بخاری کتاب بدء الخلق) چنانچہ واقعات بتاتے ہیں - کہ
باوجود اس کے کہ دشمنوں نے آپ کو مجنون بھی کہا - کاہن
بھی کہا - ساحر بھی کہا کذّاب بھی کہا اور ہر رنگ میں انہوں
نے آپ کے مشن کو مٹانا چاہا - مگر آخر انہی میں سے ایسی
سعید روحیں نکل آئیں جنہوں نے دلیری سے صداقت
کو قبول کر لیا اور اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر وہ دیوانہ وار
اسلام کی اشاعت کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور تھوڑے
عرصہ میں ہی انہوں نے چہار دانگ عالم کو اسلامی نور سے
منوّر کر دیا -

غرض لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ
میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس بے مثال شفقت اور
محبت کا ذکر کیا گیا ہے جو آپ کو بنی نوع انسان سے تھی
اور بتایا گیا ہے کہ آپؐ اُن کی ہدایت کے لئے رات اور
دن اس قدر جدوجہد فرماتے اور اتنی دُعائیں کرتے تھے
کہ قریب تھا کہ آپ اس غم سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے
آپ کو نہ اپنے کھانے کی پرواہ تھی نہ پینے کی پرواہ تھی -
نہ نیند اور آرام کی پرواہ تھی - آپ لوگوں کو ہلاکت کے
گڑھوں سے بچانے اور انہیں نجات اور سلامتی کا راہ
دکھانے کے لئے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور
گریہ وزاری کرتے اور اتنی اتنی دیر کھڑے رہتے کہ آپ
کے پاؤں متورّم ہو جاتے - گویا جس طرح جوش کی حالت
میں بعض دفعہ انسان بکرے پر چھری چلاتے ہوئے اُس
چُھری کو گردن کے آخری حصّہ تک پہنچا دیتا ہے اور
قریب ہوتا ہے کہ اگر ذرا سا بھی اور زور لگ جائے
تو اُس کی گردن کٹ کر پرے جا پڑے - اسی طرح محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جان کو ہلاک کرنے میں کوئی کسر
اُٹھا نہیں رکھی تھی - اور اگر آپ کی جان بچی تو اس کے
یہ معنے نہیں کہ آپ نے کوئی کمی کی تھی بلکہ اس کے معنے
یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی غیر معمولی حفاظت فرمائی
ورنہ آپؐ نے اپنی جان کو ہلاک کرنے میں کوئی کسر نہیں
اُٹھا رکھی تھی -

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امتیازی خصوصیت
جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے اس میں
مومنوں کے لئے بھی بڑا بھاری سبق ہے اور انہیں توجہ
دلائی گئی ہے کہ اگر تم ترقی کرنا چاہتے ہو تو اپنی قربانیوں
کو اس حد تک پہنچاؤ کہ دشمن کی نظر میں تو وہ صریح خودکشی
ہو - مگر تم جانتے ہو کہ وہ خودکشی نہیں بلکہ اسی میں تمہاری
ابدی حیات کا راز مضمر ہے - قرآن کریم میں جنگ اُحد
کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُسوقت منافق کہتے
تھے کہ اگر ہمیں علم ہوتا کہ لڑائی ہو گی تو ہم ضرور ساتھ دیتے
(آل عمران آیت ۱۶۸) اس کے یہ معنے نہیں کہ انہیں علم نہیں
تھا کہ لڑائی ہو گی بلکہ بات یہ ہے کہ انہوں نے مشورہ
دیا تھا کہ لڑائی کے لئے مدینہ سے باہر نہ نکلیں - اور

إِنْ نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ

اگر ہم چاہیں تو آسمان سے اُن پر ایک ایسا نشان اُتار دیں کہ اُس کے سامنے اُن کی

اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۞ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ

گردنیں جُھکی کی جُھکی رہ جائیں۔ اور رحمٰن کی طرف سے کبھی کوئی نیا ذکر

الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ۞ فَقَدْ

نہیں آتا کہ جس سے لوگ اعراض نہ کرتے ہوں۔ سو (چونکہ) انہوں نے

كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۞

(خدا تعالیٰ کی آیتوں کو) جھٹلایا ہے اس کے نتیجہ میں اُن کے استہزاء کی حقیقت ضرور اُن پر کھُل جائے گی۔ ۳ـــ

اِس پر دو روز بحث ہوتی رہی پس منافق باہر نکل کر لڑنے کو خودکشی قرار دیتے تھے اور جب وہ یہ کہتے تھے کہ اگر ہمیں لڑائی کا علم ہوتا تو ہم ضرور جاتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم تو اسے لڑائی نہیں بلکہ خودکشی سمجھتے تھے۔ اِس لئے شامل نہ ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنی مومن جماعت کے سپرد ہمیشہ ایسے کام کرتا ہے جنہیں لوگ خودکشی سمجھتے ہیں۔ اُن جماعتوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانیں اپنے اموال اپنے اوقات اور اپنی عزت و آبرو غرض سب کچھ قربان کر دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے یہانتک کہ لوگ کہنے لگ جاتے ہیں کہ یہ پاگل ہیں جو اتنی بڑی قربانیاں کر رہے ہیں اور منافق بھی کہتے ہیں کہ یہ بیوقوف لوگ ہیں جو ہمیں بھی بیوقوف بنانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم بھی اِسی طرح قربانی کرو جس طرح ہم کر رہے ہیں غرض منافق بھی اور مخالف بھی سب اُسے ہلاکت سمجھتے ہیں۔ مگر مومن جانتے ہیں کہ یہ ہلاکت نہیں بلکہ زندگی کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہے پس لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ میں صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک بے مثال خصوصیت اور آپ کی شفقت علیٰ خلق اللہ کا ایک بے نظیر نمونہ ہی پیش نہیں کیا گیا بلکہ مومنوں کو یہ نصیحت بھی کی گئی ہے کہ اگر تم خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی قربانیوں کو اِس حد تک پہنچا دو کہ دوست اور دشمن کی نگاہ میں تمہاری گردن کٹنے کے قریب پہنچ جائے اور ہر شخص یہ سمجھے کہ تم موت کے مُنہ میں جا رہے ہو۔ یہی وہ مقام ہے جو روحانی جماعتوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ اِس کے بغیر انہیں ابدی حیات حاصل نہیں ہو سکتی۔

۳ـــ حل لغات

اَعْنَاقٌ (۲) — اَعْنَاقٌ : عُنُقٌ اور عُنْقٌ کی جمع ہے اور اَلْعُنُقُ کے معنے گردن کے ہیں۔ اِسی طرح اِس کے معنے ہیں اَلرُّءُوْسَاءُ سردارانِ قوم اَلْجَمَاعَةُ مِنَ النَّاسِ لوگوں کی جماعت (اقرب)

خٰضِعِيْنَ (۲) — خَاضِعِيْنَ : خَاضِعٌ کی جمع ہے جو خَضَعَ سے اسم فاعل ہے اور خَضَعَ لَهٗ کے معنے ہیں اِنْقَادَ مطیع ہو گیا۔ پس خَاضِعٌ کے معنے ہونگے جھکنے والا مطیع ہونے والا۔ (اقرب)

مُحْدَثٍ

مُحْدَثٍ کے معنے ہیں نَقِیْضُ الْقَدِیْمِ یعنی نیا (اقرب)

تفسیر:- فرماتا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ہم اُن پر ایسا عذاب نازل کریں کہ جس کی وجہ سے مجبور ہو کر اُن کی گردنیں جُھک جائیں۔ اور یہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے لگ جائیں لیکن اگر ہم ایسا کریں تو پھر اُن کے ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ایمان اسی حالت میں انسان کے لئے فائدہ بخش ثابت ہو سکتا ہے جب خیر اور شر دونوں مخفی ہوں۔ جو چیز کھلے طور پر نظر آ رہی ہو اُس پر ایمان لانے سے کوئی انعام میسّر نہیں آیا کرتا۔ جیسے سورج ایک خیر رکھنے والی چیز ہے، اور اُس کا وجود قطعی طور پر ظاہر ہے لیکن سورج کے وجود کو تسلیم کر لینا انسان کو کسی انعام کا مستحق نہیں ٹھہرا سکتا۔ اور اگر کوئی کہے کہ جب تمہیں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے سے انعام ملے گا تو ہمیں سورج پر ایمان لانے سے کیوں انعام نہیں مل سکتا۔ تو ہم اُسے یہی کہیں گے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا علم چونکہ جستجو اور جدوجہد اور قربانی کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ اِس لئے آپ پر ایمان لانا انسان کو اللہ تعالےٰ کے روحانی انعامات کا مستحق بنا دیتا ہے مگر سورج پر ایمان لانے کے لئے چونکہ کسی جدوجہد جستجو اور قربانی کی ضرورت نہیں ہوتی اور اُس کی حقیقت کلی طور پر ظاہر ہوتی ہے اس لئے اُس پر ایمان لانے سے کوئی انعام نہیں مل سکتا اور اگر اس جواب پر بھی کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو آپ کے ماننے والوں کو قربانیاں کرنی پڑیں جس کی وجہ سے وہ انعام کے مستحق ہوئے مگر آپؐ کے بعد والوں کو تو کوئی قربانی نہیں کرنی پڑتی اور پھر انہیں انعام کا مستحق کیوں قرار دیا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک نسلی مسلمانوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے کوئی قربانی نہیں کرنی پڑتی مگر انہیں اپنے ایمان کو قائم رکھنے کے لئے ہر وقت قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ اسلام کے ہر حکم کے بارہ میں اُن کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اِس پر کیوں عمل کریں اور اس کیوں کے جواب کے لئے انہیں نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا پڑتا ہے اور پھر اُن احکام پر عمل کرنے کے لئے انہیں ہر وقت قربانی اور جدوجہد کے دَور میں سے گذرنا پڑتا ہے پس قربانیوں سے کوئی مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں۔ صحابہؓ نے ایمان لانے کے لئے قربانیاں کی تھیں اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کو اپنے ایمان کو قائم رکھنے کے لئے قربانیاں کرنی پڑتی ہیں پس چونکہ روحانی انعامات کا حصول قربانیوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کبھی ایسے نشانات ظاہر نہیں کرتا جو اتنے کھلے اور واضح ہوں کہ شدید سے شدید معاند بھی اُن کو دیکھ کر سر جھکا دیں اور ایمان لانے کے لئے دوڑ پڑیں اور اُن کے لئے انکار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو پھر اُن کا ایمان لانا ایک قسم کے جبر کا نتیجہ ہوگا اور اللہ تعالےٰ یہ نہیں چاہتا کہ لوگ کسی جبر کے نتیجہ میں ایمان قبول کریں اور اس طرح اپنے انعامات کو باطل کر دیں۔ مگر افسوس ہے کہ اتنی واضح آیت کی موجودگی میں بھی مسلمانوں نے جبر اور قدر کے مسئلہ پر بحثیں شروع کر دیں اور یہ نظریہ قائم کر لیا کہ اللہ تعالیٰ بھی بعض باتوں میں جبر سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ آج بھی جب کسی مسلمان سے پوچھا جائے کہ تمہاری مشکلات کا کیا باعث ہے تو وہ ایک سرد آہ کھینچ کر کہہ دیگا کہ "ہماری قسمت" وہ یہ نہیں کہیگا کہ چونکہ ہمارے اندر بعض کمزوریاں پائی جاتی ہیں اور ہم نے قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کرنا اور خدا تعالیٰ

کے احکام کی پیروی کرنا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ہدایات پر چلنا چھوڑ دیا ہے اِس لئے ہم پر مصائب آرہے ہیں بلکہ وہ یہ کہہ کر کہ "تمہاری قسمت" اِس کی ساری ذمہ واری خدا تعالیٰ پر ڈال دیگا۔ حالانکہ یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے جبر ہی کرنا ہوتا تو وہ نیکی اور ہدایت پر جبر کرتا اور ایسے نشانات نازل کرتا جن سے بڑے بڑے کفّار کی گردنیں جھک جاتیں اور وہ ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا۔ وہ نشانات تو نازل کرتا ہے مگر اُن میں ایک قسم کا اِخفاء بھی رکھتا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائیں وہ اپنی اپنی کوشش اور جدوجہد کے مطابق اللہ تعالیٰ سے اجر پائیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں میں نشاناتِ الٰہیّہ کے متعلق ایسی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں کہ ایک دفعہ قادیان میں غیر احمدی مولویوں نے جلسہ کیا۔ اس جلسہ میں ایک غیر احمدی مولوی صاحب نے بڑے جوش کے ساتھ تقریر کی اور کہا۔ مرزا صاحب نبی بنے پھرتے ہیں۔ مرزا صاحب کے معجزے بھی کوئی معجزے ہیں۔ معجزہ تو یہ ہوتا ہے کہ سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ کے پاس کوئی شخص مرغ پکا کر لایا۔ آپ نے کھا کر اُس سے کہا۔ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے اگر ہم تمہیں بھی احسان کا بدلہ دینا چاہتے ہیں اور یہ کہہ کر انہوں نے مرغ کی ہڈیاں لیں اور ہاتھ میں پکڑ کر انہیں زور سے دبایا تو وہی مرغ کُڑاکُڑ کُڑاکُڑ کرکے اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ اِس قسم کے قصّے مسلمانوں میں اسی لئے آئے کہ انہوں نے معجزات کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی سنّت کو نظرانداز کر دیا۔ اور یہ نہ سمجھا کہ اگر ایسے معجزات ظاہر ہوں تو پھر کون شخص ہے جو کسی نبی کا انکار کر سکتا ہے اور اگر ایسے معجزات کے ظہور کے بعد کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اُس نے ایمان لا کر کوئی قربانی کی ہے اور وہ کسی انعام کا مستحق ہے۔ پس اِس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی ایسے نشانات نازل نہیں کرتا جو اپنے کھلے اور واضح ہوں کہ انہیں دیکھ کر کفّار کی بھی گردنیں جھک جائیں اور وہ ایمان لے آئیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو یہ ایک قسم کا جبر ہو گیا اور اللہ تعالیٰ قبول ہدایت کے بارہ میں کسی قسم کا جبر روا نہیں رکھتا۔

پھر فرماتا ہے۔ وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ جب بھی رحمٰن خدا کی طرف سے کوئی نیا پیغام آیا ہے لوگوں نے ہمیشہ اُس کا انکار کیا ہے۔ پھر یہ لوگ کس طرح اِس پیغام کو قبول کر سکتے ہیں۔ اسجگہ خدائی پیغام کو اِن معنوں میں نیا نہیں کہا گیا کہ ہر نبی کوئی نئی شریعت لاتا ہے بلکہ اِن معنوں میں اُسے نیا قرار دیا گیا ہے کہ وہ پیغام دنیا کی نگاہوں سے مخفی ہوتا ہے۔ دُنیا اُسکو بھول چکی ہوتی ہے اور وہ اُس سے ایسی غافل اور بیگانہ ہوتی ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ اُس کی اپنی کھوئی ہوئی چیز ہوتی ہے پھر بھی وہ اُسے ایک نئی چیز سمجھنے لگتی ہے اور اس سے ڈر کر دُور بھاگنے لگتی ہے۔ اِنہی معنوں میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر پہلی کتب الہامیّہ کو بھی حدیث قرار دیا ہے اور قرآن کریم کی فضیلت اِن الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ (الزمر آیت ۲۴) یعنی اللہ تعالیٰ نے بڑی شان اور طاقت اور قوت کے ساتھ اس کتاب کو اتارا ہے جو احسن الحدیث ہے یعنی ساری الہامی کتابوں سے افضل ہے۔ پس ہر نبی جو دُنیا میں ظاہر ہوا۔ وہ دنیا کے لئے ایک نیا پیغام لایا۔ بعض انبیاء تو اِن معنوں میں نیا پیغام لائے کہ وہ ایک ہدایتِ جدیدہ لے کر آئے اور کثیر انبیاء اِن معنوں میں نیا پیغام لائے کہ انہوں نے وہ پُرانی شراب جس کا سرچشمہ الٰہی نور تھا نئے برتنوں میں لوگوں کے سامنے پیش کی

مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا تعالیٰ کا کوئی پیغامبر آیا ہو اور دُنیا نے اس کے پیغام سے اعراض نہ کیا ہو۔ یا اُسے مختلف قسم کے مصائب اور آلام کا نشانہ نہ بنایا ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس دُنیا کو ایسے رنگ میں چلایا ہے کہ عام طور پر یہ اس کے عام قواعد کے ماتحت کام کرتی رہتی ہے۔ اور بظاہر خدا کا ہاتھ اس کے کاموں میں نظر نہیں آتا جب سے یہ کائنات پیدا ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایک چکر دے دیا ہے اور یہ زمین سورج کے گرد اور چاند زمین کے گرد چکر کھا رہا ہے۔ اور پھر ساری کائناتِ شمسی مل کر ایک غیر معلوم جہت کی طرف چلی جا رہی ہے۔ بظاہر دیکھنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ ہے اور اس دنیا کو پیدا کرنیوالا اور چلانیوالا کوئی نہیں۔ کیونکہ ایک قانون ہے جو چل رہا ہے۔ مثلاً ایک ایسا شخص جس نے گھڑی نہیں دیکھی اگر وہ ایسے گھر میں آجائے۔ جہاں کوئی آدمی موجود نہ ہو اور ہفتہ بھر کی کُنجی سے چلنے والی گھڑی چل رہی ہو تو وہ گھڑی کو دیکھ کر یہی سمجھیگا کہ یہ آپ ہی آپ چل رہی ہے۔ اسے چلانے والا کوئی نہیں۔ جب تک وہ وقت نہ آجائے کہ جب گھڑی کو کنجی دی جاتی ہے یا جب تک وہ وقت نہ آجائے کہ جب وہ گھڑی کھڑی ہو جائے۔ درمیانی عرصہ سے وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ کسی اَور نے اسس کو کنجی دی ہے۔ اور وہ چل رہی ہے۔ اِسی طرح دنیا کو چلانے والے نے لاکھوں کروڑوں سال پہلے اس کو کنجی دے دی۔ اور یہ چل رہی ہے جس طرح گھڑی کو دیکھ کر انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ آپ ہی آپ چل رہی ہے سوائے اِس کے کہ وہ واقف ہو۔ اِسی طرح دُنیا کو دیکھکر ایک ناواقف انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہ آپ ہی چل رہی ہے لیکن اس قانون کے علاوہ کبھی کبھی خدا تعالیٰ اپنی خدائی ثابت کرنے کے لئے بعض خاص باتیں بھی ظاہر کیا کرتا ہے جن سے پتہ لگ جاتا ہے کہ اِس دُنیا کا ایک خالق اور مالک ہے جیسے گھڑی چل رہی ہو تو ایک ناواقف آدمی تو یہ سمجھیگا کہ یہ آپ ہی چل رہی ہے کسی اَور کا اس پر تصرف نہیں۔ لیکن مالک آتا ہے۔ اُسے چابی دیتا ہے اور پھر اُسے رکھ دیتا ہے۔ تو اس کو دیکھ کر وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ گھڑی کسی اَور کے ذریعہ چل رہی ہے۔ اِسی طرح خدا تعالیٰ کبھی کبھی اپنی خاص صفات کے ذریعہ اپنے وجود کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اُس کی صفات کا یہ ظہور اس کے رسولوں اور مصلحین کے ذریعہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ صاف بات ہے کہ جب خدا اِس دُنیا میں دخل دیگا۔ تو اُس کی کوئی وجہ ہوگی اور وہ وجہ یہی ہوتی ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ سے دُور چلے جاتے ہیں۔ وہ اُس کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ اور اُسکے احکام پر ہنسی اُڑاتے ہیں اُس وقت خدا تعالیٰ اُن کو یاد دلانے کے لئے اپنا کوئی مامور اور مُرسل بھیجتا ہے جب وہ مامور اور مُرسل دنیا میں آتا ہے تو وہ زمانہ وہی ہوتا ہے جب لوگ خدا تعالیٰ کو بھول چکے ہوتے ہیں۔ اور جو شخص کسی چیز کو بھول چکا ہو اُس کو اُس کی طرف توجہ دلانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ کیونکہ اُس نے بھول کر کوئی اَور راستہ اختیار کیا ہوا ہوتا ہے اور یہ آنے والا اُس کے روزمرّہ اور معمول کے راستہ سے ہٹا کر اُسے دوسری طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اَور جو شخص کسی چیز کا عادی ہو چکا ہو اُس سے ہٹانے والا دوست نہیں بلکہ دشمن سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے ملک میں بعض عادتیں راسخ ہو چکی ہیں۔ ہندوستان کی عورتیں پان کھاتی ہیں۔ اب پان کا زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق نہیں۔ پان کے ذریعہ علم حاصل نہیں ہوتا۔ پان کے ذریعہ

روپیہ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن باوجود اس کے اگر کوئی کہے کہ پان چھوڑ دو تو وہ اُسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہونگی اور اصرار کرینگی کہ ہم پان کو نہیں چھوڑ سکتیں بلکہ پان تو الگ رہا چھوٹی سے چھوٹی رسم کو بھی اگر چھڑانے کی کوشش کی جائے تو لوگ مخالفت کرتے ہیں۔ مثلاً گاؤں کی عورتیں اپنے سر کو گھی لگاتی ہیں۔ شہر کی عورتیں سر میں تیل لگاتی ہیں۔ یورپ کی عورتیں تیل بھی پسند نہیں کرتیں وہ ایک قسم کا لوشن استعمال کرتی ہیں۔ اب سر کو گھی لگانا زندگی کا کوئی جزو نہیں۔ اگر زندگی کا جزو ہوتا تو تیل سے کس طرح گذارہ ہو جاتا۔ اگر تیل زندگی کا جزو ہوتا تو خالی لوشن سے کس طرح گذارہ ہو جاتا۔ دُنیا کے ایک حصّے کا تیل چھوڑ دینا اور دوسرے حصہ کا گھی چھوڑ دینا اور تیسرے حصہ کا تیل اور گھی دونوں کو چھوڑ دینا بتاتا ہے کہ ان چیزوں کو انسان چھوڑ سکتا ہے لیکن باوجود غیر ضروری چیزیں ہونے کے اگر تم گاؤں کی عورتوں سے گھی چھڑوانا چاہو تو تمہیں سال ہا سال لگ جائیں گے۔ وہ کہیں گی کہ اگر ہم گھی لگانا چھوڑ دیں تو ہمیں سر درد ہو جاتا ہے۔ زکام ہو جاتا ہے اور وہ تمہاری مخالفت کریں گی اور سمجھیں گی کہ تم اُن کے راستہ میں روک بن رہے ہو۔ غرض چھوٹی سے چھوٹی عادت کا چھڑانا بھی آسان کام نہیں ہوتا لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والا مصلح تو ساری دنیا کو پلٹ دینے کے لئے آتا ہے۔ وہ اُن کے طور طریق سے انہیں باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اس کی کس طرح مخالفت نہ ہو۔ چنانچہ جب بھی کوئی مصلح آتا ہے لوگ اُس کی باتوں پر ہنسی اڑاتے ہیں۔ مذاق کرتے ہیں۔ اُسے مارتے پیٹتے ہیں۔ اُس کے ساتھیوں کو مارتے پیٹتے ہیں۔ اور یہ چیز برابر متواتر چلتی چلی جاتی ہے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو مکّہ والے اُس وقت کئی کئی معبود مانتے تھے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہنا شروع کیا کہ اللہ ایک ہے تو قرآن کریم میں لکھا ہے کہ مکّہ والوں کو یہ عجیب بات معلوم ہوئی اور انہوں نے اس پر ہنسی اڑانی شروع کر دی۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے تو کہتے۔ بتاؤ لَاتؔ خدا ہے یا نہیں۔ وہ کہتا۔ کیوں نہیں۔ پھر وہ کہتا۔ اچھا مَنَاۃؔ خدا ہے یا نہیں۔ وہ کہتا۔ یقیناً ہے۔ پھر وہ کہتا۔ اچھا عُزّٰیؔ خدا ہے یا نہیں۔ وہ کہتا۔ ضرور ہے۔ اس پر وہ ایک عجیب انداز میں قہقہہ مار کر کہتا کہ تم نے سُنا یہ شخص کیا کہتا ہے۔ اس نے اِتنے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا ہے۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ جس طرح عورتیں چٹنی بناتی ہیں۔ تو کچھ نمک لیتی ہیں۔ کچھ مرچیں لیتی ہیں۔ کچھ پودینہ لیتی ہیں اور ان سب کو پیس کر چٹنی بنا لیتی ہیں اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لاتؔ مناتؔ۔ عزّٰیؔ وغیرہ کو کوٹ پیس کر ایک خدا بنا دیا ہے قرآن کریم میں لکھا ہے کہ وہ تعجب سے یہ کہا کرتے تھے کہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (ص آیت ۶) یعنی ہمارے بہت سے جو خدا تھے ان کو توڑ مروڑ کر اس نے ایک خدا بنا دیا ہے۔ یہ خیال کہ یہ خدا ہیں ہی نہیں اُن کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ جب اُن کے سامنے کوئی شخص کہتا کہ ایک خدا ہے تو وہ سمجھتے تھے کہ ایک خدا کے معنے یہ ہیں کہ اس نے سارے خداؤں کو کوٹ کر ایک چٹنی سی بنا دی ہے اور جب وہ اس بات کو پیش کرتے تو سارے لوگ ہنس پڑتے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پاگل سمجھتے۔ لیکن اب اگر یہی بات کسی مسلمان کے سامنے بیان کرو تو وہ بھی ہنس پڑے گا۔ . . . .

. . . کیونکہ اب اسے ایک خدا پر یقین پیدا ہو چکا ہے۔ اور اس کا یہ خیال پختہ ہو گیا ہے۔ تو جس جس زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی طرف سے

کوئی بات پیش کی جاتی ہے چونکہ لوگ اُس کے عادی نہیں ہوتے اس لئے وہ اُس کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام آئے تو آپ کے خلاف دھوکا اور فریب سے کام لیا گیا۔ اور آخر آپ کو انہوں نے اس مقام سے نکلنے پر مجبور کر دیا جو اُن کا مولد و مسکن تھا اور جس میں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث کئے گئے تھے حضرت نوح علیہ السلام آئے تو انہیں بھی مختلف رنگ میں اذیتیں پہنچائی گئیں۔ اور انہیں بھی اپنے ملک سے ہجرت کرنی پڑی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے۔ تو آپ کو آگ میں ڈالا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تو آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ایک لمبے عرصہ تک فرعون کے مظالم کا تختۂ مشق بننا پڑا۔ اور جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل میں سے بعض کے سروں پر آرے رکھ کر ان کو چیر دیا گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام آئے تو دشمنوں نے آپ کو صلیب پر لٹکا دیا اور آپ کے خلفاء اور حواریوں میں سے بھی بعض کو قتل کیا اور بعض کو صلیب پر لٹکایا۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آیا تو آپ کو بھی شدید سے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی صحابہؓ قتل کئے گئے۔ بعض کا مثلہ کیا گیا بعض کو اس طرح شہید کیا گیا کہ دو اونٹوں سے اُن کی دو ٹانگیں باندھ کر اُن اونٹوں کو مختلف جہات میں دوڑایا گیا۔ اور اس طرح اُنکو چیر کر دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ بعض صحابہؓ کو تپتی ریت پر لٹایا گیا۔ بعض کو سخت پتھروں والی زمین پر گھسیٹا گیا۔ بعض کے سینوں پر جوتیوں سمیت ناچا گیا۔ عورتوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار مار کر اُن کو مارا گیا۔ غرض وہ تمام قسم کی مصیبتیں اور اذیتیں جو مختلف انبیاء کے زمانہ میں اُنکے دشمنوں نے اُنکو دیں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جمع ہو گئیں۔ اور آپ کے پیغام کو قبول کرنے سے اعراض اختیار کر لیا گیا۔ یہی حال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت پر بھی ہوا۔ اور آپ کو ہر رنگ میں کچلنے اور نابود کرنے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ آپ دُنیا کی طرف جو پیغام لائے وہ اُن کے فرسودہ خیالات کے منافی تھا اور اُن کے اندر ایک نیا تغیّر پیدا کرنے والا تھا۔

بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے جب دعویٰ کیا تو اُس وقت لوگوں میں یہ احساس تھا کہ مسیح ناصریؑ دوبارہ دنیا میں آئینگے اور وہ غیر مسلموں کے سب اموال لوٹ کر مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے آتے ہی اعلان فرما دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں۔ اب بظاہر یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ ہر شخص جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ ایک دن مرتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی طرح آئے اور فوت ہو گئے۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے دلوں میں مسیحؑ کی آمدِ ثانی کے متعلق جو تصوّرات قائم کر رکھے تھے اُن کو اس تعلیم سے شدید صدمہ پہنچا۔ اور انہوں نے کہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عیسائیوں کو کوئی نہیں مار یگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندوؤں کو کوئی نہیں ماریگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سکھوں کو کوئی نہیں ماریگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان ویسے ہی کمزور رہیں گے جیسے پہلے تھے۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنے زور سے آگے نکلنے کی کوشش کریں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یورپ اور امریکہ کی دولت مسلمانوں میں تقسیم نہیں ہوگی۔ غرض اس تعلیم سے حضرت مسیحؑ پر ہی موت نہ آئی بلکہ خود مسلمان بھی زندہ درگور ہو گئے وہ لوگ جو پہلے گھروں میں بیٹھے دولتوں کے منتظر تھے سمجھتے تھے کہ امریکہ کے پریذیڈنٹ کا سارا مال فلاں کو مل جائے گا اور راک فیلر کا مال فلاں کو مل جائیگا اُنکی تو ساری اُمیدیں ختم ہو گئیں اور وہ گویا جیتے جی مر گئے۔ اب بظاہر یہ ایک چھوٹی سی چیز

نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس نے قوم کے
خیالات کو اتنا دھکا دیا کہ جس کا صدمہ مسلمانوں سے
برداشت نہ ہو سکا اور وہ مخالفت کے لئے کھڑے
ہو گئے۔ پہلے جب مسلمانوں سے کہا جاتا تھا کہ کام
کرو تو وہ کہتے تھے ہم نے کام کر کے کیا لینا ہے۔
مسیح جب آئیگا تو وہ کافروں کا مال لوٹ کر ہمارے
گھروں میں ڈال دیگا۔ حضرت مرزا صاحبؑ کے آنے
سے اُن کی سب امیدوں پر پانی پھر گیا کیونکہ حضرت
مرزا صاحبؑ نے آکر اُن سے یہ کہا کہ جو کچھ کرنا ہے
تم نے کرنا ہے۔ تم نے ہی لڑنا ہے۔ تم نے ہی مرنا ہے
اور تم نے ہی اپنی ترقی کے لئے آپ جدوجہد کرنی ہے
گویا جو چیز انہیں پہلے بیٹھے بٹھائے حاصل ہونے کی
توقع تھی اس کے متعلق انہیں محنت اور قربانی اور
جدوجہد کا راستہ دکھایا گیا اور انہیں بتایا گیا کہ
تم غلط خیالات میں مبتلا ہو کر اپنی قیمتی زندگی کو ضائع
کر رہے ہو۔ اِس پر اُن کا غصہ میں مبتلا ہونا اور
اُن کا حضرت مرزا صاحبؑ کی مخالفت کے لئے
کھڑا ہو جانا ایک بالکل طبعی بات تھی۔ یہ ایسی
ہی بات تھی جیسے کوئی شخص کسی دوسرے کو کہہ دے
کہ آج تمہارے گھر کے تمام افراد کا کھانا ہمارے ہاں
ہے لیکن جب کھانے کا وقت آئے تو اُسے پتہ لگے کہ
اُسے دھوکا دیا گیا ہے کھانا وغیرہ کسی نے تیار نہیں کیا
اب ایسے موقعہ پر اگر وہ غصہ میں نہ آئے تو کیا کرے
کیونکہ اُسے بھوک لگی ہوئی ہو گی۔ بچے رو رہے ہونگے
اور اُدھر یہ حالت ہوگی کہ ابھی گھر میں آٹا گوندھا جا
رہا ہو گا۔ آگ جلائی جا رہی ہوگی۔ اور سب کہہ رہے
ہونگے کہ یہ کیا مصیبت آگئی۔ اب کھانا کب تیار
ہو گا۔ اور کب کھائینگے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے
آنے سے درحقیقت ایسا ہی ہوا۔ مسلمانوں کو کہا گیا
تھا کہ تمہاری خدا تعالیٰ کی طرف سے دعوت ہے تمہیں
کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آسمان سے مسیحؑ آئیگا اور
وہ دنیا کی دولتیں لوٹ کر تمہارے گھروں میں بھر دیگا
اور وہ اطمینان اور آرام کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سمجھتے
تھے کہ نہ ہمیں لکھنے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ نہ روپیہ
کمانے کی ضرورت ہے نہ کسی جدوجہد اور قربانی کی
ضرورت ہے مسیح آئیگا اور ہم اُس کے آتے ہی بامِ عروج
پر جا پہنچیں گے۔ اِس عقیدہ کے نتیجہ میں جب وہ علم
سے محروم ہو گئے۔ ترقیات سے محروم ہو گئے۔ عزت سے محروم ہو گئے۔ شہرت
سے محروم ہو گئے۔ پستی اور ذلت اور نکبت اُن پر
پوری طرح چھا گئی تو حضرت مرزا صاحبؑ نے آکر
کہا کہ جو کچھ بنیگا اپنے کام سے بنے گا۔ کسی دوسرے
پر اُمید رکھنا بالکل غلط ہے۔ تم کو ایک وقت کی روٹی
نہ ملنے سے جتنا صدمہ پہنچتا ہے اس سے کتنا زیادہ
صدمہ ان لوگوں کو ہوا ہو گا۔ تم تصور تو کرو کہ اگر کوئی
تم سے مذاق کرے کہ رات کو تمہارا ہمارے ہاں کھانا
ہو گا اور عین وقت پر جب تمہارے بچے بھوک سے
بلبلا رہے ہوں تمہیں معلوم ہو کہ تمہارے ساتھ مذاق
کیا گیا ہے اور اُس وقت تمہیں کھانا پکانے کی فکر
ہو تو جتنا غصہ تمہارے دل میں اُس وقت پیدا ہو سکتا
ہے اُس سے لاکھوں گنا زیادہ غصہ مسلمانوں کو پیدا ہوا
کیونکہ اُن کا اور اُن کی نسلوں کا انحصار ہی اُس لوٹ پر
تھا جو مسیح نے کرنی تھی۔ پھر ایک چیز نہیں۔ بیسیوں
چیزیں ہیں جو مسلمانوں میں جھگڑے کا باعث بنی ہوئی
تھیں۔ کہیں رفع یدین پر جھگڑا تھا۔ کہیں آمین بالجہر
کہنے پر جھگڑا تھا۔ کہیں تشہد میں انگلی اٹھانے یا نہ
اٹھانے پر جھگڑا تھا۔ کہیں نماز میں ہاتھ سینے پر
باندھنے یا ناف کے نیچے باندھنے پر جھگڑا تھا۔
حضرت مرزا صاحبؑ نے اِن تمام جھگڑوں کو ختم کر دیا

اور کہا کہ ان باتوں پر لڑنا جھگڑنا فضول ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی قوم کو جوش دلانے کے لئے آمین اونچی بھی کہی ہے اور کبھی نیچی بھی کہی ہے۔ کبھی فوجی رُوح قائم کرنے کے لئے آپؐ نے اپنے ہاتھ سینہ پر باندھے اور کبھی انکسار اور تذلّل کی حالت میں آپؐ نے ناف کے نیچے بھی باندھ لئے۔ کبھی تشہّد کے وقت آپنے انگلی اُٹھائی اور کبھی نہیں اُٹھائی۔ تشہّد میں انگلی اُٹھانے کے یہ معنے ہیں کہ انسان اپنے ہاتھ سے بھی اِس بات کا اقرار کرتا ہے کہ خدا ایک ہے۔ مگر یہ دونوں طرح جائز ہے۔ خواہ کوئی انگلی اُٹھائے یا نہ اُٹھائے اُسکی نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض عربوں کو دیکھ کر کہ ابھی ان میں پوری طرح توحید نہیں آئی تشہّد میں انگلی اُٹھانے کا حکم دے دیا۔ مگر بعض دفعہ آپؐ نے انگلی نہیں بھی اُٹھائی۔ جو شخص توحید کے عقیدہ پر پختگی کے ساتھ قائم ہو گیا ہے اگر وہ انگلی نہ اُٹھائے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ مگر اِس مسئلہ پر اتنا زور دیا گیا کہ بعض لوگوں کی محض اِس وجہ سے انگلیاں توڑ دی گئیں کہ انہوں نے تشہّد میں انگلی کیوں اُٹھائی ہے۔ پھر قرآن کے متعلق مسلمانوں میں یہ غلط خیال قائم تھا کہ اس کی کئی آیات منسوخ ہیں لیکن حضرت مرزا صاحبؑ نے آکر کہدیا کہ قرآن کریم کی ایک آیت بھی منسوخ نہیں۔ بسم اللہ سے لیکر والنّاس کے س تک ایک ایک حرف اور ایک ایک زبر اور ایک ایک زیر قابلِ عمل ہے۔ اب بجائے اِس کے کہ مسلمان شکرگذار ہوتے کہ آپؐ نے ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہمارے سامنے پیش کی ہے جو قرآنی حسن کو نمایاں کرنے والی ہے۔ چونکہ یہ تعلیم اُن کے خیالات کے خلاف تھی انہوں نے آپکی مخالفت شروع کر دی اور علماء نے ہندوستان کے ایک سرے سے لیکر اُس کے دوسرے سرے تک آپؑ کے خلاف ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا اور آپ کو کافر اور مرتد اور زندیق اور واجب القتل قرار دیا گیا۔

غرض تاریخ کا ہر دور وَمَا يَأْتِيهِم مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ کی سچائی پر شہادت دے رہا ہے جب کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغامبر قوم کی زندگی کا پیغام لے کر آیا ہمیشہ اُس پر ہنسی اُڑائی گئی۔ اُسے تباہ کرنے کی کوشش کی گئی اور اُس کے پیغام سے اعراض کیا گیا۔ اسجگہ بھی اللہ تعالیٰ اِسی اعراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنْبٰٓؤُا مَا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ چونکہ یہ لوگ صداقت کو جھٹلا چکے ہیں اس لئے اب عنقریب اِن کے پاس اُن امور کے متعلق جن پر یہ ہنسی اُڑایا کرتے تھے ہماری عظیم الشان خبریں پوری ہو کر آجائیں گی۔ اور انہیں معلوم ہو جائیگا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا انکار کیسی خطرناک چیز ہے۔ اِس جگہ سزاؤں کو خبریں اِس لئے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فرقان کے آخر میں کفّار کو تنبیہہ کی تھی کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے حضور دُعا اور گریہ وزاری سے کام نہیں لوگے تو خدا تعالیٰ تمہاری کوئی پرواہ نہیں کریگا جس کے معنے یہ تھے کہ اگر وہ توبہ نہیں کرینگے تو اُن پر عذاب نازل ہو گا اور وہ تباہ کر دیئے جائیں گے۔ پس چونکہ سورۂ فرقان کے آخر میں انہیں عذاب کی خبر دی گئی تھی جس پر کفّار نے ہنسی اڑائی اور انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے اعراض کیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ جن اُمور پر یہ لوگ ہنسی اُڑاتے رہے ہیں اُن کے متعلق اب ہماری خبریں اُن کے سامنے پوری ہو کر آجائیں گی۔ اور انہیں معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے رسول نے جو کچھ کہا تھا۔ سچ کہا تھا۔ نَبَأٌ کے متعلق

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ

کیا وہ زمین کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے اُس میں قسم قسم کے عمدہ جوڑے

زَوْجٍ كَرِیْمٍ ﴿۸﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ

بنائے ہیں۔ اس میں ایک بڑا نشان ہے مگر ان میں سے اکثر

مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۰﴾ ع

ایمان نہیں لاتے۔ اور تیرا ربّ ہی یقیناً غالب (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے۔ ‏[۴]

ع ۱ ۵

زَوْجٍ

علامہ ابوالبقاء نے اپنی کتاب کلیات میں لکھا ہے کہ یہ لفظ قرآن کریم میں ہمیشہ ایسے اُمور کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو بہت بڑی عظمت اور شان رکھنے والے ہوں۔ اور چونکہ اسلام کے غلبہ سے بڑی اور عظیم الشان خبر اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اسجگہ انبیاء میں انہی خبروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کفر کی تباہی اور اسلام کے غلبہ کے متعلق قرآن کریم میں دی گئی تھیں۔ اور جن پر کفار نے اپنی طاقت اور قوت کے گھمنڈ میں ہنسی اڑائی۔ مگر تھوڑے دنوں کے بعد ہی انہوں نے دیکھا کہ وہی غلام جن کو وہ گلیوں میں گھسیٹا کرتے تھے اور جن کے سینوں پر بڑے بڑے پتھر رکھ کر انہیں لات اور مناۃ کی پرستش کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا گھوڑے دوڑاتے اور فتح و ظفر کا پرچم لہراتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے۔ اور مکہ کے بڑے بڑے صنادید کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا۔ کہ وہ اپنے گھروں میں چھپ کر بیٹھ رہیں یا مکہ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ غرض وہ خبریں جو اُن کی تباہی کے متعلق دی گئی تھیں پوری ہوئیں۔ اور اسلام عرب کے کونہ کونہ میں پھیل گیا۔ اور اب خدا کے فضل سے وہ دنیا کے کونہ کونہ میں پھیل چکا ہے۔ اور ابھی آئندہ زمانہ میں اور بھی پھیلیگا۔

---

[۴] حل لغات:۔ زَوْجٌ کے معنے ہیں كُلُّ وَاحِدٍ مَعَهُ اٰخَرُ مِنْ جِنْسِهٖ۔ ہر وہ چیز جس کے ساتھ اُس کی جنس میں سے ایک اَور وجود بھی ہو۔ اَلصِّنْفُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ۔ ہر چیز کی ایک ایک قسم۔ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ کیا انہوں نے کبھی غور نہیں کیا۔ کہ زمین میں ہم نے کس طرح قسم قسم کی اعلیٰ ترکاریاں اور پھل وغیرہ پیدا کئے ہیں۔ اگر وہ اس پر غور کرتے تو اُنکو معلوم ہو جاتا کہ دین کے معاملہ میں بھی خدا ایسا ہی کریگا۔ اور اعلیٰ روحانی نعمتیں بھیجیگا جو رُوح کی غذا بنیں گی۔ اور اعلیٰ قسم کے انسان پیدا کریگا جو ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ ہونگے۔ اور گو یہ لوگ ابھی خدا تعالیٰ کی آواز پر لبیک نہیں کہہ رہے مگر تیرا رب بڑا غالب اور رحم کرنے والا ہے وہ ضرور ایسی تدبیر کریگا جس سے دنیا پر اُس کی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔ اور اُس کے رحم کا لمبا سلسلہ انسانوں کے لئے جاری ہو جائیگا۔

مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ تمام نباتات نر و مادہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی ان میں کچھ نر پودے ہوتے ہیں

اور کچھ مادہ - اور جب وہ دونوں آپس میں ملتے ہیں تب فصل پیدا ہوتی ہے - اِسی لئے ماہرینِ زراعت کہا کرتے ہیں کہ باغوں میں شہد کی مکھیاں رکھنی چاہئیں کیونکہ وہ نر درخت پر بیٹھ کر اُس سے نر کا نطفہ لیتی ہیں - اور مادہ درخت پر جاکر رکھ دیتی ہیں جس کی وجہ سے اُسے خوب پھل آتا ہے - عرب لوگ کھجور کے متعلق اِس حقیقت کو جانتے تھے اور وہ نر اور مادہ درختوں کو آپس میں ملایا کرتے تھے - مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اِس کا علم نہیں تھا - ایک دفعہ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھجور کے نر درختوں کو مادہ کھجوروں سے ملا رہے ہیں - آپ نے فرمایا کیا کرتے ہو - انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم تو نر کو مادہ پر ڈالتے ہیں تاکہ فصل اچھی ہو - آپ نے فرمایا - اِس کا کیا فائدہ جو پھل پیدا ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے - انہوں نے یہ سُنکر چھوڑ دیا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی فصل ماری گئی - وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا - یا رسول اللہ! ہماری تو فصل اچھی نہیں ہوئی - آپ نے فرمایا - کیوں - انہوں نے کہا - آپ نے جو فرمایا تھا کہ نر کا مادہ مادینہ کھجور پر نہ ڈالو - آپ نے فرمایا - میں تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں یہ علم تو تم جانتے ہو - مجھے معلوم نہیں - اس لئے تم وہی کچھ کرو جسے علمی لحاظ سے تم صحیح سمجھتے ہو (مسلم جلد ۲ - کتاب الفضائل) غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اِس بارہ میں ذاتی طور پر کوئی علم نہیں تھا - مگر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ تمام نباتات آپس میں جوڑہ جوڑہ ہیں - بلکہ سورۂ ذاریات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (ذاریات ع۳) یعنی نر و مادہ صرف انسانوں میں ہی نہیں بلکہ ہر چیز میں ہیں - جمادات میں بھی ہیں - نباتات میں بھی ہیں - حیوانات میں بھی ہیں - اور اب تو بعض سائنسدان اِس تحقیق میں اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ دھاتوں میں بھی نر و مادہ کے قائل ہو گئے ہیں - ایک سائنسدان کی کتاب میں مَیں نے پڑھا کہ ٹین بھی دو قسم کے ہوتے ہیں - ایک ٹین نر ہوتا ہے اور ایک مادہ ہوتا ہے اور وہ بھی ایک دوسرے کے اثر کو قبول کرکے ایک نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں - مگر خدا تعالیٰ اِس سے بھی اوپر جاتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہم نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے اور چیز کے لفظ میں نباتات بھی آجاتی ہے - حیوانات بھی آجاتے ہیں - جمادات بھی آجاتے ہیں - بلکہ اِس سے بڑھ کر ذراتِ عالم اور مجموعۂ ذراتِ عالم بھی آجاتے ہیں اور جب خدا تعالےٰ نے یہ کہا کہ ہم نے ہر چیز کو جوڑا بنایا ہے تو اِس کے معنے یہ ہوئے کہ خدا تعالیٰ کے سوا باقی ہر چیز کا جوڑا ہے اور کوئی چیز اپنے جوڑے کے بغیر صحیح نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی - جس طرح مادی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے - اِسی طرح روحانی دنیا میں انسانی رُوح خدا تعالیٰ کے فضل اور اُس کی رحمت کا جوڑا ہے اور جب تک الٰہی فضل انسانی رُوح سے آکر نہ ملے اس وقت تک روحانی نسل کا سلسلہ قائم نہیں ہو سکتا - مجھے یاد ہے - مَیں ابھی بچّہ ہی تھا کہ مَیں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ میں امرتسر میں ہوں وہاں ملکہ کا ایک بُت تھا جو سنگِ مرمر کا بنا ہُوا تھا اور اُس کے اردگرد ایک چبوترہ تھا اور وہ بھی سنگِ مرمر کا بنا ہُوا تھا - اور چبوترے پر چڑھنے کے لئے سنگِ مرمر کی ہی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں - مَیں نے رؤیا میں دیکھا کہ اُن سیڑھیوں پر تین چار سال کا ایک بچّہ کھڑا ہے جو نہایت حسین اور صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ہے اور آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے رؤیا میں مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ مسیح ہے - تھوڑی دیر کے بعد

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١١﴾

اور (یاد کر) جب تیرے رب نے موسیٰؑ کو پکارا تھا (اور کہا تھا) کہ ظالم قوم یعنی فرعون کی قوم کے پاس جا۔

قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ﴿١٢﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ

(اور اُن سے کہہ کہ) کیا وہ تقویٰ نہیں کرتے؟ اُس نے (جواب میں) کہا۔ اے میرے رب! مَیں ڈرتا ہوں کہ

اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿١٣﴾ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ

وہ میری تکذیب نہ کریں۔ اور میرا سینہ تنگی محسوس کرتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) چلتی نہیں

فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿١٤﴾ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ

پس (میرے ساتھ) ہارونؑ کو بھی مبعوث کر۔ اور (یہ بات بھی ہے کہ) اِن (لوگوں) کا میرے خلاف ایک الزام بھی ہے اور مَیں

آسمان پھٹا اور اُس میں سے ایک چیز زمین کی طرف اُڑتی ہوئی نظر آئی۔ وہ خوبصورت رنگوں والے لباس میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اُس کے پَر تھے جن سے وہ اُڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ مَیں رؤیا میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرت مریمؑ ہیں نیچے آ کر جیسے مرغی اپنے پَر پھیلا کر بچوں کو اپنے پَروں کے نیچے لے لیتی ہے۔ اِسی طرح اُس نے بچّہ پر اپنے پَر رکھ دیئے۔ اور جب اُس نے ایسا کیا تو میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے:-

LOVE CREATS LOVE

یعنی محبت محبت پیدا کرتی ہے۔ جب میری آنکھ کھلی تو مَیں نے سمجھا کہ مریم جو رؤیا میں مجھے بطور ماں کھائی گئی ہے اِس سے مُراد خدا تعالیٰ کی محبت ہے اور بچّہ جو مسیح کی شکل میں دکھایا گیا وہ رُوح کی خدا تعالیٰ کی طرف انابت اور جھکنے کا تمثّل تھا۔ جب انسانی روح خدا تعالیٰ کی طرف جھکتی ہے تو اُس کے نتیجہ میں ایک روحانی وجود پیدا ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کو ایسا ہی پیارا ہوتا ہے جیسے ماں کو اُس کا بچّہ۔ کیونکہ خدا تعالیٰ جسم کے ساتھ پیار نہیں کیا کرتا۔ وہ وجود جس کے ساتھ خدا تعالیٰ پیار کرتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ مل کر پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے خدا بمنزلہ ماں بن جاتا ہے۔

یہی سبق اللہ تعالیٰ نے کفار کو دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ کیا وہ زمین کی طرف نہیں دیکھتے کہ ہم نے اُس میں کیسے کیسے خوبصورت جوڑے پیدا کر دیئے ہیں پھر کیا وہ اس نظارہ کو دیکھتے ہوئے نہیں سمجھ سکتے کہ جس طرح مادی دنیا میں ہم نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے اِسی طرح اُن کی رُوح بھی اپنی طاقتوں کے اظہار کے لئے ایک جوڑے کی محتاج ہے اور یہ جوڑا خدا تعالیٰ کی رحمت سے مل کر مکمل ہوتا ہے۔ پس اگر وہ اپنی روحانی نسل کو جاری کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس خدائی رحمت کے ہاتھ کو تھام لینا چاہیئے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں اُن کی طرف بلند ہوا ہے ورنہ جس طرح ایک بانجھ عورت

يَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۵﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ

ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل نہ کر دیں - فرمایا - ہرگز نہیں - پس (ہمارا حکم سُن کر) تم دونوں ہماری آیتیں لیکر (چلے) جاؤ - ہم

مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ

(تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے) ساتھ ہونگے اور تمہاری دُعاؤں کو سنتے رہینگے - پس فرعون کے پاس جاؤ اور اُسے کہو کہ ہم

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۷﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۸﴾

رب العالمین (خدا) کے بھیجے ہوئے ہیں - (اس حکم کے ساتھ) کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیجدے - ۵

اولاد سے محروم رہتی ہے - اِسی طرح وہ اُن روحانی نعماء سے محروم رہیں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ لٹائے جا رہے ہیں -

۵ حل لغات :- ذَنْبٌ : يُسْتَعْمَلُ فِيْ كُلِّ فِعْلٍ يَسْتَوْخَمُ عُقْبَاهُ (مفردات) یعنی ہر وہ فعل جس کا نتیجہ خراب ہو ذنب کہلاتا ہے -

ذَنْبٌ

تفسیر :- فرماتا ہے - اُسوقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے موسیٰؑ کو پکارا اور اُسے کہا کہ تُو ظالم قوم یعنی فرعونیوں کی قوم کے پاس جا اور اُسے کہہ کہ کیا وہ تقویٰ اختیار نہیں کرینگے ؟ اِس پر موسیٰ نے کہا - اے میرے رب! میرے جانے کا کیا فائدہ وہ تو مجھے جھٹلا دیں گے - علاوہ ازیں میرا سینہ اُن کے آنے والے سلوک کا تصوّر کر کے تنگی محسوس کرتا ہے اور میری زبان اِس ڈر سے بند ہوتی چلی جاتی ہے کہ وہ انکار سے کام لیں گے - پس تُو اپنا پیغام ہارونؑ کی طرف بھیج - نیز وہ مجھ پر گناہ کا الزام بھی عائد کرتے ہیں - سو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ میری بات سُنے بغیر ہی مجھے قتل نہ کر دیں - اللہ تعالےٰ نے فرمایا - اُن کی مجال نہیں کہ وہ ایسا کر سکیں - لیکن چونکہ تُو نے ایک خواہش کا اظہار کیا ہے - ہم ہارونؑ کو بھی مبعوث کرتے ہیں سو تم دونوں ہمارے نشان لے کر جاؤ - بڑا نشان تو یہی ہے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تمہاری دُعائیں سُنتے رہیں گے - اور فرعون اور اس کے ساتھی تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گے - سو تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اُسے کہو کہ ہم رب العالمین خدا کی طرف سے تمہاری طرف رسول بن کر آئے ہیں - تم ہمارے پیغام کو قبول کرو - اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دے کر ہمارے ساتھ روانہ کر دو - یہ واقعہ بیان فرما کر اللہ تعالیٰ نے اِس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس خدا نے فرعون کی قوم کے لئے ہدایت کا سامان مہیا کیا تھا وہ مکہ والوں کے لئے کیوں ہدایت کا سامان مہیا نہ کرتا - فرعون کی قوم کے لئے تو کسی پہلے نبی کی دُعا موجود نہیں تھی - لیکن مکہ والوں کے لئے تو ابراہیمؑ کی یہ دُعا موجود تھی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (بقرہ آیت ۱۳۰) یعنی اے ہمارے رب! تُو اِن لوگوں میں اپنا ایک رسول مبعوث فرما جو اِن پر تیری آیات کی تلاوت کرے - انہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور اِن کا تزکیہ نفوس کرے - تُو بڑا غالب اور حکمت والا ہے - پس اگر بغیر کسی دُعا کے

اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کی ہدایت کے لئے موسیٰؑ کو مبعوث فرما دیا تو اتنی بڑی دُعا کی موجودگی میں جبکہ اللہ تعالیٰ کا بھی یہ وعدہ تھا کہ وہ اپنے انعامات کی بارش نسلِ اسمٰعیلؑ پر برسائیگا اور اُسے بھی ایک بڑی قوم بنائے گا۔ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰ تا ۲۲) کیوں اُنکی ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ اپنا برگزیدہ کھڑا نہ کرتا۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا لوگوں کے لئے کسی حیرت کا موجب نہیں بننا چاہیئے۔ حیرت تب ہوتی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کا کوئی سامان پیدا نہ ہوتا اور ابراہیمی دُعا رائیگاں چلی جاتی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کا ذکر فرما کر یہود کو بھی اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تم موسیٰؑ کی کتاب پر ایمان رکھتے ہو تمہیں معلوم ہے کہ تورات میں یہ پیشگوئی موجود ہے کہ

"میں اُن کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے
تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا اور جو کچھ میں
اُسے فرماؤنگا وہ سب ان سے کہیگا۔
اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو
جنہیں وہ میرا نام لے کے کہیگا نہ سُنیگا
تو میں اُس کا حساب اُس سے لونگا۔"

(استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵ تا ۲۰)

کیا اس پیشگوئی کے مطابق یہ ضروری نہیں تھا کہ موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ایک ایسا نبی آتا جو موسیٰؑ کا مثیل ہوتا۔ یعنی جس طرح وہ صاحبِ شریعت نبی تھا۔ اسی طرح آنیوالا رسول بھی صاحبِ شریعت ہوتا۔

پھر تورات میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ جب بھی خدا کا کلام سُنائیگا تو کہیگا کہ میں خدا کا نام لیکر تمہیں یہ کلام سُناتا ہوں۔ چنانچہ قرآن کریم کی کوئی سورۃ نہیں جو اللہ تعالیٰ کے نام کے بغیر شروع ہوتی ہو ہر سورۃ سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھا ہؤا ہوتا ہے جو ہر یہودی اور عیسائی کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ تم کیوں اس نبی کو نہیں مانتے جو موسیٰؑ کی پیشگوئی کے مطابق جب خدا تعالیٰ کا کلام سُناتا ہے تو اس سے پہلے یہ الفاظ بھی کہہ دیتا ہے کہ میں اللہ کا نام لے کر یہ کلام سُناتا ہوں۔ اور پھر بھی اس کو کوئی سزا نہیں ملتی۔

غرض موسیٰؑ کا ذکر مکہ والوں کو دُعائے ابراہیمی کی طرف اور یہودیوں اور عیسائیوں کو تورات کی پیشگوئی کی طرف توجہ دلانے کے لئے کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ اس دُعا اور پیشگوئی کی عظمت کو سمجھیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ کے غضب کا اسی طرح نشانہ نہ بنیں جس طرح فرعون موسیٰؑ کا انکار کر کے نشانہ بنا۔

اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔ قَوْمَ فِرْعَوْنَ میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون کی طرف بھجوایا گیا تو آپ کا بڑا کام یہی تھا کہ بنی اسرائیل کو اُس کی غلامی سے نجات دلائیں۔ اور فرعون کو سمجھائیں کہ وہ اس الٰہی منشاء میں روک نہ بنے اور بنی اسرائیل کو اُن کے ساتھ جانے کی اجازت دیدے چنانچہ جب بنی اسرائیل مصر سے چلے گئے تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مصریوں سے کوئی واسطہ نہ رہا بلکہ اُن کی تمام تر توجہ بنی اسرائیل کی طرف ہی مبذول رہی جن کی ہدایت اور ترقی کے لئے وہ مبعوث کئے گئے تھے مگر چونکہ بنی اسرائیل اہلِ مصر سے مِل جُل کر رہتے تھے اور بنی اسرائیل کو الگ مخاطب کرنے اور اُن کے اندر ایک نئی مذہبی روح پیدا کرنے کی اُس وقت کوئی صورت نہیں تھی اس لئے ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اُسکی قوم

کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت میں شریک کر لیا۔ اور آپ نے
فرعون اور اسکی قوم کو بڑی بھاری تبلیغ کی اور متواتر
کئی نشانات کے ذریعہ اُن پر حجت تمام کی۔ مگر بنی اسرائیل
کے مصر سے چلے جانے کے بعد آپ کا مصریوں کے ساتھ کوئی
واسطہ نہ رہا۔ کیونکہ آپ اصولی طور پر صرف بنی اسرائیل
کی ہدایت کے لئے ہی مبعوث ہوئے تھے لیکن رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت کی اور آپؐ مدینہ تشریف
لے گئے تو مکہ والوں سے آپؐ کا تعلق منقطع نہیں ہوا
بلکہ آپ برابر اُن کی ہدایت کے لئے کوشش فرماتے رہے
جو آپؐ کے درجہ اور مقام کی بلندی کا ایک بہت بڑا
ثبوت ہے۔

اَلَا یَتَّقُوْنَ میں بتایا گیا ہے کہ انبیاء کی بعثت
کی اہم غرض تقویٰ کا قیام ہوتی ہے مگر بالعموم لوگ
غلطی سے نیکی اور تقویٰ کو ایک ہی چیز سمجھ لیتے ہیں حالانکہ
نیکی تو وہ نیک کام ہوتا ہے جو ہم کر چکے ہیں یا کر رہے
ہیں اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان ایسے مقام پر کھڑا ہو
جائے کہ اُس کے دل میں آئندہ جو جذبات بھی پیدا
ہوں وہ نیک اور پاک ہوں۔ کیونکہ جذبات کا اصل
مقام دل ہے گو ان کا ظہور دماغ کے اعصاب کے
ذریعہ سے ہوتا ہے۔

سائنس دان اس امر پر بحثیں کرتے چلے آئے ہیں
کہ انسانی روح کا منبع دماغ ہے دل نہیں اور یہی
وجہ ہے کہ وہ رُوح کی حقیقت کو نہیں پا سکے حالانکہ
واقعہ یہ ہے کہ انسانی رُوح کا جیسا کہ انبیاء علیہم السلام
کی تعلیموں اور رؤیا و کشوف سے پتہ چلتا ہے دل سے
تعلق ہے ہاں دماغ چونکہ منبعِ اعصاب ہے اسلئے
قلبی علوم کو محسوس کرنا اور دل کے علوم مخفیہ سے مستفیض
ہونا اس کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
حیاۃ کا مقام دل کو قرار دیا ہے دماغ کو نہیں۔
اور رُوح کا سب سے گہرا تعلق اُس عضو سے ہو سکتا ہے
جو انسانی جسم میں سب سے اہم حیثیت رکھتا ہو اور
جس کا کام سب سے نمایاں ہو۔ اور وہ اہم کام دل
کا ہی ہے۔ دماغ کا نہیں۔ دل کی ایک سیکنڈ کی
حرکت بند ہونے سے کلی طور پر انسان پر موت وارد
ہو جاتی ہے۔ لیکن دماغ میں اگر فتور پیدا ہو جائے تو
گو اس وجہ سے کہ دماغ کا کام علومِ قلبیہ کو محسوس
کرنا ہے علوم پردہ میں آجاتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ
انسان پر موت بھی وارد ہو جائے۔ غرض دماغ خادم
ہے اور دل وہ اصل مرکز ہے جہاں اللہ تعالیٰ اپنے انوار
نازل کرتا ہے۔ لیکن خواہ فلسفیوں کے تتبع میں کوئی شخص
تدبّر اور تفکّر اور اخلاقِ فاضلہ کا تمام مدار دماغ پر رکھے
یا یہ کہے کہ انسانی عقل اور معرفت کا سرچشمہ دل ہے۔
اور دماغ کو علوم اور معارف سے کچھ تعلق نہیں پھر خواہ وہ دل اور دماغ
کی بجائے جذبات اور افکار کا لفظ استعمال کرے بہرحال کوئی بھی صورت
ہو انسان کیلئے دو چیزوں کی صفائی نہایت ضروری ہے۔ اُن میں سے
ایک فکر ہے اور دوسری جذباتِ لطیفہ ہیں۔ افکار
کی صفائی جسے عربی میں تنویر کہتے ہیں دماغ کی صفائی
سے حاصل ہوتی ہے۔ تنویر اس بات کو کہتے ہیں کہ
انسان کے اندر ایسا نور پیدا ہو جائے جس کی وجہ
سے ہمیشہ صحیح خیالات پیدا ہوتے رہیں جس طرح ایک
تندرستی تو یہ ہوتی ہے کہ انسان کہے میں اس وقت
تندرست ہوں۔ اور ایک تندرستی یہ ہوتی ہے کہ
انسان آئندہ بھی تندرست رہے۔ اسی طرح تنویرِ فکر
کی وہ درستی ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں آئندہ جو خیالات
بھی پیدا ہوں درست ہی ہوں۔ اور تنویر کے جو معنے
دماغ کی نسبت سے ہیں وہی تقویٰ کے معنے دل کی
نسبت سے ہیں۔ یعنی جس طرح فعلاً صحیح خیال کا پیدا
ہونا تنویر نہیں بلکہ ایسے ملکہ کا پیدا ہو جانا کہ ہمیشہ

صحیح خیالات ہی پیدا ہوتے رہیں تنویر ہے۔ اسی طرح تقویٰ
صرف ایک یا چند نیکیوں کا نام نہیں بلکہ انسان کا ایسے
مقام پر کھڑا ہو جانا تقویٰ کہلاتا ہے کہ اُس کے اندر
جو جذبات بھی پیدا ہوں وہ ہمیشہ نیک اور پاک ہوں۔
اِس کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا شیطان مسلمان ہو گیا
ہے یعنی میرے دل میں جو خیال بھی پیدا ہوتا ہے نیک
ہی ہوتا ہے بُرا نہیں ہوتا۔ غرض افکار کے لئے تنویر
اور جذبات کے لئے تقویٰ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے
اور انسان بدی کے حملہ سے اُسی وقت محفوظ ہوتا ہے
جب کسی انسان کو تنویر افکار بھی حاصل ہو اور تقویٰ قلب
بھی حاصل ہو۔ پس اَلَا یَتَّقُوْنَ میں بتایا گیا ہے کہ
حضرت موسیٰ علیہ السلام قومِ فرعون کی طرف تقوی اللہ
کا پیغام لے کر گئے تھے۔ اور آپ کی بعثت کا بڑا مقصد
یہ تھا کہ آپ اپنی دُعاؤں اور تبلیغ اور نصائح کے
نتیجہ میں اُن کی ایسی اصلاح کر دیں کہ نہ صرف اُنکے
افکار اور اُن کے جذبات میں درستی پیدا ہو جائے بلکہ
اُن کے اندر ایسا ملکہ پیدا ہو جائے کہ آئندہ جب بھی
اُن کے دماغ میں کوئی خیال پیدا ہو وہ صحیح ہو۔ اور
جب بھی اُن کے دلوں میں کوئی جذبات پیدا ہوں وہ
پاکیزہ ہوں۔ یہی چیز ہے جس پر تمام انبیاء زور دیتے چلے
آئے ہیں۔ اور اسلام نے بھی اِس کی طرف بار بار توجہ
دلائی ہے۔ کیونکہ روحانی علوم اللہ تعالیٰ کی طرف سے
دل پر نازل ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص کا دل پاک نہ ہو تو
وہ الٰہی فیضان سے محروم رہتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون
کی طرف جانے کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کیا کہ رَبِّ
اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ۔ اے میرے رب! میں
ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب نہ کریں۔ اِس کے یہ معنے
نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس سنّتِ قدیم کا
علم نہیں تھا کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی
مامور مبعوث ہوتا ہے تو دنیا اس کا انکار کیا کرتی ہے
بلکہ اُن کا خوف اس وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے
کہ تمام قومیں اپنے اپنے زمانہ میں انبیاء کا انکار کرنے
کی وجہ سے ہلاک ہو چکی ہیں۔ پس اُن کے دل میں ڈر
پیدا ہُوا کہ اگر ان لوگوں نے بھی انکار کیا تو یہ بھی
خدائی گرفت میں آجائیں گے۔ اور یہ چیز ایسی ہے جو
انبیاء کے لئے سخت دکھ کا موجب ہوتی ہے پس
انہوں نے فرعون کی طاقت اور اُس کے مظالم پر
نظر دوڑاتے ہوئے اِس امکانی خطرہ کا اظہار کیا
کہ وہ اپنے تکبّر اور سرکشی کی وجہ سے تکذیب پر کمربستہ
ہو جائیگا اور اپنے اس تلخ انجام کو اپنے قریب کر لیگا
جو ہمیشہ سے منکرینِ انبیاء کا ہوتا چلا آیا ہے چنانچہ
آیت کا اگلا ٹکڑا ان معنوں کی تائید کرتا ہے۔ وہ فرماتے
ہیں وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ۔ اے میرے رب! میرا
سینہ تنگی محسوس کرتا ہے۔ یعنی اُن کے ہدایت کو
ردّ کر دینے کے خیال سے میری یہ کیفیت ہے کہ میرا
سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میرا دم گھٹ رہا ہے۔
اِن الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام
کی اُس محبت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو انہیں اپنی
قوم سے تھی اور بتایا ہے کہ اُن کا سینہ اپنی قوم کے
کفر اور فسق کا تصوّر کر کے تنگی محسوس کرتا تھا اور
وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی قوم الٰہی پیغام کا انکار
کر کے اُس کے عذاب کی مستحق ہو۔ مگر اس بارہ میں
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام
پر ایک بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ حضرت
موسیٰ علیہ السلام نے تو یہ کہا ہے کہ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ
اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ۔ اے میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ

وہ کہیں میری تکذیب نہ کر دیں۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (انعام ع۴) یعنی ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ یہ مخالف لوگ کہتے ہیں اس سے تجھے بڑا سخت غم پہنچتا ہے کیونکہ یہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فکر نہیں تھا کہ قوم ان کی تکذیب کر رہی ہے بلکہ آپ اگر غمزدہ تھے تو اس لئے کہ قوم خدا تعالیٰ کی آیات کا انکار کر رہی ہے۔ گویا آپ کا غم اپنی ذات کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ آپ کا غم محض اس وجہ سے تھا کہ قوم خدا تعالیٰ کو ردّ کر رہی ہے اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں نظریوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو یہ ڈر تھا کہ قوم میری تکذیب کرے گی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا غم تھا کہ قوم خدا کا انکار کر رہی ہے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو اپنی قوم سے صرف اتنی محبت تھی کہ اپنی قوم کے کفر کو دیکھ کر ان کا سینہ تنگی محسوس کرتا تھا مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کے کفر کا اتنا درد تھا کہ صدمہ کے مارے آپؐ کی جان نکلی جا رہی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی ان لوگوں کے ایمان نہ لانے اور کافر رہنے کا ہمارے رسول کو اسقدر صدمہ ہے کہ گویا اس کی گردن پر تلوار رکھ کر کسی نے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اسے کاٹ دیا ہے۔ جب لوگوں کے ایمان نہ لانے کا رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس قدر افسوس تھا تو ان کا کفر کی حالت میں مرجانا آپ پر کس قدر گراں گذرتا ہوگا۔ جو شخص صرف اس بات سے ہی صدمہ محسوس کرتا ہو کہ ایک شخص خدا تعالیٰ پر ایمان نہیں لایا اس کے دل پر اس وقت کیا گذرتی ہوگی جب اسے یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ اب کفر پر اس کا خاتمہ بھی ہو گیا ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ دنیا میں ہمیشہ بڑی چیزوں پر چھوٹی چیزوں کو قربان کیا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کمزور انسانیت پر اپنے پیدا کئے ہوئے قیمتی سے قیمتی جوہروں کو قربان کیا۔ آدمؑ اپنے زمانہ کا سب سے قیمتی جوہر تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کمزور لوگوں کیلئے جنہوں نے شیطان کا ساتھ دیا آدمؑ کی سی قیمتی جان کو قربان کرا دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنے زمانہ میں سب سے قیمتی وجود تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ان ازلی شقیوں اور ان بدبخت وجودوں کے لئے جو ہدایت سے محرومی اختیار کر چکے تھے حضرت نوح علیہ السلام کی جان کو قربان کرا دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانہ کے سب سے قیمتی وجود تھے مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جان کو کمزور اور ناقص انسانوں کے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کرب و بلا میں مبتلا کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے زمانہ کے قیمتی سے قیمتی وجود تھے مگر وہ بنی اسرائیل جو خدا کے لئے صرف اس قربانی کے مالک تھے کہ انہوں نے کہہ دیا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ آیت ۲۵) اے موسیٰؑ! تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور ان سے جنگ کرو ہم تو بہر حال اسی جگہ بیٹھے رہیں گے۔ اس بزدل اور نشانات سے آنکھیں بند کر لینے والی قوم کے لئے خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سی قیمتی جان کو قربان کرا دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے زمانہ کے قیمتی ترین وجودوں میں سے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے جن کے متعلق حضرت مسیح علیہ السلام خود کہتے ہیں کہ وہ سانپ اور

اور سانپوں کے بچے ہیں (متی باب ۲۳ آیت ۳۳) ان کی زندگی کو بھینٹ چڑھا دیا۔ پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ پاک اور اعلیٰ وجود اِس دنیا میں کون آیا کہ جس کے متعلق ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا کہ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (فوائد المجموعہ مصنفہ علامہ شوکانی ص۱۱۶) اے محمد! (صلے اللہ علیہ وسلم) اگر تجھے پیدا نہ کرنا ہوتا تو میں زمین و آسمان کو بھی پیدا نہ کرتا۔ مگر وہ وجود جس کی خاطر بنی نوع انسان پیدا کئے گئے ابوجہل عتبہ اور شیبہ کی ہدایت اور بھلائی کے لئے اُس کو ایک ایسی صلیب پر لٹکا دیا جو لوگوں کو تو نظر نہیں آئی مگر خدا تعالےٰ نے جس کی نظر میں ہر غیب بھی ظاہر ہے وہ اس صلیب کے متعلق فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) شاید کہ غم کی چھری تجھاو ذبح کرتے کرتے تیری گردن کے آخری تسموں کو بھی کاٹ دیگی اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔

غرض جہاں تک قربانی اور محبت کا سوال ہے دُنیا کے ہر نبی نے اپنی قوم کے لئے قربانیاں کیں اور ہر نبی اپنی قوم کے کفر اور نفاق کو دیکھ دیکھ کر پریشان حال رہا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے انبیاء میں یہ فرق ہے کہ پہلے انبیاء کے سینہ میں تو اپنی قوم کا کفر دیکھ کر صرف تنگی محسوس ہوتی تھی۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کا کفر دیکھ کر ایسا غم ہوتا تھا کہ قریب تھا کہ آپ اس غم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو یہ کہا کہ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا کہ جا اور دُنیا کو خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچا۔ تو آپؐ نے فوراً اپنی بیوی کو خبر دی اور پھر بعد میں اپنی ساری قوم کو خبر دی اور یہ نہیں کہا کہ قوم میری تکذیب کریگی بلکہ آپؐ نے دلیری سے خدا تعالیٰ کے حکم پر لبیک کہا اور کسی ڈر اور خوف کا اظہار نہیں کیا۔ یہ امر بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ بہت بلند تھا۔

اِس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اور بات کی۔ اور فرمایا لَا يَنْطَلِقُ لِسَانِیْ اے میرے ربّ! میری تو زبان بھی نہیں چلتی۔ مگر خدا تعالیٰ کی شان دیکھو کہ وہی موسیٰؑ جنہیں یہ خوف تھا کہ میں فرعون کے دربار میں کس طرح بات کر سکونگا اور جنہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کی یہ خوبی بیان کی تھی کہ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا (قصص آیت ۳۵) وہ بات کرنے میں مجھ سے بہت زیادہ فصیح ہیں۔ جب فرعون کے سامنے جاتے ہیں تو حضرت ہارونؑ کو ایک فقرہ بھی بولنے نہیں دیتے اور خود ہی اس کے تمام سوالات کے جواب دیتے چلے جاتے ہیں۔ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یقیناً فصیح البیان تھے۔ اور اُن کی زبان میں جیسا کہ پُرانے مفسرین خیال کرتے ہیں کوئی خلقی نقص نہیں تھا۔ صرف اتنی بات ضرور ہے کہ وہ اپنے آپ کو فصاحتِ بیان میں حضرت ہارون علیہ السلام سے کم درجہ پر سمجھتے تھے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے رسالت کا کام آپ کے سپرد کیا اور فرعون کے دربار میں آپ تشریف لے گئے۔ تو وہاں آپ کی فصاحت اور آپ کے دلائل کی مضبوطی کی ایسی دھاک بیٹھی کہ فرعون جھنجھلا اٹھا۔ اور اُس نے سمجھا کہ اب مقابلہ کے لئے کوئی اجتماعی پروگرام مرتب کرنا چاہیئے ورنہ یہ لوگوں کو برگشتہ کر دیگا۔

ہم نے اپنی جماعت میں بھی دیکھا ہے کہ جب کوئی شخص اخلاص کے ساتھ احمدی ہوتا ہے

تو باوجود اس کے کہ وہ اَن پڑھ اور جاہل ہوتا ہے۔ احمدی ہوتے ہی اُس کی زبان اس طرح کھل جاتی ہے کہ بڑے بڑے مولوی اُس کے ساتھ بات کرنے سے گھبرانے اور کترانے لگ جاتے ہیں۔ اس کی عقل پہلے سے تیز ہو جاتی ہے۔ اور اُس کی بحث کرنے کی قابلیت غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ انکا علم اپنا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا ہوتا ہے جو ہر موقعہ پر اُن کی تائید کرتا اور انہیں وقت پر ایسی ایسی باتیں سمجھا دیتا ہے کہ حیرت آتی ہے۔ قادیان میں ایک شخص "پیرا" ہوا کرتا تھا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خادم تھا۔ وہ اتنی موٹی عقل کا آدمی تھا کہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ احمدیت کیا ہے لیکن اُسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ایک ذاتی لگاؤ تھا۔ کہیں اُس کو گنٹھیا کی بیماری ہوگئی۔ وہ پہاڑی آدمی تھا۔ اس کے رشتہ داروں کو بعض لوگوں نے کہا۔ کہ یہاں اِس کا علاج نہیں ہو سکیگا اسے کہیں میدانوں میں لے جاؤ۔ چنانچہ وہ اسے گورداسپور لے آئے۔ مگر چونکہ وہ سب غریب آدمی تھے اور ایسے لوگوں کو روٹی بھی کھلانی پڑتی ہے اور دوائی بھی دینی پڑتی ہے۔ اِس لئے کوئی شخص علاج کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر کسی نے اُنکو بتایا کہ قادیان میں ایک مرزا صاحب ہیں جو بڑے خدا پرست ہیں۔ وہ معالج اور حکیم بھی ہیں اُن کے پاس لے جاؤ وہ اس کی خبر گیری بھی کریں گے اور دوا بھی دینگے چنانچہ اس کے رشتہ دار اُسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پاس لے آئے اور اُسے وہاں چھوڑ کر کھسک گئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اُس کا علاج کیا۔ اور آہستہ آہستہ اُسے آرام آنا شروع ہو گیا۔ جب اُسکے رشتہ داروں کو معلوم ہوا کہ اب وہ اچھا ہو گیا ہے اور کام کاج کر سکتا ہے۔ تو دوسری سردیوں میں پھر

اُس کے رشتہ دار آئے اور انہوں نے کوشش کی کہ وہ اُن کے ساتھ چل پڑے۔ مگر معلوم ہوتا ہے اُسکے قلب میں نیکی تھی جب انہوں نے اُسے کہا کہ ہم تجھے لینے کیلئے آئے ہیں تو کہنے لگا۔ تم بے شک میرے رشتہ دار ہو مگر تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اِس لئے اب تو جس نے میرا علاج کیا اور جس کی وجہ سے میں اچھا ہوا۔ میرا رشتہ دار وہی ہے میں اُسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ وہ ڈیوڑھی پر پڑا رہتا تھا اور جو مہمان آتا تھا اُسکی خدمت کرتا تھا۔ اِسی طرح گھر کا معمولی کام کاج بھی کر دیا کرتا تھا۔ اُس کی عقل کا یہ حال تھا کہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ اُسے بڑا مجبور کیا کرتے تھے کہ وہ نماز پڑھے مگر وہ یہی جواب دیتا تھا کہ مجھے نماز نہیں آتی حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کو بھی بڑا جوش تھا کہ یہ حضرت مسیح موعودؑ کے دروازے پر بیٹھا رہتا ہے اور نماز ہی نہیں پڑھتا لوگ اِسے دیکھیں گے تو اعتراض کرینگے اسلئے آپ اِسے بار بار نماز پڑھنے کی نصیحت کرتے تھے مگر وہ جواب دیتا مجھے نماز یاد ہی نہیں ہوتی۔ آخر حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے تنگ آکر اُسے فرمایا کہ نماز نہیں آتی تو سُبحان اللہ سُبحان اللہ ہی کہہ لیا کرو۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی ساتویں آٹھویں دن نماز میں شامل ہو جاتا تھا۔ اور سُبحان اللہ سُبحان اللہ کہتا رہتا تھا۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے ایک دن اِس خیال سے کہ شاید انعام کے لالچ سے اسے نماز پڑھنے کی عادت ہو جائے۔ اُسے فرمایا۔ پیرے اگر تم ایک دن پانچوں نمازیں وقت پر پڑھو اور ایک نماز کا بھی ناغہ نہ کرو۔ تو میں تمہیں دو روپے انعام دوں گا دو روپے اُس زمانہ میں اُس کے لئے بڑا بھاری انعام تھا۔ وہ کہنے لگا۔ آج ضرور میں پانچوں نمازیں پڑھوں گا۔ شاید عشاء کا وقت تھا جب اُس نے نماز شروع کی

صبح ہوئی تو پھر بھی اُس نے ہمت کرکے نماز پڑھ لی۔ ظہر اور عصر میں بھی کسی نہ کسی طرح شامل ہو گیا۔ مگر مغرب کی نماز رہتی تھی۔ اُن دنوں چونکہ مہمان تھوڑے ہُوا کرتے تھے اِس لئے اُن کا کھانا ہمارے گھر تیار ہُوا کرتا تھا۔ اور مغرب کے وقت اُن کا کھانا گھر سے جایا کرتا تھا۔ اتفاق ایسا ہُوا کہ اُس دن مغرب کی نماز نسبتاً دیر سے ہوئی۔ اور کھانا لے جانے کا وقت ہو گیا۔ جو عورت اندر سے کھانا لایا کرتی تھی اُس نے پیرے کو آواز دی کہ پیرے کھانا تیار ہے۔ مہمانوں کے لئے لے جاؤ۔ مگر پیرا مسجد میں تھا۔ اور اُس وقت نماز ہو رہی تھی۔ لیکن بلانے والی عورت کو اس کا علم نہ تھا۔ اُس نے دو چار آوازیں دیں مگر پیرا وہاں ہوتا تو جواب دیتا آخر اُس نے زور سے آواز دی کہ پیریا کھانا لے جا نہیں تو مَیں تیری شکایت کرونگی۔ یہ آواز چونکہ اُس نے زور سے دی تھی۔ اِس لئے پیرے نے بھی سُن لی جس پر اُس نے نماز میں ہی جواب دیا کہ "ٹھہر جا! التحیات پڑھ لواں تے آنداں۔" یعنی ٹھہر جاؤ۔ ابھی تشہد پڑھکر آتا ہوں۔ گویا عین آخری تشہد میں وہ بول پڑا اور اِس طرح اُس نے اپنے دَو روپے کھو دیئے۔ تو وہ بہت ہی موٹی عقل کا آدمی تھا۔ اِتنی موٹی عقل کا کہ وہ اپنی بیوقوفی کی وجہ سے مہمانوں کو خوش کرنے کیلئے دال میں مٹی کا تیل ڈال کر کھا لیا کرتا تھا اور جب لوگ کہتے کہ تم مٹی کا تیل کیوں ڈالتے ہو تو کہتا۔ اِس میں کیا حرج ہے۔ سرسوں کا تیل نہ ڈالا تو مٹی کا تیل ڈال لیا۔ اُس وقت قادیان میں نہ تار گھر تھا۔ اور نہ ریل آیا کرتی تھی۔ اِس لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کبھی تار دینے کی ضرورت پیش آتی یا کوئی ریلوے پارسل منگوانا ہوتا تو آپ بٹالے کسی آدمی کو بھجوا دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی پیرے کو بھی اِس غرض کے لئے بھیجدیتے تھے۔ اُن دنوں مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی جو سلسلہ احمدیہ کے اشد ترین مخالفوں میں سے تھے اسٹیشن پر جایا کرتے تھے اور جب کسی نو وارد مسلمان کو اُترتے دیکھتے تو اُسے پوچھتے کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے اور جب کسی کے متعلق معلوم ہوتا کہ وہ قادیان جانا چاہتا ہے تو اُسے ورغلانے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ یہیں سے واپس چلے جاؤ۔ قادیان میں جاکر تمہارا ایمان خراب ہو جائیگا۔ ایک دن انہیں اور کوئی شکار نہ ملا تو انہوں نے پیرے کو ہی پکڑ لیا۔ وہ اُس دن کوئی تار دینے یا کوئی بلٹی لینے کے لئے بٹالے گیا ہُوا تھا۔ مولوی محمد حسین صاحب اُسے کہنے لگے۔ پیرے تیرا تو ایمان خراب ہو گیا ہے۔ مرزا صاحب کافر اور دجّال ہیں تو اپنی عاقبت اُن کے پیچھے لگ کر کیوں خراب کرتا ہے۔ پیرا اُن کی باتیں سُنتا رہا۔ جب وہ اپنا جوش نکال چکے تو انہوں نے اپنی باتوں کی پیرے سے بھی تصدیق کروانی چاہی اور انہوں نے اُس سے پوچھا کہ بتاؤ میری باتیں کیسی ہیں۔ پیرا کہنے لگا۔ مولوی صاحب۔ مَیں تو اَن پڑھ اور جاہل ہوں۔ مجھے نہ کوئی علم ہے اور نہ مَیں مسئلے سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن ایک بات ہے جو مَیں بھی سمجھ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ مَیں سال ہا سال سے بلٹیاں لینے اور تاریں دینے کے لئے یہاں آتا ہوں اور مَیں دیکھتا ہوں کہ آپ ہمیشہ اسٹیشن پر آکر لوگوں کو قادیان جانے سے منع کرتے ہیں۔ آپ کی اب تک شاید اِس کوشش میں کتنی ہی جوتیاں گھس گئی ہونگی۔ مگر پھر بھی آپ کی کوئی نہیں سُنتا۔ اور مرزا صاحب قادیان میں بیٹھے ہیں پھر بھی لوگ اُن کی طرف کھچے چلے جاتے ہیں۔ آخر کوئی بات تو ہے جس کی وجہ سے یہ فرق ہے۔ اب دیکھو! یہ کیسا لطیف اور صحیح جواب ہے۔ وہ فی الحقیقت دینی مسائل کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اور

وہ نہیں جانتا تھا کہ دلائل کیا ہوتے ہیں۔ مگر فطرت کے لگاؤ اور محبت کی وجہ سے اس نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ شخص بہرحال جھوٹ بول رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بعض دفعہ ایسی باتیں سمجھا دیتا ہے کہ انسان کی عقل دنگ ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے پاس سارے سامان ہیں۔ اور جس چیز کی کمی ہو وہ اُس کے پاس موجود ہوتی ہے۔ عقل کی کمی ہو تو وہ اس کے پاس موجود ہے۔ جرأت کی کمی ہو تو وہ اس کے پاس موجود ہے۔ سخاوت کی کمی ہو تو وہ اُس کے پاس موجود ہے۔ صحت کی کمی ہو تو وہ اس کے پاس موجود ہے۔ عزّت کی کمی ہو تو اس کے پاس موجود ہے۔ مال کی کمی ہو تو وہ اس کے پاس موجود ہے غرض ہر چیز کے خزانے اس کے پاس موجود ہیں اور وہ اپنے بندوں کو ان خزانوں میں سے ایسے رنگ میں حصّہ دیتا ہے کہ انسان حیران ہو جاتے ہیں۔

حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ آتھم کے مباحثہ میں ہم نے جو نظّارہ دیکھا اس سے پہلے تو ہماری عقلیں دنگ ہو گئیں اور پھر ہمارے ایمان آسمان پر پہنچ گئے۔ فرماتے تھے کہ جب عیسائی مباحثہ سے تنگ آ گئے اور انہوں نے دیکھا کہ ہمارا کوئی داؤ نہیں چلا تو چند مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر انہوں نے ہنسی اُڑانے کے لئے یہ شرارت کی کہ کچھ اندھے۔ کچھ بہرے کچھ لولے اور کچھ لنگڑے بُلا لئے اور انہیں مباحثہ سے پہلے ایک طرف چھپا کر بٹھا لیا۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے تو جھٹ انہوں نے اُن اندھوں۔ بہروں اور لُولوں لنگڑوں کو نکال کر آپؑ کے سامنے پیش کر دیا اور کہا۔ زبانی باتوں سے جھگڑے طے نہیں ہوتے۔ آپ کہتے ہیں۔ میں مسیح ناصری کا مثیل ہوں اور مسیح ناصری اندھوں کو آنکھیں دیا کرتے تھے۔ بہروں کو کان بخشا کرتے تھے اور لُولوں لنگڑوں کے ہاتھ پاؤں درست کر دیا کرتے تھے۔[1] ہم نے آپ کو تکلیف سے بچانے کے لئے اِس وقت چند اندھے۔ بہرے اور لولے لنگڑے اکٹھے کر دیئے ہیں۔ اگر آپ فی الواقعہ مثیلِ مسیح ہیں تو اِن کو اچھا کر کے دکھا دیجئے۔ حضرت خلیفۂ اوّل رضؓ فرماتے تھے کہ ہم لوگوں کے دل اُن کی اِس بات کو سُنکر بیٹھ گئے۔ اور گو ہم سمجھتے تھے کہ یہ بات یونہی ہے۔ مگر اس خیال سے گھبرا گئے کہ آج لوگوں کو ہنسی اور ٹھٹھے کا موقعہ مِل جائیگا۔ مگر جب ہم نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرہ کو دیکھا تو آپ کے چہرہ پر ناپسندیدگی یا گھبراہٹ کے کوئی آثار نہ تھے۔ جب وہ بات ختم کر چکے تو آپؑ نے فرمایا دیکھئے پادری صاحب! مَیں جس مسیحؑ کے مثیل ہونیکا دعویٰ کرتا ہوں اسلامی تعلیم کے مطابق وہ اِس قسم کے اندھوں۔ بہروں اور لولوں لنگڑوں کو اچھا نہیں کیا کرتا تھا مگر آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیح جسمانی اندھوں جسمانی بہروں۔ جسمانی لولوں اور جسمانی لنگڑوں کو اچھا کیا کرتا تھا۔ اور آپ کی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر تم میں ایک رائی برابر بھی ایمان ہو۔ اور تم کسی پہاڑ سے کہو کہ یہاں سے وہاں چلا جائے تو وہ چلا جائے گا۔[1] اور اگر تم بیماروں پر ہاتھ رکھو گے تو وہ اچھے ہو جائیں گے۔[2] پس یہ سوال مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ مَیں تو وہ معجزے دکھا سکتا ہوں جو میرے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائے۔ آپ ان معجزوں کا مطالبہ کریں تو مَیں دکھانے کے لئے تیار ہوں۔ باقی رہے اِس قسم کے معجزے سو آپ کی

---

[1] متی باب ۱۷ آیت ۲۱ و لوقا باب ۱۷ آیت ۶

[2] مرقس باب ۱۶ آیت ۱۷، ۱۸

کتاب نے بتادیا ہے کہ ہر وہ عیسائی جس کے اندر ایک
رائی کے برابر بھی ایمان ہو ویسے ہی معجزے دکھا سکتا ہے
جیسے حضرت مسیح ناصری نے دکھائے۔ سو آپ نے بڑی اچھی
بات کی جو ہمیں تکلیف سے بچالیا۔ اور ان اندھوں۔
بہروں۔ لُولوں اور لنگڑوں کو اکٹھا کر دیا۔ اب یہ
اندھے۔ بہرے۔ لُولے اور لنگڑے موجود ہیں۔ اگر آپ
میں ایک رائی کے برابر بھی ایمان موجود ہے۔ تو ان کو
اچھا کر کے دکھا دیجیئے۔ آپ فرماتے تھے اس جواب
سے پادریوں کو ایسی حیرت ہوئی کہ بڑے بڑے پادری
ان لُولوں لنگڑوں کو کھینچ کھینچ کر الگ کرنے لگ گئے۔
تو اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کو ہر موقعہ پر عزت بخشتا ہے
اور اُن کو ایسے ایسے جواب سمجھاتا ہے جن کے نتیجہ میں
دشمن بالکل ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

قادیان میں ایک دفعہ پادری زویمر آیا جو دنیا کا
مشہور ترین پادری اور امریکہ کا رہنے والا تھا۔ وہ وہاں
کے ایک بہت بڑے تبلیغی رسالہ کا ایڈیٹر بھی تھا
اور یوں بھی ساری دنیا کی عیسائی تبلیغی سوسائٹیوں
میں ایک نمایاں مقام رکھتا تھا۔ اس نے قادیان کا
بھی ذکر سنا ہوا تھا۔ جب وہ ہندوستان میں آیا تو
اور مقامات کو دیکھنے کے بعد وہ قادیان آیا۔ اس کے
ساتھ ایک اور پادری گارڈن نامی بھی تھا۔ ڈاکٹر
خلیفہ رشید الدین صاحب مرحوم اُس وقت زندہ تھے
انہوں نے اُسے قادیان کے تمام مقامات دکھائے۔
مگر پادری آخر پادری ہوتا ہے۔ نیش زنی سے باز نہیں
رہ سکتا۔ اُن دنوں قادیان میں ابھی ٹاؤن کمیٹی نہیں
بنی تھی۔ اور گلیوں میں بہت گند پڑا رہتا تھا۔ پادری
زویمر باتوں باتوں میں ہنس کر کہنے لگا۔ ہم نے قادیان
بھی دیکھ لیا اور نئے مسیح کے گاؤں کی صفائی بھی
دیکھ لی۔ ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب اُسے ہنس کر
کہنے لگے۔ پادری صاحب ابھی پہلے مسیح کی ہی ہندوستان
پر حکومت ہے اور یہ اس کی صفائی کا نمونہ ہے۔ نئے
مسیح کی حکومت ابھی قائم نہیں ہوئی۔ اِس پر وہ بہت
ہی شرمندہ اور ذلیل ہوگیا۔ پھر اُس نے مجھے کہلا
بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں میری طبیعت
کچھ خراب تھی میں نے جواب دیا کہ پادری صاحب
بتائیں کہ وہ مجھے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے
کہا چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ مگر پہلے نہیں بتا سکتا
خیر میں نے اُن کو بُلا لیا۔ وہ بھی آگئے اور پادری
گارڈن صاحب بھی آگئے۔ ایک دو دوست اور بھی
موجود تھے۔ پادری زویمر صاحب کہنے لگے میں ایک
دو سوال کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا فرمائیے۔ کہنے
لگے۔ اسلام کا عقیدہ تناسخ کے متعلق کیا ہے؟ آیا
وہ اِس مسئلہ کو مانتا ہے یا انکار کرتا ہے۔ جونہی
اُس نے یہ سوال کیا۔ معاً اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں
ڈال دیا کہ اِس کا اس سوال سے منشا یہ ہے کہ تم
جو مسیح موعود کو مسیح ناصری کا بروز اور اُن کا مثیل
کہتے ہو تو آیا اِس سے یہ مطلب ہے کہ مسیح ناصری
کی رُوح اِن میں آگئی ہے اگر یہی مطلب ہے تو یہ تناسخ
ہوا اور تناسخ کا عقیدہ قرآن کریم کے خلاف ہے
چنانچہ میں نے انہیں ہنس کر کہا۔ پادری صاحب آپکو
غلطی لگ گئی ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ مرزا صاحبؑ میں
مسیح ناصری کی رُوح آگئی ہے بلکہ ہم اِن معنوں میں
آپ کو مسیح ناصری کا مثیل کہتے ہیں کہ آپ مسیح ناصری
کے اخلاق اور روحانیت کے رنگ میں رنگین ہو کر
آئے ہیں۔ میں نے جب یہ جواب دیا تو اُسکا رنگ
فق ہوگیا اور کہنے لگا۔ آپ کو کس نے بتایا کہ میں نے
یہ سوال کرنا تھا۔ میں نے کہا۔ آپ یہ بتائیں کہ آیا
آپ کا اس سوال سے یہی منشا تھا یا نہیں؟

کہنے لگا - ہاں میرا منشا تو یہی دریافت کرنا تھا مَیں حیران
تھا کہ جب قرآن تناسخ کے خلاف ہے تو احمدی مرزا صاحب
کو مسیح موعود کس طرح کہہ سکتے ہیں - پھر مَیں نے کہا - اچھا
آپ دوسرا سوال پیش کریں - کہنے لگا - میرا دوسرا
سوال یہ ہے کہ نبی کی بعثت کیسے مقام پر ہونی چاہیئے
یعنے اس کو اپنا کام سرانجام دینے کے لئے کس قسم کا
مقام چاہیئے - جونہی اُس نے یہ دوسرا سوال کیا معًا
دوبارہ خدا نے میرے دل میں یہ بات ڈالدی کہ اس
سوال سے اس کا منشا یہ ہے کہ قادیان ایک چھوٹا
سا گاؤں ہے یہ دنیا کا مرکز کیسے بن سکتا ہے - اور
اس چھوٹے سے مقام سے ساری دنیا میں تبلیغ کس طرح
کی جاسکتی ہے - اگر حضرت مرزا صاحب کی بعثت
کا مقصد ساری دنیا میں اسلام کی تبلیغ پہنچانا ہے
تو آپ کو ایسی جگہ بھیجنا چاہیئے تھا جہاں ساری دنیا
میں آواز پہنچ سکتی ہو - نہ یہ کہ قادیان جو ایک چھوٹا
سا گاؤں ہے اس میں آپ کو بھیجدیا جاتا - غرض اللہ تعالیٰ
نے اس کے سوال کے معًا بعد یہ بات میرے دل میں
ڈال دی اور مَیں نے پھر اُسے مسکرا کر کہا - پادری
صاحب! ناصرہ یا ناصرہ سے بڑا کوئی شہر ہو وہاں
نبی آسکتا ہے - حضرت مسیح ناصری جس گاؤں میں
ظاہر ہوئے تھے اُس کا نام ناصرہ تھا اور ناصرہ کی
آبادی بمشکل دس بارہ گھروں پر مشتمل تھی - میرے
اس جواب پر پھر اس کا رنگ فق ہوگیا اور وہ حیران
ہوُا کہ مَیں نے اس کی اُسی بات کا جواب دے دیا جو
درحقیقت اُس کے سوال کے پس پردہ تھی - اس
کے بعد اُس نے تیسرا سوال کیا جو اِس وقت مجھے یاد نہیں
رہا - بہرحال اُس نے تین سوال کئے اور تینوں سوالات
کے متعلق قبل از وقت اللہ تعالیٰ نے القاء کرکے
مجھے بتادیا کہ اس کا اِن سوالات سے اصل منشاء
کیا ہے - اور باوجود اس کے کہ وہ چکّر دیکر پہلے اور سوال
کرتا تھا - پھر بھی اللہ تعالیٰ اس کا اصل منشاء مجھ پر
ظاہر کر دیتا اور وہ بالکل لاجواب ہوگیا - تو اللہ تعالیٰ
قلوب پر عجیب رنگ میں تصرف کرتا اور اس تصرّف کے
ماتحت اپنے بندوں کی مدد کیا کرتا ہے اور یہ تصرف
صرف خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہوتا ہے بندوں کے اختیار
میں نہیں ہوتا - ایک دفعہ ایک کج بحث مُلّا مسجد میں
مجھے ملا اور کہنے لگا - مجھے مرزا صاحب کی صداقت کا
ثبوت دیجیئے - مَیں نے کہا - قرآن موجود ہے - سارا
قرآن مرزا صاحب کی صداقت کا ثبوت ہے - کہنے لگا
کونسی آیت - مَیں نے کہا - قرآن کی ہر آیت مرزا صاحب
کی صداقت کا ثبوت ہے - اب یہ تو صحیح ہے کہ قرآن
کی ہر آیت ہی کسی نہ کسی رنگ میں نبی پر چسپاں ہوسکتی
ہے - مگر بعض آیات ایسی ہیں کہ ان کا سمجھانا اور یہ
بتانا کہ کس رنگ میں اس سے نبی کی صداقت کا ثبوت
نکلتا ہے بہت مشکل ہوتا ہے - فرض کرو کسی آیت
میں لڑائی کا واقعہ بیان ہو تو اب گو اس سے بھی نبی
کی صداقت ثابت کی جاسکتی ہے مگر وہ ایسا رنگ
ہوتا ہے جو عام طبائع کی سمجھ سے بالا ہوتا ہے - مگر
مجھے اُس وقت یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ تصرف فرما کر اسکی
زبان سے وہی آیت نکلوائے گا جس سے نہایت
وضاحت کے ساتھ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی
صداقت ثابت ہوجائیگی - خیر وہ اصرار کرتا رہا کہ آپ
کوئی آیت بتائیں - مگر مَیں یہ کہوں کہ آپ کوئی آیت
پڑھ دیں - اُسی سے مَیں حضرت مرزا صاحبؑ کی صداقت
ثابت کردونگا - آخر اُس نے یہ آیت پڑھی کہ وَمِنَ
النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (بقرہ آیت ۹) مَیں نے سمجھ لیا
کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی تصرّف ہے کہ اُس نے اسکی زبان سے

یہ آیت نکلوائی ہے۔ چنانچہ میں نے اُس سے کہا۔ یہ آیت کن لوگوں کے متعلق ہے مسلمانوں کے متعلق ہے یا غیر مسلمانوں کے متعلق۔ اس کا اصل سوال یہ تھا کہ جب مسلمان نمازیں پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں حج کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں تو اُن کے لئے کسی نبی کی کیا ضرورت ہے۔ جب اُس نے یہ آیت پڑھی تو میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ آیت کن لوگوں کے متعلق ہے۔ اُس نے کہا مسلمانوں کے متعلق۔ میں نے کہا تو پھر یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں سے بھی بعض لوگ خراب ہو جاتے ہیں۔ وہ مُنہ سے تو کہتے ہیں ہم مومن ہیں مگر درحقیقت وہ مومن نہیں ہوتے۔ اور قرآن یہ بتاتا ہے کہ خالی اپنے آپ کو مومن کہہ دینا کافی نہیں جب تک انسان اپنے عمل سے بھی ایمان کا ثبوت نہ دے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ جب مسلمان بھی بگڑ سکتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ اُن کی اصلاح کے لئے کسی نبی کو بھیجیگا یا نہیں بھیجیگا؟ دلوں کو تسلی دینا تو خدا کا کام ہے مگر اس کی زبان بند ہو گئی اور وہ اِس کا کوئی جواب نہ دے سکا اور اس بات کا میرے دل میں پہلے ہی یقین تھا کہ جو آیت اِس کے مُنہ سے نکلے گی وہ وہی ہوگی جس سے اس کی زبان بند ہو جائیگی تو علم بھی خدا کے اختیار میں ہے۔ جرأت بھی خدا کے اختیار میں ہے۔ عزت بھی خدا کے اختیار میں ہے اور طاقت بھی خدا کے اختیار میں ہے حضرت موسےٰ علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ میں فرعون کے دربار میں کہاں بول سکوں گا۔ مگر جب وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی ایسی تائید فرمائی کہ فرعون دنگ رہ گیا اور اُسے دلائل کے میدان میں موسےٰ علیہ السلام کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

اِس موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ فرمایا کہ فَاَرْسِلْ اِلٰی ھَارُوْنَ تُو اپنا پیغام ہارونؑ کی طرف بھیج۔ اِس سے یہ مُراد نہیں کہ تُو مجھے مبعوث نہ کر بلکہ جیسا کہ سورۂ طٰہٰ سے معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ دُعا کی تھی کہ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ھٰرُوْنَ اَخِی اشْدُدْ بِہٖٓ اَزْرِیْ وَاَشْرِکْہُ فِیْٓ اَمْرِیْ (طٰہٰ آیت ۳۰ تا ۳۳) یعنی اے میرے خدا! میرے اہل میں سے ہارون کو جو میرا بھائی ہے میرا نائب تجویز کر اور اُس کے ذریعہ سے میری طاقت کو مضبوط فرما اور اسے میرے کام میں شریک کر۔ پس اَرْسِلْ اِلٰی ھٰرُوْنَ کے یہ معنے ہیں کہ میرے علاوہ اس کی طرف بھی کلام بھیج اور اُسے بھی میرے ساتھ مبعوث فرما۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کسی مقدس انسان کو نبوت کا مقام عطا کیا جاتا ہے تو وہ انکسار کی وجہ سے گھبراتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ ایسا نہ ہو میں اس عظیم الشان ذمہ واری کو پوری طرح ادا نہ کرسکوں اور اِس میں میری طرف سے کوئی خامی اور نقص رہ جائے یہی طریق تمام انبیاء کا ہے اور اسی طریق سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی کام لیا اور کہدیا کہ ہارون کو بھی میرے ساتھ شامل کر دیجیئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی احادیث سے ثابت ہے کہ آپؐ نے ابتداء میں انکسار سے کام لیا اور جب فرشتے نے کہا اِقْرَءْ یعنی پڑھ۔ تو آپؐ نے یہی فرمایا کہ مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ۔ میں تو پڑھے لکھے آدمیوں میں سے نہیں ہوں۔ اِس وجہ سے میں نے کیا کام کرنا ہے۔ اور اسی بناء پر ابتدائی ایام میں آپؐ کو شدید گھبراہٹ رہی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی متواتر تائیدات نے آپؐ کو ایسے مقام پر کھڑا کر دیا کہ آپؐ نے سمجھ لیا اب میرا فرض ہے کہ میں آگے کی طرف بڑھتا چلا جاؤں اور کسی مشکل کی پرواہ نہ کروں مگر آپ کا عرفان چونکہ

موسیٰ عرفان سے بہت زیادہ تھا اس لئے آپؑ نے یہ
نہیں کہا کہ مجھے کوئی مددگار دیا جائے ۔ بلکہ آپؑ اکیلے
ہی اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہو گئے ۔ حالانکہ
آپؐ کے سپرد جو کام تھا وہ موسیٰؑ کے کام سے بہت بڑا
تھا ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی قوم کی طرف
مبعوث ہوئے تھے جو متمدّن تھی اور متمدّن لوگوں
کو دینی علوم سکھانا ۔ اُن میں نظام قائم کرنا اور
اُن کے اندر جماعتی رُوح پیدا کرنا نسبتاً آسان ہوتا
ہے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم کی
طرف آئے تھے جو تمدّن اور تہذیب سے بالکل ناآشنا
تھی ۔ یہاں تک کہ اطاعت جو دنیا میں مہذب قوموں
کا شعار سمجھا جاتا ہے وہ اُن کے نزدیک سخت ذلّت
کی بات تھی ۔ چنانچہ عرب کی ادب کی کتب میں لکھا
ہے کہ عرب میں ایک بادشاہ عمرو ابن ہند تھا ۔ اُس
نے ایک علاقہ پر جو شام اور عراق کی طرف تھا اپنی
حکومت قائم کی ۔ اور عرب کے لحاظ سے اِس قدر
شوکت حاصل کر لی کہ اُسے یہ خیال پیدا ہوا کہ سارا
عرب میری بات مانتا ہے ۔ ایک دن درباریوں سے
اُس نے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ کیا عرب میں کوئی
ایسا شخص بھی ہے جو میری بات ماننے سے انکار
کر سکے ۔ وہ اِس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ عرب کے
لوگ اطاعت کرنا نہیں جانتے ۔ مگر اُس نے خیال کیا
کہ مجھے ایسا رُعب حاصل ہو گیا ہے کہ اب عرب کا کوئی
شخص کم از کم میری بات ماننے سے انکار نہیں کر سکتا
انہوں نے کہا ۔ ایک شخص عمرو ابن کلثوم ہے ۔ جو
اپنے قبیلہ کا سردار ہے ۔ ہمارے خیال میں وہ ایسا
شخص ہے جو آپ کی اطاعت نہیں کریگا ۔ اُس نے کہا
بہت اچھا میں اِس کی تصدیق کرنے کے لئے اُسے
بلواتا ہوں ۔ چنانچہ بادشاہ نے عمرو ابن کلثوم کو
دعوت دی اور اُسے خط لکھا کہ آپ یہاں تشریف
لائیں آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے ۔ چنانچہ وہ اپنے
قبیلہ کے کچھ لوگوں کو لے کر آ گیا ۔ جیسے عرب کا دستور
تھا بادشاہ اُسوقت کسی جگہ خیموں میں ٹھہرا ہوا
تھا ۔ وہیں اُس نے آکر اپنے خیمے لگا دیئے ۔ اُس نے
عمرو ابن کلثوم کو یہ بھی لکھا تھا کہ اپنی والدہ اور دوسرے
عزیزوں کو بھی لیتے آنا ۔ چنانچہ وہ اس کے مطابق
اپنی والدہ کو بھی لے آیا ۔ عمرو ابن ہند نے اپنی والدہ
سے کہا کہ کام کرتے کرتے عمرو ابن کلثوم کی ماں سے کوئی
چھوٹا سا کام لے کر دیکھنا تا پتہ لگ سکے کہ اِن لوگوں
کی کیا حالت ہے ۔ چنانچہ جب وہ کھانا کھانے بیٹھے تو
عرب کے دستور کے مطابق گو وہ بادشاہ کہلاتا تھا مگر
اُس کی ماں خود کھانا تقسیم کرنے بیٹھ گئی ۔ اپنے
بیٹے کے لئے بھی اور عمرو ابن کلثوم کے لئے بھی ۔ گویا عمرو
ابن ہند کی والدہ اُسوقت عملاً عمرو ابن کلثوم اور اُس
کے دوسرے عزیزوں کا کام کر رہی تھی پس ایسے وقت
میں عمرو ابن کلثوم کی ماں کا کسی کام میں ہاتھ بٹانا ہرگز
اُس کی ہتک کا موجب نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ جب
بادشاہ کی ماں خود ایک کام کر رہی تھی تو اُس کام میں
عمرو ابن کلثوم کی ماں کا ہاتھ بٹانا کوئی ایسی بات نہیں
تھی جو اس کی شان اور عزّت کے منافی ہوتی ۔ مگر واقعہ
کیا ہوتا ہے ۔ کھانا تقسیم کرتے وقت ایک تھال کچھ
فاصلے پر پڑا تھا ۔ عمرو ابن ہند کی والدہ کھانا تقسیم
کرتے کرتے اُسے کہنے لگی ۔ بی بی ذرا وہ تھال تو سرکا
کر ادھر کر دینا ۔ اُسے بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ اِس
سے زیادہ اُسے کوئی کام کرنے کے لئے کہے ۔ مگر تاریخوں
میں لکھا ہے کہ جونہی اُس نے عمرو ابن کلثوم کی والدہ
سے یہ بات کہی ۔ وہ کھڑی ہو گئی اور اُس نے زور سے
پکارنا شروع کر دیا کہ او ابنِ کلثوم ! تیری ماں کی ہتک ہو گئی ہے

عمرو ابن کلثوم اُسوقت بادشاہ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا اور شاہی اعزاز کی وجہ سے وہ اپنے شہنشاہ خیمہ میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ مگر جونہی اُس نے اپنی ماں کی اِس آواز کو سُنا۔ اُس نے اپنی ماں سے جاکر یہ نہیں پوچھا کہ تمہاری کیا ہتک ہوئی ہے۔ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگ گیا۔ خیمہ میں بادشاہ کی تلوار لٹک رہی تھی۔ اُس نے اُچک کر تلوار کو میان سے نکالا اور بادشاہ کو قتل کر دیا۔ پھر باہر نکل کر اُس نے اپنے قبیلہ والوں سے کہا۔ بادشاہ کا سب مال و متاع لوٹ لو۔ چنانچہ اُس کا سب مال و متاع لوٹ کر وہ اپنے وطن کی طرف واپس چلا گیا۔

ایسی اُجڈ اور وحشی قوم کی طرف جو بالکل بے راہ رَو تھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمائے گئے۔ اور پھر موسیٰؑ کی طرح آپؐ کا دائرہ ہدایت صرف بنی اسرائیل تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ آپؐ کے سپرد تمام دُنیا کو دینِ واحد پر جمع کرنے اور انہیں خدا تعالیٰ کے آستانہ پر لا ڈالنے کا کام کیا گیا۔ مگر اتنا عظیم الشان کام سپرد ہونے کے باوجود آپؐ نے یہ نہیں کہا کہ اے اللہ! میرے رشتہ داروں یا دوستوں میں سے کوئی ساتھی میرے ساتھ کر دے۔ بلکہ آپ حکم ملتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا کہ بہت اچھا اور کام شروع کر دیا۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو اپنی انفرادیت پر پورا بھروسہ نہ کرتے ہوئے ایک ساتھی کا مطالبہ کیا۔ اور اگرچہ ایک ساتھی مل جانے سے اجتماعیت نہیں ہو جاتی لیکن تاہم اتنی ڈھارس ضرور ہو جاتی ہے کہ میں اکیلا نہیں بلکہ میرے ساتھ ایک اَور ساتھی بھی ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی انفرادیت کے کمال کا مظاہرہ کیا اور اس بات کی کوئی پروا نہ کی کہ دُنیا آپؐ سے کیا سلوک کرتی ہے۔ بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا مددگار مقرر کرنے کی درخواست کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔ مگر وہی موسیٰؑ جنہوں نے خدا تعالیٰ کے سامنے یہ عذر کیا تھا کہ میری تو زبان نہیں چلتی جب فرعون کے دربار میں گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی قوتِ بیانیہ عطا فرمائی کہ آپ خود ہی فرعون کے تمام سوالات کے جوابات دیتے چلے گئے اور حضرت ہارون علیہ السلام کو بولنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات پر جب انصار اور مہاجرین میں خلافت کے متعلق اختلاف پیدا ہوا۔ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچے تو حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ مَیں نے اس موقعہ پر تقریر کرنے کیلئے اپنے ذہن میں ایک بہت بڑا مضمون تیار کیا ہوا تھا۔ اور میرا ارادہ تھا کہ مَیں جاتے ہی ایسی تقریر کروں گا کہ تمام انصار میرے دلائل کے قائل ہو جائیں گے اور وہ اِس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ انصار کی بجائے مہاجرین میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کریں۔ مگر جب ہم وہاں پہنچے تو حضرت ابوبکرؓ نے تقریر شروع کر دی۔ مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ اِنہوں نے بھلا کیا بیان کرنا ہے مگر خدا کی قسم جتنی باتیں مَیں نے سوچی ہوئی تھیں وہ سب اِنہوں نے بیان کر دیں بلکہ ان کے علاوہ اِنہوں نے اپنے پاس سے بھی بہت سے دلائل دیئے۔ تب مَیں نے سمجھا کہ مَیں ابوبکرؓ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اِسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سمجھتے تھے کہ مجھ سے فرعون کے دربار میں کہاں بولا جائیگا۔ مگر جب وہاں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی ایسی تائید فرمائی کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو ایک لفظ تک نہ بولنا پڑا اور اِس طرح خدا تعالیٰ نے اپنے انتخاب کی عظمت کو ظاہر کر دیا۔ اسکے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اَور عذر کیا اور کہا۔

کہ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُوْنِ وہ لوگ مجھ پر ایک گناہ کا الزام لگاتے ہیں۔ سو میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں مجھے قتل ہی نہ کر دیں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان دینے سے ڈرتے تھے بلکہ انہیں اس بات کا خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فرعون مجھے جاتے ہی گرفتار کرلے اور اس وجہ سے کہ میرے ہاتھ سے ایک قبطی مارا جا چکا ہے میرے قتل کے احکام صادر کر دے اور خدا تعالیٰ کا پیغام اُسے نہ پہنچ سکے۔ گویا انہیں اپنی موت کا غم نہیں تھا بلکہ انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں انہیں اپنے فرائض کی بجا آوری سے پہلے ہی قتل نہ کر دیا جائے اور اس طرح اُس مشن کو نقصان نہ پہنچے جو خدا تعالیٰ نے اُنکے سپرد کیا تھا۔ ورنہ انبیاء خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان دینے سے نہیں ڈرتے۔ بیشک جہاں تک نبیوں کا وجود اُن کی اُمت کے مقابلہ میں ہوتا ہے وہ بہت بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ اتنی بڑی حیثیت کہ اگر ساری دُنیا کی جانیں بھی ایک نبی کی جان بچانے کیلئے قربان کرنی پڑیں تو وہ قربان کی جا سکتی ہیں۔ مگر جہاں تک صداقت کا سوال ہے نبی بھی اُسی طرح صداقت کا خادم ہوتا ہے جس طرح اس کا عام پیرو صداقت کا خادم ہوتا ہے اگر کسی سلسلۂ روحانیہ کے پہلے اور آخری نبی کے علاوہ کہ جن پر سلسلہ کا انحصار ہوتا ہے کوئی اور نبی مارا جاتا ہے یا جلاوطن کر دیا جاتا ہے لیکن اُس کی پیش کردہ صداقت دنیا سے نہیں مٹتی تو اُس کا مارا جانا یا وطن سے بے وطن ہو جانا ہرگز قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ نبی کے مقابلہ میں صداقت حاکم ہوتی ہے اور نبی خادم۔ جس طرح نبی کے مقابلہ میں اُمت خادم ہوتی ہے اور نبی حاکم۔ جس طرح نبی کے مقابلہ میں اگر ساری دنیا بھی تباہ کر دی جائے تو کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کا پیغام دنیا تک پہنچ جائے تو پھر بیشک نبی شہید ہو جائے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ اس غرض کے لئے آیا تھا کہ صداقت دنیا میں پھیلائے پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس خدشہ کا اظہار اپنی موت کے خوف سے نہیں کیا بلکہ اس لئے کیا کہ کہیں صداقت دنیا سے مٹ نہ جائے۔ اور خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے سے پہلے ہی وہ اُس کے ظلم و استبداد کا شکار نہ ہو جائیں۔

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جو یہ فعل سرزد ہوا تھا محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ جو خدا تعالیٰ کی نگاہ میں آپ کو مجرم بنانے والا نہیں تھا۔ کیونکہ ذَنْبٌ ہر ایسے فعل کو کہتے ہیں جس کا نتیجہ خراب نکلے خواہ شرعی نقطۂ نگاہ سے وہ انسان کو مجرم بنانے والا نہ ہو (مفردات) مگر اس سے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقام کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُن کی بعثت سے پہلے ایک الزام لگایا گیا خواہ وہ جھوٹا ہی تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کی بعثت سے پہلے بھی تمام لوگ امین اور صدوق کہتے اور آپ کی نیکی اور انصاف اور دیانتداری کے قائل تھے بہرحال یہ حادثہ چونکہ ایسا تھا جس میں فرعونی قوم کا ایک آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے مارا گیا تھا اور فرعون کے وزراء نے آپ کو قتلِ عمد کا مرتکب قرار دیکر چاہا تھا کہ آپ کو قتل کر دیا جائے جس کے نتیجہ میں آپ کو مصر سے بھاگ کر مدین میں پناہ گزین رہنا پڑا اس لئے آپ نے اس فعل کو ذنب قرار دیا۔ اور اس خدشہ کا اظہار فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ میرے اس فعل کی بنا پر مجھے جاتے ہی گرفتار کرلیں اور مجھے قتل کر دیں۔ یہ واقعہ قرآن کریم میں اس طرح بیان

کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ رات کے وقت شہر میں پھر رہے تھے کہ انہوں نے دو آدمیوں کو آپس میں لڑتے اور دست و گریبان ہوتے دیکھا۔ اُن میں سے ایک اُن کی قوم کا فرد تھا اور ایک اُن کی دشمن یعنی فرعونی قوم کا فرد تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر اُن کی قوم کے آدمی نے انہیں آواز دی اور اپنی مدد کے لئے بلایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور انہوں نے مخالف شخص کو ایک مکّا مارا۔ مکّا یا تو اُسے زیادہ زور سے مارا گیا یا اُس شخص کا دل اور جگر کمزور تھا اور مکّا اس کے دل اور جگر پر لگا۔ بہر حال اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ گر گیا اور اُس کی جان نکل گئی۔ دوسرے دن وہ صبح کے وقت پھر شہر کی گشت کے لئے نکلے۔ تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ وہی شخص جو کل اُن سے مدد مانگ رہا تھا آج پھر کسی اَور سے لڑ رہا ہے اور موسیٰؑ کو اپنی مدد کے لئے بلا رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ کل بھی یہی شخص لڑ رہا تھا اور آج بھی یہی یہی لڑ رہا ہے تو سمجھا کہ یہ کوئی جوشیلا آدمی معلوم ہوتا ہے ورنہ وجہ کیا ہے کہ ہر شخص اسی کو مارنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہو۔ چنانچہ آپ نے اُسے کہا کہ دوسرے شخص کا قصور تو ہوگا۔ مگر تم بھی بہت جوشیلے معلوم ہوتے ہو۔ اِس کے بعد انہوں نے چاہا کہ آگے بڑھ کر دوسرے شخص کا مقابلہ کریں۔ مگر اُس نے سمجھا کہ چونکہ ابھی انہوں نے مجھے ڈانٹا ہے اسلئے شاید یہ مجھے ہی مارنے کیلئے آگے بڑھے ہیں۔ چنانچہ اُس نے بے سوچے سمجھے چلّا چلّا کر کہنا شروع کر دیا کہ اے موسیٰ! کیا تُو یہ چاہتا ہے کہ جس طرح کل تُو نے ایک شخص کو مارا تھا اسی طرح مجھے بھی مار دے۔ اُس کے اِس شور سے اردگرد کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کل جو آدمی مارا گیا ہے وہ موسیٰؑ نے ہی مارا تھا۔ اور چونکہ مقتول فرعونی قوم کا آدمی تھا

اس لئے یہ خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور تمام قوم میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ یہ خبر ذمہ وار افسروں تک پہنچ گئی اور انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ موسیٰؑ کو قتل کر دیا جائے۔ اِنہی سردارانِ قوم میں سے ایک شخص جو در پردہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخلصانہ تعلقات رکھتا تھا دوڑا ہُوا آیا اور اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ سردارانِ قوم تیرے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں اسلئے میری نصیحت یہ ہے کہ فوراً اس شہر سے نکل جاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر سے نکلے اور کئی منزلیں طے کرنے کے بعد مدین میں جا نکلے۔ پس وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اِسی واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا اور اس خدشہ کا اظہار کیا کہ وہ لوگ اس واقعہ کی بنا پر مجھے قتل نہ کر دیں۔ اِس سے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ظاہر ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو اللہ تعالیٰ سے اپنی حفاظت کا وعدہ لیا۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کچھ بولے کھڑے ہو گئے اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی قسم کی تکلیف کی پروا نہ کی۔ بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اس خدشہ کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تم دونوں ہمارے نشانات کے ساتھ فرعون کے پاس جاؤ اور یاد رکھو کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہمیشہ تمہاری دعاؤں کو سُنتے رہیں گے۔ جب بھی تمہیں کوئی مشکل پیش آئے تم میرے حضور جھکو اور دُعائیں کرو۔ مَیں اُسی وقت تمہاری مدد کے لئے دوڑا چلا آؤنگا۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ ہم ربّ العالمین خدا کے رسول ہیں۔ اور ہم اسلئے آئے ہیں

کہ تو بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر کے ہمارے ساتھ روانہ کر دے۔

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہاں موسیٰ اور ہارونؑ دو کا ذکر ہے مگر آگے یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم دونوں رب العالمین کی طرف سے رسول ہیں۔ حالانکہ دو آدمیوں کے لئے رَسُوْلَانِ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے رسول کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عرب لوگ کبھی کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ ھٰذَانِ رَسُوْلِیْ وَ وَکِیْلِیْ وَھٰؤُلَاءِ رَسُوْلِیْ وَ وَکِیْلِیْ یعنی یہ دو یا سب کے سب میرے رسول اور وکیل ہیں (فتح البیان جلد ۷ صفحہ) اسی طرح قرآن کریم میں بھی دوسری جگہ یہ محاورہ استعمال کیا گیا ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں فَاِنَّھُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (شعراء ع۵) یعنی یہ سب کے سب رب العالمین کے سوا میرے دشمن ہیں حالانکہ عام عربی قواعد کے لحاظ سے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ یہ سب میرے اعداء ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں اَعْدَاءٌ کا لفظ نہیں بلکہ عَدُوٌّ کا لفظ رکھا ہے جو مفرد ہے۔ پس اس آیت پر نہ عربی زبان کے لحاظ سے کوئی اعتراض ہو سکتا ہے اور نہ محاورۂ قرآن کے لحاظ سے کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ میں اَنْ تفسیری بھی ہو سکتا ہے اور اَنْ مصدری بھی ہو سکتا ہے۔ مصدری ہونے کی صورت میں اس کے یہ معنے ہونگے کہ نَحْنُ مُرْسَلُوْنَ لِتُرْسِلَ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ہم خدا تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اس موقعہ پر قرآن کریم اور بائیبل کے ایک اختلاف کا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بائیبل میں لکھا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ

"تو اسرائیلی بزرگوں کو ساتھ لے کر مصر کے بادشاہ کے پاس جانا اور اُس سے کہنا کہ خداوند عبرانیوں کے خدا کی ہم سے ملاقات ہوئی۔ اب تو ہم کو تین دن کی منزل تک بیابان میں جانے دے تاکہ ہم خداوند اپنے خدا کے لئے قربانی کریں۔"

(خروج باب ۳ آیت ۱۸)

گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ نے ایک رنگ میں حضرت موسیٰ اور ہارونؑ کو دھوکا کی تعلیم دی۔ اور کہا کہ فرعون کو اگر صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ ہم بنی اسرائیل کو اس ملک سے نکال کرلے جانا چاہتے ہیں تو وہ اس کی اجازت نہیں دیگا۔ اس دھوکا اور فریب سے اُس سے اجازت حاصل کی جائے کہ ہم اپنے خدا کے لئے قربانی کرنا چاہتے ہیں اس لئے ہمیں مصر سے نکلنے کی اجازت دی جائے۔ جب وہ اس کی اجازت دیدے تو اس بہانہ سے تمام بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے کر مصر سے نکل آنا۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ ہم نے موسیٰ اور ہارونؑ کو صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ فرعون سے جاتے ہی یہ مطالبہ کرنا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دیا جائے کیونکہ اب اُن پر مظالم کی انتہا ہو چکی ہے۔ کسی دھوکا اور فریب کی ہم نے انہیں تعلیم نہیں دی تھی۔

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کے الفاظ یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مختص القوم نبی تھے جو صرف بنی اسرائیل کو غلامی کی اُن زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے آئے تھے جن میں وہ سینکڑوں سال سے جکڑے چلے آتے تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت عطا فرمائی کہ آپ کسی ایک قوم

کی طرف نہیں بلکہ تمام دنیا کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے
چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا
(سبا آیت ۲۹) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! ہم نے تجھے تمام
بنی نوع انسان کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔
اِس میں عربی اور غیر عربی یا مشرقی اور مغربی کا کوئی
امتیاز نہیں۔ دنیا کے ہر شخص کا خواہ وہ کسی ملک کا
رہنے والا ہو اور خواہ وہ کوئی زبان بولنے والا ہو۔
فرض ہے کہ وہ تیرے پیغام کو قبول کرے اور تیری
ہدایات کے تابع چلے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جو تمام دُنیا سے منقطع
تھا۔ وہ ملک تمدن کے لحاظ سے بھی کمزور تھا علمی لحاظ
سے بھی کمزور تھا اور سیاسی لحاظ سے بھی کمزور تھا۔ اس
کمزور ترین ملک میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک
کمزور ترین انسان تھے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے آپؐ سے کہا کہ
ہم نے تجھے تمام دنیا کی طرف رسول بنا کر مبعوث کیا ہے۔
اگر ہم اس فقرہ کی صحیح ترجمانی کریں تو اس کے معنے یہ
ہونگے کہ خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
سے کہا۔ اے میرے رسول! تُو کہہ دے کہ مَیں کینیڈا کی
ہدایت کیلئے آیا ہوں جس کو تم جانتے بھی نہیں۔ مَیں یونائیٹڈ
اسٹیٹس امریکہ کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہوں جو ابھی آباد
بھی نہیں ہوئیں۔ مجھے خدا تعالیٰ نے برازیل۔ کیوبا۔ بولیویا
چلّی۔ کولمبیا اور میکسیکو کی ہدایت کیلئے مبعوث فرمایا ہے
جنہیں ابھی کوئی جانتا بھی نہیں اور بالکل ویران پڑے ہیں
اور کسی آئندہ زمانہ میں آباد ہونگے۔ مَیں جاپان اور فلپائن
کی اصلاح کیلئے بھیجا گیا ہوں جن کو کوئی نہیں جانتا بلکہ
مَیں اُن ملکوں کی ہدایت کے لئے بھی مامور کیا گیا ہوں
جو ابھی دریافت بھی نہیں ہوئے۔ غرض اس آیت کو
پھیلا کر دیکھا جائے تو انسان محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔

آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اِس دعویٰ کو
پورا کرنے کے کونسے سامان تھے۔ آپ کے پاس کونسے
ہوائی جہاز تھے کہ جن کے ذریعہ آپؐ امریکہ جاتے۔ کینیڈا
جاتے۔ برازیل۔ کولمبیا اور بولیویا جاتے۔ پھر آپؐ پاس
وہ کونسے ذرائع تھے کہ جن سے آپؐ اپنی تعلیم کو اپنی
وفات کے بعد بھی ممتد کئے جاتے جب تک وہ ملک
دریافت نہ ہوتے آپؐ وہاں جا ہی کیسے سکتے تھے۔ لوگ
بات کرتے ہیں تو اُن کے بیٹے بھول جاتے ہیں اور اگر بیٹے
یاد رکھتے ہیں تو پوتے بھول جاتے ہیں۔ اگر پوتے یاد
رکھتے ہیں تو پڑپوتے بھول جاتے ہیں۔ مگر یہ ملک تو
اُس وقت دریافت بھی نہیں ہوئے تھے۔ آپؐ کی
وفات کے نو سو سال بعد امریکہ دریافت ہوا۔ لیکن
فرض کرو۔ اُسوقت امریکہ دریافت بھی ہوا ہوتا تو
آپؐ کے پاس کونسی گارنٹی تھی کہ آپؐ کا دعویٰ پورا ہو
جائیگا۔ ہمیں تو یہی نظر آتا ہے کہ لوگ اپنے بچے قربان
کرتے ہیں۔ اپنے بھائی قربان کرتے ہیں اپنا عیش اور
آرام قربان کرتے ہیں۔ بعض ناجائز باتوں کیلئے قربانیاں
کرتے ہیں بعض جائز اور اچھی باتوں کے لئے قربانیاں کرتے ہیں لیکن اُن کے
نتائج بہت محدود رہتے ہیں اور ان محدود نتائج کا بھی کوئی ذمہ وار نہیں
ہوتا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس طرح دعویٰ
تمام دنیا سے نرالا تھا۔ اسی طرح آپؐ کا بدلہ بھی نرالا تھا
چنانچہ باوجود اِس کے کہ آپؐ کے پاس کوئی ایسے سامان
نہیں تھے جن سے آپ اپنا پیغام دنیا کے تمام ممالک
تک پہنچا سکتے۔ پھر بھی خدا تعالیٰ نے آپؐ کو بعض اسود
و احمر و اصفر سب میں قبولیت بخشی اور آپؐ کا دین
مختلف قوموں اور ملکوں میں پھیلنا شروع ہوا۔
یہاں تک کہ وہ دنیا کے کناروں تک پھیل گیا۔ چنانچہ
آج چین میں کروڑوں مسلمان ہیں۔ انڈونیشیا میں نوّے
فیصدی مسلمان ہیں۔ انڈین یونین میں پچیس تیس فیصدی

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ

اس (فرعون) نے کہا (اے موسیٰ) کیا ہم نے تجھ کو اس وقت نہیں پالا جبکہ تو ابھی بچہ تھا۔ اور تو نے ہم میں اپنی عمر کے

سِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۰﴾

بہت سے سال گذارے ہیں۔ اور تو نے وہ کام بھی کیا ہے جو تو کر چکا ہے۔ اور تو (ہمارے احسانوں کا) ناشکر گذار ہے۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۱﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ

(موسیٰ نے) کہا وہ کام (جس کا تو نے اشارہ کیا ہے) میں نے اُس وقت کیا تھا جبکہ میں اپنی قوم کی محبت میں سرشار تھا پس جب مجھے تم سے ڈر محسوس ہوا تو

لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۲﴾

میں تم سے بھاگ کر چلا گیا۔ اس پر میرے رب نے مجھے حُکم (یعنی عہدۂ نبوت) عطا فرمایا اور مجھے رسولوں میں سے (ایک رسول) بنا دیا۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۳﴾

اور بچپن میں مجھے پالنے کی نعمت جس کا تم احسان جتاتے ہو کیا یہ اس بات کے مقابل میں پیش کی جاتی ہے کہ تم نے بنی اسرائیل کی ساری قوم کو

مسلمان ہیں۔ پھر افغانستان۔ ایران۔ برما۔ شام۔ فلسطین ایسے سینیا۔ وسطی افریقہ۔ شمالی و جنوبی افریقہ۔ مغربی و مشرقی افریقہ۔ امریکہ۔ ایشیا اور یورپ کے بہت سے علاقوں میں لاکھوں کروڑوں مسلمان پائے جاتے ہیں۔ غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نمایاں امتیاز حاصل ہے کہ آپ تمام دنیا کی طرف مبعوث کئے گئے جبکہ موسیٰ صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے مبعوث کئے گئے۔

چونکہ بنی اسرائیل کی غلامی کا اصل باعث فرعون کا پنجۂ استبداد تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کی طرف موسیٰ کو بھجوایا اور اُسے توجہ دلائی کہ بنی اسرائیل کی مظلومیت کی پکار ہمارے عرش تک پہنچ چکی ہے اب تمہارے لئے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ تم اپنے فولادی پنجہ کی گرفت کو ڈھیلا کر دو اور بنی اسرائیل کو آزاد کر دو ورنہ خدا تعالیٰ کے فرشتے آسمان سے تلواریں لے کر اتریں گے اور وہ تمہیں اس جرم کی عبرتناک سزا دیں گے۔

۶۔ تفسیر۔ فرماتا ہے۔ جب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کا یہ پیغام سُنا۔ تو نہایت ڈھٹائی سے کہنے لگا۔ اے موسیٰ! وہ دن بھول گئے جب ہم تجھے پالا کرتے تھے۔ اور جبکہ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہم میں گذارے۔ اب تجھے بھی باتیں کرنی آگئی ہیں اور تو جو ہمارے ٹکڑوں پر پلا ہے۔ اب ہمیں ہی نصیحت کرنے کے لئے آگیا ہے۔ یہ الفاظ اُس نے موسیٰ کی تحقیر کے لئے اُسی طرح کہے جس طرح فقیہوں اور فریسیوں نے جب مسیح کو کوچوں اور بازاروں میں تبلیغ کرتے اور خدائے واحد کا نام بلند کرتے دیکھا تو انہوں نے کہا:۔

"کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں۔ اور

اُس کی ماں کا نام مریم اور اس کے بھائی یعقوب
اور یوسف اور شمعون اور یہوداہ نہیں ۔ اور
کیا اس کی سب بہنیں ہمارے ہاں نہیں؟
پھر یہ سب کچھ اس میں کہاں سے آیا ۔ اور
انہوں نے اس کے سبب سے ٹھوکر کھائی ۔"

(متی باب ۱۳ آیت ۵۵ و ۵۶)

جس طرح فریسیوں کے لئے یہ بات حیرت کا موجب تھی کہ یہ شخص جو ایک بڑھئی کا بیٹا ہے اور جس کی تمام بہنیں ہمارے ہاں بیاہی ہوئی ہیں ہمیں وعظ اور نصیحت کرنے کے لئے آ گیا ہے ۔ اسی طرح فرعون کے لئے بھی یہ بات حیرت کا موجب ہوئی کہ موسٰی جسے اس کی ماں نے ہم سے ڈرتے ہوئے سمندر کی طوفانی موجوں میں پھینک دیا تھا اور جسے بچا کر ہم نے اپنے گھروں میں رکھا اور اس کی پرورش کی وہی ہمارے ٹکڑے کھانے کے بعد آج نعوذ باللہ ایسا طوطا چشم نکلا ہے کہ میری طاقت اور عظمت کا اس نے ذرا بھی پاس نہیں کیا اور اس نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ میں اس کی غلامی اختیار کر دوں ۔ فرعون اُس وقت موسٰیؑ کی ابتدائی حالت اور اپنے موجودہ عروج کو دیکھ رہا تھا ۔ مگر وہ اس بات کو بھول گیا کہ بعض دفعہ ایک چھوٹا سا بیج بویا جاتا ہے لیکن بعد میں وہ نشوونما پاتے پاتے اتنا ترقی کر جاتا ہے کہ دنیا حیران ہو جاتی ہے ۔ اور بعض دفعہ ایک چیز ابتدا میں نہایت اہم نظر آتی ہے لیکن اُس کا انجام اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ انسان حیران ہو جاتا ہے کہ ایک چھوٹی سی بات کو اتنی اہمیت اور عظمت کیوں دے دی گئی تھی ۔ مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل قریباً ہم عمر تھے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ایسی حالت میں ہوئی کہ آپؐ کے والد آپ کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے ۔ اگر وہ زندہ بھی ہوتے تو پھر بھی وہ کوئی مالدار آدمی نہیں تھے ۔ آپؐ کے دادا حضرت عبد المطلب بھی امیر لوگوں میں سے نہ تھے اور گو آپ آسودہ حال ضرور تھے لیکن چونکہ آپ ایک سخی آدمی تھے ۔ اس لئے آخری عمر میں آپ کی دولت بہت کم ہو گئی تھی ۔ پس اوّل تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان کوئی امیر خاندان نہیں تھا دوسرے آپ خصوصیت سے غریبانہ حالت میں پیدا ہوئے ۔ آپؐ کے والد آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے ۔ پس آپ کی پیدائش پر آپ کی والدہ نے کیا خوشی کی ہو گی ۔ آپ کی والدہ کے پاس کچھ تھا ہی نہیں ۔ لوگ تو دنیا کو دیکھتے ہیں ۔ مال اور دولت کو دیکھتے ہیں ۔ جہاں روپیہ ہوتا ہے وہاں جمع ہو جاتے ہیں ۔ مگر آپ کی والدہ کے پاس روپیہ نہیں تھا ۔ شاید آپ کے قریبی رشتہ دار مبارکباد دینے کے لئے آ گئے ہوں ۔ مگر دوسرے لوگوں نے آپ کی پیدائش کو کوئی اہمیت نہیں دی ۔ لیکن ابوجہل کا باپ مالدار تھا ۔ جب وہ پیدا ہوا ہو گا اس کے ماں باپ نے کتنی خوشیاں منائی ہوں گی ۔ ابوجہل کا نام ابوالحکم تھا یعنی حکمتوں کا باپ ۔ عقلمند دانا اور مدبّر لیکن بعد میں اُس نے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت کی اور حماقت کا اظہار کیا تو مسلمانوں نے اُس کا نام ابوجہل رکھ دیا ۔ ابوجہل کے ماں باپ چونکہ مالدار تھے ۔ اس لئے جب وہ پیدا ہوا ہو گا تو ہر شخص جس کی ضروریات اُن سے وابستہ ہوں گی اُنکے گھر پہنچا ہو گا اور اس کی پیدائش پر مبارکباد دی ہو گی اور کہا ہو گا ہمارا ملک کتنا ہی خوش قسمت ہے جس میں اس جیسا بچہ پیدا ہوا ۔ اس کے چہرہ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اسکے اقبال کا ستارہ کتنا بلند ہے ۔

غرض اُس کی تعریف میں لوگوں نے ہزاروں مبالغے کئے ہونگے معلوم نہیں اُس کی پیدائش پر کتنے اونٹ ذبح کرکے دعوتیں کی گئی ہونگی۔خوشی میں دفیں بجائی گئی ہونگی۔عورتوں نے گیت گائے ہونگے۔رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش پر آپؐ کے گھر کے پاس سے گذرنے والے یہ خیال کرتے ہونگے کہ ایک غریب کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے جو خود بخود ختم ہو جائیگا۔لیکن ابوجہل کی پیدائش پر اس کے گھر کے پاس سے گذرنے والے یہ سمجھتے ہونگے کہ آج ایک رئیس پیدا ہوا ہے۔نہ معلوم بڑا ہو کر یہ کیا کچھ کرے گا۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتداء بظاہر ایک ادنیٰ رنگ میں ہوئی لیکن انتہاء کیا ہوئی؟ وہی بچہ جس کو دائیاں لینے کے لئے تیار نہیں تھیں جسکی پیدائش پر مکہ والوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا جب فوت ہوا تو عرب کی تاریخ میں ہی نہیں ساری دُنیا کی تاریخ میں ایک غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا۔گویا آپ پر یہ الہٰی نوشتہ اپنی پوری شان کے ساتھ صادق آیا کہ

" وہ پتھر جسے معماروں نے ناپسند کیا

وہی کونے کا سرا ہوا۔"

(مرقس باب ۱۲ آیت ۱۰ و لوقا باب ۲۰ آیت ۱۷)

سارے عرب قبائل آپؐ کے زیر سایہ تھے جو آپؐ سے پہلے کسی بادشاہ کے مطیع نہیں ہوئے تھے۔پھر بادشاہوں کو جو ظاہری عظمت حاصل ہوتی ہے اُس کی وجہ سے ڈر کے مارے لوگ اُن کی بڑائیاں بیان کرتے ہیں لیکن دل میں انہیں ہزاروں ہزار گالیاں دیتے ہیں۔بادشاہ جب مرجاتے ہیں تو بے شک ان کی موت سے ملک کو صدمہ بھی ہوتا ہے لیکن لوگ یہی کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ اگر مرگیا ہے تو کوئی دوسرا شخص بادشاہ بن جائیگا۔اور وہ وہی کام شروع کردیگا جو پہلا بادشاہ کرتا تھا۔انگریزی میں ایک مثل ہے :-

KING NEVER DIES یعنی بادشاہ کبھی نہیں مرتے۔ایک بادشاہ مرجاتا ہے تو دوسرا کھڑا ہو جاتا ہے اور پہلے بادشاہ اور دوسرے بادشاہ میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا۔اگر قوم بیدار ہوتی ہے۔ تو دوسرے بادشاہ کے وقت میں بھی وہ ترقی کرتی چلی جاتی ہے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔آپ کی وفات کو تمام عرب نے جو اُسوقت آپ کی خوبیوں۔اہمیت اور عظمت کا قائل ہو چکا تھا ایک انسان کی موت خیال نہیں کیا۔ملک کی موت خیال نہیں کیا۔بلکہ دنیا کی موت خیال کیا چنانچہ حسان بن ثابتؓ نے آپؐ کی وفات پر جو شعر کہے وہ یہ ہیں کہ ؎

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيَّ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ

یعنی اے محمد رسول اللہ! آپ تو میری آنکھوں کی پتلی تھے۔آپؐ کی وفات نہیں ہوئی بلکہ میری آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں۔اب کوئی شخص مرتا پھرے مجھے اِس سے کیا۔مَیں تو آپؐ کے متعلق ہی ڈرتا تھا۔یہ وہ جذبۂ عقیدت تھا جو آپ کے متعلق صحابہؓ میں پایا جاتا تھا۔حسان بن ثابتؓ نے ایک شاعرانہ کلام ہی نہیں کہا بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ تمام عرب نے حسان بن ثابتؓ کے اِن شعروں کو اپنے ہی جذبات کا اظہار خیال کیا۔گویا عرب کی آواز حسان بن ثابتؓ کی زبان پر جاری ہو گئی۔تاریخ کہتی ہے کہ ہفتوں تک مدینہ مکہ اور دوسرے مسلمان شہروں والے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے۔بازاروں میں چلتے پھرتے اور اپنے کاروبار کرتے ہوئے یہی شعر پڑھتے تھے کہ

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيَّ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ أُحَاذِرُ

لیکن ابوجہل جس کی پیدائش پر سینکڑوں اونٹ ذبح کر کے لوگوں میں گوشت تقسیم کیا گیا تھا جس کی پیدائش پر دفوں کی آواز سے مکّہ کی فضا گونج اٹھی تھی بدر کی لڑائی میں جب مارا جاتا ہے۔ تو پندرہ پندرہ سال کے دو انصاری چھوکرے تھے جنہوں نے اُسے زخمی کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جنگ کے بعد لوگ جب واپس جا رہے تھے تو مَیں میدان میں زخمیوں کو دیکھنے کے لئے چلا گیا آپ بھی مکّہ ہی کے تھے۔ اسلئے ابوجہل آپ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ آپ فرماتے ہیں کہ مَیں میدانِ جنگ میں پھر ہی رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ابوجہل زخمی پڑا کراہ رہا ہے۔ جب مَیں اس کے پاس پہنچا۔ تو اُس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مَیں اب بچتا نظر نہیں آتا تکلیف زیادہ بڑھ گئی ہے۔ تم بھی مکّہ والے ہو۔ مَیں یہ خواہش کرتا ہوں کہ تم مجھے مار دو تا میری تکلیف دُور ہو جائے۔ لیکن تم جانتے ہو کہ مَیں عرب کا سردار ہوں اور عرب میں یہ رواج ہے کہ سرداروں کی گردنیں لمبی کر کے کاٹی جاتی ہیں۔ اور یہ مقتول کی سرداری کی علامت ہوتی ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ تم میری گردن لمبی کر کے کاٹنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ مَیں نے اُس کی گردن ٹھوڑی سے کاٹ دی اور کہا کہ تیری یہ آخری حسرت بھی پوری نہیں کی جائیگی۔ اب انجام کے لحاظ سے دیکھو تو ابوجہل کی موت کتنی ذلّت کی موت تھی جس کی گردن اپنی زندگی میں ہمیشہ اونچی رہا کرتی تھی وفات کے وقت اس کی گردن ٹھوڑی سے کاٹی گئی۔ اور اُس کی یہ آخری حسرت بھی پوری نہ ہوئی پھر چونکہ کفار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں گڑھے کھودا کرتے تھے اور مسلمانوں کو پتھروں پر گھسیٹتے تھے اور آپؐ کی یہ پیشگوئی تھی کہ ایک دن ان کفار کو بھی بالوں سے پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جائیگا (علق آیت ۱۶/۱۷) اس لئے بدر کی جنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ کفار کی لاشوں کو ایک اندھے کنوئیں میں گرا دیا جائے۔ آپؐ کے اس حکم کے مطابق صحابہؓ نے کفار کی لاشوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر ایک اندھے کنوئیں میں پھینکدیا۔ غرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل دونوں کی پیدائش اور وفات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کے وقت جو ناقابلِ التفات نظر آتا تھا وفات کے وقت وہ سیدِ عرب بنا۔ لیکن جو سیدِ عرب نظر آتا تھا وفات کے وقت وہ نہایت ہی ذلیل وجود ثابت ہوا۔ غرض بعض دفعہ ایک چیز کی ابتداء اَور ہوتی ہے اور انتہاء اَور۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی جب پیدا ہوئے تو آپ کے ماں باپ نے آپ کی پیدائش پر خوشی کی ہوگی۔ مگر جب آپ کی عمر بڑی ہو گئی اور آپ کے اندر دُنیا سے بے رغبتی پیدا ہو گئی۔ تو آپ کے والد آپ کی اس حالت کو دیکھ کر آہیں بھرا کرتے تھے کہ ہمارا یہ بیٹا کسی کام کے قابل نہیں۔ مجھے ایک سکھ نے بتایا کہ ہم دو بھائی تھے ہمارے والد صاحب بڑے مرزا صاحب (یعنی مرزا غلام مرتضیٰ صاحب) کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور ہم بھی بسا اوقات اُن کے ساتھ آجایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مرزا صاحب نے ہمارے والد صاحب سے کہا۔ کہ تمہارے لڑکے غلام احمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پاس آتے جاتے ہیں۔ تم ان سے کہو کہ اُسے جا کر سمجھائیں۔ ہم دونوں جب آپ کے پاس جانے کیلئے تیار ہو گئے تو مرزا صاحب نے کہا کہ غلام احمد (علیہ السلام) کو باہر جا کر کہنا کہ تمہارے والد کو اس خیال سے بہت دُکھ ہوتا ہے کہ اُس کا چھوٹا لڑکا اپنے بڑے بھائی کی روٹیوں پر پلے گا۔ اسے کہو کہ میری زندگی میں ہی کوئی کام کرے

میں کوشش کر رہا ہوں کہ اسے کوئی اچھی نوکری مل جائے میں مر گیا تو پھر سارے ذرائع بند ہو جائیں گے۔ اُس سکھ نے بتایا کہ ہم مرزا غلام احمد صاحب (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پاس گئے۔ اور کہا کہ آپ کے والد صاحب آپ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ انہیں یہ دیکھ کر کہ آپ کچھ کام نہیں کرتے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر میں مر گیا تو غلام احمدؐ کا کیا بنے گا۔ آپ اپنے والد صاحب کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ آپ کے والد صاحب اُس وقت کپورتھلہ میں کوشش کر رہے تھے اور کپورتھلہ کی ریاست نے آپ کو ریاست کا افسر تعلیم مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ سکھ کہنے لگا کہ جب ہم نے یہ بات کہی کہ آپ اپنے والد صاحب کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ آپ کچھ کام کریں تو آپ نے فرمایا۔ والد صاحب تو یونہی غم کرتے رہتے ہیں۔ انہیں میرے مستقبل کا کیوں فکر ہے۔ مَیں نے تو جسکی نوکری کرنی تھی کر لی ہے۔ ہم واپس آ گئے اور مرزا غلام مرتضیٰ صاحب سے آکر ساری بات کہہ دی۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ اگر اُس نے یہ بات کہی ہے تو ٹھیک کہا ہے وہ جھوٹ نہیں بولا کرتا۔

یہ آپؑ کی ابتداء تھی اور پھر ابھی تو انتہا نہیں ہوئی لیکن جو عارضی انتہا نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی وفات کے وقت ہزاروں ہزار آدمی آپ پر قربان ہونیوالا موجود تھا۔ آپ خود فرماتے ہیں ؎

لُفَاظَاتُ الْمَوَائِدِ کَانَ اُکُلِیْ
وَصِرْتُ الْیَوْمَ مِطْعَامَ الْاَھَالِیْ

ایک وہ زمانہ تھا جب بچے ہوئے ٹکڑے مجھے دیئے جاتے تھے اور آج میرا یہ حال ہے کہ مَیں سینکڑوں خاندانوں کو پال رہا ہوں۔ آپ کی ابتداء کتنی چھوٹی تھی مگر آپ کی انتہا ایسی ہوئی کہ علاوہ ان لوگوں کے جو خدمت کرتے تھے لنگر میں روزانہ دو اڑہائی سو آدمی کھانا کھاتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ اپنے والد کی جائیداد میں اپنے بھائی کے برابر کے شریک تھے۔ لیکن زمینداروں میں یہ عام دستور ہے کہ جو کام کرے وہ تو جائیداد میں شریک سمجھا جاتا ہے اور جو کام نہیں کرتا وہ جائیداد میں شریک نہیں سمجھا جاتا اور یہ دستور ابھی تک چلا آتا ہے۔ لوگ عموماً کہہ دیتے ہیں کہ جو کام نہیں کرتا اُس کا جائیداد میں کیا حصّہ ہو سکتا ہے۔ آپ کے پاس جب کوئی ملاقاتی آتا اور آپ اپنی بھاوجہ کو کھانے کے لئے کہلا بھیجتے تو وہ آگے سے کہہ دیتیں کہ وہ یونہی کھا پی رہا ہے۔ کام کاج تو کوئی کرتا نہیں۔ پھر آپ اپنا کھانا اُس مہمان کو کھلا دیتے اور خود فاقہ کر لیتے یا چنے چبا کر گذارہ کر لیتے۔ خدا کی قدرت ہے کہ وہی بھاوجہ جو اُس وقت آپ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں بعد میں میرے ہاتھ پر احمدیت میں داخل ہوئیں۔ غرض اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کوئی کام شروع کیا جاتا ہے تو اُس کی ابتداء بڑی نظر نہیں آیا کرتی لیکن اُس کی انتہا پر دُنیا حیران ہو جاتی ہے۔

فرعون نے بھی موسیٰؑ کو اُن کی ابتدائی کس مپرسی کا حوالہ دیا اور کہا کہ تم مجھے نصیحت کیا کر سکتے ہو۔ تمہاری تو خود ہمارے خاندان نے پرورش کی ہے۔ حالانکہ دنیا میں کبھی کسی چیز کی ابتداء کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ اُس کی انتہا پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ بڑ کے بیج کو دیکھ کر اگر کوئی شخص اُسے بے حقیقت خیال کرتا ہے تو وہ نادان ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر وہ نادان ہے جو اپنی آنکھوں سے بڑ کے درخت کا اسقدر پھیلاؤ دیکھے کہ سینکڑوں آدمی اُس کے سایہ تلے آرام کر رہے ہوں اور پھر بھی وہ اُس کے سایہ میں بیٹھنے سے انکار کر دے محض اس لئے کہ اُس کا بیج کسی زمانہ میں

ایسا حقیر تھا کہ ہوا کا ایک معمولی جھونکا بھی اُسے پرے پھینک دیتا ہے۔ بہرحال فرعون نے ایسی ہی حماقت کی اور موسیٰؑ کو اس بات کا طعنہ دیا کہ تو ہمارے گھر وں میں پلتا رہا ہے۔ وہ اس بات کو بھول گیا کہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سے یہ سنّت چلی آرہی ہے کہ وہ اپنے نبیوں کو دشمنوں کے زیر سایہ ہی ترقی عطا کیا کرتا ہے۔ حضرت مسیحؑ ناصری نے روما کی حکومت کے سایہ تلے پرورش پائی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بچپن میں ثقیف قوم میں پرورش پائی جس نے ابرہہ کو خانہ کعبہ گرانے کیلئے راہنما دیئے تھے۔ گویا وہی قوم جس نے خانہ کعبہ کو گرانے کے لئے اپنی خدمات پیش کی تھیں اللہ تعالیٰ نے اُسی قوم کے زیر سایہ اُس مقدس انسان کو جگہ دی جو دُعائے ابراہیمی کا مصداق اور خانہ کعبہ کا مقصود تھا۔ اسی طرح خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو حبشہ کی عیسائی حکومت کے سایہ تلے پناہ دی حالانکہ اسی حکومت کے ایک گورنر ابرہہ نے بیت اللہ پر حملہ کیا تھا۔ موجودہ زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے پھر اسی تدبیر سے کام لیا اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو انگریزوں کے زیر سایہ رکھا حالانکہ آپ عیسائیت کی بیخکنی کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ نادان لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ مگر وہ نہیں دیکھتے کہ کیا خدا نے موسیٰؑ کو فرعون کے زیر سایہ نہیں رکھا۔ کیا خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو ایک عیسائی حکومت کے زیر سایہ نہیں رکھا۔ کیا خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ثقیف قوم کے زیر سایہ نہیں رکھا۔ پھر اگر ان کا وہاں پرورش پانا قابل اعتراض امر نہیں تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انگریزوں کے زیر سایہ ترقی کرنا کس طرح قابلِ اعتراض ہو گیا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا نشان ہے کہ وہ اپنے انبیاء کو خود اُنکے دشمنوں کے زیر سایہ رکھ کر ترقی عطا فرماتا ہے اور اس طرح دنیا پر ثابت کر دیتا ہے کہ اُس کے ارادوں کو کوئی شخص روک نہیں سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ پر ہی غور کر کے دیکھ لو۔ کجا یہ کہ فرعون نے حکم دے دیا تھا کہ بنی اسرائیل کا کوئی بچہ زندہ نہ رہے اور کجا یہ کہ تصرّفِ الٰہی کے ماتحت اُس نے خود اپنے گھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کی۔ گویا وہی جس کی خاطر بچے مارے جاتے تھے اس کی چھاتیوں پر چڑھ کر موسیٰؑ بڑھا اور پھولا اور پھلا اور آخر اُسی موسیٰؑ کی مخالفت نے فرعون کو تباہ و برباد کر دیا۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے خدا تعالیٰ کی بات پر اعتبار کر کے اپنے بچے کو دریا میں ڈال دیا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کئی قسم کی احتیاطوں کے ساتھ اُن کو دریا میں ڈالا مگر کون ہے جو اس سے سوگنا زیادہ احتیاط کر کے بھی اپنے بچّے کو دریا میں پھینکنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔ انہوں نے خدا کا حکم پورا کرنے کے لئے اس موت کو قبول کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے موسیٰؑ کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔ اور وہ جس کے متعلق خطرہ تھا کہ دریا کی لہروں میں وہ کہیں غرق نہ ہو جائے خدا اُسے بچا کر فرعون کے گھر میں لے گیا۔ اور اس کی روٹیاں کھا کھا کر اور اس کے گھر کا دودھ پی پی کر اور اُسی کے کندھوں پر چڑھ چڑھ کر اُس نے تربیت حاصل کی اور آخر ایک دن وہ تمام بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے بچا کر لے آیا۔ اور فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق ہو گیا اسی پرورش کا اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طعنہ دیا۔ اور پھر کہا کہ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ۔ اِس دوران میں تجھ سے وہ فعل بھی سرزد ہوا جس کا تجھے خوب علم ہے یعنی قبطی قوم کا ایک آدمی تیرے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور تو یقیناً ناشکروں میں سے ہے۔

اس جگہ اَنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ سے یہ مراد نہیں کہ تُو کافروں میں سے ہے۔ بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ تُو سخت ناشکرا نکلا کہ تُو نے ایک محسن قوم کا آدمی مار ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ پہلے تمام حالات پر غور کرو اور پھر الزام لگاؤ۔ بیشک یہ فعل مجھ سے سرزد ہُوا ہے مگر فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ مجھ سے یہ فعل ایسی حالت میں سرزد ہُوا تھا جب کہ میں اپنی قوم کی محبت میں سرشار تھا۔ یعنی جب مَیں نے دیکھا کہ ایک دشمن قوم کا فرد میری قوم کے ایک آدمی کو بلا وجہ مار رہا ہے تو مجھے اپنی مظلوم قوم کے ایک فرد کی حمایت میں جوش آگیا اور مَیں نے ظالم کا مقابلہ کیا جس کے نتیجہ میں وہ نادانستہ طور پر ہلاک ہو گیا۔

یہ واقعہ جس کی طرف فرعون نے اشارہ کیا وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک رات ایک قبطی کو دیکھا کہ وہ ایک اسرائیلی سے لڑ رہا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن کے پاس سے گذرے تو اسرائیلی نے حضرت موسیٰؑ کو دیکھ کر انہیں اپنی مدد کے لئے پکارا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی سمجھا کہ اگر مَیں نے اسرائیلی کی مدد نہ کی تو وہ مارا جائیگا۔ چنانچہ انہوں نے آگے بڑھ کر قبطی کو ایک گھونسہ مارا۔ اب یا تو جوش کی حالت میں وہ گھونسہ زیادہ زور سے مار بیٹھے۔ یا اُس کا دل کمزور تھا گھونسہ لگتے ہی وہ مر گیا۔ اِس واقعہ کا فرعون انہیں طعنہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے تو تجھے بچوں کی طرح پالا اور تو نے ہمارے ہی آدمی کو مار دیا اور ناشکری کا نمونہ دکھایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُسے جواب دیتے ہیں کہ پہلے سب حالات پر غور کرو اور پھر الزام لگاؤ۔

یہ تو درست ہے کہ میرے ہاتھ سے ایک آدمی مارا گیا لیکن سوال یہ نہیں کہ آدمی مارا گیا یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا میرا اُسے مارنے کا ارادہ تھا یا نہیں۔ اگر حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ایسا تھا جس میں فوری مدد کی ضرورت تھی تو ایسی حالت میں اگر مَیں نے اپنی قوم کے ایک مظلوم فرد کی مدد کی تو گو اتفاقی طور پر ایک آدمی مر بھی گیا لیکن پھر بھی مَیں قصوروار کس طرح ہُوا۔ میرا قصور تو تب ہوتا جب مَیں جانتے بوجھتے ہوئے محض قتل کرنے کی نیت سے اس پر حملہ کرتا مگر جبکہ میرا ارادہ اُسے قتل کرنے کا تھا ہی نہیں تو اگر نادانستہ طور پر ایک آدمی مر گیا تو یہ بات مجھے مجرم بنانے والی کس طرح ہوگئی۔ مگر بہر حال چونکہ مَیں نے ایک مظلوم قوم کے فرد کی حمایت کی تھی اور حاکم قوم کا ایک فرد مارا گیا تھا اس لئے مجھے ڈر پیدا ہُوا کہ میرے معاملہ میں انصاف سے کام نہیں لیا جائیگا۔ اور مجھے سزا دینے کی کوشش کی جائیگی۔ چنانچہ مَیں تمہارے ملک کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ مگر میرے ربّ نے جو میرے دلی خیالات کو جانتا تھا مجھے بری قرار دیا اور مجھے شریعت عطا فرمائی اور مجھے اپنا رسول بنا کر کھڑا کر دیا باقی رہا وہ احسان جو تُو جتا رہا ہے کہ ہم نے تجھے پالا سو کیا یہ احسان اس جُرم کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت رکھتا ہے کہ تم نے اپنے باپ رعمسیس ثانی کے زمانہ سے سارے بنی اسرائیل کو اپنی غلامی میں جکڑ رکھا ہے اور تم انہیں بیگار میں پکڑ کر اُن سے بڑے بڑے مشقت طلب کام لیتے ہو اور اُن پر ایسے ایسے مظالم ڈھاتے ہو جو نہایت شرمناک ہیں۔ اگر اتنے لمبے عرصہ تک ایک قوم کے مردوں اور عورتوں اور بچوں سے ظالمانہ خدمت لینے کے بعد اس قوم کا ایک بچہ تم نے پال دیا تو کیا غضب کیا۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ

اس پر فرعون نے (شرمندہ ہوکر اور بات پھیرنے کیلئے) کہا۔ یہ رب العالمین کون ہے؟ (جس کی طرف سے آنا تم بیان کرتے ہو۔)

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۲۵﴾

(موسیٰؑ نے) کہا آسمان اور زمین اور جو کچھ (ان دونوں کے درمیان ہے ان کا رب۔ اگر تم میں یقین کرنے کی خواہش ہے

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗۤ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۶﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَ

اس پر اس (فرعون) نے اپنے ارد گرد کے لوگوں سے کہا۔ کیا تم سنتے نہیں (کہ موسیٰؑ کیا کہتا ہے) (موسیٰؑ نے اپنے پہلے بیان کی

رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ

تشریح کرتے ہوئے) جواب دیا۔ وہی جو تمہارا بھی رب ہے، اور تمہارے پہلے باپ دادوں کا بھی رب تھا۔ (اس پر فرعون) بولا۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس فرعون نے پالا تھا اُس کا نام رعمسیس تھا۔ مگر دعویٰ نبوت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس فرعون کے پاس جانا پڑا وہ اُس کا بیٹا منفتاح تھا۔ چونکہ وہ بچپن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے گھروں میں پرورش پاتے دیکھتا رہا تھا اور جانتا تھا کہ اُس کے باپ نے کس محبت کے ساتھ موسیٰؑ کی پرورش کی اس لئے اُس نے اپنے باپ کے اس سلوک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا کیا ہم نے تجھے اپنے گھروں میں نہیں پالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں اُسی رعمسیس کے ان مظالم کا ذکر شروع کر دیا جو وہ اپنی زندگی میں بنی اسرائیل پر ڈھاتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس نے حکم دے دیا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو بھی لڑکا پیدا ہو اُسے مار ڈالا جائے۔ اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے۔ رعمسیس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا منفتاح تخت نشین ہوا اور اُس نے بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بنی اسرائیل پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ آخر جب اُن کی دردناک چیخ و پکار نے عرش الٰہی کو ہلا دیا تو اُس نے اُن اسیروں کی رستگاری کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ فرعون کے پاس جائیں اور انہیں کہیں کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے۔ مگر بجائے اس کے کہ فرعون اس ظلم سے باز آتا اور بنی اسرائیل کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دیتا اُس نے موسیٰؑ پر طعنہ زنی شروع کر دی کہ تُو تو ہمارے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہے۔ اور اب تُو ہی ہمیں وعظ و نصیحت کرنے کے لئے آ گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ سب کچھ درست ہے۔ مگر کیا یہ اس ظلم کے جواز کی کوئی دلیل ہے جو بنی اسرائیل پر کیا جا رہا ہے۔ اگر مجھے پالا تو کیا اس کے نتیجہ میں تمہارے لئے یہ جائز ہو گیا کہ تم ساری قوم کو اپنی غلامی میں جکڑے رکھو۔ اور خدا تعالیٰ کے ان بندوں کو جو تمہاری طرح اس دنیا میں آئے ذلت اور بیچارگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرو۔

الَّذِیٓ اُرۡسِلَ اِلَیۡکُمۡ لَمَجۡنُوۡنٌ ﴿۲۸﴾

(اے لوگو!) تمہارا وہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے ضرور پاگل ہے ؎

؎ **تفسیر**:۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کو یہ جواب دیا تو اُس نے کھسیانے ہو کر کلام کا موضوع ہی بدل دیا۔ اور کہنے لگا۔ اچھا ان باتوں کو جانے دو۔ تم یہ بتاؤ کہ تم جو کہہ رہے ہو کہ میں ربّ العالمین خدا کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں تو یہ ربّ العالمین خدا کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ ربّ العالمین وہ خدا ہے جو آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اُن کا ربّ ہے اگر تم یقین لانے والوں میں سے ہو۔ تو یہ دلیل تمہارے لئے بڑی کافی ہے۔ فرعون اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہنے لگا۔ سُنتے ہو یہ کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ اگر آسمان اور زمین کے بنانے والے کو تم نہیں سمجھ سکتے تو پھر یہی دلیل سمجھ لو کہ تمہاری اور تمہارے گذشتہ باپ دادوں کی بھی تو کسی نے پرورش کی تھی۔ وہ ربّ العالمین خدا ہے۔ فرعون اس دلیل کی طاقت سے جھنجھلا اُٹھا اور گالیوں پر اُتر آیا۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔ یہ شخص جو تمہاری طرف رسول ہو کر آنے کا دعویٰ کرتا ہے یقیناً پاگل ہے۔ اس کا مطلب جیسا کہ سورۂ نازعات سے ظاہر ہے یہ تھا کہ اے فرعونیو! تمہارا رب تو مَیں ہوں۔ یہ موسیٰؑ ربّ العالمین خدا کہاں سے لے آیا ہے اور چونکہ مَیں اس کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں اور اس کے باوجود یہ اپنے عقیدے پر قائم رہا ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دماغ میں کچھ نقص ہے جو اپنے دعویٰ پر اسقدر اصرار کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تک دنیا میں خدا تعالیٰ کا کوئی بھی نبی نہیں آیا جسے اُس کے مخالفوں نے پاگل نہ کہا ہو کیونکہ جس طرح مجنون انسان اپنی انتہائی طاقت استعمال کر دیتا ہے اور اُسے اپنے انجام کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے انبیاء بھی ہر قسم کے ڈر اور خوف اور لالچ سے بے نیاز ہو کر اس صداقت کو پہنچانا شروع کر دیتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے اُن کے سپرد کی ہوتی ہے اور انہیں اپنے انجام کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ نادان انسان جو اُن کی پُشت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے وہ انہیں جب اپنے مقصد کے لئے ایسے جوش سے کام کرتا دیکھتا ہے جو بظاہر عقل کے خلاف ہوتا ہے تو انہیں پاگل کہنا شروع کر دیتا ہے۔

علم النفس کے ماہرین نے بھی جنون کی مختلف کیفیات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب جنون پیدا ہوتا ہے تو انسان اپنے گرد و پیش کے تمام حالات کو بھلا دیتا ہے اور اپنے کام کے متعلق اس میں اس قدر انہماک پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی دوسری چیز کی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ مجھے یاد ہے حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک عورت جو اُستانی تھی پاگل ہو گئی۔ درمیان میں کبھی کبھی اس کی حالت درست بھی ہو جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ عورتوں میں درس ہو رہا تھا اور وہ بھی درس میں شامل تھی کہ یکدم اس عورت کو جنون کا دورہ ہُوا اور کھڑکی میں سے کود کر نیچے گرنے لگی۔ حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ نے اُٹھ کر اُسے پکڑ لیا۔ یہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے دو چار ماہ بعد کا واقعہ ہے جبکہ ابھی حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ گھوڑے سے نہیں گرے تھے۔ اور آپ میں

اتنی طاقت تھی کہ بعض دفعہ آپ اپنا ہاتھ بڑھا کر فرمایا کرتے تھے کہ کوئی اسے ٹیڑھا کر کے دکھا دے۔ آپ نے اُٹھ کر اُس عورت کو پکڑ لیا۔ لیکن باوجود سارا زور لگانے کے وہ دُبلی پتلی عورت آپ کے ہاتھوں سے نکلی جاتی تھی۔ اِس پر آپ نے عورتوں کو آواز دی کہ یہ تو گرنے لگی ہے میری مدد کے لئے آؤ۔ پھر پانچ سات عورتوں نے آپ کے ساتھ مل کر اُسے باندھا حالانکہ عقل اور ہوش کے زمانہ میں اُس کو سترہ اٹھارہ سال کا بچہ بھی پکڑ سکتا تھا۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ عقلمند انسان سمجھتا ہے کہ اگر ایک خاص حد سے زیادہ اُس نے اپنی طاقتوں کو استعمال کیا تو اُسے نقصان پہنچیگا لیکن پاگل کا دماغ اُسے حد سے زیادہ طاقت خرچ کرنے سے نہیں روکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پاگلوں میں بہت زیادہ طاقت آجاتی ہے اور ایک ایک پاگل کو آٹھ آٹھ دس دس آدمی مل کر پکڑتے ہیں۔ تب وہ قابو میں رہتا ہے پس چونکہ پاگلوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ بسا اوقات ایسے جوش سے کام کرتے ہیں جو عقل کے خلاف ہوتا ہے۔ اس لئے جب لوگ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ زمانہ کی رَو کے بالکل خلاف آواز اُٹھا رہے ہیں اور اپنے مقصد کو پورا کرنے کیلئے انہیں کسی قسم کی ہلاکت اور تباہی کی پروا نہیں تو وہ سمجھتے ہیں یہ لوگ پاگل ہیں اگر عقلمند ہوتے تو ایک عالَم کے خلاف اپنی آواز کیوں بلند کرتے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے اور آپؐ نے مکّہ والوں کے سامنے یہ بات پیش کی کہ ایک خدا کی پرستش کرو تو عرب کے لوگ جو لاتؔ اور مناتؔ اور عزّیٰ کے پرستار تھے اُن کے لئے یہ بات حیرت کا موجب ہوئی اور انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ شخص تو پاگل ہے جو اتنے خداؤں کو ایک خدا قرار دے رہا ہے۔ خدا تو کئی ہیں مگر یہ شخص کہتا ہے کہ صرف ایک ہی خدا ہے۔ پس انکی نگاہ میں آپ کی یہ بات نعوذ باللہ ایک پاگلانہ بڑ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا اِس لئے بھی پاگل کہتی کہ آپؐ فرماتے تھے۔ شراب نہ پیو۔ جُوا نہ کھیلو۔ اور دوسروں کے مال نہ لُوٹو۔ عرب کے لوگ کہتے تھے۔ یہ کیسا آدمی ہے جو شراب سے منع کرتا ہے جو زندگی کا سرور ہے اور جُوا کھیلنے اور مال لوٹنے سے منع کرتا ہے جو ایک فائدہ مند کام ہے۔ اسکی یہ باتیں تو پاگلوں والی باتیں ہیں۔ اِسی طرح وہ کہا کرتے کہ محمد رسول اللہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم اپنی زندگیوں کو بنی نوع انسان کی خدمت میں لگا دو۔ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرو تو تمہیں ثواب ملیگا۔ یہ تو پاگلوں والی بات ہے۔

حضرت شعیبؑ جب لوگوں سے کہتے کہ تم دوسروں کا مال نہ لُوٹو۔ اپنے مال کو ناجائز کاموں میں صرف نہ کرو۔ تو آپ کی باتوں سے آپکی قوم حیران ہوتی تھی اور کہتی تھی کہ شعیب پاگل ہو گیا ہے۔ اور دیوانوں کی سی باتیں کرتا ہے۔

اِس زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لوگوں نے پاگل کہا۔ جب آپ نے وفاتِ مسیحؑ کا مسئلہ دنیا کے سامنے پیش کیا تو مسلمان سمجھ ہی نہ سکے کہ جب ۱۳۰۰ سال سے یہ مسئلہ اُمّتِ محمدیہ کے اکابر پیش کرتے چلے آرہے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں تو وہ فوت کس طرح ہو گئے۔ لوگوں کو اِس مسئلہ کے متعلق جسقدر یقین اور وثوق تھا وہ اس واقعہ سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ پنجاب کے ایک مشہور طبیب جن کی طبی عظمت کے حضرت

خلیفہ اول رضی اللہ عنہ جیسے طبیب بھی قائل تھے ۔ اور
جن کا نام حکیم اللہ دین تھا اور بھیرہ کے رہنے والے تھے
ایک دفعہ اُن کے پاس مولوی فضل دین صاحب بھیروی
جو حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے گہرے دوست اور
نہایت مخلص احمدی تھے گئے ۔ اور انہیں کچھ تبلیغ کی ۔
وہ باتیں سُنکر کہنے لگے ۔ میاں تم مجھے کیا تبلیغ کرتے ہو
تم بھلا جانتے ہی کیا ہو اور مجھے تم نے کیا سمجھانا ہے
مرزا صاحب کے متعلق تو جو مجھے عقیدت ہے اسکا دسواں
بلکہ بیسواں حصہ بھی تمہیں اُن سے عقیدت نہیں ہوگی
مولوی فضل دین صاحب یہ سنکر بہت خوش ہوئے
اور انہوں نے سمجھا کہ شاید یہ دل میں احمدی ہیں ۔
اس لئے انہوں نے کہا ۔ اِس بات کو سُنکر مجھے بڑی
خوشی ہوئی ہے کہ آپ کو حضرت مرزا صاحب سے عقیدت ہے
اور میں خوش ہونگا اگر آپ کے خیالات سلسلہ کے متعلق
کچھ اور بھی سُنوں ۔ وہ کہنے لگے ۔ آجکل کے جاہل
نوجوان بات کی تہ تک نہیں پہنچتے اور یونہی تبلیغ
کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں ۔ اب تم آگئے ہو مجھے
وفات مسیح کا مسئلہ سمجھانے ۔ حالانکہ تمہیں معلوم ہی
کیا ہے کہ مرزا صاحب کی اس مسئلہ کو پیش کرنے میں
حکمت کیا ہے ؟ وہ کہنے لگے ۔ آپ ہی فرمائیے ۔
انہوں نے کہا سنو ! اصل بات یہ ہے کہ مرزا صاحب
نے براہین احمدیہ کتاب لکھی ۔ تیرہ سو سال میں بھلا
کوئی مسلمان کا بچہ تھا جس نے ایسی کتاب لکھی ہو
مرزا صاحب نے اس میں ایسے ایسے علوم بھر دیئے
کہ کسی مسلمان کی کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی
وہ اسلام کے لئے ایک دیوار تھی جس نے اُسے
دوسرے مذاہب کے حملوں سے بچا لیا ۔ لیکن مولوی
ایسے احمق اور بے وقوف نکلے کہ بجائے اس کے کہ
وہ آپ کا شکریہ ادا کرتے اور زانوئے ادب تہ کرکے
آپ سے کہتے کہ آئندہ ہم آپ کے بتائے ہوئے دلائل ہی استعمال
کیا کریں گے انہوں نے اُلٹا آپ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا
اور اسلام کی اتنی عظیم الشان خدمت دیکھنے کے باوجود
جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تیرہ سو سال
میں اور کسی نے نہ کی آپ کے خلاف کفر کے فتوے دینے
لگے اور اپنی علمیت جتانے لگ گئے ۔ اور سمجھنے لگے
کہ ہم بڑے آدمی ہیں ۔ اِس پر مرزا صاحب کو غصہ
آنا چاہیئے تھا اور آیا ۔ چنانچہ انہوں نے مولویوں سے
کہا ۔ اچھا تم بڑے عالم بنے پھرتے ہو اگر تمہیں اپنی
علمیت پر ایسا ہی گھمنڈ ہے تو دیکھو کہ حیاتِ مسیح
کا عقیدہ قرآن سے اتنا ثابت ہے اتنا ثابت ہے کہ
اِس کے خلاف حضرت مسیح کی وفات ثابت کرنا ناممکن
نظر آتا ہے ۔ لیکن میں قرآن سے ہی حضرت مسیح کی وفات
ثابت کرکے دکھاتا ہوں ۔ اگر تم میں ہمت ہے تو اسکا
ردّ کرو ۔ چنانچہ انہوں نے مولویوں کو اُن کی بیوقوفی
جتانے کے لئے وفاتِ مسیح کا مسئلہ پیش کر دیا اور
قرآن سے اُس کے متعلق ثبوت دینے لگ گئے ۔ اب
مولوی چاہے سارا زور لگالیں ۔ چاہے اُن کی زبانیں
گھس جائیں اور قلمیں ٹوٹ جائیں ۔ سارے ہندوستان
کے مولوی مل کر بھی مرزا صاحب کے دلائل کا مقابلہ
نہیں کر سکتے ۔ مرزا صاحب نے انہیں ایسا پکڑا ہے
کہ اُن میں سر اُٹھانے کی تاب نہیں رہی ۔ اب اس کا
ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ سارے مولوی مِلکر
ایک وفد کی صورت میں حضرت مرزا صاحب کے پاس جائیں اور
اُن سے کہیں کہ ہم سے آپ پر کفر کا فتویٰ لگانے میں
بے ادبی ہوگئی ہے ۔ ہمیں معاف کیا جائے ۔ پھر
دیکھ لیں مرزا صاحب قرآن سے ہی حیاتِ مسیح
ثابت کرکے دکھاتے ہیں یا نہیں ؟
اِس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُس وقت

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ إِنْ

(موسیٰ نے سمجھ لیا کہ وہ بات ٹلانا چاہتا ہے اور) کہا (رب العالمین) وہی ہے جو مشرق کا بھی رب ہے اور مغرب کا بھی (رب ہے) اور

كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٢٩﴾ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا

جو کچھ انکے درمیان ہے، (اُنکا بھی رب ہے) بشرطیکہ تم عقل سے کام لو۔ (اس پر فرعون نے طیش میں آکر) کہا اگر میرے سوا تُو نے کوئی اور

غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ ﴿٣٠﴾ قَالَ

معبود بنایا تو میں تجھے قید کر دونگا۔ اُس (یعنی موسیٰ) نے کہا۔

أَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُبِينٍ ﴿٣١﴾ قَالَ فَأْتِ بِهِ

کیا اُس صورت میں بھی کہ میں کوئی (حقیقتِ حال کو) کھول دینے والی چیز تیرے پاس لے آؤں (یعنی معجزہ)۔ اِس پر اُس

إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٣٢﴾ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ

(یعنی فرعون) نے کہا۔ اگر تُو سچا ہے تو لے بھی آ۔ پس اُس (یعنی موسیٰ) نے اپنا عصا زمین پر دھر دیا

حیاتِ مسیح کا عقیدہ کتنا یقینی سمجھا جاتا تھا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتبار اور اعتماد رکھتے ہوئے آپ کو اسلام کا سب سے بڑا خادم سمجھتے ہوئے پھر بھی اُن کا ذہن اس طرف نہیں جاتا تھا کہ حضرت مسیح فوت ہو گئے ہیں بلکہ وہ کہتے تھے کہ یہ محض مولویوں کو شرمندہ کرنے کے لئے کہتے ہیں ورنہ حیاتِ مسیح کا مسئلہ تو ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ جب آپ پر اعتماد رکھنے اور آپ کو اسلام کا سب سے بڑا خادم سمجھنے والوں کی یہ کیفیت تھی تو دوسرے لوگ جو آپ کو اسلام کا دشمن قرار دیتے تھے وہ اس مسئلہ کی وجہ سے اگر آپ کو پاگل نہ کہتے تو کیا کہتے۔ اِسی طرح جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دنیا کے سامنے یہ نظریہ پیش کیا کہ اب جہاد کی شکل بدل گئی ہے اب لٹریچر اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام پھیلانے کا زمانہ ہے تو مسلمان حیران ہوئے کہ کیا اس طرح اسلام دنیا پر غالب آسکتا ہے۔ اُن کے نزدیک تو ترقی کا صرف یہی ایک ذریعہ تھا کہ غیرمسلموں کو قتل کر دیا جائے۔ پس جب انہوں نے سُنا کہ ایک شخص یہ کہہ رہا ہے کہ اسلام کی ترقی غیرمسلموں کو قتل کرنے سے نہیں بلکہ اپنی جانوں کو اسلام کی راہ میں قربان کرنے سے وابستہ ہے تو انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مرزا صاحب پاگل ہیں جو ایسے خلافِ عقل مسائل دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں یہی حربہ فرعون نے بھی استعمال کیا۔ اور جب اُس نے دیکھا کہ وہ دلائل کے میدان میں پورا نہیں اُتر رہا تو اُس نے کہا یہ تو پاگل ہے جو ایسی احمقانہ باتیں کر رہا ہے۔

فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ

تو اچانک (اہلِ فرعون نے دیکھا کہ) وہ ایک صاف صاف نظر آنے والا اژدہا ہے - اور اُس نے اپنا ہاتھ (اپنی بغل میں)

بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ ع

نکالا تو سب دیکھنے والوں نے اچانک دیکھا کہ وہ بالکل سفید ہے ۵۸

ع ۲ / ۶

ثُعْبَانٌ

نَزَعَ

۵۸ حل لغات: ثُعْبَانٌ: حِزْبٌ مِّنَ الْحَيَّاتِ طِوَالٌ - یعنی ثُعْبَانٌ سانپوں کی اقسام میں سے ایک قسم کا سانپ ہوتا ہے جو خاصا لمبا ہوتا ہے (اقرب)

نَزَعَ: نَزَعَ يَدَهٗ کے معنے ہیں اَخْرَجَهَا مِنْ جَيْبِهٖ ہاتھ کو اپنے گریبان سے نکالا (اقرب)

تفسیر:- فرعون نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجنون کہا تو آپ سمجھ گئے کہ اب یہ مجھے اصل موضوع سے دوسری طرف پھیرنا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اِس وقت اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ عالمین پر جو گفتگو شروع ہے وہ ذاتیات میں اُلجھ کر رہ جائے اور میں اس مضمون کو ترک کرکے اِس امر پر بحث شروع کردوں کہ مجھے مجنون کیوں کہا گیا ہے - میرے اندر تو کوئی جنون والی بات نہیں پائی جاتی - پس آپ نے مناسب سمجھا کہ اُس کی اس گالی کا اُسے کوئی جواب نہ دیں اور اصل موضوع کو جاری رکھیں - چنانچہ آپ نے فرمایا - رب العالمین خدا وہ ہے جو مشرق کا بھی ربّ ہے اور مغرب کا بھی ربّ ہے اور جو کچھ اِن دونوں کے درمیان ہے اُن کا بھی ربّ ہے یعنی تُو تو صرف مصریوں کا ربّ ہونیکا دعویدار ہے حالانکہ مصر کی دنیا کے مقابلہ میں حیثیت ہی کیا ہے - مشرق و مغرب میں سینکڑوں ملک مصر سے کئی کئی گنا بڑے موجود ہیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ فرعون مصر والوں کو پال رہا ہے تو وہ لوگ جو مشرق اور مغرب اور ان کے درمیان رہتے ہیں اُن کو کون پالتا ہے - بہرحال جو ساری دنیا کو پالتا ہے وہی ربّ العالمین ہے - فرعون ربّ العالمین نہیں ہوسکتا - کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو مصریوں اور قبطیوں کا خدا کہتا ہے - اِس پر فرعون کے غصہ کا پارہ بہت ہی چڑھ گیا اور موسیٰؑ سے کہنے لگا کہ یا تو سیدھی طرح مجھے خدا قرار دو ورنہ میں تجھے قید کردونگا - اور پھر تجھے پتہ لگیگا کہ تیری اِس گستاخی کی کیا سزا ہے - مگر اللہ تعالیٰ کی شان دیکھو کہ وہی جو موسیٰؑ کو آہنی سلاخوں کے پیچھے قید کرنا چاہتا تھا خدا تعالیٰ نے اُسے بحیرۂ قلزم کی طوفانی موجوں میں ایسا قید کیا کہ وہ اپنے تمام لاؤلشکر اور مددگاروں کے باوجود اُس قید سے رہا نہ ہوسکا - جب اُس نے قید کرنے کی دھمکی دی - تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کیا اگر میں کوئی ایسی دلیل لاؤں جو میری بات کو بالکل واضح کردے تو کیا پھر بھی تم قید کروگے؟ فرعون نے اپنے دل میں سوچا کہ چلو اِس موت تو بحث سے جان چھوٹی آئندہ دیکھا جائیگا اور کہنے لگا کہ اگر تم سچے ہو تو ایسی دلیل پیش کرو - اِس پر موسیٰؑ نے اپنا سونٹا زمین پر ڈال دیا تو لوگوں کو اچانک یہ نظر آنے لگا کہ وہ ایک اژدہا ہے جو صاف صاف نظر آرہا ہے - اِس کے بعد موسیٰؑ نے اپنے پہلو سے اپنا ہاتھ نکالا - تو وہ دیکھنے والوں کو چمکتا ہوا نظر آنے لگا -

اسجگہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

کے سونٹے کا سانپ بن جانا اور آپ کے ہاتھ کا لوگوں کو چمکتا ہوا نظر آنا درحقیقت ایک کشفی نظارہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو بھی دکھا دیا۔ اور رؤیا و کشوف کے متعلق یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے جس کی انبیاء اور اولیاء کی تاریخ میں کثرت سے مثالیں پائی جاتی ہیں کہ بعض دفعہ کشفی نظارے ایسے وسیع کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ دوسروں کو بھی نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انشقاقِ قمر کا جو معجزہ ظاہر ہوا وہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا جو وسیع کر دیا گیا۔ اور نہ صرف مکہ کے کچھ لوگوں کو نظر آیا[1] بلکہ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے ہندوستان کے ایک راجہ کو بھی نظر آگیا اور وہ مسلمان ہوگیا (تاریخ فرشتہ اردو جلد ۲ صفحہ ۴۹۱ مقالہ ۱۱) مفسّرین نے چونکہ اس حقیقت کو نہیں سمجھا اس لئے ان کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ چاند واقعہ میں جسمانی طور پر پھٹ کر دو ٹکڑے ہوگیا تھا حالانکہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سونٹا تھا تو سونٹا ہی مگر فرعون اور اس کے درباریوں کو وہ ایک اژدہا کی شکل میں دکھایا گیا۔ اسی طرح چاند تو اپنی جگہ پر ہی رہا تھا مگر کشف میں یہ دکھایا گیا کہ وہ پھٹ گیا ہے۔ اور جس طرح ہر خواب اور کشف تعبیر طلب ہوتا ہے اسی طرح اس کشف کی بھی یہ تعبیر تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو تغیّر رونما ہونے والا ہے اُس کا وقت اَب آچکا ہے اور کفّار کی حکومت عرب سے مٹ جائیگی۔ چنانچہ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (سورۃ قمر آیت ۲) یعنی عرب کی تباہی قریب آگئی ہے اور اُس کا ثبوت یہ ہے کہ چاند پھٹ گیا ہے۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ساعت کے قریب آنے اور چاند کے پھٹنے میں تعلق تھا۔ مگر ظاہری طور پر چاند کے پھٹنے کا ساعت سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ اگر ساعت سے اُس کا تعلق ہوتا تو چاہیئے تھا کہ قیامت بھی آجاتی۔ مگر چاند کے پھٹنے پر تو تیرہ سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے اور قیامت ابھی تک آئی نہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ساعت قریب آگئی ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ چاند پھٹ گیا ہے پس معلوم ہوا کہ شق کے جو معنے عام طور پر کئے جاتے ہیں وہ بھی غلط ہیں اور ساعت کے جو معنے لئے جاتے ہیں وہ بھی درست نہیں۔ دراصل قرآن کریم میں انبیاء کی بعثت اور اُن کی ترقی اور غلبہ کے زمانہ اور اُن کے مخالفین کی تباہی کے زمانہ کو ساعت کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اِس آیت کے یہ معنے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو ساعت آنی تھی اور آپ کے ذریعہ جو تغیّر رونما ہونا تھا اس کا وقت اب آگیا ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ چاند پھٹ گیا ہے۔ یہ علامت اسلئے بتائی گئی کہ عربوں میں قمر سے مراد عرب کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ حضرت صفیہؓ جو ایک یہودی سردار کی بیٹی تھیں اور بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہّرات میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ اُن کی گود میں چاند آگرا ہے۔ وہ کہتی ہیں جب مَیں نے اپنے باپ کو یہ خواب سُنائی تو اُس نے میرے مُنہ پر زور سے تھپڑ مارا اور کہا کہ کیا تو عرب کے بادشاہ سے شادی کرنا چاہتی ہے[2]۔ اِس سے پتہ لگتا ہے کہ عرب کے لوگ قمر سے مُراد عرب کی حکومت لیتے تھے

پس جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کشفی طور پر

[1] بخاری جلد ۲۔ کتاب التفسیر باب قولہ وانشق القمر۔

[2] اصابہ

یہ نظارہ دکھایا گیا کہ چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اب کفارِ عرب کی تباہی کا وقت آپہنچا ہے چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ پر ایک لمبے عرصے سے مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بشارت دی کہ اب اسلام کی ترقی کا زمانہ آگیا ہے۔ اور یہ نظارہ نہ صرف آپؐ کو دکھایا گیا بلکہ کفار کو بھی اس نظارہ میں شامل کر لیا گیا۔ تاکہ وہ بھی اس بات کو سمجھ لیں کہ اب کفر کے مٹنے کے دن آگئے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعہ میں خدا تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتاب "سرمہ چشم آریہ" میں اس معجزہ پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے رؤیا و کشوف کے دائرہ کی اس وسعت کو تسلیم کیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ

"یہ بھی ممکن ہے کہ نبی کی قوتِ قدسیہ کے اثر سے دیکھنے والوں کو کشفی آنکھیں عطا کی گئی ہوں۔ اور جو انشقاق قربِ قیامت میں پیش آنے والا ہے اُس کی صورت انکی آنکھوں کے سامنے لائی گئی ہو۔ کیونکہ یہ بات محقق ہے کہ مقربین کی کشفی قوتیں اپنی شدّتِ حدّت کی وجہ سے دوسروں پر بھی اثر ڈال دیتی ہیں۔ اِس کے نمونے اربابِ مکاشفات کے قصوں میں بہت پائے جاتے ہیں بعض اکابر نے اپنے وجود کو ایک وقت اور ایک آن میں مختلف ملکوں اور مکانوں میں دکھلا دیا ہے۔ باذن اللہ تعالیٰ"

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۲۹ و صفحہ ۲۳۰)

اسی طرح فرماتے ہیں:۔

"صاحبِ کشف پر ایسے ایسے اسرار ظاہر ہوتے ہیں کہ اُن کی کُنہہ کو سمجھنے میں بکلّی عقل عاجز رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات صاحبِ کشف صدہا کوسوں کے فاصلہ سے باوجود حائل ہونے بے شمار حجابوں کے ایک چیز کو صاف صاف دیکھ لیتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات عین بیداری میں باذنہٖ تعالیٰ اس کی آواز بھی سُن لیتا ہے اور اس سے زیادہ تر تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات وہ شخص بھی اُس کی آواز سُن لیتا ہے جس کی صورت اس پر منکشف ہوتی ہے۔ بعض اوقات صاحبِ کشف اپنے عالم کشف میں جو بیداری سے نہایت مشابہ ہے ارواح گذشتہ سے ملاقات کرتا ہے اور عام طور پر ہر یک نیک بخت روح یا بدبخت روح کے ساتھ کشفِ قبور کے طور پر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ خود اس میں مؤلف رسالہ ہذا صاحبِ تجربہ ہے۔ اور یہ امر ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کی بیخ کنی کرنے والا ہے اور سب سے تعجب کا یہ مقام ہے کہ بعض اوقات صاحبِ کشف اپنی توجہ اور قوتِ تاثر سے ایک دوسرے شخص پر باوجود صدہا کوسوں کے فاصلہ کے باذنہٖ تعالیٰ عالم بیداری میں ظاہر ہو جاتا ہے حالانکہ اس کا وجود عنصری اپنے مقام سے جنبش نہیں کرتا۔ اور عقل کے زور سے ایک چیز کا دو جگہ ہونا محال ہے۔ سو وہ محال اس عالم ثالث میں ممکن الوقوع ہو جاتا ہے۔" (حاشیہ سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۳۰)

اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض اَور بھی ایسے کشوف ہوئے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو بھی شریک کر لیا۔ مثلاً حدیثوں میں آتا ہے کہ

ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک اجنبی شخص جس پر سفر کے کوئی آثار معلوم نہیں ہوتے تھے آیا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اور پھر اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ایمان کی کیا تعریف ہے؟ اسلام کے کون کون سے ارکان ہیں؟ احسان کس مقام کا نام ہے؟ قیامت کی کیا کیا نشانیاں ہیں؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے ہر سوال کا جواب دیتے رہے۔ جب وہ چلا گیا۔ تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ یہ جبرائیل تھا جو تمہیں دینی مسائل سکھانے کے لئے آیا تھا۔ (ترمذی جلد ۲۔ ابواب الایمان) اب یہ بھی ایک کشف تھا جس کے دائرہ کو اتنا وسیع کر دیا گیا کہ صحابہؓ نے بھی جبرائیل کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتے دیکھ لیا۔

اِسی طرح جنگ بدر کے موقعہ پر اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کی تائید کے لئے جو ملائکہ نازل فرمائے۔ وہ کشفی حالت میں جہاں بعض صحابہؓ کو دکھائی دیئے وہاں کفّار نے بھی اُن کو دیکھا اور پھر انہوں نے اپنی مجالس میں بھی اس کا حیرت کے ساتھ ذکر کیا۔ (تفسیر ابن جریر جلد ۴ صفحہ ۴۸۔ تفسیر فتح البیان جلد ۲ صفحہ ۱۰۳)

اِسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بچپن میں اپنی دائی حلیمہ کے ہاں پرورش پا رہے تھے تو روایات میں ذکر آتا ہے کہ آپ کا ایک رضاعی بھائی ایک دن دوڑتا ہُوا اپنے والدین کے پاس آیا اور اُس نے کہا کہ ہمارے بھائی (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ حلیمہ جلدی سے باہر گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے ہیں۔ حلیمہ نے دریافت کیا کہ کیا ہُوا تھا؟ آپؐ نے فرمایا۔ ابھی تین آدمی آئے تھے جنہوں نے میرا سینہ چیرا اور میرے دل کو دھو کر اندر رکھ دیا اور پھر چلے گئے اب یہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا۔ اور حلیمہ کے بیٹے نے بھی اس نظارہ کو دیکھ لیا۔ ورنہ خدا تعالیٰ کے ملائکہ کسی کے دل کی صفائی کے لئے ظاہری چیر پھاڑ کے محتاج نہیں ہوتے۔ اِسی طرح حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات مدینہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں سو رہے تھے جب آپؐ تہجد کے لئے اُٹھے اور وضو فرمانے لگے تو مجھے آواز آئی کہ آپؐ فرما رہے ہیں لَبَّیْکَ۔ لَبَّیْکَ۔ لَبَّیْکَ۔ اِس کے بعد آپؐ نے فرمایا۔ نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ۔ وہ کہتی ہیں۔ جب آپ میرے پاس تشریف لائے تو میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! کیا کوئی آدمی آیا تھا۔ اور آپ اس سے باتیں کر رہے تھے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں میرے سامنے کشفی طور پر خزاعہ کا ایک وفد پیش ہُوا اور مَیں نے دیکھا کہ وہ شور مچاتے چلے آ رہے ہیں کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس کے خدا کی قسم دیکر کہتے ہیں کہ تیرے ساتھ اور تیرے باپ دادوں کے ساتھ ہم نے معاہدے کئے تھے اور ہم تیری مدد کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر قریش نے ہمارے ساتھ بدعہدی کی۔ اور رات کے وقت ہم پر حملہ کر کے جبکہ ہم میں سے کوئی سجدہ میں تھا اور کوئی رکوع میں ہم کو قتل کر دیا۔ اب ہم تیری مدد حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ جب کشفی طور پر مجھے وہ وفد نظر آیا تو مَیں نے لَبَّیْکَ۔ لَبَّیْکَ۔ لَبَّیْکَ مَیں تمہاری مدد کے لئے حاضر ہوں۔ مَیں تمہاری مدد کے لئے حاضر ہوں۔ مَیں تمہاری مدد کے لئے حاضر ہوں۔ پھر مَیں نے کہا۔ نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ۔ نُصِرْتَ۔ تجھے مدد دی جائیگی۔ تجھے مدد دی جائیگی تجھے مدد دی جائیگی؟

اب دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کشفی نظارہ دیکھ رہے ہیں اور کشفی حالت میں ہی آپ لبیك لبیك ۔ لبیك کہتے ہیں ۔ اور پھر تین دفعہ نُصِرْتَ نُصِرْتَ ۔ نُصِرْتَ کہتے ہیں ۔ اور یہ آواز حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بھی سُن لیتی ہیں ۔ اور وہ آپؐ سے دریافت فرماتی ہیں کہ کیا کوئی آدمی تھا جس سے آپ باتیں کر رہے تھے ۔ اور آپؐ فرماتے ہیں ۔ یہ ایک کشفی نظارہ تھا ۔ یہ واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کشفی حالت میں بعض دفعہ دوسرے لوگ بھی شریک کر لئے جاتے ہیں ۔ اب گو حضرت میمونہؓ نے وہ وفد نہیں دیکھا ۔ مگر انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ جواب سُن لیا جو آپؐ نے کشفی حالت میں خزاعہ کے وفد کو دیا تھا ۔ اور پھر چند دن بعد ایسا ہی وقوع پذیر ہو گیا ۔

پھر یہ واقعات صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی نہیں ہوئے بلکہ بعد میں بھی اللہ تعالیٰ ایسے نشانات ظاہر کرتا رہا ہے ۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دفعہ خطبہ پڑھا رہے تھے کہ خطبہ پڑھاتے پڑھاتے آپ نے بلند آواز سے فرمایا ۔ یا ساریة الجبل ۔ اے ساریہ پہاڑ کے دامن میں پناہ لو ۔ اور یہ فقرہ آپ نے دو تین مرتبہ دہرایا وہ لوگ جو خطبہ سُن رہے تھے سخت حیران ہوئے کہ حضرت عمرؓ نے یہ کیا کہہ دیا ہے ۔ بلکہ بعض منافقوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ عمرؓ پاگل ہو گیا ہے کہ اُس نے خطبہ پڑھتے پڑھتے یہ بے جوڑ بات کہہ دی کہ یا ساریة الجبل اے ساریہ تو پہاڑ کے دامن میں چلا جا ۔ جب لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونی شروع ہوئیں تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ لوگ آپ کے متعلق مختلف قسم کی باتیں کر رہے ہیں اور وہ حیران ہیں کہ آپ نے آج خطبہ میں یہ کیا کہہ دیا کہ یاساریة الجبل ۔ آپ نے فرمایا ۔ میں خطبہ پڑھ رہا تھا کہ اچانک مجھ پر کشفی حالت طاری ہوئی اور عراق کی سرزمین میرے سامنے آگئی اور میں نے دیکھا کہ ساریہ جو اسلامی جرنیل ہے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دشمن فوج سے برسرِ پیکار ہے مگر دشمن فوج کا پلہ بھاری ہے اور قریب ہے کہ اسلامی فوج شکست کھا جائے ۔ میں نے جب یہ نظارہ دیکھا تو چونکہ اُسوقت میدانِ جنگ کا سب نقشہ میری آنکھوں کے سامنے تھا ۔ میں نے بلند آواز سے ساریہ سے کہا کہ اے ساریہ ! پہاڑ کی طرف ہو جاؤ تاکہ تم دشمن کے حملہ سے بچ سکو ۔ چند دن کے بعد میدانِ جنگ سے حضرت عمرؓ کو ساریہ کا خط پہنچا ۔ تو اس میں لکھا تھا کہ جمعہ کے دن صبح کی نماز کے وقت ہماری دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی ۔ اور ہم اُن سے لڑتے چلے گئے یہاں تک کہ جمعہ کی نماز کا وقت آگیا ۔ اُسوقت اچانک ہمارے کانوں میں آپ کی یہ آواز آئی کہ یاساریة الجبل یاساریة الجبل اور ہم فوراً میدان چھوڑ کر پہاڑ کی طرف آ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح دی اور دشمن شکست کھا گیا (تاریخ الخمیس جلد ۲ صفحہ ۲۷۰-۲۷۱)

اب دیکھو اسلامی افواج مدینہ سے سینکڑوں میل دُور ہیں ۔ اور حضرت عمرؓ مدینہ میں بیٹھے ہیں ۔ مگر جب آپ پر کشفی حالت طاری ہوئی تو نہ صرف آپ کی آواز کو اُن لوگوں نے سُنا جو اُس وقت خطبہ میں شریک تھے بلکہ سینکڑوں میل دُور عراق کی سرزمین میں ساریہ اور اُس کے سپاہیوں نے بھی سُن لی اور انہوں نے فوراً اس کی تعمیل کی جس کے نتیجہ میں اسلامی فوج تباہی سے بچ گئی اور دشمن شکست کھا گیا ۔

یہ مثال اس حقیقت کو نہایت وضاحت سے ثابت کرتی ہے

کہ بعض دفعہ کشوف کے دائرہ کو ایسا وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سینکڑوں میل دُور رہنے والے بھی اسمیں شامل ہو جاتے ہیں

اسی طرح امت محمدیہ میں جو اولیاء گذرے ہیں۔ ان میں سے ایک بزرگ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہر روز تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کیا کرتے تھے۔ ایک رات جبکہ وہ دُعا مانگ رہے تھے اُن کا ایک مرید بھی اُن کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ دُعا کرنے کے بعد اُن کو ایک الہام ہُوا۔ جو اُس مرید نے بھی سُن لیا۔ مگر ادب کی وجہ سے وہ خاموش رہا۔ دوسرے دن وہ پھر تہجد کے لیئے اُٹھے اور انہوں نے دُعائیں کیں تو پھر اُن پر وہی الہام نازل ہُوا جو پہلے دن نازل ہُوا تھا۔ اور یہ الہام بھی اُن کے مرید نے سُن لیا۔ مگر پھر بھی وہ خاموش رہا۔ تیسرے دن وہ دُعا کے لئے اُٹھے اور نماز سے فارغ ہوئے تو پھر انہیں وہی الہام ہُوا۔ جو اُن کے مُرید نے بھی سُن لیا۔ اور وہ کہنے لگا حضور مَیں برابر تین دن سے یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہر روز آپ پر یہ الہام نازل ہوتا ہے کہ مَیں تمہاری دُعا قبول نہیں کرونگا۔ مگر آپ برابر دُعا کئے جاتے ہیں۔ آپکو تو چاہیئے کہ اب دُعائیں کرنا چھوڑ دیں۔ جب خدا تعالیٰ قبول کرنا نہیں چاہتا تو اتنا زور دینے کا کیا فائدہ؟ انہوں نے کہا۔ تُو تو صرف تین دن یہ الہام سنکر گھبرا گیا ہے مجھے تو تیس۳۰ سال سے برابر یہ الہام ہو رہا ہے۔ مگر مَیں اللہ تعالیٰ سے مایوس نہیں ہُوا کیونکہ بندے کا کام دُعا مانگتے چلے جانا ہے۔ مایوس ہونا مومن کا کام نہیں لکھا ہے کہ دوسرے ہی دن اللہ تعالیٰ نے اُن پر الہام نازل کیا کہ تم نے تیس۳۰ سال کے عرصہ میں جس قدر بھی دُعائیں کی تھیں وہ سب مَیں نے قبول کرلی ہیں۔ انہوں نے اپنے اس مرید کو بُلایا اور کہا۔ دیکھو اگر مَیں تمہاری بات مان کر دُعائیں کرنا ترک کر دیتا تو مَیں اللہ تعالیٰ کے کتنے بڑے فضلوں سے محروم ہو جاتا۔ اور اُس وقت محروم ہوتا جبکہ میں کامیابی کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اَب دیکھو ایک بزرگ کو الہام ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کے دائرہ کو اتنا وسیع کر دیتا ہے کہ اُن کا ایک مرید بھی الہام کی آواز سُن لیتا ہے اور برابر تین دن تک سُنتا رہتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سُرخی کے چھینٹوں والا کشف دکھایا گیا۔ تو سُرخی کے چھینٹے نہ صرف آپکی قمیص پر پائے گئے بلکہ ایک قطرہ میاں عبداللہ صاحب سنوری کی ٹوپی پر بھی آگرا۔ اور اِس طرح اللہ تعالیٰ نے اِس نشان میں اُن کو بھی شریک کرلیا۔ اِسی طرح ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں مجھے بتایا گیا کہ آج رات حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر یہ الہام نازل ہُوا ہے کہ اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْکَ بَغْتَۃً۔ صبح حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اشاعت کے لئے اپنے الہامات لکھ کر دیئے تو اتفاقاً آپ کو یہ الہام لکھنا یاد نہ رہا۔ مَیں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کہا کہ مجھے تو آج رات ایک فرشتہ نے بتایا تھا کہ آپ کو یہ الہام ہوا ہے کہ اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْکَ بَغْتَۃً مگر آپ نے جو الہامات لکھے ہیں اُن میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ٹھیک ہے مجھے یہ الہام ہُوا تھا۔ مگر لکھنا یاد نہیں رہا پھر آپ اندر سے اپنے الہامات کی کاپی اُٹھا لائے اور مجھے فرمایا کہ دیکھو اس میں مَیں نے یہ الہام درج کیا ہُوا ہے۔ اِس کے بعد آپ نے اُس الہام کو بھی اخبار میں شائع کروا دیا۔ اب دیکھو ادھر ایک الہام حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر نازل ہوتا ہے اور اُدھر اللہ تعالیٰ مجھے بھی بتا دیتا ہے کہ اِن الفاظ میں

آپ پر الہام نازل ہوا ہے اور صبح معلوم ہوتا ہے کہ بات بالکل درست تھی۔

غرض رؤیا و کشوف میں بعض دفعہ ساتھ رہنے والے بھی شریک کرلئے جاتے ہیں۔ اور یہ چیز ایسی قطعی اور یقینی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ملکہ وکٹوریہ کو تبلیغ اسلام کرتے ہوئے لکھا کہ

"اگر کوئی طالب حق نیت کی صفائی سے ایک مدت تک میرے پاس رہے اور وہ حضرت مسیح کو کشفی حالت میں دیکھنا چاہے تو میری توجہ اور دعا کی برکت سے وہ ان کو دیکھ سکتا ہے۔ اُن سے باتیں بھی کرسکتا ہے اور اُن کی نسبت اُن سے گواہی بھی لے سکتا ہے۔ کیونکہ میں وہ شخص ہوں جس کی روح میں بروز کے طور پر یسوع مسیح کی روح سکونت رکھتی ہے۔" (تحفۂ قیصریہ صفحہ ۲۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سونٹے کا سانپ بن کر نظر آنا بھی ایسے ہی کشوف میں سے تھا جس کا دائرہ وسیع کر دیا گیا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں نے موسیٰ کا عصا ایک بہت بڑے اژدہا کی صورت میں دیکھا جسے دیکھ کر وہ ڈر گئے اور اُن کے دلوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

یہ نظارہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک غریب شخص جس کا ابوجہل کے ذمہ کچھ قرض تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ابوجہل نے میرا اتنا روپیہ دینا ہے مگر بار بار تقاضوں کے باوجود وہ میرا روپیہ مجھے نہیں دیتا۔ آپ اس بارہ میں میری مدد کریں۔ اور مجھے اس سے روپیہ دلوا دیں۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے ایک ایسی مجلس میں شریک رہ چکے تھے جس کا ہر ممبر یہ حلف اٹھاتا تھا کہ میں مظلوموں کی مدد کرونگا۔ اور حقدار کو اُس کا حق دلانے کی کوشش کرونگا۔ اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فوراً اُس کے ساتھ ابوجہل کے مکان کی طرف چل پڑے۔ حالانکہ اُس زمانہ میں مکہ میں آپؐ کی شدید مخالفت تھی اور گلی کوچوں میں آپؐ کا اکیلے پھرنا خطرہ سے خالی نہیں تھا مگر آپؐ اپنی جان کی کوئی پروا نہ کرتے ہوئے اُس کے ساتھ چل پڑے اور ابوجہل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آیا۔ تو آپؐ نے فرمایا۔ تم نے اِس شخص کا کوئی روپیہ دینا ہے۔ اُس نے کہا۔ ہاں! آپؐ نے فرمایا۔ پھر اسے لا دو۔ وہ چپکے سے اندر گیا اور اُس نے روپیہ لا کر دے دیا۔ جب یہ خبر مکہ کے لوگوں نے سُنی تو انہوں نے ابوجہل کو طعنے دینے شروع کر دیئے کہ تم ہمیں تو کہتے ہو کہ محمدؐ رسول اللہ کی کوئی بات نہ مانو مگر خود اتنا ڈر گئے کہ اُس کے کہنے پر تم چپکے سے اندر گئے اور روپیہ لا کر اُس کے حوالے کر دیا۔ وہ کہنے لگا۔ تمہیں کیا معلوم کہ میرے ساتھ کیا واقعہ ہوا۔ جب میں نے دروازہ کھولا اور مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نظر آئے۔ تو میں نے دیکھا کہ آپ کے دائیں اور بائیں دو مست اونٹ کھڑے ہیں اور وہ ایسے جوش میں ہیں کہ میں نے سمجھا اگر اس وقت میں نے ذرا بھی انکار کیا تو یہ دونوں اونٹ مجھے نوچ کر کھا جائیں گے۔ چنانچہ میں نے اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ فوراً روپیہ لا کر پیش کر دوں۔ یہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا جو ابوجہل کو دکھائی دیا۔ ورنہ ظاہر میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں کوئی دیوانے اونٹ نہیں تھے۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک ہندو جو لاہور کے کسی دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا اور علم توجہ کا بڑا ماہر تھا۔ کسی برات کے ساتھ اِس نیت اور ارادہ سے قادیان آیا کہ میں مرزا صاحب پر مسمریزم کروں گا۔ تو وہ مجلس میں بیٹھے ناچنے لگ جائیں گے اور لوگوں میں

ان کی بڑی سُبکی ہوگی - یہ واقعہ اُس ہندو نے خود لاہور کے ایک احمدی دوست میاں عبدالعزیز صاحب مغل کو سنایا تھا جس کی تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے میاں عبدالعزیز صاحب کو اپنی ایک کتاب دی اور فرمایا کہ یہ فلاں ہندو کو دے دینا - انہوں نے اُسے کتاب پہنچا کر پوچھا کہ حضرت صاحب نے آپ کو یہ کتاب کیوں بھجوائی ہے اور آپ کا اُن کے ساتھ کیا تعلّق ہے - اِسپر اُس ہندو نے یہ سارا واقعہ سُنایا اور کہا کہ مجھے مسمریزم کے علم میں اتنی مہارت حاصل ہے کہ اگر میں تانگہ میں بیٹھے ہوئے کسی شخص پر توجہ ڈالوں تو وہ فوراً تانگے کے پیچھے پیچھے بھاگا آئیگا - حالانکہ نہ وہ میرا واقف ہوگا اور نہ میں اُسے جانتا ہونگا - پھر اُس نے کہا - کہ میں نے آریوں اور ہندوؤں سے حضرت مرزا صاحب کے خلاف بہت سی باتیں سُنی ہوئی تھیں جن کی بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ میں مرزا صاحب پر مسمریزم کے ذریعہ اثر ڈالوں گا - اور اُنکے مُریدوں کے سامنے اُن کی سُبکی کرونگا - چنانچہ میں ایک شادی کے سلسلہ میں قادیان گیا اور مرزا صاحب کی مجلس میں بھی چلا گیا مرزا صاحب اُس وقت کچھ وعظ و نصیحت کی باتیں کر رہے تھے - میں نے دروازے میں بیٹھ کر اُن پر توجہ ڈالنی شروع کی - مگر اُن پر کچھ بھی اثر نہ ہُوا - میں نے سمجھا کہ اِن کی قوتِ ارادی زیادہ قوی ہے چنانچہ میں نے پہلے سے زیادہ توجہ ڈالنی شروع کی - مگر پھر بھی اُن پر کچھ اثر نہ ہُوا - اور وہ اُسی طرح باتوں میں مشغول رہے - تب میں نے سمجھا کہ ان کی قوتِ ارادی بہت زیادہ مضبوط ہے اور میں نے اپنی ساری توجہ اُن پر صرف کر دی - میں ابھی توجہ کر ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سامنے کچھ فاصلہ پر ایک شیر بیٹھا ہے - میں اُسے دیکھ کر کانپ گیا - لیکن میں نے اپنے دل کو ملامت کی کہ تو کیسے وہم میں مبتلا ہوگیا ہے - یہاں بھلا شیر کا کیا کام ہے اور میں نے پھر توجہ کرنی شروع کر دی - اِس پر میں نے دیکھا کہ وہ شیر میرے قریب آگیا ہے اُسے دیکھ کر میرا جسم پھر کانپ اُٹھا - مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر توجہ ڈالنی شروع کر دی جب میں نے اپنا پورا زور لگا دیا تو اچانک میں نے کیا دیکھا کہ وہی شیر کود کر مجھ پر حملہ آور ہُوا ہے اور ڈر کے مارے زور سے میری چیخ نکل گئی اور میں جلدی سے اپنی جوتی لے کر نیچے بھاگا - میری آواز سُن کر حضرت مرزا صاحب نے اپنے مریدوں سے کہا کہ دیکھنا یہ کون شخص بھاگا ہے اور اسے کیا ہُوا ہے - چنانچہ ایک شخص میرے پیچھے آیا اور اُس نے مسجد کے ساتھ والے چوک میں مجھے آپکڑا میں چونکہ اُس وقت سخت حواس باختہ تھا - اِس لئے میں نے اُس سے کہا کہ تم مجھے جانے دو - میرے حواس اِسوقت درست نہیں ہیں - چنانچہ مجھے چھوڑ دیا گیا - بعد میں اُس نے یہ تمام واقعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو لکھا اور کہا کہ مجھ سے گستاخی ہوگئی ہے - میں آپ کے مرتبہ کو پہچان نہ سکا - آپ بڑے خدا رسیدہ اور بزرگ انسان ہیں - آپ میری اِس غلطی کو معاف فرماویں میاں عبدالعزیز صاحب مغل سُنایا کرتے تھے کہ میں نے اس ہندو سے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں نہ سمجھا کہ مرزا صاحب مسمریزم جانتے ہیں اور اِس علم میں وہ تم سے بڑھ کر ہیں - وہ کہنے لگا - ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا - کیونکہ مسمریزم کے لئے توجّہ کا ہونا ضروری ہے اور یہ عمل کامل سکون اور خاموشی چاہتا ہے مگر مرزا صاحب تو اس وقت باتوں میں مشغول تھے

اس لئے مَیں نے سمجھ لیا کہ ان کی قوتِ ارادی زمینی نہیں بلکہ آسمانی ہے اور وہ خدا رسیدہ انسان ہیں۔ چنانچہ یہ ہندو جب تک زندہ رہا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بڑا معتقد رہا اور ہمیشہ آپ سے خط و کتابت رکھتا تھا۔

اسی طرح ۱۸۹۳ء میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب عبداللہ آتھم کے متعلق پیشگوئی فرمائی کہ وہ پندرہ ماہ تک ہاویہ میں گرایا جائیگا اور اسکو سخت ذلت پہنچیگی۔ بشرطیکہ حق کی طرف رجوع نہ کرے۔ تو عبداللہ آتھم کے دل پر اس پیشگوئی کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اُسے قسم قسم کے خوفناک نظارے نظر آنے شروع ہوگئے۔ ایک دفعہ امرتسر میں اُسے ایک خطرناک سانپ دکھائی دیا جس کی اس کے دل پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر لدھیانہ اپنے داماد کے پاس بھاگ گیا۔ مگر وہاں پہنچ کر بھی اُسے سکون نہ ملا۔ بلکہ اُس نے دیکھا کہ بعض آدمی جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں نیزے پکڑے ہوئے ہیں اُس کو قتل کرنے کے لئے مستعد کھڑے ہیں اور کوٹھی کے احاطہ کے اندر آ پہنچے ہیں۔ اسپر وہ پھر گھبرایا اور دوڑ کر اپنے دوسرے داماد کے پاس فیروز پور چلا گیا۔ مگر وہاں بھی اُسے ایسے ہی حملہ آور دکھائی دیئے جو بندوقوں اور تلواروں سے مسلّح تھے غرض پندرہ ماہ اُس نے سخت بے چینی اور اضطراب میں بسر کئے اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دوڑتا رہا۔ یہ نظارے جو آتھم کو دکھائے گئے درحقیقت کشفی رنگ ہی رکھتے تھے۔ ورنہ اگر کوئی جسمانی سانپ ہوتا تو عبداللہ آتھم اُسے آسانی کے ساتھ مار سکتا تھا۔ اسی طرح اگر انسان حملہ آور ہوتے تو وہ آسانی سے گرفتار کئے جا سکتے تھے۔ مگر یہ چیز تو ایسی تھی جو صرف آتھم کو دکھائی دی۔ اور اُس نے خود ان واقعات کو بیان کیا۔

غرض جس طرح ابوجہل کو دو مست اونٹ دکھائی دیئے اور لاہور کے ہندو دوست کو ایک شیر حملہ کرتا ہؤا دکھائی دیا۔ اور عبداللہ آتھم کو سانپ اور تلواروں اور نیزوں وغیرہ سے مسلّح افراد دکھائی دیئے اسی طرح فرعونِ مصر کو موسیٰؑ کا عصا ایک اژدہا کی صورت میں نظر آیا جسے دیکھ کر وہ کانپ گیا اور گو اس نے اُسے ایک جسمانی سانپ ہی سمجھا مگر درحقیقت اس کی تعبیر یہ تھی کہ موسیٰ کی جماعت ایک دن فرعون اور اس کے تمام لاؤلشکر کو اژدہا بن کر کھا جائیگی اور وہی بنی اسرائیل جن کو وہ موسیٰؑ کے ساتھ بھیجنے کے لئے تیار نہیں ایک دن اُس کی تباہی اور بربادی کا باعث بن جائیں گے اور موسیٰؑ کو غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ تعطیر الانام میں بھی لکھا ہے کہ مَنْ رَاٰی اَنَّہٗ مَلَکَ ثُعْبَانًا فَاِنَّہٗ یُصِیْبُ سُلْطَانًا عَظِیْمًا۔ یعنی اگر کوئی شخص یہ دیکھے کہ کوئی بڑا اژدہا اُس کے قبضے میں آگیا ہے تو اُس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اُسے بہت بڑا غلبہ حاصل ہوگا۔ پس یہ کشف موسیٰؑ اور اس کی جماعت کے غلبہ اور فرعون اور اس کی قوم کی تباہی کی خبر اپنے اندر رکھتا تھا۔ اسی طرح اس کشف میں فرعون کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کا موسےٰ کے ہاتھ میں ہی رہنا ضروری ہے۔ ورنہ اگر یہ تمہارے پاس رہی تو تمہارے اخلاق و اطوار ہی ان پر اثر انداز ہونگے۔ مگر پھر یہ انسان نہیں رہیں گے بلکہ سانپ بن جائیں گے۔ اور جس طرح سانپ سفلی زمین کی مٹی کھاتا ہے۔ اسی طرح وہ بھی زمین کے کیڑے بن جائینگے ایک مضبوط اور مستعد جماعت کی شکل اختیار نہیں کر سکیں گے۔ مگر فرعون نے اس کشفی نظارہ کی حقیقت کو

نہ سمجھا اور یہ خیال کر لیا کہ موسیٰؑ کوئی بڑا جادوگر ہے۔ جس نے اپنے جادو کے زور سے سونٹے کو سانپ کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عصائے موسیٰؑ کے سانپ بن جانے کے متعلق قرآن کریم نے تین الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اوّل ثُعْبَانٌ۔ دوم حَیَّةٌ۔ سوم جَآنٌّ۔ ثعبان کا لفظ تو سورۃ اعراف ع ۱۳ اور سورۂ شعراء کی زیرِ تفسیر آیت میں استعمال ہوا ہے۔ حیّة کا لفظ سورۂ طٰہٰ کے پہلے رکوع میں استعمال ہوا ہے اور جآنّ کا لفظ سورۂ نمل ع ۱ اور سورۂ قصص ع ۴ میں استعمال ہوا ہے۔ دشمنانِ اسلام اپنی نادانی سے یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ ایک ہی امر کے متعلق قرآن کریم نے اتنے مختلف الفاظ کیوں استعمال کئے ہیں۔ اِس سے تو معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر یہ اعتراض قلّتِ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ غور کرتے تو انہیں اِس میں کوئی اختلاف نظر نہ آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعون کے دربار میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا اور وہ اژدہا بن کر نظر آنے لگا۔ تو اس واقعہ کے متعلق قرآن کریم نے ہر مقام پر صرف ثعبان کا لفظ استعمال کیا ہے کوئی اور لفظ استعمال نہیں کیا۔ پس اِس بارہ میں اختلاف کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

باقی رہا حَیَّةٌ اور جَآنٌّ کے الفاظ کا استعمال سو یہ دونوں الفاظ اُس موقعہ پر استعمال کئے گئے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کلام سے نوازا اور انہیں فرعون کی طرف جانے کی ہدایت فرمائی۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! اپنا سونٹا پھینک۔ انہوں نے سونٹا پھینکا تو قرآن کریم میں لکھا ہے کہ فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى (طٰہٰ ع ۱) موسیٰ نے کیا دیکھا کہ وہ ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔ حَیَّةٌ کا لفظ چھوٹے اور بڑے دونوں قسم کے سانپوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن سورۂ نمل اور قصص میں یہی مضمون اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ (نمل ع ۱) جب موسیٰؑ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی ہل رہی ہے گویا کہ وہ ایک چھوٹا سانپ ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اُس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ سورۂ قصص رکوع ۴ میں بھی یہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں پس اگر اعتراض ہوسکتا ہے تو صرف اس پر کہ ایک ہی واقعہ کے متعلق ایک جگہ حَیَّةٌ اور دوسری جگہ جَآنٌّ کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ ثُعْبَانٌ کا لفظ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے الگ موقعہ پر استعمال ہوا ہے اِس لئے ثعبان کے بارہ میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوسکتا۔ سوال صرف یہ ہوسکتا ہے کہ حَیَّةٌ کو دوسرے مقام پر جَآنٌّ کیوں کہا گیا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ سورۂ نمل اور قصص دونوں مقامات پر قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ وہ جَآنٌّ تھا بلکہ یہ کہا ہے کہ تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وہ اِس طرح ہلتا تھا جس طرح چھوٹا سانپ ہلتا ہے۔ گویا تھا تو وہ بڑا سانپ ہی مگر وہ ہلتا اِس طرح تیزی سے تھا جیسے چھوٹا سانپ ہلا کرتا ہے۔ پس قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں اُن کا آپس میں کوئی تضاد نہیں۔ جہاں قرآن کریم نے جآنّ کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں اُس سانپ کی صرف تیزی کا ذکر ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا پھینکا تو وہ چھوٹے سانپ کی طرح تیزی سے دوڑنے لگ پڑا وہاں اُس کی شکل کا کوئی ذکر نہیں کہ وہ چھوٹا تھا یا بڑا بلکہ یہ بتانا مدِّ نظر ہے کہ چھوٹے سانپ کی طرح اُس میں

تیزی پائی جاتی تھی۔ لیکن جہاں ثُعْبَانٌ کا لفظ آیا ہے
وہ آیات دیکھی جائیں تو صاف معلوم ہوگا کہ وہ
واقعہ فرعون کے سامنے ہوا ہے اور فرعون کو چونکہ
ڈرانا مقصود تھا۔ اِس لئے اُسے ثُعْبَانٌ کی شکل میں
سونٹا دکھائی دیا۔ پس قرآنی آیات میں جو تضاد
سمجھا جاتا ہے۔ وہ حقیقتاً کوئی تضاد نہیں محض
قلّتِ تدبّر یا لغتِ عرب سے ناواقفیت کی وجہ
سے ایسے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرا نشان جو اللہ تعالیٰ نے اِس موقعہ پر ظاہر
کیا وہ یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلو سے اپنا
ہاتھ نکالا تو وہ انہیں بالکل سفید اور چمکتا ہوا دکھائی
دیا۔ یہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا جو فرعونیوں کو دکھایا
گیا۔ اور جس میں ایک تو اس طرف اشارہ تھا کہ
اے فرعونیو! تم مسمریزم جانتے ہو اور تمہیں معلوم ہے
کہ سفید رنگ نیکی اور پاکیزگی اور طہارتِ قلب کی
علامت ہوا کرتا ہے پس موسیٰؑ کے ہاتھ کا سفید
نظر آنا بتا رہا ہے کہ یہ شخص پاک اور بے عیب ہے اور
یہ جو کچھ کہہ رہا ہے اِس میں کسی جھوٹ اور افترا کی
آمیزش نہیں۔ اگر اس کا ہاتھ سیاہ دکھائی دیتا تو
یہ اُس کی سیاہیٔ قلب اور باطنی تاریکی کا ثبوت
ہوتا۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ اس کا ہاتھ سورج کی
طرح روشن ہے اور اس کی شعاعیں تمہاری آنکھوں کو
خیرہ کر رہی ہیں۔ پس تم اپنے علم کی بناء پر بھی سمجھ سکتے
ہو کہ یہ شخص پاکباز ہے اور تمہارا فرض ہے کہ یہ جو
کچھ کہے تم اسے تسلیم کرو۔

اِسی طرح موسیٰ کا روشن ہاتھ اس تعبیر کا بھی حامل تھا کہ
اس شخص کے ہاتھ پر بڑے بھاری تغیرات مقدّر ہیں مگر وہ تغیرات
کسی ظلم اور تشدد کے نتیجہ میں نہیں ہونگے۔ نہ مکر اور فریب اور
جھوٹ اور جعلسازی اُن میں کام کر رہی ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ کی
تائید اور اُسکی معجزانہ نصرت اسکا باعث ہوگی جسکو موسیٰؑ کی دُعائیں جذب
کرینگی اور وہ روحانی سِلسلہ جس کی اس کے ہاتھ سے
بنیاد رکھی جا رہی ہے ایک دن دنیا کو اپنے انوار سے
روشن کر دے گا۔ گویا جس طرح سورج اور چاند کے
طلوع سے تاریکی غائب ہو جاتی ہے اسی طرح موسیٰؑ
کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کے جو نشانات ظاہر ہوں گے۔
اُن سے وہ ظلمت اور تاریکی دُور ہو جائیگی جو لوگوں کے
قلوب کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور شیطان کی جگہ رحمٰن
کی حکومت قائم ہو جائے گی۔

پھر موسیٰؑ کے اس کشف میں آپؑ کی قوم کی
پاکیزگی اور طہارت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا کیونکہ
ہاتھ کی تعبیر میں جہاں بھائی بیٹے اور رشتہ دار وغیرہ
مُراد ہوتے ہیں وہاں یَدٌ سے قوم بھی مُراد ہوتی ہے
کیونکہ قوم کے افراد بھی ایک دوسرے کی تقویت اور
سہارے کا موجب ہوتے ہیں اور مشکلات میں وہ
دوسروں کے کام آتے ہیں۔ پس کشفی طور پر آپکے ہاتھ
کا روشن اور بے عیب دکھایا جانا اِس تعبیر کا بھی حامل
تھا کہ آج تو بنی اسرائیل میں کئی قسم کے عیوب دکھائی
دے رہے ہیں لیکن جب یہ قوم میرے ہاتھ پر جمع ہوگی تو
اللہ تعالیٰ اس کے اندر ایسا نور پیدا کر دے گا کہ یہ
بھولے بھٹکوں کی راہنما بن جائیگی اور اخلاق اور روحانیت
میں اعلیٰ درجہ کا کمال حاصل کرلے گی۔

یہ خیال کہ کسی انسان کے جسم سے ایسی شعاعیں
کس طرح نکل سکتی ہیں جو دوسروں کو بھی نظر آ جائیں
صرف اِس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اِس نشان کو
ظاہر پر محمول کر لیتے ہیں۔ اگر وہ سمجھتے کہ یہ ایک کشفی
واقعہ ہے تو اس قسم کے وساوس بھی اُن کے دل میں
پیدا نہ ہوتے۔ موسیٰؑ کا زمانہ تو بہت دُور کی بات ہے
ہم تو دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی اللہ تعالےٰ نے

اپنے بعض ایسے نشانات دکھائے ہیں جن میں کشفی نگاہ رکھنے والوں نے اللہ تعالیٰ کے انوار کو ظاہری شکل میں بھی متمثل دیکھا اور اُس کے روحانی کیف سے لذّت اندوز ہوئے۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام لاہور تشریف لے گئے تو وہاں ایک جلسہ میں آپؑ نے تقریر فرمائی۔ ایک غیر احمدی دوست شیخ رحمت اللہ صاحب وکیل بھی اُس تقریر میں موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں۔ دورانِ تقریر میں مَیں نے دیکھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سر سے نُور کا ایک ستون نکل کر آسمان کی طرف جا رہا تھا۔ اُس وقت میرے ساتھ ایک اَور دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مَیں نے انہیں کہا۔ دیکھو وہ کیا چیز ہے۔ انہوں نے دیکھا۔ تو فوراً کہا کہ یہ تو نُور کا ستون ہے جو حضرت مرزا صاحب کے سر سے نکل کر آسمان تک پہنچا ہوا ہے۔ اس نظارہ کا شیخ رحمت اللہ صاحب پر ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے اُسی دن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت کر لی (الفضل ۵ ستمبر ۱۹۴۳ء)

اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت چھ ماہ متواتر روزے رکھے تو آپ نے اُن روزوں کے روحانی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا:۔

"اِس قسم کے روزہ کے عجائبات میں سے جو میرے تجربہ میں آئے وہ لطیف مکاشفات ہیں جو اُس زمانہ میں میرے پر کُھلے۔ چنانچہ بعض گذشتہ نبیوں کی ملاقاتیں ہوئیں اور جو اعلیٰ طبقہ کے اولیاء اس اُمّت میں گذر چکے ہیں اُن سے ملاقات ہوئی۔ اور علاوہ اس کے انوارِ روحانی تمثیلی طور پر برنگ ستون سبز و سُرخ ایسے دلکش اور دلستان طور پر نظر آتے تھے جن کا بیان کرنا بالکل طاقتِ تحریر سے باہر ہے۔ وہ نورانی ستون جو سیدھے آسمان کی طرف گئے ہوئے تھے جن میں سے بعض چمکدار سفید اور بعض سبز اور بعض سُرخ تھے۔ اُن کو دل سے ایسا تعلق تھا کہ اُن کو دیکھ کر دل کو نہایت سرور پہنچتا تھا اور دنیا میں کوئی بھی ایسی لذّت نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اُن کو دیکھ کر دل اور رُوح کو لذّت آتی تھی۔ میرے خیال میں ہے کہ وہ ستون خدا اور بندہ کی محبّت کی ترکیب سے ایک تمثیلی صورت میں ظاہر کئے گئے تھے یعنی وہ ایک نور تھا جو دل سے نکلا اور دوسرا وہ نور تھا جو اوپر سے نازل ہُوا۔ اور دونوں کے ملنے سے ایک ستون کی صورت پیدا ہوگئی۔ یہ روحانی امور ہیں کہ دُنیا ان کو نہیں پہچان سکتی۔ کیونکہ وہ دنیا کی آنکھوں سے بہت دُور ہیں۔ لیکن دُنیا میں ایسے بھی ہیں جن کو ان اُمور سے خبر ملتی ہے۔

(کتاب البریّہ حاشیہ صفحہ ۱۶۴ تا صفحہ ۱۶۷)

اسی طرح آپؑ نے ایک دفعہ فرمایا کہ:۔

"مَیں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے فیوض عجیب نوری شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتے ہیں اور پھر وہاں جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں سے نکل کر اُن کی لا انتہاء نالیاں ہوتی ہیں۔ اور بقدرِ حصہ رسدی ہر حقدار کو پہنچتی ہیں"

(الحکم مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷)

اسی طرح ایک دفعہ آپؑ کو رؤیا میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ اور آپؑ نے دیکھا

کہ جیسے آفتاب کی کرنیں چھوٹتی ہیں۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانیٔ مبارک سورج کی طرح چمک رہی ہے۔ (تذکرہ ص۴۳)

پھر جلسہ اعظم مذاہب لاہور میں ابھی آپ کا مضمون نہیں پڑھا گیا تھا کہ آپ نے رؤیا میں دیکھا کہ

"میرے محل پر غیب سے ایک ہاتھ مارا گیا۔ اور اُس ہاتھ کے چھونے سے اُس محل میں سے ایک نور ساطعہ نکلا جو اردگرد پھیل گیا۔ اور میرے ہاتھ پر بھی اُس کی روشنی پڑی۔" (تذکرہ ص۲۹۵)

غرض اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو اصلاح خلق کے لئے مبعوث فرماتا ہے وہ انہیں اپنے انوار اور تجلّیات کا جلوہ گاہ بناتا ہے۔ اور یہ نور بعض دفعہ ظاہری طور پر متمثل ہو کر دوسرے لوگوں کو بھی نظر آجاتا ہے تاکہ سعید الفطرت انسان اس سے فائدہ اُٹھائیں اور وہ اپنے قلوب میں تغیّر پیدا کریں۔

خود مجھے بھی اللہ تعالیٰ کا نور بعض دفعہ تمثّل کے طور پر دکھائی دیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء کا واقعہ ہے کہ مجھے بخار ہو گیا اور ساتھ ہی مجھے اپنی ران میں شدید درد ہونے لگا۔ چونکہ اُن دنوں طاعون سے بعض اموات ہو رہی تھیں مجھے وہم ہوا کہ کہیں یہ طاعون ہی نہ ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور سوچنے لگا کہ یہ کیا ہونے لگا ہے۔ اسی اثناء میں جبکہ میری آنکھیں کھلی تھیں میں در و دیوار کو دیکھ رہا تھا اور مجھے اپنے کمرہ کی تمام چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے کشفی طور پر دیکھا کہ ایک سفید اور نہایت چمکتا ہوا نور ہے جو میرے کمرے کے نیچے سے نکل رہا ہے اور آسمان کی طرف چھت پھاڑ کر جا رہا ہے۔ نہ اس کی کوئی ابتداء معلوم ہوتی ہے اور نہ انتہاء۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ اُس نور میں سے ایک ہاتھ نکلا ہے جس میں ایک سفید چینی کا پیالہ ہے اور اس پیالہ میں دودھ بھرا ہوا ہے۔ اُس ہاتھ نے وہ پیالہ مجھے پکڑا دیا اور میں نے وہ دودھ پی لیا۔ جب میں وہ دودھ پی چکا تو میں نے دیکھا کہ نہ تو کوئی درد ہے اور نہ بخار بلکہ میں اچھا بھلا ہوں۔ اور مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے

اسی طرح بعض دفعہ دوسروں کے جسم سے ایسی شعاعیں نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جن سے اُن کے اندرونی خیالات بے نقاب ہو جاتے ہیں اور پتہ لگ جاتا ہے کہ وہ سچے مومن ہیں یا نہیں۔ میں نے کئی دفعہ دیکھا ہے کہ ایک شخص میرے ساتھ بات کرتا ہے اور میری رُوح اُس کی رُوح سے ٹکرا کر معلوم کر لیتی ہے کہ یہ منافق کی رُوح ہے۔ اسی طرح کئی ایسے ہوتے ہیں جو ظاہر میں بڑے اخلاص کا اظہار کرتے ہیں۔ ہاتھ چومتے ہیں۔ مگر اُن کے ہاتھ چومنے پر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے ہاتھ کو نجاست لگا دی ہے اور اُن کی باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ گویا وہ گالیاں دے رہے ہیں۔ کیونکہ قلوب کے اسرار بعض دفعہ تو اللہ تعالیٰ اس طرح ظاہر کر دیتا ہے کہ خود انسان کے مُنہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو اُس کی قلبی کیفیت کا آئینہ دار ہوتی ہیں اور کبھی اُس کے اندر سے باریک شعاعیں نکل کر دوسروں کے قلوب پر پڑتی ہیں۔ اور وہ چیز جسے وہ مخفی سمجھ رہا ہوتا ہے دوسروں پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ خدا کے بندوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی نظر باوجود انسانی ہونے کے لوگوں کے دلوں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ چیز جو دُنیا کیلئے پوشیدہ ہوتی ہے اُن کے لئے ظاہر ہو جاتی ہے مگر چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ستّاری کی چادر اوڑھے ہوئے

ہوتے ہیں اس لئے وہ اُن کے عیب کو چھپا لیتے ہیں۔ وہ ایسا اس لئے نہیں کرتے کہ اُن کے دل کا خیال اُن پر ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ خدا نہیں چاہتا کہ اُس کی ستّاری کی چادر کو اُٹھا دیا جائے۔

مجھے یاد ہے قادیان میں ایک دفعہ ایک بہائی عورت آئی اور مختلف مسائل پر مجھ سے گفتگو کرتی رہی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن اُس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے جسم سے کوئی چیز نکل کر اُس کے ساتھ ٹکرا جاتی ہے لیکن آگے نہیں گذرتی۔ آخر میں نے دُعا کی تو میں نے دیکھا کہ وہ چیز جو اُس کے ساتھ ٹکراتی تھی آگے نکلنے لگی ہے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو وہ بڑے جوش سے باتیں کر رہی تھی اور یا پھر یکدم گھبرا گئی اور اُس نے بحث بند کر دی اور کہنے لگی کہ میرا بچہ بیمار ہے اس لئے میں جاتی ہوں حالانکہ وہ اچھا بھلا تھا۔

غرض انبیاء اور اولیاء کے جسم سے مختلف قسم کی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں جو اُن کے روحانی درجہ اور مقام کے مطابق مختلف رنگ کی ہوتی ہیں مگر یہ شعاعیں مادی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں بلکہ اُن کے دیکھنے کیلئے کشفی نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی میسّر آ سکتی ہے۔ یہی نور تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے نکلا۔ اور الٰہی تصرف کے ماتحت فرعون اور اُس کے درباریوں نے بھی دیکھ لیا۔ مگر چونکہ وہ روحانی علوم سے بے بہرہ تھے انہوں نے اتنے بڑے نشان کو دیکھ کر بھی موسیٰؑ کی عظمت اور اُس کے تقدس کو نہ پہچانا اور یہ خیال کر لیا کہ موسیٰؑ نے اپنے جادو کے زور سے ایسا کر لیا ہے۔ بہرحال موسیٰؑ کے ہاتھ پر خدا تعالیٰ نے اپنے جلال اور جمال کا اظہار کیا اور سانپ کی شکل میں اُسے انذاری اور ید بیضاء کی شکل میں تبشیری نشان دکھایا۔ مگر بائیبل نے عصا کا سانپ بن جانا تو تسلیم کیا ہے اگرچہ وہ اس نشان کو موسیٰؑ کی طرف نہیں بلکہ ہارونؑ کی طرف منسوب کرتی ہے مگر موسیٰؑ کے دربار میں ید بیضاء والے معجزہ کے دکھائے جانے کا اُس نے ذکر تک نہیں کیا اور یہ اس کی ایک بہت بڑی فروگذاشت تھی جس کا قرآن کریم نے ازالہ کیا۔ بلکہ خود بائیبل کی ایک اندرونی شہادت سے بھی ثابت ہے کہ فرعون کے دربار میں ید بیضاء والا نشان بھی ضرور دکھایا گیا تھا۔ اور وہ شہادت یہ ہے کہ جب موسیٰؑ کو خدا تعالیٰ نے فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو اُس وقت بائیبل بھی تسلیم کرتی ہے کہ

> "خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔ اُس نے کہا۔ لاٹھی۔ پھر اُس نے کہا کہ اِسے زمین پر ڈال دے اُس نے اسے زمین پر ڈالا تو وہ سانپ بن گئی اور موسیٰؑ اُس کے سامنے سے بھاگا۔"
>
> (خروج باب ۴ آیت ۲ و ۳)

اسی طرح لکھا ہے کہ

> "پھر خداوند نے اُسے یہ بھی کہا کہ تو اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لے۔ اُس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اُسے ڈھانک لیا اور جب اُس نے اُسے نکال کر دیکھا۔ تو اُس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔"
>
> (خروج باب ۴ آیت ۶)

اِس حوالہ میں اوّل تو حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کی سفیدی کوڑھ کی طرف منسوب کی گئی ہے جو ایک نہایت ہی شرمناک بات ہے۔ موسیٰؑ خدا تعالیٰ کا ایک مقدس نبی تھا۔ اور وہ مقام جہاں اُس وقت موسیٰؑ خدا تعالیٰ سے ہمکلام ہوا تجلیاتِ الٰہیہ کا مرکز تھا۔ ایسے مقدس مقام پر موسیٰؑ جیسے مقدس نبی سے خدا تعالیٰ کا ہمکلام ہونا تو ایک بہت بڑا انعام تھا اور وہ الٰہی برکات اور اُس کے فیوض کا وقت تھا۔ ایسے بابرکت وقت میں خدا تعالیٰ کا یہ عذاب کیسے نازل ہو سکتا تھا کہ موسیٰؑ کے ہاتھ کو کوڑھ ہو جاتا۔ یقیناً موسیٰؑ کے ہاتھ کو کوڑھ نہیں ہُوا۔ بلکہ کسی بدبخت یہودی کا دل روحانی کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہُوا اور اُس نے یہ عیب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اِس کا ذکر کرتے ہوئے مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ (طٰہٰ ع۱) کے الفاظ بیان فرمائے ہیں کہ ہاتھ کی سفیدی کسی بیماری کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نشان کے طور پر عطا کی گئی تھی۔

بہرحال اِن دونوں معجزات کا ذکر کرنے کے بعد بائیبل میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

"اور یوں ہوگا کہ اگر وہ تیرا یقین نہ کریں اور پہلے معجزہ (یعنی لاٹھی کے سانپ بن جانے) کے معجزہ کو بھی نہ مانیں تو وہ دوسرے معجزہ (یعنی ہاتھ کی سفیدی اور چمک) کے سبب سے یقین کریں گے۔" (خروج باب ۴ آیت ۸)

اب اگر لاٹھی کو سانپ کی شکل میں دیکھ کر فرعون ایمان لے آتا تو ہم تسلیم کر سکتے تھے کہ اُسے دوسرا معجزہ دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن جب وہ ایمان ہی نہ لایا تو بائیبل کے خود اپنے بیان کے مطابق ضروری تھا کہ موسیٰؑ اسے یدِبیضاء والا معجزہ بھی دکھاتے۔ اور اگر وہ پھر بھی ایمان نہ لاتا تو اور معجزات دکھاتے جن کا بائیبل میں بھی ذکر آتا ہے اور قرآن کریم نے بھی ان کو بیان کیا ہے۔ پس بائیبل کا ایک طرف یہ کہنا کہ اگر فرعون پہلے معجزہ کو دیکھ کر ایمان نہ لایا تو پھر دوسرا معجزہ اُسے دکھایا جائے بتاتا ہے کہ فرعون کے سامنے یہ دونوں معجزے دکھائے گئے تھے۔ مگر بائیبل چونکہ انسانی دست بُرد کا شکار رہی ہے اِس لئے اُس نے اِس معجزہ کا ذکر تو کر دیا اور دوسرے معجزہ کے دکھائے جانے کا کوئی ذکر نہ کیا۔ لیکن خود اس کی اندرونی شہادت بتا رہی ہے کہ فرعون کے دربار میں یہ دونوں معجزات دکھانے کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا تھا۔ پس صحیح بات وہی ہے جو قرآن کریم نے کہی ہے اور بائیبل نے جو کچھ کہا ہے وہ خود بائیبل کی اپنی شہادت سے ہی غلط ثابت ہوتا ہے۔
باقی رہا بائیبل کا یہ کہنا کہ فرعون کے دربار میں موسیٰؑ نے نہیں بلکہ ہارونؑ نے عصا پھینکا تھا (خروج باب ۷ آیت ۱۰) یہ بھی بائیبل کی غلط بیانی ہے کیونکہ خود بائیبل خروج باب ۴ میں تسلیم کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہارونؑ سے نہیں بلکہ موسیٰؑ سے کہا تھا کہ

"یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔ اُس نے کہا لاٹھی: پھر اُس نے کہا کہ اِسے زمین پر ڈال دے۔ اُس نے اُسے زمین پر ڈالا اور وہ سانپ بن گئی۔ اور موسیٰ اُس کے سامنے سے بھاگا۔ تب خداوند نے موسیٰ سے کہا ہاتھ بڑھا کر اس کی دُم پکڑ لے۔ اُس نے ہاتھ بڑھایا اور اُسے پکڑ لیا۔ وہ اُس کے ہاتھ میں لاٹھی بن گیا۔"
خروج باب ۴ آیت ۲ تا ۴)

پھر یہ بات بھی خدا تعالیٰ نے موسیٰ سے ہی کہی تھی کہ اگر وہ پہلے معجزہ کو نہ مانیں تو "وہ دوسرے

معجزہ کے سبب یقین کرینگے" (خروج باب ۴ آیت ۹) پس جبکہ تمام گفتگو موسیٰؑ سے ہی ہوتی رہی اور موسیٰؑ کی لاٹھی ہی سانپ بنی اور موسیٰؑ کو ہی یہ کہا گیا کہ اگر فرعون اور اُس کے درباری پہلے معجزہ کو دیکھ کر ایمان نہ لائے تو دوسرے معجزہ کو دیکھ کر ایمان لے آئیں گے تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ فرعون کے دربار میں موسیٰؑ کی بجائے ہارون اپنا عصا پھینک دیتے پس یہ بات بھی بائیبل کی اندرونی شہادت سے باطل قرار پاتی ہے اور صحیح بات وہی ثابت ہوتی ہے جو قرآن کریم نے کہی۔

بہرحال یہ دو بڑے بھاری نشانات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کے ہاتھ پر ظاہر کئے۔ مگر اس امر کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ حقیقتاً یہ ایک بہت بڑا نشان تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا پھینکا اور وہ سانپ بن گیا یا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا مارا اور دریا پھٹ گیا یا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سونٹا مارا اور چٹان سے پانی بہ نکلا پھر بھی اس صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موسیٰؑ کے عصا کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو عصا عطا فرمایا وہ اتنا عظیم الشان ہے کہ موسیٰؑ کے عصا سے بحیرہ قلزم کا پھٹنا یا اُن کے عصا سے پتھر کی چٹانوں سے پانی بہہ نکلنا یا خود اُنکے عصا کا سانپ بن کر لوگوں کو دکھائی دینا اسکے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ موسیٰؑ کا عصا بیشک بڑے بھاری نشانات کا حامل تھا مگر آج دنیا میں کہیں موسوی عصا کا نشان نہیں۔ وہ عصا موسیٰؑ کے ہاتھ میں رہا اور موسیٰؑ کی وفات کے ساتھ ہی اُس کی نشان نمائی کا معجزہ ختم ہو گیا۔ مگر محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ عصا عطا فرمایا جس پر انسانوں کی موت اور زمانہ کی گردشیں کوئی اثر نہیں کر سکتیں۔ جسے دُنیا کی بڑی سے بڑی حکومتیں بھی توڑنے کی طاقت نہیں رکھتیں۔ اس عصا کو نہ کوئی زمینی کیڑا کھانے کی طاقت رکھتا ہے اور نہ کوئی آسمانی صاعقہ اُسے معرضِ ہستی سے معدوم کر سکتا ہے۔ وہ عصا جو آج بھی کفر کے سر کو پاش پاش کر رہا ہے اور قیامت تک شیطان کے پھیلائے ہوئے جالوں اور اس کی رسیّوں کو نگلتا چلا جائیگا قرآن کریم ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان آیت ۵۳) اے مسلمانو! تم قرآن کریم کو اپنے ہاتھ میں لو اور اس کے ذریعہ کفار سے جہاد کبیر کرو۔ گویا قرآن کریم ایک کتاب ہی نہیں بلکہ وہ ایک کامیاب ہتھیار بھی ہے جس سے کفر و شیطنت کی پھیلائی ہوئی ظلمتوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہہ کر بتایا کہ یہ قرآن بنی نوع انسان کا مقصد بھی ہے اور ایصالِ مقصد کا ذریعہ بھی ہے یعنی روحانی دلائل و براہین کے لئے یہ کسی دوسرے کی وکالت کا محتاج نہیں بلکہ خود ہی اپنے دعاوی کے دلائل بھی دیتا ہے اور اس طرح بنی نوع انسان کے عقلی اور فکری معیار کو بھی بلند کرتا چلا جاتا ہے۔

غرض قرآن وہ عظمت و شوکت اپنے اندر رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ توپ و تفنگ کے بغیر بھی دنیا کو فتح کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب دوسرے مسلمانوں میں بھی بیداری اور قربانی کی رُوح پیدا ہو رہی ہے لیکن قربانی کی وہ رُوح انہیں توپ و تفنگ کی طرف لے جاتی ہے۔ بے شک موجودہ دَور کا مسلمان آج سے سو یا پچاس سال قبل کے مسلمانوں کی نسبت زیادہ بیدار ہے لیکن وہ توپوں اور تلواروں کی طرف بھاگ رہا ہے۔ وہ حسرت سے ایٹم بم بنانیوالوں کی طرف دیکھ رہا ہے اور اس اُمید میں ہے کہ وہ اُسے بھی صدقہ کے طور پر کچھ ہتھیار دے دیں لیکن حضرت

مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے
ہمیں بتایا کہ تمہاری توپ قرآن ہے۔ تمہاری رائفل قرآن
ہے۔ تمہاری بندوق قرآن ہے۔ تمہارا پستول قرآن ہے
قرآن وہ ہتھیار ہے جس سے تم نے دُنیا کا سر کچلنا ہے
پس تم فتح کے لئے اس امر کے محتاج نہیں ہو کہ انگلستان
تمہیں توپیں دے۔ تم فتح کے لئے اس امر کے محتاج
نہیں ہو کہ امریکہ تم پر مہربان ہو اور ایک دو ایٹم بم
دے دے۔ یا فرانس اور جرمن تمہیں کیمیاوی چیزیں
پیدا کر کے دے بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم قرآن کریم
لو اور دُنیا کو فتح کر لو۔

قرآن وہ کتاب ہے جو انسان کے دل میں
خدا تعالیٰ کی خشیت پیدا کر کے اُس کو خدا کی طرف
لے جاتی ہے اور انسان کی جتنی طبعی اور رُوحانی ضرورتیں
ہیں اُن سب کو پُورا کرتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے۔ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ
كُلِّ مَثَلٍ (بنی اسرائیل آیت ۔ ۹) ہم نے اس قرآن
میں پھیر پھیر کر اور چکر دے دے کر اور نئے نئے اسلوب
سے اور نئی نئی طرز سے تمام قسم کی فطرتوں کے لئے
مضامین بیان کر دیئے ہیں۔

دُنیا میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں جو کسی تعلیم کی برتری
کو ثابت کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر قسم کے مضامین اس
میں بیان ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ مختلف طبقات میں کہ
ہر طبقہ کے لئے اسمیں مضامین بیان ہوں اور یہ دونوں
خصوصیتیں قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں۔ گویا کوئی انسان
نہیں رہا جو قرآن کریم کا مخاطب نہ ہو اور کوئی بات
نہیں رہی جو قرآن نے بیان نہ کی ہو۔ جب ہر بات اس
میں بیان کر دی گئی ہے۔ اور ہر قسم کے لوگوں کی فطرت
کو ملحوظ رکھ کر اس میں تعلیم نازل کر دی گئی ہے۔ تو پھر
نبی نوع انسان کو اپنے خدا کی محبت اور اُس کا پیار
کیوں حاصل نہ ہو۔ بیشک پُرانے زمانہ میں موسیٰؑ اور عیسیٰؑ
اور دوسرے نبیوں کو خدا ملا اور ہم اس پر ایمان رکھتے
ہیں لیکن ہمارا دل اس سے تسلّی نہیں پاتا۔ ہم چاہتے
ہیں کہ ہمیں بھی خدا تعالیٰ کی محبت حاصل ہو۔ اور زندہ
کتاب وہی کہلا سکتی ہے جو زندہ خدا سے ہمارا تعلق
پیدا کر دے۔ اگر وہ ہمیں خدا سے نہیں ملاتی تو اُس
کتاب کا وجود اور عدم ہمارے لئے برابر ہو جاتا ہے
اور قرآن کہتا ہے کہ ہم نے ہر انسان کی روحانی ضرورتوں
کے پُورا کرنے کے سامان اس کتاب میں رکھ دیئے ہیں
پس جو بھی سچے دل سے اس پر عمل کرے گا وہ اپنے
خدا کو پا لیگا۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ
هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ
(انعام آیت ۲۰) اے محمد رسول اللہ تو لوگوں سے
کہدے کہ یہ قرآن میری طرف اس لئے وحی کیا گیا ہے
کہ میں اس کے ذریعہ سے تمہیں بھی فائدہ پہنچاؤں اور
وہ تمام لوگ جن کے کانوں تک اس کی آواز پہنچے اُنکو
بھی فائدہ پہنچاؤں۔ ایک طرف قرآن کریم نے یہ
دعویٰ کیا ہے کہ اس میں ہر قسم کے مضامین بیان کئے
گئے ہیں اور ہر قسم کے لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور
دوسری طرف اُس نے یہ کہا ہے کہ جس کے ہاتھ میں بھی
یہ قرآن ہے اُس کو فائدہ پہنچے گا۔ کیونکہ یہ اسی لئے
نازل کیا گیا ہے کہ وہ سب لوگ جن کے کانوں تک
اس کی آواز پہنچے اُن کو فائدہ پہنچائے

پس قرآن کریم ایک بہت بڑا ہتھیار ہے جو
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ موسیٰؑ کا
عصا تو صرف تھوڑی دیر کے لئے فرعونیوں کو سانپ
کی شکل میں نظر آیا تھا جس سے کچھ دیر کے لئے اُن کے
جسموں پر لرزہ بھی طاری ہُوا مگر قرآن وہ کتاب ہے جو
آج تک انذار کا کام کر رہی ہے اور پھر اُسکا انذار

کسی ایک قوم یا ایک ملک سے مخصوص نہیں بلکہ دنیا کی تمام اقوام اور دنیا کے تمام ممالک اس کے دائرۂ انذار میں شامل ہیں اور پھر اُس کے انذار کی وسعت زمانوں کی قیود سے بھی بالا ہے۔ قیامت تک کوئی زمانہ ایسا نہیں آسکتا جس میں قرآن دشمنانِ اسلام کے لئے ایک نذیرمبین کا کام نہ کر رہا ہو یا اس کے انذاری نشانات اُن کی شان و شوکت کو مٹا کر اسلام کو غلبہ دینے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ پھر موسیٰ کا عصا صرف موسیٰ کے ہاتھ میں ہی نشان دکھا سکتا تھا مگر قرآن جس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک زندہ کتاب تھی اسی طرح آج سچے اور مخلص مومن کے لئے بھی وہ ایک زندہ کتاب ہے۔ اور جس طرح وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حقائق و معارف کی کان میں سے لاتعداد ہیرے اور جواہر پیش کرتی تھی اسی طرح وہ اُمتِ محمدیہ کے ہر مخلص فرد کو اس کے ایمان اور اخلاص کے مطابق اپنے معارف سے حصہ دیتی اور اپنے علوم سے بہرہ ور کرتی ہے۔ کیونکہ اس کا نزول اُس ہستی کی طرف سے ہے جسے غیب کا علم ہے اور جو انسان کے خیالات اور جذبات اور افکار کو جانتی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان خواہ اُس کا تجربہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو تمام افراد کے تمام افکار تمام جذبات اور تمام خیالات کا واقف نہیں ہو سکتا تمام انسانوں کے جذبات۔ افکار اور اُن کے خیالات کو وہی ذات سمجھ سکتی ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور وہ قرآن کریم میں بولتی ہے اور ہر شخص اپنی ضرورت کی چیز اس میں سے لے جاتا ہے۔ دنیا میں کسی کو کھدر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی کو لٹھے کی ضرورت ہوتی ہے کسی کو زربفت و کمخواب کی ضرورت ہوتی ہے کسی کو سرد یا گرم سوٹ یا ریشمی کپڑوں کی مختلف اقسام کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کپڑے خرید کر دوکان سے باہر نکلتا ہے تو اُس کی گٹھڑی میں سے ہر قسم کے کپڑے نہیں مل سکتے ہر قسم کے کپڑے صرف دوکان سے ہی مل سکتے ہیں جو شہر یا گاؤں کے لوگوں کی ضروریات کے لئے قائم ہوتی ہے۔ ایک عالم کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ایک کپڑا خریدنے والا۔ اور ایک بہت بڑے عالم کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک بہت بڑا امیر جو اپنے خاندان کی ضرورت کے مطابق دوکان سے مختلف قسم کے کپڑے ایک بڑی مقدار میں خرید تا ہے۔ تم اس امیر شخص کی گٹھڑی میں کپڑے کی بہت سی اقسام دیکھو گے تم اس میں لٹھے کے تھان دیکھو گے۔ تم زربفت و کمخواب دیکھو گے۔ تم کوٹوں کے کپڑے دیکھو گے۔ لیکن پھر بھی کپڑے کی بیسیوں اقسام ایسی رہ جائینگی جو تمہیں اُس گٹھڑی میں نظر نہیں آئیں گی حالانکہ وہ ہزاروں روپے کا کپڑا خرید کر لایا ہو گا۔ اسی طرح جو شخص قرآن کریم کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا علم خواہ کتنا تھوڑا ہو وہ اگر قرآن کریم کے ساتھ موانست رکھتا ہے تو اُس کا دماغ اپنی ضرورت کے مطابق قرآن کریم سے چیزیں لے لیتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی مثال دُنیا کی سی ہے جس کے جنگلوں میں تم جاتے ہو اور اپنی ضرورت کے مطابق کوئی نہ کوئی درخت کاٹ لاتے ہو۔ لیکن اس کے اندر پائی جانے والی دھاتوں کی اصلیت تمہیں معلوم نہیں ہوتی۔ اسی طرح قرآنی علوم کو سمجھنے والے افراد قرآن کے سمجھنے میں دوسروں کے ممد تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کے قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ قرآن کریم کا قائم مقام قرآن کریم ہی ہے۔ بڑے سے بڑا مفسر بلکہ ایک نبی بھی اس کا مؤید۔ معین اور ناصر تو ہے اُس کا قائم مقام نہیں۔ حتّٰی کہ وہ وجود جو خود قرآن تھا یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ بھی اسکا قائم مقام

نہیں ہو سکتا۔ وہ زمین جس میں یورینیم پائی جاتی ہے جس سے ایٹم بنتا ہے وہ ساری چیزوں کو نہیں جانتی۔ وہ ماں بھی بچے کو پوری طرح نہیں جانتی جس نے نو ماہ تک بچے کو پیٹ میں رکھا ہو۔ قرآن قرآن ہی ہے۔ اور انسان انسان ہی ہے۔ ہر موقعہ۔ ہر ضرورت، ہر جذبہ اور ہر فکر کی تبدیلی پر قرآن اپنے پڑھنے والے کے لئے ایک نیا روپ بدلتا ہے۔ وہ ہر متلاشی کے لئے نیا روپ بدلتا ہے۔ وہ ہر شخص کے لئے نیا دروازہ کھولتا ہے جو اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پس قرآن کریم کے ساتھ محبت اور پیار کرو اور اس پر غور اور فکر کی عادت ڈالو۔ اس کے بغیر نہ خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ صحیح اسلامی رُوح پیدا ہو سکتی ہے۔ بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے قرآن کریم کی اسی فضیلت کا اپنے ایک شعر میں اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ ؎

پہلے سمجھے تھے کہ موسیٰؑ کا عصا ہے فرقاں
پھر جو سوچا تو ہر اک لفظ مسیحا نکلا

یعنی پہلے ہم نے یہ سمجھا کہ جس طرح موسیٰؑ کا عصا ساحروں کے سانپ نگل گیا تھا۔ اسی طرح قرآن کریم بھی اپنے دلائل و براہین اور معجزات و نشانات کے ذریعہ سے دشمنانِ اسلام کے پھیلائے ہوئے جالوں کو تار تار کر دیتا ہے اور اس لحاظ سے اُسے موسیٰؑ کے عصا کے ساتھ مشابہت ہے لیکن جب ہم نے زیادہ غور کیا اور قرآن کریم کے مطالب پر گہری نگاہ ڈالی تو ہمیں نظر آیا کہ قرآن کریم موسیٰؑ کے عصا سے لاکھوں گُنا بڑھ کر ہے کیونکہ موسیٰؑ کے عصا سے تو صرف ساحروں کا بھانڈا پھوٹا اور اُن کے سانپ فنا ہوئے مگر قرآن کریم نہ صرف دشمنانِ اسلام کی سرکوبی کے لئے ہر وقت ایک چوکس اور ہوشیار جرنیل کی طرح اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے بلکہ اُسکا ایک ایک لفظ مُردوں کو زندہ کرنے والا اور اُنکے اندر زندگی کی تازہ رُوح پھونکنے والا ہے گویا موسوی عصا نے صرف اتنا کام کیا کہ دشمن کا سر پاش پاش کر دیا۔ اور اُسے روحانی لحاظ سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہُوا قرآن صرف دشمنوں کو ہلاک ہی نہیں کرتا بلکہ اُنکو از سرِ نو زندہ کر کے خدا تعالیٰ کا مقرب بھی بنا دیتا ہے۔ اور وہ صرف دفعِ شر کی ہی خاصیت اپنے اندر نہیں رکھتا بلکہ ایصالِ خیر کا پہلو بھی اُس میں بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے اور وہ مُردوں کو زندہ کرنے کی اپنے اندر طاقت رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اسی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ (انفال آیت ۲۵) یعنی اے مومنو! جب خدا اور اُس کا رسول تمہیں زندہ کرنے کے لئے آواز دے تو تم اُس کی آواز پر فوراً لبیک کہا کرو۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ قرآن کریم مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے آیا ہے بے شک اس کی تعلیم پر عمل کر کے اندھے آنکھیں پا سکتے ہیں۔ بہرے شنوا ہو سکتے ہیں۔ لنگڑے لُولے چل پھر سکتے ہیں۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر قرآن کریم میں یہ خوبی ہے کہ اس کی تعلیم پر عمل کر کے مُردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں اور اُن میں بھی ایک نئی رُوحانی حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی رُوح تھی جس نے عرب کی سرزمین میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اور وہ لوگ جو اصنام و احجار کے آگے سربسجود رہا کرتے تھے اور ہر قسم کے فواحش کے ارتکاب میں ایک لذّت اور سرور محسوس کیا کرتے تھے خدائے واحد کے ایسے پرستار ہوئے کہ انہوں نے بھیڑ بکریوں کی طرح اُس کی راہ میں اپنے سر کٹوا دیئے اور خدا تعالیٰ کے قرب میں بڑھتے چلے گئے۔ پس موسیٰؑ کا عصا اس عظیم الشان انعام کے مقابلہ میں کوئی

حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ اور جو آج بھی دشمنانِ دین کیلئے ایک برہانِ قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرا نشان جو فرعون کے دربار میں دکھایا گیا وہ یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ انہیں بالکل نورانی اور سفید دکھائی دیا۔ یہ نشان بھی بیشک بہت بڑا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تقدس اور ان کی اعلیٰ شان کو ظاہر کرتا ہے۔ اور ان برکات پر روشنی ڈالتا ہے جن کا انکے ہاتھ پر ظہور مقدر تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پہلو میں بھی ایک نمایاں فضیلت عطا فرمائی۔ چنانچہ موسیٰؑ کا تو صرف ہاتھ سفید دکھائی دیا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے سرتاپا ایک نورِ مجسّم قرار دیا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے بنی نوع انسان کو خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا کہ:۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا (نساء آیت ۱۷۵)

یعنی اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک کھلی دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک نہایت روشن نور نازل کیا ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ۔ (مائدہ آیت ۱۶) تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور اور روشن کتاب آچکی ہے۔ پس موسیٰؑ کے تو صرف ایک ہاتھ سے نورانی شعاعیں نکلتی دکھائی دی تھیں مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے سرتاپا نور کا ایک پیکر بنایا۔ اور یہ فرق اس لئے تھا کہ موسیٰؑ نے صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کا کام سرانجام دینا تھا مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے تمام دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا۔ اسلئے موسیٰؑ کا تو صرف ایک ہاتھ نور کی شکل میں دکھائی دیا۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالےٰ نے سر سے پیر تک نور ہی نور قرار دے دیا۔

پھر موسیٰؑ کا ہاتھ بیشک نورانی دکھائی دیا مگر بہرحال وہ موسیٰؑ کا ہی ہاتھ تھا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کو خدا تعالیٰ نے اپنا ہاتھ قرار دیا اور فرمایا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (فتح آیت ۱۱) یعنی وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ تیری بیعت نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالےٰ کی بیعت کرتے ہیں اور اُن کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بظاہر نہیں وہ ہاتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دکھائی دیتا ہے مگر حقیقتاً وہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے اسی طرح غزوۂ بدر میں جب آپؐ نے کفار کی طرف کنکروں کی مٹھی پھینکی اور اُس کے ساتھ ایک طوفانِ باد اُٹھا جس نے کفار کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ تو اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی۔

(انفال آیت ۱۸) اے محمد رسول اللہ! جب تُو نے کفار کی طرف کنکر پھینکے تھے تو تُو نے نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے پھینکے تھے۔ پس موسیٰؑ کا ہاتھ خواہ کس قدر نورانی نظر آیا۔ بہرحال وہ موسیٰؑ کا ہی ہاتھ تھا۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کو خدا تعالےٰ نے اپنا ہاتھ قرار دے دیا۔

پھر اگر ہاتھ کی سفیدی سے یہ اشارہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی قوم کو روحانی لحاظ سے بڑی پاکیزگی عطا فرمائے گا۔ اور وہ دین کے لئے بڑی قربانیاں کرنے والے ہونگے تو اس پہلو کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نمایاں فضیلت عطا فرمائی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام

کی قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اُسے کنعان کا ملک دیا جائیگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ساتھ لے کر مصر سے چل پڑے اور جب وہ ملک سامنے آگیا تو آپ نے اپنی قوم سے کہا کہ جاؤ اور لڑائی کر کے اِس ملک پر قبضہ کر لو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے غلطی سے یہ خیال کر لیا کہ خدا تعالیٰ نے یہ ملک ہمیں دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اس لئے وہ خود ہی اس وعدہ کو پورا کریگا اور یہ ملک ہمارے قبضہ میں دے دیگا۔ اگر ہم نے ہی اس ملک کو فتح کرنا تھا تو پھر وعدے کا کیا فائدہ۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ آیت ۲۵) کہ اے موسیٰ! تُو اور تیرا ربّ دونوں جاؤ اور دشمنوں سے لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔ جب تم ملک فتح کر کے ہمیں دیدوگے تو ہم اُس میں داخل ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کو اس قوم کی یہ بات سخت ناگوار گذری اور اُس نے کہا کہ اب چالیس سال تک تم اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے چالیس سال تک تم جنگلوں میں بھٹکتے پھرو۔ پھر اللہ تعالیٰ تمہاری نئی نسل کو اس امر کی توفیق دے گا کہ وہ اپنی جانیں قربان کر کے اس ملک میں داخل ہوں اور خدا تعالیٰ کے انعامات کے مورد ہوں۔ غرض موسیٰؑ کو وہ قوم ملی جس نے خدا تعالیٰ کا اتنا بڑا نشان دیکھنے کے باوجود کہ اُسے فرعون کی غلامی سے آزادی ملی اُسے اور اُس کی آئندہ نسلوں کو فرعونیوں کے لئے اینٹیں بنانے اور لکڑیاں کاٹنے اور ہر ذلیل سے ذلیل کام کرنے سے نجات ملی پھر بھی موسیٰؑ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور جب انہیں کہا گیا کہ اُٹھو اور اس عظیم الشان ملک پر قبضہ کر لو جس پر عاد قوم حکمران ہے تو انہوں نے کہہ دیا کہ ہم سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ تو اور تیرا ربّ دونوں جاؤ اور دشمنوں سے لڑتے پھرو۔ جب دشمن مر گیا اور ہمیں اطمینان ہو گیا کہ اب ہماری جانوں کو کوئی خطرہ پیش نہیں آئیگا تو ہم اس ملک کی حکومت سنبھال لینگے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ صحابہؓ عطا فرمائے جنہوں نے موسیٰؑ کے ساتھیوں کی طرح کسی ایک مقام پر بھی یہ نہیں کہا کہ ہم اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ وہ آپؐ کے دائیں بھی لڑے اور بائیں بھی لڑے۔ اور آگے بھی لڑے اور پیچھے بھی لڑے۔ اور انہوں نے ہر نازک سے نازک مقام پر اپنی فدائیت اور جاں نثاری کو ثابت کر دیا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ ابوسفیان ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام کی طرف سے آرہا ہے اور راستہ میں تمام قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اُکساتا چلا آتا ہے۔ قافلہ کا راستہ بھی مدینہ کے پاس سے گذرتا تھا اور گو ایسا قریب تو نہیں تھا مگر مکہ کی نسبت مدینہ سے زیادہ قریب تھا۔ تمام قبائل جو مدینہ کے گرد رہتے تھے وہ شام سے آنے والے قافلہ سے ملتے اور تجارتی چیزوں کا آپس میں تبادلہ کرتے تھے۔ اِس لئے شام سے جو قافلہ آتا اُسکے تعلقات مدینہ کے تمام قبائل سے ہو جاتے تھے اور چونکہ اُس قافلہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو اُکساتے اور اشتعال دلاتے تھے اسلئے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ علم ہوا کہ ابوسفیان قافلہ کو لے کر مدینہ کے پاس سے گذر رہا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مکہ والے بھی اِس خیال سے کہ قافلہ پر مدینہ والے حملہ نہ کریں کچھ لشکر لے کر نکلے ہیں تو آپؐ نے اپنے دوستوں سے مشورہ لیا کہ اگر ہم مدینہ میں بیٹھے رہے تو دشمن دلیر ہو جائیگا۔ ہمیں آگے چلنا چاہیئے تاکہ دشمن یہ نہ سمجھے کہ ہم اُس سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ صحابہؓ کی

اس جماعت کو لے کر مدینہ سے باہر تشریف لے گئے اور
بدر کے مقام پر پہنچے۔ الٰہی اشارات سے آپ کو معلوم ہو
چکا تھا کہ مکہ سے ایک لشکر آرہا ہے جس کے ساتھ مسلمانوں
کا مقابلہ ہوگا۔ لیکن آپؐ کو یہ اجازت نہیں تھی کہ آپؐ
اس خبر کو ظاہر کریں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ سے بہت کم
لوگ آپؐ کے ساتھ گئے۔ کیونکہ وہ اسے لڑائی نہیں
سمجھتے تھے بلکہ صرف جرأت کے اظہار کا ایک موقعہ سمجھتے
تھے۔ بدر کے مقام کے قریب جاکر آپؐ نے مناسب سمجھا
کہ اب یہ بات ظاہر کردی جائے۔ چنانچہ آپؐ نے لوگوں
کو جمع کیا۔ اور فرمایا۔ اے لوگو! مجھے خدا نے کہا ہے کہ
دشمن کا لشکر قریب آگیا ہے اور بجائے اس کے کہ قافلہ سے
لڑائی ہو شاید اسی سے لڑائی ہو جائے۔ تمہاری اس بارہ
میں کیا رائے ہے؟ مہاجرین یکے بعد دیگرے کھڑے ہونے
شروع ہوئے اور انہوں نے کہا۔ یارسول اللہ! ہم لڑنے
کے لئے تیار ہیں۔ لیکن انصار خاموش رہے۔ وہ اس لئے
خاموش رہے کہ جو فوج آرہی تھی اس میں مہاجرین کے بھائی
بہنوئی۔ سالے بیٹے اور تائے وغیرہ اور اسی طرح اور
قریبی رشتہ دار تھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ اگر ہم نے
کہا۔ ہم لڑنے کے لئے تیار ہیں تو مہاجرین سمجھیں گے کہ ہمیں
ان کے رشتہ داروں سے لڑنے کا شوق ہے پس انکی
دلجوئی اور مہمانوں کی عزت کی وجہ سے سب انصار خاموش
رہے۔ مہاجرین یکے بعد دیگرے اٹھتے اور اٹھ اٹھ کر
قربانی کی رغبت ایثار اور فدائیت کے جوش کا اظہار
کرتے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر صحابیؓ کی تقریر
کے بعد فرماتے۔ اے لوگو! مجھے مشورہ دو۔ جب متواتر
آپؐ نے یہ بات دہرائی تو ایک انصاری اٹھے اور
انھوں نے کہا۔ یارسول اللہ! آپ کو مشورہ تو دیا
جا رہا ہے لیکن باوجود مشورہ پیش کئے جانے کے آپؐ
یہی فرماتے ہیں کہ اے لوگو مشورہ دو۔ شاید آپ کی
مراد لوگوں سے ہم انصار ہیں کہ ہم بھی مشورہ دیں۔
ورنہ مشورہ تو آپ کو مل ہی رہا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ٹھیک ہے۔ میری یہی مراد تھی۔
اس صحابیؓ نے کہا۔ یارسول اللہ! ہم نے آپؐ سے مکہ
میں ایک معاہدہ کیا تھا اور اقرار کیا تھا کہ اگر دشمن
مدینہ پر حملہ آور ہوا تو ہم ہر طرح اس کا مقابلہ کریں گے
لیکن مدینہ سے باہر اگر لڑائی ہوئی تو ہم اس معاہدہ کے
پابند نہیں ہونگے۔ کیونکہ ہمارے اندر اتنی طاقت نہیں
کہ سارے عرب سے لڑسکیں۔ شاید آپ جو بار بار ہم
سے مشورہ چاہتے ہیں تو آپؐ کا اشارہ اس معاہدہ کی
طرف ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ٹھیک ہے۔ اس انصاری
نے یہ بات سنکر بڑے جوش سے رسول کریم صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! جب
آپؐ سے ہم نے مکہ میں وہ معاہدہ کیا تھا اس وقت
تک آپؐ کا مقام ہم پر پوری طرح روشن نہیں ہوا تھا۔
صرف ایک محدود روشنی ہمیں ملی تھی اور ہم شرطیں باندھنے
میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے لیکن یارسول اللہ! اس کے
بعد حقیقتِ اسلام ہم پر پوری طرح کھل چکی ہے اور
آپؐ کی صداقت کو ہم نے پوری طرح پرکھ لیا ہے۔ اس
صداقت کے روشن ہوجانے اور پرکھنے کے بعد کیا اب
بھی کوئی شرط باقی رہ سکتی ہے۔ اب تو شرطوں کا سوال
ہی نہیں یارسول اللہ! اگر آپؐ ہمیں حکم دیں کہ تم اپنے
گھوڑوں اور سواریوں کو سمندر میں ڈال دو تو ہم بغیر کسی
ہچکچاہٹ کے سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں گے
اور یارسول اللہ! اگر یہیں جنگ ہوئی تو دشمن گو طاقتور
ہے اور تعداد میں بہت زیادہ ہے۔ مگر ہم آپؐ کے دائیں
بھی لڑینگے اور بائیں بھی لڑیں گے۔ آگے بھی لڑیں گے اور
پیچھے بھی لڑینگے اور خدا کی قسم! دشمن آپؐ تک نہیں پہنچ سکتا
جب تک وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گذرے۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۵﴾ يُّرِيْدُ

اِس پر فرعون نے اپنے اردگرد کے سرداروں سے کہا یہ تو کوئی بڑا واقف کار جادوگر ہے - یہ چاہتا ہے کہ

اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖۗ فَمَاذَا

اپنے جادو کے ذریعہ سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے - پس بتاؤ تم کیا

تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي

مشورہ دیتے ہو - انہوں نے کہا - اس کو اور اس کے بھائی کو کچھ دن ڈھیل دے - اور مختلف شہروں کی طرف

الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۸﴾

آدمی بھیجو جو (قابل آدمیوں کو) جمع کر سکیں - (اور) ہر بڑے جادوگر اور بڑے جاننے والے کو تیرے پاس لے آئیں -

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۹﴾ وَّ

اِس پر سب جادوگر ایک معلوم دن پر جمع کئے گئے - اور

قِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۴۰﴾ لَعَلَّنَا

لوگوں سے کہا گیا - کیا تم سب (ایک مقصد پر) اکٹھے ہونے کے لئے تیار ہو (کہ نہیں) - تاکہ اگر

یہ وہ نمونہ ہے جو صحابہؓ نے دکھایا اور پھر مُونہہ کی باتوں تک ہی انہوں نے اپنے جذبۂ اخلاص کو محدود نہیں رکھا بلکہ عملی رنگ میں بھی وہ رات اور دن اسلام کے لئے قربانیاں کرتے رہے اور انہوں نے ایسی جاں نثاری کا نمونہ دکھایا کہ سر ولیم میور "لائف آف محمدؐ" میں غزوۂ احزاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس جنگ میں کفار کا اتنا بڑا لشکر جمع ہوا تھا کہ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا شکست کھا جانا بالکل یقینی امر تھا۔ مگر اتنے بڑے لشکر کے باوجود کفار کو جو کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اُسکی وجہ صرف یہی تھی کہ کفار سے ایک سیاسی غلطی ہوئی۔ اور وہ یہ کہ جب وہ خندق پار کر کے آگے آجاتے تو وہ اپنی بیوقوفی سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ کی طرف بڑھنا شروع کر دیتے تھے مگر محمد رسول اللہ کے صحابہؓ آپ پر اتنے فدا تھے کہ جب وہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا منشاء یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کریں تو مرد عورتیں اور بچے پاگلوں کی طرح دشمن کے لشکر کے سامنے آجاتے تھے اور وہ شکست کھانے پر مجبور ہو جاتا تھا - اگر وہ یہ بیوقوفی نہ کرتے کہ محمد رسول اللہ کے خیمہ کی طرف رجوع کرتے تو ممکن ہے انکو احزاب میں فتح ہو جاتی - غرض صحابہؓ نے اپنے عشق کا جو نمونہ دکھایا موسیٰ کی جماعت کا نمونہ اس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا - پس محمد رسول اللہ کا ید بیضاء موسیٰ

نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

جادوگر غالب ہو جائیں تو ہم اُن کے کہنے پر چلیں۔ ۵۹

کے ید بیضاء سے افضل ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عصائے قرآنی موسیٰؑ کے عصا پر ہر لحاظ سے فضیلت رکھتا ہے۔

۵۹ حل لغات:۔ اَرْجِهْ: اَرْجَهَ الْاَمْرَ کے معنے ہیں اَخَّرَهٗ عَنْ وَقْتِهٖ کسی معاملہ کو اُس کے وقت سے پیچھے ہٹا دیا (اقرب) اَرْجِهْ امر کا صیغہ ہے اس لئے اس کے معنے ہونگے۔ پیچھے ہٹا دے۔ یعنی ڈھیل دے دے۔

مِیْقَاتٌ: مطلق وقت کو بھی کہتے ہیں۔ اور اُس وقت کو بھی کہتے ہیں جو کسی چیز کے لئے مقرر کیا جائے نیز اس کے معنے ہیں اَلْمَوْعِدُ الَّذِیْ جُعِلَ لَهٗ وَقْتٌ وہ وعدہ جس کے لئے کوئی وقت مقرر کیا جائے۔ وَقَدْ يُسْتَعَارُ لِلْمَوْضِعِ الَّذِیْ جُعِلَ وَقْتًا لِلشَّیْءِ اور کبھی اُس جگہ کو بھی میقات کہہ دیتے ہیں جو کسی کام کے سرانجام دینے کے لئے مقرر کی جائے (اقرب)

تفسیر:۔ جب فرعون نے موسوی عصا اور ید بیضاء کا نشان دیکھا تو چونکہ وہ دینی علوم سے بے بہرہ تھا اُس نے یہ نہ سمجھا کہ یہ ایک کشف ہے جس میں اردگرد کے لوگوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے بلکہ سمجھا کہ شاید یہ کوئی جادوگر ہے جو اپنے فن میں بڑا مشاق ہے اور چونکہ جادوگر روحانی آدمی نہیں ہوتا اس لئے خیال کیا کہ ضرور اس جادو کے پیچھے کوئی غرض ہوگی اور وہ غرض اُس نے یہ نکالی کہ یہ ہم کو اپنے ملک سے نکالنا چاہتا ہے اس بیوقوف نے یہ نہ سوچا کہ تھوڑی ہی دیر پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس سے کہہ چکے تھے کہ میں تیرے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے تو جو شخص بنی اسرائیل کو مصر سے نکالنے کی خواہش کرتا ہے وہ قبطیوں کو جو اُس کی مخالف قوم تھے مصر سے نکالنے کا کس طرح ارادہ کر سکتا ہے؟ یہ دونوں باتیں تو متضاد ہیں۔ اگر بنی اسرائیل نکل جاتے تو قبطیوں کے پاؤں اور بھی مضبوط ہو جاتے۔ بنی اسرائیل کے نکالنے کی خواہش سے قبطیوں کے نکالنے کا ذکر کہاں سے نکلا؟ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے درباریوں کے ہوش کچھ ٹھکانے تھے انہوں نے سمجھ لیا کہ بادشاہ بے تُکی باتیں کر رہا ہے موسیٰؑ کی باتوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی قوم کو نکالنا چاہتا ہے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ قبطیوں یعنی قوم فرعون کو نکالنا چاہتا ہے اس لئے انہوں نے کہا اس کو اور اس کے بھائی کو ابھی ڈھیل دیجیئے۔ اور اردگرد آدمی بھیجیئے کہ وہ تمام بڑے بڑے ساحروں کو جمع کریں۔ اگر یہ واقعہ میں ساحر ہے نبی نہیں تو یہ اُن سے ہار جائیگا۔ اور اس کا دعویٰ باطل ثابت ہو جائیگا۔ چنانچہ لوگوں کو اعلان کر کے جمع کیا گیا اور انہیں کہہ دیا گیا کہ اگر ساحر غالب رہے تو ہم اُنکے پیچھے چل پڑیں گے۔ یہ فقرہ بتا رہا ہے کہ کفار کی ذہنیت کیسی پست ہوتی ہے۔ چونکہ اُن کے دل خدا تعالیٰ کی خشیت سے بالکل خالی ہوتے ہیں اسلئے وہ نبی کو ماننے کے لئے تو کسی صورت میں بھی تیار نہیں ہوتے لیکن ان کا مخالف تھوڑی سی بھی کامیابی حاصل کرے تو اُس کے پیچھے چلنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ قوم فرعون کی اسی افسوسناک ذہنیت کا قرآن کریم نے ایک اور مقام پر ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے کہ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ

اَرْجِهْ

مِیْقَات

اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ۝ (ھود ع ۹) یعنی ہم نے موسیٰؑ کو ہر قسم کے نشانات اور روشن دلائل دے کر فرعون اور اُس کی قوم کے بڑے بڑے عمائد کی طرف بھیجا۔ لیکن بجائے اِس کے کہ لوگ موسیٰؑ کی پیروی کرتے انہوں نے فرعون کی پیروی کی۔ حالانکہ فرعون کی جو تعلیم تھی وہ صحیح راستہ دکھانے والی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی جو گمراہی کی طرف لے جانے والا تھا اسکی بات تو انہوں نے مان لی اور جو ہدایت کی طرف لے جانے والا تھا اُسکی بات نہ مانی۔

بد قسمتی سے یہی طریق ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوئے تو آپ نے جو تعلیم دی وہ بنی نوع انسان کو فلاح اور کامیابی کے مقام تک پہنچانے والی تھی مگر آپ کے وطن کے لوگوں نے اُس کا انکار کر دیا اور پہلے تو ابوجہل کے پیچھے چلے جو فرعون کا ایک روحانی قائم مقام تھا اور اس کی ہر گندی اور فساد پھیلانے والی تعلیم کو انہوں نے قبول کر لیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کو رد کر دیا آپؐ کے بعد بھی یہی ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو صحابہؓ آپ پر ایمان لے آئے مگر سارے عرب نے بغاوت کر دی اور انہوں نے وہی طریق اختیار کیا جو ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے اختیار کیا تھا اور اس وقت کے فراعنہ کے پیچھے چل پڑے۔ اُس وقت کے فرعون مسیلمہ کذّاب۔ اسود عنسی اور سجاح وغیرہ تھے۔ جنہوں نے جھوٹے طور پر نبوت کا دعویٰ کر دیا اور لوگ اُن کے متبع ہو گئے۔ مگر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا جانشین تھا اور لوگوں کے اندر اسلامی روح پیدا کرنے والا تھا اُس کو چھوڑ دیا۔ پھر آپؐ کے بعد حضرت عمرؓ کو خدا تعالیٰ نے خلیفہ بنایا۔ تب بھی یہی ہوا۔ حضرت عمرؓ اپنی وفات کے قریب حج کے لئے گئے تو بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ عمرؓ مر جائینگے تو ہم فلاں کو خلیفہ بنائیں گے اور کسی کی بیعت نہیں کرینگے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے ماتحت حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو اُن کے زمانہ میں بھی عبداللہ بن سبا جیسے لوگوں نے فتنہ کھڑا کر دیا۔ یہ شخص بھی مصری تھا جیسا کہ فرعون مصری تھا اور لوگوں نے اُس کی بات ماننی شروع کر دی۔ اُن کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے۔ تب بھی لوگوں نے یہی طریق اختیار کیا۔ پہلے تو حضرت علیؓ کو خلیفہ بننے پر مجبور کیا گیا اور پھر ایک چھوٹا سا عذر کر کے کہ معاویہؓ سے صلح کیوں کی انہی لوگوں نے جنہوں نے آپ کو خلافت کے لئے کھڑا کیا تھا بغاوت کر دی اور خوارج کے نام سے الگ ہو گئے۔ اور انہوں نے دو صدیوں تک اسلام میں وہ تہلکہ مچایا کہ لوگوں کا امن بالکل برباد ہو گیا۔ اسی طرح جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر ایک لمبا عرصہ گذر گیا اور اُمتِ محمدیہ میں مختلف اولیاء پیدا ہوئے۔ تب بھی یہی ہُوا کہ لوگوں نے اُن کی نہ سُنی بلکہ اُن کے دشمنوں کی سُنی جو اپنے وقت کے فرعون تھے اور اُن کے پیچھے چل پڑے۔ چنانچہ حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ۔ حضرت قطب الدین صاحب بختیار کاکیؒ۔ حضرت نظام الدین صاحب دلیؒ اور حضرت خواجہ فرید الدین صاحب گنج شکرؒ وغیرہ کی بھی مخالفت ہوئی۔ حضرت سید احمد صاحب سرہندیؒ آئے تو لوگوں نے جہانگیر کے کان بھرنے شروع کر دیئے کہ یہ شخص حکومت کا باغی ہے اسے جلدی سنبھالیں ورنہ سخت فتنہ پیدا ہو جائیگا۔ چنانچہ جہانگیر نے انہیں گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ مگر پھر بعض لوگوں نے انہیں سمجھایا کہ یہ بزرگ انسان ہے اسے رہا کر دو۔ چنانچہ اُس نے دانائی سے کام لے کر انہیں رہا کر دیا۔

غرض جب سے اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور خلفاء کا سلسلہ جاری ہے صداقت کی ہمیشہ مخالفت ہوتی چلی آئی ہے۔ یہی مخالفت کا جذبہ فرعون اور اُس کی قوم

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا

پس جب جادوگر آگئے تو انہوں نے فرعون سے کہا کہ اگر ہم غالب ہوئے تو کیا ہمیں کوئی

نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۳﴾

انعام بھی ملیگا؟ (فرعون نے) کہا۔ ہاں: بلکہ اُس صورت میں تم دربار میں مقربین میں جگہ پاؤ گے۔ ؎۱۰

کے اکابر کے دل و دماغ پر بھی حاوی تھا چنانچہ انہوں نے لوگوں کو جمع کیا۔ مگر انہیں یہ کہنے کی توفیق نہ ملی کہ اگر اس مقابلہ کے نتیجہ میں موسیٰؑ غالب آگیا تو ہم موسیٰؑ کے پیچھے چل پڑینگے اور اُس کی بات مان لیں گے۔ بلکہ انہوں نے اگر لوگوں کے کان میں کوئی بات ڈالی تو صرف یہی کہ اگر جادوگر غالب آگئے تو ہم اُن کے پیچھے چل پڑینگے۔ حالانکہ مقابلہ میں اِس بات کا بھی امکان تھا کہ موسیٰؑ جیت جاتے اور جادوگر ہار جاتے مگر باوجود اِس کے کہ دونوں پہلو اُن کے سامنے موجود تھے اور وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اگر جادوگر غالب آگئے تو ہم جادوگروں کی بات مان لینگے اور اگر موسیٰؑ غالب آیا تو ہم موسیٰؑ کی بات مان لیں گے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اگر جادوگر غالب آئے تو ہم اُن کے پیچھے چل پڑیں گے اور اِس طرح انہوں نے اپنے دلوں کے بغض اور عناد کا اظہار کر دیا۔ اور بتا دیا کہ انہیں صداقت سے کوئی غرض نہیں وہ صرف فرعون کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اِسی غرض کے لئے وہ اِس مقابلہ کا انتظام کر رہے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ جیسے عظیم الشان نبی کے مقابلہ میں اُنکا ساحروں کو بلانا یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء کی ابتدائی حالت کتنی کمزور ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اور آپ فرعون کو تبلیغ کرنے کیلئے گئے تھے مگر وہ انہیں اتنا حقیر سمجھتا تھا کہ اُن کے مقابلہ کے لئے اُس نے مداریوں کو بلا کر کھڑا کر دیا۔ مگر کجا وہ حالت اور کجا یہ کہ آج حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کو دنیا میں اتنی طاقت حاصل ہے کہ بڑی بڑی سلطنتیں اُس کی ناراضگی سے ڈرتی ہیں۔ آج امریکہ جیسی طاقت اُن کی پیٹھ پر ہے اور فلسطین میں اُن کی حکومت قائم ہے لیکن اُس وقت اتنی کمزوری کی حالت تھی کہ فرعون مداریوں کو بلا کر آپ کے مقابلہ پر کھڑا کر دیتا ہے۔ آج اگر ہندو یا عیسائی کسی مسلمان عالم کے مقابل پر بھی مداری کھڑا کر دیں تو تمام لوگ شور مچانا شروع کر دیں گے کہ اِن کی ہتک کی گئی ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اِس خیال سے کہ شاید اللہ تعالیٰ انکو اِسی راہ سے ہدایت دیدے مقابلہ سے انکار نہ کیا۔ اور مداریوں کے مقابلہ میں بھی کھڑے ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔ لیکن اب اگر وہی فرعون دوبارہ زندہ کیا جائے تو مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ایک بندر سے بھی زیادہ ذلیل سمجھے اور یہ دیکھ کر حیران ہو کہ اُس کی نسل کا تو دُنیا میں کہیں نشان بھی نظر نہیں آتا اور موسیٰؑ کی قوم فلسطین پر حکومت کر رہی ہے۔

؎۱۰ **تفسیر**:۔ جب جادوگر آگئے تو انہوں نے فرعون سے کہا کہ اگر ہم غالب آئے تو کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملیگا؟ اِس آیت سے نبی اور غیر نبی کی طبیعت کا فرق معلوم ہو جاتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتیں جو اوپر گذر چکی ہیں اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا اور ساری دُنیا کو پالنے والا صرف خدا تعالیٰ کو قرار دیتے تھے کسی بندے پر اپنی نگاہ نہیں رکھتے تھے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ

اِس پر موسیٰؑ نے اُن سے کہا جو تدبیر تم نے کرنی ہے کر لو - اِس پر انہوں نے اپنی رسّیاں اور اپنے

عِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۵﴾

سونٹے (میدان میں نکال کر) رکھ دیئے اور کہا - فرعون کے اقبال کی قسم ہم ضرور غالب آئیں گے - ۵۱۱

لیکن جو مداری فرعون نے اُن کے مقابلہ کے لئے جمع کئے تھے اُن کی نظریں اتنی نیچی اور ان کے حوصلے اتنے پست تھے کہ بادشاہ کے دربار میں آتے ہی بول پڑے کہ حضور اگر ہم جیت گئے تو کیا کوئی انعام بھی ملیگا یا نہیں - یہی مضمون سورۂ اعراف میں بھی بیان کیا گیا ہے لیکن وہاں طرزِ کلام بدل دی گئی ہے - وہاں یہ الفاظ آتے ہیں کہ اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ (اعراف ع) اگر ہم غالب آئے تو ہم کو ضرور اجر ملیگا - مگر یہاں یہ کہا گیا ہے کہ اگر ہم غالب آئے تو کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملیگا یا نہیں - گویا بظاہر دونوں میں اختلاف دکھائی دیتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ان دونوں آیتوں میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں - بیشک یہاں سوالیہ فقرہ استعمال کیا گیا ہے - مگر اس سوالیہ فقرہ کے یہ معنے نہیں کہ انکو اجر ملنے کے متعلق کوئی شبہ تھا بلکہ بعض دفعہ سوالیہ فقرہ توقع کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے - یعنی مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ ضرور ملیگا مگر کہنے والا کہتا یہ ہے کہ کیا کچھ ملیگا بھی؟ پس سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء کی آیتوں میں کوئی تضاد نہیں - مداریوں کے انعام کی خواہش ظاہر کرنے پر فرعون نے کہا - ہاں ہاں انعام تو ملیگا اور اس کے علاوہ تم میرے مقرّب بھی ہو جاؤ گے -

۵۱۱ تفسیر:- جب فرعون اور آنے والے ساحروں میں بات چیت ہو چکی تو حضرت موسےٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم نے جو کچھ میرے مقابلہ میں پھینکنا ہے پھینکو -

اسجگہ بھی سورۂ اعراف سے ایک اختلاف دکھائی دیتا ہے جس کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے - اور وہ یہ کہ سورۂ اعراف میں یہ لکھا ہے کہ مداریوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ (اعراف ع) یعنی پہلے آپ پھینکیں گے یا ہم پھینکیں - حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا پہلے تم پھینکو - لیکن اس آیت میں مداریوں کے سوال کا کوئی ذکر ہی نہیں - صرف حضرت موسیٰؑ کا قول درج ہے کہ تم نے جو کچھ پھینکنا ہے پھینک لو - لیکن یہ بھی کوئی اختلاف نہیں بلکہ اس موقعہ کے مناسب یہی کلام تھا - درحقیقت سورۂ اعراف میں مداریوں کا یہ یقین ظاہر کیا گیا ہے کہ ہم کو ضرور اجر ملیگا - اس یقین کے مطابق انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ پہلے آپ پھینکیں گے یا پہلے ہم پھینکیں - لیکن سورۂ شعراء میں وہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن میں توقع کا پہلو غالب ہے یقین کا پہلو اتنا نمایاں نہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے کلام کی مناسبت کے لحاظ سے مداریوں کا سوال حذف کر دیا اور صرف حضرت موسیٰؑ کا قول نقل کر دیا - کہ میری نسبت پھر دیکھا جائیگا پہلے تم اپنی اُمید پوری کر لو - اور جو کچھ پھینکنا ہے پھینک لو - چنانچہ مداریوں نے اپنی رسّیاں اور سونٹے پھینک دیئے اور فرعون کو خوش کرنے کیلئے کہا کہ فرعون کے اقبال سے

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۶﴾

تب موسیٰؑ نے بھی اپنا عصا دے مارا۔ تو اچانک وہ اُن کے جھوٹوں کو ملیا میٹ کرنے لگا۔

فَاُلْقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۷﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۸﴾

تب جادوگر (خدا کے سامنے) سجدہ میں گرا دیئے گئے۔ (اور) انہوں نے کہا۔ہم رب العالمین پر جو موسیٰ اور

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۹﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ

ہارون کا رب ہے ایمان لاتے ہیں۔اس پر وہ (یعنی فرعون جھنجھلا کر) بولا کہ کیا میرے حکم دینے سے پہلے تم ایمان لے آئے ہو؟

ہم ہی غالب رہینگے۔ یہ الفاظ جو مداریوں کی زبان سے قرآن کریم میں استعمال کئے گئے ہیں قرآن کریم کی سچائی اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر زبردست شاہد ہیں عیسائی پادری ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی کتاب ہے۔ہم تو اُن کے اِس اعتراض کو غلط سمجھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے جو گذشتہ اور موجودہ اور آئندہ آنے والے زمانوں کے تمام حالات کو خوب جانتا ہے لیکن اگر دشمن کے قول کے مطابق قرآن کریم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہی کلام قرار دیا جائے تب بھی ماننا پڑے گا کہ آپ کا ادبی کمال انتہا کو پہنچا ہوا تھا اور آپ کے معلومات کی وسعت کا کوئی ٹھکانا نہ ہی نہیں تھا کیونکہ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب فرعون نے مصر کے جادوگروں کو موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے بلایا تو اُس وقت انہوں نے کرتب دکھاتے وقت یہ الفاظ کہے کہ بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ۔ فرعون کے اقبال کی قسم ہم ضرور غالب آئیں گے۔اور یہ فقرات ایسے ہیں جو عربوں کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی نہیں آسکتے تھے۔کیونکہ عرب میں کوئی مداری نہیں تھے جن سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ فقرہ سنکر سمجھ لیتے کہ مداری کرتب دکھاتے وقت ہمیشہ اِس قسم کے الفاظ کہا کرتے ہیں۔پس وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ قرآن کریم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بنایا ہوا ہے انہیں سوچنا چاہیئے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جہاں مداریوں اور ہتھکنڈے کرنے والوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔پھر یہ فقرہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کس نے بتایا۔میں نے عرب کی تاریخ کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔اس کی تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ عرب لوگ شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور گلہ بانی کرنا اُن کا پیشہ تھا لیکن مداریوں اور ہتھکنڈے کرنے والوں کا ان کی تاریخ میں کہیں ذکر نہیں آتا۔وہ مصر اور ہندوستان وغیرہ میں پائے جاتے تھے مگر ان ممالک میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کبھی گئے ہی نہیں پھر آپ کو یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ مداری جب کھیل دکھاتے ہیں تو وہ یہ فقرہ کہتے ہیں۔میں نے خود بعض مداریوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ کھیل شروع کرتے ہیں تو دیکھنے والوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ آپ کے اقبال سے ایسا ہو جائیگا۔اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے مداریوں نے کہا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ۔ فرعون کے اقبال کی قسم۔ لیکن عرب کی تاریخ میں کوئی محاورہ میں نے آج تک ایسا نہیں دیکھا۔

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬

یہ (شخص) یقیناً تمہارا کوئی سردار ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔ پس عنقریب تم (اپنا انجام) معلوم کر لوگے

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ

میں تمہارے ہاتھوں اور پیروں کو (اپنی) خلاف ورزی کی وجہ سے کاٹ دونگا اور تم سب کو صلیب پر

اَجْمَعِيْنَ ۝۵۰ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝۵۱

لٹکا دوں گا۔ انہوں نے کہا (اس میں) کوئی حرج نہیں۔ آخر کار ہم اپنے ربّ کی طرف ہی لوٹ کر جانیوالے ہیں

اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَاۤ اَنْ

ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا ربّ ہمارے گناہ اس وجہ سے معاف کر دے گا کہ ہم

كُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۲ ع

سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے بن گئے ١٢

٣ ع ٧

جس میں یہ کہا گیا ہو کہ ہم یہ کام فلاں کے اقبال سے شروع کرتے ہیں۔ پس یہ فقرہ صاف بتاتا ہے کہ قرآن کریم خدا تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے لیکن اگر یہ فقرہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نہیں بتایا بلکہ نعوذ باللہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خود بنالیا تھا تب بھی یہ آپؐ کا اتنا بڑا کمال ہے کہ جسکی مثال نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ بعینہٖ اسی رنگ کا فقرہ ہے جو مداری اب بھی کہتے ہیں۔ مگر یہ کتنی ہنسی کی بات ہے کہ ایک طرف تو وہ خدا تعالیٰ کے نبی پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم یقیناً غالب آجائیں گے اور دوسری طرف جس کی خاطر تماشا دکھا رہے ہیں اُس کی تعریف کرتے چلے جاتے ہیں کہ آپ کے اقبال سے ایسا ہو جائیگا تاکہ کچھ زیادہ پیسے مل جائیں۔

١٢ حل لغات: - تَلْقَفُ ۔ لَقِفَ سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور لَقِفَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں تَنَاوَلَہٗ بِسُرْعَةٍ اُسکو جلدی سے پکڑ لیا (اقرب) پس تَلْقَفُ کے معنے ہونگے جو کام جادوگر کر رہے تھے اُس کو جلدی جلدی لپیٹ کرنے لگا۔

خِلَافٍ: خِلَافٌ کے معنے مخالفت کے بھی ہیں۔ اور اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں یا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں (اقرب)

ضَيْرَ: اَلضَّيْرُ کے معنے اَلْمَضَرَّةُ کے ہیں یعنی نقصان (مفردات)

تفسیر: - جب مداریوں نے اپنی رسیاں اور سونٹے پھینک دیئے تو موسیٰؑ نے بھی اپنا عصا اُٹھا کر دے مارا۔ اور چونکہ ان رسیوں اور سونٹوں میں انہوں نے

تَلْقَفُ

خِلَافٍ

ضَيْرَ

پارہ بھر رکھا تھا جس سے وہ ہلتی تھیں۔ اِس لئے جب موسیٰؑ کا سونٹا اُن کو زور سے لگا تو اُن میں سوراخ ہو گئے اور اُن کا سارا فریب کھل گیا۔ گویا تمثیلی زبان میں موسیٰؑ کا سونٹا اُن کے فریب کو کھا گیا جس پر مداری جو اپنی حقیقت کو خوب جانتے تھے۔ سجدے میں گر گئے اور چلّا اٹھے کہ ہم ربّ العالمین خدا پر جو موسےٰؑ اور ہارونؑ کا خدا ہے ایمان لاتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ موسیٰؑ نبی ہے اور ہم محض مداری ہیں۔

اسجگہ اُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سَاجِدِیْنَ کے الفاظ فرما کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جادوگروں کی یہ شکست ایسی نمایاں تھی کہ انہیں یوں محسوس ہُوا کہ گویا کسی خفیہ طاقت نے اُن کے پاؤں تلے سے زمین نکال لی ہے اور وہ خدا کے سامنے سجدہ میں گرا دیئے گئے اور انہوں نے بلند آواز سے اِس امر کا اقرار کیا کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کی اتباع کرتے ہیں۔

اِس پر فرعون غصّہ میں آگیا اور اُس نے کہا کہ کیا تم میری اجازت سے پہلے اس پر ایمان لے آئے ہو۔ معلوم ہوتا ہے یہ تمہارا سردار ہے جس نے تم کو مداریوں کا فن سکھایا ہے۔ پس تم جلدی ہی اپنے اِس فعل کا نتیجہ دیکھ لوگے۔ گویا اتنی جلدی وہ بھول گیا کہ ابھی تو میں انکو خدا کے ایک نبی کے مقابلہ میں کھڑا کر رہا تھا اور اُن کو اپنا مقرّب بنانے کی پیشکش کر رہا تھا اور ابھی اُن کو اتنا ذلیل قرار دے رہا ہوں کہ جو چاہوں اُن کو سزا دے لوں۔ چنانچہ بولا کہ چونکہ تم میرے مخالف چل پڑے ہو۔ اِس لئے اس جرم کی وجہ سے مَیں تمہارے ہاتھ اور پیر کاٹ دونگا اور پھر تم سب کو صلیب پر لٹکا دونگا تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ مگر وہ پیسے لیکر تماشا دکھانے والے مداری اب مومن بن چکے تھے۔ وہ فرعون جیسے لوگوں کی دھمکیوں سے کب مرعوب ہو سکتے تھے۔ انہوں نے جھٹ کہا۔ اِس میں کوئی حرج نہیں ہم نے ایک دن اپنے ربّ کی طرف لوٹ کر جانا ہی ہے اگر تمہارے ہاتھ سے مارے گئے تو کونسی بڑی بات ہے اگر تم نے ہم کو مارا تو ہمارا فائدہ ہی ہے۔ دین کی خاطر دُکھ اُٹھانے کی وجہ سے ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دیگا کیونکہ ہم ایسے بُرے ماحول میں سب سے پہلے خدا تعالےٰ کے نبی پر ایمان لائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کسی انسان کو خدا نظر نہیں آتا دُنیا کی مصیبتیں اُسے پہاڑ اور اس کے ابتلاء اسے بے کنار سمندر نظر آتے ہیں۔ مگر جب خدا نظر آجاتا ہے تو اُسکی نگاہ میں ساری چیزیں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ تب ایک ہی چیز اُسکے سامنے ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کا قول پورا ہو اور خدا کے قول کے مقابلہ میں نہ حکومتیں کوئی حقیقت رکھتی ہیں نہ بادشاہتیں کوئی حقیقت رکھتی ہیں اور نہ جائیدادیں کوئی حقیقت رکھتی ہیں۔ وہ ہنستا ہُوا جاتا اور اپنی قربانی پیش کر کے خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہو جاتا ہے۔ ہماری جماعت کے صاحبزادہ عبد اللطیف صاحبؓ ہمارے جیسے ہی ایک انسان تھے۔ مگر جب بادشاہ نے اُن کو بلا کر کہا کہ دیکھیں مولوی صاحب میرے دل میں آپ کا بڑا ادب ہے اور مَیں آپ کو رہا کرنا چاہتا ہوں لیکن اگر یونہی چھوڑ دوں تو مولوی میرے مخالف ہو جائیں گے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ جب آپ سے پوچھا جائے کہ کیا آپ قادیانی ہیں تو آپ خواہ دل میں کچھ عقائد رکھیں زبان سے کہہ دیں کہ مَیں قادیانی نہیں ہوں اِس طرح میں آپ کو آسانی سے چھوڑ سکوں گا۔ حضرت صاحبزادہ عبد اللطیفؓ صاحب نے کہا۔ بادشاہ تمہیں جان کی قیمت معلوم ہوتی ہوگی۔ مجھے تو اس کی کوئی قیمت معلوم نہیں ہوتی اور مَیں تو یہ قربانی پیش کرنے کے لئے ہی تمہارے پاس آیا ہوں۔

مجھے تو پہلے ہی کہا گیا تھا کہ مَیں احمدیت کا اظہار نہ کروں
مگر مَیں نے انکار کر دیا۔ دراصل وہ گورنر جس کے سامنے
وہ پہلی دفعہ پیش ہوئے۔ وہ بھی اُنکے شاگردوں میں سے
تھا۔ جب آپ اُس سے ملے تو اُس نے بھی کہا۔ کہ
آپ یہاں سے بھاگ جائیں۔ ورنہ آپ کی جان خطرہ
میں پڑ جائیگی صاحبزادہ صاحبؓ نے کہا۔ تمہاری ہتھکڑیاں
کہاں ہیں لاؤ اور میرے ہاتھوں میں پہناؤ مجھے تو
آج رات خدا نے بتایا ہے کہ مجھے سونے کے کنگن ڈالے
جائیں گے۔ پس مَیں اپنی موت سے نہیں ڈرتا۔ مَیں تو
قوم کی نجات کے لئے اپنی جان پیش کرنا چاہتا ہوں۔
پھر جب انہیں پتھراؤ کیا گیا۔ تو اُس وقت بھی اُن کے
دل میں اپنی قوم کا کوئی کینہ اور بغض نہیں تھا۔ بلکہ
سنگسار کرنے سے پہلے جب انہیں گاڑنے لگے۔ اور
گاڑتے اس لئے ہیں کہ پتھروں کے ڈر سے انسان بھاگ
نہ جائے تو صاحبزادہ صاحبؓ نے کہا کہ مَیں بھاگتا تو
نہیں۔ مجھے گاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر جب اُن پر
پتھر پڑنے لگے تو دیکھنے والوں کی گواہی ہے کہ صاحبزادہ
صاحبؓ بلند آواز سے یہ دُعا کرتے جاتے تھے کہ اے
میرے ربّ! میری قوم پر رحم کر۔ کیونکہ وہ جہالت سے
ایسا کر رہی ہے۔ یہ وہ شاندار نمونے ہیں جو قوموں کو
زندہ کیا کرتے ہیں۔ بیشک اُن میں کچھ کمزور بھی ہوتے
ہیں مگر نوجوان جب اس قسم کے نمونہ کو دیکھتے ہیں تو
اُن کے دلوں میں جوش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کہتے
ہیں کیسا اچھا انجام تھا آؤ ہم بھی ایسی ہی قربانی کریں
اور وہ بھی آگ اور خون کے دریا میں چھلانگیں لگا دیتے
ہیں۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر انجیل میں رُوحانی
بادشاہت کو انگور کے باغ سے تشبیہہ دی گئی ہے[۵]

کیونکہ انگور کی بیل ہی ایک ایسی بیل ہوتی ہے جس کو
سرسبز و شاداب کرنے کے لئے خون کی کھاد ڈالی جاتی ہے
پس اِس مثال میں اسی طرف اشارہ تھا کہ خدا تعالیٰ کے
دین کو تازہ کرنے کے لئے ہمیشہ انسانی قربانیوں کی ضرورت
ہوگی اور انسانوں کے خون اس باغ کی جڑوں میں گرا کر
اسے پھر زندہ اور سرسبز و شاداب کیا جائے گا۔ چنانچہ
روحانی سلسلوں کی ایک لمبی تاریخ اس صداقت کو واضح
کرتی ہے۔ آج تک کوئی نبی بھی ایسا نہیں گذرا جس کی
جماعت شدید ترین مصائب میں سے نہ گذری ہو۔ انکو
گرفتار کیا گیا۔ اُنکو قتل کیا گیا۔ اُنکو پھانسی پر لٹکایا گیا
اُن کو تلواروں سے شہید کیا گیا۔ مگر ان تمام تکالیف
کے باوجود صداقت دنیا پر ہمیشہ غالب آئی۔ حضرت
داؤدؑ کے بعد بخت نصر نے بیت المقدس کی ساری عمارتیں
تہ و بالا کر دی تھیں اور مسجد اقصیٰ کا نشان تک بھی اُس
نے نہ چھوڑا تھا۔ مگر ان باتوں سے کیا ہوا۔ بات تو
وہ بھی جو موسیٰؑ لایا۔ مگر موسیٰؑ کی لائی ہوئی بات آج تک
دنیا نہیں مٹا سکی۔ ان کی عزت آج بھی دنیا میں قائم
ہے اور آج بھی اُن کے ناموں پر اپنی جانیں قربان کرنیوالے
لوگ دنیا میں موجود ہیں۔ آج ایک زندہ اور باجبروت اور
قاہر اور خبردار اور منتظم بادشاہ کو گالی دے کر ایک انسان
سزا سے بچ سکتا ہے۔ اس کی گرفت سے بھاگ سکتا ہے
لیکن یہ لوگ جو انسانوں جیسے انسان تھے اوّل تو فقیری
میں انہوں نے عمر گذار دی اور اگر بعض بادشاہ بھی ہوئے
تو اُن کی بادشاہتیں اپنی دنیوی عظمت کے لحاظ سے بہت
سے دنیوی بادشاہوں سے کم تھیں۔ لیکن آج جبکہ وہ
منوں مٹی کے نیچے دفن ہیں اور بعض کی نسلوں کا بھی کوئی
پتہ نہیں چلتا۔ اور بعض کی اُمتیں بھی مٹ چکی ہیں کوئی
زبردست سے زبردست بادشاہ بھی بے ادبی سے اُن کا
نام لے تو وہ ذلّت و رسوائی سے بچ نہیں سکتا کیونکہ

---

۵ لوقا باب ۲۰ آیت ۹ تا ۱۸

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور ہم نے موسٰیؑ کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا - تمہارا پیچھا کیا جائے گا -

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ

اس پر فرعون نے شہروں کی طرف جمع کرنے والے آدمی بھجوائے (یہ کہتے ہوئے کہ) یہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل) تو

قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۷﴾

ایک تھوڑی سی جماعت ہیں - باوجود اسکے وہ ہم کو غصہ دلاتے ہیں - اور ہم ایک بڑی جماعت ہیں جو بہت محتاط ہیں (پس ہمیں انکا ...

انہوں نے خدا تعالیٰ کی محبت کی چھری کو خوشی سے اپنی گردنوں پر پھروا لیا اور وہ خدا کے بڑے قرار پائے گویا جسطرح ایک بکری کا گوشت اُس کے ذبح ہو جانیکے بعد انسان کی غذا بن کر انسان ہو جاتا ہے اسی طرح جو لوگ خدا کے بڑے بن کر قربان ہو جاتے ہیں وہ بھی خدا میں شامل ہو جاتے ہیں - اور ابدی بادشاہت اُن کو عطا کی جاتی ہے - موسیٰؑ پر ایمان لانے والے ساحروں نے بھی قربانی کا یہی شاندار نمونہ دکھایا - اور انہوں نے فرعون سے کہہ دیا کہ ہمارے دل اب نُورِ ایمان سے منوّر ہو چکے ہیں اب تیری کوئی بھی تکلیف ہمیں جادۂ حق سے منحرف نہیں کر سکتی - یہی ایمان ہے جو انسان کی نجات کا باعث بنتا ہے اور یہی قربانی کی رُوح ہے جو قوموں کو دنیا پر غالب کیا کرتی ہے -

۵۳ حل لغات :- اَسْرِ : اَسْرٰی سے امر کا صیغہ ہے - اور اَسْرٰی سَرَی سے باب افعال کا ماضی کا صیغہ ہے - سَرَی الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں سَارَ عَامَّةَ اللَّيْلِ - یعنی وہ رات کے اکثر حصّہ میں چلتا رہا - اور اَسْرٰی کے معنے سَرَی کی طرح ہی ہیں - لیکن بعض ائمہ لغت نے کہا ہے کہ اَسْرٰی لِاَوَّلِ اللَّيْلِ وَسَرَی لِاٰخِرِ اللَّيْلِ - رات کے ابتدائی حصّہ میں چلنے کے لئے اَسْرٰی کا فعل استعمال کیا جاتا ہے اور رات کے آخری حصّہ میں چلنے کے لئے سَرَی کا (اقرب) پس اَسْرِ بِعِبَادِيْ کے معنے ہونگے (۱) رات کے وقت میرے بندوں کو لے کر چل (۲) یا رات کے ابتدائی حصّہ میں لے کر چل -

شِرْذِمَةٌ

شِرْذِمَةٌ : اَلشِّرْذِمَةُ : اَلْجَمَاعَةُ الْقَلِيْلَةُ مِنَ النَّاسِ - لوگوں کی تھوڑی سی جماعت (اقرب)

حٰذِرُوْنَ

حٰذِرُوْنَ : حَاذِرٌ سے جمع کا صیغہ ہے - اور حَاذِرٌ کے معنے ہوتے ہیں اَلْمُتَاَهِّبُ - اَلْمُسْتَعِدُّ چوکس اور تیار - (اقرب)

تفسیر :- اِس آیت میں اَسْرِ کا لفظ آتا ہے جو سَرٰی سے نکلا ہے اور سَرَی الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں سَارَ عَامَّةَ اللَّيْلِ فلاں شخص رات کا اکثر حصّہ چلتا رہا - اور جب اَسْرَی الرَّجُلُ اِسْرَاءً کہیں تو اس کے معنے بھی سَرٰی کی طرح ہی رات کو چلنے کے ہوتے ہیں - لیکن بعض لغویوں نے کہا ہے کہ اَسْرٰی کے معنے ہوتے ہیں رات کے پہلے حصّہ میں چلا - اور سَرٰی کے معنے ہوتے ہیں رات کے پچھلے حصّہ میں چلا -

اَسْرِ

اِس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت

موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اب فرعون کافی ڈر گیا ہے۔ اُس سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ اب خدا کا نام لے کر رات کے وقت اپنی قوم کو نکال کر لے جاؤ۔ ہاں ہوشیار رہنا کیونکہ فرعون اور اسکے ساتھی تمہارا پیچھا کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ فرعون نے سب شہروں میں ڈھنڈورچی بھیجدیئے اور یہ اعلان کرا دیا کہ بنی اسرائیل ایک چھوٹی سی جماعت ہے جو ہمیں غصہ دلا رہی ہے حالانکہ ہم سب ایک بڑی جماعت ہیں جو ہر قسم کا ساز و سامان بھی اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اکثریت میں ہوتے ہوئے اقلیت سے ڈر جائیں اور اُسے کچلنے کے لئے تیار نہ ہو جائیں۔

یہی وہ عیب ہے جو ہر نبی کے زمانہ میں اُس کے دشمنوں میں دکھائی دیتا ہے کہ وہ اکثریت کے گھمنڈ میں بجائے دوسروں کے احساسات کا خیال رکھنے کے یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو ہم تمہیں ڈنڈے سے سیدھا کریں گے۔ مثل مشہور ہے کہ کوئی بھیڑیا ندی کے کنارے پانی پی رہا تھا کہ ایک بکری کا بچہ آیا اور اُس نے بھی پانی پینا شروع کر دیا۔ بکری کا بچہ دیکھ کر بھیڑیے کے منہ میں پانی بھر آیا اور اُس نے چاہا کہ اُسے کھا لے (انسانوں اور حیوانوں کے حالات ایک سے نہیں ہوتے۔ انسان دلیل دیتا ہے لیکن ایک حیوان دلیل نہیں دیتا۔ مثال میں چونکہ دلیل دی گئی ہے اسلئے یہاں بھیڑیے سے مُراد وہ آدمی ہے جو بھیڑیے کے سے خصائل رکھتا ہو اور بکری کے بچہ سے مراد وہ آدمی ہے جو اسکے خصائل رکھتا ہو) بہرحال بھیڑیے کو یہ لالچ پیدا ہوا۔ کہ کسی نہ کسی طرح بکری کے بچہ کو کھا لے۔ چنانچہ وہ بکری کے بچہ کو دیکھ کر کہنے لگا۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو میرا پانی گدلا کر رہا ہے۔ بکری کے بچہ نے کہا سرکار یہ کونسی بات ہے آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اوپر ہیں اور میں نیچے ہوں۔ آپ کا پیا ہوا پانی میری طرف آ رہا ہے نہ کہ میرا پیا ہوا پانی آپ کی طرف جا رہا ہے۔ بھیڑیئے نے آگے بڑھ کر بکری کے بچہ کو تھپڑ مارا اور اُسے مار دیا اور کہا نالائق آگے سے جواب دیتا ہے۔ یہی حالت حق کے مخالفوں کی ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ سچائی کیا چیز ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اکثریت ہماری طرف ہے اور ہم اکثریت کے بل بوتے پر جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ مولوی ثناء اللہ صاحب قادیان آئے اور ایک بڑے جلسہ میں نعرہائے تکبیر میں انہوں نے کہا۔ میں ایک نکتہ بیان کرتا ہوں۔ مرزا صاحب اور میرے درمیان آسان طریق فیصلہ یہ ہے کہ مرزا صاحب میرے ساتھ کلکتہ تک ٹرین میں چلیں۔ کلکتہ تک بیسیوں اسٹیشن ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ راستہ میں انہیں پتھر پڑتے ہیں یا مجھے اور پھول مجھ پر برسائے جاتے ہیں یا ان پر۔ کلکتہ تک جاتے ہوئے اِس بات کا فیصلہ ہو جائے گا کہ مسلمان کس کی تائید میں ہیں۔ جماعت کے دوست گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے۔ اور انہوں نے کہا۔ لوگوں پر بہت بُرا اثر ہوا ہے اور وہ اِسوقت سخت جوش میں ہیں۔ شام کو میری تقریر تھی۔ میں نے کہا۔ مولوی ثناء اللہ صاحب نے خود فیصلہ کر دیا ہے کہ سچا کون ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ انہوں نے نتیجہ از خود نکال لیا ہے ورنہ اگر نتیجہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے نکلا ہوا ہے تو پھر ہمارے لئے اچھا ہے۔ میں نے کہا مولوی ثناء اللہ صاحب نے کہا ہے کہ مرزا محمود احمد میرے ساتھ کلکتہ تک چلیں ہم دیکھیں گے کہ راستہ میں پھول کس پر برستے ہیں اور پتھر کس پر پھینکے جاتے ہیں اور اس سے مولوی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جس پر پھول پڑینگے وہ سچا ہوگا۔ حالانکہ نتیجہ نکالنا ان کا کام نہیں تھا

ہم سے پہلے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل گذر چکے ہیں۔ مولوی صاحب خود بتا دیں کہ مکہ میں پتھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پڑا کرتے تھے یا ابوجہل کو۔ اور پھول ابوجہل کو پڑا کرتے تھے یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ اور اگر پتھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پڑا کرتے تھے اور پھول ابوجہل پر برسائے جاتے تھے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ جس پر پتھر پڑیں گے وہ سچا ہوگا اور جس پر پھول برسائے جائیں گے وہ جھوٹا ہوگا۔

غرض کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو دین سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اسوجہ سے وہ ہر قسم کے مظالم پر کمربستہ ہو جاتے ہیں لیکن جس طرح کثرت دماغ میں غرور پیدا کرکے عقل مار دیتی ہے اسی طرح عشق بھی ایک عاشق صادق کے اندر کبریائی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر وہ کبریائی کے نشہ میں آکر مارتا نہیں بلکہ مرتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو کثرت والوں نے ہمیشہ تھوڑی تعداد والوں کو اپنے غرور میں آکر مارا ہے لیکن عاشقوں نے ہمیشہ اپنے معشوقوں کے لئے جانیں دی ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی حقیقت کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ فرماتے ہیں کہ ؎

در کوئے تو اگر سرِ عشاق را زنند
اول کسے کہ لافِ تعشق زند منم

یعنی اگر تیرے کوچہ میں جانے والوں کے متعلق یہ حکم ہو جائے کہ ہر شخص جو عاشقی کا دعویٰ کریگا اُسے قتل کر دیا جائیگا تو گو عشق کا دل کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور کوئی شخص دعویٰ کرے یا نہ کرے عاشق عاشق ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ اعلان ہو جائے کہ جو بھی عشق کا دعویٰ کریگا اس کا سر قلم کر دیا جائیگا تو سب سے پہلا شخص جو عشق کا دعویٰ کرے گا اور کہیگا کہ میں عاشق ہوں وہ میں ہوں گا۔

حقیقت یہ ہے کہ عاشق اور مسلمان دو متضاد چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز کے یہ دو نام ہیں۔ مگر عاشق سے میری مراد ہوس پرست عاشق نہیں بلکہ ایک سچا اور کامل مسلمان مراد ہے۔ وہ مصائب کو صرف برداشت ہی نہیں کرتا بلکہ اگر اس پر مصائب نہ آئیں تو وہ اپنے اندر ایک بیکلی سی محسوس کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں میرا محبوب مجھ سے خفا تو نہیں ہو گیا۔ مصائب سے بھاگنا ایک منافق کا کام ہے اور مصائب کو برداشت کرنا صرف مسلمان کا خاصہ نہیں بلکہ ایک کافر بھی اس میں شریک ہو سکتا ہے لیکن سچا مسلمان وہ ہے جو نہ صرف مصائب کو برداشت کرتا ہے بلکہ مشکلات کے دَور کو اپنی روحانی ترقی کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور اگر اس دَور میں التواء واقعہ ہو جائے تو وہ گھبراتا ہے کہ کہیں میرے ایمان میں تو کوئی نقص نہیں آگیا کہ میرا رب میرے ایمان کو دُنیا پر ظاہر کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کر رہا۔

پس بے شک اکثریت اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مومنوں پر ظلم کرتی رہے وہ اُسے برداشت کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجرموں کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ اور اکثریت کے بل بوتے پر ظلم کرنے والے اپنے جرائم کی پاداش میں کیفر کردار کو پہنچ جاتے ہیں چنانچہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مکہ فتح کرکے آئے تو آپؐ نے اُن کفار سے جو رات دن آپؐ پر اور آپؐ کے صحابہؓ پر شدید ترین مظالم کرتے رہتے تھے پوچھا کہ اے مکہ والو! بتاؤ اب میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟ آپ کا مطلب یہی تھا کہ تم جو ننانوے فیصدی ہونے کے گھمنڈ میں یہ کہا کرتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا حیثیت ہے۔ اس کی کیا طاقت ہے کہ وہ

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۸﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّ

تب ہم نے اُن (یعنی فرعون اور اُس کی جماعت) کو باغوں اور چشموں اور خزانوں اور عزت والے ملک سے نکال

مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۹﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۶۰﴾ ؕ

دیا (یعنی محروم کر دیا) - ایسا ہی ہوا - اور ہم نے اُن (چیزوں) کا وارث بنی اسرائیل کو کر دیا -

ہمارے مقابلہ میں بول سکے - اب اس کے سامنے تم اکثریت کے دعویدار پیش ہو رہے ہو - مگر اُس دن وہ ایسے سٹپٹائے کہ انہوں نے کہا - ہم آپ سے اُسی سلوک کی امید رکھتے ہیں جو یوسف نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا - چنانچہ آپؐ نے اُن سب کو معاف فرما دیا - یہی اکثریت کا گھمنڈ فرعون کے دماغ میں بھی جاگزین تھا - بلکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو جب سے دنیا کا آغاز ہوا ہے ہمیشہ دو قسم کی حکومتیں پائی جاتی رہی ہیں - ایک عقل اور سمجھ سے کام لینے والی اور دوسری زور اور طاقت سے کام لینے والی - ہر زمانہ کے محاورے الگ الگ ہوتے ہیں - آجکل جو حکومت عقل اور سمجھ سے کام لے اُسکو جمہوریت کہتے ہیں - اور جو حکومت زور اور تشدد اور طاقت سے کام لے اُس کو ڈکٹیٹر شپ کہتے ہیں یا بعض دفعہ ٹیلرازم بھی کہہ دیتے ہیں - مگر نام خواہ کچھ ہی ہو جب سے دنیا بنی ہے یہ دونوں طاقتیں کام کر رہی ہیں حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے یہ کام شروع ہوا اور اب تک جاری ہے - قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے - ایک کی اللہ تعالیٰ نے قربانی قبول کرلی اور دوسرے کی رد کر دی - ایک کے پیچھے اخلاص اور تقویٰ تھا اس لئے اُس کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی قربانی کے پیچھے چونکہ اخلاص اور تقویٰ نہیں تھا اِس لئے وہ

رد ہوئی - اب دانائی تو یہ تھی کہ دوسرا شخص جس کی قربانی قبول نہیں ہوئی تھی وہ اپنے اندر تقویٰ - عجز اور انکسار پیدا کرتا اور سمجھتا کہ اس کی قربانی خدا نے رد کی ہے اُس کے بھائی کی وجہ سے رد نہیں ہوئی مگر وہ اٹھے کہ اپنے بھائی کے پاس پہنچا اور اُسے کہا کہ مَیں تجھے قتل کر دونگا - مگر اُس کے بھائی نے دلیل والا طریق اختیار کیا اور کہا کہ قربانی قبول کرنا خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اگر تجھے اس بات پر غصہ آیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تیری قربانی قبول کیوں نہیں کی تو اس میں میرا کیا قصور ہے - مَیں تو اپنے آپ کو ایک عاجز بندہ سمجھتا ہوں - یہ نظرت پُرانے زمانہ کی تھی اُس وقت نہ ڈکٹیٹر شپ کے الفاظ تھے نہ جمہوریت کے مگر وہ رُوح موجود تھی جس سے یہ دونوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں - یہ رُوح جب سے حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے ہیں یا دنیا پیدا ہوئی ہے متوازی چلی آرہی ہے - دنیا میں ایک طبقہ ایسا چلا آیا ہے جو ہمیشہ حق و انصاف کا قائل ہوتا ہے اور دوسرا اپنے زور اور طاقت پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بہر حال ہم نے اپنی مرضی پوری کرنی ہے - اگر لوگ ہماری مرضی کے مطابق نہیں چلیں گے تو ہم حکومت جتھہ اور طاقت سے دوسروں کو سیدھا کر دینگے اور اپنی مرضی چلائیں گے - انبیاء کی جماعتیں چونکہ ابتداء میں ہمیشہ چھوٹی ہوتی ہیں اور بعض دفعہ تو اُنکی تعداد

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿٦١﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ

پھر صبح کے وقت وہ (یعنی فرعون اور اُس کی قوم کے لوگ بنی اسرائیل کو روکنے کیلئے) اُن کے پیچھے چل پڑے۔ پھر جب

الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿٦٢﴾

دونوں گروہ ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تو موسیٰؑ کے ساتھیوں نے کہا۔ ہم تو پکڑے گئے۔

قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿٦٣﴾

(موسیٰؑ نے) جواب دیا۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ میرا رب میرے ساتھ ہے اور وہ مجھے کامیابی کا راستہ دکھائیگا ۱۴ ۱؎

اتنی قلیل ہوتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بعض انبیاء کو صرف ایک ایک شخص نے مانا۔ اِس لئے ہر شخص ان پر مذاق اڑاتا ہے اور اُن کے دعووں کو ایک مجنونانہ بڑ سے زیادہ حقیقت نہیں دیتا۔ فرعون نے بھی اسی گھمنڈ میں شہر بشہر اپنے ڈھنڈورچی بھیجے اور اُن سے کہا کہ جاؤ اور لوگوں کو یہ کہہ کر اشتعال دلاؤ کہ بنی اسرائیل جو ایک حقیر سی جماعت ہیں ہمیں اشتعال دلا رہے ہیں حالانکہ ہم ایک بڑی زبردست اکثریت ہیں اور پھر بڑے محتاط اور دُور اندیش اور ہر قسم کے ساز و سامان اور اسلحہ سے لیس ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان لوگوں کو سختی سے کچل دیں اور ان پر ترقی کے تمام دروازے بند کر دیں۔

۱۴ ۱؎ حل لغات :۔ کُنُوْزٌ: کَنْزٌ کی جمع ہے اور اَلْکَنْزُ کے معنے ہیں وہ مال جو کسی جگہ میں محفوظ ہو۔ اِسی طرح اس کے معنے ہیں اَلذَّھَبُ سونا۔ اَلْفِضَّۃُ۔ چاندی۔ مَا یُحْرَزُ فِیْہِ الْمَالُ کَالْمَخْزَنِ وَالصُّنْدُوْقِ۔ وہ صندوق یا الماری جس میں مال محفوظ کیا جائے اُس کو بھی کَنْز کہتے ہیں (اقرب)

مُشْرِقِیْنَ: مُشْرِقٌ سے جمع کا صیغہ ہے جو اَشْرَقَ سے اسم فاعل ہے اور اَشْرَقَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں دَخَلَ فِیْ شُرُوْقِ الشَّمْسِ۔ کسی جگہ اُسوقت داخل ہؤا جبکہ سورج نکل رہا تھا (اقرب) پس مُشْرِقٌ کے معنے ہیں کسی جگہ صبح کے وقت داخل ہونے والا۔

تفسیر :۔ فرعون کو چونکہ اپنی کثرتِ تعداد اور طاقت پر غرور تھا اور وہ بنی اسرائیل کو بالکل حقیر سمجھتا تھا۔ اِس لئے جب موسیٰؑ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر نکلے تو فرعون کو بھی پتہ لگ گیا۔ اور وہ اپنا وہ لشکر جمع کر کے موسیٰؑ کے پیچھے چلا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب اُس نے ایسا کیا تو ہم نے بھی فرعون اور اُس کی جماعت کو باغوں اور چشموں اور خزانوں اور عزت والے ملک میں سے نکال دیا اور ہم نے بنی اسرائیل کو اِن چیزوں کا وارث کر دیا۔ اسجگہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ وہ خود وہاں سے نکلے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ہم نے انکو نکالا۔ حالانکہ بظاہر واقعہ یہ تھا کہ وہ خود وہاں سے نکلے تھے۔ درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ موسیٰؑ کے آنے اور اُن کے نکلنے کی وجہ سے باہر نکلا تھا اور موسیٰؑ کو بھیجنا اور بنی اسرائیل کو نکالنے کا

کُنُوْزٌ ۱

مُشْرِقِیْنَ ۱

حکم دینا خدا تعالیٰ کا کام تھا اس لئے بالواسطہ طور پر خدا تعالیٰ ہی فرعون اور اُس کے لشکر کو نکالنے کا موجب بنا اور خدا تعالیٰ نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب کیا اور بتایا کہ گو وہ خود نکلا تھا مگر چونکہ یہ تحریک ہماری طرف سے تھی اور ہم نے ہی موسیٰ کو بنی اسرائیل کے نکالنے کا حکم دیا تھا اس لئے ہم ہی فرعون اور اس کے لشکر کو نکالنے والے بن گئے۔ اور آخر ان نعمتوں کا ہم نے بنی اسرائیل کو وارث بنا دیا۔

اَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ سے یہ مراد نہیں کہ اُنہی باغوں اور اُنہی چشموں اور اُنہی خزانوں کا وارث بنا دیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انہیں اسی قسم کے باغوں اور چشموں اور خزانوں کا فلسطین میں وارث بنا دیا۔ یہ ایک غلط خیال ہے جو بعض لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کو مصر پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ اِس خیال کی نہ قرآن کریم سے تصدیق ہوتی ہے اور نہ بائبل سے۔ قرآن کریم اور بائبل دونوں سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل مصر سے نکلنے کے بعد اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے ایک لمبے عرصہ تک بیابانوں میں پھرتے رہے اور آخر چالیس سال کے بعد انہیں کنعان پر قبضہ ملا۔ پس اَوْرَثْنٰهَا سے ملک مصر مراد نہیں بلکہ وہ جگہ مراد ہے جہاں انہیں سب چیزیں میسر آگئیں یعنی فلسطین کا ملک۔ جو اپنے باغات اور چشموں میں مصر کے بالکل مشابہ ہے۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ سے ظاہر ہے کہ سورج نکلتے وقت فرعون کا لشکر اُن کے پیچھے چلا تھا۔ کیونکہ فرعون نے بھی اپنا لشکر جمع کرنا تھا۔ اور موسیٰؑ پہلے سے تیار تھے۔ پس موسیٰؑ پہلے نکل گئے اور فرعون پیچھے نکلا۔ مگر جاتے جاتے جب لشکرِ فرعون اور موسیٰؑ کے ساتھیوں کا آمنا سامنا ہُوا تو موسیٰؑ کے ساتھی جو صدیوں سے فرعون کے غلام چلے آ رہے تھے ڈر گئے اور شور مچانے لگے کہ اے موسیٰؑ! ہم تو مارے گئے اور پکڑے گئے۔ اِس پر موسیٰؑ نے کہا کہ ایسا گمان مت کرو۔ اُس لشکر کے ساتھ فرعون ہے اور میرے لشکر کے ساتھ خدا ہے اور خدا تعالیٰ یقیناً ہمیں پار لے جائیگا۔ خدا تعالیٰ پر توکل کا یہ ایک نہایت ہی شاندار نمونہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دکھایا مگر اس صداقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انتہائی خطرات میں چاروں طرف سے گھرے ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ پر جس کامل یقین اور ایمان کا مظاہرہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہمیں دکھائی دیتا ہے وہ اس واقعہ سے کہیں زیادہ شاندار اور ایمان افزا ہے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم ملا تو آپؐ حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لے کر جبلِ ثور کی طرف تشریف لے گئے جو مکّہ سے کوئی چھ سات میل کے فاصلہ پر ہے اور اُس پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ صبح جب کفار نے دیکھا کہ آپ اپنے گھر میں موجود نہیں اور ہر قسم کے پہرہ کے باوجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامیابی کے ساتھ نکل گئے ہیں تو وہ فوراً آپ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے مکّہ کے چند بہترین کھوجی جو پاؤں کے نشانات پہچاننے میں بڑی بھاری دسترس رکھتے تھے اپنے ساتھ لئے جو انہیں جبلِ ثور تک لے آئے اور انہوں نے کہا کہ بس محمد رسول اللہؐ اگر ہیں تو یہیں ہیں۔ اِس سے آگے اور کہیں نشان نہیں ملتا۔ اُس وقت یہ کیفیت تھی کہ دشمن غار کے عین سر پر کھڑا تھا۔ اور غار کا منہ تنگ نہیں تھا۔ جس کے اندر جھانکنا مشکل ہو مگر وہ ایک فراخ مُنہ کی کھلی غار ہے جس کے اندر جھانک کر بڑی آسانی سے

معلوم کیا جا سکتا تھا کہ کوئی شخص اندر بیٹھا ہے یا نہیں مگر ایسی حالت میں بھی محمد رسول صلے اللہ علیہ وسلم پر کوئی خوف طاری نہیں ہوتا بلکہ آپؐ کی قوتِ قدسیہ کی برکت سے حضرت ابوبکرؓ کا دل بھی مضبوط رہتا ہے اور وہ موسیٰؑ کے ساتھیوں کی طرح یہ نہیں کہتے کہ ہم پکڑے گئے بلکہ انہوں نے اگر کچھ کہا تھا تو یہ کہ یا رسول اللہ دشمن اتنا قریب پہنچ چکا ہے کہ وہ اگر ذرا بھی نظر نیچی کرے تو ہمیں دیکھ سکتا ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُسْكُتْ يَا اَبَا بَكْرٍ اِثْنَانِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا ابوبکرؓ خاموش رہو ہم اس وقت دو نہیں بلکہ ہمارے ساتھ ایک تیسرا خدا بھی ہے پھر وہ کیونکر ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ باوجود اس کے کہ دشمن غار کے سر تک پہنچ چکا تھا پھر بھی اُسے یہ توفیق نہ ملی کہ وہ آگے بڑھ کر جھانک سکتا اور وہ وہیں سے بڑبڑاتے واہی تباہی باتیں کرتے ہوئے واپس چلا گیا۔ غرض اس واقعہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ موسیٰؑ کے ساتھیوں نے گھبرا کر یہ کہا کہ اے موسیٰؑ! ہم پکڑے گئے۔ گویا انہوں نے اپنے ساتھ موسیٰؑ کو بھی لپیٹ لیا۔ اور خیال کیا کہ اب ہم سب فرعون کی گرفت میں آنے والے ہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توکل نے آپؐ کے ساتھی پر بھی ایسا اثر ڈالا کہ اس کی زبان سے بھی یہ الفاظ نہ نکلے کہ ہم پکڑے گئے بلکہ اُس نے کہا تو صرف یہ کہ دشمن اتنا قریب آچکا ہے کہ اگر وہ ہمیں دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واہمہ کو بھی برداشت نہ کیا اور فرمایا کہ ایسا خیال بھی مت کرو ہم اس وقت دو نہیں بلکہ ہمارے ساتھ ایک اور بھی ہستی ہے اور وہ ہمارا خدا ہے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکلے تو وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے جسے بائیبل نے اپنی شاعرانہ زبان میں لاکھوں بنا دیا ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک آدمی تھا۔ اور گو وہ ایک آدمی بھی اپنے ایمان کے لحاظ سے سوا لاکھ پر بھاری تھا مگر بہرحال وہ فردِ واحد ہی تھا کوئی بڑی بھاری جمعیت اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ پھر موسیٰؑ اور اُس کے ساتھیوں کے سامنے بھاگنے کے لئے ایک کھلا راستہ تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس جگہ محصور ہوئے اس میں سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا مگر باوجود اس کے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ایک آدمی تھا اور باوجود اس کے کہ دشمن سے بھاگنے کا آپؐ کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا اور پھر آپؐ بالکل نہتے تھے آپؐ نے اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھا اور فرمایا۔ ابوبکرؓ! غم مت کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (توبہ آیت ۴۰) یقیناً ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو صرف یہ کہا کہ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ۔ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ یقیناً مجھے کامیابی کا راستہ دکھائیگا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فرما کر حضرت ابوبکرؓ کو بھی اپنے وجود میں مدغم کر لیا اور فرمایا کہ جس طرح مجھے خدا کی معیت حاصل ہے اسی طرح تمہیں بھی خدا کی معیت حاصل ہے۔ اسلئے گھبراہٹ اور تشویش کی ضرورت نہیں۔ پھر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ فرعون نے جب موسیٰؑ کا تعاقب کیا تو اُس نے موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ لیا۔ لیکن جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعاقب میں مکہ والے نکلے تو خدا نے اُن کی آنکھوں کو اندھا کر دیا اور نہ صرف وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ

تب ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ اپنے سونٹے کو سمندر پر مار ۔

فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۴﴾ ج

جس پر (سمندر) پھٹ گیا ۔ اور اُس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیلے کی طرح نظر آنے لگا ۔

وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۵﴾ ج وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَ

اور اُس وقت ہم دوسرے گروہ (یعنی فرعونی گروہ) کو قریب لے آئے ۔ اور موسیٰؑ اور اُس کے

مَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۶﴾ ج ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۷﴾ ط

ساتھیوں کو نجات دی ۔ اور دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا ۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

اس (واقعہ) میں ایک بڑا نشان ہے ۔ لیکن اِن (منکروں) میں سے اکثر مانتے نہیں ۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۹﴾ ع

اور تیرا ربّ یقیناً غالب (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے ۔ ۱۵؎

ع ۴ / ۸

کو پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ بلکہ انہیں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھنے کی خدا تعالیٰ نے ان کو طاقت نہ دی ۔ اور اس طرح کلّی طور پر خدا تعالےٰ نے اُن کو خائب و خاسر کیا ۔ اور اگر کسی شخص نے آپؐ کو دیکھ بھی لیا جیسا کہ سراقہ نے آپؐ کو مدینہ جاتے وقت دیکھ لیا تھا تو خدا تعالےٰ نے ایسے اُس وقت تک واپس نہیں آنے دیا جب تک محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور آپؐ کی صداقت کا نشان اُس نے نہیں دیکھ لیا ۔ گویا دشمن صرف ایک مقام پر آپؐ کو دیکھنے میں کامیاب ہُوا مگر اُس مقام پر بھی وہ دشمن کی کامیابی نہیں تھی بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی تھی کیونکہ دشمن نے آپؐ کو گھائل نہیں کیا بلکہ آپؐ نے دشمن کو گھائل کیا اور پیشتر اس کے کہ وہ واپس لوٹتا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپؐ کی عظمت کا قائل ہو چکا تھا گو اسلام میں وہ فتح مکّہ کے موقعہ پر داخل ہُوا (اصابہ جلد ۳ صـ۳۵)

۱۵؎ حل لغات :- اِنْفَلَقَ ۔ اِنْفَلَقَ کے معنے ہیں اِنْشَقَّ ۔ پھٹ گیا ۔ (اقرب)

۱- اِنْفَلَقَ

فِرْقٌ : اَلْفِرْقُ کے معنے ہیں اَلطَّائِفَةُ مِنَ الشَّيْءِ الْمُتَفَرِّقِ ۔ یعنی فِرْقٌ متفرق چیز کے ایک حصّہ کو کہتے ہیں (اقرب)

۲- فِرْقٌ

اَلطَّوْدُ : اَلْجَبَلُ الْعَظِيْمُ ۔ یعنی طود عربی میں بڑے پہاڑ کو کہتے ہیں ۔ نیز اُس کے معنے

۳- اَلطَّوْدُ

ہیں اَلْمُشْرِفُ مِنَ الرَّمْلِ۔ ریت کا ٹیلہ۔ اَلْھَضَبَۃُ
چھوٹی سی پہاڑی جو زمین پر پھیلی ہوئی ہو (اقرب)
اَزْلَفْنَا: اَزْلَفْنَا اَزْلَفَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے
اور اَزْلَفَہٗ کے معنے ہیں قَرَّبَہٗ۔ اُس کو قریب کیا
جَمَعَہٗ: اُس کو جمع کیا (اقرب) پس اَزْلَفْنَا کے
معنے ہونگے ہم نے قریب کیا یا جمع کیا۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے ہم نے موسیٰؑ کو وحی کی
کہ اپنا سونٹا سمندر پر مار۔ جب اُس نے سونٹا مارا
تو سمندر پھٹ گیا۔ اور ہر ٹکڑا یعنی سمندر کی طرف کا
پانی بھی اور خشکی کی طرف کا پانی بھی جو جھیلوں کی
شکل میں تھا ایک اونچے ٹیلے کے طور پر نظر آنے
لگ گیا۔ اُسوقت ہم نے لشکرِ فرعون کو قریب
کر دیا۔ تب موسیٰ اور اس کے ساتھی تو سمندر اور
جھیلوں کے درمیان کی ریت پر سے آرام کے ساتھ گذر
گئے۔ مگر فرعون کے لشکر میں گھبراہٹ پیدا ہوئی اور
اُن کی گاڑیوں کے پہیئے ریت میں پھنسنے لگ گئے۔
نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑیاں نکالتے ہوئے مد کا وقت آگیا
اور وہ سب کے سب غرق ہو گئے۔

بائیبل میں اس معجزہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:
"پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر
بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تُند پوربی
آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر
اُسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے
ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں
سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور
اُن کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار
کی طرح تھا۔ اور مصریوں نے تعاقب کیا
اور فرعون کے سب گھوڑے اور رتھ
اور سوار اُن کے پیچھے پیچھے سمندر کے
بیچ میں چلے گئے۔ اور رات کے پچھلے پہر
خداوند نے آگ اور بادل کے ستون میں
سے مصریوں کے لشکر پر نظر کی اور اُن کے
لشکر کو گھبرا دیا اور اُس نے اُنکے رتھوں
کے پہیوں کو نکال ڈالا۔ سو اُنکا چلانا
مشکل ہو گیا۔ تب مصری کہنے لگے آؤ ہم
اسرائیلیوں کے سامنے سے بھاگیں کیونکہ
خداوند اُن کی طرف سے مصریوں کے ساتھ
جنگ کرتا ہے۔ اور خداوند نے موسیٰ سے
کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تاکہ
پانی مصریوں اور اُن کے رتھوں اور سواروں
پر پھر بہنے لگے۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ
سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے
سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آگیا اور
مصری اُلٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے
سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا
کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اُس نے
رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے
لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا
سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا اور ایک
بھی اُن میں سے باقی نہ چھوڑا۔ پر بنی اسرائیل
سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر
چل کر نکل گئے اور پانی ان کے داہنے
اور بائیں ہاتھ دیوار کی طرح رہا۔ سو
خداوند نے اُس دن اسرائیلیوں کو مصریوں
کے ہاتھ سے اِس طرح بچایا اور اسرائیلیوں
نے مصریوں کو سمندر کے کنارے مرے
ہوئے پڑے دیکھا اور اسرائیلیوں نے وہ
بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر

اَزْلَفْنَا

ظاہر کی دیکھی اور وہ لوگ خداوند سے ڈرے
اور خداوند پر اور اُس کے بندے موسیٰ پر
ایمان لائے۔"

(خروج باب ۱۴ آیت ۲۱ تا ۳۱)

پُرانے مفسّرین نے اس موقعہ پر بعض عجیب و غریب
قصّے بیان کئے ہیں۔ چنانچہ وہ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ
فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں
کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب سونٹا مارا تو سمندر
بارہ جگہ سے پھٹ گیا۔ تاکہ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل
اُس میں سے علیحدہ علیحدہ گذر جائیں۔ (تفسیر فتح البیان
جلد ۷ صفحہ ۱۱) پھر بعض نے اور زیادہ مبالغہ سے کام لیا
ہے۔ اور لکھا ہے کہ چونکہ ہر فریق کے درمیان پانی کی
ایک دیوار حائل تھی اور بنی اسرائیل ایک دوسرے کو
دیکھ نہیں سکتے تھے اس لئے انہوں نے کہا کہ جب تک
ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھیں گے اُس وقت تک ہم
ایک قدم بھی آگے نہیں چلیں گے۔ اِس پر موسیٰ علیہ السلام
نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی۔ اور انہیں حکم ملا کہ پانی کی
جو دیواریں کھڑی ہیں اُن میں اپنا سونٹا داخل کرو۔
چنانچہ انہوں نے اِسی طرح کیا۔ اور تمام دیواروں میں
چوڑے چوڑے سوراخ ہوگئے اور وہ سب کے سب ایک دوسرے
کو دیکھنے لگ گئے بلکہ ایک دوسرے کی باتیں بھی سُننے
لگے اور ہنسی خوشی سمندر میں سے گذر گئے۔ (کشاف جلد
اوّل صفحہ ۲۱۵ زیر آیت وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ)

مفسّرین نے یہ قصّہ اپنی عجوبہ پسند طبیعت کی
تسکین کے لئے تو بیان کر دیا مگر انہوں نے یہ نہیں بتایا
کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سونٹا کس قدر لمبا تھا کہ
وہ بارہ راستے جن پر سے یہود نے گذرنا تھا اُنکی دیواروں
میں اُس سونٹے نے اپنے ایک ہی وار سے سوراخ
کر دیئے۔ اور پھر انہوں نے اس سوال پر بھی کوئی روشنی
نہیں ڈالی کہ جن بنی اسرائیل میں باہم اِس قدر محبت پائی
جاتی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر سمندر میں سے
گذرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے وہ ایک ہی راستہ
سے کیوں نہ گذر گئے۔ اور اُن کے لئے الگ الگ
راستے کیوں تجویز کئے گئے۔ ایک طرف اُن کا ایسے
پُر خطر وقت میں بھی جب کہ فرعون اُن کے تعاقب میں
تھا الگ الگ راستوں سے جانا اور دوسری طرف
اُن میں اِس قدر محبت کا پایا جانا کہ وہ ایک دوسرے
کو دیکھے بغیر ایک قدم بھی اٹھانا گوارہ نہ کریں بالکل
متضاد بیانات ہیں جو اِس قصّہ کے بنانے والے کے
افتراء کو ظاہر کر رہے ہیں۔ حقیقت صرف اتنی ہی ہے
کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایسے وقت میں سمندر
کے سامنے پہنچایا جبکہ جزر کا وقت تھا۔ چنانچہ اِدھر
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر پر سونٹا مارا اُدھر
اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت پانی گھٹنا شروع ہوگیا
لیکن جب فرعون کا لشکر پہنچا تو اُس وقت حضرت
موسیٰ علیہ السلام سمندر کے اِس خشک ٹکڑے کا اکثر
حصّہ طے کر چکے تھے۔ فرعون نے اُنکو پار ہوتے دیکھ
کر جلدی سے اپنی رتھیں سمندر میں ڈال دیں۔ مگر
سمندر کی ریت اُس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی
اُس کی رتھوں کے پہیئے ریت میں پھنسنے لگے۔ جن کو
نکالتے نکالتے اِس قدر دیر ہوگئی کہ مدّ کا وقت آگیا۔
اور فرعون اپنے تمام لشکر کے ساتھ وہیں غرق ہوگیا۔
فَانْفَلَقَ کا لفظ بھی اِسی حقیقت کی طرف اشارہ
کرتا ہے۔ کیونکہ اِنْفَلَقَ کے معنے جُدا ہو جانے کے
ہیں اور سمندر کے جدا ہونے کا یہی مفہوم ہے کہ وہ
کنارہ سے ہٹ گیا تھا اور اُس کی وجہ سے جو خشکی
نکل آئی تھی اُس میں سے بنی اسرائیل گذر گئے۔ اُس وقت
بنی اسرائیل کے ایک طرف سمندر تھا اور دوسری طرف

وہ چھوٹی چھوٹی جھیلیں تھیں جو سمندر کے کنارے واقعہ تھیں اور وہ درمیان میں سے گذرنے والوں کو ریت کے اونچے ٹیلے کی طرح اٹھی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اس عظیم الشان معجزہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ۔ اس واقعہ میں خدا تعالیٰ کی طاقت اور اس کی عظمت کا ایک بہت بڑا نشان مخفی ہے مگر افسوس ہے کہ اتنے بڑے نشانات کو دیکھنے کے باوجود لوگوں کی آنکھیں بند رہتی ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے انبیاء پر ایمان لاکر اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جب بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی آتا ہے اکثریت اس کا انکار کر دیتی ہے اور بہت تھوڑے لوگ اس پر ایمان لانے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ حالانکہ چاہیئے یہ تھا کہ اتنے بڑے نشانات کے بعد اکثریت ہمیشہ خدا تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہتی اور صرف شاذ و نادر کے طور پر ہی چند ایسے لوگ رہ جاتے جو اس کی آواز پر لبیک نہ کہتے مگر یہ کتنے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ اتنے بڑے نشانات بھی لوگوں کی آنکھیں کھولنے کا موجب نہیں بنتے اور وہ مخالفت اور انکار پر ہی کمربستہ رہتے ہیں۔ مگر اُن کے انکار کے باوجود اسمیں کوئی شک نہیں کہ اِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ تیرا ربّ بڑا غالب اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ یعنی وہ اپنے نبیوں کو غالب کر کے اپنے عزیز ہونے کا ثبوت دیتا ہے اور لوگوں کے استہزاء اور انکار کے باوجود دنیا میں نئی خرابیاں پیدا ہونے پر پھر اپنے رسول بھیج کر اپنے رحیم ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ عربی زبان کے قواعد کے مطابق رحیم کے وزن پر جو الفاظ آتے ہیں اُن کے معانی میں مبالغہ اور تواتر پایا جاتا ہے پس صفت رحیم کا ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ نے اپنی اسی سنّت کا ذکر فرمایا ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے کہ جب بھی دُنیا میں خرابی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کے لئے اپنا کوئی مامور مبعوث فرما دیتا ہے جو پھر بھولے بھٹکے بندوں کا خدا تعالیٰ سے تعلق قائم کر دیتا ہے چنانچہ دیکھ لو آج تک دنیا میں کوئی نبی بھی ایسا نہیں آیا جو اپنے دشمنوں پر غالب نہ آیا ہو۔ اور کبھی ایسا نہیں ہؤا کہ دنیا میں خرابی پیدا ہوئی ہو اور خدا تعالیٰ نے اُس کی اصلاح کا سامان نہ کیا ہو۔ آدمؑ آیا تو لوگوں نے اُس کی مخالفت کی۔ مگر آدمؑ کی مخالفت کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ اب میں اپنا کوئی نبی نہیں بھیجوں گا بلکہ اُس نے نوحؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے بھجوا دیا۔ نوحؑ کی بھی لوگوں نے شدید مخالفت کی۔ مگر اس مخالفت کو دیکھتے ہوئے جب پھر اُس کے بندے گمراہ ہوئے تو خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے کھڑا کر دیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بھی شدید مخالفت ہوئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے آپ کو آگ میں ڈال دیا مگر اتنی مخالفت کے باوجود خدا تعالیٰ جو رحیم تھا اُس نے پھر موسیٰؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے کھڑا کر دیا اور پھر اُن کی اُمت میں سینکڑوں انبیاء مبعوث کئے جن میں سے بعض قتل بھی کئے گئے۔ مگر لوگوں کی اتنی عداوت کے باوجود جب پھر تمام دنیا میں گمراہی پھیل گئی تو اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرما دیا۔

غرض اللہ تعالیٰ کے عزیز اور رحیم ہونے کا ہمیں ہر زمانہ میں ثبوت ملتا ہے۔ ہر زمانہ میں خدا اور اس کا رسول غالب رہے۔ جیسا کہ وہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ کَتَبَ اللّٰہُ

وقف لازم

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ﴿۷۰﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ

اور ان کو ابراہیمؑ کا واقعہ پڑھ کر سنا - جب کہ اُس نے اپنے باپ اور

قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا

اپنی قوم سے کہا تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں -

فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ﴿۷۲﴾ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ

اور اُن کے آگے بیٹھے رہتے ہیں - اس پر اُس (یعنی ابراہیمؑ) نے کہا کہ کیا جب تم انکو بلاتے ہو تو وہ

تَدْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا

تمہاری (اس) پکار کو سنتے ہیں! یا تمہیں کوئی نفع پہنچاتے یا ضرر دیتے ہیں! انہوں نے کہا -

بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ ﴿۷۵﴾

ایسا تو نہیں لیکن ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے دیکھتے آئے ہیں۔ ۱۶

لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ (مجادلہ آیت ۲۲) یعنی خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے۔ اور پھر ہر زمانہ میں اس کے رحیم ہونے کا بھی ثبوت ملتا رہا یعنی باوجود اس کے کہ لوگوں نے اس کے پیاروں کی شدید مخالفت کی پھر بھی وہ بار بار لوگوں کی ہدایت کا سامان کرتا رہا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان فرما کر اللہ تعالیٰ نے اپنے عزیز اور رحیم ہونے کی صفات کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ اس واقعہ نے ایک طرف تو خدا تعالیٰ کے عزیز ہونے کو ظاہر کر دیا اور باوجود اس کے کہ موسیٰؑ کی فرعون کے لاؤ لشکر کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں تھی پھر بھی موسیٰؑ غالب آیا اور فرعون تباہ ہو گیا اور دوسری طرف اس واقعہ نے خدا تعالیٰ کے رحیم ہونے کو بھی ثابت کر دیا۔ کیونکہ باوجود اس کے کہ موسیٰؑ کی اتنی شدید مخالفت ہوئی پھر بھی خدا تعالیٰ نے اپنے رسولوں کا سلسلہ منقطع نہ کیا۔ بلکہ جب پھر اُس کے بندے روحانی بھوک اور افلاس کا شکار ہوئے تو اُس نے اُن کی اصلاح کے لئے اپنے رسولوں کو کھڑا کر دیا۔

اَصْنَامٌ

۱۶ حل لغات - اَصْنَامٌ: صَنَمٌ کی جمع ہے۔ اور صَنَمٌ کے معنے ہیں صُوْرَةٌ اَوْ تِمْثَالُ اِنْسَانٍ اَوْ حَیَوَانٍ یُتَّخَذُ لِلْعِبَادَةِ۔ انسان یا حیوان کا وہ مجسمہ جو عبادت کیلئے بنایا جاتا ہے۔ اَوْ كُلُّ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ یا اللہ تعالیٰ کے سوا جسکی عبادت کی جائے اس کو بھی صنم کہتے ہیں (اقرب)

مفردات میں ہے۔ بَلْ كُلُّ مَا یَشْغَلُ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰی یُقَالُ لَهٗ صَنَمٌ۔ ہر وہ بات جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور اُس کے احکام کی تعمیل میں روک بنے وہ صنم کہلاتا ہے۔

عَاكِفِيْنَ

عَاكِفِيْنَ: عَكَفَ سے اسم فاعل مذکر کا صیغہ عَاكِفٌ آتا ہے - اور عَاكِفُوْنَ اور عَاكِفِيْنَ سے اسم جمع کا صیغہ ہے - عَكَفَ کے معنے ہیں - کسی کی عظمتِ شان کی وجہ سے اُس کی طرف متوجہ ہونا اور اس کے ساتھ رہنا (مفردات) پس عَاكِفٌ کے معنے ہونگے - کسی کی عظمتِ شان کی وجہ سے اُس کے پاس بیٹھنے والا اور اُس کے پاس رہنے والا -

تفسیر:- فرماتا ہے - اب تو خدا تعالیٰ کے عزیز اور رحیم ہونے کے ثبوت میں انکو ابراہیمؑ کا واقعہ سُنا جس نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی اور بتوں کی پرستش سے اُسے روکا -

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک بُت پرست بلکہ بُت ساز گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور کلڈیا کے ایک شہر اُور کسدیم کے رہنے والے تھے - ان کے خاندان کے لوگوں کا گذارہ ہی بتوں کے چڑھاووں اور بُت فروشی پر تھا - والد بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے - اور چچا کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی تھی جس نے اُن کے ہوش سنبھالتے ہی اپنے بیٹوں کے ساتھ آپ کو بھی بُت فروشی کے کام پر لگا دیا - حقیقت سے ناآشنا چچا کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس دل کو خالق کون و مکاں چُن چکا ہے اُس میں بتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی - پہلے ہی دن ایک امیر گاہک جو اپنی عمر کی انتہائی منزلیں طے کر رہا تھا اور تھا بھی مالدار بُت خریدنے کے لئے آیا - بُت فروش چچا کے بیٹے خوش ہوئے کہ آج اچھی قیمت پر سودا ہوگا - بوڑھے امیر نے ایک اچھا سا بُت چُنا اور قیمت دینے ہی لگا تھا کہ اُس بچہ کی توجہ اُس گاہک کی طرف ہوئی - اور اُس نے سوال کیا - میاں بوڑھے - تم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو - تم اس چیز کو کیا کرو گے ؟ اُس نے جواب دیا کہ گھر لے جاؤنگا اور ایک صاف اور مطہر جگہ میں رکھ کر اُس کی عبادت کرونگا - یہ سعید بچہ اُس خیال پر اپنے جذبات کو نہ روک سکا - اور پوچھا - تمہاری عمر کیا ہوگی - اُس نے اپنی عمر بتائی اور اس بچہ نے نہایت حقارت آمیز ہنسی ہنس کر کہا کہ تم اتنے بڑے ہو اور یہ بُت تو ابھی چند دن ہوئے میرے چچا نے بنوایا ہے کیا تمہیں اِس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے شرم نہ آئیگی - نہ معلوم اُس بوڑھے کے دل پر توحید کی کوئی چنگاری گری یا نہ گری لیکن اُس وقت اُس بُت کا خریدنا اُس کے لئے مشکل ہو گیا - اور وہ بُت وہیں پھینک کر واپس چلا گیا - اِس طرح ایک اچھے گاہک کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر بھائی سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے اپنے باپ تارہ کو اطلاع دی جس نے اس بچہ کی خوب خبر لی - یہ پہلی تکلیف تھی جو اُس پاکباز ہستی نے توحید کے لئے اُٹھائی مگر باوجود چھوٹی عمر اور کم سنی کے زمانہ کے یہ سزا جوشِ توحید کو سرد کرنے کی بجائے اُسے اَور بھی بھڑکانے کا موجب ہوئی - سزا نے فکر کا دروازہ کھولا اور فکر نے عرفان کی کھڑکیاں کھول دیں - یہاں تک کہ بچپن کی طبعی سعادت جوانی کا پختہ عقیدہ بن گئی - اور آخر اللہ تعالےٰ کا نُور ذہنی نور پر گر کر الہام کی روشنی پیدا کرنے کا موجب ہو گیا - اور خدا تعالےٰ نے آپ کو دنیا کی اصلاح کے لئے نبوت کے مقام پر سرفراز فرمایا -

چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تمام خاندان کا گذارہ ہی بتوں کی فروخت پر تھا اور تارہ خود بت پرست اور بت ساز تھا جیسا کہ بائیبل کی کتاب یشوع باب ۲۴ آیت ۲ سے ثابت ہوتا ہے اِس لئے اُن کے چچا اور چچا زاد بھائیوں نے ان کو مشورہ دیا کہ ہم پروہت ہیں اور ہمارا گذارہ ہی اِس پر ہے - اگر تم نے بتوں کی پرستش نہ کی تو ہمارا رزق بند ہو جائیگا - مگر آپ نے نہایت دلیری سے جواب دیا

کہ جن بتوں کو انسان اپنے ہاتھ سے گھڑتا ہے اُن کو میں ہرگز سجدہ نہیں کر سکتا۔ اس جواب کی اہمیت کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا صرف وہی کر سکتا ہے جسے قربانی کرنے کا موقعہ ملا ہو۔ آج جبکہ منظم حکومتیں دنیا میں موجود ہیں اس پُرامن زمانہ میں بھی میں نے دیکھا ہے کہ بعض لوگوں پر جب صداقت کھل جاتی ہے۔ تو وہ مجھے لکھتے ہیں کہ اگر ہم احمدی ہو جائیں تو ہمارے گذارہ کی کیا صورت ہوگی؟ ہمارے ساتھ ہمدردی کی کیا صورت ہوگی؟ آج جب احمدیت کو قبول کرنے میں کوئی خاص تکالیف نہیں ہیں سوائے معمولی تکالیف کے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ بڑی عمر کے اور بیوی بچوں والے یہ سوال کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہمدردی کی کیا صورت ہوگی گذارہ کا کیا انتظام ہوگا؟ لیکن حضرت ابراہیمؑ جو یتیم ہونے کی وجہ سے پہلے ہی شکستہ دل تھے اور جن کا پہلے ہی کوئی ٹھکانہ نہ تھا اپنے چچا کے ہاں اور اُس کی مہربانی سے پرورش پا رہے تھے وہ اپنے دل سے یہ سوال نہیں کرتے کہ اب گذارہ کی کیا صورت ہوگی! بلکہ بلا سوچے بہادرانہ طور پر یہ جواب دیتے ہیں کہ جن بُتوں کو انسان خود گھڑتے ہیں اُن کو میں سجدہ نہیں کر سکتا۔ بعینہٖ اسی قسم کا واقعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آیا۔ جب ایک لمبے عرصہ تک آپؐ نے شرک کے خلاف تعلیم دی اور ایک لمبی کوشش کے بعد اہل مکہ آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو دوبارہ اپنے دین میں شامل کرنے سے مایوس ہوگئے تو مکہ کے رؤساء آپؐ کے چچا ابوطالب کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کی خاطر ہم اب تک آپ کے بھتیجے سے نرمی کرتے رہے ہیں مگر ہمارے سایہ کے نیچے رہتے ہوئے اس نوجوان نے ہمارے معبودوں کو بہت بُری طرح ذلیل کیا ہے ہم اس پر سختی کر سکتے تھے مگر ہمیں آپ کا لحاظ تھا۔

اس لئے ہم نے اس سے وہ سلوک نہ کیا جس کا وہ مستحق تھا۔ مگر اب یہ بات ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوگئی ہے اور ہم یہ آخری پیغام لے کر آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ اسے سمجھائیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ اپنی تعلیم پیش نہ کرے بلکہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے معبودوں پر سختی سے حملہ نہ کرے اور تبلیغ میں نرمی کا پہلو رکھے اور اگر وہ آپ کے کہنے سے اتنا بھی کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو آپ اس سے قطع تعلق کریں اور ہم پر اس کا معاملہ چھوڑ دیں۔ اور اگر آپ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں تو گو ہمارے دلوں میں آپ کا بہت ادب ہے اور آپ کے خاندان کو فضیلت حاصل ہے۔ لیکن اب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ہم صبر نہیں کر سکتے اور آپ سے بھی ہمیں مجبوراً قطع تعلق کرنا پڑے گا۔ ابوطالب مومن نہ تھے اور ایمان کے بعد جو بہادری انسانی قلب میں پیدا ہو جاتی ہے اس سے محروم تھے۔ وہ رئیس تھے اور اُن کے نزدیک سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ریاست سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ اُن کے سامنے تھا۔ سارا مکہ اُن کو سلام کرتا تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ چھوڑنے کا یہ نتیجہ ہو سکتا تھا کہ کوئی اُن کو مُنہ بھی نہ لگاتا۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس قسم کی عزتوں کے لئے لوگ بڑی بڑی قربانیاں بھی کر دیتے ہیں اور ایک ایک سلام کے لئے مرا کرتے ہیں۔ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ سُنایا کرتے تھے کہ جب آپ تعلیم سے فارغ ہو کر نئے نئے بھیرہ میں آئے تو بعض مولویوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ وہابی ہیں اور بعض نے آپ کے خلاف کفر کے فتوے کی تحریک شروع کر دی۔ اُس وقت اس علاقہ میں ایک معزز پیر صاحب تھے جن کا بھیرہ اور اس کے نواح میں بہت اثر تھا۔ فتوائے کفر شائع کرنے والے اُنکے

پاس بھی گئے کہ دستخط کر دیں۔ باقی مولویوں سے تو حضرت
خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے دوست نہ ڈرتے تھے مگر ان
پیر صاحب کے متعلق انہیں ضرور خیال تھا کہ اگر یہ بھی
مولویوں کے ساتھ مل گئے تو فساد بڑھ جائیگا اس لئے
آپ کے دوستوں میں سے ایک زیرک دوست پیر صاحب
کے پاس پہنچے اور کہا سُنا ہے مولوی لوگ آپ سے فتویٰ
لینے آئے تھے۔ پیر صاحب نے کہا کہ ہاں آئے تھے
اور جو باتیں وہ کہتے تھے ٹھیک ہیں اور میرا ارادہ ہے
کہ فتویٰ دے دوں۔ اِس پر اُس دوست نے کہا کہ
آپ تو پیر ہیں اور سب نے آپ کو سلام کرنا ہے۔
نورالدین خواہ کچھ ہو۔ آپ کو سلام تو ضرور کرتا ہے
اور اگر آپ نے فتویٰ دے دیا تو وہ اور اُن کے دوست
آئندہ آپ کو سلام نہیں کریں گے۔ اِس پر پیر صاحب
گھبرا گئے اور کہنے لگے۔ بھلا ہم پیروں کا فتووں سے
کیا تعلق۔ آپ مولوی صاحب سے کہدیں کہ سلام
نہ چھوڑیں۔ اُس دوست نے آکر حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ
سے کہا کہ مَیں اِس طرح کر آیا ہوں اور اب پیر صاحب
چاہیں گے کہ آپ اُن کو سلام کریں۔ آپ نے فرمایا۔ ہمارا
کیا حرج ہے کر دیں گے۔ چنانچہ وہ دوست پھر
پیر صاحب کے پاس گئے۔ اور پیر صاحب سے کہا کہ
مولوی صاحب کہتے ہیں کہ پیر صاحب بڑے آدمی ہیں
ہم انکو سلام کیوں نہ کرینگے۔ اِس پر پیر صاحب بہت
خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اچھا ہم فلاں روز اس
طرف سے گذریں گے۔ مولوی صاحب سے کہنا کہ ضرور
سلام کریں۔ چنانچہ پیر صاحب مولوی صاحبؓ کے
مطب کے سامنے سے گذرے اور حضرت مولوی صاحبؓ
نے اپنے دوستوں سمیت باہر نکل کر اُن کو سلام کیا۔
پیر صاحب نے گھوڑا کھڑا کر لیا اور حضرت مولوی صاحب
سے باتیں کرنے لگے کہ دیکھو ہمارے پاس مولوی لوگ
فتویٰ کے لئے آئے تھے مگر ہم نے انکار کر دیا کہ ہم کو اِن
باتوں سے کیا تعلق ہے۔ ہمیں سب نے سلام کرنا ہوا۔
یہ واقعہ شہر میں پھیل گیا اور پیر صاحب کے مرید
اِس تحریک سے الگ ہو گئے اور مخالفت کا زور ٹوٹ
گیا۔ غرض ابو طالب کے لئے یہ بڑا امتحان تھا۔ وہ
سارے شہر میں مکرّم سمجھے جاتے تھے اور ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ اب اُن کی عزّت جاتی رہے گی۔ انہوں نے
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بلوایا اور کہا کہ اے
میرے بھتیجے مَیں سمجھتا ہوں کہ تو جو کچھ کرتا ہے سچ
سمجھ کر کرتا ہے اور مَیں نے بھی ہمیشہ تیری مدد کی
ہے اور تجھے دشمنوں سے بچایا ہے مگر اب میری قوم
کے لوگ میرے پاس آئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے
کہ یا تو اپنے بھتیجے سے کہو کہ تبلیغ میں نرمی کرے اور
یا پھر اس سے قطع تعلق کر لو اور اگر مَیں ایسا نہ کروں
تو قوم میرے ساتھ قطع تعلق کر لیگی اور تو جانتا ہے
کہ قوم کا مقابلہ مشکل ہوتا ہے۔ اب تو بتا تیری
کیا رائے ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس
وقت یہ بات سُنی۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر
آئے اور آپؐ نے فرمایا۔ اے میرے چچا۔ میرے دل
میں آپ کا بڑا ادب ہے۔ مگر سچائی کے مقابلہ میں
مَیں آپ کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ اگر دشمن
میری دائیں طرف سورج اور بائیں طرف چاند لاکر
کھڑا کر دیں تب بھی مَیں تبلیغ میں نرمی نہیں کرونگا۔
اور توحید کی اشاعت سے باز نہیں رہوں گا۔ مَیں
آپ کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہوں لیکن یہ بات
آپ کی نہیں مان سکتا۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ
دیں اور اپنی قوم سے صلح کر لیں۔ میرے لئے اللہ تعالیٰ
کافی ہے۔ اِس پر باوجود اِس کے کہ ابو طالب کیلئے
قوم کا چھوڑنا مشکل تھا اِس دلیرانہ جواب کو سُنکر

اُن پر ایسا اثر ہُوا کہ انہوں نے کہا کہ اگر قوم مجھے چھوڑتی ہے تو بیشک چھوڑ دے مَیں تجھے نہیں چھوڑوں گا ۔

ابوطالب کے اِس جواب کی اہمیت کا پورا اندازہ وہ لوگ نہیں لگا سکتے جو تاریخ سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک اَور واقعہ کو نہیں جانتے جس سے ابوطالب کی قلبی کیفیت کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی قوم سے کتنی محبت تھی ۔ جب اُن کی وفات کا وقت قریب آیا تو چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اُن سے بہت ہی محبت تھی ۔ اُن کی قربانیوں اور حسنِ سلوک کی وجہ سے آپؐ کو اس بات سے سخت دُکھ ہوا کہ آپ مسلمان ہوئے بغیر مر رہے ہیں ۔ آپ کبھی اُن کے دائیں جاتے اور کبھی بائیں اور کہتے کہ اے چچا! اب موت کا وقت قریب ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہہ دیجیئے ۔ مگر ابوطالب خاموش رہے اور کچھ جواب نہ دیا ۔ آخر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بہت اصرار کیا ۔ آپؐ پر رقّت طاری تھی ۔ اور آپؐ بار بار کہتے تھے کہ اے چچا! ایک دفعہ کلمہ پڑھ لیں تاکہ مَیں خدا کے حضور کہہ سکوں کہ آپ نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن ابوطالب نے آخر میں یہی جواب دیا کہ مَیں اپنی قوم کے دین کو نہیں چھوڑ سکتا ۔ گویا انکو اپنی قوم سے اتنی محبت تھی کہ وہ اس کے بغیر جنت میں بھی جانا نہ چاہتے تھے ۔ مگر اپنی قوم سے اس قدر شدید محبت رکھنے والے شخص پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہادرانہ جواب کا یہ اثر ہُوا کہ اُس نے کہہ دیا کہ اچھا اگر قوم مجھے چھوڑتی ہے تو چھوڑ دے مَیں تم کو نہیں چھوڑوں گا ۔

جوزیفس مشہور یہودی مؤرخ پُرانی کُتب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ابراہیمؑ پہلے آدمی تھے جنہوں نے دلیری سے خدا کے خالق ہونے اور ایک ہونے کا اعلان کیا ۔ اور کہا کہ سب ستارے خدا کے قبضہ میں ہیں اور اُسی کے حکم کے ماتحت حرکت کرتے ہیں ۔ چونکہ اُن کی قوم ستارہ پرست تھی اُن کی ستارہ پرستی کی مخالفت نے چیلڈئیز کا غصّہ بھڑکا دیا اور اُن کو اپنا ملک چھوڑ کر کنعان جانا پڑا ۔ سکتے ہیں کہ جب آپ چودہ برس کے تھے تو ستاروں اور بتوں کی پرستش سے بچنے کے لئے آپ نے اپنے باپ کو چھوڑ دیا اور خدا سے دُعا کی کہ وہ اُن کو انسانوں کی غلطیوں سے بچائے ۔ یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے زراعت کے بعض عمدہ طریق ایجاد کئے اور انہوں نے اپنے باپ تارہ کو توحید کی تعلیم دی مگر وہ لوگوں سے ڈرتا تھا اور اُس نے انکو خاموش رہنے کو کہا ۔ جب حضرت ابراہیمؑ کے بھائی بھی اُن کے مخالف ہو گئے تو انہوں نے بُت خانہ کو آگ لگا دی اور اُن کے بچانے کی کوشش میں اُن کا بھائی ہاران جل مرا (اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکڑی کے بُت تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تلوار سے اُن کو کاٹ دیا تھا) لکھا ہے کہ نئے سال کے چاند کو ایک دفعہ دیکھ رہے تھے تاکہ آئندہ سال کی فراخی کو معلوم کریں کہ ان کو الہام ہُوا کہ خدا کی مرضی کے مقابلہ میں ستاروں کا اثر کیا حقیقت رکھتا ہے ۔ آخر بہت دُعاؤں کے بعد آپ نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا ۔ تاکہ اعلیٰ صداقتوں کو دنیا میں قائم کریں ۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سال کی عمر میں اُن کو سچّا علم ملا ۔ بعض میں دس اور بعض میں چالیس لکھا ہے ۔ فلسطینی ربّیوں کے لٹریچر میں آپ کے متعلق بہت سی تفاصیل دی گئی ہیں اور آپ کے زمانہ کے بادشاہ کا نام نمرود بتایا گیا ہے اور چاند ستاروں کا واقعہ یوں لکھا ہے کہ تارہ نے نمرود سے

ڈر کر جو اُن کے بیٹے کو مارنا چاہتا تھا (کیونکہ نجومیوں نے اُسے بتایا تھا کہ ایک بچہّ پیدا ہُوا ہے جو تیری حکومت کو تباہ کر دیگا) تین سال تک حضرت ابراہیمؑ کو چھپائے رکھّا۔ جب وہ بھورے سے باہر نکلے تو سورج کو دیکھ کر انہوں نے خدا سمجھا۔ جب سورج ڈوبا تو چاند کو خدا اور ستاروں کو اس کا نوکر سمجھا۔ جب صبح ہوئی تو دونوں سے انکار کرکے کہا کہ خدا کوئی اَور ہو گا۔ اِسپر ابراہیمؑ نے باپ سے پوچھا۔ آسمان وزمین کس نے پیدا کئے ہیں۔ اُس نے جواب میں کہا کہ یہ بُت جو سامنے ہے یہ ہمارا خدا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ مَیں اسے نذر چڑھاؤں گا۔ اور عمدہ کھانا پکوا کر اُس کو دیا اُس نے نہ کھایا تو اَور اچھا کھانا پکوا کر سامنے رکھا جب پھر بھی اُس نے نہ کھایا اور نہ کوئی جواب دیا تو آگ سے اُس کو اور دوسرے بُتوں کو جلا دیا جب تارہ واپس آیا تو اُس نے پوچھا۔ اِن کو کس نے جلایا ہے۔ انہوں نے کہا۔ بڑا چھوٹوں پر ناراض ہو گیا۔ اور غصّہ میں اُس نے ان کو جلا دیا۔ باپنے کہا۔ بیوقوف جو نہ سُنے نہ دیکھے نہ چل سکے۔ وہ یہ کام کس طرح کر سکتا تھا۔ انہوں نے کہا۔ پھر تم زندہ خدا کو چھوڑ کر اِن کے پیچھے کیوں چل پڑے ہو۔ ایک دن ایک عورت کھانے کی کوئی چیز نذر لائی۔ ابراہیمؑ نے کہا۔ اِن کے مُنہ ہیں پر بولتے نہیں۔ آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ کان ہیں مگر سُنتے نہیں۔ ہاتھ ہیں مگر پکڑ نہیں سکتے۔ اِن کے بنانیوالوں اور ان پر اعتبار کرنے والوں کا بھی یہی حال ہو۔ یہ کہہ کر آپنے بُتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور پھر انہیں جلا دیا۔ اِس پر آپ نمرود کے سامنے پیش کئے گئے۔ اُس نے ان کو کہا کہ کیا تُو نہیں جانتا کہ مَیں خدا اور دنیا کا حاکم ہوں۔ آپ نے جواب دیا۔ اگر تُو خدا اور دُنیا کا حاکم ہے تو کیوں سورج کو مغرب سے نکال کر مشرق کی طرف نہیں چڑھاتا۔ اگر تُو خدا اور دنیا کا حاکم ہے تو بتا میرے دل میں اِس وقت کیا ہے اور میرا آئندہ کیا حال ہو گا؟ نمرود کی زبان بند ہو گئی اور وہ حیران رہ گیا۔ اور ابراہیمؑ نے اپنی بات کو جاری رکھا اور کہا کہ تُو کوتس کا بیٹا ہے اور اُسی کی طرح ایک فانی وجود ہے تو اپنے باپ کو موت سے نہیں بچا سکا۔ اور نہ تُو خود اِس سے بچ سکتا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ نمرود نے کہا۔ آگ کو پوج۔ ابراہیمؑ نے کہا۔ پانی کو کیوں نہیں وہ تو اُسے بُجھا دیتا ہے۔ اُس نے کہا۔ بہتر اُسی کو سہی۔ انہوں نے کہا۔ بادلوں کو کیوں نہیں جو پانی سے پُر ہوتے ہیں۔ اُس نے کہا۔ اُنہی کو سہی۔ انہوں نے کہا۔ ہَوا ان کو بھی اڑا دیتی ہے۔ اس نے کہا اُس کو پوج۔ انہوں نے کہا۔ انسان اس کے صدمہ سے بھی بچ جاتا ہے اور مکانوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ اس نے کہا پھر میں انسانوں کا بادشاہ ہوں۔ مجھے پوج۔ انہوں نے کہا۔ اگر تُو خدا ہے تو پھر سورج کو مغرب کی طرف سے نکال کر دکھا۔ اِسپر نمرود نے ابراہیمؑ کے جلانے کا حکم دے دیا۔ ایک لکڑیوں کا انبار پانچ گز مربع جمع کیا گیا اور اُس کو آگ لگائی گئی اور ابراہیمؑ کو اُس میں ڈالا گیا۔ اِسی کی طرف پیدائش باب ۱۵ آیت ۷ میں اشارہ ہے۔ بعض نسخوں میں اسجگہ لکھا ہے کہ "تجھے کسدیوں کی آگ سے نکال لایا۔" (جیوئش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ ابراہام)

چیلڈنیز میں سورج کی پرستش خاص طور پر کی جاتی تھی (نیلسن انسائیکلوپیڈیا) چیلڈنیز کا خدا MENODACK نامی تھا جو سورج کی شعاع یا دن کی روشنی سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ بنی نوع انسان کو نفع پہنچاتا ہے۔ اس کا نام بعل یعنی آقا بھی تھا۔ اِس کے علاوہ اُنکا

ایک بُت شمس تھا یعنی سورج دیوتا ۔ ایک سِنّین تھا یعنی
چاند دیوتا ۔ ایک نیبُو یعنی نبی دیوتا یا معلّم تھا ۔
(نیلسنز انسائیکلو پیڈیا بیلونیا کے ماتحت)
اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انہی واقعات
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
سے فرماتا ہے کہ اگر موسیٰؑ اور فرعون کے واقعات سے بھی
یہ لوگ کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے تو پھر تُو ان کے سامنے
ابراہیمؑ کے واقعات بیان کر کیونکہ ابراہیمؑ وہ نبی ہے جس کی
عزت مکّہ والوں کے قلوب میں جاگزیں ہے ۔ اور خصوصیت
کے ساتھ ان کے سامنے وہ واقعہ بیان کر جبکہ اُس نے
اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کس چیز کی عبادت
کرتے ہو ؟ چونکہ اُن کی قوم نے سورج اور چاند اور ستاروں
کے نام پر کئی قسم کے بُت بنائے ہوئے تھے جن کی وہ
پرستش کرتے تھے اس لئے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام
نے یہ سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم تو بُت پوجتے ہیں ۔
اور سارا دن اُن کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں حضرت ابراہیم
علیہ السلام نے کہا ۔ اچھا جب تم انکو پکارتے ہو تو کیا
اُن کی طرف سے کوئی جواب بھی ملتا ہے جس سے
پتہ لگے کہ انہوں نے تمہاری دعائیں سُن لی ہیں یا نفع اور
ضرر کی شکل میں کوئی نتیجہ بھی نکلتا ہے ؟ یعنی اگر وہ واقعہ
میں اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے ہیں تو جس طرح خدا تعالیٰ
لوگوں کی دُعائیں سُنتا ہے اسی طرح اِن بُتوں کو بھی
تمہاری دُعائیں سُننی چاہئیں ۔ اور جس طرح خدا اپنے
بندوں کو ہر قسم کی تکالیف سے بچاتا اور اُن کے لئے
رحمت اور برکت کے سامان پیدا کرتا ہے اسی طرح اِن
بُتوں کے اندر بھی یہ طاقت ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے
ماننے والوں کو فائدہ پہنچائیں اور جو لوگ ان کا انکار
کریں انہیں تباہ کر دیں ۔ مگر کیا یہ بُت ایسا کر سکتے ہیں ؟
کیا یہ تمہاری باتوں کا جواب دیتے ہیں یا کیا ان میں
طاقت ہے کہ وہ تمہاری کسی تکلیف کو دُور کر سکیں یا
تمہیں کوئی نفع پہنچا سکیں ۔ اگر ان میں کوئی بات بھی نہیں
پائی جاتی تو پھر تم ایسے بُتوں کی کیوں پرستش کرتے
ہو جو نہ سُنتے ہیں نہ بولتے ہیں اور نہ نفع اور ضرر
کی اپنے اندر کوئی طاقت رکھتے ہیں ۔ یہ دلیل ایسی
زبردست ہے کہ ایک صحابیؓ کہتے ہیں ۔ مجھے اسلام
قبول کرنے کی تحریک صرف اس لئے ہوئی کہ میں ایک دفعہ
سفر پر گیا تو عرب کے دستور کے مطابق میں نے پتھر کا
ایک چھوٹا سا بُت اپنے ساتھ رکھ لیا تاکہ وہ ضرورت
کے وقت کام آئے ۔ ایک دفعہ جبکہ میں ایک جنگل میں سے
گذر رہا تھا مجھے کوئی ضروری کام پیش آگیا ۔ میں نے اپنا
اسباب وہیں رکھا اور بُت کو پاس بٹھا کر کہا کہ حضور
میں تھوڑی دیر کے لئے باہر جا رہا ہوں آپ مہربانی فرما کر
میرے سامان کی حفاظت کریں ۔ جب میں واپس آیا تو
ایک گیدڑ ٹانگ اُٹھا کر اُس بُت پر پیشاب کر رہا تھا
یہ دیکھ کر میرے دل میں ایک آگ لگ گئی اور میں نے
کہا کہ جو بُت گیدڑ کے پیشاب سے اپنے آپ کو نہیں
بچا سکا اُس نے میرے اسباب کی کیا حفاظت کرنی ہے
چنانچہ میں نے اُس بُت کو وہیں پھینکا اور واپس آکر
مسلمان ہو گیا ۔
اِسی طرح ایک اَور صحابیؓ کہتے ہیں کہ مجھے توحید
کی اِس طرح سمجھ آئی کہ میں ایک دفعہ سفر پر گیا تو میں نے
اپنے ساتھ آٹے کا ایک بُت بنا کر رکھ لیا ۔ اتفاق ایسا
ہُوا کہ راستہ میں ہمارا آٹا ختم ہو گیا اور بھوک نے ہمیں
بے قرار کر دیا ۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح کوئی
اَور چیز مل جائے تو ہم گذارہ کر سکیں مگر ہمیں کوئی چیز نہ ملی
جب بھوک نے ہمیں سخت تنگ کیا تو ہم نے اُسی بُت کو
کوٹ کاٹ کر آٹا گوندھ لیا اور روٹی پکا کر کھا گئے ۔
جب ہم خوب سیر ہو چکے تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آئی

قَالَ اَفَرَءَيۡتُمۡ مَّا كُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۷۶﴾ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمُ

اُس نے کہا کیا تم کو معلوم ہے کہ جن کی تم عبادت کرتے چلے آئے ہو تم بھی اور تمہارے پرانے

الۡاَقۡدَمُوۡنَ ﴿۷۷﴾ فَاِنَّهُمۡ عَدُوٌّ لِّىۡۤ اِلَّا رَبَّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۷۸﴾

باپ دادے بھی وہ سب کے سب ربّ العالمین کے سوا میری تباہی چاہتے ہیں۔

کہ میں بھی کیسا احمق ہوں کہ جس وجود کو میں کوٹ کاٹ کر ہضم بھی کر گیا اُس کو میں اپنا خدا اور حاجت روا سمجھتا رہا ہوں۔ چنانچہ اس کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ سفر سے واپس آتے ہی میں مسلمان ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بُتوں کے اسی عجز اور بیچارگی کی طرف توجہ دلائی اور اُن سے پوچھا کہ بتاؤ۔ کیا یہ تمہیں کوئی نفع دیتے ہیں یا تمہارے دشمنوں کو ضرر پہنچا سکتے ہیں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے شرمندہ ہو کر کہا کہ نتیجہ تو کچھ نہیں نکلتا۔ لیکن ہم نے اپنے باپ دادوں کو دیکھا ہے کہ وہ ایسا ہی کرتے تھے۔ اِس لئے ہم نے بھی بُتوں کی پرستش شروع کر دی۔ ان کا یہ جواب بالکل ایسا ہی تھا جیسے حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ ایک بادشاہ کے دربار میں صفائی کرنے کے لئے ایک خاکروبہ اور ایک خاکروب آیا کرتا تھا۔ اُس خاکروب اور خاکروبہ نے سؤر پال رکھے تھے۔ اتفاقاً سؤر کا ایک بچہ مر گیا۔ پالے ہوئے جانور سے بھی انسان کو محبت ہو جاتی ہے چاہے وہ سؤر ہی ہو یا کوئی اَور جانور۔ اُن کے لئے سؤر کا بچہ ایسا ہی تھا جیسے ہمارے لئے گھوڑا یا کوئی اَور جانور۔ دربار کی صفائی کرتے ہوئے خاکروبہ کو اُس سؤر کے بچے کا خیال آ گیا اور وہ دربار کی ایک دیوار کے ساتھ اپنا سر رکھ کر رونے لگ گئی۔ اِتنے میں دربار کا ایک چپڑاسی آیا اور اُس نے خاکروبہ کو روتے دیکھ کر یہ خیال کیا کہ خدانخواستہ اندر کوئی حادثہ

ہو گیا ہے۔ مجھے پتہ نہیں لگا۔ اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا کہ میں رو نہیں رہا تو مجھ پر بے وفائی کا شبہ کر لیا جائیگا اِس لئے وہ بھی رونے لگ گیا۔ پھر ایک چوبدار آیا۔ اُس نے جو دیکھا کہ یہ دونوں رو رہے ہیں تو سمجھا کہ ضرور کوئی واقعہ ہؤا ہے جس کا مجھے پتہ نہیں لگا۔ اگر کوئی شخص آ گیا اور اُس نے دیکھ لیا کہ میں رو نہیں رہا تو وہ خیال کرے گا کہ مجھے بادشاہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خیال کر کے وہ بھی مصنوعی طور پر رونے لگ گیا۔ پھر کلرک آئے انہوں نے بھی اُن لوگوں کو دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔ پھر چھوٹے افسر آئے۔ درباری آئے۔ وزراء آئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ ہمارا تو کام تھا کہ ہم ہر وقت خبر رکھیں لیکن ہمیں اس حادثہ کا کوئی علم نہیں ہؤا۔ ضرور کوئی بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ رو رہے ہیں۔ اگر ہم نہ روئے تو ہم پر بے وفائی کا شبہ کر لیا جائیگا۔ یہ خیال کر کے وہ بھی رونے لگ پڑے۔ اور بڑے آدمیوں نے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے آنکھوں پر رومال رکھ کر رونا شروع کر دیا۔ اتنے میں ایک بڑا وزیر آیا وہ کچھ عقلمند تھا وہ رویا نہیں۔ اُس نے پاس والے وزیر سے دریافت کیا کہ کیا بات ہوئی ہے۔ اُس نے کہا۔ مجھے تو معلوم نہیں میرے پاس والے وزیر رو رہے تھے اِس لئے میں بھی رونے لگ گیا۔ اُس نے کہا۔ اُس سے پوچھو کیا بات ہے۔ جب اُس سے پوچھا گیا۔ تو اُس نے کہا۔ مجھے تو علم نہیں میرے ساتھ والا وزیر رو رہا تھا

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۹﴾ وَالَّذِیْ هُوَ

جس (ربّ العالمین) نے مجھے پیدا کیا ہے اور (اسکے نتیجہ میں) وہ مجھے ہدایت بھی دیگا - اور جس کی صفت یہ ہے کہ وہی

یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ﴿۸۰﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿۸۱﴾

مجھے کھانا کھلاتا اور وہی مجھے پانی پلاتا ہے - اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ شفا دیتا ہے -

وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿۸۲﴾ وَالَّذِیْۤ اَطْمَعُ

اور جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا - اور وہ ایسا ہے کہ میں اُمید کرتا ہوں

اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۸۳﴾

کہ وہ میرے گناہ جزا سزا کے وقت مجھے معاف کر دے گا۔ ۱۷ؔ

آخر بات خاکروبہ تک پہنچی - اس سے دریافت کیا گیا تو اُس نے بتایا کہ میرا سؤر کا بچّہ مرگیا تھا۔ مجھے وہ یاد آگیا تو مَیں نے رونا شروع کر دیا - جس طرح ایک خاکروبہ کو روتے دیکھ کر سارا دربار رونے لگ گیا تھا حالانکہ بات کچھ بھی نہیں تھی اِسی طرح انہوں نے کہا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو دیکھا تھا کہ وہ اِن بُتوں کی پرستش کرتے ہیں - جب ہم نے دیکھا کہ وہ اِن بُتوں کے آگے ہاتھ جوڑتے اور سجدے کرتے ہیں تو ہم بھی ہاتھ جوڑنے اور سجدہ کرنے لگ گئے۔

۱۷ؔ حل لغات :- اَلدِّیْنُ کے معنے ہیں اَلْجَزَاءُ وَالْمُکَافَأَۃُ - بدلہ - اَلْحِسَابُ - محاسبہ اَلْقَضَاءُ - فیصلہ (اقرب)

تفسیر :- حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں جواب دیا کہ تم مجھے اِن معبودوں کی حالت تو بتاؤ جن کی تم پرستش کرتے چلے آئے ہو - یعنی تم بھی اور تمہارے پہلے باپ دادا بھی - تمہارے یہ سب معبود میرے دشمن ہیں سوائے ربّ العالمین خدا کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے - اگر یہ بُت اپنے اندر کوئی طاقت رکھتے - تو کیا یہ سب مل کر مجھ اکیلے پر غالب نہ آجاتے اور مجھے تباہ و برباد نہ کر دیتے؟ اسجگہ عَدُوٌّ مفرد استعمال ہُوا ہے جو ھُمْ کی خبر کے طور پر آیا ہے - حالانکہ چاہیئے تھا کہ اَعْدَاءٌ کا لفظ استعمال کیا جاتا جو جمع ہے - سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ کبھی مبتدا کو جمع اور خبر کو مفرد لے آتے ہیں - چنانچہ اس سورۃ کے شروع میں ہی آتا ہے کہ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ - یعنی اے موسیٰ اور ہارونؑ! فرعون سے کہنا کہ ہم دونوں اپنے ربّ کے رسول ہیں حالانکہ موسیٰؑ اور ہارونؑ دو نبی تھے - اور بظاہر اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّكَ کی بجائے اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ کہنا چاہیئے تھا - مگر وہاں رَسُوْلَا رَبِّكَ کی بجائے اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّكَ اِسی لئے کہا گیا ہے کہ عربی زبان میں یہ طریق کلام رائج ہے - چنانچہ عربی میں کہتے ہیں - هٰذَانِ رَسُوْلِیْ وَوَکِیْلِیْ وَهُوُلَاءِ رَسُوْلِیْ وَوَکِیْلِیْ (فتح البیان جلد ۷ صفحہ) یعنی یہ دونوں میرے

رسول اور وکیل ہیں اور یہ سب میرے رسول اور وکیل ہیں حالانکہ هٰذَانِ کے بعد رَسُوْلَانِ آنا چاہیئے تھا یعنی یہ دونوں میرے رسول ہیں اور هٰٓؤُلَآءِ کے بعد رُسُلِیْ آنا چاہیئے تھا - کہ یہ سب میرے رسول ہیں - مگر تثنیہ کی خبر میں بھی واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا اور جمع کی خبر میں بھی واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا - پس یہ ایک مروجہ عربی کا طریق ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا -

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ کے متعلق بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ یہاں پتھر کے بے جان بتوں کو دشمن کیوں کہا گیا ہے - مفسرین نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں قلب نسبت سے کام لیا گیا ہے - یعنی جس طرح ہماری زبان میں یہ کہا جاتا ہے کہ پرنالہ چلتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ پرنالہ نہیں چلتا بلکہ پانی چلتا ہے اسی طرح یہاں کہا تو یہ گیا ہے کہ وہ میرے دشمن ہیں لیکن مراد یہ ہے کہ میں ان کا دشمن ہوں - چنانچہ فرّاء نے یہی معنے کئے ہیں اور ان الفاظ کو مقلوب قرار دیا ہے - لیکن میرے نزدیک اس جگہ مخالفوں کے عقیدہ پر تعریض کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ تم تو سمجھتے ہو کہ وہ معبود ہیں مگر میں ان کی عبادت نہیں کرتا اس لئے لازماً وہ میرے دشمن ہونگے سوائے رب العالمین خدا کے جس کی میں عبادت کرتا ہوں - پس اب ہم دیکھ لیں گے کہ رب العالمین خدا میری مدد کرکے مجھے بچاتا ہے یا تمہارے معبود میری دشمنی کرکے مجھے ہلاک کرتے ہیں - اگر ان بتوں میں بھی کوئی طاقت ہے تو چاہیئے کہ یہ مجھے ہلاک کردیں - لیکن وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے - جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بالکل بے بس ہیں اور ان میں کوئی طاقت نہیں - چنانچہ نتیجہ نے بتادیا کہ رب العالمین خدا نے ابراہیمؑ کو بچالیا اور اس کی قوم کے معبود اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے - اسی طرح اس پیشگوئی کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہودی جو حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو ماننے والے تھے وہ کامیاب ہوگئے اور ان کے دشمن تباہ ہوگئے -

پھر رب العالمین کے الفاظ استعمال فرماکر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ میں جس خدا پر ایمان رکھتا ہوں وہ ایک زندہ اور طاقتور خدا ہے مگر تمہارے معبودوں میں تو جان ہی نہیں انہوں نے کسی کی مدد کیا کرنی ہے ؟ بے شک رب العالمین کے معنوں میں یہ بھی داخل ہے کہ ہمارا خدا انسانوں کا بھی خدا ہے اور جانوروں کا بھی خدا ہے اور کیڑوں مکوڑوں کا بھی خدا ہے اسی طرح وہ عربوں کا بھی خدا ہے اور ایرانیوں کا بھی خدا ہے اور ہندوستانیوں کا بھی خدا ہے - لیکن رب العالمین میں جن جہانوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ زمانہ کے لحاظ سے بھی ہوسکتے ہیں - پس اس کے ایک معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ میں جس خدا کو پیش کرتا ہوں وہ ایک زندہ خدا ہے - وہ آدمؑ کے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا تھا - وہ نوحؑ کے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا تھا اور وہ میرے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا ہے اور بعد میں آنے والوں کا بھی خدا ہوگا - اور جو خدا آدم علیہ السلام کے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا تھا اور نوح علیہ السلام کے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا تھا اور ہمارے زمانہ کے لوگوں کا بھی خدا ہے اور بعد میں آنے والے لوگوں کا بھی خدا ہوگا - صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک زندہ خدا ہے اگر وہ زندہ خدا نہ ہوتا تو ہر زمانہ کے لوگوں کا کس طرح خدا ہوسکتا - پس رب العالمین کہہ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ میرا خدا ایک

زندہ خدا ہے جس سے ہر زمانہ کے لوگ ویسا ہی فائدہ اُٹھا
سکتے ہیں جیسے پہلے لوگ فائدہ اٹھاتے رہے ہیں مگر
تمہارے بُت نہ پہلے لوگوں کو کوئی فائدہ پہنچا سکے اور
نہ ہمیں کوئی فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ تم اپنے سارے
معبودوں کو میری تباہی کے لئے اکٹھا کر لو اور اُنکے
کے آگے رو رو کر دُعائیں کرو۔ پھر دیکھو کہ میرا رب العالمین
خدا جیتتا ہے یا تمہارے بُت فتح حاصل کرتے ہیں۔
گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتایا کہ جس طرح ایک
چھوٹا بچہ جب اکیلا گلی میں سے گذر رہا ہوتا ہے اور
گلی کے اوباش اور شریر لڑکے اُس کو دق کرنے کے لئے
اُس پر حملہ کرتے ہیں تو اُن کی آواز سُنکر اُس لڑکے کی
ماں بے تاب ہو کر اپنے گھر سے باہر نکل آتی ہے اسی طرح
میرا رب العالمین خدا میرے ساتھ ہے۔ تم میری کتنی بھی
مخالفت کرو اور مجھے کچلنے کے لئے خواہ انتہائی طاقت
صرف کر دو یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میرا خدا مجھے چھوڑ
دے اور تمہارے بُت خدائے واحد پر غالب آجائیں۔
دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ۔ دُنیا کے بڑے سے
بڑے مدبّر۔ دنیا کے بڑے سے بڑے لیڈر انسانی امداد پر
بھروسہ کرتے ہیں۔ اُن کی تکلیفوں کے وقت کچھ
انسان آگے آتے ہیں جو بعض دفعہ کامیاب ہوتے ہیں
اور بعض دفعہ ناکام۔ مگر جب کسی مومن کو تکلیف دی جاتی
ہے تو خدائے واحد خود آسمان سے اُتر آتا ہے اور
وہ لڑنے والوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ اور
یہ ایک بہترین انعام ہے جو کسی قوم یا فرد کو حاصل ہو
سکتا ہے۔ یہی انعام ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
اور آپ کی جماعت کو حاصل ہوا۔ یہی انعام ہے جو
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی جماعت کو حاصل
ہوا۔ یہی انعام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپکی
جماعت کو حاصل ہوا۔ اور یہی انعام ہے جو حضرت
ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی جماعت کو حاصل ہوا کہ ایک
زندہ خدا اور طاقتور خدا اُن کے ساتھ تھا۔ اور جب
بھی دشمن حملہ آور ہوتا تھا خدا آسمان سے اُتر کر اُن کے
ساتھ کھڑا ہو جاتا تھا اور وہ اُن کے لئے بڑے بڑے
نشانات ظاہر کرتا تھا۔ اور اس کا یہ پیار اتنی قیمتی چیز
تھا کہ اگر جائز ہوتا تو انسان تمنا کرتا کہ لوگ میری اور
بھی دشمنی کریں تاکہ میرے خدا کی محبت میرے لئے
اور زیادہ جوش مارے مگر اسلام نے ایسی خواہش سے
منع کر دیا ہے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کہ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ (بخاری کتاب التمنی)
اے مومنو! تم کبھی دشمن کے حملہ کی تمنا نہ کرو۔ آخر ہمیں
سوچنا چاہیئے کہ اس فقرہ کے معنے کیا ہیں؟ کون ہے جو
دشمن کے حملہ کی تمنا کیا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں تک
لڑائی کا تعلق ہے۔ جہاں تک مرنے کا تعلق ہے جہاں تک
تکالیف کا تعلق ہے کوئی شخص بھی دشمن کے حملہ کی تمنا
نہیں کر سکتا۔ مگر مسلمان ایسی حالت میں تھے کہ اُن کے
دل اسی نکتہ کے ماتحت جس کا مَیں نے ابھی ذکر کیا ہے
بعض دفعہ خواہش کر سکتے تھے کہ کاش ہمارا دشمن ہم پر
حملہ کرے تاکہ ہمارا خدا پھر ہماری مدد کے لئے ہمارے پاس
آجائے۔ پس صرف یہی وجہ تھی جس کو مدنظر رکھتے ہوئے
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے مسلمانو! جب
دشمن تم پر حملہ کرتا ہے تو خدا تمہارے ساتھ کھڑا ہو
جاتا ہے اور یہ بات تمہیں اتنی لذیذ معلوم ہوتی ہے اور
تمہیں اس میں اتنا مزا آتا ہے کہ جب دشمن حملہ چھوڑ دیتا
ہے تو تم کہتے ہو۔ کاش ہمارا دشمن ہم پر پھر حملہ کرے۔
تا ہمارا خدا پھر ہمارے پاس آجائے۔ مگر یہ خواہش
جہاں تک عشق کا سوال ہے وہاں تک تو درست ہے
لیکن الٰہی حکمتوں اور منشاء کے خلاف ہے اس لئے خدا تعالیٰ
کے ادب کے لحاظ سے ایسی خواہشات مت کیا کرو۔

ہاں جب دشمن تم پر خود بخود حملہ کر دیگا اور تمہارا خدا تعالیٰ سے سچا تعلق ہوگا تو یہ ممکن ہی نہیں کہ خدا تعالیٰ تمہیں چھوڑ دے کیونکہ خدا تعالیٰ کی یہ دائمی سنت ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی بھی مدد کرتا ہے اور اُن لوگوں کی تائید کے لئے بھی اپنے نشانات دکھاتا ہے جو اُن رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔

پس فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی اِسی سنتِ قدیم کی طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تمہارے یہ سب بُت جن کے سامنے تم اپنی ناکیں رگڑتے ہو میرے دشمن ہیں اگر اِن میں کوئی طاقت ہے تو میرے ربّ العالمین خدا کے مقابلہ میں جو ایک زندہ اور طاقتور خدا ہے مجھے نقصان پہنچا کر دکھائیں۔ یقیناً تمہارے بُت ناکام رہینگے اور میرا ربّ العالمین خدا ہمیشہ میرا ساتھ دیگا۔

اِسی طرح ربّ العالمین کے الفاظ میں یہ پیشگوئی بھی مخفی تھی کہ یہ دین آخر ایک عالمگیر صورت اختیار کرلیگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا نبی مبعوث ہوگا جو ساری دنیا کی طرف ہوگا اور جس کی فیض رسانی کے دائرہ سے کوئی متنفس بھی باہر نہیں رہیگا۔

پھر فرماتے ہیں۔ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ربّ العالمین خدا وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور اُس کے نتیجہ میں لازماً وہ تمام خطرات اور حوادث سے بچاتے ہوئے مجھے منزلِ مقصود پر پہنچائے گا۔ اور مجھے اپنے مقصد میں کامیاب کریگا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے پیدا کرے اور ایک مقصدِ عظیم کے لئے کھڑا کرے اور پھر اپنی محبت کا ہاتھ پیچھے ہٹا لے اور مجھے حوادث کا شکار ہونے دے۔ اِس کی صفت خلق اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کامیابی بھی اسی کی طرف سے آئے کیونکہ جو ہستی اپنے معرضِ وجود میں آنے کے لئے دوسرے کی محتاج ہے وہ ترقی کے وسائل اور ذرائع بھی خود بخود مہیّا نہیں کر سکتی بلکہ اس کیلئے بھی وہ اپنے خالق کی ہی محتاج ہوگی۔ اِس کی ایسی ہی مثال ہے۔ جیسے مَیں اگر کوئی مکان بناؤں تو جب تک میں اُس میں دروازے نہ لگاؤں۔ جب تک مَیں اُس میں کھڑکیاں نہ رکھوں۔ جب تک مَیں اُس میں طاقچے اور روشندان نہ بناؤں اُسوقت تک اُس مکان میں نہ دروازہ لگ سکتا ہے نہ کھڑکی لگ سکتی ہے نہ طاقچہ اور روشندان بن سکتا ہے۔ کیونکہ وہ میرا مکان ہے اور مَیں نے ہی اُسے بنایا ہے۔ اِسی طرح جب انسان کو ربّ العالمین خدا نے پیدا کیا ہے تو ربّ العالمین خدا ہی جب تک اس کی مادی اور روحانی ترقی کے سامان مہیّا نہ کرے اُسوقت تک وہ جسمانی اور روحانی طور پر کیسے ترقی کر سکتا ہے۔

اِن الفاظ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اپنی قوم کو اپنے غلبہ اور ترقی کی خبر دی ہے اور اپنے اِس یقینِ محکم کا اظہار کیا ہے کہ میرا خدا مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ بیشک میرا چچا مجھے چھوڑ دے میرے بھائی مجھے چھوڑ دیں میرے دوست مجھ سے الگ ہو جائیں میری قوم مجھ سے کنارہ کرے پھر بھی ربّ العالمین خدا جس کے کنارِ عاطفت میں مَیں نے اپنی زندگی بسر کی ہے اور جس کی گود میں مَیں نے پرورش پائی ہے مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ اور ہمیشہ مجھے عزت اور کامیابی اور غلبہ بخشیگا۔ وہاں آپ نے اپنی قوم کو اِس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تمہیں اپنی پیدائش کے مقصد پر غور کرنا چاہیئے اور اپنی زندگی کو رائیگاں نہیں کھونا چاہیئے۔ آخر اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ اُسے کسی اَور ہستی نے پیدا کیا ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس بات پر غور کرتے ہیں کہ انہیں کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ وہ دُنیا کی رعنائیوں اور دلچسپیوں میں کچھ ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ اُن کے دلوں میں اَور اَور

سوالات تو پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر اُن کے دلوں میں اگر سوال پیدا نہیں ہوتا تو صرف یہی کہ وہ کیوں پیدا کئے گئے ہیں ۔ ہم نے دیکھا ہے ۔ بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ ایسے جنگلوں میں جہاں کوئی آبادی نہیں ہوتی اور ایسے پہاڑوں میں جہاں انسان کا پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی انسان وہاں پہنچ سکتا ہے نہایت دلکش اور خوب صورت پھول کیوں پیدا کئے گئے ہیں ۔ پھر ہزاروں قسم کے کیڑے برسات کے موسم میں نکلتے ہیں اُن کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔ اِسی طرح سمندروں میں جھینگر اور دوسرے بعض بدشکل سمندری جانور پیدا کرنے سے کیا فائدہ ہے ۔ پھر قسم قسم کی جڑی بوٹیوں کو اتنی کثرت سے کیوں اُگایا گیا ہے ۔ اور زمین پر رینگنے والے کیڑے سانپ اور کنکھجورا وغیرہ کیوں پیدا کئے گئے ہیں ۔ غرض سمندر اور زمین پر اور ہوا میں ہزارہا ایسی چیزیں ہیں جن کے متعلق انسان سوال کرتا ہے کہ وہ کیوں پیدا کی گئی ہیں ۔ دشوار گذار پہاڑوں میں جہاں انسان بڑی مشکل سے پہنچتا ہے بعض اوقات نہایت خوبصورت پھولوں کا نظارہ انسان دیکھتا ہے تو اس کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے مقام پر اس قسم کے خوبصورت پھول پیدا کرنے کی کیا غرض تھی ۔ غرض اس قسم کے ہزاروں سوالات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنی اپنی عقل کے مطابق ان سوالات کے جواب دینے کی کوشش کرتا ہے ۔ مثلاً کہتا ہے کہ زہریلے کیڑوں یعنی سانپ وغیرہ کے زہروں سے اب بہت سی دوائیں تیار ہو رہی ہیں جو نہایت سریع الاثر ثابت ہوئی ہیں ۔ یا یہ کہ دشوار گذار مقامات پر یہ خوش کن نظارے اس لئے بنائے گئے ہیں کہ جو لوگ تکلیف ، مشقت اور محنت برداشت کر سکیں وہی ان نظاروں کو دیکھیں ۔ ان سوالات اور جوابات سے پتہ لگتا ہے کہ انسان اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ دُنیا میں ہر چیز کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ اور غرض ہونی چاہیئے مگر انسان کو کبھی یہ بھی خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کیوں پیدا کیا ہے ۔ اور میرے پیدا کرنے کی غرض و غایت کیا ہے ۔ وہ اور چیزوں کے پیدا کرنے کی غرض و غایت معلوم کرنے کا بہت شوق رکھتا ہے لیکن اس کے دل میں یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ میں کیوں پیدا کیا گیا اور میں اس غرض کو پورا بھی کر رہا ہوں یا نہیں ۔ اور اگر میں پیدا نہ کیا جاتا اور اگر میرا وجود نہ ہوتا تو دنیا کو کیا نقصان ہوتا ۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے ہیں جن کی زندگی ہوئی نہ ہوئی برابر ہوتی ہے کیونکہ انہیں نہ اپنی زندگی کی غرض و غایت کا علم ہوتا ہے اور نہ وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اگر تمام لوگ اس سوال پر غور کریں تو اُن میں سستی اور غفلت اور کام کو اُدھورا چھوڑنے کی عادت نہ رہے اور وہ ہر قسم کی قربانیوں سے کام لیکر اپنی روحانی ترقی کے لئے کوشش کریں ۔ آخر غور کرو ۔ دنیا میں کتنے لوگ ہٹلر ، نپولین اور تیمور بن سکتے ہیں نہ ساری دنیا ہٹلر بن سکتی ہے اور نہ ساری دُنیا نپولین بن سکتی ہے اور نہ ساری دنیا تیمور بن سکتی ہے ۔ کیونکہ دنیوی ترقی کا میدان بہت تنگ ہے ۔ لیکن ایک میدان ایسا بھی ہے جہاں ہر انسان اپنے آپ کو نمایاں کر سکتا ہے اور جتنا جی چاہے ترقی کر سکتا ہے اور کسی کو نقصان پہنچائے بغیر اور کسی کا راستہ روکے بغیر ترقی کر سکتا ہے اور وہ خدا رسیدہ بننے کا میدان ہے ۔ اس میں کسی کے بڑھنے سے کسی دوسرے کا نقصان نہیں اور پھر ہر پیشہ اور ہر درجہ کا انسان خدا رسیدہ بن سکتا ہے ۔ ایک بادشاہ اور اس کا بیٹا بھی خدا رسیدہ انسان بن سکتا ہے اور ایک فقیر بے نوا بھی خدا رسیدہ انسان بن سکتا ہے اور ایک نائی اور دھوبی بھی خدا رسیدہ انسان

بن سکتا ہے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک اقلیم میں دو بادشاہ نہیں ہو سکتے ۔ مگر اولیاء اللہ کا مقام وہ ہے کہ اقلیم تو کیا ایک گھر میں بلکہ ایک گھر تو کیا ایک کمرہ میں بھی دس اولیاء اللہ رہ سکتے ہیں ۔ اور اس میں کسی کا نقصان نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کے راستے اتنے وسیع ہیں کہ ان میں کبھی تنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جس طرح سمندر میں سے چڑیا چونچ بھر کر پانی لے جائے تو اس سے سمندر کے پانی میں کوئی کمی نہیں آتی اسی طرح اللہ تعالیٰ سے تعلق کا حال ہے یہ اتنا وسیع خزانہ ہے کہ جس میں کمی کا کوئی امکان نہیں ۔ دیکھو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کی اتنی محبت حاصل ہوئی کہ جس کی مثال باقی انبیاء میں نہیں ملتی مگر اسکے باوجود خدا تعالیٰ کے پاس ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ کو دینے کے لئے بھی محبت موجود تھی اور تمام صحابہؓ نے بھی اپنے اپنے ظرف کے مطابق اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کی ۔ پس ہمیشہ اس بات پر غور کرتے رہنا چاہیئے کہ ہماری پیدائش کی غرض کیا ہے ۔ پیدائش کی اصل غرض جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا پیارا بن جائے ۔ جب وہ یہ مقام حاصل کر لیتا ہے تو دنیا بے شک مٹ جائے خدا تعالیٰ کے رجسٹر سے اس کا نام کبھی نہیں مٹ سکتا ۔ وہ گدڑی میں پڑا ہوا بھی خدا تعالیٰ کا مقرب بن سکتا ہے اور اتنا بڑا بن سکتا ہے کہ دنیا کی بڑائیاں اُس کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہو جائیں ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو اِسی بنیادی نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور انہیں نصیحت کی ہے کہ تم اپنی پیدائش کے مقصد پر غور کرو اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کا جو سامان کیا ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ تمہاری زندگی بیکار چلی جائیگی اور تم اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے والے قرار پاؤ گے ۔

پھر فرماتے ہیں وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ رب العالمین خدا ہی ہے جو مجھے کھانا کھلاتا اور پانی پلاتا ہے ۔ ورنہ نہ گندم میری پیدا کی ہوئی ہے ۔ نہ پانی میرا بنایا ہوا ہے ۔ نہ نمک میرا بنایا ہوا ہے ۔ نہ مرچ میری پیدا کی ہوئی ہے ۔ نہ گوشت میرا پیدا کیا ہوا ہے ۔ نہ ترکاریاں میں نے پیدا کی ہیں ۔ یہ سب چیزیں میرے باپ دادا کی پیدائش سے بھی پہلے کی ہیں ۔ بڑے سے بڑے خاندان کا ذکر بھی سو پشتوں سے آگے نہیں جاتا ۔ لیکن گندم ۔ پانی ۔ ترکاری ۔ گوشت نمک ۔ مرچ اور مونگ وغیرہ ہزاروں پشتوں سے بھی پہلے کی ہیں ۔ پھر یہ انسان کی کس طرح ہو گئیں ہم اگر کھاتے ہیں تو اس لئے کہ خدا نے ہمیں ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی ہے ۔ ورنہ ہم میں طاقت نہیں تھی کہ یہ چیزیں خود مہیا کر سکتے ۔ اسی طرح جب ہم پانی پیتے ہیں اور اس بات پر غور کرتے ہیں کہ یہ پانی ہمیں کس طرح ملا تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانی خدا تعالیٰ نے ہی زمین کی تہوں میں رکھا ہوا ہے ۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں بار بار فرماتا ہے کہ اگر ہم اس پانی کو کھینچ لیں تو تم پانی کہاں سے لاؤ ۔ اور یہ بالکل سچی بات ہے کہ ہم میں کوئی طاقت نہیں کہ ہم پانی مہیا کر سکیں ۔ یہ سب خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ اُس نے یہ تمام ضروری اشیاء ہمیں مہیا کر دی ہیں ۔ اگر تھوڑی دیر بھی ہمیں پانی نہ ملے تو ہمیں سخت دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ چنانچہ جن علاقوں میں پانی کی کمی ہے وہاں لوگ ایسی ایسی چیزیں پیتے ہیں جن کو ہمارے علاقے میں پانی نہیں کہہ سکتے ۔ مثلاً سندھ اور بلوچستان کے بعض علاقے ایسے ہیں ۔ جہاں لوگ کیچڑ پیتے ہیں ۔ لیکن ہمارے ملک والے ایسا نہیں کر سکتے ۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں کوئی مشکل پیش آجائے ۔

تو وہ بھی اس قسم کا پانی پی لیں - ورنہ عام حالات میں ہمارے ہاں اسے پانی نہیں سمجھا جاتا - غرض کھانے اور پینے کی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مہیّا نہ کی ہو - لیکن چونکہ خدا تعالیٰ کا وجود مخفی ہے اور وہ پسِ پردہ احسان کرتا ہے اس لئے باوجود اس کے کہ اُس کے احسانات بہت زیادہ ہیں لوگ انہیں محسوس نہیں کرتے - ماں اپنی چھاتیوں سے دودھ پلاتی ہے - اور بچہ اپنی عقل کے مطابق سمجھتا ہے کہ ماں اس پر احسان کرتی ہے اور اپنا خون اُسے چوساتی ہے حالانکہ یہ قربانی کا جذبہ ماں نے خود پیدا نہیں کیا - یہ جذبہ اُس کی پیدائش سے بھی پہلے اُس کے اندر رکھا گیا تھا - چنانچہ دیکھ لو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں گڑیاں بناتی ہیں اور اُن سے کھیلتی ہیں - یہ وہی بچہ پالنے کا جذبہ ہوتا ہے جو اُن کے اندر پایا جاتا ہے - اُن کے اندر یہ حِس خدا تعالیٰ نے ہی پیدا کی ہے خواہ وہ عقل کے ماتحت ایسا کرتی ہیں یا بے عقلی کے ماتحت ایسا کرتی ہیں - بہر حال عورت کے اندر خدا تعالےٰ نے اولاد سے محبت کرنے کا مادہ رکھا ہے - اور یہ وہ چیز ہے جو ماں نے خود اپنے اندر پیدا نہیں کی بلکہ اُس کی پیدائش سے بھی پہلے اُس کے اندر رکھ دی گئی تھی - اور جب یہ مادہ ماں کی پیدائش سے پہلے کا اُس کے اندر پایا جاتا ہے تو پھر یہ اس کا پیدا کیا ہُوا نہ ہُوا - اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مادہ ماں کا پیدا کیا ہُوا نہیں تو آخر یہ مادہ ماں کے اندر کس نے پیدا کیا ہے - بہر حال وہ کوئی اور ہستی ہے - اور ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ہستی جس نے سب مخلوقات کو پیدا کیا ہے اُسی نے یہ مادہ ماں کے اندر رکھا ہے - مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بچّہ ماں سے محبت کرتا ہے خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کرتا اسلئے کہ خدا تعالےٰ اُسے نظر نہیں آتا - جب اُس کی ماں اپنی ماں کے پیٹ میں تھی اور خدا تعالےٰ کے فرشتے اُس کے دل میں اولاد کی خواہش اور محبت پیدا کر رہے تھے تو اُس نے اس نظارہ کو دیکھا نہیں تھا - اُس نے صرف اتنا ہی دیکھا کہ ماں اُسے اپنی چھاتیوں سے دودھ پلا رہی ہے خواہ وہ فاقہ ہی کر رہی ہو اور بھوک کی وجہ سے نڈھال ہو رہی ہو - وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہو - اُس کا گوشت گھُل گیا ہو اور ہڈیاں نکل آئی ہوں - لیکن اِدھر بچّہ رویا اُدھر ماں نے اپنے سوکھے ہوئے پستان اُس کے مونہہ میں دے دیئے - خواہ پستانوں میں دودھ کا کوئی قطرہ ہو یا نہ ہو - ماں کے اندر یہ جذبہ کس ہستی نے پیدا کیا ہے وہ بچّہ کو نظر نہیں آتی - اس لئے وہ اُس سے محبّت نہیں کرتا - ماں اپنی چھاتیوں سے دودھ پلاتی ہوئی اُسے نظر آتی ہے اس لئے وہ اُس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے - انسان کھانا کھاتا ہے جس شخص نے اُسے گندم دی اور اُس نے اُس سے روٹی بنائی وہ اُس کا شکریّہ ادا کرتا ہے یا جس کی نوکری کر کے اُس نے پیسے کمائے اور اُن سے اُس نے گندم خریدی وہ اُس کا شکریّہ ادا کرتا ہے جس ماں اور بیوی نے اُسے روٹی پکا کر کھلائی وہ اُن کا شکریہ ادا کرتا ہے - لیکن جس نے گندم بنائی جس نے نمک بنایا جس نے پانی بنایا وہ اُس کا شکریّہ ادا نہیں کرتا - اِس لئے کہ گندم مہیّا کرنے والا یا ملازمت دینے والا اُسے نظر آتا تھا - ماں اُسے نظر آتی تھی کہ وہ گرمی کے دنوں میں آگ کے آگے بیٹھی روٹی پکا رہی ہے یا سردی میں جب وہ خود لحاف سے باہر نہیں نکلتا وہ صحن میں بیٹھی اس کیلئے ناشتہ تیار کر رہی ہے چونکہ وہ اُسے نظر آتی ہے اِس لئے اُس کے اندر احساسِ شکریّہ پیدا ہو جاتا ہے - لیکن چونکہ اُسے اِس احسان کا اصلی بانی نظر نہیں آتا اِس لئے اُسے یہ خیال نہیں آتا کہ دراصل

یہ احسان کسی اور ذات نے کیا ہے ۔

ہمارے ملک میں لطیفہ مشہور ہے ۔ واللہ اعلم وہ سچا ہے یا عام حالات میں وہ خود بنا لیا گیا ہے جب ہمارے ملک پر انگریز حاکم تھے ۔ لوگوں میں انہیں خوش کرنے کے لئے ڈالیاں پیش کرنے کا رواج تھا ۔ بعد میں اگرچہ یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ افسروں کو ڈالیاں پیش نہ کی جائیں لیکن حکام اور رؤسائے شہر کو جب موقعہ ملتا اور وہ انگریز افسروں کو ملنے کے لئے جاتے تو اُن میں سے بعض ہوشیار لوگ ڈالیاں بھی لے جاتے تھے ۔ کہتے ہیں ایک انگریز افسر کو ایک ای ۔ اے ۔ سی اور ایک تحصیلدار ملنے کے لئے گئے ای ۔ اے ۔ سی ڈالی بھی ساتھ لے گیا ۔ یہ تو سارے جانتے ہیں کہ ای ۔ اے ۔ سی بڑا ہوتا ہے اور تحصیلدار چھوٹا ہوتا ہے کیونکہ علاقوں کا چارج ہی ای ۔ اے ۔ سی کے پاس ہوتا ہے ۔ اور تحصیلدار اسکے ماتحت ہوتا ہے پس جب وہ دونوں ملاقات کیلئے گئے تو اتفاقاً انگریز افسر کے پاس ملاقات کا وقت تھوڑا تھا اسلئے بجائے اِس کے کہ وہ دونوں کو الگ الگ بلاتا ۔ اُس نے کہلا بھیجا کہ دونوں آجاؤ ۔ جب ای ۔ اے ۔ سی ڈالی کو اُٹھانے لگا تو تحصیلدار نے آگے بڑھ کر ڈالی اُٹھالی ۔ اور کہا حضور ہمارے ہوتے ہوئے آپ یہ تکلیف کیوں کریں ۔ چنانچہ تحصیلدار نے ڈالی اُٹھالی اور بڑے آرام سے اندر جا کر انگریز افسر کے سامنے رکھ دی اور یہ نہ کہا کہ یہ ڈالی ای ۔ اے ۔ سی نے پیش کی ہے ۔ وہ انگریز افسر اسی اثر کے ماتحت کہ ڈالی تحصیلدار نے پیش کی ہے ای ۔ اے ۔ سی کی طرف پیٹھ کر کے اور تحصیلدار کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ گیا اور اُس سے حالات پوچھنے لگا ۔ ای ۔ اے ۔ سی دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا ۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا ۔ برابر دو گھنٹے تک انگریز افسر تحصیلدار سے باتیں کرتا رہا ۔ اور اُس نے ای ۔ اے ۔ سی کو پُوچھا تک نہیں ۔ ملاقات سے فارغ ہو کر جب باہر آئے تو ای ۔ اے ۔ سی نے غصہ نکالنا شروع کیا کہ تم نے کیوں یہ حرکت کی تحصیلدار نے کہا حضور یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ آپ میرے سامنے بوجھ اُٹھاتے ۔ اب ڈالی تو ای ۔ اے ۔ سی لایا تھا ۔ لیکن چونکہ وہ ڈالی تحصیلدار نے انگریز افسر کے آگے رکھی تھی اس لئے وہ اس پر مہربان ہو گیا ۔ یہی حال انسان کا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے ڈالی آتی ہے لیکن ماں باپ ۔ بیوی بچہ ۔ بہن یا بھائی وہ ڈالی اُٹھا کر اُس کے سامنے رکھدیتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اصل ڈالی پیش کرنے والے وہی ہیں حالانکہ اُن کے پیچھے خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے ۔

اسلام نے انسان کو یہ یاد دلانے کے لئے کہ حقیقی محسن خدا تعالیٰ ہی ہے یہ ترکیب رکھ دی کہ جب تم کھانا کھاؤ ۔ یا پانی پیو ۔ تو اس کے شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لیا کرو ۔ اور کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کے یہ معنے ہیں کہ یہ کھانا تمہارے سامنے رکھا تو ماں نے ہے لیکن بھیجا خدا نے ہے ۔ یا کھانا تمہارے سامنے رکھا تو بیوی نے ہے لیکن بھیجا خدا تعالیٰ نے ہے یا کھانا تمہارے سامنے رکھا تو تمہارے بھائی نے ہے لیکن بھیجا خدا تعالیٰ نے ہے ۔ اور جب انسان کو پتہ لگ جاتا ہے اور بار بار یہ مضمون اُس کے سامنے دُہرایا جاتا ہے کہ درحقیقت یہ تمام نعمتیں عطا کرنے والا خدا تعالیٰ ہی ہے ۔ وہی ہمیں کھانا دیتا ہے وہی ہمیں پانی دیتا ہے ۔ وہی ہمیں پہننے کو کپڑا مہیا کرتا ہے تو آہستہ آہستہ اُس کی طرف دل مائل ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ میں یہی نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اصل احسان خدا تعالیٰ کا ہے جس نے ہمیں کھانے پینے کو دیا ۔ اور جب وہی محسن حقیقی ہے تو انسان کی یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ وہ محسن حقیقی کو تو چھوڑ دیتا ہے اور ان لوگوں کے آگے جھکنا شروع کر دیتا ہے جن کو اُس نے صرف ایک درمیانی واسطہ بنایا ہے ۔ گویا وہ

شاخ پر تو ہاتھ مارتا ہے اور تنے کو نظر انداز کر دیتا ہے ایسا انسان یقیناً اپنی روحانی ترقی کا راستہ اپنے ہاتھ سے بند کرتا اور خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ

جب میں بیمار ہوتا ہوں تو خدا تعالیٰ مجھے شفا بخشتا ہے

آپ نے اسجگہ مَرِضْتُ میں مرض کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور شفاء کو خدا تعالیٰ کی طرف۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں وہ سب کی سب انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی ہیں۔ جب انسان اُن کو غلط استعمال کرتا ہے تو اس وقت وہ بیمار ہو جاتا ہے یا نقصان اُٹھاتا ہے اور جب انسان پھر اس کا کسی رنگ میں ازالہ کر دیتا ہے اور علاج کرتا ہے تو شفا پا جاتا ہے۔ اس لئے مرض تو انسان کی طرف منسوب ہوتی ہے اور شفاء خدا تعالیٰ کی طرف۔ دنیا میں جتنی مصیبتیں اور بلائیں انسان پر وارد ہوتی ہیں اُن پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ساری کی ساری خدا تعالیٰ کی نعمتوں کے غلط استعمال کی وجہ سے آتی ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا صحیح استعمال کیا جائے تو انسان ان مصائب اور بلاؤں سے بچ سکتا ہے۔ مثلاً بیماری ہے۔ یہ کیوں پیدا ہوتی ہے؟ یہ اسلئے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ ایسی چیزیں کھاتے ہیں جن سے اُن کے اعضائے انہضام بگڑتے ہیں یا وہ ایسی چیزیں کھاتے ہیں جو اپنے وجود میں تو نقصان دہ نہیں ہوتیں۔ مگر اعتدال سے زیادہ استعمال کر لینے کی وجہ سے یا غلط استعمال کرنے کی وجہ سے وہ بیمار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً خربوزہ ہے۔ جہاں تک خربوزے کا سوال ہے یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ لیکن اسی نعمت کو اگر اعتدال سے زیادہ استعمال کیا جائے تو مصیبت بن جاتی ہے اور بیماری پیدا ہوتی ہے۔ یا آم ہے۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کی نعمت ہے۔ لیکن حد سے زیادہ کھا لینے سے نقصان ہوتا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی نعمتیں ہیں اُن کو ایک حد کے اندر استعمال کیا جائے تو فائدہ مند ہیں اور جب حد سے تجاوز کیا جائے تو بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً بینگن اور کریلے گرم ہوتے ہیں۔ اگر یہ حد کے اندر کھائے جائیں تو نعمت ہیں لیکن حد سے زیادہ کھائے جائیں تو بینگن سے بواسیر اور کریلوں سے پیچش وغیرہ ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح گنّا ہے۔ اگر اس کا استعمال حد کے اندر کیا جائے تو نہایت فائدہ مند ہے لیکن اگر زیادہ استعمال کیا جائے تو پیشاب کی بعض امراض لاحق ہو جاتی ہیں۔ اب جہانتک گنّے کا سوال ہے وہ بیماری پیدا نہیں کرتا۔ بیماری پیدا کرنے والی چیز گنّے کا حد سے زیادہ استعمال ہے۔ ورنہ شوگر انسانی جسم کے لئے نہایت ضروری چیز ہے۔ گلوکوز کو ہی دیکھ لو یہ شوگر ہی ہے۔ لیکن ڈاکٹر جب مریضوں کو گلوکوز کا انجیکشن کرتے ہیں تو اُن کی چھوٹی ہوئی نبضیں بھی چل پڑتی ہیں۔ پہلے زمانہ میں لوگ ناواقفیت سے ذیابیطس کا علاج کرتے ہوئے شکر کو بالکل ختم کر دیتے تھے حالانکہ اس کا باقی رہنا ضروری ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کئی لوگ جن کی شوگر بالکل ختم کر دی جاتی تھی اُن کا ہارٹ فیل ہو جاتا تھا۔ آجکل بھی انسولین کا ٹیکہ کرتے وقت ڈاکٹروں کو یہ ہدایت ہوتی ہے کہ اگر مریض کے قلب پر اس کا اثر ہو تو فوراً اسے گلوکوز کا ٹیکہ کر دو۔ اور جب ایسا کیا جاتا ہے تو مریض سنبھل جاتا ہے۔ پس جتنی بیماریاں انسان کے اندر پیدا ہوتی ہیں وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کے غلط استعمال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ان نعمتوں کا صحیح استعمال کیا جائے تو کبھی بیماری پیدا نہ ہو۔ خدا تعالیٰ نے انسان فائدہ کے لئے لوہا پیدا کیا ہے۔ جب تک اس کا صحیح استعمال کیا جائے یہ نہایت فائدہ مند چیز ہے اور ہر قسم کی مشینریاں اس سے تیار ہوتی ہیں جو انسان کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ لیکن جب اس کا غلط استعمال

کیا جائے تو یہی چیز نقصان دہ ہوجاتی ہے ۔ مجھے اپنا بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے کہ ہمارے مکانوں کی تعمیر کیلئے سیالکوٹ سے ترکھان آئے ہوئے تھے ۔ میں اُن کو کام کرتے دیکھتا ۔ اور جب وہ تیشہ چلاتے تو میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوتا کہ میں اسکو چلا کر دیکھوں ۔ وہ تو روزی کمانے کے لئے کام کرتے تھے مگر میں سمجھتا تھا کہ ان کو اِس فعل میں مزا آتا ہے اور میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ میں کیوں نہ یہ مزا اُٹھاؤں ۔ میں نے بہت دفعہ کوشش کی کہ تیشہ چلا کر دیکھوں لیکن وہ مجھے ہاتھ نہ لگانے دیتے تھے اور کہتے تھے ۔ زخمی ہوجاؤ گے ۔ مگر میں اُن کے منع کرنے سے سمجھتا تھا کہ وہ مجھے اِس مزے سے محروم رکھنا چاہتے ہیں ۔ آخر ایک دن میرا داؤ چل گیا وہ لوگ نماز پڑھنے کیلئے مسجد میں گئے ہوئے تھے اور اُنکے ہتھیار وہیں پڑے تھے ۔ میں نے تیشہ اُٹھایا اور چلانا شروع کر دیا ۔ مگر پہلی ہی چوٹ لگائی تھی کہ تیشہ میرے ہاتھ پر آ لگا اور میں زخمی ہوگیا ۔ چنانچہ اِس زخم کا نشان اب تک موجود ہے ۔ اب دیکھو خدا تعالیٰ نے تیشہ اس لئے نہیں بنایا تھا کہ انسان زخمی ہو مگر اُس کے غلط استعمال نے میرے ہاتھ کو زخمی کر دیا ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں وہ سب کی سب انسان کے فائدہ کے لئے ہیں لیکن ان کے غلط استعمال سے اُسے نقصان ہوتا ہے ۔ مثلاً لڑائی میں دوسرے پر تلوار یا خنجر سے حملہ کیا جاتا ہے جس سے وہ ہلاک ہوجاتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے لوہا اِس لئے بنایا تھا کہ دوسرے کے سر پر مارا جائے ۔ اگر اُسی لوہے کو بجائے انسانوں پر استعمال کرنے کے اُس سے چاقو اور چھریاں بنائی جائیں اور ان سے ترکاریاں وغیرہ کاٹنے کا کام لیا جائے یا اُس کی کلہاڑیاں بنائی جائیں جن سے درخت کاٹے جائیں یا اس سے ہل چلانے والے اوزار بنائے جائیں اور اُس کی مشینیاں تیار کی جائیں تو یہ ایک نہایت ہی مفید چیز ہے لیکن اگر اُسی لوہے کو دوسرے کے سر پر مارا جائے تو اُس کا سر پھٹ جائیگا ۔ پس دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کا اچھا استعمال کیا جائے تو وہ نقصان پہنچائے ۔ نقصان پہنچانے والی چیز ان نعمتوں کا بُرا استعمال ہوتا ہے نہ کہ خود وہ نعمتیں مثلاً سانپ اور بچھو کا زہر نہایت خطرناک چیز ہے ۔ مگر ہومیوپیتھک والوں نے کئی قسم کے امراض کے علاج میں اسے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے اور اسے نہایت مفید پایا ہے ۔ جن مریضوں کے ناخن پھٹ جاتے ہیں ان کو سانپ کا زہر ہومیوپیتھک دوا کی صورت میں دیدو تو فوراً آرام آجائے گا ۔ اسی طرح سنکھیا ہے ۔ اِس کے کھانے سے لوگ مرتے بھی ہیں لیکن دیکھنا تو یہ چاہیئے کہ اس کے کھانے سے کتنے لوگ مرتے ہیں اور کتنے زندہ ہوتے ہیں ۔ اگر اندازہ لگایا جائے تو سال میں ہزار دو ہزار آدمی سنکھیا کھانے سے مرتے ہیں ۔ لیکن جو لوگ اس سے شفا پاتے ہیں اُنکی تعداد لاکھوں تک ہے ۔ پُرانے ملیریا کے مریض پر جب کوئی دوا اثر نہیں کرتی تو وہ سنکھیا کی قلیل مقدار سے ٹھیک ہوجاتا ہے ۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے امراض کے لئے یہ مفید ہے ۔ اسی طرح کچلہ ہے ۔ یہ بھی زہر ہے اس کے کھانے سے کئی لوگ مر جاتے ہیں لیکن لاکھوں لاکھ انسان اس سے بچتے بھی ہیں ۔ اسی طرح بہت بڑی تباہی والی چیز افیون ہے ۔ لیکن اس کی تباہی کے مقابلہ میں اس کے فوائد بہت زیادہ ہیں ۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ اطباء کا قول ہے کہ طب کی آدھی دوائیں ایسی ہیں جن میں افیون استعمال ہوتی ہے اور اس کا اتنا فائدہ ہے کہ اندازہ لگانا مشکل ہے ۔ جب انسان کو بے چینی اور بیکلی ہوتی ہے ۔ جب

انسان کی نیند اُڑ جاتی ہے جب انسان درد سے نڈھال ہو کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو اُس کو مارفیا کا ٹیکا لگاتے ہیں جس سے اُسے فوراً آرام ہو جاتا ہے پس دُنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اپنی ذات میں نقصان دینے والی ہو۔ نقصان دینے والی چیز صرف غلط استعمال ہے جو انسان کی اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اِسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مرض کو اپنی طرف اور شفاء کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے مگر ہمارے ملک میں ایک مسلمان خدا تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے جب کسی کام میں ناکام ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے۔ مَیں نے تو پُورا زور لگا دیا تھا لیکن خدا تعالیٰ نے مجھے ناکام کر دیا۔ گویا وہ خوبی کو اپنی طرف اور بُرائی کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی بڑی بھاری ہتک ہے جو ہمارے ملک میں کی جاتی ہے حالانکہ سچے مومن کا یہ طریق ہوتا ہے کہ جب اس کے کام کا اچھا نتیجہ نکل آتا ہے تو وہ کہتا ہے الحمد للہ خدا تعالیٰ نے مجھے کامیاب کر دیا۔ اور اگر خراب نتیجہ نکلتا ہے تو وہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا ہے۔ اور کہتا ہے مَیں اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے ناکام رہا ہوں۔ ورنہ خدا تعالیٰ نے تو میرے لئے برکت اور رحمت ہی کے سامان کئے تھے۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے برکت اُسی کو ملتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح عیب اپنی طرف اور خوبی خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کہتا ہے۔ میرے اِس بندہ نے چونکہ عیب اپنی طرف اور خوبی میری طرف منسوب کی ہے۔ اس لئے اب میرا فرض ہے کہ مَیں اِسے پوری طرح کامیاب کر دوں تاکہ تمام خوبیاں میری طرف ہی منسوب ہوں لیکن جب وہ ایسا نہیں کرتا اور خدا تعالیٰ کو تمام خرابیوں کا ذمہ وار قرار دیتا ہے تو خدا تعالیٰ بھی اُس کی مدد سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔

پھر فرماتے ہیں وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ میرا خدا وہ ہے جو مجھے ماریگا اور پھر مجھے زندہ کرے گا۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات مُحْیِي اور مُمِیْت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ اُس کے زندہ کرنے کا ثبوت تو وہ ہزاروں لاکھوں بچّے ہیں جو روزانہ دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور ایسے حالات میں پیدا ہوتے ہیں جو انسان کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں اور ایسے حالات میں سے گذر کر بڑھتے ہیں کہ اگر کسی بالا ہستی کا تصرف نہ ہو تو اُن کے بڑھنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکتی۔ ایک جانور کا بچہ صرف چند دن میں ہی اپنی ضرورتوں کو خود بخود پورا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے چڑیوں کے بچے ایک یا ڈیڑھ ہفتہ میں اُڑنے لگ جاتے ہیں۔ مرغیوں کے بچے تین چار ہفتہ میں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے لگ جاتے ہیں۔ چوپایوں کے بچے پیدا ہوتے ہی تھوڑی دیر میں اچھلنے کودنے لگ جاتے ہیں مگر انسان کا بچہ چھ سات مہینے بلکہ بعض دفعہ نو نو ماہ تک گودی میں اُٹھائے رکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات تو سات آٹھ بلکہ نو مہینہ تک وہ گھٹنوں کے بل چلنے کے بھی قابل نہیں ہوتا۔ پھر اُس کی غذا جس سے وہ پرورش پا سکتا ہے اُس کی ماں کی چھاتیوں میں ہوتی ہے۔ کہیں دو تین سال میں جاکر وہ دانت نکالتا ہے۔ بیشک ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جو چھ یا سات مہینہ میں ہی اپنے دانت نکال لیتے ہیں یا نکالنے شروع کر دیتے ہیں مگر بالعموم ایسے دانت جن سے بچہ کسی قدر غذا حاصل کر سکتا ہے وہ ڈیڑھ دو بلکہ اڑھائی سال کے بعد مکمل ہوتے ہیں اتنے لمبے عرصہ تک اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر ایک عورت جو اپنے بچے کی خدمت کرتی ہے یہ بغیر اس کے کبھی ممکن ہی نہیں تھا جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے دل میں پرورش کا خیال اور بچہ کی محبت پیدا نہ کر دی جاتی۔ یہ مت خیال کرو کہ صرف ماں ہونا ہی اس محبت کا موجب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ

ماں کے جذبات اس کے اپنے اختیار کی چیز نہیں اور اختیاری چیز ہی کسی انسان کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے جو چیز کسی انسان کے اختیار کی نہیں وہ اُسکی طرف منسوب کس طرح کی جاسکتی ہے وہ تو لازماً کسی ایسی ہستی کی طرف منسوب کرنی پڑیگی - اور وہ ہستی اللہ تعالیٰ کی ہی ہے جس نے ماں کے دل میں اپنے بچوں کی محبت پیدا کی اور اُسے پیدائش اور پرورش کی تکالیف برداشت کرنے کی طاقت دی چنانچہ سالہا سال تک وہ اپنے بچوں کو پالتی رہتی ہے پہلے نو ماہ تو وہ اپنے بچہ کو پیٹ میں اُٹھاتی ہے - پھر دو سال اُسے گود میں اُٹھاتی ہے - گویا اوسطاً اڑہائی سال تک ماں اپنے بچہ کی ہی ہو رہتی ہے تب کہیں وہ پرورش پاتا ہے - مگر اس کے بعد وہ فارغ نہیں ہو جاتی بلکہ بالعموم اُسی وقت ایک دوسرے بچہ کی آمد شروع ہو جاتی ہے اور اس طرح اپنی زندگی کا بہترین حصّہ عورت اپنے بچوں کی پرورش میں لگا دیتی ہے - پس یہ جذبۂ محبت جو ہر عورت کے دل میں اپنے بچوں کے متعلق پایا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی پیدا کیا گیا ہے - ورنہ اتنی محنت کی برداشت انسانی عقل کے ماتحت نہیں ہو سکتی تھی - اگر خدا تعالیٰ یہ جذبات ماں کے دل میں پیدا نہ کرتا تو آہستہ آہستہ فلسفہ اور عقل کے ماتحت یا تو انسان اولاد پیدا کرنا ہی بند کر دیتے اور یا پھر اُن کی پرورش کی طرف سے اپنی توجہ کلیتہً ہٹا لیتے -

پھر خدا تعالیٰ کے مُمیت ہونے کا نظارہ بھی روزانہ نظر آتا ہے - بڑے بڑے شہروں میں سینکڑوں آدمی روزانہ مرتے ہیں - چنانچہ کسی سڑک پر چلے جاؤ - تمہیں جنازے گذرتے دکھائی دیں گے - چھوٹے قصبات میں بھی پانچویں دسویں کوئی نہ کوئی موت ہوتی رہتی ہے چھوٹے گاؤں میں بھی سال میں دو تین موتیں ہو جاتی ہیں - پس موت کا یہ نظارہ بھی ہمیں کثرت سے دنیا میں نظر آتا ہے - غرض خدا تعالیٰ کی یہ دونوں صفات کہ وہ محیی بھی ہے اور ممیت بھی ہے اس رنگ میں لوگوں کے سامنے آتی رہتی ہیں کہ کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا - حیات انسان کے لئے خوشی کا موجب ہوتی ہے اور موت لوگوں کے لئے رنج کا موجب ہوتی ہے - دشمن کی بھی لاش پڑی ہوئی ہو تو سوائے کسی شقی القلب انسان کے دوسرے انسانوں کے دلوں میں رحم کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے - بیس بیس تیس تیس سال کی دشمنیاں اُسوقت دلوں سے نکل جاتی ہیں اور دشمن کی لاش دیکھ کر انسان کے دل میں سے اُس وقت دُعا ہی نکلتی ہے - یا اس کے رشتہ داروں اور عزیزوں کیلئے دل میں رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں - کیونکہ ہر انسان جانتا ہے کہ جو دن اس پر آیا ہے وہ مجھ پر بھی آنے والا ہے - لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو عالم الغیب ہے یہ دونوں مواقع نہ کلی طور پر خوشی کا موجب ہوتے ہیں اور نہ کلی طور پر غم کا موجب ہوتے ہیں - جب کوئی بچہ کسی کے گھر میں پیدا ہوتا ہے تو اس کے ماں باپ اور عزیز سمجھتے ہیں کہ ایک نیا چاند دُنیا میں نکلا ہے ایک رحمت کا نیا دروازہ ہمارے لئے کھلا ہے حالانکہ بسا اوقات پیدا ہونے والی رُوح دُنیا کے لئے کئی قسم کے مصائب اور دکھوں کا موجب ہوتی ہے - اُس کے رشتہ دار تو اُس کی پیدائش پر خوش ہو رہے ہوتے ہیں لیکن آسمان پر خدا کے فرشتے اُسکی پیدائش سے غمگین ہو رہے ہوتے ہیں -

غرض پیدائش دنیا کے نزدیک ایک ہی نکتہ رکھتی ہے یعنی خوشی کا - کسی کی پیدائش پر تھوڑے لوگ خوش ہوتے ہیں اور کسی کی پیدائش پر زیادہ - لیکن آسمان کے فرشتے کسی کی پیدائش پر اگر اُن کے لئے رونا ممکن ہو تو آنسو بہاتے یا دوسرے الفاظ میں اپنے رنج کا

اظہار کرتے ہیں۔ اور کسی کی پیدائش پر خواہ دنیا کے لوگ خوشی نہ منائیں فرشتے بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی حال موت کا ہے۔ موت کے وقت بھی دنیا کے ہر انسان کے رشتہ دار اور دوست تھوڑے ہوں یا بہت رنج محسوس کرتے ہیں۔ ایک ڈاکو مرتا ہے تو اس کے بیوی بچے خوش نہیں ہوتے کہ ہمارا باپ ڈاکو تھا۔ قاتل تھا۔ فتنہ وفساد پھیلاتا تھا۔ اچھا ہوا کہ وہ مرگیا بلکہ اُن کی اُسی طرح چیخیں نکل جاتی ہیں جس طرح بڑے سے بڑے محسن اور نیک باپ کے بچوں کی اُس کی وفات پر نکل جاتی ہیں اور وہ دنیا کے لئے اس کی موت کو ایسا ہی خطرناک سمجھتے ہیں جیسے کسی بڑے سے بڑے مصلح کی وفات کو بلکہ شائد اس سے زیادہ۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات ہوئی تو چونکہ اُن کے دورِ حکومت میں امن قائم ہوا تھا۔ اور وہ طوائف الملوکی جو پہلے پھیلی ہوئی تھی جاتی رہی تھی اِس لئے سکھوں کے علاوہ جو اُن کے ہم مذہب اور ہم قوم تھے ہندو اور مسلمان بھی عام طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اب اِن کی وفات کے بعد پھر فتنے پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے اس لئے لوگوں میں ایک کہرام مچا ہوا تھا اور ہر شخص کے آنسو رواں تھے جن کے زیادہ گہرے تعلقات تھے وہ چیخیں مار رہے تھے۔ فرماتے تھے کہ کوئی چوہڑا لاہور کے قریب سے گذرا اور اُس نے جب دیکھا کہ ہر شخص ماتم کر رہا ہے تو اُس نے کسی سے پوچھا کہ آج لاہور والوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جس کو دیکھو رو رہا ہے جس کو دیکھو رو رہا ہے اُس نے کہا تمہیں پتہ نہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ فوت ہو گئے ہیں۔ وہ بڑی حیرت کا اظہار کر کے کہنے لگا۔ اچھا! رنجیت سنگھ مرگیا ہے اور اسپر لوگ رو رہے ہیں۔ پھر کہنے لگا۔ "باپو ہوراں جیہے مرگئے تے رنجیت سنگھ بچارا کس شمار وچ"۔ یعنی جب میرے باپ جیسا آدمی مرگیا تو رنجیت سنگھ بھلا کس شمار میں تھا۔ اب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ذریعہ بیشک امن قائم ہوا تھا۔ مگر چونکہ اُس چوہڑے کا جو تعلق اپنے باپ سے تھا وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے نہیں تھا۔ اور سیاسی فوائد کو وہ سمجھنے کے قابل نہیں تھا اِس لئے اُس کے نزدیک سب سے بڑی رنج کی بات اپنے باپ کی وفات تھی۔ اِسی طرح کئی بادشاہ بڑے ظالم ہوئے ہیں۔ مثلاً ہلاکو خاں بڑا ظالم مشہور ہے۔ مگر جب ہلاکو خاں مرا ہو گا تو کیا تم سمجھتے ہو کہ اُس کی بیوی اور بچوں کو دوسروں کی بیویوں اور بچوں سے کم صدمہ ہوا ہو گا۔ یقیناً نہیں ہلاکو خاں کی وفات پر ویسا ہی صدمہ ہوا ہو گا جیسے نوشیرواں عادل کی وفات پر اس کے بیوی بچوں کو ہوا تھا۔ حالانکہ نوشیرواں عدل کی وجہ سے مشہور ہے اور ہلاکو خاں ظلم کی وجہ سے مگر دونوں کے بیوی بچوں کو یکساں صدمہ ہوا ہو گا۔ بلکہ ممکن ہے ہلاکو خاں کے بیوی بچوں کو احساسات کے زیادہ تیز ہونے کی وجہ سے نوشیرواں کے بیوی بچوں سے بھی زیادہ صدمہ ہوا ہو۔ مگر آسمان پر یہ بات نہیں جس طرح پیدائش پر دنیا میں سارے بندے خوش ہوتے ہیں گو کسی کی پیدائش پر تھوڑے لوگ خوش ہوتے ہیں اور کسی کی پیدائش پر زیادہ لوگ خوش ہوتے ہیں مگر آسمان پر یہ بات نہیں۔ وہاں کسی کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے اور کسی کی پیدائش پر رنج کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اِسی طرح موت کا حال ہے۔ موت پر سب لوگ رنج کا اظہار کرتے ہیں گو کسی کی موت پر تھوڑے لوگ رنج کا اظہار کرتے ہیں اور کسی کی موت پر زیادہ لوگ رنج کا اظہار کرتے ہیں مگر آسمان پر

یہ بات نہیں۔ وہاں کسی کی موت پر رنج کا اظہار کیا جاتا اور کسی کی موت پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ پھر یہ جذبہ بھی اموات کے لحاظ سے نسبتی طور پر تقسیم ہو جاتا ہے اور فرشتوں کا رنج اور انکی خوشی بعض دفعہ مرکب ہو جاتی ہے یعنی فرشتے صرف رنج یا صرف خوشی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ان کی خوشی اور اُن کا رنج مِلا جُلا ہوتا ہے۔ مثلاً جب کوئی بد قسمت اور گنہگار انسان مرتا ہے یا ایسا ظالم انسان مرتا ہے جس نے دنیا کے امن کو برباد کیا ہُوا ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ کے ملائکہ خوش بھی ہوتے ہیں کہ بندوں کو اس ظالم انسان سے نجات ملی۔ اور وہ رنج بھی کرتے ہیں کہ اپنے مولیٰ کو راضی کرنے سے پہلے وہ شخص مر گیا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کے بزرگ اور نیک لوگ فوت ہوتے ہیں اور دنیا میں اُن کی وفات کی وجہ سے کہرام مچا ہُوا ہوتا ہے تو خدا تعالےٰ کے فرشتے اُن کی صحبت کے خیال سے خوشی منا رہے ہوتے ہیں۔ موت کیا ہے؟ موت اس دُنیا سے اگلے جہان میں جانے کا ایک دروازہ ہے۔ جس طرح کوئی مصلح یا محسن انسان کسی شہر میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کے رہنے والے خوشی مناتے ہیں لیکن جب وہاں سے نکلتا ہے تو وہ رنج کا اظہار کرتے ہیں مگر آگے جب کسی دوسرے شہر میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کے رہنے والے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح جب خدا تعالیٰ کے برگزیدہ اور چنیدہ لوگ جو اپنی نیکی اور تقویٰ اور مقامِ قرب میں ملائکہ سے بڑھ کر بلکہ ملائکہ کو سبق دینے والے ہوتے ہیں (جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ سے ظاہر ہے) وفات پا جاتے ہیں تو دنیا کے لوگ تو اُن کی وفات پر رنج کا اظہار کرتے ہیں اور اس بات پر غمگین ہوتے ہیں کہ وہ اپنا دور ختم کر کے اگلے جہان چلے گئے۔ مگر فرشتے اس بات سے خوش ہوتے ہیں کہ اب وہ ہمارے ملک میں آ گئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جب مدینہ میں کہرام پڑا ہُوا تھا۔ جنت کے لوگوں میں کتنی خوشی منائی جا رہی ہوگی۔ لوگ خدا اور اس کے فرشتوں کی زبان سے سُنتے ہونگے کہ خدا تعالیٰ کا ایک برگزیدہ دُنیا میں پیدا ہو چکا ہے اور وہ بہت بلند روحانی مقامات رکھتا ہے۔ ان باتوں کو سُن سُن کر جنتیوں کے دلوں میں کتنی خواہش پیدا ہوتی ہوگی اور وہ کس طرح اس بات کے تصوّر سے خوش ہوتے ہونگے کہ کبھی یہ مبارک انسان ہم میں بھی آئیگا۔ پس جب فرشتوں نے آپ کی رُوح قبض کی ہوگی اور جب جنتیوں کو پتہ لگا ہوگا کہ اب اُن کی سالہا سال کی اُمیدیں بر آنے لگی ہیں تو انہوں نے کیسی خوشی ظاہر کی ہوگی۔ مگر بہرحال یہ آسمانی بات ہے زمین پر یہی ہوتا ہے کہ موت پر رنج کا اظہار کیا جاتا ہے جس طرح خدا تعالیٰ کی یہ دو صفات ہمیں دنیا میں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح کئی انسان ایسے ہوتے ہیں جو دنیا کے تولّد کا موجب بنتے ہیں یا اُس کی حیات کا موجب ہوتے رہتے ہیں مثلاً ماں باپ ہی ہیں وہ نئی نسلیں دنیا میں لاتے ہیں ڈاکٹر اور اطباء ہیں وہ مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ اسی طرح قومی خدمات کرنے والے لوگ ہیں۔ جو ڈوبتے ہوئے لوگوں کو بچاتے ہیں کہیں آگ لگ جائے تو بجھاتے ہیں۔ اسی طرح اور کئی واقعات اور حادثات جو رونما ہوتے رہتے ہیں اُن میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کی صفت محیی کے مورد ہوتے ہیں۔ اور اس کا ایک نمونہ ہوتے ہیں۔ لیکن کئی لوگ دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ تباہیاں اور بربادیاں اور ہلاکتیں لاتے رہیں کہیں اُن کی وجہ سے قتل ہو رہے ہوتے ہیں۔ کہیں فساد ہو رہے ہوتے ہیں۔ کہیں غارتگری کے واقعات رونما ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی صفت ممیت کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ کی ہر صفت کی نقل کرنے والا انسان ضروری نہیں کہ خدا تعالےٰ کا

مقبول ہو۔ خدا بیشک مُمِیت ہے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک قاتل کسی کو بلا وجہ قتل کر دے تو وہ یہ کہے کہ مَیں نے چونکہ فلاں شخص کو قتل کر کے خدا تعالیٰ کی صفت مُمیت کا اپنے آپ کو مظہر ثابت کیا ہے اس لئے میں بڑا مقرب ہوں۔ اگر وہ ایسا کہیگا۔ تو اُس کا دعویٰ بالکل غلط ہوگا کیونکہ بندے کو جن حالات میں مُمیت بننے کا حق حاصل ہے اُن حالات میں اگر وہ مُمیت بنتا ہے تب تو وہ بے شک خدا تعالےٰ کا مقرب بن سکتا ہے لیکن اگر ان حالات میں مُمیت نہیں بنتا تو وہ مقرب نہیں ہوسکتا۔ اِسی طرح ولادت خدا تعالیٰ کی احیاء کی صفت ہے مگر ناجائز ولادت کا موجب خدا تعالیٰ کی صفتِ مُحیی سے نسبت دے کر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا مقرب نہیں کہہ سکتا۔ صرف وہی شخص خدا تعالیٰ کی صفت مُحیی یا مُمیت کو پورا کرنے والا قرار پا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے ماتحت ان صفات کا مظہر بنتا ہے۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے ماتحت مُحیی بنتا ہے تو بیشک وہ خدا تعالیٰ کا اِس صفت میں مظہر بن سکتا ہے۔ اِسی طرح اگر وہ خدا تعالیٰ کی صفتِ مُمیت کا مظہر اس رنگ میں بنتا ہے جو خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قواعد کے مطابق ہو۔ تو خدا تعالیٰ کا مقرب ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔ چنانچہ دیکھ لو جس وقت جہاد ہوتا ہے۔ دونوں فریق ایک سا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی تلوار چلا رہا ہوتا ہے اور یہ بھی تلوار چلا رہا ہوتا ہے۔ کافر مومن کو مارتا ہے اور مومن کافر کو مارتا ہے پس بظاہر اُن دونوں کا فعل یکساں ہوتا ہے مگر جب کافر کی تلوار سے ایک مومن گرتا ہے تو اللہ تعالےٰ کا عرش کانپ جاتا ہے اور فرشتے اس کافر پر لعنتیں ڈالتے ہیں لیکن جب کسی مومن کی تلوار سے ایک کافر گرتا ہے تو فرشتے خوش ہوتے ہیں اور مومن پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل کرتے ہیں۔ حالانکہ فعل ایک ہوتا ہے۔ مقام ایک ہوتا ہے اور ذریعۂ قتل ایک ہوتا ہے۔ مگر ایک کے فعل پر تو برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور دوسرے کے فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنتیں اور ملامتیں نازل ہوتی ہیں۔ پس اپنی ذات میں مُمیت ہونا یا مُحیی ہونا کوئی اچھی یا بُری بات نہیں۔ اگر مُحیی ہونا خدا تعالیٰ کے قانون کے ماتحت ہو تو اچھا ہوتا ہے۔ اگر مُمیت ہونا خدا تعالیٰ کے قانون کے ماتحت ہو تو اچھا ہوتا ہے لیکن اگر مُمیت یا مُحیی ہونا خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون کے خلاف ہو تو یہی بات بُری بن جاتی ہے۔

پس اسلام یہ سکھاتا ہے کہ اپنے کاموں کو ہمیشہ خدا تعالیٰ کی رضا کے ماتحت رکھنے کی کوشش کرو۔ اور اِس بات سے عبرت حاصل کرو کہ دُنیا میں لوگ مُحیی ہو کر بھی ظالم ہوتے ہیں اور مُمیت ہو کر بھی ظالم ہوتے ہیں۔ کئی ایسے ہیں جو احیاء کے سامان کر رہے ہیں مگر پھر بھی وہ ظالم ہیں اور کئی ایسے ہیں جو اماتت کے سامان کر رہے ہیں مگر پھر بھی وہ ظالم ہیں۔ لیکن مومن کی یہ حالت نہیں ہوتی وہ مُحیی بنتا ہے تب بھی اُس پر رحم کیا جاتا ہے اور مُمیت بنتا ہے تب بھی اُس پر رحم کیا جاتا ہے۔ وہ قتل کرتا ہے تب بھی اُسے ثواب ملتا ہے اور پیدائش کا موجب بنتا ہے تب بھی اُسے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ پس ایسے انسان بننے کی کوشش کرو تاکہ تم سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جس کے نتیجہ میں تمہیں خدا تعالےٰ کی رضا حاصل نہ ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ایٹم بم کی ایجاد کی وجہ سے بڑی بڑی حکومتیں پریشان ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ اِس کا کوئی توڑ پیدا ہو تاکہ دنیا اُس کے تباہ کن نتائج سے محفوظ ہوسکے۔ لیکن دوسری طرف اگر ہم غور کریں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ خدا تعالیٰ بھی ہمیشہ ایٹم بم گراتا رہتا ہے اور ہر سال دنیا میں پچاس ساٹھ لاکھ انسان مر جاتے ہیں۔

بلکہ جب کبھی وبائیں پڑتی ہیں تو اس سے بھی زیادہ انسان مر جاتے ہیں اور کروڑ ڈیڑھ کروڑ تک یہ تعداد جا پہنچتی ہے مگر ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے اس فعل سے دنیا میں کبھی گھبراہٹ پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ خدا تعالیٰ جہاں اپنے ایٹم بم (یعنی طبعی موت) سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو مارتا ہے وہاں اتنی ہی تعداد کو پیدا بھی کر دیتا ہے۔ اور اس کے پاس اگر مارنے کی طاقت ہے تو زندہ کرنے کی طاقت بھی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے سالانہ مرنے کے لوگوں میں گھبراہٹ کے آثار پیدا نہیں ہوتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارا خدا مُحیی بھی ہے اور مُمیت بھی ہے۔ وہ مارنا بھی جانتا ہے اور پیدا کرنا بھی جانتا ہے۔ مگر اب ایٹم بم یا اسی قسم کی اور ایجادات کے ذریعہ موت ایسے لوگوں کے قبضہ میں آئی ہے جو صرف مارنا ہی جانتے ہیں جلانا نہیں جانتے۔ اسی لئے لوگ ایسی چیزوں سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ ورنہ دنیا میں لوگ یوں بھی تو مرتے رہتے ہیں لیکن کسی کو گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ کسی عزیز رشتہ دار کے مرنے پر اس کے لواحقین دو چار روز تک رو دھو کر چُپ ہو جاتے ہیں اور تھوڑا عرصہ ہی گذرتا ہے کہ اسی گھر میں جہاں سے تھوڑا عرصہ پہلے ماتم اور چیخ و پکار کی آوازیں آتی تھیں ڈھول اور باجے بج رہے ہوتے ہیں اور کسی خوشی کی تقریب کا انتظام ہو رہا ہوتا ہے۔ غرض عزیز سے عزیز وجود کے مرنے پر بھی اس کے متعلقین میں جو گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے وہ عارضی ہوتی ہے جو تھوڑے دنوں تک بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ مگر دیکھ لو ایٹم بم سے دنیا کتنی گھبرائی ہوئی ہے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس کے ساتھ موت تو واقع ہو سکتی ہے مگر پیدائش کا کوئی انتظام نہیں۔ اگر اس کے ساتھ پیدائش کا بھی انتظام ہوتا تو اتنی گھبراہٹ کبھی نہ ہو سکتی۔ ہندوؤں میں ایک فرقہ ہے جس میں شامل ہونے والے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ برہما جی پیدا کرتے ہیں اور شوجی مارتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں برہما جی کے مندر نہیں ہیں اور شوجی کے بہت سے مندر ہیں۔ برہما جی کا سارے ہندوستان میں صرف ایک مندر ہے۔ کہتے ہیں اس فرقہ سے تعلق رکھنے والے ایک راجہ کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ اس راجہ نے اپنے وزراء سے مشورہ کیا کہ میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی کیا کرنا چاہیئے۔ وزراء نے مشورہ دیا کہ آپ برہما کی پرستش کریں لڑکا پیدا ہوگا۔ راجہ نے پرستش شروع کر دی اور ساتھ ہی نذر نیاز بھی مانی اور کہا اے برہما! اگر میرے گھر میں بیٹا ہوا تو میں اپنے راج میں سب لوگوں سے تیری ہی پرستش کرواؤنگا اور شوجی کی پرستش چھڑا دونگا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اُس کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا۔ اور اُس نے شوجی کی پرستش سے تمام رعایا کو منع کر دیا اور برہما جی کی پرستش شروع کرا دی۔ کوئی عقلمند راجہ اُسے آکر ملا اور اُس نے کہا کہ تمہارا جتنا کام برہما جی کے ساتھ تھا وہ تو پُورا ہو گیا اور بیٹا پیدا ہو گیا۔ اس لئے بہتر ہے کہ اب شوجی مہاراج کی پُوجا کی جائے تاکہ وہ غصہ میں آکر لڑکے کی جان نہ نکال لے۔ راجہ نے اس بات کو سمجھ لیا اور کہا اچھا آئندہ شوجی کی پرستش کی جایا کرے تاکہ میرا لڑکا زندہ رہے۔ چنانچہ شوجی کی پوجا شروع ہو گئی اور برہما جی کو بھلا دیا گیا۔ لڑکا جب بڑا ہُوا تو اُس نے کسی کی زبانی یہ سارا واقعہ سُنا کہ مجھے برہما جی مہاراج نے پیدا کیا تھا اور اب میرے والد نے برہما جی کو چھوڑ کر شوجی کی پُوجا شروع کر دی ہے۔ اس لڑکے کے اندر اخلاقی جرأت تھی۔ اُس نے سوچا کہ احسان کرنے والے کے احسان کی قدر ہونی چاہیئے تھی۔ اس لئے اُس نے فیصلہ کیا کہ میں تو برہما جی کی ہی پوجا کرونگا۔ جب راجہ نے اپنے بیٹے کا یہ رویّہ دیکھا تو اُس کو فکر ہُوا کہ اگر میرے لڑکے نے برہما جی کی پُوجا کی تو شوجی ناراض ہو جائیں گے اور اس کی جان

نکال لیں گے۔ چنانچہ راجہ نے اپنے بیٹے کو ڈانٹا کہ برہما جی کی پوجا چھوڑ دو۔ لڑکے نے کہا۔ مَیں برہما جی کا احسان فراموش نہیں ہو سکتا۔ کچھ مدت باپ بیٹے کا اسی طرح جھگڑا چلتا رہا۔ جب کسی کے دل میں ضد پیدا ہو جاتی ہے تو وہ روکنے سے اور بھی بڑھتی ہے۔ بیٹے کے دل میں بھی ضد بڑھتی گئی اور باپ کے دل میں بھی بڑھتی گئی۔ آخر باپ نے ناراض ہو کر کہا۔ اے شوجی! اس کی جان نکال لے۔ شوجی نے لڑکے کی جان نکال لی۔ اس پر برہما جی شوجی پر سخت ناراض ہوئے اور کہا اس کی جان کیوں نکالی گئی ہے۔ اور انہوں نے پھر اُس کو زندہ کر دیا۔ مگر شوجی نے دوبارہ اس کی جان نکال لی اور برہما جی نے پھر اسکو زندہ کر دیا۔ اِس طرح دیوتاؤں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ یہ تو ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ مگر درحقیقت بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے اندر دو طاقتیں ہیں۔ ایک طاقت مارتی ہے اور دوسری پیدا کرتی ہے۔ اِس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مارنے کی طاقت تو دیدی ہے مگر پیدا کرنے کی طاقت نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا گھبرا اُٹھی ہے۔ اور جن ممالک کے پاس ایٹم بم نہیں ہیں وہ ہر وقت سہمے ہوئے اور خوفزدہ رہتے ہیں اور دُنیا کے کونے کونے سے آوازیں آتی رہتی ہیں کہ ایٹم بم کو لڑائی میں استعمال نہ کیا جائے مگر مَیں سمجھتا ہوں کہ ایٹم بم دنیا کو توجہ دلاتا ہے کہ انسانوں کے ہاتھ میں آئی ہوئی طاقت کسقدر تباہ کن اور ہلاکت خیز ثابت ہوتی ہے اور انسان اس طاقت کو کس طرح بے موقعہ اور بے محل استعمال کر کے ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اور پھر اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ وہ یہ بھی کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اسکو اور بھی زیادہ مہلک بناؤں تاکہ وہ پہلے سے بھی بڑھ کر تباہی مچا سکے اور زیادہ سے زیادہ انسانوں کو تھوڑے سے تھوڑے وقت میں موت کے گھاٹ اتارا جا سکے۔ حالانکہ یہی چیز اگر جائز طریق سے برمحل اور باموقعہ استعمال کی جائے تو بنی نوع انسان کے لئے حد درجہ مفید ہو سکتی ہے۔ بہرحال اِس گھبراہٹ کا علاج صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اُس خدا کی طرف رجوع کیا جائے جو مارنا بھی جانتا ہے اور جلانا بھی جانتا ہے۔ اس کے پاس یہ دونوں طاقتیں موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی فرمایا ہے کہ ہمارا خدا محیی بھی ہے اور ممیت بھی ہے۔ پس اُسی کے ساتھ تعلق رکھنا چاہیئے جو لاکھوں کو مارتا ہے مگر کسی کے دل میں گھبراہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ کسی گھر میں ایک آدمی مر جاتا ہے تو اس کے لواحقین دو چار دن تک اس پر رو دھو کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ مگر تھوڑے دن نہیں گذرتے کہ اُسی گھر میں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو مبارک مبارک کے الفاظ کہے جا رہے ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ اس لئے ہمیں بھی خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اور اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے انسان کی طاقتیں صرف سطحی ہوتی ہیں۔ جب تک خدا تعالیٰ کا منشاء اِس دنیا کو قائم رکھنے کا ہے۔ اُس وقت تک ایٹم بم کچھ نہیں کر سکتا۔ بلکہ خدا اِن سب مارنے والوں کو بھی مار سکتا ہے اور ایسے سامان بھی پیدا کر سکتا ہے جن سے یہ ایٹم بم سب بیکار ہو کر رہ جائیں۔ پس انسان کو اِن تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر روحانیت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور صرف خدا تعالیٰ کی پرستش کرنی چاہیئے۔ جو ممیت تو ہے مگر ساتھ ہی محیی بھی ہے یعنی گو وہ مارتا بھی ہے مگر پھر وہ زندہ بھی کرے گا۔ اور اس طرح موت کے بعد بھی اُس کی طرف سے خیر ہی خیر آئیگی۔ موت کا ایک عارضی زمانہ ہوگا اور آخر میں انسان کے لئے صرف حیات ہی حیات رہ جائیگی۔

پھر فرماتے ہیں وَالَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ۔ میرا رب وہ ہے جسکے متعلق

مجھے اُمید ہے کہ وہ نتائج کے ظہور کے وقت میری کمزوریوں
پر پردہ ڈالتے ہوئے اپنا فضل میرے شاملِ حال رکھیگا اور
مجھے کامیابی اور کامرانی عطا فرمائیگا ۔

اِس آیت میں جو غفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے
اس کے معنے صرف گناہوں کی معافی کے نہیں بلکہ کمزوریوں
پر پردہ ڈالنے کے بھی ہیں ۔ چنانچہ عربی زبان میں جب
غَفَرَ الشَّیْءَ غَفْرًا کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں ۔
سَتَرَہٗ کسی چیز کو ڈھانپ دیا ۔ اور جب غَفَرَ الْمَتَاعَ
فِی الْوِعَاءِ کہا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَدْخَلَہٗ
وَسَتَرَہٗ ۔ سامان کو کسی ٹرنک یا تھیلے میں بند کر کے محفوظ
کر دیا ۔ اور جب کسی کے متعلق غَفَرَ اللّٰہُ ذَنْبَہٗ کے الفاظ
استعمال کئے جائیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں غَطّٰی عَلَیْہِ
وَعَفَا عَنْہُ ۔ خدا تعالیٰ نے اس کے قصور کو ڈھانپ دیا اور
اُس کی کمزوریوں پر پردہ ڈال دیا (اقرب) اسی طرح خَطِیْئَۃٌ
کا لفظ اِثْم کے مقابلہ میں اپنے اندر عمومیت رکھتا ہے یعنی
اِثْمٌ کا لفظ تو صرف ایسے قصور کے لئے استعمال کیا جاتا
ہے جو عمدًا اور ارادۃً کیا جائے لیکن خَطِیْئَۃٌ کا لفظ
اُن بشری کمزوریوں کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے
جن میں ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا ۔ اسی طرح یَوْمٌ
کا لفظ صرف دن کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ
وقت اور زمانہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔
چنانچہ قرآن کریم میں بعض جگہ یَوْمٌ کا لفظ ایک ہزار سال[1]
کے لئے اور بعض جگہ پچاس ہزار سال[2] کے لئے استعمال کیا
گیا ہے ۔ محاورہ عرب میں بھی یَوْمٌ زمانہ اور وقت کے
معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے

یَوْمَاہُ یَوْمٌ نَدًی وَیَوْمٌ طِعَانٍ

(لسان العرب و تاج العروس)

یعنی اس شخص کے دو ہی یوم ہیں ۔ ایک سخاوت کرنے کا
یوم اور ایک نیزہ مارنے کا یوم ۔ اسجگہ یوم وقت
کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور شاعر اپنے ممدوح
کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی زندگی کے کام
صرف دو حصوں میں تقسیم ہیں ۔ اس کا کچھ وقت تو سخاوت
کے کاموں میں خرچ ہوتا ہے اور کچھ وقت لڑائی میں بسر
ہوتا ہے ۔ اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ تِلْکَ
اَیَّامُ الْھَرَجِ یہ فتنہ کے ایام ہیں اور مراد یہ ہے کہ یہ
فتنہ کے اوقات ہیں ۔ اسجگہ بھی یوم وقت اور زمانہ
کے معنے میں استعمال ہوا ہے ۔ باقی رہا دین کا لفظ
سو اس کے بھی عربی زبان میں کئی معانی ہیں ۔ دین کا لفظ
اطاعت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ جزاء اور
مطابق عمل نتیجہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ قضا
اور فیصلہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ ملت کے
معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ حساب کے معنوں میں بھی
استعمال ہوتا ہے ۔ غلبہ اور تفوق کے معنوں میں بھی استعمال
ہوتا ہے ۔ حکومت اور بادشاہت کے معنوں میں بھی استعمال
ہوتا ہے ۔ تدبیر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔
عادت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ طریقِ عبادت
کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ پرہیزگاری کے
معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ حال کے معنوں میں بھی
استعمال ہوتا ہے ۔ بلند شان کے معنوں میں بھی استعمال
ہوتا ہے ۔ سیرۃ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔
پس یَوْمَ الدِّیْنِ کے معنے صرف قیامت کے نہیں کہ اس
دنیا کو آخری جزاء سزا کے دن کے لئے مخصوص سمجھا جائے
بلکہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے دین کے ایک معنے جزاء
اور مطابق عمل نتیجہ کے بھی ہوتے ہیں ۔ پس حضرت ابراہیم علیہ
السلام فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے رب پر امید ہے کہ جب
میرے اعمال کا نتیجہ نکلے گا تو وہ میری کمزوریوں پر پردہ

[1] سورۃ السجدہ ع ۱ [2] سورۃ المعارج ع ۱

رَبِّ هَبْ لِیْ حُکْمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۴﴾ وَ

اے میرے رب! مجھے صحیح تعلیم عطا کر۔ اور نیکوں میں شامل کر۔ اور بعد میں

اجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۸۵﴾ وَاجْعَلْنِیْ

آنے والے لوگوں میں ایک ہمیشہ قائم رہنے والی تعریف مجھے بخش۔ اور مجھے

ڈالتے ہوئے اپنی رحمت میرے شامل حال رکھیگا۔ اور مجھے اپنے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے گا۔

وہ لوگ جو روحانیت سے بے بہرہ ہوتے ہیں یہ خیال کر لیتے ہیں کہ انسان اسی صورت میں مغفرت کا طلبگار ہوتا ہے جبکہ وہ گناہ آلود زندگی بسر کر رہا ہو۔ مگر یہ خیال اُن کی عربی زبان سے کلّی ناواقفیت اور روحانی کوچہ سے قطعی طور پر ناآشنا ہونے کا ثبوت ہے حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان اس بات کا محتاج ہے کہ خدا اُسے اپنے نور سے حصّہ عطا فرمائے۔ اُسے اپنی طاقت سے طاقت بخشے اور اپنے علم سے علم عطا کرے جس طرح انسانی آنکھ سورج کی روشنی کے بغیر بیکار ہے اور انسانی کان ہوا کے توسط کے بغیر دوسرے کی آواز سُننے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اسی طرح ہر انسان خواہ وہ خدا تعالیٰ کا نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہو خدائی طاقت اور اُس کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے سکھایا ہے کہ ہر انسان پانچ وقت نماز کی ہر رکعت میں خدا تعالیٰ سے یہ کہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی اے خدا! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں مگر یہ کام ایسا ہے جس میں صرف ہماری کوشش اور ارادہ ہمیں کامیاب نہیں کر سکتا بلکہ اس میں کامیابی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہماری کوشش کے ساتھ تیری مدد بھی شامل ہو جائے۔ جب یہ دونوں چیزیں مل جائیں گی۔ تب کوئی نتیجہ پیدا ہو گا ورنہ محض ہماری کوشش کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ انہی معنوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں اپنی طاقت کے مطابق تو خدا تعالیٰ کی توحید پھیلانے کے لئے رات اور دن جدّوجہد کر رہا ہوں مگر میری یہ جدوجہد اللہ تعالیٰ کے فضل اور اُس کی نصرت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی اس لئے مَیں اُسی سے مدد کا طلب گار ہوں۔ اور مَیں اُمید رکھتا ہوں کہ جب ان کوششوں کے نتائج کا ظہور ہو گا تو اس وقت اللہ تعالیٰ میری حقیر کوششوں میں برکت پیدا فرمائیگا اور اگر کوئی خامی بشریت کی وجہ سے میرے کاموں میں رہ بھی گئی تو اس کمی کو اللہ تعالیٰ کا فضل پورا فرما دیگا اور مجھے اپنے مقصد میں کامیابی عطا فرمائیگا۔

پھر جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے دین کے ایک معنے غلبہ کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ کے یہ معنے ہونگے کہ مَیں اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلۂ روحانیہ کی ترقی کے زمانہ میں بھی جسکی ترویج میرے ہاتھ سے ہو رہی ہے میری بشری کمزوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسے سامان پیدا فرمائیگا کہ جن کے نتیجہ میں تبلیغ اور تربیت کا سلسلہ جاری رہے گا اور اس کے دین کی کشتی ہر قسم کے حوادث کے تھپیڑوں سے بچتی ہوئی ساحلِ مُراد پر کامیابی سے پہنچ جائیگی

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی جماعتوں کا غلبہ جہاں اپنے اندر بڑی بھاری بشارت رکھتا ہے۔ وہاں یہ غلبہ

مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۶﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ

نعمتوں والی جنّت کے وارثوں میں سے بنا ۔ اور میرے باپ کو معاف کرنے وہ

كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۸﴾

بھٹک جانے والوں میں سے تھا ۔ اور جس دن لوگ زندہ کرکے اٹھائے جائیں مجھے اُس دن رُسوا نہ کیجیو۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۹﴾ اِلَّا مَنْ

جس دن کہ نہ مال نفع دے گا نہ بیٹے (نفع دیں گے) ۔ ہاں (وہی نفع پائیگا) جو

اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۹۰﴾

اللہ (تعالیٰ) کے پاس ایک تندرست دل لے کر آئے گا۔ ۱۸ه

اپنے اندر ایک انذار کا پہلو بھی لئے ہوئے ہوتا ہے کیونکہ اس وقت ہزاروں ہزار لوگ سلسلۂ روحانیہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے دین کے لئے کسی قسم کی تکلیف برداشت نہیں کی ہوتی اور پھر وہ مذہبی تعلیم سے بھی بہت حد تک ناواقف ہوتے ہیں اس لئے ان کے اندر کئی قسم کے بگاڑ پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ منہ سے تو بے شک ہر قسم کے عقائد کا اظہار کرتے ہیں مگر اُن کا عمل اپنے دعویٰ کے مطابق نہیں ہوتا۔ اور وہ دین میں داخل ہوتے ہوئے بھی دین کی عائد کردہ پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح قومی تنزل کا بیج پرورش پانے لگتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی معرفت کی آنکھ سے اِس بیج کو دیکھا اور انہوں نے اس کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کرنی شروع کر دیں اور ساتھ ہی اِس اُمید کا بھی اظہار کیا کہ میرا رب میرا ساتھ دیگا۔ اور وہ میری اِس بشری کمزوری کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ کوئی ایک انسان ہزاروں لوگوں کی تربیت نہیں کر سکتا اپنے فضل سے خود ہی ایسے سامان پیدا فرما دے گا کہ جن کے نتیجہ میں آنے والوں کی تربیت ہوتی رہے اور وہ اخلاص اور فدائیت کی روح کے ساتھ اُس کے دین کے جھنڈے کو ہمیشہ بلند رکھیں۔

اَلْحُكْمُ

۱۸ه حل لغات: اَلْحُكْمُ۔ اَلْحُكْمُ بِالشَّیْءِ کے معنے ہیں اَنْ تَقْضِیَ بِاَنَّهٗ كَذَا اَوْ لَيْسَ بِكَذَا سَوَاءٌ اَلْزَمْتَ ذٰلِكَ غَيْرَكَ اَوْلَمْ تُلْزِمْهُ یعنی کسی امر کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ اُس کی صحیح صورت کیا ہے۔ خواہ وہ بات دوسروں پر واجب کی جائے یا نہ کی جائے۔ وَ اَلْحُكْمُ اَعَمُّ مِنَ الْحِكْمَةِ فَكُلُّ حِكْمَةٍ حُكْمٌ۔ یعنی عربی زبان میں دو لفظ استعمال ہوتے ہیں ایک حُكْمٌ ہے اور دوسرا اَلْحِكْمَةُ ہے اور حُكْمٌ کا لفظ عام ہے اِس لئے اس کے ماتحت حکمت کے سارے معنے آجاتے ہیں (مفردات)

اَلْحِكْمَةُ کے معنے ہیں اِصَابَةُ الْحَقِّ بِالْعِلْمِ وَ الْعَقْلِ یعنی درست بات کو علم اور عقل سے معلوم کر لینا اور پا لینا (مفردات)

اقرب الموارد میں ہے۔ اَلْحِكْمَةُ ۔ اَلْعَدْلُ وَ اَلْعِلْمُ وَ اَلْحِلْمُ وَ النُّبُوَّةُ ۔ یعنی حکمت کے معنے انصاف ۔ علم ۔ بُرد باری اور نبوت کے ہیں ۔ اسی طرح اس کے معنے ہیں مَا یَمْنَعُ مِنَ الْجَهْلِ ہر وہ بات جو جہالت سے روکے ۔ وَ قِیْلَ كُلُّ كَلَامٍ مُوَافِقِ الْحَقِّ ہر وہ بات جو حق کے مطابق ہو اُس کو بھی حکمت کہتے ہیں وَ قِیْلَ وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ مَوْضِعِهٖ وَ صَوَابُ الْاَمْرِ وَ سَدَادُهٗ ۔ اور بعض ماہرین لغت کہتے ہیں کہ کسی چیز کا برمحل استعمال حکمت کہلاتا ہے ۔ (اقرب)

لِسَانَ صِدْقٍ

لِسَانَ صِدْقٍ : مفردات میں ہے کہ یُعَبَّرُ عَنْ كُلِّ فِعْلٍ فَاضِلٍ ظَاهِرًا وَّ بَاطِنًا بِالصِّدْقِ ہر وہ امر جو ظاہری اور باطنی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کا ہو اس کے ساتھ صدق کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے ۔ اور یہ جو حضرت ابراہیمؑ کی دُعا آتی ہے کہ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ اس سے یہ مُراد ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ ایسا بنائے کہ آنے والی نسلیں جو ہمارا ذکر خیر کریں تو وہ درست ہو اور خلاف واقعہ نہ ہو (مفردات) اقرب الموارد میں ہے کہ لِسَانُ الصِّدْقِ اچھے ذکر کو کہتے ہیں ۔

سَلِیْمٍ

سَلِیْمٍ : اَلسَّلَامَةُ کے معنے میں اَلتَّعَرِّیْ مِنَ الْاٰفَاتِ الظَّاهِرَةِ وَ الْبَاطِنَةِ ۔ ظاہری اور باطنی ہر قسم کی خرابیوں سے پاک ہونا (مفردات) پس قَلْبٍ سَلِیْمٍ کے معنے ہونگے ۔ ایسا دل جو ہر قسم کی خرابیوں سے پاک ہو ۔

تفسیر :۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ اللہ تعالیٰ پر ایک بہت بڑی امید کا اظہار کیا تھا ۔ اس لئے آپ نے سمجھا کہ اب میرا فرض ہے کہ میں خود بھی اُسکے آستانہ پر جُھک جاؤں اور اس سے دُعا کروں کہ وہ میری اس خواہش کی تکمیل کے سامان پیدا فرمائے اور مجھے ایسی توفیق بخشے کہ میں اس کے پیغام کو احسن طریق پر لوگوں کو پہنچاتا چلا جاؤں ۔ چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو دُعا فرمائی کہ اے میرے ربّ ! مجھے حکم عطا فرما اور مجھے نیک اور پاک لوگوں میں شامل کر دے ۔

حُکم کے اصل معنے جیسا کہ امام راغبؒ نے اپنی مشہور کتاب مفردات میں لکھا ہے اصلاح کی خاطر کسی کام سے روکنے کے ہوتے ہیں ۔ اسی وجہ سے جانور کی لگام کو حَكَمَةٌ کہتے ہیں کیونکہ اس کے ذریعہ جانور کو روکا جاتا ہے اور اَلْحُكْمُ بِالشَّیْءِ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ کسی امر کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ اُسے کس طرح سرانجام دیا جائے خواہ وہ بات دوسروں پر واجب کی جائے یا نہ کی جائے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حُکم کا لفظ صرف کسی فیصلہ پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس بات پر بھی دلالت کیا کرتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی معقول وجہ کام کر رہی ہے ۔ چنانچہ اسی سے حکمت کا لفظ نکلا ہے جس کے معنے فلسفہ کے ہیں ۔ پس حُکم کا لفظ صرف زور اور طاقت کے ساتھ کوئی بات منوانے کے لئے نہیں آتا بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اہم مقصد کام کر رہا ہے اور اُمپر عمل کرنے میں خود انسان کا اپنا فائدہ ہے ۔ بلا سوچے سمجھے محض اپنی حکومت جتانے کے لئے کوئی حکم نہیں دیا گیا ۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کا اہم مقصد خدا تعالیٰ کی توحید پھیلانا تھا ۔ اور اس مقصد کے حصول میں اسی صورت میں کامیابی ہو سکتی تھی جبکہ آپ کی ہر بات حکمت کے ساتھ تعلق رکھتی ہو اور وہ دلوں کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی ہو ۔ اس لئے آپ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ الٰہی : تو مجھے ایسی تعلیم عطا فرما جس کی کوئی بات حکمت کے خلاف نہ ہو تاکہ لوگ اُس کو بشاشت قلب کے ساتھ قبول کریں اور اشاعتِ ہدایت کے راستے کھلتے چلے جائیں ۔

مفسّرین میں سے بعض نے اسجگہ حُکم سے نبوّت اور رسالت مُراد لی ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ اِس جگہ

حُکم سے علم و فہم مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اُس کے احکام کی معرفت مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اسجگہ حُکم سے مراد لوگوں کے درمیان سچائی کے ساتھ فیصلہ کرنے کی طاقت ہے۔ یہ تمام توجیہات صرف اِسوجہ سے کی گئی ہیں کہ مفسّرین نے سیاقِ کلام کو مدّنظر نہیں رکھا اور جو کچھ کسی کے ذہن میں آیا وہ اُس نے معنے کر دیئے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں حکم کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہُوا ہے بعض جگہ حُکم کا لفظ حکومت اور غلبہ کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (جاثیہ ع۲) ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور نبوت بخشی تھی۔ اسی طرح فرماتا ہے مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ع۸) کسی انسان کے یہ شایانِ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ تو اُسے کتاب اور حکومت اور نبوت دے اور وہ یہ کہنے لگ جائے کہ تم خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔

بعض جگہ حُکم کا لفظ فیصلہ کرنے کی فراست کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (یوسف ع۳) جب وہ اپنی قوت اور مضبوطی کی عمر کو پہنچا تو ہم نے اُسے فیصلہ کرنے کی فراست بخشی۔ اور اپنے پاس سے علم عطا فرمایا۔

بعض جگہ حُکم کا لفظ صرف فیصلہ کے معنوں میں بھی استعمال ہُوا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ (مائدہ ع۷) کیا یہ لوگ کلامِ الٰہی کے نازل ہونے سے پہلے کے فیصلہ کو پسند کرتے ہیں؟ یا فرماتا ہے اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ۔ (انعام ع۸) اچھی طرح سن لو کہ فیصلہ اُسی کے اختیار میں ہے اور وہ حساب لینے والوں میں سے سب سے جلدی حساب لینے والا ہے۔

بعض جگہ حُکم کا لفظ احکامِ الٰہیہ اور تعلیمِ مذہبی کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ (مائدہ ع۷) وہ لوگ تجھے کس طرح حَکَم بنا سکتے ہیں جبکہ اُن کے پاس تورات موجود ہے جو خود اُن کے نزدیک احکامِ الٰہی اور مذہبی تعلیم پر مشتمل ہے۔

بعض جگہ حُکم کا لفظ عہدۂ نبوت کے معنوں میں بھی استعمال ہُوا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (شعراء ع۲) اللہ تعالیٰ نے مجھے حُکم یعنی عہدۂ نبوت عطا فرمایا۔ اور مجھے رسولوں میں سے ایک رسول بنا دیا۔

غرض حُکم کا لفظ قرآن کریم میں مختلف معانی میں استعمال ہُوا ہے۔ اِسجگہ سیاقِ کلام بتا رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل اور دماغ پر یہ بات حاوی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جس مقصد کے لئے مبعوث فرمایا ہے وہ بخیر و خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچے اور کوئی ایسی خرابی پیدا نہ ہو جو اس روحانی عمارت کو متزلزل کرنے والی ہو جس کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے مجھے کھڑا کیا گیا ہے۔ اور چونکہ یہ کام الٰہی مدد کے بغیر سرانجام نہیں دیا جا سکتا تھا اس لئے آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہی دُعا کی کہ الٰہی تو خود مجھے غلبہ عطا فرما۔ تو خود مجھے دینی معاملات میں صحیح فیصلہ کرنے کی فراست عطا فرما اور خود مجھے ان احکام کے نفاذ کی طاقت بخش جن کو قبول کرنے کے لئے فطرتِ صحیحہ خود بخود دوڑتی چلی آئے۔

گویا تیرے احکام کو لوگ قبول تو کریں مگر ڈنڈے کے زور سے
نہیں بلکہ اس لئے کہ خود اُن کی عقل اور اُن کی فطرت اِن
احکام کی عظمت اور برتری کو تسلیم کرتی ہو۔ وَاَلْحِقْنِیْ
بِالصّٰلِحِیْنَ اور اے میرے رب! مجھے نیک اور پاک
لوگوں میں شامل فرما۔ اِس دُعا میں یہ بات غور کے قابل
ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ نبی کے مُنہ سے جس کی
نجات اور جس کا قرب یقینی ہے یہ دُعا جاری ہوئی ہے۔ اگر
تو کسی ایسے شخص کی زبان پر یہ دُعا جاری ہوتی جسکی نجات
اور جس کا قرب غیر یقینی ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ اُس نے
یہ دُعا اپنی نجات اور اپنے قرب کے لئے مانگی ہے۔ کیونکہ
اس کی نجات یا قرب یقینی نہیں تھا۔ مگر انبیاء کے متعلق یہ
خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی نجات غیر یقینی ہے۔
اگر انبیاء کی نجات یقینی نہ ہو اور اگر انبیاء کا قرب یقینی
نہ ہو تو پھر دنیا میں کسی کی نجات اور کسی کا قرب بھی یقینی
نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے مامور اور اس کے مرسل
تو وہ لوگ ہیں جو اپنے دعوٰی سے پہلے ہی نجات یافتہ ہوتے
ہیں۔ اگر وہ نجات یافتہ نہ ہوں تو دوسروں کو نجات دلانے
کے لئے وہ کس طرح کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ان کا اللہ تعالیٰ
کی طرف سے لوگوں کی نجات کے لئے کھڑا ہونا بتاتا ہے کہ
وہ پہلے ہی نجات یافتہ ہوتے ہیں۔ اور جب انبیاء کی
یہ حالت ہوتی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی خدا تعالیٰ
کے ایک نبی تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص جو دُنیا
کا راہنما بنا کر بھیجا گیا۔ جس کے متعلق لوگوں کو یہ کہا گیا کہ
اگر تم نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کی اقتدا کرو۔
اُس نے یہ دُعا کیوں کی کہ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ مجھے
صالحین کے ساتھ شامل کیجیو۔ کیا اِس دُعا کے یہ معنے
ہیں کہ وہ نعوذ باللہ صالحین میں سے نہیں تھے یا اس کا
کوئی اور مفہوم ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض دفعہ
لفظ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر مواقع اور حالات کے اختلاف
کی وجہ سے دوسری جگہ اُس کا مفہوم بالکل بدل جاتا ہے
اِس کی موٹی مثال یوں سمجھ لو کہ عام طور پر جس قد و قامت
کو میانہ قرار دیا جاتا ہے بعض ممالک میں اس کو چھوٹا
یا لمبا سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ناروے کے لوگ، انگلستان
اور دوسرے کئی ممالک کے باشندوں سے بہت لمبے
ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ ناروے کی دو پادری عورتیں سیر
و سیاحت کی غرض سے ہندوستان میں آئیں تو وہ دونوں
اتنی لمبی تھیں کہ عام آدمیوں سے وہ ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت
اونچی تھیں۔ اب یہ تو نہیں تھا کہ ناروے والوں نے
سارے ملک میں سے چھانٹ کر انہی دو عورتوں کو بھیجا
تھا تاکہ اُن کے قد کی لمبائی کا دوسروں پر اثر ہو۔ بلکہ
ناروے کی ساری آبادی ہی لمبے قد والی ہے پس لمبائی
کا معیار ناروے میں جاکر بالکل بدل جائیگا۔ مثلاً ایک
شخص جس کا قد پانچ فٹ چھ انچ ہو وہ ہمارے ہاں
میانہ قد والا کہلائیگا۔ لیکن نیپال کے علاقہ میں وہ لمبا
کہلائیگا۔ اور ناروے میں جاکر وہ ٹھگنا کہلائے گا۔
اِسی طرح رنگ کو لے لو۔ ہمارے ہاں جس آدمی کا رنگ
ذرا سا بھی اُجلا ہو اُس کو گورا کہنے لگ جاتے ہیں مگر
انگلستان والے اس کو کالا کہیں گے۔ اور پھر وہی شخص
جب حبشیوں میں جائیگا تو اس کو سفید کہا جائے گا۔
بلکہ حبشیوں میں تو جس شخص کو ہم سانولے رنگ والا کہتے
ہیں اُسے بھی سفید رنگ والا کہا جاتا ہے۔ ہمارے
سابق مبلّغ افریقہ مولوی عبدالرحیم صاحب نیّر کا رنگ
سفید نہیں تھا بلکہ گندم گوں تھا۔ مگر جب وہ افریقہ گئے
تو وہاں اُنکو حبشی لوگ سفید رنگ والا کہتے تھے اور
وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے ہاں بزرگوں کی یہ پیشگوئیاں
موجود ہیں کہ جب ہمارے ملک میں سفید رنگ والا مبلّغ
آئے گا تو بہت زیادہ ترقی ہوگی۔ پس جس طرح رنگ
اور قد کے معنے مختلف علاقوں میں بدلتے رہتے ہیں

اسی طرح صالح کے معنے بھی مختلف حالات میں بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھو ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (نساء آیت ۷۰) میں صالحیت کو سب سے ادنیٰ مقام قرار دیا ہے اور دوسری طرف حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کے متعلق فرماتا ہے کہ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ (تحریم آیت ۱۱) وہ دونوں ہمارے صالح بندوں کے نکاح میں تھیں۔ حالانکہ نوحؑ اور لوطؑ دونوں نبی تھے۔ اسی طرح حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کے متعلق فرماتا ہے وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ (انبیاء آیت ۷۳) ہم نے اِن سب کو صالح بنایا۔ حالانکہ حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ بھی نبی تھے۔ پھر حضرت یحیٰی علیہ السلام کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے بشارت دیتے ہوئے فرمایا کہ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (آل عمران آیت ۴۰) وہ صالحین میں سے نبوت کا مقام حاصل کرے گا۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ کے متعلق آتا ہے کہ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (آل عمران آیت ۴۷) وہ چھوٹی عمر میں بھی لوگوں سے کلام کرے گا اور بڑی عمر میں بھی اور صالحین میں سے ہوگا۔ حالانکہ حضرت مسیح ناصریؑ خدا تعالیٰ کے نبی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صالح کے لفظ کا استعمال مختلف معانی رکھتا ہے۔ جب ایک عام فرد یہ دعا کریگا کہ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اے خدا! مجھے صالحیت کا مقام رکھنے والوں میں شامل فرما۔ اور جب ایک صالح شخص یہ دعا مانگے گا تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ وہ شہداء کی معیّت کا خواہشمند ہے اور جب ایک شہید یہ دعا مانگے گا تو اُس کے معنے یہ ہونگے کہ وہ صدیقوں میں شامل ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ اور جب ایک صدیق یہ دعا مانگے گا تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ وہ اپنے سے بالا درجہ کے صدیقوں یا نبیوں کی معیّت کا خواہشمند ہے۔ اور جب ایک نبی یہ دعا مانگیگا تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ وہ اپنے مقام سے بالا مقام رکھنے والے انبیاء کی معیت کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہے گویا ہر جگہ اس کے معنے بدلتے چلے جائیں گے۔ جب صالح کا لفظ ایک عام فرد کے لئے استعمال ہوگا تو اس کے اَور معنے ہونگے۔ اور جب صالح کا لفظ شہید اور صدیق کے لئے استعمال ہوگا تو اس کے اَور معنے ہونگے اور جب ایک نبی کے لئے استعمال ہوگا تو اس کے اَور معنے ہونگے۔ اِس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے قرآن کریم میں ایک طرف تو اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو فرماتا ہے کہ تم مت کہو ہم ایمان لے آئے ہیں۔ تم صرف اتنا کہو کہ اَسْلَمْنَا (حجرات آیت ۱۵) ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن دوسری طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے کہ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (بقرۃ آیت ۱۳۲) جب اُس کے ربّ نے اُسے کہا کہ ہماری فرمانبرداری اختیار کر تو اُس نے جواب میں کہا کہ مَیں تو پہلے ہی رب العالمین کی فرمانبرداری اختیار کر چکا ہوں۔ گویا ایک جگہ تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ایمان کا ابتدائی قدم قرار دیا ہے اور دوسری جگہ اسلام کو ایمان اور معرفت کا انتہائی قدم قرار دیا ہے۔ اسی طرح ایک لحاظ سے تو سارے انسان ہی خدا تعالیٰ کے عبد ہیں مگر دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی عبد اللہ کا لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے (سورۂ جنّ آیت ۲۰) اور صوفیاء کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام ناموں میں سے سب سے بڑا نام آپؐ کا عبد اللہ ہی ہے۔

اَب یوں تو سب انسانوں کو خواہ وہ مومن ہوں یا کافر عبداللہ کہا جائیگا۔کیونکہ انہیں اللہ تعالےٰ نے ہی پیدا کیا ہے۔لیکن جب یہ لفظ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استعمال ہوگا تو اس کے معنے عام معنوں سے مختلف ہونگے اور اس سے مراد یہ ہوگی کہ صرف آپؐ ہی ایک ایسے وجود ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبودیت کو اپنے انتہائی کمال تک پہنچا دیا ہے۔اسی طرح ایک صالحیت کا مقام تو وہ ہے جو صدیقیت اور شہادت سے بھی نیچے ہے۔اور ایک صالحیت کا مقام وہ ہے جس کے لئے انبیاء بھی دُعائیں کرتے ہیں۔کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے قرب کے غیر متناہی مدارج ہیں اور انسان کسی مقام پر بھی کھڑے ہو کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے تمام مدارج کو طے کر لیا ہے۔پس وہ دُعائیں کرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اور زیادہ ترقی دے اور انہیں اُن لوگوں کی معیت عطا کرے جنہیں اُن سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اُس کا قرب حاصل ہے۔آخر معراج کی رات جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف انبیاء سے ملاقات کی تو وہ تمام انبیاء ایک ہی آسمان پر تو نہیں تھے بلکہ اُن میں سے کوئی پہلے آسمان پر تھا کوئی دوسرے آسمان پر تھا۔کوئی تیسرے آسمان پر تھا۔کوئی چوتھے آسمان پر تھا۔کوئی پانچویں آسمان پر تھا۔کوئی چھٹے آسمان پر تھا اور کوئی ساتویں آسمان پر تھا۔پس چونکہ انبیاء میں بھی مدارج کا بڑا بھاری فرق ہے۔اس لئے جب ایک نبی یہ دُعا کرے گا کہ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ تو اس کے یہ معنے نہیں ہونگے کہ وہ اس صالحیت کے مقام کے لئے دُعا کر رہا ہے جو شہادت سے بھی نیچے ہے۔بلکہ اس کے معنے یہ ہونگے کہ وہ اُن لوگوں کی معیت کے لئے دُعا کر رہا ہے جو اُس سے بالا مقام رکھنے والے ہیں۔اور چونکہ اللہ تعالےٰ کے قرب کے غیر محدود مراتب ہیں اور جب کسی شخص کو ایک مقام حاصل ہو جائیگا تو اس سے اگلے مقام کے حصول کی خواہش اُس کے دل میں پیدا ہو جائے گی۔اور جب وہ بھی اُسے حاصل ہو جائے گا تو پھر اس سے اگلے مقام کی تڑپ اُس کے دل میں پیدا ہو جائیگی اسلئے اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ کی دُعا بھی ہمیشہ جاری رہے گی۔اور کبھی کوئی ایسا وقت نہیں آئے گا جب وہ اِس دُعا سے مستغنی ہو سکے۔

درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دُعا مانگ کر دنیا کو ایک بہت بڑا سبق سکھایا ہے۔آپ نے بتایا ہے کہ کسی شخص کو خواہ کتنا بلند مقام حاصل ہو چکا ہو یہ کبھی نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اُس نے ترقی کے تمام مدارج کو طے کر لیا ہے۔کیونکہ جب بھی یہ خیال اُس کے دل میں پیدا ہوگا وہ تنزل کی طرف گرنا شروع ہو جائیگا۔قوموں کی تباہی اور ان کے اِدبار کی بڑی وجہ بھی ہوا کرتی ہے کہ بعض دفعہ افراد یہ خیال کر لیتے ہیں کہ انہوں نے ترقی کے تمام مدارج طے کر لئے ہیں جب یہ وسوسہ اُن کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو وہ تنزل کا شکار ہو جاتے ہیں۔خدا تعالےٰ نے اس دُنیا کو ایسا متحرک بنایا ہے کہ کوئی ذرّہ ایسا نہیں جو حرکت نہ کر رہا ہو۔کسی کی حرکت دائرہ کی صورت میں ہوتی ہے اور کسی کی حرکت آگے کی طرف ہوتی ہے۔بہرحال کوئی ذرّہ ایسا نہیں جو متحرک نہ ہو۔خدا تعالیٰ نے انسانی زندگی کا مرکز قلب بنایا ہے اور وہ بھی ہر وقت حرکت کرتا رہتا ہے۔اگر اُس کی حرکت سکون سے بدل جائے تو اُسی وقت انسانی زندگی ختم ہو جائے۔یہی حالت ایمان کی ہے۔اور اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایمان کی ترقی یا اُسکے تنزل کا ذکر کرتے ہوئے قلب انسانی کی مثال دی ہے۔چنانچہ آپ نے فرمایا کہ انسانی جسم میں گوشت کا ایک مضغہ ہے

اگر وہ درست رہے تو سارا جسم درست رہتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے جسمانیات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کے قلب میں خرابی پیدا ہو جائے تو وہ تمام خرابیوں سے زیادہ پریشان کن ہوتی ہے۔ نہ اُسے کھانا اچھا لگتا ہے نہ پینا اچھا لگتا ہے۔ ہر وقت گھبراہٹ اور اُداسی اور غم اُس پر چھایا رہتا ہے۔ اور گو وہ زندہ ہوتا ہے مگر اُس کی حالت مُردوں سے بدتر ہوتی ہے۔ اِسی طرح جب روحانی لحاظ سے کسی کے قلب میں فتور واقع ہو جائے تو اُسکی وہ قوّتِ ممیّزہ جو نیکی اور بدی میں فرق کرنے والی ہوتی ہے ماری جاتی ہے۔ اور اُس کی حالت گرتے گرتے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے پس ضروری ہے کہ انسان اپنی کسی حالت پر بھی قانع اور مطمئن نہ ہو بلکہ وہ ہمیشہ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے مقام کی طرف ترقی کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

غرض یہ دُعا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے اس لئے نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی نجات میں کوئی شبہ تھا۔ بلکہ اس لئے بیان کی گئی ہے کہ مومنوں کو روحانی مدارج کے طے کرتے وقت یہ امر ہمیشہ مدّنظر رکھنا چاہیئے کہ وہ کسی مقام کو انتہائی مقام نہ سمجھ لیں اور کسی مقام پر پہنچ کر وہ یہ خیال نہ کر لیں کہ اب ہمیں گرنے کا کوئی خطرہ نہیں۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دُعا نہ مانگتے تو لوگ یہ خیال کر لیتے کہ ہمیں بھی کسی ایسی دُعا کی ضرورت نہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے انبیاء اُس مقام پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں کہ اُن کا ہر وقت عبادتِ الٰہی بسر ہوتا ہے وہ رات اور دن سوتے اور جاگتے۔ اُٹھتے اور بیٹھتے اللہ تعالیٰ کے عشق اور اُس کی محبت میں مخمور رہتے ہیں اُس کا ذکر اُن کی زبانوں پر جاری رہتا ہے اور اُس کے نام کو بلند کرنے کے لئے اُن کی زندگی کا ہر لمحہ اور اُنکے جسم کا ہر ذرّہ مصروف ہوتا ہے۔ لیکن باوجود اس حالت کے اُن کو بھی حکم ہوتا ہے کہ جاؤ اور نمازیں پڑھو۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ اگر وہ نمازیں نہ پڑھیں تو وہ لوگ جو انبیاء کے نمونہ کو دیکھ کر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی نمازوں کو چھوڑ دیں اِسی لئے کوئی نبی ایسا نہیں ہوا جسے عبادات سے فارغ کیا گیا ہو۔ ہر نبی کو عبادت کرنی پڑتی ہے ویسی ہی عبادت جیسی اَور لوگ کرتے ہیں حالانکہ اُن کا ہر لمحہ عبادت میں گذر رہا ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہی دیکھ لو۔ آپؐ صرف پانچ نمازیں ہی نہیں پڑھا کرتے تھے بلکہ آپؐ کی زندگی کی ہر گھڑی عبادتِ الٰہی میں گذرتی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ آپؐ کے متعلق فرماتا ہے کہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (انعام ع ۲۰) یعنی اے محمدؐ رسول اللہ! لوگوں سے کہہ دے کہ تم یہ نہ سمجھو کہ مَیں صرف پانچ وقت کی نمازیں پڑھتا ہوں بلکہ میری عبادت بھی اور میری قربانیاں بھی اور میری زندگی کی حرکات بھی اور میری موت بھی سب خدا کے لئے ہے میرا کوئی وقت ایسا نہیں جو خدا تعالیٰ کی یاد اور اُس کی محبت اور اُس کے ذکر میں نہ گذرتا ہو بلکہ میری موت بھی خدا کی عبادت ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب وفات پانے لگے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ اُس وقت بھی آپؐ کی زبان پر یہ کلمات جاری تھے اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی میرا وہ رفیق جو عرش پر بیٹھا ہے میں اب اُس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ پس آپؐ کا پانچ نمازیں پڑھنا درحقیقت ہماری ہدایت اور راہنمائی کے لئے ہی تھا۔ ورنہ اگر آپؐ نمازیں نہ پڑھتے تو جیسے

جھوٹے صوفیاء کی عادت ہوتی ہے کئی لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمیں نماز روزہ کی ضرورت نہیں۔

مَیں ایک دفعہ جمعہ کی نماز پڑھا کر فارغ ہُوا تو ایک صوفی منش آدمی آگے بڑھا اور کہنے لگا مَیں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ مَیں نے کہا فرمائیے۔ کہنے لگا۔ اگر کوئی شخص دریا میں سفر کرتے کرتے کنارہ پر پہنچ جائے تو اس کے بعد وہ کشتی میں ہی بیٹھا رہے یا نیچے اُتر جائے۔ جب اُس نے یہ سوال کیا معاً اللہ تعالیٰ نے مجھے اُس کے سوال کا مقصد سمجھا دیا۔ دراصل یہ صوفیاء کا ایک دھوکا ہے جس میں وہ عام طور پر مبتلا پائے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی حیثیت سواریوں کی سی ہے۔ یہ سواریاں ہمیں اپنے محبوب کے دروازہ تک پہنچانے کے لئے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے محبوب کے دروازہ تک پہنچکر سواریوں پر بیٹھا رہے اور نیچے نہ اُترے تو وہ اول درجہ کا گستاخ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرلے تو اُسے نماز روزہ کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ وہ خدا کے دروازہ تک پہنچ گیا۔ غرض جب اُس نے یہ سوال کیا۔ معاً اللہ تعالیٰ نے یہ تمام بات مجھ پر کھول دی اور مَیں نے اُسے کہا۔ اگر تو وہ دریا ایسا ہے جو کنارے والا ہے تو بیشک جب کنارہ آئے وہ کشتی سے اُتر جائے۔ لیکن اگر وہ دریا غیر محدود ہے اور اس کا کوئی کنارہ ہی نہیں تو وہ یاد رکھے کہ جس جگہ وہ نیچے اُتریگا اُسی جگہ وہ ڈوب جائیگا۔ اب آپ بتائیں کہ جس دریا کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ محدود ہے یا غیر محدود۔ کہنے لگا۔ ہے تو غیر محدود۔ مَیں نے کہا تو پھر غیر محدود دریا میں انسان جس جگہ بھی نیچے اُتریگا اُسی جگہ ڈوب جائیگا۔ اسکی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ کشتی پر سوار رہے۔ غرض ہم اُس خدا کی طرف جاتے ہیں جو غیر محدود ہے۔ یہ دنیا تو چند سالوں کی ہے مگر ہمیں یہ وعدہ دیا گیا ہے کہ اس دُنیا کے بعد پھر ایک زندگی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی اور اسی وجہ سے ہم اِس بات کے قائل ہیں کہ جنتیوں کو وہ نعمتیں ملیں گی جو غیر منقطع ہونگی۔ پس جبکہ ہم ایک غیر محدود دریا کے شناور ہیں اور ہمارا مقصد اس خدا کے قرب میں بڑھنا ہے جو ازلی ابدی ہے تو اس کے بعد ہمارا کسی حالت پر مطمئن ہوکر کھڑا ہو جانا کس طرح درست ہوسکتا ہے اگر ہم کھڑے ہوجائیں تو یقیناً تباہ ہو جائیں۔ مگر بجائے اِس کے کہ لوگ اس نکتہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے قربِ الٰہی کی منازل کے حصول کے لئے اپنے قدموں کو تیز تر کردیں اور اپنی قربانیوں اور ایثار اور خدمتِ خلق اور اعلیٰ اخلاق اور نیک نمونہ اور غرباء پروری اور خدمتِ قرآن اور اشاعت اسلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کو حاصل کرنے کی کوشش کریں وہ اس قسم کی سطحی بحثوں میں پڑ جاتے ہیں کہ ایک نبی نے یہ کیوں دُعا کی کہ الٰہی مجھے صالحین میں شامل کر۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ سارے صلحاء آخر ایک جگہ پر تو نہیں ہیں جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پہنچے وہاں حضرت ابوہریرہؓ نہیں پہنچے۔ اور جہاں حضرت ابوہریرہؓ پہنچے وہاں آجکل کے مسلمان نہیں پہنچے۔ پس اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تمہیں ہر وقت یہ دُعا مانگنی چاہیئے کہ تمہیں سارے صالحین کی مصاحبت حاصل ہو۔ پہلے ایک صالح کی مصاحبت حاصل ہو تو تمہارے دل میں دوسرے صالح سے ملنے کی خواہش پیدا ہو جائے دوسرے صالح سے ملو تو تیسرے صالح کے مقام تک پہنچنے کی خواہش پیدا ہو جائے۔ تیسرے صالح کے مقام تک پہنچو تو چوتھے صالح کے مقام تک پہنچنے کی خواہش

پیدا ہو جائے اور یہ خواہش اسی طرح بڑھتی چلی جائے یہاں تک کہ تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں تک پہنچ جاؤ۔ جو تمام صالحین میں سے سب سے بلند اور سب سے بالا اور سب سے ارفع مقام پر فائز ہیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات کو ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اندر بھی یہی رنگ پایا جاتا تھا اور آپ بھی خدا تعالےٰ کے قرب کے غیر متناہی مراتب کے حصول کے لئے ہمیشہ اپنے قدم کو تیز رکھتے تھے آجکل بعض نادان ایسے ہیں کہ دو چار دن کی نمازوں کے بعد ہی یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ انہوں نے قرب کے انتہائی مقامات کو طے کر لیا ہے۔ وہ خدا کو ایک چھوٹی سی چیز سمجھ لیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے اُس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کی ہستی ایسی عظیم الشان ہے کہ بڑے سے بڑے انبیاء بھی اسکے قرب میں جسقدر بڑھ جائیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے قرب کے سب مقامات کو طے کر لیا ہے۔ بلکہ وہ جتنا زیادہ اُس کے قرب میں بڑھتے ہیں اُتنا ہی وہ خدا تعالیٰ کے فضلوں میں اور اس کی طاقتوں میں اور اُس کی قدرتوں میں وسعت پاتے ہیں اور وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اُن کے لئے قرب کا ابھی ایک غیر متناہی میدان پڑا ہے جس کو انہوں نے طے کرنا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ آپ بڑھاپے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے حضور اس قدر گریہ وزاری کرتے اسقدر گڑگڑاتے اور اس قدر تضرع اور عاجزی سے دُعائیں کرتے کہ بعض دفعہ اللہ تعالےٰ کے حضور عبادت میں کھڑے کھڑے آپ کے پاؤں سُوج جاتے۔ یہ دیکھکر آپ کی بیویوں کے دلوں میں رحم پیدا ہوتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں۔ آخر ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ ہی دی کہ یا رسول اللہ! جب آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ اللہ تعالیٰ معاف کر چکا ہے تو آپ اسقدر عبادت کیوں کرتے ہیں اور کیوں اتنی مشقت برداشت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا۔[1] تم کہتی ہو کہ خدا نے مجھ پر یہ فضل کیا کہ میرے اگلے پچھلے سب گناہوں کو معاف کر دیا۔ اور جب حالت یہ ہے تو کیا میرا فرض نہیں کہ میں خدا تعالیٰ کے اس فضل کا شکریہ ادا کروں۔ اور اس وجہ سے کہ اُس نے مجھ پر یہ انعام کیا ہے میں اس کی دوسروں سے بھی زیادہ عبادت بجا لاؤں جب اُس نے مجھ پر اتنے بڑے فضل کئے ہیں تو مجھے دوسروں سے زیادہ شکریہ بھی تو ادا کرنا چاہیئے پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی خدا تعالےٰ کے قرب کے حصول کے لئے ہمیشہ زیادہ سے زیادہ جدوجہد کرتے رہے۔ اور یہی سبق ہے جو دعا کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں دیا ہے۔ اگر لوگ اس سبق کو یاد رکھیں تو اُنکی روحانیت کبھی مُردہ نہ ہو اور شیطان اُن پر کبھی تسلّط اور غلبہ نہ پائے۔

پھر فرماتے ہیں۔ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ۔ اے خدا! بعد میں آنے والے لوگوں میں تو مجھے ایک قائم رہنے والی اور ظاہر و باطن طور پر اچھی تعریف مجھے بخش۔ عربی زبان میں جب صدق کی طرف کوئی لفظ مضاف ہو تو اس کے مفہوم میں دوام اور ظاہر و باطن کی خوبی کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ مفردات امام راغبؒ میں لکھا ہے۔ اَلصِّدْقُ یُعَبَّرُ عَنْ کُلِّ فِعْلٍ فَاضِلٍ ظَاهِرًا وَّبَاطِنًا بِالصِّدْقِ

---

[1] تفسیر درمنثور جلد ۶ زیر آیت اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا و بخاری جلد اوّل کتاب التہجد۔

فَیُضَافُ اِلَیْہِ ذٰلِکَ الْفِعْلُ الَّذِیْ یُوْصَفُ بِہٖ ۔
یعنی صدق سے مراد ہر وہ فعل ہوتا ہے جو ظاہر و باطن
میں خوبی رکھتا ہو اور جس فعل کی صدق کو صفت بنانا
ہو اُس کو صدق کی طرف مضاف کر دیتے ہیں۔ پس
اِس دُعا کے معنے یہ ہیں کہ اے میرے خدا! تو آخری زمانہ
کے لوگوں کے دلوں میں میرے لئے دُعا کی تحریک پیدا کر
دے لیکن وہ دُعا عارضی نہ ہو بلکہ ہمیشہ ہمیش کے لئے
ہو۔ اور پھر وہ تعریف صرف لوگوں کی زبانوں پر ہی
نہ ہو بلکہ واقعہ میں میرے نیک کام دنیا میں قائم رہیں
اور اِس طرح مجھے ظاہری اور باطنی طور پر اچھی تعریف
حاصل ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اِس دُعا کو دُنیا کے
تمام مذاہب میں سے صرف مسلمانوں نے پورا کیا ہے۔
ممکن ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے بیٹے اور
پوتے آپ کے لئے دُعا کرتے ہوں۔ لیکن بہت سی نسلیں
گذر جانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روحانی
اور جسمانی اولاد ان کو بھول گئی۔ لیکن مسلمان ہیں جو تیرہ سو
سال سے برابر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے دُعا
کرتے چلے آرہے ہیں اور قیامت تک دُعا کرتے چلے
جائیں گے۔ چنانچہ ہر نمازی تشہد کے آخر میں کہتا ہے
کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ
عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ
عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔
یعنی اے اللہ! تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اُسی طرح
فضل نازل فرما جس طرح تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام
پر فضل نازل فرمایا۔ گویا ہم خدا تعالیٰ کی اُس محبت پر
انتہا درجہ کا اعتماد رکھتے ہیں جو اُس نے حضرت ابراہیم
علیہ السلام کے ساتھ کی اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ
نے اُن سے انتہا درجہ کا پیار کیا تھا۔ لیکن بعض لوگ جو
حقائق سے ناآشنا ہوتے ہیں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نسبت دینے میں آپ کی
ہتک خیال کرتے ہیں۔ اور یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ جب
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل تھے
تو اللہ تعالیٰ نے درود میں اپنی برکات اور انعامات کے
نزول کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کیوں مثال دی
سو اس بارہ میں ایک نکتہ یاد رکھنا چاہیئے جس سے
یہ سوال بالکل حل ہو جاتا ہے۔ دنیا میں اگر ایک شخص
سنگترے کا درخت لگائے تو سنگترہ اپنی ذات میں
کچھ خاصیتیں رکھتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک خاص حد
تک اونچا ہو سکتا ہے ایک خاص حد تک پھیل سکتا ہے
اور ایک خاص حد تک پھل دے سکتا ہے۔ اعلیٰ درجہ
کا سنگترہ پندرہ بیس فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔ پس
اگر وہ سنگترہ بیس فٹ تک اونچا ہو جائے تو سارے
لوگ کہیں گے کہ سنگترہ اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ اگر ایک
سنگترہ پچیس فٹ کے گھیر میں پھیل سکتا ہے اور وہ اتنا پھیل
جاتا ہے تو لوگ کہیں گے کہ اس سنگترے نے کمال کر دیا
اگر ایک سنگترہ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار پھل دے
سکتا ہے اور وہ ایک ہزار پھل دے دیتا ہے تو ہم
کہیں گے اس سنگترے نے کمال کر دیا۔ لیکن اس کے
مقابل میں بڑ کا درخت لے لو۔ بڑ کا درخت دو سَو
فٹ تک اونچا ہو جاتا ہے اور عام درخت اسّی نوّے
فٹ کے ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص بڑ لگائے اور
وہ پچیس فٹ کا ہو جائے۔ یا اگر اس کا پھیلاؤ ڈیڑھ
دو سو فٹ ہو سکتا ہے اور اُس کا پھیلاؤ بیس پچیس
فٹ ہو جائے اور کوئی کہہ دے کہ اُس نے کمال کر دیا
تو ہم اس کو بیوقوف کہیں گے۔ یا فرض کرو کسی نے بیر
کا درخت لگایا۔ بیر کا درخت ایک ہزار نہیں بلکہ

بیس ہزار کے قریب پھل دیتا ہے۔ اب اگر بڑ کا درخت پچیس فٹ اونچا ہو جائے اور پچیس فٹ اس کا گھیر ہو جائے۔ اور بیر کا درخت ایک ہزار بیر دے اور کوئی کہے کہ چونکہ بڑ کا پھیلاؤ سنگترے جتنا اور بیر کو پھل بھی سنگترے جتنا لگا ہے اس لئے انہوں نے تو کمال کر دیا ہے تو ہم کہیں گے یہ احمقانہ بات ہے یہ چیز ان درختوں کے کمال کا ثبوت نہیں بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ درخت ناقص ہیں۔ پس ہر کمال نسبت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ مثلاً ہم نے سنگترہ لگایا اور خدا تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ سنگترہ جتنا اونچے سے اونچا ہو سکتا تھا ہو گیا جتنا زیادہ سے زیادہ پھیل سکتا تھا پھیل گیا اور جتنا زیادہ سے زیادہ پھل دے سکتا تھا اُتنا پھل اُس نے دے دیا۔ پھر ہم نے آم کا درخت لگایا۔ اب اگر آم کا درخت لگاتے ہوئے ہم کہیں گے کہ اے خدا! تو اس میں ایسی ہی برکت دے جیسے سنگترے میں دی تھی۔ تو کوئی شخص اس کے یہ معنے نہیں کرے گا کہ اے خدا! اس کو بیس فٹ اونچا کر دے۔ اسی طرح کوئی اس کے یہ معنے نہیں کرے گا کہ خدا تعالیٰ اس کا گھیر پچیس فٹ کر دے اور کوئی شخص اس کے یہ معنے نہیں کرے گا کہ خدا تعالیٰ اس کو ایک ہزار پھل لگا دے بلکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اے خدا! جتنا زیادہ سے زیادہ آم کا درخت پھیل سکتا ہے تو اسے پھیلا دے اور جتنا زیادہ سے زیادہ آم کا درخت اونچا ہو سکتا ہے اُتنا ہی اُسے اونچا کر دے اور جتنا زیادہ سے زیادہ آم کا درخت پھل دے سکتا ہے اُتنا اُسے پھل لگا دے تاکہ جس طرح وہ سنگترہ اپنی جنس میں کمال کو پہنچ گیا تھا اسی طرح یہ بھی اپنی جنس میں کمال کو پہنچ جائے۔ تو اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ کے یہ معنے ہیں کہ جس طرح قومی نبیوں میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات میں کمال کو پہنچ گئے تھے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو جمیع عالم کی طرف نبی ہیں اور ایک الگ جنس ہیں اس میں وہ اپنے کمال کو پہنچ جائیں۔ جیسے سنگترہ اَور ہے اور بڑ یا آم اَور۔ جب ہم کہیں گے کہ سنگترہ کی طرح آم اپنے کمال کو پہنچ جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو گا کہ وہ ایک ہزار پھل دے بلکہ مطلب یہ ہو گا کہ آم آٹھ دس ہزار پھل دے۔ اسی طرح جب ہم یہ کہیں گے۔ کہ سنگترے کی طرح بڑ اپنے کمال کو پہنچ جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو گا کہ وہ بیس پچیس فٹ اونچا ہو جائے بلکہ یہ مطلب ہو گا کہ وہ دو سو فٹ اونچا ہو جائے۔ تو درحقیقت درود کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح ابراہیمؑ اپنی جنس میں کمال درجہ کا وجود تھا۔ اُسی طرح اے خدا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی جو جمیع عالم کی طرف نبی ہیں اُن کی جنس کے لحاظ سے جو سب سے بڑا درجہ ہے انہیں عطا کر یعنی اس کو جتنا بڑا ہونا چاہیئے اُتنے بڑے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہو جائیں اور اُس کا جتنا پھیلاؤ ہونا چاہیئے اُتنا پھیلاؤ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہو جائے۔ اور جتنا اُسے پھل لگنا چاہیئے اُتنا پھل اُن کو لگ جائے۔ گویا درود میں ہم یہ دُعا کرتے ہیں کہ اے خدا جس طرح ابراہیمؑ اپنی محدود جنس میں کمال کو پہنچا ہے اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا میں اپنے کمال کو پہنچ جائیں۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کسی نے ایک بکری لی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی برکت ڈالی کہ اُس نے ڈیڑھ سیر دودھ دینا شروع کر دیا اور دو بچے ششماہی دینے شروع کر دیئے اس کے بعد جب

کوئی شخص گائے لے گا۔ تو وہ کہیگا۔ اے خدا جس طرح
تُو نے فلاں کی بکری میں برکت ڈالی تھی اُسی طرح میری
گائے میں بھی برکت ڈالدے۔ اب کیا اس کا یہ مطلب
ہوگا کہ یہ گائے ڈیڑھ سیر دودھ دینے لگ جائے۔
اور ہر چھٹے مہینے دو بچّے دیدے۔ کبھی کسی گائے نے ایسا
نہیں کیا۔ اچھی گائے کبھی بھی ڈیڑھ سیر دودھ نہیں دیتی
اور نہ ہی کوئی گائے چھ ماہ میں دو بچّے دیتی ہے۔
بلکہ اس کی دُعا کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس طرح فلاں
بکری بکریوں میں اچھی ثابت ہوئی ہے اسی طرح یہ
گائے گائیوں میں اچھی ثابت ہو۔ تو اَللّٰھُمَّ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ
عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ
مَّجِیْدٌ کے یہی معنے ہیں کہ جس طرح ابراہیمؑ اپنی قسم
کے لوگوں میں سے انتہائی درجہ کے کمال کو پہنچ گئے۔
اُسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کام کے لحاظ
سے کمال کو پہنچ جائیں۔ ابراہیمؑ بنی اسرائیل کے لئے تھے
جس طرح انہوں نے بنی اسرائیل میں اپنا کمال دکھایا۔
اُسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا میں
کمال دکھائیں۔ تو اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی
اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی
اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ کے معنے ہم
یہ کریں گے کہ اے خدا جس طرح تو نے ابراہیمؑ کو
بنی اسرائیل کے لئے برکت دی جو دنیا کا ہزارواں حصّہ
ہے اسی طرح تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جو
ساری دنیا کے لئے مبعوث ہوئے ہیں اور جو بنی اسرائیل
سے ایک ہزار گنا بڑی ہے ابراہیمؑ سے ہزار گنا زیادہ
برکت دے۔ کَمَا کا لفظ بعض اوقات نسبتی
معنوں میں بھی بول لیا جاتا ہے جیسے میں نے مثال دی
ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس بکری ہو جو اپنے کمال کو
پہنچی ہوئی ہو تو جب کوئی زمیندار گائے خریدے گا تو
وہ کہے گا۔ اے خدا! جس طرح تو نے فلاں کی بکری میں
برکت دی تھی اسی طرح تو میری گائے میں بھی برکت
دے۔ اب اس کے یہ معنے نہیں ہونگے کہ گائے چھ ماہ
میں دو بچے دے یا ڈیڑھ سیر دودھ دے۔ گائے اگر
اچھی ہوگی تو سات آٹھ سیر دودھ دیگی۔ اور اگر بھینس
لے گا۔ اور وہ دُعا کرے گا۔ کہ جس طرح
فلاں بکری میں برکت ڈالی تھی اُسی طرح اِس میں بھی
برکت ڈال تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے ایسی بھینس
دے جو چودہ پندرہ سیر دودھ دینے والی ہو۔ غرض
الفاظ تو ویسے ہی بولے جائیں گے لیکن چونکہ جنس علیحدہ
علیحدہ ہوگی اس لئے معنے بھی الگ الگ ہو جائینگے
حضرت ابراہیمؑ کی جنس الگ تھی اور رسول کریم صلے اللہ
علیہ وآلہٖ وسلم کی الگ۔ آپ کی قوم دو چار لاکھ تھی
دنیا میں یہودی اِسوقت ڈیڑھ دو کروڑ کی تعداد میں ہیں لیکن
ساری دنیا کی آبادی دو ارب سے بھی زیادہ ہے۔
گویا یہودی دنیا کی آبادی کا سوواں حصہ ہیں۔ اِس
لحاظ سے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ کے معنے یہ ہونگے کہ اے اللہ!
جس طرح تُو نے ابراہیمؑ کو یہودی قوم کے لئے برکت دی
اُسی طرح تُو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ابراہیمؑ سے
سَو گُنا زیادہ برکت دے۔ اگر دس ارب روپیہ یہود کو
دیا تو اسی نسبت سے اُمتِ محمدیہ کو سو گنا زیادہ مال
دے۔ پس یہاں کَمَا کے معنے زیادتی کے ہیں برابری
کے نہیں کیونکہ جنس الگ ہے۔ اگر رسول کریم صلے اللہ
علیہ وسلم صرف عرب کے لئے مبعوث ہوتے تو پھر
ویسے ہی معنے لئے جاتے کیونکہ بکری کی بکری سے
نسبت ہوتی ہے اور گائے کی گائے سے نسبت ہوتی ہے۔

غرض کما کا مفہوم برابری کا نہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح ابراہیمؑ اپنی جنس میں کامل وجود بنا اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی جنس میں کامل وجود بنیں۔ آخر ساری دنیا کی طرف آنے والے نبی کو جو درجہ ملنا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام تو وہاں پہنچ ہی نہیں سکتے تھے جس طرح ایک جمعدار اگر اپنے ماتحتوں پر جو کہ پندرہ بیس ہوتے ہیں اچھی طرح کنٹرول رکھتا ہے اور ایک کمانڈر دو تین لاکھ فوج کی کمان کرتا ہے تو وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم کہیں کہ جس طرح اس جمعدار نے پندرہ آدمیوں پر کنٹرول کر رکھا ہے ویسے ہی یہ کمانڈر بھی کنٹرول رکھتا ہے تو اس "ویسے" کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ پندرہ آدمیوں پر کنٹرول رکھنے والا دو تین لاکھ پر کنٹرول کر سکتا ہے۔ بہرحال کوئی عقلمند اس فقرہ کے سوائے اس کے اور کوئی معنے نہیں لیگا کہ جس طرح اس جمعدار نے اپنی جنس میں کمال پیدا کیا ہے اسی طرح کمانڈر اپنی جنس میں کمال پیدا کرے ویسے تو پندرہ آدمیوں پر کمان کرنے والے اور دو لاکھ آدمیوں پر کمان کرنے والے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پندرہ آدمیوں پر کنٹرول کرنے والے کو اگر سو آدمی بھی دے دیئے جائیں تو وہ فیل ہو جائیگا۔ لیکن تین لاکھ آدمیوں پر کنٹرول کرنے والا ایک وقت میں ہزارہا جمعداروں پر کنٹرول کرلے گا۔ تو جب ہم یہ دُعا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ جس طرح تو نے ابراہیمؑ کو اپنی جنس میں کمال عطا فرمایا اسی طرح تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی جنس میں کمال عطا فرما۔ اور اس سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہتک نہیں ہوتی۔ بہرحال ابراہیمؑ کو اللہ تعالےٰ نے اپنی جنس میں بڑا کمال بخشا۔ اور ایسا بخشا کہ اس جنس میں سے کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ حکومتیں اپنی ملکی ترقی کیلئے دو قسم کی پالیسیاں اختیار کیا کرتی ہیں ایک پالیسی "شارٹ ٹرم پالیسی" کہلاتی ہے اور ایک "لانگ ٹرم پالیسی" کہلاتی ہے۔ یعنی ایک تو اس ملک کی موجودہ مشکلات کو دُور کرنے کے لئے عارضی انتظام ہوتا ہے اور ایک اُس ملک کے لئے لمبا پروگرام ہوتا ہے جس کا مقصد اس ملک کی حالت کو بہتر بنانا ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی گورنمنٹ اپنے ملک کو ایک دن میں اعلیٰ ترقی نہیں دے سکتی بلکہ اس کے لئے تیس پینتیس[۳۵] سال کی کوشش اور جد وجہد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن تیس پینتیس سال کی کوشش کے یہ معنے نہیں کہ اگر کسی حصّۂ ملک میں قحط پڑ جائے تو حکومت کہے کہ ہم نے پروگرام بنایا ہُوا ہے کہ تیس سال کے بعد ایسے حالات پیدا نہیں ہونگے اب چونکہ ہم اس طرف لگے ہوئے ہیں اس لئے ہم قحط زدہ لوگوں کی مدد نہیں کر سکتے۔ اگر وہ مرتے ہیں تو مریں۔ ایسے مواقع پر شارٹ ٹرم پالیسی کو اختیار کیا جاتا ہے تا اچانک پیدا ہونے والی باتیں اس پروگرام میں مخل نہ ہوں۔ "لانگ ٹرم پالیسی" یعنی ایسی پالیسی جس سے آئندہ آنے والے لوگوں کیلئے پچھلی تکالیف کا ازالہ کیا جائے اس کے لئے لوگ بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں مگر اُن میں سے کوئی قربانی بھی ابراہیمؑ کی قربانی سے بڑھ کر نہیں۔ یعنی جو "لانگ ٹرم پالیسی" حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کی کسی اور نے نہیں کی۔ شارٹ ٹرم پالیسی یہ ہے کہ اگر کسی کو کوئی ایسا آدمی نظر آئے جو بھوک سے مر رہا ہو اور وہ اس کے سامنے روٹی رکھدے اور کہے کہ کھا لو تو ہم اُسے اچھا اور نیک آدمی کہیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی پیاسا ہو اور کوئی اس کے سامنے خالی پانی ہی نہیں بلکہ شربت رکھے اور کہے کہ پی لو تو ہم اُسے اچھا اور نیک آدمی کہیں گے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ہم اُسے ظالم کہتے۔ ایسے کاموں کو ہم شارٹ ٹرم پالیسی کہتے ہیں اور اس قسم کی نیکیاں

عام طور پر پائی جاتی ہیں مگر ایک نیکی وہ ہوتی ہے جو سارے لوگوں کے لئے ہوتی ہے اور جس سے ساری دنیا فائدہ اُٹھاتی ہے ۔ جیسے مشہور ہے کہ ایک بادشاہ کہیں سے گذر رہا تھا کہ اُس نے ایک بوڑھے کو ایک درخت لگاتے دیکھا جو اسّی نوّے سال کے بعد پھل لاتا تھا اور بہت آہستہ آہستہ اُس کی ترقی ہوتی تھی ۔ یہ حالت دیکھ کر وہ کسان کے پاس آیا اور کہنے لگا ۔ کیا تیری عقل ماری ہوئی ہے کہ تُو ایسا درخت لگا رہا ہے جو اسّی سال کے بعد تجھے کوئی فائدہ پہنچائے گا ۔ کیا تُو سمجھتا ہے کہ تو اسّی سال تک زندہ رہ سکیگا ۔ تیری تو موت قریب ہے اگر تُو زیادہ سے زیادہ بھی زندہ رہا تو آٹھ دس سال تک زندہ رہ سکیگا ۔ پھر جب تجھے اس چیز سے کوئی فائدہ نہیں تو تُو اِسے کیوں لگا رہا ہے ۔ کسان نے کہا آپ تو بادشاہ ہیں اور اس مرتبہ کے لحاظ سے آپ کو بڑا تجربہ کار ہونا چاہیئے تھا ۔ آپ کو معلوم ہے کہ آدمی اٹھارہ بیس سال کا ہو کر کھیتی باڑی کا کام اچھی طرح سنبھال سکتا ہے اگر وہ اُسوقت اِس درخت کو لگائے اور اسّی سال تک یعنی جب اس کی عمر سو سال کی ہو جائے انتظار کرتا رہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اُسوقت تک وہ زندہ رہے گا ۔ اُن میں سے تو اکثر اس پھل کے آنے سے پہلے ہی مر چکے ہونگے ۔ اور بہت ہی کم تعداد ایسی ہوگی جو اس سے فائدہ اٹھا سکیگی ۔ اگر ہمارے باپ دادا بھی اسی خیال سے درخت نہ لگاتے تو پھر یہ درخت دنیا میں ہوتا ہی نہ ۔ ہر شخص کہتا کہ میں کیوں اس درخت کو لگاؤں جبکہ میں نے اس کا پھل کھانا ہی نہیں لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ انہوں نے پھل نہیں کھانا انہوں نے درخت لگائے اور ہم نے ان کا پھل کھایا ۔ اب ہم لگائیں گے تو ہماری اولادیں کھائیں گی ۔ بادشاہ کو یہ بات بہت پسند آئی ۔ اور اُس نے کہا ۔ "زہ" زہ کے معنے ہیں واہ واہ ۔ بادشاہ نے اپنے وزیر کو جو سفر میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا ہدایت کی ہوئی تھی کہ جب میں کسی سے خوش ہو کر "زہ" کہا کروں تو تم اُس شخص کو تین ہزار درہم یعنی ساڑھے سات سو روپیہ انعام دے دیا کرو ۔ جسوقت بادشاہ نے کہا "زہ" تو وزیر نے اُسی وقت تین ہزار درہم کی تھیلی کسان کو پکڑا دی ۔ جب کسان کو تھیلی ملی تو اُس نے پوچھا کہ یہ تھیلی مجھے کس لئے دی گئی ہے ۔ وزیر نے کہا کہ جب بادشاہ کسی بات پر خوش ہو کر "زہ" کہتا ہے تو اُس وقت یہ تین ہزار درہم کی تھیلی اُس شخص کو دے دی جاتی ہے جس کی بات پر بادشاہ سلامت خوش ہو کر زہ کہتے ہیں ۔ کسان نے بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا ۔ بادشاہ سلامت! آپ فرما رہے تھے کہ تم ایسا درخت لگا رہے ہو جس کا پھل تم نے نہیں کھانا بادشاہ سلامت لوگ یہ درخت لگاتے ہیں تو اسّی سال کے بعد اُس کا پھل کھاتے ہیں ۔ گندم بوتے ہیں تو چھ ماہ بعد کاٹتے ہیں لیکن میں نے تو اپنا پھل دم نقد وصول کر لیا ہے اس پر بادشاہ نے پھر کہا "زہ" ۔ یعنی اس نے کیا ہی اچھی بات کہی ہے ۔ وزیر نے جھٹ تین ہزار درہم کی دوسری تھیلی کسان کو دے دی ۔ کسان دونوں تھیلیوں کو ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگا ۔ بادشاہ سلامت! پھلدار درخت سال میں ایک دفعہ پھل دیتے ہیں ۔ بعض درخت ایسے بھی ہوتے ہیں جو سال میں دو دفعہ پھل دیتے ہیں ۔ پھر بعض ایسی فصلیں بھی ہوتی ہیں جو مہینہ دو مہینہ کے بعد کاٹی جاتی ہیں غرض کوئی فصل ایسی نہیں کہ جس دن اُسے اُگایا جائے اُسی دن وہ پھل دے دے یا کسی قسم کا اُس سے فائدہ اُٹھایا جا سکے ۔ لیکن میں نے ایک منٹ میں دو دفعہ پھل کھا لیا ہے ۔ بادشاہ نے کہا "زہ" ۔ اِس پر وزیر نے جھٹ تیسری تھیلی کسان کو دے دی ۔ اِس کے بعد بادشاہ کہنے لگا ۔ اِس بوڑھے نے تو ہمیں لُوٹ لینا ہے آگے چلو ۔

اَب دیکھو بوڑھے نے پھل کا درخت لگایا تاکہ آئندہ نسلیں
کھائیں یہ "لانگ ٹرم پالیسی" کہلاتی ہے۔ لانگ ٹرم پالیسی
میں لوگ بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں وہ زمینیں خریدتے ہیں
اِس غرض سے کہ ہمارے بیٹوں کے کام آئیں اور وہ مشکلات
میں نہ پھنسیں لیکن مَیں نے کسی زمیندار کو نہیں دیکھا کہ اُس
نے اپنے پوتوں کے لئے زمینوں کا انتظام کیا ہو۔ اگرچہ
یہ بھی ایک لانگ ٹرم پالیسی ہے کہ بیٹوں کے مفاد کے لئے
زمین خریدی جائے لیکن بڑے بڑے زمیندار بھی اپنے پوتوں
کے لئے زمینیں نہیں خریدتے صرف بیٹوں کا خیال رکھتے
ہیں۔ ہماری جماعت خدا تعالیٰ کے فضل سے لاکھوں کی ہے
اور اس کا اکثر حصّہ زمینداروں کا ہے اور اُن میں بڑے
بڑے امیر زمیندار ہیں لیکن مَیں نے اُن میں سے کسی کو نہیں
دیکھا کہ اس نے اس غرض سے زمین خریدی ہو کہ پوتوں
کے کام آئے۔ پھر ہزاروں غیر احمدی۔ ہندو اور عیسائی ہیں
جو مجھ سے ملتے ہیں، مشورہ کرتے ہیں اور دعاؤں کے لئے
کہتے رہتے ہیں اور مَیں ان کی حالت جانتا ہوں لیکن مَیں نے
اُن میں سے بھی کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ اس غرض سے زمین
بڑھا رہا ہو یا مال جمع کر رہا ہو کہ اُس کے پوتوں کے کام
آسکے۔ ہر ایک اس لئے بڑھاتا ہے کہ اس کے بیٹے
کے کام آسکے۔ پوتے کا کسی کو خیال ہی نہیں آتا۔ لیکن
اِس کے مقابل پر ابراہیمؑ کی لانگ ٹرم پالیسی دیکھو۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے۔ آپ نے ایک
بیٹے حضرت اسحاقؑ کو کہا کہ آباد ملک میں جاکر تبلیغ کرو
اور دوسرے بیٹے کو مکّہ میں جو کہ وادیٔ غیر ذی زرع تھی
چھوڑ آئے۔ اِس غرض سے کہ ڈیڑھ ہزار سال بعد جو قوم
یہاں آباد ہو چکی ہوگی اُس کو ایک رہبر کی ضرورت ہوگی
اور اُسوقت میری یہ نسل خدا تعالیٰ کا نام بلند کرے گی۔
اب دیکھو یہ کتنی بڑی لانگ ٹرم پالیسی ہے۔ کہا جاتا ہے
کہ دو دن کے بعد قبیلۂ جرہم کے لوگ وہاں آکر آباد
ہوگئے تھے لیکن وہ بھی کتنے ہونگے زیادہ سے زیادہ
پچاس ساٹھ ہونگے اِس سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔ اور
گو یہ لوگ وہاں آکر آباد بھی ہوگئے۔ لیکن پھر بھی مکّہ
حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ میں تو نہیں بنا بلکہ
حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد ڈیڑھ ہزار سال اُسکو
آباد ہوتے لگے۔ غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت
اسماعیل علیہ السلام کو وادیٔ غیر ذی زرع میں اسلئے بٹھایا
تا ڈیڑھ ہزار سال بعد جب یہ جنگل آباد ہو تو اس وقت
یہ نسل اُن کو تبلیغ کرے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے اشوک
کے زمانہ میں یا بکرماجیت کے زمانہ میں کوئی پنتھ یا وڈّان
یا سناتنی یا جینی اپنی اولاد کو سرگودہا بار یا منٹگمری بار
میں اِس لئے بساتا کہ کبھی نہ کبھی یہ علاقہ آباد ہوگا اور
جب یہ علاقہ آباد ہوگا تو اُسوقت یہ خدا کا نام لیں گے۔
یہ کتنی لانگ ٹرم پالیسی ہے۔ دو ہی بیٹے ہیں۔ ایک کو
تو آباد علاقہ میں بھیج دیا تاکہ وہ وہاں تبلیغ کرے۔
اور دوسرے کو وادیٔ غیر ذی زرع میں بٹھا دیا تاکہ جب
وہ آباد ہو تو اُس کی نسل وہاں تبلیغ کرے۔ اتنی
لانگ ٹرم پالیسی میرے نزدیک نہ سیاسی لحاظ سے
نہ تجارتی لحاظ سے۔ نہ سائنس کے لحاظ سے۔ نہ کسی قوم نے
نہ کسی قبیلہ نے۔ نہ کسی خاندان نے۔ نہ کسی علمی گروہ نے۔
اور نہ کسی فلسفی جماعت نے اختیار کی ہے جو حضرت
ابراہیم علیہ السلام نے تبلیغ کے لئے اختیار کی۔ حضرت
ابراہیم علیہ السلام کے سامنے چند دنوں کا سوال نہ تھا۔
بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں سالوں کا سوال تھا۔ کسی کو
علم نہیں تھا کہ عرب کب آباد ہوگا اور کتنی دیر تک اُن
کی اولاد کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اِس میں کوئی
شبہ نہیں کہ اس تمام واقعہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام
کے ارادہ کے ساتھ الہامِ الٰہی بھی شامل تھا لیکن اللہ تعالیٰ
بھی اپنے بندے کی قلبی کیفیت کو دیکھتے ہوئے ہی اسکے

مطابق الہام نازل فرماتا ہے۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام
کے دل کی کیفیت ایسی نہ ہوتی اور اُن کے جذبات ایسے
نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ اُن کو کبھی اپنے بچے کو قربان کرنے
کا حکم نہ دیتا۔ اگر اُن کے دل میں یہ تڑپ نہ ہوتی کہ اُن
کا بچہ خدا کی راہ میں قربان ہو تو اللہ تعالیٰ اُن کے لئے
یہ کبھی سامان پیدا نہ کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ سامان پیدا کرنا
بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں یہ تڑپ
موجود تھی۔ اور اسی تڑپ کی وجہ سے ہم کہتے ہیں اَللّٰھُمَّ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی
اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
جب ہم درود پڑھتے ہیں تو ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام
کا یہ جذبہ یاد آ جاتا ہے اور ہمارے دلوں میں بھی یہ خواہش
موجزن ہوتی ہے کہ تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نام بلند ہو
اور کیا آبادیاں اور کیا ویرانے ہر جگہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کی آواز
بلند ہو۔

ڈلہوزی سے قریباً بارہ میل کے فاصلہ پر ایک جگہ ہے
جس کو کھجیار کہتے ہیں۔ اُس میں ایک تالاب ہے اور اُس
تالاب میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو تیرتا پھرتا ہے۔
معلوم نہیں کہ کس طرح خدا تعالیٰ کی قدرت سے وہ حصّہ
زمین سے علیحدہ ہو گیا۔ اس جزیرہ میں گھاس اور مٹی کے
سوا کچھ نہیں۔ وہ تالاب جس میں وہ جزیرہ تیرتا ہے قریباً
دوسو فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے اور وہ جزیرہ تیس۳۰
پینتیس۳۵ فٹ کے قریب لمبا چوڑا ہے اور ہوا کے چلنے
سے ہلتا اور ایک طرف سے دوسری طرف چلا جاتا ہے۔
ہندوؤں کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا کوئی خاص کرشمہ
ہے۔ وہاں ایک مندر ہے جو ایک سادھو کی یادگار کے
طور پر بنایا گیا ہے۔ اُس سادھو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ
اس تالاب کی تہ کا پتہ لگانے کے لئے اسّی سال تک رسّی
بٹ بٹ کر اس میں ڈالتا رہا۔ لیکن باوجود اسّی سال تک رسّی بٹنے کے وہ رسّی
پانی کی تہ تک نہ پہنچی۔ آخر اُس سادھو نے "تو ہی پرمیشور
ہے" کہہ کر اس تالاب میں چھلانگ لگا دی اور ڈوب گیا۔
ایک دفعہ ہم کھجیار گئے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا
کہ اس جزیرہ پر چڑھنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے ایک دوست
سے کہا کہ ہمت کرو اور یہ جو تختے اور گیلیاں اردگرد پڑی
ہیں اُٹھا لاؤ تاکہ ان کے ذریعہ ہم جزیرہ کے زیادہ قریب
ہو جائیں۔ اُس وقت کوئی ہندو یا سرکاری افسر وہاں
نہیں تھا جو ہمیں جزیرہ پر چڑھنے سے روکتا۔ ایک گیلی
ہم نے تالاب میں ڈالی اور اُس سے کہا کہ تم اس کے ساتھ
چمٹ جاؤ ہم گیلی کو دھکا دیں گے اور تم جزیرے تک
پہنچ جاؤ گے اور ساتھ چپّو بھی دیدیا کہ اگر ضرورت ہو
تو اس سے کام لے لینا۔ چنانچہ ہم نے گیلی کو دھکا دیا اور
وہ دوست جزیرے تک پہنچ گئے اور اُس کو آہستہ آہستہ
ہمارے پاس لے آئے۔ جب جزیرہ ہمارے پاس آ گیا۔ تو
میں نے کہا یہ موقعہ ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا نام بلند کرو
اس سے پہلے کسی نے اس پر اللہ تعالیٰ کا نام بلند نہیں کیا
چنانچہ ہم اس جزیرہ پر چڑھ گئے اور خوب اذانیں دیں۔
اس بات کا علم ہونے کے بعد گورنمنٹ نے یہ قانون بنا
دیا کہ کسی شخص کو اس جزیرہ کو کھینچنے یا اس پر چڑھنے کی
اجازت نہیں۔ اب بیشک یہ قانون بن جائے لیکن ہم
نے تو اس پر اذانیں دے دیں اور اللہ تعالیٰ کا نام اُس پر
بلند کر دیا۔ جب ہم اذانیں دے رہے تھے تو مندر کا ایک
پجاری آ گیا۔ چونکہ ہمیں روکنے کی اُس میں جرأت نہ تھی
اس لئے وہ ہمیں ڈرانے کے لئے کہنے لگا کہ اس جزیرہ
پر ایک بہت بڑا سانپ رہتا ہے خطرہ ہے کہ آپ میں سے
کسی کو کاٹ نہ کھائے۔ میں نے کہا۔ سانپ کاٹتا ہے تو
کاٹنے دو۔ مگر ہم اس پر اذانیں ضرور دیں گے کیونکہ مومن
کے دل میں یہ تڑپ ہوتی ہے کہ میں وہاں اللہ کا نام بلند
کروں جہاں کسی نے بھی نہیں کیا۔ پس اپنے اندر

ابراہیمی جذبہ پیدا کرو۔ اور جو ملک آباد ہیں اُن میں تبلیغ کے لئے نکل جاؤ اور جو ملک غیر آباد ہیں وہاں اپنے بچوں کو بسا دو جیساکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد عرب میں بسا دی تاکہ جب بھی عرب آباد ہو تو اُن کی اولاد اُن میں اللہ تعالیٰ کا نام بلند کرنے والی ہو۔ یہ گوبی ڈیزرٹ یا دوسرے غیر آباد علاقے جو آج بیابان اور ویران نظر آتے ہیں تم ایسے علاقوں کو آباد کرو۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بجلی سے چلنے والی مشین یا کلیں ایسی نکال دے جن کے ذریعہ یہ علاقے بھی آباد ہو جائیں اور یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ کیونکہ باقی غیر آباد علاقے بھی تو پہلے اسی طرح ویران تھے۔ پس جہاں امریکہ۔ افریقہ۔ انگلستان۔ جرمن۔ اٹلی اور دوسرے آباد ممالک میں ہمارے مبلغ جائیں وہاں ساتھ ہی ہمیں یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ گوبی جیسے ریگستانوں اور ہندوستان کے ریتیلے علاقوں یا عرب کے غیر آباد علاقوں میں بھی ہم احمدیوں کو بسا دیں تاکہ جب بھی وہ علاقے آباد ہوں وہاں احمدیوں کی نسل موجود ہو جو اُن میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولؐ کا نام بلند کرے۔ ابراہیمی طریق تو یہی ہے کہ جو ملک آباد ہیں اُن میں اپنے مبلغ بھیجو۔ اور جو ملک غیر آباد ہیں وہاں اپنی نسلیں بسا دو۔ یہ ایسا جذبہ ہے کہ اس کے ماتحت جو قدم بھی تم اٹھاؤ گے اللہ تعالیٰ اُس میں برکت دیگا اور تمہارے ساتھ وہی سلوک کریگا جو اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے کیا۔ ہم دن رات کہتے ہیں اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ ہم اسی لئے کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں یہ جذبہ تھا کہ اس کا ایک حصہ آبادیوں میں تبلیغ کرنے لگ گیا اور دوسرا حصہ ویرانوں میں جا بسا۔ اب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد بھی تبھی ان برکات کی وارث ہوسکتی ہے جب اس کا ایک حصہ آبادیوں میں تبلیغ کرے اور سیدھی راہ سے برگشتہ لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف لوٹائے اور دوسرا حصہ غیر آباد علاقوں میں جا کر رہائش اختیار کرے تاکہ جب وہ علاقے آباد ہوں تو کلمہ پڑھنے والے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جانیں قربان کرنے والے لوگ وہاں موجود ہوں اور دنیا کی تمام آبادیاں اور ویرانے سب اللہ اکبر کی آوازوں سے گونج رہے ہوں۔

پھر فرماتے ہیں وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ۔ اے خدا! تو میرے باپ کو بھی معاف کردے کیونکہ وہ ہدایت اور راستی کے طریق سے منحرف ہو جانے والے لوگوں میں سے تھا۔ اسجگہ اَب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر اس سے مراد اُن کا چچا ہے جو بُت پرست تھا۔ کیونکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے اور انہیں اُن کے چچا نے پالا تھا۔ جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش بھی آپؐ کے والدین کی وفات کی وجہ سے آپؐ کے چچا حضرت ابو طالب نے کی تھی جو بُت پرست نہ تھے۔ اور اَب کے لفظ کا چچا کے معنوں میں استعمال قرآنی محاورہ سے ثابت ہے چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت جب اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ بتاؤ تم میرے مرنے کے بعد کس کی عبادت کروگے تو انہوں نے جواب دیا کہ نَعْبُدُ اِلٰھَکَ وَاِلٰہَ اٰبَآئِکَ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰھًا وَّاحِدًا (بقرہ ع ۱۶) ہم اُسی خدائے واحد کی پرستش کرینگے جس کی آپ بھی عبادت کرتے رہے ہیں اور آپ کے آباء حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ بھی عبادت کرتے رہے ہیں۔ اسجگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی جو حضرت یعقوبؑ کے دادا تھے

اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بھی جو آپ کے چچا تھے اَب قرار دیا گیا ہے۔ اِسی طرح اس آیت میں گو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ مگر مراد ان کا چچا ہی ہے جو بُت پرستی پر قائم رہا تھا۔ یہ دُعا جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لئے کی تھی کہ جب اُن کے چچا نے انہیں دھمکی دی کہ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا (مریم ع) اے ابراہیم! اگر تو بُتوں کی مذمت سے باز نہیں آئیگا تو مَیں تجھے سنگسار کر دونگا۔ اگر تُو اپنی جان بچانا چاہتا ہے تو کچھ دیر کے لئے میری نظروں سے اوجھل ہو جا تاکہ مَیں غصّہ میں کچھ کر نہ بیٹھوں۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا۔ اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے گو آپ اتنی سختی سے کام لے رہے ہیں لیکن پھر بھی مَیں آپ کے لئے اپنے ربّ سے مغفرت کی دُعا کرونگا کیونکہ وہ مجھ پر بہت ہی مہربان ہے۔ پس چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اُن کی مغفرت کے لئے دُعا کرینگے اس لئے انہوں نے اپنے وعدہ کے مطابق اللہ تعالےٰ سے دُعا کی کہ وَاغْفِرْ لِاَبِیْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ اے میرے خدا! میرے چچا کے گناہ کو معاف فرما دیں۔ وہ یقیناً گنہگاروں میں سے تھا مگر قرآن کریم بتاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ حقیقت کھل گئی کہ ان کا چچا توحید کا دشمن ہے تو انہوں نے اُس سے اپنی برأت کا اظہار کر دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔
مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ۝ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ ۝ (توبہ ع۱۴) یعنی نبی اور اُس پر ایمان لانیوالوں کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ مشرکوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی مغفرت طلب کریں۔ خواہ وہ اُن کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں جبکہ یہ امر اُن پر ظاہر ہو جائے کہ وہ توحید کا انکار کرنے کی وجہ سے دوزخی بن چکے ہیں (یعنی یا تو اللہ تعالیٰ اُن کا دوزخی ہونا اُن پر ظاہر کرے یا وہ شرک کی حالت میں ہی مر جائیں اور اس طرح اُن کی مشرکانہ موت سب کو نظر آ جائے) ہاں ابراہیمؑ کا اپنے چچا کے لئے استغفار صرف اس وجہ سے تھا کہ اُس نے اپنے چچا سے ایک وعدہ کیا تھا مگر جب اُس پر یہ امر کُھل گیا کہ وہ اللہ تعالےٰ کا دشمن ہے تو وہ اُس سے کلّی طور پر بیزار ہو گیا۔ ابراہیمؑ یقیناً بڑا ہی درد مند دل رکھنے والا اور بردبار انسان تھا۔

اسجگہ اَب سے چچا اس لئے بھی مراد لیا جاتا ہے۔ کہ قرآن کریم ایک طرف تو یہ بتاتا ہے کہ جب اُن پر اپنے اَب کے متعلق یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ اللہ تعالےٰ کا دشمن تھا۔ یعنی شرک کی حالت میں ہی اس کا انتقال ہو گیا تو وہ اس کے لئے مغفرت کی دُعا کرنے سے پوری طرح دست بردار ہو گئے۔ مگر دوسری طرف قرآن کریم بتاتا ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کے وقت انہوں نے یہ دُعا کی کہ رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ (ابراہیم ع) یعنی اے ہمارے ربّ تُو مجھے بھی اور میرے والدین کو بھی اور تمام مومنوں کو بھی قیامت کے دن اپنی مغفرت کے دامن میں چھپا لیجیئو۔ اور ہمارے گناہوں کو بخش دیجیئو۔ یہ ظاہر ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر انہوں نے اُسوقت کی ہے جبکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جوان ہو چکے تھے اور چونکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ دونوں کی پیدائش آپ کے بڑھاپے کے زمانہ میں ہوئی ہے اس لئے رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ والی دُعا آپ کی عمر کے آخری حصہ سے تعلق رکھتی ہے

اور وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ والی دُعا جو انہیں ترک کرنی پڑی اِس سے پہلے کی ہے۔ اگر اَب سے مُراد اُن کے باپ ہی ہوتے تو اس یقینی علم کے بعد کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن تھا بڑھاپے میں وہ اپنے والدین کی مغفرت کے لئے کیوں دُعا کرتے۔ پس اُن کا آخری عمر میں خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت اپنے والدین کی مغفرت کے لئے دُعا مانگنا بتاتا ہے کہ چونکہ اُن کے والدین کا زمانۂ فترت میں انتقال ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے اُن کی مغفرت کے لئے دُعا کر دی۔ لیکن اُن کے چچا نے چونکہ زمانۂ نبوت پایا اور اُسے توحید کی تبلیغ بھی کی گئی لیکن پھر بھی وہ اپنے شرک پر مصر رہا اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا اسلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے وعدہ سے دست بردار ہو گئے۔ اور یہ امر خود قرآن کریم سے ثابت ہے کہ انبیاء کی بعثت سے پہلے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں بوجہ اسکے کہ اُن پر حجّت تمام نہیں ہوتی اُن کا معاملہ ان لوگوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے جن پر نبی کے زمانہ میں حجّت تمام ہو چکی ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (مائدہ ع ۳) یعنی اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آ چکا ہے جو سلسلۂ رسالت کے ایک لمبے انقطاع کے بعد تمہیں ہمارے احکام خوب کھول کھول کر سُنا رہا ہے تاکہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ہمیں جوکس اور ہوشیار کرنے والا کوئی نہیں آیا۔ اب دیکھ لو کہ تمہارے پاس ہمارا بشیر اور نذیر آ چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر اُس امر پر جس کا وہ ارادہ کرے پوری طرح قادر ہے۔ اِس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے عدمِ آگاہی کو ایک معقول عذر قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ چونکہ ایسا عذر لوگوں کے حق بجانب ہونے کی علامت ہو سکتی تھی اسلئے ہم نے اُن کے عذر کو توڑ دیا۔ اور اُنکی طرف اپنے انبیاء بھیج دیئے تاکہ وہ دنیا میں ہماری تعلیم پھیلائیں۔ لوگوں پر حجّت قائم کریں۔ اور اُن کو کسی قسم کے عذر کا موقع نہ ملے۔ لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ خود یہ بات بھی تشریح طلب ہے۔ کیونکہ اگر اس کے یہ معنے کئے جائیں کہ جب نبی آتا ہے۔ صرف اُسی وقت لوگوں پر حجّت ہوتی ہے تو اِس کے یہ معنے ہونگے کہ جس جس زمانہ میں نبی آئے ہیں اُسی زمانہ کے لوگوں پر حجّت تمام ہوئی ہے باقی لوگوں پر حجّت تمام نہیں ہوئی۔ اگر یہ معنے تسلیم کر لئے جائیں تو اس طرح دنیا کا اکثر حصّہ اتمامِ حجّت کے دائرہ سے باہر نکل جائیگا۔ کیونکہ ہزاروں سال کے لمبے عرصہ میں چند زمانوں میں ہی نبی آئے ہیں۔ درمیان میں بڑے بڑے وقفے نظر آتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نبی لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث نہیں ہوا۔ پس اگر یہ معنے کئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف اُس زمانہ کے لوگوں پر ہی حجّت ہوئی ہے جس زمانہ میں کوئی نبی آیا ہے۔ باقی سب دنیا کسی الزام کے نیچے نہیں آتی۔ پس یہ جو شبہ پیدا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے میں اِسی کے متعلق بتاتا ہوں کہ قرآن کریم کی اِس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف کسی نبی کی زندگی میں جو لوگ ایمان نہیں لاتے وہی اتمامِ حجّت کے نیچے آتے ہیں بلکہ جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے ہر نبی کی حیات دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک اُس کی حیاتِ جسمانی ہوتی ہے اور ایک اُس کی حیاتِ فیضانی ہوتی ہے۔ ایک وہ زمانہ ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے جسم کے ساتھ دنیا میں زندہ ہوتا ہے اور ایک وہ زمانہ ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے فیضان کے ساتھ دنیا میں زندہ ہوتا ہے۔

اور کسی نبی کے فیضان کے زمانہ کی زندگی لوگوں کے عذرات کے لحاظ سے ویسی ہی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ اُس کی حیاتِ جسمانی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ زندہ موجود ہوتے ہیں جنہوں نے نبی کی زبان سے خدا تعالیٰ کا کلام سُنا ہوتا ہے اور وہ اُسکی قوتِ قدسیہ کے حامل ہوتے ہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول رسول ہی ہے اور اُسکے اتباع اتباع ہی ہیں۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ایک زندہ خدا لوگوں کو نظر آیا ہے اِسی طرح ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ کے ذریعہ بھی لوگوں کو ایک زندہ خدا نظر آتا تھا اور پھر ویسا ہی زندہ خدا حضرت حسن بصریؒ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ۔ حضرت جنید بغدادیؒ۔ حضرت محی الدین صاحب ابن عربیؒ۔ حضرت شہاب الدین صاحب سہروردیؒ حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ اور سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ وغیرہ کے ذریعہ بھی نظر آتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام کے زندگی بخش اثرات کو برابر قائم رکھا۔ اور اِس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے فیضان کی زندگی جاری رہی۔ سوال صرف یہ نہیں ہوتا کہ کوئی چیز کتنی نظر آئی ہے بلکہ اصل سوال یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز نظر آئی ہے یا نہیں آئی۔ اگر کوئی چیز نظر آجائے تو یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ وہ چیز چھوٹی ہے یا بڑی۔ دنیا میں مختلف قسم کی گائیں ہوتی ہیں۔ مختلف قسم کے گھوڑے ہوتے ہیں۔ کوئی ادنیٰ قسم کے ہوتے ہیں اور کوئی اعلیٰ قسم کے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی اعلیٰ درجہ کی گائے یا کسی اعلیٰ درجہ کے گھوڑے کو دیکھ کر یہ کہے کہ مجھے جب تک ایسی ہی گائے یا ایسا ہی گھوڑا دکھائی نہ دے میں مان نہیں سکتا کہ دنیا میں کوئی گائے یا گھوڑا بھی موجود ہے تو یہ اُس کی غلطی ہوگی۔ میں ایک دفعہ کپورتھلہ گیا تو وہاں میں نے مہاراجہ کی ایک گائے دیکھی جو تین ہزار روپیہ کی تھی اور جو ولایت سے منگوائی گئی تھی۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ میں نے گائے نہیں دیکھی اور اس کا مطلب وہ یہ لے کہ مہاراجہ کپورتھلہ کی جو تین ہزار روپیہ کی گائے ہے وہ میں نے نہیں دیکھی تو کوئی معقول انسان اُس کی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا۔ اِسی طرح ہم گھوڑوں کو دیکھتے ہیں تو وہ ٹٹو بھی ہوتے ہیں جو معمولی سی قیمت پر آجاتے ہیں اور وہ گھوڑے بھی ہوتے ہیں جو پچیس پچیس لاکھ روپیہ کو خریدے جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص پچیس لاکھ روپیہ والے گھوڑے کا ذکر سُن کر کہے کہ میں نے کبھی گھوڑا نہیں دیکھا اور اُس کا مطلب یہ ہو کہ میں نے پچیس لاکھ روپیہ قیمت والا گھوڑا نہیں دیکھا تو کوئی معقول انسان اُس کی اِس بات کو تسلیم نہیں کریگا۔ اگر وہ ایک بیمار اور ضعیف اور کمزور گھوڑا بھی دیکھ لیتا ہے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے گھوڑا نہیں دیکھا۔ اِسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ثبوت کسی انسان کے ذریعہ سے مِل جائے تو چاہے وہ اِتنا روشن اور بیّن نہ ہو اور چاہے وہ اُس فیضان کا ایک چھوٹا سا ظہور ہو بہرحال جب خدا کا عکس اُس کے آئینہ قلب میں سے نظر آجائے اور دُنیا اس کا انکار نہ کرسکے بلکہ اُسے کہنا پڑے کہ مَیں نے خدا کو دیکھ لیا تو کسی کا یہ کہنا کہ جب تک مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی طرح خدا نظر نہیں آئیگا مَیں تسلیم نہیں کروں گا۔ درست نہیں ہوگا۔ جب ایک چیز موجود ہو تو اس کا انکار واقعات کو جھٹلانا ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ کوئی چیز چھوٹی ہو اور کوئی بڑی۔

پس نبی کی جو حیات فیضانی ہوتی ہے اُس میں جتنے لوگ ہوں سب پر حجت تمام ہو جاتی ہے کیونکہ نبی کے زیر سایہ اور زیر تعلیم لوگوں کے ذریعہ وہ ایسے نشانات دیکھتے ہیں جن سے زندہ خدا کا ثبوت مل جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں یہ سلسلۂ فیوض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے طور پر جاری ہے کہ اِس میں کبھی انقطاع نہیں ہُوا۔ یہ سلسلہ ابتدائے اسلام سے جاری ہُوا

اور حضرت سید احمد صاحب شہید بریلویؒ کے زمانہ تک برابر جاری رہا۔ اور اُن کے اور اُن کے اتباع کے ذریعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے فیضان کا ثبوت لوگوں کو ملتا رہا۔ اُن پر الہامات کا نزول ہوتا تھا۔ وہ اُن الہامات کو بیان کرتے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی ہستی پر یقین پیدا ہوتا تھا۔ اور یہ تو صرف ہندوستان کا ذکر ہے۔ دُنیا کے اَور حصّوں میں بھی مختلف مجدّدین مبعوث ہوئے اور وہ لوگوں کے لئے ہدایت اور راہنمائی کا موجب بنے

مجدّدین کے متعلق لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ایک ہی مجدّد ساری دُنیا کی طرف مبعوث ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر علاقہ میں اللہ تعالیٰ مجدّد پیدا کیا کرتا ہے مگر لوگ قومی یا ملکی لحاظ سے اپنی قوم اور اپنے ملک کے مجدّد کو ہی ساری دنیا کا مجدّد سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ جب اسلام ساری دنیا کے لئے ہے تو ضروری ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں اور مختلف ملکوں میں مختلف مجدّدین کھڑے ہوں۔ حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ بھی بیشک مجدّد تھے۔ مگر وہ ساری دنیا کے لئے نہیں تھے۔ بلکہ صرف ہندوستان کے مجدّد تھے۔ اگر کہا جائے کہ وہ ساری دنیا کے مجدّد تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے عرب کو کیا ہدایت دی انہوں نے مصر کو کیا ہدایت دی۔ انہوں نے ایران کو کیا ہدایت دی۔ انہوں نے افغانستان کو کیا ہدایت دی۔ ان ملکوں کی ہدایت کے لئے انہوں نے کوئی کام نہیں کیا لیکن اگر ان ممالک کی تاریخ دیکھی جائے تو ان میں بھی ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو صاحب وحی اور صاحب الہام تھے اور جنہوں نے اپنے ملک کی راہنمائی کا فرض سرانجام دیا پس وہ بھی اپنی اپنی جگہ مجدّد تھے اور یہ بھی اپنی جگہ مجدّد تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی بڑا مجدّد ہوتا ہے اور کوئی چھوٹا۔ ہندوستان میں آنے والے مجدّدین کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ اس ملک میں آئے جہاں مسیح موعود نے آنا تھا۔ اور اس طرح اُنکا وجود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰة والسلام کیلئے بطور ارہاص تھا۔ ورنہ ہمارا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ صرف یہی مجدّد ہیں باقی دنیا مجدّدین سے خالی رہی ہے ہر شخص جو الہام کے ساتھ تجدید دین کا کام کرتا ہے وہ روحانی مجدّد ہے۔ ہر شخص جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے تجدید کا کوئی کام کرتا ہے وہ مجدّد ہے۔ چاہے وہ روحانی مجدّد نہ ہو۔ جیسے مَیں نے کئی دفعہ مثال دی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰة والسلام نے ایک دفعہ فرمایا کہ اورنگ زیبؒ بھی مجدّد تھا۔ حالانکہ اورنگ زیبؒ کو خود الہام کا دعویٰ نہیں تھا۔ تو نبیؐ کے فیوض روحانی کا زمانہ نبی کی زندگی میں ہی شامل ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو فترت کا زمانہ بہت قلیل رہ جاتا ہے۔ گو بعض ممالک ایسے بھی ہیں جن پر فترت کا زمانہ کسی قدر لمبا نظر آتا ہے مگر ان ممالک کے ارد گرد بھی روحانی فیوض کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر جاری تھا۔ جیسے عرب کا ملک ہے۔ اس پر فترت کا ایک لمبا دَور آیا۔ گو بعض لوگ کہتے ہیں۔ اس عرصہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے بعض انبیاء ان میں مبعوث ہوئے۔ چنانچہ سنانؔ بن خالد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بھی نبی تھے اور اگر اس کو تسلیم کیا جائے تو اس طرح عرب پر بھی زمانۂ فترت زیادہ عرصہ تک نہیں رہتا۔ لیکن اگر مان بھی لیا جائے کہ ملک عرب پر فترت کا دَور لمبے عرصہ تک رہا تو بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اہل عرب کے دائیں اور بائیں ایسے لوگ مبعوث ہوتے رہے تھے جو خدا تعالیٰ کی طرف لوگوں کو بلاتے اور نشانات کے ذریعہ اُسکی ہستی کا ثبوت پیش کرتے۔ آخر یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ اہل عرب پر کسی ایسے نبی کے ذریعہ ہی اتمام حجت کی جاتی جو اُن میں سے ہوتا۔ جب داؤدؑ کے ذریعہ خدا اُن پر ظاہر ہو رہا تھا جب سلیمانؑ کے ذریعہ خدا اُن پر ظاہر ہو رہا تھا۔

جب عیسٰیؑ کے ذریعہ خدا اُن پر ظاہر ہو رہا تھا جب یحییٰؑ کے ذریعہ خدا اُن پر ظاہر ہو رہا تھا۔ جب ذوالقرنین کے ذریعہ جس سے مراد خورس شاہ ایران ہے ان پر خدا ظاہر ہو رہا تھا اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے الہام کا دعویٰ کیا۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو اہلِ عرب کے دائیں بائیں مبعوث ہوئے تو اس کے بعد اگر عرب میں کچھ وقفہ بھی ہؤا تب بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہمیں پتہ نہیں شرک بُری چیز ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ بار بار ان انبیاء کے ذریعہ پیش کیا جا چکا تھا۔ اور یہ انبیاء وہ تھے جو اہلِ عرب کے دائیں بائیں مبعوث ہوئے اور جن کے حالات اور جن کی تعلیم سے وہ لوگ بے خبر نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر اس طرح ہم دیکھیں تو فترت کا زمانہ بہت ہی قلیل رہ جاتا ہے جب خدا کا نور کہیں نظر نہ آتا ہو۔ اہلِ عرب پر بیشک فترت کا کچھ لمبا زمانہ نظر آتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کی برکت کی وجہ سے اور دوسری طرف اہلِ عرب پر اس رحم کی وجہ سے کہ انہوں نے فترت کا ایک لمبا دَور برداشت کیا تھا اپنے خاتم النّبیّین کو عربوں میں مبعوث فرما دیا اور اس طرح اس کمی کا ازالہ ہو گیا۔ بہرحال لوگوں کے خلافِ توحید اعمال اس وجہ سے معاف نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی اُن پر حجّت قائم کرنے کے لئے مبعوث نہیں ہؤا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس عذر کو ہمیشہ توڑتا رہتا ہے اور وہ انبیاء کے ذریعہ لوگوں پر حجّت قائم کر دیتا ہے خواہ یہ حجّت انبیاء کی جسمانی زندگی میں ہو خواہ اُنکی فیضانی زندگی میں ہو۔ لیکن وہ لوگ جو نہ تو انبیاء کی جسمانی زندگی کے زمانہ میں موجود ہوتے ہیں اور نہ اُن کی فیضانی زندگی میں موجود ہوتے ہیں ان کا معاملہ ایک جداگانہ نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ چنانچہ

احادیث میں آتا ہے کہ ایسے لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دوبارہ اپنا رسول بھیجے گا۔ اور پھر اُس کی اطاعت کرنے والوں یا اس کا انکار کرنیوالوں کو اپنے اپنے عمل کے مطابق جزا دی جائے گی[1]۔ اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کے زمانہ میں احکامِ الٰہی کی جو اہمیّت ہوتی ہے وہ فترت کے زمانہ میں نہیں ہوتی جب کسی نبی کی فیضانی زندگی بھی ختم ہو چکی ہو یا اُس فیضانی زندگی میں کوئی وقفہ پڑ چکا ہو جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ فیضانی موجود تھی مگر چونکہ کوئی ایسا بندہ موجود نہیں تھا جو بنی نوع انسان پر آپؐ کی روحانیت کا پرتو ڈالتا اور آپؐ کا نور اپنے آئینۂ قلب میں جذب کر کے اُس کی شعاعوں سے دوسروں کو منوّر کرتا اسلئے امتِ محمدیہ پر بھی فترت کا زمانہ آ گیا۔ مگر وہ فترت کا زمانہ بہت ہی تھوڑا تھا۔ آخر حضرت سید احمد صاحب شہید بریلویؒ کے وفات پاتے ہی اُن کے تمام شاگرد تو اپنے فرائض سے غافل نہیں ہو گئے تھے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ اُنکی وفات کے ساتھ ہی فترت کا زمانہ شروع ہو گیا تھا۔ آپ کی شہادت ۶ رمئی ۱۸۳۱ء کو ہوئی اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ۱۸۶۴ء کے قریب الہامات شروع ہو گئے تھے اور ۱۸۷۲ء میں آپؑ نے اسلام کی صداقت کے متعلق مضامین وغیرہ لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ گویا ابھی ایک انسانی عمر بھی نہیں گذری تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور شخص کو لوگوں کی اصلاح کے لئے کھڑا کر دیا یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زندہ نبی ہونے کا ایک نہایت ہی واضح اور کھلا ثبوت ہے اور بتاتا ہے کہ اسلام میں فترت کا زمانہ نہایت قلیل ہوتا ہے

[1] تفسیر رُوح المعانی جلد ۴ ص۴۹۶

بلکہ بعض دفعہ تو صرف نام کے طور پر ہوتا ہے ورنہ اِدھر ایک زمانہ ختم ہوتا ہے اور اُدھر تھوڑے سے وقفہ کے بعد ایک اَور دَور شروع ہو جاتا ہے اور اِس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان دُنیا میں ہمیشہ جاری رہتا ہے لیکن جن انبیاء کی فیضانی زندگی ختم ہو جائے اور اُن کے بعد بھی فترت کا دَور لمبا ہو جائے - اس دَور میں جو لوگ پیدا ہوتے ہیں اُن کے متعلق شرعی احکام بالکل اَور رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور اُن کے لئے مغفرت کی دُعا بالکل جائز ہوتی ہے۔

زیرِ تفسیر آیت میں جو مثال دی گئی ہے وہ ایک ایسے شخص کی ہے جو نبوت کے زمانہ میں تھا یعنی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا اور اِس زمانہ میں زندہ موجود تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کی تعلیم لوگوں کے سامنے پیش کی۔ پس ایسا انسان جس کے سامنے ایک نبی اپنی تعلیم پیش کرتا ہے اور وہ پھر بھی شرک پر اصرار کرتا ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی توحید سے پھرانے کی کوشش کرتا ہے اُسکے متعلق یقیناً اَور احکام ہونگے۔ اور زمانۂ فترت سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر اَور احکام نافذ ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا کے متعلق تو مغفرت کی دُعا واپس لے لی اور اُس سے اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا مگر اپنے والدین کے متعلق انہوں نے بڑھاپے میں بھی دُعا کی کیونکہ وہ زمانۂ فترت میں انتقال کر چکے تھے۔ اور اُن کے متعلق احکام ایک جُداگانہ نوعیت کے حامل تھے۔ اِس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے گذشتہ زمانہ میں جو مسلمان حیاتِ مسیح کے قائل رہے ہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن کو بزرگ اور صالح قرار دیا ہے لیکن موجودہ زمانہ میں اِس عقیدہ کو آپ نے عیسائیت کی مضبوطی کا موجب قرار دیا ہے۔ کیونکہ پہلے لوگوں کو علم نہیں تھا کہ یہ عقیدہ اسلام کے لئے کیسا خطرناک ہے مگر اب یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے۔ پس چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین زمانۂ فترت میں انتقال کر چکے تھے آپ نے اُن کی مغفرت کی دُعا کی۔ اور چونکہ اُن کا چچا توحید کی تعلیم سُننے کے باوجود اپنے شرک پر مصر رہا آپ نے اُس سے اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اَب کا نام قرآن کریم میں آزر بتایا گیا ہے (سورۂ انعام ع ۹) لیکن بائیبل کہتی ہے کہ اس کا نام تارا تھا (پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۷) عیسائی مستشرقین جو بائیبل کی ہر بات کو وحیٔ آسمانی سے کم نہیں سمجھتے بالعموم اعتراض کیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر قرار دے کر غلطی کی ہے۔ حالانکہ بائیبل نہ تو کوئی تاریخ کی کتاب ہے اور نہ ہی ہم پر حجت ہے۔ اس کے اپنے بیانات اسقدر متضاد اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں کہ قرآن کریم کے مقابلہ میں اُسے کسی طرح درست نہیں مانا جا سکتا۔ بائیبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا جو نام لکھا ہے وہ لکھنے والے اُن کے وقت میں موجود نہ تھے بلکہ سوا دو سو سال بعد میں پیدا ہوئے۔ پھر اُن کی بات تاریخی لحاظ سے کیونکر صحیح مانی جا سکتی ہے۔ اور بائیبل کے بیانات کی جو حالت ہے وہ اس ایک مثال سے ہی ظاہر ہے کہ بائیبل میں لکھا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ مصر سے نکلے تھے اُن کی تعداد چھ لاکھ سے اوپر تھی (گنتی باب ۱ آیت ۴۶) اور یہ وہ لوگ تھے جو لڑائی کے قابل تھے۔ اس لحاظ سے گویا کل مرد عورتیں اور بچے چوبیس پچیس لاکھ ہو گئے۔ مگر یہ بالکل ناممکن ہے کہ سوا دو سو سال میں بنی اسرائیل کی تعداد اسقدر بڑھ جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ تعداد چار ہزار تک

بڑھ سکتی ہے بشرطیکہ اُن میں کوئی عورت بانجھ نہ ہو اور کوئی مرد نامرد نہ ہو۔ گویا اگر نسل کی انتہائی ترقی مدنظر رکھی جائے جو دنیا میں کسی قوم کی نہیں ہوئی۔ اور یہ تسلیم کریں کہ ہر چالیس سال میں اُنکی تعداد دُگنی ہو جاتی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اُن کی تعداد چار ہزار ہونی چاہیئے۔ مگر بائیبل کہتی ہے کہ اُن میں چھ لاکھ سے اوپر جوان لڑنے والے تھے۔ گویا اُسوقت بنی اسرائیل کی تعداد چھبیس پچیس لاکھ کے قریب تھی۔ یہ بات حضرت موسےٰ علیہ السلام کے زمانہ کی بیان کی جارہی ہے۔ مگر قرآن کریم دو ہزار سال کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی یہ بات اِن الفاظ میں بیان فرماتا ہے کہ "وَهُمْ أُلُوفٌ" (بقرۃ ع ۳۲) وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ اور یہ وہی تعداد ہے جو بنی اسرائیل کی زیادہ سے زیادہ نسل بڑھنے کے متعلق اندازہ لگا کر میں نے پیش کی ہے۔ پس جس کتاب کی یہ حالت ہو اُسے تاریخی کتاب کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ تاریخ نہیں بلکہ قصوں اور کہانیوں کی کتاب ہے۔ اگر ہم اس کا احترام کرتے ہیں تو اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ ورنہ اس میں اتنا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے کہ اب اس کی کسی بات پر پورے طور پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پھر تورات کہتی ہے کہ حضرت ہارونؑ نے شرک کیا۔ اور اپنے ہاتھ سے پرستش کے لئے بچھڑا بنایا۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ حضرت ہارونؑ نے شرک نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کو روکنے کی کوشش کی اور یہی بات ایک نبی کے شایانِ شان ہے۔

غرض جبکہ بائیبل کی کئی باتیں تاریخی لحاظ سے غلط ہیں تو یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا بائیبل نے جو نام بتایا ہے وہ درست ہے اور قرآن کریم نے جو نام بتایا ہے وہ غلط ہے۔ اگر بائیبل کا بیان کلی طور پر درست ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تارا ہی ہوتا تو طالمود میں اُن کے باپ کا نام زارا کیوں لکھا جاتا۔ اور جوزیفس جو مشہور یہودی مؤرخ ہے وہ اس کا نام آتھر یعنی آذر کیوں بتاتا (ترجمۃ القرآن از سیل صفحہ ۹۵) یہ اختلاف جو خود یہودیوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے باپ کے نام کے متعلق اختلاف تھا۔ اور چونکہ قرآن کریم کا نزول اِسی لئے ہُوا کہ وہ پہلی الہامی کتب کے پیدا کردہ اختلافات کو دُور کرے اس لئے اُس نے اس اختلاف کو بھی دُور کر دیا اور بتا دیا کہ اُس کا نام آذر ہی تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ تارا سے ہی قرآن کریم نے آذر بنالیا ہو۔ کیونکہ تؔ زؔ سے بدل جاتی ہے۔ اور قلب کے ذریعہ الف پہلے آجاتا ہے معلوم ہوتا ہے عربوں کی زبان پر تارا کا لفظ نہیں چڑھتا تھا۔ انہوں نے تارا کو زارا بنالیا اور پھر زارا سے آذر بن گیا۔ چونکہ قرآن کریم عموماً معرّب نام استعمال کرتا ہے۔ جیسے ابراہام کو ابراہیم۔ اور یسوع کو عیسیٰ اور یوحنا کو یحییٰ اور حنوک کو ادریس کہا گیا ہے۔ اِسی طرح تارا کو زارا کہہ دیا گیا ہے۔ پس یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔

پھر سوال یہ ہے کہ ہم تو یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ اس جگہ اَبْ سے ان کا حقیقی باپ مُراد ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اسجگہ اَبْ کا لفظ چچا کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اِسی لئے دوسرے مقام پر جب انہوں نے اپنے والدین کے لئے دُعا کی تو وہاں اَبْ کی بجائے والد کا لفظ استعمال کیا۔ پس جبکہ ہم آذر اُن کے چچا کا نام سمجھتے ہیں تو بائیبل میں اگر اُن کے باپ کا نام تارا آگیا ہے تو اس سے قرآن کریم پر کیا اعتراض پڑ سکتا ہے۔ اگر بائیبل اُن کے چچا کا نام تارا بتاتی تب تو یہ اعتراض ہو سکتا تھا۔ لیکن بائیبل تو اُن کے حقیقی باپ کا نام تارا بتاتی ہے اور قرآن کریم اُن کے چچا کا نام آذر بتاتا ہے اِن دونوں کا آپس میں کوئی تعلق ہی نہیں کہ ایک نام کو دیکھکر دوسرے نام پر

اعتراض کر دیا جائے۔ اس کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ بائیبل حضرت سارہ کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی تھیں تارہ کی بیٹی قرار دیتی ہے۔ (پیدائش باب ۲۰ آیت ۱۲) اگر تارہ کو ان کا حقیقی باپ سمجھا جائے تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں۔ کہ آپ نے اپنی سگی بہن سے شادی کی حالانکہ بہن سے شادی کرنا ناجائز تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل وہ باپ نہیں بلکہ چچا تھا۔ مگر چونکہ انکی پرورش اپنے چچا کے گھر میں ہی ہوئی تھی اس لئے لوگوں کو غلطی لگ گئی اور انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تارا کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر مؤرخین نے بھی اسے آپ کا باپ قرار دے دیا۔ اس مقام پر بھی طالمود نے بائیبل کی اصلاح کی ہے اور بتایا ہے کہ حضرت سارا انکے بھائی کی بیٹی تھیں۔ اُن کی حقیقی بہن نہیں تھیں پھر طالمود میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بتوں کے خلاف آواز بلند کی تو آذر نے تنگ آکر بادشاہ کے پاس اُن کی شکایت کی اور انہیں سزا دلوانے کی کوشش کی۔ اس فعل کی بھی عقلی لحاظ سے ایک باپ سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ پس یہ تمام قرائن اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اس جگہ اَب سے اُن کا چچا ہی مراد ہے اور بائیبل سے نام کا اختلاف کوئی قابل اعتراض امر نہیں۔

پھر فرماتے ہیں وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ۔ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔ یعنی اے میرے رب! مجھے اُس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھیو جس دن تمام لوگ اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کے لئے اُٹھائے جائیں گے اور جس دن انسان کو نہ اسکا مال نفع دیگا اور نہ اُس کے بیٹے اس کے کسی کام آئیں گے ہاں وہی شخص فائدہ میں رہے گا جو اللہ تعالیٰ کے پاس ایک پاک اور بے عیب اور مطمئن دل لے کر حاضر ہو گا۔ یہ ظاہر ہے کہ دل تبھی مطمئن ہوتا ہے جب انسان کو یقین ہو کہ اُس نے اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل کر لیا ہے اور اُسے اپنے انجام کے متعلق کوئی اضطراب لاحق نہ ہو مگر یہ یقین اللہ تعالیٰ کے تعلق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا پس قلب سلیم درحقیقت اُسی شخص کو میسر آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق پیدا کر لیتا ہے ورنہ ظاہری مال و دولت کسی انسان کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ یورپین قوموں کو دیکھ لو۔ مال و دولت کے لحاظ سے دنیا کی کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر ہر قسم کی طاقت اور جتھے اور مال کے باوجود اُن کے اندر ایک احساس کمتری پیدا ہو رہا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی چیز ایسی ہے جو اُن کے پاس نہیں بلکہ ایشیائیوں کے پاس ہے۔ یہ احساس کمتری ابھی اُن میں اتنا نمایاں نہیں کہ بڑوں اور چھوٹوں سب لوگوں میں پایا جائے لیکن تاہم اُن کے اندر ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو سمجھتا ہے کہ اُنکے پاس دولت بھی ہے مال بھی ہے لیکن انہیں دل کا چین نصیب نہیں۔ وہ لوگ شرابیں پیتے ہیں سینما دیکھتے ہیں۔ ناچ اور گانوں میں دن رات کا ایک بڑا حصہ بسر کرتے ہیں۔ لیکن جب نشہ اُتر جاتا ہے اور وہ چارپائی پر جاکر لیٹتے ہیں تو انہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اندر کوئی خلا پایا جاتا ہے۔ اور وہ خلا سوائے تعلق باللہ اور دین کے اَور کوئی چیز پُر نہیں کر سکتی۔ دنیا کی ہر نعمت کو حاصل کر لینے کے بعد بھی اُن کے اندر یہ بے چینی ہوتی ہے کہ کوئی چیز ایسی ہے جو انہیں حاصل نہیں اور وہ انہیں حاصل ہونی چاہیئے۔ دراصل خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کا وصال ایک ایسی نعمت ہے کہ جب وہ کسی شخص کو میسّر آجاتی ہے تو دُنیا کے سارے غم مٹ جاتے ہیں اور اُسے کوئی حسرت باقی نہیں رہتی۔ عارضی غم بے شک آتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کو کانٹا چبھ جائے تو اس کے نتیجے میں اُسے درد تو ہوتا ہے لیکن اُسے کوئی شخص بیماری نہیں

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ

اور جس دن جنت متقیوں کے قریب کر دی جائے گی۔ اور گمراہوں کے لئے دوزخ پر سے پردے

لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۳﴾

اٹھا دیئے جائیں گے۔ اور کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کے سوا عبادت

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۴﴾

کرتے تھے۔ کیا وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں؟ یا تمہارا بدلہ لے سکتے ہیں؟

فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۵﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۶﴾

پس اُسوقت وہ (جھوٹے معبود اور کافر) اور گمراہ اور ابلیس کے لشکر سارے کے سارے اس (دوزخ) میں اوندھے منہ گرا دیئے جائینگے

کہہ سکتا۔ اسی طرح عارضی تکلیفیں اور غم تو ایسے انسان پر بھی آتے ہیں لیکن یہ غم اُن کے راستہ میں روک نہیں بنتے اور اپنے اپنے درجہ کے مطابق انہیں اطمینان اور سکون حاصل رہتا ہے۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ انسانی جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ ٹھیک ہوتا ہے تو سارا انسانی جسم ٹھیک ہو جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا انسانی جسم خراب ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ۔ سُنو! وہ گوشت کا لوتھڑا دل ہے۔

بعض لوگوں نے خصوصاً اس زمانہ کے سائنسدانوں اور تشریح الابدان والوں نے کہا ہے کہ وہ چیز جو انسانی اعمال، افعال اور ارادوں اور خواہشات کو مضبوط کرتی ہے اور انہیں ایک نظام کے نیچے لاتی ہے وہ دل نہیں بلکہ دماغ ہے۔ اور سائنس والوں سے ڈر کر بعض مسلمان علماء نے بھی قرآن کریم کی بعض آیات کی ایسی تفسیر شروع کر دی ہے جس سے یہ نکلتا ہے کہ قلب سے مُراد قلب انسانی نہیں بلکہ اس سے مُراد محض وہ مقام ہے جو انسانی جسم پر حکومت کرتا ہے۔ چاہے وہ دماغ ہی ہو۔ لیکن میرے نزدیک یہ توجیہہ محض ڈر کی وجہ سے کی گئی ہے۔ ورنہ جہاں تک قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے میرے نزدیک قلب سے مُراد وہی چیز ہے جو سینہ میں ہوتی ہے اور اُس چیز کو دماغ قرار دینا محض دھینگا مُشتی ہے۔ بہرحال اِس حدیث سے ظاہر ہے کہ انسانی اعمال کی صفائی دل کی صفائی کے ساتھ وابستہ ہے۔ تم اپنے ہاتھوں کی صفائی کرکے پاک نہیں ہو سکتے۔ تم اپنے مُنہ کی صفائی کر کے پاک نہیں ہو سکتے۔ تم اپنے سر کی صفائی کرکے پاک نہیں ہو سکتے کیونکہ پاکیزگی کا منبع دل ہے۔ لیکن اگر تم اپنے دل کی صفائی کر لو۔ تو اللہ تعالےٰ کے حضور تم ایک مطمئن دل لے کر حاضر ہو گے۔ ہمارا خالق اور مالک جس نے مخلوق کو پاکیزگی کے حصول کے لئے پیدا کیا ہے اس کے نزدیک سب سے مقدّم دلوں کی پاکیزگی ہی ہے۔ کیونکہ تقویٰ کا درخت صرف اُسی زمین میں پرورش پا سکتا ہے جو پاک اور صاف ہو۔ ناپاک دل اُس کی صفا کا جلوہ گاہ نہیں

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ

وہ آپس میں جبکہ وہ اُس (یعنی جہنم) میں جھگڑ رہے ہونگے کہیں گے۔ خدا کی قسم ہم تھے کھلی گمراہی

ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۸﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَآ

میں پڑے ہوئے تھے۔ جب کہ ہم تم کو رب العالمین خدا کے برابر درجہ دیتے تھے۔ اور ہم کو

اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ

تو مجرموں نے ہی راستہ سے بھٹکایا تھا۔ پس (آج) شفاعت کرنیوالوں میں کوئی ہماری شفاعت نہیں کرتا۔ اور

لَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۲﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

نہ ہمارا کوئی غمخوار دوست ہے۔ پس اگر ہمیں لوٹنے کی طاقت ہوتی تو ہم (لوٹ کر) ضرور مومنوں میں (شامل) ہو جاتے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَ

اس (واقعہ) میں ایک بہت بڑا نشان ہے لیکن ان (کافروں) میں سے اکثر ایمان ہی نہیں لاتے۔ اور

۵ ع ۹

اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۵﴾ ع

تیرا رب یقیناً غالب (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ ۱۹ھ

ہوسکتا اور نہ ناپاک ہاتھ اُس کے عرش کے پائے کو چھو سکتے ہیں۔

۱۹ھ حل لغات:- اُزْلِفَتْ: اَزْلَفَ سے مؤنث کا فعل مجہول کا صیغہ ہے اور اَزْلَفَ کے معنے ہیں قَرَّبَهٗ۔ اُس کو قریب کیا (اقرب) پس اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ کے معنے ہونگے۔ جنت قریب کر دی جائیگی۔

بُرِّزَتْ: بَرَّزَ سے مؤنث کا فعل مجہول کا صیغہ ہے اور بَرَّزَهٗ کے معنے ہیں اَظْهَرَهٗ وَ بَيَّنَهٗ کسی چیز کو ظاہر اور واضح کر دیا (اقرب) پس بُرِّزَتْ کے معنے ہونگے ظاہر کر دی جائیگی۔

اَلْجَحِيْمُ: اَلنَّارُ الشَّدِيْدَةُ التَّأَجُّجِ یعنی جحیم کے معنے سخت بھڑکنے والی آگ کے ہیں۔ نیز اس کے معنے ہیں۔ كُلُّ نَارٍ عَظِيْمَةٍ فِيْ مَهْوَاةٍ فَهِيَ جَحِيْمٌ یعنی ہر وہ بڑی آگ جو گڑھے میں ہو۔ اَلْمَكَانُ الشَّدِيْدُ الْحَرِّ۔ سخت گرمی والی جگہ۔ اِسْمٌ مِنْ اَسْمَاءِ جَهَنَّمَ۔ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام جحیم بھی ہے (اقرب)

كُبْكِبُوْا۔ كَبْكَبَ سے جمع مذکر کا مجہول کا صیغہ ہے اور كَبْكَبَهٗ کے معنے ہیں قَلَبَهٗ وَ صَرَعَهٗ۔ اس کو پچھاڑ دیا اور شکست دیدی۔ اور جب كَبْكَبَ الشَّيْءَ کہیں تو معنے ہونگے رَمَاهُ فِي الْهُوَّةِ۔ اُس کو گڑھے میں پھینک دیا۔ (اقرب) پس كُبْكِبُوْا کے معنے ہونگے (۱) اُن کو پچھاڑ دیا جائیگا (۲) اُنکو گڑھے میں پھینک دیا جائیگا۔

اُزْلِفَتْ

كُبْكِبُوْا

بُرِّزَتْ

اَلْجَحِيْمُ

اَلْغَاوٗنَ اَلْغَاوُوْنَ : اَلْغَاوِیْ کی جمع ہے جو غَوٰی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور غَوَی الرَّجُلُ کے معنے ہیں ضَلَّ۔ گمراہ ہوگیا خَابَ۔ ناکام ہوگیا۔ اِنْھَمَکَ فِی الْجَھْلِ۔ جہالت میں لگ گیا۔ ھَلَکَ۔ ہلاک ہوگیا۔ پس اَلْغَاوِیْ کے معنے ہونگے گمراہ ہونے والا۔ ناکام ہونے والا۔ جہالت کے کاموں میں مشغول ہونے والا۔ ہلاک ہونے والا۔

جُنُوْدٌ جُنُوْدٌ، جُنْدٌ کی جمع ہے اور اَلْجُنْدُ کے معنے ہیں اَلْعَسْکَرُ۔ لشکر۔ اَلْاَعْوَانُ۔ مددگار (اقرب)

نُسَوِّیْکُمْ نُسَوِّیْکُمْ: سَوّٰی سے فعل مضارع کا جمع متکلم کا صیغہ ہے اور سَوَّاہُ بِہٖ کے معنے ہیں عَدَّلَ۔ کسی کو کسی کے برابر قرار دیا (اقرب) پس اِذْ نُسَوِّیْکُمْ کے معنے ہونگے۔ جب ہم تم کو برابر قرار دیتے تھے

حَمِیْمٌ حَمِیْمٌ : اَلْقَرِیْبُ الَّذِیْ تَھْتَمُّ بِاَمْرِہٖ۔ وہ قریبی جس کے کاموں کی سرانجام دہی کی فکر رہتی ہو۔ اَلصَّدِیْقُ دوست (اقرب)

کَرَّۃٌ کَرَّۃٌ۔ کَرَّ سے مصدر ہے۔ اور کَرَّ کے معنے ہیں رَجَعَ۔ لوٹا (اقرب) پس کَرَّۃٌ کے معنے ہیں ایک دفعہ لوٹنا۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اُس دن جنّت متقیوں کے قریب کر دی جائے گی۔ یعنی متقی جوں جوں نیک کام کرتا چلا جاتا ہے نیکی اس پر آسان ہوتی جاتی ہے اور جنّت اُس کے قریب ہوتی چلی جاتی ہے۔ مَیں نے بالعموم دیکھا ہے کہ جب کسی کو نیکی کی لذّت حاصل ہو جائے تو اس کے بعد وہ بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے بڑھتا ہے اور ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری نیکی اس کے لئے آسان سے آسان تر ہو جاتی ہے۔

پارٹیشن سے پہلے میں ایک دفعہ دہلی گیا۔ چوہدری ظفراللہ خان صاحب اُسوقت تک ابھی وزیر نہیں بنے تھے۔ ویسے وہ حکومت کی طرف سے ایک خاص مقدمہ کی پیروی کے لئے مقرر تھے۔ اُن دنوں ہندوستان کی حکومت نے انگلستان سے مالیات کے ایک ماہر کو منگوایا تھا تاکہ بعض اہم باتوں میں اس کا مشورہ لیا جا سکے۔ چوہدری صاحب نے اُسے مجھ سے ملانے کے لئے دعوت دی۔ اور اُس میں اور چیزوں کے علاوہ گلاب جامن یا رس گلّے بھی رکھ دئے۔ اُس شخص کے لئے یہ بالکل ایک نئی چیز تھی وہ انہیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ مگر چوہدری صاحب نے کہا۔ اسے کھا کر دیکھو۔ چنانچہ اُس نے ایک گلاب جامن یا رس گلّا اُٹھا کر کھایا۔ چوہدری صاحب نے پھر ایک گلاب جامن یا رس گلّا اُسے دیا۔ اُس نے پھر گریز کیا تو چوہدری صاحب نے اُسے کہا کہ تم نے پہلا گلاب جامن یا رس گلّا تو تجربہ کے طور پر کھایا تھا۔ اب دوسرا گلاب جامن یا رس گلّا اُس کے مزے کی وجہ سے کھاؤ۔ مَیں نے چوہدری صاحب سے کہا کہ آپ نے یہ کیا بات کہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انگریزی میں یہ محاورہ ہے کہ پہلی چیز تجربہ کے طور پر ہوتی ہے اور دوسری چیز اس کے مزے کی وجہ سے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ تو ایک دنیوی ضرب المثل ہے لیکن مَیں نے روحانیات میں بھی دیکھا ہے کہ پہلے چسکہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر خود بخود عادت پڑ جاتی ہے۔ شنکھیا زہر والکوحل سے تباہ ہوتی ہیں بچے اور جوان اُن کے پینے سے گھبراتے ہیں لیکن یورپ میں لوگ شراب تک مزے لے لے کر پیتے ہیں۔ اور روکنے کے باوجود اُسے نہیں چھوڑتے۔ امریکہ میں جب شراب نوشی کے انسداد کے لئے قانون وضع کیا گیا تو ہزارہا موتیں وہاں صرف اس وجہ سے واقع ہوئیں کہ لوگ شراب پینے کے شوق میں سپرٹ پی لیتے۔ سالہا سال ایسا ہوتا رہا کہ چونکہ لوگوں کو پینے کے لئے شراب نہیں ملتی تھی اِس لئے وہ سپرٹ پی لیتے تھے اور سپرٹ میں چونکہ زہریلی چیزوں کی آمیزش ہوتی ہے اِس لئے کئی اندھے ہو جاتے اور کئی مر جاتے۔ مگر پھر بھی وہ اپنی خواہش کو نہ روک سکتے۔ پس ہر چیز کے دو مزے ہوتے ہیں ایک تو

اُس کا ذاتی مزا ہوتا ہے اور دوسرا مزا عادت کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں لوگ پان میں زردہ کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جس نے پہلے زردہ استعمال نہ کیا ہو وہ اگر زردہ کھائے تو اُس کے سر میں چکر آنے لگتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ مجھے نقرس کی تکلیف ہوئی۔ ایک دوست جو ہندوستان کے تھے انہوں نے کہا۔ آپ پان میں زردہ ڈال کر کھائیں۔ درد ہٹ جائیگی۔ مَیں نے کہا۔ مَیں نے تو زردہ کبھی نہیں کھایا۔ اِس لئے اگر مَیں نے زردہ کھایا تو سر میں چکر آجائیگا۔ انہوں نے کہا نہیں آپ استعمال تو کریں۔ چنانچہ انہوں نے پان میں زردہ ڈال کر مجھے دیا اور مَیں نے کھالیا۔ اِس سے درد میں واقعہ میں کچھ کمی ہوگئی چند گھنٹوں کے بعد انہوں نے پھر مجھے پان میں زردہ ڈال کر دیا۔ غرض دو دن ہم سفر میں رہے اور دونوں دن وہ برابر مجھے پان میں زردہ ڈال کر دیتے رہے۔ دو دن کے بعد مَیں نے دیکھا کہ درد کی تکلیف کم ہونے لگی ہے تب مَیں نے اُسے چھوڑ دیا کہ کہیں اس کی عادت ہی نہ پڑ جائے۔ غرض بڑی تکلیف دہ اور بدمزہ چیزیں بھی اگر علاج کے طور پر استعمال کی جائیں تو اُن کی عادت پڑ جاتی ہے اور اچھی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور جب ادنیٰ چیزوں کی عادت پڑ جاتی ہے تو دین کی قربانی کی عادت کیوں نہیں پڑ سکتی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان کو ایک دفعہ قربانی کے لئے آگے لایا جائے اس کے بعد خود بخود اُس کے اندر ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اُسے دین کے کاموں میں ایسی لذّت آنے لگتی ہے کہ ان کو ایک لمحہ کے لئے بھی چھوڑنا اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک انسان کو روٹی نہیں ملتی تو وہ چلّاتا اور خدا تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتا ہے کہ خدایا مجھے روٹی دے۔ اِسی طرح اگر اُسے اشاعتِ دین کی توفیق ملتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کا ممنون ہوتا ہے اور اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور اگر کسی وقت اُسے دین کی خدمت کی توفیق نہیں ملتی تو وہ خدا تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتا ہے کہ وہ اس کی کمزوری کو دُور کرے اور اُس کے اندر دینی خدمات بجا لانے کی زیادہ سے زیادہ طاقت پیدا کرے۔ اِس طرح قدم بقدم نیکی اُس پر آسان ہوتی جاتی ہے اور جنت اس کے قریب ہوتی چلی جاتی ہے لیکن سچائی سے منحرف لوگوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اُن کے لئے دینی قربانیاں جو ایک مومن کے لئے بالکل آسان ہوتی ہیں آگ کے شعلوں کا سا رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ اور وہ اُن سے دُور بھاگتے ہیں اور اپنے آپ کو اُن سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا مومن تو خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے قربانیوں کی آگ میں اپنے آپ کو جھونک دیتے ہیں۔ اور وہ آگ اُن کے لئے گلزار بن جاتی ہے لیکن ایک منافق اور ایک گمراہ انسان کو وہی آگ جہنم کا ایندھن بنا دیتی ہے۔ کیونکہ اس وقت اُس کی بے ایمانی پر جو پردہ پڑا ہوتا ہے وہ اُٹھ جاتا ہے۔

اِسی طرح اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ میں یہ بھی خبر دی گئی ہے کہ آخری زمانہ میں جنّت متقیوں کے قریب کر دی جائیگی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے سامان پیدا کر دے گا۔ کہ مذہبی باتیں لوگوں کی سمجھ میں آنے لگ جائینگی اور سائنس جو مذہب کی مخالفت کر رہی ہوگی اُس کی مخالفت آپ ہی آپ ختم ہو جائیگی اس طرح متقی لوگوں کے لئے جنّت کا حصول بہت آسان ہو جائیگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں یہ پیشگوئی پوری ہو رہی ہے اور احرارِ یورپ میں سے کچھ تو آہستہ آہستہ اپنے بلند بانگ دعاوی کو چھوڑ رہے ہیں۔ اور کچھ ان باتوں کو جو اس سے قبل انہیں غیر قدرتی نظر آتی تھیں قانونِ قدرت میں شامل کر کے مذہب کی طرف آ رہے ہیں گویا دَنَا فَتَدَلّٰی کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ یعنی سائنس دان اُوپر کی

طرف چڑھ رہا ہے۔ اور علماء نے جو مبالغہ کا رنگ مذہب پر چڑھا دیا تھا وہ اتارا جا رہا ہے۔ اور اس طرح دُنیا خدائی باتوں کی تصدیق کے لئے تیار ہو رہی ہے اور جنت اُن کے قریب کی جا رہی ہے۔ مگر ایسے زمانہ میں بھی جو لوگ خدائی ہدایت کو قبول کرنے سے اعراض کریں گے انہیں اپنے اعمال کی جوابدہی کے لئے خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا۔ تب اُن سے کہا جائیگا کہ اَیْنَمَا کُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ هَلْ یَنْصُرُوْنَکُمْ اَوْ یَنْتَصِرُوْنَ وہ تمہارے معبود کہاں ہیں جن کے آستانہ پر تم سر جھکاتے تھے اور جنہیں اپنا خدا سمجھا کرتے تھے۔ آج بتاؤ کہ کیا وہ تمہاری کچھ بھی مدد کر سکتے ہیں یا تمہارا بدلہ لینے کی کوئی طاقت رکھتے ہیں۔ جب وہ اپنی آنکھوں سے اس انجام کو دیکھ لینگے تو وہ بھی اور اُن کے معبود بھی اور تمام ابلیسی لشکر بھی دوزخ میں اوندھے منہ گرا دیئے جائیں گے۔ اور اُن کی تمام عزتیں خاک میں مل جائیں گی۔ تب وہ آپس میں جھگڑا شروع کر دینگے۔ اور وہ لوگ جو دنیا میں اپنے لیڈروں کی اندھی تقلید کرتے رہے اور خدا تعالیٰ کی آواز پر انہوں نے کان نہ دھرا۔ وہ اُن سے کہیں گے کہ خدا کی قسم ہم تو بڑی غلطی میں مبتلا رہے۔ جبکہ ہم تمہیں رب العالمین کے برابر درجہ دیتے رہے اور ہم نے تمہاری باتوں پر تو کان دھرا مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے جو منادی آیا۔ اس کی آواز کو ہم نے نہ سُنا مگر پھر وہ اپنے دلوں کو تسلی دینے کے لئے کہیں گے۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ وَمَا اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ہمیں تو اِن مجرموں نے ہی صحیح راستہ سے بھٹکایا ہے۔ اگر یہ لوگ ہماری راہ میں روک بن کر کھڑے نہ ہو جاتے تو آج یہ ہمارا حشر کیوں ہوتا۔ یہ تو ہم سے کہا کرتے تھے کہ ہم تمہارے سب بوجھ اٹھائیں گے اور تمہیں جنت میں پہنچا دیں گے مگر آج یہ حالت ہے کہ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ۔ نہ آج شفاعت کرنے والوں میں سے کوئی ہماری شفاعت کرتا ہے اور نہ کوئی دوست اور غمخوار ہمیں اس مصیبت سے چھڑاتا ہے۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری ایک بہن تھی جو کسی پیر کی مُرید تھی۔ وہ ایک دفعہ قادیان مجھے ملنے کے لئے آئی۔ تو مَیں نے کہا بہن تم احمدی کیوں نہیں ہوتیں۔ وہ کہنے لگی مجھے احمدی بننے کی کیا ضرورت ہے۔ مَیں نے فلاں پیر صاحب کی بیعت کر لی ہے اور انہوں نے مجھے کہہ دیا ہے کہ اب تمہیں کسی نیکی کی ضرورت نہیں جو جی میں آئے کرو۔ تمہارے سب گناہ ہم نے اُٹھا لئے۔ مَیں نے کہا۔ اب جب پیر صاحب سے ملو گی تو اُن سے پوچھنا کہ قیامت کے دن جب ایک ایک شخص کو گناہوں کی وجہ سے جوتیاں پڑنی ہیں تو کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ آپ جنہوں نے اپنے سب مریدوں کے گناہ اُٹھا لئے ہیں آپ کو کتنی جوتیاں پڑیں گی۔ وہ کہنے لگی اچھا مَیں یہ بات اُن سے ضرور دریافت کرونگی۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد جب وہ دوبارہ آپ سے ملنے کیلئے آئی تو آپ نے پوچھا۔ کہ بہن پیر صاحب سے وہ بات پوچھی تھی۔ وہ کہنے لگی۔ ہاں مَیں نے پوچھی تھی مگر وہ تو انہوں نے فوراً حل کر دی۔ مَیں نے کہا کس طرح؟ کہنے لگی۔ جب مَیں نے یہ سوال کیا تو پیر صاحب کہنے لگے۔ دیکھو جب فرشتے تم سے پوچھیں کہ تم نے فلاں فلاں گناہ کیوں کئے ہیں تو کہہ دینا کہ مجھے اِس کا کچھ پتہ نہیں۔ یہ پیر صاحب کھڑے ہیں اِن سے پوچھو۔ اِس پر وہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔ تم اطمینان سے جنت میں چلی جانا۔ مَیں نے کہا۔ پیر صاحب پھر آپ کا کیا بنیگا کہنے لگے جب وہ مجھ سے پوچھیں گے تو مَیں بھی لال لال آنکھیں نکال کر کہونگا کہ کربلا میں ہمارے نانا امام حسینؓ نے جو قربانی کی تھی کیا وہ کافی نہیں تھی کہ آج کچھ پھر تنگ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ تم نے کیا کیا؟

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۰۶ اِذْ قَالَ لَهُمْ

نوحؑ کی قوم نے (اپنے) رسولوں کا انکار کیا۔ جب کہ اُن سے اُن کے

اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۱۰۷ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ

بھائی نوحؑ نے کہا۔ کیا تم تقویٰ نہیں کرتے؟ مَیں تمہاری طرف ایک امانت دار

اَمِیْنٌ ۝۱۰۸ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝۱۰۹ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ

پیغامبر ہوکر آیا ہوں۔ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ اور مَیں اس (خدمت کے سلسلہ) میں

اِسپر فرشتے شرمندہ ہوکر ایک طرف ہوجائیں گے اور ہم دنگڑ دنگڑ کرتے ہوئے جنّت میں چلے جائیں گے۔

اِسی طرح دنیا میں روزانہ ہمیں یہ نظارہ نظر آتا ہے کہ لوگ اپنے دوستوں کی خاطر جھوٹ بولنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ اُن کے لئے ہر قسم کے دھوکا اور فریب اور جعلسازی سے کام لینے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں اور خدا اور اس کے رسول کے احکام کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ مگر قیامت کے دن نہ کسی کی دوستی کام آئیگی اور نہ اپنے سر دوں پر گناہوں کا بوجھ اٹھالینے کا وعدہ کرنے والے کسی کو جہنم سے بچا سکیں گے بلکہ انہیں حسرت اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ اگر ہم میں یہ طاقت ہوتی کہ ہم دوبارہ دنیا میں لوٹ کر جاسکتے تو ہم تلافیٔ مافات کرنے کے لئے تیار ہیں مگر اُس وقت اُنکی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکیگی۔ کیونکہ اُس وقت عمل کا دروازہ بند ہوچکا ہوگا۔ فرماتا ہے ابراہیمؑ کے اس واقعہ میں بھی ایک بہت بڑا نشان مخفی ہے کہ کس طرح ابراہیمؑ نے انتہائی کمزوری اور ضعف کی حالت میں بتوں کے خلاف آواز بلند کی۔ کس طرح اُس کی قوم نے مخالفت کی اور آخر اسے ہجرت کرنے پر مجبور کردیا۔ مگر آخر ابراہیمؑ ہی فاتح ہُوا۔ اور بُت اس کی قوم کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے۔ مگر اتنا بڑا نشان دیکھنے کے باوجود ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں سے اکثر لوگ دنیوی لذات میں ہی منہمک رہے۔ اور انہیں آپ پر ایمان لانے کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ لیکن فرماتا ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ۔ تیرا ربّ یقیناً بڑا غالب اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ یعنی بے شک ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی اکثریت اُس پر ایمان نہیں لائی مگر تیرا رب بڑا غالب اور مہربان ہے وہ ایک دن تیری قوم کی اکثریت کو تجھ پر ایمان لانے کی سعادت عطا فرمادے گا۔ اور انہیں ایک لمبے عرصہ تک اپنے انعامات سے متمتع فرماتا چلا جائیگا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد ایسا ہی ہُوا۔ آپؐ کی ساری قوم آپ پر ایمان لے آئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس ایمان کی برکت سے انہیں سینکڑوں سال تک اپنے انعامات سے نوازا۔ اور انہیں ایک لمبا دورِ حکومت عطا فرمایا۔

عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

کوئی اجر نہیں مانگتا میرا بدلہ تو رب العلمین (خدا) کے ذمہ ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۱۱﴾

پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو ۲۰

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

انہوں (یعنی کافروں) نے کہا کہ کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں حالانکہ نہایت حقیر لوگ تیرے متبع ہوئے ہیں۔

۲۰ تفسیر: سمجھا تا ہے۔ نوحؑ کی قوم نے بھی نوحؑ کی جو کہ اُسوقت سب رسولوں کا قائم مقام تھا تکذیب کی۔ نوحؑ نے اُن کو سمجھایا۔ مگر وہ نہ مانے اور یہ بھی بتایا کہ آخر میرے سمجھانے کی غرض کیا ہے۔ میں تم سے کچھ مانگتا تو نہیں۔ میری اُمید اور میرا توکل تو صرف رب العالمین خدا پر ہے۔ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

اَطِيْعُوْنِ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی اطاعت اور شریعت پر عمل جُدا جُدا چیزیں ہیں۔ اہل قرآن کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن کی اطاعت کا حکم ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم نہیں۔ مگر حضرت نوح علیہ السلام جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ادنیٰ نبی تھے کہتے ہیں۔ وَاَطِيْعُوْنِ تم میری ذات کی اطاعت بھی کرو۔ تب تمہارا تقویٰ مکمل ہوگا۔ کیونکہ خدائی تعلق کا پہلا زینہ خدا تعالیٰ کے نبیوں سے تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے جس طرح تمہارے لئے یہ ناممکن ہے کہ تم چھلانگ لگا کر چھت پر چڑھ سکو۔ اسی طرح تمہارے لئے یہ ناممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف راہنمائی کرنے والے وجودوں کو چھوڑ کر تم خدا تعالےٰ سے تعلق پیدا کر سکو مگر جس طرح کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ چھت پر بیٹھا ہوا انسان جب دیکھتا ہے کہ کسی پر شیر یا ڈاکو نے حملہ کر دیا ہے تو وہ رسّی گرا کر اُس کو اوپر کھینچ لیتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ جب دیکھتا ہے کہ کوئی شخص اُس سے ملنے کی سچی تڑپ رکھتا ہے لیکن وہ ایسے ماحول میں ہے کہ اُسے انبیاء کی راہنمائی میسر نہیں آسکتی تو وہ خود اس کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ مگر ایسا بہت شاذ ہوتا ہے اور شاذ پر کسی قانون کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ عام قانون یہی ہے کہ جو لوگ خدا نما وجود ہوتے ہیں انہی کے ذریعہ انسان کو روحانی ترقی ملتی ہے اور اُس ترقی کے حصول کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ انسان دنیوی محبتوں کو سرد کرکے اُن کی محبت کو اپنے اوپر غالب کرلے۔ جب وہ اُن کی محبت کو غالب کرلیتا ہے تو اُن کی اطاعت کرنا اور اُن کا نمونہ اختیار کرنا اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے۔ اُسوقت وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی غیر ہے جس کی میں اقتداء کر رہا ہوں۔ بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا باپ ہے اور اس کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اسی نکتہ کی طرف اپنی قوم کو توجہ دلائی کہ اگر تم نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور میری اطاعت کا جُوا اپنی گردنوں پر رکھو کیونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے تمہاری ہدایت کیلئے مبعوث فرمایا ہے۔

قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ

اُس نے کہا مجھے کہاں سے علم آیا ہے کہ اُن کے اندرونی اعمال کیسے ہیں - ان کا حساب کرنا تو

اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

میرے رب کے ذمہ ہے - اگر تم سمجھو - اور جو شخص مومن ہو کر میرے پاس آتا ہے میرا کام نہیں کہ میں اُسے دھتکار دوں

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۶﴾

مَیں تو صرف ایک کھُلو کھُلا ہوشیار کرنیوالا انسان ہوں - ۲۱ع

۲۱ع تفسیر :- اللہ تعالیٰ کے انبیاء پر ہمیشہ یہ اعتراض ہوتا چلا آیا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ہُوا کہ اس کے ماننے والے تو ادنیٰ لوگ ہیں ہم اس کی بات کس طرح مان لیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کیا ہی اچھا جواب دیا کہ ہدایت دینا تو خدا تعالےٰ کے اختیار میں ہے - اگر اس نے اُن کو ہدایت کے قابل سمجھا تو ہدایت دے دی - پس جب اُس کے نزدیک ان کے عمل اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے سے ہیں تو میں ان کو کس طرح دھتکار سکتا ہوں - آخر ان کا حساب تو خدا تعالےٰ کے ذمہ ہے - میرے ذمہ تو نہیں - کاش تم عقل سے کام لو - اور جس کو خدا مومن بنا دے - اس کی تحقیر نہ کرو - اور اگر تم تحقیر کرو بھی تو میں بہرحال اسے دھتکار نہیں سکتا کیونکہ اس کو خدا نے میرے حوالہ کیا ہے - میرا کام تو یہ ہے کہ میں لوگوں کو بُری باتوں سے روکوں - اس کے بعد جب خدا تعالےٰ نے کسی کو ہدایت دے دے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ بُری باتوں سے رُک گیا ہے اور نہایت عزت والا انسان بن گیا ہے - اس کے بعد وہی معزز ہے تم لوگ معزز نہیں - اسلامی تاریخ میں اس کے متعلق ایک بڑا اچھا واقعہ آتا ہے - حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دفعہ حج کے لئے تشریف لے گئے تو حج کے بعد عید کے دن لوگ آپ کو ملنے کے لئے آئے - شروع میں مکہ کے رؤساء اور رئیسوں کے بیٹے آئے - اس کے بعد کچھ غلام آئے جو ابتدائے زمانہ میں اسلام لائے تھے - اُن کے آنے پر حضرت عمرؓ نے رؤساء کو پرے سرکنے کیلئے کہا اور اپنے پاس غلاموں کو بٹھا لیا - اس کے بعد کچھ اور نومسلم غلام آئے - حضرت عمرؓ نے پھر اُن کو اپنے پاس بٹھا لیا - اور رؤساء کو پرے سرکنے کا اشارہ کیا - اسی طرح متواتر ہوتا رہا - آخر شرمندہ ہو کر رؤساء کے لڑکے اُٹھ کھڑے ہوئے اور باہر جا کر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ دیکھ لیا آج تمہاری کیسی بے عزتی ہوئی ہے - اس پر اُن میں سے ایک ہوشیار لڑکا بولا کہ اس میں قصور کس کا ہے - یہ غلام جن کو تم ذلیل سمجھتے ہو سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے تھے - اور انہوں نے اپنی زندگیاں اسلام کی ترقی کیلئے خرچ کر دیں جبکہ تمہارے باپ دادے اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دشمنی کر رہے تھے - اب اسلام کی حکومت آئی ہے تو عزت انہی کو ملے گی - ہم کو نہیں ملے گی - باقی ساتھیوں نے کہا - تو پھر اس کا علاج کیا ہے - اُس ذہین لڑکے نے کہا - چلو اس کا علاج حضرت عمرؓ سے ہی پوچھیں چنانچہ وہ پھر جمع ہو کر حضرت عمرؓ کے پاس گئے - حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُنکو دیکھ کر بات سمجھ لی - اور کہا -

اے نوجوانو! مجھے معلوم ہے کہ تمہاری مکّہ میں کیا حیثیت ہے۔ مگر مَیں مجبور تھا۔ یہ لوگ جن کو مَیں نے آگے بٹھایا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی ان کو آگے بٹھایا کرتے تھے۔ اب میں اُن کے درجہ میں فرق کس طرح کر سکتا تھا۔ اِن نوجوانوں نے کہا۔ پھر اس کا کوئی علاج بھی ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو ان کے خاندانوں کی عزت کو جانتے تھے اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور انہوں نے اپنا ہاتھ شمال کی طرف اونچا کر دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اب شام میں عیسائیوں سے جنگ ہو رہی ہے۔ وہاں چلے جاؤ اور اپنے باپ دادا کے گناہوں کا کفارہ ادا کرو۔ چنانچہ وہ نوجوان خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے اور اُسی وقت اونٹوں یا گھوڑوں پر سوار ہو کر شام چلے گئے اور اسلامی لشکر میں مل گئے اور وہیں کفار سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے اُن میں سے کوئی بھی لوٹ کر نہ آیا۔

سو عزت وہی ہوتی ہے جو خدا دے۔ مال و دولت سے عزت نہیں ملتی۔ کافروں کا نبیوں پر ایمان لانے والوں کو اس لئے ذلیل سمجھنا کہ وہ غریب ہیں اول درجہ کی حماقت ہے جو نبی پر پہلے ایمان لاتے ہیں وہی سب سے زیادہ معزز ہوتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ابوبکرؓ۔ علیؓ۔ زیدؓ ایمان لائے۔ مکّہ کے صنادید کی موجودگی میں ابوبکرؓ کو مسلمانوں نے خلیفہ تسلیم کیا۔ جس پر اُن کے باپ نے بھی تعجب کیا۔ مگر ابوجہل عتبہ اور شیبہ کی عزت تو ابوبکرؓ اور علیؓ کی جوتیوں کے برابر بھی نہیں۔ یہی بات حضرت نوحؑ نے اپنے مخالفین کے سامنے پیش کی اور کہا کہ وَمَا عِلْمِیْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ بیشک یہ تمہیں حقیر نظر آتے ہیں۔ مگر مجھے کیا معلوم کہ اِن کی وہ کونسی چھپی نیکیاں تھیں جن کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے اِن کو یہ شرف بخشا کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے نبی کو قبول کر لیا۔ اور تمہاری وہ کونسی بداعمالیاں تھیں جو تمہاری راہ میں حائل ہو گئیں اور جنہوں نے تم سے نورِ بصیرت چھین لیا اور تم اللہ تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہنے سے محروم رہ گئے۔ اور جب اُنکی نیکیوں کی وجہ سے ہی خدا تعالیٰ نے اِن پر اتنا بڑا انعام نازل کیا ہے کہ انہیں ایک نبی کو ماننے کی سعادت حاصل ہو گئی ہے تو یہ لوگ ذلیل کس طرح ہوئے۔ ذلیل تو وہ لوگ ہیں جن کی بداعمالیوں نے انہیں اللہ تعالیٰ کے مامور کی شناخت سے محروم کر دیا ہے۔ پھر فرمایا اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ۔ بیشک یہ آج غریب اور کنگال ہیں۔ کوئی مال اور جائیداد ان کے پاس نہیں مگر اللہ تعالیٰ اِنکی قربانیوں کو کبھی ضائع نہیں کرے گا اور وہ ایک دن انہیں بہت بڑی ترقی عطا کرے گا۔ کاش تم شعور سے کام لیتے۔ اور اس قسم کے بیہودہ عذرات سے کام لے کر خدائی ہدایت کو ٹھکرانے کے لئے تیار نہ ہو جاتے۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اس مضمون کو مختلف مقامات میں مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ کسی جگہ تو فرماتا ہے کہ ہمارے مخالف شعور سے کام نہیں لیتے اور کسی جگہ فرماتا ہے کہ ہمارے مخالف علم سے کام نہیں لیتے۔ شعور اُس حِسّ کو کہتے ہیں جو انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور علم اُس حِسّ کو کہتے ہیں جو باہر سے آتی ہے۔ خواہ سُن کر یا دیکھ کر یا چھو کر یا چکھ کر۔ مثلاً ہم چلے جا رہے ہوتے ہیں کہ ہمیں ایک جنگل نظر آتا ہے جسے دیکھ کر ہمارا علم بڑھتا ہے۔ یہ علم باہر سے پیدا ہوتا ہے اندر سے نہیں۔ یا کسی شخص کو کوئی چیز چکھ کر جس ذائقہ کا پتہ لگتا ہے وہ علم کہلاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں بعض دفعہ ہم بیٹھے بیٹھے محسوس کرتے ہیں کہ ہماری کیا ضرورتیں ہیں۔ ہماری قوم کی کیا ضرورتیں ہیں۔ ہمارے بچوں کی کیا ضرورتیں ہیں۔ ہمارے خاندان کی کیا ضرورتیں ہیں۔ یہ چیز جب قدرتی طور پر آپ ہی آپ پیدا ہو تو اُسے شعور کہتے ہیں۔ گویا انسان جب اُن جبلی طاقتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے خود اُس کے اندر پیدا کی ہیں محسوس کر کے

اپنے لئے ایک نیک راہ تجویز کرتا ہے۔ تو اُسے شعور کہتے ہیں اور جب محنت کرکے انسان یہ سوچتا ہے کہ فلاں چیز میرے لئے فائدہ مند ہے یا نہیں تو اس کام کا نام فکر ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اِس کی طرف بھی بار بار توجہ دلائی ہے کیونکہ یہ قوت بیرونی علم سے نتائج اخذ کرنے میں مدد دیتی ہے اِسی کے ایک پہلو کا نام عقل بھی ہے۔ عقل اس قوت کو کہتے ہیں جو انسان کو علم۔ فکر اور شعور کے مطابق کام کرنے کی توفیق بخشتی ہے۔ عقل کے معنے یہی ہوتے ہیں کہ انسان سوچتا اور فیصلہ کرتا ہے کہ یہ چیز میرے لئے مضر ہے یا مفید جب وہ فیصلہ کرے کہ فلاں چیز میرے لئے مضر ہے اور جب یہ حس اسے بُری چیز سے روک دے تو اُسے عقل کہتے ہیں۔ یعنی بدی کی طرف لے جانے والی چیز سے روکنے والی عقل ہے۔ اِسی کی طرف قرآن کریم نے تفقّہ کے لفظ سے بھی توجہ دلائی ہے۔ تفقّہ کے معنے ہوتے ہیں۔ کسی چیز کی باریکی کو پالینا۔ فرماتا ہے تمہارے سامنے کئی چیزیں آتی ہیں۔ مگر تمہیں یہ نظر نہیں آتا کہ اُن سے کیا نتیجہ نکلتا ہے یوں دیکھنے میں ایک مُرغا۔ ایک کتّا اور ایک بلّی انسان کے شریک ہیں پھر تمہارے دیکھنے اور اُن کے دیکھنے میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہی ہے کہ تم ایک چیز کو دیکھ کر نتیجہ نکال لیتے ہو۔ لیکن مُرغا اور بلّی اور کتّا اُسے دیکھ کر کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا۔ بلّی اور کتّا اگر ایک درخت دیکھتے ہیں تو انہیں اتنا ہی نظر آتا ہے کہ ایک لمبا سا ڈنڈا کھڑا ہے۔ لیکن انسان صرف یہی فیصلہ نہیں کرتا کہ یہ ایک درخت ہے بلکہ وہ یہ بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے پھل کیا لگتا ہے۔ کس موسم میں لگتا ہے اور کس موسم میں نہیں لگتا۔ وہ پھل غذا کے کام آتا ہے یا دوا کے کام آتا ہے یا اس درخت سے محض سائے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن بکری اِن باتوں کو نہیں جانتی۔ گیدڑ اتنا ہی جانتا ہے کتّا اتنا ہی جانتا ہے کہ دھوپ لگے تو درخت کے سائے میں بیٹھ جاؤ لیکن انسان کسی درخت کو دیکھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کی لکڑی مضبوط ہے اور وہ اسے کاٹ کر دروازے بنالیتا ہے۔ کسی کے متعلق سمجھتا ہے کہ یہ لکڑی بوجھ زیادہ اٹھا سکتی ہے اُس کے وہ شہتیر اور بلے بنالیتا ہے کسی کے متعلق سمجھتا ہے کہ اس کی لکڑی پانی کو زیادہ برداشت کرنے والی ہے اور وہ اس لکڑی کو ایسے مقامات پر استعمال کرتا ہے جہاں بارشیں زیادہ ہوں۔ کسی کے متعلق سمجھتا ہے کہ یہ محض جلانے کے کام آسکتی ہے چنانچہ وہ اُسکا ایندھن بنالیتا ہے یا اُسے کوئلہ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ غرض لکڑی وہی ہے۔ جانور بھی اسکو دیکھتا ہے اور انسان بھی اُس کو دیکھتا ہے۔ انسان اُس کے کئی کئی استعمال نکال لیتا ہے لیکن جانور آدمؑ کے وقت سے صرف سایہ کے نیچے بیٹھنا جانتا ہے اِس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔

پھر قرآن کریم نے ایک اَور طرح بھی اِس کی طرف توجہ دلائی ہے اور اِسکا نام استنباط رکھا ہے۔ استنباط کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ مختلف واقعات کو لے کر انسان اُن سے ایک نتیجہ نکالتا ہے۔ گویا وہ اپنی قوتِ فکر سے ایک نئی چیز اُگاتا ہے۔ ایک شخص کو زید نظر آتا ہے بکر نظر آتا ہے عمر نظر آتا ہے اور پھر وہ دیکھتا ہے کہ یہ سارے ایک پارٹی کے ہیں اور مختلف راستوں اور مختلف مقامات سے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ تو وہ اُنکو دیکھ کر یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ انہوں نے ضرور کوئی سکیم بنائی تھی جس کے ماتحت یہ اکٹھے ہوئے ہیں لیکن بکری اور کُتّا وغیرہ یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے وہ یہی دیکھیں گے کہ زید آیا ہے یا بکر اور عمر اور خالد آیا ہے لیکن انسان یہ دیکھ کر کہ ایک پارٹی کے آدمی مختلف راستوں سے ایک مقام پر اکٹھے ہوئے ہیں سمجھ جاتا ہے کہ انہوں نے پہلے سے کوئی فیصلہ کیا ہوا تھا۔ یا دشمن کاروائی کرتا ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ مجھے کس طرح اسے زک دینی چاہیئے۔

غرض قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے کہ تم شعور سے کام لو۔ تم علم سے کام لو۔ تم فکر سے کام لو۔ تم عقل سے کام لو۔ تم تفقہ سے کام لو۔ تم استنباط کی قوت سے کام لو اور وہ بار بار دشمنوں کو توجہ دلاتا ہے کہ تمہیں کیا ہوا کہ تم شعور سے کام نہیں لیتے۔ تم علم سے کام نہیں لیتے۔ تم فکر سے کام نہیں لیتے۔ تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ تم تفقہ سے کام نہیں لیتے۔ تم استنباط سے کام نہیں لیتے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دشمنوں میں بھی فرق بتایا ہے۔ فرماتا ہے۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (سورۂ یوسف آیت ۱۰۹) اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے مخالفوں سے کہدے کہ تمہارے اور میرے درمیان ایک فرق ہے تم بھی ایک عقیدہ پر ایمان رکھتے ہو اور میں بھی ایک عقیدہ پر ایمان رکھتا ہوں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عقیدہ ہے اسی طرح ہمارا ایک عقیدہ ہے اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو سچا کہیں تو ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے۔ ہم کیوں یہ سمجھیں کہ جو بات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے اور جو اُن کے دشمن کہتے ہیں وہ غلط ہے۔ بہر حال مکہ کا ایک آدمی کہہ سکتا تھا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ ہماری بات مانی جائے۔ اِس کی وجہ کیا ہے اور کیوں ہم آپ کی بات کو تسلیم کریں۔ اِس کے کئی جواب ہو سکتے تھے جن میں سے ایک جواب قرآن کریم نے یہ دیا ہے کہ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔ تو مکہ والوں سے کہدے کہ تمہارے جھوٹے ہونے اور میرے سچے ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں اور میرے ساتھی ہر بات کو دلیل کے ساتھ مانتے ہیں اور تم بے دلیل مانتے ہو۔ تمہارا بلا دلیل ماننا بتاتا ہے کہ تم نے سوچا نہیں اور میرا با دلیل ماننا بتاتا ہے کہ میں نے سوچکر مانا ہے اور یہ لازمی بات ہے کہ جو سوچکر ماننے گا وہ زیادہ حق پر ہوگا بہ نسبت اُس شخص کے جو بلا سوچے سمجھے کسی بات کو تسلیم کر لیتا ہے قطع نظر اِس کے کہ وہ بلا سوچے سمجھے کسی حق بات کو ہی کیوں نہ مان لے۔ کیونکہ خواہ وہ حق پر ہو اللہ تعالیٰ اُس سے یہ کہیگا کہ تمہیں کیونکر پتہ لگا تھا کہ یہ سچ ہے تم نے تو بلا سوچے سمجھے ہی یہ بات مانی تھی لیکن فرض کرو۔ ایک شخص غور کرکے ایک نتیجہ پر پہنچا ہو تو خواہ وہ غلط ہی ہو۔ لیکن چونکہ اُس نے صحیح جد وجہد سے کام لیا ہوگا اللہ تعالیٰ کے حضور وہ ثواب کا مستحق ہوگا کیونکہ اپنی طرف سے اُس نے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک شخص جو سوچکر کوئی فیصلہ کرتا ہے تو خواہ وہ غلط فیصلہ ہی دے تب بھی وہ ثواب کا مستحق ہوگا۔ بیشک فیصلہ غلط ہوگا۔ لیکن چونکہ اُس نے سوچ کر اپنی طرف سے پورا زور لگانے کے بعد دیا ہوگا۔ اِس لئے خواہ وہ فیصلہ کرنے میں غلطی کرجائے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے متعلق یہی کہے گا کہ اُس نے اپنے فرض کو ادا کر دیا۔ اِس لئے وہ انعام کا مستحق ہوگا سزا کا نہیں۔ اِسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص جس پر حجت تمام نہیں ہوئی وہ دوزخ میں نہیں ڈالا جائیگا۔ کیونکہ اُس کے لئے موقع ہی نہیں تھا کہ وہ سوچتا اور غور کرتا۔ اِسی طرح آپ نے فرمایا کہ دیوانہ شخص دوزخ میں نہیں ڈالا جائیگا کیونکہ وہ معذور تھا اور سوچ نہیں سکتا تھا۔ اِسی طرح آپ نے فرمایا کہ بچے جو چھوٹی عمر میں مرجائیں گے یا بڈھا جس کی عقل ماری گئی یا پہاڑوں پر رہنے والا شخص جس تک میری آواز نہیں پہنچی وہ دوزخ میں نہیں ڈلے جائیں گے اِس لئے کہ اُن کے لئے سوچنے کا موقعہ ہی نہیں تھا۔ پس سزا کا مستحق بھی وہی ہوتا ہے جسے سوچنے کا موقع ملے۔ اور پھر وہ نہ سوچے۔ اور انعام کا مستحق بھی وہی ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر کسی سچائی کو قبول کرے۔ رسمی اور آبائی مذہب یا رسمی اور آبائی طریقہ خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کا نہیں ہو سکتا

چنانچہ ظاہری طور پر بھی ہمیں یہی قانون نظر آتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لو۔ آپ نے اپنی قوم کو یہی نصیحت کی کہ ہر بات پر غور کرنے کی عادت ڈالو۔ اور صحابہؓ کو بھی آپ یہی نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ سوچو اور سمجھو اور پھر کسی بات کو مانو۔ اُس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ علمی طور پر صحابہؓ کو اتنی فضیلت حاصل ہو گئی کہ اُن کا اَن پڑھ بھی لوگوں کے سامنے اِس طرح دلائل دیتا کہ مخالفوں کے لئے سوائے اِس کے اَور کوئی چارہ باقی نہیں رہ جاتا تھا کہ وہ ڈنڈے کے زور سے اپنی بات منوانے کی کوشش کریں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ دلائل کے میدان میں ہم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مثلاً شرک کی تعلیم ہے۔ ایک مکّہ کا رہنے والا مشرک شرک کی یہ دلیل دیتا تھا کہ میرے ماں باپ نے ایسا کیا ہے۔ کیا وہ جھوٹے تھے۔ کیا اُن میں عقل نہیں تھی۔ کیا اُن میں تمیز نہیں تھی۔ سیدھی بات ہے کہ جب وہ کہیں گے کہ یہ لوگ ہمارے ماں باپ کو جاہل بتاتے ہیں تو نوجوانوں کو جوش آجائیگا اور وہ کہیں گے۔ اچھا یہ ہمارے ماں باپ کو جھوٹا کہتے ہیں اور اس طرح وہ مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جائینگے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی تھی کہ تم غور کرکے دیکھ لو۔ بُتوں میں کوئی بھی طاقت اور قوت ہے جب اِن میں کوئی بھی طاقت نہیں تو ان کی پرستش کس لئے کی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ مکھی بھی اگر کھانا اٹھا کر لے جائے تو یہ بُت اُس سے چھین نہیں سکتے جب یہ اس قدر کمزور اور بے بس ہیں تو انہیں خدائی کا مقام دینا کونسی عقلمندی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص دلیل سے کسی بات کو تسلیم کرے گا اُس کا مقابلہ وہ شخص نہیں کر سکتا جو بلا دلیل اور بلا سوچے سمجھے ماننے کا عادی ہو بے دلیل ماننے والا بہرحال کسی نہ کسی جگہ جا کر رہ جاتا ہے اِسی لئے قرآن کریم میں بار بار آتا ہے کہ تفقّہ سے کام لو عقل سے کام لو۔ فکر سے کام لو۔ شعور سے کام لو۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی جب کسی پر خوش ہوتے تو اُس کے لئے یہی دُعا فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو سوچنے کی عادت ڈالے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لئے اندر تشریف لے گئے۔ مَیں لوٹا بھر کر باہر کھڑا رہا۔ جب آپ اندر سے نکلے۔ تو مَیں نے آگے بڑھ کر پانی پیش کیا اور وضو کرایا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم میرے اِس فعل سے بہت خوش ہوئے اور آپؐ نے فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ۔ اے اللہ! تُو اِسے دین کو سوچنے اور مسائل میں غور کرنے کی توفیق بخش۔ اور یہی اصل کام ہوتا ہے کہ انسان سوچے اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچے۔ یونہی کسی بات کے پیچھے چل پڑنا اور غور و فکر سے کام نہ لینا انسان کو اُس کے اعلیٰ مقام سے گرا دیتا ہے۔ اسلام کی اِسی تعلیم کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان جہاں بھی جاتے لوگ حیران رہ جاتے کہ ان لوگوں کا بچہ بچہ علوم جانتا ہے اور بڑی با دلائل گفتگو کرتا ہے۔ اور پھر یہ سوچنے کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کے ایمانوں میں تزلزل واقع نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ جو کچھ مانتے تھے۔ سمجھ کر مانتے تھے سوچ کر مانتے تھے اور ساری تشریحات کو مدّنظر رکھ کر مانتے تھے اور پھر یہی وجہ تھی کہ مسلمان جان دیتا تھا تو لوگ حیران رہ جاتے تھے کہ یہ کس دلیری اور جرأت کے ساتھ اپنی جان دے رہے ہیں۔ ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ میرے ایمان لانے کی وجہ ہی یہی ہوئی کہ مَیں نے ایک مسلمان کو اس جرأت کے ساتھ جان دیتے دیکھا کہ مَیں حیران رہ گیا۔ واقعہ یہ ہُوا کہ دشمنوں نے مسلمانوں کی ایک جماعت دھوکا سے گھیر لی۔ اور پھر مزید دھوکا انہوں نے یہ دیا کہ انہوں نے ان گھرے ہوئے مسلمانوں سے یہ کہا کہ اگر تم پہاڑی سے نیچے اُتر آؤ تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ جب وہ نیچے آئے تو انہوں نے حملہ کرکے اُن میں سے اکثر کو شہید کر دیا۔ وہ شخص جو اس واقعہ کو دیکھنے کے بعد ایمان لایا

وہ کہتا ہے کہ میں کسی اور قبیلہ کا تھا۔ لیکن ہم سمجھتے تھے کہ یہ مسلمان لوگ بے دین ہیں اور عربوں کے خلاف جذبات رکھتے ہیں۔ اور چونکہ ہمارے کانوں میں بار بار یہ باتیں ڈالی جاتی تھیں کہ مسلمان عربوں کے دشمن ہیں۔ اس لئے میں بھی ان لوگوں کے ساتھ آکر شامل ہو گیا۔ اور مسلمانوں کا میں نے مقابلہ کیا۔ اُسوقت میں نے دیکھا کہ ایک شخص آگے بڑھا اور اُس نے ایک مسلمان کے سینہ میں نیزہ مارا۔ جونہی وہ نیزہ اُس کے سینہ سے پار گیا بے اختیار اُس کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوئے کہ فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ خدائے کعبہ کی قسم! آج میں نے اپنا مقصد پا لیا۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ گرا اور شہید ہو گیا۔ میں نے یہ الفاظ سُنے۔ تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ یہ بات کیا ہے۔ کیا یہ شخص پاگل تھا کہ دشمن اُسے نیزہ مارتا ہے۔ اور نیزہ بھی ایسی حالت میں مارتا ہے جب یہ اپنے وطن سے سوڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ اُسوقت بجائے اِس کے کہ یہ کہے ہائے اماں! بجائے اِس کے کہ یہ کہے ہائے ابا! بجائے اس کے کہ یہ کہے ہائے میری بیوی! وہ کہتا ہے تو یہ کہ خدائے کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ یہ کامیاب کہاں ہوا؟ یہ تو مر گیا تھا پھر اُس نے یہ الفاظ کیوں کہے معلوم ہوتا ہے یہ شخص پاگل تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ کامیابی کیا چیز ہے اور ناکامی کیا چیز؟ چنانچہ لڑائی کے بعد میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ کیا یہ کوئی پاگل تھا کہ جب اُس پر حملہ کیا گیا تو بجائے اِس کے کہ یہ کسی تکلیف کا اظہار کرتا اُس نے کہا تو یہ کہ ربّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کہنے لگا۔ مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ مرنے میں کامیابی سمجھتے ہیں۔ جب اُس نے یہ بات کہی تو میرے دل پر اس کا گہرا اثر ہُوا اور میں نے کہا۔ تب ضرور کوئی بات ہے ورنہ اِس طرح جان دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہو سکتا چنانچہ ایک دن میں چوری چھپے مدینہ گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں سُنیں۔ تو میرا دل کُھل گیا اور میں نے سمجھا کہ اصل میں یہی سچائی ہے۔ تب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ مسلمان کیوں جان دیتا ہے مسلمان اس لئے جان دیتا ہے کہ اُسے روشنی نظر آجاتی ہے۔ اور جسے روشنی نظر آجائے اُس کا مقابلہ وہ شخص کہاں کر سکتا ہے جسے تاریکی ہی تاریکی دکھائی دے۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم نے بار بار مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ تم سوچو اور سمجھو۔ درحقیقت بغیر اس کے ہمیں کسی دوسری قوم پر فضیلت حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم خالی کہیں کہ تم قرآن مانو۔ اور مسلمان بنو تو ہندو کہیں گے ہندو بنو اور وید پڑھو۔ سکھ کہیں گے سکھ بنو اور گرنتھ پڑھو۔ عیسائی کہیں گے عیسائی بنو اور انجیل پڑھو۔ پھر ہم میں اور اُن میں کیا فرق رہا۔ صرف ایک ہی فرق ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہم سوچ کر مانیں اور سمجھ کر مانیں جب ہم ہر بات کو سوچکر اور سمجھکر مانیں جب ہم ہر بات کو سوچکر اور سمجھ کر ماننے کے عادی ہو جائینگے تو سچی کتاب والا اپنی کتاب پر زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتا چلا جائیگا اور غلط تعلیم والا زیادہ سے زیادہ اپنی مذہبی کتاب سے متنفر ہوتا چلا جائیگا۔ مثلاً ہم قرآن کریم پر غور کریں گے اور اُس کی تعلیموں کو سوچیں گے تو زیادہ سے زیادہ اُس میں سے دلائل نکلتے چلے آئیں گے اور ہمارا ایمان زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتا چلا جائیگا۔ لیکن ایک عیسائی عیسائیت پر جتنا بھی غور کریگا اس کا ایمان کمزور ہوتا جائے گا۔ ایک یہودی جتنا جتنا تورات پر غور کریگا چونکہ وہ محرّف و مبدّل ہو چکی ہے اس لئے اتنا ہی اُس سے بدظن ہوتا چلا جائیگا۔ اِسی طرح جتنا جتنا کوئی ویدوں پر غور کرے گا اُتنا ہی وہ ویدوں سے بدظن ہوتا چلا جائیگا گویا غور اور فکر کا یہ نتیجہ ہوگا کہ مسلمان اپنے ایمان میں مضبوط ہوتا چلا جائیگا اور ہندو اور عیسائی اور موسائی اپنے ایمان میں متزلزل اور کمزور ہوتے چلے جائیں گے۔

پس سوچنا اور سمجھنا مذہب کو مضبوط کرتا اور ایمان کو تقویت دیتا ہے۔ دنیوی لحاظ سے بھی غور کر کے دیکھو تو ابتدائے اسلام میں مسلمانوں نے سوچا اور علوم پر غور کیا تو وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ آخر مسلمانوں سے پہلے عربی زبان موجود تھی۔ بلکہ عربوں کی یہ مادری زبان تھی۔ مسلمانوں سے پہلے تاریخ موجود تھی لیکن باوجود اس کے انہوں نے اسلام سے پہلے ذرا بھی حرکت نہیں کی۔ لیکن اسلام کے بعد اُن میں ایسی تبدیلی پیدا ہوگئی کہ انہوں نے عربی مدوّن کی۔ لغتیں لکھیں۔ زبان عربی کے اصول اور قواعد وضع کئے۔ صرف و نحو کے اصول تجویز کئے۔ فقہ کے اصول تجویز کئے۔ تاریخ کے اصول مدوّن کئے۔ یہ فرق آخر کیوں ہوا؟ اسی لئے کہ مسلمانوں کو تعلیم دی گئی تھی کہ ہر بات پر سوچو اور غور کرو۔ جب انہوں نے سوچا تو وہ ہر میدان میں آگے نکل گئے۔ اور اُن میں بڑے بڑے نحوی۔ بڑے بڑے صرفی۔ بڑے بڑے قاضی۔ بڑے بڑے مؤرخ اور بڑے بڑے جرنیل نظر آنے لگے لیکن جب مسلمانوں نے سوچنا ترک کر دیا اور یورپ نے سوچنا شروع کیا۔ تو مسلمان گر گئے اور یورپ کے لوگ کہیں سے کہیں نکل گئے۔

مسلمان جب ایک زندہ قوم تھے۔ وہ ہر چیز میں غور و فکر کرنے کے عادی تھے۔ اور اس چیز نے اُن کے دماغوں کو ایسا روشن کر دیا تھا کہ وہ بڑے بڑے جھگڑے نہایت خوش اسلوبی سے طے کر لیا کرتے تھے۔ یورپ میں بچوں کو جو ریڈرز پڑھائی جاتی ہیں اُن میں ابن ابی لیلیٰ کا ایک واقعہ آتا ہے۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے ایک مسلمان جج تھے۔ انہوں نے قضاء میں جس طرح ترقی کی اُس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک دفعہ اُن کے پاس دو شخص لڑتے ہوئے آئے۔ اُن میں سے ایک تیلی تھا۔ اور دوسرا قصائی۔ جھگڑا یہ تھا کہ کچھ روپوں کے متعلق اُن میں سے ایک کہتا تھا کہ یہ میرے روپے ہیں۔ اور دوسرا کہتا تھا کہ یہ میرے روپے ہیں۔ آخر انہوں نے اُس کے فیصلہ کی ایک راہ نکالی۔ غور کرو وہ کتنی باریک بات تھی جو انہوں نے سوچی۔ انہوں نے سوچا کہ ان میں سے ایک قصائی ہے اور ایک تیلی۔ ان دونوں کے پاس کہیں اکٹھی دولت نہیں آسکتی۔ یہی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے روپیہ روپیہ لے کر جمع کیا ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ روپے کس کے ہیں؟ اس کے لئے انہوں نے پانی منگوایا اور اُسے گرم کروایا۔ پھر وہ روپے اُس پانی میں ڈال دیئے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ پانی پر کیا چیز آتی ہے۔ اگر تیل آیا تو روپے تیلی کے ہونگے اور اگر چربی آگئی تو روپے قصاب کے ہونگے۔ چنانچہ جو نشان آیا۔ اُس کے مطابق انہوں نے فیصلہ کر دیا۔ یہ سوچنے کا نتیجہ تھا کہ اُن کے دماغ نے فوراً ایک راہ نکال لی اور اُس کے مطابق انہوں نے اس جھگڑے کا فیصلہ کر دیا۔ اس قسم کے اُن کے اور بھی بہت سے فیصلے مشہور ہیں اور وہ آج تک یورپ کی ریڈرز میں بچوں کو پڑھائے جاتے ہیں اور انہیں سگیشس قاضی یعنی عقلمند قاضی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بہت جلد فیصلہ کر دیتے تھے اور فیصلہ نہایت صائب ہوتا تھا۔ مگر اس کی وجہ کیا تھی؟ وجہ یہی تھی کہ انہیں سوچنے اور غور کرنے کی عادت تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کوفہ کے لوگ بار بار شرارتیں کرتے تھے اور جو بھی گورنر مقرر ہو کر آتا اُس کی شکائتیں کرنی شروع کر دیتے اور آخر اُسے بدلوا دیتے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک دفعہ بعض لوگوں نے کہا کہ آپ کوفہ کے گورنر کو بار بار کیوں بدلتے ہیں۔ ان لوگوں کی تو عادت ہی یہی ہے کہ جو شخص بھی ان کا گورنر بن کر جائے اُس کی شکائتیں کرنے لگ جاتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تک یہ لوگ گورنر بدلنے کے لئے کہتے چلے جائیں گے میں بھی بدلتا چلا جاؤنگا تاکہ ان کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔ آخر جب اُن کی شکائتیں بہت بڑھ گئیں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا

کہ اب کی دفعہ میں ایک ایسا آدمی بھیجونگا جس کے متعلق
مجال نہیں کہ کوفہ والے اُف بھی کرسکیں۔ چنانچہ انہوں نے
ابن ابی لیلیٰ کو وہاں کا گورنر مقرر کر کے بھیجا۔ اُس وقت اُنکی
عمر ۱۹ سال کی تھی۔ کوفہ والوں کو جب پتہ لگا کہ اب ایک
ایسا نوجوان ہمارا گورنر بن کر آیا ہے جس کی عمر فقط ۱۹ سال
ہے تو وہ بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے سوچا کہ اب ہم
اِس کا خوب مذاق اُڑائیں گے اور اسے اچھی طرح شرمندہ
اور ذلیل کریں گے۔ جب اُن کے آنے کی وہاں اطلاع پہنچی
تو انہوں نے بڑے بڑے آدمیوں کو اکٹھا کیا اور تجویز یہ کی
کہ بڈھوں اور بڑی عمر والوں کا ایک وفد بنایا جائے۔
جو شہر سے باہر نکل کر گورنر کا استقبال کرے۔ اِس وفد
کے ساتھ عام لوگوں کا ایک بھاری ہجوم ہو۔ تمام شہر میں
جلوس نکالا جائے اور جب گورنر صاحب تشریف لائیں تو
تمسخر کے طور پر اُن سے پوچھا جائے کہ جناب کی عمر کیا
ہے؟ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ بڑے بڑے بڈھے
اور آزمودہ کار اور شہر کے رئیس ایک وفد کی صورت میں
جمع ہوئے۔ اُن کے ساتھ شہر کے ہزاروں آدمی ایک جلوس
کی صورت میں باہر نکلے تاکہ وہ ابن ابی لیلیٰ کا استقبال
کریں۔ جب وہ قریب پہنچے تو ایک بہت بڈھا آدمی جسکو
انہوں نے سکھایا ہوا تھا آگے بڑھا اور اُس نے کہا۔
حضور آپ کی عمر کیا ہے؟ اُن کا خیال تھا کہ وہ جواب میں
کہیں گے ۱۹ سال اور اِس پر سب لوگ ہنس پڑیں گے۔
کہ ۱۹ سال کا نوجوان کوفہ جیسے شہر میں گورنر بنا کر بھیجا
گیا ہے۔ مگر اُن کو سوچنے کی عادت تھی اور رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو غور کرنیکا ایسا عادی بنا
دیا تھا کہ اُن کی نگاہ حقیقت تک فوراً پہنچ جاتی تھی۔
جب انہوں نے کہا۔ حضور آپ کی عمر؟ تو وہ فوراً تاڑ گئے
کہ ان کی غرض سوال کرنا نہیں بلکہ تمسخر اور استہزاء کرنا ہے
چنانچہ انہوں نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میری عمر
۱۹ سال ہے۔ بلکہ کہا۔ جناب والا! جب رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زیدؓ کو شام کی فوج کا افسر
بنا کر بھیجا تھا جس میں ابوبکرؓ اور عمرؓ جیسے انسان بھی شامل
تھے تو جو عمر اُسوقت اسامہؓ کی تھی اُس سے ایک
سال میں بڑا ہوں۔ جب اُسامہؓ کو رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے شام کی فوج کا افسر بنا کر بھیجا ہے اُسوقت
اُن کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ یہ جواب سُن کر انہوں نے
فیصلہ کر لیا۔ کہ جب تک یہ شخص یہاں رہے اُسوقت
تک کوئی شرارت نہیں کرنی۔ چنانچہ انہوں نے ایک
لمبے عرصہ تک قضا کی۔ مگر پھر کسی نے اُن کے تبادلہ کی
درخواست نہیں کی۔ تو انسان کو ہمیشہ سوچنے اور صحیح
نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہ
کرے تو اپنے مقام سے گر جاتا ہے۔ اَب کُجا تو یہ حالت
تھی کہ مسلمان ہر علم میں ترقی کر رہے تھے اور کُجا یہ حالت
ہے کہ جب انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جو ہونا تھا
ہو چکا اب علوم میں ترقی نہیں ہو سکتی تو وہ گر گئے۔
اور ایسے گرے کہ اب دنیا کی علمی دوڑ میں غیر مذاہب کے
لوگ تو آگے ہیں اور مسلمان پیچھے ہیں۔ اس کے مقابل میں
یورپ نے کہا کہ اگر پہلوں نے ترقی کی تھی تو ہم کیوں ترقی
نہیں کر سکتے۔ ہم بھی سوچیں گے اور غور کریں گے اور اس طرح
اپنی ترقی کے لئے نئے سے نئے راستے نکالیں گے۔ چنانچہ
اُن کے سوچنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے کئی قسم کی ایجادیں
کرلیں۔ مثلاً وہ ریل جس پر تمام دنیا سفر کرتی ہے۔ یہ
کس چیز کا نتیجہ ہے۔ یہ سوچنے اور غور کرنیکا ہی نتیجہ ہے
ریل کے موجد نے دیکھا کہ ہنڈیا کو جب چولہے پر چڑھایا
جاتا ہے تو اُس کا ڈھکنا سٹیم کے زور سے اُچھلتا ہے
اِس پر غور کر کے اُس کا دماغ اِس طرف چلا گیا کہ سٹیم
میں بہت بڑی طاقت ہے۔ اگر سٹیم کو بند رکھا جائے
اور ہنڈیا کے نیچے پہیئے لگا دیئے جائیں تو وہ دوڑنے

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ

انہوں (یعنی کافروں) نے کہا۔ اے نوحؑ! اگر تو باز نہ آیا تو تُو سنگساروں میں شامل

الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿١١٧﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿١١٨﴾

ہو جائیگا (یعنی ہم تجھے سنگسار کر دینگے) اس پر اُس (یعنی نوحؑ) نے کہا۔ اے میرے ربّ! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔

لگ جائیگی۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ ہنڈیا کے نیچے پہیئے لگائے سٹیم کو بند کیا اور وہ دوڑنے لگ گئی۔ اِسی پر قیاس کر کے اُس نے ریل ایجاد کر لی۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ اُس نے ہنڈیا میں سے کبھی سٹیم نکلتے نہیں دیکھی گھروں میں روزانہ عورتیں کھانا پکاتی ہیں اور مرد روزانہ دیکھتے ہیں کہ سٹیم کے زور سے ہنڈیا کا ڈھکنا اچھل رہا ہے مگر اُن کا ذہن کبھی اِس طرف مائل نہیں ہوتا کہ وہ اس پر غور کریں اور سوچیں کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ریل کے موجد نے اسے دیکھا اور اُس نے سوچ کر ایک ایسی چیز نکالی جس سے آج ساری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اِسی طرح اَور کئی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جن سے کچھ کا کچھ نتیجہ نکل آتا ہے۔ کولمبس کو دیکھو۔ اُس نے مسلمانوں سے یہ سُنا ہؤا تھا کہ زمین گول ہے۔ حالانکہ علمِ ہیئت کی ترقی اُس وقت اتنی نہیں ہوئی تھی۔ دراصل مسلمانوں نے چاندگرہن پر غور کر کے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ زمین چپٹی نہیں بلکہ گول ہے۔ کیونکہ چاندگرہن کے وقت اس پر ایک گول نشان ہوتا ہے۔ اُس نشان سے مسلمانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زمین گول ہے۔ جب کولمبس نے یہ سُنا کہ مسلمانوں کے علماء کا یہ خیال ہے کہ زمین گول ہے تو اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر زمین گول ہے تو مَیں سپین سے چلونگا اور ہندوستان پہنچ جاؤنگا۔ چنانچہ اُس نے پہلے بادشاہ اور پھر ملکہ کو تحریک کی کہ وہ اُس کی امداد کریں۔ اور آخر وہ ہندوستان تو نہ پہنچا لیکن ہندوستان سے ایک زیادہ طاقتور ملک امریکہ اُسے مل گیا۔ یہ نتیجہ کس بات کا تھا؟ اِس بات کا کہ مسلمانوں کو سوچنے اور غور کرنے کی عادت تھی۔ انہوں نے پہلے سوچا کہ چاندگرہن کیوں لگتا ہے اور پھر انہوں نے سوچ کر یہ نتیجہ نکالا کہ چاندگرہن اس لئے لگتا ہے کہ سورج اور چاند کے درمیان زمین آجاتی ہے۔ پھر انہوں نے سوچا کہ گرہن کے وقت چاند پر گول نشان کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب اُن کے دماغ نے یہ دیا کہ یہ گول نشان زمین کا ہے۔ اور یہ گول نشان ثابت کرتا ہے کہ زمین چپٹی نہیں بلکہ گول ہے اور جب مسلمان علماء نے یہ کہا کہ زمین گول ہے تو کولمبس نے اِس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جب مَیں سپین سے چلونگا تو ساری دنیا کے گرد چکر لگا لونگا۔ کیونکہ گول چیز کے گرد چکر لگایا جاسکتا ہے۔ چپٹی ہو تو کنارہ پر آکر قدم رُک جاتا ہے۔ غرض چھوٹی چھوٹی چیزوں پر غور کرنے کا نتیجہ یہ ہؤا کہ ایک نیا ملک دریافت ہو گیا۔ اِتنا بڑا ملک کہ آج ساری دنیا امن کے لئے اس کی طرف دیکھ رہی ہے آج ساری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ہماری حفاظت کا ذریعہ ہی یہی ہے کہ یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ کی مدد ہمارے ساتھ ہو۔ یہ عظیم الشان نتیجہ آخر کس طرح نکلا؟ اِسی طرح کہ پہلے مسلمانوں نے چاندگرہن پر غور کیا پھر چاندگرہن سے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین گول ہے اور کولمبس نے زمین کے گول ہونے سے یہ نتیجہ نکالا کہ

فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ

پس تُو میرے اور ان کے درمیان ایک قطعی فیصلہ کر اور مجھے اور میرے ساتھی مومنوں کو (دشمن کے)

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۲۰﴾

شر سے بچالے۔ پس ہم نے اُس کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے ایک بھری ہوئی کشتی کے ذریعہ (شر سے) بچالیا

ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ

پھر اس کے بعد جو باقی لوگ تھے انکو غرق کر دیا۔ اس میں ایک بہت بڑا نشان تھا مگر ان (یعنی کافروں) میں سے اکثر

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۳﴾ ع ۶ / ۱۰

ایمان لانے پر آمادہ نہیں تھے اور تیرا رب ہی غالب (اور) بار بار کرم کرنیوالا ہے۔ ۲۲

کہ اگر وہ گول ہے تو میں ساری دنیا کے گرد چکر لگا لُوں گا۔ چنانچہ وہ چلا اور اُس نے ایک نئی زمین دریافت کر لی جو اب اتنا بڑا ملک بن گیا ہے کہ ساری دنیا کی راہنمائی کر رہا ہے۔ اگر مسلمان چاند کو دیکھتے رہتے جس طرح پہلے دیکھا کرتے تھے۔ اگر مسلمان اس بات پر غور نہ کرتے کہ اسے گرہن کے وقت گول دائرہ کیوں بن جاتا ہے۔ اگر کولمبس یہ نہ سوچتا کہ زمین کے گول ہونے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ساری دنیا کا چکر لگایا جا سکتا ہے تو نہ امریکہ دریافت ہوتا۔ نہ موٹر کاریں ہوتیں نہ ہوائی جہاز نکلتے نہ بجلی ایجاد ہوتی نہ اتنی عظیم الشان طاقت دنیا پر رونما ہوتی کہ جس کے پیچھے آج انگریز اور فرانس بھی چلنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں جتنی ایجادات ہیں وہ ساری کی ساری بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں پر غور کرنیکا نتیجہ ہیں۔ ایڈیسن جس نے فونوگراف اور بجلی وغیرہ کئی چیزیں ایجاد کی ہیں میں نے اُس کی سوانحعمری پڑھی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے جس قدر ایجادیں کی ہیں یہ سب کی سب بعض چھوٹے چھوٹے مسائل پر غور کرنے کا نتیجہ ہیں۔ پس سوچنا اور غور کرنا قومی ترقی کیلئے

ایک نہایت ہی ضروری چیز ہے۔ جو قومیں بلا سوچے سمجھے صرف نعرے لگانا جانتی ہیں وہ کوئی کام نہیں کر سکتیں۔ وہ نعروں سے اُس وقت کی فضا کو مشوش کر سکتی ہیں۔ وہ نعروں سے کمزور بچوں کو ڈرا سکتی ہیں۔ وہ نعروں سے کمزور عورتوں کے دلوں کو دہلا سکتی ہیں لیکن اگر وہ کوئی حقیقی کام کر سکتی ہیں تو صرف سوچ بچار سے اور صحیح نتائج کو اخذ کرکے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو شعور کی طرف توجہ دلائی۔ اور فرمایا کہ کاش اس قسم کے لغو اعتراضات کرنے کی بجائے تم حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور وہ مخفی حِس جو انسان کو اس کے اندرونی قوتوں کا علم دیتی ہے اور جس کے نتیجہ میں فطرتِ صحیحہ بیدار ہوتی ہے اُس سے کام لیتے ہوئے تم دوسروں پر اعتراض کرنے کی بجائے اپنے نفس پر غور کرتے کہ اُس میں کیا کیا خامیاں ہیں اور بُرے بھلے کی تمیز کرنیکی طاقت پیدا کرتے۔

۲۲ حل لغات:- اَلْمَرْجُوْمِيْنَ۔ اَلْمَرْجُوْمُ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور رَجَمَ سے اسم مفعول ہے۔ اور رَجَمَہٗ کے معنے ہیں۔ رَمَاہُ بِالْحِجَارَۃِ۔ اس کو پتھر مارے۔ قَتَلَہٗ۔ اُس کو قتل کیا۔ قَذَفَہٗ۔ اُس پر الزام لگایا۔

اَلْمَرْجُوْمِیْنَ

كَذَّبَتْ عَادُ ِالْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٢٤﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ

(اسی طرح) عاد نے بھی رسولوں کا انکار کیا۔ جب کہ اُن سے اُن کے بھائی

هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٢٥﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٢٦﴾

ہودؑ نے کہا۔ کیا تم تقویٰ نہیں کرتے۔ میں تمہاری طرف ایک امانت دار پیغامبر ہو کر آیا ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٢٧﴾ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ

پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ اور میں تم سے اِس (خدمت) پر کوئی بدلہ

لَعَنَهٗ۔ اُس پر لعنت کی۔شَتَمَهٗ۔ اُس کو گالی دی هَجَرَهٗ۔ اُس کو جُدا کر دیا۔ طَرَدَهٗ۔ اُسکو دھتکار دیا (اقرب)

اَلْمَشْحُوْن: شَحَنَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اور شَحَنَ السَّفِيْنَةَ کے معنے ہیں مَلَأَهَا کشتی کو بھر دیا (اقرب) پس اَلْمَشْحُوْن کے معنے ہونگے۔ بھری ہوئی۔

تفسیر: ۔حضرت نوح علیہ السلام کے مخالفین نے جب دیکھا کہ وہ دلائل سے نوحؑ کو مغلوب نہیں کر سکتے تو انہوں نے کہا کہ اب تو ہمارے پاس ایک ہی علاج ہے۔ اگر تم اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ہم تجھے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔ آخر حضرت نوح علیہ السلام خدا تعالیٰ کے حضور جُھکے اور انہوں نے کہا کہ اے میرے ربّ! میری قوم نے تو مجھے جھٹلا دیا ہے۔ اب تُو ہی میرے اور اُن کے درمیان فیصلہ فرما۔ اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو اُن کے شر سے محفوظ رکھ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی دُعا کو سُنا اور اُس نے ایک بھری ہوئی کشتی کے ذریعہ انہیں اپنے دشمنوں کے شر سے بچا لیا۔ اور جو باقی لوگ رہ گئے۔ اُن کو طوفان میں غرق کر دیا۔ اِس واقعہ میں بھی خدا تعالیٰ کی عظمت اور اُس کی طاقت کا بڑا بھاری نشان ہے۔ مگر پھر بھی اُن میں سے اکثر لوگ ایمان نہ لائے۔ لیکن ان کے ایمان نہ لانے کے باوجود تیرے ربّ کا عزیز اور رحیم ہونا ثابت ہو گیا۔ نوحؑ اپنے دشمنوں پر غالب آ گیا۔ اور نوحؑ کے حقیر سمجھے جانے والے ساتھی دنیا کے سردار بن گئے۔

اَلْمَشْحُوْن

اسجگہ نوحؑ کی کشتی کے متعلق اَلْمَشْحُوْن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنے بھری ہوئی کشتی کے ہیں مگر ظاہر ہے کہ اگر کشتی پہلے ہی بھری ہوئی ہو تو اَور لوگ اس میں سوار نہیں ہو سکتے۔ پھر بھری ہوئی کشتی میں نوحؑ کے ساتھی کس طرح بیٹھ سکتے تھے؟ درحقیقت عربی زبان میں بعض دفعہ کسی چیز کو اُس حالت کے مطابق نام دے دیتے ہیں جو اُس پر بعد میں وارد ہونے والی ہو۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ مَنْ قَتَلَ قَتِيْلًا فَلَهٗ سَلَبُهٗ یعنی جو شخص جہاد میں کسی مقتول کو قتل کرے اس کا مال و اسباب قتل کرنے والے کو ہی ملے گا۔ اِس حدیث میں آپ نے دوسرے کے متعلق قَتِیل کا

مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۸﴾ اَتَبْنُوْنَ

نہیں مانگتا میرا بدلہ صرف رب العالمین خدا کے ذمہ ہے (جس نے مجھے بھیجا ہے) ۲۳؎ کیا تم ہر ٹیلہ پر

بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمْ

فضول کام کرتے ہوئے عمارت بناتے ہو - اور تم بڑے بڑے محل بناتے ہو تاکہ تم ہمیشہ

تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ فَاتَّقُوا اللّٰہَ

قائم رہو اور جب تم کسی کو پکڑتے ہو تو ظالموں کی طرح پکڑتے ہو پس اللہ (تعالیٰ) کا تقویٰ اختیار کرو

وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۳۲﴾ وَاتَّقُوا الَّذِیْٓ اَمَدَّکُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ اَمَدَّکُمْ

اور میری اطاعت کرو - پھر میں کہتا ہوں کہ اُس (ذات) کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہاری اُن چیزوں سے مدد کی ہے جنکو تم جانتے ہو - اُس نے تمہاری

بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۱۳۵﴾ اِنِّیْٓ

مدد کی ہے چار پائے اور بیٹے اور باغ اور چشمے دے کر میں تم پر

اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۳۶﴾

ایک بڑے دن کا عذاب نازل ہونے سے ڈرتا ہوں - ۲۴؎

لفظ استعمال فرمایا ہے - حالانکہ وہ ابھی زندہ ہوتا ہے۔ اسی طرح چونکہ وہ کشتی حضرت نوحؑ اور انکی جماعت کے افراد سے بھر جانے والی تھی - اسلئے اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ ہم نے انہیں ایک بھری ہوئی کشتی کے ذریعہ نجات دی -

۲۳؎ تفسیر :- اِن آیات میں حضرت ہودؑ کو بھی تمام رسولوں کا قائم مقام بنایا گیا ہے - اور رسول کی جگہ مرسلین کا لفظ اس کے لئے استعمال کیا گیا ہے - کیونکہ ایک رسول کا انکار درحقیقت تمام رسولوں کا انکار ہوتا ہے - فرماتا ہے جس طرح نوحؑ کو اُس کی قوم نے جھٹلایا تھا - اسی طرح ہودؑ کو بھی اُسکی قوم عاد نے جھٹلایا - حالانکہ اُس کے زمانہ میں بھی ہم نے یہی حکم دیا تھا - کہ علاوہ کلامِ الٰہی کی اطاعت کے خود ہودؑ کی اطاعت بھی ضروری ہے جس کی طرف اَطِیْعُوْنِ میں اشارہ کیا گیا ہے -

رِیْعٌ

۲۴؎ حل لغات :- رِیْعٌ : اَلرِّیْعُ کے معنے ہیں اَلتَّلُّ الْعَالِیْ - اونچا ٹیلہ - اَلطَّرِیْقُ الْمُنْفَرِجُ فِی الْجَبَلِ - پہاڑ میں چڑھائی کا وہ راستہ جو چکر کھا کر جاتا ہو - اَلْجَبَلُ الْمُرْتَفِعُ - بلند پہاڑ - وَقِیْلَ مَسِیْلُ الْوَادِیْ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ مُرْتَفِعٍ - اور بعض اہلِ لغت کہتے ہیں کہ ریع ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اونچی جگہ سے پانی آئے اور بہہ جائے (اقرب)

تَعْبَثُوْنَ

تَعْبَثُوْنَ : عَبَثَ سے فعل مضارع مخاطب جمع

کا صیغہ ہے۔ اور اَلْعَبَثُ (جو عَبَثَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں۔ اِرْتِکَابُ اَمْرٍ غَیْرِ مَعْلُوْمِ الْفَائِدَۃِ اَوْ لَیْسَ فِیْہِ غَرْضٌ صَحِیْحٌ لِفَاعِلِہٖ۔ کسی ایسی بات کا کرنا جس کا کوئی فائدہ نظر نہ آتا ہو۔ یا ایسا کام کرنا کہ جس کے کرنے والے کی غرض صحیح نہ ہو (اقرب) پس تَعْبَثُوْنَ کے معنے ہونگے تم بے فائدہ کام کرتے ہو۔

مَصَانِعَ کے معنے ہیں۔ اَلْقُرٰی وَ الْمَبَانِیْ مِنَ الْقُصُوْرِ وَ الْحُصُوْنِ۔ بستیاں اور بڑی بڑی عمارات (اقرب)

بَطَشْتُمْ: بَطَشَ سے جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور بَطَشَ کے معنے ہیں اَخَذَہٗ بِالْعُنْفِ۔ سختی سے پکڑا۔ وَ تَنَاوَلَہٗ بِشِدَّۃٍ عِنْدَ الصَّوْلَۃِ۔ حملہ کے وقت سختی سے پکڑا۔ (اقرب) پس بَطَشْتُمْ کے معنے ہونگے تم سختی سے پکڑتے ہو۔

جَبَّارِیْنَ: جَبَّارٌ کی جمع ہے اور جَبَّارٌ کے معنے ہیں۔ کُلُّ عَاتٍ مُتَمَرِّدٍ۔ متکبر اور سرکش شخص۔ (اقرب)

تفسیر:۔ قوم عاد جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے فن تعمیر میں خاص شغف رکھتی تھی کیونکہ اُسکی تہذیب کی بنیاد علم ہندسہ کیمسٹری اور ہیئت پر تھی۔ اس تہذیب کے بانیوں کا خیال تھا کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے مادی عالم میں سورج اور چاند اور ستارے بنائے ہیں اسی طرح انسانی ترقی کے لئے اس نظام کی نقل کرنا ضروری ہے اور اس کا ذریعہ ہے کہ وہ نظام شمسی پر غور کرکے اور اس کے راز معلوم کرکے اُن کی اتباع کرے جس طرح آدین۔ روَمن اور ایرانی ثقافت نے متمدن دنیا پر ایک گہرا اثر ڈالا۔ اور سابق نظاموں کی جگہ ایک نیا نظام قائم کر دیا اسی طرح بابلی تحریک جس کے بانی قوم عاد سے تعلق رکھنے والے تھے اُس نے بھی دنیا کے کلچر اور تہذیب پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ اور گو اس تحریک کے بانی کچھ عرصہ بعد سیاسی طور پر اپنی حکومت کو کھو بیٹھے اور اسکی جگہ دوسری اقوام نے لے لی۔ مگر اُن کو شکست دینے والے اُن کے فلسفہ سے آزاد نہ ہو سکے۔ یہ تحریک چونکہ انتہائی قدیم تحریک ہے اس لئے موجودہ زمانہ میں اس کے آثار بہت کم ملتے ہیں لیکن جتنے آثار بھی ملتے ہیں وہ قرآنی بیانات کی صداقت اور اُس کی عظمت کو روشن کر دیتے ہیں۔

اس تہذیب کی بنیاد قوم عاد کے ہاتھوں رکھی گئی تھی اور اس کو اپنے زمانہ میں اتنی طاقت حاصل تھی کہ اُن کے بعد عرب میں کسی اور قوم کو اس قسم کی طاقت حاصل نہیں ہوئی۔ اس تہذیب بابلی کی علمبردار دو قومیں ہوئی ہیں۔ ایک وہ جسے عادِ اولیٰ کہتے ہیں۔ اور جو تہذیب بابلی کے بانی تھے اور دوسرے ثمود جو بعد میں اس تہذیب کے حامل بنے اور جو اسی عاد کی ایک دوسری شاخ تھے۔

مَصَانِعَ

بَطَشْتُمْ

ان آیات میں انہی پہلے عاد یعنی بانیان تہذیب بابلی کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ ہودؑ نے اپنے زمانہ کی مشہور ترین طاقت یعنی قوم عاد سے مخاطب ہو کر کہا۔ کہ تم لوگ ہر پہاڑی پر شاندار عمارتیں بناتے ہو۔ اور بڑی بڑی فیکٹریاں اور کیمسٹری کے مرکز تیار کرتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ تم ہمیشہ قائم رہو گے۔ جیسے یورپ اور روس کے لوگ آجکل یہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کی تہذیب ہمیشہ قائم رہے گی۔ اسجگہ جو مصانع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد بڑی بڑی فیکٹریاں اور کیمیکل ورکس ہی ہیں۔

جَبَّارِیْنَ

پھر فرمایا وَ اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ تمہارے اندر اتنی طاقت پائی جاتی ہے کہ جب تم کسی ملک پر غلبہ پاتے ہو تو تم اُس کی تہذیب کو بالکل تباہ کر دیتے ہو۔ اُسکی جگہ اپنی تہذیب اور اپنا تمدن قائم کر دیتے ہو۔ جبّار کے معنے ہوتے ہیں دوسرے کو نیچا کر کے اپنے آپکو اونچا کرنیوالا۔ پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم دوسری اقوام کے تمدن اور تہذیب کو تباہ کر کے

اپنے تمدن اور تہذیب کو دنیا میں قائم کرتے ہو۔ اسی طرح وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ سے یہ استنباط بھی ہوسکتا ہے کہ آلاتِ جنگ کی بعض حیرت انگیز ایجادات انہی کے زمانہ میں ہوئی ہیں۔ چنانچہ جس رنگ میں انہوں نے پہاڑوں میں عمارتیں بنائی ہیں اُن کو دیکھ کر بعض مؤرخین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس قوم نے بارود اور ڈائنامیٹ ایجاد کر لیا تھا۔ اِن معنوں کی رُو سے اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ تم ایسے ایسے سامانِ جنگ ایجاد کرتے ہو جو نہایت ہی مہلک ہیں اور تم اُن کے ذریعہ باقی اقوام کو تباہ کر کے اپنی تہذیب اور اپنا تمدّن قائم کر دیتے ہو غرض بابلی تحریک میں عمارتوں کی تعمیر اور آلاتِ جنگ کی ایجاد اور رصدگاہوں کے بنانے پر زیادہ زور تھا۔ چنانچہ بابل کی حکومت کا جو بیان تورات میں آتا ہے اُس سے بھی قرآنی بیان کی ہی تصدیق ہوتی ہے۔ بائیبل میں آتا ہے۔

"اور انہوں نے کہا۔ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر بنادیں اور ایک بُرج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے۔ اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ تمام روئے زمین پر پریشان ہو جائیں۔ اور خداوند اس شہر اور بُرج کو جسے بنی آدم بناتے تھے دیکھنے اُترا اور خداوند نے کہا۔ دیکھ لوگ ایک ہیں اور ان سب کی ایک ہی بولی ہے۔ اب وَے یہ کرنے لگے سو وَے جس کام کا ارادہ رکھیں گے اُس سے نہ رُک سکیں گے۔ آؤ ہم اُتریں اور ان کی بولی میں اختلاف ڈالیں تاکہ وَے ایک دوسرے کی بات نہ سمجھیں۔" (پیدائش باب ۱۱ آیت ۴ تا ۷)

اِس حوالہ سے ظاہر ہے کہ یہودی تاریخ کے مطابق بھی ان لوگوں کا بڑا کمال بلند و بالا عمارات بنانا تھا۔ کیونکہ تورات کے اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ دنیا میں زبانوں کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ کسی وقت بابل کے لوگوں نے ایک بلند عمارت بنانی شروع کی تاکہ وہ اُن کے لئے ایک نشان قرار پائے اور اس کی وجہ سے وہ پراگندگی سے بچ جائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اُن کی پراگندگی چاہتا تھا اِس لئے اس نے اُن کو اس ارادہ سے باز رکھنے کے لئے اُن کی زبانوں میں اختلاف ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُس قوم میں سے اتحاد مٹ گیا۔ اور اُن کی طاقت ٹوٹ گئی اور وہ اس عمارت کے بنانے میں ناکام رہے۔

جو وجہ اس حوالہ میں بتائی گئی ہے وہ تو محض ایک کہانی ہے لیکن اس سے یہ تاریخی شہادت ضرور معلوم ہو جاتی ہے کہ اہل بابل اونچی عمارتیں بنانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور ایسی بلند عمارتیں بناتے تھے جن کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ چنانچہ عرب میں اب بھی بعض نہایت پُرانی عمارتیں ملتی ہیں جو بہت بڑی بڑی ہیں۔ بلکہ سفر یورپ کے دوران میں عدن سے چند میل کے فاصلہ پر مَیں نے خود بعض بڑی بڑی پُرانی اونچی عمارتیں دیکھی ہیں جو اونچے ٹیلوں پر بنی ہوئی تھیں اور اُن میں حوض وغیرہ بھی تھے۔ اور لوگ یہی کہتے تھے کہ یہ عاد کی بنائی ہوئی عمارتیں ہیں۔

یورپ کے لوگ ایک زمانہ میں عاد کے وجود سے ہی انکار کیا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ عاد نام کی کوئی قوم نہیں گذری۔ مگر قریباً نصف صدی سے جب کہ عاد کے آثار ملے ہیں۔ وہ بھی ماننے لگ گئے ہیں کہ عاد نام کی ایک قوم ہوئی ہے۔ بلکہ مشہور عیسائی مؤرخ جرجی زیدان نے "العرب قبل الاسلام" میں لکھا ہے کہ عاد کے متعلق مؤرخوں کی سینکڑوں صفحوں کی کتابیں بھی اس سے زیادہ معلومات بیان نہیں کر سکیں جتنے معلومات قرآن کریم نے اپنے چند الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَیْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَکُنْ مِّنَ الْوٰعِظِیْنَ ﴿۱۳۷﴾

انہوں نے کہا تیرا وعظ کرنا یا نہ کرنا ہمارے لئے برابر ہے (کیونکہ جو باتیں ہم کرتے ہیں) وہ تو پہلے زمانہ کے

اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۱۳۹﴾

لوگوں سے رائج ہیں ۔ اور ہم پر (کبھی) عذاب نہیں آئے گا ۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ

پس ان کافروں نے اسکو جھٹلا دیا اور ہم نے انکو ہلاک کر دیا ۔ اس واقعہ میں ایک بہت بڑا نشان ہے لیکن ان میں سے اکثر

قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ قوم حضرت نوحؑ کی قوم کے معًا بعد گذری ہے ۔ چنانچہ فرماتا ہے وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (اعراف ع ۹) یعنی یاد کرو جب خدا نے تم کو نوحؑ کی قوم کے بعد اُس کا جانشین بنایا ۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا جن کی پیشگوئیوں میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دی گئی تھی ۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا جن سے موسوی سلسلہ کی ابتداء ہوئی ۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا ۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نوحؑ کی شریعت کے پیرو تھے ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ (صافات ع) یعنی حضرت ابراہیمؑ نوحؑ کی جماعت میں سے ہی تھے ۔ پس ابراہیمؑ کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اُن کے سلسلہ کے بانی حضرت نوحؑ کا ذکر فرما دیا ۔ اور نوحؑ کے ذکر کے معًا بعد ھُوْدؑ علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو قوم عادؔ کی طرف مبعوث ہوئے تھے ۔ کیونکہ عادؔ ہی نے نوحؑ کی قوم کی جگہ لی تھی ۔

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو توجہ دلائی کہ تم بڑے بڑے ٹیلوں پر اونچی عمارتیں کھڑی کرتے ہو اور اپنی تہذیب اور تمدن کے تیار کئے ہوئے دوسری اقوام کو ظالمانہ طور پر کچل دیتے ہو ۔ مگر یہ سب باتیں عبث ہیں کیونکہ ان ظاہری نشانوں کے باوجود تمہارے نشان مٹ جائیں گے اور قائم صرف تقویٰ رہیگا ۔ تم بڑی بڑی فیکٹریاں اور صنعت گاہیں بناتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تمہاری قوم انکے ذریعہ سے زندہ رہیگی اور اپنی مالی ترقی کے گھمنڈ میں غریبوں پر ظلم کرتے ہو ۔ مگر یہ جھوٹی عزت تمہارے کسی کام نہیں آئے گی ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو ۔

وَاتَّقُوا الَّذِیْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ فرمایا آخر یہ علم جس سے تم دنیا میں ترقی کر رہے ہو خدا ہی کے دیئے ہوئے ہیں اور وہ سامان جن سے تم کام لیتے ہو وہ بھی خدا تعالیٰ ہی کے دیئے ہوئے ہیں ۔ اسی طرح جانور بھی اور اولاد بھی اور باغات بھی ۔ اور چشمے بھی سب اُسی کی عطا ہیں ۔ اگر تم اُس کی طرف توجہ نہ کروگے تو کسی دن یہ سب کچھ چھینا جائے گا ۔

مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۱

مومنوں میں سے نہ بنے۔ اور تیرا ربّ یقیناً غالب (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ ۲۵ؔ

۲۵ؔ تفسیر: ۔ حضرت ہود علیہ السلام نے جب انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے کہا۔ میاں ایسی نصیحتیں کرو یا نہ کرو۔ ہم نے ماننا تو ہے ہی نہیں۔ پہلے زمانوں سے ایسے لوگ ہوتے چلے آئے ہیں جو کہتے تو رہے ہیں کہ زیادہ دولتیں نہ کماؤ اور دولتوں کا گھمنڈ نہ کرو۔ مگر پھر بھی یہ دنیا کام کرتی ہی چلی آئی ہے۔ ہم کو کارخانے بنانے اور دولتیں کمانے پر کوئی عذاب نہیں ہوگا۔ اس لئے خواہ تم ہمیں تبلیغ کرو یا نہ کرو ہمارے لئے یہ برابر ہے اور ہم کبھی تمہاری بات نہیں مان سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی انسان سرکشی اور تمرّد میں بڑھ جائے تو اُسے نیکی کی طرف توجہ دلانا بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ لیکن اس مشکل کو تسلیم کرنے کے باوجود قرآن کریم نے مسلمانوں کو یہی ہدایت دی ہے کہ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (سورۂ اعلیٰ ع ۱) تمہارا کام یہی ہے کہ تم نصیحت کرتے چلے جاؤ۔ کیونکہ نصیحت کرنا بہرحال دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ پس خواہ کوئی کتنا ہی مخالف ہو۔ اسکے متعلق کبھی مایوسی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ دل خدا تعالیٰ کے قبضہ و اختیار میں ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم بار بار خدا اور اس کے رسولؐ کی باتیں لوگوں کے کانوں میں ڈالتے رہو۔ ایک دن یقیناً ایسا آجائیگا کہ اُن کے دل کے زنگ دُور ہو جائیں گے۔ اور وہ ہدایت کو خوشی سے قبول کر لیں گے۔

اولیاء کی کُتب میں لکھا ہے کہ ایک شخص مسلمانوں کو سخت دُکھ دیا کرتا تھا۔ اور باوجود سمجھانے کے باز نہیں آتا تھا۔ آخر کئی لوگوں نے تنگ آکر اُس محلّہ کو ہی چھوڑ دیا جس میں وہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ ایک بزرگ حج کر رہے تھے کہ انہوں نے اُسی شخص کو کعبہ کا طواف کرتے دیکھا۔ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ تُو کہاں؟ تیرا کام تو سارا دن گانا بجانا اور شرابیں پینا تھا تو کعبہ کا طواف کرنے کے لئے کس طرح آگیا۔ وہ کہنے لگا۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ آپ لوگ مجھے قرآن بھی سُناتے اور حدیثیں بھی بتاتے مگر میرے دل پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا۔ ایک دن مجلس لگی ہوئی تھی۔ دوست احباب بیٹھے تھے شراب کی صراحیاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں کہ یکدم مجھے گلی میں سے ایک آواز آئی۔ کوئی اجنبی نہ معلوم کون گلی میں سے گذر رہا تھا اور قرآن کریم کی یہ آیت بڑی خوش الحانی سے پڑھتا جارہا تھا کہ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ۔ کیا مومنوں پر ابھی وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل خدا تعالیٰ کے خوف سے بھر جائیں۔ یہ آیت جونہی میرے کان میں پڑی مجھے یوں معلوم ہوا کہ یہ آیت ابھی آسمان سے میرے لئے اُتری ہے۔ میرے آنسو جاری ہوگئے۔ میں نے مجلس برخواست کردی۔ گانے بجانے کے آلات توڑ دیئے توبہ کی اور حج کیلئے چل پڑا۔ تم نے سارا قرآن مجھے سُنا دیا مگر مجھ پر اثر نہ ہوا لیکن وقت ہوتا ہے۔ ایک آیت نے میری کایا پلٹ دی اور اب میں توبہ کرکے حج کرنے آیا ہوں۔ تو قلوب بعض دفعہ ایسے رنگ میں بدلتے ہیں کہ حیرت آجاتی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دفعہ ایک عورت نے دوسری عورت کو مارا اور اُس کا دانت توڑ دیا۔ اسلامی شریعت کی رُو سے ضروری تھا کہ اُس عورت کا بھی قصاص کے طور پر دانت توڑا جاتا۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا۔ وہ عورت

جس نے دانت توڑا تھا اُس کی طرف سے حضرت ابوہریرہؓ بطور وکیل پیش ہوئے۔ اور انہوں نے کہا کہ بے شک قصاص کے طور پر اس کا بھی دانت توڑا جانا چاہیئے مگر مَیں معافی کی درخواست کرتا ہوں اگر دوسرا فریق معاف کردے تو یہ اس کا احسان ہوگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دوسری عورت کے رشتہ داروں سے کہا کہ بیشک شریعت نے تمہیں قصاص کا حق دیا ہے لیکن اگر تم معاف کردو تو اچھا ہے۔ مگر دوسرے فریق پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ لوگ یہی کہتے چلے گئے کہ دانت کے بدلے جب تک دانت نہ توڑا جائیگا ہم نہیں ٹلیں گے۔ آخر حضرت ابوہریرہؓ کو جوش آگیا۔ اور انہوں نے کہا۔ خدا کی قسم میری رشتہ دار عورت کا دانت نہیں توڑا جائیگا یہ الفاظ انہوں نے ایسے جوش سے کہے کہ وہ لوگ جو اس بارہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سفارش بھی نہیں مان رہے تھے۔ ڈر گئے اور انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! ہم نے معاف کیا۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بال بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور اُن کے جسم غبار آلود ہوتے ہیں مگر جب وہ کسی معاملہ میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا لیں تو خدا تعالیٰ اُن کے متعلق اپنی غیرت دکھلاتا اور اُس بات کو پورا کردیتا ہے جس کے لئے وہ قسم کھاتے ہیں۔ تو دیکھو حضرت ابوہریرہؓ نے جب خدا کی قسم کھا کر یہ کہا کہ میری اس رشتہ دار عورت کا دانت نہیں توڑا جائیگا تو وہ لوگ جو اس بارہ میں خود حضرت ابوہریرہؓ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھے یکدم اُن کی طبیعت بدل گئی۔ اور انہوں نے اپنا حق چھوڑ دیا۔ پس مومنوں کو اس بات کی اہمیت سمجھنی چاہیئے کہ انہیں ہمیشہ ایک دوسرے کو سمجھاتے رہنا چاہیئے اور کبھی خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ دوسرے کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ اور اگر بالفرض دوسرے کی اصلاح نہ بھی ہو تو کم سے کم جو شخص دوسرے کو سمجھائیگا اُس کی اپنی اصلاح تو ہو جائے گی۔ بہرحال دوسرے کو سمجھانا فائدہ کے بغیر نہیں ہوتا۔ پس وعظ و نصیحت کا سلسلہ اپنے اندر بھی جاری کرنا چاہیئے اور غیروں میں بھی جاری کرنا چاہیئے۔ جہاں دوست ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھیں اُن کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہیں کہ سچ بولو۔ معاملات میں صفائی رکھو۔ گالی گلوچ سے کام نہ لو جھگڑا نہ کرو۔ محبت اور پیار سے رہو۔ جب اس قسم کے وعظ و نصیحت کا سلسلہ بند ہو جائے تو نئی پود کئی قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پُرانے لوگ تو شیطان سے بہت سی لڑائیاں لڑ چکے ہوتے ہیں۔ اور اُن کے اندر نیکی اور تقویٰ پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔ مگر نئی پود نے وہ لڑائی نہیں کی ہوتی اس لئے شیطان اُن کے اندر آسانی سے داخل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور شیطان کا قصہ اسی لئے بیان کیا ہے کہ ذرا سی غفلت بھی بہت بڑے نقصان کا موجب ہو جاتی ہے۔ اگر آدمؑ جو شیطان کے ساتھ دیر سے جنگ کرتا چلا آرہا تھا۔ دھوکا کھا سکتا ہے تو جن سے شیطان کی ابھی جنگ ہی نہیں ہوئی وہ تو اس کے فریب میں بہت جلد آ سکتے ہیں۔ آدمؑ اسی لئے شیطان کے دھوکا میں آیا کہ شیطان مذہب کا لبادہ اوڑھ کر آدمؑ کے سامنے آیا اور حضرت آدمؑ نے سمجھا کہ اب اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اُس کے ساتھ صلح کرلی۔ اور نتیجہ خراب نکلا۔ مگر جس شخص نے شیطان سے ابھی لڑائی شروع ہی نہیں کی۔ اُس کے سامنے اگر شیطان بزرگ بن کر آجائے تو وہ جلدی دھوکا کھا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس قصہ کے بیان کرنے سے یہی منشاء ہے کہ جب آدمؑ شیطان کو دیکھ کر دھوکا کھا گیا تو وہ لوگ جو ابھی شیطان کے

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوْهُمْ

ثمود نے بھی رسولوں کو جھٹلایا تھا۔ جب کہ انہیں اُن کے بھائی صالحؑ نے

صٰلِحٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾

کہا تھا کہ کیا تم تقوٰی نہیں کرتے؟ مَیں تمہاری طرف ایک امانت دار پیغامبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ

پس اللہ (تعالیٰ) کا تقوٰی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ اور مَیں اِس کام پر تم سے کوئی اُجرت

مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

طلب نہیں کرتا میری اُجرت تو ربّ العالمین کے ذمہ ہے (جس نے مجھے بھیجا ہے)۔

أَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَا اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِيْ جَنّٰتٍ

کیا (تم خیال کرتے ہو کہ) جو کچھ اس (دنیا) میں ہے تمہیں اسی میں امن کے ساتھ (زندگی بسر کرتے ہوئے) چھوڑ دیا جائیگا۔ یعنی

وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿۱۴۸﴾

باغات اور چشموں میں اور لہلہاتے کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کے پھل بوجھ کی وجہ سے ٹوٹے جا رہے ہوں

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

اور تم لوگ پہاڑ کھود کھود کر (اپنی بڑائی پر) اِتراتے ہوئے گھر بناتے ہو۔

ہتھکنڈوں سے واقف ہی نہیں وہ اس کی طرف سے کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ پس موجودہ اور آئندہ نسلوں کو شیطان کے حملوں سے بچانے کے لئے اسلام یہ نصیحت کرتا ہے کہ تم اپنے اندر بھی وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رکھو اور بیرونی دنیا کو بھی ہمیشہ خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے رہو تاکہ شیطان ذریتِ آدمؑ کو گمراہ کرنے سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جائے۔ بہرحال عاد کی قوم نے ہودؑ کی نصیحتوں پر کوئی کان نہ دھرا اور اس کو جھٹلا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ہلاک کر دیا۔

إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ۔ فرماتا ہے انہوں نے تو بڑے بڑے مکانات بنا کر اپنا نشان قائم کیا تھا مگر ہم نے انکی بستیاں مٹا کر ایک نشان قائم کر دیا۔ لیکن اس نشان کا ہود کی قوم کو کیا فائدہ پہنچا۔ وہ تباہ ہو گئی اور بعد میں آنے والوں کے لئے ایک عبرت کا نشان قائم کر گئی۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٥١﴾ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٥٢﴾

پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو - اور حد سے بڑھ جانے والے لوگوں کی باتوں کو مت مانو -

الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿١٥٣﴾

وہ لوگ جو ملک میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے ع ٢٦

٢٦ حل لغات: - طَلْعٌ : طَلْعٌ مِّنَ النَّخْلِ کے معنے ہیں شَيْءٌ يَخْرُجُ كَاَنَّهٗ نَعْلَانِ مُطْبَقَانِ - کھجور کا خوشہ جس کے اندر پھل پیدا ہوتا ہے (اقرب)

هَضِيْمٌ : دَاخِلٌ بَعْضُهَا فِيْ بَعْضٍ كَاَنَّمَا شُدِخَ - وہ خوشہ جس کا ایک حصہ دوسرے کے اندر داخل ہو (اقرب)

تَنْحِتُوْنَ : نَحَتَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور نَحَتَ الْحَجَرَ کے معنے ہیں سَوَّاهُ وَ اَصْلَحَهٗ - پتھر کو گھڑ کر ٹھیک کیا - اور نَحَتَ الْجَبَلَ کے معنے ہیں حَفَرَهٗ - پہاڑ کو کھودا (اقرب) پس تَنْحِتُوْنَ کے معنے ہونگے - تم کھودتے ہو -

فَارِهِيْنَ : فَارِهٌ سے جمع کا صیغہ ہے اور اَلْفَارِهُ کے معنے ہیں اَلْحَاذِقُ بِالشَّيْءِ - کسی کام کا ماہر (اقرب)

تفسیر: - فرماتا ہے - عاد کے بعد ثمود کی قوم آئی اور اُن میں صالحؑ نبی آیا - اُس نے بھی اپنی قوم کو تقویٰ کی نصیحت کی - اور بتایا کہ میں تم سے اس تعلیم کے بدلہ میں کچھ مانگتا نہیں - میری مزدوری میرا خدا دے گا - تم جن مادّی ترقیات پر خوش ہو وہ قائم نہیں رہیں گی - نہ یہ باغات رہیں گے - نہ چشمے - نہ کھیتیاں - نہ کھجوریں جن کے خوشے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں - تم لوگ بڑے فخر سے پہاڑ کھود کر مکان بناتے ہو مگر عزت حاصل کرنے کا یہ طریق نہیں - عزت حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو اور جو لوگ حد سے نکل جانے والے ہیں اُن کی فرمانبرداری مت کرو - اسی طرح وہ لوگ جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے اُن کے پیچھے مت رہو -

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود عاد کی قائم مقام تھی - چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (اعراف ع) یعنی اُس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں عاد کے بعد اُن کا قائم مقام بنایا - فتوح الشام کا مصنف ابو اسمٰعیل لکھتا ہے کہ ثمود کی قوم بصریٰ سے لے کر جو شام کا ایک شہر ہے عدن تک پھیلی ہوئی تھی اور وہیں اُن کی حکومت تھی - یونانی تاریخوں میں بھی ثمود کا ذکر آتا ہے اور انہوں نے اس کا ذکر مسیحؑ کے زمانہ کے قریب کیا ہے - حجر کو اس کا مرکزی مقام بتایا ہے جو اس قوم کا دار الحکومت معلوم ہوتا ہے - یہ مقام مدینہ منورہ اور تبوک کے درمیان تھا - اور اس علاقہ میں اس قوم کا بڑا زور تھا -

اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ - فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ - وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کا ملک چشموں اور باغات والا تھا - وہاں کھجوریں بھی اچھی قسم کی ہوتی تھیں اور زراعت بھی خوب ترقی پر تھی - اسی طرح وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس قوم کو سنگ تراشی میں کمال حاصل تھا - چنانچہ پرانے آثار سے بھی معلوم ہوتا ہے

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ

(لوگ جو کافر تھے) بولے۔ تجھ کو صرف کھانا دیا جاتا ہے۔ تو ہماری طرح کا ایک آدمی ہے پس اگر تو سچا ہے تو

بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ

کوئی نشان ظاہر کر۔ اُس نے کہا: یہ ایک اونٹنی ہے ایک دن اُس کے لئے گھاٹ پر پانی پینا مقرر ہے

وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۶﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ

اور ایک دن تمہارے لئے گھاٹ سے پانی لینا مقرر ہے۔ اور تم اس (اونٹنی) کو کوئی نقصان نہ پہنچانا ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب

عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۸﴾

تم کو آ پکڑے گا۔ (یہ سن کر بھی) انہوں نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور (پھر) شرمندہ ہو گئے۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ

تب اُن کو (موعود) عذاب نے آ پکڑا۔ اس میں یقیناً ایک بہت بڑا نشان تھا۔ لیکن اُن میں سے اکثر مومن نہ تھے

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ ع

شریک نہ ہوئے۔ اور تیرا رب یقیناً غالب (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ ۲۷

ع ۸ ۱۲

کہ یہ لوگ شہروں کے شہر پہاڑوں کی کھوہ میں بناتے چلے گئے تھے حتّٰی کہ بعض جگہ انہوں نے پتھر کاٹ کاٹ کر عجیب و غریب محل بنائے تھے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ اس کے سوا اُن کے اور کسی قسم کے مکان نہیں ہوتے تھے بلکہ اس سے اُنکی خاص عمارتوں کی طرف اشارہ ہے جس سے اُنکے تمدن کی ترقی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح پہاڑ کھود کھود کر اپنی رہائش کے لئے مکانات اور شہر بنانے میں اس طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم سال کا کچھ حصّہ پہاڑوں پر سیر و تفریح کے لئے بسر کرتی تھی مگر اس کے باوجود کسی کو ان کے ملک پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس قوم نے بھی حضرت صالحؑ کا انکار کیا اور اُن کی باتوں پر کان نہ دھرا۔ چنانچہ حضرت صالحؑ کے سمجھانے پر

اُس قوم نے جو جواب دیا اُس کا قرآن کریم اگلی آیات میں ذکر فرماتا ہے۔

عَقَرُوْهَا

۲۷ حل لغات: - عَقَرُوْهَا: عَقَرَهٗ کے معنے ہیں جَرَحَهٗ۔ اُس کو زخمی کر دیا۔ نَحَرَهٗ اُسکو ذبح کیا۔ اور جب اونٹ کے متعلق یہ لفظ استعمال کریں اور کہیں کہ عَقَرَ الْاِبِلَ تو معنے ہونگے قَطَعَ قَوَائِمَهَا بِالسَّيْفِ اُس کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں (اقرب) پس عَقَرُوْهَا کے معنے ہونگے انہوں نے اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔

تفسیر: - حضرت صالح علیہ السلام نے جب انہیں نصیحت کی تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اے صالحؑ ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تجھے کھانا دیا جا رہا ہے۔

یعنی ہمیں تباہ کرنے کے لئے کوئی غیر حکومت تجھے رشوت دے رہی ہے۔ ہر نبی کے وقت میں ایسا ہی ہؤا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی مخالف کہتے تھے کہ بعض اَور لوگ اس کی مدد کر رہے ہیں۔ اور بانیٔ سلسلۂ احمدیہ کے وقت میں بھی لوگ یہی کہتے تھے کہ انگریز ان کو روپیہ دے کر مسلمانوں کے خلاف کھڑا کر رہے ہیں۔

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا۔ آخر تجھے کیا لال لگے ہوئے ہیں تو ہمارے جیسا ایک آدمی ہی ہے نا۔ اگر ایسا نہیں اور تُو واقعہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو جو نشان تیرے پاس ہے وہ لے آ۔ حضرت صالح علیہ السلام نے جواب میں کہا کہ لو یہ میری اونٹنی ہے۔ جب تم اکٹھے ہوتے ہو تو فساد ہوتا ہے۔ اب تمہارے امتحان کے لئے یہ نشان مقرر کیا جاتا ہے کہ ایک دن یہ پانی پیئے گی اور ایک دن تم پانی پی لینا یعنی اپنے جانوروں کو پانی پلانا اور اپنے لئے بھی پانی لے لینا اور اس کو کوئی تکلیف نہ دینا اگر تم اس کے خلاف عمل کرو گے تو تم کو ایک بڑے دن کا عذاب پکڑ لے گا۔ انہوں نے اُس اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیئے۔ مگر بعد میں شرمندہ ہو گئے۔

لوگ اِن آیات سے اونٹنی کی خصوصیات نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض مفسرین نے تو عجیب و غریب قصے بھی بیان کر دیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگ حضرت صالح علیہ السلام کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ ہم تو تب مانیں گے جب فلاں پہاڑ سے اونٹنی پیدا کر دو۔ انہوں نے دعا کی تو پہاڑ میں سے اونٹنی نکل آئی اور پھر اُسی وقت اُس اونٹنی نے اپنے جیسا ایک بچہ بھی جن دیا (تفسیر جلالین جلد ۲ صفحہ ۱۶۲ و درمنثور جلد ۲ صفحہ ۹۸) مگر یہ سب لغو باتیں ہیں جن کا قرآن کریم سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کریم اس اونٹنی کی پیدائش کو نشان قرار نہیں دیتا بلکہ اُس کی آزادی کو نشان قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر کفار نے اس اونٹنی کو دکھ پہنچایا تو وہ عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ اونٹنی اپنی ذات میں کوئی اہمیت رکھتی تھی بلکہ اس لئے کہ حضرت صالحؑ اس اونٹنی پر چڑھ کر سارے ملک میں تبلیغ کیا کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں موٹریں نہیں تھے نہ ریل اور ہوائی جہاز وغیرہ ایجاد ہوئے تھے۔ سفر کا ذریعہ صرف اونٹنی تھی جس پر سوار ہو کر حضرت صالحؑ خدا تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ چونکہ مخالف اُن کی اس تبلیغی تگ و دَو کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے لازماً وہ آپ کے تبلیغی سفروں میں روک ڈالتے ہونگے اور آپ کو اِدھر اُدھر پھرنے نہیں دیتے ہونگے۔ جب اُن کی شوخیاں اور شرارتیں حد سے گزر گئیں تو اللہ تعالیٰ نے اس اونٹنی کو اُن کے لئے ایک نشان قرار دے دیا اور فرمایا کہ تم صالحؑ کی اونٹنی کو اِدھر اُدھر پھرنے دو اور اُس کی تبلیغی مساعی میں روک مت بنو۔ ورنہ خدا تعالیٰ کے عذاب کا مورد بن جاؤ گے انہوں نے اِس انذار کو بھی ایک مجنونانہ بڑ خیال کیا اور تمرّد اور سرکشی سے کام لیتے ہوئے اُس اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیئے جس کے معنے یہ تھے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو چیلنج کیا اور کہا کہ ہم اپنے ملک میں تیرے نام کو بلند کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ جب انہوں نے خدا کے لئے اپنے ملک کے دروازے بند کر دئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس ملک کے دروازے اُن کے لئے بند کر دیئے۔ اور اس نے انہیں اپنی قہری تلوار کا نشانہ بنا دیا۔ بیشک عذاب کو دیکھ کر آخر میں وہ شرمندہ بھی ہوئے۔ مگر اُس وقت شرمندگی کا کیا فائدہ تھا۔ فرماتا ہے اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اِس واقعہ میں بھی ایک بڑا بھاری نشان ہے جو آئندہ آنے والی نسلوں کو یہ سبق دیتا ہے کہ الٰہی جماعتوں کے تبلیغی راستہ میں روڑے اٹکانا اور خدا تعالیٰ کے

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٦١﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ

لوطؑ کی قوم نے بھی رسولوں کا انکار کیا جب کہ اُن کے بھائی لوطؑ نے کہا کہ

أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٦٢﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٦٣﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ

کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟ میں تمہاری طرف ایک امانت دار پیغامبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پس اللہ (تعالیٰ) کا تقویٰ اختیار کرو

وَأَطِيعُونِ ﴿١٦٤﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ

اور میری اطاعت کرو۔ اور میں اس (کام) کے بدلہ میں تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا۔ میرا بدلہ تو صرف

إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٥﴾ أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٦﴾

ربّ العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تمام مخلوقات میں سے تم نے نردوں کو اپنے لئے چُنا ہے۔

وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ

اور تم انکو چھوڑتے ہو جن کو تمہارے ربّ نے تمہاری بیویوں کی حیثیت سے پیدا کیا ہے (صرف یہی نہیں کہ تم ایسا فعل کرتے ہو)

بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ﴿١٦٧﴾

بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) تم (انسانی فطرت کے) تقاضوں کو ہر طرح توڑنے والی قوم ہو۔ ۲۸ ؎

نام بلند کرنے کی اجازت نہ دینا قوموں کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستحق بنا دیتا ہے۔ مگر یہ چیز تو بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے صرف درسِ عبرت کا کام دے رہی ہے۔ خود اس قوم کی اکثریت ایمان سے محروم رہی مگر یہ قوم بھی اپنی ہلاکت اور بربادی سے خدا تعالیٰ کے عزیز اور رحیم ہونے کو ثابت کر گئی۔ اُس نے چاہا تھا کہ صالحؑ مغلوب ہو مگر خدا اور اُس کا رسول ہی غالب آئے۔ اور پھر اُس نے چاہا تھا کہ صالحؑ کی تبلیغی مساعی رنگ نہ لائیں اور خدا اور اُس کے رسول کا نام دنیا میں نہ پھیلے مگر خدا تعالیٰ کی رحیمیت نے حضرت صالحؑ کی تبلیغی کوششوں میں برکت ڈالی اور اُن کے انفاسِ قدسیہ سے ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جس نے خدا تعالیٰ کے نُور کی قندیلیں اپنے سینوں میں روشن کیں اور بھولی بھٹکی دنیا کے لئے ہادی اور راہنما بن گئی۔

۲۸ ؎ **تفسیر**:- فرماتا ہے۔ لوطؑ کی قوم نے بھی رسولوں کا انکار کیا۔ اس جگہ بھی لوطؑ کے لئے مرسلین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ لوطؑ اپنے زمانہ میں باقی نبیوں کی طرح سب رسولوں کا قائم مقام تھا اور اس کا انکار درحقیقت سب نبیوں کا انکار تھا۔ لوطؑ نے بھی اپنی قوم سے کہا کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک رسول امین کی حیثیت میں تمہاری طرف آیا ہوں۔ تم اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری سُنو تاکہ تم نجات پاؤ۔ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ

انہوں نے کہا۔ اے لوطؑ! اگر تو باز نہ آیا تو تُو ملک بدر کئے جانے والوں

الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۹﴾

میں شامل ہو جائے گا۔ اُس (یعنی لوطؑ) نے کہا (بہر حال) میں تمہارے عمل کو نفرت سے دیکھتا ہوں۔

رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

اے میرے ربّ! مجھے اور میرے اہل کو ان کے اعمال سے نجات دے۔ ۲۹

اجر صرف ربّ العالمین خدا کے ذمہ ہے۔ مَیں تو اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں برائیوں سے بچنے کی نصیحت کردوں۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرف توجہ دلاؤں۔ تم میں یہ ایک بڑی خرابی پائی جاتی ہے کہ تم مردوں سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ نے تسکین جذبات اور باہمی مودّت و الفت کے قیام کے لئے جو مرد و عورت کے تعلقات کا سلسلہ قائم کیا ہے اُسکو پس پُشت ڈال رہے ہو۔ یہ چیز بتا رہی ہے کہ تم انسانی فطرت کے تقاضوں کو توڑنے والی قوم ہو۔

۲۹ حل لغات:۔ قَالِيْنَ: قَلٰی سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے اور قَلٰی فُلَانًا کے معنے ہیں اَبْغَضَهٗ وَكَرِهَهٗ غَايَةَ الْكَرَاهَةِ فَتَرَكَهٗ۔ کسی کو ناپسند کیا اور ناپسندیدگی کی بنا پر چھوڑ دیا (اقرب)

تفسیر:۔ انہوں نے لوطؑ کی نصیحتوں سے تنگ آکر اُسے دھمکی دی کہ اگر تُو باز نہ آیا تو ہم تجھے اپنے ملک سے نکال دینگے۔ لوطؑ نے کہا۔ بے شک نکال دو۔ مَیں تمہارے اعمال کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور خدا تعالیٰ سے دُعا کی کہ خدایا مجھ کو اور میرے خاندان کو اُن کے بُرے اعمال سے بچائیو۔

اِس آیت میں ایک تو یہ سبق دیا گیا ہے کہ عذاب ظاہری سے نجات مانگنی اتنی اہم نہیں جتنی کہ عملِ بد سے نجات مانگنی اہم ہے۔ اور دوسرا سبق یہ دیا گیا ہے کہ نفرت ہمیشہ بُرے اعمال سے رکھنی چاہیئے نہ کہ گمراہ اور خطاکار انسان کو بھی قابلِ نفرت سمجھنا چاہیئے۔ اصلاحِ اخلاق کے سلسلہ میں یہ ایک نہایت ہی اہم نکتہ ہے جس پر اسلام نے خصوصیّت سے زور دیا ہے اور بد اور بدی میں فرق کیا ہے۔ وہ یہ تو کہتا ہے کہ بُرائی کو دُور کرو مگر وہ یہ نہیں کہتا کہ بُرائی کو دُور کرنے کے ساتھ ہی بد کو مٹا ڈالو۔ بلکہ وہ اِن دونوں میں ایک حد قائم کرتا اور اُس کو محفوظ رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ ع ۲) کسی قوم کی دشمنی تمہاری آنکھوں پر ایسا پردہ نہ ڈال دے کہ تم اس کے متعلق ناانصافی اور ظلم پر اُتر آؤ۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اُس کے متعلق بھی عدل و انصاف کی حدود کا خیال رکھو ورنہ تقوٰی کے مقام سے تم اپنے آپ کو گرانے والے ہوگے۔ گویا اسلام دشمن کی قابلِ نفرت حرکات سے تو بیزاری کی تعلیم دیتا ہے مگر دشمن کی دشمنی رکھنے سے منع کرتا ہے۔ پھر فرماتا ہے لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ

قَالِيْنَ

فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِى الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾

پس ہم نے اُس کو اور اُس کے اہل کو سب ہی کو نجات دی ۔ سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں شامل ہو گئی

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ

پھر (لوطؑ کو نجات دینے کے بعد) سب دوسروں کو ہم نے ہلاک کر دیا ۔ اور ہم نے اُن پر (پتھروں کی) بارش برسائی ۔ اور جن کو (خدا کی طرف سے)

وَلَا تُقْسِطُوْۤا اِلَيْهِمْ (ممتحنہ ع ۲) وہ لوگ جو تمہارے دین کے مخالف تو ہیں مگر تمہیں اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنا کر تمہیں جبرًا اپنے دین سے منحرف کرنے کی کوشش نہیں کرتے ۔ نہ تمہیں اپنے وطن سے بے وطن کرتے ہیں اُن کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک کرنے اور اُن کے معاملات میں عدل و انصاف سے کام لینے سے اللہ تعالیٰ تمہیں ہرگز نہیں روکتا ۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اُن سے نیکی کرو ۔ اور اُن کے معاملات میں بھی انصاف کا پورا پورا خیال رکھو ۔ غرض اسلام بنی نوع انسان کو نصیحت کرتا ہے کہ اگر کسی فرد یا قوم کو تم تقوٰے و طہارت کے خلاف عمل کرتا دیکھو تو اُس کے فعل سے تو نفرت کرو مگر اُس فرد یا قوم کی خیر خواہی کا جذبہ اپنے دل سے کبھی مٹنے نہ دو ۔ کیونکہ اگر یہ جذبہ مٹ گیا تو تم اُن کی اصلاح سے بھی غافل ہو جاؤ گے ۔ حضرت لُوط علیہ السلام نے بھی اِسی اخلاقی کمال کا مظاہرہ کیا اور فرمایا کہ مَیں تمہاری اصلاح کے لئے تو رات دن کوشش کر رہا ہوں لیکن تمہارے گندے افعال سے مجھے شدید نفرت ہے ۔ اِس قدر نفرت کہ مَیں اللہ تعالیٰ سے بھی دُعا کرتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے بھی اور میرے تمام جسمانی اور روحانی اہل کو بھی ان برائیوں سے محفوظ رکھے مگر تعجب ہے کہ وہی لُوطؑ جن کے اخلاقی کمال کی قرآن کریم نے اس قدر تعریف کی ہے اور جن کے متعلق اُس نے دوسری جگہ یہ خبر دی ہے کہ اَدْخَلْنٰهُ فِىْ رَحْمَتِنَا

(انبیاء ع ۵) ہم نے اُسے اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دی ۔ اُس پر بائیبل یہ نہایت ہی گندہ اور ناپاک الزام لگاتی ہے کہ اُس نے اپنی لڑکیوں سے بدکاری کی ۔ اور پھر اُن لڑکیوں سے ناجائز بچے پیدا ہوئے (پیدائش باب ۱۹ آیت ۳۰ تا ۳۸) مگر پھر وہی بائیبل جو ایک طرف تو حضرت لُوطؑ اور اُن کی پاکدامن بیٹیوں پر بدکاری کا الزام لگاتی اور اُن کے بطن سے ناجائز بچوں کی ولادت کا اشتہار دیتی ہے دوسری طرف یہ بھی لکھتی ہے کہ اِس حرامکاری کے نتیجہ میں ایک بیٹا موآب پیدا ہوا جو موآبیوں کا باپ بنا ۔ اور دوسرا بیٹا بن عمی پیدا ہوا جو بنی عمون کا باپ بنا ۔ گویا ایک طرف تو وہ حضرت لوطؑ اور اُن کی بیٹیوں پر الزام لگاتی ہے اور دوسری طرف یہ کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان بچوں پر ایسا فضل کیا کہ وہ دو بڑے بڑے خاندانوں کے بانی قرار پائے اور خدا تعالیٰ نے اُن سے ایک لمبا سلسلۂ نسل جاری کر دیا ۔ اگر حضرت لوطؑ ایسے ہی اخلاق کے حامل ہوتے جس قسم کے اخلاق بائیبل اُن کی طرف منسوب کرتی ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اُن کی نسل کو ایسی ہی برکت دیتا جیسی بائیبل کے بیان کے مطابق نہیں دی گئی ۔ پس بائیبل کا اپنا بیان جو خدا تعالیٰ کی ایک فعلی شہادت پر مشتمل ہے اُس کے بیان کردہ الزام کو جھوٹا قرار دے رہا ہے ۔ اور پھر قرآن کریم جو ایک کتاب مبین کی شکل میں نازل ہوا تھا اُس نے کھلے لفظوں میں بتا دیا کہ لوطؑ ہمارے مقربین میں سے تھا

فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿١٧٣﴾ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۚ وَمَا

ہوشیار کر دیا جاتا ہے (لیکن پھر بھی باز نہیں آتے) اُن پر برسائی جانے والی بارش بہت بُری ہوتی ہے - اِس واقعہ میں یقیناً ایک بڑا نشان تھا

كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧٤﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ

لیکن ان (کفار) میں سے اکثر پھر بھی مومن نہ بنے - تیرا رب یقیناً وہ ہے جو

الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٧٥﴾ ع

غالب (اور) بار بار کرم کرنے والا ہے ۳۵

۹ ع ۱۳

اور وہ ان تمام گندے اور ناجائز افعال سے منزّہ تھا جن میں اس کی قوم گرفتار تھی - بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے بھی دُعائیں کرتا رہتا تھا کہ وہ اُس کی مدد کرے - اور اُسے اور اُس کے اہل کو ان برائیوں سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔

۳۵ حل لغات: عَجُوْزًا: اَلْعَجُوْزُ اَلْمَرْاَۃُ الْمُسِنَّۃُ لِعَجْزِھَا عَنْ اَکْثَرِ الْاُمُوْرِ - بڑھیا عورت - اور بڑھیا عورت کو عجوز کا نام دینے میں یہ حکمت ہے کہ اکثر امور سرانجام دینے سے وہ عاجز ہوتی ہے (اقرب)

غَابِرِيْنَ: غَبَرَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور غَبَرَ کے معنے ہیں - مَکَثَ وَ بَقِیَ - ٹھہر گیا اور رہ پڑا (اقرب) نیز اَلْغِبْرُ کے معنے ہیں اَلْحِقْدُ - کینہ (اقرب) پس غَابِرٌ کے معنے ہونگے - پیچھے رہنے والا اور کینہ رکھنے والا -

تفسیر: فرماتا ہے - اللہ تعالیٰ نے اُس کی دُعا کو سُنکر اُس کو اور اُس کے تمام خاندان کو تو بچا لیا مگر اُسکی بڑھیا بیوی عذاب کا شکار ہو گئی - کیونکہ وہ غابرین میں سے تھی - لُغت میں غِبْر کے ایک معنے اَلْحِقْدُ یعنی کینہ کے بھی لکھے ہیں (اقرب) پس غَابِرِيْن کا لفظ استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ حضرت لوطؑ کی بیوی اُن لوگوں میں سے تھی جو حضرت لوطؑ کی تعلیم سے کینہ اور بُغض رکھتے تھے - اور آپ کی مخالفت کے درپے رہتے تھے اِس لئے جب عذاب آیا تو وہ بھی اُنہی لوگوں کے ساتھ شامل کر دی گئی - بائیبل نے اِس مقام پر یہ بیان کیا ہے کہ حضرت لوطؑ کی بیوی بھی بچائے جانے والے لوگوں میں شامل تھی بلکہ لکھا ہے کہ فرشتوں نے اُس کا اور اُس کی جورو کا اور اُس کی دونوں بیٹیوں کا ہاتھ پکڑا کیونکہ خداوند کی مہربانی اُس پر ہوئی اور اُسے نکال کر شہر سے باہر پہنچا دیا - (پیدائش باب ۱۹ آیت ۱۶) مگر پھر بائیبل ہی بیان کرتی ہے کہ جاتی دفعہ اُس نے پیچھے پھر کے دیکھا اور وہ نمک کا کھمبا بن گئی - (پیدائش باب ۱۹ آیت ۲۶) اوّل تو جیتے جاگتے انسان کا محض پیچھے مڑ کر دیکھنے کی وجہ سے نمک کا کھمبا بن جانا ایک ایسا امر ہے جو بائیبل کے معتقدین کے نزدیک تو ممکن ہے قابلِ تسلیم ہو - مگر کوئی اور شخص اِس خوش اعتقادی کا قائل نہیں ہو سکتا - دوسرے جب اللہ تعالیٰ کا منشاء یہی تھا کہ اُن کی بیوی عذاب سے محفوظ رہے تو اُسے نمک کا کھمبا کیوں بنا دیا اِسی طرح جب خدا تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اُس عورت نے دس بیس قدم کے بعد پھر تباہ ہونا ہے تو اُسے پکڑ کر باہر نکالنے کے کیا معنے تھے ؟ بائیبل کے یہ متضاد بیانات بتا رہے ہیں کہ انسانی دست بُرد نے اُس کی روایات کو انتہائی مخدوش بنا دیا ہے - سچی بات وہی ہے

عَجُوْزًا

غَابِرِيْنَ

كَذَّبَ اَصۡحٰبُ لۡـَٔيۡكَةِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۱۷۷﴾ اِذۡ قَالَ لَهُمۡ

بَن کے رہنے والوں نے بھی رسولوں کا انکار کیا تھا ۔ جب کہ اُن سے

شُعَيۡبٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۸﴾ اِنِّىۡ لَكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ﴿۱۷۹﴾

شعیبؑ نے کہا کہ کیا تم تقویٰ نہیں کرتے ۔ مَیں تمہاری طرف ایک امانت دار پیغامبر کی حیثیت سے آیا ہوں

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ‌ ﴿۱۸۰﴾ وَمَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ‌

پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو ۔ اور میری اطاعت کرو ۔ اور مَیں اس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا ۔

اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۸۱﴾

میرا بدلہ صرف رب العالمین (خدا) کے ذمّہ ہے ۔ ۱۳۱ھ

جو قرآن کریم نے بیان کی کہ حضرت لوطؑ کی بیوی آپ کے مخالف گروہ سے تعلق رکھتی تھی اس لئے جب عذاب آیا تو وہ بھی اُس کی لپیٹ میں آ گئی ۔ چنانچہ فرماتا ہے ہم نے اُن پر پتھروں کی بارش برسائی (پتھروں کا ذکر سورۃ حجر ع ۵ میں کیا گیا ہے) یعنی ایک سخت زلزلہ آیا جس سے اُن کی زمین جو پتھریلی تھی پہلے نیچے سے اُٹھ کر اوپر آئی اور پھر اوپر سے نیچے گری ۔ اور بجائے پانی کے اُوپر سے پتھر برسے جس سے وہ تباہ ہو گئے ۔ شدید زلزلوں میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ اُن سے زمین کے ٹکڑے اُڑ کر پھر وہیں آ کر گرنے لگتے ہیں ۔ فرماتا ہے ۔ یہ بھی ایک نشان تھا مگر بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے ۔ وہ قوم تو پھر بھی ایمان نہ لائی ۔

بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی حاران کے بیٹے تھے اور اُور سے جو عراق کا ایک قصبہ تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہی ہجرت کر کے فلسطین کی طرف چلے آئے تھے ۔ اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے الگ ہو کر سدوم نامی ایک بستی میں رہنے لگے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا ذکر کر کے مکہ والوں کو توجہ دلائی کہ اگر تم بھی اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو لوطؑ کے دشمنوں جیسا سلوک تم سے بھی کیا جائیگا ۔ چنانچہ جس طرح لوطؑ کی قوم پر پتھر برسے اسی طرح بدر کی جنگ میں اُن پر پتھر پڑے یعنی ایک نشان کے طور پر آندھی چلی جس کے نتیجہ میں کنکر اُڑ اُڑ کر کفار کی آنکھوں میں گھس گئے اور وہ مقابلہ کی طاقت کھو بیٹھے جس کے نتیجہ میں اُنکے بڑے بڑے صنادید بدر کے میدان میں ہی ہلاک ہو گئے ۔ اور قریش کی عظمت اور اُن کے دبدبہ کا خاتمہ ہو گیا پھر معنوی طور پر بھی اُن سے یہی سلوک ہُوا ۔ چنانچہ جس طرح سدوم کی بستی کے اُوپر کے حصّہ کو نیچے کر دیا ۔ اسی طرح کفارِ مکّہ کی عزتیں خاک میں مل گئیں ۔ اُن کے بڑے بڑے خاندان تباہ ہو گئے اور وہی بچے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش میں پناہ گزیں ہوئے ۔

۱۳۱ھ تفسیر: ۔ قوم لوطؑ کے ذکر کے بعد اب اللہ تعالیٰ اصحاب الایکہ کا ذکر فرماتا ہے اور بتاتا ہے کہ اصحاب الایکہ نے بھی رسولوں کا انکار کیا تھا ۔ ایکہ کے معنے ایسے درخت کے ہوتے ہیں جس کی ٹہنیاں بہت

پھیلی ہوئی ہوں یا اُس جنگل کے ہوتے ہیں جس میں کثرت سے بیریاں اور پیلو کے درخت اُگے ہوئے ہوں۔ اور اَیْکَۃٌ اس کی جمع ہے۔ اسی طرح عربی زبان کا ایک یہ بھی محاورہ ہے کہ فُلَانٌ فَرْعٌ مِنْ اَیْکَۃِ الْمَجْدِ کہ فلاں شخص ایکۃ المجد کی ایک شاخ ہے۔ یعنی اَیْکَۃٌ اعلیٰ خاندان کے لوگوں کو بھی کہتے ہیں۔ پس اصحاب الایکہ کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس میں کسی ایسے علاقہ کا ذکر ہے جس جگہ کے لوگ اپنے آپ کو بڑا خاندانی سمجھتے تھے اور چونکہ اگلی آیت یعنی اِذْ قَالَ لَھُمْ شُعَیْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ میں حضرت شعیبؑ کا ذکر ہے اور حضرت شعیبؑ مدین کے رہنے والے تھے جو عربوں کا ایک شہر ہے اور عرب اپنے آپ کو عرانیوں سے زیادہ اچھی نسل کا سمجھتے تھے پس اس لئے اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ شعیبؑ کی قوم نے جو اپنے آپ کو بڑے خاندان میں سے سمجھتی تھی اپنے رسولوں کا انکار کیا۔ اسی طرح اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ شعیبؑ کی قوم نے جو ایک گھنے جنگل کی مالک تھی اپنے رسولوں کا انکار کیا۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے حضرت شعیبؑ کو مدین کا رسول قرار دیا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا (ھود ع) ہم نے مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدین کے باشندے ہی اصحاب الایکہ کہلاتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعہ میں مدین کے پاس کوئی ایسا جنگل تھا جس میں بیری اور پیلو کے درخت بکثرت پائے جاتے ہوں۔ سو اس بارہ میں ایک یونانی جغرافیہ نویس کے حوالہ سے مسٹر برٹن نے اپنی کتاب "گولڈ مائنز آف مدین" میں لکھا ہے کہ خلیج عقبہ کے پیچھے نباتات اور اشجار کے سوا کچھ نہیں ہوتا جو انسانی قد و قامت کے برابر ہوتے ہیں۔ اور جنگل کی وجہ سے ہرنوں کے گلّے جنگلی اونٹ اور بارہ سنگھے وہاں کثرت سے ملتے ہیں اسی طرح مویشی اور بھیڑوں کے گلّے بھی (ارض القرآن)

اس تاریخی شہادت سے ظاہر ہے کہ مدین کے پاس جو خلیج عقبہ کے سر پر واقع تھا ایک بڑا جنگل تھا جس میں قد آدم درخت تھے۔ اور پیلو اور جنگلی بیر قد آدم ہی ہوتے ہیں۔ وہاں جنگلی اونٹ رہتے تھے یہ بھی پیلو اور بیر کے درختوں کی موجودگی کا ثبوت ہے کیونکہ اونٹ اسی قسم کے درختوں پر گذارہ کرتے ہیں۔ مویشیوں اور بھیڑوں کے گلّوں کا ذکر بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ مدین کی قوم اسی جنگل میں اپنے جانور چرایا کرتی تھی۔ یہ قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کی اولاد تھی جو انکی بیوی قطورہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے (پیدائش باب ۲۵ آیت ۱تا۴) اور انہی کے نام پر مدین کہلائے اور پھر اسی نام پر انہوں نے ایک شہر بھی بسایا۔

قرآن کریم نے مدین قوم اور مدین شہر دونوں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ قوم کے معنوں میں تو فرماتا ہے وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا (ھود ع) یعنی مدین قوم کی طرف ہم نے انہی کے بھائی شعیبؑ کو مبعوث کیا۔ اور شہر کے معنوں میں سورۃ توبہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ اَصْحٰبِ مَدْیَنَ وَ الْمُؤْتَفِکٰتِ (توبہ ع) یعنی کیا انکو مدین شہر کے رہنے والوں اور اُن بستیوں کی تباہی کی خبر نہیں پہنچی جو عذاب سے اُلٹا دی گئی تھیں یعنی قوم لوطؑ کی بستیاں۔ حضرت شعیبؑ نے بھی اس قوم سے یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ میں تمہاری طرف خدا کے ایک رسول کی حیثیت سے آیا ہوں اور اپنے کام کے بدلہ میں تم سے کچھ مانگتا نہیں میرا بدلہ رب العالمین خدا مجھے دیگا۔

اس آیت میں اور پہلی کئی آیتوں میں گذر چکا ہے کہ جب ہر پہلے رسول نے کہا کہ میری اطاعت کرو تو ساتھ ہی [illegible]

الٰہی حکومت اور دنیوی حکومت میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ لوگ اطاعت کرواکے اجر لیا کرتے ہیں مگر ان آیات میں یہ مذکور ہے کہ میری اطاعت کرو۔ میں اس اطاعت کی وجہ سے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ پس معلوم ہوا کہ آسمان کی طرف سے جس اطاعت کا حکم آتا ہے وہ جبری اطاعت نہیں ہوتی بلکہ اطاعت کروانے والا درحقیقت بندوں کا خادم ہوتا ہے مگر چونکہ خادم ہمیشہ اجرت لیا کرتے ہیں اس لئے ہر رسول کے مُنہ سے یہ کہلوایا گیا کہ میری اطاعت ایسے رنگ میں ہوگی کہ میں تمہاری خدمت تو کرونگا لیکن تم سے کوئی اجر نہیں لونگا۔ گو بظاہر تو تم میرے مطیع نظر آؤگے لیکن حقیقتاً میں تمہارا خادم ہونگا۔ گو تمہاری اطاعت بھی نرالی ہوگی اور میری خدمت بھی نرالی ہوگی۔ تم بظاہر اطاعت کرتے ہوئے مجھ سے خدمت کرواؤگے۔ اور میں انتہا درجہ کی خدمت کرتے ہوئے بھی تم سے کوئی اجرت نہیں لونگا۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی بلند مقام عطا فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (الشوریٰ ع ۳) یعنی اے محمد رسول اللہؐ! تو لوگوں سے کہدے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اُس محبت اور پیار کے جو اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے کی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگ غلطی سے اس آیت کے یہ معنے کرتے ہیں کہ تم پر جو میرے احسانات ہیں اُن کے بدلہ میں میں ذاتی طور پر تم سے کسی چیز کا خواہشمند نہیں ہاں میں تم سے صرف اتنی خواہش کرتا ہوں کہ میرے رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنا۔ مگر یہ معنے درست نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ میں تم سے کوئی اور اجر نہیں مانگتا ہاں یہ اجر ضرور مانگتا ہوں کہ میرے رشتہ داروں کا خیال رکھنا حالانکہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں وضاحتاً کہا گیا ہے کہ میں تم سے کوئی ایسا اجر نہیں مانگتا جس کا دنیا کے ساتھ کوئی تعلق ہو۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لاؤ۔ بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ سبا ع ۶ میں یہاں تک فرماتا ہے کہ قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ۔ یعنی اگر تمہارے خیال میں میں نے کوئی اجر تم سے مانگا ہے تو وہ ہرگز نہ دینا اُسے اپنے ہی گھر رکھو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کہنا کہ مجھ پر ایمان لاؤ اور میرے احکام کی اطاعت کرو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذاتی فائدہ ہو۔ ایمان اور اطاعت تو بہرحال لوگوں کے اپنے فائدہ کی چیز ہے۔ پس اسجگہ جو اجر کا لفظ آیا ہے اور جس کے طلب کرنے کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد ایسا ہی اجر ہو سکتا ہے جس کا جسمانی طور پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یا آپ کے خاندان کو فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ اور جہاں تک ایسے اجر کا تعلق ہے جس کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جسمانی طور پر فائدہ پہنچ سکتا۔ اس کی نفی دوسری آیت میں جو اسی مفہوم میں آئی ہے موجود ہے۔

پس جب ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری جگہ بغیر کسی استثنیٰ کے کہہ دیا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور ساتھ ہی دوسرے انبیاء نے بھی یہی کہا ہے کہ ہم کوئی اجر نہیں مانگتے تو اب اس آیت میں اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کے کوئی ایسے معنے کئے جائیں جن کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے تعلق ہو تو یہ اوّل تو دوسری آیت کے خلاف ہوگا۔ دوسرے اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انبیاء سابقین پر فضیلت ثابت ہونے کی بجائے نقص ثابت ہوگا۔ کیونکہ یہی آیت اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء کے منہ سے بھی نکلوائی ہے مگر وہاں یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے بغیر کسی اجر کی تمنا کے خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے بنی نوع انسان کی خدمت کی۔ اُن سے کسی معاوضہ کا تقاضا نہیں کیا۔ نہ اپنے لئے

نہ اپنے رشتہ داروں کے لئے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ آپؐ نے نعوذ باللہ گو یہ تو کہا
کہ مَیں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا مگر پہلے انبیاء کے طریق
کے خلاف اتنا ضرور کہا کہ میرے رشتہ داروں کا خیال
رکھنا اور اُن سے محبت کیا کرنا۔ پس یہ بات ایسی ہے
جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کرنے والی اور آپؐ
کے درجہ کو گھٹانے والی ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اِلَّا
استثنیٰ ہے اور استثنیٰ جو نفی کے بعد آئے اُس کے معنے
یہ ہوتے ہیں کہ پہلے جملہ میں جس چیز کی نفی کی گئی تھی اُس
کے حکم سے بعد میں آنے والی شئے باہر ہے۔ مثلاً اگر کوئی
شخص کہے کہ میرے پاس پانچ پانچ روپے کے نوٹوں کے
سوا اور کوئی نوٹ نہیں۔ تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ
اُس نے جو نوٹوں کی نفی کی تھی اُس میں سے پانچ پانچ روپے
کے نوٹوں پر وہ نفی اثر انداز نہیں۔ اِن معنوں کے رُو سے
اَلْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی کے معنے رشتہ داروں کی محبت
کے کئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ مَیں تم سے کوئی اجر نہیں
چاہتا مگر رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرنے کا اجر چاہتا
ہوں اور اس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے درجہ کی
سخت تنقیص ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (۱) اَلْمَوَدَّۃَ
کے معنے جسمانی رنگ میں نیک سلوک کے کئے جائیں تو اسکے
یہ معنے ہونگے کہ اے لوگو! مَیں تم سے جسمانی طور پر نیک سلوک
کی اُمید نہیں رکھتا مگر میرے رشتہ داروں سے جسمانی طور پر نیک
سلوک کرتے رہنا اور (۲) اگر مودۃ کے معنے روحانی تعلق
کے کئے جائیں تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ اے لوگو! مَیں
تم سے یہ نہیں چاہتا کہ مجھ سے روحانی تعلق رکھو صرف یہ
چاہتا ہوں کہ میرے رشتہ داروں سے روحانی تعلق رکھنا۔
ظاہر ہے کہ یہ دونوں معنے غلط ہیں۔ جسمانی سلوک کے معنے
کرکے یہ مراد لینا کہ میرے رشتہ داروں سے جسمانی طور پر
نیک سلوک کرنا تو اس لئے غلط ہے کہ اس میں رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سوال کی نسبت ہوتی ہے اور دوسرے
انبیاء سے بھی آپؐ کا درجہ گر جاتا ہے۔ اور روحانی تعلق
کے معنے کرنے سے تو یہ معنے بالکل کفر کے ہو جاتے ہیں۔
کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ مجھ سے روحانی
تعلق نہ رکھو حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے
روحانی تعلق پیدا کرکے ہی ایمان حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ
اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ جب تک
یہ لوگ اپنی بیویوں اور اپنے بچوں اور اپنے بھائیوں اور
اپنے عزیزوں سے زیادہ مجھ سے پیار نہیں کرتے اُس وقت
تک یہ مومن نہیں کہلا سکتے[۵]۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
تو فرماتے ہیں کہ مجھ سے مودت کرنی ضروری ہے اور ایسی
ضروری ہے کہ تمہیں میری خاطر اگر اپنے ماں باپ کو چھوڑنا
پڑے۔ اپنی بیویوں کو چھوڑنا پڑے۔ اپنے بچوں کو چھوڑنا پڑے
اپنے بھائیوں کو چھوڑنا پڑے۔ اپنے دوستوں کو چھوڑنا پڑے
تو ان سب کو چھوڑ دو۔ پس اس محبت کا نہ صرف وجود ثابت
ہے بلکہ قرآن کریم کی دوسری آیات سے اس قسم کی مودت کا
حکم ثابت ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ اگر تم رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم سے اس قسم کی محبت نہیں رکھو گے جو دوسری تمام
محبتوں پر غالب ہو تو اُس وقت تک تم ایماندار نہیں کہلا
سکتے۔ پس یہ دونوں معنے باطل ہیں۔

اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ اِلَّا
الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی کے الفاظ کو بھی رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم پر ہی چسپاں کیا جائے اور اس آیت کے معنے یہ
کئے جائیں کہ مَیں تم سے کوئی دنیوی اجر نہیں مانگتا ہاں تم سے
ایک مطالبہ ضرور کرتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ تم میرے ساتھ
روحانی تعلق پیدا کرو اور اس تعلق میں ایسے اعلیٰ درجہ کے
ثابت قدم نکلو کہ اس کی نظیر کسی دنیوی رشتے میں نہ مل سکے

---

[۵] سورۃ توبہ آیت ۲۴۔

اور یہ معنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے بالکل شایاں ہیں۔ پس قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کے یہ معنے ہوئے کہ میں تم سے ایسے ہی تعلقات محبت کا تقاضا کرتا ہوں جیسے اعلیٰ درجہ کے قریب سے قریب رشتہ داروں کا آپس میں ہوتا ہے۔ گویا وہ مودّت جو قریبی رشتہ داروں میں ہوتی ہے میں تم سے ایسی مودّت کا اپنے متعلق تقاضا کرتا ہوں۔ یہ وہی مضمون ہے جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (نحل آیت ۹۱) فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں عدل اور احسان اور ایتاء ذی القربیٰ کا حکم دیتا ہے۔ ایتاء ذی القربیٰ سے اسجگہ یہی مراد ہے کہ تمہارا نیکیوں کی طرف ایسا طبعی میلان ہو جائے کہ تمہیں نیکی کا کام کرتے وقت یہ خیال ہی پیدا نہ ہو کہ تمہیں اس کے بدلہ میں کچھ ملے گا یا نہیں۔ گویا تمہیں وہ مقام حاصل ہو جائے جو تمام دنیوی خیالات اور نتائج اور ثمرات کو نظر انداز کر دینے والا ہو۔ پس اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کے معنے یہ ہوئے کہ میں تم سے وہ محبت چاہتا ہوں جو ایک ماں اور بچہ کے درمیان ہوتی ہے۔ ماں اپنے بچہ سے حسن سلوک کرتے وقت یہ خیال نہیں کرتی کہ اس کے بدلہ میں مجھے کچھ ملیگا یا نہیں بلکہ وہ ایک فطری لگاؤ کے ماتحت اس سے پیار اور محبت رکھتی ہے۔ یہی حال بچّے کا ہوتا ہے۔ ماں کی محبت اُس کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی ہوتی ہے اور وہ اُس سے ایک والہانہ تعلق رکھتا ہے یہی امر اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ تم مجھ سے ایسی ہی محبت کرو جیسے ایک بچّہ اپنی ماں سے کرتا ہے۔ بلکہ دوسری آیت میں مومنوں سے اس سے بھی بڑھ کر مطالبہ کیا گیا ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ تمہیں اللہ تعالےٰ کے انبیاء سے اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ محبت ہونی چاہیئے پس یہ کم سے کم مطالبہ ہے جو مومنوں سے کیا گیا ہے۔ اور اگر اس حد تک بھی کسی شخص کے دل میں محبت نہ پائی جائے تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنے دعویٰ ایمان میں جھوٹا ہے۔ پس لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کے اصل معنے یہ ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ ہاں تمہاری اصلاح اور تمہاری ترقی کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ ویسی ہی محبت ہو جیسے ذی القربیٰ میں ہوتی ہے یعنی تمہیں یہ احساس ہی نہ رہے کہ اس کے بدلہ میں تمہیں ملیگا کیا؟ بدلے اور اجر کا خیال تمہارے دل سے بالکل مٹ جائے۔

مفسّرین نے اسجگہ قربیٰ کے معنے یہ کئے ہیں کہ وہ رستہ جس سے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کی تشریح انہوں نے یہ کی ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے اندر خدا تعالےٰ کے قرب کی محبت پیدا ہو جائے۔ مگر اس میں مشکل یہ ہے کہ قربیٰ کے معنے لغت میں قرابتِ رحمی کے ہی ہوتے ہیں۔ قُرب کے معنے نہیں ہوتے۔ لغت والے اَلْقُرْبَةُ۔ اَلْقُرْبُ اور اَلْقُرْبٰی میں فرق کرتے ہیں۔ گویا یہ لفظ ۃ کے ساتھ ی کے ساتھ اور بغیر ۃ اور ی کے آتا ہے۔ قُرب کے معنے قُربِ مکانی کے ہوتے ہیں لیکن جب قرب مکانی نہ ہو بلکہ درجہ کا قرب مراد ہو تو اس کے لئے عربی زبان میں قُرْبَةٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور جب نہ مکانی قرب مراد ہو اور نہ درجہ کا قرب مراد ہو بلکہ رحمی تعلقات کے لحاظ سے کسی کا قرب مراد ہو تو اس کے لئے قُرْبٰی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اقرب الموارد میں لکھا ہے۔ قِیْلَ اَلْقُرْبُ فِی الْمَکَانِ وَالْقُرْبٰی فِی الرَّحِمِ وَالْقُرْبَةُ فِی الْمَنْزِلَةِ۔ پس چونکہ لغت اس میں فرق کرتی ہے ہمیں قُربٰی کے وہی معنے کرنے پڑیں گے جو لغت کے بھی مطابق ہوں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی کوئی اعتراض پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں اور وہ معنے یہی ہیں

کہ میں تم سے ایسی محبت کا تقاضا کرتا ہوں جو ذی القربٰی سے کی جاتی ہے۔ یعنی وہ تعلق جو ماں کا اپنے بچے سے ہوتا ہے یا بچہ کا اپنی ماں سے ہوتا ہے۔ یا باپ کا اپنے بیٹے سے ہوتا ہے یا بیٹے کا اپنے باپ سے ہوتا ہے تم ویسا ہی تعلق میرے ساتھ پیدا کرو۔ اِس تعلق میں کوئی مادی خواہش نہیں ہوتی بلکہ فطری لگاؤ کے ساتھ ایک دوسرے سے محبت کی جاتی ہے۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ چونکہ میں معلم ہوں اور میرا کام یہ ہے کہ تمہیں دینی تعلیم سکھاؤں اس لئے ضروری ہے کہ طبعی طور پر تمہارے اندر یہ احساس پایا جائے کہ تمہیں میرے پیچھے چلنا چاہیئے۔ پس تم ایسی ہی محبت کرو جیسے بچہ اپنی ماں سے کرتا ہے تاکہ تمہیں سوچ سوچکر میرے احکام کی اطاعت نہ کرنی پڑے بلکہ آپ ہی آپ میرے احکام کے پیچھے چل پڑو۔ گویا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کے معنے یہ ہوئے کہ تم میرے ساتھ ویسی ہی محبت کرو جیسی بیٹا اپنے باپ سے یا بچہ اپنی ماں سے کرتا ہے اور یہاں تک وہ اپنے ماں باپ کی نقل کرتا ہے کہ اگر ہم غور کریں تو انسانی خد و خال اور حرکات میں بھی بیٹوں اور باپوں اور ماؤں اور لڑکیوں میں اتنی مشابہت پائی جاتی ہے کہ دیکھ کر حیرت آتی ہے۔ بعض دفعہ باپ کو اپنا ہاتھ کسی خاص طرز پر ہلانے کی عادت ہوتی ہے تو بیٹا بھی اُسی طرز پر اپنا ہاتھ ہلانے لگ جاتا ہے یا ماں کو عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی آنکھ کو کسی خاص طریق پر حرکت دے تو اُس کی بیٹی بھی اُسی طریق پر آنکھ کو حرکت دینے لگ جاتی ہے۔ یا اگر کسی شخص کو خاص طور پر لوچ اور لچک کے ساتھ بات کرنے کی عادت ہو تو بچے بھی اسی طرح لوچ اور لچک کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔ یا باپ کے اندر اگر لُکنت پائی جاتی ہو تو عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ بچوں میں بھی لکنت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو بچوں میں نقل کا ایسا مادہ پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو جس طرح کوئی کام کرتے دیکھتے ہیں اُسی طرح خود بھی کرنے لگ جاتے ہیں۔ پس اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی میں اِس امر کی طرف اشارہ ہے کہ تم میرے ساتھ صرف ذہنی تعلق نہ رکھو صرف جذباتی تعلق نہ رکھو بلکہ ایسا تعلق رکھو جیسے بچہ کا اپنے ماں باپ سے ہوتا ہے۔ جس طرح وہ اپنے ماں باپ کی خود بخود نقل کرنے لگ جاتا ہے اسی طرح اگر تم مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہو تو میرے ساتھ صرف فکری تعلق نہ رکھو بلکہ ایسا تعلق رکھو کہ تم اپنے افکار اور اپنے خیالات اور اپنے اعمال میں خود بخود میری نقل کرنے لگ جاؤ جیسے بچہ اپنے ماں باپ کی نقل کرتا ہے۔ یہ چیز ایسی ہے جو واقعہ میں قابلِ تسلیم ہے کیونکہ آخر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی شخص فائدہ اٹھائیگا جو ہر کام میں طبعی طور پر آپکی نقل کرے گا۔ اگر یہ مادہ اس کے اندر نہیں ہوگا تو وہ آپؐ سے فائدہ کیا اُٹھائیگا۔

اِن معنوں سے آپؐ کی انبیائے سابقین پر فضیلت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور وہ اعتراض بھی دفع نہیں ہوتا جو بعض لوگوں کے معنے تسلیم کرنے سے آپؐ پر عائد ہوتا ہے۔ اس آیت کے غلطی سے جو معنے کئے جاتے ہیں وہ دوسرے نبیوں کے مقابلہ میں آپؐ کی تنقیص کرنے والے ہیں کیونکہ باقی نبی تو اپنی اُمتوں سے یہی کہتے رہے کہ ہم تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے مگر اُن کے نزدیک محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آکر یہ کہدیا کہ بیشک تم مجھے کوئی اجر نہ دو مگر دیکھنا میرے بچوں اور میرے رشتہ داروں کا خیال رکھ لینا۔ لیکن یہ معنے جو میں نے کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی زیادہ مکمل ہے۔ کیونکہ پہلے انبیاء نے صرف یہی کہا کہ ہم تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں تم سے ایک اجر مانگتا ہوں۔ مگر وہ اجر بھی ایسا ہے جس کا

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

(اے لوگو!) پیمانہ پورا (بھر کر) دیا کرو۔ اور (دوسروں کو) نقصان پہنچانے والے مت بنو۔

تمہاری ذات کو ہی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور وہ یہ کہ تم مجھ سے ایسا تعلق رکھو جیسے بچہ اپنی ماں سے رکھتا ہے تاکہ تم رات اور دن میرے اعمال کی نقل کرتے رہو جو کچھ میں کہوں اُس کی تم نقل کرو۔ اور جو کچھ میں کروں اُس کی تم نقل کرو جس طرح ماں باپ ہندوستانی لباس پہنتے ہیں تو بچہ بھی ہندوستانی لباس پہننے لگ جاتا ہے۔ ماں باپ جو زبان بولتے ہیں وہی زبان بچہ بھی بولنے لگ جاتا ہے۔ ماں باپ جو حرکات کرتے ہیں وہی حرکات بچہ بھی کرنے لگ جاتا ہے اسی طرح تم میری طرف دیکھو اور میری کامل طور پر اتباع کرو۔ تاکہ جو تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری ہدایت کے لئے مجھے ملی ہے وہ تمہاری رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں سرایت کر جائے۔ یہ معنے ایسے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلے انبیاء پر فضیلت اور برتری ثابت کرنے والے ہیں۔ پہلے انبیاء نے اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى نہیں کہا۔ اِس لحاظ سے اُن کی تعلیم یقیناً اس درجہ کی نہیں تھی جس درجہ کی تعلیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی یہ معنے جو میں نے اس آیت کے کئے ہیں ان کی تصدیق اِسی آیت کا اگلا حصہ بھی کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا۔ جو شخص نیکی کا کوئی کام کرتا ہے ہم اُس کی نیکی کو اس کیلئے اور زیادہ حسین بنا دیتے ہیں۔ اب اگر اس آیت کے معنے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں سے تعلقاتِ محبت رکھنا ہوتا تو مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا کے ذکر کا موقع ہی کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو شخص نیکیوں میں حصہ لیتا ہے ہم اُس کے حسن کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اب اس بات کا بھلا اس سے کیا تعلق ہو

سکتا ہے کہ میرے رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنا لیکن میں نے جو معنے کئے ہیں اُن کے لحاظ سے یہ آیت بالکل صاف ہے۔ میں نے یہ معنے کئے ہیں کہ تمہارا میرے ساتھ بچوں والا تعلق ہونا چاہیئے جس طرح بچہ بغیر فکر اور بغیر دلیل کے اپنے ماں باپ کی نقل کرتا ہے۔ اسی طرح تمہارا فرض ہے کہ تم میری نقل کرو۔ اِسپر سوال پیدا ہوتا تھا کہ بچہ تو عقل کے بغیر نقل کرتا ہے پس اگر ہم بھی بچوں کی طرح آپؐ کی نقل کرتے ہیں اور خود غور اور فکر سے کام نہیں لیتے تو یہ ایک ادنیٰ مقام ہے۔ انسان کو تو جو بات ماننی چاہیئے وہ علیٰ وجہ البصیرت ماننی چاہیئے نہ کہ اندھا دھند۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ پہلا درجہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا یہی ہوگا کہ تم اُن کی ویسی ہی نقل کرو جیسے بچہ ماں باپ کی نقل کرتا ہے مگر مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا جو شخص آپؐ کی نقل کرے گا۔ اعمال میں آپؐ کی نقل کرے گا جذبات میں آپؐ کی نقل کریگا اقوال میں آپؐ کی نقل کرے گا معاملات میں آپؐ کی نقل کریگا اور اس طرح نیکیاں اپنے اندر پیدا کرتا چلا جائیگا تو گو یہ اوپر کے مقام کی نسبت سے ایک ادنیٰ مقام ہوگا مگر جُوں جُوں اُسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ یقین پیدا ہوتا چلا جائیگا کہ آپؐ خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں اور وہ آپ کی کامل متابعت کرتا رہے گا تو نَزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ہم اُسے رفتہ رفتہ ایک ایسے مقام پر پہنچا دیں گے کہ اُسے اعمال کے متعلق ایک کامل بصیرت حاصل ہو جائیگی۔ گویا ہم اُسے پہلے درجہ پر ہی نہیں رہنے دیں گے بلکہ براہ راست اس کے دل پر نورِ نبوت نازل کرکے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت اور آپؐ کی

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۳﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ

اور سیدھی ڈنڈی سے تولا کرو ۔ اور لوگوں کو اُن کی چیزیں (اُن کے حق سے)

اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۴﴾

کم نہ دیا کرو ۔ اور ملک میں ہرگز فساد نہ کیا کرو ۔ ۳۲ـہ

کامل فرمانبرداری کے طفیل اسے بصیرت بھی عطا کر دینگے ۔

پس نَزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا جو اس آیت کا اگلا حصہ ہے یہ بھی بتا رہا ہے کہ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى سے مراد دنیوی سلوک نہیں ورنہ نَزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا کے کوئی معنے ہی نہیں بنتے ۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلے انبیاء بھی اپنی اپنی جگہوں پر لوگوں سے یہی کہتے ہونگے کہ ہم تمہارے باپ ہیں ۔ جیسا کہ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ ہر نبی مومنوں کا باپ ہوتا ہے اور وہ اُن کو اِس امر کی طرف توجہ دلاتے ہوں گے کہ جیسے بچے اپنے ماں باپ کی اطاعت کرتے ہیں اسی طرح تمہارا فرض ہے کہ ہماری اطاعت کرو لیکن جب انہوں نے یہ کہا کہ ہم تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے تو اس وقت انہوں نے اس کے ساتھ یہ دوسرا فقرہ نہیں کہا جو قلوب میں ایک گدگدی پیدا کر دیتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے تو اس کے لئے سامان میں پیدا کر دیتا ہے ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے جو کام لیا وہ کسی اور نبی سے نہیں لیا ۔ اسی لئے آپؐ پر جو کلام نازل ہُوا وہ بھی ایسا مکمل ہے کہ اس کی آیات کو پڑھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز ہمارے دل کو پکڑ رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ یہ بھی لے لو اور وہ بھی لے لو ۔

۳۲ـہ **حل لغات** :۔ اَلْقِسْطَاسُ : اَلْمِيْزَانُ یعنی قسطاس کے معنے ترازو کے ہیں ۔ وَ اَقْوَمُ الْمِيْزَانِ ۔ اور خاص طور پر اُس ترازو کے جو بالکل صحیح تول دیتا ہو (اقرب)

تفسیر :۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم دوسروں کو پیمانہ پورا بھر کر دیا کرو ۔ اور لوگوں کو نقصان پہنچانے والے مت بنو ۔ اور ترازو کی ڈنڈی بھی سیدھی رکھا کرو ۔ اور انہیں جائز حق سے کم مت دیا کرو ۔ اور ملک میں فتنہ و فساد سے کلی طور پر مجتنب رہو ۔

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم میں شرک کے علاوہ تجارتی بد دیانتی کا بھی بڑا زور تھا ۔ چونکہ اُن لوگوں کا گزارہ زیادہ تر تجارت پر تھا اسلئے وہ دھوکا اور فریب کا م لینے لگ گئے ۔ وہ اوّل تو وزن میں کمی کر دیتے تھے جس کے لئے ممکن ہے انہوں نے مختلف قسم کے باٹ رکھے ہوئے ہوں ۔ اشیاء لیتے وقت اور قسم کے بٹے استعمال کرتے ہوں اور دیتے وقت اور قسم کے بٹوں سے وزن کرتے ہوں ۔ پھر وہ ڈنڈی مارنے میں بھی مہارت رکھتے تھے ۔ اور ماپ اور تول دونوں میں لوگوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے تھے ۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں تجارتی بد دیانتی سے باز رکھنے کی کوشش کی ۔ مگر وہ لوگ جنہیں حرام مال کھانے کی چاٹ لگ گئی تھی اس سے کب باز آنے والے تھے انہوں نے اور بھی اپنے ہاتھ رنگنے شروع کر دیئے اور آخر وہ وقت آیا جب

اُن کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور آسمان سے عذاب کے فرشتے اُنکی تباہی کے لئے نازل ہوگئے۔

افسوس ہے کہ یہ مرض اِس زمانہ میں بھی بڑے زوروں پر ہے اور دیانت ہمارے ملک سے اس حد تک اُٹھ چکی ہے کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ دوسرے کو جس حد تک ممکن ہو لوٹے اور نقصان پہنچائے۔ گاہک چاہتے ہیں کہ دوکاندار کم قیمت وصول کریں اور دوکاندار اس کا علاج یہ سوچتے ہیں کہ وہ ناقص اور گندی چیزیں کم قیمت پر گاہکوں کو دے دیتے ہیں میں تو سودا لینے نہیں جاتا لیکن چونکہ سودے ہمارے گھروں میں آتے رہتے ہیں اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ سودوں میں بالعموم دیانت سے کام نہیں لیا جاتا۔ آٹے میں مٹی ملی ہوئی ہوتی ہے اور کھانڈ اور شکر میں بھی بہت کچھ میل اور گند ہوتا ہے یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو فوراً نظر آجاتی ہیں چنانچہ کھانڈ کے ہر چمچہ میں انسان اگر آنکھیں کھول کر دیکھے تو اُسے بہت سی مٹی ملی ہوئی دکھائی دیگی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وزن زیادہ کرنے کے لئے مٹی ملائی جاتی ہے۔ اِسی طرح آٹے میں ریت اور مٹی ہوتی ہے۔ دانت کے نیچے آٹے کو ذرا چبا کر دیکھو تو فوراً اس سے کِرکِر کی آواز آنے لگیگی۔ عام طور پر ہمارے ملک میں لوگ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے حالانکہ اگر وہ لقمہ چبا چبا کر کھانے کی عادت رکھتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ آٹا نہیں کھاتے بلکہ گند کھا رہے ہیں نوّے فی صدی آٹا ایسا ہوتا ہے جس میں کِرک ہوتی ہے۔ ذرا اُسے دانتوں کے نیچے دباؤ تو کِرکِر کی آواز آنے لگ جائیگی اور یہ صحت کے لئے سخت مضر ہوتا ہے۔ پھر یہ دھوکا بازی بھی ہے کہ دوکاندار قیمت خالص آٹا کی وصول کرتے ہیں اور آٹا وہ دیتے ہیں جس میں ریت اور مٹی ملی ہوئی ہوتی ہے۔ بددیانتی صرف اس چیز کا نام نہیں کہ تم کسی کا ناحق روپیہ لے لیتے ہو بلکہ بددیانتی اس بات کا بھی نام ہے کہ تم کسی کی کوڑی اُٹھا لیتے ہو۔ اِسی طرح بددیانتی صرف اس کا نام نہیں کہ تم ۹۵ فیصدی آٹا اور ۵ فیصدی مٹی ملا کر دو بلکہ اگر تم ۹۸ فیصدی آٹا اور ۲ فیصدی مٹی ملاتے ہو۔ یا ننانوے فیصدی آٹا اور ۱ فیصدی مٹی ملاتے ہو یا ساڑھے ننانوے فیصدی آٹا اور نصف فیصدی مٹی ملاتے ہو بلکہ اگر تم ۹۹۹ حصہ آٹا اور ۱/۱۰۰۰ حصہ مٹی ملاتے ہو تو وہ بھی ویسی ہی بددیانتی اور گندی عادت ہے جیسے ۵ فیصدی مٹی ملانا۔ نیکی اور بدی دل سے تعلق رکھتی ہے۔ جس طرح اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کی راہ میں اخلاص سے ایک پیسہ دیتا ہے اور وہ یہ اُمید رکھتا ہے کہ اس کا ایک پیسہ امیر آدمی کے ایک لاکھ روپیہ سے کم نہ سمجھا جائے اور وہ اخلاص سے ایک پیسہ دے کر سمجھتا ہے کہ اُس نے ایک لاکھ روپیہ دینے والے جیسی قربانی کی ہے تو اسی طرح اگر کوئی شخص ۵ فیصدی ٹھگی کرتا ہے تو وہ بھی ٹھگ ہے اور جو ۱/۱۰۰۰ حصہ کی ٹھگی کرتا ہے وہ بھی ویسا ہی ٹھگ ہے۔ جس طرح نیکی کی جزا نیّت پر ہے اسی طرح بدی کی سزا بھی نیّت پر ہے۔ جس طرح اللہ تعالےٰ یہ نہیں دیکھتا کہ اُس کی راہ میں ایک غریب نے اخلاص سے ایک پیسہ دیا اور دوسرے امیر نے ایک لاکھ روپیہ دیا۔ بلکہ وہ اخلاص دیکھتا ہے اور اس کے مطابق جزا دیتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ یہ نہیں دیکھے گا کہ ایک نے ۵ فیصدی ٹھگی کی ہے اور دوسرے نے آدھ فیصدی بلکہ وہ کہیگا کہ دونوں نے ٹھگی کی ہے۔ ۵ فیصدی ٹھگی کرنے والے نے بھی ٹھگی کی ہے اور ۱/۱۰۰۰ حصہ ٹھگی کرنے والے نے بھی ٹھگی کی ہے تقدس اور نجاست کا دل سے تعلق ہوتا ہے اور جس طرح زیادہ نیکی بھی نیکی اور تھوڑی نیکی بھی نیکی سمجھی جاتی ہے اسی طرح زیادہ بدی بھی بدی اور تھوڑی بدی بھی بدی سمجھی جاتی ہے۔ ممکن ہے کسی جگہ دوکاندار خود اس قسم کی حرکات نہ کرتے ہوں اور باہر سے بے احتیاطی سے اس قسم کا ناقص مال لے آتے ہوں۔ لیکن اس صورت میں بھی وہ بری نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر کوئی شخص جاتا ہے اور

خراس والے سے گندا آٹا لے آتا ہے تو یہ اُسی کا قصور ہے اگر گندہ آٹا تھا تو وہ کیوں لایا۔ اُسے چاہیئے تھا کہ وہ نہ لاتا۔ اور اگر وہ ناقص مال سمجھکر سستا لے آیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بلا واسطہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ مثلاً دوسری جگہ سے اچھا آٹا خریدتا تو اُس کے ایک سَو ایک روپے خرچ ہوتے۔ لیکن جس خراس والے سے اُس نے خریدا اُسے سَو روپے دینے پڑے تو اس صورت میں بھی یہ ٹھگ ہے کیونکہ یہ دوسرے کی ٹھگی میں شریک ہوتا ہے۔ پس اگر اس قسم کی ٹھگی یہ خود نہیں کرتا بلکہ باہر سے ناقص سودا لاتا اور بیچتا ہے تب بھی وہ ویسا ہی ٹھگ ہے جیسے اپنے ہاتھ سے آٹے میں مٹی ملانے والا۔ ولایت میں کئی چور ایسے ہیں جو یتیم بچوں کی پرورش کرتے اور پھر اُن کے ذریعہ چوریاں کرواتے ہیں۔ اب کیا تم سمجھتے ہو وہ یتیم بچوں کے ذریعہ چوریاں کروانے کی وجہ سے کم چور ہیں۔ اگر خود چوری کرتے تو زیادہ چور ثابت ہوتے۔ وہ ویسے ہی چور ہیں جیسے اپنے ہاتھ سے چوریاں کرنے والے۔ اسی طرح جب تم خراس سے ناقص آٹا لاتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ وہ خراب ہے تو تم ویسے ہی مجرم ہو جیسے اپنے ہاتھ سے آٹے میں مٹی یا ریت ملانے والا۔ پھر کئی لوگ بظاہر دیانت دار بھی ہوتے ہیں اور وہ مٹی نہیں ملاتے لیکن جب گیہوں کو صاف کرنے کے لئے زمین پر پھیلاتے ہیں تو اُسے سمیٹتے وقت جب جھاڑو دیں گے تو پاؤ یا سیر کے قریب اُس میں مٹی بھی ملا دیں گے اور اپنی طرف سے یہ سمجھیں گے کہ ہم تو بڑے دیانت دار ہیں حالانکہ وہ دیانت دار نہیں ہوتے۔ اسی طرح بعض غلّہ فروش کمپنیوں کے ایجنٹ غلّہ خریدتے ہیں۔ تو اُس میں باریک غبار ملا دیتے ہیں۔ چونکہ لاکھوں کا غلّہ ہوتا ہے اس لئے اُن کی یہ چالاکی چھپی رہتی ہے اور ہر ایک کو اُس کا پتہ نہیں لگتا۔ بعض لوگ غلّے کو پانی کا چھینٹا دے دیتے ہیں۔ تاکہ بوجھل ہو جائے۔ اسی طرح اگر کسی کو کچھ خریدنا ہوتا ہے تو کہتا ہے مَیں نے اِتنا مال لیا مگر تم کچھ بھی رعایت نہیں کرتے اور اگر بیچنا ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ کیا تم ہمارا گھر ہی لوٹ کر لے جاؤ گے۔

اسی طرح بمبئی کے بعض تجّار کی نسبت تو عجیب حکایات سُنی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ بعض تاجروں کے تین قسم کے باٹ ہوتے ہیں (۱) پورے وزن کے (۲) بھاری اور (۳) ہلکے۔ اور ان کے انہوں نے عجیب عجیب نام رکھے ہوئے ہیں کسی کا نام سُبحان اللہ رکھا ہوا ہوتا ہے کسی کا نام استغفر اللہ اور کسی کا نام لاحول ولا قوۃ۔ اور جس قسم کا کوئی آدمی دیکھتے ہیں اُسی طرز کا اُس سے سلوک کرتے ہیں۔ اگر ہوشیار آدمی ہوا تو اصل بٹہ نوکر کو لانے کا حکم دیا۔ اور وہ لفظ بول دیا جس سے اصل بٹوں کی طرف اشارہ ہوتا ہو۔ کوئی سادہ لوح آیا تو چھوٹے بٹے منگوا لیئے۔

اسی طرح دھوکا باز عطّاروں کا طریق ہے کہ علاقہ میں کوئی وبا شروع ہو جائے اور حکیم لکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ مریض کو عرق مکو اور عرق گاؤزبان پلاؤ تو ایک دیانت دار عطّار تو بعض دفعہ کہدیگا کہ میرے پاس عرق مکو اور عرق گاؤزبان تیار نہیں۔ لیکن بددیانت عطّار کہیگا۔ میرے پاس دونوں چیزیں موجود ہیں۔ وہ پانی لیگا بوتل میں بھر دیگا اور کہیگا یہ عرق مکو ہے۔ یہ عرق کاسنی ہے۔ یہ عرق گلاب ہے۔ تم جو عرق بھی مانگو گے وہ اُس کے پاس موجود ہوگا۔

ہماری تاریخ طبّ کی کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک عبّاسی بادشاہ نے کہا۔ اب طبّ بڑی ترقی کر رہی ہے۔ اِس پر کسی نے کہا۔ طبّ ترقی کیسے کر سکتی ہے جب تک دوائیں بیچنے والوں میں دیانت پیدا نہ ہو۔ طبیب چاہے کوئی نسخہ لکھے اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ بادشاہ نے کہا۔ بغداد میں پانچ چھ سو دوکانیں ہیں۔ تم تجربہ کر لو۔ اِس پر انہوں نے کسی دوائی کا مصنوعی نام

رکھ لیا اور کہا۔ یہ دوا منگوا دو۔ وہ دوا آنی شروع ہوئی۔ کسی
دَوا فروش نے مٹی بھیجدی اور کہدیا یہی وہ دَوا ہے۔ کسی
نے عناب بھیجدئے اور کہدیا یہی وہ دَوا ہے۔ غرض سب
دوکانداروں نے یہی طریق اختیار کیا۔ صرف ایک دوکاندار
ایسا نکلا جس نے کہا کہ میرے پاس یہ دَوا نہیں۔ مَیں نے یہ
نام پہلے کبھی نہیں سُنا۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ کس
دوکاندار نے سچ بولا ہے۔ تو طبیبوں نے کہا۔ سب جھوٹ
بولتے ہیں۔ سچا وہی ہے جو کہتا ہے کہ مَیں نے یہ نام پہلے
نہیں سُنا۔ کیونکہ ہم نے مصنوعی نام رکھ کر یہ تجربہ کیا
تھا۔ اِسی تجربہ کی وجہ سے مسلمان بادشاہوں نے دَوا سازی
کا بھی امتحان رکھا تھا اور دواؤں کی پہچان کے لئے سکول
بنائے گئے تھے اور جو شخص وہ مخصوص امتحان پاس کر لیتا
تھا صرف اس کو دوائی بیچنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ عام
لوگوں کو دوا فروشی کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

کشمیر میں مَیں نے دیکھا ہے وہاں لوگ مشک کا نافہ
لاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں اس کے اندر ایک تولہ مشک ہے۔
اور اس کی اصل قیمت بتیس روپے ہے مگر چونکہ ہمیں روپے
کی ضرورت ہے اس لئے ہم آپ کو چوبیس پچیس روپے
میں نافہ دے دیں گے۔ پھر وہی نافہ جس کی وہ پچیس روپے
قیمت بتاتے ہیں بعض دفعہ آٹھ آنہ میں بھی دے دیتے ہیں۔
اور جب تم آٹھ آنہ میں مشک کا نافہ لے کر یہ سمجھتے ہو کہ دنیا
کے سب سے بڑے ماہر تم ہو کیونکہ تم نے ایک شخص سے
مشک کا نافہ آٹھ آنہ میں لے لیا تو اُس وقت بھی تم دھوکہ
خوردہ ہوتے ہو۔ کیونکہ جب اُسے کھول کر دیکھا جاتا ہے
تو اس میں سے کبوتر کے جمے ہوئے خون کے سوا اور کچھ نہیں
نکلتا اور تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ بڑے ماہر تم نہیں بلکہ
بڑا ٹھگ وہی تھا جو تمہیں لوٹ کر لے گیا۔ وہ نافہ کے باہر
تھوڑی سی مشک مل دیتے ہیں اور اندر کبوتر کا خون بھر دیتے
ہیں۔ کبوتر کے خون کی بعض دوائیوں کے ملانے سے بالکل
مشک کی سی شکل ہو جاتی ہے اور ناواقف آدمی سمجھتا ہے
کہ آج مَیں نے بڑا سستا سودا کیا ہے۔ مَیں نے آٹھ آنہ میں
مشک کا نافہ خرید لیا ہے۔ حالانکہ اس میں صرف کبوتر کا
خون ہوتا ہے اور کبوتر کے خون کی قیمت ایک روپیہ بھی نہیں
ہوتی۔

اِسی طرح ایک دفعہ مَیں کشمیر گیا۔ وہاں ایک قسم کی
قالین بنتی ہے جو اُونی کپڑے کاٹ کاٹ کر اور پھر اُنکو سی کر
بناتے ہیں۔ اور اُس کو گابھا کہتے ہیں۔ ہمیں وہ دیکھکر پسند
آیا۔ چنانچہ مَیں نے بھی چاہا کہ یہاں سے دو چار خرید کر
لے جائیں۔ اپنے گھروں میں تحفہ دینگے۔ ایک شخص اسلام آباد
میں اس کام کے لئے اچھا مشہور تھا۔ مَیں نے اُس کو جا کر
کہا۔ کہ مَیں یہ قالین پنجاب میں تحفۃً لے جانا چاہتا ہوں
تم مجھے اچھے سے قالین بنا دو۔ اُس نے کہا۔ اچھا کچھ
پیشگی دیدیں۔ چنانچہ ہم نے کچھ رقم اُس کو پیشگی دیدی
اور ہم آگے پہاڑ پر سیر کیلئے چلے گئے۔ مَیں نے اُسے یہ بھی
کہا کہ دیکھنا میں جو اس کی لمبائی چوڑائی بتاؤں گا وہ ٹھیک
ہو۔ کیونکہ مَیں کمروں کے لحاظ سے لے رہا ہوں۔ اُس نے
کہا۔ بالکل ٹھیک ہونگے۔ جب وہ آئے تو مجھے دیکھتے
ہی پتہ لگ گیا کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں اور پھر جو ماپ کر
دیکھا تو ایک بالشت چوڑائی میں کمی تھی اور ایک بالشت
لمبائی میں کمی تھی۔ مَیں نے اُس کو کہا کہ یہ تم نے بڑی دھوکا بازی
کی ہے کہ اس کو چھوٹا بنا دیا ہے۔ اِس پر اُس نے شور مچانا
شروع کر دیا کہ "مَیں مسلمان ہوں" "مَیں مسلمان ہوں"۔ مَیں
نے کہا۔ مسلمان تو تم ہوئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے
ساتھ تمہارا وعدہ تھا یا نہیں کہ اتنے لمبے چوڑے قالین
بناؤں گا۔ اور پھر دو چار آدمیوں کے سامنے یہ بات ہوئی
تھی۔ مَیں نے اُن آدمیوں سے کہا کہ بتاؤ تمہارے سامنے
اس نے یہ وعدہ کیا تھا یا نہیں۔ انہوں نے کہا۔ ہمارے
سامنے وعدہ کیا تھا۔ اس پر مَیں نے اُسے کہا کہ دیکھو

تم نے وعدہ کیا تھا۔ وہ اپنے کشمیری طریق پر کہنے لگا۔ "جی میں مسلمان ہوندی۔ میں مسلمان ہوندی"۔ میری عمر اس وقت کوئی انیس بیس سال کی تھی۔ مجھے اس پر غصہ چڑھے کہ یہ اپنا فعل اسلام کی طرف کیوں منسوب کرتا ہے۔ یہ کہے میں نے ٹھگی کی ہے جانے دو۔ یہ کیوں کہتا ہے کہ میرے مسلمان ہونے کے لحاظ سے میرا حق تھا کہ میں ٹھگی کرتا۔ غرض میں اصرار کروں کہ اسے پورا کرو۔ اور وہ یہی کہتا جائے کہ میں مسلمان ہوں میں مسلمان ہوں۔ گویا اسلام اتنا گر گیا ہے کہ اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمان اگر ٹھگی کرے تو یہ بھی اُسکا ایک قسم کا جائز حق ہے۔

میں جب پہلی دفعہ کشمیر گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ کشمیر کے تاجروں کی صرف چاندی کے کام کی ایک کروڑ روپیہ کی تجارت یورپ والوں سے تھی۔ ایک کروڑ روپیہ کی تجارت کے یہ معنے ہیں کہ بیس پچیس لاکھ روپیہ انہیں بطور منافع حاصل ہوتا تھا اور کام کی مزدوری الگ تھی۔ لیکن مجھے بتایا گیا کہ اب یہ تجارت سولہ لاکھ روپیہ تک رہ گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے لوگ کہتے ہیں۔ یہاں کے مال کا کوئی معیار نہیں کبھی کوئی چیز بھیجدیتے ہیں اور کبھی کوئی۔ کبھی تو نہایت اعلیٰ مال روانہ کریں گے اور کبھی اُس میں کھوٹ ملا دینگے۔ حالانکہ اگر وہ دیانت داری سے کام کرتے تو وہ ایک کروڑ کی تجارت آج تین چار کروڑ روپیہ تک پہنچی ہوئی ہوتی۔ پہلے زمانہ میں تجارتیں بہت کم تھیں۔ تجارت میں زیادتی اسی زمانہ میں ہوئی ہے۔ پھر اگر اُس زمانہ میں جبکہ تجارت کا رواج بہت کم تھا اُتنی ایک کروڑ روپیہ کی تجارت ہو سکتی تھی تو لازماً اب وہ تجارت تین چار کروڑ روپیہ کی ہو جاتی۔ مگر بجائے اس کے کہ اُتنی تجارت تین چار کروڑ روپیہ تک ترقی کرتی اور کروڑ ڈیڑھ کروڑ روپیہ انہیں نفع حاصل ہوتا۔ پہلی تجارت بھی گر گئی اور وہ ایک کروڑ سے اُتر کر سولہ لاکھ روپیہ تک آگئی۔ اگر وہ تھوڑے سے نفع کی خاطر بددیانتی کر کے اپنے کام کو نقصان نہ پہنچاتے تو نتیجہ یہ ہوتا کہ اُن کی یہ تجارت خوب چلتی مگر چونکہ انہوں نے بددیانتی کی اسلئے تجارت میں نقصان ہو گیا انگریزوں کے کئی لوگ دشمن ہیں۔ مگر دشمن بھی اقرار کرتے ہیں کہ تجارت کے معاملہ میں انگریزوں پر زیادہ اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ انگریزوں سے اُتر کر امریکہ اور جرمن کے لوگ ہیں اور اُن سے اُتر کر اور ممالک کے لوگ ہیں۔ مگر ایشیا تجارت میں اتنا خطرناک طور پر بدنام ہے کہ کوئی قوم اس پر اعتبار نہیں کرتی۔ حالانکہ قومی ترقی ہمیشہ امانت اور دیانت داری کی شہرت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر تمام مسلمان تاجر دیانتدار ہوں تو لوگ سو دوکانوں کو چھوڑ کر بھی اُن کے پاس جائینگے اور کہیں گے کہ ان سے سودا اچھا ملتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان دوکاندار بھی ایک من آٹے میں سیر بھر مٹی ملا دیتا ہے تو اس کے اندر وہ کونسی چیز ہوگی جس کی وجہ سے لوگ اُس کی طرف توجہ کریں گے۔ پس ہر شخص کو اس بات کا فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ میں نے بددیانتی کو مٹانا ہے۔ اگر اس کا باپ دوکاندار ہے تو وہ اپنے باپ سے کہدے کہ میں تمہیں بددیانتی نہیں کرنے دونگا۔ اگر اُس کے بھائی دوکاندار ہیں تو وہ اپنے بھائیوں سے کہدے کہ میں تمہیں بددیانتی نہیں کرنے دوں گا۔ اگر اُس کے دوست اور رشتہ دار دوکاندار ہیں تو وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے کہدے کہ میں تمہیں بددیانتی نہیں کرنے دونگا۔ اگر اُس کی بیوی دوکان کرتی ہے تو وہ اپنی بیوی سے کہدے کہ میں تمہیں بددیانتی نہیں کرنے دوں گا۔ اور اگر تم باز نہ آئے اور اصلاح نہ کی تو میں تمہارے خلاف کھڑا ہو جاؤنگا۔ اگر ہر شخص اس بات کا تہیہ کرلے کہ میں نے بددیانتیوں کا مقابلہ کرنا ہے تو ایک گھنٹہ کے اندر اندر اس عیب کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اگر تمہارا بھائی تاجر ہے اور وہ بددیانتی کرتا ہے۔ اگر تمہارا باپ تاجر ہے اور وہ بددیانتی کرتا ہے

اگر تمہاری ماں تاجر ہے اور وہ بددیانتی کرتی ہے۔ اگر تمہاری بیوی تاجر ہے اور وہ بددیانتی کرتی ہے تو یہ بددیانتی اس وقت تک پنپ سکتی ہے جب تک اُنکو یقین ہے کہ تم اُن کی محبت کی خاطر اُن کی بالا افسروں کے پاس رپورٹ نہیں کروگے۔ لیکن جب اُنکو معلوم ہوجائیگا کہ تم ان کی محبت کی پرواہ نہیں کروگے اور تم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر وہ بددیانتی سے باز نہ آئے تو تم اُن کی رپورٹ کردوگے تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ڈیپارٹمنٹ میں بددیانتی کریں۔ باپ کہیگا بیٹا پچھلا قصور جانے دو آئندہ میں کبھی بددیانتی نہیں کرونگا۔ بھائی کہیگا پچھلا قصور معاف کرو آج سے میں باز آیا بیوی کہے گی۔ اب یہ قصور معاف کردو آئندہ میں ایسی حرکت نہیں کرونگی۔ پس قوم کی اصلاح تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ بیٹے کی اصلاح باپ کے ہاتھ میں ہے۔ باپ کی اصلاح بیٹے کے ہاتھ میں ہے۔ بھائی کی اصلاح بھائی کے ہاتھ میں ہے۔ بیوی کی اصلاح خاوند کے ہاتھ میں ہے۔ اور ماں کی اصلاح بیٹوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم اس طریق کو استعمال کرو تو چند دن نہیں بلکہ ایک گھنٹہ کے اندر اندر ساری قوم کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر تمہارا دوست دیکھتا ہے کہ وہ بددیانتی کرے گا۔ تو تم اُسپر پردہ ڈالوگے اور جھوٹ بولوگے تو تم اُس کو بھی تباہ کرتے ہو اور آپ بھی تباہ ہوتے ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی جماعت روپے سے زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ ایمان سے زندہ رہتی ہے اگر روپیہ ہی اصل چیز ہو تو یہودیوں، عیسائیوں، پارسیوں اور ہندوؤں کے پاس مسلمانوں سے بہت زیادہ روپیہ ہے۔ پھر خدا تعالیٰ نے اُن کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ ایمان کا روپے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو بھی روپیہ دیتا ہے مگر وہ روپیہ یا تو انعام کے طور پر ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ چاہتا ہے کہ اُس کے ذریعہ غرباء کی امداد کی جائے۔ اور یا پھر آزمائش کے طور پر ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اس روپیہ کا کیسے استعمال کرتے ہیں۔ اگر تو روپیہ کے آنے سے انسان کا ایمان سلامت رہے تو وہ روپیہ اس کے لئے خیر اور برکت کا موجب ہوتا ہے لیکن اگر وہ روپیہ انسان کے ایمان کو باطل کردیتا ہے اور وہ بے ایمانوں جیسی چالاکیاں کرنے لگ جاتا ہے اور چوروں اور ٹھگوں کی طرح لوگوں کو لوٹتا ہے۔ مثلاً بلیک مارکیٹ شروع کردیتا ہے۔ مقررہ نرخ پر چیز فروخت نہیں کرتا بلکہ چیز کی موجودگی سے ہی انکار کردیتا ہے لیکن اگر اسے کوئی چوری چھپے حسب منشاء دام دیدے تو وہ فوراً اُسے مہیا کردیتا ہے تو وہ روپیہ اس کیلئے عذاب کا باعث بن جاتا ہے۔ اس قسم کے ناجائز منافع خوروں کی ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے جیسے کہتے ہیں کہ کسی حریص آدمی کے پاس ایک مرغی تھی جو روزانہ سونے کا ایک انڈا دیا کرتی تھی۔ اُس کے دل میں لالچ پیدا ہوا کہ اگر میں اِسے زیادہ کھلاؤں تو شاید یہ دو انڈے دینے لگ جائے۔ چنانچہ اُس نے مرغی کو پکڑ کر اُس کا مُنہ کھول کر روزانہ اُسے زیادہ سے زیادہ دانے کھلانے شروع کردیئے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مُرغی بیمار ہوکر مرگئی۔ اور وہ ایک انڈے سے بھی محروم ہوگیا۔ اِس قسم کے ناجائز منافع خور بھی روپیہ جمع کرتے جاتے ہیں مگر ایک دن آتا ہے جب کسی نہ کسی رنگ میں انہیں اپنی اس بددیانتی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ فوری نقصان تو اس رنگ میں پہنچ جاتا ہے کہ جب وہ کسی شخص کو ایک سیر چیز دینے کی بجائے پندرہ چھٹانک دیتے ہیں اور وہ گھر جاکر اس کا وزن کرتا ہے تو اُسے پتہ لگتا ہے کہ دوکاندار نے اُسے ایک چھٹانک چیز کم دی ہے تو وہ

آئندہ کے لئے اُس سے سودا لینا بند کر دیتا ہے۔ اِس طرح بظاہر تو اُسے ایک چھٹانک کا نفع ہوا تھا لیکن اُسے نقصان ہزار چھٹانک کا ہو گیا۔ کیونکہ وہ آئندہ کے لئے اُس کی دوکان پر نہیں آئے گا۔ اور کسی دوسرے سے سودا خریدنا شروع کر دے گا۔

یہ خیال کہ صرف بے ایمانی سے ہی روپیہ کمایا جاسکتا ہے اوّل درجہ کا احمقانہ خیال ہے۔ صحابہؓ کو دیکھ لو وہ ہر امر میں دیانت کو ملحوظ رکھتے تھے۔ مگر اُس زمانہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی وفات کے بعد اُن کا بچا کھچا روپیہ دو کروڑ نکلا حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ دین کے لئے بہت قربانی کرنے والے تھے لیکن اِس کے باوجود اُن کے پاس دو کروڑ روپیہ بچ گیا تھا۔ جو آجکل کے دو ارب کے برابر ہے۔ اسی طرح تاریخوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص گھوڑے کو فروخت کرنے کے لئے بازار میں لایا اور اُس نے کہا کہ اِس کی پانچ سو درہم قیمت ہے۔ ایک صحابیؓ نے اس گھوڑے کو دیکھا اور اُسے پسند کیا اور کہا کہ مَیں یہ گھوڑا لیتا ہوں۔ مگر اِس کی قیمت مَیں پانچ سو درہم نہیں بلکہ دو ہزار درہم دونگا۔ کیونکہ یہ گھوڑا نہایت اعلیٰ قسم کا ہے اور اس کی قیمت اتنی تھوڑی نہیں جتنی تم بتاتے ہو۔ اِس پر گھوڑا بیچنے والا اصرار کرنے لگا کہ مَیں پانچسو درہم لوں گا اور گھوڑا خریدنے والا اصرار کرنے لگا کہ مَیں دو ہزار درہم دونگا۔ ایک کہتا کہ تجھے گھوڑے کی پہچان نہیں یہ گھوڑا زیادہ قیمت کا ہے اور دوسرا کہتا کہ مَیں صدقہ لینا نہیں چاہتا۔ مَیں اپنے گھوڑے کو جانتا ہوں۔ اِس کی قیمت پانچسو درہم ہی ہے۔

اِس واقعہ پر غور کرو اور دیکھو کہ اِس کے کتنے پُرلطف نتائج دنیا میں نظر آتے ہیں۔ وہاں تو یہ تھا کہ چیز خریدنے والا قیمت بڑھاتا تھا اور چیز بیچنے والا قیمت گراتا تھا۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ دو دو آنے کی چیز بعض دفعہ دس دس روپے میں فروخت کی جاتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ خریدار بھی دوکانداروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں اور دوکاندار بھی گاہکوں کو فریب سے گندی چیزیں نہ دیں۔ اور نہ ماپ اور تول میں انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو تجارتی دیانت اختیار کرنے کی نصیحت کرنے کے بعد ایک اور نصیحت یہ فرمائی کہ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ: تم زمین میں فساد نہ کرو۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم میں قتل وغارت اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں بھی کثرت سے ہوتی رہتی تھیں۔ چونکہ یہ علاقہ عرب اور شام اور مصر کے راستوں پر تھا۔ اور شام اور مصر کو جانے والے قافلے اُن کے پاس سے گذرا کرتے تھے معلوم ہوتا ہے یہ لوگ مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے اور بعض کو قتل بھی کر دیا کرتے تھے۔ اِس قیاس کو مزید تقویت اس امر سے بھی حاصل ہوتی ہے کہ یہ لوگ اصحاب الایکہ تھے۔ یعنی ان کے قبضہ میں ایک بہت بڑا جنگل تھا جس میں بیریاں اور پیلو کے درخت بڑی کثرت کے ساتھ تھے اور ایسے جنگل میں ڈاکہ ڈالنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ درختوں کے پیچھے انسان آسانی سے چھپ جاتا ہے پس حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں نصیحت کی کہ تم تجارتی معاملات میں بھی دیانت اختیار کرو اور چوری ڈاکہ زنی اور قتل وغارت کو بھی ترک کر دو۔

وَاتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۸۵﴾

اور جس نے تم کو اور تم سے پہلی مخلوق کو پیدا کیا ہے اس کا تقویٰ اختیار کرو ۳۳

جِبِلَّۃٌ

۳۳ حل لغات: - جِبِلَّۃٌ - مفرداتِ امام راغبؒ میں ہے۔ جَبِلٌّ کَثِیْرٌ ای جَمَاعَۃٌ یعنی جَبِلٌّ کے معنے جماعت کے ہیں (مفردات) پس اَلْجِبِلَّۃَ الْاَوَّلِیْنَ کے معنے ہونگے پہلی جماعتیں۔

تفسیر: - پھر فرمایا تم اس خدا سے ڈرو جس نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور تم سے پہلی قوموں اور جماعتوں کو بھی پیدا کیا ہے یعنی آج تو تم اپنے اِن افعال پر نازاں ہو۔ لیکن کیا تم نہیں دیکھتے کہ انہی ناپسندیدہ حرکات کی وجہ سے تم سے پہلے بھی کئی قومیں ہلاک ہو چکی ہیں۔ پھر کیوں تم اُن کی ہلاکت اور بربادی سے سبق حاصل نہیں کرتے اور کیوں اُن کے زوال کے اسباب پر غور کر کے اپنے اندر تغیّر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ قومیں دنیا میں بنتی بھی ہیں اور بگڑتی بھی ہیں۔ اور جب سے دنیا چلی آ رہی ہے اُسی وقت سے یہ سلسلہ بھی چلا آ رہا ہے۔ ہزاروں قوموں کی تباہی اور ہزاروں قوموں کی ترقی پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں مگر تاریخ کے تمام واقعات بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کے واقعات کا سوواں حصہ بھی نہیں ہیں۔ وہ زمانہ جو تاریخی کہلاتا ہے اُس سے بھی مدتوں پیشتر انسان دنیا میں موجود تھا۔ اور پھر جو زمانہ تاریخی کہلاتا ہے اُس کا بھی اکثر حصہ ایسا ہے جس کی تاریخ محفوظ نہیں۔ مگر وہ زمانے جن کی تاریخ محفوظ ہے اور وہ زمانے جن کی تاریخ محفوظ نہیں ان دونوں قسم کے زمانوں میں ہزاروں قومیں بگڑتی اور بنتی چلی گئیں۔ ہزاروں قوموں نے پہلے بامِ رفعت تک رسائی حاصل کی اور پھر زوال پذیر ہو گئیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ جس طرح انسانی پیدائش کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور جس طرح انسانی موت کا انکار نہیں کیا جا سکتا اِسی طرح قوموں کی پیدائش اور اُن کی موت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر جس طرح بنی نوع انسان ہر روز موت کا مشاہدہ کرنے کے باوجود موت بُھلا دیتے ہیں۔ اِسی طرح قومیں بھی دوسری قوموں کے تنزل کو دیکھنے کے باوجود اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتیں۔

قرآن کریم نے اس مسئلہ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اور سورۂ فاتحہ سے لیکر سورۂ والنّاس تک سارا قرآن کریم اِن بیانات سے بھرا پڑا ہے کہ قومی ترقی کے کیا گُر ہیں۔ بے شک اَور بھی بہت سے مضامین قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں۔ اِس کے اندر عقلی مضامین بھی بیان کئے گئے ہیں اور علمی بھی۔ روحانی مضامین بھی بیان کئے گئے ہیں اور جسمانی بھی۔ اقتصادی مضامین بھی بیان کئے گئے ہیں اور سیاسی بھی۔ غرض سینکڑوں اور ہزاروں مضامین اس کے اندر بیان ہوئے ہیں لیکن سورۂ فاتحہ کی ابتداء ہی ایسے رنگ میں کی گئی ہے کہ اس میں قومی ترقی اور تنزل سے تعلق رکھنے والے تمام اصول بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اِسکی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے چھوٹے چھوٹے چشموں سے دریا پھوٹتے ہیں تو ایک کوتاہ اندیش انسان چشمہ میں سے نکلتے ہوئے دریا کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ یہ چھوٹا سا نالہ چند گز یا چند فرلانگ تک جا کر ختم ہو جائے گا یا خشک ہو جائیگا کیونکہ اُس کی آنکھ صرف چشمہ میں سے پھوٹتے ہوئے دریا کے اس پاٹ پر ہی ہوتی ہے جس پر سے وہ اگر چھلانگ مار کر اُس کے پار جانا چاہے تو بڑی آسانی کے ساتھ جا سکتا ہے۔ لیکن جب وہ اُس چھوٹی سی نالی

کے ساتھ ساتھ چلتا ہے تو وہ یہ دیکھکر حیران ہو جاتا ہے کہ اَب یہ نالی نالے کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ تھوڑی دُور اور آگے جاکر وہ اَور بھی متعجب ہوتا ہے کہ وہ نالہ ایک نہر کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ اور جب کچھ اَور فاصلہ طے کرتا ہے تو یہ دیکھکر اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ وہی چھوٹی سی نالی جو چشمے میں سے دھیمے دھیمے پھوٹ رہی تھی اور جس پر سے چھلانگ لگا کر اس پار ہو جانا ذرا بھی مشکل نہ تھا وہ یہاں پہنچکر ایک بہت بڑا اور عظیم الشان دریا بن گیا ہے۔ دریائے جہلم جو پنجاب میں پہنچکر ایک بہت بڑے دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے اپنے دہانہ پر اتنا تنگ ہے کہ چند فٹ سے زیادہ نہیں۔ اُس جگہ کھڑے ہوکر کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ یہ چشمے میں سے بہنے والا چھوٹا سا نالہ پنجاب کی لاکھوں ایکڑ زمین کو سیراب کریگا اور لوگ میلوں میل کشتیوں میں بیٹھ کر اپنی مسافتوں کو طے کریں گے۔ اسی طرح سورۂ فاتحہ کے شروع ہونے کی مثال ایسی ہی ہے جیسے چشمہ میں سے نکلتے ہوئے نالہ کی لیکن آخر پر پہنچکر اس کی مثال ایک بہت بڑے دریا کی سی ہو جاتی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں جس مضمون کو چشمے سے نکلتے ہوئے ایک چھوٹے سے نالے کی طرح بیان کیا گیا ہے۔ اُسے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ تک پہنچکر ایک عظیم الشان دریا کی طرح واضح کر دیا گیا ہے۔ کوئی شخص اگر روحانی نابینا ہو تو الگ بات ہے ورنہ ہر شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ ترقی اور تنزل کی تمام منزلیں اس چھوٹی سی سورۃ کے اندر واضح طور پر بیان کی گئی ہیں۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں تو ترقی کا مضمون بیان ہُوا ہے کہ اے اللہ ہمیں وہ راستہ دکھا جس پر چلنے والے انعام حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ہمیں اُن قوموں میں شامل فرما جن قوموں نے ترقی کی تھی۔ مگر آگے چل کر غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ میں بتا دیا کہ ہر وہ قوم جس نے ترقی حاصل کی وہ آخرکار گر پڑی مگر یہ دُعا سکھا کر اللہ تعالیٰ نے ہمیں تنزل اور پستی سے بچنے کا ایک گُر بھی بتا دیا ہے۔ مستقبل کے متعلق تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے اور کیا ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ دُعا سکھا کر اِس امر کی طرف ہماری راہنمائی فرمائی گئی ہے کہ اگر مسلمان توجہ سمجھ اور عقل کو کام میں لائیں تو وہ تنزل سے بچ سکتے ہیں۔ پچھلے دَور میں تو مسلمان اس کی طرف سے توجہ ہٹا لینے کی وجہ سے نہ بچ سکے۔ لیکن اسلام کے لئے ایک نشأۃ ثانیہ کی بھی خبر دی گئی تھی۔ اور وہ زمانہ مسیح موعودؑ کی بعثت سے شروع ہونا تھا۔ پس یہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کی دُعا جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھائی ہے مسلمان قوم اس پر عمل کرکے دوسری تمام اقوام سے لمبی عمر پا سکتی ہے۔ اور ضلالت سے بچ سکتی ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو دُعا اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کو سکھاتا ہے اُس پر اگر عمل کیا جائے تو وہ ہرگز ضائع نہیں جاتی کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وعدہ مضمر ہوتا ہے کہ اگر تم مجھ سے مانگو گے تو مَیں تمہیں دے دونگا۔ اور یہ خدا تعالیٰ کی شان سے بالکل بعید ہے کہ وہ خود اپنے بندوں کو ایک دُعا سکھائے اور جب بندے اُس دُعا پر عمل کریں تو وہ انہیں نہ دے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تو ایک بہت بڑی چیز ہے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض انسانوں کے وعدے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ کوئی بادشاہ کوئی ڈپٹی کمشنر کوئی گورنر یا کوئی اور ایسا ہی بڑا حاکم اگر کسی شخص کے ساتھ وعدہ کرے تو وہ شخص اپنے دل میں بڑا خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ لوگ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ حالانکہ یہ لوگ پیشتر اس کے کہ اپنے وعدہ کا ایفا کریں مر بھی سکتے ہیں اور یہ بھی امکان ہوتا ہے کہ وہ کہدیں کہ اب ہم اس وعدہ کو پورا نہیں کر سکتے۔ یا ممکن ہے کہ وہ

وعدہ کرتے وقت تو با اختیار ہوں لیکن وعدے کے ایفاء کے وقت اُن سے تمام اختیارات چھن چکے ہوں۔ یا کسی اور محکمہ میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ مگر وہ خدا جو ازلی ابدی ہے وہ نہ بدلتا ہے اور نہ مرتا ہے اور نہ ہی اس پر کوئی ایسا وقت آسکتا ہے کہ اس سے اختیارات چھن جائیں اسلئے ہمیں ایسے شخص سے ہزاروں گُنے زیادہ پُر اُمید ہونا چاہیئے۔ اور ہمیں اس بات میں ذرا بھی شک نہیں لانا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا ایفاء کرے گا۔ جب خدا تعالیٰ نے خود ہمیں یہ دُعا سکھائی ہے تو اس کے اندر یہ وعدہ موجود ہے کہ وہ تنزل جو قوموں پر اُن کے عروج کے بعد آتا ہے مسلمانوں کے اس دُعا مانگنے کی وجہ سے پیچھے ڈال دیا جائیگا۔ اور اُن کے عروج کے زمانہ کو لمبا کر دیا جائیگا۔ حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ تھے۔ جو وَلَا الضَّآلِّيْنَ کی مدّ اور شدّ سے ایک عجیب استدلال کیا کرتے تھے۔ وہ بزرگ کہتے تھے کہ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں جو شدّ کے بعد مدّ آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کا زمانہ بہت لمبا ہو گا۔ مگر اس سے بھی بڑا نکتہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں یہ موجود ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کو پورا ہی نہیں کرنا تھا تو اِس دُعا پر زور ہی کیوں دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا اس دُعا کو ہم سے بار بار منگوانا بتاتا ہے کہ وہ اسے ضرور پُورا کرے گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا گروہ نہ آنا تھا تو یہ دُعا مسلمانوں کو سکھائی ہی کیوں گئی تھی۔ اِسی طرح میں کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بچانا نہ تھا تو غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ والی دُعا کیوں سکھائی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ والی دُعا سکھا کر بتا دیا کہ وہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا ایک گروہ پیدا کرنا چاہتا ہے اِسی طرح غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ والی دُعا سکھا کر اُس نے بتا دیا ہے کہ اگر مسلمان اس پر عامل رہے تو اُن کو مغضوب اور ضالّین میں شامل ہونے سے بھی بچایا جائیگا اگر ضآلّین کی مدّ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عیسائیوں کو عروج کا لمبا زمانہ نصیب ہوگا تو غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے بدرجۂ اتم یہ استنباط ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو عیسائیوں سے بھی لمبا زمانہ دیا جائیگا اور ضآلّین بننے سے بھی بچایا جائیگا۔ حدیثوں سے بے شک یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے قریب دنیا میں اشرار ہی رہ جائینگے مگر قرب قیامت کی تعیین کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ اور خدا تعالیٰ نے ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کب آئے گی۔ کیونکہ قرآن کریم میں ایک ایک دن کو ایک ہزار اور پچاس ہزار سال کا بتایا گیا ہے۔ اِس طرح اگر دنیا کی عمر سات ہزار سال شمار کی جائے اور ایک دن ایک ہزار سال کا شمار کیا جائے تو دنیا کی عمر ستر لاکھ سال بنتی ہے۔ اور اگر ایک دن پچاس ہزار سال کا شمار کیا جائے تو یہ عمر ۳۵ کروڑ سال بنتی ہے۔ اور خدا کے دن تو اس سے بڑے ہو سکتے ہیں اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کی عمر کتنی ہے۔ ہم یہ تو مان لیتے ہیں کہ یہ آخری زمانہ ہے مگر اس کی حد بندی کس طرح کی جائے اس کا علم تو صرف خدا تعالیٰ کو ہی ہے لوگوں کی بحثیں محض فلسفیانہ ہیں۔ اور فلسفیانہ بحثیں ہمیشہ عبث اور لاحاصل ہوتی ہیں۔ درحقیقت یہ سب باتیں جو آخری زمانہ کے متعلق بیان ہوئی ہیں استعارات سے پُر ہیں جن کی تفصیلات ہمیں خدا تعالیٰ پر چھوڑ دینی چاہئیں حقیقت یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ قومی لحاظ سے خواہ کتنی بھی ترقی کر جاؤ تمہیں ہمیشہ یہ امر مدّنظر رکھنا چاہیئے کہ اگر تمہارا قدم ذرا بھی پھسلا تو یا تو تم مغضوب علیہم میں شامل ہو جاؤ گے اور یا پھر ضالّین میں تمہارا شمار ہو جائیگا۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کے اِس کو مضبوطی سے پکڑے رکھو گے اور ہمیشہ اُس سے دُعائیں کرتے رہو گے کہ وہ تمہارا قدم

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ

(اس پر اس کی قوم نے) کہا. تُو تو ایسا (شخص) ہے جسے غذا دی جاتی ہے ۔ اور تُو صرف ہماری طرح کا ایک

مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا

انسان ہے اور ہم یقیناً تجھے کاذب سمجھتے ہیں ۔ پس اگر تُو

كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۸﴾ قَالَ رَبِّيْٓ

سچا ہے تو ہم پر کوئی بادل کا ٹکڑا گرا ۔ (اس پر شعیبؑ نے) کہا ۔ میرا رب

اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ

تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے ۔ (مگر اس کے سمجھانے کے باوجود) انہوں نے اُسکو جھٹلایا ۔ پس اُن کو سایہ کے دن والے عذاب نے

يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۹۰﴾ اِنَّ فِيْ

آپکڑا (یعنی گھنے اور دیرپا بادلوں کے عذاب نے)، وہ یقیناً ایک بڑے بھاری دن کا عذاب تھا ۔ اس واقعہ میں

ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

ایک بڑا نشان تھا اور (اسے دیکھ کر بھی) اِن کافروں میں سے اکثر مومنوں میں شامل نہ ہوئے ۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۲﴾ ع

اور تیرا رب یقیناً غالب (اور) بار بار کرم کرنے والا ہے ۔ ۳۴ھ

۱۰ ۲ ۱۴

صراطِ مستقیم پر قائم رکھے تو اُس کا فضل تمہارے شاملِ حال ہوگا اور وہ تمہیں تنزل اور انحطاط کا شکار ہونے سے محفوظ رکھیگا ۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اسی نکتہ کی طرف اپنی قوم کو توجہ دلائی اور فرمایا کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ تم سے پہلے بھی کئی قومیں گذری ہیں جنہیں اپنے اپنے زمانہ میں بڑی طاقت حاصل تھی مگر جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو وہ تباہ و برباد کر دی گئیں ۔ پھر تم کیوں اپنی چند روزہ زندگی میں تقوی اللہ سے کام نہیں لیتے اور مادی لذات کے حصول کے لئے ناجائز ذرائع اور تدابیر اختیار کرتے ہو ۔

۳۴ھ حل لغات :- اَلْمُسَحَّرِيْنَ : مُسَحَّرٌ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور سَحَّرَهٗ کے معنے ہیں اَعْطَاهُ السَّحُوْرَ ۔ اُس کو غذا دی (اقرب) ۔ مفردات میں ہے سَحُوْرُ الْغِذَاءِ سِحْرًا مِنْ حَيْثُ اِنَّهٗ يَدِقُّ وَيَلْطُفُ تَأْثِيْرُهٗ ۔ یعنی غذا کو عربی زبان میں سِحْر اس لئے کہتے ہیں کہ اُس کی تاثیر جسم میں بہت باریک اور لطیف ہوتی ہے ۔

اَلْمُسَحَّرِيْنَ ۲

پس مُسَحَّرِیْن کے معنے ہونگے جن کو غذا دی جائے۔

كِسَفًا :- کِسْفَۃٌ کی جمع ہے اور اَلْکِسْفَۃُ کے معنے ہیں اَلْقِطْعَۃُ مِنَ الشَّیْءِ یعنی کسی چیز کا ٹکڑا (اقرب)

اَلظُّلَّۃُ :- اَوَّلُ سَحَابَۃٍ تُظِلُّ ۔ بادلوں میں سے پہلا بادل جو زمین پر سایہ ڈالتا ہے۔ (اقرب) عَذَابَ یَوْمِ الظُّلَّۃِ ۔ سَحَابَۃٌ اَظَلَّتْھُمْ فَلَجَاءُوْا اِلٰی ظِلِّھَا فَاَطْبَقَتْ عَلَیْھِمْ وَ اَھْلَکَتْھُمْ ۔ شعیبؑ کی قوم پر بادل آئے اور وہ قوم تو اُن کو اچھا سمجھتی رہی۔ لیکن اُن بادلوں نے اُن کو برباد کر دیا۔ اس کو قرآن مجید نے عَذَابَ یَوْمِ الظُّلَّۃِ سے تعبیر کیا ہے (اقرب)

تفسیر :- حضرت شعیب علیہ السلام کی نصائح پر اُن کی قوم نے جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ تم نے جو ہم سے ٹکر لی ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی اور تمہیں اُکسا رہا ہے اور تمہیں مالی مدد دے رہا ہے تاکہ تم ہمارے خلاف ایسی باتیں کرو اور ہماری طاقت کو کمزور کر دو۔ سَحَّرَ کے معنے عربی زبان میں کھانا دیئے جانے کے ہوتے ہیں۔ مگر استعارۃً انہوں نے یہ الفاظ مدد دیئے جانے کے معنوں میں استعمال کئے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہم چونکہ تجارتی قوم ہیں جو لوگ تجارت میں ہم سے بڑھ نہیں سکتے انہوں نے تجھ کو رشوت دی ہے کہ تو ہمیں اُن طریقوں سے روک دے جن سے ہماری تجارت ترقی کر رہی ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۔ آخر تو ہمارے جیسا ایک آدمی ہے اور کیا ہے وَاِنْ نَّظُنُّکَ لَمِنَ الْکٰذِبِیْنَ اور ہم تو تجھے یقیناً جھوٹا سمجھتے ہیں فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۔ اگر تو سچا ہے تو آسمان سے ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔ یعنی اتنی شدید بارش ہو کہ بجائے اس کے کہ ہماری کھیتیوں اور باغات کا پھل بڑھے سارا ملک تباہ ہو جائے۔ ہم تو تیری سچائی کا صرف یہی ایک معیار سمجھتے ہیں۔ حضرت شعیبؑ نے اُن سے کہا۔ میرا رب تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے اور وہ جس قسم کا سلوک چاہیگا تم سے کریگا۔ مگر پھر بھی وہ اُس کو جھٹلاتے ہی رہے۔ آخر اُن کو اُنہی کے معیار کے مطابق ایک سایہ والے دن کے عذاب نے پکڑ لیا۔ یعنی باد و باراں کا ایسا شدید طوفان آیا کہ جس نے اس ملک کو تباہ کر دیا وہ عذاب ایک ہولناک دن کا عذاب تھا اور اُس نے بعد میں اُس ملک کو آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ کے لئے ایک نشان بنا دیا۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم نے اِس عذاب کے متعلق ایک اور جگہ صَیْحَۃ اور دوسری جگہ رَجْفَۃ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ بِرَحْمَۃٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَۃُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ (ہود ع ۸) یعنی جب ہمارا عذاب آ گیا۔ تو ہم نے شعیبؑ اور اُس پر ایمان لانے والوں کو اپنے فضل سے بچا لیا اور وہ لوگ جنہوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کیا تھا انہیں عذاب نے پکڑ لیا اور وہ اپنے گھروں میں زمین سے چمٹے ہوئے تباہ ہو گئے۔

اِسی طرح سورۂ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَکَذَّبُوْہُ فَاَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ (عنکبوت ع ۴) یعنی انہوں نے شعیبؑ کو جھٹلا دیا جس کے نتیجہ میں ایک ہلا دینے والے عذاب نے اُن کو پکڑ لیا اور اپنے گھروں میں زمین سے چمٹے کے چمٹے رہ گئے۔

ان دونوں مقامات پر یہ امر بیان نہیں کیا گیا کہ آیا یہ عذاب اُن پر زلزلہ کی شکل میں آیا یا کسی اور شکل میں۔ مگر سورۂ شعراء میں اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کے متعلق وضاحت فرما دی کہ یہ عذاب ایک ہولناک بارش کی صورت میں آیا تھا جس کے نتیجہ میں وہ اپنے گھروں میں زمین سے چمٹے کے چمٹے دیکھے

باقی رہا صَیْحَۃ یا رَجْفَۃ کے الفاظ کا استعمال سو صَیْحَۃ کے معنے مطلق عذاب کے بھی ہیں اور صَیْحَۃ کے معنے ایسی تباہی کے بھی ہیں جو اچانک آجائے۔ اور رَجْفَۃ کے لفظ میں اُس ہلا دینے والے منظر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انہیں اپنی بداعمالی کی وجہ سے دیکھنا پڑا اور جس نے اُن کی بنیادوں کو ہلا ڈالا۔ چنانچہ رَجَفَ الْاِنْسَانُ کے معنے ہوتے ہیں لَمْ یَسْتَقِرَّ لِخَوْفٍ عُرِضَ لَہٗ کہ کسی خوف کی وجہ سے اُس کا قرار چھینا گیا۔ اور ایک جگہ آرام سے بیٹھنا اُس کے لئے ناممکن ہوگیا اور رَجَفَ الرَّعْدُ کے معنے ہوتے ہیں تَرَدَّدَتْ ھَدْھَدَتُہٗ فِی السَّحَابِ بادلوں میں بڑے زور سے اُس کی گڑگڑاہٹ کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ پس یہ الفاظ بھی اُس تباہ کن بارش کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس نے اچانک اُن کے قرار کو چھین لیا۔ اور انہیں ایک ایسے عذاب میں مبتلا کر دیا جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ہر شخص اپنے اپنے مکان میں محصور رہا۔ یہاں تک کہ اُن کے مکانوں کی دیواریں چھتوں سمیت اُن پر آ گریں اور وہ زمین کے ساتھ چمٹے کے چمٹے رہ گئے۔

فرماتا ہے شعیبؑ کی قوم کی اکثریت بھی ایمان سے محروم رہی اور بہت تھوڑے لوگ اپنے زمانہ کے نبی پر ایمان لائے۔ مگر اے محمد رسول اللہ! اِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ تجھے کسی گھبراہٹ کی ضرورت نہیں کیونکہ تیرا رب جس نے تجھے نہایت ادنیٰ حالت سے ترقی دیتے دیتے اس عظیم الشان مقام تک پہنچایا ہے وہ بڑا غالب اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ بیشک موسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور نوحؑ اور ہودؑ اور صالحؑ اور لوطؑ اور شعیبؑ پر اُن کی قوم کی اکثریت ایمان نہیں لائی۔ مگر جس طرح تیری شان ان تمام نبیوں سے نرالی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کا سلوک بھی تیرے ساتھ ان تمام نبیوں سے نرالا ہے وہ کبھی ایسا نہیں کریگا کہ تیری قوم کی اکثریت ایمان سے محروم رہے۔ بلکہ اُن کی شدید ترین مخالفت کے باوجود اللہ تعالیٰ اُن کی اکثریت کو اپنے دامنِ رحمت میں جگہ دیگا اور انہیں تجھ پر ایمان لانے کی سعادت سے بہرہ ور فرمائیگا۔ یہی حکمت ہے جس کی بناء پر بار بار اس آیت کو دوہرایا گیا ہے اور بار بار رَبَّکَ کے لفظ پر زور دیا گیا ہے۔ رَبَّکَ کہکر اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے اپنی اس غیر معمولی ربوبیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی فرمائی۔ اور اس طرح بتایا کہ جس خدا نے بچپن سے تجھے اپنے کنارِ عاطفت میں رکھا اور تجھے قدم بقدم ترقی دیتے دیتے اس عالی شان مقام تک پہنچایا وہ اب تجھے کس طرح چھوڑ سکتا ہے۔ وہ یقیناً تبلیغِ ہدایت کے معاملہ میں بھی تجھ سے ممتاز سلوک کرے گا۔ اور تیری افضلیت کو باقی تمام انبیاء پر ثابت کر دیگا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ نے جس غیر معمولی رنگ میں ربوبیت فرمائی اور جس طرح نہایت ادنیٰ حالت سے ترقی دیتے دیتے آپؐ کو بلندیوں کے انتہا تک پہنچا دیا اس کی نظیر دنیا کے اور کسی نبی کی زندگی میں نظر نہیں آتی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بچپن میں ہی یتیم رہ گئے تھے۔ آپؐ کے والد محترم آپؐ کی پیدائش سے بھی پہلے اور آپؐ کی والدہ ماجدہ آپؐ کی پیدائش کے چند سال بعد ہی وفات پا گئی تھیں۔ اس کے بعد کچھ عرصہ آپؐ کو آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب نے اپنے پاس رکھا مگر جب وہ بھی وفات پا گئے تو آپؐ اپنے چچا ابوطالب کی کفالت میں آ گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے بڑی محبت اور پیار کے ساتھ آپؐ کی پرورش کی اور ہر نازک سے نازک موقعہ پر انہوں نے آپؐ کا ساتھ دیا۔ مگر آپؐ کی زندگی کا ایک واقعہ ایسا ہے جو ہمیشہ ہی میرے قلب کو مضطرب کر دیا کرتا ہے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ آپؐ کے چچا کے گھر میں جب کھانا تقسیم ہوتا تھا تو آپؐ کبھی بڑھکر

مانگا نہیں کرتے تھے باقی بچے لڑ جھگڑ کر مانگتے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک طرف خاموش کھڑے رہتے اور جب آپ کی چچی آپ کو کچھ دیتی تو آپ لے لیتے۔ خود مانگ کر نہیں لیتے تھے۔ بالعموم اس واقعہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقار اور آپ کی متانت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے مگر میں تو جب بھی اس واقعہ کو پڑھتا ہوں میری طبیعت رقت کے جذبات کے انتہائی مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ نہیں تھا بلکہ بچپن کا زمانہ تھا اور آپ زیادہ سے زیادہ اُس وقت آٹھ نو سال کی عمر کے تھے۔ اور آٹھ نو سالہ بچے کے متعلق یہ ثابت کرنا کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ بڑا باوقار تھا خواہ آئندہ چل کر وہ نبی ہی بننے والا کیوں نہ ہو۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں اَلصَّبِیُّ صَبِیٌّ وَلَوْ کَانَ نَبِیًّا کہ بچہ بچہ ہی ہے خواہ آئندہ زمانہ میں وہ نبی بننے والا ہو۔ میری طبیعت تو یہ واقعہ پڑھ کر اس خیال کو بے تاب ہو جاتی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس بچپن کی عمر میں بوجہ اپنی ذہانت اور سمجھ کے (بعض بچے جو ذہین ہوتے ہیں وہ چچی اور ماں کا فرق کوئی زیادہ نہیں سمجھتے اور وہ اسی طرح چچی سے بھی لڑ جھگڑ کر چیزیں مانگ لیتے ہیں جس طرح ماں سے مانگی جاتی ہیں مگر یہ محبت کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ اُن کی عقل کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے) یہ محسوس کرتے تھے کہ میں اس گھر سے بطور حق کے کچھ نہیں مانگ سکتا۔ مجھ پر تو میرے چچا اور چچی کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے محبت اور پیار سے مجھے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ پس کبھی بھی اس واقعہ کو پڑھتے ہوئے میں بغیر اس کے کہ رقت مجھ پر غلبہ نہ پالے آگے نہیں گذر سکتا۔ اور میں ہمیشہ سوچتا ہوں کہ اُسوقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں کیا جذبات پیدا ہوتے ہونگے بعض دفعہ آپ کے چچا بھی موجود ہوتے اور چچا کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی وہ ایسی تھی کہ باپ

کی طرح ہی تھی۔ اسی وجہ سے بعض دفعہ ابوطالب جب گھر میں آتے اور وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو عام بچوں سے الگ ایک طرف کھڑے دیکھتے اور یہ بھی دیکھتے کہ باقی بچے شور کر رہے ہیں اور لڑ جھگڑ کر چیزیں لے رہے ہیں مثلاً مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے تو ایک کہتا ہے۔ میں مٹھائی کی ایک ڈلی نہیں دو ڈلیاں لونگا۔ دوسرا کہتا ہے۔ اماں مجھے تو تُو نے کچھ بھی نہیں دیا۔ اسی طرح ہر بچہ اپنا اپنا حق جتا کر چیز کا مطالبہ کر رہا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کونہ میں خاموش بیٹھے ہوئے ہیں تو ابوطالب اُنکو بازو سے پکڑ لیتے اور کہتے میرے بچے تو یہاں کیوں خاموش بیٹھا ہے پھر وہ آپ کو لاکر اپنی بیوی کے پاس کھڑا کر دیتے اور کہتے تو بھی اپنی چچی سے چمٹ جا اور اُس سے مانگ۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہ چمٹتے اور نہ کچھ مانگتے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت دراصل انہی جذبات کا نتیجہ تھی کہ آپ سمجھتے تھے۔ میرا اس گھر پر کوئی حق نہیں۔ اور جو کچھ مجھے ملتا ہے بطور احسان ملتا ہے۔ مجھ پر یہ نکتہ اُس وقت کھُلا جب میری بیوی سارہ بیگم فوت ہوئیں اُس وقت اخبار میں جو میں نے مضمون شائع کرایا تھا اُس میں بھی اس واقعہ کا ذکر کر دیا تھا۔ سارہ بیگم کی بچی کی جوتی ایک دفعہ پھٹ گئی جس گھر میں میں نے اُسے رکھا تھا انہوں نے نوکر کو کہا کہ بازار سے جاکر اس بچی کیلئے بوٹ لے آؤ۔ چار پانچ سال اس کی عمر تھی وہ بوٹ لایا میں اُسوقت صحن میں ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے بوٹوں کے جوڑے [illegible] گودی میں لے لئے اور خوشی سے کودی اور کہا۔ آہا میرے بوٹ آ گئے میرے بوٹ آ گئے۔ مگر پھر میں نے دیکھا [illegible] اُس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اُس نے [illegible] بوٹ رکھ [illegible] ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اور بے اختیار اُس کی زبان سے نکلا۔ ہائے اللہ۔ اب میں یہ بوٹ [illegible] ہے۔ تب میرے لئے یہ امر حل ہوا کہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا علیحدہ بیٹھنا بھی اسی قسم کا تھا یہ بچی ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئی تھی اور ۱۹۳۳ء کا یہ واقعہ ہے ایک چار سال کے بچے کے مُنہ سے یہ نقرہ مجھے عجیب قسم کا معلوم ہُوا کہ حیران ہو کر اُس نے بُوٹ زمین پر رکھ دیئے اور کہا۔ ہائے اللہ! اب مَیں بوٹ دکھاؤں کیسے۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو علیحدہ بیٹھنا تھا۔ وہ بھی اسی رنگ کا تھا۔ اب یہ جذبات خواہ کتنے ہی بے چین کرنے والے ہوں اگر کوئی شخص اپنی زندگی کو خدا تعالیٰ کیلئے خرچ کر دیتا ہے تو پھر بھی غم کے جذبات جو دراصل کمزوری کے جذبات ہیں اُسے کہیں کا کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف اُس بچے کو دیکھو جو صحن کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہُوا ہے سارے بچے اس کے پاس سے کودتے ہوئے گذر جاتے ہیں اور اپنی والدہ کے پاس پہنچکر کوئی اس کے کندھے پر چڑھ جاتا ہے کوئی اُس کے دامن سے لپٹ جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے اماں! مَیں فلاں چیز ایک نہیں دو لونگا۔ کوئی کہتا فلاں کو کیوں زیادہ دیا مَیں بھی اُتنا ہی لونگا۔ غرض کوئی کچھ کہہ رہا ہے اور کوئی کچھ۔ مگر وہ ایک گوشہ میں خاموش بیٹھا ہے سارے کا خیال اس کے دل میں نہیں آتا۔ اُس کے دل میں آدھے کا خیال بھی نہیں آتا۔ اُس کے دل میں چوتھے حصّے کا خیال بھی نہیں آتا۔ اُس کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ وہ بیسویں حصّہ کا حقدار ہے۔ بلکہ اُس کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ میری چچی مجھے کچھ دیتی ہے یا نہیں۔ باقی تمام بچے جھپٹ جھپٹ کر مانگتے ہیں، اصرار کرکے مانگتے ہیں مگر وہ ایک گوشہ میں کھڑے یہ خیال کرتا ہے کہ دنیا میں میرا حصّہ ہے ہی نہیں۔ مَیں اگر مانگوں تو کیوں مانگوں۔ اور اگر مانگوں تو کس سے مانگوں۔ لیکن خدا تعالیٰ کی راہ میں زندگی بسر کرنے کے بعد وہی بے کس اور یتیم جب فوت ہوتا ہے تو دنیا میں اس کے سوا کسی اَور کا حصّہ باقی نہیں رہتا۔ ساری ہی دُنیا اُس کی ہو جاتی ہے۔ اور دنیا ہی نہیں خالقِ کون ومکان بھی کہتا ہے کہ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کوئی زمانہ تھا کہ تُو یہ سمجھا کرتا تھا کہ مٹھائی کی ایک ڈلی۔ روٹی کے ایک ٹکڑے اور گوشت کی ایک بوٹی میں بھی تیرا حصّہ نہیں اور تُو گوشۂ تنہائی میں بیٹھا یہ خیال کیا کرتا تھا کہ جن پر میرا حق تھا وہ دنیا میں نہیں رہے۔ مگر اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تجھے پتہ بھی ہے کہ تیری پیدائش سے بھی پہلے جبکہ ابھی کائناتِ عالم وجود میں نہیں آئی تھی۔ ہم نے اسے پیدا ہی تیری خاطر کیا تھا اور ہم نے اُسی وقت سے یہ فیصلہ کیا ہُوا تھا کہ یہ تمام زمین و آسمان مَیں تیری خاطر بناؤں گا۔ اگر تُو نہ ہوتا تو مَیں زمین و آسمان کو بھی پیدا نہ کرتا۔ گو یہ حدیث صوفیاء کی احادیث میں سے ہے اُن احادیث میں سے نہیں جن کو محدثین صحیح قرار دیتے ہیں مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الہام نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سچی حدیث ہے۔ کیونکہ آپؑ کا بھی الہام ہے کہ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ (تذکرہ مٹ ۶۰۲ وطٹ ۶۲۹) اب مقابلہ کرو اس کیفیت کا اُس یتیم کا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ہُوا اپنے آپ کو کامل لاوارث سمجھتا تھا۔ جو مکّہ کے ایک چھوٹے سے غریب گھر میں پیدا ہُوا۔ جو روٹی کے ایک ٹکڑے اور گوشت کی ایک بوٹی پر بھی اپنا حق نہیں سمجھتا تھا۔ وہی ایک دن مکّہ میں داخل ہوتا ہے اور مکّہ کے تمام بڑے بڑے سردار مجرموں کی طرح اُس کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور وہ پوچھتا ہے۔ بتاؤ اب تم سے کیا سلوک کیا جائے۔ گویا وہ جن کے گھر کی ایک دھجّی پر بھی وہ اپنا تصرّف نہیں سمجھتا تھا اُن کے جسم کا تسمہ تسمہ اُس کے قبضہ میں تھا اور وہ تمام سردار گردن ڈالے ہوئے اُس کے سامنے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے آپ ہم سے وہی سلوک کریں جو یُوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کیا۔ چنانچہ وہ یتیم جس سے دنیا نے حسنِ سلوک نہیں کیا تھا جسے دنیا نے غیر حقدار اور لاوارث قرار دیا تھا جب خدا نے اُس کو طاقت دی تو اُس نے

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۴﴾ عَلٰى

اور یقیناً یہ (قرآن) رب العالمین خدا کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ اُس کو لے کر ایک امانت دار کلام بردار فرشتہ (جبریلؑ) تیرے دل پر اُترا ہے

قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۶﴾

تاکہ تو ہوشیار کرنیوالی جماعت میں شامل ہو جائے۔ (اسکو جبریلؑ نے خدا کے حکم سے) کھول کر بیان کرنیوالی عربی زبان میں اُتارا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۷﴾ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً

اور یقیناً اس کا ذکر پہلی کتابوں میں بھی موجود تھا۔ کیا اُن کے لئے یہ نشان کم ہے کہ اِس (قرآن) کو

اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۸﴾

علمائے بنی اسرائیل بھی پہچانتے ہیں (یعنی سمجھتے ہیں کہ یہ قرآن انبیائے بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں کے مطابق ہے)۔ ۲۵

اُن سے یہ سلوک کیا کہ کہا لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ جاؤ تم پر کوئی گرفت نہیں۔ غرض یہ وہ شخص تھا جو اپنی وفات سے ستاون اٹھاون سال پہلے اپنے گھر کے صحن میں اکیلے خاموش کھڑا رہتا اور گھر کی مالکہ سے دوسرے بچوں کی طرح نہ چمٹتا کہ وہ سمجھتا تھا کہ میرا اس گھر میں کوئی حق نہیں۔ مگر پھر اس حالت میں اتنا عظیم الشان تغیر آگیا کہ یا تو آپؐ ایک یتیم اور بے کس تھے اور یا پھر تمام دنیا کا سہارا آپؐ ہی بن گئے اور تمام دنیا کی ماں آپؐ ہی بن گئے۔ وہی یتیم بچہ جو کسی وقت بے باپ اور بے ماں کے تھا۔ ایک وقت اُس پر آیا جب وہ ساری دنیا کا باپ اور ساری دنیا کی ماں بن گیا۔ بلکہ وہی باپ نہیں بنا اُس کی بیویاں بھی مومنوں کی مائیں بن گئیں۔ گویا ابوّت صرف آپؐ تک محدود نہ رہی بلکہ آپؐ سے تعلق رکھنے والوں کی عظمت بھی آپؐ ہی کے ذریعہ قائم ہوئی۔

غرض اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ میں اللہ تعالےٰ نے ان عظیم الشان احسانات کا ذکر فرمایا ہے جو اُس نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر فرمائے اور بتایا ہے کہ جس خدا نے تجھے اتنی عظیم الشان ترقی بخشی وہ اب بھی تجھے کبھی ضائع نہیں کریگا بلکہ تیری ساری مُرادیں تجھے دیگا۔ اور تجھے ساری دنیا پر غلبہ اور فتح عطا کریگا۔ اور یہ غلبہ صرف ایک زمانہ تک محدود نہیں ہوگا۔ بلکہ جس طرح خدا تعالیٰ بار بار رحم کرنے والا ہے اُسی طرح وہ بار بار تجھے غالب کرے گا۔ گویا ہر تاریکی کا دَور جب بھی دُور ہوگا دنیا دیکھے گی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا آفتاب حقانیت اپنی پوری شان کے ساتھ چمک رہا ہے۔

۳۵ حل لغات: ۔ زُبُرٌ : زَبُوْرٌ کی جمع ہے اور اَلزَّبُوْرُ کے معنے ہیں اَلْكِتَابُ. کتاب (اقرب)

تفسیر: ۔ حضرت موسیٰؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت نوحؑ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد جو بعض مخصوص اقوام کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے اب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ کلام جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے یہ سب دُنیا کو مخاطب کر کے نازل کیا گیا ہے۔ جبکہ پہلے کلام صرف بعض خاص خاص قوموں کی ہدایت کے لئے نازل ہوئے تھے اور جبکہ وہ کلام صرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ثبوت تھے۔

یہ کلام ربوبیّت عالمین کا ثبوت ہے اور اس کلام کو رُوح الامین لے کر نازل ہُوا ہے۔ کیونکہ پہلے نبیوں کے کلام میں کئی قسم کی خرابیاں واقع ہوگئی تھیں اور بندوں نے اس کی حفاظت میں کوتاہی کی تھی۔ پس خدا تعالیٰ نے اس رُوح کے ذریعہ سے جو امین ہے محفوظ طور پر یہ کلام آپ پر نازل کیا۔ اور چونکہ کلام الٰہی کے پہنچانے کے لئے اس کا سمجھنا بھی ضروری تھا تاکہ لوگوں تک اس کے پہنچانے میں کسی قسم کی خرابی واقع نہ ہو اسلئے وہ کلام تیرے دل پر نازل کیا گیا ہے اور یقیناً یہ کلام پہلی کُتب میں بھی مذکور ہے۔ اِس طرح بھی کہ اس کے اُصول اُن میں پائے جاتے ہیں اور اِس طرح بھی کہ ان کتابوں میں اِس کی پیشگوئی موجود ہے۔

قرآن کریم کو دوسری الہامی کُتب پر جو فضیلتیں حاصل ہیں اُن میں سے ایک بہت بڑی فضیلت یہ بھی ہے۔ کہ قرآن کریم سے پہلے ربّ العالمین کا خیال دنیا میں معیّن صورت میں موجود نہیں تھا۔ اِس میں کوئی شُبہ نہیں کہ وہ ایک ہستی کو سب دنیا کا خالق و مالک مانتے تھے مگر چونکہ اُنکی تعلیم قومی تھی اور مشرکین خاص طور پر اپنے اپنے خدا الگ پیش کرتے تھے اِس لئے انسانی ذہن محدود خیالات کا مرجع رہتا تھا۔ اِسی وجہ سے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (شعراء ع ۲) اے موسیٰؑ یہ ربّ العالمین کون ہے جس کی طرف سے مبعوث کئے جانے کا تم دعویٰ کرتے ہو۔ اور پھر ڈوبتے وقت بھی اُس نے کہا کہ مَیں ربِّ بنی اسرائیل پر ایمان لاتا ہوں (یونس ع ۹) لیکن قرآن کریم نے اس خیال کو ایک معیّن صورت میں پیش کیا اور اِسی طرح اتحادِ بین الاقوام کی ایسی داغ بیل ڈال دی جو پہلی تعلیموں کے لحاظ سے ناممکن تھی۔ بائیبل پڑھکر دیکھ لو۔ اُس میں یہی دکھائی دیگا کہ "خداوند بنی اسرائیل کا خدا مبارک ہے جس نے تجھے بھیجا ہے" (۱۔ سموئیل باب ۲۵ ایت ۳۲) "خداوند اسرائیل کا خدا ابدالآباد مبارک ہو" (۱۔ تواریخ باب ۱۶ آیت ۳۶) "خداوند خدا اسرائیل کا خدا جو اکیلا ہے عجائب کام کرتا ہے۔" (زبور باب ۷۲ آیت ۱۸) لیکن قرآن کریم نے اِس نقطۂ نگاہ کو بالکل بدل دیا۔ اس نے خدا تعالیٰ کو ربّ العالمین کی شکل میں پیش کیا اور بتایا کہ وہ صرف افراد اور قوموں کا ہی خدا نہیں بلکہ سب مخلوق کا خدا ہے اُس کی ابتداء ہی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے ہوئی ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ جو سب جہانوں کا ربّ ہے اُس کی برکات کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں بلکہ جس طرح جسمانی طور پر اُس کے فیوض سب کو پہنچتے ہیں اِسی طرح رُوحانی طور پر بھی اُس نے اپنے فیض سے کسی کو محروم نہیں کیا۔ کفار کو اس خیال پر اِس قدر حیرت ہوئی کہ وہ بے اختیار کہہ اُٹھے کہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (ص ع ۱) یعنی اِس نے تو کئی خداؤں کو کوٹ کاٹ کر ایک خدا بنا دیا ہے۔ اُن کے خیال میں یہ امر آ ہی نہیں سکتا تھا کہ اصل میں ایک ہی خدا ہے اور باقی سب مصنوعی خدا ہیں کیونکہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں سے یہی الفاظ سُنتے تھے کہ "ہمارا خدا اور تمہارا خدا اور" گو توحید اُن کے سامنے پیش کی جاتی تھی۔ مگر وہ توحید کا یہ مطلب نہیں لیتے تھے کہ سب کا خدا ایک ہے۔ بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا تو ایک ہے مگر وہ بنی اسرائیل کا یا مسیحیوں کا خدا ہے اور اگر وہ سچا ہے تو پھر ہم بغیر خدا کے ہیں؟ مگر اسلام نے بتایا کہ وہ مومن و کافر سب کا خدا ہے اور پھر وہ ایک ہی خدا ہے۔ یہ بیان اس صفائی کے ساتھ دنیا کے لئے بالکل نرالا تھا۔ مگر یہ نرالا پیغام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو دیا گیا اور پھر نرالے طور پر آپ کو ساری دنیا کی طرف رسول بناکر بھیجا گیا جبکہ پہلے انبیاء صرف ایک ایک قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور اس طرح آپ کے ذریعہ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کا تصوّر دنیا میں قائم کیا گیا حالانکہ آپؐ ایک ایسے

ملک میں پیدا ہوئے تھے جس کے باقی دنیا سے کوئی تعلقات
نہیں تھے ۔عرب باقی ساری دنیا سے کٹا ہوا ملک تھا اور
عرب کی دنیا صرف عرب تک ہی محدود تھی - اور اگر وہ دیگر
قوموں کے متعلق کوئی خیال رکھتے بھی تھے تو صرف منافرت
کا خیال تھا ۔عربوں میں تکبّر اتنا زیادہ پایا جاتا تھا کہ وہ
سمجھتے تھے کہ اُن سے بڑا کوئی ہے ہی نہیں ۔صرف رومن
اور ایرانی حکومتوں کی سیاسی برتری کو وہ تسلیم کرتے تھے
گویا سیاسی نقطۂ نگاہ سے تو وہ عرب کو ادنیٰ سمجھتے تھے
لیکن قومی نقطۂ نگاہ سے وہ باقی تمام دنیا کو ذلیل خیال کرتے
تھے اور قومیت کا خیال آتے ہی وہ عرب کو باقی تمام قوموں
سے بالا سمجھنے لگتے تھے ۔ ہاں جب سیاست کا سوال آتا
تو وہ رومن اور ایرانیوں کے درباروں میں جاکر رومی اور
ایرانی بادشاہوں کو حضور کہنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے
کیونکہ جب وہ اُن کے درباروں میں جاتے تھے تو کچھ لینے
کے لئے جاتے تھے ۔غرض نہ وہ جغرافیائی حیثیت سے ایک
دنیا کے قائل تھے اور نہ قومی لحاظ سے ایک دُنیا کے قائل
تھے ۔پھر جو لوگ رومن اور ایرانی درباروں میں جاتے بھی تھے
اُن کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی تھی بالعموم اُن میں وہی
لوگ تھے جنہوں نے اپنے گھروں کے اردگرد سو سو میل سے
باہر قدم نہیں رکھا تھا ۔اِس کے مقابلہ میں بنی اسرائیل ایک
ترقی یافتہ قوم تھی - وہ مصر میں رہتے تھے اور ایک ایسی
قوم کے اقتدار میں رہتے تھے جس کی اپنی حکومت تھی پھر
مصر اُن دنوں سب سے زیادہ متمدن ملک تھا - مصر کے
جہاز یورپ افریقہ اور ہندوستان وغیرہ دوسرے ممالک
میں بھی جاتے تھے اور اُس کی بیرونی ممالک سے تجارت تھی
جس کے نتیجہ میں وہ اُن ممالک سے سیاسی اور تمدنی تعلقات
رکھتا تھا ۔غرض مصر میں رہنے والی قوم باقی دنیا کے حالات سے
غافل نہیں رہ سکتی تھی ۔مصری قوم اس زمانہ میں ویسی ہی متمدن
تھی جیسے آجکل انگلستان کی حکومت ہے ۔انگلستان سیاسی
اور تمدنی طور پر اتنی ترقی کر چکا ہے کہ اُس میں رہنے والا
دُنیا کے حالات سے غافل نہیں رہ سکتا ۔افغانستان میں
رہنے والا غافل رہ سکتا ہے کیونکہ تمدنی اور سیاسی ترقی
میں وہ بھی بہت پیچھے ہے ۔یہی حالت عرب کی مصر کے
مقابلہ میں تھی ۔لیکن مصر میں رہتے ہوئے ،مصری اقتدار کے
ماتحت رہتے ہوئے اور مصری تہذیب کے ساتھ تعلق رکھتے
ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کا خدا پیش کیا ۔
جیسا کہ بتایا جا چکا ہے تورات میں بار بار یہی ذکر آتا ہے ۔ کہ
بنی اسرائیل کا خدا یُوں کہتا ہے ۔بنی اسرائیل کا خدا یُوں کہتا ہے
پھر حضرت مسیح علیہ السلام جن کے زمانہ میں تمدّن بہت پھیل
چکا تھا اور یورپ اور ایشیا آپس میں مخلوط ہو چکے تھے ۔ وہ
بھی یہی کہتے ہیں کہ مَیں بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو اکٹھا
کرنے کے لئے آیا ہوں ۔گویا دنیا میں اتحاد ہو جانے کے باوجود
حضرت مسیح علیہ السلام قومی نظریہ سے اوپر نہیں جا سکے حضرت
مسیح علیہ السلام بھی یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ بنی اسرائیل کے سوا
باقی لوگ خدا تعالیٰ کی مخلوق نہیں ۔ وہ یہ بھی خیال نہیں کرتے
تھے کہ بنی اسرائیل کے علاوہ باقی مخلوق کا خدا خدا نہیں حضرت
مسیح علیہ السلام یہی سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کے علاوہ باقی مخلوق
بھی خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے اور خدا بنی اسرائیل کے علاوہ دوسرے
لوگوں کا بھی خدا ہے مگر باوجود اس کے موسوی نظریہ کے مطابق
حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی یہی نظریہ پیش کیا کہ خدا تعالیٰ
بنی اسرائیل کا باپ ہے اور باقی لوگ اُس کے سوتیلے بیٹے
ہیں ۔اِس کے مقابل پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ ایک
ایسے ملک میں پیدا ہوئے جو تہذیب اور تمدن کے لحاظ سے
بہت پیچھے تھا اور باقی دنیا سے بالکل کٹا ہوا تھا ۔مگر پھر
بھی آپ نے دنیا کے سامنے پہلی دفعہ یہ نظریہ پیش کیا کہ
تمام قومیں خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور خدا تعالیٰ تمام قوموں کا
خدا ہے ۔آپ نے فرمایا ۔ بیشک عرب قوم میری مخاطب ہے
اور مَیں اسی میں پیدا ہوا ہوں مگر مَیں صرف اسی قوم کی بہبودی اور

ہدایت کے لئے مبعوث نہیں ہوا۔ بلکہ بُعِثْتُ اِلَی الْاَسْوَدِ وَالْاَبْیَضِ وَالْاَحْمَرِ وَالْاَصْفَرِ میں سیاہ اور سفید اور سُرخ اور زرد سب قوموں کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔ کوئی چینی ہو یا افریقی، انگریز ہو یا امریکن ہندوستانی ہو یا جاپانی ان ساروں کے لئے مجھے مبعوث کیا گیا ہے۔ اور میری زندگی ان تمام قوموں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ رہے مگر بنی اسرائیل کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ رہے مگر اپنی قوم کیلئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام زندہ رہے مگر فلسطینیوں کیلئے۔ حضرت نوح علیہ السلام زندہ رہے مگر عراقیوں کے لئے۔ حضرت کرشن اور حضرت رامچندر علیہما السلام زندہ رہے۔ مگر ہندوستانیوں کے لئے۔ انہوں نے تکالیف بھی اٹھائیں مصائب بھی برداشت کئے مگر صرف بنی اسرائیل کے لئے یا صرف فلسطینیوں کے لئے یا صرف عراقیوں کے لئے یا صرف ہندوستانیوں کے لئے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے حکم سے فرماتے ہیں کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی میں اگر تکالیف اور دُکھ اٹھاتا ہوں تو صرف ایک قوم کے لئے نہیں بیشک میں عرب قوم میں پیدا ہوا ہوں اور وہ میری پہلی مخاطب ہے لیکن میرے دُکھ اور میرے مصائب ساری دنیا کے لئے ہیں۔ کیونکہ میں نے اپنی ساری زندگی خدا تعالیٰ کے لئے وقف کی ہوئی ہے اور ایسے خدا کے لئے وقف کی ہوئی ہے جو ربّ العالمین یعنی سب جہانوں کی ربوبیّت کرنے والا ہے۔ میں صرف عرب قوم کا لیڈر نہیں ہوں۔ میں تو خدا تعالیٰ کا جو ربّ العالمین ہے بندہ ہوں اور اُس کی خاطر میں نے اپنی ساری زندگی وقف کی ہوئی ہے۔ وہ اگر ربّ العٰلمین ہے اور اگر وہ سب جہانوں کی ربوبیّت کرتا ہے تو اُس کا خادم ہونے کی حیثیت سے میری تکالیف اور دُکھ کسی خاص قوم کے ساتھ کیوں مخصوص ہوں۔ میں نے خدا تعالیٰ کو رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ سمجھ کر مانا ہے۔ ربِّ عرب یا ربِّ بنی اسرائیل سمجھ کر نہیں مانا۔ اور جب میں نے اسے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ سمجھ کر مانا ہے تو اُس کی جتنی بھی مخلوق ہے سب کی خاطر مجھے اپنے اوپر تکالیف وارد کرنی چاہئیں۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں کثرت سے اس قسم کے احکام پائے جاتے ہیں کہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے۔ مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس جب ایک غیر قوم کی عورت نے آکر کہا کہ اے اُستاد تُو مجھے بھی اُس سچائی سے حصّہ دے جو تُو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرتا ہے تو اُس عورت کی خاطر دُکھ اور تکلیف اُٹھانا تو الگ رہا حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا۔ بیٹوں کی روٹی میں کتّوں کے آگے کیسے پھینک دوں۔ گویا اُنکی نگاہ میں بنی اسرائیل تو خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے اور غیر قومیں کُتّوں کی مانند تھیں۔ اُس کے مقابلہ میں اسلام کے ابتدائی زمانہ میں۔ ایسے ابتدائی زمانہ میں جبکہ ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی جبکہ قرآن کریم کا ایک پارہ بھی پورا نازل نہیں ہوا تھا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ہدایت اور راستی کے متلاشی آتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی یونانی ہوتا ہے جیسے صُہیبؓ۔ کوئی حبشہ کا ہوتا ہے جیسے بلالؓ۔ کوئی ایران کا ہوتا ہے جیسے حضرت سلمانؓ۔ یہ لوگ آتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی یہ خواہش پیش کرتے ہیں کہ ہمیں بھی اپنی تعلیم سُنائیے۔ اُن کے سوال کے جواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں فرماتے کہ کوئی شخص اپنے بیٹوں کی روٹی کُتّوں کے آگے نہیں پھینک سکتا۔ بلکہ آپ سمجھتے ہیں کہ جس طرح عرب قوم ہے ویسے ہی یہ لوگ بھی ہیں۔ آپؐ فوراً انہیں تعلیم دینا شروع کر دیتے ہیں۔ بلکہ دینی تعلیم دینا تو الگ رہا یہاں تک ثابت ہے، کہ دو بھائی تھے جو عربی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے تھے

یا بہت کم علم رکھتے تھے۔ وہ صرف بائیبل جانتے تھے اور
لوہا کوٹا کرتے تھے۔ آپؐ اُن دونوں بھائیوں کو اشاروں کے
ساتھ تبلیغ کیا کرتے تھے۔ جب آپؐ وہاں سے گذرتے تو
اُن کے پاس کھڑے ہوجاتے۔ وہ دونوں یونانی تھے اور
آپ کی باتیں نہیں سمجھ سکتے تھے۔ لیکن آپؐ محبت کی وجہ سے
وہاں کھڑے ہوجاتے اور اُن کی باتیں سُنتے۔ پھر آپؐ انہیں
تبلیغ کرنے لگ جاتے۔ زبان تو وہ سمجھ نہیں سکتے تھے
آپؐ اشاروں سے انہیں تبلیغ کرتے۔ مثلاً اللہ کا لفظ کہکر
آسمان کی طرف اشارہ کردیا۔ آہستہ آہستہ اُن دونوں کو
آپؐ سے اُنس ہوتا گیا۔ اور بالآخر وہ دونوں ایمان لے آئے
اِسی طرح بلالؓ حبشی تھے۔ اور حبشی غلام بنائے جاتے تھے
لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان لوگوں میں سے نہیں تھے
جن کے نزدیک کوئی غیر قوم مقہور و ذلیل ہو بلکہ آپؐ کے
نزدیک سب قومیں یکساں طور پر خدا تعالیٰ کی مخلوق تھیں
آپؐ کو یونانیوں اور حبشیوں سے بھی ویسا ہی پیار تھا
جیسے عربوں سے۔ یہی محبت تھی جس نے اِن غیر قوموں
کے دلوں میں بھی آپؐ کا وہ عشق پیدا کردیا جس کو عرب
کے بھی بہت سے لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے۔ پھر عرب قوم میں پیدا ہوئے
اور عربوں میں سے بھی قریش قبیلہ میں پیدا ہوئے جو دوسری عرب
قوموں کو بھی حقیر اور ذلیل سمجھتا تھا۔ آپؐ کو حبشیوں سے کیا
جوڑ تھا۔ اگر آپؐ کسی قوم یا قبیلہ کو محبت ہونی چاہیئے تھی تو وہ
بنو ہاشم کو ہونی چاہیئے تھی۔ آپؐ سے کسی کو محبت ہونی
چاہیئے تھی تو قریش کو ہونی چاہیئے تھی یا پھر عرب کے لوگوں
کو ہونی چاہیئے تھی۔ غیر قوموں کے دلوں میں جن کی حکومتوں کو
آپؐ کے لشکروں نے تباہ کردیا تھا جن کی قومی برتری کو اسلامی
سلطنت نے بیکار کرکے رکھ دیا تھا محبت ہو ہی کیسے سکتی
ہے۔ نہیں تو آپؐ سے دشمنی ہونی چاہیئے تھی مگر رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کے عشق کا یہ حال تھا کہ آپؐ کی
وفات کے کئی سال بعد ایک دن کچھ لوگ دمشق میں اکٹھے ہوئے
اور انہوں نے باتوں باتوں میں کہا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے زمانہ میں بلالؓ اذان دیا کرتے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پھر
اُن کی اذان سُنیں۔ چنانچہ انہوں نے بلالؓ سے جو رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ سے شام چلے گئے تھے
اور پھر شام سے دمشق جا پہنچے تھے اپنی اس خواہش کا اظہار
کیا۔ لیکن انہوں نے انکار کردیا اور کہا۔ رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کے بعد میں نے اذان دینا چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ جب
بھی میں اذان دینے کا ارادہ کرتا ہوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کا زمانۂ مبارک میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ
بات میری برداشت سے باہر ہوجاتی ہے۔ حضرت عمرؓ بھی
اُن دنوں دمشق آئے ہوئے تھے۔ لوگوں نے آپ سے عرض
کیا کہ آپ بلالؓ سے کہیں کہ وہ اذان دیں۔ ہم میں وہ لوگ بھی
ہیں جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور ہمارے
کان ترس رہے ہیں کہ پھر بلالؓ کی اذان سُنیں۔ اور ہم میں
وہ بھی ہیں جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نہیں
دیکھا صرف باتیں سُنی ہیں وہ بھی خواہش رکھتے ہیں کہ اُس
شخص کی اذان سُن لیں جس کی اذان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
سُنا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بلالؓ کو بلایا اور فرمایا لوگوں
کی خواہش ہے کہ آپ اذان دیں۔ آپ نے فرمایا۔ آپ خلیفۂ وقت
ہیں آپ کی خواہش ہے تو میں اذان دے دیتا ہوں۔ لیکن میرا دل
برداشت نہیں کرسکتا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کھڑے
ہوگئے اور انہوں نے بلند آواز سے اُسی رنگ میں اذان دی جس
رنگ میں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اذان
دیا کرتے تھے۔ بلالؓ کی آواز جونہی فضا میں گونجی رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک کو یاد کرکے آپؐ کے صحابہؓ
جو عرب کے باشندے تھے اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں
ہوگئے اور بعض کی چیخیں بھی نکل گئیں۔ لیکن حضرت بلالؓ
جو حبشی تھے جن سے عربوں نے خدمتیں لیں جنہیں عربوں سے

کوئی خونی رشتہ نہیں تھا اور نہ بھائی چارے کا تعلق تھا وہ اذان ختم کرتے ہی بے ہوش ہوگئے اور چند منٹ کے بعد اُنکی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس دعویٰ پر غیر قوموں کی گواہی تھی کہ میرے نزدیک عرب اور غیر عرب میں کوئی فرق نہیں۔ یہ گواہی تھی غیر قوموں کی جنہوں نے آپؐ کی محبت بھری آواز کو سُنا اور اس کا اثر جو انہوں نے دیکھا اُس نے انہیں اِس یقین پر بھر دیا کہ اُن کی اپنی قوم اُن سے وہ محبت نہیں کرسکتی تھی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن سے کی۔

پھر لوگ مرتے ہیں تو اپنی تکلیف اور دُکھ کی وجہ سے انہیں دوسروں کا خیال تک نہیں آتا۔ کیونکہ وفات کے وقت غیر معمولی تکلیف ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے جس شخص کو وفات کے وقت زیادہ تکلیف ہوتی تھی۔ مَیں خیال کرتی تھی کہ وہ گنہگار ہے۔ مگر جب مَیں نے آپؐ کی وفات دیکھی تو سمجھا کہ یہ بات غلط ہے کیونکہ آپؐ کی نزع کی حالت نہایت تکلیف دہ تھی۔ وفات کے وقت مرنے والوں کو عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنا کام اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو سنبھال جائیں مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے اور بیماری کی وجہ سے جب ایسی حالت کو پہنچے کہ آپؐ کے لئے چلنا بھی مشکل ہوگیا۔ تو ایک دن آپؐ سہارا لے کر مسجد میں آئے اور صحابہؓ کو اکٹھا کیا اور فرمایا۔ ہر ایک انسان آخری وقت میں کوئی نہ کوئی نصیحت کرتا ہے۔ مَیں بھی تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ یہ غلام تمہاری طرح خدا تعالیٰ کے بندے ہیں اور تمہارے بھائی ہیں اِن کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کرنا اور جو شخص یہ برداشت نہ کرسکتا ہو کہ اُن کے ساتھ نیک سلوک کرے اُسے چاہیئے کہ انہیں آزاد کردے لیکن جو شخص اُن سے کام لینا چاہتا ہو وہ جو کچھ خود کھائے وہی انہیں کھلائے جو خود پہنے وہی انہیں پہننے کو دے جس حالت میں وہ خود رہے اُسی حالت میں انہیں بھی رکھے۔ اور اگر تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں کرسکتا تو اسے اُن سے خدمت لینے کا بھی کوئی حق نہیں پھر فرمایا۔ اے میرے صحابہؓ! عورت پر بہت بڑا ظلم ہوتا رہا ہے۔ مَیں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اُن کے حقوق ادا کرو۔ ہمیں انبیاءِ سابقین کے متعلق یہ معلوم نہیں کہ وہ کیسے فوت ہوئے۔ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق پتہ لگتا ہے کہ جب آپ کو صلیب پر لٹکایا گیا تو اگرچہ وہ اُنکی وفات کا وقت نہیں تھا تاہم آپ نے آنکھیں کھول لیں اور حضرت مریم کو رنجیدہ کھڑے دیکھ کر آپ نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے بیٹے کے مصلوب ہوجانے کے بعد اپنے کسی ولی اور نگران کی عدم موجودگی پر افسوس کر رہی ہیں۔ آپ نے اپنے حواری تھوما سے کہا۔ گو جذبات کی وجہ سے آپ اپنا فقرہ مکمل نہ کرسکے کہ اے تھوما یہ ہے تمہاری ماں اور اے عورت یہ ہے تمہارا بیٹا جس کے یہ معنے تھے کہ مَیں تھوما پر اعتبار کرتا ہوں اور اسے تمہارا بیٹا بناتا ہوں۔ اور اے تھوما مَیں تم پر اعتبار کرتا ہوں اور اسے تمہاری ماں بناتا ہوں۔ یہ بڑا نیک جذبہ ہے جو حضرت مسیح کے دل میں پیدا ہوا۔ مگر اُس شخص کی محبت کتنی بالا ہے جو وفات کے وقت اپنے اعزاء اور اقرباء کو بھول جائے اور غریب اور مظلوم کی ہمدردی میں اپنے آخری لمحات گذار دے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کے وقت اگر کسی کا خیال کیا تو وہ صرف مظلوموں مقہوروں عورتوں اور اُن بے بس اور بے کس لوگوں کا تھا جن کی پرورش کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

پھر عین وفات کا وقت آتا ہے تو آپؐ کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہوتا ہے کہ خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے جنہوں نے اپنے بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہیں بنالیا ہے

یہود اور نصاریٰ بھی موحد تھے مگر اُن میں سے جو قبروں کو سجدہ کرتے تھے۔ انہیں آپؐ نے حقارت سے دیکھا اور اُن سے اظہارِ نفرت فرمایا۔ اس فقرے کے معنے درحقیقت یہ تھے کہ اے مسلمانو! تم کسی کو ربّ العلمین نہ بنانا۔ ربّ العالمین صرف خدائے واحد ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے پھر جب موت کا وقت اور قریب آتا ہے تو اُس وقت آپؐ کی زبان پر جو الفاظ جاری ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اَللّٰهُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی۔ اَللّٰهُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی۔ بے شک آپؐ نے یہاں رَفِیْق کا لفظ استعمال فرمایا ہے مگر اَلْاَعْلٰی کا لفظ ربّ العلمین کی طرف ہی اشارہ کرتا ہے۔ گویا رفیق کہکر آپ نے اپنے تعلق باللہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور اَلْاَعْلٰی کہکر اُس کے رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

غرض رَبُّ الْعٰلَمِیْن کا صحیح معنوں میں تصوّر صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہی دنیا میں قائم ہُوا۔ چنانچہ اسی امر کی طرف زیرِ تفسیر آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ پہلے تمام انبیاء صرف اپنی اپنی قوم کی ہدایت کے لئے آتے تھے اور اُن پر جو کلام نازل ہوئے وہ بھی مختص القوم اور مختص الزمان تھے مگر اب یہ کلام رَبُّ الْعٰلَمِیْن خدا کی طرف سے دنیا کی تمام قوموں، دنیا کے تمام ملکوں اور قیامت تک آنے والے تمام زمانوں کے لئے نازل کیا گیا ہے اور پھر اس کلام کو ایک بڑی خصوصیت یہ حاصل ہے کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۔ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۔ رُوح الامین اس کلام کو لے کر تیرے دل پر نازل ہُوا ہے تاکہ تُو لوگوں کو ہوشیار اور بیدار کرنے والے لوگوں میں شامل ہو جائے۔ عیسائی اس بات کو ہمیشہ بڑے فخر کے ساتھ پیش کیا کرتے ہیں کہ مسیح پر رُوح القدس نازل ہُوا تھا۔ حالانکہ قرآن کریم نہ صرف یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر رُوح القدس نازل ہُوا تھا بلکہ وہ اس سے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر روح الامین نازل ہوا ہے۔ پھر روح القدس کے نازل ہونے کا وہ ان الفاظ میں ذکر فرماتا ہے کہ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۔ (نحل ع۱۴) یعنی اے محمد رسول اللہ تُو لوگوں سے کہدے کہ اس کلام کو رُوح القدس نے تیرے ربّ کی طرف سے حق و حکمت کے ساتھ اُتارا ہے۔ تاکہ جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں وہ ایمان پر ثبات بخشے۔ اسی طرح یہ کلام اللہ تعالیٰ کے اطاعت گذار بندوں کے لئے مزید ہدایت اور انہیں بشارت دینے کے لئے اُس نے نازل کیا ہے۔ پس یہ بالکل غلط ہے کہ رُوح القدس کا نزول صرف حضرت مسیحؑ کے ساتھ مخصوص تھا قرآن کریم کو بھی رُوح القدس ہی لے کر نازل ہُوا ہے۔ اور پہلے نبیوں پر بھی روح القدس ہی نازل ہوتا رہا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر قرآن کریم یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ ہر فرشتہ ہی پاک اور معصوم ہے اور اس لحاظ سے جو فرشتہ بھی کلام لے کر نازل ہو وہ رُوح القدس ہی کہلاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ ملائکہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (تحریم ع۱) یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں جس بات کا بھی حکم دیا جائے اُس کی نافرمانی کرنے کی اُن میں طاقت ہی نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ انہیں کہا جائے وہی کچھ وہ عمل کرتے ہیں۔ پس رُوح القدس کا مفہوم درحقیقت فرشتہ کے لفظ میں ہی شامل ہے لیکن قرآن کریم کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک مزید امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ آپؐ پر رُوح الامین نازل ہُوا۔ یعنی وہ فرشتہ نازل ہُوا جس کے ذمہ یہ بھی فرض تھا کہ وہ قرآن کریم کو صحیح و سالم صورت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائے گویا قرآن کریم کے دونوں حصّوں کی حفاظت کا انتظام کر دیا گیا۔ ایک طرف تو اُس کے نزول میں کسی غلطی یا نسیان کا

امکان باقی نہ رہا۔ کیونکہ رُوح الامین اُسے لے کر نازل ہُوا اور دوسری طرف نزول کے بعد مستقل طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمادیا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر ع ۱) یعنی ہم نے ہی اس ذکر کو اتارا ہے اور ہم یقیناً اسکی حفاظت کریں گے۔ گویا قرآن کریم کے متعلق دونوں زمانوں میں حفاظت کا انتظام کرلیا گیا۔ لیکن انجیل کے دونوں زمانوں کے متعلق کوئی وعدہ نہیں۔ نہ تو انجیل میں کوئی ایسی آیت ہے جس میں یہ ذکر ہو کہ جب انجیل کی وحی آئی تو رستہ میں اُس کی حفاظت کا انتظام کیا گیا۔ یا جب تک وہ حضرت مسیحؑ کے دماغ میں رہی اور دنیا میں نہیں پھیلی اُس وقت تک اُس کی حفاظت کی گئی اور نہ کوئی ایسی آیت ہے جس میں یہ ذکر ہو کہ جب مسیحؑ نے وہ وحی لکھوا دی یا سُنا دی تو اُس کے بعد قیامت تک خدا تعالیٰ نے اُس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لی پس انجیل کی حفاظت کا ثبوت خود انجیل سے کوئی نہیں ملتا۔ لیکن قرآن کریم کی مکمل حفاظت کا ثبوت خود قرآن کریم سے ہی ملتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب مطہر پر وحیٔ الٰہی کے نازل ہونے تک بلکہ جب تک وہ وحی دنیا میں شائع نہیں ہوئی اُس وقت تک کی حفاظت کا ثبوت اِس آیت سے ملتا ہے اور دُنیا میں شائع ہوجانے کے بعد اسکی حفاظت کا ثبوت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ سے ملتا ہے۔ گویا خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی الٰہی کے نازل ہونے کے وقت سے لیکر قیامت تک قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ موجود ہے جس کے مشابہ وعدہ بھی انجیل میں کوئی موجود نہیں۔

غرض رُوح الامین میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کلام کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر انتظام کیا گیا ہے تاکہ پہلی کُتب کی طرح اِس میں کوئی بگاڑ پیدا ہو۔ ورنہ ہر فرشتہ اپنی ذات میں امین ہی ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب کسی صفت کا خاص طور پر ذکر کیا جائے تو اُس سے مراد اُس کے خاص ظہور کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً جہاں رُوح القدس کا لفظ استعمال کیا جائے وہاں اِس طرف اشارہ کرنا مقصود ہوگا کہ یہ کلام اپنے اندر قدوسیت کی صفت رکھتا ہے اور یہ صفت سب نبیوں کے الہام میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ لیکن امین کی صفت سے جبریلؑ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا ہے یہی وجہ ہے کہ صرف آپؐ کے کلام کی حفاظت کی گئی جبکہ پہلی الہامی کُتب انسانی دست بُرد کا شکار ہوچکی ہیں۔

اِس کے بعد فرماتا ہے کہ روح الامین نے یہ کلام تیرے دل پر نازل کیا ہے یعنی روح الامین کا فرضِ حفاظت اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ وحی تیرے دل پر نازل نہ ہوجائے تاکہ اُس کے نتیجہ میں تُو لوگوں تک اِس وحی کو عمدگی سے پہنچا دے۔ اسجگہ وحیٔ الٰہی کو قلب پر نازل کرنے کے یہ معنے ہیں کہ جس طرح کلام الٰہی لفظوں میں نازل ہوتا ہے اِسی طرح نبی کے دل کو بھی ساتھ ساتھ تقویت دی جاتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کا کلام جس شخص پر نازل ہوتا ہے اُسے ایک قلبی پاکیزگی اور استقامت بھی عطا کی جاتی ہے تاکہ وہ اُسے دنیا میں قائم کرنے میں کامیاب ہوسکے۔ پس قلب پر نازل ہونے کے یہ معنے ہیں کہ وہ صرف پیغامبر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ کلام اُس کے دل کے اندر جذب ہوجاتا ہے اور وہ اُس کا جزو ہوجاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شرعی اور غیر شرعی یا ظلّی وحی میں ایک فرق ہوتا ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ ہر شرعی وحی نبی کے قلب پر بھی نازل ہوتی ہے۔ چونکہ اُس وحی کے متعلق یہ حکم ہوتا ہے کہ اِس پر اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ کہو۔ اِس لئے یہ قلب پر نازل ہوتی ہے اور جوں جوں نازل ہوتی ہے وہ ایمان کو مضبوط کرتی چلی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اِس آیت سے ایک غلطی کھائی ہے خصوصاً بہائیوں کو اِس سے غلطی لگی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جو خیال بھی دل میں آجائے وہ وحی

ہوتا ہے حالانکہ قرآن کریم اور احادیث سے پتہ لگتا ہے کہ وحی زبان پر بھی نازل ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتا ہے لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ کہ تُو زبان کو جلدی جلدی حرکت نہ دیا کر۔ اِس کے معنے یہ ہیں کہ وحی زبان پر بھی نازل ہوتی ہے۔ اصل میں یہ دوہری وحی ہوتی ہے۔ یہ وحی زبان پر بھی نازل ہوتی ہے اور دل پر بھی اس کا نزول ہوتا ہے۔ لیکن دوسروں کو جو وحی ہوتی ہے وہ بروزی اور ظلّی طور پر ہوتی ہے اور اِس قسم کی ہر وحی قلب پر نازل نہیں ہوتی۔ وہ بعض دفعہ کان پر نازل ہوتی ہے۔ مثلاً انسان ایک کلام سُنتا ہے۔ اور کہتا ہے مجھے یہ الہام ہُوا ہے۔ یا اُس کی زبان پر کوئی الفاظ جاری ہو جاتے ہیں اور وہ کہتا ہے مجھے الہام ہُوا ہے یا فلاں کلام میری زبان پر جاری ہُوا ہے۔ مگر تشریعی انبیاء کی جو وحی ہوتی ہے یا بعض اوقات ظلّی اور بروزی انبیاء کی وحی بھی صرف کان اور زبان پر ہی نازل نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک ہی وقت میں کان یا زبان اور اُس کے ساتھ قلب پر بھی نازل ہوتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تین جگہ نازل ہوتی ہے۔ ایک تو وہ زبان یا کان پر نازل ہوتی ہے۔ دوسرے قلب پر نازل ہوتی ہے اور تیسرے دماغ پر نازل ہوتی ہے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ یہ وحی کتاب مکنون میں ہے یعنی یہ وحی ایک طرف تو اس قرآن میں نازل کی گئی ہے۔ اور دوسری طرف اسے انسانی فطرت کے اندر رکھ دیا گیا ہے پس تشریعی انبیاء کی وحی زبان یا کان پر نازل ہونے کے علاوہ قلب پر بھی نازل ہوتی ہے اور میخ کی طرح دل میں گڑ جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ یعنی چونکہ یہ وحی تیرے قلب پر نازل ہوتی ہے اس لئے تیرے اندر اس وحی کے متعلق غیر معمولی استقامت پائی جاتی ہے۔ اور تو کہتا ہے کہ اگر تم سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں لاکر بھی رکھ دو۔ اور پھر مجھ سے کہو کہ میں خدائے واحد کی توحید کی اشاعت کرنے سے رُک جاؤں تو میں ایسا نہیں کرونگا۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کی وحی میرے دل پر نازل ہوئی ہے۔ اگر وہ میرے قلب پر نازل نہ ہوتی تو میں تمہاری باتوں کو بھی سُنتا لیکن اَب یہ سوال ہی باقی نہیں رہا کہ میں تمہاری بات سُنوں۔ کیونکہ خدا تعالےٰ نے میرے دل پر اپنی وحی نازل کی ہے اور میرے دل میں آہنی میخ کی طرح توحید کا عقیدہ راسخ کر دیا ہے۔

بہرحال جیسا کہ میں نے بتایا ہے بعض لوگوں نے اِس آیت سے دھوکا کھایا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ جو خیال بھی دل میں پیدا ہو وہ وحی ہوتا ہے۔ حالانکہ وحی زبان اور کان پر بھی نازل ہوتی ہے اور اُس کے ساتھ ہی اُسکا قلب پر بھی نزول ہوتا ہے تاکہ اُس کی تائید ہو جائے لیکن بہاءاللہ ایک طرف تو اقرار کرتے تھے کہ مجھے لفظی وحی نہیں ہوتی اور دوسری طرف اُن کے دل میں جو خیالات بھی پیدا ہوں اُن کو وہ الہام قرار دے دیتے تھے۔ یہی کیفیت گاندھی جی کی تھی۔ وہ بھی بعض دفعہ اپنے خیالات کا نام الہام رکھ لیا کرتے تھے۔ لیکن اسجگہ جس وحی کا ذکر ہے اُس میں مقررہ الفاظ ہوتے ہیں جو تکرار کے ساتھ دوہرائے جاتے ہیں اور زبان یا کان کے علاوہ انسانی قلب پر بھی جاری ہوتے ہیں اور اُن میں اس قدر تکرار ہوتا ہے کہ بعض دفعہ آدھا آدھ گھنٹہ تک ایک ایک فقرہ کو دوہرایا جاتا ہے۔

پھر اگر قرآن کریم میں صرف یہی آیت ہوتی کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ تو ہمیں دھوکا لگ سکتا تھا کہ شاید اِس میں دل کے خیالات کو ہی وحی قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے علاوہ بعض اور آیات بھی قرآن کریم میں آتی ہیں جن سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور آپؐ کے کان پر بھی وحی نازل ہوتی تھی اور وہ وحی معیّن الفاظ میں ہوتی تھی۔ مثلاً

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ (القیامۃ ع) یعنی اے محمد رسول اللہ! تو اپنی زبان کو جلدی جلدی حرکت نہ دیا کر۔ اس قرآن کو جمع کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور اس کا دُنیا کو سُنانا بھی ہمارا کام ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھ لیا کریں تو اس کے بعد تُو بھی اسے پڑھ لیا کر۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحیٔ الٰہی بڑی سرعت سے نازل ہوتی تھی اس لئے آپؐ جلدی جلدی اس کلام کو اپنی زبان سے دہرانے لگتے تھے تاکہ ان الفاظ پر قابو پا سکیں اور وہ آپؐ کے دماغ میں پوری طرح محفوظ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تسلّی دی کہ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں آپ پر جو کلام نازل کیا جا رہا ہے یہ شریعتِ الٰہیہ کا حامل ہے اور شرعی الہام بھولا نہیں کرتا۔ کیونکہ اگر وہ بھول جائے تو وحیٔ متلوّ ہی ادھوری رہ جائے۔ ہاں ہم یہ کلام پڑھ لیا کریں تو اسکے بعد تُو بھی اسے پڑھ لیا کر۔ یہ آیت اس امر پر نصِ صریح ہے کہ قرآن کریم صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مطہّر پر ہی نازل نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ السنزاً کا آپؐ کو پڑھایا بھی جاتا تھا اور پڑھایا اُسی صورت میں جا سکتا ہے جب کہ وہ آپؐ پر معین الفاظ میں نازل ہوتا۔

اِسی طرح قرآن کریم صراحتاً اس کلام کو کلام اللہ قرار دیتا ہے جس سے نہ صرف اس وسوسہ کو دُور کیا گیا ہے کہ نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جو خیالات پیدا ہوتے تھے اُنہی کو آپؐ وحیٔ الٰہی قرار دیتے تھے۔ بلکہ کلام اللہ کہہ کر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کتاب میں شروع سے لے کر آخر تک جو کچھ لکھا ہے یہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس میں کسی کے دل کے خیالات کا تو کیا ذکر ہے کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو کسی انسان کا بنایا ہُوا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ (توبہ ع) یعنی اگر ان مشرکوں میں سے جو تجھ سے برسرِ جنگ ہیں کوئی شخص پناہ مانگے۔ تو تُو اسے پناہ دے تاکہ وہ اس کتاب کو سُن سکے جو تجھ پر نازل ہوئی ہے اور جو ساری کی ساری کلام اللہ ہے۔ پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو سُن لے اور چاہے کہ اپنی قوم کے لوگوں کے پاس واپس چلا جائے تو چاہیئے کہ اُسے پوری حفاظت کے ساتھ اس علاقہ میں پہنچا دیا جائے جو اُس کے لئے امن کا مقام ہے اِسی طرح قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ (سورۃ العلق ع) یعنی اے محمد رسول اللہ! تو اپنے ربّ کا نام لے کر پڑھ جس نے سب اشیاء کو پیدا کیا ہے۔ تُو اپنے اُس ربّ کا نام لے کر پڑھ جس نے انسان کو خون کے ایک لوتھڑے سے پیدا کیا ہے۔ یہ بھی بتاتا ہے۔ کہ قرآنی آیات معیّن الفاظ میں آپؐ پر نازل ہوتی تھیں جن کی آپ پوری طرح تلاوت فرما سکتے تھے۔ پھر قرآن کریم کا بار بار یہ فرمانا کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ یا قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ یا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ یا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ یہ سب آیات وحیٔ الفاظ پر دلالت کرتی ہیں۔ اِسی طرح حدیث میں آتا ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بعض اوقات مجھ پر وحی صلصلۃ الجرس کی طرح آتی ہے اور صلصلۃ الجرس یعنی گھنٹی کی آواز کو کان کے ذریعہ سُنا جاتا ہے۔ اِسی طرح آپ فرماتے ہیں: وَ اَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِيْ فَاَعِيْ مَا يَقُوْلُ (بخاری باب کیف کان بدءُ الوحی) یعنی کبھی اللہ تعالیٰ کا فرشتہ آدمی کی شکل میں متمثّل ہو کر میرے پاس آجاتا ہے اور وہ مجھ سے کلام کرتا ہے جسے میں اپنے دماغ میں محفوظ

رکھ لیتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی زبان اور کان اور آنکھوں پر بھی نازل ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اُس کا دل پر بھی نزول ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ شخص جس پر وحی نازل ہوتی ہے سب سے بڑا مومن ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے کانوں اور زبان کے ساتھ ساتھ اُس کے دل پر بھی وحی کا نزول ہوتا ہے۔ اور چونکہ سارے عقائد اور خیالات دل سے ہی پیدا ہوتے ہیں اس لئے اگر دل پر وحی نازل ہو گئی تو یہ ساری چیزیں آپ ہی آپ درست ہو جاتی ہیں۔ غرض وحی کے کئی مراتب ہوتے ہیں۔ انبیائے تشریعی کی وحی اَور درجہ کی ہوتی ہے اور انبیائے بروزی اور ظلّی کی وحی اَور درجہ کی ہوتی ہے انبیائے بروزی اور ظلی وحی کو بھی بھول سکتے ہیں انبیائے تشریعی شرعی وحی کو نہیں بھولتے۔ کیونکہ اگر شریعت ہی بھول جائے تو اُن کی اُمت تباہ ہو جائے۔ اِسی طرح انبیائے بروزی اور ظلّی کی ایسی وحی بھی جو کسی پہلی وحی کی تفصیل بیان کرنے یا کسی خاص نکتۂ معرفت کے بیان کرنے کے لئے آتی ہے وہ بھی نہیں بھولتی کیونکہ اس کے لئے بھی وہی قانون جاری ہے جو شرعی وحی کے لئے ہے اور اس کی بھی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ عام وحی کی بھی ایک قسم کی حفاظت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر یہ وحی ہو کہ فلاں شخص مر جائیگا یا طاعون آجائیگی تو اس وحی کی بھی ایک قسم کی حفاظت ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر وہ اخبارِ غیبیہ جن پر خدا تعالےٰ اپنے کسی بندہ کو اطلاع دیتا ہے ساری کی ساری بھول جائیں تو وہ لوگوں کو سُنائی کیسے جا سکیں۔ لیکن بہرحال اُسے وہ مقام حاصل نہیں ہوتا جو تشریعی وحی کو حاصل ہوتا ہے کہ اُس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک شعشہ کی حفاظت ہوتی ہے۔

پھر فرماتا ہے بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ اسے خدا تعالیٰ نے ایک ایسی زبان میں نازل کیا ہے جو اپنے مطالب کو خوب کھول کر بیان کرنے والی ہے۔ درحقیقت کسی کلام کی حفاظت کا ایک یہ بھی پہلو ہوتا ہے کہ جو کلام نازل ہو اُس کو سمجھنے والے لوگ دنیا میں پائے جاتے ہوں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُس نے قرآن کریم کو حفاظت کے اس پہلو سے بھی نوازا ہے اور اسے ایک ایسی زبان میں نازل کیا ہے جو اپنے مضمون کو آپ واضح کرتی ہے اور پھر وہ ہر قسم کے دلائل بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔

مفردات راغب جو قرآنی لغت کی مشہور کتاب ہے اُس میں اَلْعَرَبِيُّ کے معنے اَلْمُفْصِحُ کے لکھے ہیں یعنی اپنے مدّعا کو خوب صفائی اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والا اور اَلْإِعْرَابُ کے معنے کھولنے اور واضح کرنے کے لکھے ہیں۔ پس بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ میں تو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری شرعی کلام اُس زبان میں نازل فرمایا ہے جو مطالب کے اظہار کے لئے اپنے اندر پورا سامان رکھتی ہے اور ہر مسئلہ پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے اور مُبِيْنٍ میں یہ بتایا کہ وہ صرف مقاصد کے اظہار پر ہی قدرت نہیں رکھتی بلکہ اپنے ساتھ دلائل اور براہین کا بھی ذخیرہ رکھتی ہے۔ گویا قرآن کریم کا صرف عربی زبان میں ہونا معجزہ نہیں بلکہ قرآن کا عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ہونے میں معجزہ ہے۔ یعنی اس کی ایسی زبان ہے کہ اُس کے اندر دلائل بھی بیان کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ ہم کیوں حکم دیتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو کیوں منواتے ہیں فرشتوں کو کیوں منواتے ہیں۔ رسولوں کو کیوں منواتے ہیں جھوٹ سے کیوں منع کرتے ہیں سچ کی کیوں تائید کرتے ہیں ظلم سے کیوں روکتے ہیں۔ انصاف کی کیوں تائید کرتے ہیں غرض یہ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ میں ہے اور اپنے احکام کی دلیلیں بھی دیتا ہے۔ جھوٹا آدمی بات تو کہہ دیگا مگر اُسکی دلیل کہاں سے لائیگا۔ مگر یہ کلام تو ایسی زبان میں نازل ہُوا ہے جو عربی ہی نہیں بلکہ مبین بھی ہے یعنی جو بات بھی کہتی ہے اُس کو کھول کر رکھ دیتی ہے اور اُسکی معقولیت کے

دلائل بھی دیتی ہے۔

پھر فرمایا وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ۔ قرآن کریم کو ایک اور فضیلت یہ بھی حاصل ہے کہ اس کا ذکر پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اور اُن میں صراحتاً اس کے نزول کی خبر دی گئی ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ کلام دنیا کو ایک عربی نبی کی زبان سے سُنایا جائیگا۔ چنانچہ مثال کے طور پر اس کے ثبوت میں یسعیاہ نبی کی ایک پیشگوئی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے اٹھائیسویں باب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی پیشگوئی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"وہ کس کو دانش سکھائیگا۔ کس کو وعظ کرکے سمجھائیگا۔ اُن کو جن کا دُودھ چھڑایا گیا جو چھاتیوں سے جدا کئے گئے کیونکہ حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون۔ قانون پر قانون ہوتا جاتا۔ تھوڑا یہاں تھوڑا۔ ہاں وہ وحشی کے سے ہونٹوں اور اجنبی زبان سے اُس گروہ کے ساتھ باتیں کریگا کہ اُس نے اُن سے کہا کہ یہ وہ آرامگاہ ہے۔ تم اُن کو جو تھکے ہوئے ہیں آرام دیجیو۔ اور یہ چین کی حالت ہے۔ پر تے شنوا نہ ہوئے۔ سو خدا کا کلام اُن سے یہ ہوگا حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون۔ قانون پر قانون۔ تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں۔ تاکہ وے چلے جاویں اور پچھاڑی گریں اور شکست کھائیں اور دام میں پھنسیں اور گرفتار ہوویں۔"

(یسعیاہ باب ۲۸ آیت ۹ تا ۱۳)

یسعیاہ نبی نے اس کلام میں یہ پیشگوئی فرمائی تھی کہ ایک زمانہ میں اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کی روحانی تشنگی اور بھوک کو دور کرنے کے لئے آسمان سے اپنا دودھ نازل فرمائیگا۔ مگر [illegible] اس قوم کو پایا جائیگا [illegible]

ایک لمبے عرصہ سے چھاتیوں سے جُدا ہو چکے ہونگے یعنی جن پر فترت کا ایک لمبا زمانہ آچکا ہوگا۔ اور اس کلام کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ یکدم نازل نہیں ہوگا اور نہ کسی ایک شہر اور مقام میں نازل ہوگا۔ بلکہ قانون پر قانون اور حکم پر حکم مختلف مقامات میں نازل ہوگا اور ایک لمبے زمانہ میں اس الٰہی قانون کی تکمیل ہوگی۔

پھر اس کلام کا ایک اور وصف یہ ہوگا کہ وہ ایک اجنبی یعنی غیر زبان میں نازل ہوگا۔ اور آنے والا مقدس رسول وحشی کے سے ہونٹوں کے ساتھ گفتگو کرے گا۔ یہ وحشی کا لفظ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عربی نبی ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ بائیبل کی اصطلاح میں عربوں کیلئے وحشی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی بناء پر پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی "وحشی" قرار دیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ لفظ اُس تعصب کے اظہار کے لئے بنو اسرائیل نے اختیار کیا تھا جو اُن کے دلوں میں بنو اسماعیل کے متعلق پایا جاتا ہے۔ اگر وہ تعصب کا شکار نہ ہوتے تو آسانی سے وہ عرب کا لفظ استعمال کرسکتے تھے۔ مگر انہوں نے اس لفظ کو اختیار کرنے کی بجائے پہلے اس کا ترجمہ کیا اور پھر ترجمہ کے لئے بھی وحشی کا لفظ اختیار کرلیا۔ اس لفظ کا انتخاب اس بناء پر کیا گیا کہ عربی زبان میں ع ر ب کے معنے اپنے مافی الضمیر کو پوری عمدگی کے ساتھ بیان کرنے کے ہوتے ہیں اور عربوں کا نام عرب بھی اسی لئے رکھا گیا تھا کہ وہ ادب کے دلدادہ اور نہایت فصیح و بلیغ کلام کرنے کے عادی تھے۔ مگر چونکہ وہ جنگلوں میں رہتے تھے اور خیموں میں اُن کی زندگی کٹتی تھی اُن کے مخالف انہیں خیموں اور جنگلوں میں رہنے والا کہنے کی بجائے وحشی کہنے لگ گئے۔ اور بائیبل نے بھی یہی طریق اختیار کیا۔ اسی وجہ سے یسعیاہ نبی کی پیشگوئی میں بیان کیا ہے کہ وہ

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ فَقَرَاَهٗ

اور اگر ہم اِس کو عجمیوں میں سے کسی پر اُتارتے۔ اور وہ اسکو اِن (کفار) کے سامنے پڑھکر

عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ كَذٰلِكَ

سُناتا تو وہ کبھی بھی اِس پر ایمان نہ لاتے۔ اِسی طرح

سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۱﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ

ہم نے مجرموں کے دلوں میں یہ (بات) داخل کر چھوڑی ہے۔ (پس) وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے

بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَاْتِيَهُمْ

یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔ پس وہ (عذاب) اُن کی لاعلمی میں

بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ

اُن کے پاس اچانک آ جائے گا۔ تب وہ کہیں گے کیا

"وحشی کے سے ہونٹوں سے کلام کرے گا۔"

یعنی وہ عرب میں مبعوث ہوگا۔ اور عربی میں اُسپر کلام الٰہی نازل ہوگا۔ چنانچہ اِسی امر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے پہلے بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ کے الفاظ لائے گئے ہیں اور پھر کہا گیا ہے کہ تمہیں اس کلام کے قبول کرنے میں کسی قسم کے تردد اور ہچکچاہٹ سے کام نہیں لینا چاہیئے کیونکہ تمہارے اپنے نبیوں کی کتابوں میں اُس کے متعلق پیشگوئیاں موجود ہیں۔[1]

پھر فرمایا۔ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ کیا اُن کیلئے یہ نشان کم ہے کہ اس قرآن کو علمائے بنی اسرائیل بھی پہچانتے ہیں۔ یعنی بنی اسرائیل کے انبیاء نے جب اس قرآن کی خبر دی ہے۔ اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدتوں پہلے گذر چکے تھے اور اُن کی بتائی ہوئی خبریں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم پر پوری اُتر آئی ہیں تو کیا قرآن کریم کے ماننے کے لئے یہ نشان کافی نہیں۔

اِس آیت سے ایک اور مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ یعنی قرآن کریم کا پہلی کتابوں میں بھی ذکر ہے۔ اور کتابیں ہمیشہ نبیوں پر ہی نازل ہُوا کرتی ہیں۔ اِس آیت میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کیا اِن لوگوں کے لئے یہ نشان کافی نہیں کہ بنی اسرائیل کے علماء اس کو جانتے ہیں۔ پس سیاقِ کلام کو مدنظر رکھتے ہوئے صاف ظاہر ہے کہ اسجگہ علماء سے وہی لوگ مراد ہیں جن پر زُبر نازل ہوئیں اور چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

[1] اس بارہ میں تفصیلات کے شائق تفسیر کبیر جلد اوّل ف ۳۷۰ تا صفحہ ۳۹۰ ملاحظہ فرمائیں جہاں بائیبل کی اِن پیشگوئیوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۵﴾

ہمیں ڈھیل مل سکے گی۔ سو (بتاؤ کہ) کیا یہی لوگ ہمارے عذاب کو جلدی مانگا کرتے تھے۔

اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿۲۰۶﴾ ثُمَّ

پس کیا تجھے یقین نہیں ہے کہ اگر ہم اُن کو سالوں تک فائدہ پہنچاتے جاتے۔ پھر

جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۷﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ

اُن کے پاس وہ (عذاب) آجاتا جس کا اُن سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ تو جو کچھ بھی اُن کو دیا گیا ہے وہ

مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ

اُن سے اُس (عذاب) کو ٹلا نہیں سکتا تھا۔ اور ہم نے کسی بستی کو بغیر اس کے کہ اس کی طرف

نے بھی فرمایا ہے کہ عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (مکتوب امام ربانی دفتر اول حصہ چہارم صفحہ ۳۳ مکتوب ۲۳۴) اسلئے ہم اِس آیت کو مدّنظر رکھتے ہوئے کامل یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس کلام کا صرف یہی مفہوم ہے کہ اَنْبِیَآءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ یعنی جس قسم کے نبی بنی اسرائیل میں گذرے ہیں ویسے ہی نبی میری امت میں بھی آئیں گے۔ اِس کے یہ معنے نہیں کہ صاحب شریعت نبی میری امت میں آسکتے ہیں۔ کیونکہ مشابہت کبھی تمام اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے اور کبھی چند اجزاء پر۔ چونکہ قرآن کریم کی دائمی حفاظت کا ذکر پہلے آچکا ہے اِس لئے قرآن کریم کے بعد کسی نئی شریعت کا آنا تو ناممکن ہے۔ پس ایسے ہی انبیاء آسکتے ہیں جو بغیر شریعت کے ہوں اور حدیث بتاتی ہے کہ اِس قسم کے انبیاء کا آنا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تسلیم فرمایا ہے۔

اِن آیات پر غور کرکے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ اسجگہ قرآن کریم کی صداقت اور اس کی عظمت اور اس کی ضرورت پر کیسا کامل اور لطیف مضمون بیان کیا گیا ہے۔ اِن آیات میں بتایا گیا ہے کہ (۱) یہ وہ کتاب ہے جو خداتعالیٰ نے اتاری ہے (۲) یہ وہ کتاب ہے جو جبرئیل لایا ہے (۳) یہ وہ کتاب ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے پاک اور مقدس انسان کے دل پر اُتاری گئی ہے۔ (۴) یہ وہ کتاب ہے جس کی غرض گمراہوں کو ہوشیار کرنا اور اُن کو آئندہ زندگی میں پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کرنا ہے (۵) یہ وہ کتاب ہے جس کا ذریعۂ بیان عربیٔ مبین ہے (۶) یہ وہ کتاب ہے جس کی خبر پہلی کتب میں بھی موجود ہے۔ یا یہ کہ اصولی تعلیم میں اِس کی پہلی کُتب کے ساتھ مشابہت ہے اِس لئے اس کا انکار درحقیقت تمام مذاہب اور رسولوں کا انکار ہے۔ اور اِس پر ایمان لانا انسان کو مجموعی طور پر اُن تمام برکات اور انوار سے مستفیض کرتا ہے جن انوار اور برکات سے انفرادی طور پر پہلے صرف ایک ایک قوم مستفیض ہوا کرتی تھی بلکہ ذوقِ ایمان رکھنے والے کے لئے تو صرف یہی ایک نشان کافی ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل

إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ ﴿٢٠٩﴾ ذِكْرَىٰ ۛ وَمَا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٢١٠﴾

نبی بھیجے ہوں ہلاک نہیں کیا - یہ اس لئے کیا گیا کہ اُنکو نصیحت پہنچ جائے - اور ہم ظالم نہیں - ۳۶ے

بھی اپنی پیشگوئیوں میں ذکر کرتے رہے ہیں۔ پھر اگر اتنے بڑے شواہد کی موجودگی میں بھی کوئی شخص اسکا انکار کرتا ہے تو سوائے اِس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ اُس کی آنکھیں روحانی بینائی سے محروم ہو چکی ہیں۔

۳۶ے حل لغات:۔ اَلْاَعْجَمِیْنَ۔ اَلْاَعْجَمُ کی جمع ہے۔ اور اَلْاَعْجَمُ کے معنے ہیں مَنْ لَا یُفْصِحُ وَلَا یُبَیِّنُ کَلَامَهٗ وَاِنْ کَانَ مِنَ الْعَرَبِ۔ وہ شخص جو اپنے مافی الضمیر کو عربی زبان میں پوری طرح کھول کر ادا نہیں کر سکتا خواہ وہ شخص عرب کے علاقہ کا ہو اور عربی جانتا ہو۔ اِسی طرح اَلْاَعْجَمُ کے معنے ہیں مَنْ لَیْسَ بِعَرَبِیٍّ وَاِنْ اَفْصَحَ بِالْعَجَمِیَّةِ۔ وہ شخص جو عرب کے علاقہ کا نہ ہو اور خواہ وہ اپنی زبان خوب فصاحت سے بولتا ہو لیکن اُس کو بھی اعجم ہی کہیں گے (اقرب)

سَلَکْنٰهُ: سَلَکَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور سَلَکَ الشَّیْءَ فِی الشَّیْءِ کے معنے ہیں اَدْخَلَهٗ فِیْهِ۔ کسی چیز کو کسی چیز میں داخل کیا کَمَا تُسْلَکُ الْیَدُ فِی الْجَیْبِ وَالْخَیْطُ فِی الْاِبْرَةِ۔ جیسے ہاتھ جیب میں داخل کیا جاتا ہے یا دھاگہ سوئی میں۔ (اقرب) پس سَلَکْنٰهُ کے معنے ہونگے ہم نے اُس کو داخل کیا۔

مُنْظَرُوْنَ: مُنْظَرٌ کی جمع ہے جو اَنْظَرَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اور اَنْظَرَهٗ کے معنے ہیں اَمْهَلَهٗ اُس کو مہلت دی (اقرب) پس مُنْظَرُوْنَ کے معنے ہونگے مہلت دیئے ہوئے۔

تفسیر:۔ اب فرماتا ہے کہ اگر ہم اِس کلام کو کسی عجمی پر نازل کرتے اور وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ پڑھ کر سُناتا تو یہ لوگ اس پر کبھی ایمان نہ لاتے لُغت عرب کے لحاظ سے اَعْجَم اس شخص کو کہتے ہیں جس کا کلام فصیح نہ ہو اور اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح واضح نہ کر سکے۔ خواہ وہ شخص عرب ہی کیوں نہ ہو اور اَعْجَم کا لفظ ایسے شخص کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو عربی نہ ہو۔ خواہ عجمی زبان میں وہ بڑا فصیح ہو (اقرب) اِس میں بتایا کہ اگر کلام کا حامل کوئی غیر عربی شخص ہوتا تو یہ لوگ کہہ سکتے تھے کہ یہ ایک غیر قوم کا آدمی ہے ہم اسکے حالات سے واقف نہیں ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ہم کو دھوکا دے رہا ہے یا نہیں دے رہا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِن کی اپنی قوم کے آدمی ہیں اور یہ لوگ آپؐ کے حالات کو خوب جانتے ہیں۔ پھر یہ کیوں فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا۔ جس نے ساری عمر انسانوں پر جھوٹ نہیں بولا وہ خدا پر کس طرح جھوٹ بول سکتا ہے۔ اِسی لئے ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ع۲) یعنی اے لوگو! میں اپنی زندگی کا ایک بیشتر حصہ تم میں گذار چکا ہوں کیا اُس کو دیکھتے ہوئے تم پھر بھی عقل سے کام نہیں لیتے اور یہ نہیں سمجھ سکتے کہ جس شخص کی راستبازی اور دیانت کے تم آج تک قائل رہے ہو وہ اب صداقت کے خلاف اتنا بڑا قدم کس طرح اُٹھا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ پر افترا کرنے لگ جائے۔

زیر تفسیر آیت میں بھی اِسی نکتہ کی طرف کفار کو توجہ دلائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود عربوں میں سے ہیں اور ہیں بھی مکّہ کے رہنے والے۔ اگر انہوں نے کسی غیر ملک میں زندگی بسر کی ہوتی تو تم کہہ سکتے تھے

کہ گویا یہ شخص ہماری قوم کا ہے گھر رہا باہر ہے۔ اس لئے ہم
اس کے حالات کو نہیں جانتے۔ اور یقین سے نہیں کہہ سکتے
کہ یہ شخص سچا ہے یا جھوٹا۔ لیکن اب تو تمہارے لئے انکار کی
کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ ایک تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
خود تمہاری قوم میں سے آئے ہیں اور دوسرے انہوں نے اپنے
بچپن اور جوانی کی عمر تم میں گذاری ہے اور تم لوگ اُن کے
اخلاق سے اچھی طرح واقف ہو۔ اور تم خود اس بات کے
گواہ ہو کہ اُس نے صداقت کے خلاف کبھی کوئی قدم نہیں
اُٹھایا۔ بلکہ اس کی صداقت اور دیانت کا یہ عالم ہے کہ
تم لوگ اسے اپنی قوم کا سب سے بڑا راستباز اور دیانتدار
انسان قرار دیتے رہے ہو۔ ایسے حالات میں تم اُس کو
کس طرح جھوٹا قرار دے سکتے ہو۔ جبکہ اس کی صداقت
کے خارجی ثبوت بھی موجود ہیں اور پُرانے انبیاء کی پیشگوئیاں
بھی اس پر صادق آرہی ہیں۔ مگر چونکہ ان تمام شواہد کو
نظر انداز کرتے ہوئے اہل عرب نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی مخالفت پر کمربستہ ہو جانا تھا اس لئے فرمایا۔ کَذٰلِکَ
سَلَکْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ۔ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰی
یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی قوم کا انکار بتا رہا ہے کہ یہ صرف پہلی اُمتوں کے نقش قدم
پر چل رہے ہیں۔ پہلی اُمتوں نے بھی موسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور
نوحؑ اور ہودؑ اور صالحؑ اور لوطؑ اور شعیبؑ کے نشانات
دیکھنے کے باوجود اپنے نبیوں کا انکار کیا تھا۔ اسی طرح
یہ لوگ کر رہے ہیں۔ اور اُس وقت تک ایمان نہیں لائینگے
جب تک کہ وہ خدائی عذاب کو نہیں دیکھ لینگے۔ پھر بتایا کہ وہ
عذاب تو آکر رہیگا مگر فَیَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ
وہ اچانک آئیگا جیسا کہ قدیم سے اللہ تعالیٰ کی سُنت چلی آ
رہی ہے اور اسی طرح پوشیدہ بڑھتے ہوئے آئیگا کہ اُن کو
پتہ نہیں لگیگا۔ چنانچہ دیکھ لو فتح مکہ کا واقعہ ایسا اچانک ہوا
کہ ابوسفیان جیسا جہاندیدہ سردار بھی حیران رہ گیا اور
جب اُس نے مکہ کے ارد گرد رات کی تاریکی میں دس ہزار
سپاہیوں کے خیموں کے سامنے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے
دیکھے تو گھبرا کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ یہ کیا ہے
کیا آسمان سے اچانک کوئی لشکر اُتر آیا ہے۔ کیونکہ عرب
کی کسی قوم کا اتنا بڑا لشکر نہیں ہو سکتا۔ اُس کے ساتھیوں
نے مختلف قبائل کے نام لینے شروع کر دیئے کہ شاید
فلاں ہو مگر ابوسفیان اُن کی ہر بات کو رد کرتا چلا گیا
اور کہنے لگا نہیں نہیں عرب کی کسی قوم کا لشکر بھی اتنا بڑا
نہیں۔ ابھی وہ یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ اسلامی گارد
جو پہرہ پر مقرر تھی پہنچ گئی اور انہوں نے ابوسفیان اور
اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ پھر دیکھو کس طرح قرآنی
پیشگوئی کے مطابق اس عذاب کو دیکھ کر وہ لوگ ایمان لے
آئے جبکہ پہلے نبیوں کی قوموں میں سے اکثر اُن پر ایمان نہیں
لائے اور اس طرح خدا نے اپنے عزیز اور رحیم ہونیکا ثبوت دیدیا۔

پھر فرماتا ہے۔ فَیَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ۔
اَفَبِعَذَابِنَا یَسْتَعْجِلُوْنَ۔ اَفَرَءَیْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ
سِنِیْنَ۔ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا کَانُوْا یُوْعَدُوْنَ۔ مَآ اَغْنٰی
عَنْهُمْ مَّا کَانُوْا یُمَتَّعُوْنَ۔ یہ لوگ اپنی مجالس میں عذاب
آنے میں دیر لگنے کی وجہ سے کہتے ہیں کہ شاید ہمارا حال پہلی
اُمتوں جیسا نہیں ہوگا۔ شاید ہم کو ڈھیل دی جائیگی اور عذاب
جلدی نہیں آئیگا۔ فرمایا۔ اس کے معنے تو یہ ہیں کہ یہ لوگ
اپنی ہنسی اور تمسخر سے ہمارے غضب کو بھڑکانا چاہتے ہیں اور
عذاب بہت جلدی لانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ اتنا تو سوچیں کہ
اگر ہم کچھ مدت تک ان پر عذاب نہ بھی لائیں اور اسکے بعد
ان پر عذاب آجائے تو عذاب کے وقفہ کا درمیانی عرصہ
ان کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ فائدہ تو انہیں ہدایت سے
ہی پہنچ سکتا ہے مگر وہ ہدایت اختیار کرنے کی طرف کوئی
توجہ نہیں کر رہے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَمَآ اَهْلَکْنَا مِنْ قَرْیَةٍ اِلَّا لَهَا

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿٢١١﴾ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهُمْ وَمَا

اور شیطان اِس (قرآن) کو لے کر نہیں اُترے - اور نہ یہ کام اُن کے مطابق حال تھا اور نہ وہ

يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿٢١٢﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿٢١٣﴾ فَلَا

اِس کی طاقت رکھتے تھے - وہ یقیناً (کلام الٰہی کے) سُننے سے دُور رکھے گئے ہیں - پس تُو

تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿٢١٤﴾

اللہ (تعالیٰ) کے ساتھ کسی اَور کو معبود نہ پکار - ورنہ تُو مبتلائے عذاب لوگوں میں سے ہو جائیگا۔ ۳۷ھ

مُنْذِرُوْنَ ۝ ذِكْرٰى وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ - اِن لوگوں کو اِتنا تو سوچنا چاہیئے کہ کیا کبھی ایسا ہُوا کہ ہم نے کسی بستی کو اتمامِ حجّت کے بغیر ہلاک کر دیا ہو - ہر قوم پر جب بھی عذاب آیا تاریخی شہادت موجود ہے کہ اُس سے پہلے ایک نبی آیا جس کی بڑی غرض یہی تھی کہ انہیں سمجھائے اور بدیوں سے باز رہنے کی نصیحت کرے - اگر بغیر اِس انذار کے ہم اُن لوگوں پر عذاب نازل کر دیتے - تو ہم لوگوں کی نگاہ میں ظالم ٹھہرتے مگر ہم ایسے نہیں ہیں - اور ہم بغیر ہوشیار کرنے کے کسی قوم کو اپنے عذاب سے ہلاک نہیں کیا کرتے - پس اِن لوگوں کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ جب اُن کی طرف ایک ہوشیار کرنے والا انسان آگیا ہے تو اُس کے انکار پر عذاب بھی ضرور آئیگا کیونکہ جس طرح ڈرانے والے کے بغیر عذاب نہیں آتا اِسی طرح ڈرانے والے کے بعد اُس کے انکار پر ضرور عذاب آتا ہے کیونکہ اگر اُس وقت عذاب نہ آئے تو ڈرانے والا جھوٹا قرار پاتا ہے -

ذِكْرٰى کہہ کر بتایا کہ ڈرانے والے کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ نصیحت حاصل کریں - یہ غرض نہیں ہوتی کہ لوگ تباہ ہو جائیں - اِسی لئے ڈرانے والے کے بعد بھی عذاب میں ڈھیل دی جاتی ہے - تاکہ جو لوگ ایمان لا سکتے ہوں وہ ایمان لے آئیں - اگر کسی نبی کی بعثت کے معًا بعد عذاب آجائے تو نصیحت حاصل کرنے کا کوئی موقعہ نہیں بچتا۔

۳۷ھ تفسیر:- اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفّار کے ایک اعتراض کی تردید فرمائی ہے - اُن کا اعتراض یہ تھا کہ اِس شخص کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے اور اُس کی طرف سے اُس پر کلام نازل ہوتا ہے - چنانچہ گو قرآن کریم نے اُن کے اِس اعتراض کو الفاظ کی شکل میں نقل نہیں کیا - لیکن اِس اعتراض کی طرف قرآن کریم کے مختلف مقامات میں اشارات ضرور پائے جاتے ہیں - مثلاً اللہ تعالیٰ سورۂ تکویر میں فرماتا ہے وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (تکویر ع) یعنی اِس رسول پر نازل ہونے والا کلام کسی دھتکارے ہوئے شیطان کا قول نہیں ہے - اِسی طرح زیرِ تفسیر آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ - شیطانوں نے اِس کلام کو نہیں اُتارا - اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفّار کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اِس پر شیطان نازل ہوتا ہے - افسوس ہے کہ بعض مسلمان مفسّرین نے اِس قول کو اَور بھی پکّا کر دیا اور کفّار کے ہاتھوں میں انہوں نے ایک خطرناک ہتھیار دے دیا اور وہ اِس طرح کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کفّارِ مکّہ کے سردار رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ آپؐ کے ماننے والے تو ادنیٰ لوگ ہیں - اگر

آپؐ دین میں کچھ نرمی کردیں تو ہم لوگ بھی آپؐ کے پاس آ کر بیٹھا کریں۔ اس طرح دوسرے لوگ بھی آپؐ کے پاس آنے لگیں گے۔ اتنے میں آپ نماز پڑھنے لگے جب آپؐ نے یہ آیت پڑھی کہ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى کہ تم بھی ذرا لات اور عزّیٰ کا حال سُناؤ اور تیسرے منآۃ کا بھی جو انکے علاوہ ہے۔ تو شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیئے کہ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى۔ یعنی یہ لمبی گردنیں رکھنے والے بُت بڑی اعلیٰ شان کے مالک ہیں اور ان کی شفاعت کی یقینی طور پر اُمید کی جاسکتی ہے کفار نے یہ بات سُنی تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ چنانچہ جب آپؐ نے سورۃ ختم کی اور سجدہ کیا تو سب کفار نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے سمجھا کہ آپؐنے دین میں نرمی کر دی ہے۔ اس روایت کو اتنے طریقوں سے بیان کیا گیا ہے کہ ابن حجرؒ جیسے آدمی بھی کہتے ہیں کہ اس کی تاویل کی ضرورت ہے۔ مَیں اسوقت اس کی تاویل میں نہیں پڑتا کیونکہ اسپر تفصیلی بحث سورۂ حج میں گذر چکی ہے۔ مَیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کیا واقعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہُوا۔ مجھے قاضی عیاض کا یہ قول بے انتہا پسند ہے کہ بعض محدثین کی قلم سے شیطان نے یہ حدیث لکھوا دی ہے گویا اگر شیطان کا تسلّط تسلیم ہی کرنا ہے تو کیوں نہ اس کا تسلّط محدثین پر تسلیم کرلیا جائے۔ یہ تو قاضی عیاض کا جواب ہے۔ قرآنی جواب یہ ہے کہ تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى کا فقرہ جہاں جہاں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے معًا بعد یہ آیت آتی ہے کہ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۔ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (سورہ نجم ع) یعنی کیا تمہیں تو اپنے لئے بیٹے پسند ہیں اور خدا تعالیٰ کے لئے تم لڑکیاں تجویز کر رہے ہو۔ یہ تقسیم تو نہایت ہی ناقص اور ظالمانہ تقسیم ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ نے ان بتوں کی تائید کے لئے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ اَب بتاؤ کہ کیا اس فرضی کلام کے بعد جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کوئی شخص ان آیتوں کو سُنکر یہ خیال بھی کر سکتا تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عقائد میں نرمی اختیار کر لی ہے اور اس پر کوئی بے وقوف سے بے وقوف مشرک بھی سجدہ کر سکتا تھا۔

پس یہ آیات ہی بتا رہی ہیں کہ ان میں وہ فقرے داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے جو بُتوں کی تعریف میں بیان کئے جاتے ہیں۔ آخر کفار عربی تو جانتے تھے۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اس سورۃ کے تو لفظ لفظ میں شرک کی مذمت کی گئی ہے پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے اپنے دینی عقائد میں نرمی اختیار کر لی ہے۔

یہی مضمون زیر تفسیر آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار کا یہ الزام کہ اس شخص پر شیطان کلام نازل کرتا ہے درست نہیں کیونکہ (الف) اس شخص کا اپنا چال چلن ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ ہے کہ ایسے آدمیوں کا شیطان سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ (ب) پھر جو تعلیم اس پر نازل ہوئی ہے وہ بھی مطہّر اور پاک ہے کہ ناپاک شیطان اس تعلیم کو اُتار ہی نہیں سکتا۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ شیطان خود اپنے خلاف تعلیم اُتارے۔ پھر جبکہ اس کلام میں شیطان کے خلاف تعلیم ہے۔ تو یہ کلام اس کی طرف سے کیسے نازل ہو سکتا ہے (ج) اس کتاب میں آسمانی علوم ہیں اور اس میں شیطانی کلام کا اس قدر ردّ ہے کہ اگر شیطان یا اس کے ساتھی اس میں کچھ ملانا بھی چاہیں تو نہیں ملا سکتے کیونکہ کہیں کوئی عبارت کھپ ہی نہیں سکتی اور پھر وہ آسمانی علوم

کے بیان کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے کیونکہ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ خدا تعالیٰ نے انہیں آسمان کی باتیں سُننے سے محروم کیا ہُوا ہے گویا آسمان پر جاکر باتیں سُننا تو الگ رہا وہاں تک کسی کے جانے کی طاقت بھی قرآن کریم نے تسلیم نہیں کی مگر عجیب بات یہ ہے کہ بعض مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ شیطان آسمان پر جاتا ہے اور وہ ملاءِ اعلیٰ اور جبریلؑ اور عرش کی باتوں کو سنکر زمین پر آجاتا ہے اور پھر وہ اپنے چیلے چانٹوں کو وہ خبریں بتاتا پھرتا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ شیطان آسمانی کلام سُننے کی طاقت ہی نہیں رکھتا۔ خدا تو خدا ہے۔ اِس دنیا کے معمولی معمولی بادشاہوں کے پاس پھٹکنے کی بھی لوگوں میں طاقت نہیں ہوتی اور وہ اُن کے قریب جانے سے لرزتے اور گھبراتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ زمین و آسمان کے خدا کے راز شیطان اُچک کر لے آئے۔ اور وہ انہیں بگاڑ کر دُنیا میں پھیلانا شروع کر دے۔ غرض قرآن کریم کفار کے اس الزام کی تردید کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ شیاطین نے اس کلام کو نازل نہیں کیا اور یہ کام نہ اُن کے مناسب حال تھا اور نہ وہ اس کی طاقت رکھتے تھے۔ یعنی قرآن کریم میں تو وہ نصیحتیں ہیں جو شیطانی تعلیموں کے بالکل خلاف ہیں۔ پھر یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ شیطان نے خود اپنے خلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تعلیم نازل کر دی۔ یہ دلیل حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں استعمال کی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ :-

"پھر وہ ایک گونگی بدروح کو نکال رہا تھا۔ اور جب وہ بدروح نکل گئی تو ایسا ہُوا کہ گونگا بولا اور لوگوں نے تعجب کیا لیکن اُن میں سے بعض نے کہا۔ یہ تو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے۔ بعض اور لوگ آزمائش کے لئے اُس سے آسمانی نشان طلب کرنے لگے۔ مگر اُس نے اُن کے خیالات کو جان کر اُن سے کہا جس سلطنت میں پھوٹ پڑے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس گھر میں پھوٹ پڑے وہ برباد ہو جاتا ہے اور اگر شیطان بھی اپنا مخالف ہو جائے تو اُس کی سلطنت کس طرح قائم رہے گی کیونکہ تم میری بابت کہتے ہو کہ یہ بدروحوں کو بعلزبول کی مدد سے نکالتا ہے۔"

(لوقا باب ۱۱ آیت ۱۴ تا ۱۸)

اِسی طرح متی میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح نے اُن سے کہا :-

"اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہو گیا۔ پھر اُس کی بادشاہی کس طرح قائم رہے گی۔"

(متی باب ۱۲ آیت ۲۶)

قرآن کریم بھی یہی دلیل مخالفوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور انہیں توجہ دلاتا ہے کہ اگر تمہارا یہ اعتراض صحیح ہو کہ شیطان نے یہ کلام نازل کیا ہے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ شیطان نے اپنا بیڑہ آپ غرق کر لیا۔ کیونکہ اس کتاب کے لفظ لفظ میں شیطان کو دھتکارا گیا ہے اور اس کی ایک ایک تعلیم میں اُس پر پھٹکار ڈالی گئی ہے۔ اب یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ شیطان نے خود اپنے خلاف اتنا بڑا مواد فراہم کر دیا۔ یہ تو عقل کے بالکل خلاف ہے۔

اِسی طرح وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ میں جو دلیل استعمال کی گئی ہے کہ اس قرآن میں تو غیب کی خبریں ہیں اور غیب کی خبریں بیان کرنا شیطان کے اقتدار سے باہر ہے۔ یہ بھی انجیل میں استعمال کیا گیا ہے اور حضرت مسیحؑ نے واضح کیا ہے کہ علمِ غیب صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے اور شیاطین تو الگ رہے فرشتے بھی اُسکے رازوں سے آگاہ نہیں

وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴿۲۱۵﴾ وَ اخۡفِضۡ

اور تو (سب سے پہلے) اپنے سب سے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا ۔ اور جو تیرے پاس

جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۱۶﴾ فَاِنۡ

مومن ہو کر آئیں اُن کے لئے محبت کے بازو جھکا دے پھر اگر

عَصَوۡکَ فَقُلۡ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۱۷﴾

وہ تیری نافرمانی کر بیٹھیں تو کہہ دے کہ میں تمہارے عمل سے بیزار ہوں

وَ تَوَکَّلۡ عَلَی الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ﴿۲۱۸﴾ الَّذِیۡ یَرٰىکَ

اور غالب (اور) بار بار کرم کرنے والی ہستی پر توکل کر ۔ جو تجھے اُس وقت بھی دیکھتا ہے ۔

چنانچہ ایک دفعہ حضرت مسیح نے جب اپنی آمدِ ثانی کی علامات بتائیں تو اُس کے ساتھ ہی آپ نے اس امر کی بھی وضاحت فرما دی کہ گو میری یہ باتیں کبھی نہیں ٹلیں گی

"لیکن اُس دن اور اُس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا۔ نہ آسمان کے فرشتے ۔ نہ بیٹا ۔ مگر صرف باپ ۔ جیسا نوح کے دنوں میں ہوا ویسا ہی ابن آدم کے آنے کے وقت ہوگا ۔ کیونکہ جس طرح طوفان کے پہلے سے دنوں میں لوگ کھاتے پیتے اور بیاہ شادی کرتے تھے اُس دن تک کہ نوح کشتی میں داخل ہوا ۔ اور جب تک طوفان آکر اُن سب کو بہا نہ لے گیا اُن کو خبر نہ ہوئی اسی طرح ابن آدم کا آنا ہوگا ۔"

(لوقا باب ۲۴ آیت ۳۶ تا ۴۰)

غرض محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پاک اور بے عیب زندگی اور آپ کی تعلیم کا پاک اور مطہر ہونا اور پھر قرآن کریم میں آسمانی علوم اور غیب کی خبروں کا بکثرت اظہار اور شیاطین کا آسمانی علوم کے بیان کرنے کی طاقت ہی نہ رکھنا بتا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ آپ کے ساتھ شیاطین کا تعلق ہے اور اُس نے آپ پر یہ کلام نازل کر دیا ہے سراسر غلط اعتراض ہے ۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا شیطان سے نہیں بلکہ خدا سے تعلق ہے اور اُسی نے آپ پر یہ کلام نازل فرمایا ہے

پھر فرماتا ہے فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِیۡنَ ۔ اے مسلمان! تو خُدا کے سوا کسی معبود سے دُعا نہ کر ۔ کیونکہ فطرتِ صحیحہ کے راز صرف خدا سے مل سکتے ہیں ۔ اور کوئی غیر اللہ اس میں تیری مدد نہیں کر سکتا ۔ اگر تو فطرتِ صحیحہ کے راز معلوم کرنے کے لئے غیر اللہ کی طرف جائے گا تو فَتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِیۡنَ اُس کی طرف سے جو تعلیم تجھے ملیگی ، اُس کے نتیجہ میں تو دُکھ ہی دُکھ اُٹھائیگا کوئی سُکھ تجھے نصیب نہ ہوگا ۔

حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۹﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۲۰﴾ اِنَّهٗ

جب تُو اکیلا نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے۔ اور اُس وقت بھی جبکہ تو (نماز باجماعت کے لئے) سجدہ کرنیوالی جماعتوں میں اِدھر اُدھر پھیر رہا ہوتا ہے۔

هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۱﴾

یقیناً وہ (خدا ہی) بہت سُننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔ ۲۸ع

۲۸ع حل لغات

عَشِيْرَةٌ :- عَشِيْرَةٌ : اَلْعَشِيْرُ اَلْقَبِيْلَةُ وَالْقَرِيْبُ وَالصَّدِيْقُ وَزَوْجُ الْمَرْأَةِ وَالْمُعَاشِرُ یعنی عَشِيْرَةٌ کے معنے قبیلہ کے بھی ہوتے ہیں۔ دوست کے بھی ہوتے ہیں خاوند کے بھی ہوتے ہیں اور ہمسائے کے بھی ہوتے ہیں (اقرب)

اَخْفِضْ : اَخْفِضْ : خَفَضَ يَخْفِضُ سے امر کا صیغہ ہے اور خَفَضَ کے معنے ہیں نیچا کیا۔ اور وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ کے معنے ہیں تَوَاضَعْ لَهُمْ۔ کہ مومنوں کے ساتھ خاکساری کے ساتھ پیش آ۔ اور ان سے ملتا رہ تاکہ انکی تربیت ہوتی رہے (اقرب)

تَقَلُّبَكَ : تَقَلُّبٌ تَقَلَّبَ کا مصدر ہے۔ اور تَقَلَّبَ عَلٰى فِرَاشِهٖ کے معنے ہیں تَحَوَّلَ مِنْ جَانِبٍ اِلٰى جَانِبٍ۔ وہ اپنے بستر میں ایک طرف سے دوسری طرف ہوتا رہا نیز جب یہ فقرہ کہیں کہ هُوَ يَتَقَلَّبُ فِي اَعْمَالِ السُّلْطَانِ تو معنے ہوتے ہیں يَتَنَقَّلُ مِنْ عَمَلٍ اِلٰى عَمَلٍ یعنی وہ بادشاہ کے مختلف کاموں میں اِدھر سے اُدھر جاتا ہے۔ (اقرب)

اَلتَّقَلُّبُ. اَلتَّصَرُّفُ یعنی تَقَلُّبٌ کے معنے اِدھر سے اُدھر آنے جانے کے ہیں (مفردات)

تفسیر :- اِن آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تُو دنیا کو ڈرا اور اُسے بیدار اور ہوشیار کر مگر پہلے اپنے رشتہ دارو اور قریبیوں کو ڈرا کیونکہ ان کا تجھ پر دوہرا حق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رشتہ داریاں دنیا میں بڑا بھاری اثر رکھتی ہیں۔ اور تاریخ میں اُس کے اثرات کی بعض حیرت انگیز مثالیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت جب تبلیغ شروع کی اور کفار نے انتہائی طور پر ہر رنگ میں اپنا اثر استعمال کر لیا اور کسی طرح بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور حق کے اعلان کو نہ چھوڑا۔ تو مکّہ کے لوگ ابو طالب کے پاس آئے۔ اور انہیں کہا کہ آپ اپنے بھتیجے کو سمجھا لیجیئے ورنہ ہم مجبور ہو جائیں گے کہ اُس کے ساتھ آپ کا بھی بائیکاٹ کر دیں۔ حضرت ابو طالب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بُلایا اور اُن سے کہا کہ اے میرے بھتیجے آج تک مَیں نے تیرا ساتھ دیا ہے مگر آج میری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ ابو طالب ہم تیرا بہت لحاظ کرتے رہے ہیں مگر آج ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہیں چھوڑیگا اور اُس کی حمایت بدستور کرتا چلا جائے گا تو ہم تیری سرداری سے بھی انکار کر دینگے۔ ابو طالب ایک غریب آدمی تھے۔ مگر وہ سارا وقت اپنی قوم کی خدمت میں لگاتے تھے اِس لئے اُن کی ساری جائیداد ہی قوم کی محبت تھی۔ دُنیا کے کچھ لوگ کمانے میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور کچھ قوم کی خدمت میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ کمانے والے اپنا بدلہ روپیہ کی صورت میں لے لیتے ہیں۔ مگر خدمت کرنے والے اپنا بدلہ قوم کی محبّت کی صورت میں لیتے ہیں۔ ابو طالب چونکہ دن رات اپنی قوم کی خدمت میں معروف رہتے تھے۔ اِس لئے اُنکی ساری کمائی یہی تھی کہ وہ قوم کی خدمت کرتے تھے اور قوم انہیں سلام کرتی تھی اِس لئے جب

قوم کی طرف سے انہیں یہ نوٹس ملا تو انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا۔ اے میرے بیٹے میری قوم آج کہہ رہی ہے کہ اگر تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہیں چھوڑ سکتا تو پھر ہم بھی تجھ کو چھوڑ دیں گے۔ اُس وقت یہ خیال کرکے کہ ساری عمر مَیں نے اپنی قوم کی خدمت میں لگا دی تھی مگر آج بڑھاپے میں آکر وہی قوم مجھے چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئی ہے حضرت ابو طالب پر رقت طاری ہوئی اور اُنکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہ دیکھ کر کہ میرے چچا باوجود اس کے کہ مسلمان نہیں ہمیشہ میری خدمت کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ انہوں نے میری تائید کی ہے اور اب میری خدمت اور میری تائید کی وجہ سے اُن کی ایک ہی قیمتی دولت جو اُن کے پاس تھی یعنی قوم میں عزت وہ کھوئی جانے لگی ہے رقت طاری ہو گئی۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اے چچا جو پیغام میں لایا ہوں وہ خدا نے میرے سپرد کیا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کسی کے کہنے پر مَیں اِسے چھوڑ دوں۔ اے میرے چچا! مَیں جانتا ہوں کہ خدا ایک ہے۔ لیکن مَیں اپنی قوم کی خاطر یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا ایک نہیں۔ اگر میری قوم سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر کھڑا کر دے اور اتنا بڑا نشان دکھائے جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی اور پھر کہے کہ اب بھی یہ مان جاؤ کہ دُنیا کا پیدا کرنے والا خدا ایک نہیں تب بھی مَیں ایسا نہیں کر سکتا۔ اے میرے چچا! مَیں آپ سے بھی یہ اُمید نہیں کرتا کہ آپ میری خاطر اتنی بڑی قربانی کریں۔ آپ نے جو خدمت کی ہے۔ مَیں اس کا ممنون ہوں۔ لیکن آئندہ کے لئے مَیں یہ بوجھ آپ پر ڈالنا نہیں چاہتا۔ آپ بیشک میرا ساتھ چھوڑ دیں اور اپنی قوم سے کہہ دیں کہ مَیں نے اپنے بھتیجے کو چھوڑ دیا ہے اور اب مَیں تمہارے ساتھ ہوں۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور یقین کے ساتھ یہ حیرت انگیز محبت ایک طرف تھی اور دوسری طرف وہ محبت کھڑی دیکھ رہی تھی جو ابو طالب کو اپنے بھتیجے کے ساتھ تھی۔ ابو طالب اُس وقت اِن دو محبتوں کے درمیان آگئے۔ یوں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کے بھتیجے تھے مگر ابو طالب نے اپنے بیٹوں سے بڑھ کر آپؐ سے محبت کی اور اپنے بیٹوں سے زیادہ آپ کی خبر گیری کی۔ پس ایک طرف وہ محبت کھڑی تھی جو ابو طالب کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی اور دوسری طرف بھتیجے کا یہ یقین اور ایمان تھا کہ مَیں نے جس صداقت کو قبول کیا ہے مَیں اُسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اُن کی ایک آنکھ کے سامنے بیک وقت یہ دو محبتیں آکر کھڑی ہو گئیں اور دوسری آنکھ کے سامنے اُنکے باپ عبدالمطلب کی رُوح آکر کھڑی ہو گئی جنہوں نے مرتے وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ ابو طالب کے ہاتھ میں یہ کہتے ہوئے دیا تھا کہ ابو طالب اِس کا باپ فوت ہو گیا ہے اس کی ماں بھی فوت ہو گئی ہے۔ مَیں نے اس کو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز سمجھ کر پالا ہے۔ اب مَیں مرنے لگا ہوں اور مجھ کو تجھ پر یہ اعتبار ہے کہ تو اس کام میں سستی اور کوتاہی نہیں کرے گا۔ مَیں اپنی سب سے زیادہ قیمتی امانت تیرے سپرد کرتا ہوں غرض باپ کی رُوح ایک طرف کھڑی تھی اور صداقت کے فدائی اور سچائی پر جان دینے والے بھتیجے کی رُوح دوسری طرف کھڑی تھی مگر باوجود اسلام نہ لانے کے ابو طالب ان محبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور انہوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ اے میرے بیٹے! جاؤ! اور جس چیز کو سچی سمجھتے ہو پھیلاؤ۔ قوم کا مذہب تو مَیں نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن میری خاطر اگر قوم مجھے چھوڑ د

تو مَیں تیرے لئے یہ قربانی بھی کروں گا۔ اور ہمیشہ تیرا ساتھ دونگا۔ تب قوم نے یہ فیصلہ کیا کہ بنو ہاشم کا مقاطعہ کیا جائے اِس اعلان پر بنو ہاشم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لیکر ایک وادی میں جو ابو طالب کی ملکیت میں تھی چلے گئے۔ وادی سے مُراد کوئی سبز و شاداب علاقہ یا وسیع زمین کا ٹکڑا نہیں بلکہ مکّہ میں بے پانی اور بے سبزی کے وادیاں ہُوا کرتی ہیں گویا بے آب وگیاہ زمین کے کچھ ٹکڑے ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اُن میں کوئی کوئی جھاڑی بھی پائی جاتی ہے جس میں اونٹ وغیرہ چر لیتے ہیں اس لئے انہیں وادی کہہ دیا جاتا ہے۔ مکّہ کے پاس ایک ایسی ہی وادی ابو طالب کی تھی۔ ابو طالب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر اور اُن چند مسلمانوں کو لے کر جو اس وقت مکّہ میں تھے اُس وادی میں چلے گئے۔ جب وہ اس وادی میں گئے تو وہ ہاشمی دشمن جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مونہہ پر بعض دفعہ گالیاں دیا کرتے تھے وہ ہاشمی دشمن جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکنے میں خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔ وہ ہاشمی دشمن جو ابو جہل کو اُکسا اُکسا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف پہنچایا کرتے تھے وہ بھی قومی عصبیّت اور رشتہ داری کی وجہ سے اپنے گھروں کو چھوڑ کر اس وادی میں محصور ہو گئے۔ اور اُن سب نے کہا کہ ہم اپنے رشتہ داروں کو نہیں چھوڑ سکتے [۵]

تو رشتہ داری بڑا بھاری اثر رکھتی ہے۔ اور خونی تعلق کبھی کبھی ایسی قربانیاں بھی کروا لیتا ہے جو دوسرے حالات میں ناممکن نظر آتی ہیں۔ اِسی لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے۔ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو دنیا کے کونے کونے کے لوگوں کو ڈرا۔ لیکن پہلے اپنے عزیزوں کو ڈرا۔ اِس لئے کہ اُن کا تجھ پر دوہرا حق ہے۔ ایک حق تو یہ ہے کہ باقی دنیا کی طرح یہ بھی تباہ ہو رہے ہیں اور ایک حق یہ ہے کہ یہ تیرے رشتہ دار ہیں اور ان کے باپ دادوں نے تیرے ساتھ کبھی حسن سلوک کیا تھا۔ انگریزی میں بھی مثل مشہور ہے کہ

CHARITY BEGINS AT HOME

یعنی صدقہ وخیرات پہلے گھر سے شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح وعظ ونصیحت کا سلسلہ بھی ہمیشہ گھر سے ہی شروع ہونا چاہیئے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی اس طرح تعمیل کی کہ آپ مکّہ کے دستور کے مطابق کوہ صفا پر کھڑے ہو گئے اور آپ نے مختلف قبائل کو نام لے لے کر بلانا شروع کیا۔ پہلے آپؐ نے آلِ غالب کو بلایا اور وہ مسجد حرام سے نکل کر کوہ صفا کے دامن میں آ گئے۔ اُس وقت ابولہب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آلِ غالب تو آ گئے ہیں آپ نے جو کچھ کہنا ہے کہہ دیں مگر آپ نے ابولہب کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور لوئی قبیلہ کے افراد کو آپ نے آواز دی۔ وہ پہنچ گئے تو ابولہب نے پھر کہا کہ اب تو لوئی قبیلہ بھی آ گیا ہے اب تو آپ بتائیں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی اس کی بات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور آلِ مرّہ کو آواز دی۔ چنانچہ وہ بھی آ گئے۔ پھر آپؐ نے آلِ کلاب اور آلِ قصیّ کو بلایا۔ یہاں تک کہ سب لوگ جمع ہو گئے اور جو لوگ خود نہ آ سکے انہوں نے اپنا ایلچی بھیج دیا تاکہ وہ معلوم کر کے انہیں اطلاع دے کہ آج انہیں کس غرض کے لئے جمع کیا گیا ہے۔ جب مکّہ کے تمام قبائل قریش سمیت جمع ہو گئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے خطاب شروع کیا اور فرمایا۔ دیکھو اگر مَیں تم سے یہ کہوں کہ اِس پہاڑ کے پیچھے ایک بہت بڑا لشکر جمع ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم میری

---

۵ السیرۃ الحلبیۃ جلد اوّل صفحہ ۳۷۵

اس بات کو مانو گے یا نہیں۔ انہوں نے کہا۔ کیوں نہیں ہم آپ کی بات ضرور مانیں گے کیونکہ ہم نے ہمیشہ آپکو راستباز پایا ہے۔ مکّہ کے حالات سے باخبر لوگ جانتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ مطالبہ درحقیقت ایسا ہی تھا جیسے کسی ناممکن چیز کو ممکن تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا جائے کیونکہ مکّہ کے لوگوں کے جانور وادی میں چرا کرتے تھے اور وہ ایسا علاقہ ہے کہ اُس میں کسی لشکر کا چھپ رہنا ناممکنات میں سے ہے۔ مگر اُن لوگوں پر آپ کی راستبازی کا اسقدر اثر تھا کہ انہوں نے کہا۔ خواہ ہماری آنکھیں اس بات کو تسلیم نہ کریں ہم آپ کی بات کو ضرور مانیں گے کیونکہ آپکی راستبازی ہمارے نزدیک مسلّم ہے۔ جب انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یک زبان ہو کر اپنے اِس یقین اور اعتماد کا اظہار کیا۔ تو آپ نے فرمایا لو سُنو! مَیں تمہیں ایک اہم خبر سُناتا ہوں۔ اور وہ خبر یہ ہے کہ مجھے اللہ تعالےٰ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ پس مَیں تمہیں کہتا ہوں کہ تم اگر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رہنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ آپ کا یہ کہنا تھا کہ ابولہب جوش سے کہنے لگا کہ تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْاَيَّامِ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا۔ یعنی نعوذ باللہ تجھ پر ہلاکت ہو۔ اتنی سی بات کیلئے تُو نے ہمیں اکٹھا کیا تھا۔ اور اسی طرح دوسرے لوگ ہنسی مذاق کرتے اور تمسخر اڑاتے ہوئے منتشر ہو گئے۔[1] مگر جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کی مخالفت اور تمسخر اور استہزاء کے باوجود اشاعت توحید کے کام کو جاری رکھا اور متواتر لوگوں کو پیغام حق پہنچاتے رہے تو اللہ تعالےٰ نے انہیں میں سے ایسے لوگ پیدا کر دیئے جنہوں نے اسلام کی اشاعت کیلئے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان پر کچھ نہ کچھ بیداری کے اوقات بھی آتے ہیں۔ اور جب کسی پر بیداری کی گھڑی آتی ہے اور اُس کے دل کی کھڑکی کھلتی ہے تو وہ سچائی کو قبول کر لیتا ہے۔ آخر وہ لوگ بھی تھے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے دن ایمان لائے۔ جیسے حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت خدیجہؓ۔ حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ۔ اور وہ لوگ بھی تھے جو آپ پر کئی سال بعد ایمان لائے۔ جیسے حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ وغیرہ بیشک خالد بن ولیدؓ میں پہلے سال بھی عقل موجود تھی۔ لیکن فرق یہ تھا کہ پہلے سال اُن کے دل کی کھڑکی نہیں کھلی تھی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ میں بھی عقل موجود تھی جو انہیں پہلے سال مسلمان بنا سکتی تھی لیکن اُنکے دل کی کھڑکی بھی نہیں کھلی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت خدیجہؓ۔ حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ اسلئے وہ پہلے دن ہی ایمان لے آئے۔ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا کہ مَیں خدا تعالےٰ کی طرف سے مبعوث ہُوا ہوں تو اُن سب نے آمنا وصدقنا کہا۔ لیکن کچھ لوگوں کی کھڑکیاں ایک سال بعد کھلیں، کچھ لوگوں کی کھڑکیاں دو سال بعد کھلیں، کچھ لوگوں کی کھڑکیاں چار سال بعد کھلیں، اور بعض لوگ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب ایمان لائے۔ پس کھڑکی کھلنے کی بات ہے ورنہ صداقت کبھی اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔

مَیں دیکھتا ہوں کہ ہماری جماعت کے دوستوں میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو

---

[1] بخاری کتاب التفسیر زیر آیت وانذر عشیرتک الاقربین

تفسیر رازی زیر آیت تبت یدا ابی لهب وتب۔

تفسیر روح المعانی زیر آیت [illegible]

تبلیغ نہیں کرتے اور ان پر اتنا دباؤ نہیں ڈالتے جتنا ڈالنا چاہئے۔ میں نے ایک دفعہ اس پر خاص طور پر زور دیا اور بعض احمدیوں نے ایسا کیا تو اس کا نمایاں اثر ہوا۔ چنانچہ ایک احمدی دوست نے بتایا کہ میں ایک دن اپنے ایک رشتہ دار کے گھر میں بیٹھ گیا اور اُسے کہہ دیا کہ یا تو تم مجھے اپنا ہم خیال بنالو اور یا تم احمدی بن جاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دلائل چونکہ معقول تھے وہ اُس پر اثر کر گئے اور وہ احمدی ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہمیں سمجھا دے کہ ہم غلطی پر ہیں تو ہمیں اُس کی بات ماننے میں کوئی حرج نہیں لیکن افسوس تو یہ ہے کہ جماعت کے دوست دلیری سے کام نہیں لیتے۔ آخر یہ صاف بات ہے کہ جس کی دلیل پختہ ہوگی وہ یقیناً دوسرے شخص کو اپنی طرف مائل کرلیگا۔ پس اگر لوگ اپنے اپنے رشتہ داروں کے پاس جائیں تو یقیناً لاکھوں لاکھ لوگ احمدیت کی طرف متوجہ ہو جائیں گے آگے پھر اُن کے رشتہ دار ہونگے جنہیں وہ تبلیغ کریں گے اور اس طرح یہ سلسلہ اتنا غیر معمولی وسیع ہو سکتا ہے کہ ہمارے احساس اور اندازہ سے بھی بالا ہو سکتا ہے۔ آخر غور کرو کہ کیا صحابہؓ نے تبلیغ کی تھی یا نہیں۔ مگر کیا صحابہؓ کے پاس پریس ہوا کرتے تھے کیا اُن کے ہاں کتابیں چھپا کرتی تھیں۔ کیا وہ تنخواہ دار مبلغ رکھا کرتے تھے۔ کیا اُن کے ہاں جلسے ہوا کرتے تھے؟ اِن میں سے کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف یہی ہوتا تھا کہ بھائی اپنی بہن کو ملنے گیا۔ تو وہ پوچھتی کہ بھائی تم نے اپنے باپ دادے کے مذہب کو کیوں چھوڑ دیا ہے وہ جواب دیتا کہ میں تو اپنے باپ دادا کی عزت کرتا ہوں۔ لیکن بتوں کو خدا کا شریک بنالینا بڑی بھاری غلطی ہے۔ بت ہمیں کیا دے سکتے ہیں۔ دینے والا تو صرف خدا ہے۔ اِس طرح وہ توحید کا سبق سکھاتا اور پھر اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو دوسرا شخص بھی مان لیتا۔ نہ کوئی تقریریں کرتا تھا نہ لٹریچر شائع کرتا تھا نہ جلسے منعقد کرتا تھا خود بخود رشتہ داروں سے میل جول اور ملاقات کے ذریعہ ہی سلسلہ وسیع ہوتا چلا جاتا۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ ہماری جماعت میں سے بعض نے اپنے رشتہ داروں کو تبلیغ کرنی چھوڑ دی ہے اور اپنے تعلقات ایسے محدود کر لئے ہیں کہ گویا وہ اپنے رشتہ داروں سے بالکل کٹ چکے ہیں۔ حالانکہ مذہباً اور اخلاقاً اور شرعاً اُن کا فرض تھا کہ وہ بار بار اپنے رشتہ داروں سے ملتے اور اُن کی غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتے مگر اِدھر وہ احمدی ہوتے ہیں اور اُدھر اپنے رشتہ داروں سے بچنا شروع کر دیتے ہیں۔ تم اپنے آپ کو اتنا کمزور کیوں سمجھتے ہو۔ تمہارے پاس ایمان ہے تمہارے پاس زندہ صداقت ہے تمہارے پاس تازہ معجزات اور نشانات ہیں۔ تمہارے پاس خدائی تائید کے نشانات ہیں۔ تمہارے اندر تو اتنی دلیری ہونی چاہئے کہ اگر تمہارا کوئی چچا ایسا ہے جس سے تم دس سال سے نہیں ملے۔ تو احمدی ہونے کے فوراً بعد اُس کے پاس جاؤ اس سے اپنے تعلقات بڑھاؤ اور اُسے اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تم اپنے رشتہ داروں کو تبلیغ کرنا شروع کردو تو میں سمجھتا ہوں کہ پچاس لاکھ احمدیوں کا رشتہ دار اس ملک میں موجود ہوگا۔ پس تمہیں غیروں کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں تم اپنے پچاس لاکھ رشتہ داروں کے پاس جاؤ اور حق ان پر واضح کرو۔ یہی کام اتنا بڑا ہے کہ ایک لمبے عرصہ تک تمہیں اسی کام سے فرصت نہیں مل سکتی۔ اور جب تم ان پچاس لاکھ کو احمدی بنالوگے تو ان پچاس لاکھ سے دو کروڑ اور رشتہ دار نکل آئینگے جن کو سمجھانے کے لئے پھر تمہیں ایک لمبی جدوجہد کی ضرورت ہوگی پس تم تبلیغ کا وہ طریق اختیار کرو جو قرآن کریم نے اس آیت میں بتایا ہے۔ جب تم اپنے

رشتہ داروں سے ملو گے اور انکی غلط فہمیوں کو دور کرنے
کی کوشش کرو گے تو تم دیکھو گے کہ ان میں سے ہزاروں ہزار
سعید روحیں احمدیت کو قبول کرنے کیلئے دوڑتی چلی آئینگی
اور اگر احمدیت قبول نہیں کرینگی تو کم از کم سلسلہ پر اعتراض
کی آئندہ انہیں جرأت نہیں ہو گی۔

میں نے کئی دفعہ سنایا ہے کہ جب میں حج کیلئے گیا تو
میں مصر کے راستہ گیا تھا۔ اصل میں میری سکیم یہ تھی کہ
میں مصر میں عربی تعلیم حاصل کرونگا اور اگلے سال حج
کرونگا مگر اتفاقاً قاہرہ جانے سے پہلے میں پورٹ سعید
میں ٹھہر گیا۔ اُسی رات میں نے رؤیا میں دیکھا کہ حضرت
مسیح موعود علیہ السلام تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں
کہ اگر تم نے حج کرنا ہے تو سب سے پہلے جہاز میں چلے
جاؤ۔ چنانچہ میں نے اُسی وقت پتہ لیا اور تین چار دن
کے بعد جو جہاز جانے والا تھا اُس میں حج کے لئے سوار
ہو گیا۔ خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اس کے بعد ایسے
حالات پیدا ہو گئے کہ مصر کے لوگ ایک دو سال تک
حج کے لئے نہ جا سکے۔ اس سفر میں میرے ساتھ دو مسلمان
اور ایک ہندو بیرسٹر بھی تھے۔ اُن کو کسی طرح پتہ لگ
گیا کہ میں احمدی ہوں۔ چنانچہ انہوں نے میرے ساتھ
بحث شروع کر دی۔ مگر میں نے انہیں یہ پتہ نہ لگنے دیا
کہ میں بانئے سلسلہ احمدیہ کا لڑکا ہوں۔ آخر بڑھتے
بڑھتے انہوں نے نہایت ناشائستہ اعتراضات شروع
کر دیئے۔ میں پھر بھی دلیل کے ساتھ اُنکے اعتراضات
کو رد کرتا رہا۔ گیارہ دن میں ہم پورٹ سعید پہنچے۔
ہم نے اپنا بھاری سامان پورٹ سعید میں رکھوا دیا
جب میں گودام سے اپنا ٹرنک نکلوا کر باہر نکلا۔ تو
اتفاقاً میرے ٹرنک پر کسی نے مرزا بشیر الدین محمود احمد
SON OF THE FOUNDER OF THE
AHMADIYYA MOVEMENT
لکھا ہوا تھا۔ میں جہاز کی سیڑھیوں
سے اُتر رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ وہ تینوں سرپٹ دوڑے
میری طرف چلے آرہے ہیں۔ میں نے کہا کیا بات ہے
کہنے لگے۔ معاف کیجئے ہم نے بڑی بیوقوفی کی۔ میں نے
کہا کیا ہوا۔ کہنے لگے ہم آپ سے بڑی گستاخی سے باتیں
کرتے رہے۔ اگر ہمیں پتہ لگ جاتا کہ آپ بانئ سلسلہ احمدیہ
کے فرزند ہیں تو ہم اپنے خیالات کے اظہار میں یہ ناشائستہ
طریق کبھی اختیار نہ کرتے۔ میں نے کہا آپ جسمانی تعلق
کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں اور میرے نزدیک روحانی تعلق زیادہ
اہم ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے اس کا اظہار اس لئے
نہیں ہونے دیا کہ میں چاہتا تھا کہ آپ کے دل میں جو
اعتراضات ہیں وہ سامنے آجائیں۔ تو جب مذہبی
بات چیت کی جائے دوسرا شخص بعض دفعہ غصہ بھی
نکال لیتا ہے۔ بُرا بھلا بھی کہہ لیتا ہے۔ لیکن اگر دل
میں خشیت پیدا ہو جائے تو پھر وہ معذرت بھی کرنے
لگتا ہے۔ ہم نے کئی ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو سلسلہ
کو شدید گالیاں دیا کرتے تھے۔ مگر پھر وہ اخلاص کے
ساتھ اس جماعت میں شامل ہوئے اور انہوں نے
اپنے تعلقات کو آخر تک بڑی وفاداری سے نبھایا۔

تاریخوں میں آتا ہے حضرت عمرو بن العاصؓ جب وفات
پانے لگے تو انتہائی کرب کی حالت میں رونے لگ گئے۔
اُن کے لڑکے نے انہیں کہا کہ آپ کیوں گھبراتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسلام کی خدمت کی بڑی توفیق
بخشی ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی بہتر جزا دے گا۔
انہوں نے کہا اصل بات یہ ہے کہ مجھ پر دو زمانے گذرے
ہیں۔ ایک زمانہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپکے
خاندان کا اتنا بغض میرے دل میں پایا جاتا تھا کہ
میں نے انتہائی نفرت کی وجہ سے کبھی آنکھ اُٹھا کر
آپ کی شکل نہیں دیکھی۔ پھر خدا نے مجھے ہدایت دی
اور میرے دل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی محبت

پیدا ہو گئی کہ فرطِ محبت اور عشق کی وجہ سے مجھے کبھی جرأت نہیں ہوئی کہ میں آنکھ اُٹھا کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ سکوں۔ چنانچہ اب اگر مجھ سے کوئی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا حلیہ پُوچھے تو میں بتا نہیں سکتا۔ لیکن آپؐ کی وفات کے بعد ہم سے کئی غلطیاں ہوئیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اُن غلطیوں کا خدا تعالےٰ کو کیا جواب دونگا۔ تو دیکھو ایک ایسا شخص جس کے دل میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اتنا بُغض تھا کہ وہ آنکھ اُٹھا کر بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھتا تھا ایک دن اُس کے دل میں اتنا عشق پیدا ہو گیا کہ پھر اس عشق کی وجہ سے وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھ سکا۔ سرسری طور پر تو انہوں نے آپؐ کو دیکھا ہو گا۔ لیکن پوری شکل دیکھنے کی نہیں ہمت نہیں پڑی۔ پس لوگوں کی ہدایت سے مایوس مت ہو۔ اور اس غرض کے لئے سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کے پاس جاؤ۔ تمہارے اپنے بھائی بہنیں سالے خُسر اور دوسرے رشتہ دار موجود ہیں۔ تم اُن کے پاس جاؤ اور اُن سے اپنے تعلقات کو وسیع کرو۔ پھر تم دیکھو گے کہ کس طرح خدا تعالےٰ تمہاری تبلیغ میں برکت پیدا کر دیتا ہے۔

مجھے یاد ہے میں چھوٹا تھا اور اپنے ایک رشتہ کی نانی کے ہاں دلّی میں ٹھہرا ہُوا تھا کہ اُن کے ایک بھائی حیدر آباد دکن سے اُن کے ملنے کے لئے آئے۔ انہوں نے ایک دن مجھے بلایا اور کہا۔ میاں تمہارا اور دوسرے مسلمانوں کا آپس میں کس بات پر اختلاف ہے۔ میں اُس وقت زیادہ علمی باتیں تو جانتا نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ہم کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں اور دوسرے مسلمان کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔ ۔۔۔ ۔ ۔۔۔ طرح کہتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ میں نے اس پر قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ میں نے کہا دیکھئے اِس میں صاف لکھا ہے کہ اے عیسیٰؑ میں تجھے وفات دونگا اور پھر تجھے اپنی طرف اٹھاؤنگا۔ پس وفات پہلے ہے اور رفع بعد میں۔ اِس پر باوجود اس کے کہ وہ ستّر سال کے بڈھے تھے۔ کہنے لگے تمہاری باتیں تو سب معقول ہیں۔ پھر مولوی کیوں مخالفت کرتے ہیں۔ ہماری نانی بڑی متعصب تھیں وہ غصہ سے کہنے لگیں کہ آگے ہی لڑکے کا دماغ خراب ہے اور اب تم اس کو اَور خراب کر رہے ہو۔ اب دیکھو وہ حیدر آباد دکن سے اپنی بہن کو ملنے آئے تھے اور میں ایک چھوٹا بچہ تھا۔ مگر محض اِس وجہ سے کہ میں اُن کی بہن کا نواسہ بلکہ پڑنواسہ تھا انہوں نے مجھ سے بات پُوچھ لی۔ اگر ایک چھوٹے بچے سے بات پوچھی جا سکتی ہے تو اپنے جوان اور بالغ داماد سے اپنے خُسر سے۔ اپنی ساس سے۔ اپنے چچا اور ماموں سے کیوں دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب تم سے کوئی بات دریافت کرینگے تو اُن کی مثال اس شخص کی سی ہو جائیگی جو کمبل کو تو چھوڑنا چاہتا تھا۔ مگر کمبل اُسے نہیں چھوڑتا تھا۔

کہتے ہیں۔ کسی نہر کے کنارے دو شخص جا رہے تھے سردی کا موسم تھا کہ ایک شخص نے نہر میں کمبل تیرتے دیکھا۔ وہ دراصل ریچھ تھا مگر اُس نے غلطی سے اُسے کمبل سمجھ لیا اُس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میں نہر سے کمبل نکال لوں تم ذرا ٹھہرو۔ جب وہ نہر میں کودا اور اُس نے کمبل پکڑنا چاہا۔ تو آپس کی رسہ کشی سے ریچھ کے ہاتھ پاؤں جو سردی کی وجہ سے سکڑے ہوئے تھے کھل گئے اور اُس نے آدمی کو پکڑ لیا ۔۔۔ ۔۔۔ آواز دی

دینی شروع کیں کہ جلدی باہر نکلو سفر خراب ہو رہا ہے۔ اگر کمبل
ہاتھ نہیں آتا تو اسے چھوڑ دو۔ اور باہر آ جاؤ۔ وہ کہنے لگا
کہ میں تو کمبل کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوں مگر کمبل مجھے نہیں
چھوڑتا۔ اِسی طرح پہلے وہ تم سے پوچھینگے کہ بتایئے۔
آپ کے کیا اعتقادات ہیں مگر اس کے بعد تمہارے لئے
تبلیغ کا ایسا رستہ کھل جائیگا کہ جس پر نہ شرعی طور پر
کوئی اعتراض ہوگا اور نہ قانونی طور پر کوئی اعتراض ہو
سکتا ہے۔ جب وہ آپ سوال کرینگے تو کونسا مولوی انہیں
کہہ سکتا ہے کہ ان کی بات نہ سنو۔ اگر کوئی کہے بھی تو
ماں کہیگی یہ میرا بچہ ہے میں اس سے ایک بات پوچھ
رہی ہوں تم بیچ میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو۔ خُسر
کہیگا یہ میرا داماد ہے میں نے اس سے ایک بات پوچھی ہے
تم مجھے روکنے والے کون ہو۔ اور چونکہ حق تمہارے ساتھ
ہے اس لئے آخری نتیجہ یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایک دن
اس کا دل بھی کھول دے گا۔ اور اُسے کھینچ کر صداقت
کی طرف لے آئیگا۔

یہ امر یاد رکھو کہ تبلیغ کوئی وقتی چیز نہیں بلکہ
ہمیشہ کے لئے ہے۔ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں حضرت مسیح
علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تمہارے
ماننے والے نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب رہینگے
اب اس کے صاف یہ معنے ہیں کہ ہمیشہ ایسے آدمی موجود
رہیں گے جو حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان نہیں لائینگے اور
جب حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لانا قرآن کریم نے بھی
ضروری قرار دیا ہے تو جو لوگ مسیح کو نہیں مانیں گے وہ
قرآن کریم کو بھی نہیں مانیں گے۔ پس لازماً قیامت تک کچھ
ایسے لوگ موجود رہیں گے جو اسلام میں داخل نہیں ہونگے
اور اگر قیامت تک ایسے لوگ موجود رہیں گے جو اسلام
میں داخل نہیں ہونگے تو اُن کو منوانے کے لئے تبلیغ کی بھی
ضرورت رہے گی۔ ہمارے ملک میں لڑکیاں ایک کھیل
کھیلتی ہیں۔ اب تو وہ کھیل کھیلتے میں نے لڑکیوں کو
نہیں دیکھا لیکن پہلے اس کھیل کا رواج زیادہ تھا۔ وہ
کھیل اس طرح ہوتی ہے کہ پانچ چھ لڑکیاں ایک طرف
کھڑی ہو جاتی ہیں اور پانچ چھ لڑکیاں دوسری طرف
کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف کی لڑکیاں دوسری طرف
کی لڑکیوں کے پاس آتی ہیں تو وہ غالباً اُن سے رشتہ
مانگتی ہیں یا کوئی اور چیز مانگتی ہیں۔ بہرحال وہ سائل
بن کر آتی ہیں اور اپنا سوال پیش کرتی ہیں تو دوسری طرف
کی لڑکیاں کہتی ہیں ہم نے نہیں دینا۔ اور جب وہ کہتی ہیں نہیں دینا تو
کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ ایک طرف کی لڑکیاں کہتی ہیں "نہیوں
دینا" ۔ اور دوسری طرف کی لڑکیاں کہتی ہیں ۔
"لے کے رہنا" اور دیر تک یہ مشغلہ جاری رہتا ہے
دونوں فریق اپنی ضد پر مُصر رہتے ہیں۔ اِسی طرح
قرآن کریم کہتا ہے کہ قیامت تک کچھ ایسے لوگ موجود
رہیں گے جو کہیں گے ہم نے نہیں ماننا۔ پس تمہارا بھی
یہی کام ہے کہ تم کہو ہم نے منوا کر چھوڑنا ہے۔ تمہارا
ایمان اور جذبہ بہرحال چھوٹی بچیوں سے زیادہ ہونا
چاہیئے۔ تمہاری غیرت ان سے زیادہ ہونی چاہیئے۔ اگر
اُن میں سے ایک فریق کہتا ہے کہ ہم نے نہیں دینا تو
دوسری لڑکیاں کہتی ہیں کہ ہم نے لے کر جانا ہے۔ اِسی
طرح تمہارا بھی یہ کام ہے کہ اگر کچھ ایسے لوگ ہوں جو
کہیں ہم نے نہیں ماننا تو تم کہو ہم نے منوا کر چھوڑنا ہے
اور اپنے اس عزم کو کبھی ترک نہیں کرنا۔

میں نے دیکھا ہے لوگ عام طور پر یہ عذر کیا
کرتے ہیں کہ ہمارے بھائی یا بھتیجے یا دوسرے رشتہ دار ہماری باتیں نہیں سنتے
یا ہماری تبلیغ کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر وہ یہ نہیں سوچتے کہ
آخر وہ بھی تو کسی کے بھائی تھے، وہ بھی تو کسی کے بھتیجے تھے۔ وہ بھی تو کسی کے
بھانجے تھے۔ وہ بھی تو کسی کے داماد یا خاوند تھے۔ پھر
اگر انہیں خدا تعالیٰ نے ہدایت دے دی تو ان کے رشتہ داروں کو

کیوں ہدایت نہیں مل سکتی۔ اصل بات یہ ہے کہ جماعت کے دوست اپنے رشتہ داروں اور قریبی دوستوں کو صحیح طور پر تبلیغ ہی نہیں کرتے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اُن پر اثر نہ ہو۔ آخر ہر رشتہ دار کا اپنے رشتہ دار پر اور ہر دوست کا اپنے دوست پر اور ہر بھائی کا اپنے بھائی پر حق ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی بیوی ایسی نہیں ہو سکتی جو یہ کہے کہ میرا خاوند خواہ جہنم میں چلا جائے مجھے اسکی پرواہ نہیں اور نہ کوئی خاوند ایسا ہو سکتا ہے۔ جو کہے کہ خواہ میری بیوی جہنم میں چلی جائے مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ پس خاوند کا اپنی بیوی کو یا بیوی کا اپنے خاوند کو حق بات پہنچانا دراصل تبلیغ کرنا نہیں بلکہ اپنے فرض کو ادا کرنا ہے۔ اسی طرح بھائی کا اپنے بھائی کو حق پہنچانا تبلیغ کرنا نہیں کہلا سکتا بلکہ بھائی کا اپنے بھائی کو حق پہنچانا فرض ہے۔ اسی طرح دوست کا اپنے دوست کو حق پہنچانا تبلیغ نہیں بلکہ اُس کا فرض ہے اور اگر وہ اپنے اس فرض کو ادا نہیں کرتا تو وہ دوست نہیں بلکہ دشمن سمجھا جائیگا۔ اور اس کا دوست بھی اُسے اپنا خیر خواہ نہیں بلکہ بدخواہ قرار دیگا کہ اُس نے اُسے سچائی سے محروم رکھا۔ اگر اس رنگ میں ہر رشتہ دار اپنے رشتہ دار کو اور ہر دوست اپنے دوست کو اپنا فرض سمجھتے ہوئے حق پہنچائے تو تھوڑے عرصہ میں ہی لاکھوں افراد تک صداقت پہنچ سکتی ہے۔

پھر فرماتا ہے وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو لوگ تیری بات مان لیا کریں اُن کے ساتھ ہمیشہ نیک برتاؤ کر تاکہ تیرے حسن سلوک کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ اسلام کے گرویدہ ہو جائیں اور اُن کی تربیت کا ہمیشہ خیال رکھ تاکہ اُن کی طاقت سے صحیح رنگ میں فائدہ اٹھایا جا سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دریا نکلتے اور بہتے چلے جاتے ہیں لیکن نااہل قومیں اُن سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے صرف اتنا نقصان اُٹھاتی ہیں کہ دریا کی طغیانیوں سے اُن کے دیہات غرق ہو جاتے یا اُن کی زمینیں بیکار اور بنجر ہو جاتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ وہ لوگ اتنا فائدہ اُٹھا لیتے ہیں کہ دریاؤں سے مچھلیاں پکڑ لیتے ہیں۔ لیکن جو عقلمند اور ذہین قومیں ہوتی ہیں وہ اُن سے نہریں نکالتی اور بنجر زمینوں کو آباد کرتی ہیں اور اس طرح اربوں ارب روپیہ کماتی ہیں۔ اسی طرح اگر افراد کی صحیح تربیت کی جائے اور اُن کے اندر جذبۂ قربانی پیدا کیا جائے تو اُنکی طاقت سے اتنا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے کہ قوم ترقی کے میدان میں کہیں کی کہیں نکل جاتی ہے۔ درحقیقت پُرانی نسل کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کسی چشمہ یا دریا کا منبع۔ لیکن نئی نسل کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک نالہ اور اس سے اگلی نسل کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک چھوٹا دریا اور پھر اس سے اگلی نسل کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک بڑا دریا۔ اور پھر اُس سے اگلی نسل کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ایک بڑا سمندر۔ چشمہ سے پانی پینے کے لئے ہمیں خود چشمہ پر جانا پڑتا ہے۔ لیکن نالہ جوش و خروش سے گھروں کے پاس سے گذرتا ہے۔ اُس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر جب وہ ایک چھوٹا دریا بن جاتا ہے تو صرف یہی نہیں کہ وہ گھروں کے پاس بہتا ہے بلکہ اور زیادہ پھیل کر وہ گھروں کے قریب آ جاتا ہے۔ پھر جب وہ چھوٹا دریا وسیع ہوتا ہے تو اور بھی زیادہ گھروں کے پاس سے گذرتا ہے اور اُسکے زمین میں جذب ہونے یا ریت میں غائب ہونیکا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ وہ پہاڑیوں اور ٹیلوں پر سے کودتے اور ریتوں پر سے بہتے ہوئے سمندر کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے اور جب وہ دریا سمندر بن جاتا ہے۔ تو ساری

زمینوں کے کنارے اس سے ملنے لگ جاتے ہیں اور کوئی حصّہ زمین بھی ایسا نہیں رہتا جو اس سے متصل نہ ہو۔ اسی طرح جب جماعت کے افراد کی صحیح تربیت کی جائے اور اگلی نسلوں میں قربانی اور ایثار اور فدائیت کا زیادہ سے زیادہ جذبہ پیدا کیا جائے تو وہ دنیا میں امن کے قیام کا ایک بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ دنیا کا ایٹم بم جو یورینیم دھات سے بننے والی ایک چیز ہے دنیا کی تباہی اور بربادی کا ایک مہلک ہتھیار ہے لیکن افرادِ جماعت کی کی طاقت کو صحیح استعمال کرنا اور آئندہ نسل کے اندر جذبۂ قربانی پیدا کرنا اور اس کی صحیح تربیت کرنا قوموں کو زندہ رکھنے کا ایک حتمی اور یقینی ذریعہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ہر فرد کے دل میں یہ احساس قائم رہتا ہے کہ دنیا کو فتح کرنے اور اسلام کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کے لئے میری ذاتی جد وجہد کی بھی ضرورت ہے یہی نکتہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے کہ تیرے دو طریق ہونے چاہئیں۔ ایک مخالفین کے ساتھ اور ایک موافقین کے ساتھ۔ مخالفین کے ساتھ تو تیرا یہ طریق ہونا چاہیئے کہ تُو اُن کو ڈرا جن میں تیرے رشتہ دار بھی شامل ہیں اور جو ایسے راستہ پر چل رہے ہیں۔ جو اُن کے لئے نقصان دہ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ تیرا دوسرا کام یہ بھی ہے کہ تُو مومنوں کی تربیت کرے کیونکہ اب دنیا کی نجات انہی لوگوں کی صحیح تربیت پر منحصر ہے۔ اِن میں سے کئی ایسے ہیں جو تیرے رشتہ دار نہیں مگر وہ تیرا حکم مانتے اور تیری اطاعت کرتے ہیں پس تُو لوگوں کو بتا دے کہ تیرے رشتہ داروں میں سے جو کوئی تیرے خلاف چلیگا اور تیری باتیں نہیں مانے گا وہ سزا پائیگا اور جو تیرا رشتہ دار تو نہ ہو گا مگر تیری باتوں پر ایمان لے آئیگا وہ انعام پائے گا۔ یعنی تیرا منکر اگر قریبی بھی ہو گا تو سزا پائے گا اور تیرا متبع اگر بعیدی بھی ہو گا تو انعام پائے گا۔ ایسے ایمان لانے والوں کے لئے خواہ وہ قریبی ہوں یا بعیدی تُو اپنا بازو جھکا دے۔ گویا ایک طرف تو تُو قریبی کو ڈراتا رہ کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو سزا ملیگی اور دوسری طرف وہ بعیدی جو تیرے رشتہ دار تو نہیں مگر تجھ پر ایمان لے آئے ہیں جن میں سے بعض روم کے ہیں بعض ایران کے ہیں۔ بعض حبشہ کے ہیں بعض شام کے ہیں اور بعض قبائل عرب میں سے ہیں اُنکی طرف تیری بہتر سے بہتر توجہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ تیرے اصل رشتہ دار اب وہی ہیں۔ جو لوگ تیرے قریبی رشتہ دار تو ہیں مگر تجھ پر ایمان نہیں لائے وہ ایمان نہ لانے کی وجہ سے تیرے رشتہ داروں میں سے نکل گئے ہیں اور اب تیرے اصل رشتہ دار وہی ہیں جو تجھ پر ایمان لائے ہیں اور تیری ہر بات کو مانتے اور تیری پیروی کرتے ہیں

آگے فرماتا ہے۔ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ یہاں عَصَوْكَ کے یہ معنے نہیں کہ اِنْ عَصَوْكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ بلکہ یہ عَصَوْكَ مخالفین کے لئے آیا ہے۔ قرآن کریم کا یہ عام قاعدہ ہے کہ جب ایک ہی آیت میں دو باتوں کا ذکر ہو تو اُن میں سے ایک فقرہ الگ گروہ کے لئے ہوتا ہے اور دوسرا فقرہ الگ گروہ کے لئے۔ یہاں جو عَصَوْكَ کا لفظ ہے اُس کے معنے ہیں اِنْ عَصَوْكَ عَشِیْرَتُكَ یعنی تیرے رشتہ دار اگر باوجود ڈرانے کے بھی نہ مانیں اور اپنے پہلے راستہ پر ہی گامزن رہیں تو تُو اُن کو کہہ دے اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اُس سے مَیں بری الذمہ ہوں یعنی پھر تُو اُن سے قطع تعلق کرلے اور کہدے کہ مَیں تمہارے اعمال سے بیزار ہوں۔ تم اس گھمنڈ میں نہ رہنا کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار اور قریبی ہیں۔ اس لئے اگر ہم نے اِس کی

بات نہ مانی تب بھی ہم نجات پا جائیں گے۔ بے شک تم
میرے رشتہ دار ہو۔ مگر نجات رشتہ داری اور قرابت
پر موقوف نہیں ہے۔ نجات کا راستہ صرف یہی ہے کہ
تم میری پیروی کرو۔ ورنہ تم باوجود میرے ساتھ رشتہ داری
اور قرابت رکھنے کے سزا پاؤ گے۔ یہ ایک نہایت اعلیٰ
درجہ کا طریقِ تبلیغ ہے۔ جو قرآن کریم نے بتایا ہے۔
اگر مسلمان اِس پر عمل کرتے تو بڑی کامیابی کا مُنہ دیکھتے
جہاں جہاں اسلام پھیلے وہاں نئے ماننے والوں کو یہ
سمجھانا چاہیئے کہ فوراً اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی
طرف جاؤ اور تبلیغ کے علاوہ اُن سے نیک سلوک بھی
کرو۔ اور اگر وہ تمہاری بات نہ سُنیں تو اُن سے ایک
حد تک الگ ہو جاؤ تا کہ اُن کے اندر ندامت پیدا ہو
اور تم بھی اُن کے بد اثر سے بچ جاؤ۔ جیسا کہ حضرت
مسیحؑ نے بھی اپنے حواریوں کو نصیحت کی کہ

"اگر کوئی تم کو قبول نہ کرے۔ اور
تمہاری باتیں نہ سُنے تو اُس گھر یا اُس شہر
سے باہر نکلتے وقت اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ
دینا۔" (متی باب ۱۰ آیت ۱۴)

اِس کے بعد دوسرے گروہ یعنی مؤمنین کے متعلق
فرمایا وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ۔ یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اپنے
بازو اُن مومنوں پر جھکا دے جو تیری اتباع کرتے ہیں۔
بازو جھکانا عرب میں ایک محاورہ ہے اور یہ محاورہ
جانوروں کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ یہ دیکھا گیا
ہے کہ جب تک جانوروں کے بچے کمزور ہوتے ہیں۔
اور اُڑنے کے قابل نہیں ہوتے یا اچھی طرح چل پھر
نہیں سکتے جانور اُن پر اپنے پر پھیلائے رکھتے ہیں تا کہ
بچوں کو چیل وغیرہ نہ لے جائے۔ انسان تو اپنے
بچوں کو کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ مگر جانوروں کے پاس
کپڑا نہیں ہوتا اسلئے وہ بچوں کو اپنے پروں کے نیچے
چھپائے رکھتے ہیں۔ مرغیوں کو دیکھو۔ اگر بچوں والی
مرغی کسی جگہ بیٹھی ہو اور آگے کوئی اُٹھا دے تو اُس کے
پروں کے نیچے سے آٹھ دس بچے نکل کر دوڑ پڑتے ہیں۔
پس وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ کے یہ معنے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ
علیہ وسلم تجھے چاہیئے کہ تو اپنی تمام تر توجہ مومنوں کی طرف
رکھ اور اُن کی اعلیٰ سے اعلیٰ تربیت کرنے کی کوشش کر۔
اب ظاہر ہے کہ یہ تربیت کا کام اور مومنین کو اعلیٰ مدارج
تک لے جانے کا کام اس قسم کا تھا کہ اِس میں تکالیف اور
مشکلات پیش آنے کا احتمال ہو سکتا تھا۔ اِسی لئے
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ۔
الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ۔ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ انذار کا کام تو صرف
مُنہ سے ہوتا ہے اور زبان سے ڈرا دینا کافی ہوتا ہے لیکن
تربیت اور اصلاح کا کام محنت طلب ہے اور یہ کام ایسا
ہے جو کسی کے اپنے اختیار میں نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ
بعض دفعہ ایک باپ چاہتا ہے کہ میرا بیٹا جج بن جائے
مگر وہ چِٹھی رساں بھی نہیں بن سکتا۔ یا ایک باپ چاہتا
ہے کہ اُس کا بیٹا عالمِ دین بن جائے لیکن جب وہ بڑا
ہوتا ہے تو علمِ دین کی طرف اُسے کوئی رغبت ہی نہیں
ہوتی۔ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ
ایک عالمِ دین جو صرف و نحو کے متبحر عالم تھے اور سارے
ہندوستان میں اُنکی علمیت کا شہرہ تھا۔ وہ بہت
سادہ طبع تھے اور اگر انہیں کوئی ایسا شخص دیکھتا جو
اُن کو پہلے سے نہ جانتا تو وہ یہی سمجھتا کہ یہ گھاس کاٹ
کر آئے ہیں۔ اُن کا نام مولوی خان ملک صاحب تھا۔
وہ کہیں سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے
دعویٰ کے متعلق خبر سُنکر قادیان آئے اور آپ کی باتیں
سُنکر ایمان لے آئے۔ واپسی پر جب وہ لاہور پہنچے تو

انہوں نے ارادہ کیا کہ مولوی غلام احمد صاحب سے ملتے چلیں مولوی غلام احمد صاحب شاہی مسجد میں درس دیتے تھے اور وہ مولوی خان ملک صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے۔ مولوی غلام احمد صاحب بھی بہت مشہور عالم تھے اور چونکہ لاہور کے لوگ اچھے متموّل تھے اس لئے مولوی غلام احمد صاحب کی مالی حالت بہت اچھی تھی اور سینکڑوں طالبعلم اُن کے پاس پڑھتے تھے۔ جب مولوی خان ملک صاحب شاہی مسجد میں پہنچے تو وہاں کے طلباء کو تو اس بات کا علم نہ تھا کہ یہ کس پایہ کے آدمی ہیں انہوں نے اُن کے معمولی لباس اور ظاہری صورت سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کوئی معمولی آدمی ہیں۔ مولوی غلام احمد صاحب نے مولوی خان ملک صاحب سے پوچھا۔ فرمائیے۔ کہاں سے تشریف لائے ہیں انہوں نے کہا۔ قادیان سے۔ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ قادیان سے۔ انہوں نے کہا۔ ہاں قادیان سے۔ انہوں نے کہا۔ کیوں؟ کہنے لگے۔ مرزا صاحب کا مرید ہونے کیلئے گیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ آپ اتنے بڑے عالم ہیں آپنے اُن میں کیا خوبی دیکھی کہ اُن کے مرید ہونے کیلئے چلے گئے مولوی خان ملک صاحب نے پنجابی میں انہیں کہا کہ "تُوں اپنا کم کر تینوں تے قَالَ یَقُوْلُ دی چنگی طرح نہیں آوندا۔" یعنی تُو اپنا کام کر تجھے تو ابھی قَالَ یَقُوْلُ بھی اچھی طرح نہیں آتا۔ چونکہ مولوی غلام احمد صاحب بھی بڑے مشہور عالم تھے اس لئے جب مولوی خان ملک صاحب نے یہ الفاظ کہے تو مولوی غلام احمد صاحب کے شاگردوں کو سخت غصہ آیا اور انہوں نے مولوی خان ملک صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔ بڈھے تُو نے یہ کیا بات کہی ہے۔ مولوی غلام احمد صاحب نے اُن کو منع کیا اور کہا خاموش رہو یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں بالکل ٹھیک ہے غرض مولوی خان ملک صاحب مرحوم کو صرف و نحو پر اتنا عبور تھا اور وہ اپنے فن میں اتنے ماہر تھے کہ تمام ہندوستان میں اُن کا شہرہ تھا اور اُن کی بعض تصانیف کے متعلق لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان کُتب کا لکھنے والا چار پانچ سو سال پہلے کا کوئی عالم ہے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ اُن کا ایک واقعہ سُنایا کرتے تھے۔ اُن کے بڑے لڑکے کا نام عبد اللہ تھا۔ انہوں نے ایک دفعہ عبد اللہ کے متعلق حضرت خلیفہ اوّلؓ سے شکایت کی کہ میرا یہ لڑکا علم کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتا آپ اُس کو سمجھائیں کہ اگر آج اس نے تعلیم حاصل نہ کی تو یہ نقصان اُٹھائیگا۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مَیں نے عبد اللہ کو بلوایا اور کہا۔ تمہارے والد صاحب اپنے علمی پایہ کی وجہ سے سارے ہندوستان میں شہرت رکھتے ہیں تم کیوں نہیں پڑھتے۔ وہ کہنے لگا۔ مَیں پڑھتا تو ہوں مگر وہ مجھے پڑھاتے ہی نہیں۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ وہ تو میرے پاس شکایت لے کر آئے تھے کہ تم پڑھتے نہیں اور تم کہتے ہو کہ مَیں پڑھتا ہوں اور وہ مجھے پڑھاتے نہیں۔ وہ کہنے لگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ مجھے عربی پڑھنے کے لئے کہتے ہیں اور مَیں عربی پڑھنا نہیں چاہتا بلکہ مَیں انگریزی پڑھنا چاہتا ہوں حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ تم عربی کیوں پڑھنا نہیں چاہتے اور انگریزی کیوں پڑھنا چاہتے ہو۔ وہ کہنے لگا۔ بات یہ ہے کہ جب نئی نئی ریل آئی تو مَیں اور والد صاحب ایک سفر پر گئے۔ اور آپ تو کہتے ہیں وہ بڑے عالم ہیں مگر اُن کو اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ گاڑی میں فرسٹ اور سیکنڈ کلاس بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ اپنی گٹھڑی اٹھائے ہوئے فسٹ کلاس کے ڈبہ میں گھس گئے۔ وہاں کوئی اینگلو انڈین ٹکٹ کلکٹر کھڑا تھا اُس نے انہیں کہا۔ ہٹ بابا تیرا یہاں کیا کام ہے جب اینگلو انڈین نے اُن کو جھڑکا تو یہ پلیٹ فارم پر ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ مَیں اُن کے پیچھے دوڑا مگر یہ اسٹیشن سے دُور نکل گئے اور کوئی میل بھر تک

بھاگتے چلے گئے۔ آخر میں نے انہیں جا کر پکڑا اور پوچھا۔ آپ بھاگتے کیوں ہیں۔ کہنے لگے۔ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی اس لئے خطرہ تھا کہ مجھے سرکاری آدمی پکڑ کر نہ لیجائیں اس دن سے میں نے اپنے دل میں یہ تہیّہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں نے عربی نہیں پڑھنی اور اگر پڑھنی ہے تو انگریزی پڑھنی ہے۔ کیونکہ عربی کے اتنے بڑے عالم ہونے کے باوجود جب اس قدر جہالت رہتی ہے کہ گاڑی کے فرسٹ اور تھرڈ کلاس کے ڈبوں کی شناخت بھی نہیں ہوسکتی تو اس علم کا فائدہ ہی کیا ہے اس لئے اگر یہ مجھے پڑھانا چاہتے ہیں تو انگریزی پڑھائیں عربی تو میں کبھی بھی نہیں پڑھونگا۔ اب دیکھو اتنا اعلیٰ پایہ کے عالم و فاضل کا بیٹا باوجود باپ کی خواہش کے کہ وہ علم حاصل کرے دینی علم سے محروم رہ گیا۔ پس وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ تربیت اور اصلاح کا کام اتنا عظیم الشان ہے کہ یہ بہت زیادہ محنت چاہتا ہے اور یہ کام ایسا ہے کہ جب تک تربیت اور اصلاح پانے والوں کے اندر جوش اور اخلاص اور فرمانبرداری کا مادہ موجود نہ ہو اس کو سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاں مخالفین منکرین اور غیر متبعین کے متعلق فرمایا کہ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ۔ یعنی انکو تو ڈرا لیکن اگر وہ تیری بات نہ مانیں تو تو ان سے کہدے کہ میں تمہارے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہوں وہاں مومنوں کے متعلق فرمایا وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مومنوں کی خبرگیری اور تربیت کا حکم دیا تھا وہ پورا نہیں ہوسکتا تھا جب تک تین باتیں نہ ہوں۔ ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ کی تائید ہو دوسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر اُن کی تربیت کا کامل جذبہ موجود ہو اور تیسرے یہ کہ جن کی آپ تربیت اور خبرگیری کرنا چاہتے تھے اُن کے اندر ماننے کا جذبہ موجود ہو۔ اِن تینوں چیزوں کے متعلق فرماتا ہے (۱) وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ تو اللہ پر توکّل کرکے اس کام کو شروع کردے وہ تیری ضرور مدد کرے گا۔ یعنی میں تیری مدد کرونگا۔ (۲) الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ تیرے اندر کیا رُوح کام کر رہی ہے۔ یعنی تُو اپنے اندر یہ جذبہ رکھتا ہے کہ ان کی تربیت کرے۔ آگے فرماتا ہے (۳) وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ۔ پھر تیسری بات بھی تجھے حاصل ہے یعنی تو اُن لوگوں میں پھرتا ہے جو ہر رنگ میں تیری اطاعت اور فرمانبرداری کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ تین مشکلات تھیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اِن آیات میں ذکر کیا ہے۔ فرماتا ہے یہ کام اللہ تعالیٰ کی تائید چاہتا ہے۔ سو میں تیری مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہ کام تیرے اندر دوسروں کی تربیت اور اصلاح کرنیکا جذبہ چاہتا ہے۔ سو وہ تیرے اندر موجود ہے۔ یہ کام اُن لوگوں کے اندر جن کی تو تربیت اور خبرگیری کرنا چاہتا ہے کامل اطاعت اور فرمانبرداری کی رُوح چاہتا ہے سو وہ اِن کے اندر موجود ہے۔ اِس لئے تجھے اِس کام میں کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہیں ہوسکتا۔

بعض مفسرین نے غلطی سے وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ کے یہ معنے کئے ہیں کہ اسجگہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباء مومن یعنی ساجد تھے۔ حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا۔ کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کی تھی کہ وہ مجھے اپنی

والدہ کے لئے استغفار کی اجازت دیدے مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی (مسند احمد بن حنبلؒ جلد ۵ صفحہ ۳۵۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین کا یہ نظریہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباء مومن تھے درست نہیں۔ حضرت عبدالمطلب کے متعلق بھی جہاں توحید کی باتوں کا ذکر آتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ذبذبہ کی حالت میں تھے۔ کبھی توحید کی طرف مائل ہو جاتے تھے اور کبھی شرک کی طرف۔ اُن کا چاہ زمزم کی تلاش کے وقت یہ نذر ماننا کہ اگر خدا انہیں دس بچے دے گا اور وہ اُن کی آنکھوں کے سامنے جوان ہونگے تو وہ اُن میں سے ایک کو قربان کردیں گے۔ اور پھر ہبل کے سامنے اُن کا قرعہ اندازی کرنا بتا رہا ہے کہ توحید کا صحیح مقام انہوں نے نہیں سمجھا تھا۔ پس یہ کہنا کہ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کے معنے یقینی اور حتمی طور پر یہی ہیں درست نہیں۔ اصل معنے یہ ہیں کہ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی تعریف کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ تمہارا رات دن ایسے لوگوں میں گذر ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پرستار اور اس کی عبادت کرنیوالے ہیں۔ تقلّب کا لفظ ایسا ہی ہے جیسے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ تیری نظر بار بار اس معاملہ میں آسمان کی طرف اُٹھتی ہے۔ پس تَقَلُّبَكَ کے معنے کسی چیز کی طرف بار بار جانے کے ہوتے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا تقلّب صحابہؓ میں ہی تھا۔ کبھی جنگی مشاورت ہو رہی ہوتی تھی اور جرنیل آپؐ کے گرد جمع ہوتے تھے۔ کبھی قضاء کے معاملات کا فیصلہ ہو رہا ہوتا تھا اور قاضی اور تفقّہ رکھنے والے صحابہؓ آپؐ کے گرد جمع ہوتے تھے کبھی تصوّف کے دریا بہائے جاتے تھے اور صوفیاء کا گروہ آپؐ کے ارد گرد جمع ہوتا تھا۔ کبھی صدقہ و خیرات کا ذکر ہو رہا ہوتا تھا اور صدقہ و خیرات دینے والے آپؐ کے ارد گرد جمع ہوتے تھے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اُس کی اطاعت کا نمونہ دکھانے والے ہر قسم کے لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے جس قسم کے کام کی آپؐ کو ضرورت ہوتی تھی نہ صرف اس کام کے ماہر آپؐ کے پاس موجود تھے بلکہ اُس کے ساتھ ہی وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے اور دن رات اُس کی پرستش کرنے والے بھی تھے۔ اور رات دن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایسے ہی لوگوں میں چکر لگا رہتا تھا۔ تَقَلُّبَ بھی یہی ہوتا ہے کہ ادھر اُدھر چکر کاٹنا۔ اور آپؐ کا ادھر اُدھر چکر کاٹنا صحابہؓ کی ذات کے لحاظ سے ہی تھا۔ پس تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کے معنے یہ ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ایسے اعلیٰ درجہ کے ساتھی ملے ہوئے تھے کہ آپ جس طرف بھی مُنہ کرتے اُدھر ساجد ہی ساجد نظر آتے تھے۔ جرنیلوں کی طرف مُنہ کرتے تو آپؐ کے پاس ساجد جرنیل تھے۔ قاضیوں کی طرف مُنہ کرتے تو آپؐ کے پاس ساجد قاضی تھے۔ مدرسوں کی طرف مُنہ کرتے تو آپؐ کے پاس ساجد مدرس تھے۔ صوفیاء کی طرف مُنہ کرتے تو آپؐ کے پاس ساجد صوفیاء تھے۔ اقتصاد اور تمدّن کے ماہرین کی طرف مُنہ کرتے تو آپؐ کے پاس ساجد ماہرین اقتصاد اور ساجد ماہرین تمدّن تھے۔ غرض جس طبقہ کی طرف بھی آپ مُنہ کرتے آپ کو ایسے لوگ مل جاتے جو اس فن کے بھی ماہر ہوتے اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور عبادت گذار بھی ہوتے۔ اسی احسان کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیرے گرد پیش سب موحد ہی موحد ہیں

اور تُو رات دن ان موحدین میں پھرتا ہے۔ یہ ہمارا کتنا بڑا احسان ہے کہ مکہ جیسی شرک کی سرزمین میں ہم نے موحد ہی موحد پیدا کر دیئے ہیں اور ان لوگوں کو توحید پر عامل کر دیا ہے جو ایک نہیں دو نہیں سینکڑوں بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ تُو دائیں جاتا ہے تو تجھے موحد نظر آتے ہیں۔ تُو بائیں جاتا ہے تو تجھے موحد نظر آتے ہیں۔ تُو ادھر جاتا ہے تو تجھے موحد ملتے ہیں اور تُو اُدھر جاتا ہے تو تجھے موحد ملتے ہیں۔ غرض تُو جہاں بھی جاتا ہے تجھے موحد نظر آتے ہیں۔ اور مکہ جیسی بستی میں جہاں رات دن بتوں کی پرستش ہوتی تھی ہم نے تیرے ساتھ موحدین پیدا کر دیئے ہیں۔ پس تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کا وہ مفہوم نہیں جو مفسرین نے سمجھا ہے بلکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ذکر کیا گیا ہے جو اُس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر کیا کہ اُس نے آپؐ کے گرد ساجد ہی ساجد جمع کر دیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض انبیاء کی بیویاں اُن پر ایمان نہیں لائی تھیں بعض کی اولاد نے اُنکی نبوت کا انکار کر دیا تھا۔ اور گو بیویوں یا اولاد کے انکار سے نبی کی شان میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں تھیں تو خدا تعالیٰ کے دین پر فدا۔ آپؐ کی اولاد تھی تو وہ بھی دین پر قربان۔ آپؐ کے ساتھی تھے تو وہ اسلام کے سچے عاشق۔ یہاں تک کہ سب تعلق رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ساجد بنا دیا۔ اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اور کسی نبی کو نصیب نہیں ہوئی۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تُو جہاں کہیں جاتا ہے موحدین اور ساجدین میں پھرتا ہے تیرے گھر میں توحید۔ تیرے دوستوں میں توحید۔ پھر تُو جدھر جاتا ہے توحید کا بیج بوتا جاتا ہے اور تُو نے ہزاروں مشرکین کو ساجد بنا دیا ہے۔

اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک حوالہ پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے جس کا اسی آیت کے ساتھ تعلق ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی کتاب تریاق القلوب میں فرماتے ہیں:-

"ایک اور جگہ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ۔ یعنی خدا پر توکل کر جو غالب اور رحم کرنے والا ہے۔ وہی خدا جو تجھے دیکھتا ہے جب تو دعا اور دعوت کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ وہی خدا جو تجھے اُس وقت دیکھتا تھا کہ جب تُو تخم کے طور پر راستبازوں کی پشتوں میں چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی بزرگ والدہ آمنہ کے پیٹ میں پڑا۔"

(تریاق القلوب ص۱۴۲ ایڈیشن سوم)

یہ حوالہ چونکہ بظاہر اوپر کی تشریح کے خلاف نظر آتا ہے اس لئے یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ ساجد کے لفظی معنے ایسے فرمانبردار کے ہوتے ہیں جو ہر بات کو تسلیم کرتا ہو اور بغاوت اور نشوز کے آثار اُس میں نہ پائے جاتے ہوں۔ لیکن اگر ہم گہرا غور کریں تو ساجد کا لفظ دو جگہ استعمال ہو سکتا ہے ایک مومن ساجد کے لئے اور ایک سوسائٹی کے ساجد کے لئے۔ مومن ساجد وہ ہو گا جو خدا تعالیٰ کی باتیں ماننے والا ہو اور خدا تعالیٰ کے قوانین سے بغاوت کرنے والا نہ ہو۔ اور سوسائٹی کا ساجد وہ ہو گا جو سوسائٹی کی باتیں ماننے والا ہو اور سوسائٹی کے قوانین سے بغاوت کرنے والا نہ ہو۔ اب ہم اس آیت کے معنوں کی طرف آتے ہیں۔ رسول کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے کئی بطن ہیں۔ ایک بطن تو قرآن کریم کا یہ ہے کہ کسی آیت کے معنے کرتے وقت اُس کے سیاق وسباق کی تمام آیات کو دیکھا جاتا ہے اور اُس کے معنے سیاق وسباق کی آیات کو مدّنظر رکھ کر کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر سیاق وسباق کو مدّنظر نہ رکھا جائے تو معنوں میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ پھر ایک بطن یہ ہے کہ کسی آیت کے معنے کرتے وقت اُس کے کچھ آگے آنے والی آیتوں اور کچھ پیچھے آنیوالی آیتوں کو دیکھا جاتا ہے اور اُن کے معنوں میں تطابق کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ پھر ایک بطن یہ ہے کہ جس آیت کے معنے مطلوب ہوں اُس ساری سورۃ کو دیکھا جاتا ہے پھر ایک بطن یہ ہے کہ کئی سورتوں کو ملا کر اس کے معنے اخذ کئے جاتے ہیں۔ پھر ایک بطن یہ ہے کہ سارے قرآن مجید کو مدّنظر رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اور بھی بعض بطن ہیں۔ یہ علم اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے مجھے عطا فرمایا ہے بعض دفعہ ایک مضمون کا تعلق ابتدائی سورتوں کے ساتھ ہوتا ہے اور بعض دفعہ بعد والی سورتوں کے ساتھ پھر ایک معنے کسی آیت کے منفرداً ہوتے ہیں اور ایک معنے دوسری آیتوں کے ساتھ ملا کر کئے جاتے ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان فرمودہ معنوں کی اس جگہ کیا صورت ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اگر ہم غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نے اس آیت کے معنے منفرداً لئے ہیں سیاق وسباق کو نہیں لیا۔ آپ نے جس مضمون میں اس آیت کو بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مُرسل اچھے اور شریف خاندانوں سے آتے ہیں اور اُن کی قوم ایسی اعلیٰ ہوتی ہے کہ کوئی شخص اس سے کراہت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر وہ ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں جس کو اس شہر یا علاقہ یا ملک کے لوگ ذلیل اور حقیر سمجھتے ہوں تو اُن کا ماننا طبائع پر گراں گذرتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت اور حکمت کے خلاف ہے کہ وہ حقیر قوموں میں سے نبیوں کو مبعوث کر کے لوگوں کو تکلیف مالایطاق میں ڈال دے۔ پس چونکہ ایسے خاندان سے کسی نبی یا رسول کا مبعوث ہونا جو رذیل سمجھا جاتا ہو طبائع کے لئے ٹھوکر کا موجب ہوتا ہے اور اس میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے نبیوں اور ماموروں کو شریف اور نجیب خاندانوں میں سے مبعوث کرتا چلا آیا ہے تاکہ لوگوں کے قلوب میں اُن کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا نہ ہوں۔ پس آپ نے اس آیت کے جو معنے لئے ہیں وہ منفرداً لئے ہیں سیاق وسباق کے لحاظ سے نہیں لئے۔ آپ نے ان معنوں کو اس رنگ میں لیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء و اجداد سوسائٹی کے ساجد تھے سوسائٹی سے بغاوت نہ کرتے تھے بلکہ اچھے شہری تھے اور وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جن کو قوم حقیر، نافرمان یا غدار سمجھتی تھی۔ بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا ہر نبی ہی ایسا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ معنے صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ہی چسپاں نہیں ہونگے بلکہ سب نبیوں پر ہو جائیں گے۔ ان معنوں کے لحاظ سے یہاں ساجد کے معنے خدا تعالیٰ کو سجدہ کرنے والے کے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ تو مسلّمہ امر ہے کہ بعض انبیاء کے آباء و اجداد ساجداً اللہ نہ تھے۔ اس لئے لازماً اس کے یہ معنے کرنے پڑیں گے کہ سوسائٹی کے ساجد اور سوسائٹی کے قوانین سے بغاوت نہ کرنے والے۔ ہر سوسائٹی کے اندر شرافت کا ایک خاص معیار ہوتا ہے۔ مثلاً شراب پینا ایک فعل ہے۔ اب فرض کرو ایک مسلمان بھی شراب پیتا ہے اور ایک انگریز بھی شراب پیتا ہے۔ تو جب مسلمان شراب پیئے گا تو اُسے اس کی سوسائٹی غیر شریف قرار دیگی اور جب انگریز شراب پیئے گا اسے اُسکی سوسائٹی شریف ہی کہیگی۔

غرض فعل ایک ہی ہے مگر جب اسے دو الگ الگ سوسائٹیوں کے معیاروں پر پرکھا جائیگا تو ایک سوسائٹی کے معیار کے مطابق وہ فعل گناہ بن جائیگا اور اس کا مرتکب سخت گنہگار قرار پائیگا اور دوسری سوسائٹی کے معیار کے مطابق وہ فعل عین شرافت سمجھا جائیگا اور اس کا مرتکب سوسائٹی کا فرمانبردار قرار پائیگا۔ پس شرافت کا معیار ہر سوسائٹی کے اپنے اپنے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد عرب کی سوسائٹی کے مطابق شریف تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ معیارِ اسلام کے مطابق اُن میں نیکیاں نہیں پائی جاتی تھیں۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اِس آیت کے جو معنے لئے ہیں منفرداً لئے ہیں۔ سیاق و سباق کے لحاظ سے نہیں لئے۔ اور قرآن کریم کے ایک بطن کے لحاظ سے وہ بھی درست ہیں۔ اور چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم کے سات بطن ہیں۔ اس لئے ایک ایک آیت کے کئی معنے کئے جا سکتے ہیں جو اپنے اپنے رنگ میں سب کے سب درست ہونگے۔ ایک معنے منفرد آیت کے ہوتے ہیں۔ ایک معنے کئی آیتوں کے تسلسل کے لحاظ سے ہوتے ہیں ایک معنے پوری سورۃ کے تسلسل کے لحاظ سے ہوتے ہیں ایک معنے کئی سورتوں کے تسلسل کے لحاظ سے ہوتے ہیں اور ایک معنے سارے قرآن کریم کے تسلسل کے لحاظ سے ہوتے ہیں اور وہ سارے معنے ہی صحیح ہوتے ہیں۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کے جو معنے کئے ہیں وہ انفرادی لحاظ سے کئے ہیں اور آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد سوسائٹی میں شریف اور معزز سمجھے جاتے تھے اور سوسائٹی کے قوانین کے پابند تھے۔ گویا عرب کی سوسائٹی کے لحاظ سے جن خاندانوں کو شرفاء کے خاندان قرار دیا جاتا تھا اُس کو مدّنظر رکھتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان نہایت شریف تھا۔ چنانچہ اِس فرق کو قرآن کریم نے بھی اتنا تسلیم کیا ہے کہ اہل کتاب کے ہاتھ کا کھانا جائز قرار دیا ہے اور مشرک کے ہاتھ کا کھانا ناجائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ اہل کتاب شراب بھی پیتے ہیں اور سؤر کا گوشت بھی کھاتے ہیں اور اُن کے مقابلہ میں مشرکین میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو سؤر نہیں کھاتے (یہاں مشرک کے معنے یہ ہیں کہ وہ جو کسی کتاب کو ماننے والا نہ ہو۔ یہ نہیں کہ جو اہل کتاب ہو وہ شرک کرتا ہی نہیں۔ باریک معنوں کی رُو سے تو اہل کتاب بھی مشرک ہوتے ہیں اور دہریہ بھی مشرک ہوتے ہیں لیکن قرآن کریم کی اصطلاح میں مشرک کا اَور مفہوم ہے اور عرفِ عام میں مشرک کا اَور مفہوم ہے۔ قرآن کریم نے اہل کتاب اُن کو قرار دیا ہے جو کسی کتاب کے قوانین کو مانتے ہیں چاہے وہ اُن قوانین پر عامل نہ ہوں۔ اُن کا قوانین کو تسلیم کرنا ہی ان کو اہل کتاب کا نام دینے کیلئے کافی ہے۔ جیسے بہت سے مسلمان بھی قرآن کریم کے احکام پر نہیں چلتے مگر وہ کہلاتے مسلمان ہی ہیں) بہرحال اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے کھانے کو اس لئے جائز قرار دیا ہے کہ اُن میں کسی کتاب کو ماننے کی وجہ سے کچھ نہ کچھ اخلاق ضرور ہونگے اور ہم اُن پر یہ حسن ظنی کر سکتے ہیں کہ چونکہ اہل کتاب میں سے کسی بھی کتاب میں دھوکا دینا جائز نہیں اس لئے یہ دھوکا دیکر ہمیں کوئی ایسی چیز نہیں کھلا دیں گے جو ہمارے مذہب کی رُو سے ناجائز ہو۔ لیکن جو شخص خود کہتا ہے کہ میں کسی قانون کا پابند نہیں تو چاہے وہ شریف ہی کیوں نہ ہو ہم اُس پر حسن ظنی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم یہ سمجھیں گے کہ چونکہ اس کے لئے کسی قانون کے پابند نہ ہونے کی وجہ سے دھوکا یا فریب کرنے میں کوئی روک نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ یہ ہمارے ساتھ دھوکا کر جائے اور ہمیں کوئی ایسی چیز کھلا دے جو ہمارے مذہب میں

ناجائز ہو۔ پس قرآن کریم نے جو اہل کتاب کا ذبیحہ کھانے کی اجازت دی ہے وہ بھی اسی لئے ہے کہ وہ ایک قانون کے پابند ہیں۔ حالانکہ وہ سؤر کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ مگر مشرک کے ہاتھ کا کھانے کی صرف اسلئے اجازت نہیں دی کہ وہ کسی قانون کا پابند نہیں۔ اور اس کو دھوکا یا فریب دینے سے کوئی چیز روکنے والی نہیں ہے۔ ایک اہل کتاب چاہے دنیوی لحاظ سے بااخلاق نہ ہو اس کا کھانا کھانے کی اجازت ہے۔ اور مشرک چاہے دنیوی لحاظ سے بااخلاق ہو اس کا کھانا کھانے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ اہل کتاب کسی نہ کسی قانون کے پابند ہیں۔ یہودی تورات کو مانتے ہیں۔ عیسائی انجیل کو مانتے ہیں اور ہندو ویدوں کو مانتے ہیں اور ان سب کا قانون اس امر پر متفق ہے کہ کسی کے ساتھ دھوکا کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی لئے شریعت اسلامیہ نے اہل کتاب کو دوسروں سے زائد حقوق دیئے ہیں۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد چونکہ اچھے شہری تھے اور سوسائٹی کے قانون کے پابند تھے اس لئے انہیں ساجد کہا گیا۔ مگر وہ ساجدًا للہ نہیں تھے بلکہ ملکی قانون کے ساجد تھے۔ اور شریف خاندان رکھتے تھے۔ اور انبیاء ہمیشہ شریف اور اعلیٰ خاندانوں میں سے ہی آتے ہیں۔ اگر کوئی نبی ادنیٰ اقوام میں سے آجائے (جو سنت اللہ کے خلاف ہے) تو لوگ اُس کو مان نہیں سکتے۔ وہ کہیں گے کہ اس کا خاندان اچھا نہیں ہے۔ یا یہ غلام ہے۔ حضرت موسٰی علیہ السلام کو ہی دیکھ لو۔ آپ غلام نہ تھے مگر چونکہ کچھ عرصہ آپ نے فرعون مصر کے گھر سے روٹی کھائی تھی اس لئے فرعون نے کہہ دیا کہ یہ وہی ہے جس کو ہم نے روٹیاں کھلا کھلا کر پالا ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھو۔ عیسائی آج تک آپؐ کے متعلق یہ طعنہ دیتے ہیں کہ آپ لونڈی کی نسل میں سے تھے۔ وہ لوگ حضرت ہاجرہؓ کو لونڈی قرار دیتے ہیں حالانکہ تورات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہؓ مصر کے بادشاہ کے رشتہ داروں میں سے تھیں۔ اور اس بادشاہ نے انہیں اخلاص کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں تحفتًہ پیش کیا تھا مگر عیسائیوں نے صرف اس لئے کہ حضرت ہاجرہؓ تحفۃً دی گئی تھیں اُن کو لونڈی قرار دے دیا۔ غرض دشمن تو ہمیشہ تعصب کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مرسل اعلیٰ اور شریف خاندانوں میں سے آتے ہیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں اُن کو مانتے ہوئے انقباض پیدا نہ ہو۔ اسی لئے جب ہرقل قیصر روم نے ابوسفیان سے سوال کیا کہ یہ شخص (یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اُس کا خاندان کیسا ہے تو ابوسفیان نے یہی جواب دیا کہ وہ اچھے خاندان کا ہے اور میرے رشتہ داروں میں سے ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کے معنے سیاق وسباق کے تسلسل میں بیان نہیں فرمائے۔ بلکہ صرف یہ ثابت کیا ہے کہ نبی اپنی قوم میں شریف ہوتے ہیں اور ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے انبیاء آئے ہیں وہ سب کے سب معزز خاندانوں میں سے تھے۔ اچھے شہریوں اور قانونِ وقت کے ساتھ چلنے والوں اور سوسائٹی کے مفید ترین لوگوں کی اولادوں میں سے تھے اس لئے لوگ اُن کی تحقیر و تذلیل نہ کر سکتے تھے بلکہ اُن کا پورا ادب اور احترام کرتے تھے۔ غرض اس آیت کے ایک معنے تو وہ ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منفردًا کئے ہیں اور دوسرے معنے وہ ہیں جو مَیں نے سیاق وسباق کے تسلسل کے لحاظ سے بیان کئے ہیں۔ لیکن اس آیت کے ایک

تیسرے معنے ساری سورۃ کے تسلسل کے لحاظ سے بھی ہیں۔
اِس سورۃ (الشعراء) میں سب سے پہلے حضرت موسیٰ
علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام
کا ذکر آتا ہے۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر آتا ہے
پھر حضرت صالح علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ پھر حضرت
لوط علیہ السلام کا ذکر آتا ہے اور پھر حضرت شعیب
علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ اِن سب انبیاء کا ذکر کرنے
کے بعد اللہ تعالیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر
فرماتا ہے۔ اِن کے علاوہ بہت سے انبیاء ایسے بھی ہیں
جن کے نام قرآن کریم میں نہیں آئے اور اُن کی تاریخ بھی
محفوظ نہیں۔ قرآن کریم نے قاعدہ کلیہ کے طور پر بیان
کر دیا ہے کہ تمام انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی خبر دیتے چلے آئے ہیں اور سب نے آپ کے متعلق
پیشگوئیاں کیں۔ مگر ان میں سے بعض کی پیشگوئیاں تو
محفوظ ہیں اور باقی انبیاء کی پیشگوئیاں محفوظ نہیں ہیں جیسے حضرت
ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئیاں موجود ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی
پیشگوئیاں تورات میں موجود ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئیاں
انجیل میں موجود ہیں۔ یہ تو ایسے ہیں جن کی پیشگوئیاں اُن کی کتابوں میں
موجود ہیں۔ لیکن جن انبیاء کے نام قرآن کریم میں بیان
نہیں ہوئے اور نہ ہی اُن کی کوئی تاریخ موجود ہے۔
اُن کی پیشگوئیاں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ اِن تمام انبیاء
کا جن کے نام میں نے اوپر بتائے ہیں ذکر کرنے کے بعد
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کیا اس پر شیطان اُتر سکتا ہے اگر
شیطان اُترتا تو ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت
بھی ہونا چاہیئے۔ آخر ان منکرین میں سے بعض ایسے لوگ
بھی ہیں جو کسی نہ کسی نبی کو مانتے ہیں۔ ان میں عیسائی بھی
ہیں یہودی بھی ہیں اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں عیسائی
حضرت عیسیٰؑ کو مانتے ہیں۔ یہودی حضرت موسیٰؑ۔ نوحؑ
ابراہیمؑ اور لوطؑ کو مانتے ہیں اور دوسرے کفار ہودؑ
اور صالحؑ کو مانتے ہیں۔ اِن سارے گروہوں میں سے مکہ والوں
کے جدامجد حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئیاں محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق موجود تھیں۔ عیسائیوں کے
جدامجد موسیٰ کی پیشگوئیاں موجود تھیں۔ غرض اللہ تعالیٰ
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے تَقَلُّبَكَ
فِي السّٰجِدِيْنَ۔ تیری صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت
یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء تیری خبر دیتے چلے
آئے ہیں۔ تَقَلُّبٌ کے معنے ہوتے ہیں چلنا پھرنا۔ یعنی
اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تُو موسیٰؑ کے سامنے کشفی حالت
میں موجود تھا۔ تُو ابراہیمؑ کے سامنے موجود تھا۔ تُو نوحؑ
کے سامنے موجود تھا۔ تُو ہودؑ کے سامنے موجود تھا۔ تُو
صالحؑ کے سامنے موجود تھا۔ فرماتا ہے جب تُو اِن تمام
انبیاء کے سامنے موجود تھا جن کو یہ لوگ اپنے بزرگ
تسلیم کرتے ہیں تو یہ کس طرح تیرا انکار کر سکتے اور کہہ سکتے
ہیں کہ تُو راستبازوں میں سے نہیں ہے۔ ابراہیمؑ نے
کشفی حالت میں تجھے دیکھا۔ اِسی لئے اُس نے تیری آمد
کی خبر دی۔ موسیٰؑ نے کشفی حالت میں تجھے دیکھا اسی لئے
اُس نے تیری آمد کی خبر دی اور عیسیٰؑ نے تجھے دیکھا۔
اِسی لئے اُس نے تیری خبر دی اور اِن تمام نبیوں نے
بتایا کہ اِس شان کا ایک نبی پیدا ہونے والا ہے پس
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِن انکار کرنے والوں کے جتنے
باپ دادے تھے۔ وہ تیرے متعلق گواہیاں دے چکے
ہیں کہ اِس اِس شان کا ایک نبی آئیگا اُس کو مان لینا
اَب یہ کس طرح تیرا انکار کر سکتے ہیں اور اپنے بزرگوں
کی شہادت کو رد کر سکتے ہیں۔ غرض ساری سورۃ کے
تسلسل کے لحاظ سے تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کے معنے ہیں
تَقَلُّبَكَ فِي الْاَنْبِيَاءِ۔ یعنی ابراہیمؑ نے انگلی اٹھائی اور
کہا یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) راستباز ہے۔ نوحؑ نے انگلی
اُٹھائی اور کہا یہ راستباز ہے۔ موسیٰؑ نے انگلی اٹھائی

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۲﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ

کیا میں تجھے بتاؤں کہ شیطان کس پر اُترتے ہیں؟ (شیطان) ہر جھوٹے گناہگار پر

اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۳﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۴﴾

اُترتے ہیں۔ وہ اپنے کان (آسمان کی طرف) لگاتے ہیں اور اُن میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ ۳۹ؔ

اور کہا۔ یہ راستباز ہے۔ عیسٰیؑ نے انگلی اٹھائی اور کہا یہ راستباز ہے۔ ہودؑ۔ صالحؑ۔ لوطؑ اور شعیبؑ نے انگلیاں اُٹھائیں اور کہا یہ راستباز ہے۔ فرماتا ہے ان تمام انبیاء نے جن کو تم اپنے بزرگ تسلیم کرتے ہو خبر دی تھی کہ یہ راستباز ہے۔ اب تم اس کا کس طرح انکار کرسکتے ہو؟

اس کے بعد فرماتا ہے اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ یقیناً وہ خدا جس نے تجھے مبعوث کیا ہے دُعاؤں کو قبول کرنے والا اور اپنے بندوں کے حالات کو جاننے والا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ پہلی آیت میں نمازوں اور دعاؤں کا ہی ذکر ہے نہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ دادوں کا۔ تبھی وہ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ دُعائیں سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ یعنی تیری اور تیرے ساتھیوں کی دُعائیں تعلیم اسلام کو مکمل سے مکمل تر کرتی چلی جاتی ہیں۔ اسی کی طرف دوسری جگہ قرآن کریم میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰہٰ ع) یعنی تو ہمیشہ اللہ سے یہ دُعا کرتا رہ۔ کہ اے میرے ربّ! میرے علم کو بڑھا۔ چونکہ یہ قرآنی دُعا ہے۔ اس لئے صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہی یہ دُعا نہیں مانگتے تھے بلکہ سارے مسلمان مانگتے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مراد تو اس دُعا سے یہ ہوتی تھی کہ اے خدا! تو مجھ پر قرآن کریم کو مکمل سے مکمل تر کرکے اُتار اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ مُراد ہوتی تھی کہ اے خدا! ہمارے رسولؐ کے ذریعہ سے ہمیں کامل سے کامل تر شریعت عطا فرما۔

۳۹ؔ حل لغات:- اَفَّاكٍ کے معنے ہیں اَلَّذِيْ يَصُدُّ النَّاسَ عَنِ الْحَقِّ بِبَاطِلِهٖ۔ وہ شخص جو لوگوں کو حق و صداقت کے قبول کرنے سے اپنے جھوٹے اور باطل طریقوں سے روکتا ہے (اقرب)

اَفَّاكٍ ۲

تفسیر:- پہلے تو اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ اس قرآن کو شیاطین نے نازل نہیں کیا اور نہ اُن میں طاقت تھی کہ وہ ایسا کرسکتے۔ اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ کفار کے اس اعتراض کے جواب میں یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ شیاطین جن لوگوں پر نازل ہوتے ہیں اُن کی کیا علامات ہوتی ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ۔ شیطان ہر جھوٹے گناہگار پر اُترتا ہے۔ یعنی شیطان کا تعلق تو اَفَّاكٍ اور اَثِيْمٍ کے سوا کسی سے ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ شیطان خود جھوٹ بولتا ہے اور اس کا نام شیطان ہی بتاتا ہے کہ وہ بڑا گناہگار ہوتا ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو نہ جھوٹا ہے اور نہ گناہگار پھر اُس پر شیاطین کس طرح اُتر سکتے ہیں۔ بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو وہ ہیں جنکی صداقت اور راستبازی کے تم بھی قائل ہو۔ چنانچہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا تو چونکہ مکہ عرب کے لوگوں کا مرکز تھا

اور لوگ وہاں حج کرنے کیلئے آیا کرتے تھے۔ اس لئے چند سربرآوردہ لوگوں نے جمع ہو کر تجویز کی کہ اس سال جب باہر سے لوگ حج کرنے کے لئے آئیں گے تو اگر ہم اُن کو آپؐ کے متعلق مختلف باتیں بتائیں گے تو وہ ہماری باتوں کو غلط سمجھیں گے۔ چاہیئے کہ مل کر ایک فیصلہ کر لیا جائے اور وہی جواب انہیں دیا جائے۔ اس پر اُن میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم کہہ دیا کرینگے کہ وہ جھوٹا ہے۔ جب اس نے یہ بات کہی۔ تو اُسی وقت ایک شدید دشمن النضر بن الحارث جوش سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ تم یہ کیا بات کر رہے ہو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تو ہم صادق اور امین کے طور پر پیش کیا کرتے تھے اسلئے اب اُس کو کیسے جھوٹا کہیں گے۔ وہ لوگ تو اس جواب میں ہمیں ملزم قرار دینگے اور کہیں گے کہ تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو (شفاء قاضی عیاض) تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی راستبازی کے تم بھی قائل ہو تو پھر اُسی مُنہ سے یہ کس طرح کہہ رہے ہو کہ اس پر شیطان کلام لے کر نازل ہوتا ہے۔ شیطان تو جھوٹوں اور گنہگاروں پر نازل ہُوا کرتا ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مُنہ جھوٹوں والا نہیں بلکہ اس کا چالیس سالہ عمل اور کردار تمہارے سامنے ہے اور تم سب جانتے ہو کہ یہ شخص تم سب میں سے زیادہ راستباز تھا۔ پھر یہ کیسے تعجب کی بات ہے کہ تم شیطان کے نزول کے لئے اُسی شخص کا نام لے رہے ہو جو شیطان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

پھر فرماتا ہے يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ۔ وہ لوگ اپنے کان آسمان کی طرف لگائے رکھتے ہیں اور اُن میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ آسمان کی طرف اپنے کان لگائے رکھنے کے دو معنے ہیں۔ ایک معنے تو یہ ہیں کہ وہ اس بات کی خواہش اور تمنّا کیا کرتے ہیں کہ اُن پر الہام نازل ہو اور انہیں کچھ غیب کی خبریں معلوم ہو جائیں۔ اور وہ اپنی اس خواہش میں اسقدر بڑھ جاتے ہیں کہ آخر انہیں شیطانی الہام ہونے لگ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ خود بھی ٹھوکر کھاتے ہیں اور دوسروں کے لئے بھی ٹھوکر کا موجب بنتے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تو یہ حالت ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ خدا تعالیٰ سے کہے کہ مجھ پر کلام نازل کر خدا خود اس پر کلام نازل کرتا ہے اور وہ نفسانی رنگ میں کبھی یہ خواہش نہیں کرتا کہ خدا اس پر کلام نازل کرے تاکہ وہ دوسروں پر اپنی بڑائی ظاہر کرے۔ ہاں جو کلام خود اس پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اس پر وہ اس کا شکر بجا لاتا ہے لیکن جو افاک اور اثیم ہوتے ہیں اُن کے دلوں میں ہر وقت یہی خواہش موجزن رہتی ہے کہ کسی طرح اُن پر کلام نازل ہو جائے۔ وہ لوگ کہیں مسمریزم کرتے ہیں۔ کہیں ہپناٹزم کا عمل کرتے ہیں اور کہیں وظیفے کرتے اور چلّے کاٹتے ہیں اور اس تمام جدوجہد سے اُن کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ انہیں کچھ غیب کی خبریں معلوم ہو جائیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی فرمایا کرتے تھے کہ تم کبھی یہ خواہش نہ کرو کہ خدا تعالیٰ کا کلام تم پر نازل ہو ہاں اگر خدا تعالےٰ کا کلام تم پر نازل ہوتا ہے اور تم کو کوئی الہام ہوتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ تم اگر اللہ تعالےٰ سے مانگنا چاہتے ہو تو اُس کا فضل مانگو۔ ہاں اگر کسی خاص موقعہ پر انسان استخارہ کرکے خدا تعالیٰ سے ہدایت طلب کرے تو اور بات ہے۔ لیکن کلام الٰہی مانگنا اور اس کی خواہش کرنا تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس کے مدّنظر صرف اپنی بڑائی کا خیال ہے خدا تعالےٰ کے قرب کی اُسے کوئی خواہش نہیں۔ اسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے

الہامات کی خواہش رکھنے سے اپنی جماعت کو سختی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ اپنی جماعت کو اِس بارہ میں ہدایت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:—

"مکالماتِ الٰہیہ کی اپنے نفس میں خواہش نہیں ظاہر کرنی چاہیئے۔ خواہش کرنے کے وقت شیطان کو موقعہ ملتا ہے اور ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ اپنا مدّعا اور مقصود ہمیشہ یہ ہونا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق تزکیہ نفس حاصل ہو اور اُس کی مرضی کے موافق تقوٰی حاصل ہو۔ اور کچھ ایسے اعمالِ حسنہ میسّر آجاویں کہ وہ راضی ہو جائے۔ پس جس وقت وہ راضی ہوگا تب اُس وقت ایسے شخص کو اپنے مکالمات سے مشرف کرنا اگر اُس کی حکمت اور مصلحت تقاضا کریگی تو وہ خود عطا کر دے گا۔ اصل مقصود اس کو ہرگز نہیں ٹھہرانا چاہیئے کہ یہی ہلاکت کی جڑ ہے۔ بلکہ اصل مقصود یہی ہونا چاہیئے کہ قرآن شریف کی تعلیم کے موافق احکامِ الٰہی پر پابندی نصیب ہو اور تزکیۂ نفس حاصل ہو۔ اور خدا تعالیٰ کی محبت اور عظمت دل میں بیٹھ جائے اور گناہ سے نفرت ہو۔"

(الحکم ۲۴ر نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

اِسی طرح فرماتے ہیں:—

"وہ لوگ جو اپنے نفس میں پوری پاکیزگی نہیں رکھتے اور پھر خوابوں کی خواہش رکھتے ہیں اور الہامات کی طرف بنا دل لگاتے ہیں اُن کو حدیث النفس اور اضغاثِ احلام کے سوائے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

(تقریر جلسہ سالانہ ۱۹۰۶ء مندرجہ اخبار بدر ۱۰ر جولائی ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۶)

اس کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت تھی کہ آپؐ پر کلامِ الٰہی نازل ہُوا تو آپ گھبراہٹ کی حالت میں اپنے گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ نہ معلوم میں اِس ذمہ داری کو ادا بھی کر سکتا ہوں یا نہیں۔ لیکن جو جھوٹے اور شیاطین کی پیروی کرنے والے لوگ ہوتے ہیں اُن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ رمل اور نجوم کے ذریعہ اور اسی طرح اور کئی قسم کے ذرائع سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کی رات دن کوشش کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ اُن کی بزرگی تسلیم کریں اور انہیں اپنا ملجا و ماوٰی سمجھنے لگ جائیں۔

یُلْقُوْنَ السَّمْعَ کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ شیطان کوشش تو کرتے ہیں کہ خدائی باتوں کو سُنیں۔ لیکن اُن میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں وہ جھوٹ کو چھوڑ نہیں سکتے وہ خدا کی سُنی ہوئی باتوں میں جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ اور اس طرح اُن کا فریب کھل جاتا ہے۔ یعنی جب وہ مسلمانوں سے قرآن کریم سُنتے ہیں تو اُس میں غلط باتیں ملا کر لوگوں میں مشہور کر دیتے ہیں اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے قرآن میں یہ یہ باتیں بیان ہوئی ہیں۔ حالانکہ وہ بالکل جھوٹ ہوتا ہے۔

اِس کا یہ مطلب نہیں جیسا کہ مفسّرین نے لکھا ہے کہ شیاطین آسمان پر جا کر خدا تعالیٰ کی وحی کو معلوم کر لیتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم کی رُو سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اِسی رکوع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِنَّھُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (آیت ۲۱۳) یعنی شیطان آسمانی باتوں کے سُننے سے دُور رکھے گئے ہیں۔ اِسی طرح ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَمْ لَھُمْ سُلَّمٌ یَّسْتَمِعُوْنَ فِیْہِ فَلْیَاْتِ مُسْتَمِعُھُمْ بِسُلْطَانٍ

مُّبِیْنٍ (طور ع۲) یعنی کیا اُن کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس کے ذریعہ وہ آسمان پر جاکر خدا تعالیٰ کی باتیں سُن سکتے ہیں۔ اگر اُن میں کوئی اس امر کا مدعی ہے کہ وہ آسمان پر گیا تھا۔ اور اس نے خدا تعالیٰ کی باتیں سُنی تھیں تو وہ اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرے۔ اِن آیات سے ظاہر ہے کہ آسمان کی باتیں سُننا تو الگ رہا وہاں تک کسی کے جانے کی اہلیت بھی قرآن کریم نے تسلیم نہیں کی۔ اور جب یہ حقیقت ہے تو یُلْقُوْنَ السَّمْعَ کے یہ معنے کرنے کس طرح جائز ہو سکتے ہیں کہ وہ آسمان کی باتیں سُننے کے لئے اپنے کان لگائے رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ آسمان کی باتیں سُننے کے معنے یہ ہیں کہ وہ مومن انسانوں سے خدا تعالیٰ کی باتیں سُنتے ہیں۔ لیکن اُن میں جھوٹ ملاکر قرآن کریم کو بدنام کرنے کے لئے لوگوں میں مشہور کر دیتے ہیں اور اس طرح ان کا جھوٹ لوگوں پر واضح ہو جاتا ہے۔ پس اس کے یہ معنے نہیں کہ شیطان آسمان پر جاکر ملاء اعلیٰ اور جبریلؑ اور عرش کی باتوں کو سُن لیتا ہے اور پھر وہ زمین پر آجاتا ہے بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جو لوگ شیطان کے مثیل ہوتے ہیں اور جنہوں نے ابلیسی جامہ زیب تن کیا ہوا ہوتا ہے۔ وہ آسمانی باتوں کو ایسے رنگ میں بگاڑ کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ایک فتنہ برپا ہو جاتا ہے اور کئی لوگ اُن کے فریب میں آجاتے ہیں۔ گویا براہ راست کلام الٰہی کے سُننے سے تو وہ محروم ہی رہتے ہیں۔ آسمانی کتابوں سے وہ جو کچھ آسمانی باتیں حاصل کرتے ہیں اُن میں بھی اپنی عادت کے مطابق اپنے پاس سے جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ اور اس طرح لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہی حقیقت اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بھی بیان فرمائی ہے کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (انعام ع۱۴) یعنی اے ہمارے رسولؐ! جس طرح تیرے زمانہ میں ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہم نے ہر نبی کے زمانہ میں انسان شیطانوں اور جن شیطانوں کو چھوڑ رکھا تھا اور وہ ایک دوسرے کو دھوکا دینے کیلئے جھوٹی باتیں سُناتے تھے۔ یہ آیت بھی بتاتی ہے کہ انبیاء کے دشمن جو بڑے لوگوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور عوام الناس میں سے بھی ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو غیب کی باتیں نہیں بتاتے بلکہ جھوٹی باتیں بتاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو مسلمان علماء نے قرآن کریم کی تفاسیر لکھی ہیں۔ اور وہیری اور بعض دوسرے مستشرقین نے بھی قرآن کریم کی تفاسیر لکھی ہیں۔ لیکن عیسائی پادریوں نے اپنی تفاسیر میں اسلام کو بدنام کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ پس آسمانی باتیں سُننے کے لئے کان تو مومن بھی رکھتے ہیں اور کافر بھی۔ مگر مومن تو اس لئے کان رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو سُنیں اور اس پر عمل کریں۔ اور کفار اس لئے رکھتے ہیں کہ وہ اس میں جھوٹ ملاکر لوگوں کو اور زیادہ گمراہ کریں اور انہیں خدا اور اُس کے رسول سے دُور رکھنے کی کوشش کریں۔ پھر فرماتا ہے۔ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۔ اُن میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ۔ شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر نازل ہوتے ہیں اور یہاں فرماتا ہے کہ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۔ ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ جب اکثر جھوٹے ہوتے ہیں تو معلوم ہُوا کہ سارے کے سارے جھوٹے نہیں ہوتے حالانکہ كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ کہہ کر ان میں سے ہر ایک کو بلا استثناء جھوٹا کہا گیا تھا۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اَكْثَرُهُمْ کے الفاظ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ کے متبعین کے لئے آئے ہیں یعنی اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ کے متبعین میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۵﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ

اور شعراء کی جماعت ایسی ہوتی ہے کہ اُن کے پیچھے چلنے والے گمراہ ہوتے ہیں۔ (اے مخاطب) کیا تیری سمجھ میں (اب تک) نہیں آیا

كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

کہ وہ (یعنی شعراء) تو ہر وادی میں بے مقصود کے پھرتے ہیں - اور وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں -

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ

سوائے (شاعروں میں سے) مومنوں اور نیک عمل کرنے والوں کے اور ان کے جو اللہ (تعالیٰ) کا

كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَ

(اپنے شعروں میں) کثرت سے ذکر کرتے ہیں اور (اگر ہجو کرتے ہیں تو ابتداءً نہیں کرتے بلکہ) مظلوم ہونے کے بعد (جائز) بدلہ لیتے ہیں اور

سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۸﴾ ع

ع ۱۱ ۱۵

وہ لوگ جو ظالم ہیں ضرور جان لیں گے کہ کس مقام کی طرف اُن کو لوٹ کر جانا ہو گا ۴۰۵

ضروری نہیں کہ افاکِ اثیم کے متبعین سارے کے سارے جھوٹے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اُن میں سے بعض غلطی خوردہ ہوں اور وہ اپنے لیڈروں کو سچا سمجھ کر اُن کے پیچھے چل رہے ہوں۔ پس چونکہ دنیا میں اس قسم کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو جھوٹ کو سچ سمجھ کر اختیار کرتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان کے تمام متبعین جھوٹے اور کذاب ہوتے ہیں۔ بلکہ فرمایا کہ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ اُن میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں - ہاں ایک قلیل تعداد غلطی خوردہ لوگوں کی بھی ہوتی ہے -

۴۰۵ حل لغات:- يَهِيْمُوْنَ: هَامَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور هَامَ عَلٰى وَجْهِهٖ کے معنے ہیں ذَهَبَ مِنَ الْعِشْقِ اَوْ غَيْرِهٖ لَا يَدْرِيْ اَيْنَ يَتَوَجَّهُ کہ اپنے عشق یا کسی اور مقصد کی خاطر اِدھر اُدھر گھومتا پھرا اور اس کو معلوم نہ ہوا کہ وہ کدھر جا رہا ہے (اقرب) پس يَهِيْمُوْنَ کے معنے ہونگے وہ سرگردان پھرتے ہیں -

اِنْتَصَرُوْا: اِنْتَصَرَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِنْتَصَرَ مِنْهُ کے معنے ہیں اِنْتَقَمَ مِنْهُ اُس سے بدلہ لیا - اور جب اِنْتَصَرَ عَلَيْهِ کہیں تو معنے ہوتے ہیں اِسْتَظْهَرَ - اس پر غالب آ گیا۔ وَ امْتَنَعَ مِنْ ظُلْمِهٖ - اُس کے ظلم سے محفوظ ہو گیا۔ (اقرب) پس اِنْتَصَرُوْا کے معنے ہیں - وہ انتقام لیتے ہیں -

اِنْتَصَرُوْا

تفسیر:- کفارِ مکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو سُنکر اپنے جن خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے قرآن کریم نے ان کا مختلف مقامات میں ذکر کیا ہے - اور بتایا ہے کہ وہ کبھی آپ کو مجنون کہنے لگ جاتے تھے - کبھی کہتے کہ اسے پریشان خوابیں آتی ہیں۔

يَهِيْمُوْنَ

جن کی وجہ سے یہ ایسا دعویٰ کر بیٹھا ہے۔ کبھی کہتے یہ ساحر ہے۔ کبھی کہتے کہ یہ خود تو نیک بخت ہے لیکن کسی اَور نے اِس پر جادو کر دیا ہے۔ گویا یہ ساحر نہیں بلکہ مسحور ہے۔ کبھی کہتے یہ کاہن ہے۔ کبھی کہتے کہ اسے کوئی اور شخص باتیں سکھا دیتا ہے یہ کلام اس کا اپنا نہیں۔ کبھی کہتے کہ اس کے ساتھ شیطان کا تعلق ہے کبھی کہتے یہ مفتری اور کذّاب ہے اور کبھی کہتے کہ یہ شاعر ہے۔ چنانچہ سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ۔ (انبیاء ع) یعنی مخالف کہتے ہیں کہ یہ کلام تو پریشان خوابیں ہیں بلکہ پریشان خوابیں بھی نہیں اس نے دیدہ دانستہ یہ باتیں اپنے پاس سے بنالی ہیں بلکہ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایک شاعرانہ مزاج رکھنے والا آدمی ہے جس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات اٹھتے رہتے ہیں اور جس طرح مشہور اور قادر الکلام شعراء کے اشعار میں بڑی بھاری فصاحت و بلاغت اور بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کا کلام بھی شاعرانہ فصاحت و بلاغت کا حامل ہے۔ پس درحقیقت یہ بھی ایک شاعر ہے کوئی روحانی آدمی نہیں۔

اللہ تعالیٰ زیر تفسیر آیات میں کفار کے اِس ادّعا کو بھی باطل ثابت کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ تمہارا یہ خیال بھی کلّی طور پر غلط ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ شعراء پر ایسے لوگ ہی گرویدہ ہوتے ہیں جن کا تقویٰ اور روحانیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چونکہ شعراء اپنے شعروں میں عموماً عشق اور محبّتِ نفسانیہ اور شہوانیہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس لئے ایسے ہی لوگ اُن کے پیچھے چلتے ہیں جو خود بھی تقویٰ سے دُور ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض آوارہ نوجوانوں کو اُن کے سینکڑوں اشعار یاد ہوتے ہیں اور بعض شاعروں کی غزلیں رنڈیاں گاتی ہیں کیونکہ اُن میں خدا اور اس کے رسول کا کہیں ذکر نہیں ہوتا بلکہ عموماً اُن کے ذریعہ نوجوانوں کے شہوانی جذبات کو تحریک دی جاتی ہے اور واعظ اور ناصح پر پھبتیاں اُڑائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے اُن کی ایسے ہی لوگوں میں مقبولیت ہوتی ہے جن کا روحانیت سے کوئی دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین تو ایسے ہیں جنہوں نے اپنی صداقت اور دیانت اور عفت اور پاکیزگی کا ایک بے مثال نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کر رکھا ہے۔ اُن کی راتیں قیام و سجود میں۔ اور اُن کے دن ذکرِ الٰہی اور اعلاءِ کلمۂ اسلام میں بسر ہوتے ہیں۔ پھر تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ جس مقدس انسان کا دامن چھو کر ان کے اندر ایسی پاکیزگی پیدا ہوئی ہے وہ تمہارے بدعمل شاعروں کی طرح ایک ایسا انسان ہے جو جذبات کو بھڑکا کر لوگوں کو اپنے اردگرد جمع کر رہا ہے۔ اِس کی جماعت کی پاکیزگی اور ان کا تقویٰ و طہارت میں بے مثال نمونہ قائم کرنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارا یہ ادّعا بالکل باطل ہے۔ اور تم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام سمجھنے میں سخت غلطی کھائی ہے۔

پھر فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ شاعر مختلف طبائع کو خوش کرنے کے لئے کبھی اِدھر کی بات کر دیتے ہیں کبھی اُدھر کی۔ اُن کے سامنے کوئی خاص مقصد اور مدّعا نہیں ہوتا بلکہ جو چیز بھی اُن کے ذہن میں آجائے اُسی کے متعلق وہ کچھ نہ کچھ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ شاعروں کی کوئی غزل لے لو فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ کا تمہیں اُن کی ہر غزل میں نظارہ نظر آجائیگا۔ ایک شعر میں تو لکھا ہوگا۔ میں مر گیا۔ میرا معشوق مجھ سے بے وفائی کرتا ہے۔ اور میں اُس کے ہجر میں اُسکی بے التفاتی

کی وجہ سے جاں بلب ہوں۔ مگر ساتھ ہی اگلے شعر میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ مجھے اپنے معشوق کا وصال نصیب ہُوا۔ مَیں جی اُٹھا اور مَیں زندہ ہو گیا۔ ساری غزل کا ایک شعر بھی دوسرے شعر سے جوڑ نہیں رکھتا۔ ایک شعر میں وہ کچھ اَور بیان کر رہے ہوتے ہیں اور دوسرے شعر میں وہ کہیں اَور نکل جاتے ہیں۔ ایک شعر میں تو وہ کہتے ہیں مَیں محبوب سے ملنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ اور دوسرے میں کہتے ہیں۔ ہائے مرا جا رہا ہوں۔ غرض ان کی غزلوں کا ہر شعر دوسرے سے متناقض ہوتا ہے اور ان کی باتوں کا کوئی سر پیر ہی نہیں ہوتا کبھی اِدھر کی کہتے ہیں کبھی اُدھر کی کبھی کہتے ہیں مَیں اپنے محبوب کے عشق میں مر گیا حالانکہ وہ زندہ اپنے شعر سُنا رہے ہوتے ہیں کبھی کہتے ہیں مَیں اپنے معشوق کے عشق میں سرگردان ہوں۔ حالانکہ وہ اچھے بھلے دنیا کے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں معشوق ہر وقت ہمارے دل میں ہے اور یہ بالکل جھوٹ ہوتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ مَیں اپنے محبوب کے لئے خون کے آنسو پی رہا ہوں۔ حالانکہ وہ آرام سے زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ نہ مَر رہے ہوتے ہیں نہ خون کے آنسو پی رہے ہوتے ہیں۔ اُن کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ لوگوں کے جذبات کو اُبھارا جائے چاہے وہ اُبھارنا اچھے رنگ میں ہو یا بُرے رنگ میں کبھی وہ خوشی کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی غمی کی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ یعنی وہ ہر جنگل میں اور ہر وادی میں سرگردان پھرتے ہیں۔ اُنکو کسی جگہ بھی جذبات کے اُبھارنے کا سامان مل جائے جھٹ سے کہیں سے ملے لے لیتے ہیں۔ وہ عاشقوں کو بھی خوش کرتے ہیں اور معشوقوں کو بھی۔ وہ غریبوں کو بھی خوش کرتے ہیں اور امیروں کو بھی۔ وہ مظلوموں کو بھی خوش کرتے ہیں اور ظالموں کو بھی۔ وہ غالب کو بھی خوش کرتے ہیں اور مغلوب کو بھی۔ اُن کو تو ہر کسی کی خوشی مطلوب ہوتی ہے

چاہے اُن کو اپنے شعروں میں کتنا بھی جھوٹ کیوں نہ بولنا پڑے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی غریب ہمارے شعر پڑھے یا امیر۔ ظالم پڑھے یا مظلوم۔ عاشق پڑھے یا معشوق، غالب پڑھے یا مغلوب سب کے سب خوش ہو جائیں چاہے اُن کے اشعار حقیقت سے کتنے ہی دُور ہوں۔ پس شعراء کا مقصد اور مدعا یہی ہوتا ہے کہ ہر خاص و عام اُن سے خوش ہو جائے اور اُن کے شعروں کی داد دے۔ چنانچہ کبھی وہ کسی امیر کی تعریف کرنے لگ جاتے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ روپے مل جائیں یا کوئی وظیفہ مقرر ہو جائے ورنہ اُسکی ذات سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ لطیفہ مشہور ہے کہ ایک شخص نے جو سخت بھوکا تھا ایک دفعہ چند لوگوں کو جو اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے کہیں جاتے دیکھا تو اُس نے خیال کیا کہ یہ غالباً دعوت پر جا رہے ہیں مَیں بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔ جب یہ کھانا کھانے لگیں گے تو مَیں بھی وہیں سے کھانا کھا لونگا۔ چنانچہ وہ اُن کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جاتے جاتے وہ بادشاہ کے دربار میں جا پہنچے اور انہوں نے اُس کی تعریف میں قصائد پڑھنے شروع کر دیئے۔ تب اُسے پتہ لگا کہ یہ تو شاعر ہیں اور اپنے اپنے قصائد سُنانے آئے ہیں۔ چنانچہ ہر شاعر نے اپنی اپنی باری پر اُٹھ کر قصیدہ سُنانا شروع کر دیا۔ یہ اب سخت حیران ہُوا کہ مَیں کیا کروں۔ شعر کہنے کی اُس میں قابلیت نہیں تھی۔ مگر طبیعت لطیفہ سنج تھی۔ جب سب شاعر اپنے اپنے قصائد سُنا چکے اور بادشاہ سے انعام لے کر گھروں کو روانہ ہو گئے تو بادشاہ اُس سے مخاطب ہُوا اور کہنے لگا۔ اب آپ قصیدہ شروع کریں وہ کہنے لگا حضور مَیں شاعر نہیں ہوں۔ بادشاہ نے پوچھا آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔ وہ کہنے لگا حضور مَیں تو ان کے ساتھ

قرآن کریم میں اس طرح ذکر آتا ہے کہ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ. شاعروں کے پیچھے غاوی آیا کرتے ہیں۔ وہ شاعر تھے اور میں غاوی ہوں۔ بادشاہ کو اُس کا یہ لطیفہ پسند آ گیا اور اُس نے حکم دے دیا کہ اسے بھی کچھ انعام دے دیا جائے۔ اب یہ ہے تو ایک لطیفہ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاعروں کے پیچھے چلنے والے عموماً گمراہ لوگ ہی ہوتے ہیں کیونکہ شاعر کبھی کچھ کہہ دیتے ہیں کبھی کچھ۔ ان کا کوئی اصول نہیں ہوتا کبھی ہزلیہ کلام سے لوگوں کو ہنساتے ہیں۔ کبھی شہادتِ امام حسینؓ کا واقعہ لکھ کر لوگوں کو رُلاتے ہیں کبھی مدحیہ قصائد پڑھتے ہیں اور کبھی اُس کی ہجو کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ غرض ہر جنگل میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ کوئی ایک مقصد اور مدّعا لے کر کھڑے نہیں ہوتے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو دُنیا میں توحید پھیلانے کے لئے آیا ہے اور یہی ایک مقصد ہے جو رات اور دن اس کے دماغ پر حاوی رہتا ہے اور اسی کے لئے وہ تکلیفیں اٹھا رہا ہے۔ پھر تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ ایک شاعر ہے۔ اگر شاعر ہوتا تو اس کا بھی کوئی مقصد نہ ہوتا۔ جدھر لوگوں کی اکثریت ہوتی اُدھر ہی چل پڑتا اور ان کو خوش کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر اُس نے تو سب دنیا کو اپنا مخالف بنا لیا ہے اور ہر ایک کو توحید کی طرف لانے کی کوشش کر رہا ہے پھر یہ شاعر کس طرح ہوا؟

پھر فرماتا ہے وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ شاعروں میں ایک یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ اُنکا قول اَور ہوتا ہے اور فعل اَور۔ اور وہ جو کچھ منہ سے کہتے ہیں عملاً وہ ایسا نہیں کرتے۔ یعنی اگر وہ اپنے اشعار میں لوگوں کو اخلاقِ حسنہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں تو خود شراب پیتے ہیں اور اگر اللہ تعالےٰ سے ڈرنے کی نصیحت کرتے ہیں تو آپ نماز اور روزہ کے قریب بھی نہیں جاتے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا جو قول ہے وہی اس کا عمل ہے اور جو بات اس کے عمل میں ہے۔ وہی اس کی زبان پر ہے۔ پس تمہارا یہ کہنا کہ محمد رسول اللہؐ ایک شاعر ہے محض حقائق پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر تم غور کرو تو تمہیں نظر آ جائے گا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور شعراء کے کلام اور اُن کے کردار میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اور دونوں کی آپس میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔

پھر فرماتا ہے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا۔ ہاں اُن شاعروں کو ہم مستثنیٰ کرتے ہیں جو مومن ہیں اور مناسب حال عمل کرتے ہیں۔ وہ اگر شعر کہتے ہیں تو اُن کا شعر حقیقت پر مبنی ہوتا ہے اور وہ وہی کچھ شعر میں کہتے ہیں جو عملی زندگی میں اُن کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال کے طور پر ہم حضرت حسان بن ثابتؓ کے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جو انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کہے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں تو انہوں نے اپنے درد اور کرب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ؎

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيْكَ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ

یعنی اے محمد رسول اللہؐ! تُو تو میری آنکھوں کی پتلی تھا آج تیرے مرنے سے میری آنکھیں اندھی ہو گئیں اَب خواہ کوئی مرے۔ میرا باپ مرے۔ میری ماں مرے۔ بیوی مرے۔ بھائی مرے۔ بیٹا مرے۔ مجھے ان میں سے کسی کی موت کی پرواہ نہیں میں تو تیری موت سے ہی ڈرا کرتا تھا حضرت حسان بن ثابتؓ جنہوں نے یہ شعر کہے۔ وہ

خود بھی نیک تھے اور اُن کے یہ اشعار بھی حقیقت پر مبنی تھے۔ پس یقیناً ایسے لوگ پہلے گروہ میں شامل نہیں۔

پھر فرمایا۔ اُن کی عادت میں یہ بات داخل ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔ اور غیر مومن شاعروں کی طرح صرف مونہہ سے یہ نہیں کہتے رہتے کہ ہم اپنے محبوب کے لئے یہ یہ قربانیاں کرینگے بلکہ جب دین کے بارہ میں اُن پر ظلم کیا جاتا ہے تو وہ عملاً اس کا بدلہ لیتے ہیں اور ثابت کر دیتے ہیں کہ جس فدائیت کا انہوں نے اپنے شعروں میں ذکر کیا تھا عملاً بھی وہ فدائیت اُن کے اندر پائی جاتی ہے۔ مگر اسکے ساتھ ہی اُن کا یہ رویہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مخالف پر ظلم کریں بلکہ وہ ہمیشہ ظلم کے بعد بدلہ لیتے ہیں خود کسی دوسرے پر ظلم نہیں کرتے۔

اس آیت میں بھی اور قرآن کریم کی متعدد دوسری آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عملِ صالح کو لازمی قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ منافق بھی زبان سے کہدیتا ہے کہ مَیں ایمان لایا ہوں یا میں خدا تعالیٰ اور اُس کی شریعت کو مانتا ہوں اور لوگ بھی اُس کے اِس ظاہری قول کے مطابق یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ وہ مومن ہے۔ حالانکہ نہ تو وہ خود اپنے دل میں اسلام کو مان رہا ہوتا ہے اور نہ ہی خدا تعالیٰ اُس کے اِس ایمان کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ بعض دفعہ لوگ تیرے پاس آتے ہیں اور قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ تُو اللہ کا رسول ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم بھی گواہی دیتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے۔ مگر یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں صرف زبان سے ہی کہتے ہیں اِن کے دل میں ایمان نہیں۔ اِس کے مقابلہ میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے

دل میں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایمان کی حقیقت کو پوری طرح جانتے ہیں مگر واقعہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ اِس کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے بعض باتیں جو اشاروں میں کہی جاتی ہیں اُن کے متعلق بعض دفعہ دوسرا سمجھتا ہے کہ میں نے فلاں کے اشارے کو سمجھ لیا ہے اور اشارہ کرنیوالا بھی سمجھتا ہے کہ دوسرے نے میرا اشارہ سمجھ لیا ہے۔ لیکن جب بات کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے مطلب کو نہیں سمجھا تھا۔ لطیفہ مشہور ہے کہ اکبر بادشاہ کے دربار میں ایک دفعہ ایران کا کوئی صوفی آیا۔ اور اُس نے کہا۔ آپ اپنے علماء کو بُلائیں مَیں اُن سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اکبر نے علماء کو بلوایا۔ جب وہ پہنچ گئے تو اُس صوفی نے اشارے کرنے شروع کر دیئے۔ اکبر نے کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ کوئی بات کریں جس کی سمجھ بھی آسکے۔ صوفی نے کہا باتیں تو جہلاء بھی کر لیتے ہیں۔ علماء کا کام تو صرف اشارے سمجھنا ہے۔ اگر یہ اشارے نہ سمجھ سکیں تو علماء کیسے ہوئے۔ آخر جب علماء اُن اشاروں کو نہ سمجھ سکے تو اُن کو مقابلہ سے عاجز سمجھا گیا۔ اور کہا گیا کہ یہ ہار گئے ہیں۔ اِسپر مُلّا ابوالحسن بن ابو محاسن جو مُلّا دو پیازہ کے نام سے مشہور ہے اُٹھا۔ اور اُس نے کہا۔ مَیں اِس صوفی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہوں۔ بادشاہ نے ایرانی صوفی سے کہا۔ اب کوئی سوال کرو۔ صوفی نے ہاتھ کی ایک انگلی دکھلائی مُلّا دو پیازہ نے اُس کے جواب میں دو انگلیاں دکھادیں صوفی نے ہاتھ کی انگلیاں کھول کر پنجہ دکھایا۔ اِس کے جواب میں مُلّا دو پیازہ نے مٹھی بند کر کے مُکّا دکھا دیا۔ اِس کے بعد صوفی نے زمین پر ایک گول دائرہ بنایا۔ اور مُلّا دو پیازہ نے اس گول دائرہ کے درمیان ایک نقطہ لگا دیا۔ اِس پر وہ صوفی کہنے لگا۔

واقعی یہ شخص قابل ہے ۔ اور میں اِس کے سامنے اب
کوئی سوال نہیں کر سکتا ۔ لوگوں نے صوفی سے پوچھا
کہ تمہارا انگلی دکھانے سے کیا مطلب تھا ۔ اُس نے کہا ۔
میرا یہ مطلب تھا کہ اللہ ایک ہے اور مُلّا دوپیازہ نے
اس کا بالکل ٹھیک جواب دیا کہ اللہ تو ایک ہے مگر
اُس کے ساتھ اس کا رسول بھی ہے ۔ پھر میں نے پانچ
انگلیاں دکھائیں جس سے میرا مطلب یہ تھا کہ پنج تن
ہی ہیں جن پر اسلام کی بناء ہے ۔ اِس کے جواب میں
مُلّا دوپیازہ نے کہا کہ واقعی پنج تن ہیں لیکن حقیقت میں
وہ ایک ہی ہیں اور اُس کے مُکّا دکھانے کا یہی مطلب
تھا ۔ پھر میں نے زمین پر گول دائرہ بنایا جس کا مطلب
یہ تھا کہ زمین گول ہے ۔ اِس کے جواب میں مُلّا دوپیازہ
نے اُس میں نقطہ لگا کر یہ کہا کہ زمین تو گول ہے مگر
وہ اپنے محور کے گرد گھومتی ہے ۔ جب مُلّا دوپیازہ سے
پوچھا گیا کہ تم نے کیا سمجھا تھا ۔ تو اُس نے کہا کہ
جب صوفی نے ایک انگلی دکھائی تو میں یہ سمجھا کہ
یہ کہتا ہے کہ میں تیری ایک آنکھ پھوڑ دونگا ۔ اس پر
میں نے اُس کے جواب میں دو انگلیاں دکھا کر کہا کہ
میں تیری دونوں آنکھیں پھوڑ دونگا ۔ پھر اُس نے پنجہ
دکھایا تو میں نے سمجھا کہ یہ مجھے کہتا ہے کہ میں تیرے
مُنہ پر تھپڑ ماروں گا ۔ میں نے اُس کے جواب میں کہا کہ
میں تمہیں گھونسہ ماروں گا ۔ پھر اُس نے زمین پر جب
گول دائرہ بنایا ۔ تو میں نے سمجھا کہ یہ کہتا ہے کہ انسان
کے لئے روٹی ضروری چیز ہے ۔ اس پر میں نے درمیان
میں نقطہ لگا کر کہا کہ صرف روٹی سے کچھ نہیں بنتا
ساتھ پیاز بھی ہونا چاہیئے ۔

اِسی طرح ایک شخص زبان سے تو کہدیتا ہے کہ
میں ایمان لایا اور وہ سمجھتا بھی یہی ہے کہ میں ایمان
کی حقیقت سے واقف ہوں مگر وہ ایمان کی حقیقت
کو نہیں سمجھ رہا ہوتا ۔ پس ایک ایمان تو اِس قسم کا ہوتا ہے
کہ ایک شخص منافقانہ طور پر صرف زبان سے کہتا ہے
میں ایمان لے آیا اور اُس کے قول کے مطابق لوگ بھی
سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ یہ ایمان لے آیا ہے مگر خدا تعالیٰ
اُس کے ایمان کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے اور
وہ منافق بھی اپنے دل میں کہتا ہے کہ میں تمسخر کر رہا
ہوں ۔ لیکن دوسرا ایمان اس قسم کا ہوتا ہے کہ ایک
شخص سمجھتا ہے کہ میں اچھی طرح ایمان کی حقیقت کو
سمجھتا ہوں مگر دراصل وہ کچھ بھی نہیں سمجھا ہوتا ۔ اِس
کے مقابلہ میں تیسری قسم کا ایمان یہ ہے کہ ایک شخص
فی الحقیقت ایمان کو سمجھ جاتا ہے اور لوگ بھی کہتے
ہیں یہ ایماندار ہے اور اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے کہ یہ
ایماندار ہے ۔ اِس کی مثال اس درخت کی سی ہوتی ہے
جس کی جڑ زمین کے اندر دُور تک چلی گئی ہو اور کسی قسم
کی آندھیاں اُس پر اثر انداز نہ ہو سکیں ۔ پہلی قسم کے
ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے کوئی
چھوٹا سا پودا اکھیڑ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا ہو ۔ اور
اُس کی جڑوں کا زمین کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو ۔
اور دوسری قسم کے ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک
درخت بظاہر زمین میں لگا ہوا ہو مگر اُس کی جڑیں بالکل
زمین کی اوپر والی مٹی میں ہوں ۔ اور وہ کسی کے ذرا سے
دھکے کے ساتھ ہی زمین پر آ رہے اور تیسری قسم کے
ایمان کی مثال ایسی ہے ۔ جیسے ایک بڑا تناور درخت
ہو ۔ اور اس کی جڑیں بھی پاتال تک چلی گئی ہوں ۔
یہی اصل ایمان ہے جو انسان کی نجات کا موجب بنتا
ہے اور اس ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ہونا بھی
ضروری ہے ۔ لیکن یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے
ہاں جن باتوں کو نیک عمل کہتے ہیں یا انگریزی میں
جنہیں گڈ ایکشنز (Good actions)

کہتے ہیں قرآن کریم انہیں عمل صالح قرار نہیں دیتا - سارے قرآن میں شاذ و نادر کے طور پر شاید ہی کسی ایک مقام پر نیک عمل کے لئے خیر کا لفظ استعمال ہؤا ہو تو ہؤا ہو - ورنہ قرآن کریم ہمیشہ عمل صالح کا لفظ استعمال کرتا ہے - اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک نیکی وہی ہے جو مطابق حالات ہو - اور اگر حالات کے مطابق کوئی عمل نہ ہو تو وہ عمل صالح نہیں کہلائیگا - مثلاً اگر لوگوں سے دریافت کیا جائے کہ نیک عمل کونسے ہیں تو وہ کہیں گے - نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد وغیرہ - حالانکہ قرآن کریم سے ہی معلوم ہوتا ہے - کہ بعض نمازیں بُری ہوتی ہیں - اسی طرح روزے اور بعض صدقہ و خیرات انسان کو ثواب پہنچانے کی بجائے اُسے خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنا دیتے ہیں - پس معلوم ہؤا کہ خالی نماز نیک عمل نہیں - اگر خالی نماز نیک عمل ہوتا تو وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ کیوں آتا - اور کیوں اللہ تعالیٰ فرماتا کہ بعض نمازیں پڑھنے والے جو ریاء کے لئے پڑھتے ہیں جو اس لئے پڑھتے ہیں کہ لوگ کہیں یہ بڑے بزرگ ہیں - یہ بڑے زاہد اور عابد ہیں - اُن پر ہماری لعنت ہوتی ہے - اسی طرح بعض روزے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا انسان کو مورد بنا دیتے ہیں - مثلاً انسان عید کے دن روزہ رکھے تو وہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے شیطان بن جائیگا - یا حج ہے - اگر انسان ایسی حالت میں کرے جب اُس میں حج کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں - یا زکوٰۃ ایسی حالت میں دے جبکہ زکوٰۃ اُس پر فرض نہ ہو تو یہ اعمال صالح نہیں کہلا سکتے - عمل صالح وہی عمل ہے جو مطابق حالات اور موقع کے مناسب ہو - اسی لئے خدا تعالیٰ نے بار بار قرآن کریم میں ایمان کے ساتھ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا ذکر کیا ہے - لوگ غلطی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ نماز نجات دلائیگی - یا روزہ نجات دلائیگا - یا حج نجات دلائیگا - یا زکوٰۃ نجات دلائیگی - حالانکہ نماز وہ نجات دلا سکتی ہے جو نماز پڑھنے کے موقعہ پر پڑھی جائے - اگر کسی وقت کفار سے جہاد ہو رہا ہو - لڑائی لڑی جا رہی ہو مسلمان مارے جا رہے ہوں - کفار بڑھتے چلے آ رہے ہوں اور کوئی شخص مصلّٰی بچھا کر نماز پڑھنے لگ جائے - تو ہم کہیں گے اس کی نماز کوئی نماز نہیں - اس وقت جہاد کا کام کرنے کا وقت تھا - مصلّٰی پر بیٹھ کر تسبیح پھیرنے کا وقت نہیں تھا - اسی طرح اگر کوئی شخص نماز کے وقت نماز نہ پڑھے اور کہے میں جہاد کیلئے چلا ہوں تو ہم کہیں گے وہ نماز سے بچنے کا بہانہ تلاش کر رہا ہے غرض اپنی ذات میں نہ نماز نجات دلا سکتی ہے - نہ روزہ نہ زکوٰۃ نہ حج نہ جہاد - بلکہ جو نیک کام بھی موقع اور محل کے مطابق ہو وہی انسان کے کام آتا ہے -

مومنوں کی دوسری خصوصیت اس آیت میں بتائی گئی ہے کہ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا - وہ اللہ تعالیٰ کا بڑی کثرت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں - چونکہ دنیا میں بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو صرف اس وقت ذکر کی طرف توجہ قائم رکھ سکتی ہیں - جب وہ اکیلے ذکر میں مشغول ہوں اور بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو دوسروں کو ذکر کرتا دیکھیں تب اُن میں ذکر کرنیکا جوش پیدا ہوتا ہے - اس لئے اللہ تعالیٰ نے انفرادی اور جماعتی دونوں قسم کے ذکر نمازوں میں جمع کر دیئے ہیں - چنانچہ ظہر اور عصر کی نمازیں اس طرح پڑھی جاتی ہیں کہ ہر شخص اپنا اپنا ذکر کر رہا ہوتا ہے - امام اپنے طور پر خاموشی سے ذکر کر رہا ہوتا ہے اور مقتدی خاموشی سے اپنے طور پر ذکر کر رہے ہوتے ہیں - لیکن مغرب عشاء اور فجر کے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ طریق مقرر کر دیا کہ جب امام سورۂ فاتحہ پڑھے تو تم بھی سورۂ فاتحہ پڑھو - مگر جب وہ قرآن پڑھے تو

تم خاموش رہو۔ غرض نماز میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسا طریق رکھا ہے کہ بعض جگہ لوگوں کو کلیتہً امام کے تابع کر دیا ہے۔ امام کہتا ہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ تو مقتدی بھی کہتا ہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ امام رکوع میں جاتا ہے۔ تو مقتدی بھی رکوع میں چلا جاتا ہے۔ امام سجدہ میں جاتا ہے تو مقتدی بھی سجدہ میں جھک جاتا ہے۔ لیکن جو خاموشی کا حصّہ ہوتا ہے اُس میں ہر شخص آزاد ہوتا ہے۔ مقتدی کوئی دُعا مانگ رہا ہوتا ہے اور امام کوئی دُعا مانگ رہا ہوتا ہے۔ اِس طرح اللہ تعالیٰ نے دونوں طبائع کا علاج کر دیا۔ اُن کا بھی جو دوسروں کو ذکر میں مشغول دیکھ کر ذکر کرنے کی عادی ہوتی ہیں اور اُن کا بھی جنہیں اس وقت عبادت میں لذت آتی ہے جب وہ علیحدہ ہوں۔ چنانچہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں مجلس میں دُعا کرتے وقت رقت آتی ہی نہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جونہی وہ کسی کی چیخ سُنتے ہیں اُن کی بھی چیخیں نکل جاتی ہیں پہلے انہیں جوش نہیں آتا۔ لیکن دوسرے کی گریہ وزاری دیکھ کر انہیں بھی رونا آ جاتا ہے۔ لیکن کامل مومن وہ ہوتا ہے کہ جب وہ علیحدہ بیٹھتا ہے تب بھی خدا تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور جب مجلس میں بیٹھتا ہے تب بھی اس کا ذکر کرتا ہے۔ اِسی وجہ سے اسلام نے انفرادی ذکر پر بھی بڑا زور دیا ہے اور اجتماعوں کے مواقع پر بھی ذکرِ الٰہی پر زور دیا ہے۔ چنانچہ مسلمان جب حج کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔ عیدین کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔ شادی اور بیاہ کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔ جنازہ کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔ گویا ہر قسم کے اجتماعوں کو بابرکت بنانے کا نسخہ اسلام نے یہی بتایا ہے کہ ذکرِ الٰہی پر زور دیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں انفرادی ذکر کی اہمیت بھی اسلام نے بار بار بتائی ہے۔ یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت۔ کھانے سے فارغ ہوتے وقت سوتے وقت جاگتے وقت۔ سفر پر جاتے وقت، پھر سے آتے وقت۔ غم کے وقت خوشی کے وقت۔ مسجد میں آتے وقت اور مسجد سے جاتے وقت۔ بلندی پر چڑھتے وقت اور بلندی سے اُترتے وقت۔ اِسی طرح آئینہ دیکھتے وقت۔ کپڑے بدلتے وقت۔ نیا چاند دیکھتے وقت۔ یہاں تک کہ بیوی کے پاس جاتے وقت بھی دعاؤں اور ذکرِ الٰہی کی تاکید کی ہے۔ اور پھر فرمایا ہے کہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ پڑھ لیا کرو۔ ورنہ تمہارا کام بے برکت ہو جائیگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ ہر نماز کے بعد تینتیس۳۳ دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہِ تینتیس۳۳ دفعہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور چونتیس۳۴ دفعہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ لیا کرو۔ مگر اسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ مومن کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں اور وہ صرف تینتیس۳۳ یا چونتیس۳۴ دفعہ تسبیح و تحمید کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بات بات پر وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سُبْحَانَ اللّٰہِ یا اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہتے رہتے ہیں۔ اور درحقیقت اگر غور سے کام لیا جائے تو یہ دونوں باتیں ہی ضروری تھیں۔ کیونکہ عشق میں انسان کی دونوں حالتیں ہوتی ہیں۔ عشق میں ایک حالت تو وہ ہوتی ہے جب انسان اَور کاموں سے فارغ ہو کر اپنے محبوب سے باتیں کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اور عشق کی دوسری حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ خواہ اَور کاموں میں مشغول رہے اُس کا دل اپنے محبوب کی طرف ہی رہتا ہے۔ پس عشق دونوں باتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ عشق یہ بھی چاہتا ہے کہ عاشق اپنے معشوق کے لئے اور کاموں سے فارغ ہو جائے۔ اور عشق یہ بھی چاہتا ہے کہ عاشق اپنے معشوق کا ہر وقت ذکر کرتا رہے۔

پس چونکہ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں اِس لئے اسلام نے بعض جگہ تسبیح و تحمید کی ایک معیّن مقدار بھی مقرر کر دی اور پھر یہ بھی کہہ دیا کہ مومن صرف اِس تعداد پر انحصار نہیں رکھتے بلکہ وہ اُٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور ہر وقت اُن کی زبانیں ذکرِ الٰہی سے تر رہتی ہیں۔ اِس طرح یہ دونوں چیزیں مل کر ایک مومن کے عشق کو مکمل کرتی ہیں۔ اگر اسے یہی خیال آتا رہے کہ مَیں فلاں وقت میں ذکر کرونگا آگے پیچھے نہیں کرونگا تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ وہ اپنے اوقات کو کلّی طور پر خدا تعالیٰ کی یاد میں صرف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ مقررہ وقت آئے تو وہ ذکر کرے۔ حالانکہ مومن وہی ہے جو ہر حالت میں خدا تعالیٰ کو یاد رکھتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کسی بزرگ کا یہ مقولہ سُنایا کرتے تھے کہ "دست در کار و دل با یار" یعنی انسان کے ہاتھ تو کاموں میں مشغول ہونے چاہئیں لیکن اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح ایک بزرگ کے متعلق مشہور ہے کہ اُن سے کسی نے پوچھا کہ مَیں کتنی دفعہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کروں۔ تو انہوں نے کہا کہ "محبوب کا نام لینا اور پھر گِن گِن کر"۔ تو اصل ذکر وہی ہے جو اَن گِنت ہو۔ مگر ایک معیّن وقت مقرر کرنے میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ انسان اس وقت اپنے محبوب کے لئے اور کاموں سے بالکل الگ ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ دونوں حالتیں ضروری ہیں اس لئے صحیح طریق یہی ہے کہ معیّن رنگ میں بھی ذکرِ الٰہی کیا جائے اور غیر معیّن طور پر بھی اُٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے۔

اور اُس کے فضلوں اور احسانات کا بار بار ذکر کیا جائے۔

تیسری خصوصیّت اللہ تعالیٰ نے سچّے مومنوں کی یہ بتائی ہے کہ وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا۔ وہ خود تو کسی پر ظلم نہیں کرتے لیکن اگر کوئی دوسرا اُن پر ظلم کرے تو پھر وہ پیچھے نہیں ہٹتے بلکہ دلیری سے ظالم کا مقابلہ کرتے ہیں۔ چونکہ یہ سورۃ مکّی ہے جب کہ ابھی جہاد کا حکم نازل نہیں ہُوا تھا اس لئے درحقیقت اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ پیشگوئی فرمائی ہے کہ اِس وقت تو مسلمان دشمن کے ظلم وستم سہہ رہے ہیں لیکن مت سمجھو کہ دشمن کے یہ مظالم رائیگاں چلے جائیں گے بلکہ ایک دن آئے گا کہ ہم انہی مظلوم اور بے کس بندوں کو دشمن کے مقابلہ کی اجازت دے دیں گے۔ مگر اس وقت بھی یہ اپنے دشمن پر کوئی ظلم نہیں کریں گے بلکہ صرف جائز حد تک اس کے مظالم کا انتقام لیں گے۔ اور پھر آخر میں سب سے بڑی دلیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی اللہ تعالیٰ یہ دیتا ہے کہ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔ وہ لوگ جو ظلم کر رہے ہیں عنقریب جان لیں گے کہ اُن کا انجام کیسا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور شیطان کے بندوں میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہر امر پر قادر ہے اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے لیکن شیطان ایسا نہیں کر سکتا پس عنقریب خدا تعالیٰ اپنی مدد کو ظاہر کر دے گا اور اسلام کے ظالم معترض دیکھ لیں گے کہ اُن کا آخری ٹھکانہ کہاں ہے اور اِس طرح دنیا کو پتہ لگ جائے گا کہ آیا وہ شیطان کے پیچھے چل رہے تھے یا مسلمان شیطان کے پیچھے چل رہے تھے۔

سُوْرَةُ النَّمْلِ

سورۂ نمل

مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ اَرْبَعٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعَةُ رُكُوْعَاتٍ

یہ سورۃ مکی ہے۔ اور بسم اللہ سمیت اِس کی چورانوے (۹۴) آیتیں اور سات (۷) رکوع ہیں۔

وقتِ تنزیل اِس سورۃ کو ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ نے مکی قرار دیا ہے اور باقی مسلمان علماء بھی اِسی کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہیری نے بھی اسے مکی ہی قرار دیا ہے۔

قریبی تعلق اِس سورۃ کا سورۂ شعراء سے قریبی تعلق یہ ہے کہ سورۂ شعراء کے آخر میں یہ بتایا گیا تھا کہ مومن غالب آئیں گے اور کفار خدا تعالیٰ کی قدیم سنّت کے مطابق تباہ ہوں گے مگر چونکہ مضمون کفّار کی تباہی کا تھا سورۃ کا سارا زور اِس قانونِ الٰہی کی تفصیل میں تھا کہ کفار ہمیشہ تباہ ہوتے چلے آئے ہیں اَب کیوں تباہ نہ ہونگے۔ سورۂ نمل میں اِس مضمون کے دوسرے مخفی پہلو کو زیادہ واضح کیا گیا ہے کہ مومن باوجود کمزور ہونے کے ترقی پاتے رہے ہیں۔ کفار کی تباہی کا ذکر بے شک سورۃ کے آخر میں کیا گیا ہے لیکن زیادہ زور اِس سورۃ میں اِس اصول پر ہے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کی آواز سُن کر سعیدۂ ذہنی اور فکری اور اخلاق اور نظامِ الٰہی کو قبول کرتے رہے ہیں وہ ہمیشہ عزت پاتے رہے ہیں۔

اِسی سلسلہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی عارضی نہ ہوگی بلکہ ایک لمبے عرصہ تک وہ ترقی کرتے چلے جائیں گے اور بنی اسرائیل کی طرح صرف اپنے ہی ملک کے بادشاہ نہیں ہونگے بلکہ غیر ملکوں کے بھی بادشاہ ہونگے۔

اِس سورۃ کا سورۂ شعراء سے دوسرا تعلق یہ ہے کہ سورۂ شعراء کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ لوگ اِس نبی کو شاعر کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِس پر شیطان نازل ہوتا ہے حالانکہ شیطان جھوٹ بولنے والے اور گنہگار پر نازل ہُوا کرتا ہے۔ اور پھر شیطانوں کا طریق یہ ہے کہ وہ خدائی تعلیمات کو سُن کر انہیں لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن اُن میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ یعنی آسمانی تعلیموں میں جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ اِس لئے وہ تعلیمات نتیجہ خیز نہیں ہوتیں اور شعراء جو کہ شیطانوں کی پیروی کرتے ہیں اُن کے پیچھے صرف گمراہ لوگ چلتے ہیں کیونکہ وہ کسی مقصد کو لے کر کھڑے نہیں ہوتے صرف دلچسپ باتیں کرنے کا انہیں شوق ہوتا ہے۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اُس پر عمل نہیں کرتے۔

اَب اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِس سورۃ کی آیتیں ایک ایسی کتاب کی آیتیں ہیں جو ہمیشہ پڑھی جاتی رہے گی اور جو تمام دینی امور کو خوب کھول کر اور با دلیل بیان کرتی ہے اور جو مومنوں کو سچا راستہ دکھانے والی ہے اور جو اس پر عمل کرتے ہیں اُن کو نیک انجام کی خبر دیتی ہے۔ اِس لئے یہ شیطانی تعلیم نہیں ہوسکتی کیونکہ شیطان نہ سچا راستہ دکھاتا ہے نہ اُس کی تعلیم پر چل کر کوئی شخص خدا کی

رحمت اور برکت حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح اس کتاب پر ایمان لانے والے وہ ہیں جو خدا کی عبادت کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور بعد میں آنے والے کلام پر یا بعد میں آنے والی زندگی پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ یعنی اوّل تو شیطان کی نازل کردہ تعلیم میں جھوٹ ہوتا ہے ہدایت نہیں ہوتی دوسرے اس تعلیم کے متبع ہدایت سے بہکے ہوئے ہوتے ہیں اور نیکوکار نہیں ہوتے۔ لیکن اس کتاب میں ہدایت ہے اور سچائیاں ہیں اور اس کے ماننے والے لوگ خدا تعالیٰ کی بھی عبادت کرتے ہیں اور بندوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتے ہیں اور ہمیشہ ہی خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والی باتوں کے ماننے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اسی طرح دوسری زندگی کا احساس بھی ہر وقت اُن کے دل میں رہتا ہے۔

پس نہ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شیطان اُتر سکتے ہیں جو ایسی کتاب لاتے ہیں جو ہدایت اور بشارت ہے اور نہ آپ کو شاعر کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ آپ کے ماننے والے انسانوں کی ہمدردی اور خدا تعالیٰ کی محبت کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اور شاعر نہ خود عمل کرتا ہے اور نہ اس کے اتباع عمل کرتے ہیں۔

خلاصۂ مضامین اس سورۃ کے شروع میں طٰسٓ حروف مقطعات میں سے آئے ہیں۔ چونکہ یہی حروف مقطعات م کی زیادتی کے ساتھ سورۂ شعراء سے بھی پہلے آئے ہیں اس لئے یہ سورۃ سورۂ شعراء کے مضمون کے سلسلہ میں ہی ہے۔

طٰسٓ میں ط لطیف کا قائم مقام ہے اور س سَمِیْع کا۔ پھر فرماتا ہے تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ۔ اس سورۃ میں جو آیتیں بیان کی گئی ہیں وہ قرآن کا حصہ ہیں اور ایک ایسی کتاب کی آیتیں ہیں جو اپنی دلیلیں خود بیان کرتی ہے اور یہ کتاب کامل ہدایت بھی ہے جیسا کہ هُدًى کی تنوین سے جو اس کو نکرہ بناتی ہے ظاہر ہے اور نکرہ عظمت کے لئے آیا کرتا ہے[1]

پھر فرماتا ہے کہ یہ کتاب مومنوں کے لئے بشارت کا موجب ہے۔ ایسے مومنوں کے لئے جو اپنی بدنی عبادتوں کو خدا تعالیٰ کے حضور میں ہمیشہ پیش کرتے رہتے ہیں اور اکیلے ہی عبادت نہیں کرتے بلکہ دوسرے بنی نوع انسانوں کو بھی عبادت کی طرف راغب کر کے باجماعت نماز ادا کرتے ہیں (جیسا کہ یقیمون کے لفظ سے ظاہر ہے اور اقامت ہمیشہ نماز باجماعت میں ہی کہی جاتی ہے) اس طرح وہ مومن جن کے لئے قرآن بشارت ہے وہ ہیں جو اپنے اموال میں سے ایک حصہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کی راہ میں غریبوں اور ناداروں پر خرچ کرنے کے لئے دیتے رہتے ہیں اور وہ یہ خرچ لوگوں کا لیڈر بننے کے لئے نہیں کرتے بلکہ اس لئے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو جائے اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ اُن کو یقین ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کے نتیجہ میں آخر اُن کو روحانی اور جسمانی درجات ملیں گے۔ (آیت ۳ و ۴)

وہ لوگ جو انجام آخر پر خواہ وہ دنیوی ہو یا اُخروی ایمان نہیں لاتے اُن کو اپنی سب کرتوتیں خوبصورت نظر آتی ہیں اور وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اُن کو بڑا عذاب ملے گا اور وہ آخر کار ناکام رہیں گے اور نقصان اٹھائیں گے (آیت ۵ و ۶)

تجھ پر جو یہ قرآن نازل ہوا ہے یہ بڑی حکمت والے اور علم والے خدا کی طرف سے ہے۔ اس لئے اس میں بڑی برکتیں ہیں۔ اور بڑی حکمتیں ہیں اور بڑا علم ہے۔ (آیت ۷)

---

[1] کتاب العروس للسبکی شرح مختصر المعانی جزو اوّل صفحہ ۳۴۹

موسیٰؑ کا واقعہ ہم تجھے بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ مَیں نے دُور کچھ آگ دیکھی ہے۔مَیں وہاں جاکر یا تو کوئی معلومات اس ملک یا اِس رستہ کی لاتا ہوں یا کوئی انگارہ لاتا ہوں تاکہ تم آگ سینکو۔ (آیت ۸)

جب موسیٰؑ اس آگ کے پاس آئے تو انہیں پکار کر کہا گیا کہ اس آگ میں جس کا جلوہ نظر آیا ہے یعنی خدا تعالیٰ کا وہ بڑی برکت والا ہے اور اس آگ کے اردگرد کا علاقہ بھی برکت والا ہے۔یعنی جو لوگ اِس کلام کو قبول کرینگے اُن کو بھی بڑی برکت ملیگی۔ وہ رب العٰلمین خدا جس نے اپنا جلوہ اس آگ میں دکھایا ہے بڑا پاک ہے۔ (آیت ۹)

پھر کہا گیا کہ اے موسیٰؑ! بات یہ ہے کہ مَیں اللہ ہوں اور بڑا غالب اور حکمت والا ہوں۔یعنی جو نظارہ تم نے دیکھا ہے وہ خدا کا جلال ہے اور تُو اپنا عصا پھینک دے۔جب انہوں نے عصا پھینکا تو دیکھا کہ وہ اِس طرح ہلتا تھا جس طرح سانپ ہلتا ہے۔موسیٰؑ ڈرے اور پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ اس پر ان کو الہام ہُوا کہ اے موسیٰؑ! ڈر نہیں۔ ڈر میرے دشمنوں کے لئے ہے۔ ڈر میرے رسولوں کے لئے نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص غلطی سے ظلم کرے اور پھر اِس کے بعد نیکی اختیار کرے تو مَیں معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں (آیت نمبر ۱۰ تا ۱۲)

اور اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال۔ جب تو اُس کو نکالیگا تو دیکھیگا وہ بالکل سفید ہے۔یعنی وہ چمکتا ہُوا نظر آئیگا۔ مگر کسی قسم کا عیب اُس میں نہیں ہوگا۔ (آیت ۱۳)

یہ نشان جو ہم نے موسیٰؑ کو دیا یہ اُن نَو نشانوں میں سے ایک تھا جو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجے جانے والے تھے۔کیونکہ وہ لوگ فرمانبرداری سے نکلے ہوئے تھے۔لیکن ہُوا یہ کہ جب موسیٰؑ وہ نشان لیکر فرعون اور اس کی قوم کے پاس آیا تو باوجود اس کے کہ وہ نشان بڑے واضح تھے اور حقیقت کو دکھانے والے تھے انہوں نے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا۔ اور کہا یہ تو کھلا کھلا فریب ہے۔ اور بڑی سختی سے اُن نشانات کا انکار کیا۔حالانکہ اُن کے دلوں نے ان کو سچا سمجھ لیا تھا۔اُن کا یہ انکار ظلم اور تکبر کی وجہ سے تھا۔ پھر دیکھ کہ ایسے فسادی لوگوں کا کیا انجام ہُوا۔ (آیت ۱۴ اور ۱۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کا ذکر کرتا ہے اور ان دونوں کا قول یہ بیان فرماتا ہے کہ ہمیں بہت سے مومن بندوں پر خدا تعالیٰ نے فضیلت بخشی ہے۔ یعنی خلافت روحانی اور جسمانی کے ذریعہ۔ (آیت ۱۶)

اِس کے بعد فرماتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کی وفات پر سلیمانؑ تخت نشین ہوئے اور انہوں نے لوگوں سے کہا کہ مجھے بھی وہ بولی سکھائی گئی ہے جو بلندی کی طرف پرواز کرنے والے لوگوں یعنی اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو سکھائی جاتی ہے۔ اور مجھے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے خدا تعالیٰ اُن کو مہیا کر دیتا ہے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے خاص فضل سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ (آیت ۱۷)

پھر فرماتا ہے۔ ایک دفعہ سلیمانؑ کے سامنے جنّوں اور انسانوں اور پرندوں میں سے اُن کے لشکر حاضر کئے گئے اور انہیں ترتیب وار الگ الگ کھڑا کیا گیا۔ (یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ اس وقت کسی ملک پر چڑھائی کرنے کی تیاری کر رہے تھے) آیت ۱۸

آپ اپنے لشکروں کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستہ میں آپ نملہ قوم کی وادی میں سے گذرے۔

(جس کو غلطی سے مفسرین نے چیونٹیوں کی وادی سمجھ لیا ہے) آپ کو اور آپ کے لاؤ لشکر کو دیکھ کر نملہ قوم کی ملکہ نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا کہ اے نملہ قوم کے لوگو اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ۔ تاکہ یہ خیال کر کے کہ تم سلیمانؑ کے لشکر کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو سلیمانؑ اور اس کا لشکر تمہیں پاؤں کے نیچے روند نہ ڈالے۔ حضرت سلیمانؑ نملہ قوم کی ملکہ کے اس اعلان پر ہنس پڑے اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے کہ اس نے دُور دراز کے ملکوں میں بھی یہ بات پھیلا دی ہے کہ سلیمانؑ ظالم نہیں اور وہ ادنیٰ قوموں کے ساتھ بھی انصاف کرتا ہے (آیت ۱۹ و ۲۰)

اُس وقت حضرت سلیمانؑ نے اپنے لشکر کا جائزہ لیا تو ایک سردارِ لشکر کو جس کا نام ھُدھُد تھا غائب پایا۔ ایسے نازک موقعہ پر ایک فوجی افسر کے غائب ہونے سے آپ کو شدید تشویش ہوئی اور آپ نے کہا کہ میں یقیناً اُسے سخت ترین سزا دونگا یا اُسے قتل کر دونگا۔ اور یا پھر اُسے واضح دلیل کے ساتھ بتانا پڑیگا کہ وہ کیوں غائب رہا۔ (آیت ۲۱ و ۲۲)

تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ وہ سردار واپس آگیا اور اُس نے بتایا کہ چونکہ آپ ملک سبا پر حملہ کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ میں پہلے سے اس ملک کے حالات دریافت کرنے کے لئے وہاں چلا گیا اور اب میں یہ رپورٹ لے کر آیا ہوں کہ اس ملک کی حکمران ایک عورت ہے لیکن غضب کی حاکم ہے۔ ہر قسم کے ساز و سامان اُس کے پاس موجود ہیں اور اُس کی بادشاہت بہت بڑی ہے لیکن روحانی لحاظ سے یہ خرابی بھی ہے کہ ملکہ اور اُس کی قوم سورج کی پرستش کرتی ہے اور توحید سے روگردان ہے حضرت سلیمانؑ سمجھ گئے کہ وہ شرارتاً غائب نہیں ہوا تھا اور انہوں نے کہا۔ بہت اچھا ہم وہاں جا کے دیکھینگے کہ تو سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ مگر پہلے میرا یہ خط لے جا اور اُسے ملکہ اور اُس کے درباریوں کے سامنے رکھیو اور خود مؤدبانہ طور پر پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جائیو۔ اور دیکھیو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں (آیت ۲۳ تا ۲۹)

جب ہُدہُد نے وہ خط پیش کیا۔ تو ملکہ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ یہ ایک بڑا معزز مکتوب ہے جو سلیمانؑ کی طرف سے آیا ہے اور اس میں لکھا ہے کہ میرے خلاف سرکشی مت کرو اور فرمانبردار ہو کر میرے حضور حاضر ہو جاؤ۔ (آیت ۳۰ تا ۳۲)

اس کے بعد ملکہ سبا نے اپنی قوم کے سرداروں سے کہا کہ اس مشکل مسئلہ کے حل کے لئے مجھے مشورہ دو۔ انہوں نے کہا۔ حضور ہم تو بڑے طاقتور ہیں اور آزمودہ کار جرنیل ہیں۔ مگر فیصلہ بہرحال آپکے اختیار میں ہے۔ ملکہ سبا نے کہا۔ بات دراصل یہ ہے۔ کہ بادشاہ جب اپنے زبردست لشکروں کے ساتھ کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اُس کو اُجاڑ کر رکھ دیا کرتے ہیں اور وہاں کے معزز شہریوں کو ذلیل جانوروں کی طرح بنا دیتے ہیں۔ اس لئے میں نے تو یہ تجویز سوچی ہے کہ میں حضرت سلیمانؑ کو ایک تحفہ بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ میرے آدمی کیا جواب لاتے ہیں (آیت ۳۳ تا ۳۵)

حضرت سلیمانؑ کو جب وہ تحفہ پیش کیا گیا۔ تو انہوں نے کہا کہ خدا نے مجھے اس سے بہتر چیزیں دے رکھی ہیں۔ یہ تحفہ جو مجھے رشوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے مجھے اپنے عزائم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ اے ہُدہُد اُن کی طرف واپس لوٹ جا اور انہیں بتا دے کہ اب میں ایک ایسا لشکر لے کر اُن پر چڑھائی کرونگا جس کے مقابلہ کی اُن میں طاقت نہیں ہوگی۔

پھر حضرت سلیمانؑ نے اپنے سردارانِ لشکر سے کہا کہ پیشتر اس کے کہ یہ لوگ میری اطاعت کا

دم بھرتے ہوئے میرے پاس آئیں - تم میں سے کون ملکہ کا تخت میرے پاس لائیگا - ایک سردار بولا کہ آپکے چڑھائی کرنے سے بھی پہلے میں وہ تخت لے آؤنگا اور اس قیمتی دولت کے لانے میں کسی قسم کی خیانت مجھ سے سرزد نہیں ہوگی لیکن ایک اور شخص جس کو دینی علم حاصل تھا اُس نے کہا کہ یہ تو پھر بھی دیر میں لائیگا میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے بھی پہلے وہ تخت لے آؤنگا - یعنی ایک نیا اور اعلیٰ درجہ کا تخت بنوا کر آپ کے دربار میں فوراً حاضر کردونگا - جب حضرت سلیمانؑ نے دیکھا کہ ایک اعلیٰ درجہ کا تخت بن کر آگیا ہے تو وہ اللہ کا شکر بجا لائے - مگر انہوں نے کہا - میں چاہتا ہوں کہ تم ایسا تخت بنا کر لاؤ جسے دیکھ کر ملکہ کو اپنا تخت حقیر نظر آنے لگے - میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس بات کو دیکھ کر وہ اپنے گھمنڈ پر ہی قائم رہتی ہے یا میری برتری اور فوقیت کو تسلیم کرتی ہے - چنانچہ ایسا ہی کیا گیا آخر ملکہ آئی تو اُس سے پوچھا گیا کہ بتاؤ تمہارا تخت بھی ایسا ہی ہے - اس پر بجائے پوری طرح تسلیم کرنے کے وہ کہنے لگی کہ یہ ویسا ہی معلوم ہوتا ہے - (آیت نمبر ۳۹ تا ۴۳)

تب حضرت سلیمانؑ نے اُس پر شرک کی بُرائی واضح کی اور عملی رنگ میں اُسپر توحید کی حقیقت آشکار کرنے کے لئے ایک محل بنوایا جس میں شیشہ کے ٹکڑے لگائے گئے تھے - ان کے نیچے پانی بہہ رہا تھا - ملکۂ سبا اُس محل میں داخل ہوئی تو اُس نے سمجھا کہ سچ مچ پانی بہہ رہا ہے اور گھبرا کر اُس نے اپنے کپڑے اُڑس لئے حضرت سلیمانؑ نے کہا - بی بی تجھے غلطی لگی ہے - یہ پانی نہیں بلکہ شیشہ میں سے پانی نظر آ رہا ہے - اِس دلیل سے وہ سمجھ گئی کہ توحید ہی سچی ہے اور وہ شرک چھوڑ کر حضرت سلیمان علیہ السلام پر ایمان لے آئی - (آیت ۴۴ و ۴۵)

حضرت سلیمانؑ کے واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ ثمود کا ذکر فرماتا ہے - کیونکہ ثمود کی قوم کا بہت سا علاقہ حضرت سلیمانؑ کے ماتحت آ گیا تھا - اور بتاتا ہے کہ اُن کے نبی نے بھی اُن کو توحید کی تعلیم دی مگر وہ لوگ دو گروہوں میں منقسم ہو گئے - بعض نے مان لیا اور بعض نے انکار کر دیا - حضرت صالحؑ کے سمجھانے پر انہوں نے کہا کہ اے صالحؑ ! ہم تو تجھے سبز قدم سمجھتے ہیں - انہوں نے کہا - مجھے بھی تمہاری خیر نظر نہیں آتی کیونکہ تم ایک ایسی قوم ہو جو سچے دین کو چھوڑ بیٹھی ہو - ثمود کی قوم میں نو بڑے بڑے معاند تھے جنہوں نے آپس میں ملکر قسمیں کھائیں اور ایک دوسرے کو اکسایا کہ رات کے وقت صالحؑ اور اُس کے اہل و عیال پر چھاپہ مارو اور اُسے قتل کر دو - اور جب کوئی پوچھے تو صاف انکار کر دو اور کہدو کہ ہم نے تو اس کی ہلاکت کا واقعہ دیکھا ہی نہیں - مگر آخر اللہ تعالیٰ کی تدبیر ہی غالب آئی چنانچہ دیکھ لو کہ اُن کے گھر تمہارے سامنے اُجڑے پڑے ہیں اور خالی اور ویران ہیں - (آیت ۴۶ تا ۵۴)

اِس کے بعد لوطؑ کا واقعہ بیان فرماتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو جنسی بے اعتدالیوں سے روکا - مگر قوم نے مخالفت کی - آخر زلزلہ سے اُن کے شہر کو اُلٹا دیا گیا اور وہ قوم تباہ کر دی گئی - (آیت ۵۵ تا ۵۹)

اِن انبیاء کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب بتاؤ کہ کیا اللہ اچھا ہے جو اپنے بندوں کو بچاتا رہتا ہے یا معبودانِ باطلہ اچھے ہیں جن کے ماننے والے کبھی کامیاب نہیں ہوئے - (آیت ۶۰)

پھر فرماتا ہے - تم اتنا تو سوچو کہ زمین و آسمان کا خدا جو بادلوں سے پانی اتار کر قسم قسم کے باغ اُگاتا ہے وہ بہتر ہے یا وہ معبودانِ باطلہ بہتر ہیں جو ان

باغوں اور پانیوں کے محتاج ہیں۔ اسی طرح غور کرو کہ وہ کون ہے جس نے زمین کو ٹھہرنے کے قابل بنایا ہے۔ اور اُس کے اندر دریا چلائے ہیں اور پھر اس نے میٹھے اور نمکین پانی میں ایک روک بنا دی ہے۔ کیا ایسے مدبّر خدا کا کوئی اور شریک پیش کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھو کہ مصیبت زدہ لوگوں کی دعاؤں کو کون قبول کرتا ہے اور کون اُن کی دُعاؤں کو قبول کر کے انہیں دنیا کا بادشاہ بنا دیتا ہے۔ کیا ایسے خدا کا کوئی اور ہمسر ہو سکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ (آیت ۶۱ تا ۶۳)

پھر فرماتا ہے کہ خشکیوں اور سمندر کے اندھیروں میں تمہیں کون راستہ دکھاتا ہے۔ اسی طرح بادلوں سے پہلے بھیگی ہوئی ہوائیں کون چلاتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود ہے جو ایسا کر رہا ہے۔ اسی طرح وہ جو پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور پھر پیدائش کے سلسلہ کو جاری رکھتا ہے اور جو آسمان اور زمین سے تمہیں رزق دیتا ہے کیا اُس قادرِ مطلق خدا کے سوا اور کوئی بھی معبود ہے۔ زمین و آسمان کے غیب اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ مگر تمہارے معبود تو وہ ہیں جو اتنا بھی نہیں بتا سکتے کہ ان کا مشرکانہ دین دنیا میں کب قائم ہوگا؟ (آیت ۶۴ تا ۶۷)

فرماتا ہے کفار بس اسی الجھن میں پڑے رہتے ہیں کہ جب ہم اور ہمارے باپ دادا مر کر مٹی ہو جائینگے تو پھر ہم زندہ کس طرح ہونگے۔ یہ باتیں پہلے بھی کہی جاتی رہی ہیں اور درحقیقت انہی کی نقل میں اب بھی وہی باتیں دوہرائی جا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ کہانیاں ہی تھیں تو پھر پہلے منکرین نے اپنے اپنے زمانہ میں سزائیں کیوں پائیں۔ اور اگر وہ سزا پاتے رہے ہیں تو اے محمد رسول اللہ تیرے مخالفین بھی ان باتوں پر الٰہی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ ایسی صورت میں تجھے ان کی تباہی پر غم نہیں کھانا چاہیئے۔ کیونکہ وہ بہرحال آنے والی ہے۔ اسی طرح ان کی مخالفانہ تدبیروں سے ہراساں نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انکی تمام تدبیریں ناکام رہینگی۔ یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہم پر عذاب کب آئیگا؟ فرماتا ہے کچھ تو جلدی آنے مقدر ہیں اور کچھ دیر میں آئیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے وہ اُن کے مخفی ارادوں اور ظاہری افعال کو خوب جانتا ہے۔ لیکن اپنے فضل کی وجہ سے ان کو ڈھیل دے رہا ہے۔ (آیت ۶۸ تا ۷۵)

فرماتا ہے۔ آسمان اور زمین میں جتنے مخفی امور ہیں وہ سب خدا تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ چنانچہ اسکے ثبوت میں قرآن کریم کو دیکھ لو کہ وہ سچی بات بیان کر دیتا ہے جبکہ بائیبل اور دوسری الہامی کتب میں مرورِ زمانہ کی وجہ سے کئی قسم کی غلط باتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ قرآن مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا پیغام ہے اور وہ اس کے ذریعہ صرف بنی اسرائیل کا صداقت سے منحرف ہونا ہی ظاہر نہیں کریگا بلکہ وہ اسرائیلی قوموں کے درمیان فیصلہ بھی کریگا اور سچوں کو غالب اور جھوٹوں کو مغلوب کر دیگا۔ (آیت ۷۶ تا ۷۹)

فرماتا ہے۔ تیرا کام یہ ہے کہ تُو اللہ تعالیٰ پر توکل کر۔ بیشک تیرا کام لوگوں کو حق پہنچانا ہے مگر پھر بھی جو مردہ دل لوگ ہیں اُن کو نہیں منوایا جا سکتا۔ اسی طرح بہرا جب پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ تو اشارہ دیکھنے سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اور اسکی ہدایت کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا۔ یہی حال اس اندھے کا ہوتا ہے جو بینا کے پیچھے چلنے کے لئے تیار نہ ہو صرف اُسی کو سچائی سمجھائی جا سکتی ہے جو خدا تعالیٰ کے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا (ہے) پڑھتا ہوں)

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ②

طاہر (اور) سمیع (یعنی پاک نور دعاؤں کا سننے والا خدا اِس سورۃ کا اتارنے والا ہے) اِس کی آیتیں قرآن اور مدلّل کتاب کا حصّہ ہیں ۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ③ الَّذِيْنَ

(جو) مومنوں کے لئے ہدایت اور بشارت (کا موجب) ہیں ۔ (ایسے مومن) جو

نشانوں پر ایمان لاتا ہو ۔ (آیت ۸۰ تا ۸۲)

فرماتا ہے جب اُن کی تباہی کا وقت آجائے گا تو اللہ تعالیٰ زمین میں سے ایک کیڑا نکالیگا جو اُن کو کاٹے گا ۔ اور دنیا پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ سزا اُنکو اِس وجہ سے ملی ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے ۔ (آیت ۸۳)

پھر فرماتا ہے ۔ تم اُسدن کو یاد کرو جبکہ ہم ہر اُس قوم میں سے جو ہمارے نشانات کا انکار کر رہی ہوگی ایک بڑی جماعت کھڑی کریں گے ۔ اور پھر اُن جماعتوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا جائیگا ۔ یعنی دنیا میں مختلف ایسوسی ایشنز بن جائیں گی ۔ اور سب قوموں میں سے ایک ایک گروہ بے دینی کی خاص طور پر تعلیم دینے لگ جائیگا ۔ اور یہ سلسلہ اُسوقت تک جاری رہیگا جب تک کہ اُن کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کا فتویٰ جاری نہ ہو جائے ۔ تب اُن کی زبانیں بند ہو جائیں گی ۔ (آیت ۸۴ تا ۸۶)

فرماتا ہے ۔ کیا انہوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ ہم ان پر رات یعنی نبوت کے بعد کا زمانہ اس لئے لائے تھے کہ یہ ترقی کی نئی قابلیتیں اپنے اندر پیدا کریں لیکن یہ لوگ تو اور بھی سُست ہو گئے ۔ اور انہوں نے دن یعنی نبوت کے زمانہ سے بھی فائدہ نہ اٹھایا ۔ (آیت ۸۷)

ایک دن آئیگا کہ صور پھونکا جائے گا ۔ یعنی تمام قوموں کو ایک دوسرے کے مقابل پر کھڑا کر دیا جائیگا اور آسمان اور زمین میں جو کوئی ہیں وہ سب ڈر جائینگے مگر باوجود اس کے کہ یہ تباہی عام ہوگی پھر بھی خدا تعالیٰ کے حضور دُعا کا راستہ کھلا رہیگا ۔ (آیت ۸۸)

فرماتا ہے ۔ تُو پہاڑوں کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ کھڑے ہیں ۔ حالانکہ وہ اِس طرح چل رہے ہیں جس طرح بادل ۔ یعنی زمین چلتی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ اسی طرح چلتے ہیں ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت سے ہے جس نے ہر چیز کو نہایت مضبوط بنایا ہے اور وہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے ۔ (آیت ۸۹)

جو شخص کوئی نیکی بجا لائیگا ۔ اُسے اپنے عمل سے بہتر بدلہ ملیگا ۔ لیکن بدی کرنے والے کو آگ میں اوندھے مُنہ گرا دیا جائیگا ۔ مگر بدی کی سزا بہرحال عمل کے مطابق ہوگی زیادہ نہیں (آیت ۹۰ و ۹۱)

فرماتا ہے ۔ اے محمد رسول اللہ! تو لوگوں سے کہہ دے کہ مجھے خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ مَیں اِس شہر کے رب کی عبادت کروں ۔ یعنی اُس جلوہ کے پیچھے

يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ

نماز باجماعت ادا کرتے ہیں - اور زکوٰۃ ادا کرتے رہتے ہیں - اور

بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُونَ ۝۴

اور آخروی زندگی پر (یا بعد میں آنے والی موعود باتوں پر) یقین رکھتے ہیں ؎۵

چلوں جو مکہ میں ابراہیم کے ذریعے ظاہر ہوا تھا اور عملاً فرمانبرداری کا نمونہ بن کر دکھاؤں اور قرآن سب کو پڑھ کر سُناؤں - میں کسی پر زبردستی نہیں کرونگا بلکہ میرا کام صرف لوگوں کو پیغام حق پہنچانا ہے - آگے ماننا یا نہ ماننا اُن کا کام ہے - مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ خدا تعالیٰ خاموش بیٹھا رہیگا - وہ آسمان سے اُترے گا اور ایسے نشان دکھائیگا جو تمہارے سامنے خدا تعالیٰ کے وجود کو لاکر کھڑا کر دیں گے - (آیت ۹۲ تا ۹۴)

؎۵ تفسیر :- اِس سورۃ سے پہلے بھی حروفِ مقطعات طٰسٓ آئے ہیں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں طٓ اللطیف کا قائم مقام ہے اور سٓ سمیع کا -

پہلی سورۃ اور اِس سورۃ میں یہ فرق ہے کہ پہلی سورۃ کے آخر میں مٓیم بھی آتا تھا جو مجید کا قائم مقام تھا - مگر اِس سورۃ میں اُسے اڑا دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں خدا تعالیٰ کی مجد اور بزرگی پر زیادہ زور دیا گیا تھا - اور اِس سورۃ میں مضمون تو مشترک ہے لیکن خدا تعالیٰ کے مجید ہونے پر اِس میں اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا پچھلی سورۃ میں دیا گیا تھا اور اس کی ظاہری دلیل یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر زیادہ کیا گیا تھا اور خدا تعالیٰ کی مجد اور اُس کی بزرگی زیادہ تر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ہی ظاہر ہوئی ہے اور اِس سورۃ میں موسیٰؑ اور داؤدؑ اور سلیمانؑ کا ذکر کیا گیا ہے جن کے وجود سے اللہ تعالیٰ کے واقفِ اسرار روحانیہ ہونیکا ثبوت تو ضرور ملتا ہے - اِسی طرح اُس کے سمیع ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے مجید ہونے کا ثبوت جتنا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی زندگی سے ملتا ہے اتنا ثبوت حضرت موسیٰؑ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ یا اُن کے ساتھیوں کی زندگی سے نہیں ملتا -

تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ - فرماتا ہے اِس سورۃ کی آیتیں قرآن کریم کی آیتیں ہیں اور ایک ایسی کتاب کی آیتیں ہیں جو اپنے مضمون کو آپ کھول کر بیان کرتی ہے - اور مومنوں کے لئے ہدایت اور بشارت کا موجب ہے - مگر ان مومنوں کے لئے نہیں جو صرف مُنہ سے اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں بلکہ اُن کے لئے جو نمازیں قائم کرتے ہیں اور زکوٰتیں دیتے ہیں اور آخرت پر ایمان اور یقین رکھتے ہیں -

اِس آیت میں تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ فرما کر قرآن کریم کی ایک ایسی فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے جس سے باقی الہامی کتب کلیۃً محروم ہیں - دُنیا میں کوئی ایسی الہامی کتاب نہیں جو اس کثرت کے ساتھ پڑھی جاتی ہو جس کثرت کے ساتھ دنیا میں قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے - اور یہی وہ فضیلت ہے جو تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ میں بیان کی گئی ہے - اور

بتایا گیا ہے کہ یہ قرآن کی آیات ہیں یعنی اس کتاب کی آیات ہیں جس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن ہے یعنی وہ تلاوت میں اس قدر آتا ہے کہ دنیا کی اور کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

درحقیقت جو کتاب سب دنیا کو فائدہ پہنچانے والی ہو ضروری تھا کہ وہ قرآن ہو یعنی کثرت سے پڑھی جانے والی ہو۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ تورات اور انجیل کے تراجم کے باوجود وہ اس قدر نہیں پڑھی جاتیں جس قدر کہ قرآن پڑھا جاتا ہے حالانکہ وہ عربی زبان میں ہے اور لوگ بھی اسے عربی زبان میں ہی پڑھتے ہیں۔ مخالفین کا یہ کہنا کہ چونکہ ایسے ذرائع اختیار کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے لوگ اسے پڑھتے ہیں جیسا کہ نمازوں وغیرہ میں پڑھنا اور اس وجہ سے اس کا پڑھا جانا ایک طبعی امر ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پھر بھی طبعی امر نہیں کیونکہ اوّل جس کتاب کو نماز میں پڑھنے کا حکم ہو ضروری نہیں کہ لوگ کثرت سے اُس پر ایمان لے آئیں۔ آخر کثرت نسبت سے ہوتی ہے۔ دوسری کتب کے مقابل میں کثرتِ تلاوت اس کی تبھی ہو سکتی تھی جبکہ اسکے ماننے والوں کی تعداد بھی بہت ہو۔ ورنہ اس کی کثرت سے تلاوت کس طرح ہو سکتی تھی۔ اور لوگوں سے منوا لینا تو طبعی امر نہیں ہے۔ سکھ لوگ گرنتھ پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ قرآن نہیں۔ کیونکہ ماننے والے نہایت محدود ہیں۔ اور کثرت سے پڑھنے والوں کا وجود یقیناً پیشگوئی کے ماتحت آ سکتا ہے۔

دوم۔ اگر ماننے والے بھی کثرت سے ہوں تب بھی ضروری نہیں کہ لوگ حکم کو ماننے والے ہوں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود غیر زبان ہونے کے لوگ کثرت سے اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی طبعی امر نہیں ہے۔

سوم۔ پھر سوال یہ ہے کہ جبکہ الہامی کتب خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں اور خدا تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ یہ تدابیر جن سے قرآن پڑھا جاتا ہے اُسکی نظر سے پوشیدہ نہیں ہو سکتی تھیں۔ پھر کیوں نہ اُس نے دوسری کتب کے متعلق بھی وہ تدابیر اختیار کریں۔ یا اب کیوں وہ لوگ یہ تدابیر اختیار نہیں کر لیتے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ یہی ایک کتاب قرآن بنے۔ اور جب کتب کے نازل کرنے والے خدا نے صرف ایک کتاب کو ہی قرآن بننے کے لئے چُنا ہے تو یقیناً وہ افضل ہے۔

چہارم:۔ یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی عبارت اس قسم کی ہے کہ وہ بہ نسبت دوسری کتب کے جلد یاد ہو سکتی ہے۔ اس لئے لوگ اسے زیادہ حفظ کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیوں نہ دوسری کتب نے بھی ایسا ہی کر لیا اور پھر کیا اس قسم کی عبارت بنانا کوئی آسان بات ہے۔

غرض قرآن کریم کا قرآن ہونا ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس میں دوسری کتب شامل نہیں۔ مجھے خیال آیا کرتا ہے کہ بعض آریہ مباحثوں میں قرآن کریم کی آیات پڑھ کر فخر کیا کرتے ہیں کہ دیکھو ہم تمہاری کتب پڑھ لیتے ہیں مگر تم ہماری کتاب نہیں پڑھ سکتے۔ حالانکہ حقیقت میں اُن کا یہ دعویٰ قرآن کریم کی تائید ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ قرآن اپنے دعویٰ کے مطابق قرآن ہے اور دشمن بھی اسی کی زبان میں اُسے سیکھ سکتے ہیں اور ویدوں کو خود اس کے ماننے والے بھی نہیں پڑھ سکتے۔ پس جو نام اس کا غیر معمولی حالات میں قرآن رکھا گیا تھا وہ سچا ثابت ہوا۔ اور دشمن نے خود اپنے فعل سے اسکی صداقت پر مہر لگا دی۔

پس یہ ہم پر ہنسی نہیں بلکہ ہماری الہامی کتاب کی تصدیق ہے۔

یہ ایک عجیب امر ہے کہ سورۂ حِجر میں تو الٓر تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ فرمایا ہے اور اِس سورۃ میں طٰسٓ۔ تِلْكَ اٰيَاتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ فرمایا ہے۔ گویا ایک جگہ کتاب کو پہلے رکھا ہے اور قرآن کو بعد میں اور مبین کی صفت قرآن کے ساتھ لگائی ہے اور دوسری جگہ قرآن کو پہلے رکھا ہے اور کتاب کو بعد میں اور مبین کی صفت کتاب کے ساتھ لگائی ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟

اِس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ سورۃ حِجر کی اِس آیت کے بعد کہ تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ کفار کا ذکر ہے اور فرمایا ہے رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ اور سورۃ نمل کی آیت کے بعد مومنوں کا ذکر ہے اور فرمایا ہے کہ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ اور یہ بات واضح ہے کہ کفار قرآن کریم کی تلاوت نہیں کرتے۔ اُن کا علم زیادہ تر مسلمانوں سے سُن کر ہوتا ہے اور سُننے پر لفظ قرآن دلالت کرتا ہے۔ پس اُن کے لئے قرآن مبین ہوتا ہے۔ اور مومن اپنے مولیٰ کے کلام کو پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں اور اُن کا پڑھنا اُن کے سُننے سے زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً دن میں اگر وہ ایک پارہ کی تلاوت کرتے ہیں تو شاید ایک ربع سنتے ہیں۔ پس اُن کا علم زیادہ تر صفتِ کتاب سے آتا ہے۔ اِس وجہ سے اُن کے لئے صفتِ کتاب زیادہ مبین ہوتی ہے۔ پس اول الذکر مقام پر قرآن کے ساتھ مبین کو لگایا اور ثانی الذکر مقام پر کتاب کے ساتھ۔ اور یہ جو آگے پیچھے اِن لفظوں کو کیا گیا ہے اِس میں یہ حکمت ہے کہ کافر کا پہلا تعلق قرآن سے ہوتا ہے۔ یعنی پہلے وہ الفاظ سُنتا ہے۔ پھر اُس کا دل صاف ہو تو وہ اُسے اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے۔ اور مومن اُسے پہلے واجب سمجھے ہوئے ہوتا ہے پھر اس کے بعد وہ اُس کی قرأت کی طرف توجہ کرتا ہے۔ پس جس چیز کو جس سے زیادہ قرب تھا اُس کے قریب اس لفظ کو رکھ دیا گیا ہے۔

پھر میرے نزدیک سورۂ حِجر میں کتاب کا لفظ پہلے اور قرآن کا لفظ بعد میں اور سورۂ نمل میں قرآن کا لفظ پہلے اور کتاب کا لفظ بعد میں اسلئے بھی رکھا گیا ہے کہ سورۂ حِجر میں کتاب کی صفت سے زیادہ اُس کے قرآن ہونے کی صفت پر زور دیا گیا ہے۔ اور چونکہ کسی چیز کا درجہ اور مقام بیان کرتے وقت چھوٹی چیز کو پہلے بیان کیا جاتا ہے اور بڑی کو بعد میں۔ اس لئے سورۂ حِجر میں کتاب کو پہلے اور قرآن کو بعد میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اِس سورۃ میں چونکہ قرآن کریم کی زبانی تلاوت سے زیادہ اس کی تحریر کے اثر کو نمایاں کرنا تھا۔ اس لئے اس میں قرآن کا لفظ پہلے رکھا گیا اور کتاب کا بعد میں۔ گویا قرآن اور کتاب یہ دو نام نہیں بلکہ دو صفات ہیں جو قرآن کریم کی بیان کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب بھی ہے اور قرآن بھی۔ کِتَابٌ میں اس کے تحریر میں آنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور قرآن میں اس کے بکثرت پڑھے جانے کی خبر دی گئی ہے۔ اور یہ دونوں صفات یکجائی طور پر صرف قرآن کریم میں ہی پائی جاتی ہیں۔ یعنی یہ کتاب تحریر میں بھی موجود ہے اور اس کثرت سے اس کی تلاوت بھی کی جاتی ہے کہ دنیا میں اور کوئی کتاب نہیں جس کی اس کثرت سے تلاوت کی جاتی ہو۔ بیشک تورات اور انجیل بھی پڑھی جاتی ہیں مگر اوّل تو وہ اس کثرت کے ساتھ نہیں پڑھی جاتیں [illegible]

کثرت کے ساتھ قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو ایسے عشاق عطا فرمائے ہیں جو اس کے ایک ایک لفظ کو حفظ کرتے اور رات دن خود بھی پڑھتے اور دوسروں کو بھی سُناتے رہتے ہیں۔ لیکن تورات اور انجیل کا دنیا میں کوئی حافظ نہیں۔ ویدوں کا ایک ایک لفظ یاد رکھنے والا دنیا میں کوئی فرد نہیں۔ یہی حال ژند اور اوستا کا ہے۔ صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جسے کتابی صورت میں بھی پڑھا جاتا ہے اور حفظ بھی کیا جاتا ہے۔ اور پھر نمازوں میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ پس چونکہ اس سورۃ میں قرآن کریم کی زبانی تلاوت سے زیادہ اس کی تحریر کے اثر کو زیادہ نمایاں کرنا تھا۔ اس لئے اِس سورۃ میں قرآن کا لفظ پہلے اور کتاب کا لفظ بعد میں رکھا گیا۔

پھر ایک اَور حکمت بھی ان الفاظ کے آگے پیچھے کرنے میں ہے۔ اور وہ یہ کہ سورۂ حِجر میں اُن انبیاء کا ذکر تھا جن میں کتابت کا رواج کم تھا اور علوم کو زبانی یاد رکھا جاتا تھا۔ جیسے حضرت آدمؑ۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت لوطؑ۔ حضرت شعیبؑ اور حضرت صالحؑ وغیرہ۔ اِن سب کے زمانوں میں تحریر کا رواج کم تھا۔ اور چونکہ سورۂ حِجر میں انہی انبیاء کی قوموں سے خطاب کیا گیا ہے جن میں تحریر کا رواج کم تھا اور جنہوں نے حفظ کے ذریعہ سے قرآنی علوم سے فائدہ اٹھانا تھا۔ اس لئے اُس سورۃ میں قرآن کے ساتھ مبین کا لفظ رکھا اور بتایا کہ ان اقوام میں اس کلام کی صفتِ قرآن لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچائیگی۔ لیکن کتاب کی صفت بھی ساتھ ہی بیان کردی تاکہ قرآن کریم کی مکمل حفاظت کا اظہار ہو۔ لیکن اس سورۃ میں کتاب کے ساتھ مبین کا لفظ لگایا گیا ہے۔ کیونکہ اس سورۃ میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے واقعات پر زور دیا گیا ہے جو بنی اسرائیل میں سے تھے اور جن میں کتابت کا رواج زیادہ اور زبانی یاد رکھنے کا رواج کم تھا۔ اِن انبیاء کی اقوام نے چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے کلام کی صفت کتاب سے بہ نسبت صفتِ قرآن کے زیادہ فائدہ اٹھانا تھا اِس لئے اس کی مناسبت سے اسجگہ قرآن کے لفظ پر کم اور کتاب پر زیادہ زور دیا۔ مگر دونوں صفات کا اکٹھا ذکر کرکے اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی کہ قرآن کریم حفظ بھی کیا جائیگا۔ اور لکھا بھی جائیگا لیکن وہ قومیں جو تحریر سے زیادہ فائدہ اٹھانیوالی ہیں وہ اسے کتاب سے پڑھ کر زیادہ فائدہ اُٹھائینگی اور اس سورۃ میں وہی قومیں مخاطب کی گئی ہیں۔ گویا وہ قومیں جو حافظہ سے زیادہ کام لیتی ہیں اُن کیلئے تو یہ قرآن مبین ہوگا۔ اور جو قومیں تحریر سے زیادہ فائدہ اٹھاتی ہیں اُن کیلئے یہ کتاب مبین ہوگا۔

قرآن کریم پر نظر غائر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قرآن مبین کا لفظ صرف دو دفعہ اور کتاب مبین کا لفظ بارہ دفعہ استعمال ہوا ہے۔ جس میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کا کتاب ہونے کے لحاظ سے حلقہ زیادہ وسیع ہوگا اور اکثر لوگ اس کے کتاب ہونے سے ہی فائدہ اٹھائیں گے گو ایک طبقہ ایسا بھی ہوگا جو حفظ کے ذریعہ اس کی برکات سے بہرہ اندوز ہوگا۔ اور اس طرح مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ تعلیم کا رواج زیادہ کریں تاکہ مسلمان قرآنی برکات سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہوسکیں۔

پھر تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ میں قرآن کریم کی دوسری فضیلت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ایک کتاب ہے یعنی وہ لکھی ہوئی اور محفوظ ہے

جبکہ باقی الہامی کتب اب صرف نام کی کتاب رہ گئی ہیں حقیقتاً وہ اب کتاب نہیں رہیں اور اُن کے الفاظ اور اُن کی عبارتیں ہی بتا رہی ہیں کہ اُن کی حقیقت بدل گئی ہے۔ نیز کتاب وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ اور صرف قرآن کریم ہی اب ایک ایسی کتاب ہے جس پر عمل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آج بھی اس کے ہر حکم پر لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ عمل کرتے ہیں۔ مگر تورات۔ انجیل وید اور ژند پر بہت کم عمل ہوتا ہے۔ پس قرآن کریم ہی ایک کتاب ہے کیا بلحاظ اس کے کہ وہ ساتھ کے ساتھ لکھی جاتی رہی اور اب تک بغیر کسی زیر اور زبر کے فرق کے وہ وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور کیا بلحاظ اس کے کہ یہی وہ کتاب ہے جس پر دنیا میں عمل کیا جاتا ہے باقی مذاہب والے بیشک اپنی الہامی کتب کو شائع کرتے اور ان کے متعلق اپنی عقیدت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ بلکہ اُن کی تعلیموں سے اختلاف رکھنے والوں کو بُرا بھلا بھی کہتے ہیں مگر جب عمل کا سوال آتا ہے تو وہ ان کتابوں کو بالائے طاق رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یہ دونوں حقائق ظاہر و باہر ہیں۔

نولڈکے جرمن کا مشہور مستشرق لکھتا ہے کہ

> "ممکن ہے تحریر کی کوئی معمولی غلطیاں ہوں تو ہوں لیکن جو قرآن عثمانؓ نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا اس کا مضمون وہی ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پیش کیا تھا۔ گو اس کی ترتیب عجیب ہے۔ یورپین علماء کی یہ کوششیں کہ وہ ثابت کریں کہ قرآن میں بعد کے زمانہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی ہے بالکل ناکام ثابت ہوئی ہیں۔"

(انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ قرآن)

اسی طرح سر ولیم میور اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں لکھتا ہے کہ

> "اس زمانہ میں جو قرآن موجود ہے اس کے متعلق ہم ویسے ہی یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اصلی صورت میں محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا بنایا ہوا کلام ہے جس یقین سے کہ مسلمان کہتے ہیں کہ وہ خدا کا غیر مبدل کلام ہے۔"

اس کے مقابل میں تورات اور اناجیل کے متعلق خود بڑے بڑے پادری تسلیم کرتے ہیں کہ وہ محرّف و مبدّل ہو چکی ہیں۔ پس دنیا کے مذاہب کی تمام الہامی کتب میں سے صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جسے صحیح معنوں میں کتاب کہا جا سکتا ہے اور جس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اُسی شکل میں محفوظ ہے جس شکل میں وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

پھر عمل کو لو۔ تو عیسائی کہنے کو تو کہتے ہیں کہ مسیحؑ نے یہ کتنی اچھی تعلیم دی ہے کہ

> "ظالم کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے۔"

(متی باب ۵ آیت ۳۹)

مگر آج اس تعلیم پر کہیں بھی عمل نہیں ہو رہا۔ اگر عمل ہو رہا ہے تو صرف قرآنی تعلیم پر جس نے کہا ہے کہ تم مجرم کو پکڑو اور اسے سزا دو۔ لیکن اگر تمہیں دکھائی دے کہ سزا سے وہ اَور بھی بگڑ جائیگا اور اگر اُسے معاف کر دیا جائے تو اس کے دل میں ندامت پیدا ہوگی اور وہ اپنی اصلاح کرنے کی کوشش کریگا تو تمہارا فرض ہے کہ تم اُسے معاف کر دو۔ کیونکہ

تمہارا کام دوسروں کی اصلاح کرنا ہے۔ ناواجب سزا یا ناواجب عفو سے کام لینا تمہارے لئے جائز نہیں۔ غرض عمل کے لحاظ سے بھی صرف قرآن کریم ہی کتاب کہلانے کی مستحق ہے جبکہ باقی کتابیں عمل کے میدان میں بالکل بیکار ثابت ہو چکی ہیں۔ پھر قرآن کریم اس لحاظ سے بھی کتاب ہے کہ اس پر عمل کرکے انسان اللہ تعالیٰ کا مقرب بن سکتا ہے۔

کتاب کے معنوں پر بحث کرتے ہوئے ماہرین لغت نے لکھا ہے کہ اَلْكِتَابُ مَا يُكْتَبُ فِيْهِ سُمِّيَ بِهٖ لِجَمْعِهٖ اَبْوَابَهٗ وَ فُصُوْلَهٗ وَ مَسَائِلَهٗ یعنی کتاب اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں کچھ لکھا گیا ہو اور اسے کتاب اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں مختلف فصلوں اور ابواب اور مسائل کو جمع کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کتاب کے معنے خط کے بھی ہیں اور کتاب کے معنے فرض کے بھی ہیں۔ حکم کے بھی ہیں اور قضا و قدر کے بھی ہیں۔ اسی طرح كَتَبَ السِّقَاءَ کے معنے ہوتے ہیں خَرَزَهٗ بِسَيْرَيْنِ مشکیزہ کو چمڑے کے تسمہ کے ساتھ سی دیا اور كَتَبَ النَّاقَةَ کے معنے ہوتے ہیں اونٹنی کو دوسرے بچے کے ساتھ عادی بنانے کی کوشش کی۔ اور اس کے نتھنوں کو سی دیا تاکہ وہ بُو یعنی بُھس بھری کھال کی بُو نہ سونگھے (اقرب)

ان معانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کتاب اصل میں جمع کرنے کے معنے رکھتی ہے۔ کتاب کو بھی کتاب اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مختلف مضامین جمع ہوتے ہیں۔ اور خط کو بھی اس لئے کتاب کہتے ہیں کہ وہ دو دوستوں کو جمع کر دیتا ہے۔ اور فرض اور حکم کو بھی اسی لئے کتاب کہتے ہیں کہ فرض اور حکم کو پورا کرکے انسان اپنے مطلوب سے مل جاتا ہے۔ اور قضا و قدر کو بھی اسی لئے کتاب کہتے ہیں کہ انسان اس سے کہیں بھاگ نہیں سکتا اور وہ اُسے پا کر رہتا ہے۔

اسی طرح خدا تعالیٰ کی وحی کو بھی اسی لئے کتاب کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور بندے کو جمع کرنے والی اور ان کے درمیان ایک واسطہ ہوتی ہے اور اُنکے درمیان ایک تقریب پیدا کر دیتی ہے۔ پس جو کتاب بندہ اور خدا تعالیٰ کا تعلق پیدا کر دیتی ہے وہ تو فی الواقعہ کتاب کہلانے کی مستحق ہے لیکن جو کتاب انسان کا خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں کرتی وہ حقیقی معنوں میں کتاب نہیں کہلا سکتی۔ اور یہ خصوصیت صرف قرآن کریم کو ہی حاصل ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان اتصال پیدا کر دیتا ہے اور اسپر عمل کرنے سے انسان خدا تعالےٰ کا مقرب ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس خصوصیت پر اتنا زور دیا ہے کہ وہ فرماتا ہے ہم نے انسان کی فطرت میں ہی تعلق باللہ کا مادہ رکھ دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اُس نے انسان کے اندر تعلق باللہ کا مادہ رکھا ہے۔ بیشک اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ اُس نے انسان کو ایسی حالت سے پیدا کیا ہے جبکہ وہ رحم سے چمٹا ہوا تھا۔ لیکن اس آیت کے ایک تحت السطح معنے بھی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ عربی محاورہ میں خَلِقَ مِنْ شَیْءٍ کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اُس کی فطرت میں یہ چیز رکھی گئی ہے۔ مثلاً وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ لیکن جب خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ آ جائے تو اُس کے یہ معنے نہیں ہونگے کہ ہم نے انسان کو جلدی سے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ جلدی کوئی مادہ نہیں کہ اُسے گھول کر انسان پیدا کر دیا۔ بلکہ اس کے یہ معنے ہونگے کہ انسان کی فطرت میں عجلت رکھی گئی ہے۔ پس جہاں علق

کے ایک معنے یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو اس حالت سے پیدا کیا ہے کہ وہ رحم سے چمٹا ہوا تھا وہاں اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ ہم نے انسان کی فطرت میں محبت اور علاقہ کا مادہ رکھا ہے اور اس کی فطرت میں یہ بات مرکوز کر دی گئی ہے کہ وہ کسی کا ہو رہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پنجابی کا ایک مصرع سُنایا کرتے تھے جس کا مفہوم یہ تھا کہ یا تو تو کسی کا ہو جا یا کوئی تیرا ہو جائے۔ پس خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ ہم نے انسانی فطرت میں محبت اور علاقہ کا مادہ رکھا ہے یعنی ہم نے اُسے ایسی حالت پر پیدا کیا ہے کہ وہ سوائے اس کے چین پا ہی نہیں سکتا کہ وہ کسی کا ہو رہے۔ بیشک جب تک اسے اصل چیز نہیں ملتی اُس وقت تک وہ کبھی بیوی کا ہو رہتا ہے کبھی بہن بھائی کا ہو رہتا ہے۔ کبھی ماں باپ کا ہو رہتا ہے۔ کبھی دوستوں کا ہو رہتا ہے اور اس طرح وہ درمیان میں بھولتا پھرتا ہے۔ مگر جب خدا تعالیٰ کے ملنے کا راستہ اُس پر کھل جاتا ہے تو پھر وہ خدا تعالیٰ کا ہی ہو جاتا ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر کے موقعہ پر دیکھا کہ ایک عورت کا بچہ گم ہو گیا ہے اور وہ میدانِ جنگ میں اپنے بچے کو تلاش کرنے کے لئے ماری ماری پھر رہی ہے۔ اُسے جہاں کوئی بچہ ملتا وہ اُسے پیار کرتی اور گلے لگاتی۔ لیکن جب وہ دیکھتی کہ وہ اس کا اپنا بچہ نہیں تو اُسے چھوڑ دیتی اور آگے چلی جاتی یہاں تک کہ اُسے اپنا بچہ مل گیا۔ اُس نے اسے پیار کیا اور گلے لگایا۔ اور ایک جگہ آرام سے بیٹھ گئی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ تم نے اس عورت کو دیکھا۔ جس طرح یہ اپنے بچہ کے لئے بیتاب رہی اور جب اُسے اپنا بچہ مل گیا تو سکون اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے بھولے بھٹکے بندہ کے لئے ہر وقت بے تاب رہتا ہے۔ لیکن جب اُس کا بندہ صحیح رنگ میں توبہ کر کے اُسے مل جاتا ہے تو وہ ایسا ہی سکون محسوس کرتا ہے جس طرح اس ماں نے محسوس کیا ہے۔ پس قرآن کریم دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر تعلق اور محبت پیدا کرنے کا مادہ رکھ دیا ہے اور پھر وہ اس کے حصول کے ذرائع پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز جو سچے مذہب کو دوسرے مذاہب یا عقائد پر فوقیت بخشتی ہے وہ تعلق باللہ ہی ہے۔ ایک انسان سچے مذہب میں شامل ہوئے بغیر محنتی ہو سکتا ہے۔ وہ سچے مذہب میں شامل ہوئے بغیر اچھا تاجر بن سکتا ہے وہ سچے مذہب میں شامل ہوئے بغیر اچھا صنّاع بن سکتا ہے اور وہ سچے مذہب میں شامل ہوئے بغیر صدقہ و خیرات بھی کر سکتا ہے۔ مگر دنیا کا کوئی انسان سچے مذہب میں شامل ہوئے بغیر خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ چیز ہے جو سچے مذہب پر چلنے والے اور نہ چلنے والے میں ما بہ الامتیاز ہے اور جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص سچے مذہب پر چلتا ہے یا نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ خدا رسیدہ وہی ہو سکتا ہے جو اس راستے پر چلتا ہے جو خدا تک پہنچتا ہے۔ جو شخص خدا تک جانے والے راستہ پر نہیں چلتا وہ خدا تک کس طرح پہنچ سکیگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا کوئی مادی چیز نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی خاص مکان ہے مگر ساری روحانی اور معنوی چیزوں کے لئے رستے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر پڑھنا یا علم حاصل کرنا مادی چیز نہیں۔ زبان جاننا مادی چیز نہیں۔ اسی طرح جغرافیہ

تاریخ اور حساب کا علم حاصل کرنا مادی نہیں مگر ان سب کے حصول کے لئے کچھ راستے مقرر ہوتے ہیں جبتک زبان دانی کے لئے زبان نہ سیکھی جائے۔ جب تک علم حساب کے لئے حساب کی کتابیں نہ پڑھی جائیں جب تک جغرافیہ کے علم کے لئے جغرافیہ کی کتابیں نہ پڑھی جائیں اور جب تک تاریخ دانی کے لئے تاریخ کی کتابیں نہ پڑھی جائیں تب تک انسان زبان تک حساب تک جغرافیہ تک اور تاریخ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح گو خدا کوئی مادی چیز نہیں مگر اس تک پہنچنے کے لئے ایک راستہ مقرر ہے۔ چنانچہ اسلام اس بارہ میں اعلان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی اے محمد رسول اللہ! تو تمام بنی نوع انسان کو یہ بشارت دے دے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا خدا تم سے محبت کرنے لگ جائیگا۔ اور تم اُس کے محبوب اور پیارے بن جاؤگے۔ یہ کتنی بڑی بشارت ہے جو دنیا کو دی گئی ہے اور کتنا امید افزا پیغام ہے جو مردہ قلوب میں بھی حیاتِ نو پیدا کر دیتا ہے۔ آج ساری دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اُس نے تورات یا انجیل یا وید یا ژند اور اوستا پر عمل کر کے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیا ہے اور خدا اس سے ہمکلام ہوتا اور اُس پر اپنے غیب کے اسرار ظاہر کرتا ہے۔ لیکن مسلمانوں میں ہر زمانہ میں ایسے پاکباز لوگ گذرے ہیں جنہوں نے اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کیا اور اس کے انوار اور برکات سے حصّہ لیا۔ بلکہ وہ دائمی طور پر مسلمانوں سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حٰم السجدہ ع ۴) یعنی وہ لوگ جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ استقلال کے ساتھ اس عقیدہ پر قائم ہوگئے وہ اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے الہام سے نوازے جائینگے اور خدا تعالیٰ کے فرشتے اُن پر یہ کہتے ہوئے اُتریں گے کہ ڈرو نہیں اور نہ کسی پچھلی کوتاہی کے بد نتائج کا خوف کرو۔ بلکہ اس جنت کے ملنے سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم اس دنیا میں بھی تمہارے دوست ہیں۔ اور آخرت میں بھی تمہارے دوست رہیں گے۔ اور اُس جنت میں جو کچھ تمہارا جی چاہے گا وہ تم کو ملیگا اور جو کچھ مانگو گے وہ بھی تم کو دیا جائیگا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اسلام ہر مومن کے لئے قربِ الٰہی کے دروازہ کو کھلا تسلیم کرتا ہے اور وہ بنی نوع انسان کو یقین دلاتا ہے کہ اگر وہ سچے دل سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کریں گے تو خدا تعالیٰ انہیں یقیناً اپنا محبوب بنالے گا۔ اور انہیں اپنے کلام اور الہام سے نوازیگا اور مشکلات میں اُن کی مدد کریگا اور انہیں غیر معمولی کامیابیوں اور برکتوں سے حصّہ بخشیگا مگر دنیا کی اَور کوئی الہامی کتاب ایسی نہیں جو اپنے متبعین کو ان برکات کا کروڑواں حصّہ بھی دے سکتی ہو۔ پس صحیح معنوں میں صرف قرآن کریم ہی کتاب کہلانے کا مستحق ہے۔ جبکہ دوسری الہامی کتب نام کے لحاظ سے تو کتاب کہلاتی ہیں۔ مگر حقیقت کے لحاظ سے وہ کتاب نہیں کیونکہ وہ خدا اور بندوں کا باہمی تعلق پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔

پھر قرآن کریم صرف کتاب ہی نہیں بلکہ وہ کتاب مبین بھی ہے ۔ یعنی وہ نہ صرف انسان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کر دیتا ہے بلکہ تقرب الی اللہ کے لئے جس قدر امور کی ضرورت ہے ان سب کو اُس نے پوری تفصیل سے بیان کر دیا ہے گویا احکام یا اخلاق فاضلہ یا اعتقاداتِ صحیحہ سے تعلق رکھنے والی کوئی بات ایسی نہیں جو قرآن کریم نے بیان نہ کی ہو ۔

اصل بات یہ ہے کہ جو چیز درونِ پردہ ہو ۔ جب تک وہ آپ ہمیں آواز نہ دے اور آپ ہماری راہنمائی نہ کرے ہمیں باہر سے اُس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکتا ۔ فرض کرو ۔ ایک مکان کا دروازہ اندر سے بند ہے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اس کے اندر کون ہے ۔ تو ہمیں اندر کا حال کس طرح معلوم ہو سکتا ہے اگر ہم محض اپنے قیاس سے اس کے متعلق کوئی فیصلہ کریں گے تو وہ ویسی ہی بات ہو گی جیسے مشہور ہے کہ کسی شہر میں چار اندھے رہا کرتے تھے ۔ اتفاقاً ایک دن اس شہر میں ہاتھی آگیا ۔ اور سینکڑوں آدمی اس کے دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو گئے ۔ ان اندھوں نے شہر والوں سے کہا کہ ہمیں بھی وہاں لے چلو سارا شہر دیکھ آیا ہے ۔ اگر ہم نہ گئے تو لوگ کیا کہیں گے ۔ چنانچہ کوئی شخص انہیں سہارا دے کر وہاں لے گیا ۔ اب وہ دیکھ تو نہیں سکتے تھے انہوں نے کہا چلو ہم ٹٹول کر ہی معلوم کر لیتے ہیں کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے ۔ چنانچہ ایک نے ہاتھ مارا تو وہ اُس کی دم پر پڑا ۔ دوسرے نے ہاتھ مارا تو کان پر پڑا ۔ تیسرے نے ہاتھ مارا تو سونڈ پر پڑا ۔ چوتھے نے ہاتھ مارا تو پیٹ پر پڑا ۔ اس کے بعد وہ واپس آگئے ۔ اور پھر انہوں نے بیٹھ کر آپس میں ہاتھی کے متعلق باتیں شروع کر دیں ۔ ایک نے کہا کہ ہاتھی بس ایک لمبی سی چیز ہوتی ہے ۔ جس کے آگے تھوڑے سے بال ہوتے ہیں ۔ دوسرے نے کہا کہ تم بالکل جھوٹ بولتے ہو ۔ ہاتھی تو ایسا ہوتا ہے جیسے چھاج ہوتا ہے ۔ تیسرے نے کہا تم نے ہاتھی دیکھا ہی نہیں وہ تو ڈھول کی طرح ہوتا ہے ۔ چوتھے نے کہا کہ سب غلط کہتے ہو وہ تو ایک موٹی سی لچکدار چیز ہوتی ہے اور کچھ بھی نہیں ہوتا (اُسکا ہاتھ سونڈ پر پڑا تھا) یہ اختلاف اسی لئے ہوا کہ انہوں نے بے دیکھے محض قیاس سے ایک چیز کا اندازہ لگایا تھا ۔

اسی طرح جو چیز درونِ پردہ ہو اُس کا پتہ باہر سے نہیں لگ سکتا اور اگر کوئی پتہ لگانے کی کوشش کرے گا تو وہ اندھوں کی طرح غلط نتیجہ پر ہی پہنچے گا ۔ یہی حال خدا تعالیٰ کی معرفت اور اُس کی دینی تعلیموں کا ہے ۔ یہ علم صرف خدا تعالیٰ کی کتاب سے ہی حاصل ہو سکتا ہے ۔ اور جو شخص اسے باہر سے سیکھنے یا سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ ان اندھوں کی طرح ہوتا ہے جن میں سے کسی نے سونڈ پر ہاتھ مار کر سمجھ لیا تھا کہ مَیں نے ہاتھی دیکھ لیا ہے ۔ کسی نے دُم پر ہاتھ مار کر سمجھ لیا تھا کہ مَیں نے ہاتھی دیکھ لیا ہے کسی نے پیٹ پر ہاتھ مار کر سمجھ لیا تھا کہ مَیں نے ہاتھی دیکھ لیا ہے اور کسی نے کان پر ہاتھ مار کر سمجھ لیا تھا کہ مَیں نے ہاتھی دیکھ لیا ہے ۔

اس زمانہ میں بعض بے وقوف سائنسدان کہتے ہیں کہ ہم عقل سے خدا کو معلوم کر سکتے ہیں ۔ جیسے بعض بے وقوف علماء یہ کہتے ہیں کہ مذہب کا عقل سے کیا تعلق ہے ۔ یہ دونوں بے وقوف ہیں ۔ خدا کو ہم عقل سے نہیں دریافت کر سکتے اور مذہب کو بغیر عقل کے ہم سمجھ نہیں سکتے ۔ جس طرح دنیا کی تمام معقول باتوں کے سمجھنے کیلئے عقل کی ضرورت ہے اسی طرح مذہب کے سمجھنے کیلئے بھی عقل استعمال کی جاتی ہے ۔

جیسے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (یوسف آیت ۱۰۹) یعنی اے محمد رسول اللہ! تو لوگوں سے یہ کہدے کہ میرا طریق یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں۔ اور میں اور میرے متبع سب بصیرت پر قائم ہیں۔ یعنی ہر بات کو ہم دلیل اور عقل کے ساتھ مانتے ہیں یونہی نہیں مانتے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ کوئی انسان محض عقل سے خدا کو پا سکتا ہے۔ خدا کو پانے کے لئے مذہب ہمارا راہنما ہے اور مذہب کے سمجھنے کے لئے عقل کا پاسبان ضروری ہے اور عقل کو صحیح راستہ دکھانے کیلئے نبی کا وجود ضروری ہے ورنہ خالی عقل سے جن لوگوں نے مذہب کو پانے کی کوشش کی ہے انہوں نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے۔ پنجابی میں ایک ضرب المثل ہے۔ "گھروں میں آیاں تے سنیہے تو دیندا ہاں" یعنی گھر سے تو میں آیا ہوں اور پیغام تم دے رہے ہو۔ بالکل یہی بات خدا تعالیٰ کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ جب کوئی شخص خدا سے ملنا چاہے تو لازماً خدا ہی اُسے بتا سکتا ہے کہ تم اس اس طرح مجھے مل سکتے ہو۔ وہ خود بخود اس تک نہیں پہنچ سکتا پس وہ سائنسدان پاگل ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا کو اپنی عقل کے زور سے پا سکتے ہیں۔ خدا کو خدا کے ذریعہ ہی پایا جا سکتا ہے اور خدا کی راہنمائی حاصل کرنے کا سب سے بڑا اور کامیاب ذریعہ یہی ہے کہ انسان خدا کے کلام پر غور کرے اُسے سمجھے اور اُس پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔

پھر فرماتا ہے۔ ھُدًی وَّ بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ یہ قرآن مومنوں کے لئے بہت بڑی ہدایت اور بشارت کا موجب ہے۔ اس جگہ ھُدًی کی تنوین تعظیم کے لئے استعمال کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ ہدایت بہت بڑی شان رکھتی ہے۔ یعنی ہدایت کا کوئی درجہ اور مقام ایسا نہیں جس کی طرف قرآن کریم بنی نوع انسان کی راہنمائی نہ کرتا ہو۔ یوں تو اپنے زمانہ میں تورات بھی دنیا کی ہدایت کا موجب تھی اور انجیل بھی دنیا کی ہدایت کا موجب تھی اور ژند و اوستا بھی دُنیا کی ہدایت کا موجب تھی مگر کامل ہدایت جس نے انسان کو نقطۂ کمال تک پہنچا دیا اور جس کے بعد قیامت تک کے لئے کسی اور ہدایت اور راہنمائی کی ضرورت نہیں۔ وہ صرف قرآن کریم ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر ہدایت کے مختلف مدارج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اَلَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی (محمد ع ۲) یعنی جو لوگ ہدایت کے راستہ پر چل پڑتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت پر ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ جس طرح خدا تعالیٰ غیر محدود ہے اُسی طرح اُس کے قرب کی راہیں بھی لا متناہی ہیں۔ مگر قرآن کریم کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر مرحلہ پر انسان کی راہنمائی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے راستہ میں کوئی مقام بھی ایسا نہیں آتا جب انسان اپنے آپ کو قرآنی راہنمائی سے مستغنی سمجھ سکے۔ وہ شروع سے لیکر آخر تک قرآنی ہدایت کا محتاج رہتا ہے۔ اور قرآن بھی اُسے قدم قدم پر اپنے انوار اور برکات سے حصّہ دیتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا تعالیٰ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

پھر فرمایا کہ یہ مومنوں کے لئے بشارت کا بھی موجب ہے یعنی یہی نہیں کہ قرآن انسان کے سامنے اللہ تعالیٰ کے قرب کے غیر متناہی دروازے کھولتا ہے بلکہ وہ اس کی تائید میں اپنے نشانات بھی ظاہر کرتا ہے اور اپنی بشارتوں سے بھی اُسے حصّہ دیتا ہے اگر مومن کی تائید میں الٰہی نشانات ظاہر نہ ہوں تو چونکہ ہدایت ایک روحانی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب دوسروں کو

مادی آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتا۔ اِس لئے لوگ اِس شبہ میں مبتلا رہ سکتے تھے کہ معلوم نہیں یہ سچ بھی کہہ رہا ہے یا نہیں۔ اِس شبہ کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی تائیدات مومنوں کے شامل حال رکھتا ہے اور اپنے نشانات اُن کی ایمانی تقویت کے لئے اور اُن کے دشمنوں پر حجت تمام کرنے کے لئے نازل کرتا رہتا ہے جو اِس بات کا ثبوت ہوتے ہیں کہ یہ لوگ حقیقۃً ہدایت یافتہ ہیں اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کر لیا ہے۔ ایک جھوٹا اور مفتری انسان یہ تو کہہ سکتا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہے مگر وہ خدا تعالیٰ کے نشانات اپنی تائید میں نازل نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کسی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی نصرت اور اس کی تائید کی فعلی شہادت ہو۔ اُس پر اللہ تعالیٰ کے الہامات نازل ہوتے ہوں۔ اُس کی دُعائیں غیر معمولی طور پر قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہوں۔ اُس کے دشمنوں کو ناکام رکھا جاتا ہو۔ اور اُسے اپنے مقاصد میں کامیابی پر کامیابی حاصل ہوتی ہو تو یہ ثبوت ہوتا ہے اِس بات کا کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں بھی سچا ہے کہ اُسے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہے اور قرآن کریم بتاتا ہے کہ اُس کے احکام پر عمل کرنے والوں کو یہ دونوں باتیں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ اس مستقل ہدایت نامہ پر عمل کرتے کرتے خدا تعالےٰ کے قرب میں بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اور پھر خدا تعالیٰ بھی اُنکی تائید کے لئے آسمان سے اُتر آتا ہے اور وہ انہیں مشکلات کے ہجوم میں بشارات سے حصہ دیتا اور انہیں اپنے دشمنوں پر غلبہ عطا فرماتا ہے اور جس مقصد کو لے کر وہ کھڑے ہوتے ہیں اُس میں انہیں کامیابی عطا کرتا ہے۔

پھر فرماتا ہے یہ قرآن ہدایت اور بشارت کا تو موجب ہے مگر اُن کے لئے نہیں جو اپنے مُنہ سے تو ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن عمل دیکھو تو نہ وہ نمازیں پڑھتے ہیں نہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور نہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے نہ قرآن ہدایت کا موجب بنتا ہے اور نہ الٰہی تائیدات اور اُس کی برکات اُن کے شامل حال ہوتی ہیں قرآن کریم کی کامل ہدایت اور اس کی بشارت کے شیریں ثمرات سے صرف وہی لوگ متمتع ہوتے ہیں جو باجماعت نمازیں ادا کرتے ہیں۔ ہمیشہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا اہم ترین حصہ جو اُس کے لئے دل اور دماغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ عبادت الٰہی ہی ہے۔ اگر عبادتِ الٰہی کو ترک کر دیا جائے تو مذہب صرف رسم و رواج کا نام بن کر رہ جائیگا۔ اور خدا تعالیٰ سے تعلق کا دعویٰ محض ایک ڈھکوسلہ ہوگا۔ اِس لئے اسجگہ مومنوں کی پہلی صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وہ نمازوں کو قائم کرتے ہیں یعنی خود بھی باجماعت نماز ادا کرتے ہیں جس کی طرف یُقِیْمُوْنَ کا لفظ اشارہ کرتا ہے اور دوسروں کو بھی نمازوں کی ادائیگی کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ گویا بحیثیت جماعت وہ نمازوں کی ادائیگی کا ہمیشہ التزام رکھتے ہیں۔ اگر یہاں صرف انفرادی نمازوں کا ذکر ہوتا تو یُصَلُّوْنَ کہنا کافی تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یصلّون کا لفظ استعمال نہیں فرمایا بلکہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اِسی طرح قرآن کریم کے اور مقامات میں بھی اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ یا اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ کے الفاظ ہی استعمال ہوئے ہیں اور اقامت ہمیشہ باجماعت نماز میں ہی ہوتی ہے۔ پس مومنوں کی ایک بڑی علامت اس آیت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ باجماعت نمازیں ادا کرتے ہیں اور نہ صرف خود نمازوں کی پابندی کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی نمازوں کی

ادائیگی کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے بعض
لوگ خود تو نماز کے بڑے پابند ہوتے ہیں مگر اپنے
بیوی بچوں کے متعلق کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ حالانکہ
اگر اُن کے دل میں سچا اخلاص ہو تو یہ ہو ہی نہیں
سکتا کہ کسی بچے کا یا بیوی کا یا بہن بھائی کا نماز
چھوڑنا انسان گوارہ کر سکے۔

ہماری جماعت کے ایک مخلص دوست تھے
جو اب فوت ہو چکے ہیں۔ اُن کے لڑکے نے ایک دفعہ مجھے
لکھا کہ میرے والد صاحب میرے نام الفضل جاری
نہیں کرواتے۔ مَیں نے انہیں لکھا کہ آپ کیوں اُس کے
نام الفضل جاری نہیں کراتے تو انہوں نے جواب دیا کہ
مَیں چاہتا ہوں کہ مذہب کے معاملہ میں اُسے آزادی
حاصل رہے اور وہ آزادانہ طور پر اس پر غور کر سکے۔
مَیں نے انہیں لکھا کہ الفضل پڑھنے سے تو آپ سمجھتے
ہیں اس پر اثر پڑے گا اور مذہبی آزادی نہیں رہیگی۔
لیکن کیا اس کا بھی آپ نے کوئی انتظام کر لیا ہے کہ
اس کے پروفیسر اس پر اثر نہ ڈالیں۔ اس کی کتابیں
اسپر اثر نہ ڈالیں۔ اس کے دوست اس پر اثر نہ
ڈالیں۔ اور جب یہ سارے کے سارے اثر ڈال رہے
ہیں تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ اُسے زہر تو کھانے
دیں اور تریاق سے بچایا جائے۔ غرض اقامتِ صلوٰۃ
ایک نہایت ہی ضروری چیز ہے۔ اور اس میں خود
نماز پڑھنا۔ دوسروں کو پڑھوانا اور اخلاص اور
جوش کے ساتھ پڑھنا۔ باوضو ہو کر ٹھہر ٹھہر کر باجماعت
اور پوری شرائط کے ساتھ نماز پڑھنا شامل ہے۔
احادیث میں آتا ہے کہ نماز خدا اور بندے کے درمیان
ملاقات کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ گویا اس کے ذریعہ
الوہیت کا وہ رنگ جو نبی کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ
پیدا کرنا چاہتا ہے مومنوں پر چڑھ جاتا ہے۔ اور
وہ اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگین ہو جاتے ہیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نماز باجماعت
کا اس قدر احترام فرماتے تھے کہ ایک دفعہ آپ
کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور اُس نے عرض کیا۔
یا رسول اللہؐ! میرا مکان مسجد سے بہت دُور ہے
اور چونکہ مجھے مسجد پہنچنے میں سخت دقت پیش آتی
ہے اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو مَیں اپنے گھر
میں ہی نماز ادا کر لیا کروں (اُس وقت مدینہ میں کچے
مکانات ہوتے تھے اور جب بارش کے دنوں میں پانی
گلیوں میں بہتا تھا تو چونکہ پانی دیواروں کی بنیادوں
کے ساتھ ٹکرا کر گذرتا تھا اور دیواریں پانی سے
ٹوٹ جاتی تھیں اس لئے پانی کی زد سے دیواروں کو
بچانے کے لئے لوگوں نے گلی میں دیواروں کی بنیادوں
کے ساتھ ساتھ چلے ہوئے پتھر جن کو پنجابی زبان
میں کھنگر کہتے ہیں رکھے ہوتے تھے۔ گلیوں میں
کھنگر رکھنے کا رواج ہمارے ملک میں بھی ہے اور
چونکہ ایک نابینا کے لئے سڑک کے بیچ میں چلنا
مشکل ہوتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ دیواروں کے ساتھ
ساتھ چلتے ہیں اور دیوار کے ساتھ ہاتھ مارتے جاتے
ہیں۔ اگر وہ ایسی دیوار کے ساتھ چلیں جس کے ساتھ
کھنگر رکھے ہوئے ہوں تو اُن کے گر کر زخمی ہونے
کا خطرہ ہوتا ہے) جب اس نابینا نے رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ چونکہ
دیواروں کے ساتھ پتھر رکھے ہوتے ہیں اور گلی کے
بیچ میں مَیں چل نہیں سکتا اور اگر دیوار کے ساتھ چل کر
مسجد میں آؤں تو گر کر زخمی ہونے کا خطرہ ہے اس لئے
مجھے اجازت ہو تو مَیں گھر پر نماز ادا کر لیا کروں
تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بہت
اچھا۔ اگر تمہیں مسجد میں آتے ہوئے مشکل پیش

آتی ہے تو تم اپنے گھر میں ہی نماز ادا کر لیا کرو۔ یہ سُنکر وہ نابینا گھر کی طرف چل پڑا۔ مگر ابھی وہ تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا۔ اس کو واپس بلاؤ۔ وہ جب واپس آیا تو آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے گھر میں اذان کی آواز پہنچ جاتی ہے۔ اُس نے عرض کیا۔ ہاں یا رسول اللہ! اذان کی آواز تو پہنچ جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اگر اذان کی آواز تمہارے گھر میں پہنچ جاتی ہے تو چاہیے تمہیں مسجد میں آتے وقت ٹھوکریں لگیں اور تم زخمی ہو جاؤ مسجد میں ضرور آیا کرو۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جب عشاء یا صبح کی نماز ہو تو مَیں اپنی جگہ کسی اَور کو کھڑا کر دوں اور کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر اُن کے سروں پر لکڑیوں کے گٹھے رکھ کر سارے شہر کا چکر لگاؤں اور جو لوگ گھروں میں بیٹھے ہوئے ہوں اُن کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ اب دیکھو گو آپ نے عملاً ایسا کیا تو نہیں۔ مگر اس سے اتنا تو ظاہر ہے کہ آپکے دل میں نماز باجماعت کی کسقدر اہمیت تھی۔ آپنے اس مثال کے ذریعہ لوگوں کو سمجھایا کہ جو لوگ باجماعت نماز ادا نہیں کرتے وہ اپنے آپکو دوزخ کا ایندھن بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیشک دنیا میں نیکی کے اَور بھی بہت سے کام ہیں۔ لیکن نماز کو خدا تعالیٰ نے سب سے مقدم قرار دیا ہے اور سوائے اس کے کہ کوئی معذوری ہو یا کوئی ہنگامی کام پڑ جائے نمازوں کے اوقات میں مسجد میں آنا نہایت ضروری ہے۔ ہنگامی کاموں سے مراد یہ ہے کہ مثلاً کسی جگہ آگ لگ گئی ہو تو اُس وقت آگ بجھانا ضروری ہوگا۔ نماز بعد میں ادا کر لی جائیگی۔ لیکن اِس قسم کے استثنائی حالات کے بغیر جو شخص نماز باجماعت کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے وہ ایک بہت بڑے جُرم کا مرتکب ہوتا ہے۔

دوسری چیز جس کی طرف اِن آیات میں توجہ دلائی گئی ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کی ضرورت اور اس کی اہمیت درحقیقت غربت کے سوال سے پیدا ہوتی ہے۔ اور غربت ایک ایسی چیز ہے جو کبھی بھی بنی نوع انسان سے جُدا نہیں ہوئی۔ عام طور پر لوگ خیال کر لیتے ہیں کہ جب دنیا کی آبادی بڑھ جاتی ہے تو ایک حصّہ غریب ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ آبادی کی کمی کی صورت میں بھی ہمیں غربت ویسی ہی نظر آتی ہے جیسے اس کی کثرت کی صورت میں۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں باوجود اس کے کہ اُسوقت صرف چند ہی افراد تھے قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے بھی بعض پر غربت کا زمانہ آیا تھا کیونکہ فرماتا ہے کہ اگر تُو اس جنت میں رہیگا تو تُو پیاسا نہیں رہیگا۔ تیرے ساتھی بھوکے نہیں رہیں گے۔ اور تیرے ساتھی ننگے نہیں رہیں گے۔ اِس وسیع دنیا میں جہاں ہر دولت اور ہر خزانہ خالی پڑا تھا اور کسی کا کوئی مالک نہیں تھا کسی مخصوص قانون میں رہ کر روزی ملنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہو سکتا تھا۔ ساری دُنیا کا سونا اُن کے قبضہ میں تھا۔ ساری دنیا کی چاندی اُن کے قبضہ میں تھی۔ ساری دنیا کا پیتل اُن کے قبضہ میں تھا۔ ساری دنیا کا لوہا اُن کے قبضہ میں تھا۔ ساری دنیا کے پھل۔ پھول اور اعلیٰ درجہ کی زمینیں اُن کے قبضہ میں تھیں۔ پھر یہ سوال کیونکر پیدا ہوا کہ اگر تُو ایک خاص قانون کے ماتحت رہیگا تو بھوک اور ننگ سے بچ جائیگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ باوجود ساری دولتوں کے پھر بھی اس بات کا امکان تھا کہ بعض لوگ بھوکے رہیں۔ بعض پیاسے رہیں اور بعض ننگے رہیں۔ اور یہ صحیح بات ہے۔ درحقیقت دنیا میں دولت دو قسم کی ہوتی ہے ایک بالقوۃ اور ایک بالفعل۔

پھر بالفعل بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک بالفعل دولت ایسی ہوتی ہے جو سکّہ کی صورت میں ہو یا اُن چیزوں کی صورت میں جن سے دوسری اشیاء خریدی جا سکتی ہیں۔ اور ایک بالفعل دولت اجناس کی صورت میں ہوتی ہے جن کو استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر اجناس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بغیر کسی اور تیاری کے انسان کے استعمال میں آ جاتی ہیں اور ایک وہ جن کی تیاری کے لئے کوشش اور سعی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں تک بالقوۃ دولت یعنی وجود دولت کا سوال ہے انگریزوں نے اس کا نام ویلتھ رکھا ہے اور اس سے مراد کسی ملک کے وہ سامان دولت ہوتے ہیں جو اس میں قدرتی طور پر پائے جاتے ہوں۔ مثلاً اگر کسی ملک میں سونے کی کانیں ہیں یا چاندی کی کانیں ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اُس کے پاس ویلتھ ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں ہونگے کہ اس کے پاس روپیہ ہے۔ اگر وہ چاندی اس تک پہنچ نہیں سکی یا لوگوں کے پاس زرخیز زمینوں میں گندم اور روئی بونے کے سامان نہیں تو پھر بھی وہ لوگ بھوکے اور پیاسے اور ننگے رہیں گے۔ پس ایک دولت تو اس قسم کی ہوتی ہے جو بالقوۃ ہوتی ہے۔ اگر اس ملک کے لوگوں میں صنعت وحرفت نہیں یا انہیں زمینداری کا علم نہیں تو باوجود اس کے کہ وہ کانوں پر بیٹھے ہونگے اور کروڑوں کروڑ روپیہ کا سونا اُن میں موجود ہوگا - وہ زرخیز زمینوں پر بیٹھے ہونگے۔ ایسی زمینوں پر کہ اگر اس میں ایک دانہ بھی ڈال دیا جائے تو سینکڑوں دانے پیدا ہوں۔ لیکن پھر بھی وہ فاقے مر رہے ہونگے۔ گویا اُن کے پاس دولت تو ہوگی لیکن ساکن دولت ہوگی۔ لیکن اگر دنیا میں کوئی ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے جو لوگوں کو مختلف قسم کے فنون سکھاتا ہے خواہ الہام کے ذریعہ سے یا القائے الٰہی کے ذریعہ سے۔ اور وہ کہتا ہے کہ آؤ ہم تمہیں زمینداری کا طریق بتاتے ہیں کپڑا بننے کے طریق سکھاتے ہیں یا اسی قسم کے اور فنون سکھاتے ہیں جن سے تم اپنی تمدنی حالت کو سدھار سکو تو یقیناً اس کے ذریعہ لوگوں کی بھوک اور اُن کی پیاس دُور ہو جائیگی۔ جیسے اسلام کی روایتوں میں خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں یہ آتا ہے کہ حضرت آدمؑ نے لوگوں کو زراعت سکھائی۔ اور حضرت شیثؑ نے اُنکو کپڑا بننا سکھایا۔ اب چاہے انہیں آدمؑ نے سکھایا ہو یا شیثؑ نے یا کسی اور نے اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدائی زمانہ میں اس قسم کے امور میں الہامِ الٰہی مدد کرتا تھا۔ جیسے قرآن کریم میں صاف طور پر یہ ذکر آتا ہے کہ زبان ابتداء میں الہاماً سکھائی گئی تھی۔ چنانچہ فرماتا ہے: عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ اس سے قیاس کر کے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جس طرح ابتدائی زمانہ میں الہام کے ذریعہ زبان کا سکھایا جانا ضروری تھا۔ اسی طرح الہام کے ذریعہ انہیں فنون سکھائے جانے بھی ضروری تھے۔ ورنہ اس کے بغیر انسان مدتوں تک تکلیف اٹھاتا چلا جاتا۔ پس اگر کوئی نبی آ جائے اور وہ یہ کہے کہ تم زمین میں ہل چلاؤ اور کھیتی باڑی کرو۔ اسی طرح وہ مختلف قسم کے درخت اور باغات لگانے کی تعلیم دے تو یقیناً اس کے نتیجہ میں اس کے ماننے والوں کو روٹی ملنے لگ جائے گی اور وہ لوگ جو نبی کے تابع نہیں ہونگے اگر وہ زبان سیکھنے سے انکار کر دیں گے تو گونگے رہیں گے۔ اور اگر کھیتی باڑی نہیں کرینگے یا کپڑا بننا نہیں سیکھیں گے یا کنوئیں نہیں کھودیں گے تو بھوکے اور پیاسے اور ننگے رہیں گے۔ یہ فنون ابتدائی دَور میں خواہ کیسی ہی ابتدائی شکل میں ہوں۔ خواہ کھال سے وہ اپنا ننگ ڈھانکتے ہوں یا پھلوں پر ان کا گذارہ ہوتا ہو اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو لوگ اِس

نظام کے ماتحت آ جائیں گے وہ بھوک اور پیاس اور ننگ سے بچ جائیں گے۔ لیکن باوجود اس کے پھر بھی ایک طبقہ ایسا رہ جاتا ہے جو غریب ہو۔ کیونکہ حوادث آتے ہیں اور انسان کو بے دست و پا بنا دیتے ہیں۔ فرض کرو۔ دنیا کے پردہ پر ایک ہی انسان ہو کشمیر بھی اس کے قبضہ میں ہے۔ ہزارہ بھی اس کے قبضہ میں ہے۔ کابل کی وادیاں بھی اس کے قبضہ میں ہیں اور اس طرح دنیا کے سارے انگور ساری ناشپاتیاں، سارے سیب اور سارے آم اس کے قبضہ میں ہیں۔ لیکن اس کے ہاتھ بھی کٹے ہوئے ہیں اور پیر بھی کٹے ہوئے ہیں تو وہ اس دولت سے فائدہ نہیں اٹھا سکیگا۔ اور پھر بھی بھوکا اور پیاسا رہیگا پس ابتدائی زمانہ میں باوجودیکہ دولت موجود تھی دنیا اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی کیونکہ اُسے فنون نہیں آتے تھے جب آدمؑ کے ذریعہ دنیا نے فنون سیکھے اور اُن کی بھوک اور پیاس اور لباس کی دقت دُور ہوئی تو پھر بھی ایک طبقہ ایسا رہ گیا جو ان چیزوں سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جیسے لولے۔ لنگڑے اور اپاہج وغیرہ اب چاہے ساری دنیا میں صرف پندرہ آدمی ہوں اور دو لولے ہوں پھر بھی دو لولے اپنی بھوک اور پیاس کیسے دُور کر سکتے ہیں جب تک اِن پندرہ میں کوئی نظام موجود نہ ہو اور وہ اِن لُولوں لنگڑوں کی بھوک اور پیاس دُور کرنے کا ذمہ وار نہ ہو۔ آدمؑ کی نبوت کی بنیاد اصل میں اُن ابتدائی تعلیموں پر ہی تھی جن سے انسان انسان بنا۔ آپ نے بنی نوع انسان کو زبان سکھائی۔ مختلف قسم کے فنون کی تعلیم دی۔ تمدن کے اصول بتائے۔ انہیں بتایا کہ آپس میں ملکر رہنا چاہیئے اور اگر کوئی غریب یا لولا لنگڑا ہو تو اس کی مدد کرنی چاہیئے جب اس قسم کی سوسائٹی قائم ہو جائیگی۔ تو ہم

کہہ سکیں گے کہ یہ سوسائٹی نہ بھوکی رہیگی نہ ننگی اور نہ پیاسی۔ اگر کوئی لولا لنگڑا ہوگا تو دوسرے لوگ اُسکی مدد کرینگے۔ اور اگر لوگ بھوکے ہونگے تو وہ زراعت اور باغبانی اور کان کنی کے ذریعہ اپنی اس تکلیف کو دُور کر سکیں گے اور اس طرح دنیا کو روپیہ بھی مل جائیگا۔ اور اُن کی تکالیف بھی دُور ہو جائینگی۔ پس غربت کا مسئلہ اس زمانہ کی پیداوار نہیں بلکہ جب سے انسان اس دنیا میں پیدا ہوا ہے اُس وقت سے یہ سوال زیر بحث چلا آیا ہے۔ جب ساری دنیا کے مالک صرف دو چار گھرانے تھے تب بھی غربت موجود تھی اور تب بھی ایک قانون کی ضرورت تھی اسی لئے حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ بنی نوع انسان کو پیغام دیا گیا کہ اگر تم اِن قواعد کی پابندی کروگے تو بھوکے اور پیاسے نہیں رہوگے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ آدمؑ کے زمانہ میں بھی جب صرف چند آدمی تھے ممکن تھا کہ لوگ بھوکے رہیں۔ ممکن تھا کہ وہ پیاسے رہیں اور ممکن تھا کہ وہ ننگے پھریں۔ پھر لوگ بڑھنے شروع ہوئے۔ پندرہ سے بیس اور بیس سے سَو سَو سے ہزار۔ ہزار سے دسہزار اور دسہزار سے لاکھ تک تعداد جا پہنچی اور بڑھتے بڑھتے اب تو دو اڑہائی ارب تک آبادی پہنچ چکی ہے۔ مگر جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے پندرہ آدمیوں کی صورت میں بھی دنیا بھوکی اور ننگی رہ سکتی تھی۔ سو آدمیوں کی صورت میں بھی دُنیا بھوکی اور ننگی رہ سکتی تھی۔ ہزار اور لاکھ آدمیوں کی صورت میں بھی دنیا بھوکی اور ننگی رہ سکتی تھی۔ بھوک اور ننگ کی بنیاد دیکھتے پر نہیں ہوتی یہ ایک غلط خیال ہے جو لوگوں میں پیدا ہو گیا ہے کہ غربت آبادی کی کثرت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ غربت اور امارت کا دارو مدار اس امر پر ہے کہ قانون قدرت نے زمین میں جو خزانے مخفی رکھے ہیں انسان اُنکو کس حد تک

استعمال کرنا ہے اور کس حد تک اُن کے استعمال کرنے کی عقل اور سمجھ رکھتا ہے۔ مثلاً اگر سونا ہو اور غلّہ نہ ہو تو محض سونے سے لوگوں کی بھوک دُور نہیں ہوسکیگی یا اگر غلّہ بھی آجائے مگر روٹی پکانی نہیں آتی تو پھر بھی انسان بھوکا رہیگا۔ ایسی صورت میں ضروری ہوگا کہ کچھ مددگار ہوں کچھ لوگ کمانے والے ہوں اور کچھ لوگ پکانے والے ہوں۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کا سِلسلہ قائم کیا ہے۔ غرض کئی قدم ہوتے ہیں جب تک وہ سارے کے سارے مہیّا نہ ہوں انسان بھوک اور ننگ سے بچ نہیں سکتا۔ یہ دَور ابتدائے عالم سے چلتا چلا آیا ہے ایک زمانہ ایسا تھا جب بنی نوع انسان کے پاس ذرائع آمد زیادہ ہوتے تھے اور کم حصّہ مجبوریوں میں گرفتار ہوتا تھا۔ مثلاً اگر ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے لوگوں کو دیکھا جائے یا اُن لوگوں کی تعداد معلوم کی جائے جو بڑھاپے اور بیماریوں کی وجہ سے کسی کام کے قابل نہیں رہتے تو وہ کتنے ہونگے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک دو فیصدی سے زیادہ نہیں ہونگے۔ لیکن کام نہ ملنے کی وجہ سے ہزار میں سے نو سو بھی بیکار ہوسکتے ہیں۔ جب کسی ملک کی آبادی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ذرائع آمد ترقی نہیں کرتے تو دس میں سے بعض دفعہ نو بیکار پھرتے ہیں۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ معذور ہوتے ہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں کام نہیں ملتا۔ پس جب دنیا کی آبادی بڑھ گئی۔ تو یہ سوال نہ رہا کہ زمین میں سے دولت کس طرح نکالی جائے بلکہ اس سوال کی صورت بالکل بدل گئی۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے تھے کہ باوجود اپنا سارا زور صرف کرنے کے کام سے محروم رہتے تھے۔ ایسی حالت میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ نئے کام نکالے جائیں غرض یہ دَور اسی طرح چلتے چلے آئے ہیں اور دُنیا نے فقر و فاقہ کی تکالیف دُور کرنے کے لئے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کیں۔ چنانچہ کبھی ایسا دَور آیا کہ لوگوں نے یہ فیصلہ کر دیا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندہ رہنے کے قابل ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوتے جیسے ہندوستان میں شودروں کی کثرت تھی مگر برہمنوں اور کھشتریوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اِن لوگوں کا کوئی حق نہیں کہ دنیا میں زندہ رہیں۔ یہ اگر مرتے ہیں تو بیشک مریں۔ چنانچہ انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور شودروں کا کوئی حق متمدن زندگی میں تسلیم نہ کیا گیا۔ پھر بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس مصیبت کا علاج صدقہ وخیرات ہے۔ جن کے پاس زیادہ مال ہو انہیں چاہیئے کہ وہ غرباء کی مدد کر دیا کریں۔

غرض مختلف تدابیر اپنے اپنے رنگ میں اختیار کی گئیں۔ مگر کوئی بھی تدبیر ایسی کامل نہیں تھی جس سے اِس مصیبت کو کُلّیتہً دُور کیا جا سکتا۔ اسلام ہی تھا جس نے اس سوال کا صحیح معنوں میں حل کیا۔ اور اس نے فیصلہ کیا کہ اس قسم کا صدقہ کوئی چیز نہیں ایک معیّن اور منظم صورت میں غرباء کی بہبودی کا انتظام ہونا چاہیئے چنانچہ اس کے لئے اُس نے زکوٰۃ اور عُشر کا طریق جاری کیا۔ جس میں امراء سے باقاعدہ ایک نظام کے ماتحت روپیہ لیا جاتا اور غرباء کی ضروریات پر صرف کیا جاتا۔ پھر اُس نے خبرگیری کے طریق بھی معیّن کر دیئے یُوں تو پہلے بھی حکومتیں ٹیکس لیا کرتی تھیں۔ مگر ان کا خرچ معیّن نہیں تھا۔ اسلام نے

اوّل آمد پر ایک مقرر حصّہ ادا کرنا واجب کر دیا اور اس امر کا فیصلہ کیا کہ امراء سے بہرحال اتنا روپیہ لے لیا جائے۔ دوسری طرف اس نے خرچ معیّن کر دیا اور اس طرح غرباء کے گزارہ کی صورت پیدا کر دی۔ آمد اور خرچ سے تعلق رکھنے والے یہ دو نقطے ایسے ہیں جو اسلام سے پہلے اور کسی قوم میں نہیں پائے جاتے تھے زکوٰۃ یہودیوں میں بھی ہے مگر ناقص صورت میں [1]

[1] دیکھو خروج باب ۲۳ - آیت ۱۰ و ۱۱)

لیکن اسلام نے اس قانون کو مدون کرکے ایک ایسا عظیم الشان نظام قائم فرمایا جو ہمارے لئے ہر تاریکی کی گھڑی میں شمع ہدایت کا کام دیتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اس نظام کی پوری اہمیت نہ سمجھی اور لدھیانے کے بڈھے دریا کی طرح یہ نظام بھی ریت میں غائب ہوگیا۔ اور مسلمان اس سے کلیتہً غافل ہوگئے۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر پہلا کام ہی یہ کیا تھا کہ جائیداد والوں کو بے جائیداد والوں کا بھائی بنادیا۔ انصارؓ جائیدادوں کے مالک تھے اور مہاجرؓ بے جائیداد تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارؓ اور مہاجرینؓ دونوں میں مواخات قائم فرمادی۔ اور ایک ایک جائیداد والے کو ایک ایک بے جائیداد والے سے ملادیا اور اس میں بعض لوگوں نے اتنا غلو کیا کہ دولت تو الگ رہی بعض کی اگر دو بیویاں تھیں تو انہوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کی خدمت میں یہ پیشکش کی کہ وہ اُن کی خاطر اپنی ایک بیوی کو طلاق دینے کیلئے تیار ہیں۔ وہ اُن سے بیشک شادی کرلیں۔ یہ مساوات کی پہلی مثال تھی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جاتے ہی قائم فرمائی۔ کیونکہ حکومت کی بنیاد دراصل مدینہ میں ہی پڑی تھی۔ اس زمانہ میں زیادہ دولتیں نہ تھیں یہی صورت تھی کہ امیر اور غریب کو اس طرح ملادیا جائے کہ ہر شخص کو کھانے کے لئے کوئی چیز مل سکے۔ پھر ایک جنگ کے موقعہ پر بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس طریق کو استعمال فرمایا۔ گو اس کی شکل بدل دی ایک جنگ کے موقعہ پر آپ کو معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کے پاس کھانے کو کوئی چیز نہیں رہی یا اگر ہے تو بہت ہی کم اور بعض کے پاس کافی چیزیں ہیں۔ تو یہ صورتِ حالات دیکھ کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس جس کے پاس جو کوئی چیز ہے وہ لے آئے اور ایک جگہ جمع کردی جائے۔ چنانچہ سب چیزیں لائی گئیں اور آپ نے راشن مقرر کردیا۔ گویا یہاں بھی وہی طریق آگیا کہ سب کو کھانا ملنا چاہیئے۔ جبتک ممکن تھا سب لوگ الگ الگ کھاتے رہے مگر جب یہ امر ناممکن ہوگیا اور خطرہ پیدا ہوگیا کہ بعض لوگ بھوکے رہنے لگ جائیں گے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب تمہیں علیحدہ کھانے کی اجازت نہیں اب سب کو ایک جگہ سے برابر کھانا ملیگا۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اِس حکم پر ہم نے اس سختی سے عمل کیا کہ اگر ہمارے پاس ایک کھجور بھی ہوتی تو ہم اس کا کھانا سخت بد دیانتی سمجھتے تھے اور اس وقت تک چین نہیں لیتے تھے جب تک کہ اس کو سٹور میں داخل نہیں کردیتے تھے۔ یہ دوسرا نمونہ تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دولت بھی آئی اور خزانوں کے منہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیئے۔

مگر اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ اس بارہ میں تفصیلی نظام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جاری ہو تا لوگ یہ نہ کہدیں کہ یہ صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔ کوئی اور شخص اسے جاری نہیں کرسکتا چنانچہ اِدھر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے ہاتھ سے ایک نمونہ قائم کردیا اور اُدھر مدینہ پہنچتے ہی انصارؓ نے اپنی دولتیں مہاجرین کے سامنے پیش کردیں۔ مہاجرین نے کہا ہم یہ زمینیں مفت میں لینے کے لئے تیار نہیں ہم ان زمینوں پر بطور مزارع کام کرینگے اور تمہارا حصّہ تمہیں دیں گے۔ لیکن یہ مہاجرین کی طرف سے اپنی ایک خواہش کا اظہار تھا۔ انصارؓ نے اپنی جائیدادوں کے دینے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ یہ ایسی ہی بات ہے۔ جیسے گورنمنٹ راشن دے

توکوئی شخص نہ لے۔ اِس سے گورنمنٹ زیرِ الزام نہیں
آئیگی۔ یہی کہا جائیگا کہ گورنمنٹ نے تو راشن مقرر کر
دیا تھا۔ اب دوسرے شخص کی مرضی تھی کہ وہ چاہے
لیتا یا نہ لیتا۔ اِسی طرح انصارؓ نے سب کچھ دیدیا
تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ مہاجرینؓ نے نہ لیا۔ غرض
عملی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام اپنی
زندگی میں ہی شروع فرما دیا تھا۔ یہاں تک کہ جب
بحرین کا بادشاہ مسلمان ہُوا تو آپؐ نے اُسے ہدایت
فرمائی کہ تمہارے ملک میں جن لوگوں کے پاس گذارہ کے
لئے کوئی زمین نہیں ہے تم اُن میں سے ہر شخص کو چار درہم
اور لباس گذارہ کے لئے دو تاکہ وہ بھوکے اور ننگے
نہ رہیں[1]۔ اس کے بعد مسلمانوں کے پاس دولتیں
آنی شروع ہوگئیں۔ چونکہ مسلمان کم تھے اور دولت
زیادہ تھی اس لئے کسی نئے قانون کے استعمال کی اُس
وقت ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ کیونکہ جو غرض تھی
وہ پوری ہو رہی تھی۔ اصول یہ ہے کہ جب خطرہ ہو
تب قانون جاری کیا جائے اور جب نہ ہو اُس وقت
اجازت ہے کہ حکومت اس قانون کو جاری کرے یا
نہ کرے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات
پاگئے اور مسلمان دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلنے شروع
ہوئے تو اُس وقت غیر قومیں بھی اسلام میں شامل
ہوگئیں۔ عرب لوگ تو ایک جتھہ اور ایک قوم کی شکل
میں تھے اور وہ آپس میں مساوات بھی قائم رکھتے تھے
جب اسلام مختلف گوشوں میں پہنچا اور مختلف قومیں
اسلام میں داخل ہونی شروع ہوئیں تو اُن کے لئے روٹی
کا انتظام بڑا مشکل ہوگیا۔ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ
نے تمام لوگوں کی مردم شماری کرائی اور راشننگ سسٹم
قائم کر دیا۔ جو بنو امیہ کے عہد تک جاری رہا۔ یورپین
مؤرخ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے پہلی مردم شماری
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کرائی تھی۔ اور وہ یہ بھی
تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے یہ سب سے پہلی مردم شماری
رعایا سے دولت چھیننے کے لئے نہیں بلکہ اُن کی غذا
کا انتظام کرنے کے لئے جاری کی تھی۔ اور حکومتیں
تو اس لئے مردم شماری کراتی ہیں کہ لوگ قربانی کے
بکرے بنیں اور فوجی خدمات بجا لائیں۔ مگر حضرت عمرؓ
نے اس لئے مردم شماری نہیں کرائی کہ لوگ قربانی کے
بکرے بنیں بلکہ اس لئے کرائی کہ اُن کے پیٹ میں
روٹی ڈالی جائے۔ چنانچہ مردم شماری کے بعد تمام
لوگوں کو ایک مقررہ نظام کے ماتحت غذا ملتی اور
جو باقی ضروریات رہ جاتیں اُن کے لئے انہیں ماہوار
کچھ رقم دے دی جاتی اور اس بارہ میں اتنی احتیاط سے
کام لیا جاتا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام
فتح ہُوا اور وہاں سے زیتون کا تیل آیا تو آپ نے
ایک دفعہ لوگوں سے کہا کہ زیتون کے استعمال سے
میرا پیٹ پھول جاتا ہے۔ تم مجھے اجازت دو تو میں
بیت المال سے اتنی ہی قیمت کا گھی لے لیا کروں[2]
غرض یہ پہلا قدم تھا جو اسلام میں لوگوں کی ضروریات
کو پورا کرنے کے لئے اٹھایا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر
یہ نظام قائم ہو جائے تو اس کے بعد کسی اَور نظام
کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ سارے ملک کی ضروریات
کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔ اُن کا کھانا۔ اُن کا پینا۔ اُن کا پہننا
اُن کی تعلیم اُن کی بیماریوں کا علاج اور انکی رہائش کے
لئے مکانات کی تعمیر یہ سب کا سب اسلامی حکومت
کے ذمہ ہوگا۔ اور اگر یہ ضروریات پوری ہوتی رہیں۔
تو کسی بیمہ وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر بدقسمتی سے
بعد میں آنے والوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بادشاہ کی

[1] السیرۃ النبویہ بر حاشیہ السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ صفحہ ۶۹
[2] سیرۃ ابن عمر الخطاب لابن الجوزی صفحہ ۹۳

مرضی پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو کچھ دے دے اور چاہے تو نہ دے۔ اور چونکہ اسلامی تعلیم ابھی پورے طور پر راسخ نہیں ہوئی تھی وہ لوگ پھر قیصر و کسریٰ کے طریق کی طرف مائل ہو گئے۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ بڈھا دریا جو ریت میں غائب ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے پھر میرے دل میں از سرِ نو جاری کیا۔ مَیں وہ پہلا شخص ہوں جس نے قرآن کریم کی یہ تعلیم لوگوں کے سامنے رکھی۔ مسلمان مجھ سے کثرت کے ساتھ پوچھا کرتے ہیں۔ کالجوں کے پروفیسر اور طلباء بھی سوال کیا کرتے ہیں کہ اگر اسلامی تعلیم یہی تھی تو پھر یہ غائب کیوں ہو گئی؟ اور مَیں ہمیشہ انہیں کہا کرتا ہوں کہ اس تعلیم کا غائب ہونا ہی بتاتا ہے کہ یہ الٰہی تعلیم تھی۔ اگر یہ انسانی تعلیم ہوتی تو لوگوں کے دلوں میں ضرور قائم رہتی۔ کیونکہ انسانی تعلیم کو قبول کرنے کیلئے لوگوں کے دماغ تیار ہو چکے ہوتے ہیں اور ماحول مناسب ہوتا ہے۔ پس اس کا غائب ہونا ہی بتا رہا ہے کہ یہ تعلیم خدا کی طرف سے آئی تھی۔ وہ ایک دفعہ لہر کی صورت میں اُٹھی اور پھر اس میں انحطاط واقع ہو گیا۔ اب مقدر یہ ہے کہ پھر دوبارہ اس کی لہر بلند ہو اور اس کی دوسری لہر پہلی لہر سے زیادہ اونچی ہو۔ قانونِ قدرت پر غور کر کے دیکھ لو۔ اس میں یہی نظارہ نظر آئیگا۔ بچپن میں جب ابھی میں نے پہاڑ نہیں دیکھا تھا مَیں یہ خیال کیا کرتا تھا کہ پہاڑ مینار کی طرح ہوتا ہوگا اور رسہ پکڑ کر اوپر چڑھنا پڑتا ہوگا مگر جب میں پہلی دفعہ شملہ گیا تو مَیں نے دیکھا کہ پہلے ایک ٹیلہ آتا ہے اس کے بعد دوسرا ٹیلا آتا ہے۔ پھر تیسرا ٹیلہ آتا ہے۔ اور ہر ٹیلہ پہلے ٹیلے سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔ مگر ہر ٹیلے کے بعد ایک انحطاط بھی ہوتا ہے۔ جب انسان پہلے ٹیلے پر قدم رکھتا ہے تو اُس کے بعد اُسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مَیں اَب نیچے جا رہا ہوں۔ مگر درحقیقت وہ پہلی سطح سے اونچا ہو رہا ہوتا ہے۔ پھر دوسرے ٹیلے کے بعد جب نیچے اُترتا ہے۔ تو پھر اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب مَیں نچلی طرف جا رہا ہوں مگر حقیقت میں اُس کا قدم اونچا اُٹھ رہا ہوتا ہے۔ اِسی طرح قدم بقدم ارتقاع اور انحطاط کے دَوروں میں سے گذرتے ہوئے وہ بہت بلند پہاڑ پر چڑھ جاتا ہے۔ جس طرح قانونِ قدرت میں ہمیں یہ نظارہ نظر آتا ہے۔ اِسی طرح انسانی دماغوں کا ارتقاء بھی ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اُسوقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے براہ راست فیوض حاصل کرنے کے نتیجہ میں یہ تعلیم لوگوں نے اپنا لی۔ مگر چونکہ دماغی ارتقاء بھی لہروں کی صورت میں چلتا ہے اسلئے پہلی لہر کے بعد اُس میں ایک انحطاط کی صورت واقع ہو گئی۔ اب دوسری لہر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ بلند ہوئی ہے۔ اور یہ لہر قانونِ قدرت کے مطابق پہلی لہر سے زیادہ بلند ہو گی۔ مگر بہرحال ہر لہر کے بعد ایک انحطاط بھی آتا ہے اور لوگ اصل تعلیم کو بھول جاتے ہیں۔ جبتک یہ چیز قائم ہے اُسوقت تک کسی انشورنس وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ انشورنس کی غرض آخر کیا ہوتی ہے۔ یہی کہ اگر ہم مر جائیں تو ہمارے بیوی بچوں کو روٹی ملتی رہے۔ کپڑا ملتا رہے۔ سامانِ خورد و نوش اور مکان ملتا رہے۔ جب حکومت ان تمام چیزوں کی ذمہ دار ہوگی تو انشورنس کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی کیونکہ سارو ں کو مکان بھی مل رہا ہوگا۔ غذا بھی مل رہی ہوگی۔ کپڑا بھی مل رہا ہوگا۔ انکی تعلیم کا بھی انتظام ہو رہا ہوگا۔ اور اُن کی بیماریوں کا علاج بھی ہو رہا ہوگا۔ یہی وہ قومی اخراجات ہیں جن کی ادائیگی کے لئے اسلام نے زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کا

وسیع نظام جاری فرمایا ہے۔ اور مومنوں کی علامت ہی
اُس نے یہ بتائی ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور
اِس طرح مخلوق کی خدمت کرکے خالق کی محبت کو حاصل
کرتے ہیں۔ دنیا میں بہترین ذریعہ کسی کی محبت حاصل کرنیکا
یہی ہوتا ہے کہ اس کے کسی عزیز سے محبت کی جائے
ریلوے سفر میں روزانہ یہ نظارہ نظر آتا ہے کہ پاس
بیٹھے ہوئے دوست کے بچہ کو ذرا پچکار دیں یا اُسے
کھانے کے لئے کوئی چیز دے دیں تو تھوڑی دیر کے بعد
ہی اُس کا باپ اُس سے محبت کی باتیں کرنے لگ جاتا
ہے کہ گویا وہ اُس کا بہت پُرانا دوست ہے۔ یہی
طریق روحانی دُنیا میں بھی جاری ہے۔ جب انسان
بنی نوع انسان کی بھوک اور اُن کے افلاس کو دُور کرنے
کے لئے اپنا روپیہ خرچ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ
چونکہ یہ میرے پیاروں کی خدمت کرتا ہے اِس لئے اسے
بھی میرے پیاروں میں داخل کرلیا جائے۔ حدیثوں میں
آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بعض لوگوں سے
کہیگا کہ دیکھو مَیں بیمار تھا مگر تم لوگ میری عیادت
کے لئے نہ آئے۔ مَیں بھوکا تھا۔ مگر تم نے مجھے کھانا نہ
کھلایا۔ مَیں ننگا تھا۔ تم نے مجھے کپڑا نہ دیا۔ اِس پر وہ
بندے کہیں گے کہ اے ہمارے رب! تُو کس طرح بیمار
ہو سکتا تھا یا تُو کس طرح بھوکا اور ننگا ہو سکتا تھا
تُو تو اِن تمام نقائص سے منزہ ہے۔ اِس پر اللہ تعالیٰ
فرمائیگا کہ جب میرے بندوں میں سے بعض لوگ بیمار
تھے یا بعض لوگ بھوکے اور ننگے تھے اور تم نے اُن کی
تیمارداری نہ کی نہ انہیں روٹی کھلائی اور نہ اُن کا ننگ
ڈھانکنے کے لئے انہیں کپڑا دیا تو تم نے انہیں اِن
چیزوں سے محروم نہیں کیا بلکہ مجھے محروم کیا۔ پس
زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم ترین رُکن ہے جس کو نظرانداز
کرنا انسان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنا دیتا ہے۔
کیونکہ ایسا انسان غرباء کے حقوق کو نظرانداز کرنے
والا ہوتا ہے۔

پھر فرماتا ہے مومنوں کی ایک علامت یہ بھی
ہے کہ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ وہ آخرت پر
کامل یقین رکھتے ہیں۔ یعنی وہ قربانیاں کرتے اور
کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اِس امر کی کوئی پرواہ نہیں کرتے
کہ اِن قربانیوں کا پھل انہیں زندگی میں بھی ملتا ہے یا
نہیں ملتا۔ کیونکہ وہ آنے والی زندگی پر یقین رکھتے
ہیں اور یہ یقین اُن کے اندر اتنی جرأت پیدا کردیتا ہے
کہ وہ قربانیوں کی آگ میں اپنے آپ کو بلا دریغ
جھونک دیتے ہیں۔

دنیا میں بھی جب ایک سپاہی لڑائی میں جاتا ہے
تو آخر کونسے فائدہ کے لئے جاتا ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ
میں مارا جاؤں گا اور بسا اوقات وہ مارا جاتا ہے مگر
فائدہ اُس کی قوم اُٹھاتی ہے۔ اِسی طرح ماں جب اپنے
بچے کو اپنا خون چُوسا رہی ہوتی ہے تو اُسے کیا فائدہ
حاصل ہو رہا ہوتا ہے۔ دودھ کا ایک ایک گھونٹ ماں کے خون سے بنتا ہے بس
ایک ایک گھونٹ جو بچے کے گلے سے اترتا ہے وہ درحقیقت ماں کا
خون ہوتا ہے جسے وہ چُوستا ہے۔ اگر تمہاری ماں
تمہارے مونہہ میں اپنا دودھ نہ ڈالتی۔ اگر تمہاری ماں
بھی یہی کہتی کہ مَیں اپنا خون کیوں چُوسنے دوں تو تم
زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ تمہاری ماں نے تمہیں اپنا خون
دیا اِس لئے کہ تم زندہ رہو۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ
تم اپنا خون گراؤ تاکہ تمہاری اولاد اور تمہاری قوم اور
تمہارا ملک زندہ رہے۔

بدر کی جنگ میں جو صحابیؓ شہید ہوئے تھے اُن
صحابیوںؓ نے دُنیا کا کونسا سُکھ دیکھا تھا۔ انہوں نے
اپنے ماں باپ کو چھوڑا اور اپنے رشتہ داروں کو چھوڑا
اپنے ساتھیوں کو چھوڑا اور پھر تیرہ برس تک کفار کے

سخت ترین مظالم کا نشانہ بننے کے بعد ایک دُکھتے ہوئے دل کے ساتھ) ایک رِستے ہوئے زخم کے ساتھ انہوں نے مکّہ کو بھی چھوڑ دیا اِس اُمید کے ساتھ کہ انہیں پھر مکّہ کی زیارت نصیب ہو گی۔ مگر ابھی ہجرت پر ڈیڑھ سال بھی نہیں گذرا تھا کہ وہ اپنے وطن سے دُور۔ پُرانے وطن سے بہت دُور اور نئے وطن سے بھی میلوں دُور ایک تپتے ہوئے ریت کے جنگل میں کفار کی تلوار سے کٹ کٹ کر تڑپنے لگ گئے۔ اُن کے سر ایک طرف تھے اور دھڑ دوسری طرف۔ اگر یہ لوگ بھی یہی کہتے کہ ہم نے قربانی کرکے کیا لینا ہے پھل تو دوسرے لوگوں نے کھانا ہے تو اسلام کو وہ شان و شوکت جو بعد میں اُسے حاصل ہوئی کہاں حاصل ہو سکتی تھی۔

اِسی طرح جنگِ اُحد کا ایک واقعہ ہے۔ جنگ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی ابن کعبؓ کو فرمایا کہ جاؤ اور زخمیوں کو دیکھو۔ وہ دیکھتے ہوئے حضرت سعد بن ربیعؓ کے پاس پہنچے جو سخت زخمی تھے اور آخری سانس لے رہے تھے۔ انہوں نے اُن سے کہا کہ اپنے متعلقین اور اعزاء کو اگر کوئی پیغام دینا ہو تو مجھے دیدیں۔ حضرت سعدؓ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں منتظر ہی تھا کہ کوئی مسلمان اِدھر آئے تو پیغام دوں۔ تم میرے ہاتھ میں ہاتھ دیکر وعدہ کرو کہ میرا پیغام ضرور پہنچا دو گے۔ اور اس کے بعد انہوں نے جو پیغام دیا وہ یہ تھا کہ میرے بھائی مسلمانوں کو میرا سلام پہنچا دینا اور میری قوم اور میرے رشتہ داروں سے کہنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس خدا تعالیٰ کی ایک بہترین امانت ہیں۔ اور ہم اپنی جانوں سے اس امانت کی حفاظت کرتے رہے ہیں۔ اب ہم جاتے ہیں اور اس امانت کی حفاظت تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اِس کی حفاظت میں کمزوری دکھاؤ۔ دیکھو ایسے وقت جب انسان سمجھتا ہو کہ مَیں مر رہا ہوں۔ کیا کیا خیالات اُس کے دل میں آتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے میری بیوی کا کیا حال ہو گا۔ میرے بچوں کو کون پوچھے گا۔ مگر اُس صحابی نے کوئی ایسا پیغام نہ دیا۔ صرف یہی کہا۔ کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے اِس دنیا سے جاتے ہیں تم بھی اِسی راستہ سے ہمارے پیچھے آجاؤ۔ ان لوگوں کے اندر یہی ایمان کی طاقت تھی جس سے انہوں نے دُنیا کو تہ و بالا کر دیا اور قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیئے۔ قیصر روم حیران تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ کسریٰ نے اپنے سپہ سالار کو لکھا کہ اگر تم اِن عربوں کو بھی شکست نہیں دے سکتے تو پھر واپس آجاؤ اور گھر میں چوڑیاں پہن کر بیٹھو یہ گوہ کھانے والے لوگ ہیں اِن کو بھی تم نہیں روک سکتے۔ اُس نے جواب دیا کہ یہ تو آدمی معلوم ہی نہیں ہوتے۔ یہ تو کوئی بلا ہیں۔ یہ تلواروں اور نیزوں کے اوپر سے کودتے ہوئے آتے ہیں

یہ جرأت مردوں پر ہی موقوف نہیں۔ مجھے تو ایک ماں کی قربانی پر حیرت آتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب عراق میں قادسیہ کے مقام پر جنگ جاری تھی۔ تو کسریٰ میدان جنگ میں ہاتھی لایا۔ اونٹ ہاتھی سے ڈرتا ہے اِس لئے وہ انہیں دیکھ کر بھاگتے تھے اور اس طرح مسلمانوں کو بہت نقصان ہوا اور بہت سے مسلمان مارے گئے۔ آخر ایک دن مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ ہو آج ہم میدان سے ہٹیں گے نہیں۔ جب تک دشمن کو شکست نہ دے لیں ایک عورت حضرت خنساء اپنے چار بیٹوں کو لے کر میدان جنگ میں آئیں اور اُن کو مخاطب کر کے کہنے لگیں کہ پیارے بیٹو! تمہارے باپ نے اپنی زندگی میں

ساری جائداد تباہ کر دی تھی ۔ اور مجھے مجبور
کیا کہ میں اپنے بھائی سے کہوں کہ وہ مجھے حصہ دے
چنانچہ میں اُس کے پاس گئی ۔ اُس نے میرا بڑا اعزاز کیا ۔
بڑی دعوت کی اور پھر اپنی جائیداد میں سے آدھی مجھے
بانٹ دی ۔ میں وہ لے کر چلی گئی ۔ تو تمہارے باپ سے
میں نے کہا ۔ کہ اب تو آرام سے گذارہ کرو ۔ مگر اُس نے
پھر اُسے بھی برباد کر دیا ۔ اور پھر مجبور کرکے میرے بھائی
کے پاس مجھے بھیجا ۔ پھر میں اُس کے پاس گئی ۔ اُس نے
پھر میرا اعزاز و احترام کیا ۔ اور پھر بقیہ میں سے مجھے
آدھی جائیداد بانٹ دی مگر وہ بھی تمہارے باپ نے برباد
کر دی اور پھر مجھے مجبور کیا کہ اپنے بھائی سے جاکر حصّہ
لوں ۔ چنانچہ میں پھر بھائی کے پاس گئی اور اُس نے پھر
بقیہ جائیداد بانٹ دی مگر وہ بھی تمہارے باپ نے
برباد کر دی اور جب تمہارا باپ مرا تو اُس نے کوئی
جائیداد نہ چھوڑی ۔ میں اُس وقت جوان تھی ۔ تمہارے
باپ کی کوئی جائیداد نہ تھی ۔ پھر اپنی زندگی میں اُس نے
میرے ساتھ کوئی حسن سلوک بھی نہ کیا تھا ۔ اور اگر عرب
کے رسم و رواج کے مطابق میں بدکار ہو جاتی تو کوئی اعتراض
کی بات نہ تھی ۔ مگر میں نے اپنی تمام عمر نیکی سے گذاری
اب کل فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے ۔ میرے تم پر
بہت سے حقوق ہیں ۔ کل کفر اور اسلام میں مقابلہ ہو گا
اگر تم فتح حاصل کئے بغیر واپس آئے ۔ تو میں خدا تعالیٰ کے
حضور کہونگی کہ میں ان کو اپنا کوئی بھی حق نہیں بخشتی ۔
اس طرح اس نے اپنے چاروں بیٹوں کو جنگ میں تیار
کرکے بھیج دیا ۔ اور پھر گھبرا کر خود جنگل میں چلی گئی اور
وہاں تنہائی میں سجدہ میں گر کر اور رو رو کر اللہ تعالیٰ سے
دُعائیں مانگنے لگی ۔ اور دُعا یہ کی کہ اے میرے خدا میں نے
اپنے چاروں بیٹوں کو دین کی خاطر مرنے کیلئے بھیجدیا ہے
لیکن تجھ میں یہ طاقت ہے کہ اُن کو زندہ واپس لے آئے
چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ مسلمانوں کو فتح بھی
ہو گئی اور اُس کے چاروں بیٹے بھی زندہ واپس آ گئے
یہ جرأت اور بہادری ایمان بالآخرۃ ہی کا نتیجہ تھی ۔
یہ لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا کی نجات اسلام سے وابستہ ہے
اور ہم خواہ مارے بھی جائیں تب بھی پرواہ نہیں کیونکہ
دنیا بچ جائیگی ۔ اور اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے گا
بیشک ایک کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ آج تو اسلام
کو کہیں غلبہ حاصل نہیں ۔ مگر اس تنزل کے زمانہ میں بھی
اُن لوگوں کی قربانیوں نے ہی مسلمانوں کو یہ عظمت دی
ہوئی ہے کہ اسلام کا نام بوجہ اس کثرت کے جو مسلمانوں
کو حاصل ہے دنیا کے تمام لوگ ادب کے ساتھ لینے
پر مجبور ہیں ۔ یہ رُعب مسلمانوں کو کہاں سے حاصل ہوا ۔ یہ
انہی لوگوں کی قربانیوں کے نتیجہ میں حاصل ہوا ۔ جو بسا اوقات
فاقہ سے رات کو سوئے اور بسا اوقات فاقہ سے ہی صبح کو اُٹھے بسا اوقات اگر
انکی پگڑی پھٹی ہوئی ہوتی تھی تو انہیں پہننے کیلئے دوسری پگڑی نہیں ملتی
تھی جوتی پھٹی ہوئی ہوتی تھی تو انہیں پہننے کیلئے دوسری جوتی نہیں
ملتی تھی ۔ یہ وہی رُعب ہے جو تمہارے باپ دادا
کی قربانی کے نتیجہ میں تمہیں حاصل ہُوا ۔ کہتے ہیں نام
بڑا ہوتا ہے کام بڑا نہیں ہوتا ۔ اب کام عام طور پر
مسلمانوں کے چھوٹے ہیں ۔ لیکن انہیں نام ایسا حاصل
ہو گیا ہے کہ سب لوگ اُن سے ڈرتے ہیں ۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے
تھے کہ رُستم کے گھر میں ایک دفعہ چور آ گیا ۔ رُستم اُسکا
مقابلہ کرنے کے لئے نکلا اور دونوں میں کُشتی شروع ہو گئی
چور کو یہ پتہ نہیں تھا کہ جس شخص کا وہ مقابلہ کر رہا ہے
وہی رُستم ہے ۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی رُستم کا
نوکر ہے ۔ آخر مقابلہ کرتے کرتے چور غالب آ گیا اور
وہ سینہ پر چڑھ کر رستم کی گردن کاٹنے لگا ۔ اتنے
میں رُستم نے یکدم شور مچا دیا کہ "آگیا رُستم ۔ آگیا رُستم"۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ

وہ لوگ جو اُخروی زندگی پر ایمان نہیں لاتے - ہم نے اُنکے اعمال کو اُن کیلئے خوبصورت کرکے دکھایا ہے

فَهُمْ یَعْمَهُوْنَ ۵ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ

پس وہ بہکے بہکے پھرتے ہیں - اُن کے لئے دردناک عذاب ہوگا -

وَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۶

اور وہ اُخروی زندگی میں سب سے زیادہ گھاٹا پانے والے ہونگے ۔ ۲

یَعْمَهُوْنَ

اور چور یہ سُنتے ہی اُس کے سینہ پر سے اُتر کر بھاگ گیا - حالانکہ اُس نے رُستم کو گرایا ہُوا تھا - مگر چونکہ رُستم کے نام کو ایک خاص رُعب حاصل ہو چکا تھا اِس لئے اُس نے رُستم کو تو گرا لیا - مگر رُستم کے نام کا مقابلہ نہ کر سکا اور بھاگ گیا - تو جو لوگ قربانیاں کرنیوالے ہوتے ہیں وہ دنیا میں اپنا نام چھوڑ جاتے ہیں - وہ مر جاتے ہیں مگر اُن کا نام اُن کی اولادوں کی حفاظت کرتا چلا جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگلے جہان میں جو انہیں لازوال بدلہ ملیگا اُس کا تو تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا - پس بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ مومنوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ قربانیوں کے میدان میں بڑھتے چلے جاتے ہیں کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر کامل یقین ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ قربانیاں ہماری قوم کو بھی عزت دینگی اور خود ہمارے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا موجب ہونگی - گویا وہ وسیع نتائج جو آئندہ نکلنے والے ہوتے ہیں اُن پر انہیں پورا یقین ہوتا ہے - اور وہ اس مقصد کے لئے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے -

---

۲ حل لغات - یَعْمَهُوْنَ: عَمَهَ سے نکلا ہے اور عَمِهَ یَعْمَهُ عَمَهًا وَ عُمُوْهِیَةً وَ عَمَهَانًا کے معنے ہوتے ہیں تَرَدَّدَ فِی الضَّلَالِ وَتَحَیَّرَ فِیْ مُنَازَعَةٍ اَوْ طَرِیْقٍ - گمراہی میں بھٹکا پھرا اور کسی جھگڑے میں یا راستہ میں حیران ہو گیا - یعنی پوری طرح سمجھ نہ سکا کہ اپنے حق میں کیا دلیل دے اور کس راستہ کو اختیار کرے -

علّامہ زمخشری اپنی کتاب "کشاف" میں لکھتے ہیں کہ عَمَهَ کا لفظ بھی عَمٰی کی طرح ہے - فرق صرف یہ ہے کہ یاء کے ساتھ جو عَمٰی ہے وہ آنکھوں کی بینائی کے نقدان اور عقل کی بینائی کے فقدان میں مشترک طور پر استعمال ہوتا ہے وَالْعَمَهُ خَاصٌّ بِالْبَصِیْرَةِ اور عَمِهَ جو ھ کے ساتھ ہوتا ہے وہ عقل کی بینائی کے ساتھ مخصوص ہے - گویا اہل عرب یہ کبھی نہیں کہتے کہ فلاں شخص اَعْمَهُ الْعَیْنِ ہے (اقرب) مزید تفصیل کے لئے دیکھیں تفسیر کبیر جلد سوم صلے ۲۷ -

تفسیر: - فرماتا ہے - وہ لوگ جو اُخروی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے اُن کے اعمال اُن کو خوبصورت کرکے دکھائے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے بُرے اعمال کو بھی اچھا سمجھ رہے ہیں اور گمراہی میں

بہکتے پھرتے ہیں۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفّار کی بدعملی اور اُن کے انکار کی بنیادی وجہ آخرت کا انکار قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ چونکہ یہ لوگ کسی جزا سزا کے قائل نہیں اسلئے انہیں اپنے اعمال کے متعلق کبھی فکر پیدا نہیں ہوتا اور نہ صداقت پرغور کرنے اور اپنے اعمال و کردار کا جائزہ لینے کا انہیں کبھی احساس ہوتا ہے۔ اگر انہیں یقین ہوتا کہ ہمیں ایک روز اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا پڑیگا اور ہمارے ناپسندیدہ اعمال ہمیں گرفت میں لے آئیں گے تو اُن کا رویہ بالکل اَور ہوتا اور اُن کے اندر متانت اور سنجیدگی کے جذبات نمایاں ہوتے۔ مگر اب چونکہ گرفت کا احساس ان کے اندر نہیں پایا جاتا اِس لئے اُن کے دل ایسے غبی ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے ناروا افعال میں بھی ایک لذّت اور سرور محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کو قابلِ نفرت چیز قرار دینے کی بجائے قابلِ تعریف سمجھنے لگ گئے ہیں۔ آخر دنیا میں کیوں کوئی شخص کسی سانپ کے سوراخ میں اپنا ہاتھ نہیں ڈالتا۔ کیوں وہ جلتی ہوئی آگ میں نہیں کود جاتا۔ کیوں وہ شیروں کی کچھار میں اپنے آپ کو نہیں پھینک دیتا۔ کیوں وہ زہر کا جام اپنے ہونٹوں سے نہیں لگاتا۔ اِسی لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر مَیں نے سانپ کے سوراخ میں اپنا ہاتھ ڈالا تو میری موت یقینی ہے۔ اگر میں جلتی ہوئی آگ میں کودا تو میرا جھلس جانا یقینی ہے۔ اگر مَیں نے اپنے آپکو شیروں کی کچھار میں ڈال دیا تو میری ہلاکت یقینی ہے اگر مَیں نے زہر کا پیالہ اپنے مُنہ سے لگایا تو میرا مر جانا یقینی ہے۔ پھر اگر ایسا ہی ایمان کسی شخص کا آخرت پر بھی ہو تو وہ کب کسی گناہ کا دلیری کے ساتھ ارتکاب کر سکتا ہے۔ گناہوں پر دلیری اور نبیوں کے انکار کی بڑی وجہ یہی ہوتی ہے کہ آخرت کا یقین دل میں نہیں ہوتا۔

انسان بڑی دلیری سے کہہ دیتا ہے کہ

"ایہہ جہان مٹھا اگلا کن ڈٹھا"

یعنی اِس جہان کے تو مزے ہمیں لُوٹنے دو۔ اگلا جہان کس نے دیکھا ہے۔ کہ ایک اَن دیکھے دن کے لئے ابھی سے ہم اِن لذائذ کو ترک کر دیں۔ غرض اعمال کی خوبی یا بُرائی صرف جزا سزا کے عقیدہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اسجگہ فرمایا ہے کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ اپنے بُرے اعمال کو بھی اچھا سمجھتے ہیں یعنی نیکی اور بدی میں وہ اصولاً کوئی فرق نہیں کر سکتے کیونکہ جب نتیجہ کوئی نہیں۔ نہ اچھے کام کا کوئی انعام ہے اور نہ بُرے کام کی کوئی سزا ہے تو پھر کسی فعل کا اچھا اور کسی کا بُرا ہونا کیا معنے رکھتا ہے۔

یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ تمام اعمال نیت کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ یوں تو کافر بھی بعض اعمال ایسے کرتا ہے جو مومنوں کے اعمال کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن چونکہ اُس کے ساتھ نیّت نیک نہیں ہوتی اور نہ خدا تعالیٰ کی رضامندی مطلوب ہوتی ہے اس لئے اُس کا عمل اُسے کسی انعام کا مستحق نہیں بناتا لیکن مومن کے عمل کا شاندار نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ مومن کے عمل کے ساتھ نیت نیک بھی شامل ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی رضا کی جستجو بھی اس کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔

زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب اُن کے بُرے اعمال خدا تعالیٰ ہی اُن کو خوبصورت کر کے دکھاتا ہے تو پھر اُن کا قصور کیا ہُوا۔ سو اِس بارہ میں یاد رکھنا چاہیئے کہ درحقیقت یہ خدا تعالیٰ کی ایک سنّت ہے اور اِس میں انسانی ترقی کے بہت سے راز مضمر ہیں۔ کہ جب کوئی شخص کچھ مدّت تک ایک کام کرتا رہتا ہے تو اُس کو اُس کام سے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اُسے اچھا سمجھنے لگجاتا ہے

اور یہاں اسی قانونِ قدرت کی طرف اشارہ ہے نہ کہ کسی خاص تقدیر کی طرف۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ چونکہ انہوں نے سچے راستہ کو چھوڑ کر غلط راستہ اختیار کر لیا تھا اور انسانی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ جب وہ کوئی کام ایک لمبے عرصہ تک کرتا چلا جاتا ہے تو اس کام کی محبت اُس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اُسے اچھا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اس لئے انہیں بھی اب اپنی بدعملی خوبصورت دکھائی دینے لگی ہے۔ اور چونکہ فطرتِ انسانی کا خدا تعالیٰ ہی خالق ہے اس لئے زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فرما کر اُسے خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ ورنہ اس کے یہ معنے نہیں کہ خدا تعالیٰ اُنہیں بُرے اعمال اچھے کر کے دکھاتا ہے۔ بلکہ وہ خود فطرت کی اعلیٰ درجہ کی خوبی کا غلط رنگ میں استعمال کر کے بُرے [illegible]ں کو بھی اچھے سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آگ خدا تعالیٰ نے اس لئے بنائی ہے کہ اُس سے کھانا تیار کیا جائے یا سردی سے بچاؤ کا سامان مہیا کیا جائے لیکن اگر کوئی شخص آگ میں گر کر اپنے آپ کو جلالے تو یہ اس کا اپنا قصور ہو گا آگ کو پیدا کرنے والے خدا کا قصور نہیں ہو گا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے انسانی ترقی کے لئے یہ قانون بنایا ہے کہ جو شخص کسی کام کا عادی ہو جاتا ہے رفتہ رفتہ اُسے اچھا سمجھنے لگ جاتا ہے اور اُس سے اُسے ایک طبعی موانست پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ اس قانون کو اس رنگ میں استعمال کریں کہ وہ برائیوں کا ارتکاب شروع کر دیں اور اس قانون کے نتیجہ میں انہیں اپنی برائیاں ہی حسین نظر آنے لگیں تو اس میں خود ان کا اپنا ہی قصور ہو گا صانع فطرت پر اس سے کوئی اعتراض پیدا نہیں ہو گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص نیک عمل کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کے ملائکہ اس کے قلب پر ایک سفید نقطہ لگا دیتے ہیں۔ دوسرا نیک عمل بجا لاتا ہے تو دوسرا سفید نقطہ لگا دیتے ہیں یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے اس کا تمام دل نورانی ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی بدی اس میں سے دُور ہو جاتی ہے۔ اس کے بالمقابل جب کوئی شخص بدی کرتا ہے تو فرشتے اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگا دیتے ہیں۔ اور جب وہ دوسری بدی کرتا ہے تو دوسرا سیاہ نقطہ لگا دیتے ہیں اور پھر اگر وہ بدیوں میں بڑھتا جائے تو اُن نقطوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کا تمام دل تاریک ہو جاتا ہے اور اس کی نیکیوں کا خرمن جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ یہ حدیث بھی اسی قانونِ فطرت کی تشریح ہے۔ کہ جب کوئی شخص نیکیوں پر دوام اختیار کرتا ہے تو نیکی اس کے جسم کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اور جب بدیوں پر دوام اختیار کرتا ہے تو بدیاں اس کے جسم کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔ اور جو چیز انسان کے جسم کا ایک حصہ بن جائے وہ اُسے اچھی ہی دکھائی دیتی ہے بُری نظر نہیں آتی۔ اگر اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان پر رحم کرتے ہوئے انسانی فطرت میں یہ بات نہ رکھ دیتا تو نیکی اختیار کرنا یا کسی کام میں دوام اختیار کرنا اس کے لئے بڑا مشکل ہوتا۔ مگر اس قانون کی وجہ سے نیکیوں میں ترقی کرنے کا سفر بڑا آسان ہو گیا ہے۔ اور ہر عمل اس سے اگلے عمل کو آسان تر بنا دیتا ہے آخر ایک ماہر فن کی کیوں تعریف کی جاتی ہے اسی لئے کہ مسلسل ایک کام کرنے کی وجہ سے وہ اپنے اندر ایک ایسی قابلیت پیدا کر لیتا ہے کہ اس فن سے اُسے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اُس میں دوسروں سے آگے نکل جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسانی فطرت میں یہ ملکہ نہ رکھ دیتا کہ مسلسل کام کے نتیجہ میں اُسے اپنے کام سے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے تو کوئی شخص بھی اپنے فن میں ترقی نہ کر سکتا۔ یہی قانون نیکی اور بدی کے

میدان میں بھی جاری ہے۔ ایک نیک انسان پہلے اپنے نفس
پر بوجھ محسوس کرتے ہوئے کسی نیکی کی طرف اپنا قدم بڑھاتا
ہے۔ مگر رفتہ رفتہ وہی نیکی اُس کے رگ و ریشہ میں اسطرح
سرایت کرجاتی ہے کہ اس کا ترک کرنا اُس کے لئے
ناممکنات میں سے ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی
شخص بدی میں اپنے آپ کو ملوث کرنا شروع کر دیتا
ہے تو خواہ پہلی بدی اُس کے دل میں اضطراب پیدا کر
دے مگر رفتہ رفتہ وہی بدی اس کی غذا بن جاتی ہے
جس کو چھوڑنا اس کے لئے بڑا دوبھر ہوتا ہے۔

غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی قانون کی
طرف اشارہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ چونکہ ان لوگوں نے
آخرت کا انکار کر دیا ہے جسکی وجہ سے انہیں کسی گرفت کا
خوف نہیں رہا۔ اس لئے اُن کے دلوں میں گناہوں پر دلیری
پیدا ہو گئی ہے اور پھر متواتر گناہوں کی وجہ سے اُن کے
دلوں پر ایسا زنگ لگ گیا ہے کہ وہ اپنے بُرے افعال
کو بھی اچھا سمجھنے لگ گئے ہیں۔ اِس کی ایسی ہی مثال
ہے جیسے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے پاس ایک
دفعہ ایک چور علاج کرانے کے لئے آیا۔ تو آپؓ نے اُسے
وعظ و نصیحت کرنی شروع کی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں
ہاتھ پاؤں اس لئے نہیں دیئے کہ تم ان سے حرام روزی
کھایا کرو۔ بلکہ اس لئے دیئے ہیں کہ تم ان کے ذریعے
حلال روزی کما کر کھاؤ۔ تم چوری کرنا چھوڑ کیوں نہیں
دیتے۔ اور کیوں حلال روزی نہیں کماتے۔ جب آپ نے
اُسے یہ وعظ و نصیحت کی تو اس کی آنکھیں غصے کی وجہ
سے سُرخ ہو گئیں۔ اور کہنے لگا۔ اچھا مولوی صاحب
اگر یہ حلال کی روزی نہیں تو پھر اور کونسی حلال کی روزی
ہے۔ آپ لوگ میٹھی نیند سو رہے ہوتے ہیں اور ہم
مارے مارے پھر رہے ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو ہمارے
متعلق علم ہو جائے تو وہ ہمیں گولی مار کر مار دے۔
ہم اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر چوری کرتے ہیں۔ پھر
اس سے بڑھ کر اور کونسی حلال روزی ہو سکتی ہے؟
حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ اسے چوری کی
عادت پڑ چکی ہے اور یہ کام کرتے کرتے اس کی فطرت
اتنی مسخ ہو چکی ہے کہ اب یہ کام اس کی نگاہ میں بُرا
نہیں رہا۔ اس لئے اب بحث کے رنگ میں سمجھانے
سے کوئی خاص فائدہ اسے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آپ
فرماتے تھے کہ مَیں نے بات کو ٹلا دیا۔ اور اِدھر اُدھر کی
باتیں شروع کر دیں تاکہ یہ بات اس کے ذہن سے نکل
جائے۔ جب کچھ دیر گذر گئی تو مَیں نے اُس سے پوچھا
کہ تم چوری کس طرح کرتے ہو؟ اُس نے کہا کہ اکیلا آدمی
چوری نہیں کر سکتا بلکہ ہم پانچ سات آدمی ملکر چوری
کرتے ہیں۔ اُن میں سے ایک آدمی گھر کا رازدار ہوتا
ہے اور وہ عام طور پر سقہ یا چوہڑا وغیرہ ہوتا ہے
کیونکہ رازدار کے بغیر چوری نہیں ہو سکتی۔ وہی کمروں
اور دروازوں کے متعلق بتاتا ہے اور وہی اس بات
کے متعلق اطلاع دیتا ہے کہ نقدی اور زیورات کہاں
ہیں اس کے بعد ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے
جسے سیندھ لگانی آتی ہو اور وہ ایسے طور پر اوزاروں
کو استعمال کرے کہ سیندھ لگانے کی آواز پیدا نہ ہو
اور اس کی آواز سے گھر والے بیدار نہ ہو جائیں۔ پھر
ایک تیسرا آدمی ایسا ہونا چاہیئے جو تالے وغیرہ کھولنے
میں مشاق ہو۔ جب دوسرا آدمی سیندھ لگا لیتا ہے
تو وہ ایک طرف ہو جاتا ہے اور پھر اس تیسرے آدمی
کا کام شروع ہو جاتا ہے اور وہ صندوقوں کے تالے
کھولتا جاتا ہے اور پھر ایک چوتھا آدمی ایسا ہونا چاہیئے
جو کہ ایسے طور پر چلنے میں مہارت رکھتا ہو کہ اُس کے
پاؤں کی آہٹ محسوس نہ ہو۔ تیسرا آدمی تالے کھول
کر اور سامان نکال کر چوتھے آدمی کو دیتا جاتا ہے۔

الثلثة

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝۷

اور تجھ کو یقیناً قرآن اُس (ہستی) کی طرف سے مِل رہا ہے جو بہت حکمت والی (اور) بہت جاننے والی ہے ۵۳

اور وہ باہر والوں کو پکڑا آتا جاتا ہے۔ پھر ایک پانچویں آدمی کی یہ ڈیوٹی ہوتی ہے کہ وہ گلی کے سرے پر کھڑا رہے اور اگر کسی شخص کو آتا جاتا دیکھے تو سیٹی بجا دے یا کوئی اور اشارہ کر دے تاکہ سب ہوشیار ہو جائیں۔ پھر چھٹا شخص ایسا ہونا چاہیئے جو سفید کپڑے پہنے ہوئے ہو اور کسی کو اس کے چلنے پھرنے پر شک نہ گذرے۔ کیونکہ ہم تو ننگ دھڑنگ ہوتے ہیں اور ہمیں کوئی دیکھ لے تو یقیناً ہم پر چور ہونے کا شبہ کرے لیکن یہ آدمی ایسے کپڑوں میں پھرتا ہے کہ کسی کو اس پر شک نہیں گذر سکتا۔ ہم نقدی اور زیورات وغیرہ اُس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ نہایت اطمینان سے مال لیکر چلا جاتا ہے۔ اور ساتویں شخص کو جو سُنار ہوتا ہے دیدیتا ہے۔ جو سونے کو اور ہیرے اور جواہرات کو لاکھ سے جُدا کرتا ہے اور اُسے پگھلا کر ایک نئی شکل دے دیتا ہے۔ اور اُس سونے کو آگے بیچتا ہے اور پھر ہم سب آپس میں برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ فرماتے تھے میں نے اُسے کہا کہ اگر تمہاری اتنی محنت کے بعد وہ سُنار تمہارا سونا کھا جائے تو پھر تم کیا کرو۔ اِس پر بے اختیار اُس چور کے مُنہ سے نکلا کہ کیا وہ اتنا حرام خور ہوگا کہ دوسرے کا مال کھا جائیگا۔ مَیں نے کہا۔ بس اب تم سمجھ گئے ہو۔ معلوم ہُوا کہ دوسروں کا مال کھانا حرام ہے اور تمہاری فطرت بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے مگر چوری کی عادت نے تمہاری فطرت کو ایسا مسخ کر دیا ہے کہ تم اس کام کو بھی حلال کی کمائی سمجھنے لگ گئے ہو۔ مگر جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ جو شخص ایک لمبے عرصہ تک کسی فعل کا ارتکاب کرتا رہتا ہے وہ رفتہ رفتہ اُسے خوبصورت نظر آنے لگتا ہے وہاں اُس کا ایک یہ بھی قانون ہے کہ کسی بُرے کام کا اچھا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ باوجود اس کے کہ انہیں اپنے بُرے اعمال میں لذّت آرہی ہے اور وہ انہیں اچھا سمجھ رہے ہیں پھر بھی یہ اُن اعمال کے بد نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتے بلکہ انہیں دنیا میں بھی اپنے بُرے اعمال کی وجہ سے رسوا ہونا پڑے گا۔ اور اُخروی زندگی میں بھی وہ سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہونگے۔

تُلَقّٰى

۵۳ حل لغات:۔ تَلَقّٰى کے معنے براہ راست مُنہ در مُنہ کلام سُننے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ لُغت میں لکھا ہے۔ تَلَقَّى الشَّيْءَ اَخَذَهٗ مِنْ فِيْكَ مُشَافَهَةً (اقرب) یعنی تَلَقَّى الشَّيْءَ کے معنے براہ راست دوسرے کے مُنہ سے کلام سُننے کے ہوتے ہیں۔

تفسیر:۔ اب فرماتا ہے۔ منکر بیشک انکار کرتے چلے جائیں۔ گالیاں دینے والے گالیاں دیتے رہیں اور بُرا بھلا کہنے والے بُرا بھلا کہتے رہیں۔ خدائے حکیم و علیم نے اپنی سکیم دنیا میں نافذ کر دی ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت اُسے پورا ہونے سے روک نہیں سکتی۔ اب حاسدوں کے لئے حسد کے انگاروں پر لوٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ وہ اپنے مونہہ کی پھونکوں سے نہ خدا تعالیٰ کے اس روشن کردہ چراغ کو بُجھا سکتے ہیں اور نہ تیر و سنان سے اسلام کی ترقی اور اس کی عظمت کو روک سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ تعلیم وہ ہے جو حکیم و علیم خدا تجھے بالمشافہ سکھا رہا ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ ایک حکیم ہستی جو ساتھ ہی علیم بھی ہے اُس کی تعلیم کو دنیا قبول نہ کرے یا اُس کی تعلیم کو مٹانے پر وہ

اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِاَھْلِہٖٓ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْکُمْ مِّنْھَا

(یاد کرو) جب موسیٰؑ نے اپنے اہل سے کہا کہ مَیں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ مَیں یقیناً تمہارے پاس اُس (آگ) سے

بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْکُمْ بِشِھَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّکُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۸﴾

کوئی (عظیم الشان) خبر لاؤں گا۔ یا تمہارے پاس ایک چمکتا ہوا انگارہ لاؤں گا۔ تاکہ تم آگ سینکو۔ ؎۴

قدرت پا سکے۔ اسجگہ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ پچھلی سورۃ میں تو یہ فرمایا تھا کہ رُوح الامین تجھ پر کلام اُتارتا ہے اور یہاں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھ پر براہ راست کلام نازل کرتا ہے۔ ان دونوں میں اختلاف کیوں ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ رُوح الامین سے مراد یہ ہے کہ جس صورت میں خدا تعالیٰ نے فرشتے کو کلام دیا تھا اُسی صورت میں اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا اور نسیان یا غلطی کا اس میں کوئی امکان باقی نہ رہا۔ اور جو کلام غلطی اور نسیان سے پاک ہو اور لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً اور حرکۃً حرکۃً اس شخص کو پہنچ جائے جس کو کلام بھیجا گیا تھا تو وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ بالمشافہ بات کرنا۔ کیونکہ بالمشافہ بات کرنے میں یہی مدنظر ہوتا ہے کہ کوئی غلطی نہ رہ جائے یا پیغامبر کچھ بھول نہ جائے۔ جب پیغامبر کے متعلق بھی یہ احتیاط کرلی گئی کہ نہ وہ کچھ بھولے نہ غلطی کرے نہ اُس کا سنایا ہوا کلام مخاطب کو بھولے اور نہ وہ اُس میں کوئی غلطی کرے تو دونوں کلاموں کو ایک سا درجہ حاصل ہوگیا۔ پس اِنَّکَ لَتُلَقَّی الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ عَلِیْمٍ والی آیت سورۃ شعراء کی اس آیت کے خلاف نہیں کہ نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ بلکہ وہ اس کی حقیقت کو واضح کرتی ہے۔

اس آیت میں درحقیقت عیسائیوں کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تو خدا تعالیٰ بالمشافہ کلام کرتا تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریل نازل ہوتا تھا۔ اسجگہ بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی خدا تعالیٰ بالمشافہ گفتگو کرتا تھا۔ رُوح الامین کے واسطہ بننے کا ذکر بطور تمثیل کے کیا گیا ہے۔ ورنہ آپؐ سے بالمشافہ کلام ہونے میں کوئی شُبہ نہیں۔

؎۴ حل لغات: اٰنَسْتُ: اٰنَسَ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے اور اٰنَسَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں اَبْصَرَہٗ۔ اُس کو دیکھا۔ اٰنَسَ الصَّوْتَ: سَمِعَہٗ وَ اَحَسَّ بِہٖ۔ اگر اٰنَسَ الصَّوْتَ کا فقرہ کہیں تو اُس کے معنے ہونگے آواز کو سُنا اور محسوس کیا (اقرب) پس اٰنَسْتُ کے معنے ہونگے۔ میں نے دیکھا۔ (اٰنَسْتُ)

شِھَابٌ: اَلشِّھَابُ کے معنے ہیں شُعْلَۃٌ مِّنْ نَّارٍ سَاطِعَۃٍ۔ آگ کا شعلہ جو اوپر کو اُٹھ رہا ہو۔ کُلُّ مُضِیْءٍ مُّتَوَلِّدٍ مِّنْ نَّارٍ۔ آگ سے پیدا ہونے والی روشنی (اقرب) (شِھَابٌ ۲)

قَبَسٌ: اَلْقَبَسُ کے معنے ہیں شُعْلَۃُ نَارٍ تُؤْخَذُ مِنْ مُّعْظَمِ النَّارِ۔ آگ کا شعلہ جو بڑی آگ سے لیا جائے۔ (اقرب) (قَبَسٌ ۳)

تَصْطَلُوْنَ: اِصْطَلٰی سے فعل مضارع جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے اور اِصْطَلٰی بِالنَّارِ اِصْطِلَاءً کے معنے ہیں اِسْتَدْفَاَ بِھَا آگ تاپی اور اُس سے

گرمی حاصل کی۔ (اقرب)

تفسیر:- ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے لطیف اور سمیع ہونے کی دلیل کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے مصر آتے وقت ایک آگ دیکھی اور اپنے رشتہ داروں سے کہا۔ کہ میں اس آگ کی طرف جاتا ہوں۔ اور یا تو میں اس آگ کے پاس سے کوئی خبر لاؤں گا۔ یا تمہارے لئے کوئی ایسا انگارہ لاؤں گا جس سے تم آگ سینک سکو۔

قبس کا لفظ اس جگہ شہاب کا بدل ہے یعنی شہاب سے میری مراد قبس ہے۔ اور چونکہ یہاں نَارًا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک روحانی نظارہ تھا جسمانی نظارہ نہیں تھا۔ مادی آنکھ سے دیکھنے والا کبھی یہ نہیں کہا کرتا کہ میں نے "ایک آگ" دیکھی ہے۔ بلکہ وہ یہ کہا کرتا ہے کہ میں نے آگ دیکھی ہے۔ اسی طرح مادی آگ صرف ایک شخص کو نظر نہیں آتی بلکہ سب لوگوں کو نظر آتی ہے۔ مگر یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ وہ مجھے نظر آتی ہے جس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ وہ آگ آپ کے باقی ساتھیوں کو نظر نہیں آتی تھی۔

پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں نے کشفی طور پر ایک آگ کا نظارہ دیکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نظارہ کے دکھانے سے خدا تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ میں اس آگ تک جاؤں۔ سو میں اس آگ تک جاؤں گا۔ اور چونکہ وہ آگ ایک کشفی نظارہ تھا۔ اور کشفی طور پر آگ دیکھنے سے مراد ہدایت ہوتی ہے اور ہدایت یا دیکھنے والے کیلئے مخصوص ہوتی ہے یا ساری قوم کے لئے عام ہوتی ہے اور ابھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ پتہ نہیں تھا کہ جو انکشاف مجھ پر ہونے والا ہے وہ میرے لئے مخصوص ہے یا میرے خاندان اور قوم کے لئے عام ہے اس لئے انہوں نے اپنے اہل سے کہا۔ کہ اگر وہ ہدایت صرف میرے لئے مخصوص ہوئی تو میں اس کی خبر تمہیں آکر سناؤں گا۔ اور اگر وہ ہدایت ایسی ہوئی کہ مجھے دوسروں تک بھی پہنچانے کا حکم ہوا تو میں اُس میں سے کوئی انگارہ تمہارے سینکنے کے لئے بھی لے آوں گا۔ یعنی کچھ تعلیم اس میں سے تم کو بھی سناؤنگا تاکہ تم اُس سے رُوحانی سردی دُور کرو۔

اس جگہ جو قبس وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یہ بھی حقیقی آگ پر دلالت نہیں کرتے۔ کیونکہ جب کسی چیز کو کسی اور چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے تو اس کی صفات کو بھی اُس کی نسبت استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے کسی کو شیر کہیں تو یہ نہیں کہینگے کہ وہ شیر کی طرح تقریر کرتا ہے۔ بلکہ یہ کہیں گے کہ وہ شیر کی طرح چنگھاڑتا ہے۔ پس چونکہ اس جگہ جلوہ الٰہی کا نام آگ رکھا گیا تھا اس لئے آگے اُس کے آثار وغیرہ کا نام بھی انگارہ رکھا گیا۔ پس اسجگہ آگ اور انگارے سے مراد وہ نورِ الٰہی ہے جو انہوں نے دیکھا تھا۔ اور چونکہ اب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کامل وحی نازل نہیں ہوئی تھی وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ آیا جو نور اُن کو نظر آیا ہے صرف اُن کی ذات کے لئے ہے یا باقی خاندان اور قوم کے لئے بھی ہے۔ یعنی یہ جلوہ جو دکھائی دیا ہے یہ جلوۂ نبوت ہے یا جلوۂ ولایت۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ آگ کے پاس جاکر یا تو میں کوئی خبر لاؤنگا یعنی تم کو یہ بتاؤنگا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ پر

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ

پھر جب وہ اُس (یعنی آگ) کے پاس آئے تو اُنکو آواز دی گئی کہ جو کوئی آگ میں ہے اور جو اُس کے گرد ہے

وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۹

اُس کو برکت دی گئی ہے ۔ اور اللہ رب العالمین پاک ہے ۔ ۵۵

یہ فضل نازل فرمایا ہے ۔ اور اگر وہ نور خاندان اور قوم کے لئے ہُوا یعنی یہ جلوہ جلوۂ ولایت نہ ہُوا بلکہ جلوۂ نبوت ہُوا اور مجھے حکم ہُوا کہ دوسروں کو بھی تعلیم دو تو مَیں ایسی تعلیمات لاؤنگا جن سے خاندان اور قوم فائدہ اٹھائے اور اُن سے گرمی حاصل کرے ۔

۵۵ تفسیر :- اپنے رشتہ داروں کو ہوشیار کرکے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس جگہ پہنچے جہاں اُن کو وہ نظارہ دکھایا گیا تھا تو اُنکو الہام ہُوا کہ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا یعنی جو شخص اس آگ میں ہے اُسے بھی برکت دی گئی ہے اور جو اس کے ماحول میں ہے اُسے بھی برکت دی گئی ہے ۔

بعض مفسرین نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ اُس آگ میں اللہ تعالےٰ کا وجود تھا ۔ اور تورات نے بھی یہی نظریہ پیش کیا ہے ۔ چنانچہ خروج باب ۳ میں لکھا ہے :-

" خداوند کا فرشتہ ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلہ میں اُس پر ظاہر ہُوا ۔ اُس نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوٹا آگ میں روشن ہے اور وہ جل نہیں جاتا تب موسیٰ نے کہا کہ مَیں اب نزدیک جاؤں اور اس بڑے منظر کو دیکھوں کہ یہ بوٹا کیوں نہیں جل جاتا ۔ جب خداوند نے دیکھا کہ وہ دیکھنے کو نزدیک آیا تو خدا نے اُس بوٹے کے اندر سے پکارا اور کہا کہ اے موسیٰ ! اے موسیٰ ! وہ بولا ۔ مَیں یہاں ہوں ۔ تب اُس نے کہا ۔ یہاں نزدیک مت آ ۔ اپنے پاؤں سے جوتا اُتار ۔ کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس زمین ہے ۔"

(خروج باب ۳ آیت ۲ تا ۵)

مگر قرآن اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا ۔ کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ موسیٰ پر ہم نے یہ الہام نازل کیا کہ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا کہ وہ جو اس آگ میں ہے اُسے بھی برکت دی گئی ہے اور اس کے ماحول کو بھی برکت دی گئی ہے ۔ حالانکہ خدا تعالیٰ دوسروں کو خود برکت دیتا ہے ۔ اُسے کوئی اَور برکت نہیں دیتا ۔ گویا وہ تبارک تو کہلا سکتا ہے مگر بُوْرِكَ نہیں کہلا سکتا ۔ پس یہ معنے کہ مَنْ فِي النَّارِ سے خدا تعالیٰ مراد ہے کسی صورت میں بھی درست نہیں ہو سکتے ۔

پھر بعض لوگوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے بُوْرِكَ کا لفظ بولنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو برکت نہیں دی جاتی بلکہ وہ خود برکت دیتا ہے فِيْ کے معنے پیچھے کے کئے ہیں اور مراد یہ لی ہے کہ وہ شخص جو اس آگ کے پیچھے آرہا ہے یا اُس کی تلاش میں ہے اُسے برکت دی گئی ہے ۔ مگر یہ معنے محاورہ کے خلاف ہیں ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فِيْ کے معنے پیچھے کے بھی آتے ہیں

مگر یہ معنے ایسے موقعہ پر استعمال کئے جاتے ہیں جبکہ فِیْ کے بعد کسی روحانی یا معنوی چیز کا ذکر ہو۔ ایسے موقعہ پر استعمال نہیں کئے جاتے جبکہ اس کے بعد اشیاء یا اشخاص کا ذکر کیا گیا ہو۔ اور چونکہ مفسرین اس آگ کو جسمانی آگ قرار دیتے ہیں اور جسمانی چیز کے لئے جب فِیْ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنے پیچھے کے نہیں ہوتے۔ اس لئے یہ معنے بھی درست نہیں سمجھے جا سکتے۔

پھر بعض لوگوں نے فِیْ کے معنے قرب کے کئے ہیں اور فِی النَّارِ کے معنے آگ کے قریب ہونے کے کئے ہیں۔ اور وَمَنْ حَوْلَهَا کو اس کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے حالانکہ وَمَنْ حَوْلَهَا کے الفاظ ہی ان معنوں کو ردّ کر رہے ہیں۔ کیونکہ خود مَنْ حَوْلَهَا کے معنے بھی قریب کے ہیں اور دو الفاظ سے ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پس یہ معنے بھی صحیح نہیں۔

پھر بعض نے کہا کہ مَنْ کا لفظ عام طور پر ذی عقل وجودوں کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر اس جگہ مَنْ سے مراد لایعقل اشیاء ہیں[۵۲]۔ اور مراد یہ ہے کہ وہ لکڑیاں جو اس آگ میں ہیں۔ اور اس کے ارد گرد کی جگہ بھی الٰہی تجلّی کی وجہ سے بابرکت ہو گئی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ سب معانی غلط ہیں۔ اور صرف نار سے دھوکا کھا کر کئے گئے ہیں۔ چونکہ انہوں نے نار کو جسمانی نار سمجھا اس لئے وہ اِن مشکلات میں گرفتار ہو گئے۔ لیکن جیسا کہ مَیں ثابت کر چکا ہوں نَارًا کے لفظ سے ثابت ہے کہ یہ نظارہ مادی آگ کا نہیں تھا بلکہ روحانی نار کا تھا۔ اور جب اس آگ کو روحانی آگ قرار دے دیا جائے اور آگ سے مراد محبّتِ الٰہی کی آگ سمجھ لیا جائے تو اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دقّت باقی نہیں رہتی۔ کشف یا خواب میں آگ دیکھنے سے مراد ہمیشہ محبتِ الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے۔ پس بُوْرِکَ کے لفظ سے نہ خدا تعالیٰ مراد ہے نہ ہو سکتا ہے کیونکہ وہ مجسم نہیں اور نہ اس کو کوئی برکت دیتا ہے۔ اور نہ بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ سے مُراد موسیٰؑ ہیں۔ بلکہ اس آیت میں ایک عام قانونِ الٰہی بیان کیا گیا ہے کہ ہر وہ شخص جو محبتِ الٰہی کی آگ میں جل رہا ہو اُس کو برکت دی جاتی ہے۔

اِسی طرح نہ تو فِیْ کے معنوں کا جھگڑا رہتا ہے نہ مَنْ کے معنوں کا۔ نہ بُوْرِکَ کی ترکیب کا اور آیت بالکل حل ہو جاتی ہے۔ اور وَمَنْ حَوْلَهَا کے معنے بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یعنی جو شخص محبتِ الٰہی کی آگ میں پڑا ہُوا ہو نہ صرف اُس کو برکت دی جاتی ہے بلکہ اس کے ہم صحبت بھی برکت پاتے ہیں۔ محبت کو دنیا کی تمام زبانوں میں آگ سے تشبیہہ دی جاتی ہے اور رؤیا و کشوف میں بھی اگر کوئی شخص اپنے آپ کو آگ میں جلتا ہُوا دیکھے تو اُسکی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ وہ عشقِ الٰہی کے مقام کو حاصل کرے گا۔

پس بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا کا یہی مطلب ہے کہ جو شخص اس آگ میں پڑے گا وہ برکت پا جائے گا اور جو اس کے اندر نہیں پڑیگا بلکہ اس کے قریب آ کر کھڑا ہوگا گویا اس سے کم حصّہ لیگا وہ بھی برکت دیا جائیگا۔

اگر مَنْ فِی النَّارِ سے مراد موسیٰؑ ہوتے تو پھر سوال پیدا ہوتا تھا کہ مَنْ حَوْلَهَا سے کیا مراد ہے۔ اُس وقت سوائے حضرت موسیٰؑ کے آگ کے پاس اور کون تھا جس کے لئے مَنْ حَوْلَهَا فرمایا گیا۔ پس اس جگہ کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ قانون بتایا گیا ہے کہ جو اس آگ میں پڑیگا وہ بھی برکت پائیگا اور جو اسکے پاس آکر اسکی گرمی حاصل کریگا وہ بھی برکت پائیگا اور ماضی کا لفظ مضارع کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے یعنی برکت دیا جائیگا۔

---

۵۱ حاشیہ تفسیر قرطبی جلد ۱۳ صفحہ ۱۵۸

۵۲ تفسیر بحر محیط جلد ۷ صفحہ ۵۶

يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٠﴾ وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا

اے موسیٰ! بات یہ ہے کہ میں اللہ ہوں جو غالب (اور) حکمت والا ہوں۔ اور تُو لاٹھی پھینک۔ اور جب اُس نے

رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰى

اُس (یعنی لاٹھی) کو دیکھا کہ وہ ہل رہی ہے گویا کہ ایک چھوٹا سانپ ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا تب ہم نے کہا، اے موسیٰ!

لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿١١﴾ اِلَّا مَنْ

ڈر نہیں۔ میں وہ ہوں کہ رسول میرے حضور میں ڈرا نہیں کرتے۔ مگر جس نے

ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْۗءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢﴾

ظلم کیا، لیکن پھر اُس ظلم کو چھوڑ کر نیکی اختیار کی۔ میں (اُس کے لئے) بڑا بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہوں۔ ۵۶

پُرانے زمانہ میں دلّی کے ایک بزرگ تھے اُن کے پاس ایک دفعہ اُن کا ایک مرید آیا۔ اور اس نے کہا کہ ہمارا جو یہ خیال ہے کہ حضرت کرشن اور حضرت رام چندر جی ہندوستان کے نبی تھے یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک آگ جل رہی ہے اور حضرت کرشن جی تو اس کے اندر ہیں اور حضرت رامچندر جی اسکے کنارہ پر کھڑے ہیں۔ وہ بزرگ کہنے لگے تم نے اس خواب کی تعبیر غلط سمجھی ہے۔ آگ کے معنے محبت الٰہی کی آگ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ کرشن جی خدا تعالیٰ کی محبت میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اور رامچندر جی اُن سے کم درجہ رکھتے تھے۔ اسی لئے حضرت کرشن جی تو آگ کے اندر جلتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اور رام چندر جی آگ کے کنارہ پر کھڑے ہوئے نظر آئے۔

آگے فرماتا ہے وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ ربّ العالمین خدا تمام عیبوں سے پاک ہے۔ یعنی جنہوں نے یہ کہا ہے کہ آگ میں خدا تعالیٰ تھا جیسا کہ بائیبل والوں نے وہ سب غلطی کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ہر قسم کے تجسّم سے پاک اور منزّہ ہے،

اسی طرح سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہہ کر اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو برکت دیتا ہے اُس کے ذریعہ دنیا میں اس کی سبّوحیت کا اظہار ہوتا ہے اور ہر قسم کے عیوب جو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں ان کا ازالہ کر دیا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کا حسین چہرہ دنیا کو ایک بار پھر اپنی پوری شان کے ساتھ نظر آنے لگ جاتا ہے۔

۵۶ حل لغات

تَهْتَزُّ: تَهْتَزُّ۔ اِهْتَزَّ سے فعل مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اِهْتَزَّتِ الْاِبِلُ کے معنے ہیں تَحَرَّكَتْ فِيْ سَيْرِهَا لِحُدَاءِ الْحَادِيْ حُدی خواں کے حدی کرنے پر اونٹ تیز چلے۔ اور جب اِهْتَزَّ الْمَاءُ فِيْ جَرَيَانِهٖ کہیں تو معنے ہونگے تَحَلَّقَ۔ پانی تیزی سے بہا اور اِهْتَزَّ الْكَوْكَبُ فِي انْقِضَاضِهٖ کے معنے ہیں اَسْرَعَ۔ ستارہ جلدی سے ٹوٹا (اقرب) پس تَهْتَزُّ کے معنے ہونگے۔ جلدی چلتا ہے۔

اَلْجَانُّ: اَلْجَانُّ: کے معنے ہیں حَيَّةٌ بَيْضَاءُ كَحْلَاءُ الْعَيْنِ لَا تُؤْذِيْ۔ سفید رنگ سُرمگیں آنکھوں والا باریک سانپ

وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ
اور تُو اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال - وہ بغیر کسی بیماری کے سفید
سُوْٓءٍ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ
نکلیگا - یہ اُن نَو نشانوں میں سے ہے جو فرعون اور اُس کی قوم کی طرف بھیجے جانے والے ہیں

جو کاٹتا نہیں - (اقرب)

تفسیر: فرماتا ہے - ہم نے اُسوقت موسیٰؑ سے کہا کہ اے موسیٰؑ! مَیں اللہ ہوں جو بڑا غالب اور حکمت والا ہوں - اِس سے بھی یہ مراد نہیں کہ آگ کے اندر خدا تعالیٰ تھا جس نے کہا کہ مَیں اللہ غالب اور حکمت والا ہوں - کیونکہ قرآن کریم کے کسی لفظ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ آگ کے اندر سے آواز آئی تھی - قرآن کریم صرف یہ بتاتا ہے کہ ایسی آواز آئی تھی خواہ وہ کہیں سے آئی ہو -

درحقیقت یہ آیت بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ محبت الٰہی کی آگ میں جلنے والا انسان بڑی برکت پاتا ہے اور یہ امر اِس بات سے ظاہر ہے کہ مَیں اللہ غالب اور حکمت والا ہوں یعنی جو میری محبت میں جلے گا وہ غالب ہوگا اور ڈنڈے کے زور سے غالب نہیں ہوگا بلکہ اس کو بڑی حکمتیں عطا کی جائیں گی اور وہ دلائل اور براہین کے ساتھ غالب آئیگا - جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء دلائل کے ساتھ دنیا پر غالب آئے -

پھر فرماتا ہے ہم نے موسیٰؑ کو الہام کیا کہ اپنا سونٹا پھینک دے - جب اُس نے اپنا سونٹا پھینک دیا تو اس نے دیکھا کہ وہ تیزی کے ساتھ ہل رہا ہے جیسا کہ چھوٹا سانپ ہلتا ہے - حضرت موسیٰ علیہ السلام اس نظارہ کو دیکھ کر دوڑ پڑے اور پیچھے کی طرف اُنہوں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا -

جیسا کہ سورۂ شعراء کی تفسیر میں بتایا جا چکا ہے یہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا - اور عصا سے مراد اُن کی جماعت تھی چنانچہ عربی زبان میں بھی کہتے ہیں شَقَّ الْعَصَا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اُس نے جماعت کی وحدت کو توڑ دیا - اِسی طرح اس نظارہ کے دکھانے سے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ جب تک تُو اپنی جماعت کو اپنے ہاتھ میں رکھیگا - اور اس کی نگرانی کرتا رہے گا - وہ ایک عصا کی شکل میں کارآمد وجود رہے گی - لیکن جب وہ تیری کامل متابعت کو ترک کر کے تیرے روحانی وجود سے الگ ہو جائے گی تو وہ ایک سانپ کی شکل اختیار کر لیگی - چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کشفی حالت میں اپنا عصا پھینک دیا تو اُن کو اپنی قوم کا وہ حال نظر آگیا جو اُن کی غیر حاضری میں ہونے والا تھا - جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نظارہ دیکھا تو وہ پیٹھ پھیر کر دوڑ پڑے اس پر اُن کو الہام ہُوا کہ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ - اے موسیٰ: ڈرنے کی کونسی بات ہے - رسول جب ہماری خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو انعام لینے کے لئے حاضر ہوتے ہیں - سزا پانے کے لئے حاضر نہیں ہوتے - پس یہ نظارہ تجھے ڈرانے کے لئے نہیں بلکہ تجھے حقیقت حال سے آگاہ کرنے اور قوم کی نگرانی کی طرف توجہ دلانے کیلئے دکھایا گیا ہے -

كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً

وہ اطاعت سے نکل جانے والی قوم ہے۔ پس جب اُن کے پاس ہمارے نشانات جو آنکھیں کھول دینے والے تھے آئے

قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴﴾ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ

تو انہوں نے کہا۔ یہ تو ایک کھلا کھلا جادو ہے۔ اور انہوں نے اصرار سے ظلم اور تکبّر کرتے ہوئے ان نشانوں کا انکار کیا حالانکہ

اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۵﴾

اُن کے دل اُن پر یقین لا چکے تھے۔ پس دیکھ کہ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہؤا کرتا ہے۔ ؎

ع ۱ / ۱۶

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اس آیت کے متعلق بعض لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ اس سے تو پتہ لگتا ہے کہ رسولوں میں سے بعض ظالم بھی ہوتے ہیں۔ مگر اُن کا یہ اعتراض نحوسے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ اِلَّا کبھی استثناء متصل کے لئے آتا ہے اور کبھی استثناء منقطع کے لئے۔ یعنی اِلَّا کے بعد بعض دفعہ نئے گروہ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور پہلا ذکر ختم ہو جاتا ہے۔ اسجگہ بھی اِلَّا استثناء منقطع کے طور پر استعمال ہؤا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگوں میں سے جو شخص ظلم سے کام لے اور پھر ظلم کے بعد نیکی اختیار کرے تو وہ ڈرتا ہے کہ معلوم نہیں میری توبہ قبول بھی ہوئی ہے یا نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مَیں بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ اس لئے انبیاء تو الگ رہے۔ ایسے شخص کے لئے بھی ڈرنے کی کوئی حقیقی وجہ نہیں۔

؎ **حل لغات**:۔ اِسْتَيْقَنَتْ: اِسْتَيْقَنَ سے مؤنث کا صیغہ ہے اور اِسْتَيْقَنَ کے معنے تَيَقَّنَ کے ہیں چنانچہ کہتے ہیں تَيَقَّنَ الْاَمْرَ عَلِمَهٗ وَتَحَقَّقَهٗ۔ یعنی کسی بات کو یقینی طور پر جان لیا۔ (اقرب)

تفسیر:۔ پھر فرمایا کہ اپنے گریبان میں ہاتھ تو ڈال۔ جب تو اُسے نکالیگا تو وہ سفید ہوگا۔ مگر کسی بیماری کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی نشان نمائی کی وجہ سے وہ نورانی اور سفید ہوگا۔

مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ کے الفاظ بائیبل کے اس ناروا الزام کو ردّ کر رہے ہیں جو اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ان الفاظ میں لگایا کہ

"اُس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اُسے ڈھانک لیا۔ اور جب اُس نے اُسے نکال کر دیکھا تو اُس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔"

(خروج باب ۴ آیت ۶ و ۷)

گویا بائیبل نویسوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی سفیدی کو کوڑھ کی طرف منسوب کر دیا تھا مگر قرآن کریم جو حضرت موسیٰؑ کے دو ہزار سال کے بعد آیا اور جس کی مخالفت میں یہودیوں اور عیسائیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ وہ حضرت موسیٰؑ کو جو یہودیوں اور عیسائیوں کا نبی تھا اُس الزام سے پاک ٹھہراتا ہے جو خود موسیٰؑ کے متبعین نے اُن پر لگا دیا تھا۔ اور اُن کے ہاتھ کی سفیدی کو کوڑھ نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کا ایک عظیم الشان نشان قرار دیتا ہے۔

وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ میں اللہ تعالےٰ نے

اِسْتَيْقَنَتْ ۱

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ چونکہ تجھ پر جو کلام نازل ہوا ہے وہ تیری قوم کے لئے ہے اس لئے تُو جا اور اپنی قوم کو اپنے ساتھ چمٹا لے۔ یعنی اُن کو اپنے ظلِ عاطفت میں لے لے۔ اور اُن کی نیک تربیت کر۔ اس تربیت کے نتیجہ میں اس قوم میں سے نہایت اعلیٰ درجہ کے لوگ پیدا ہونگے۔ جن میں کوئی عیب نہیں ہو گا۔ وہ دل کے صاف اور خدا تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ اور اس کے مقبول ہونگے۔ اور دنیا کو اپنے نور سے منور کرنے والے ہونگے لیکن جب وہ تجھ سے الگ ہوگئے یعنی تیری روحانی تعلیم کو انہوں نے پس پُشت پھینک دیا تو وہ زمین کی طرف جُھک جائیں گے اور جس طرح سانپ سفلی زمین کی مٹی کھاتا ہے اسی طرح وہ بھی دنیا کے کیڑے بن جائیں گے چنانچہ دیکھ لو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی جو تھیروں کا کام کرنے والے تھے اُن کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو فتح کو قریب لانے والی ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت کے نتیجہ میں انہیں ایسی ہمت اور طاقت بخشی کہ انہوں نے عمالقہ کی قوم پر فتح حاصل کی اور کنعان پر خدا نے انہیں حکمرانی عطا فرما دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا عمالقہ کی قوم پر فتح حاصل کر لینا ایسا ہی تھا جیسے چُوہا بلّی کو مار لے۔ عمالقہ قوم کی شام اور کنعان پر حکومت تھی۔ اور وہ بڑی بھاری شوکت اور عظمت رکھتی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی اینٹیں پاتھنے والے غلامی کی زندگی بسر کرنے والے اور سیاست سے کلّی طور پر نابلد تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ تھا کہ وہ اس جاہل اور ناواقف اور غلامی کی زندگی بسر کرنے والی قوم کو عمالقہ کی زمین کا وارث کر دیگا اور یہ سینکڑوں سال تک غلام رہنے والی قوم جس نے کبھی تلوار نہیں چلائی تھی اور ہمیشہ غلامی کی زنجیروں میں مقید رہی تھی عمالقہ کی قوم پر جو تلوار کی دھنی تھی اور ہر قسم کے ساز و سامان اُس کے پاس موجود تھے غالب آجائیگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور خدا تعالیٰ نے انہیں غلبہ عطا فرما دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب انہوں نے اپنی نادانی سے یہ کہہ دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ یعنی تُو اور تیرا خدا دونوں دشمنوں سے لڑتے پھرو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ مگر آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعاؤں اور تربیت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن کے اندر ایسا تغیر پیدا کیا کہ انہوں نے اپنے آپ کو بلا دریغ قربانیوں کی آگ میں جھونک دیا اور آخر کنعان کے دروازے اُن کے لئے کھُل گئے۔ اور غلام کہلانے والے دنیا کے بادشاہ بن گئے۔ پھر نہ صرف خدا تعالیٰ نے اُن کو دنیوی حکومت عطا فرمائی بلکہ حضرت موسیٰؑ کی تعلیم پر چل کر اُن میں بڑے بڑے ربّانی اور احبار بلکہ خدا تعالیٰ کے انبیاء تک پیدا ہوئے جو چودہ سو سال تک دنیا کے لئے شمعِ ہدایت کا کام دیتے رہے۔ یہ تمام پاکبازوں کا گروہ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ کی صداقت کا ایک عملی ثبوت تھا۔ اور پھر یہ تمام مقدسین مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ کے مطابق معصوم اور بے عیب تھے۔ بائیبل نویسوں نے اپنی نادانی سے خدا تعالیٰ کے ان انبیاء کو جو بنی اسرائیل کی ہدایت کیلئے مبعوث ہوتے رہے قسم قسم کے ناروا الزام لگائے ہیں کسی کے متعلق کہا کہ اُس کا دل غیر معبودوں کی طرف پھر گیا کسی کے متعلق کہا کہ اس نے دوسرے کی بیوی اڑا لی اور اُس کے خاوند کو مروا دیا۔ کسی کے متعلق کہا کہ اُس نے جھوٹ بولا۔ مگر قرآن کریم ان تمام اتہامات سے ان کو پاک ٹھہراتا ہے اور بتاتا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کو پہلے سے یہ خبر دے دی تھی کہ تیری تربیت کے نتیجہ میں ایسے لوگ پیدا ہونگے جو نورانیت کا مجسمہ ہوں گے اور

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا ج وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ

اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا ۔ اور دونوں نے کہا اللہ ہی سب تعریف کا مالک ہے

الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۶﴾

جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی ہے

اُن میں کوئی ایسا عیب نہیں ہوگا جو اُن کی معصومیت کو داغ دار کرنے والا ہو ۔

فرماتا ہے یہ دونوں نشان اُن نو نشانوں میں سے ہیں جو فرعون اور اُس کی قوم کے لئے دکھائے جانیوالے ہیں ۔ کیونکہ وہ اطاعت سے نکلنے والی قوم ہے ۔

اِن نو نشانات میں سے عصا اور ید بیضاء کے معجزات کا تو اِس جگہ ذکر ہے اور دو معجزات کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کہ وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّکَّرُوْنَ (اعراف ع) یعنی ہم نے آلِ فرعون کو قحط اور بچوں کی ہلاکت کے عذاب میں گرفتار کیا ۔ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۔ باقی پانچ نشانات کا اِس آیت میں ذکر آتا ہے ۔ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ (اعراف ع) یعنی ہم نے آلِ فرعون پر کئی قسم کے عذاب بھیجے جن میں طوفان ۔ ٹڈیوں ۔ جوؤں ۔ مینڈکوں اور خون کا عذاب شامل تھا ۔

بائبل کی کتاب "خروج" کے مختلف ابواب میں اِن عذابوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں ۔ طوفان کا عذاب تو وہی تھا جو بحیرۂ احمر میں ظاہر ہوا ۔ جب فرعون اور اس کا لشکر اس میں غرق کر دیئے گئے لیکن اس کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید میں اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں پر ٹڈیوں کا عذاب بھی نازل کیا ۔ یعنی اتنے ٹڈی دَل آئے کہ ملک کی تمام فصلیں تباہ ہوگئیں اور لوگ بھوکے مرنے لگے ۔ جوؤں کا عذاب بھی نازل کیا ۔ یعنی اتنی شدید سردی پڑی کہ لوگوں کے لئے غسل کرنا مشکل ہوگیا ۔ اور اُنکے بال جوؤں سے بھر گئے ۔ مینڈکوں کا عذاب بھی نازل کیا یعنی اتنی کثرت سے بارشیں ہوئیں کہ جگہ جگہ مینڈک پیدا ہوگئے ۔ خون کا عذاب بھی نازل کیا جس سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ اُن کا خون خراب ہوگیا اور انہیں کثرت کے ساتھ پھوڑے وغیرہ نکلنے لگ گئے یا اُن میں نکسیر کا مرض پھوٹ پڑا ۔ یا بواسیر دموی کے مرض نے آگھیرا ۔ یا اُن میں وہ طاعون پھیل گئی جس میں مریض کے ناک ۔ مونہہ اور مقعد سے خون جاری ہو جاتا ہے ۔ اور کبھی جلد کے نیچے جریانِ خون ہو کر تمام جسم پر سیاہ سیاہ داغ پڑجاتے ہیں ۔ اور ستر اسّی فیصدی مریض ہلاک ہو جاتے ہیں ۔ غرض پے در پے اُن کے انتباہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب نازل ہوتے رہے ۔ مگر فرماتا ہے باوجود اس کے کہ فرعون کی قوم نے وہ نشانات دیکھے جو اُن کی آنکھیں کھولنے والے تھے پھر بھی انہوں نے یہی کہا کہ یہ تو بڑی پُرفریب باتیں ہیں ۔ یعنی بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشانات خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر اصل میں محض اتفاقات ہیں اور انہوں نے اِن نشانات کا انکار کردیا ۔

وَ وَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَ قَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا

اور سلیمان داؤد کا وارث بنا۔ اور اُس نے کہا اے لوگو! ہمیں

مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَ اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا

پرندوں کی زبان سکھائی گئی ہے اور ہر ضروری چیز (یعنی تعلیم) ہم کو دی گئی ہے۔ یہ

لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾

کھلا کھلا فضل ہے۔ ۵۸

حالانکہ اُن کے دل سمجھ چکے تھے کہ یہ محض اتفاقات نہیں بلکہ اُن کی بداعمالی کی سزا کے طور پر یہ عذاب آئے ہیں۔ اُن کا یہ انکار محض ظلم اور تکبر کی وجہ سے تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ صداقت کا اپنی زبان سے اقرار کرکے اپنی بڑائی کو ضعف پہنچائیں۔ مگر دیکھ لو کہ پھر ان مفسد لوگوں کا انجام کیسا خطرناک ہوا۔ جب فرعون اور اُس کے ساتھی ہلاک ہوگئے تو آج تیرے مخالفوں کا انجام کس طرح اچھا ہوسکتا ہے جو اُسی رستہ پر چل رہے ہیں جس پر فرعون اور اُس کے ساتھی چلے اور اُنہی کی طرح اللہ تعالیٰ کے نشانات کا انکار کرتے چلے جا رہے ہیں۔

منطق الطیر

۵۸ حل لغات:۔ مَنْطِقَ الطَّيْرِ: اَلْمَنْطِقُ اَلْكَلَامُ یعنی منطق کے معنے کلام کے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر:۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا ذکر فرماتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو چونکہ یہودیوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خاص بیٹا تسلیم کیا جاتا ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اُن کا ذکر کیا گیا ہے اور اُن دونوں کا یہ قول بیان کیا گیا ہے کہ ہمیں خدا تعالیٰ نے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت بخشی ہے یعنی خلافتِ روحانی اور خلافتِ جسمانی کے ذریعہ سے اُس نے ہمیں مومنوں کا افسر بنایا ہے۔

اِس کے بعد فرماتا ہے کہ سلیمانؑ داؤدؑ کا وارث ہُوا۔ یعنی اُن کے انتقال کے بعد اُن کا جانشین ہُوا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اگلی آیات میں جہاں جہاں نا کا لفظ آیا ہے اُس سے مراد صرف حضرت سلیمانؑ ہی ہیں اور نا کا لفظ شاہی سطوت اور جبروت کے اظہار کیلئے ہے نہ یہ بتانے کے لئے کہ حضرت داؤدؑ اُس میں شامل ہیں۔ کیونکہ آیت کے شروع میں ہی بتایا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اُس وقت فوت ہو چکے تھے۔ پس یہ جو کہا گیا ہے کہ اے لوگو! ہم کو منطق الطیر سکھائی گئی ہے۔ اِس سے مراد صرف حضرت سلیمان علیہ السلام ہی ہیں نہ کہ حضرت داؤدؑ۔ کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام اِس سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔

مفسرین نے منطق الطیر کے یہ معنے کئے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو کبوتروں اور تیتروں اور چڑیوں اور بٹیروں وغیرہ کی زبان سکھائی گئی تھی اور وہ اُن کی بولی کو اسی طرح سمجھ لیتے تھے جس طرح ایک انسان کی گفتگو کو دوسرا انسان سمجھ لیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت سلیمان علیہ السلام نے

ایک بلبل کو دیکھا کہ ایک شاخ پر بیٹھی ہوئی اپنی دُم اور سر
ہلا کر کچھ بول رہی ہے۔ اُس کی آواز سُنکر آپ نے اپنے
اردگرد بیٹھنے والوں سے پُوچھا کہ تم جانتے ہو یہ بُلبل
کیا کہہ رہی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا
رسول ہی بہتر جانتے ہیں ہمیں کیا علم ہے۔ حضرت سلیمان
علیہ السلام نے کہا۔ یہ کہہ رہی ہے کہ دنیا کے سر میں خاک
پڑے۔ مَیں نے تو آج صرف آدھی کھجور کھائی ہے۔ پھر
فاختہ بولی۔ تو آپ نے فرمایا۔ یہ کہتی ہے کاش یہ
سب مخلوق پیدا ہی نہ ہوتی۔

اِسی طرح مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ
فرمایا کرتے تھے کہ کبوتر کہتا ہے۔ مرنے کے واسطے اپنی
اولادیں پیدا کرو۔ اور ویران ہونے کے لئے مکانات
بناؤ۔ اور مور کہتا ہے کہ جو کچھ تُو کریگا اُسکا بدلہ
پائیگا۔ اور ہُدہُد کہتا ہے کہ جو دوسرے پر رحم کریگا
خدا اُس پر رحم کرے گا۔ اور ابابیل کہتی ہے کہ نیک
اعمال کو آگے بھیجو تا کہ تم انہیں خدا کے پاس پاؤ اور
کبوتر کہتا ہے کہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى مِلْأَ سَمَآئِهٖ وَ
اَرْضِهٖ۔ اور قطاۃ کہتا ہے کہ جو خاموشی اختیار کریگا
سلامت رہیگا۔ اور طوطا کہتا ہے کہ افسوس اُس پر جسکا
مقصود اور مطلوب دنیا ہے۔ اور مرغا کہتا ہے کہ اے غافلو
اللہ کو یاد کرو۔ اور مینڈک کہتا ہے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْقُدُّوْسِ
اور چڑیا کہتی ہے۔ اے گنہگارو استغفار کرو۔ اور چیل
کہتی ہے کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ یعنی خدا کے
سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ غرض انہوں نے یہ
ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام
پرندوں کی بولی کو خوب سمجھتے تھے گو انہوں نے پرندوں
میں مینڈک وغیرہ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ مگر یہ محض استعارے
اور مجاز کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے اور ایسی ہی بات ہے جیسے
قرآن کریم میں تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا
حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ
مِنَ الْفَجْرِ (بقرہ ع ۲۳) یعنی رمضان کے ایام میں سحری کا وقت
اُس وقت تک ہے جب تک کہ صبح کی سفید دھاری سیاہ
دھاری سے الگ نظر نہ آنے لگے۔ مگر پنجاب میں بہت
سے زمیندار رمضان کی راتوں میں سفید اور سیاہ تاگا
اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور چونکہ تاگا اچھی روشنی میں ہی
نظر آتا ہے اس لئے وہ اُس وقت تک خوب کھاتے
پیتے رہتے ہیں۔ جب تک انہیں سیاہ اور سفید تاگا
الگ الگ نظر نہ آنے لگے۔ اسی طرح تشبیہ اور استعارہ
کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں اگر خدا تعالیٰ کے ہاتھ کا ذکر
آجائے تو بعض لوگ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ خدا کا
ہاتھ بھی نعوذ باللہ اسی طرح گوشت پوست کا ہے
جس طرح ہمارا ہے۔ اور اگر انہیں کہا جائے کہ ہاتھ سے
مراد خدا تعالیٰ کی طاقت ہے تو وہ کہیں گے کہ تم تاویلیں
کرتے ہو۔ جب خدا نے ہاتھ کا لفظ استعمال کیا ہے تو
تمہارا کیا حق ہے کہ تم اُس کی تاویل کرو۔ یا خدا تعالےٰ
کے متعلق اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے الفاظ پڑھ لیں تو
جب تک وہ خدا تعالیٰ کو ایک سنگ مرمر کے تخت پر
بیٹھا ہوا تسلیم نہ کریں انہیں چین ہی نہیں آئیگا۔ حالانکہ
دنیا کی ہر زبان میں تشبیہ اور استعارہ کا استعمال موجود
ہے۔ ہمارے ملک میں محاورہ ہے کہ "آنکھ بیٹھ گئی"۔
مگر کوئی نہیں کہتا کہ آنکھ کی ٹانگیں تھیں یا وہ بیٹھی ہے
تو کس پلنگ اور کرسی پر بیٹھی ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا
ہے کہ آنکھ بیٹھنے کے معنے یہ ہیں کہ آنکھ ضائع ہو گئی۔
اور پھوٹ گئی۔ اسی طرح اور کئی قسم کے استعارات
ہماری زبان میں استعمال کئے جاتے ہیں اور کوئی ان پر
اعتراض نہیں کرتا بلکہ ان استعارات کو زبان کی خوبی اور
اس کا کمال سمجھا جاتا ہے۔

غرض جس طرح دنیا کی ہر زبان میں مجاز اور

استعارات کا استعمال پایا جاتا ہے اِسی طرح الہامی کتابیں بھی اِن استعارات کو استعمال کرتی ہیں۔ مگر وہ لوگ جو استعارہ اور مجاز کی حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ انہیں ظاہر پر محمول کر لیتے ہیں اور اس طرح خود بھی ٹھوکر کھاتے ہیں اور دوسروں کے لئے بھی ٹھوکر کا موجب بنتے ہیں۔

یہی حال مَنطِقَ الطَّیر کا ہے۔ مفسّرین نے صرف طَیر کے لفظ کو دیکھکر خیال کر لیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو امتیازی طور پر اللہ تعالےٰ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ انہیں تیتروں اور بٹیروں کی بولی بھی سکھا دی تھی مگر سوال یہ ہے کہ اس بولی کے سکھانے کا فائدہ کیا تھا۔ یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ پرندے بھی بڑے بڑے علوم اور معارف جانتے ہیں۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس علم سے محروم رہیں اس لئے اُس نے آپ کو اُن کی زبان بھی سکھا دی۔ مگر پرندے تو ایک جاہل سے جاہل اور غبی سے غبی انسان جتنی بھی عقل نہیں رکھتے پھر اُن سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کیا علم سیکھنا تھا۔ پھر اگر اُن کا دماغ واقعہ میں اتنا اعلیٰ ہوتا کہ حضرت سلیمانؑ جیسے نبی کو بھی اُن سے معارف اور علوم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو شریعت انکو ذبح کرنے کی اجازت کیوں دیتی۔ اللہ تعالیٰ کا انسان کو ذبح کرنے کی اجازت نہ دینا اور جانوروں کو ذبح کرنے کی اجازت دینا صاف بتا رہا ہے کہ یہ امتیاز صرف دماغ کے فرق کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ اور اُن کا دماغ عام انسانی دماغ سے بھی ادنیٰ ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کو اُن کی زبان کس حکمت کے ماتحت سکھائی گئی تھی۔

پھر مفسّرین صرف یہیں تک بس نہیں کرتے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو تمام پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی تھیں بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہُدہُد جو ایک پرندہ تھا وہ اتنی عقل اور سمجھ رکھتا تھا کہ اُس نے ملکہ سبا کی باتیں سمجھیں۔ اُس کے درباریوں کی باتیں سمجھیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی باتیں سمجھیں۔ مگر ہُدہُد کی باتیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ گویا ایک پرندہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تمام درباری علماء اور فضلاء سے بھی بڑا تھا۔ کیونکہ وہ اُن سب کی باتیں سمجھتا تھا لیکن اس کی بات کو کوئی نہیں سمجھتا تھا اور اگر کوئی سمجھتا تھا تو وہ صرف حضرت سلیمانؑ تھے۔ گویا اگر ہُدہُد سے کسی کو برابری حاصل تھی تو صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کو تھی باقی جتنے امراء اور وزراء تھے وہ سب اُس "کھٹ بڑھئی" سے نیچے تھے۔ یہ اتنا احمقانہ نقشہ ہے کہ اس کو ایک معمولی عقل رکھنے والا انسان بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اگر یہ بات مانی جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑیگا کہ پرندے انسان سے افضل ہیں۔ اور پھر ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ پرندوں کو ذبح کرنا جائز نہیں ہاں انسان کو ذبح کرکے کھانا جائز ہے کیونکہ پرندے نعوذ باللہ انسان سے افضل ہیں۔ یہ تو "اندھیر نگری چوپٹ راجہ" والی بات ہوگی جس کو کوئی بھی معقول انسان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ایک استعارہ اور مجاز ہے جس کو لوگوں نے نہ سمجھا اور وہ صحیح راستہ سے بھٹک کر دُور از کار بحثوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ طَیر عربی زبان میں اُڑنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ اور استعارۃً اس سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو عالمِ روحانی کی فضاؤں میں پرواز کرتے اور خدا تعالیٰ کے برگزیدہ اور اُسکے محبوب ہوتے ہیں۔ بانیٔ سلسلہ احمدیہ کا ایک الہام بھی اِن معنوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ آپ کو ایک دفعہ الہام ہُوا کہ:- "ہزاروں آدمی تیرے پَروں کے نیچے ہیں"

(تذکرہ صفحہ ۶۵۰)

اب ظاہر ہے کہ پَر ہمیشہ پرندوں کے ہی ہُوا کرتے ہیں اور پرندے کے پَروں کے نیچے بیٹھنے والے بھی پرندے ہی

ہوتے ہیں۔ گویا اِس الہام میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بھی پرندہ قرار دیا گیا۔ اور پھر یہ بھی بتایا گیا کہ وہ لوگ جو آپ کی صحبت سے فیض حاصل کرنے والے ہیں وہ بھی عالم روحانی کے پرندے ہیں۔ اس الہام نے قرآن کریم کی اس آیت کی تشریح کر دی اور بتا دیا کہ طَیر سے مراد جسمانی پرندے نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف پرواز کرنے والے ہیں۔ اِن برگزیدہ لوگوں کو استعارۃً اس لئے بھی پرندہ کہا جاتا ہے کہ پرندہ آسمان کی طرف اُڑتا ہے اور علوم سماوی آسمان سے نیچے کی طرف اُترتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز اوپر سے نیچے کی طرف اُتری ہوگی تو وہ سب سے پہلے اُسی کو ملے گی جو اوپر پرواز کر رہا ہوگا۔ پس عالم روحانی کی فضاؤں میں پرواز کرنیوالے کو اس لئے بھی پرندہ کہا جاتا ہے کہ آسمانی علوم اور اسرارِ غیبی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے انہی لوگوں کو الہام یا رؤیا وکشوف کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں جو اوپر پرواز کر رہے ہوں۔ اور انہی آسمانی طیور کو اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اپنے فیوض سے متمتع فرماتا ہے۔ پھر وہ لوگ جو اُن کی صحبت میں آکر بیٹھتے ہیں وہ بھی اپنے اپنے اخلاص اور درجہ کے مطابق اِن فیوض سے مستفیض ہوتے چلے جاتے ہیں۔

غرض طَیر کے اس مفہوم کو مدِنظر رکھتے ہوئے عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ کے یہ معنے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے لوگوں سے کہا کہ اے لوگو! مجھے بھی وہ بولی سکھائی گئی ہے جو بلندی کی طرف پرواز کرنے والے لوگوں کو سکھائی جاتی ہے۔ یعنی نبیوں کے معارف اور حقائق اور یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک حضرت سلیمان علیہ السلام نبی نہیں تھے بلکہ صرف ایک بادشاہ تھے۔ چنانچہ بائیبل میں کہیں بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی نہیں قرار دیا گیا بلکہ ایک فلاسفر اور عالم قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ۱۔سلاطین باب ۴ میں لکھا ہے :-

> " اور خدا نے سلیمان کو حکمت اور سمجھ بہت ہی زیادہ اور دل کی وسعت بھی عنایت کی جیسی سمندر کے کنارے کی ریت ہوتی ہے۔ اور سلیمان کی حکمت سب اہلِ مشرق کی حکمت اور مصر کی ساری حکمت پر فوقیت رکھتی تھی۔" (آیت ۲۹و۳۰)

اسی طرح لکھا ہے :-

> " اُس نے تین ہزار مثلیں کہیں اور اُس کے ایک ہزار پانچ گیت تھے۔ اور اُس نے درختوں کا یعنی لبنان کے دیودار سے لیکر زوفا تک کا جو دیواروں پر اُگتا ہے اور چوپاؤں اور پرندوں اور رینگنے والے جانداروں اور مچھلیوں کا بھی بیان کیا۔ اور سب قوموں میں سے زمین کے سب بادشاہوں کی طرف سے جنہوں نے اُس کی حکمت کی شہرت سُنی تھی لوگ سلیمان کی حکمت کو سُننے آتے تھے۔" (آیت ۳۲، ۳۴)

غرض بائیبل حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک حکیم اور فلاسفر تو قرار دیتی ہے مگر نبی قرار نہیں دیتی۔ بلکہ اِس سے بڑھ کر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ الزام لگاتی ہے کہ

> " جب سلیمان بڈھا ہو گیا تو اُس کی بیویوں نے اُس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا۔ اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا۔"
>
> (۱۔سلاطین باب ۱۱۔ آیت ۴و۵)

پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال کی تردید کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ حضرت

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ

اور (ایک دفعہ) سلیمانؑ کے سامنے جنوں اور انسانوں اور پرندوں میں سے اُسکے لشکر ترتیب دار اکٹھے کئے گئے۔

فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ⑱

پھر اُن کو کوچ کا حکم ملا۔ ۵۹

سلیمان علیہ السلام نبی تھے اور انہیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینی علوم اور معارف عطا کئے گئے تھے جو اللہ تعالیٰ کے اُن برگزیدہ بندوں کو عطا کئے جاتے ہیں جو اسکی طرف پرواز کرتے اور اس کے قرب میں بہت بلند اور بالا مقام رکھتے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ہمیں ہر ضروری چیز عطا کی گئی ہے۔ اسجگہ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ کے معنے ہر چیز کے نہیں بلکہ ہر ضروری چیز کے ہیں۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مدمقابل ملکہ سبا کے متعلق بھی اسی سورۃ میں آتا ہے کہ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (آیت ۲۴) حالانکہ وہ دنیا کے ایک نہایت مختصر علاقہ کی بادشاہ تھی۔ اگر اُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ کے معنے ہر چیز کے کئے جائیں تو اس آیت کا مفہوم یہ قرار پاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملکہ سبا اور اُس کا تخت بھی حاصل تھا اور جب ہُدہُد نے ملکہ کا ذکر کیا اور کہا کہ اُسے ہر نعمت حاصل ہے تو اس کے معنے یہ تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اور اُن کے لشکر بھی اُس کو حاصل تھے حالانکہ یہ دونوں باتیں بالبداہت غلط ہیں۔ دراصل عربی زبان کے محاورہ کے مطابق یہ ضروری نہیں ہوتا کہ کُلّ کا لفظ تمام افراد جنس پر مشتمل ہو بلکہ بسا اوقات یہ لفظ صرف ضرورت کے مطابق اشیاء پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (انعام ع ۵) یعنی جب پہلی قوموں کے افراد نے اُس نصیحت کو بھلا دیا جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے اُن پر پہلے تو ہر قسم کی ترقیات کے دروازے کھولدیئے اور پھر اُن پر عذاب نازل کر دیا۔ اس آیت میں بھی کُلّ کے لفظ کے یہ معنے نہیں کہ اُن کو دنیا کی ہر نعمت ملی بلکہ صرف یہ مراد ہے کہ اُس زمانہ کی اور اُن کے ملک کی بڑی بڑی نعمتوں سے انہیں حصّہ ملا۔ اسی طرح اہل مکّہ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا (قصص ع ۶) یعنی کیا اہل مکّہ کو ہم نے ایک عزت والے اور محفوظ مقام میں جگہ نہیں دی جس کی طرف ہمارے انعام کے طور پر ہر قسم کے میوے لائے جاتے ہیں۔ اس آیت میں بھی کُلّ سے تمام دنیا کے میوے مراد نہیں بلکہ بہت سے میوے مراد ہیں جو اہل مکّہ کی صحت اور اُن کی لذّت کے سامان پیدا کرنے کیلئے ضروری تھے۔ اسی طرح شہد کی مکھّی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ تو تمام پھلوں کو کھا۔ حالانکہ شہد کی مکھّی سارے پھلوں کو نہیں کھاتی بلکہ بعض پھلوں کو کھاتی ہے۔ اسی طرح یہاں وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ کے معنے ہر چیز کے نہیں بلکہ ہر مطابقِ ضرورت چیز کے ہیں اور مراد یہ ہے کہ جن جن چیزوں کی حضرت سلیمان علیہ السلام کو ضرورت ہوتی تھی خدا تعالیٰ اُنکو مہیّا کر دیتا تھا اور جن جن چیزوں کی اپنے زمانہ میں ملکۂ سبا کو ضرورت ہوتی تھی وہ اُس کو میسّر آجاتی تھیں چنانچہ یہ دعویٰ کرکے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے کھلے فضل سے حاصل ہوتی ہے. بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل کے انسانی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔

۵۹ حل لغات: يُوْزَعُوْنَ: اَوْزَعَ سے فعل مضارع مجہول جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَوْزَعَ وَزَعَ سے ہے اور وَزَعَهٗ کے معنے ہیں كَفَّهٗ وَمَنَعَهٗ وَ

يُوْزَعُوْنَ

حَبَسَهٗ یعنی اُس کو ہٹایا - روکا یا روکے رکھا - اور جب وَزَعَ الْجَیْشَ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں حَبَسَ اَوَّلَهُمْ عَلٰی اٰخِرِهِمْ یعنی لشکر کو اوّل سے لیکر آخر تک روکے رکھا اور جب کہیں کہ رَأَیْتُهٗ یَزَعُ الْجَیْشَ تو معنے ہونگے یُرَتِّبُهُمْ وَیُسَوِّیْهِمْ وَیَصِفُّهُمْ لِلْحَرْبِ یعنی میں نے اُسے دیکھا کہ وہ لشکر کو ترتیب دے رہا تھا اور انہیں ٹھیک کر رہا تھا اور لڑائی کے لئے صف بستہ کر رہا تھا - (اقرب) پس یُوْزَعُوْنَ کے معنے ہونگے کہ (۱) لشکروں کو ترتیب دی جاتی تھی (۲) لشکروں کا پورا پورا انتظام رکھا جاتا تھا -

تفسیر: فرماتا ہے - ایک دفعہ سلیمانؑ کے سامنے جنّوں اور انسانوں اور پرندوں میں سے اُس کے لشکر حاضر کئے گئے اور اُن کو ترتیب وار الگ الگ کھڑا کیا گیا - یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اُس وقت کسی ملک پر چڑھائی کرنے کے لئے تیار تھے اور انہوں نے اپنی تمام فوج اکٹھی کی تھی جن میں جنّات کا بھی لشکر تھا - انسانوں کا بھی لشکر تھا - اور پرندوں کا بھی لشکر تھا -

جنّات کا لفظ سامنے آتے ہی مفسّرین کا ذہن پھر اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی غیر مرئی مخلوق ہے جو حضرت سلیمان کے قبضہ میں تھی - حالانکہ اگر وہ قرآن کریم پر غور کرتے تو انہیں اسقدر دُور از کار تاویلات کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی - جنّات کی حقیقت پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا قرآن کریم میں صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ہی یہ ذکر آتا ہے کہ اُن کے پاس جنّ تھے یا کسی اور نبی کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ اُس کے پاس جنّ آئے - اس غرض کے لئے جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں سورۃ احقاف میں یہ آیات نظر آتی ہیں:-

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ○ قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○ یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَیُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ○

(احقاف ع ۴) فرماتا ہے اُس وقت کو بھی یاد کرو جبکہ ہم جنّوں میں سے کچھ لوگوں کو تیری طرف لائے جو قرآن سُننے کی خواہش رکھتے تھے - جب وہ تیری مجلس میں پہنچے تو کہنے لگے چُپ کرو - تاکہ اس کی آواز ہمارے کانوں میں اچھی طرح پڑے - جب قرآن کریم کی تلاوت ختم ہو گئی تو وہ اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے اور کہنے لگے اے ہماری قوم ہم نے ایک کتاب کی تلاوت سُنی ہے - جو موسٰیؑ کے بعد اُتاری گئی ہے اور جو کتابیں اس سے پہلے اُتری ہیں اُن سب کی تصدیق کرتی ہے اور حق کی طرف بلاتی اور سیدھا راستہ دکھاتی ہے - اے قوم! اللہ تعالیٰ کے منادی کی آواز کو سُنو اور اُسے قبول کرو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دیگا اور تمہیں دردناک عذاب سے بچائیگا -

پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنّ تورات پر - حضرت موسٰیؑ پر اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے تھے - پس سلیمانؑ ہی ایک ایسے نبی نہیں جن پر جنّ ایمان لائے - بلکہ موسٰیؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی قرآن کریم سے ثابت ہے کہ جنّات اُن پر ایمان لائے - مگر افسوس ہے کہ مفسّرین حضرت سلیمانؑ کے جنّوں کے متعلق تو عجیب عجیب قصّے سُناتے ہیں - کہتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام قالین پر بیٹھ جاتے اور چار جنّوں کو چار گوشے پکڑوا دیتے اور وہ انہیں اُڑا کر آسمانوں کی سیر کراتے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو جنّ ایمان لائے اُن کے متعلق کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی یہ ثابت نہیں کرتے

کہ انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کبھی ایسی مدد کی ہو حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھا کر سفر کرتے تھے۔ آپ کے صحابہؓ کو کئی دفعہ سواریاں نہ ملتیں اور وہ روتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کہتے کہ ہمارے لئے کسی سواری کا انتظام فرما دیجئے تو ہم جانے کے لئے حاضر ہیں۔ کئی دفعہ صحابہؓ نے ننگے پیر لمبے لمبے سفر کئے ہیں۔ مگر یہ تمام دُکھ اور تکلیفیں دیکھنے کے باوجود اُن سنگدل جنّوں کا دل نہ پسیجا وہ حضرت سلیمانؑ کے وقت تو لشکر کا لشکر اُٹھا کر دوسری جگہ پہنچا دیتے تھے اور یہاں اُن سے اتنا بھی نہ ہُوا کہ دس بیس مہاجرین کو ہی اٹھا کر میدانِ جنگ میں پہنچا دیتے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنّ غیر از انسان وجود ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ اور حضرت سلیمان علیہم السلام پر ایمان لائے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا اِن معنوں کو قرآن کریم تسلیم کرتا ہے۔ اگر یہ ایک استعارہ ہے تو یقیناً قرآن کریم نے اس کو اپنی کسی دوسری آیت میں حل کیا ہوگا۔ اور استعارہ تسلیم نہ کرنے کی صورت میں قرآن کریم کی دو آیتیں باہم ٹکرا جائیں گی اور اس طرح قرآن کریم میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ پس ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اس کو استعارہ تسلیم نہ کرنے سے قرآن کریم میں اختلاف پیدا ہوتا ہے یا استعارہ تسلیم کرکے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

استعارہ کے متعلق یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو لوگ اسے استعارہ نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ یہ ایسا ہی لفظ ہے جیسے شیطان کا لفظ آتا ہے۔ جس طرح شیطان سے مراد ایک ایسی مخلوق ہے جو انسانوں سے علیحدہ ہے۔ اسی طرح جنّ بھی ایک ایسی مخلوق ہے جو انسانوں سے الگ ہے حالانکہ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ میں مفسرین بالاتفاق کہتے ہیں کہ اسجگہ شیاطین سے مراد یہود اور اُن کے بڑے بڑے سردار ہیں۔ پس اگر انسان شیطان بن سکتا ہے تو انسان جنّ کیوں نہیں بن سکتا۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (انعام ع۱۴) کہ ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے ہیں شیطان آدمیوں میں سے بھی اور جنوں میں سے بھی جو لوگوں کو مخالفت پر اُکساتے اور انہیں نبی اور اس کی جماعت کے خلاف برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالےٰ نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ انسان بھی شیطان ہوتے ہیں۔ پس اگر شیاطین الانس ہوسکتے ہیں تو جن الانس کیوں نہیں ہوسکتے۔ یعنی جس طرح انسانوں میں سے شیطان کہلانے والے پیدا ہوسکتے ہیں اُسی طرح اُن میں جن کہلانے والے بھی پیدا ہوسکتے ہیں۔ بہرحال قرآن کریم سے ہمیں پتہ لگ گیا کہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضہ میں ہی جنّ نہیں تھے بلکہ حضرت موسیٰؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جنّ ایمان لائے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کن کی طرف ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ سورۂ نساء میں اس کے متعلق فرماتا ہے وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا (نساء ع۱۱) ہم نے تجھے تمام آدمیوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اب اللہ تعالےٰ اس آیت میں صاف طور پر فرماتا ہے کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تمام آدمیوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا حالانکہ اگر آدمیوں کے علاوہ کوئی اور نرالی مخلوق جسے جنّ کہتے ہیں آپ پر ایمان لائی تھی تو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ وَالْجِنِّ رَسُوْلًا مگر وہ یہ نہیں فرماتا بلکہ فرماتا ہے کہ ہم نے تجھے آدمیوں کیلئے رسول بنا کر بھیجا۔ تو جب آدمیوں کی طرف ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

مبعوث کئے گئے تھے تو صاف پتہ لگ گیا کہ جہاں یہ ذکر ہے کہ جن آپ پر ایمان لائے وہاں اُن سے جنّ الانس ہی مراد ہیں نہ کہ کوئی اور نرالی مخلوق جس کا نقشہ عام لوگوں کے دماغوں میں ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں جس کے راوی حضرت جابر بن عبداللہ ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے پانچ ایسی خصوصیتیں عطا کی گئی ہیں جو پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ اُن میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ کَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِہٖ خَاصَّةً کہ پہلے ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا وَ بُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ عَامَّةً مگر میں روئے زمین کے تمام آدمیوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ یہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم قطعی طور پر بیان فرماتے ہیں کہ انبیائے سابقین میں سے ایک نبی بھی ایسا نہیں جو اپنی قوم کے سوا کسی اور قوم کی طرف مبعوث ہُوا ہو۔ لیکن مسلمان یہ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جنّوں اور طیور اور چیونٹیوں کی طرف بھی بھیجے گئے تھے۔ اگر واقعہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام جنّوں اور طیور کی طرف مبعوث ہوئے تھے تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نعوذ باللہ درجہ میں بڑھ گئے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو صرف انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے

پھر اگر یہ جنّ غیر از انسان ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے مخاطب کیونکر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ (انعام ع ۱۵) یعنی جب قیامت کے دن سب لوگ جمع ہونگے تو ہم جنّوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہیں گے اے جنّوں کے گروہ! تم نے اکثر حصۂ انسان کو اپنے قابو میں کیا ہُوا تھا ہم تو جنّوں کو تلاش کرتے کرتے تھک گئے مگر قرآن یہ کہتا ہے کہ جنّوں نے اکثروں کو قابو کیا ہُوا ہے۔ حالانکہ ہم تلاش کرتے ہیں تو وہ ملتے نہیں۔ لوگ وظیفے پڑھتے ہیں چلّہ کشیاں کرتے ہیں اور جب اُن کا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور خشکی سے کان بجنے لگتے ہیں تو کہتے ہیں جنّ آگیا۔ حالانکہ اس وقت جنّ نہیں آتا بلکہ اُسوقت وہ خود دنیا سے کھوئے جاتے اور پاگل ہو جاتے ہیں۔ تر و تازہ دماغ کے ہوتے ہوئے جنّ کبھی انسان کے پاس نہیں آتے۔

غرض جنّوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ تم نے انسانوں سے بہت سے فائدے اٹھائے ہیں۔ اور وہ جو انسان ہیں وہ بھی کہیں گے کہ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ ہم میں سے بعض نے بعض سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ اب اپنے اپنے محلہ اور گاؤں میں پھر کر لوگوں سے دریافت کرلو کہ کیا پچاس یا اکاون فیصدی لوگ جنوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں؟ تم سَو میں سے ایک بھی ایسا شخص نہیں ملے گا جو یہ کہتا ہو کہ میں جنّوں سے فائدہ اٹھاتا ہوں اور میرے ان سے تعلقات ہیں۔ جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جنّ سے مراد انسانوں کے علاوہ کوئی اور مخلوق نہیں بلکہ انسانوں میں سے ہی بعض جنّ مراد ہیں۔ اور انسانی جنّوں کی دوستیاں بڑی کثرت سے نظر آتی ہیں۔

پھر اس سے بڑھ کر ایک اَور دلیل ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ۔ اے جنّوں اور انسانوں کے گروہ جو ہمارے سامنے کھڑے ہو۔ بتاؤ کیا تمہارے پاس ایسے رسول نہیں آئے جو تمہیں میں سے تھے۔ اب بتاؤ جب خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر بعض جنّ بھی ایمان لائے اور دوسری طرف یہ فرماتا ہے کہ ہمارا رسول بھی انہیں میں سے تھا

توکیا اس سے صاف ثابت نہیں ہوتا کہ وہ جن بھی انسان ہی تھے کوئی غیراز انسان وجود نہیں تھے ۔ پھر یہیں تک بات ختم نہیں کی بلکہ فرمایا وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۔ وہ تمہیں انذار بھی کرتے تھے اور قیامت کے دن سے ڈراتے تھے ۔ گویا حضرت موسیٰؑ حضرت سلیمانؑ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنوں کو ڈرایا بھی کرتے تھے ۔ اور انہیں یوم آخرت اور اللہ تعالیٰ کا خوف دلایا کرتے تھے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ جن جن الانس ہی تھے کوئی اور مخلوق نہیں تھے ۔ جس طرح شیاطین الانس ہوتے ہیں اسی طرح جن الانس بھی ہوتے ہیں ۔

اب ایک اور موٹی مثال سنو ۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (الفتح ع) کہ ہم نے اس رسول کو اس لئے بھیجا ہے تاکہ تم ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو ۔ اب جبکہ جن بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے تو کیا کوئی ثابت کرسکتا ہے کہ ان جنوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کبھی مدد کی ہو ۔ ایک معمولی ملا کے لئے تو وہ انگوروں کے خوشے لا سکتے ہیں ۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے وہ روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ لائے اور آپ کو بسا اوقات فاقے کرنے پڑے ایک دفعہ آپ کے چہرہ پر ضعف کے آثار دیکھ کر صحابہؓ نے سمجھا کہ آپ کو بھوک لگی ہوئی ہے ۔ چنانچہ ایک صحابیؓ نے بکری ذبح کی اور آپ کو اور بعض اور صحابہؓ کو کھانا کھلایا ۔ مگر ایسے مواقع میں سے ایک موقع پر بھی تو جنوں نے مدد نہیں کی ۔ میں سمجھتا ہوں وہ بڑے ہی بے شرم جن تھے کہ وہ آجکل کے ملنوں کو تو سیب اور انگور لا کر کھلاتے ہیں مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جن پر وہ ایمان لائے تھے انہوں نے کبھی ایک جو کی روٹی بھی نہ دی ۔ پھر وہ مومن کس طرح ہو گئے ۔ وہ تو پکے کافر تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال ہی بالکل غلط ہے کہ جن کوئی ایسی مخلوق ہے جو انسانوں سے نرالی ہے ۔ وہ جن جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے وہ بھی انسان ہی تھے اور جس طرح اور لوگوں نے آپ کی مدد کی وہ بھی مدد کرتے رہے ۔ اگر کوئی نرالی مخلوق مانی جائے تو پھر اس سوال کا حل کرنا ان لوگوں کے ذمہ ہوگا جو جنات کے قائل ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی مدد نہ کی ۔ حالانکہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاچکے تھے ۔ اور انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کریں ۔

پھر اس سے بڑھ کر ایک اور دلیل ہے اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب میں بطور قاعدہ کلیہ کے فرماتا ہے ۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔ (احزاب ع) کہ ہم نے اپنی شریعت اور کلام کو آسمانوں کی مخلوق کے سامنے پیش کیا اور کہا کوئی ہے جو اسے مانے اور اس پر عمل کرے ۔ اس پر تمام آسمانی مخلوق نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم یہ بار امانت اٹھانے کے ہرگز قابل نہیں ۔ پھر ہم نے زمینوں کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا اور کہا ۔ تو یہ بوجھ اُٹھاتے ہو ۔ انہوں نے کہا ہرگز نہیں پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے بھی انکار کیا حالانکہ لوگ عام طور پر یہ کہا کرتے ہیں کہ جن پہاڑوں پر رہتے ہیں فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا سارے ڈر گئے اور کسی نے بھی اس ذمہ واری کو اُٹھانے کی جرأت نہ کی وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ صرف ایک انسان آگے بڑھا اور اس نے کہا ۔ مجھے شریعت دیجیئے ۔ میں

اس پر عمل کرکے دکھاؤں گا۔ فرماتا ہے اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ انسان نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا۔ کیونکہ وہ ہمارے عشق میں سرشار تھا۔ اُس نے یہ نہیں دیکھا کہ بوجھ کتنا بڑا ہے۔ بلکہ شوق سے اُسے اٹھانے کے لئے آگے نکل آیا۔ اب دیکھو یہاں اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ شریعت کو اٹھانے والا صرف انسان ہے۔ اور کوئی شریعت کا مکلّف نہیں۔ اب جبکہ انسان کو ہی خدا نے شریعت دی تو سوال یہ ہے کہ اگر جنّ غیر از انسان ہیں تو وہ کہاں سے نکل آئے اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کا کیوں اظہار کیا۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ غیر از انسان تھے تو خدا تعالیٰ کا کلام باطل ٹھیرتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ انسان کے سوا سب مخلوق نے اس شریعت پر عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور جبکہ قرآن سے بھی ثابت ہے کہ جنّ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو صاف معلوم ہو گیا کہ یہ جنّ انسان ہی تھے غیر از انسان نہیں تھے۔ یہاں بھی جنّ سے مراد جنّ الانس ہی ہیں۔ ایسی مخلوق مراد نہیں جو انسانوں کے علاوہ ہو۔ اور نہ میں ایسے جنّوں کا قائل ہوں جو انسانوں سے آکر چمٹ جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک دوست نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں لکھا کہ میری ہمشیرہ کے پاس جنّ آتے ہیں اور وہ آپ پر ایمان لانے کے لئے تیار ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے انہیں خط لکھا کہ آپ اُن جنّوں کو یہ پیغام پہنچا دیں کہ ایک عورت کو کیوں ستاتے ہو۔ اگر ستانا ہی ہے تو مولوی محمد حسین بٹالوی یا مولوی ثناء اللہ کو جاکر ستائیں۔ ایک غریب عورت کو تنگ کرنے سے کیا فائدہ؟ تو ایسے جنّ کوئی نہیں ہوتے جن کو عام لوگ مانتے ہیں۔ بیشک کئی ایسے لوگ بھی ہونگے جو انگریزی تعلیم کے ماتحت پہلے ہی اس امر کے قائل ہوں۔ لیکن مومن کے سامنے اصل سوال یہ نہیں ہوتا کہ اُس کی عقل کیا کہتی ہے، بلکہ اصل سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے۔ اگر قرآن کہتا ہو کہ جنّ ہوتے ہیں تو ہم کہیں گے آمنّا وصدّقنا۔ اور اگر قرآن سے ثابت ہو کہ انسانوں کے علاوہ جنّ کوئی مخلوق نہیں تو پھر ہمیں یہی بات ماننی پڑے گی۔

اصل بات یہ ہے کہ بعض لوگ بڑے متکبّر اور سرکش ہوتے ہیں جو کسی دوسرے کی اطاعت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ مگر جب انبیاء کے سامنے آتے ہیں تو یکدم اُن کی حالت بدل جاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہی دیکھ لو۔ ابتداء میں وہ اسلام کی کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے تھے اور ایک دفعہ تو انہیں یہاں تک جوش آیا کہ تلوار سونت لی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ کے رُعب کی وجہ سے کانپنے لگ گئے۔ تو بعض طبائع ناری ہوتی ہیں۔ مگر جب نبیوں کے سامنے جاتی ہیں تو ٹھنڈی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایسی طبائع رکھنے والے انسانوں کو عربی زبان میں جنّ کہتے ہیں۔ اسی طرح جنّوں سے وہ لوگ بھی مراد ہوتے ہیں جو محلّات میں رہتے ہیں اور اُن کے دروازہ پر آسانی سے لوگ نہیں پہنچ سکتے۔ چنانچہ لُغت میں لکھا ہے جِنُّ النَّاسِ مُعْظَمُهُمْ (اقرب) یعنی جنّ کا لفظ انسانوں میں سے بڑے آدمیوں کے لئے بولا جاتا ہے کیونکہ اُن کی حفاظت کے لئے بڑے بڑے مضبوط پہریدار مقرر ہوتے ہیں اور ہر شخص آسانی سے اُن تک نہیں پہنچ سکتا۔

پُرانے زمانہ میں تمام بڑے بڑے بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ خاص خاص مقاموں پر لڑنے کیلئے اور اپنے باڈی گارڈز کے طور پر اعلیٰ قبیلوں کے آدمیوں کو بھرتی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جرمن کے بادشاہ وِلیم نے

بھی ایسا دستہ بھرتی کیا ہوا تھا۔ اور نپولین نے بھی
ایسا دستہ بھرتی کیا ہوا تھا اور ہندوستان کے بادشاہ
اکبر نے بھی بارہ کے سیدوں میں سے ایسا دستہ بھرتی
کیا ہوا تھا۔ چنانچہ جب اکبر نے چتوڑ کے قلعہ پر حملہ
کیا اور وہ قلعہ جلد فتح نہ ہو سکا تو اکبر نے اُن رجمنٹوں
کو جو بارہ کے سیدوں میں سے بھرتی ہوئی تھیں حکم
دیا کہ وہ چتوڑ پر حملہ کریں اور وہ اس وقت تک
کٹ کٹ کر مرتے چلے گئے جب تک کہ چتوڑ کے قلعہ
کی دیواروں میں رخنہ پیدا نہ ہو گیا۔ چنگیز خاں نے
بھی ایک خاص قبیلہ میں سے اپنی حفاظت کا دستہ
بھرتی کیا تھا۔ جس کو بڑی عزت دی جاتی تھی۔ اور
اُس دستہ کے افسروں کو بادشاہ کے دربار میں خاص
مقام پر بٹھایا جاتا تھا۔ نپولین کے محافظ دستہ کا
ایک عجیب واقعہ مشہور ہے۔ کہ جب واٹر لُو
کے میدان میں نپولین کی فوج کو شکست ہوئی تو
اس کا محافظ دستہ میدان سے نہیں ہلا۔ لارڈ
ولنگٹن کی فوج گولے پر گولے برسا رہی تھی اور وہ
مرتے چلے جاتے تھے لیکن اپنی جگہ نہیں چھوڑتے تھے
اُس وقت نپولین کی فوج کا ایک جرنیل جو ایک خاص
کام پر بھیجا گیا تھا واپس آیا اور اُس نے جرنل نے کو
جو اس خاص دستہ کا افسر تھا جا کر کہا کہ ہمارا گولہ بارود
ختم ہو چکا ہے اور دشمن بڑھتا چلا آ رہا ہے تم یہاں
کیوں کھڑے ہو۔ پیچھے ہٹو تاکہ کسی طرح بادشاہ
کی جان بچائی جا سکے اور پھر جمع ہو کر دشمن پر حملہ کریں
اس پر جرنل نے نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔
اور نہایت سادگی سے کہا۔" مگر میں کیا کروں مجھے
نپولین نے پیچھے ہٹنا نہیں سکھایا۔"
اسجگہ پر جو جنّ کا لفظ بولا گیا ہے وہ ایسے
ہی خاص دستوں کے لئے بولا گیا ہے۔ کیونکہ اُن
دستوں میں معزز خاندانوں کے افراد بھرتی کئے جاتے تھے
جو گھروں میں اور پہروں کے پیچھے رہنے کے عادی ہوتے
تھے اور جنّ کہلانے کے مستحق تھے جن کے معنے پوشیدہ
وجود کے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو عام طور پر نظر نہیں آتے
اور پوشیدہ رہتے تھے۔ چنانچہ لُغت میں لکھا ہے
کہ جنّ کے معنے ہر ایسی چیز کے ہوتے ہیں جو حواس سے
چھپی ہوئی ہو (اقرب) یعنی جن کی آوازیں سُنائی
نہ دیں۔ اور آنکھوں کو نظر نہ آئیں۔ گویا دُنیا سے الگ
تھلگ رہنے والے لوگ یا دوسرے لفظوں میں امراء
جیسا کہ لُغت نے واضح معنے اس کے امراء بھی کر دیئے
ہیں۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر تین قسم کے
لوگوں پر مشتمل تھا (۱) امراء کا خاص حفاظتی دستہ۔
(۲) عوام الناس کی فوج (۳) رُوحانی لوگوں کا دستہ۔
حضرت سلیمان علیہ السلام ان کو الگ الگ کھڑا کیا کرتے
تھے۔ جس طرح تیمور بھی اپنی فوج کے مختلف لوگوں کو
الگ کھڑا کیا کرتا تھا۔ مگر وہ روحانی لوگوں یا مولویوں
کو فوج کے پیچھے کھڑا کیا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ یہ
جنگ میں سب سے پہلے بھاگیں گے۔ اس لئے اِن کو
پیچھے کھڑا کرنا چاہیئے۔ مگر ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت
سلیمان علیہ السلام کے وقت میں بھی علماء کا یہی حال تھا
ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے
زمانہ میں علماء کا یہ حال نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت علی
رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ صحابہؓ میں سب سے
زیادہ بہادر اور دلیر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے اور
پھر انہوں نے کہا کہ جنگ بدر میں جب رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کے لئے ایک علیحدہ چبوترہ بنایا گیا تو اُس وقت
سوال پیدا ہوا کہ آج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
حفاظت کا کام کس کے سپرد کیا جائے۔ اس پر حضرت
ابوبکر رضی اللہ عنہ فوراً ننگی تلوار لے کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ

یہاں تک کہ جب وہ وادیٔ نملہ میں پہنچے تو نملہ قوم میں سے ایک شخص نے کہا اے نملہ قوم!

ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ

اپنے اپنے گھروں میں چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر (تمہارے حالات کو) نہ جانتے ہوئے تمہیں

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ

پیروں کے نیچے مسل دیں۔ پس وہ (یعنی سلیمانؑ) اُسکی بات سُنکر ہنس پڑا۔ اور کہا۔ اے میرے ربّ!

اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى

مجھے توفیق دے کہ تیری نعمت کا جو تُو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کی ہے شکریہ ادا کر

وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ

سکوں۔ اور ایسا مناسب عمل کروں جسے تُو پسند فرمائے۔ اور اے خدا! اپنے رحم کے ساتھ تُو

فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۰﴾

مجھے اپنے بزرگ بندوں میں داخل کر۔ ۱۰ھ

اِس انتہائی خطرہ کے موقعہ پر نہایت دلیری کے ساتھ آپ کی حفاظت کا فرض سرانجام دیا (تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۲۹) اسی طرح احادیث میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا۔ اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا۔ (الجامع الصغیر جلد اوّل ص ۹۵) یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اُس کا دروازہ ہیں۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے علماء میں سے قرار دیا ہے مگر خیبر کی جنگ میں سب سے نازک وقت میں اسلام کا جھنڈا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ ہی کے ہاتھ میں دیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت علماء بُزدل نہیں تھے بلکہ سب سے زیادہ بہادر تھے۔ ہاں شاعر کمزور ہوتے تھے چنانچہ حسان بن ثابتؓ کے متعلق آتا ہے کہ اُن کا دل بہت کمزور تھا۔

۱۰ھ حل لغات: ۔ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ: حَطَمَ يَحْطِمُ سے مضارع منفی کا صیغہ ہے اور حَطَمَهٗ کے معنے ہیں كَسَرَهٗ کسی چیز کو توڑ دیا (اقرب) پس لَا يَحْطِمَنَّكُمْ کے معنے ہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو توڑ دیں۔

اَوْزِعْنِيْ: اَوْزِعْنِيْ اَوْزَعَ سے امر کا صیغہ ہے اور اَوْزَعَ اللّٰهُ فُلَانًا کے معنے ہیں اَلْهَمَهُ الشُّكْرَ خدا نے اُسے شکر کی توفیق دی۔ (مفردات) پس اَوْزِعْنِيْ کے معنے ہونگے مجھے شکر کی توفیق عطا کر۔

لَا يَحْطِمَنَّكُمْ

اَوْزِعْنِيْ

تفسیر: فرماتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنا لشکر لے کر روانہ ہوئے تو چلتے چلتے ان کا وادی النمل میں سے گذر ہوا (جس کے ایک معنے چیونٹیوں کی وادی کے بھی ہیں) اس لشکر جرار کو دیکھ کر ایک نملہ نے کہا۔ اے بھائیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ کا لشکر تمہیں بےخبری میں اپنے پاؤں تلے روند ڈالے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس کا یہ قول سُنکر ہنس پڑے اور انہوں نے کہا۔ اے میرے خدا! مجھے توفیق دے کہ مَیں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کرسکوں جو تُو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہیں اور مَیں ایسے نیک اور مناسب حال اعمال بجا لاؤں جن سے تو راضی ہوجائے اور تُو مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما۔

مفسّرین نے جس طرح جنوں اور پرندوں کے متعلق مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اسی طرح وادی النمل کے متعلق بھی بہت مبالغہ سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ ایک وادی تھی جس میں چیونٹیاں رہتی تھیں اور چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولی جانتے تھے اس لئے جب چیونٹی بولی تو حضرت سلیمان علیہ السلام فوراً سمجھ گئے کہ اُس نے کیا کہا ہے۔ نہ معلوم ہمارے مفسّرین نے کس کتاب میں پڑھا ہے کہ چیونٹیاں بھی پرندوں کی ایک قسم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمایا تھا کہ ہم نے سلیمان کو منطق الطیر کا علم دیا تھا مگر ہمارے مفسّرین نے انکو چیونٹیوں کی بولی کا علم بھی بخشدیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں لمبے عرصہ تک بارشیں نہ ہوئیں تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ چلو شہر سے باہر نکل کر استسقاءُ کی نماز پڑھیں۔ جب آپ نماز پڑھنے جارہے تھے۔ تو آپ نے دیکھا کہ ایک چیونٹی اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا کر اور آسمان کی طرف مُنہ کرکے خدا تعالیٰ سے یہ دُعا مانگ رہی ہے کہ خدایا ہم بھی تیری مخلوق ہیں ہمیں بارش سے محروم نہ رکھ۔ آپ نے یہ دُعا سُنتے ہی فرمایا کہ اب استسقاء کی نماز پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں واپس چلو۔ اس چیونٹی کی دُعا ہی کافی ہے اور اسی کے نتیجہ میں بارشیں برس جائینگی۔ (تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح البیان جلد ۷، ص ۲۰۹)

پھر مفسّرین نے اپنی تحقیق یہیں تک ہی نہیں رہنے دی بلکہ انہوں نے چیونٹیوں کے قبیلوں کا بھی پتہ لگایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انسانوں میں مغل اور راجپوت اور پٹھان وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح چیونٹیوں میں بھی مختلف قومیں اور قبائل ہیں۔ چنانچہ یہ علم آپ لوگوں کے کام آئیگا کہ چیونٹیوں کے ایک قبیلہ کا نام انہوں نے بنوشیصان بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اسی قبیلہ کی ایک چیونٹی نے یہ بات کہی تھی اور پھر انہوں نے بڑی تحقیق کے بعد اس کے نام کا بھی پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ گو افسوس ہے کہ کسی ایک نام پر اُن کا اتفاق نہیں ہوسکا۔ چنانچہ بعض نے اس کا نام منذرہ بعض نے طافیہ یا لافیہ اور بعض نے حرمی بتایا ہے اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ وہ چیونٹی ایک پاؤں سے لنگڑی تھی۔ اسی طرح مفسّرین نے اس کا قد بھی بتایا ہے۔ چنانچہ بعض کہتے ہیں وہ مُرغ کے برابر تھی۔ بعض کہتے ہیں بھیڑ کے برابر تھی اور بعض کہتے ہیں وہ بھیڑیے کے برابر تھی۔ اسی طرح مفسّرین نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اس نملہ کے ساتھ چالیس ہزار چیونٹیاں بطور نقیب اور ہر نقیب کے ساتھ چالیس چالیس ہزار چیونٹیاں بطور چوبدار رہا کرتی تھیں۔ (تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح البیان جلد ۷، ص ۲۰۵ و تفسیر حسینی)

حالانکہ پہلی بات جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسجگہ نملہ سے مراد چیونٹی نہیں یہ ہے کہ اوپر ذکر تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو

منطق الطیر سکھائی تھی۔ مگر اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ
چیونٹی بولی تو حضرت سلیمان علیہ السلام سمجھ گئے کہ اُس نے
کیا کہا ہے۔ حالانکہ جب دعویٰ یہ تھا کہ حضرت سلیمان
علیہ السلام کو پرندوں کی بولی آتی تھی تو دلیل میں کسی پرندے
کی مثال پیش کرنی چاہیئے تھی۔ مگر مفسرین کہتے ہیں کہ
چیونٹی بولی تو حضرت سلیمان علیہ السلام کو سمجھ آ گئی جو
عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ کا ثبوت ہے۔ حالانکہ چیونٹی پرندہ
نہیں۔ پس نملہ سے مراد اگر چیونٹی لی جائے تو یہ دلیل بالکل
عقل میں نہیں آ سکتی۔ قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ
حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولی آتی تھی۔ اور
وہ اس کو سمجھتے تھے مگر بولنے لگ جاتی ہے نملہ۔ اور وہ
اس بات کو سمجھ جاتے ہیں۔ غرض پہلی بات جو اس ضمن
میں قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ نملہ کیا چیز ہے؟

دوسری چیز یہ قابلِ غور ہے کہ یہاں حطم
کا لفظ آتا ہے اور حَطَمَ کے معنے توڑنے اور غصہ سے
حملہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ عام طور پر لوگ اس کا ترجمہ یہ
کر دیتے ہیں کہ سلیمانؑ اور اس کا لشکر تمہیں اپنے پیروں
کے نیچے نہ کچل دیں۔ مگر یہ حَطَمَ کے درست معنے
نہیں۔ عربی میں حطم کے معنے توڑ دینے اور غصہ میں
حملہ کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں دوزخ کی آگ
کا ایک نام حُطَمَۃ بھی رکھا گیا ہے کیونکہ وہ جلا دیتی
ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ آگ کے پیر ہونگے اور وہ لوگوں
کو اپنے پاؤں کے نیچے مسل دیگی۔ پس لَا یَحْطِمَنَّکُمْ
کے معنے یہ ہوئے کہ ایسا نہ ہو سلیمانؑ اور اس کا لشکر
تمہیں توڑ دے یا غصہ سے حملہ کر دے اور تباہ کر دے
اب سوال یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ جو اتنے بڑے نبی
تھے جن کے پاس جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے
لشکر در لشکر تھے کیا اُن کا سارا غصہ چیونٹی پر نکلتا تھا
اور کیا اُن سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ چیونٹیوں پر
حملہ کرنے لگ جائیں گے۔ مَیں بتا چکا ہوں کہ لَا یَحْطِمَنَّکُمْ
کے معنے پیروں میں مسل دینے کے نہیں بلکہ طاقت کو توڑ دینے
اور حملہ آور ہونے کے ہیں۔ اسی لئے عربی زبان میں قحط
کو حاطوم کہتے ہیں کیونکہ اُس سے ملک کی طاقت ٹوٹ
جاتی ہے۔ اگر یہ معنے کئے جائیں تو پھر اس کا مطلب یہ
ہو گا کہ چیونٹیوں نے ایک دوسری سے کہا کہ اپنے اپنے
بلوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کا لشکر
کلہاڑیاں اور کدالیں لے کر آ جائے اور ہماری بلوں کو
کھود کھود کر غلّہ کے دانے نکال لے اور اس طرح ہماری
طاقت کو توڑ دے۔ مگر کیا کوئی عقلمند ان معنوں کو
درست تسلیم کر سکتا ہے؟

تیسری دلیل جو نہایت ہی بیّن اور واضح ہے وہ
یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے جتنے صیغے استعمال
کئے ہیں سب وہ ہیں جو ذوی العقول کے لئے استعمال
ہوتے ہیں۔ مثلاً اُدْخُلُوْا کا لفظ آتا ہے۔ حالانکہ
چیونٹیوں کے لحاظ سے اُدْخُلْنَ کا لفظ آنا چاہیئے تھا
اسی طرح لَا یَحْطِمَنَّکُمْ میں کُمْ کا لفظ آتا ہے۔
حالانکہ کُنَّ کا لفظ آنا چاہیئے تھا۔ پس قرآن مجید کے
الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ کوئی انسان تھے جن کے لئے
کُمْ اور اُدْخُلُوْا وغیرہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں
پھر وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ کہہ کر بھی اس بات کو واضح
کر دیا گیا ہے کہ وہ چیونٹیاں نہیں تھیں۔ کیونکہ لشکر
تو الگ رہے چیونٹیاں تو نبیوں کے پاؤں کے نیچے بھی
آ جاتی ہیں۔ پس اگر اس جگہ نملہ سے مراد چیونٹی لی جائے
تو یہ کہنا کہ سلیمانؑ اور اُس کا لشکر تم کو بے جانے اپنے
پاؤں کے نیچے کچل نہ دے ایک بالکل بے معنے فقرہ بن
جاتا ہے۔ کیا دنیا کی کسی بھی مذہبی کتاب میں لکھا ہے۔
خواہ اسلامی ہو یا قبل از اسلام کی کوئی اور کتاب کہ
کوئی نبی سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھتے ہوئے چلتا تھا کہ

کہیں کوئی چیونٹی اُس کے پیروں کے نیچے نہ آجائے۔

حقیقت یہ ہے کہ وادی النمل کوئی چیونٹیوں کی وادی نہیں تھی بلکہ ایک حقیقی وادی تھی جس میں انسان بستے تھے۔ چنانچہ تاج العروس جو لُغت کی مشہور کتاب ہے اُس میں لکھا ہے کہ شام کے ملک میں جبرین اور عسقلان کے درمیان ایک علاقہ ہے جسے وادی النمل کہا جاتا ہے۔ اور عسقلان کے متعلق تقویم البلدان میں لکھا ہے کہ یہ ساحل سمندر کے بڑے بڑے شہروں میں سے ایک شہر ہے جو غزّہ سے جو سینا کے ملحق فلسطین کی ایک بندرگاہ ہے بارہ میل اوپر شمال کی طرف واقع ہے اور جبرین شمال کی طرف کا ایک شہر ہے جو ولایت دمشق میں واقع ہے (تقویم البلدان صفحہ ۲۳۸ و معجم البلدان جلد ۸ صفحہ ۱۷۱)

پس وادی النمل ساحل سمندر پر یروشلم کے مقابل پر یا اُس کے قریب دمشق سے حجاز کی طرف آتے ہوئے ایک وادی ہے جو اندازاً دمشق سے سو میل نیچے کی طرف تھی اِن علاقوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت تک عرب اور مدین کے بہت سے قبائل بستے تھے (مقام کی وضاحت کیلئے دیکھو نقشہ فلسطین و شام بعہد قدیم و عہد جدید نیلسنز انسائیکلوپیڈیا)

اب رہ گیا نملہ سو قاموس میں البرق کے ماتحت لکھا ہے۔ وَالْاَبْرَقَةُ مِنْ مِيَاهِ النَّمْلَةِ (قاموس جلد ۳ صفحہ ۲۱۹) کہ نملہ قوم کے چشموں میں سے ایک چشمہ کا نام ابرقہ تھا۔ غرض لغت اور جغرافیہ کی مدد سے بھی نملہ قوم بھی مل گئی اور وادی النمل کا بھی پتہ مل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ علاقہ شام میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے علاقہ کے نزدیک تھا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ اِس قسم کے نام پُرانے زمانہ میں بڑے مقبول تھے چنانچہ جنوبی امریکہ میں بعض قوموں کے نام بھیڑیا۔ سانپ بچھو اور کنکھجورا وغیرہ ہُوا کرتے تھے۔ بلکہ ہمارے ملک میں ہی ایک قوم کا نام کاڈھا ہے۔ نورالدین کاڈھا لاہور کے ایک مشہور شخص ہوئے ہیں۔ اِسی طرح ایک قوم کا نام کیڑے ہے۔ ایک کا نام مکوڑے ہے۔ کشمیر میں ایک قوم کا نام ہاپت ہے جس کے معنے ریچھ کے ہیں۔ اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام جب ملکۂ سبا پر حملہ کرنے کے لئے اپنے ملک سے یمن کی طرف چلے تو اُن کا گذر نملہ قوم کی وادی میں سے ہوا جس کو غلطی سے مفسّروں نے چیونٹیوں کی وادی بنا لیا ہے۔ جب آپ وہاں پہنچے تو نملہ قوم کی ملکہ نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا کہ اے نملہ قوم کے لوگو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ یہ خیال کرکے کہ تم سلیمانؑ کے لشکر کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو سلیمان اور اس کا لشکر تمہیں پاؤں کے نیچے روند ڈالیں۔ اِن الفاظ نے مفسّرین کو اور بھی جرأت دلائی اور انہوں نے یقینی طور پر اسے ایک چیونٹی کا کلام قرار دے دیا۔ حالانکہ جب کوئی حملہ آور کسی مقابل قوم کو سختی سے شکست دیتا ہے تو اس کے لئے محاورہ میں روند ڈالنے کے الفاظ ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ پس اوّل تو محاورہ کے لحاظ سے یہ لفظ بالکل واضح تھا لیکن اگر وہ لغت کو دیکھتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ حَطَمَ کے معنے توڑ ڈالنے کے بھی ہیں (اقرب) اور مراد یہ ہے کہ اُس نملہ قوم کی ملکہ نے کہا کہ سلیمانؑ تم کو توڑ نہ ڈالے یعنی تمہاری قوت اور شوکت کو کچل نہ دے۔ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا۔ اس پر سلیمانؑ اُس نملہ کی بات سُن کر ہنس پڑے۔

یہاں مفسّروں نے یہ عجیب بات نکالی ہے کہ سلیمانؑ جسے خدا نے پرندوں کی بولی سکھائی تھی اور مفسّروں نے چیونٹیوں کی۔ اُس نے چیونٹیوں کے سردار کی بات فوراً سمجھ لی اور ہنس پڑا کہ دیکھو چیونٹیاں بھی مجھے کتنا انصاف پسند سمجھتی ہیں کہ بے سوچے سمجھے تو میرا پَیر چیونٹی پر پڑ سکتا ہے۔ لیکن مَیں جان بوجھ کر کسی چیونٹی پر بھی پَیر نہیں رکھونگا۔ حالانکہ کوئی شریف آدمی بھی

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ

اور اُس نے سب پرندوں کی حاضری لی۔ پھر کہا۔ مجھے کیا ہُوا ہے کہ مَیں ہُدہُد کو نہیں دیکھتا۔

اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿٢١﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا

یا وہ (جان بُوجھ کر) غیر حاضر ہے۔ مَیں اُس کو یقیناً سخت سزا

خواہ وہ غیرنبی ہو جان بُوجھ کر چیونٹیوں کے اوپر پیر نہیں رکھا کرتا۔ ہم نے تو کئی شریف آدمیوں کو دیکھا ہے کہ برسات کے موسم میں جب کیڑے زمین میں سے نکل آتے ہیں تو وہ بچ بچ کر چلتے ہیں کہ کہیں زیادہ کیڑے اُن کے پیر کے نیچے آکر نہ مارے جائیں۔ پس یہ بات تو غلط ہے۔ اصل بات صرف اتنی تھی کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم ہُوا کہ نملہ قوم کی ملکہ نے اپنی قوم کو کہہ دیا ہے کہ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ جاؤ۔ اور مخالف مظاہرہ نہ کرو۔ تاکہ اس مظاہرہ سے بھڑک کر حضرت سلیمانؑ کا لشکر اُن پر حملہ نہ کردے۔ اور اُن کو پتہ بھی نہ لگے کہ سردارِ قوم نے اپنی قوم کو عجز و انکسار کا حکم دیا ہے۔ تو آپ ہنس پڑے کہ خدا تعالیٰ نے کس طرح دُور دراز کے ملکوں تک بھی یہ بات پھیلا دی ہے کہ سلیمانؑ ظالم نہیں اور وہ ادنےٰ اقوام کے ساتھ بھی انصاف کا سلوک کرتا ہے۔

نملہ قوم کی ملکہ کا یہ اعلان کرنا کہ اپنے اپنے گھروں میں گھُس جاؤ اور دروازے بند کرلو۔ دراصل اس جنگی دستور کے مطابق تھا کہ جب کوئی لشکر کہیں سے گذرے اور وہاں کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھُس جائیں اور دروازے بند کریں تو اس کے معنے یہ ہوتے تھے کہ وہ اپنی شکست تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقعہ پر بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان کرا دیا تھا کہ جو لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھُس جائیں گے اور دروازے بند کریں گے۔ تو اُن سے کوئی بازپُرس نہیں ہوگی۔ یہی نملہ نے کہا۔ کہ اپنے اپنے گھروں میں گھُس جاؤ اور دروازے بند کرلو۔ حضرت سلیمانؑ سمجھ جائیں گے کہ یہ میرا مقابلہ کرنا نہیں چاہتے۔ اگر ہم باہر رہینگے تو ممکن ہے وہ حملہ کردیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب نملہ قوم کی ملکہ کا یہ اعلان پہنچا۔ تو وہ ہنسے اور انہوں نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میری نیکی اور تقوٰی کی کتنی دُور دُور خبر پہنچی ہوئی ہے۔ یہ قوم بھی جو اتنی دُور رہتی ہے سمجھتی ہے کہ سلیمانؑ ظالمانہ طور پر حملے نہیں کیا کرتا۔ اگر ہم اپنے دروازے بند کرلیں گے تو یہ ہم پر حملہ نہیں کریگا حالانکہ اس زمانہ کے جنگی دستور کے مطابق جو فاتح قوم ہوتی تھی وہ ملک کو لوٹ لیا کرتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے خدا تعالیٰ سے مخاطب ہوکر کہا کہ اے اللہ! یہ نیک شہرت تیرے فضل سے ہوئی ہے۔ پس تو مجھے توفیق دے کہ مَیں تیرے اس انعام کا شکریہ ادا کروں جو تُو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر نازل کیا ہے اور ہمیشہ ایسے کام کروں جن سے تو راضی ہو۔ یعنی جس طرح اب ایک نملہ نے تسلیم کیا ہے کہ سلیمانؑ اور اُس کے ساتھی جانتے بُوجھتے ہوئے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اگر ان لوگوں کے ہاتھوں سے کوئی نقصان پہنچا

شَدِیْدًا اَوْ لَاۡاَذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۲﴾

دوں گا۔ یا اُسے قتل کر دونگا۔ یا وہ میرے سامنے کوئی کُھلی دلیل (اپنی غیرحاضری کی) پیش کریگا۔ ۱۱؎

تو وہ محض غفلت کا نتیجہ ہوگا۔ ورنہ ارادتًا وہ کوئی ظلم اور تعدّی نہیں کر سکتے۔ اِسی طرح تُو مجھے اور میرے لشکریوں کو توفیق عطا فرما کہ وہ ہمیشہ اعلیٰ درجہ کے اخلاق سے آراستہ رہیں اور ہمیشہ لوگ یہ تسلیم کرتے رہیں کہ اِن لوگوں کے ہاتھوں سے دیدہ و دانستہ کوئی ظلم سرزد نہیں ہو سکتا۔ اور تُو اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما دے۔

۱۱؎ **تفسیر**:۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے سارے لشکر کا جائزہ لیا اور امراء لشکر کو اپنے سامنے حاضری کا حکم دیا تو اُس وقت علماء میں سے ایک سردار کو جس کا نام ہُدہُد تھا انہوں نے غائب پایا اِس نہایت ہی نازک موقعہ پر جبکہ آپ ایک ملک پر حملہ کرنے کے لئے جا رہے تھے اپنے لشکر کے ایک سردار کو غائب دیکھکر حضرت سلیمان علیہ السلام کا غصہ بھڑک اُٹھا اور اُن کا ذہن اس طرف منتقل ہوگیا کہ مبادا اِس میں کوئی سازش کام کر رہی ہو۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ کیا ہُدہُد پر میری نظر نہیں پڑی یا وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔ اب مَیں اُسے یا تو کوئی شدید ترین سزا دونگا یا اُسے قتل کر دونگا اور یا پھر اُسے میرے سامنے کوئی واضح ثبوت پیش کرنا پڑے گا کہ وہ کیوں غائب رہا۔

مفسّرین خیال کرتے ہیں کہ سچ مچ کے پرندے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں شامل تھے اور لشکر کا ایک سردار ہُدہُد پرندہ تھا جس کو چھوٹے بچے بھی غلیلوں سے مار لیتے ہیں۔ اِس زبردست لشکر کو لے کر حضرت سلیمان علیہ السلام یمن کا ملک فتح کرنے کے لئے نکلے تھے۔ ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ یہ قصّہ ہُدہُد کو سردار ثابت نہیں کرتا بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو نعوذ باللہ بیوقوف ثابت کرتا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کے نبی بیوقوف نہیں ہُوا کرتے۔ یمن کا ملک فتح کرنے کے لئے کبوتر۔ فاختہ۔ چڑیاں۔ ہُدہُد۔ بٹیر اور تلیئرے کر نکلنا کسی عقلمند کا کام نہیں ہو سکتا۔ ایسے لشکروں کو فتح کرنے کے لئے بادشاہ کی فوجوں کو نکلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے لشکروں کے آنے کی خبر سُن کر تو سارا شہر کی گلیوں میں بچے اپنی غلیلیں لیکر نکل پڑیں گے اور سارے شہر کیلئے عید کا دن آجائیگا اور خوب پرندوں کا گوشت کھایا جائیگا۔ آخر یہ جنگ ہونے لگی تھی یا چڑیماروں کا مظاہرہ ہُوا تھا۔

تفسیروں کے اِن قصّوں کو پڑھ کر خیال آتا ہے کہ تیمور جو کچھ کرتا تھا ٹھیک ہی کرتا تھا۔ کیونکہ جو علماء جنگ کو ایسی حقیر کھیل سمجھتے تھے اُن کو لشکر کے پیچھے ہی رکھنا مناسب تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ جن کے متعلق ابھی یہ کہا گیا ہے کہ وہ ایک چیونٹی کو بھی جانتے ہوئے اپنے پیروں کے نیچے نہیں کچلتے تھے۔ اب اتنے غصّے میں آ گئے کہ ہُدہُد جیسے جانور کے متعلق جو ایک بڈّی کے برابر ہوتا ہے اور کوئی عقل نہیں رکھتا فرماتے ہیں کہ یا تو وہ کوئی زبردست دلیل لائے ورنہ مَیں اُس کو ذبح کر ڈالوں گا۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون پرندوں سے وہ اُمید رکھنی جو بلند عقل کے مالک انسانوں سے رکھی جاتی ہے ایک نبی کا کام نہیں ہو سکتا۔ نہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایسا کرتے تھے۔ آخر قرآن ہمارے سامنے ہے کیا قرآن سے یہی پتہ لگتا ہے کہ پرندے ایسی عقل کے مالک ہیں۔ اگر اُن سے کوئی قصور

سرزد ہو تو آدمی تلوار لے کر کھڑا ہو جائے اور اُسے کہے وجہ بیان کرو ورنہ ابھی تمہارا سر کاٹ دونگا - یا کبھی تم نے دیکھا کہ تمہارا کوئی ہمسایہ ہُدہُد پکڑ کر اُسے سوٹیاں مار رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ میرے دانے تُو کیوں کھا گیا تھا اور اگر تم کسی کو ایسا کرتے دیکھو تو کیا تم اُسے پاگل نہیں قرار دوگے - پھر وہ لوگ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف یہ امر منسوب کرتے ہیں کہ انہوں نے ہُدہُد کے متعلق یہ کہا وہ اپنے عمل سے یہی فتویٰ حضرت سلیمان علیہ السلام پر بھی لگاتے ہیں بلکہ حضرت سلیمانؑ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میں اُسے سخت ترین سزا دونگا - اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ - ورنہ وہ ایسی دلیل پیش کرے جو نہایت ہی واضح اور منطقی ہو - گویا وہ ہُدہُد سقراط بقراط اور افلاطونؔ کی طرح دلائل بھی جانتا تھا - اور حضرت سلیمانؑ اس سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنے دلائل پیش کرے گا -

(۲) پھر قرآن تو یہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جنوں انسانوں اور طیور کے لشکر تھے مگر حضرت سلیمانؑ کی نظر صرف ہُدہُد کی طرف جاتی ہے - اور فرماتے ہیں مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ کیا ہوا کہ اس لشکر میں ہُدہُد کہیں نظر نہیں آتا - دُنیوی حکومتوں میں تو جس کا قد پانچ فٹ سے کم ہو - وہ فوج میں بھرتی کے قابل نہیں سمجھا جاتا - مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ عجیب بھرتی شروع کر دی تھی کہ ہُدہُد بھی اُن کے لشکر میں شامل تھا - پھر ہُدہُد کی کوئی فوج آپ کے پاس ہوتی - تب بھی کوئی بات تھی - بتایا یہ جاتا ہے کہ ہدہد صرف ایک آپ کے پاس تھا - اُس ایک ہُدہُد نے بھلا کیا کام کرنا تھا - اور ایک جانور ساتھ لے جانے سے کیا مطلب تھا -

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے - کہ ہُدہُد نے یہ یہ کہا - اور معجزہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولی سمجھتے تھے حالانکہ اصولی طور پر یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ بیان ہونا چاہیئے تھا - مگر بیان ہُدہُد کا معجزہ ہوتا ہے جو سلیمان علیہ السلام کے معجزہ سے بھی بڑھکر ہے -

(۴) ایک اور بات یہ بھی ہے کہ ہُدہُد اُن جانوروں میں سے نہیں جو تیز پرواز ہوں اور اس قدر دُور کے سفر کرتے ہوں - یہ جہاں پیدا ہوتا ہے وہیں مرتا ہے - مگر قرآن یہ بتلاتا ہے کہ ہُدہُد دمشق سے اُڑا اور ۱۵۰۰ سو میل اُڑتا چلا گیا - یہاں تک کہ سبا کے ملک تک پہنچا اور وہاں سے خبر بھی لے آیا - گویا وہ ہُدہُد آجکل کے ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ تیز رفتار تھا - اور معجزہ دکھانے والا ہُدہُد تھا نہ کہ حضرت سلیمانؑ - حالانکہ بتانا یہ مقصود تھا کہ حضرت سلیمانؑ نے معجزہ دکھایا -

(۵) اسی ہُدہُد کا دوسرا معجزہ یہ ہے کہ وہ شرک اور توحید کے باریک اسرار سے بھی واقف تھا - اور اس کو وہ وہ مسئلے معلوم تھے جو آجکل کے مولویوں کو بھی معلوم نہیں - کتنی اعلیٰ توحید وہ بیان کرتا ہے کہتا ہے - وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ - یعنی میں نے اُسے اور اُس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بجائے سورج کو سجدہ کرتے ہیں - اور شیطان نے اُن کے عمل اُنہیں خوبصورت کرکے دکھائے ہیں اور انہیں سچے راستہ پر چلنے سے روک دیا ہے - جس کی وجہ سے وہ ہدایت نہیں پاتے - پھر اُس کی غیرتِ دینی دیکھو آجکل کے مولویوں کے ہمسایہ میں بُت پرستی ہو رہی ہو تو وہ اس کے روکنے کی کوشش نہیں کرتے مگر ہُدہُد چاروں طرف اُڑتا پھرتا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو خبر دیتا ہے کہ فلاں جگہ

شرک ہے۔ فلاں جگہ بُت پرستی ہے۔

(۶) پھر وہ سیاسیات سے بھی واقف تھا۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ اُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ۔ یعنی ملکۂ سبا کے پاس بادشاہت کی تمام صفات موجود ہیں۔ گویا وہ اُس کے تمام خزانے اور محکمے چیک کرکے آیا۔ اور اُس نے رپورٹ کی کہ تمام وہ چیزیں جن کی حکومت کے لئے ضرورت ہے، وہ اُس کے پاس موجود ہیں۔

(۷) پھر شیطان اور اُس کی کارروائیوں سے بھی وہ خوب واقف ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے میں جانتا ہوں انسان کا جب شیطان سے تعلق پیدا ہو جائے تو بُرے خیالات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ اُن خیالات کے نتائج سے بھی واقف تھا۔ کیونکہ کہتا ہے فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ ایسے خیالات کے نتیجہ میں شیطان نے انہیں اللہ تعالیٰ کے قرب کے راستہ سے دُور پھینک دیا ہے۔

یہ ہُدہُد کیا ہوا۔ اچھا خاصہ عالم ٹھہرا۔ ایسا ہُدہُد اگر آج مل جائے تو سارے مولویوں کو نکال کر اُسی کو مفتی بنا دینا چاہیئے۔

(۸) ہاں ایک بات رہ گئی۔ اور وہ یہ کہ وہ تختِ سلطنت کی حقیقت سے بھی خوب واقف تھا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ ملکۂ سبا کے پاس ایک عظیم الشان تخت ہے جو آپ کے پاس نہیں۔ گویا وہ لالچ بھی دلاتا ہے اور کہتا ہے اُس پر حملہ کیجیئے۔

یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ یہ ہُدہُد کوئی پرندہ نہیں تھا۔ کیونکہ قرآن میں صاف موجود ہے کہ وہ امانت جسے فرشتے بھی نہ اُٹھا سکے۔ جسے آسمان اور زمین کی کوئی چیز اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اُسے انسان نے اُٹھا لیا۔ وہی ہے جو ہماری شریعت کے رموز کو جانتا ہے۔ فرشتہ ایک ہی بات سمجھتا ہے یعنی نیکی کی بات کو مگر انسان نیکی اور بدی دونوں پہلوؤں کو جانتا اور تمام حالات پر مکمل نگاہ رکھتا ہے۔ مفسر کہتے ہیں کہ ہُدہُد کوئی جانور تھا۔ حالانکہ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ والی آیت موجود ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کے سوا کوئی اَور مخلوق اسرارِ شریعت کی حامل نہیں۔ پس جبکہ ہُدہُد بھی اسرارِ شریعت سے واقف تھا تو لازماً وہ بھی انسان ہی تھا نہ کہ پرندہ۔

بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ اگر یہ ہُدہُد آدمی ہی تھا تو اُس کے لئے ذبح کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ عربی زبان میں ذبح کا لفظ قتل کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (تاج العروس) جیسے قرآن کریم میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے متعلق ہی آتا ہے کہ یُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ (قصص آیت ۵) وہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کیا کرتا تھا۔ اگر ذبح کے لفظ سے هُدْهُد کو پرندہ قرار دینا درست ہو سکتا ہے تو کیا یُذَبِّحُ اَبْنَاءَهُمْ کے یہ معنے ہیں کہ وہ سب پرندے تھے جن کو ذبح کیا جاتا تھا۔

پھر بعض دفعہ جب کسی مناسبت کی بناء پر کوئی نام رکھا جاتا ہے تو حسنِ کلام کے لئے الفاظ بھی اُسی رنگ کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسے کسی کو شیر قرار دیا جائے تو کہا جائیگا کہ وہ شیر کی طرح دھاڑتا ہے یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ شیر کی طرح سُریلی آواز سے گاتا ہے۔ اِسی طرح جب ہُدہُد کا ذکر کیا گیا تو گو وہ ایک سردار تھا مگر ہُدہُد کی مناسبت سے اُس کے لئے ذبح کا لفظ استعمال کر دیا گیا جو حسنِ کلام کا ایک لطیف نمونہ ہے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن میں ہُدہُد نام کیوں رکھا گیا۔ اور گو اُس کا عقلی جواب میں قرآن کریم سے ہی دے چکا ہوں۔ مگر اب بتاتا ہوں کہ ہُدہُد

سے مراد کیا ہے۔ ہُدہُد کا پتہ لینے کیلئے جب ہم بنی اسرائیل کی کتابیں دیکھتے ہیں اور اس امر پر غور کرتے ہیں کہ کیا اُن میں کسی ہُدہُد کا ذکر آتا ہے۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں یہودیوں میں کثرت سے ھَدَدْ نام ہوا کرتا تھا۔ جو عبرانی سے عربی میں بدل کر ہُدہُد ہو گیا۔ جیسے عبرانی میں ابراہام کہا جاتا ہے مگر جب یہ لفظ عربی میں آیا تو ابراہیم بن گیا۔ اسی طرح عبرانی میں یسوع کہا جاتا ہے اور عربی میں عیسٰی کہتے ہیں اسی طرح عبرانی میں موشے کہا جاتا ہے اور عربی میں یہی نام موسیٰ ہو گیا۔ اب بھی کسی اہل عرب کو لکھنؤ کہنا پڑے تو وہ لکھنؤ نہیں بلکہ لکھنا ہور کہے گا۔ اسی طرح عبرانی میں ھَدَدْ کہا جاتا تھا مگر چونکہ قرآن کریم عربی میں ہے اس لئے جب یہ نام اس میں آیا تو ھُدھُد ہو گیا۔

تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ھُدَدْ کئی ادومی بادشاہوں کا نام تھا۔ اور اس کے معنے بڑے شور کے ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں بھی ھدّ کے ایک معنے اَلصَّوْتُ الْغَلِیْظُ یعنی بڑی بلند آواز کے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اونچی آواز والے لڑکے کا نام ھُدَدْ یا ھُدْ ھُدْ رکھ دیتے تھے مگر یہ نام تیسرے ادومی بادشاہ کا بھی تھا جس نے مدین کو شکست دی تھی۔ اور آخری بادشاہ کا نام بھی یہی تھا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ایک لڑکے کا نام بھی ہُدہُد تھا (پیدائش باب ۲۵ آیت ۱۴)

بائیبل کی کتاب سلاطین باب ۱۱ آیت ۱۴ میں بھی ادوم کے خاندان کے ایک شہزادہ کا ذکر آتا ہے جس کا نام ہدد تھا اور جو یوآب کے قتل عام سے ڈر کر مصر بھاگ گیا تھا۔ جیوئش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ اُرا نے عہد نامہ میں جب یہ لفظ اکیلا آوے تو اُس کے ساتھ کوئی صفاتی فعل یا لفظ نہ ہو تو اس کے معنے ادومی خاندان کے آدمی کے ہوتے ہیں۔

غرض یہ ھُدْ ھُدْ عبرانی زبان کا لفظ ھُدَدْ ہے جو عربی زبان میں آکر ھُدْ ھُدْ ہو گیا۔ چونکہ مفسرین کو یہ شوق ہوتا ہے کہ اپنی تفسیر کو دلچسپ بنائیں اس لئے وہ بعض دفعہ بے ہودہ قصے بھی اپنی تفسیروں میں درج کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ضبّ عربی میں گوہ کو کہتے ہیں۔ مگر ضبّ عرب کے ایک قبیلے کے سردار کا بھی نام تھا۔ اور یہ ایسا ہی نام ہے جیسے ہندوؤں میں طوطا رام نام ہوتا ہے وہ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اُس نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا۔ اب وعظ کی کتابوں میں اس بات کو ایک قصہ کا رنگ دیتے ہوئے یوں بیان کیا گیا ہے۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کہیں جا رہے تھے کہ راستہ میں ایک سوراخ میں سے گوہ نکلی۔ اور اُس نے قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اب جن لوگوں نے یہ بنا لیا کہ ایک گوہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں قصیدہ پڑھا تھا اُن کے لئے ہُدہُد کا پرندہ بنا لینا کونسا مشکل کام تھا۔ چنانچہ مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہُدہُد کے غائب ہونے کا اس طرح پتہ چلا کہ ایک دفعہ چلتے چلتے وہ ایک ایسے میدان میں پہنچے جہاں پانی نہیں ملتا تھا۔ نماز کا وقت آیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے وضو کرنا چاہا مگر انہیں پانی نہ ملا۔ انہوں نے کہا۔ ہُدہُد کہاں ہے اُسے کہو کہ پانی تلاش کرے۔ کیونکہ پہلے بھی جب لشکر کو پانی کی ضرورت ہوتی تھی تو ہُدہُد ہی پانی کی جگہ بتایا کرتا تھا۔ مگر اُس روز اُسے ڈھونڈا تو وہ نہ ملا جس پر حضرت سلیمان علیہ السلام کو غصہ آ گیا۔ اور

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ

پس کچھ دیر وہ ٹھہرا (اتنے میں ہُدہُد حاضر ہُوا) اور اُس نے کہا کہ مَیں نے اُس چیز کا علم حاصل کیا ہے جو تجھے حاصل نہیں

بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ

اور مَیں سبا (کی قوم کے علاقہ) سے تیرے پاس (آیا ہوں) (اور) ایک یقینی خبر لایا ہوں۔ (جو یہ ہے کہ) مَیں نے (وہاں)

امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا

ایک عورت کو دیکھا جو اُن (کی ساری قوم) پر حکومت کرتی ہے۔ اور ہر نعمت اُسے حاصل ہے۔ اور اس کا ایک

عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۴﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ

بڑا تخت ہے۔ اور مَیں نے اُس کو اور اُس کی قوم کو اللہ کے سوا سورج کے آگے سجدہ

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

کرتے دیکھا۔ اور شیطان نے اُن کے عمل اُن کو خوبصورت کرکے دکھائے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ ہُدہُد آیا تو مَیں اُسے شدید سزا دونگا یا اُسے ذبح کردونگا۔ مگر بعض نے اس واقعہ سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ اصل واقعہ یہ نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر پرندوں کے جھنڈ ہمیشہ سایہ رکھتے تھے۔ ایک دن اچانک ایک سوراخ میں سے دھوپ آگئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو آپ کو پتہ لگ گیا کہ ہُدہُد کی جگہ خالی ہے۔ (تفسیر روح المعانی)

غرض مفسّرین نے عجیب وغریب حکایات اپنی تفسیروں میں لکھدی ہیں حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ قرآن کریم میں جو ہُدہُد کہا گیا ہے یہ ھَدَدْ کا معرب ہے اور اس سے مراد ادومی خاندان کا کوئی شہزادہ ہے جو آپ کے فوجی سرداروں میں سے ایک سردار تھا۔ یہ ادومی خاندان حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت میں بستا تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے خاندان کا رقیب تھا۔

اس قوم کے سردار کو جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے نہ پایا۔ تو سمجھا کہ یہ رقیب قبیلہ کا سردار ہے ممکن ہے کہ کسی شرارت کی نیت سے دشمن کے ملک میں چلا گیا ہو۔ اور اس پر اُن کو غصہ آگیا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ہُدہُد عرب قبیلہ کا کوئی سردار ہو۔ کیونکہ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام بھی ہُدہُد تھا۔ اور تاریخی طور پر یہ امر ثابت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت تک اس رستہ میں جو فلسطین سے یمن کی طرف آتا ہے عرب قبیلے بستے تھے (تقویم البلدان) اور چونکہ عربوں اور یہودیوں کی باہم سخت چپقلش تھی اور گو وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ماتحت آگئے تھے

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٢٥﴾ اَلَّا

اور اُن کو سچے راستہ سے روک دیا ہے ۔ جس کی وجہ سے وہ ہدایت نہیں پاتے ۔ اور مُصر ہیں کہ

يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ

اللہ کو سجدہ نہ کریں جو کہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ تقدیر کو ظاہر کرتا

وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿٢٦﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ

ہے اور جو کچھ تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو اُن تدبیروں کو بھی جانتا ہے ۔ حالانکہ اللہ وہ ہے

اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿٢٧﴾ السجدۃ

جس کے سوا کوئی معبود نہیں (وہ) ایک بڑے تخت کا مالک ہے ۱۲ ع

السجدۃ

لیکن مخالفت اب تک باقی تھی ۔ اس لئے جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ عرب قوم کا ایک سردار غائب ہے تو اُن کے دل میں شبہ پیدا ہوا اور وہ ناراض ہو گئے ۔ اور یمن چونکہ عرب کا ایک حصہ ہے اس لئے یہی بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے ۔

۱۲ حل لغات :۔ اَلْخَبْءُ کے معنے ہیں مَا خُبِئَ وَغَابَ ۔ یعنی وہ چیز جو چھپائی جائے اور غائب ہو ۔ اور خَبْءُ الْاَرْضِ کے معنے ہیں نَبَاتُھَا زمین کی انگوری ۔ اور خَبْءُ السَّمَآءِ کے معنے ہیں مَطَرُھَا بارش (اقرب)

الخبء

تفسیر :۔ فرماتا ہے ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو وہاں پڑاؤ کئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ سردار واپس آ گیا ۔ اور اُس نے بتایا کہ چونکہ آپ مُلک سبا پر حملہ کرنے کے لئے جا رہے تھے اور سبا کا علاقہ میرے ملک کا ایک حصہ ہے مَیں پہلے سے خبر لینے کے لئے وہاں چلا گیا ۔ کیونکہ زبان اور قوم کے ایک ہونے کی وجہ سے میرے لئے وہاں کے حالات معلوم کرنا آسان تھا مجھے اس بات کا یقینی طور پر علم حاصل ہو چکا ہے ۔ کہ اس وقت اس ملک میں ایک عورت حاکم ہے لیکن غضب کی حاکم ہے ہر قسم کے ساز و سامان اس کے پاس موجود ہیں اور اُس کی بادشاہت بہت بڑی ہے ۔

اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سے یہ مراد نہیں کہ ملکۂ سبا کو ہر نعمت میسر ہے ۔ کیونکہ اگر اُسے ہر نعمت میسر ہوتی تو جب اُس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تحفہ بھیجا تھا تو آپ اُسوقت یہ نہ کہتے کہ میرے پاس تو اس سے بھی بڑھ کر چیزیں ہیں ۔ مَیں ان تحفوں سے کیونکر متاثر ہو سکتا ہوں ۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ کہنا کہ میرے پاس تو ملکۂ سبا سے بھی بڑھ کر مال و دولت اور سامان موجود ہے بتاتا ہے کہ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سے صرف یہ مراد ہے کہ ملکۂ سبا کو اپنی مملکت کے لحاظ سے جسقدر چیزوں کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ تمام چیزیں اُسے میسّر ہیں ۔ اور وہ بڑی بیدار مغز حکمران ہے ۔ شاید یہ کہہ کر اُس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ڈرانا چاہا کہ کہیں وہ اُس کے ملک کے ایک حصہ پر قبضہ نہ کر لیں ۔ لیکن ساتھ ہی

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۸﴾

(اس سلیمان نے) کہا - کہ ہم دیکھیں گے کہ تو نے سچ بولا ہے یا تو جھوٹوں میں سے ہے -

اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ

تو میرا یہ خط لے جا اور اُسے اُنکے (یعنی سبا کی قوم کے) سامنے پھینک دے - پھر (ادب سے) پیچھے ہٹ (کر کھڑا ہو) جا

فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۹﴾

اور دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں - ۱۳ے

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۰﴾

(جب اُس نے ایسا کیا تو) وہ (ملکہ) بولی - اے میرے درباریو! میرے سامنے ایک معزز خط رکھا گیا ہے -

اُس نے ایسی بات کہہ دی جس کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے ارادہ میں اور بھی پختہ ہو گئے - اور وہ یہ کہ میں نے ملکہ اور اُس کی قوم کو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سورج کی پرستش کرتے دیکھا ہے اور شیطان نے اُن کو اپنے اعمال پر بڑا نازاں کر دیا ہے اور توحید کے رستہ سے ہٹا دیا ہے اور وہ اِس بات پر مصر ہیں کہ اُس خدا کو سجدہ نہ کریں جو آسمان اور زمین کے تمام چھپے رازوں کو ظاہر کرنے والا ہے اور جس نے سورج اور چاند کو محض ایک خادم کی حیثیت دی ہے اور علوم ظاہری اور باطنی اپنے انبیاء کو بتا دیئے ہیں - وہ اللہ جو کہ موحدوں کا خدا ہے اُس کی بادشاہت اُس ملکہ کی بادشاہت سے بہت بڑی ہے اور ضرور اُس کی بادشاہت غالب آئیگی اِس طرح اُس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو خوش کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ وہ بلا وجہ غیر حاضر نہیں رہا - بلکہ اُس نے ملکی مفاد کے لیے یہ تحقیق کرنا ضروری سمجھا تھا -

۱۳ے تفسیر:- اِس پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ بہت اچھا ہم نے جانا تو ضرور ہے - ہم وہاں جا کر دیکھیں گے کہ تو نے سچ بولا ہے یا ایک جھوٹی رپورٹ پیش کر دی ہے - تو میرا یہ خط لے جا - اور اُن لوگوں کے سامنے جا کر انہیں یہ خط پیش کر دے اور پھر ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جائیو - اور دیکھیو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں -

ذرا دیکھو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا عقلمند نبی ایک پرندے کو کیا نصیحت کرتا ہے - کبوتروں کی گردن میں تو لوگ خط باندھا ہی کرتے تھے - مگر ہُد ہُد کو ڈاکیہ بنانے کا لطیفہ ہمارے مفسرین کو ہی سوجھا - پھر ایک بے عقل جانور کو کیسے آداب سکھلائے جاتے ہیں کہ براہِ راست ملکہ کے ہاتھ میں خط نہ دیجیو - کیونکہ یہ ایک بے ادبی سمجھی جاتی ہے - بلکہ اُس کے درباریوں کے سامنے خط رکھیو - وہ خود اُس کے آگے خط پیش کر دیں گے - جیسا کہ سلطانی آداب میں یہ بات شامل ہے پھر جلدی سے جواب نہ مانگیو - گویا حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہی پرندوں کی بولی نہیں آتی تھی بلکہ ملکہ سبا کو بھی

اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۳۱﴾

(جس کا مضمون یہ ہے کہ) یہ (خط) سلیمان کی طرف سے ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ جو بے انتہا کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے اسکے نام سے ہم شروع کرتے ہیں

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ﴿۳۲﴾

(اور کہتے ہیں) کہ ہم پر زیادتی نہ کرو۔ اور ہمارے حضور میں فرمانبردار بن کر حاضر ہو جاؤ [۱۴]

۲ ع ۱۷

آتی تھی۔ اور مناسب انتظار کے بعد جب وہ جواب دیں تو لے آئیو۔

[۱۴] حل لغات:۔ اَلْمَلَأُ کے معنے ہیں اَلْاَشْرَافُ بڑے لوگ۔ صاحب مرتبہ وجاہت والے قِیْلَ سُمُّوْا بِذٰلِکَ لِمَلَأَتِھِمْ بِمَا یُلْتَمَسُ عِنْدَھُمْ مِنَ الْمَعْرُوْفِ وَجَوْدَۃِ الرَّأْیِ اَوْ لِاَنَّھُمْ یَمْلَأُوْنَ الْعُیُوْنَ اُبَّھَۃً وَالصُّدُوْرَ ھَیْبَۃً۔ اور سرداروں کو مَلَأٌ اس لئے کہتے ہیں کہ جس امر کے متعلق اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق رائے دینے کے لئے اُن کا دماغ بھرپور ہوتا ہے۔ نیز اُن کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں اور دل رُعب سے بھر جاتے ہیں۔ (اقرب الموارد)

تفسیر:۔ جب ہُدہُد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملکہ کے درباریوں کے آگے رکھدیا اور انہوں نے ملکہ کے آگے پیش کر دیا۔ تو ملکہ نے کہا۔ ایک بڑا معزز خط میرے آگے پیش کیا گیا ہے وہ سلیمانؑ کی طرف سے ہے اور اُس کے شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھی ہے۔ اور اس کا مضمون یہ ہے کہ میرے خلاف سرکشی مت کرو۔ اور فرمانبردار ہو کر میرے حضور حاضر ہو جاؤ۔

دیکھو: یہ کتنا واضح اشارہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بلاوجہ اس ملک کی طرف نہیں گئے تھے بلکہ پہلے اس ملک کے لوگوں نے کوئی سرکشی کی تھی اُس کشی کو دبانے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یمن کا رُخ کیا تھا۔ اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا۔ کہ اگر تم فرمانبرداری اختیار کرو گے تو مَیں تمہارا پہلا قصور معاف کر دونگا۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط سے پہلے جو بسم اللہ الرحمن الرحیم کے الفاظ لکھے ہیں۔ اُن کو دیکھ کر دشمنانِ اسلام کی طرف سے بالعموم یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے اپنی ہر سورۃ کے ابتداء میں جو بسم اللہ لکھی ہے وہ درحقیقت پُرانی کتب کی ایک چوری ہے اور پہلے لوگ بھی اس کا علم رکھتے تھے۔ چنانچہ راڈول لکھتا ہے کہ یہ کلمہ یہودی الاصل ہے (وہیری صفحہ ۲۸۶ جلد اوّل) اور وہیری لکھتا ہے کہ یہ امر یقینی ہے کہ یہ کلمہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہودیوں اور صابیوں سے مستعار لیا ہے۔ اُنو الذکر بھی اپنی تحریروں سے پہلے یہ لکھا کرتے تھے " بنام یزدان بخشائش گردادار (وہیری صفحہ ۲۸۹ جلد اوّل) یا دری سینٹ کلیر ٹسڈل صاحب نے اپنی کتاب " ینابیع الاسلام " میں اس عبارت کو زرتشتیوں کی طرف منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ کتاب دساتیر میں ہر نبی کے صحیفہ سے پہلے یہ عبارت ہے۔" بنام ایزد بخشش گر مہربان دادگر "۔ (اردو ترجمہ ینابیع الاسلام صفحہ ۱۲۷)

یہ عجیب بات ہے کہ تین مسیحی مصنف اس آیت کو مسروقہ ثابت کرنے کے لئے تین سرچشمے اس کے بیان کرتے ہیں۔ ایک یہودیوں کو اس کا سرچشمہ بتاتا ہے۔

النفلاۃ

دوسرا صابیوں کو۔ تیسرا زردشتیوں کو۔ اِن لوگوں کا اس
آیت کو مسروقہ ثابت کرنے کے لئے اِس قدر کوشش کرنا خود
اِس امر کا ثبوت ہے کہ اُن کے نزدیک یہ آیت اپنے معنوں
کے لحاظ سے ایک سمندر ہے۔ ورنہ ان کا یہ لکھدینا ہی
کافی ہوتا کہ اِس آیت کے مضمون میں کوئی خاص خوبی نہیں
پھر سوال یہ ہے کہ تینوں سرچشموں میں سے اصل سرچشمہ
کونسا ہے؟ تینوں قوموں کو اس آیت کا موجد تو قرار
نہیں دیا جاسکتا۔ پس ضروری ہے کہ یہ مسیحی مصنف یا
اُن کے شاگرد یہ تصفیہ بھی کریں کہ آیا یہودیوں نے
زردشتیوں یا صابیوں سے چُرایا ہے یا برعکس معاملہ ہے۔

یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہودیوں میں
اِس کلمہ کے استعمال کا ایک بھی حوالہ نہیں دیا گیا۔
اور نہ وہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ جن میں یہودی اس
مضمون کو بیان کیا کرتے تھے۔ بلکہ باوجود اس بات کے کہ
مسیحیت یہودیت کی ایک شاخ ہے اور یہودی کتب گویا
مسیحیوں کی اپنی مذہبی کتب ہیں پھر بھی مسیحی مصنف یہودی
کتب کا حوالہ نہیں دے سکے اور نہ اُن کے الفاظ نقل کر
سکے البتہ زردشتیوں اور صابیوں کی کُتب کے حوالے انہوں
نے نقل کر دیئے ہیں۔ جس سے یہ بات اَور بھی روشن ہو
جاتی ہے کہ اس آیت کے حُسن کو دیکھ کر وہ کچھ ایسے
بدحواس ہوگئے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنی مذہبی کُتب
میں اِس کا وجود ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

باقی رہے صابی اور زردشتی سو صابیوں کی کُتب
تو محفوظ نہیں۔ ہاں زردشتیوں کی کتب کے بعض حصّے
اِس وقت بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کتب کی نسبت
خود زردشتی لوگ کہتے ہیں کہ وہ اصل صورت میں محفوظ نہیں
ہیں۔ پس کیا تعجب ہے کہ اُن کے بعض حصّے اسلام کے
بعد ہی بنائے گئے ہوں۔ لیکن اگر ان کتب کو صحیح بھی تسلیم
کرلیا جائے تب بھی قرآن کریم پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا
کیونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہی نہیں کہ یہ آیت پہلی دفعہ
قرآن کریم میں نازل ہوئی ہے۔ بلکہ وہ خود تسلیم کرتا ہے
کہ یہ آیت پہلے بھی دنیا میں موجود تھی۔ چنانچہ حضرت
سلیمان علیہ السلام نے جو خط ملکہ سبا کو لکھا۔ اُس کے
الفاظ بتائے گئے ہیں کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ۔ پس اگر یہ
ثابت بھی ہو جائے کہ یہود یا زردشتیوں یا صابیوں یا
کسی اَور قوم میں یہ آیت پہلے سے موجود تھی تو بھی کوئی
حرج نہیں کیونکہ جب قرآن کریم خود تسلیم کرتا ہے کہ
یہ آیت حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم تھی۔ تو جو
آیت حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم تھی وہ یقیناً
اُن کے اتباع کو بھی معلوم ہوگی اور بالکل ممکن ہے کہ
دوسری قوموں کے نبیوں کو بھی معلوم ہو۔ فرق صرف
یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس کا مضمون عربی زبان میں نازل ہُوا
ہے۔ اور پہلی قوموں میں اُن کی اپنی زبانوں میں ہوگا۔

مگر بایں ہمہ قرآن کریم میں ہر سورۃ سے پہلے اس آیت کی
موجودگی نقل نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ قرآن کریم میں اس
آیت کا وجود ایک پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے ہے
اور جو کلام کسی نئی غرض کے لئے دوہرایا جائے اور
کسی خاص فائدہ کے لئے اختیار کیا جائے وہ نقل یا
چوری ہرگز نہیں کہلاتا۔

یہ پیشگوئی خروج باب ۱۹ و ۲۰ اور استثناء باب ۱۸
میں مذکور ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ بنی اسرائیل کو پاک کرکے
سینا کے نیچے لا کھڑا کر۔ تاکہ وہ سُنیں کہ مَیں تجھ سے کلام
کرتا ہوں۔ پہلے تو وہ پہاڑ کے پاس کھڑے رہیں۔ لیکن
جب قرنا کی آواز بہت بلند ہو تو قریب آجائیں حضرت
موسیٰ علیہ السلام جب وہاں گئے اور خدا تعالیٰ کا کلام
نازل ہُوا تو اُس کے ساتھ ہی بجلی چمکی اور دھوآں اُٹھا

اور گرج پیدا ہوئی۔ وہ لوگ ڈر کے دُور جا کھڑے ہوئے۔
جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن کے پاس گئے تو انہوں نے
کہا کہ تُو ہی ہم سے بول اور ہم سُنیں۔ لیکن خدا ہم سے
نہ بولے۔ کہیں ہم مر نہ جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام
نے اُن لوگوں سے کہا کہ تم مت ڈرو۔ اس لئے کہ خدا
آیا ہے تاکہ تمہارا امتحان کرے اور تاکہ اُس کا جلال تمہارے
سامنے ظاہر ہو۔ کہ تم گناہ نہ کرو۔ مگر پھر بھی وہ لوگ
دُور ہی کھڑے رہے اور صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام
ہی اللہ تعالیٰ کے پاس گئے" (خروج باب ۲۰ آیت ۱۹ تا ۲۱)
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ سے جا کر
عرض کیا کہ الٰہی میری قوم تو تیرے پاس آنے سے ڈرتی ہے
تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر یہ وحی نازل ہوئی
کہ:-

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی
درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری
مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اُس کی طرف
کان دھریو۔ اس سب کی مانند جو تُو نے
خداوند اپنے خدا سے حورب میں مجمع کے
دن مانگا۔ اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں
خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سُنوں اور
ایسی شدت کی آگ میں پھر دیکھوں تاکہ
میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھے کہا
کہ انہوں نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا۔ میں
اُن کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا
ایک نبی برپا کرونگا۔ اور جو کچھ میں اُسے
فرماؤں گا وہ سب اُسے کہیگا۔ اور ایسا ہوگا
کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام
لے کے کہیگا نہ سُنیگا تو میں اُس کا حساب
اُس سے لونگا۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی
کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس
کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا اور
معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل
کیا جائے۔"

(استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵ تا ۲۰)

اس پیشگوئی میں بتایا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے بعد ایک نبی اُن کا مثیل بن کر آئے گا۔ اور وہ جب
بھی خدا تعالیٰ کا کلام سُنائیگا تو کہے گا کہ میں خدا کا
نام لے کر یہ کلام سُناتا ہوں۔ اور خدا کا نام لیکر
کا ترجمہ عربی زبان میں بِسْمِ اللّٰهِ ہے۔ پس
بِسْمِ اللّٰهِ میں اسم کا لفظ بڑھا کر اس پیشگوئی
کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس طرح آنحضرت
صلے اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا قرآن کریم کی ہر سورۃ
کے شروع میں ہی ایک ثبوت پیش کر دیا گیا ہے تا
یہودیوں اور عیسائیوں پر آپ کی سچائی کھل جائے۔
اور اُن پر حجت پوری ہو کہ وہ موعود جس کا اُن کی
کتابوں میں ذکر ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی
ہیں۔ جو ہر بات کو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر بیان کرتے
ہیں۔ پس ہر سورۃ سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ ہر یہودی اور
ہر عیسائی کو توجہ دلاتی ہے کہ تم کیوں اس نبی کو نہیں
مانتے جو موسیٰ کی پیشگوئی کے مطابق جب اللہ تعالیٰ
کا کلام سُناتا ہے تو اُس سے پہلے یہ الفاظ بھی کہہ
دیتا ہے کہ میں اللہ کا نام لے کر یہ کلام سُناتا ہوں۔
بہرحال اس پیشگوئی میں بتایا گیا تھا کہ (۱) بنی اسرائیل
کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی آئے گا۔
(۲) اُس کو حضرت موسیٰ کی طرح شریعت دی جائیگی
(۳) وہ جو نیا مضمون بھی خدا کی طرف سے پاکر دُنیا
کے سامنے پیش کرے گا اُس سے پہلے یہ کہہ لے گا کہ
میں خدا تعالےٰ کا نام لے کر اس کلام کو شروع کرتا ہوں۔

قَالَتْ يٰاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ

پھر اُس (ملکہ) نے کہا۔ اے سردارو! میرے معاملہ میں اپنی پختہ رائے دو۔ کیونکہ میں کبھی بھی

قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۳﴾ قَالُوْا نَحْنُ

کوئی فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم میرے پاس حاضر ہو (کر مشورہ نہ دے لو)۔ انہوں (یعنی درباریوں) نے کہا

اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ۵ وَّ الْاَمْرُ

ہم بڑی طاقت والے ہیں اور بڑے جنگجو ہیں۔ اور (آخری) معاملہ آپ کے

اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَا ذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۴﴾ قَالَتْ اِنَّ

ہاتھ میں ہے۔ پس غور کریں کہ آپ کیا حکم دینا چاہتی ہیں (ہم اُس کی اتباع کرینگے)۔ اُس نے کہا کہ جب

الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا

بادشاہ کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اُسے تباہ کر دیتے ہیں اور اُس کے باشندوں میں سے

(۴) اگر کوئی جھوٹا انسان اِس پیشگوئی کو اپنے اوپر چسپاں کرنا چاہیگا تو وہ ہلاک ہو جائیگا (۵) اور جو اس پیشگوئی کے مصداق کا انکار کرے گا۔ وہ بھی ہلاک کیا جائے گا۔

پس اس پیشگوئی کے مطابق ہر سورۃ سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ رکھ دی گئی۔ اور اِس طرح یہود اور نصاریٰ کو توجہ دلائی گئی کہ اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰؑ اور وہ موعود نبی نہیں تو انہیں سزا ملے گی کیونکہ پیشگوئی کے مطابق اس پیشگوئی کا جھوٹا مصداق سزا سے نہیں بچ سکتا۔ لیکن اگر وہ وہی موعود ہیں اور اِس پیشگوئی کے مطابق خدا کا کلام اُس کا نام لے کر بیان کرتے ہیں تو پیشگوئی کے مطابق تم انکار کرکے سزا سے بچ نہیں سکتے۔ بلکہ خدا تعالیٰ تم سے ضرور حساب لے گا۔

غرض باوجود اس کے کہ بِسْمِ اللّٰہِ پہلے انبیاء کی اُمتوں میں بھی مروّج تھی۔ قرآن کریم میں اسکا وجود چوری نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ (۱) قرآن کریم خود تسلیم کرتا ہے کہ اس سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ تھی (۲) اس لئے کہ اِس میں بِسْمِ اللّٰہِ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے آئی ہے۔ اگر اُس کی ہر سورۃ بِسْمِ اللّٰہِ سے شروع نہ ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی جھوٹی ہو جاتی۔ مگر کیا یہ امر دسا تیر کے متعلق ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے مصنف بنی اسرائیل میں سے تھے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح شریعت لائے تھے۔ یا اُن کی ہر وحی سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ لکھا ہُوا ہوتا تھا۔ وہ تو ایک تاریخ کی کتاب ہے جس میں انبیاء کا حال ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کے یہ الفاظ تھے کہ " ایسا ہو گا کہ جو کوئی میری باتوں کو

اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝۳۵

معزز لوگوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں ۔ اور وہ اسی طرح کرتے چلے آئے ہیں ۔ ۱۵ف

جو وہ میرا نام لے کے کہیگا نہ سُنیگا تو مَیں اس کا حساب اُس سے لونگا ۔" گویا ان الفاظ میں یہ شرط بتائی گئی تھی کہ وہ خدا کی وحی اُس کا نام لے کر بیان کرے گا پس بِسْمِ اللّٰهِ کا قرآن مجید کی ہر سورۃ سے پہلے آنا اس پیشگوئی کے مطابق ہے ۔ اور اس پر چوری کا اعتراض خصوصًا اُن اقوام کے مُنہ سے جو حضرت موسٰی علیہ السلام کی پیرو ہیں بالکل زیب نہیں دیتا ۔

۱۵ف حل لغات :- قَاطِعَةً :- قَطَعَ سے اسم فاعل واحد مؤنث کا صیغہ ہے اور قَطَعَ فُلَانٌ فِی الْقَوْلِ کے معنے ہیں جَزَمَ اُس نے بات پختہ کر لی (اقرب) پس قَاطِعَةً کے معنے ہونگے پختہ فیصلہ کرنیوالی ۔

تفسیر :- فرماتا ہے ۔ یہ خط سُنکر ملکہ سبا نے کہا ۔ اے میری قوم کے سردارو ۔ میری اس مشکل میں مجھے مشورہ دو ۔ جب تک تم میرے دربار میں حاضر ہو کر مشورہ نہ دو مَیں کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتی ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی ڈیماکریسی قائم ہو گئی تھی اور بادشاہت کے حقوق محدود تھے ۔

اُن سورماؤں نے جنہوں نے حضرت سلیمانؑ کے ایک لشکر کے سردار کو جو ہُدہُد جیسا جانور تھا دیکھ لیا تھا کہا کہ حضور ہم تو بڑے طاقتور ہیں اور جنگ میں بڑے آزمودہ کار ہیں ۔ ان پرندوں کے لشکر نے ہمارا کیا بگاڑ لینا ہے ۔ دس منٹ میں ہمارے بچے ہی ان کو مار مار کر کھا جائیں گے ۔ مگر فیصلہ بہرحال آپکے اختیار میں ہے جو آپ حکم دینگے کریں گے ۔ اگر آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان چڑیوں کے پیچھے آپ کے جرنیل گھوڑے دوڑاتے ہوئے دوڑ پڑیں تو ہم ایسا ہی کریں گے اور اگر آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان چڑیوں کو بھون بھون کر کھا جاؤ تو ہم ایسا ہی کریں گے ۔ ملکۂ سبا نے کہا کہ جب بادشاہ کسی زبردست لشکر کے ساتھ ملک میں داخل ہوتے ہیں تو اُس کو اُجاڑ دیا کرتے ہیں ۔ اور اُس کے باشندوں میں سے معزز لوگوں کو ذلیل یعنی جانوروں کی طرح کر دیا کرتے ہیں ۔ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ اور ہمیشہ سے بادشاہ اسی طرح کرتے چلے آئے ہیں ۔

قَاطِعَةً

چنانچہ دُنیا کی تاریخ پر غور کر کے دیکھ لو ۔ جب بھی کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی ہے وہ اپنی فتح کے غرور میں مفتوح قوم پر بڑی بڑی سختیاں کرتی ہے اور پھر غرور کے علاوہ اس قوم کو یہ ڈر بھی ہوتا ہے کہ اگر مفتوحین کو جلد کُچلا نہ گیا ۔ تو ممکن ہے یہ پھر بغاوت کر دیں ۔ گویا اُن کے قلوب میں اطمینان نہیں ہوتا ۔ اور انہیں ہر وقت بغاوت کا خطرہ رہتا ہے ۔ اسی لئے وہ حد سے زیادہ مظالم ڈھاتے اور بڑی بڑی سختیاں لوگوں پر کرتے ہیں ۔ جیسے اٹلی نے جب ایبے سینیا پر قبضہ کیا تو اُس نے بڑے بڑے ظلم کئے ۔ عرب لوگ ان مظالم کو کثرت سے بیان کیا کرتے ہیں ۔ اُن کا بیان ہے کہ اٹلی نے ایبے سینیا پر قبضہ کرنے کے بعد ہزاروں آدمی بلا وجہ مروا ڈالے ۔ اور بعض دفعہ لوگوں پر اپنی حکومت کا رُعب جمانے کے لئے گھروں کے دروازوں پر لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ۔ حالانکہ اُن کا کوئی قصور نہیں ہوتا تھا ۔ غرض ہر قوم جس کی بنیاد مذہب پر نہیں ملکوں کو فتح کرنے کے بعد اس قسم کے مظالم کیا کرتی ہے ۔ آخر دنیا میں ہزاروں سال کی تاریخ موجود ہے ۔ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے اتباع کو چھوڑ کر

یا ایک دو لوٹ بادشاہوں کو مستثنیٰ کر کے بتاؤ تو سہی کہ کسی قوم نے کسی ملک پر غلبہ حاصل کیا ہو۔ اور اُس نے وہاں ظلم و ستم کا بازار نہ گرم کر دیا ہو۔ تورات پڑھ کر دیکھ لو وہاں بھی یہی احکام ہیں کہ

"جبکہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالے کرے۔ تو تُو انہیں مارلیو اور حرم کیجیو۔ نہ تو اُن سے کوئی عہد کریو۔ اور نہ اُن پر رحم کریو...... تم اُن کے مذبحوں کو ڈھا دو اور اُن کے بُتوں کو توڑ دو۔ اُن کے گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور اُن کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دو۔"
(استثناء باب ۷ آیت ۲ تا ۶)

اسی طرح لکھا ہے:۔

"جب خداوند تیرا خدا اُسے تیرے قبضہ میں کر دے تو تُو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر..... اور جو کچھ اُس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لئے لے۔" (استثناء باب ۲۰ آیت ۱۳ تا ۱۶)

غرض جب کوئی قوم فاتح ہو تو وہ یہی کچھ کیا کرتی ہے۔ انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو انہوں نے بھی یہاں کے لوگوں پر بڑی بڑی سختیاں کیں اور جب غصہ نکل گیا تب اعتدال پر آئے۔ ورنہ غدر کے ایام میں انگریزوں نے جو جو کارروائیاں کی ہیں اُن کا ذکر سُن کر انسان کانپ اُٹھتا ہے۔ اُس وقت کے کئی چشمدید واقعات کا ذکر میں نے بھی سُنا ہے۔ ہمارے اپنے پڑنانا کا حال ہماری نانی صاحبہ سُنایا کرتی تھیں کہ غدر کے دنوں میں وہ سخت بیمار تھے۔ ایک دن اچانک انگریزی فوج کے بعض سپاہی مکان کے اندر گھس آئے اور اُن میں سے ایک نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس شخص کو بھی ہم نے لڑتے دیکھا ہے۔ وہ بیچارے گھبرا کر کھڑے ہوئے تو اُن سپاہیوں نے وہیں گولیوں سے اُنکو مار ڈالا۔

ملکہ سبا اسی حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً یعنی دستور اور قانون یہی ہے کہ جب کسی ملک میں نئے بادشاہ آتے ہیں تو معزز لوگوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں۔ یہ خدائی قانون ہے جو کبھی نہیں بدل سکتا۔ سوائے اس کے کہ داخل ہونے والا دنیوی اصطلاح میں ملِک نہ ہو۔ جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفاء تھے۔ وہ روحانی بادشاہ تھے دنیوی اصطلاح میں ملِک نہیں تھے۔ اسی طرح دو چار اور لوگ جنہیں بطور استثناء پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ گو بادشاہ کہلاتے ہوں مگر ان معنوں میں بادشاہ نہیں تھے جن معنوں میں دنیادار بادشاہ ہوتے ہیں بلکہ درحقیقت وہ خدا تعالیٰ کے نیک بندے تھے۔ چنانچہ ساری یورپین تاریخ میں صرف ایک مثال ایسی نظر آتی ہے جس میں فاتح نے غیر قوموں کے مقابلہ میں نہیں بلکہ اپنی قوم کے ہی ایک حصہ کے مقابلہ میں عفو اور درگذر کا سلوک کیا۔ یہ مثال ابراہیم لنکن کی ہے۔ جو امریکہ کا پریذیڈنٹ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں ایک دفعہ یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ کے ایک حصے نے دوسرے حصہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ جب شمالی یونائیٹڈ سٹیٹس نے جنوبی یونائیٹڈ سٹیٹس پر فتح پائی اور وہ ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہونے لگا تو جرنیلوں نے فتح کا مظاہرہ کرنے کی بہت بڑی تیاری کی ہوئی تھی اور اُن کی تجویز تھی کہ بینڈ بجاتے ہوئے ہم شہر میں داخل ہونگے۔ مگر جب ابراہیم لنکن نے اِن انتظامات کو دیکھا تو اُس نے اپنے جرنیلوں کو ڈانٹ دیا اور کہا کہ کیا یہ خوشی کا مقام ہے کہ امریکنوں نے امریکنوں کو قتل کیا ہے۔ لڑائی تو ہمیں مجبوراً کرنی پڑی

تھی ورنہ اپنی قوم کا خون بہانا کوئی پسندیدہ بات نہیں ہو سکتی ۔ پھر اُس نے اپنے جرنیلوں سے کہا کہ تم پیچھے کھڑے رہو میں اکیلا شہر میں داخل ہونگا ۔ چنانچہ وہ اکیلا شہر میں داخل ہؤا اور باغی فوج کے افسر کے دفتر میں جاکر اُس کے ڈیسک پر سر جھکا کر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر پُرنم آنکھوں کے ساتھ دُعا میں مشغول رہ کر اُٹھ کھڑا ہُوا ۔

یہ تمام یورپین تاریخ میں صرف ایک مثال ہے ۔ جہاں فاتح نے مفتوح کو ذلیل کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے ۔ آپؐ نے جب مکہ فتح کیا تو باوجود اس کے کہ کفارِ مکہ سال ہا سال تک آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو سخت سے سخت تکالیف پہنچاتے رہے تھے آپؐ نے ان سب سے کہہ دیا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ جاؤ میں تم پر کوئی گرفت نہیں کرتا ۔ پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عفو و درگذر یہیں تک محدود نہیں بلکہ آپؐ نے ایک دفعہ صحابہؓ سے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ تمہارے ہاتھ پر مصر کو فتح کریگا ۔ جب تم فاتحانہ حیثیت سے اُس میں داخل ہو تو اُسوقت تم اس بات کو یاد رکھنا کہ تمہاری دادی ہاجرہؑ مصر کی تھی ۔ اب کہاں حضرت ہاجرہؑ کا زمانہ اور کہاں صحابہؓ کا زمانہ مگر اتنی دُوری کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیس سو سال پہلے کی دادی ہاجرہؑ کا ذکر کرکے اپنے صحابہؓ کو نصیحت فرمائی کہ تم اس تعلق کی بنا پر مصر کے لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنا ۔ اور اُن سے حسنِ سلوک کرنا ۔ پس اس قسم کا نمونہ دکھانا انبیاء کا ہی کام ہوتا ہے ۔ ورنہ عام دستور دنیا کے بادشاہوں کا یہی ہے کہ جب وہ کسی ملک میں فاتح بن کر داخل ہوتے ہیں تو بڑے بڑے ظلم کرتے اور ہزاروں لوگوں کو بے دریغ قتل کر دیتے ہیں ۔

پس ملکۂ سبا کو جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملا تو اُس نے اپنی سلطنت کے اکابر سے مشورہ لیا ۔ اُن سب نے کہا کہ ہم ملک کی خدمت کے لئے تیار ہیں اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہیں ۔ آپ جو حکم دینا چاہتی ہیں ۔ دیں ۔ اُس نے جواب دیا کہ ہماری موت سے ملک کو کیا فائدہ پہنچے گا ۔ دیکھنا صرف یہ نہیں کہ لوگ جنگ کے لئے آمادہ ہیں یا نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری موت کوئی فائدہ پہنچائے گی یا نہیں ۔ اگر ہم زندہ رہیں اور سلیمانؑ کی بادشاہت قبول کریں تو یہ زیادہ مفید ہوگا یا یہ زیادہ مفید ہوگا کہ ہم لڑیں اور مر جائیں اور سلیمانؑ ہمارے ملک پر قابض ہو جائے ۔ غرض حکومت کا کلّی تغیّر ہم پر اثر انداز ہو سکتا ہے یا اُس کا جزوی تغیّر ۔ ایک تغیّر تو یہ ہے کہ سلیمانؑ کو اس ملک کی عظمت اور بڑائی حاصل ہو جائے ۔ بادشاہت ہمارے پاس ہی رہے ہم صرف اس کے باجگذار ہو جائیں ۔ اور ایک تغیّر یہ ہے کہ ہم مارے جائیں اور ملک بھی سلیمانؑ کے قبضہ میں چلا جائے ۔ ان تمام امور پر غور کرکے وہ جو کچھ کہتی ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی ملک میں کوئی نئی بادشاہت آیا کرتی ہے تو جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وہ اس ملک کے معززین کو ذلیل کر دیا کرتی ہے ۔ اس کے یہ معنے نہیں جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ حکومتوں میں جب تغیّر ہو تو نئی حکومت بڑوں کو چھوٹا اور چھوٹوں کو بڑا کر دیتی ہے ۔ یہاں یہ مضمون بیان نہیں ہؤا ۔ کیونکہ اگر اس کے یہی معنے ہوں تو گو بڑے چھوٹے ہو جائینگے لیکن چھوٹوں کے بڑا بن جانے سے پھر بھی اس ملک کو ہی فائدہ پہنچے گا اور اُسے کوئی نقصان نہیں رہے گا ۔ حالانکہ قرآن کریم کی آیت صرف نقصان اور تباہی کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ دراصل اس آیت میں غیر قوم کی حکومت کا ذکر ہے ۔ اور بتایا گیا ہے کہ جب اس قسم کی

نئی بادشاہت کا قیام عمل میں آئے تو وہ بڑوں کو ذلیل کر دیتی ہے اور جو پہلے ہی ذلیل ہوں وہ اس حکومت میں اَور بھی زیادہ ذلیل اور بے حیثیت ہو جاتے ہیں گویا خارجی قوم کی حکومت نئے حاکم مقرر کرتی - نئے سردار بناتی اور نیا نظام قائم کرتی ہے - پھر وہ لوگ اپنا قانون جاری کرتے - اپنے افسروں اور اپنے حکّام کا تقرر کرتے اور اپنے ہی نظام کو رائج کرتے ہیں - جیسے انگریز یہاں آئے تو انہوں نے انگریزوں کو افسر بنایا - مغل آئے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ترقی دی - پٹھان آئے تو انہوں نے اپنے ہم قوم افراد کو ذمہ واری کے عہدے دیئے - اِسی طرح آرین لوگوں نے حکومت کی تو انہوں نے آریوں کو عروج پر پہنچایا اور گونڈ اور بھیل وغیرہ اقوام جو کسی زمانہ میں اعزّہ میں سے تھیں انہیں ذلیل کر دیا غرض ہر خارجی بادشاہت دنیا میں ایک نیا تغیّر پیدا کرتی اور پہلے نظام کو بدل کر ایک نیا نظام قائم کرتی ہے تاکہ وہ لوگ دوبارہ اقتدار حاصل کر کے بغاوت نہ کریں - مجھے یاد ہے ایک دفعہ دِلّی میں مجھے ایک شخص کے متعلق بتایا گیا کہ یہ مغلیہ خاندان میں سے ہے - اُس کا کام صرف اِتنا تھا کہ وہ حقّہ اُٹھائے پھرتا تھا اور چاندنی چوک میں اور لال قلعہ کے سامنے لوگوں کو حقّہ پلاتا تھا - اور حقّہ پینے والا اُسے آنہ دو آنے دے دیتا تھا - وہ ہر شخص کے سامنے جاتا اور کہتا حقّہ پی لیجیئے - وہ لوگ جو حقّہ کے عادی ہوتے وہ اُس سے حقّہ لے کر پی لیتے اور جاتے ہوئے آنہ دو آنے دے دیتے - اُس نے عزتِ نفس کی وجہ سے بجائے ہاتھ پھیلانے کے یہ طریق اختیار کر لیا تھا - پس دنیا کے واقعات اِس قانون کی تائید کرتے ہیں کہ جب بھی کسی ملک کی حکومت پر کوئی اور حکومت قبضہ کرتی ہے وہ ملک کے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیا کرتی ہے اور حکمران خاندان کو کلّی طور پر حکومت کے کاموں سے علیحدہ کر کے گمنامی میں پھینک دیتی ہے اور ایسے لوگوں کو حکومت کی باگ ڈور دی دی جاتی ہے جو پہلی حکومت سے بغض رکھتے ہوں تاکہ وہ ان لوگوں کو اُبھرنے کا موقعہ نہ دیں - انگریزوں کو ہی دیکھ لو - انہوں نے راجوں مہاراجوں کو اونچا کر دیا اور مغلیہ شاہی خاندان کو اس طرح گرا دیا کہ آج اُن کا نام و نشان بھی نہیں ملتا -

غرض ملکۂ سبا بطور قانون یہ بات بیان کرتی ہے کہ بادشاہ جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اُس کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور وہاں کے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں -

پھر جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً میں اعزّہ کے صرف یہی معنے نہیں کہ جو لوگ واقعی معزز ہوتے ہیں اُن کو ذلیل کیا جاتا ہے بلکہ اس کا ایک اور مطلب یہ بھی ہے کہ جو لوگ غریبوں - کمزوروں اور ناتوانوں کو جوتیاں ملنے کی وجہ سے اپنے آپ کو معزز سمجھتے ہیں اُن کے اِس فعلِ بد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی غیرت اور اُسکی محبّت غرباء کے لئے جوش میں آتی ہے اور وہ اُن پر کسی ایسے بادشاہ کو مسلّط کر دیتا ہے جو اُن کے خود ساختہ اعزاز کو مٹا کر انہیں ذلیل کر دیتا ہے - گویا جو قومیں جوتوں کے ساتھ دوسروں کو سیدھا کرنا چاہتی ہیں - اللہ تعالیٰ اُن کو مغلوب کر دیتا ہے اور دوسروں کو اُن پر غلبہ دے دیتا ہے - چنانچہ دیکھ لو حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیٹا جب آپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا تو اُس نے رعایا کے ساتھ شریفانہ سلوک روا نہ رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کے دس قبائل نے بغاوت کر دی اور سلیمانؑ کی وسیع سلطنت ایک ریاست کی شکل میں محدود ہو کر رہ گئی - رعایا کے چند قبائل نے اس سے پیشتر بھی ایک دفعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت میں منصوبہ کیا تھا کہ ہم حکومت کو موقع پاکر کمزور کر دیں

اور بغاوت کر دیں - مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے تائیدِ الٰہی
سے اِس قسم کی بغاوتوں کو دبائے رکھا - جب حضرت
سلیمان علیہ السلام کا بیٹا تخت نشین ہُوا تو بارہ قبائل
میں سے دس نے اکٹھے ہو کر مشورہ کیا کہ چلو بادشاہ کے
پاس چل کر درخواست کریں کہ آئندہ ہم پر سختی نہ کی جائے
انہوں نے سمجھا کہ اِس طرح اکٹھے ہو کر جانے سے بادشاہ
مرعوب ہو جائیگا اور ہم اُس سے بعض باتیں منوا لیں گے
اگر تو وہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی میں آپ
کے پاس جاتے اور اپنی شکایات پیش کرتے تو چاہیے
آپ اُن کی کوئی بات مانتے یا نہ مانتے اتنا ضرور تھا کہ
آپ اُن قبائل کا اعزاز کرتے اور انہیں احسن طریق سے
سمجھانے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ ہم جو کچھ کر رہے
ہیں تمہارے فائدہ کے لئے کر رہے ہیں - مگر آپ کی وفات
کے بعد آپ کا بیٹا چونکہ مؤید من اللہ نہیں تھا - اور
اُس کے اندر تقوٰی نہیں پایا جاتا تھا اُس نے جب قبائل
کے اِس قسم کے مشورہ کی خبر سُنی تو وہ آگ بگولہ ہو گیا
اور اُس نے امراء - وزراء اور دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کیا
کہ کیا کرنا چاہیئے - وہ وزراء اور امراء بھی بادشاہ کے ہمخیال
تھے انہوں نے مشورہ دیا کہ "گربہ کُشتن روزِ اوّل" جب
وہ قبائل آپ کے پاس آئیں تو آپ اُن کی خوب خبر لیں -
چنانچہ جب وہ قبائل بادشاہ کے پاس آئے تو انہوں نے
کہا - بادشاہ سلامت! ہم نے آپ کے باپ دادا کی بھی
خدمت کی ہے اور اطاعت گذار رہے ہیں مگر اسوقت
بعض معاملات ایسے ہیں جن میں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم پر سختی
کی جا رہی ہے - اِن میں نرمی ہونی چاہیئے - یہ سُن کر بادشاہ
بڑی شان سے بیٹھ گیا - اور اُس نے بڑے جوش میں کہا
تم نے اگر میرے باپ دادا کی اطاعت اور فرمانبرداری کی
تھی تو کونسا احسان کیا تھا - انہوں نے تم سے جوتوں
کے ساتھ اطاعت کروائی تھی - اِسی طرح میں بھی تمہارے
شور و شر سے ڈرنے والا نہیں - بلکہ یاد رکھو میرے
باپ دادا نے تو تم سے جوتوں سے اطاعت کروائی تھی اور
میں ڈنڈے مار مار کر تم سے اطاعت کرواؤں گا - اِسلئے
مطالبات کو ترک کر دو - اگر تم میں سے کوئی ذرا بھی بولا
تو گُدّی سے اُس کی زبان کھینچ لی جائیگی - وہ یہ سختی
کا جواب سُنکر سخت برہم ہوئے اور انہوں نے وہیں
قصرِ شاہی کی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر آپس میں مشورہ
کیا کہ اب ہمارے لئے سوائے اِس کے اور کوئی چارہ
نہیں کہ ہم بغاوت کر دیں - چنانچہ اُن دس قبائل کے
آدمیوں نے وہیں ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر اپنا ایک
بادشاہ چُن لیا اور سلیمانؑ کے بیٹے سے کہہ دیا کہ
ہم تمہاری حکومت سے بغاوت کرتے ہیں - چنانچہ اُنکی
بادشاہت سینکڑوں سال تک چلتی رہی اور سلیمانؑ
کے بیٹے کی حکومت صرف ایک ریاست بن کر رہ گئی - اِسی
طرح وہ لوگ جو ڈنڈے کے زور سے دوسروں پر حکومت
کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اعزّہ میں سے سمجھتے ہیں اُن کی
جیرہ دستیاں بھی جب حد سے زیادہ تجاوز کر جاتی ہیں
تو اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آتی ہے اور ملک میں
ایسا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے کہ ملک میں بڑے بڑے
معزز سمجھے جانے والے ذلیل ہو جاتے ہیں - اور انہیں
اپنے ناروا افعال کی سزا بھگتنی پڑتی ہے -

پھر گو ملکۂ سبا کا یہ قول ایک سیاسی ذکر کے دوران
میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً
اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً مگر اِس
میں اُس رُوحانی قانون کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو
انبیاء کی بعثت پر دنیا میں جاری کیا جاتا ہے - کیونکہ
جس طرح دنیوی ملوک اپنے ساتھ ایک انقلاب لاتے
ہیں اسی طرح انبیاء جو مملکتِ روحانی کے بادشاہ
ہوتے ہیں اُن کی آمد کے ساتھ بھی جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً

کا نقشہ انسانی آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور اُنکے زمانہ میں بھی کئی چھوٹے بڑے اور کئی بڑے چھوٹے کر دیئے جاتے ہیں۔ کئی حقیر اور ذلیل سمجھی جانے والی قومیں خدا تعالیٰ کے مامور کو قبول کر کے عزت حاصل کر لیتی ہیں۔ اور کئی معزز سمجھی جانے والی قومیں خدا تعالیٰ کے مامور کو ردّ کر کے ذلیل ہو جاتی ہیں۔ بلکہ دنیا کا ایک لمبا تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ الٰہی صداقتیں ہمیشہ ایسے علاقوں میں ہی زیادہ کثرت اور زیادہ زور کے ساتھ پھیلتی ہیں جو باقی دُنیا کی نگاہوں میں جاہل اور وحشی ہوتے ہیں۔ جب کبھی کسی تعلیم نے یکدم کسی قوم کو پکڑا ہے تو وہ قوم ہمیشہ ایسی ہی ہوتی رہی ہے جو اپنے ظاہری علوم کے لحاظ سے دوسری قوموں سے ادنیٰ اور گری ہوئی سمجھی جاتی ہے۔ مگر پھر وہی قوم خدا تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہکر دنیا کی فاتح اور حکمران بن جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خواہ کوئی کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو انسانی فطرت اپنے ذہن میں کچھ نہ کچھ نتائج نکالتی رہتی ہے بلکہ انسان تو ایک طرف رہا ہم جانوروں اور درختوں میں بھی یہ بات دیکھتے ہیں۔ سائنس سے ثابت ہے کہ بعض جانور بعض درختوں پر رہنے کی وجہ سے خاص قسم کے رنگ پیدا کر لیتے ہیں۔ تیتری کتنا چھوٹا سا جانور ہے نہ اُس میں گوشت ہوتا ہے نہ ہڈی۔ جب تیتریاں پھولوں پر اُڑ رہی ہوتی ہیں تو وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ کتنی حسین اور دلکش نظر آتی ہیں۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان تیتریوں کا رنگ زیادہ تر مرہونِ منّت ہوتا ہے اُن پھولوں اور پتّوں کا جن میں وہ رہتی ہیں۔ وہ مختلف قسم کے پھولوں اور مختلف قسم کے پتّوں میں رہتی ہیں اور انہی پتوں اور انہی پھولوں کے رنگ کا انعکاس اپنے پَروں میں پیدا کر لیتی ہیں۔ چنانچہ اکثر تیتریوں کے رنگ دوسرے جانوروں کے رنگ کے خلاف عارضی ہوتے ہیں۔ اگر ایک طوطے کا سبز رنگ تم مٹانا چاہو تو تم نہیں مٹا سکتے۔ اگر ایک فاختہ کا بھورا رنگ تم مٹانا چاہو تو نہیں مٹا سکتے۔ لیکن تیتری کا پَر اپنے ہاتھ میں مسلو تو اس کا رنگ فوراً تمہارے ہاتھ کو لگ جائیگا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا رنگ درحقیقت ایک فوٹو اور انعکاس ہوتا ہے اُن شعاعوں کا جو اُن پھولوں اور پتوں میں رہنے کی وجہ سے اُس کے پَروں پر پڑتی ہیں۔ جب یہ انعکاس ایک لمبے عرصہ تک چلتا چلا جاتا ہے تو اُسی قسم کا ایک مستقل رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بالعموم ریت کے اندر رہنے والے جانور بھوسلا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ریت کے تودوں میں اُن کی شکل نظر نہیں آتی۔ ہرن سامنے بیٹھا ہوا ہوتا ہے بلکہ گلّے کا گلّا بعض دفعہ سامنے ہوتا ہے مگر ہر شخص اُن کو پہچان نہیں سکتا۔ صرف ماہر شکاری ہی امتیاز کر سکتا ہے۔ ورنہ عام انسان بسا اوقات پاس سے گذر جاتا ہے اور اُسے معلوم تک نہیں ہوتا کہ سامنے ہرن بیٹھا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ریت میں ایک لمبا عرصہ رہنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ وہ ریت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ یہی حال درختوں کا ہوتا ہے کہ درخت بھی اپنے اپنے ماحول کے مطابق رنگ اختیار کرتے ہیں اور یہی حال انسانوں کا ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی اپنے اپنے ماحول کے مطابق رنگ اختیار کرتے ہیں۔ ہم اُن کو وحشی کہہ دیں۔ ہم اُن کو جاہل کہہ دیں۔ ہم اُن کو تہذیب و تمدن سے کوسوں دُور کہہ لیں۔ لیکن کیا اُن کا دماغ اتنا بھی کام نہیں کر رہا ہوتا جتنا ایک طوطے یا ایک تیتر یا ایک ہرن کا دماغ کام کر رہا ہوتا ہے۔ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہ کہ جس طرح طوطے اور ہرن نے معین صورت میں اپنے تاثرات کو باہر نہیں نکالا اسی طرح ایک جاہل اور وحشی نے بھی اپنے ماحول کے تاثرات کو باہر نہیں نکالا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار

نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے مطابق ایک رنگ اپنے اندر پیدا کرتا رہتا ہے۔ تم اگر کسی وحشی سے پوچھو کہ کیا تم نے اپنی زندگی کے ماحول کے نتیجہ میں کوئی اثر قبول کیا ہے یا نہیں تو وہ کہیگا۔ مَیں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اثر قبول کیا ہوتا ہے۔ مگر وہ اس سے ایسا ہی ناواقف ہوتا ہے جیسے تیتری یہ نہیں جانتی کہ وہ پھولوں کے رنگ کا اثر قبول کر رہی ہے۔ ہرن یہ نہیں جانتا کہ وہ ریت کی رنگت اپنے اندر پیدا کر رہا ہے۔ جس طرح شہد کی مکھی بغیر اس بات کے جاننے کے کہ وہ کیا پیدا کر رہی ہے۔ اور اس کے کیا کیا فوائد ہیں۔ مختلف پھولوں پر بیٹھ کر شہد کے باریک ذرات اپنے مُنہ میں سے نکالتی رہتی ہے اور وہ نکالنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اِسی طرح وہ قومیں جنہیں دُنیا نے الگ پھینک رکھا ہے۔ اپنے ماحول کے اثرات سے متاثر ہو رہی ہوتی ہیں گو وہ خود بھی نہ سمجھ سکیں کہ اُن کا ماحول اُن کو کسی خاص رنگ میں رنگین کر رہا ہے۔ مگر بہرحال اُن قوموں کے دلوں میں باریک طور پر یہ حِس پائی جاتی ہے کہ خدا نے ہم کو دُنیا سے فائدہ اٹھانے کے لئے پیدا کیا تھا۔ باقی لوگ اپنا حصّہ لے چکے مگر ہم نے اِس دوڑ میں اپنا حصّہ نہیں لیا ہمیں دنیا نے دھتکار رکھا ہے۔ ہمیں اُس نے فوائد سے محروم کر دیا ہے۔ وہ اور اُس کی نسلیں فائدہ اٹھا رہی ہیں مگر ہمیں فائدہ اٹھانے کا کوئی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ یہ وہ خیال ہوتا ہے جو اُن قوموں کے دلوں میں بغیر کسی خاص احساس کے یا بغیر کسی معین صورت کے اندر ہی اندر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی کے ذریعہ یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ مَیں دنیا کی گری ہوئی قوموں کو ترقی کی بلندیوں پر پہنچانے کے لئے آیا ہوں تو اُن قوموں کے اندر ایک خلش سی پیدا ہو جاتی ہے ایک بے چینی سی رونما ہو جاتی ہے۔ ایک اضطراب سا اُن کی حرکات سے ظاہر ہونے لگتا ہے وہ کہتی ہیں ہماری اُمیدوں کے بر آنے کا وقت آگیا۔ ہماری نحوستوں کے دُور ہونے کا زمانہ آگیا۔ آؤ ہم اِس نبی کو قبول کر کے دُنیا پر حکمرانی کریں اور اپنے کھوئے ہوئے حق کو حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔

وہ زمین جس میں ایک لمبے عرصہ تک ہل چلایا جاتا ہے۔ جو مختلف قسم کی سبزیاں پیدا کرتی ہے۔ جو مختلف قسم کے پھل اور پھول تیار کرتی ہے بیشک اُسکی روئیدگی انسانی آنکھوں کو تراوت بخشتی ہے۔ اُس کے پھل انسانی غذا کے کام آتے ہیں۔ اُس کے پتّے جانوروں کی بھوک مٹانے کا کام دیتے ہیں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک لمبے استعمال کی وجہ سے اپنی طاقت کو کھو بیٹھتی ہے۔ لیکن اُس کے پاس کی پڑی ہوئی زمین جو ابھی استعمال میں نہیں آئی ہوتی وہ اس بات کی زیادہ اہل ہوتی ہے کہ اُس میں بیج بویا جائے اور اُس سے اعلیٰ درجہ کی پیداوار حاصل کی جائے۔ اچھا فلاح ہمیشہ اُس زمین کی طرف جاتا ہے جو خالی پڑی ہو۔ اُس زمین کی طرف نہیں جاتا جسے ہزاروں سال سے بویا جا رہا ہو۔ کیونکہ وہ جانتا ہے اب مجھے اِس استعمال شدہ زمین سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مجھے اگر فائدہ ہوگا تو اُس زمین سے جو بظاہر بنجر ہے۔ جو بظاہر ویران ہے۔ جو بظاہر غیر آباد ہے۔ بیشک اُس پر محنت زیادہ ہوگی۔ مگر اُس کی فصل دوسری زمینوں سے زیادہ بہتر ہوگی۔ نادان لوگ گاؤں کی مہنگی زمین خریدتے ہیں۔ لیکن ہوشیار زمیندار مربعوں والی زمین خریدتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گاؤں کی زمینوں کے مالک بعض دفعہ ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سو ایکڑ زمین اپنے پاس رکھتے ہیں مگر اُن کی تہ بند پھٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اُن کے جسم پر پوری چادر بھی نہیں ہوتی۔ لیکن ایک دوسرا

شخص عمدہ لباس پہنے ہوئے ہوتا ہے۔ اچھا کھاتا پیتا ہو اور کہا جاتا ہے کہ یہ بڑے زمیندار ہیں مگر اُس کے پاس صرف ایک مربع زمین ہوتی ہے۔ حالانکہ ایک مربع کے معنے ہیں صرف ۲۵ ایکڑ۔ لیکن باوجود اس کے اُس کے پاس صرف ۲۵ ایکڑ زمین ہوتی ہے اور دوسرے کے پاس چھ گنا زیادہ زمین ہوتی ہے۔ وہ غربت میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے اور ایک مربع رکھنے والا کشائش کی حالت میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ ایک شخص نے عقلمندی سے وہ زمین اختیار کی جس نے اپنی طاقت خرچ نہیں کی تھی اور دوسرے نے اپنے اور اپنے خاندان کے لئے اس زمین کو ترجیح دی جو اپنی طاقتوں کو کھو چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ روپیہ خرچ کرنیکے باوجود وہ گھاٹے میں رہا اور تھوڑا خرچ کرنے والا فائدہ میں رہا۔ بیشک شہری لحاظ سے وہ زمین بھی مفید ہوتی ہے۔ اور مکانوں کے لئے گراں قیمت پر فروخت ہو جاتی ہے۔ مگر جہاں تک فصل کا سوال ہے خالی پڑی ہوئی زمین زیادہ مفید ہوتی ہے۔ اور زمیندارہ اصول بھی یہی ہے کہ جب کسی زمین سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہوتا ہے تو اُس کو کچھ عرصہ کے لئے خالی چھوڑ دیا جاتا ہے۔

عرب میں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہم جانتے ہیں کہ یہ محض خدا تعالیٰ کا فضل تھا اور پیشگوئیوں کے مطابق عرب میں ہی آپ کا مبعوث ہونا ضروری تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ خدا بھی اپنے سارے کام حکمت کے ماتحت کرتا ہے۔ اسی لئے اس کا ایک نام حکیم ہے۔ وہ یونہی بلا سوچے یا بغیر کسی حکمت کے وہ کوئی کام نہیں کرتا اور جبکہ اُس کا ہر کام حکمت کے ماتحت ہوتا ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُس کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو عرب میں مبعوث کرنا کسی بہت بڑی حکمت کے ماتحت تھا۔ اور وہ حکمت یہی تھی کہ عرب وہ ملک تھا جسے ہزارہا سال سے دنیا میں کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا تھا۔ بے شک عربوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ آپ کی تکفیر و تکذیب کی۔ آپ کو بُرا بھلا کہا۔ آپ کو مٹانے کے لئے انہوں نے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا۔ مگر اس کے باوجود جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ آواز عرب میں گونجتی تھی۔ کہ اے عربو! میں تمہیں دنیا کا بادشاہ بنانے کے لئے آیا ہوں تو اُن کا دل جلدی جلدی حرکت کرنے لگ جاتا تھا وہ کہتے تھے۔ یہ کیسی آواز ہے جو ہمارے کانوں میں آ رہی ہے پھر وہ کچھ اور سوچتے اور کہتے یہ تو وہی آواز ہے جس کے لئے ہم اپنے باپ دادا کے زمانہ سے ترستے چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ جب انہیں اپنی مخالفت بھولی عداوت اُن کے دلوں سے دُور ہوئی۔ اِس آواز نے اُنکے قلوب میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اور وہ دیوانہ وار لبیک یا رسول اللہ لبیک یا رسول اللہ کہتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑ پڑے۔ کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا کہ ہماری ترقی کا زمانہ آ گیا۔ اُن کے دبے ہوئے جذبات اُبھر آئے۔ اُن کی دیرینہ خواہشات جوش میں آ گئیں اور ہر روک کو توڑ کر وہ اس آواز دینے والے انسان کے اردگرد جمع ہو گئے۔

مؤرخ لکھتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اِس آواز پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا خشک صحرا سمندر بن گیا ہے۔ اُسکی لہریں اُٹھ اُٹھ کر ہمسایہ ممالک اور پھر اُن کے ساتھ والے ممالک تک پہنچیں اور اُن سب کو انہوں نے اپنے زیرنگیں کر لیا۔ یہ دبی ہوئی حِسّ ہی تھی کہ ہمیں دُنیا میں ترقی کرنے کا موقعہ نہیں ملا جس نے عربوں میں ایک دیوانگی پیدا کر دی۔ جنون کی سی کیفیت اُن میں پیدا ہو گئی۔ انہوں نے کہا یہ کیا ہوا کہ دنیا ترقی میں اپنا حصّہ لے چکی مگر ہم اس سے محروم رہ گئے۔ تب

وہ اپنے اونٹوں کی مہاریں پکڑے نکلے اور اس جوش اور دیوانگی کے ساتھ نکلے کہ قیصر و کسریٰ کی حکومتیں پاش پاش ہوگئیں اور وہ دنیا کے کناروں تک اپنی حکومت پھیلانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ سامان تھا جو خدا نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ترقی اور عظمت کے لئے کیا کہ آپ کو اُس ملک میں خدا تعالیٰ نے بھیجا جس ملک میں بسنے والوں کے جذبات سینکڑوں سال سے دبے چلے آ رہے تھے۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ اور لوگ تو حصہ لے چکے مگر ہم اب تک محروم ہیں۔ گویا اُن کی مثال ایسی ہی تھی جیسے کہتے ہیں کہ کوئی اندھا اور سوجاکھا کھانا کھانے بیٹھے۔ اندھے نے سمجھا کہ سوجاکھا زیادہ کھانا کھا رہا ہوگا۔ کیونکہ اُس کی آنکھیں ہیں اور میں اندھا ہونے کی وجہ سے اُسکے مقابلہ میں کم کھا رہا ہوں۔ یہ خیال آنے پر اُس نے پہلے تو جلدی جلدی کھانا شروع کر دیا۔ پھر اس خیال کے آنے پر کہ میری یہ حرکت سوجاکھے نے بھانپ لی ہوگی اور وہ بھی ضرور جلدی جلدی کھانے لگ گیا ہوگا اُس نے دونوں ہاتھوں سے کھانا شروع کر دیا۔ پھر جو خیال آیا تو ایک ہاتھ سے وہ چاول مُنہ میں ڈالتا اور دوسرے ہاتھ سے جھولی میں ڈالتا۔ اس پر پھر اُسے خیال آیا کہ اب ضرور سوجاکھا بھی ایسا ہی کر رہا ہوگا۔ چنانچہ اب کی دفعہ اُس نے تھالی اُٹھالی اور کہنے لگا۔ اب میرا ہی حصہ رہ گیا ہے۔ تم اپنا حصہ کھا چکے۔ اور اُس سوجاکھے کی یہ حالت تھی کہ اُس نے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ اندھے کی حرکات کو دیکھ دیکھ کر ہی ہنستا جا رہا تھا کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ عربوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ انہوں نے دُنیا کی بادشاہت کی پلیٹ اُٹھا کر اپنے سامنے رکھ لی اور کہا کہ تم اپنا حصہ لے چکے یہ ہمارا حق ہے۔ غرض یہ الٰہی سامان تھا۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے اُس قوم میں مبعوث کیا جو ایک لمبے عرصہ سے ترقی سے محروم چلی آئی تھی اور جس کے جذبات گو دبے ہوئے تھے مگر وہ ایک آواز کے منتظر تھے۔ اُس آواز کے جو انہیں دنیا کا فاتح اور حکمران بنا دے۔ اُن کے دل یہ دیکھکر کہ اور لوگ تو اپنا حصہ لیتے جاتے ہیں اور ہمیں کوئی پوچھتا بھی نہیں غصہ سے بے تاب ہو رہے تھے اور تم جانتے ہو کہ انسان کا ایک ایک سال کا دبا ہوا غصہ باہر نکلے تو وہ دوسرے کو کچل ڈالتا ہے۔ پھر کیا حال ہوگا اس قوم کا جس نے صدیوں سے اپنے غصہ کو دلوں میں دبا رکھا ہو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک قصہ سُنایا کرتے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک دفعہ اپنے باورچی کو محض اس جُرم میں کہ کھانے میں اُس نے کچھ نمک زیادہ ڈال دیا تھا ایک سو کوڑے لگانے کی سزا دی۔ عزیز الدین ایک مسلمان اُن کے وزیر تھے۔ وہ بڑے نرم دل تھے۔ کہنے لگے۔ یہ بادشاہ کی شان سے بعید ہے کہ کھانے میں ذرا سا نمک زیادہ ہو جائے تو وہ اس پر چڑ کر ایک سو کوڑے لگانے کا حکم دے دے مہاراجہ کہنے لگا۔ وزیر صاحب! آپ یہ خیال نہ کریں کہ میں اسے نمک کی زیادتی پر یہ سزا دے رہا ہوں۔ اس نے میرا ایک سو بکرا کھایا ہوا ہے اور ایک ایک بکرے پر ایک ایک دُرّے کی سزا میں اسے دے رہا ہوں۔ کھانے میں نمک کی زیادتی محض ایک بہانہ ہے۔ اس ذریعہ سے تو مجھے اس کو گذشتہ قصوروں کی سزا دینے کا موقع مل گیا ہے۔

غرض ایک ایک دو دو سال کے جذبات اگر دبے ہوئے ہوں تو انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ پھر کیا حال ہوگا اُن قوموں کا جنہوں نے سالہا سال سے اپنے جذبات کو دبایا ہوا تھا۔ جو سمجھتی تھیں کہ دُنیا اپنا حصہ لے چکی مگر ہمارا حصہ اس نے ہمیں نہیں دیا۔ یہ دبے ہوئے جذبات

قوموں کو کہیں کا کہیں پہنچا دیتے ہیں بے شک یہ جذبات خود اُن کی نظروں میں بھی معیّن نہیں ہوتے جیسے تیتری نہیں جانتی کہ وہ پھولوں کا رنگ اختیار کر رہی ہے فاختہ نہیں جانتی کہ وہ بھورا رنگ پیدا کر رہی ہے طوطا نہیں جانتا کہ وہ سبز رنگ پیدا کر رہا ہے۔ ہرن نہیں جانتا کہ وہ بھوسلا رنگ پیدا کر رہا ہے لیکن اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مخفی اثر اپنے ماحول کا ہر چیز پر پڑتا ہے۔ اِسی طرح انسان اُس رنگ میں رنگین ہوتا جاتا ہے جو اس کا ماحول اُس کے لئے پیدا کرتا ہے۔ اگر ہرن کی زبان ہوتی اور کوئی شخص اس سے پُوچھتا کہ کیا تم کوئی رنگ پیدا کر رہے ہو تو وہ نہیں بتا سکتا تھا کہ مَیں بھوسلا رنگ پیدا کر رہا ہوں۔ لیکن اُس کی یہ خواہش کہ مَیں صحرا کی ریتوں میں چھپ جاؤں خود بخود اُس کے اندر ایک رنگ پیدا کر دیتی ہے جسے وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتا۔ سُرخ پھولوں میں رہنے والی تیتری اگر اُس کی زبان ہوتی یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ مَیں سُرخ رنگ پیدا کر رہی ہوں۔ مگر اُس کی یہ خواہش کہ مَیں سُرخ پھولوں میں چھپ جاؤں خود بخود اُس کے پَروں میں سُرخ رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ ایک سبز رنگ کا طوطا اگر اُس کی زبان ہوتی یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ مَیں سبز رنگ پیدا کر رہا ہوں۔ لیکن اُس کی یہ خواہش کہ مَیں سبز رنگ کے پتوں میں چُھپا رہوں خود بخود اس کے جسم پر سبز رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ اِسی طرح وہ جاہل اور وحشی اقوام جو متمدن دُنیا سے علیحدہ ہیں جو حکومت سے محروم ہیں جو دُنیا سے فائدہ نہیں اُٹھا رہیں گو اپنی زبان سے نہ کہہ سکیں کہ وہ اس ماحول سے کوئی اثر قبول کر رہی ہیں مگر اُن کی دبی ہوئی خواہشات اُن کے جسم پر ایک رنگ پیدا کرتی چلی جاتی ہیں۔ وہ دیکھتی ہیں کہ ہماری نسل کے بعد نسل پیدا ہوئی مگر دنیا نے ہمارا حق ہم کو نہ دیا۔ ہمارا حق اُس نے چھین لیا۔ ہماری دولت اُس نے چھین لی ہماری تعلیم اس نے چھین لی۔ اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم دُنیا پر چھا جائیں اور اس سے اپنا حق واپس لیں۔ یہ وہ تأثر ہے جو اس ماحول کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ تأثر ہے جو اقوام کو فاتح بنایا کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسی قوم میں آئے جو مہذب سمجھی جاتی تھی جو تعلیم یافتہ تھی جو دُنیا کی ترقی کی دوڑ میں اپنا حصّہ لے چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے حواریوں کو تین سو سال تک محنت اور تگ و دَو کرنی پڑی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی قوم میں آئے جو مظلوم تھی جو ترقی سے محروم تھی جو دیکھتی تھی کہ اَور قومیں تو آگے نکل گئیں مگر ہم پیچھے رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ موسیٰؑ کی آواز پر وہ یکدم آپ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کیونکہ اُن کی فطرتیں پکار رہی تھیں کہ ہماری ترقی کا وقت آ گیا جب اُن کی فطرت کی آواز خدائی آواز کے ساتھ مل گئی تو انہوں نے دنیا کو روند ڈالا اور اپنا حق لوگوں سے حاصل کر لیا۔

یہی قانون اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ رُوحانی دنیا میں بھی جب انبیاء کے ذریعہ ایک انقلاب پیدا کیا جاتا ہے تو اُس وقت بھی جَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً کا نظارہ نظر آتا ہے۔ یعنی کئی بڑے بڑے معزز اور عقلمند کہلانے والے ذلیل ہو جاتے ہیں اور کئی چھوٹے اور حقیر نظر آنے والے افراد یا حقیر اور ذلیل سمجھی جانے والی اقوام بڑی بڑی عزتیں حاصل کر لیتی ہیں۔ ابوجہل اپنی قوم میں کتنا عقلمند اور معزز سمجھا جاتا تھا لوگوں نے اس کا نام ہی ابوالحکم یعنی دانائی کا باپ رکھا ہُوا تھا۔ مگر جب

وَاِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ

اور (میں نے فیصلہ کیا ہے کہ) میں اُن کی طرف ایک تحفہ بھیجوں گی۔ پھر دیکھوں گی کہ میرے ایلچی کیا جواب لیکر

الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَلَمَّا جَآءَ سُلَیْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ

واپس آتے ہیں۔ پھر جب وہ تحفہ سلیمانؑ کے سامنے لاکر رکھا گیا تو اُس نے کہا۔ کیا تم مال کے ذریعہ میری مدد کرنا

بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَیْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ

چاہتے ہو۔ (اگر یہ بات ہے تو یاد رکھو کہ) اللہ نے جو کچھ مجھے دیا ہے وہ اُس سے بہت بہتر ہے جو تم کو دیا ہے اور (معلوم ہوتا ہے کہ)

بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِرْجِعْ اِلَیْهِمْ فَلَنَاْتِیَنَّهُمْ

تم اپنے تحفہ پر بڑے نازاں ہو۔ (اے ہُدہُد) تو اُن کی طرف لوٹ جا اور (اُن سے کہدے کہ) میں ایک بڑے لشکر کے ساتھ

بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ

اُن کے پاس آؤنگا۔ ایسا لشکر کہ اُس کے مقابلہ کی اُنکو طاقت نہ ہوگی اور میں اُنکو اس (ملک سبا) (مفتوح ہونیکے بعد) ایسی حالت میں

اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۸﴾

نکال دونگا کہ وہ بادشاہت (کی عزت) کھو چکے ہونگے۔ ۱۶

اُس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تو وہ اتنا ذلیل ہوگیا کہ لوگوں نے اُسے ابوجہل یعنی جہالت کا باپ کہنا شروع کردیا۔ اُس کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کو دیکھو وہ صرف گیارہ سال کے تھے جب وہ دین کی تائید کے لئے کھڑے ہوئے۔ مگر پھر خدا تعالےٰ نے اُنکو اتنی عزت دی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ خلیفہ بنے اور پھر اُن کی نسل کو بھی اللہ تعالےٰ نے ایسا نیک بنایا کہ بارہ نسلوں تک برابر اُن میں بارہ امام پیدا ہوئے۔ لیکن وہ لوگ جو اس وقت اپنے آپ کو مکہ کے رؤساء میں سے سمجھتے تھے اور بڑی بڑی عزتوں کے مالک تھے آج اُن کا کوئی نام بھی نہیں لیتا اور نہ اُنہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔

پس جس طرح دنیوی بادشاہتوں کے متعلق یہ قانون ہے کہ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً اسی طرح روحانی دنیا میں بھی یہ قانون جاری ہے اور انبیاء کی بعثت پر بھی کئی بڑے سمجھے جانے والے چھوٹے کر دیئے جاتے ہیں اور کئی چھوٹے سمجھے جانے والے بڑی بڑی عزتوں کے مالک بن جاتے ہیں۔

۱۶ حل لغات: اَلْقِبَلُ: اَلطَّاقَةُ طاقت۔ یُقَالُ مَالِیْ بِهٖ قِبَلٌ۔ محاورہ میں کہا جاتا ہے مجھے اس کی کوئی طاقت نہیں۔ (اقرب)

اَلْقِبَلُ

صٰغِرُوْنَ: صَاغِرٌ سے جمع کا صیغہ ہے اور

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ

(اس کے بعد) اُس نے (اپنے درباریوں سے مخاطب ہوکر کہا۔ اے درباریو! تم میں سے کون اُسکے تخت کو میرے پاس لے آئیگا پیشتر اسکے کہ

يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا

وہ (لوگ) فرمانبردار ہوکر میری خدمت میں حاضر ہوں۔ (پہاڑی قوموں میں سے) ایک سرکش سردار نے کہا۔ آپ کے (اس)

اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ

مقام سے جانے سے پہلے میں وہ (عرش) لے آؤں گا۔ اور میں اس بات پر بڑی

اَلصَّاغِرُ کے معنے ہیں اَلْمُهَانُ وَالرَّاضِيْ بِالذُّلِّ وَالضَّيْمِ یعنی رسوا شدہ۔ وہ شخص جو ذلت اور ظلم پر رضامند ہوجائے گویا یہ لفظ صَغَار سے ہے جس کے معنے ذلت اور ظلم کے ہیں (اقرب)

تفسیر: — جب درباری اپنا مشورہ پیش کر چکے تو ملکہ سبا نے کہا کہ تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں نے یہ سوچا ہے کہ میں انہیں ایک تحفہ بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ میرے بھیجے ہوئے آدمی کیا جواب لاتے ہیں پھر اُس نے ایک تحفہ ہُدہُد کے سپرد کیا۔ یہ چڑیا اپنی چونچ میں جو معزز تحفہ لے گئی ہوگی معزز قارئین خود ہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ نے بھی اس تحفہ کو دیکھتے ہی کہا کہ کیا تم یعنی ملکہ کے ملک والے لوگ میری مال سے مدد کرنا چاہتے ہو۔

ہُدہُد کی چونچ میں ایک دھیلے کا دسواں حصہ ہی آیا ہوگا۔ جب وہ تحفہ حضرت سلیمانؑ کے آگے رکھا گیا ہوگا تو ان کو کس طرح فوری طور پر یقین آگیا ہوگا کہ ملکۂ سبا کے پاس ہر قسم کا مال موجود ہے۔ مگر تیرا ہدہد جو کچھ لایا ہوگا اس کو ہم خوب سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اسے دیکھ کر حضرت سلیمانؑ بولے کہ یہ کیا حقیر چیز تم میرے پاس لائے ہو۔ خدا نے اس سے بہتر چیزیں مجھے دے رکھی ہیں تمہارے

جیسے ذلیل لوگ ہی اس ہدیہ پر خوش ہو سکتے ہیں جسکو ہُدہُد اُٹھا لایا ہے۔

پھر فرمایا۔ اے ہُدہُد! اُن کی طرف لوٹ جا میں اب ایسا لشکر لے کر اُن پر چڑھائی کرونگا جس کے مقابلہ کی طاقت اُن میں نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس لشکر میں ہُدہُد بھی ہونگے۔ چڑیاں بھی ہونگی۔ بِدیاں بھی ہونگی اور بئے بھی ہونگے اور میں ملک سبا کے لوگوں کو ملک سبا سے ذلیل کرکے نکال دونگا۔ اور وہ دیر تک ایسے زبردست لشکر کی ماتحتی میں رہیںگے۔ (صاغر اسم فاعل ہے جو دوام پر دلالت کرتا ہے)

حضرت سلیمان علیہ السلام کا اس ہدیہ پر ناراض ہونا درحقیقت اس لئے تھا کہ پرانے زمانہ میں بادشاہوں کا یہ طریق تھا کہ وہ زیادہ زبردست بادشاہوں کا مُونہہ رشوت سے بند کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے جب بلقیس کے تحائف حضرت سلیمان علیہ السلام کو پہنچے تو انہوں نے سمجھا کہ اُس نے مجھے بھی ایسا ہی بد اخلاق اور رشوت خور سمجھا ہے۔ اور اُس کے اس فعل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہ رشوت کی پیشکش ایسی ہی تھی جیسے مسلمانوں نے جب ایران پر حملہ کیا تو بادشاہ نے اپنے درباریوں سے کہا۔ کہ میں یقین نہیں کر سکتا کہ عرب کے رہنے والے

لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿٣٩﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ

قدرت رکھنے والا اور امانت دار ہوں۔ (اس پر) اُس شخص نے جس کو (الٰہی) کتاب کا علم حاصل تھا کہا کہ

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ

مَیں تیرے پاس اس (تخت) کو تیرے آنکھ جھپکنے سے پہلے لے آؤں گا۔

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ

پس جب اُس نے (یعنی سلیمانؑ نے) اُس کو پاس رکھا ہُوا دیکھا۔ تو اُس نے کہا۔ یہ میرے ربّ کے فضل

فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ

کی وجہ سے ہُوا ہے۔ تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ مَیں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ اور جو

شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ

شکر کرے وہ اپنی جان کے فائدہ کے لئے ایسا کرتا ہے۔ اور جو ناشکری کرے تو یقیناً

میرے ملک پر حملہ آور ہوئے ہوں۔ وہ تو نہایت ذلیل لوگ ہیں۔ انہیں میرے ملک پر حملہ آور ہونے کی کیسے جرأت ہوسکتی ہے۔ تم اُن کے جرنیل کو پیغام دو۔ کہ مجھ سے آکر ملے۔ چنانچہ اس کا پیغامبر اسلامی جرنیل کے پاس پہنچا۔ انہوں نے اپنے ایک صحابیؓ افسر کو ایک دستہ کے ہمراہ بادشاہِ ایران کے پاس بھجوایا۔ صحابہؓ کے ہاتھ میں بڑے بڑے نیزے تھے اور دربار میں لاکھوں روپے کی قالینیں بچھی ہوئی تھیں۔ صحابہؓ اُن قالینوں پر اپنے نیزے مارتے ہوئے گذر گئے۔ بادشاہ کو سخت غصہ آیا کہ لاکھوں روپے کے قالین ہیں لیکن یہ لوگ ان پر نیزے مارتے ہوئے آرہے ہیں۔ جب وہ صحابیؓ قریب پہنچ گئے تو بادشاہ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگوں کو مجھ پر حملہ آور ہونے کی کس طرح جرأت ہوئی تم لوگ تو اِس قدر ذلیل تھے کہ تم گوہ کا گوشت کھایا کرتے

تھے اور اپنی ماؤں سے نکاح کرلیا کرتے تھے۔ مَیں تمہارا لحاظ کرتے ہوئے تمہارے ہر سپاہی کو ایک ایک اشرفی اور ہر افسر کو دو دو اشرفی دونگا۔ تم واپس چلے جاؤ۔ اور حملہ کا ارادہ ترک کردو۔ اُس صحابیؓ نے جواب دیا۔ بادشاہ! تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہماری یہی حالت تھی۔ ہم گوہیں کھاتے تھے اور ماؤں سے نکاح کرلیا کرتے تھے۔ لیکن اب ہماری وہ حالت نہیں رہی۔ اب خدا تعالیٰ نے ہم میں اپنا ایک رسول مبعوث کیا ہے جس نے ہمارا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے اور اُس نے ہمیں حلال اور حرام کی تمیز سکھا دی ہے۔ اب وہ زمانہ چلا گیا جب لوگ ہمیں رشوت دے کر اپنی بات منوا لیتے تھے۔ اب جب تک ہم تمہارا ملک فتح نہ کرلینگے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ بادشاہ نے کہا۔ مَیں تمہیں اِس گستاخی کی سزا دونگا۔ چنانچہ اُس نے اپنے ایک سپاہی کو

رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۱﴾ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ

میرا رب بے نیاز (اور) بڑی سخاوت کرنے والا ہے۔ (پھر) اُس نے کہا کہ اس (یعنی ملکہ) کیلئے اُسکا عرش حقیر کرکے دکھاؤ۔ ہم دیکھیں گے کہ

اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۲﴾

کیا وہ ہدایت پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے بنتی ہے جو ہدایت نہیں پاتے۔ ۱۷؎

بلایا اور اُسے حکم دیا کہ ایک بورا مٹی سے بھر کر لاؤ جب وہ مٹی کا بورا لے آیا تو اُس نے مسلمان افسر سے کہا۔ آگے آؤ۔ وہ آگے آگئے۔ اُس نے کہا۔ نیچے جھکو۔ امیر وہ نیچے جھک گئے۔ اُس نے مٹی کا بورا اُس کی پیٹھ پر رکھ دیا اور کہنے لگا۔ جاؤ میں اس بورے سے زیادہ تمہیں کچھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ میں نے تمہیں اشرفیاں پیش کی تھیں۔ لیکن تم نے انہیں قبول نہ کیا۔ اب تمہیں اس مٹی کے بورے کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا۔ وہ صحابیؓ بورا اُٹھا کر جلدی سے باہر نکل گئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا آجاؤ۔ بادشاہ ایران نے ایران کی زمین خود اپنے ہاتھ سے ہمارے سپرد کر دی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور لشکر کی طرف روانہ ہو گئے۔ مشرک تو وہمی ہوتا ہے۔ ایران کے بادشاہ نے جب یہ بات سُنی تو اُس نے لوگوں سے کہا جلدی جاؤ اور اُس مسلمان افسر سے مٹی کا بورا لے آؤ۔ یہ تو بڑی بدشگونی ہوئی۔ کہ میں نے اپنے ملک کی مٹی اپنے ہاتھ سے اُن کے حوالے کر دی۔ لیکن وہ اُسوقت تک بہت دُور نکل چکے تھے۔

العفریت

ملکۂ سبا نے بھی چاہا کہ کچھ ہدیے اور تحائف بھجوا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس حملہ سے باز رکھنے کی کوشش کروں۔ مگر انہوں نے ان تحائف کو ردّ کر دیا۔ کیونکہ وہ تحفہ نہیں تھے بلکہ ایک رشوت تھی۔

۱۷؎ **حل لغات**:۔ اَلْعِفْرِيْتُ کے معنے ہیں اَلنَّافِذُ فِي الْاَمْرِ الْمُبَالِغُ فِيْهِ مَعَ دَهَاءٍ۔ کسی کام کو کر گذرنے والا۔ اَلْخَبِيْثُ۔ اَلْمُنْكَرُ۔ بُرا۔ اور ناپسندیدہ (اقرب)

تفسیر:۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے سوچا کہ ھُدھُد کے اس لائے ہوئے تحفہ سے تو کچھ نہیں بنتا۔ کوئی اور چیز منگواؤ۔ اور فرمایا۔ اے میرے سردارو پیشتر اس کے کہ وہ لوگ میرے پاس فرمانبردار ہو کر آئیں ملکہ کا تخت کون میرے پاس لائیگا۔ وہ لوگ جو خاص باڈی گارڈ تھے ان کا ایک سردار بولا کہ آپ کے چڑھائی کرنے سے پہلے میں وہ تخت لے آؤنگا۔ چونکہ وہ سردار لشکر تھا۔ اُس کو پتہ تھا کہ اس لشکر کا یہاں کتنے عرصہ تک پڑاؤ ہوگا۔ اس لئے اُس نے اندازہ کر لیا کہ اِتنے دنوں میں ملکہ کو مرعوب کر کے وہ تخت لایا جا سکتا ہے اور ساتھ ہی یہ دعویٰ کیا کہ میں ایک طاقتور سردار ہوں اور اس چھوٹے سے ملک کی فوج میرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور میں آپ کا مطیع بھی ہوں۔ اس مال کے لانے میں کسی قسم کی خیانت مجھ سے نہیں ہو گی۔ لیکن ایک اور شخص جس کو دینی علم حاصل تھا اُس نے کہا کہ آپ کے آنکھ جھپکنے سے بھی پہلے میں وہ تخت لے آؤنگا۔

حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ طرف کے معنے خراج کے ہوتے ہیں۔ مگر میری نظر سے اب تک یہ معنے نہیں گذرے۔ اس لئے جب تک وہ

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ قَالَتْ

پس جب وہ آگئی تو کہا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ اس پر اُس نے کہا۔

كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا

کہ یُوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی ہے اور ہم کو اس سے پہلے ہی علم حاصل ہو چکا تھا اور ہم (تیرے)

مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ

فرمانبردار بن چکے تھے۔ اور اس (یعنی سلیمانؑ) نے ملکہ کو اللہ (تعالیٰ) کے سوا پرستش کرنے سے

معنے نہیں مَیں تو یہی کہوں گا کہ اس نقرہ کے وہی معنے ہیں جو عام طور پر بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی جلدی کے۔ چنانچہ جب کسی کام کے جلدی کرنے کا ذکر کرنا ہو تو یہی کہا کرتے ہیں کہ آنکھ جھپکنے میں یہ کام ہو جائیگا۔ یا آنکھ جھپکنے سے پہلے یہ کام ہو جائیگا۔ پس جب ایک سردار نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ملکہ سبا کا تخت اُس کی فوج سے لڑ بھڑ کر اس لشکر کے کوچ کرنے سے پہلے لاسکتا ہے۔ تو ایک یہودی عالم بول پڑا اور اُس نے کہا کہ وہ تخت تو اس شخص کے تخت لانے سے بھی پہلے حاضر کر دیتا ہوں۔ یعنی جتنی دیر میں یہ غیر یہودی سردار یا ادومی یا عرب سردار کام کرے گا اُس سے پہلے مَیں یہ کام کر لونگا۔ یعنی ایک نیا اور اعلیٰ درجہ کا تخت بنوا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر کر دونگا اور چونکہ وہ یہود کا ملک تھا۔ اس لئے عبرانی عالم کو یقین تھا کہ یہودی ماہرین صنعت میرے لئے بہت جلد یہ کام کر دیں گے۔ پس اُس نے عفریت سے بھی پہلے عرش لانے کا وعدہ کیا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے یہ تخت پیش کیا گیا۔ اور آپ نے اُسے دیکھا تو فرمایا۔ یہ

میرے ربّ کا فضل ہے کہ اُس نے ایسے ایسے ہوشیار افسر مجھے عطا کئے ہیں اور میری ہر تمنا پوری ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ مَیں اُس کا شکر گذار بندہ بنتا ہوں یا ناشکرا۔ اور چونکہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ اِس لئے قرآن کریم نے ہی اس بات کی وضاحت کر دی کہ اِن انعامات کے نتیجہ میں سلیمانؑ شکر گذار بنا تھا ناشکرا نہیں بنا تھا۔

پھر فرماتا ہے کہ شکر گذار بننا خود انسان کے لئے فائدہ بخش ہوتا ہے اور ناشکر گذار ہونے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنی ذات میں کامل ہے اور اُسے کسی کی احتیاج نہیں۔

اللہ تعالےٰ کے حضور اُس کی شکر گذاری کے جذبات کا اظہار کرنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے پھر پہلے مضمون کی طرف رجوع کیا اور فرمایا کہ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا۔ یہ تخت جو تم لائے ہو ہے تو اچھا لیکن مَیں یہ چاہتا ہوں کہ اُس کے تخت سے بھی زیادہ اچھا تخت ہو۔ پس تم ملکہ کے لئے اُس کے تخت کو حقیر بنا دو یعنی ایسا تخت بناؤ کہ اُسے اپنا تخت حقیر نظر آنے لگے۔ مَیں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ اس بات کو

دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۴﴾

روکا - وہ یقیناً کافر قوم میں سے تھی ۱۸ؑ

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ

اور اُسے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ - پس جب اُس نے اس (محل) کو دیکھا تو اُس کو گہرا پانی سمجھا اور

كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ

گھبرا گئی - تب اُس (یعنی سلیمانؑ) نے کہا - یہ تو محل ہے جس میں شیشہ کے ٹکڑے لگائے گئے ہیں۔

قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ

تب وہ (ملکہ) بولی - اے میرے رب! مَیں نے اپنی جان پر ظلم کیا - اور مَیں سلیمانؑ کے ساتھ

سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ ع

۳ ع ۱۸

رب العالمین خدا پر ایمان لاتی ہوں - ۱۹ؑ

دیکھ کر تسلیم کر لیتی ہے کہ نہیں کہ مجھ پر خدا تعالیٰ کے بڑے فضل ہیں یا اپنے گھمنڈ پر قائم رہتی ہے۔

۱۸ؑ تفسیر: - جب ملکہ آ گئی تو اُس سے کہا گیا کہ یہ تخت جو ہمارے بادشاہ کے پاس پڑا ہے کیا تمہارا تخت بھی ایسا ہی ہے۔ اس پر اُس کا گھمنڈ اس کے راستہ میں حائل ہو گیا - اور بجائے یہ کہنے کے کہ یہ تو اُس سے بہت اعلیٰ ہے اُس نے کہا - یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ ویسا ہی تخت ہے۔ مگر پھر کہنے لگی اِن تدبیروں کی کیا ضرورت تھی - ہم تو سلیمانؑ کے دین کے حالات سُن کر پہلے ہی معلوم کر چکے ہیں کہ اُس کا دین سچا ہے۔ اور ہم فرمانبردار بن چکے ہیں۔

تب حضرت سلیمانؑ نے اُس کو اُن چیزوں کی پرستش کرنے سے روکا جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش کرتی تھی اور اُسے وعظ و نصیحت کی کیونکہ وہ کافر قوم میں سے تھی۔

اَلصَّرْحُ

لُجَّةً

مُمَرَّدٌ

قَوَارِيْرَ

۱۹ؑ حل لغات: - اَلصَّرْحُ : (۱) اَلْقَصْرُ - محل - (۲) كُلُّ بِنَاءٍ عَالٍ - ہر اونچی عمارت (اقرب)

لُجَّةٌ : لُجَّةٌ کے معنے ہیں مُعْظَمُ الْمَاءِ - گہرا پانی - اَلْمِرْاٰةُ - آئینہ - اَلْفِضَّةُ - چاندی (اقرب)

مُمَرَّدٌ : مَرَّدَ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور مَرَّدَ الْبِنَاءَ کے معنے ہیں مَلَّسَهٗ وَ سَوَّاهُ - عمارت کو درست اور ہموار اور نرم بنایا - (اقرب) پس مُمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ کے معنے ہیں جس پر شیشے لگائے گئے ہوں - اور اُسے نازک بنایا گیا ہے۔

قَوَارِيْرَ : قَارُوْرَةٌ کی جمع ہے اور قارورہ کے معنے شیشہ کے ہیں (اقرب) پس قَوَارِيْرَ کے معنے ہونگے شیشے۔

تفسیر: - مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ملکہ بلقیس سے شادی کرنا چاہتے تھے - مگر

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا

اور ہم نے ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح کو ضرور رسول بنا کر بھیجا تھا۔ (یہ کہتے ہوئے) کہ اللہ (تعالیٰ)

اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ يٰقَوْمِ

کی عبادت کرو۔ پس وہ سُنتے ہی دو گروہ ہو گئے جو آپس میں جھگڑنے لگے۔ اُس (یعنی صالحؑ) نے کہا اے میری قوم!

اُن کو جنوں نے خبر دی کہ اُس کی پنڈلیوں پر بکری کی طرح بال ہیں۔ انہوں نے اس بات کی تحقیق کے لئے ایک عظیم الشان محل بنایا۔ اور اس میں ایک بہت بڑا حوض کھدوا کر اُسے پانی سے لبریز کر دیا اور پھر اُس پر بلور کے ٹکڑوں کا ایسا فرش لگوایا کہ انسانی نگاہ دھوکا کھا جائے اور وہ یہ سمجھے کہ صحن میں پانی بہ رہا ہے۔ جب یہ محل تیار ہو گیا۔ تو انہوں نے بلقیس کو وہ محل ٹھہرنے کے لئے پیش کیا۔ جب وہ صحن میں سے گذرنے لگی۔ تو چونکہ فرش پر شیشہ لگا ہوا تھا اور اُس کے نیچے پانی بہ رہا تھا۔ اُس نے سمجھا کہ سچ مچ پانی بہ رہا ہے اور گھبرا کر اُس نے اپنے کپڑے اُڑس لئے اور پنڈلیاں ننگی کر دیں۔ اس طریق سے آپ نے معلوم کر لیا کہ واقعہ میں اُس کی پنڈلیوں پر بال موجود ہیں۔ اور پھر آپ نے ایک بال صفا پوڈر تیار کیا جس سے اُس کے بال دُور ہوئے۔

بعض کہتے ہیں۔ پنڈلیوں کے بال دیکھنے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسقدر انتظام کیں کرنا تھا اصل بات یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے ملکہ کا تخت منگوایا تھا انہیں خیال آیا کہ تخت منگوانے سے میری سبکی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس سُبکی کا ازالہ کرنے کے لئے آپ نے یہ محل بنوایا تاکہ اپنی وقعت قائم کر سکیں۔ مگر کیا دنیا کا کوئی بھی سمجھدار انسان کہہ سکتا ہے کہ یہ باتیں ایسی اہم ہیں کہ ان کا ذکر خدا تعالیٰ کے کلام میں اور خصوصاً آخری شریعت کے حامل کلام میں ہونا چاہیئے تھا۔ ان باتوں کا تو نہ دین سے تعلق ہے نہ عرفان سے اور نہ خدا تعالیٰ کے انبیاء ایسے لغو کام کیا کرتے ہیں۔ اصل بات صرف اتنی ہے۔ کہ ملکہ سبا ایک مشرکہ عورت تھی اور سورج پرست تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے کہ وہ شرک چھوڑ دے۔ اس کے لئے آپ نے اُسے زبانی بھی نصیحت فرمائی۔ مگر پھر آپ نے چاہا کہ عملاً بھی اس کے عقیدہ کی غلطی اُس پر ظاہر کریں۔ چنانچہ اس کے لئے آپ نے یہ طریق اختیار کیا کہ اُس کے قیام کے لئے آپ نے ایک ایسا محل تجویز فرمایا جس میں شیشہ کا فرش تھا اور اُس کے نیچے پانی بہتا تھا جب ملکہ اُس کے فرش پر سے گذرنے لگی تو اُسے شبہ ہوا کہ یہ پانی ہے اور اُس نے جھٹ اپنی پنڈلیوں پر سے کپڑا اُٹھا لیا یا اُسے دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

(كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا کے یہ دونوں معنے ہیں) اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اُسے تسلی دی اور کہا کہ بی بی! دھوکا مت کھاؤ۔ جسے تم پانی سمجھتی ہو یہ تو دراصل شیشہ کا فرش ہے اور پانی اس کے نیچے ہے۔ چونکہ پہلے آپ دلائل سے شرک کی غلطی اُس پر واضح کر چکے تھے اُس نے فوراً سمجھ لیا کہ انہوں نے ایک عملی مثال دے کر مجھ پر شرک کی حقیقت کھول دی ہے اور سمجھایا ہے کہ جس طرح پانی کی جھلک شیشہ میں سے تجھے نظر آتی ہے اور تو نے اسے پانی سمجھ لیا ہے ایسا ہی خدا تعالیٰ کا نور اجرام فلکی میں سے جھلک رہا ہے۔ چنانچہ اس دلیل سے وہ بڑی متاثر ہوئی اور بے اختیار کہہ اُٹھی کہ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ

لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا

تم خوشحالی کے آنے سے پہلے خراب حالی کے لئے کیوں جلدی کرتے ہو؟ کیا تم خدا (تعالیٰ)

تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ قَالُوا اطَّيَّرْنَا

سے اپنے گناہوں پر استغفار نہیں کرتے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ انہوں نے کہا (اے صالح!) ہم نے (جتنا سوچا ہے)

بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ

تجھے اور تیرے ساتھیوں کو منحوس ہی پایا ہے (یعنی تم لوگ اپنی قوم کے لئے کسی ترقی کا نہیں بلکہ تباہی کا موجب ہوگئے) اُس (یعنی صالح)

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۸﴾

نے کہا۔ تمہاری نحوست کا سبب تو اللہ کے پاس ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم ایک ایسی قوم ہو جس کو آزمائش میں ڈالا گیا ہے۔ ؎۲۰

وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. یعنی اے میرے رب میں نے شرک کرکے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ اب میں سلیمانؑ کے ساتھ یعنی اُس کے دین کے مطابق اُس خدا پر ایمان لاتی ہوں جو سب جہانوں کا رب ہے اور سورج اور چاند وغیرہ بھی اُسی سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔

۲۰ حل لغات:۔ اِطَّيَّرْنَا اصل میں تَطَيَّرَ سے ہے اور اِس میں قلب اور ادغام کا قاعدہ استعمال ہوا ہے اور تَطَيَّرَ کے معنے ہیں تَشَاءَمَ یعنی نحوست کا اندازہ لگایا یا نحوست محسوس کی۔ اہلِ عرب کہتے ہیں اِطَّيَّرَ بِهٖ وَ اِطَّيَّرَ مِنْهُ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے نحوست کے آثار دیکھے۔ (اقرب)

طٰٓئِرُكُمْ : طائر کے معنے پرندے کے ہیں۔ لیکن عرب لوگ چونکہ پرندوں سے شگون لیا کرتے تھے اِس لئے شگون کے لئے بھی طَائِر کا لفظ بول لیا جاتا ہے چنانچہ مسافر کو رخصت کرتے وقت دُعا کے طور پر کہتے ہیں سِرْ عَلَى الطَّائِرِ الْمَيْمُوْنِ. مبارک شگون پر چل۔ اسی طرح کہتے ہیں هُوَ مَيْمُوْنُ الطَّائِرِ۔ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ مبارک چہرے والا ہے۔ اِسی طرح انسانی اعمال کو بھی خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے طائر کہتے ہیں۔ اور ستارے کو بھی طائر کہتے ہیں کیونکہ ستاروں سے بھی نحوست اور بھلائی کے حالات معلوم کئے جاتے ہیں۔ (اقرب)

تُفْتَنُوْنَ : فُتِنَ الرَّجُلُ فِيْ دِيْنِهٖ کے معنے ہوتے ہیں مَالَ عَنْهُ. اپنے دین سے علیحدہ ہوگیا اور فُتِنَ فُلَانٌ کے معنے ہوتے ہیں اَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ۔ فَذَهَبَ مَالُهٗ وَ عَقْلُهٗ. اس پر کوئی مصیبت نازل ہوئی جس کی وجہ سے اُس کا مال یا اُس کی عقل جاتی رہی۔

تفسیر:۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ ثمود کا ذکر فرماتا ہے۔ یہ قوم یہود کی ترقی کے زمانہ سے پہلے گذر چکی تھی اور حضرت موسیٰؑ کے قریب زمانہ کی تھی۔ مگر اس کا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر کے بعد اور اُن کے واقعہ سے ملا کر اس لئے کیا گیا ہے کہ ثمود کی قوم کا بہت سا علاقہ حضرت سلیمان

علیہ السلام کے ماتحت آگیا تھا۔

قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں کہ تاریخوں کے لحاظ سے واقعات بیان کرے۔ قرآن کریم مذہب اور تمدن کی کتاب ہے۔ اس لئے مذہب اور تمدن کے لحاظ سے جو واسطہ مختلف قوموں میں تھا اُس کے لحاظ سے وہ اُن کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ ثمود جو پہلے گذرے تھے مگر اُن کا علاقہ چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ماتحت آگیا تھا۔ اور یہودی تمدن نے اُن پر اثر ڈال لیا تھا اور انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اطاعت قبول کرلی تھی اس لئے ان کی قوم کا ذکر حضرت سلیمان علیہ السلام کی قوم کے بعد کر دیا گیا۔ کیونکہ درحقیقت جن لوگوں کا نام جِنّ رکھا گیا ہے وہ ثمود کی قوم کے ہی لوگ تھے۔ جنہیں ایک غیر قوم کے افراد ہونے کی وجہ سے جِنّ کہہ دیا گیا پس چونکہ اُن کی زنجیر یہودیوں کی زنجیر میں مل گئی تھی اور ان کا ایک ادنیٰ حصہ ہو گئی تھی اس لئے ان کا ذکر یہودیوں کے ذکر کے بعد کیا گیا۔

قوم ثمود کے متعلق فرماتا ہے کہ اُن کے نبی حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں توحید کی تعلیم دی تھی۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ اس کی آواز کو سُنتے اور اس پر لبیک کہتے انہوں نے جھگڑا اور فساد شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن میں دو گروہ ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے تو حضرت صالح علیہ السلام کو مان لیا۔ اور کچھ لوگوں نے انکار کر دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ ثمود عاد کے قائم مقام تھے اور یہ لوگ عرب کے جنوب سے بڑھتے ہوئے عرب کے شمال کے تمام علاقوں میں پھیل گئے تھے۔ اور بہت سی موحّد قوموں کا ان سے تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ "فتوح الشام" کا مصنف ابو اسمٰعیل لکھتا ہے کہ ثمود قوم بصریٰ سے لے کر (جو شام کا ایک شہر ہے) عدن تک پھیلی ہوئی تھی اور وہیں اُن کی حکومت تھی۔ پھر حمیر اور سبا کی طاقت کے زمانہ میں جب ان کو ہجرت کرنی پڑی تو اُس وقت وہ جنوب سے شمال کو نکل گئے۔ چنانچہ پہلے حجاز پھر تہامہ اور پھر حِجر میں چلے گئے۔ پس وہ لوگ جو توحید کے زیر اثر تھے انہوں نے تو حضرت صالح علیہ السلام کو مان لیا۔ مگر جو توحید سے دُور علاقہ کے رہنے والے تھے انہوں نے آپ کی سخت مخالفت کی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں سمجھایا مگر بجائے اس کے کہ وہ نصیحت حاصل کرتے انہوں نے کہا اے صالح! ہم تو تجھے سبز قدم سمجھتے ہیں۔ ہمیں تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ تیری تعلیم سے جو ہماری قوم میں تفرقہ پیدا ہُوا ہے یہ ہماری قوم کو تباہ کر دیگا۔ اُن نادانوں نے یہ نہ سمجھا کہ صالح ہمیں زندہ کرنے کے لئے آیا ہے۔ یہ ہمیں قعرِ ذلّت سے اُٹھا کر بامِ رفعت پر پہنچانے کے لئے آیا ہے۔ انہوں نے صرف یہ دیکھ کر کہ صالحؑ کے آنے سے قوم کے اندر ایک ہلچل پیدا ہو گئی ہے اور کچھ لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ ہم ایک غلط راستہ پر چل رہے تھے اب ہمیں اپنی اصلاح کرنی چاہیئے اور بُرے اعمال سے اجتناب اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ کہنا شروع کر دیا کہ قوم میں یہ بگاڑ صرف صالحؑ کی نحوست کی وجہ سے پیدا ہُوا ہے۔ اگر صالح نہ آتا تو ہماری یکجہتی کو یہ صدمہ نہ پہنچتا۔ حالانکہ مردہ انسان خواہ لاکھوں بھی ہوں دنیا میں کوئی تغیّر پیدا نہیں کیا کرتے۔ تغیّر ہمیشہ زندہ وجودوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے خواہ اُن کی کتنی ہی قلیل تعداد کیوں نہ ہو۔ صالحؑ کے آنے سے پہلے وہ لوگ مُردہ تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی کے ذریعہ اُن کی اصلاح کا سامان کیا۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ اس سامان پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے انہوں نے حضرت صالحؑ کو قوم کا بیڑہ غرق کرنے والا

قرار دیدیا - چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے توحید کے قیام کے لئے کھڑا کیا تھا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح حضرت صالح علیہ السلام کو انکی قوم نے تفرقہ انداز قرار دیا تھا - اسی طرح کفّار نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والا قرار دیا - بلکہ وہ ایک دفعہ حضرت ابوطالب کے پاس محض اس لئے آئے کہ وہ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں اور انہیں توحید کی اشاعت سے روکنے کی کوشش کریں - کفّارِ مکّہ کی یہ گھبراہٹ بالکل ویسی ہی تھی جیسے حضرت صالحؑ کے زمانے میں اُن کے مخالفین نے جب انہیں توحید کی تعلیم دیتے دیکھا تو انہوں نے بگڑ کر حضرت صالحؑ کو منحوس اور سبز قدم کہنا شروع کر دیا - مگر نہ حضرت صالحؑ نے خدائے واحد کا پیغام پہنچانا ترک کیا اور نہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے توحید کی تعلیم ترک کی - اور آخر اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک دن مُردہ عرب زندہ ہو گیا - آخر ایک زندہ اور مُردہ میں کیا فرق ہوتا ہے یہی فرق ہوتا ہے کہ مُردہ کو کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا - اس کے سامنے اس کے کسی عزیز ترین وجود کو گالی دی جائے یا اُسے قتل کر دیا جائے وہ دفاع کے لئے کوئی حرکت نہیں کر سکتا - نہ اس ظلم کا اُسے کچھ احساس ہوتا ہے لیکن زندہ انسان اپنے نفع اور نقصان کو بھی سمجھتا ہے - اور دوسروں کے حقوق کے لئے بھی جدوجہد کرتا ہے - یہی کیفیت رُوحانی مُردوں میں بھی پائی جاتی ہے وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہر قسم کے مظالم دیکھتے ہیں لوگ اُن کے سامنے جھوٹ بولتے ہیں - اُن کی موجودگی میں دھوکہ بازیاں کرتے ہیں - اُن کی آنکھوں کے سامنے ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں - مگر انہیں پرواہ تک نہیں ہوتی مگر جب اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی دنیا میں آتا ہے تو وہ کہتا ہے اگر تم کسی کو جھوٹ بولتے دیکھو تو اُسے منع کرو - اگر کوئی ظلم کر رہا ہو تو اُسے ظلم سے روکو - بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا کہ ایمان کی علامت یہ ہے کہ جب مومن کوئی بُری بات دیکھے تو ہاتھ سے اُس کا ازالہ کرے - اور اگر ہاتھ سے ازالہ نہ کر سکتا ہو تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے - اور اگر زبان سے بھی نہ روک سکتا ہو تو اپنے دل میں ہی بُرا منائے - مگر روحانی مُردوں میں یہ تینوں باتیں نہیں پائی جاتیں - وہ بُرائی ظلم اور جھوٹ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں - مگر نہ تو وہ ہاتھ سے اس کا ازالہ کرتے ہیں نہ زبان سے کسی کو منع کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کے بُرے فعل پر اپنے دل میں ہی بُرا مناتے ہیں - بے شک بعض دفعہ وہ دکھاوے کے طور پر زبان سے کہہ بھی دیتے ہیں - مگر کہتے وقت اُن کے چہرے پر غیرت کے آثار نہیں پائے جاتے - مگر زندہ انسان کی یہ علامت ہے کہ اُس کے اندر ان تینوں باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوگی - وہ بُری بات کو دیکھ کر یا تو ہاتھ سے اُس کا ازالہ کرے گا - یا زبان سے دوسرے کو روکے گا - اور یا پھر دل میں ہی بُرا منائیگا -

اس کی ایک نمایاں مثال حضرت عثمان بن مظعونؓ کا واقعہ ہے - حضرت عثمان بن مظعونؓ چھوٹی عمر میں ہی اسلام میں داخل ہو گئے تھے - جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی - تو عثمان بن مظعونؓ نے بھی ہجرت کا ارادہ کیا - جب وہ تیار ہو گئے تو مکّہ کے ایک رئیس نے اُن سے کہا کہ تمہارا باپ میرا دوست تھا اور وہ میرا بھائی بنا ہوا تھا - اگر تم اس وجہ سے ہجرت کر رہے ہو کہ لوگ تمہیں تکلیفیں دیتے ہیں تو میں سارے شہر میں اعلان کر دیتا ہوں کہ عثمان آج سے میری پناہ میں ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے - حضرت

عثمان بن مظعونؓ نے اُس کی بات مان لی۔ اور اُس نے دستور کے مطابق اعلان کر دیا کہ میں عثمانؓ کو پناہ دیتا ہوں۔ اُس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ لوگ انہیں تکلیفیں پہنچانے سے رُک گئے۔ اور وہ آزادانہ طور پر ادھر اُدھر پھرنے لگے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ مکّہ کے لوگ دوسرے مسلمانوں پر برابر ظلم کر رہے ہیں تو اُن کی غیرت نے یہ برداشت نہ کیا کہ وہ آرام سے پھرتے رہیں اور اُن کے بھائی اسلام کی وجہ سے تکلیفیں اُٹھائیں۔ وہ اُس رئیس کے پاس پھر آئے اور کہنے لگے کہ اپنی پناہ واپس لے لو مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا کہ میرے بھائیوں پر ظلم ہو اور میں آرام سے پھروں۔ اُس نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور آخر اُس نے اعلان کر دیا کہ آج سے عثمانؓ میری حفاظت میں نہیں ہے۔ اِس اعلان کے کچھ دن بعد عکاظ کا میلہ لگا اور لبید جو ایک بہت بڑے شاعر گذرے ہیں انہوں نے ایک مجلس میں اپنا قصیدہ سُنانا شروع کیا۔ مکّہ کے بڑے بڑے عمائد اور رؤساء بیٹھے شعر سُن رہے تھے اور جھوم جھوم کر اُس کے شعروں کی داد دے رہے تھے کہ لبید نے یہ مصرع پڑھا ؎

أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ

یعنی سُنو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز فنا ہو جانیوالی ہے۔ یہ مصرع سُنتے ہی حضرت عثمان بن مظعونؓ نے اونچی آواز سے کہا کہ بالکل درست ہے۔ تم نے سچ کہا ہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا ہر چیز فنا ہو جانیوالی ہے۔ وہ شاعر عثمانؓ سے عمر میں بہت بڑا تھا۔ اُس وقت اُسکی عمر اسّی سال کے قریب تھی اور بعد میں وہ ایک سو چالیس سال کی عمر پا کر فوت ہُوا۔ جب اُس نے دیکھا کہ ایک اٹھارہ سال کی عمر کے بچے نے اُس کے شعر کی داد دی ہے تو چونکہ وہ اپنے آپ کو بڑا کہنہ مشق اور نہایت تجربہ کار سمجھتا تھا اُس کو ایک اٹھارہ سالہ بچے کا داد دینا چُبھا اور اُس نے رؤساء سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے مکّہ والو! کیا تم میں اب کوئی اَدب باقی نہیں رہا۔ اِس لڑکے نے مجھے کیوں داد دی ہے۔ اس کا داد دینا بتاتا ہے۔ کہ اَب تم میں اپنے شاعروں کا کوئی اَدب باقی نہیں رہا۔ اِس پر لوگوں نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کو ڈانٹا اور اُنہیں کہا کہ بڑوں کی مجلس میں بولنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ تم خاموش بیٹھو اور شعر سُنو۔ اسکے بعد لبید نے اُسی شعر کا اگلا مصرعہ پڑھا کہ ؎

وَكُلُّ نَعِيْمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلٌ

یعنی ہر نعمت آخر ایک دن زائل ہونے والی ہے۔ یہ مصرعہ سُنکر حضرت عثمان بن مظعونؓ پھر بول اُٹھے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے جنّت کی نعمتیں کبھی زائل نہیں ہوتیں۔ اَب وہ شخص جس نے عثمانؓ کے داد دینے پر بھی بُرا منایا تھا وہ اُنکی مذمت کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اُس نے شعر سُنانے بند کر دیئے اور کہا کہ میں ایسی مجلس میں آئندہ کوئی شعر سُنانے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ اِسپر ایک شخص بڑے جوش سے اُٹھا اور اُس نے عثمان بن مظعونؓ کو گھونسا مارا جو سیدھا اُن کی آنکھ میں لگا اور اُن کی ایک آنکھ کا ڈیلا باہر نکل آیا۔ وہ رئیس جس نے پہلے انہیں پناہ دی تھی وہ بھی اُسی مجلس میں بیٹھا ہُوا تھا وہ رؤساء کی موجودگی میں اتنی جرأت تو نہیں کر سکتا تھا کہ کھُلم کھُلا عثمانؓ کی حمایت کرتا مگر جیسے کسی نوکر کا بچہ اگر آقا کے بچے سے لڑ پڑے اور آقا کا بچہ نوکر کے بچے کو مارے تو نوکر اپنے بچے کو ہی ڈانٹنا شروع کر دیتا ہے۔ اِسی طرح اُس رئیس نے بھی حضرت عثمانؓ کو دیکھا اور غصّہ سے کہا۔ میں نہیں کہتا تھا کہ میری پناہ میں سے نہ نکلو۔ اب دیکھا پناہ میں سے نکلنے کا کیا مزہ آیا۔ اب بظاہر تو یہ الفاظ غصہ والے نظر آتے ہیں مگر درحقیقت

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ

اور شہر میں نو آدمی تھے جو ملک میں

فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿۴۹﴾ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ

فساد کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ تم سب اس پر اللہ (تعالیٰ) کی قسم کھاؤ

ان میں محبت کی ایک جھلک پائی جاتی تھی۔ جب اُس رئیس نے یہ بات کہی تو عثمان بن مظعونؓ نے جواب دیا کہ اگر میری ایک آنکھ نکل گئی تو کیا ہُوا۔ خدا کی قسم میری تو دوسری آنکھ بھی اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ اُسے خدا کی راہ میں نکلنے کا کب موقعہ ملتا ہے۔ یہ وہ نئی زندگی ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ صحابہؓ کو ملی اور جس نے انہیں ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔

اِس کے مقابلہ میں ابوجہل کے سامنے ہر قسم کے بُرے کام کئے جاتے تھے مگر وہ انہیں ہنسی خوشی برداشت کر لیتا تھا۔ ابوجہل کے برداشت کر لینے اور صحابہؓ کے برداشت نہ کر سکنے کی وجہ یہی ہے کہ ابوجہل مُردہ تھا اور صحابہؓ زندہ تھے۔ پھر صحابہؓ کی زندگی کا اس امر سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ مکہ کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے رکھی گئی تھی۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک مکہ کے لوگ کولھو کے بیل کی طرح صرف ایک ہی جگہ چکر کاٹتے رہے اور عرب سے کبھی باہر نہیں نکلے۔ مگر جونہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں زندگی کی ایک نئی رُوح پھونکی۔ وہ ایک قلیل عرصہ میں ساری دنیا پر چھا گئے حالانکہ صحابہؓ انہی لوگوں کی اولاد تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک جو اڑھائی ہزار سال کا لمبا عرصہ بنتا ہے ساکت اور جامد بیٹھے رہے اور کولھو کے بیل کی طرح عرب کے اندر ہی چکر کاٹتے رہے لیکن جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے اندر زندگی کی ایک نئی رُوح پھونکی تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے چین، سپین، سسلی، اٹلی، افریقہ اور روس کی سرحدوں تک جا پہنچے۔ اور ابھی آدھی صدی بھی نہیں گذری تھی کہ مسلمان ساری دنیا پر چھا گئے۔ یہی وہ زندگی تھی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اُن کو عطا ہوئی اور یہی وہ زندگی تھی جس کا جام ہر نبی کو دیا گیا۔ اور انہوں نے چاہا کہ روحانی لحاظ سے سڑے گلے مُردے بھی وہ جام اپنے ہونٹوں سے لگا کر ایک نئی زندگی حاصل کریں۔ مگر اس لئے کہ انبیاء ایک نیا نظام جاری کرتے ہیں اور ہر نظام اپنے ساتھ ایک انقلاب وابستہ رکھتا ہے وہ لوگ جو روحانیت کے دشمن ہوتے ہیں اُن کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں ہر قسم کی نحوستوں کا موجب قرار دے دیتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیوں کے مطابق طاعون اور زلازل سے اموات ہوئیں تو گو ایک طبقہ نے ہدایت حاصل کی مگر کچھ لوگوں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ یہ بلائیں اور وبائیں محض مرزا صاحب کی نحوست کی وجہ سے آ رہی ہیں۔ اگر یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ نہ کرتے تو دنیا پر یہ عذاب کیوں آتے۔ یہی بات حضرت صالح علیہ السلام کے مخالفین نے بھی کہی کہ یہ سب تیری نحوست کا نتیجہ ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اُن کی بات سُن کر کہا۔ کہ تمہارا نحس اور مبارک شگون تو خداتعا

لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا

کہ ہم اُس کے اور اُس کے گھر والوں پر رات کے وقت حملہ کریں گے پھر جو بھی اُس کے خون کا مطالبہ کرنے آئیگا ہم اُس سے کہیں گے کہ ہم نے

مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا

اُس کے اہل کی ہلاکت (کے واقعہ) کو نہیں دیکھا اور ہم سچے ہیں - اور انہوں نے ایک تدبیر کی اور ہم نے بھی ایک

مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۱﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

تدبیر کی اور وہ جانتے نہیں تھے - پھر دیکھ اُن کی تدبیر کا نتیجہ کیا

مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۲﴾ فَتِلْكَ

نکلا - ہم نے اُن کو اور اُنکی قوم کو سب کو تباہ کر کے رکھدیا - پس (دیکھ) یہ

بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

ان کے گھر ہیں جو ان کے ظلموں کی وجہ سے گرے ہوئے ہیں - اس میں علم والی قوم کے لئے

لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۴﴾

بڑا نشان ہے - اور ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور تقویٰ کرتے تھے نجات دی۔ ۲۱ﮦ

کے ہاتھ میں ہے - اگر تم اُس کو سزا پر آمادہ کرو گے تو وہ تمہیں سزا دیگا اور اگر انعام پر آمادہ کرو گے تو انعام دیگا لیکن مجھے بھی تمہاری خیر نظر نہیں آتی - کیونکہ تم ایک ایسی قوم ہو جو سچے دین کو چھوڑ بیٹھی ہے - اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم سزا ہی پاؤ گے -

۲۱ﮦ حل لغات

رَهْطٌ - اَلرَّهْطُ کے معنے ہیں قَوْمُ الرَّجُلِ وَ قَبِيْلَتُهٗ - یعنی قوم اور قبیلہ وَ عَدَدٌ يُّجْمَعُ مِنَ الثَّلٰثَةِ اِلَى الْعَشَرَةِ وَ لَيْسَ فِيْهِمْ اِمْرَاَةٌ - اور تین سے دس تک کے عدد کی گنتی جس میں کوئی عورت نہ ہو اسے بھی رَهْط کہتے ہیں - (اقرب)

لَنُبَيِّتَنَّهٗ

لَنُبَيِّتَنَّهٗ : بَيَّتَ سے فعل مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے - اور بَيَّتَ الْاَمْرَ کے معنے ہیں عَمِلَهٗ اَوْ دَبَّرَهٗ لَيْلًا - رات کو کام کیا - یا اس کام کے کرنے کے متعلق رات کو تدبیر کی (اقرب) پس نُبَيِّتَنَّهٗ کے معنے ہونگے ہم اُس کی ہلاکت کے متعلق رات کو تدبیر کریں گے -

رَهْط
دَمَّرْنَا

دَمَّرْنَا : دَمَّرَ سے جمع متکلم کا صیغہ ہے اور دَمَّرَهُمْ وَ عَلَيْهِمْ کے معنے ہیں اَهْلَكَهُمْ - اُن کو ہلاک کیا - (اقرب)

خَاوِيَةٌ

خَاوِيَةٌ : خَوٰى سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور خَوَتِ الدَّارُ کے معنے ہیں سَقَطَتْ وَ تَهَدَّمَتْ - مکان گر گیا اور تباہ ہو گیا اور خَوِيَتِ الدَّارُ کے معنے

ہوتے ہیں خَلَتْ مِنْ اَھْلِھَا ۔ رہنے والوں سے گھر خالی ہو گیا۔ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جس شہر میں مبعوث فرمایا تھا اُس میں قوم ثمود کے نو ائمۃ الکفر رہتے تھے جو رات دن تخریبی سرگرمیوں میں مشغول رہتے تھے اور حضرت صالحؑ کے مشن کو نقصان پہنچانے اور آپ کی اشاعتِ توحید کی مساعی کو ناکام بنانے کی جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ اگر وہ اپنی بڑائی اور عزت کو اصلاحی کاموں میں صرف کرتے اور لوگوں کو صلاحیت اور رشد کے راستہ پر چلانے کی کوشش کرتے تو اُن کی عزت میں اَور بھی اضافہ ہو جاتا۔ مگر انہوں نے اس راستہ پر قدم مارا جو انہیں ہلاکت اور بربادی کی طرف لے جانے والا تھا۔ چنانچہ ایک دن انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ آؤ اور اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر معاہدہ کرو کہ ایک رات ہم سب مل کر صالحؑ اور اُس کے اہل و عیال پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دینگے اور پھر جب اُس کے ورثاء ہم سے خونبہا مانگیں گے تو ہم اُن سے صاف صاف کہہ دیں گے کہ ہم نے اس کے اور اس کے اہل کے قتل کے واقعہ کو دیکھا تک نہیں اور ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ اِس طرح انہوں نے حضرت صالحؑ کی تباہی کا منصوبہ سوچا۔ مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ آسمان پر ایک خدا موجود ہے جو صالحؑ کی حفاظت کر رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی تدبیریں کیں مگر اُن کے بالمقابل ہم نے بھی تدبیریں کیں اور وہ ہماری تدبیروں کو کہاں سمجھ سکتے تھے۔ وہ اِسی دھوکا میں مبتلا رہے کہ صالح کے قتل کے منصوبے میں انہیں کامیابی حاصل ہو جائیگی۔ اور وہ سمجھ بھی نہ سکے کہ آسمانی تدبیر غالب آ رہی ہے اور اُن کی تدبیر ناکام جا رہی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو کہ اُن کی تدبیروں کے باوجود ہم نے اُن نو آدمیوں کو بھی اور اُن کی قوم کے تمام چھوٹوں اور بڑوں کو بھی جو اس قاتلانہ منصوبہ میں اُن کے شریک تھے یا اُن کی ہمدردی انہیں حاصل تھی اپنے عذاب کا نشانہ بنا دیا اور ان سب کو تباہ و برباد کر دیا۔ تمہارے سامنے انکی اُجڑی ہوئی بستیاں اور گرے ہوئے مکانات اور مکینوں سے خالی مکان موجود ہیں جو لوگوں کے لئے عبرت کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ اور اس میں عقل اور دانش رکھنے والی قوم کے لئے بڑا بھاری نشان ہے۔ مگر جو لوگ صالحؑ پر ایمان لائے تھے اور جنہوں نے تقویٰ اور طہارت میں اپنی عمر بسر کی تھی ہم نے اُنکو اس عذاب سے بچا لیا اور اُن کی ترقی کے سامان پیدا کئے۔

قوم ثمود کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس طرح حضرت صالحؑ کے قتل کے لئے اُن کی قوم کے نو ائمۃ الکفر نے ایک خطرناک سازش کی تھی اسی طرح مکہ کے نو ائمۃ الکفر بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لئے باہم معاہدہ کرینگے اور آخر وہ اُسی فیصلہ پر پہنچیں گے کہ تمام قبائل مل کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر دیں۔ مگر جس طرح حضرت صالحؑ کے دشمن ناکام رہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ مکہ کے ائمۃ الکفر کو بھی ناکام کریگا۔ اور پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت صالحؑ اور اُن پر ایمان لانے والوں کو نجات دی اور انہیں عذاب کے مقام سے نکال کر لے گیا۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بھی دشمن کے نرغہ سے نکال کر مدینہ لے جائیگا اور آپ کی کامیابی اور فتوحات کا دروازہ کھول دیگا۔

ہر شخص جو تاریخ سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ کس طرح یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی جس طرح حضرت صالحؑ کے زمانہ میں نو بڑے بھاری مفسد تھے۔ اِسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے

مقابلہ میں وُہی ائمۃ الکفر تھے۔

(۱) سب سے بڑا مفسد جو گویا رأس المعاندین تھا ابوجہل تھا جسے مکہ والے ابوالحکم یعنی دانائی کا باپ کہا کرتے تھے (۲) دوسرا مفسد ابولہب تھا (۳) تیسرا مفسد امیّہ بن خلف تھا۔ (۴) چوتھا مفسد النضر بن الحارث تھا (۵) پانچواں مفسد عقبہ بن ابی معیط تھا (۶) چھٹا مفسد ولید بن مغیرہ تھا (۷) ساتواں مفسد عاص بن وائل تھا (۸) آٹھواں مفسد عتبہ تھا اور (۹) نواں مفسد شیبہ تھا۔

ان میں سے ابوجہلؔ۔ امیّہؔ۔ عقبہؔ بن ابی معیط عتبہؔ اور شیبہؔ پانچوں جنگ بدر میں مارے گئے۔ النضر ابن الحارث جنگِ بدر میں قید ہوا۔ اور پھر اپنے جرائم کی پاداش میں مارا گیا۔ ولیدؔ ہجرت کے تین ماہ بعد پاؤں میں تیر چبھ جانے کی وجہ سے ہلاک ہوا۔ عاصؔ بن وائل ہجرت کے دوسرے ماہ اچانک پاؤں سُوجھ جانے سے مرگیا اور ابولہب جنگ بدر کے تھوڑا عرصہ بعد مکہ میں بیمار ہو کر ہلاک ہوا۔

ان لوگوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مشن کو نقصان پہنچانے اور آپ کو جسمانی رنگ میں بھی ہر رنگ کا دکھ پہنچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی اور پھر انہوں نے یہیں تک بس نہ کی بلکہ ایک دن قریش مکہ کے تمام رؤساء دارالندوہ میں جمع ہوئے۔ اور انہوں نے کہا کہ اب ہمیں اسلام کے مٹانے کے لئے متحدہ طور پر کوئی تدبیر کرنی چاہیئے۔ اور آخر ابوجہل کی اِس رائے پر سب کا اتفاق ہوگیا کہ ہر قبیلہ سے ایک ایک نوجوان چنا جائے اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک تلوار دے دی جائے۔ پھر یہ سارے کے سارے اکٹھے ہو کر ایک رات محمد (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) پر حملہ کر کے اُسے قتل کر دیں۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ چونکہ تمام قبائل کے چُنیدہ نوجوان اُس میں شریک ہونگے۔ اس لئے بنو عبد مناف کو یہ جرأت نہیں ہوگی کہ وہ ساری قوم کے ساتھ لڑ سکیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کریں گے کہ خونبہا مانگ لیں۔ سو وہ ہم دے دیں گے۔ غرض انہوں نے یہ تدبیر کی اور اپنے دل میں خوش ہوئے کہ اب ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے مگر جس خدا نے حضرت صالحؑ اور اُن پر ایمان لانے والے مخلصین کو دشمنوں کی سازش سے محفوظ رکھا تھا اُس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچاؤ کے متعلق بھی تدبیر کی۔ اور ادھر تو وہ یہ منصوبہ کر کے باہر نکلے اور ادھر خدا نے اس منصوبہ کی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دیدی اور آپ کو ہجرت کی اجازت مل گئی۔ یہ ہجرت کی اجازت درحقیقت اسلام کے غلبہ کی ایک عظیم الشان بنیاد تھی اسی ہجرت کے نتیجہ میں جنگِ بدر کی صورت میں اہل مکہ پر وہ عذاب آیا جس نے اُن کی طاقت کو بالکل توڑ کر رکھ دیا۔ اور پھر دوسرا عذاب اُن پر اُس وقت آیا جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکہ کو فتح کر لیا۔ مکہ والوں پر جو یہ عذاب آیا۔ وہ اُن کے لئے نہایت دردناک تھا۔ مکہ کے رؤساء کو لوگوں میں اس قسم کی عزت اور عظمت حاصل تھی کہ لوگ اُنکے سامنے بات تک کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے اور اُنکے احسانات بھی لوگوں پر اس کثرت کے ساتھ تھے۔ کہ کوئی اُن کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اُن کی اِس عظمت کا پتہ اس واقعہ سے لگ سکتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جس سردار کو مکہ والوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اُس نے باتوں باتوں میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو ہاتھ لگا دیا۔ یہ دیکھ کر ایک صحابیؓ نے اپنی تلوار کا کُندہ اُس کے ہاتھ پر مارا اور کہا اپنے ناپاک ہاتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو مت لگا۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ

اور (ہم نے) لُوطؑ کو (بھی رسول بنا کر بھیجا) جبکہ اُس نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا تم بدیاں کرتے ہو۔ اور تم

تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ

دیکھ رہے ہوتے ہو۔ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مَردوں کے پاس شہوت کی نیت سے

اُس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تاکہ معلوم کرے کہ یہ کون شخص ہے جس نے میرے ہاتھ پر تلوار کا دستہ مارا ہے۔ صحابہؓ چونکہ خود پہنے ہوئے تھے اِس لئے اُن کی صرف آنکھیں اور اس کے حلقے ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ تھوڑی دیر غور کرکے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ تم فلاں شخص ہو۔ انہوں نے کہا: ہاں! اُس نے کہا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں مَیں نے فلاں موقعہ پر تمہارے خاندان کو فلاں مصیبت سے نجات دی تھی۔ اور فلاں موقع پر تم پر فلاں احسان کیا تھا۔ کیا تم میرے سامنے بولتے ہو۔ اب تو احسان فراموشی کا مادہ لوگوں میں اسقدر عام ہو چکا ہے کہ کسی پر صبح کو احسان کرو تو شام کو وہ بھول جاتا ہے اور شام کو کرو تو صبح کو بھول جاتا ہے اور کہتا ہے کیا مَیں اب ساری عمر اسکا غلام ہی بنا رہوں۔ وہ ساری عمر کے احسانات چھوڑ ایک رات کے احسان کی قدر تک برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر عربوں میں احسان مندی کا جذبہ بدرجۂ کمال پایا جاتا تھا جب اُس نے اپنے احسانات گنوائے تو گو یہ ایک نہایت ہی نازک موقعہ تھا مگر پھر بھی اس صحابیؓ کی نظریں زمین میں گڑ گئیں اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اِس پر پھر اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرنی شروع کر دیں اور کہا۔ مَیں عرب کا باپ ہوں۔ مَیں تمہاری منت کرتا ہوں کہ تم اپنی قوم کی عزت رکھ لو۔ اور دیکھو یہ جو تمہارے اردگرد جمع ہیں یہ تو مصیبت آنے پر فوراً بھاگ جائیں گے اور تمہارے کام آخر تمہاری قوم ہی آئیگی۔ پس کیوں اپنی قوم کو ذلیل کرتے ہو اسی دوران میں اُس نے اپنی بات پر زور دینے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منوانے کی خاطر آپ کی ریش مبارک کو پھر ہاتھ لگا دیا۔ اور گو آپ کی ریش مبارک کو اسکا ہاتھ لگانا لجاجت کے رنگ میں ہی تھا اور اس لئے تھا کہ آپ سے وہ اپنی بات منوائے مگر چونکہ اس میں تحقیر کا پہلو بھی پایا جاتا تھا۔ اِس لئے صحابہؓ اُسے برداشت نہ کر سکے۔ اور جونہی اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈاڑھی کو ہاتھ لگایا۔ پھر کسی شخص نے زور سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر مارا اور کہا اپنے ناپاک ہاتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کی طرف مت بڑھا۔ اُس نے پھر آنکھ اُٹھائی اور غور سے دیکھتا رہا کہ یہ کون شخص ہے جس نے مجھے روکا اور آخر پہچان کر اُس نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا ابوبکرؓ! مَیں جانتا ہوں کہ تم پر میرا کوئی احسان نہیں۔ پس وہ دوسروں پر اسقدر احسان کرنے والی قوم تھی کہ سوائے حضرت ابوبکرؓ کے جسقدر انصار اور مہاجر وہاں تھے اُن سب پر اُس شخص کا کوئی نہ کوئی احسان تھا۔ اور حضرت ابوبکرؓ کے سوا اور کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ اُس کے ہاتھ کو روک سکے۔

اب ایک تو وہ زمانہ تھا کہ اہل مکّہ کو اس قدر عزت حاصل تھی کہ اُن کا ایک سردار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جاتا ہے اور آپ کی ریش مبارک کو ہاتھ لگا کر کہتا ہے۔ مَیں عرب کا باپ ہوں۔ میری بات مان لو۔ اور جب وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو ہاتھ لگاتا ہے تو سوائے حضرت ابوبکرؓ کے اور کوئی صحابی جرأت نہیں کر سکتا کہ اُسے روکے۔ کیونکہ اُن میں سے

النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ

آتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم ایک جاہل قوم ہو۔ پس اُس کی قوم کا جواب صرف

قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْۤا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ

یہ تھا کہ (اے لوگو!) لُوط کے خاندان کو اپنے شہر سے نکال دو۔

اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا

وہ ایسے لوگ ہیں جو بڑا نیک بننا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ہم نے اُس (یعنی لوطؑ) کو اور اُسکے خاندان کے لوگوں کو

امْرَاَتَهٗ ؗ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَاَمْطَرْنَا

سوائے اسکی بیوی کے نجات دی۔ ہم نے اُس (یعنی بیوی) کو پیچھے رہنے والوں میں گن چھوڑا تھا۔ اور ہم نے اُن پر

عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۹﴾

ایک بارش برسائی۔ اور جن کو عذاب کا پیغام پہنچ چکا ہو اُن کی بارش بہت بُری ہوتی ہے ۵ ۲۲

۴ ع ۱۹

ہر ایک پر رؤسائے مکّہ کا کوئی نہ کوئی احسان تھا۔ اور یا پھر وہ زمانہ آیا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ فتح کیا تو یہ تمام رؤساء مجرموں کی طرح آپ کے سامنے پیش کئے گئے اور آپ نے اُن سے پُوچھا۔ کہ بتاؤ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ اُس وقت ان لوگوں نے نہایت ندامت اور شرمندگی کے ساتھ اپنے سر جُھکا لئے اور کہا کہ ہم آپ سے اُسی سلوک کی اُمید رکھتے ہیں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کا مکّہ سے نکالا جانا حضرت صالحؑ اور اُن کے ساتھیوں کی طرح بڑی بھاری کامیابیوں اور فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہُوا اور اسلام مکّہ سے نکل کر عرب میں اور پھر عرب سے نکل کر سارے عالم میں پھیل گیا اور مشرکین مکّہ کا نشان تک باقی نہ رہا۔

غٰبِرِيْنَ

۲۲ حل لغات: غٰبِرِيْنَ: غَابِرٌ کی جمع ہے اور اَلْغَابِرُ کے معنے ہیں اَلْبَاقِيْ۔ باقی رہنے والا۔ نیز اَلْغِبْرُ کے معنے ہیں اَلْحِقْدُ۔ کینہ۔ (اقرب) پس غَابِر کے معنے ہونگے باقی رہنے والا یا کینہ رکھنے والا۔

تفسیر: ۔ قوم ثمود کی ہلاکت کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ بیان فرماتا ہے حضرت لوط علیہ السلام بھی حضرت سلیمان علیہ السلام سے بہت پہلے گذر چکے تھے یعنی حضرت سلیمانؑ موسیٰ علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے جو آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے جن کے لوطؑ چچازاد بھائی تھے۔

حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ یہاں اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ اُن کے واقعہ کو حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے واقعہ سے مشابہت ہے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے بھی رات کے وقت منصوبہ کر کے اُن پر حملہ کرنا چاہا تھا۔ اور لُوطؑ کی قوم نے بھی رات کے وقت

منصوبہ کر کے اُن کو گھر سے نکالنا اور اُن کے مہمانوں کو ذلیل کرنا
چاہا تھا۔ اسی مشابہت کی وجہ سے اِس واقعہ کو یہاں بیان
کیا گیا ہے۔ اور درحقیقت یہ تمام واقعات رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے بطور پیشگوئی بیان کئے جاتے ہیں۔
چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی حضرت
لوطؑ کی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ حضرت لوطؑ کی قوم نے
بھی یہ فیصلہ کیا کہ اُن کو اُن کے شہر سے نکال دیں۔ یہی
فیصلہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم نے بھی کیا تھا اور
دونوں کا الزام ایک تھا گو وجوہ مختلف تھے۔ دونوں کہتے
تھے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہم سے زیادہ پاکیزہ قرار دیتے ہیں
مگر ہُوا یہ کہ خدا نے لوطؑ اور اس کے اہل کو سوائے اُس کی
بیوی کے بچا لیا۔ کیونکہ وہ آپ کے مخالفوں میں سے تھی۔
اور وہ آپ کی تعلیم سے کینہ اور بغض رکھتی تھی۔ اسی طرح
اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی
بچا لیا اور آپؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ بھی محفوظ رہے
پس اس آیت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ یقیناً آپ کے
اہل میں شامل ہیں۔ بیشک حضرت لوطؑ کے متعلق یہ بھی
آتا ہے کہ اُن کی بیوی پیچھے رہ گئی۔ مگر محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام چونکہ حضرت لوطؑ سے بہت
بالا تھا۔ اس لئے آپؐ کی کوئی بیوی اِن معنوں میں پیچھے نہیں
رہی تھی جن معنوں میں کہ حضرت لوطؑ کی بیوی پیچھے رہی تھی۔ کوئی بیوی
اپنی مرضی سے پیچھے نہیں رہی اور کوئی بیوی دائمی طور پر پیچھے نہیں
رہی اور نہ کوئی بیوی کسی عذاب میں مبتلا ہوئی بلکہ حضرت
سودہؓ اور حضرت عائشہؓ دونوں بعد میں مدینہ پہنچ گئیں
حضرت سودہؓ اور آپ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو تو حضرت
زیدؓ لے آئے جنہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے
مدینہ میں تشریف لاتے ہی دو اونٹ اور پانچسو درہم دیکر
مکہ بھجوایا تھا تاکہ وہ آپ کی بیٹیوں اور ازواج مطہرات کو
لے آئیں۔ اور حضرت عائشہؓ اپنے بھائی حضرت عبداللہؓ کے
ساتھ مدینہ منورہ پہنچ گئیں۔ اور اس طرح آپؐ کی سب
بیویاں آپؐ کے انعامات میں حصہ دار بنیں۔ حضرت لوط
علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اور
اُن کو باہر سے آنے والے لوگوں پر ظلم کرنے فساد کرنے اور
جنسی معاملات میں بے راہ روی اختیار کرنے سے منع کیا
تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرتے
انہوں نے حقارت سے حضرت لوط علیہ السلام کے ماننے والوں
کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیا کہ اِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُوْنَ
کہ یہ لوگ بڑے نیک بنے پھرتے ہیں۔ یعنی حقیقتاً تو نیک
نہیں مگر ہمارے افعال پر اعتراض کر کے یہ لوگ اپنی بڑائی
ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یا یہ ایک ایسا گروہ ہے جو تکلف
سے نیکی ظاہر کرتا ہے۔ یعنی نیکی اور تقویٰ کا دعویٰ تو کرتا ہے
لیکن دراصل نیک نہیں ہے۔

فرماتا ہے وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَسَاءَ
مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ۔ ہم نے اُن کے جرائم کی پاداش میں اُن
پر ایک تباہ کن بارش برسائی۔ اور جن کے لئے تباہی اور
بربادی کا فیصلہ ہو چکا ہو اُن پر نازل ہونے والی بارش
بہت ہی ہولناک اور خطرناک نتائج کی حامل ہُوا کرتی ہے
یہ بارش دراصل پتھروں کی تھی جو ایک خطرناک زلزلہ کے نتیجہ
میں ہوئی۔ یعنی زمین کا تختہ اُلٹ گیا۔ اور مٹی سینکڑوں فٹ
اوپر جا کر پھر نیچے گری۔ اور اس طرح گویا مٹی اور پتھروں
کی اُن پر بارش ہوئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جس بارش
کو عذاب کے طور پر نازل کیا گیا تھا وہ ظاہری بارش بھی
تھی جو جنگ بدر کے وقت ہوئی۔ اور ریت اور کنکروں
کی بارش بھی تھی جو اُس وقت آئی جب رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنے کے بعد
کنکروں کی ایک مٹھی اُٹھا کر دشمن کی طرف پھینکی۔ آپ کا
یہ کنکر پھینکنا گویا آسمانی طاقتوں کو ایک اشارہ تھا

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ

تو کہدے ہر تعریف کا اللہ (ہی) مستحق ہے۔ اور اس کے وہ بندے جن کو اُس نے چُن لیا ہو

اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۰﴾

اُن پر ہمیشہ سلامتی نازل ہوتی ہے۔ کیا اللہ (تعالیٰ) بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو وہ (اُس کا) شریک قرار دیتے ہیں۔ ۲۳ع

ادھر آپ نے کنکروں کی مٹھی پھینکی اور اُدھر ایک تیز آندھی مسلمانوں کی پُشت کی طرف سے چل پڑی اور اُس کے ساتھ ریت اور کنکروں کا ایک طوفان اُٹھا جس نے کفّار کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی اُنکے تیر بھی ہوا کی مخالفت کی وجہ سے مسلمانوں تک پہنچنے سے رُک گئے۔ اور میدان کے درمیان میں ہی بے کار اور بے ضرر ہو کر گرنے لگے اور اس طرح کفّار مکّہ پر وہ عذاب آگیا جو قومِ لوطؑ کی مشابہت میں اُن پر آنا ضرور تھا۔ اور جس کے لئے ابوجہل نے بھی یہ دُعا کی تھی کہ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (انفال ع۴) یعنی اے خدا اگر اسلام ایک سچا مذہب ہے اور ہم غلط راستہ پر جا رہے ہیں تو تُو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔ یا ہمیں کوئی اور دردناک عذاب دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کے نتیجہ میں آسمان سے اُن پر پتھر بھی برسائے اور پھر انہیں اس عذاب الیم میں بھی مبتلا کیا کہ اُن کے چیدہ چیدہ افسر اس جنگ میں ہلاک ہو گئے۔ اُن کی عزتیں خاک میں مل گئیں۔ اُن کی وجاہتوں کا خاتمہ ہو گیا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت دنیا پر آفتاب نصف النہار کی طرح ظاہر ہو گئی۔

۲۳ع تفسیر: فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ تو لوگوں سے کہدے کہ ہر قسم کی تعریف کا اللہ تعالیٰ ہی مستحق ہے جس نے ہر زمانہ میں لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے اپنے انبیاء بھیجے۔ کسی زمانہ میں اُس نے موسیٰؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ کسی زمانہ میں داؤدؑ اور سلیمانؑ کو بھیج دیا۔ کسی زمانہ میں حضرت صالحؑ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث کیا۔ کسی زمانہ میں حضرت لوطؑ کو نبوت کے مقام پر کھڑا کر دیا اور پھر خدا نے اپنے ان برگزیدہ بندوں کو کبھی اپنی نصرت اور تائید سے محروم نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ اُن کے لئے سلامتی نازل ہوتی رہی اور ہمیشہ ہی اُس کے برگزیدہ بندوں پر سلامتی نازل ہوتی رہتی ہے۔ اب بتاؤ کیا اللہ اچھا ہے جو اپنے بندوں کو بچاتا اور ترقی دیتا رہتا ہے اور جس نے لوگوں کی راہنمائی کے لئے اپنے کلام اور الہام کا سلسلہ جاری کیا ہوا ہے یا یہ معبودانِ باطلہ اچھے ہیں جن کے ماننے والے ہمیشہ تباہ ہوتے ہیں اور جن کی طرف سے کبھی کوئی رسول اس پیغام کے ساتھ کھڑا نہیں ہوا کہ مجھے ھبل نے دنیا کی ہدایت کے لئے بھجوایا ہے یا لات اور مناۃ نے بھجوایا ہے اور میں اپنے مخالفوں پر غالب رہوں گا۔

سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر ہمیشہ اُسکی طرف سے سلامتی نازل ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے مومنوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ جب بھی کسی نبی کا نام لیں تو اس کے ساتھ علیہ السلام کے الفاظ ضرور کہا کریں۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ

(بتاؤ تو) آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور (کس نے) تمہارے لئے بادل سے

السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ

پانی اتارا ہے - پھر اُس (یعنی پانی) کے ذریعہ سے ہم نے خوبصورت باغ نکالے ہیں -

وہ لوگ جو حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں بعض دفعہ ان دُعائیہ کلمات کے متعلق سوال کر دیا کرتے ہیں کہ انبیاء کیلئے سلامتی کی خاص طور پر کیوں دُعا کی جاتی ہے جبکہ اُن کا خدا تعالیٰ کے سایۂ رحمت میں ہونا ایک قطعی اور یقینی امر ہے - وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ سلامتی تو اُن کو بیشک حاصل ہے کہ وہ وفات پاکر اللہ تعالیٰ کے سایۂ رحمت میں چلے گئے لیکن ایک اور بات ایسی ہے جس کے لحاظ سے اُن کے مرنے کے بعد بھی ہمیشہ سلامتی کی دُعا کرتے رہنا ضروری ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انبیاء دنیا میں ایک بہت بڑی روحانی جائیداد چھوڑ کر جاتے ہیں - دنیوی جائدادیں تو اگر نااہل ہاتھوں میں چلی جائیں تب بھی اُن کی تباہی کا اثر بہت محدود ہوتا ہے، لیکن انبیاء جو جائیداد چھوڑ جاتے ہیں اگر اُس کو گمراہی کا ذریعہ بنا لیا جائے تو صدیوں تک لوگ گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ اُن کے لئے دُعاؤں کے سلسلہ کو ہمیشہ جاری رکھا جائے - انہوں نے تو وہ جائداد اس لئے چھوڑی ہوتی ہے کہ لوگ اُس سے روشنی اور نور حاصل کریں - مگر پیچھے آنے والے روشنی اور نور حاصل کرنے کی بجائے خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں - چنانچہ دیکھ لو کئی قسم کے گناہ ہیں جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ اور حضرت لوطؑ علیہم السلام کی طرف منسوب کر دیئے - لوگ جب اِن واقعات کو پڑھتے ہیں تو کمزور طبع لوگ اُن سے متأثر ہوتے ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ جب انبیاء نے اِس طرح کر لیا تھا تو ہم کیوں نہ کریں - عیسائی یوں تو مُنہ سے دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بالکل معصوم اور بے گناہ تھے مگر تفصیلات میں وہ اُن پر بھی الزام لگانے سے باز نہیں آئے - چنانچہ وہ کہتے ہیں - کہ ایک دفعہ وہ کسی کا گدھا بے پوچھے لے گئے اور اُس پر سواری کرتے پھرے[1] - پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو گالیاں دیتے اور انہیں کتّے اور زناکار وغیرہ کہتے تھے[2] - اسی طرح کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کے گناہ اُٹھا کر صلیب پر لٹک گئے اور اس طرح نعوذ باللہ لعنتی بنے - اور تین دن تک دوزخ میں رہے[3] - پھر کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کے سُوروں کے گلے بغیر اُن کے مالکوں کو کوئی قیمت دینے کے تباہ کر دیا کرتے تھے[4] - اسی طرح ہندوؤں کو لو تو وہ حضرت کرشنؑ اور حضرت رامچندر جی کو اپنا اوتار مانتے ہیں مگر رامچندر جی کا سیتا سے جو سلوک بیان کرتے ہیں وہ اگر ایک طرف رکھ لیا جائے اور دوسری طرف ان کی بزرگی اور نیکی دیکھی جائے تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ایسا فعل کیا ہوگا مگر وہ حضرت رامچندر جی کی طرف بغیر کسی جھجک کے یہ ظلم منسوب کرتے ہیں - پھر حضرت کرشنؑ کے متعلق

---

[1] مرقس باب ۱۱ و متی باب ۲۱ - [2] متی باب ۷ آیت ۶ و متی باب ۲۵ آیت ۲۶ و متی باب ۱۲ آیت ۳۹ -
[3] ۱ - پطرس باب ۳ آیت ۱۸ تا ۲۰ -
[4] متی باب ۸ آیت ۲۸ تا ۳۲ و مرقس باب ۵ -

مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط

تم اُن (باغوں) کے درخت نہیں اُگا سکتے تھے۔ کیا اللہ کے ساتھ اور بھی معبود ہے (جو سب کائنات عالم کا انتظام

بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ط ﴿۶۱﴾

کر رہا ہے) لیکن یہ (کافر) ایسی قوم ہیں جو اُسکے شریک بنا رہے ہیں ۲۴

کہتے ہیں کہ وہ کھمن چُرا چُرا کر کھایا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کے نبی تھے۔ پس انبیاء جہاں ہدایت پھیلانے کا ذریعہ ہوتے ہیں وہاں شیطانی لوگ اُن کو ایک قسم کی گمراہی اور شیطنت پھیلانے کا بھی ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انبیاء پر سلام کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے تاکہ ہم جب بھی اُن انبیاء کا نام لیں ساتھ ہی یہ دُعا بھی کیا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان فتنہ گروں کو تباہ کرے جو اُن کا نام لے کر دنیا میں گمراہی پھیلاتے ہیں تاکہ اُنکی کوششیں اکارت نہ چلی جائیں۔ حدیثوں میں آتا ہے۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب مرض الموت سے بیمار ہوئے۔ تو آپ اپنی آخری گھڑیوں میں بڑے اضطراب کے ساتھ کروٹیں بدلتے اور بار بار فرماتے کہ خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ آخر یہ لازمی بات ہے کہ جب نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا جائیگا تو لوگوں میں توحید نہیں رہے گی۔ اور شرک روز بروز بڑھتا چلا جائیگا۔ پس انبیاء پر سلام اسی حکمت کی وجہ سے آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے انوار اور برکات کے سلسلہ کو وسیع کرے اور وہ فتنہ گر تباہ ہوں جو اُن کی روحانی جائیداد کو غارت کرنے والے ہیں۔

۲۴ حل لغات :- حَدَآئِقَ : حَدِيْقَةٌ کی جمع ہے اور اَلْحَدِيْقَةُ کے معنے ہیں اَلْبُسْتَانُ يَكُوْنُ عَلَيْهِ حَائِطٌ ایسا باغ جس کے گرد دیوار ہو (اقرب)

بَهْجَةٌ : اَلْبَهْجَةُ کے معنے ہیں اَلْحُسْنُ - خوبصورتی - وَيُقَالُ هُوَ حُسْنُ لَوْنِ الشَّيْءِ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بَهْجَةٌ کسی چیز کے رنگ کی خوبصورتی کا نام ہے۔ وَقِيْلَ هُوَ فِي النَّبَاتِ النَّضَارَةُ. وَ فِي الْاِنْسَانِ ضِحْكُ اَسَارِيْرِ الْوَجْهِ اَوْ ظُهُوْرُ الْفَرَحِ اَلْبَتَّةَ - بعض ائمہ لغت کہتے ہیں کہ بَهْجَةٌ کا لفظ اگر نباتات کے متعلق استعمال ہو تو اس کے معنے تازگی اور سرسبزی کے ہوتے ہیں اور جب انسان کے متعلق اس لفظ کا استعمال ہو تو یہ معنے ہونگے کہ اُس کا چہرہ تمتما اٹھا یا یہ کہ اُس سے خوب خوشی ظاہر ہوئی۔ (اقرب)

تفسیر :- فرماتا ہے۔ تم آسمانی اور زمینی نظام پر غور کر کے دیکھو کہ یہ زمین اور آسمان کس نے پیدا کئے ہیں اور پھر کون ہے جو بادلوں سے پانی اتار کر قسم قسم کے باغ اگاتا ہے حالانکہ تم ایک درخت بھی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ پھر سوچو کہ وہ خدا جس نے یہ نظامِ کائنات بنایا وہ بہتر ہے یا وہ معبودانِ باطلہ بہتر ہیں جو ان باغوں اور پانیوں اور آسمان اور زمین سب کے محتاج ہیں۔ تم اس خدا جیسا کوئی اور دکھاؤ تو سہی۔ یقیناً تم نہیں دکھا سکتے۔ مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ لوگ پھر بھی عقل سے کام نہیں لیتے اور وہ خواہ مخواہ خدا تعالیٰ کے ہمسر بناتے چلے جاتے ہیں۔

اس آیت کے پہلے حصہ میں غائب کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔ لیکن دوسرے حصہ میں اَنْبَتْنَا کہکر جمع متکلم

بَهْجَةٌ [2]

حَدَآئِقَ [1]

کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ یہ قرآنی کمالات میں سے ایک بہت بڑا کمال ہے کہ وہ بعض دفعہ ایک چھوٹے سے لفظ کے ذریعے ایک بہت بڑا اشارہ کر دیتا ہے۔ اسجگہ بھی غائب سے متکلّم کی طرف ضمیر بلا وجہ نہیں پھیری گئی۔ بلکہ اس لئے پھیری گئی ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش اور آسمان سے بارش نازل ہونے اور اُس کے ذریعہ زمین سے ہر قسم کی سبزیاں اور باغات پیدا ہونے پر جب انسان غور کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کی قدرت اور اُس کے جلال اور جبروت کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور وہ اُسے غائب نہیں بلکہ حاضر سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ اسی مضمون کی طرف اشارہ کرنے کیلئے اس آیت میں اَنْبَتْنَا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ گویا خدا بندوں کے سامنے کھڑا ہے اور وہ انہیں اپنے احسانات گنوا رہا ہے۔ پس یہ غلطی نہیں بلکہ قرآن کریم کے اعلیٰ درجہ کے کمالات میں سے ایک بڑا کمال ہے۔

پھر اسجگہ اللہ تعالیٰ نے ظاہری پیدائش عالم کو پیش کر کے روحانی پیدائش کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جس طرح مادی دنیا میں زمین و آسمان کی پیدائش اور بادلوں سے بارش نازل ہونے کا سلسلہ جاری ہے اسی طرح روحانی دنیا میں بھی ایسا ہی قانون جاری ہے۔ اور انبیاء کی آمد بھی ایک بارش سے مشابہت رکھتی ہے جس طرح وہ بادل جو ضرورت کے مطابق اور لمبے انتظار کے بعد خشک زمین پر برستا ہے جب لوگ گرمی کی شدت اور حبس کی تکلیف کی وجہ سے بے کل ہو رہے ہوتے ہیں جب انسان اور جانور تازہ اور اچھے پانی کے لئے تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ جب کھیت اپنی روئیدگی کو نکالنے اور سبزہ کو اُبھارنے کے لئے پانی کی چھینٹوں کو ترس رہے ہوتے ہیں اور اُسے دیکھ کر دنیا خوش ہوتی ہے کہ اب اُس کی اُمیدیں بر آئیں گی اور اُس کی فصلیں تر و تازہ ہو جائیں گی۔ اسی طرح روحانی ظلمات کی تکلیف اور ایک لمبے انتظار کے بعد انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں ظہور ہوا کرتا ہے جو اپنے انفاسِ قدسیہ سے پیاسی دُنیا کو سیراب کرتے اور علم و عرفان کے دریا بہا دیتے ہیں جن سے بڑے بڑے روحانی باغ تیار ہوتے ہیں جو آنکھوں کی طراوت اور دلوں کی تسکین کا موجب بنتے ہیں۔ مگر جہاں بارش اللہ تعالیٰ کے فضلوں میں سے ایک بہت بڑا فضل ہے اگر بر وقت بارش نہ ہو تو فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور کنوؤں کے پانی تک خشک ہو جاتے ہیں۔ وہاں اس کے ساتھ کچھ تکالیف بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب لوگوں کو نماز کے لئے مسجد میں آنا پڑتا ہے۔ یا سودا سلف کیلئے بازار جانا پڑتا ہے تو انہیں کیچڑ کی وجہ سے تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے وقت پر مکانوں کی چھتوں پر لپائی نہ کرائی ہو اُن کی چھتیں ٹپک پڑتی ہیں جس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کے پاس جانور باندھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ عام حالات میں تو وہ صحن وغیرہ میں انہیں باندھ دیتے ہیں مگر بارش اور سردی میں انہیں جانور اپنے کمروں میں باندھنے پڑتے ہیں اور وہ وہیں گوبر وغیرہ کرتے ہیں۔ اُن کو بدبو بھی آتی ہے تکلیف بھی ہوتی ہے مگر وہ مجبور ہوتے ہیں۔ تو جہاں بارش اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا فضل ہے وہاں اُس میں کچھ تکلیف کے پہلو بھی ہیں۔ پھر اُس میں اندھیرا بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات تو شدید کڑک ہوتی ہے جس سے بچوں اور کمزور لوگوں کے دل ہل جاتے ہیں اور بعض کمزور بچے ڈر سے مر بھی جاتے ہیں۔ پھر بارش میں بعض اوقات بجلی بھی چمکتی ہے اور کبھی گرتی بھی ہے جس سے جان و مال کا نقصان ہوتا ہے اور یہ سب تکلیف کے مختلف پہلو ہیں۔ مگر بارش کے مقابلہ میں لوگ ان تکالیف کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ سب جانتے ہیں کہ بارش ہو گی تو اُس کے ساتھ کیچڑ بھی ہو گا۔ کیا کوئی ایسا زمیندار بھی ہے جو سمجھتا ہو کہ

بارش ہوگی تو زمین گیلی نہ ہوگی۔ اور کیچڑ نہ ہوگا۔ یا پھر کوئی
ایسا زمیندار ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ بارش ہونے سے سردی
بڑھ جائیگی۔ پھر کوئی نہیں جو یہ نہ جانتا ہو کہ بارش کے
ساتھ کڑک بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات بجلی بھی گرتی ہے
جس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ سب لوگ ان باتوں
کو جانتے ہیں مگر پھر بھی وہ یہی دعائیں کرتے ہیں کہ یا اللہ
بارش ہو۔ وہ کیوں یہ دعائیں کرتے ہیں اس لئے کہ وہ
یہ جانتے ہیں کہ بارش کے ساتھ جو فصل وابستہ ہوتا ہے
اور اس سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ان کے مقابلہ میں
تکلیف بہت کم ہے۔ یہی حال انبیاء کی بعثت کا ہوتا
ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ
السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ یعنی جس طرح
بادلوں میں سے بارش ہوتی ہے تو جہاں اس کے بیشمار فائدے
اور برکتیں ہوتی ہیں وہاں اس میں ظلمات کڑک اور بجلی
بھی ہوتی ہے اور اس سے کچھ تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اور
بعض اوقات نقصان بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیاء کی
بعثت کا حال ہے۔ اس میں برکتیں بھی بہت ہوتی ہیں
مگر کچھ تکلیف بھی ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح بارش کی تکلیف
کے باوجود اس کی ناقدری نہیں کی جاتی۔ اسی طرح انبیاء
کی بعثت کی بھی ناقدری نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ ان
تکالیف کی قیمت اس وقت معلوم ہوگی جب قیامت کے
دن نتیجہ نکلے گا۔ جب فصل پکتی ہے۔ تب زمیندار کو معلوم
ہوتا ہے کہ یہ اندھیرے اور کڑک اور برق کتنی قیمتی تھی
اگر یہ نہ ہوتی تو زمیندار جب اپنے کھیت میں فصل پکنے
پر جاتا۔ تو سوائے تھوڑے سے سوکھے اور جلے ہوئے
دانوں کے اس کے ہاتھ کچھ نہ آسکتا۔ لیکن بارش ہونے
کے بعد جب اس کی فصل پکتی ہے تب اسے معلوم ہوتا ہے
کہ وہ اندھیرا اور وہ کڑک اور وہ بجلی کتنی مفید تھی۔
وہ سمجھتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں اس کے ہاں غلہ پیدا ہوا
کپڑوں اور دوسرے اخراجات مثلاً شادیوں بیاہوں کے لئے
سامان میسر آیا۔ ایک ایک دانہ کے ستر ستر اسّی اسّی اور
سَو سَو دانے ہوئے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے ساتھ
بھی کچھ تکالیف وابستہ ہوتی ہیں مگر جو انسان ان تکالیف
کے باوجود اس نعمت کی قدر کرتا ہے اس کی مثال ویسی
ہی ہوتی ہے جیسے اس زمیندار کی جس کی فصل پر ابھی
بارش برس چکی ہو۔ بیشک اس کے ساتھ اندھیرے بھی
ہوتے ہیں۔ کڑک بھی ہوتی ہے۔ بجلیاں بھی ہوتی ہیں مگر
پھر بھی لوگ اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں اور اس کے
فوائد کے مقابلہ میں ان تکالیف کی کوئی پرواہ نہیں کرتے
اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوجاتا کہ ہر زمیندار
اگر دس دفعہ پھسلے تو پھر بارش ہوگی تو تم دیکھتے کہ کس طرح
زمیندار بیس بیس دفعہ پھسلتے یا اگر خدا تعالیٰ یہ قانون
بنا دیتا کہ ہر بارش کے ساتھ بیس دفعہ کڑک پیدا ہوگی
تو زمیندار کہتے خدایا تیس دفعہ کڑک پیدا ہو مگر بارش
ضرور ہوجائے۔ غرض انبیاء کی بعثت کی بارش کے ساتھ مثال
دے کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ
ان کی بعثت کے ساتھ جو تکالیف وابستہ ہوتی ہیں۔
مومن کو دلیری سے ان کو برداشت کرنا چاہیئے۔ جب
وہ ایک دفعہ دین کو سچا سمجھ کر قبول کرتا ہے تو پھر خواہ
اُسے کتنی تکالیف آئیں خواہ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے
کر دیئے جائیں اُسے ہرگز کمزوری نہیں دکھانی چاہیئے اور
دین کے ساتھ اس طرح چمٹے رہنا چاہیئے جس طرح چیونٹا
جسے پنجابی میں "کاڈھا" کہتے ہیں چمٹ جاتا ہے تو پھر
چھوڑتا نہیں۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے۔
میاں جان محمد صاحب کشمیری قادیان کی مسجد اقصیٰ کے
امام ہوا کرتے تھے۔ ہمارے دادا صاحب نے انہیں مقرر
کیا ہوا تھا۔ وہ ہمارے گھر کا کام کاج بھی کرتے تھے
ایک دن کوئی دوست مچھلی تحفہ کے طور پر لائے۔

ہماری ڈیوڑھی کے آگے ایک تخت پوش بچھا رہتا تھا۔ وہ اُس پر بیٹھ کر مچھلی صاف کرنے لگے اور ہم چار پانچ بچے تماشہ دیکھنے کے لئے پاس بیٹھ گئے۔ میرے ہاتھ میں ایک پیڑہ تھا جو مَیں کھا رہا تھا۔ مجھے کے خیال میں شائد میرا ہاتھ تخت پوش سے لگ گیا اور ایک چیونٹا پیڑے پر چڑھ گیا۔ مَیں جب اُسے کھانے لگا تو اُس چیونٹے نے میرے ہونٹ پر کاٹ لیا۔ مَیں نے اُسے بہتیرا کھینچا اور چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر اُس نے نہ چھوڑا۔ آخر میاں جان محمد صاحب نے اُسے چھُری سے کاٹ دیا۔

یہی حال مومن کا ہونا چاہیئے۔ یا تو وہ دین کو اختیار ہی نہ کرے اور اگر کرے تو پھر اُس کے ساتھ اس طرح چمٹ جائے جس طرح چیونٹا چمٹ جاتا ہے اور پھر چاہے اُسے کاٹ ڈالا جائے وہ دین چھوڑنے کیلئے تیار نہ ہو۔ آخر ایمان کی فصل تو مرنے کے بعد ہی کٹتی ہے۔ اگر وہ اس جد وجہد میں مر بھی جائیگا تو کیا ہوگا۔ صرف اتنا ہی فرق پڑے گا کہ لوگوں کی فصل اگر مئی میں کٹتی ہے تو اُس کی فروری میں کٹ جائیگی اور اُس کے دانے پہلے اُس کے گھر آجائیں گے۔

پھر بارش کے ساتھ انبیاء کی مشابہت میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ جب مادی بادل برستے ہیں تو اُن کے برسنے سے ہر قسم کی روئیدگی ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ بارش ایک ہی ہوتی ہے مگر اُسی بارش سے ایک طرف میٹھے پھل پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف اُسی بارش سے کڑوے پھلوں کو بھی نشوونما حاصل ہوتا ہے۔ بارش کا ایک ہی قطرہ جہاں انگور کو زیادہ شیریں بنا دیتا ہے۔ جہاں آم کو زیادہ شیریں بنا دیتا ہے جہاں اور مختلف میٹھے پھلوں کو زیادہ شیریں بنا دیتا ہے وہاں بارش کا وہی قطرہ گیکر کو اور حنظل کو زیادہ تلخ بنا دیتا ہے کھٹی چیزوں کو زیادہ ترش بنا دیتا ہے۔ وہی بارش کا قطرہ جو انسان کے اندر گوشت پیدا کر دیتا ہے وہی قطرہ گھاس کے اندر روئیدگی پیدا کرتا ہے۔ جنگل میں اُگی ہوئی مختلف قسم کی جھاڑیاں اور جڑی بوٹیاں جن کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں اور پہاڑیوں کی وادیوں میں پیدا ہونیوالی بوٹیاں بھی اسی بارش سے اپنی روئیدگی کو اُبھارنا شروع کر دیتی ہیں۔ غرض بارش کا وہی قطرہ جہاں انسان کے اندر تروتازگی اور نمو پیدا کرتا ہے وہاں وہ جنگل میں اُگنے والی ہزاروں قسم کی جڑی بوٹیوں میں بھی روئیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ یہی حال انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں بھی ہوتا ہے۔ یعنی جب روحانی بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے تو دونوں قسم کی روئیدگی ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ایک طرف سویا ہوا کفر بھی بیدار ہو جاتا ہے اور دوسری طرف ایمان بھی تروتازہ ہو جاتا ہے کفر بھی اس زمانہ میں اپنی شان دکھانا شروع کر دیتا ہے اور مخالف لوگوں کے اندر بھی ایک نئی قسم کی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آخر مکّہ میں وہی تھا اور عرب بھی وہی تھا۔ لیکن آپ کی بعثت سے قبل عرب کے سرداروں کا کوئی نظام معلوم نہیں ہوتا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ہم کفار کو بھی منظم اور مصروفِ عمل پاتے ہیں اور وہ سارے کے سارے اس کام کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں کہ کسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کو پھیلنے سے روکیں اور سارے متحد ہو کر اس دین کو مٹانے کے لئے کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ یہ تنظیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جب آسمان سے بارش آتی ہے تو ہر قسم کی چیزوں میں روئیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور کفر بھی اپنا سر اُٹھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب جھوٹے مدعی کھڑے ہوتے ہیں تو لوگ اُن سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے کیونکہ کری

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا

(بتاؤ تو) کس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا ہے اور اس کے بیچ میں دریا چلائے ہیں۔ اور

وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ

اس کے (فائدہ) کے لئے پہاڑ بنائے ہیں اور دو سمندروں کے درمیان (جن میں سے ایک میٹھا اور ایک کھاری ہوتا ہے) ایک روک

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ ﴿۶۲﴾

بنائی ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔ ۲۵؎

بکری سے کبھی نہیں ڈرتی۔ بکری شیر سے ڈرا کرتی ہے۔ اس لئے جب کوئی جھوٹا مدعی کھڑا ہوتا ہے تو لوگ اُس سے نہیں ڈرتے۔ لیکن جب کبھی فطرتِ انسانی یہ سمجھتی ہے کہ سچا موعود آگیا ہے تو اُس وقت کافر بھی بیدار ہوجاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ سچا خطرہ ہے اس کو دُور کرنے کی کوشش کرنا میرے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ جس قسم کی منظم مخالفت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی ہے یا اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ہوئی ہے ایسی مخالفت کسی جھوٹے مدعی کے زمانہ میں نہیں ہوئی۔ باب کے زمانہ میں بے شک شورش اور فساد پیدا ہوا لیکن یہ فساد بابیوں کے اپنے افعال کے نتیجہ میں تھا۔ پہلے بابیوں نے بعض لوگوں کو قتل کیا اُن قتلوں کے نتیجہ میں حکومت نے انکو مارا۔ لیکن پبلک خاموش رہی اور اُس نے کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں تمام غیر قوموں میں آپ کے مقابلہ کا جوش پیدا ہوگیا اور ہر ایک نے یہ کوشش کی کہ کسی طرح احمدیت کو کچلا جائے۔ یہ چیز دنیا کے پردہ پر اور کسی مدعی کے مقابلہ میں نظر نہیں آتی۔ بہائی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو منسوخ قرار دیتے ہیں لیکن ایک مسلمان کہلانے والا ایک بہائی کی باہوں میں باہیں ڈالتا ہے اور کہتا ہے۔ چھوڑو ان باتوں کو تم بھی سچے اور ہم بھی سچے۔ چلو دونوں مل کر احمدیت کا مقابلہ کریں۔ تو جس طرح بارش کا پانی گرنے سے ہر قسم کی روئیدگی پیدا ہوجاتی ہے اسی طرح روحانی بارش کے وقت کفر بھی بیدار ہوجاتا ہے اور ایمان بھی تروتازہ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں اِدھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد سے ایک مخلص جماعت قائم ہوئی۔ وہ جماعت جس کے اندر تقویٰ اور اخلاص پایا جاتا ہے اور اُس کے ایمان کے اندر ایک بیداری اور بلندی کی اُمنگ پائی جاتی ہے اور اُدھر آپ کے آنے سے کفر میں بھی بیداری اور حرکت پیدا ہوگئی۔ غرض جس طرح بارش کے آنے پر تلخ بوٹیاں جو آپ ہی آپ اُگ آتی ہیں وہ اپنا جوش اور اُبھار دکھاتی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ انبیاء کی جماعتوں سے بھی اُمید رکھتا ہے کہ اِن تلخ بوٹیوں کے مقابل میں اُسی طرح بلکہ اُن سے بھی بڑھ کر اپنا اُبھار دکھائیں اور روحانی حُسن کو ظاہر کرنے کی ایسے رنگ میں کوشش کریں کہ شیطان کا حُسن بالکل ماند پڑ جائے۔

رَوَاسِيَ — ۲۵؎ حل لغات۔ رَوَاسِيَ۔ اَلرَّوَاسِيْ کے معنے ہیں اَلْجِبَالُ الثَّوَابِتُ الرَّوَاسِخُ۔ مضبوط گڑے ہوئے پہاڑ۔ (اقرب)

حَاجِزًا — حَاجِزًا: حَجَزَ سے اسم فاعل ہے۔ اور

حَجَزَهٗ حَجْزًا وَ حِجَازًا کے معنے ہیں مَنَعَهٗ وَکَفَّهٗ وَ دَفَعَهٗ۔ اس کو روکا اور ہٹایا۔ اور اَلْحَاجِزُ کے معنے ہیں اَلْبَرْزَخُ۔ برزخ۔ روک۔ پردہ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ وہ کون ہے۔ جس نے زمین کو رہائش کے قابل بنایا ہے۔ اور اُس کے اندر دریا چلائے ہیں۔ جن کے پانی کو سلامت رکھنے کے لئے اُس نے پہاڑوں کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے جن سے دریاؤں کو مدد ملتی رہتی ہے۔ پھر زمین میں اُس نے سمندر بنائے ہیں اور سمندروں کے نمکین پانی اور دریاؤں کے میٹھے پانی کے درمیان ایک روک بنادی ہے یعنی سمندر کا نمکین پانی ڈھلوان کی طرف ہے۔ وہ دریاؤں کے میٹھے پانی کو خراب نہیں کرسکتا۔ اور دریاؤں کا میٹھا پانی سمندر کے نمکین پانی کے مقابلہ میں اتنا تھوڑا ہے کہ باوجود سمندروں میں گرنے کے پھر بھی وہ سمندر کے پانی کے مزے کو بدل نہیں سکتا۔ اور اس طرح میٹھے اور نمکین پانی میں ایک دائمی روک قائم رہتی ہے۔ کیا ایسے مدبّر خدا کا کوئی اَور شریک پیش کیا جاسکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ لیکن مشرک لوگ اکثر جاہل ہوتے ہیں۔ وہ اتنے بڑے نشانات کو دیکھنے کے باوجود کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے اور اندھوں کی طرح اِدھر اُدھر ہاتھ مارتے پھرتے ہیں۔

کائناتِ عالم کا یہ نظارہ پیش کرکے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جب تمہارے مادی فوائد کے لئے اِتنے بڑے سامان پیدا کئے گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ تمہاری رُوحانی ضرورتوں کو کس طرح نظر انداز کرسکتا تھا۔ تم جانتے ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ زمین میں ایسے نشیب پیدا نہ کرتا جن میں دریاؤں کا پانی سکڑ کر چلتا تو سب زمین پر پانی ہی پانی ہوتا۔ اور یہ دُنیا رہنے کے قابل نہ ہوتی۔ اِسی طرح اگر پہاڑ نہ ہوتے جو سارا سال برف کے ڈھیر جمع رکھتے ہیں اور جن کی مدد سے تمام دریا ملک کو سال بھر پانی مہیّا کرتے رہتے ہیں تو تمہاری باؤلیاں اور حوض تمہیں کب تک زندہ رکھ سکتے تھے یہی کیفیت روحانی عالم میں بھی پائی جاتی ہے۔ انسانی تدابیر جو باؤلیوں اور حوضوں کی طرح ہوتی ہیں صرف عارضی طور پر ایک محدود دائرہ میں بنی نوعِ انسان کو کام دیتی ہیں مستقل ہدایت جو آسمانی پانی سے مشابہت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی آتی ہے اور وہی لوگوں کی روحانی تشنگی کو فرو کرنے کا سامان مہیا کرتی ہے۔ پھر جس طرح پہاڑ قسم قسم کی ضروری ادویہ اور پھل اور پھول اور نہ ختم ہونے والے لکڑی کے ذخائر جمع رکھتے ہیں اسی طرح روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بھی ایک ایسے کلام کی ضرورت تھی جو دائمی طور پر دُنیا کے لئے ہدایت اور رحمت کے ذخائر اپنے اندر جمع رکھتا۔ پھر جس طرح نمکین اور میٹھے پانی میں اللہ تعالیٰ نے ایک روک بنادی ہے اِسی طرح کفر اور ایمان میں بھی اُس نے دلائل کی ایک دیوار حائل کردی ہے جس کی وجہ سے ایمان کا پانی اپنی حلاوت کی وجہ سے اور کفر کا پانی اپنی تلخی اور مرارت کی وجہ سے فوراً پہچانا جاتا ہے۔ ایسے محسن خدا کا دوسروں کو شریک قرار دینا اور اس کے دروازہ کو چھوڑ کر بتوں کے آگے اپنا سر جھکانا ایسے ہی لوگوں کا شیوہ ہوسکتا ہے جو عقل اور فہم سے کلّیتہً عاری ہوں۔

أَمَّنْ يُّجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ

(نیز بتاؤ تو) کون کسی بے کس کی دُعا کو سُنتا ہے جب وہ اُس (یعنی خدا) سے دُعا کرتا ہے۔ اور (اُسکی) تکلیف

السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ

کو دُور کر دیتا اور وہ تم (دُعا کرنے والے انسانوں) کو (ایک دن) ساری زمین کا وارث بنا دیگا۔ کیا (اس قادرِ مطلق)

اللّٰهِ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۳﴾

اللہ کے سوا کوئی معبود ہے؟ تم بالکل نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ ۲۶

۲۶ **تفسیر:**۔ فرماتا ہے۔ تم یہ بھی تو دیکھو کہ مصیبت زدہ انسان کی دُعاؤں کو کون قبول کرتا ہے اور کون اُس کی مصیبتوں کو دُور کرتا ہے۔ اور کون تم کو زمین کا وارث بناتا ہے۔ کیا ایسی صفاتِ حسنہ رکھنے والے خدا کا کوئی ہمسر نہیں نظر آتا ہے؟ مگر افسوس کہ تم لوگ قطعاً نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اِس آیت میں جو "مُضْطَرّ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اِس سے ایسا شخص مراد ہے جو اپنے چاروں طرف مشکلات ہی مشکلات دیکھتا ہے اور اُسے اپنی کامیابی کا کوئی مادی رستہ نظر نہیں آتا۔ صرف ایک جہت اللہ تعالیٰ والی باقی رہ جاتی ہے اور اُسی پر اُس کی نظر پڑتی ہے۔ گویا مُضْطَرّ کے صرف یہی معنے نہیں کہ اُس کے دل میں گھبراہٹ ہو۔ کیونکہ گھبراہٹ میں بعض دفعہ ایک شخص بے تحاشہ کسی طرف چل پڑتا ہے بغیر اس یقین کے کہ جس طرف وہ جا رہا ہے وہاں اُسے امن بھی حاصل ہوگا یا نہیں۔ بلکہ بعض لوگ گھبراہٹ میں ایسی طرف چلے جاتے ہیں جہاں خود خطرہ موجود ہوتا ہے اور وہ اُس سے نہیں بچ سکتے۔ پس محض اضطراب کا دل میں پیدا ہونا اضطرار پر دلالت نہیں کرتا۔ اضطرار پر وہ حالت دلالت کیا کرتی ہے جب چاروں طرف کوئی پناہ کی جگہ انسان کو نظر نہ آتی ہو اور ایک طرف نظر آتی ہو۔ گویا اضطرار کی نہ صرف یہ علامت ہے کہ چاروں طرف آگ نظر آتی ہو بلکہ یہ بھی علامت ہے کہ ایک طرف امن نظر آتا ہو اور انسان کہہ سکتا ہو کہ وہاں آگ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی دُعا خدا تعالیٰ کے حضور قبول کی جاتی ہے جس کے کرتے وقت بندہ اس رنگ میں اس کے سامنے حاضر ہوتا ہے کہ اُسے یقینِ کامل ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے میرے لئے اور کوئی پناہ کی جگہ نہیں۔ یہی وہ مضطر کی حالت ہے جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّآ اِلَيْكَ یعنی اے خدا تیرے عذاب اور تیری طرف سے آنے والے ابتلاؤں سے کوئی پناہ کی جگہ نہیں سوائے اس کے کہ میں سب طرف سے مایوس ہو کر اور آنکھیں بند کرکے تیری طرف آجاؤں۔ تو لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا والی جو حالت ہے یہی اضطرار کی کیفیت ہے اور جب خدا نے اس آیت میں یہ کہا کہ اَمَّنْ يُّجِيبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ ایسے شخص کی دُعا جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ملجاء و ماویٰ نہیں سمجھتا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا منجاء قرار نہیں دیتا ضرور سُنی جاتی ہے اور یہ شرط بلاوجہ نہیں رکھی گئی ہے

کہ گو حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی ہر مضطر کا علاج ہے مگر بعض دفعہ اُس کے دیئے ہوئے انعام کے ماتحت کوئی بندہ بھی دوسر کے اضطرار کو بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ چنانچہ بعض دفعہ ایک آدمی سخت غریب ہوتا ہے۔ اُس کے کپڑے پھٹ جاتے ہیں اور اُسے نظر نہیں آتا کہ وہ نئے کپڑے کہاں سے بنوائے کہ اچانک ایک امیر آدمی جو بعض دفعہ ہندو ہوتا ہے بعض دفعہ سکھ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ پارسی ہوتا ہے بعض دفعہ جینی یا بت پرست ہوتا ہے اُسے دیکھتا ہے اور کہتا ہے تمہارے کپڑے پھٹ گئے ہیں آؤ میں تمہیں نیا جوڑا بنوا دوں۔ اب گو ہمارے یقین کے مطابق خدا تعالیٰ نے ہی اس امیر آدمی کے دل میں تحریک پیدا کی کہ وہ اُسے کپڑے بنوا دے مگر جو کامل الایمان نہیں ہوتا وہ سمجھتا ہے کہ میری اضطرار کی حالت میں فلاں آدمی میرے کام آیا ہے مگر وہی آدمی جس نے اُسے کپڑوں کا جوڑا بنا کر دیا تھا جب یہ ایسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کے لئے کھانا اور پینا حرام ہو جاتا ہے۔ پانی تک اُسے ہضم نہیں ہوتا۔ تمام جسم کی حالت خراب ہو جاتی ہے اور چل پھر بھی نہیں سکتا تو ایسی حالت میں وہ امیر آدمی اُس کی مدد نہیں کر سکتا بلکہ اگر کوئی اچھا لائق اور رحمدل طبیب ہوتا ہے اور وہ اُسے اس حالت میں دیکھتا ہے تو کہتا ہے تمہیں علاج پر روپیہ خرچ کرنے کی توفیق نہیں تو میں تمہیں مفت دوائی دینے کے لئے تیار ہوں تم میرے پاس رہو اور اپنے مرض کا علاج کرو۔ اب ایسی اضطرار کی حالت میں امیر اس کے کام نہیں آیا بلکہ طبیب اس کے کام آیا۔ جب وہ کپڑوں کے لئے مضطر تھا تو امیر آدمی اُس کے کام آگیا مگر جب وہ علاج کے لئے مضطر ہوا تو ایک طبیب اُس کے کام آگیا۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اُس پر کوئی مقدمہ بن جاتا ہے۔ وہ بے گناہ ہوتا ہے اُس کا دشمن زبردست ہوتا ہے اور وہ کسی وجہ سے ناراض ہو کر اُسے کسی مقدمہ میں ماخوذ کرا کے عدالت تک پہنچا دیتا ہے۔ اب اُسے نہ وکیل کرنے کی توفیق ہے اور نہ اُس میں خود مقدمہ لڑنے کی قابلیت ہے اور وہ حیران ہوتا ہے کہ کیا کرے۔ آخر کوئی رحمدل وکیل اُسے مل جاتا ہے اور وہ کہتا ہے میں بغیر فیس کے تمہاری وکالت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اب ایسے موقعہ پر نہ امیر اُس کے کام آسکا۔ نہ طبیب اُس کی مشکل کو دُور کر سکا۔ صرف وکیل اُس کے کام آیا۔ اِسی طرح ایک اور وقت میں یہ مضطر ہوتا ہے۔ بوجھ اٹھائے جا رہا ہوتا ہے کہ تھک کر چُور ہو جاتا ہے اور بوجھ اُس سے گر جاتا ہے۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اُس بوجھ کو پھر اُٹھا سکے۔ اب ایسے وقت میں نہ امیر اس کے کام آسکتا ہے۔ نہ طبیب اُس کے کام آسکتا ہے۔ نہ وکیل اُس کے کام آسکتا ہے۔ البتہ کوئی مضبوط زمیندار چلتے ہوئے اُسے دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تُو یہاں کیوں بیٹھا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے بوجھ مجھ سے اُٹھایا نہیں جاتا۔ اس پر وہ زمیندار اُس کا بوجھ اُٹھا لیتا ہے۔ اب یہ مضطر تو تھا۔ مگر اس حالت میں نہ امیر اس کے کام آسکا۔ نہ طبیب اُس کے کام آسکا۔ نہ وکیل اُس کے کام آسکا۔ بلکہ اُسکا ایک زمیندار بھائی اُس کے کام آگیا۔ تو ایک ہی انسان کے مختلف اضطراروں میں مختلف لوگ اُس کے کام آسکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ۔ مطلق مضطر جس کے لئے کوئی شرط نہیں کہ وہ کس قسم کا مضطر ہو۔ خواہ وہ بھوکا ہو۔ ننگا ہو۔ پیاسا ہو بیمار ہو۔ بوجھ اُٹھائے جا رہا ہو۔ کسی قسم کا اضطرار ہو اُس کی ساری ضرورتوں کو پورا کرنے والی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے پھٹے پُرانے کپڑے ہوں۔ تو کوئی امیر اس کے کام آجائے۔ مگر طبیب اُس کے کام نہیں آسکتا۔ کوئی بیمار ہو تو طبیب اُس کے

کام آجائے مگر وکیل اُس کے کام نہیں آسکتا۔ ہوسکتا ہے
کہ کوئی بے گناہ کسی مقدمہ میں مبتلا ہو تو وکیل اُس کے کام
آجائے۔ مگر بوجھ اُٹھانے کے وقت وکیل اُس کے کام نہیں
آسکتا۔ ہوسکتا ہے بوجھ اُٹھانے کے وقت ایک زمیندار
اُس کے کام آجائے لیکن امیر طبیب اور وکیل اُس کے کام
نہیں آسکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ یہ سارے کام کرسکتا ہے۔
باقی انسان جس قدر ہیں وہ تو کسی کسی ضرورت میں کام آ
سکتے ہیں۔ کوئی ایک قسم کے مضطر کے کام آسکتا ہے
کوئی دوسرے قسم کے مضطر کے کام آسکتا ہے۔ مگر ہر قسم
کے مضطرین کی ضرورتیں پورا کرنے والی خدا کی ہی ذات
ہوتی ہے اور انسان کے اضطرار کی ہزاروں حالتیں ہوتی
ہیں۔ بھلا ان حالتوں میں کوئی بندہ کسی کے کب کام آسکتا
ہے۔ ان حالتوں میں تو کوئی بادشاہ بھی کسی کے کام نہیں
آسکتا۔ فرض کرو ایک شخص سخت بیمار ہے۔ اب بادشاہ
کا خزانہ اُس کے کام نہیں آسکتا۔ بادشاہ کی فوجیں اُس
کے کام نہیں آسکتیں۔ بادشاہ کا قرب اُس کے کام نہیں
آسکتا۔ اُس کے کام تو اللہ تعالیٰ ہی آسکتا ہے۔ جو
ہر قسم کی بیماریوں کو دُور کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یا
ایک جنگل میں گذرنے والا شخص جس پر بھیڑیا یا شیر اچانک
جھپٹ کر حملہ کر دیتا ہے۔ وہ بادشاہ کا چاہے کتنا
ہی مُنہ چڑھا ہو یا بادشاہ کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو بادشاہ
اُس کے کیا کام آسکتا ہے یا طبیب جو اُس کا علاج
کرتا تھا وہ اُس کے کیا کام آسکتا ہے یا امیر جو نئے
کپڑے سلادیتا تھا وہ اس کے کیا کام آسکتا ہے یا
وکیل جس نے رحم کرکے اس کا مقدمہ لے لیا تھا اُس
کے کس کام آسکتا ہے۔ جنگل میں وہ تن تنہا جارہا ہوتا
ہے کہ شیر چیتا یا بھیڑیا اُس کے سامنے آجاتا ہے
ایسی حالت میں وہاں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے جو کام
آتی ہے۔ کوئی انسان کام نہیں آسکتا۔ تو جب تک
انسان کے اندر یہ یقین پیدا نہ ہو کہ ہر قسم کے اضطرار
کی حالت میں اللہ تعالیٰ ہی کام آتا ہے اُس وقت تک
وہ مضطر نہیں کہلا سکتا۔ مگر بہرحال جب وہ مضطر ہونے
کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو خدا اُس کے پاس
دوڑتے ہوئے آجاتا ہے اور اُس کی ہر تکلیف اور مصیبت
کو دُور کر دیتا ہے۔ دُنیا میں تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ لوگ
اگر دوسروں کے خلاف فریاد کرنا بھی چاہیں تو نہیں کرسکتے
افسر اُن سے کہتے ہیں کہ اگر تم نے ہمارے خلاف شکایت
کی تو ہم تمہاری زبان گُدّی سے کھینچ لیں گے۔ وہ ڈرتا ہے
کہ اگر میں نے فریاد کی تو بعد میں وہی افسر مجھے اور رنگ
میں مصیبتوں میں مبتلا کر دیں گے۔ مگر یہاں یہ حالت ہوتی
ہے کہ رات کی تاریکی سایہ ڈالے ہوئے ہوتی ہے اور
مصیبت زدہ بندہ اپنے لحاف میں پڑا آہیں بھر رہا
ہوتا ہے اور دنیا کا کوئی فرد نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا
ہے یا کیا کہہ رہا ہے۔ کوئی افسر اُسے دھمکا نہیں
سکتا۔ کوئی افسر اُسے فریاد کرنے سے روک نہیں سکتا۔
وہ لحاف میں لیٹے لیٹے خدا تعالیٰ کے دربار میں اپنی آواز
بلند کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا! فلاں نے مجھ پر
ظلم کیا ہے تو میری طرف سے آپ اس کا بدلہ لے۔
ظالم نہیں جانتا کہ اس کے خلاف بادشاہ تک شکایت
پہنچ چکی ہے۔ وہ نہ سُنتا ہے نہ دیکھتا ہے نہ اُسکے دل میں
کوئی خیال گذرتا ہے۔ مگر مظلوم کی فریاد خدا تعالیٰ کے عرش
کو ہلا دیتی ہے۔ پس فرماتا ہے اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ
اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ۔ جب انسان خدا تعالیٰ
کے حضور مضطر ہوکر فریاد کرتا ہے جب کوئی اُس کے
پاس نہیں ہوتا تو اُس وقت کون اُس کی مدد کے لئے آتا
ہے۔ دُنیا غافل ہوتی ہے مگر خدا اپنے بندے کی مدد سے
غافل نہیں ہوتا۔ وہ خود آتا ہے اور کہتا ہے اے میرے
بندے۔ میں تیری مدد کے لئے آگیا ہوں۔ اور پھر وہ

اُس سے ایسی محبت اور پیار کا سلوک کرتا ہے کہ اُسکا ہر دُکھ دُور ہو جاتا ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ وہ صرف یہیں تک اپنے انعامات کو محدود نہیں رکھتا کہ مضطر کی دُعا کو قبول کرکے اُسکی تکلیف کو دُور کر دیتا ہے بلکہ یَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ۔ وہ بڑے بڑے سرکشوں اور ظالموں کو تباہ کرکے مظلوم اور کمزور نظر آنے والے لوگوں کو اُن کا خلیفہ اور جانشین بنا دیتا ہے۔ گویا انفرادی رنگ میں بھی وہ پریشان حال لوگوں کی تکالیف کو دُور کرتا ہے اور قومی رنگ میں بھی مظلوم اور اسیر اقوام کو بامِ رفعت تک پہنچاتا ہے اور بڑے بڑے مغرور اور خودسر اور ظالم اور عیاش حکمران اُن کی آہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اِسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (یونس ع ۲) یعنی ہم یقینی طور پر تم سے پہلے بھی قوموں کے بعد قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ جبکہ انہوں نے باوجود اِس کے کہ اُن کے پاس اُنکے رسول کھلے کھلے نشانات لے کر آئے تھے ظلم سے کام لیا اور وہ ایمان نہ لائے اور ہم مجرموں سے اِسی طرح انتقام لیا کرتے ہیں۔ اِس کے بعد ہم نے تمہیں اُن کا جانشین بنا دیا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم دنیا میں کیسے عمل کرتے ہو۔ اور مظلومیت کی حالت میں جو تمہارے اندر نیکی اور تقویٰ پایا جاتا تھا آیا اپنی طاقت کے زمانہ میں بھی تم اُس کو قائم رکھتے ہو یا نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ مضطر کی دُعا اُسے اللہ تعالیٰ کے انعامات کا تو مستحق بنا دیتی ہے مگر انعامات کو قائم رکھنے اور اُس کے تسلسل کو لمبا کرنے کیلئے پھر اور جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی قوم اِس میں غفلت سے کام لیتی ہے تو وہ اِس انعام کو کھو بیٹھتی ہے۔

زیرِ تفسیر آیت میں اللہ تعالیٰ نے فردی اور قومی دونوں قسم کے انعامات کا ذکر فرمایا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا انفرادی رنگ میں بھی یہ سلوک ہے کہ وہ مظلوم کی دُعا کو قبول کرکے اُس کی تکلیف کو دُور کر دیتا ہے۔ اور قومی رنگ میں بھی اُس کا یہ قانون ہے کہ وہ ظالم قوم کو مٹا کر مظلوموں کو اُن کا جانشین بنا دیا کرتا ہے اور تاریخ میں اِس کی ہزاروں مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اِنہیں واقعات کو اپنی ہستی کے ثبوت میں پیش کرتے ہوئے بنی نوع انسان کو توجہ دلاتا ہے کہ کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ اِس کی تہ میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہی کام کر رہا ہے۔ مگر افسوس کہ تم پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ کے آستانہ کو ترک کرکے بتوں کے آگے اپنے سر جھکاتے پھرتے ہو۔

اِس آیت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی ذات کا یقین دلانے اور اپنے وجود کا علم دینے اور انہیں اپنی طرف کھینچنے کے لئے دُعا کا دروازہ کھولا ہے جو ہر مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والے کیلئے یکساں طور پر کھلا ہے یعنی خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا انسان ہو اگر وہ مضطر ہو کر اللہ تعالیٰ کو پکارے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اُسکی دعاؤں کو سُنیگا اور اسکے لئے رستہ کھول دیگا جس سے اُس کی مشکلات دُور ہو جائیں گی اور اُسے اطمینان قلب حاصل ہو جائیگا۔

مجھے یاد ہے قادیان میں ایک دفعہ ایک ہندو میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے میرے آقا نے آپ کے پاس بھجوایا ہے اور دریافت کیا ہے کہ کیا خُدا ملنے کا بھی کوئی طریق ہے؟ پہلے تو اُس نے یہ نہ بتایا کہ کون اُس کا آقا ہے اور وہ

کہاں رہتا ہے اور اُس نے بات کو چھپانا چاہا۔ مگر جب مَیں نے جرح کی تو کہنے لگا وہ بڑے ٹھیکیدار ہیں۔ اُن کے پاس عمارتوں اور نہروں کا ٹھیکہ ہوتا ہے اور ہندوستان میں اُس کا ایک بڑا بھاری کارخانہ بھی ہے۔ آخر بہت سی باتوں کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ سردار بلدیو سنگھ صاحب جو ہندوستان کے ڈیفنس منسٹر رہے ہیں اُن کے والد نے اُسے بھجوایا تھا۔ ٹاٹا نگر کے پاس اُن کا بڑا بھاری کارخانہ ہے۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ وہ تو سکھ ہیں اور تم ہندو ہو تمہارا اُن کے ساتھ کیسے تعلق ہُوا۔ اِسپر اُس نے کہا کہ مَیں اور وہ بچپن میں اکٹھے پڑھتے رہے ہیں اور اُن کے ساتھ میری بڑی دوستی ہے۔ اب انہوں نے اُس دوستی کی وجہ سے ہی ایک دفتر کا مجھے انچارج بنایا ہُوا ہے اور مذہبی خیالات کا تبادلہ مجھ سے کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم مرزا صاحب سے جاکر پوچھو کہ کیا نُور ملنے کی بھی کوئی تدبیر ہے۔ ہم مسلمان پیروں کے پاس بھی گئے ہیں۔ ہندوؤں کے پاس بھی گئے ہیں۔ سکھوں کے پاس بھی گئے ہیں۔ مگر ہمیں کہیں نور نہیں ملا۔ مَیں نے کہا۔ یہ ہماری تو اصطلاح نہیں سکھوں کا ایک محاورہ ہے جو اُن میں رائج ہے۔ مگر بہرحال ہم جس چیز کو ہدایت کہتے ہیں وہ اُس کا نام نور رکھتے ہیں۔ اور ہدایت ملنے کا راستہ میں بتانے کیلئے تیار ہوں۔ مگر چونکہ اُس نے شروع میں ہی کہہ دیا کہ وہ بڑے مالدار ہیں۔ اور کروڑ پتی ہیں۔ اِس لئے مَیں نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ گو مَیں عیسائی نہیں مگر حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت اور بزرگی کا قائل ہوں اور آپ فرماتے ہیں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں سے گذر جانا آسان ہے لیکن دولت مند کا خدا تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے[1]۔ اس لئے گو مَیں تمہیں نور حاصل کرنے کا راستہ بتا دونگا۔ مگر مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ نُور کو قبول نہیں کریں گے۔ کہنے لگا۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ نور مل بھی جائے اور پھر بھی انسان اس کو چھوڑ دے۔ مَیں نے کہا۔ حضرت مسیحؑ نے ایسا ہی کہا ہے۔ اِس لئے مَیں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے نورُ دیکھنے کے باوجود اُسے قبول کرنے کی کوشش نہیں کرنی۔ اُس نے کہا۔ آپ ہمیں نور حاصل کرنے کا راستہ بتائیں۔ وہ اُسے ضرور قبول کرینگے۔ اِس پر مَیں نے اپنے پرائیویٹ سکرٹری کو بلایا۔ اور اُسے کہا کہ چونکہ یہ عربی نہیں جانتے اس لئے انہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کا پنجابی میں ترجمہ لکھ کر دے دو۔ چنانچہ انہیں اس کا پنجابی ترجمہ لکھ کر دے دیا گیا اور مَیں نے کہا روزانہ سوتے وقت آپ لوگ یہ دُعا پڑھا کریں مگر جسوقت یہ دُعا کریں اُسوقت اپنے دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کریں کہ اَے خدا تو ہمیں کہیں بھی ہدایت دکھائے ہم اُسے قبول کریں گے۔ اگر اُس دُعا کے کرتے وقت آپ نے دل میں یہ فیصلہ نہ کیا کہ خدا تعالیٰ جو بھی ہدایت دیگا ہم اُسے قبول کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو نور نہیں دکھائیگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مداری نہیں وہ فضول کھیلیں نہیں دکھایا کرتا۔ ہاں اگر آپ کے دل میں کمزوری کی وجہ سے بعد میں آپ سے کچھ غلطی ہو جائے تو یہ اور بات ہے۔ چور چوری سے توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُسے قبول کر لیتا ہے۔ حالانکہ دوسرے دن وہ توبہ توڑ کر پھر چوری کرنے لگ جاتا ہے۔ پس اگر آپ کے نفس میں کوئی کمزوری ہوئی تو اللہ تعالیٰ اُس کی پرواہ نہیں کریگا وہ صرف یہ دیکھے گا کہ اس وقت آپ کی نیّت یہ ہے کہ اُس کی ہدایت کو قبول کریں گے۔ اس پر وہ چلا گیا پندرہ بیس دن کے بعد اُس کی چِٹھی آئی کہ آپکی بات

[1] متی باب ۱۹ آیت ۲۴ -

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ

(بتاؤ تو) خشکیوں اور سمندروں کی مصیبتوں میں کون تم کو نجات کی راہ دکھاتا ہے۔ اور کون اپنی رحمت

يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ

(یعنی بارش) سے پہلے خوشخبری کے طور پر ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ کیا اللہ کے سوا

مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

کوئی اور معبود ہے؟ اللہ تمہاری شرک کی باتوں سے بہت بلند ہے۔ ۲۷ھ

سچی ہوگئی۔ خدا تعالیٰ کا نور میرے آقا کو نظر آگیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی آپ کی یہ دوسری بات بھی سچی ہوگئی کہ اُن سے مانا نہیں جائیگا۔ اب نور تو نظر آگیا ہے مگر اُنہیں اُس کو قبول کرنے کی ہمت نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اُسے اسلام کی صداقت کے متعلق کوئی اشارہ کر دیا ہوگا۔ مگر پھر اُس نے سوچا ہوگا کہ اگر مَیں نے اسلام قبول کر لیا تو میرے بیٹے کی وزارت بھی جائیگی اور میرا کارخانہ بھی تباہ ہو جائیگا اس لئے قبول کرنے کا کیا فائدہ۔

غرض اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے دُعاؤں کا راستہ کھلا رکھا ہُوا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سچّے دل سے توجہ کرنیوالا خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اگر وہ مضطر ہو جائے تو خدا تعالیٰ اُس کی دُعا کو یقیناً سُنتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ اِس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور وہ سیدھا راستہ اختیار کرنے کی بجائے غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔

۲۷ھ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ بتاؤ تو سہی کہ خشکیوں اور سمندروں کے اندھیروں میں تمہیں کون رستہ دکھاتا ہے۔ اسجگہ برّ سے مراد ایسی قومیں ہیں جن میں الہام الٰہی نہیں پایا جاتا۔ اور بحر سے مراد ایسی قومیں ہیں جن میں الہام الٰہی تو پایا جاتا ہے لیکن وہ انسانی دخل اندازیوں کی وجہ سے سمندر کے پانی کی طرح شور ہو گیا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ قرآن کریم میں اِن معنوں کی وضاحت موجود ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (روم ع ۵) یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت اِس لئے پیش آئی تھی کہ وہ قومیں بھی بگڑ گئی تھیں جن میں الہامی پانی کا وجود نہیں ہے اور وہ اپنی عقل سے اپنے لئے قانون بناتی ہیں۔ اور وہ قومیں بھی بگڑ گئی تھیں جن میں الہامی پانی تو ہے لیکن سمندر کے پانی کی طرح شور ہو کر انسان کے استعمال کے قابل نہیں رہا۔

اِسی طرح بتاؤ تو سہی کہ بادلوں سے پہلے بھیجی ہوئی ہوائیں کون چلاتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود ہے جو یہ ہوائیں چلاتا ہے۔ یقیناً وہ مشرکوں کے شرکیہ خیالات سے بہت بالا ہے۔

جہاں تک ظاہری ہواؤں کا تعلق ہے بیشک اُن کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ایک ثبوت ہے لیکن اسجگہ یہ روحانی ہواؤں کا ذکر ہے اور رحمت سے مراد بعثتِ انبیاء ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بعثتِ انبیاء سے پہلے اُنکی قبولیت

کے لئے لوگوں کے دلوں میں جوش پیدا کر دیتا ہے ۔ اور وہ یہ
محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ اب کوئی نبی ہی آئے
تو وہ قوم کی اصلاح کر سکتا ہے ورنہ اس کے سوا قوم
کی اصلاح کا اور کوئی ذریعہ نہیں اور یہ اس بات کا ثبوت
ہوتا ہے کہ آنے والا خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے ۔ اور
چونکہ بُتوں کی طرف سے ایسے کوئی آدمی نہیں آتے اسلئے
آنے والوں کے ذریعہ شرک کی تردید اور توحید کا قیام ہو
جاتا ہے اور اس طرح خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اُس کے
مشرکانہ خیالات سے بہت بالا ہونے کا ثبوت لوگوں کو
نظر آ جاتا ہے ۔

اِس زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود
علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آنے سے پہلے خدا تعالیٰ نے ایسی رَو
چلا دی تھی کہ تمام کے تمام لوگ خواہ وہ کسی مذہب سے
تعلق رکھنے والے ہوں یہ تسلیم کرنے لگ گئے تھے کہ یہ
زمانہ مہدی اور مسیح کا محتاج ہے ۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی صاحب
نے ایک دفعہ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی تو اسکے بعد
انہوں نے اپنے سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ

" ممالک اسلامیہ کے سفر میں جتنے مشائخ
اور علماء سے ملاقات ہوئی مَیں نے اُن کو
امام مہدی کا بڑی بے تابی سے منتظر پایا[۱]"

اِسی طرح یورپ کا ایک مفکر جس کا نام مارس اندس
تھا ۔ وہ بھی ایک دفعہ اسلامی ممالک کی سیاحت کے
لئے گیا ۔ تو اُس نے بعد میں اپنے تأثرات کا اظہار کرتے
ہوئے لکھا کہ

" دمشق بیروت بغداد مکہ طہران قاہرہ
اور اُن کے ساتھ لنڈن اور واشنگٹن بھی
ایک پیغمبر کے انتظار میں ہیں جو سماجی مقصد
و اصلاح کا جھنڈا لے کر کھڑا ہو[۲] ۔"

یورپ کا ایک پروفیسر جس کا نام میکنزی ہے
اُس نے ایک کتاب " انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی " میں
اِس امر پر بحث کرتے ہوئے کہ کامل انسانوں کے بغیر
سوسائٹی معراج کمال تک نہیں پہنچ سکتی لکھا کہ

" ہمیں بھی ترقی کے لئے ایک مسیح کی
ضرورت ہے[۳] "

اِسی طرح نواب صدیق حسن خان صاحب نے بڑی
بے تابی کے ساتھ لکھا کہ

" حساب کی رُو سے مہدی کا ظہور تیرھویں
صدی کے شروع میں ہونا چاہیئے تھا ۔ مگر
یہ صدی پوری گذر گئی اور مہدی نہ آئے ۔ اب
چودھویں صدی ہمارے سر پر آئی ہے ۔ شائد
اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے اور چار یا چھ
برس کے اندر اندر مہدی ظاہر ہو جائیں[۴] ۔"

علاّمہ اقبال نے بھی اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے
ہوئے لکھا کہ

یہ دَور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

پھر اَور لوگ تو الگ رہے مولانا مودودی صاحب
کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ

" اکثر لوگ اقامتِ دین کی تحریک کرنے
کے لئے کسی ایسے مردِ کامل کو ڈھونڈتے
ہیں جو اُن میں سے ایک ایک شخص کے تصوّرِ
کمال کا مجسمہ ہو اور جس کے سارے پہلو

۱؎ اہل حدیث ۲۶ر جنوری ۱۹۱۲ء

۲؎ بحوالہ رسالہ " نگار " جنوری و فروری ۱۹۵۱ء

۳؎ بحوالہ مکاتیب اقبال صفحہ ۲۶۲ ، ۲۶۳ ، ۲۶۴

۴؎ " اقتراب الساعۃ " صفحہ ۲۱

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ

(بتاؤ تو کہ) وہ جو پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور پھر (پیدائش کے) سلسلہ کو جاری کرتا ہے - اور جو بادلوں اور

مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ

زمین سے تمہیں رزق دیتا ہے - کیا (اس قادر مطلق) اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے؟ تُو کہہ دے

قوی ہی قوی ہوں۔ کوئی پہلو کمزور نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ لوگ دراصل نبی کے طالب ہیں اگرچہ زبان سے ختمِ نبوت کا اقرار کرتے ہیں۔ اور کوئی اجرائے نبوت کا نام بھی لے تو اُس کی زبان گُدّی سے کھینچنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ مگر اندر سے اُن کے دل ایک نبی مانگتے ہیں اور نبی سے کم کسی پر راضی نہیں۔[1]"

غرض حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایسی رَو چلا دی کہ تمام دنیا بڑی بے تابی سے ایک مسیح اور مہدی کا انتظار کرنے لگ گئی - یہ بھیگی بھیگی ہوائیں اِس بات کا ثبوت تھیں کہ اب جلد ہی آسمانِ روحانیت پر ایسا بادل چھانے والا ہے جو اپنی موسلادھار بارش سے پیاسی روحوں کو سیراب کر دیگا۔ اور اُن کی بے قراری کو دُور کر دیگا۔ اِسی لئے بانی سلسلہ احمدیہ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ

"اے بندگانِ خدا! آپ لوگ جانتے ہیں کہ جب امساکِ باراں ہوتا ہے اور ایک مدت تک مینہ نہیں برستا تو اُس کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کنوئیں بھی خشک ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ پس جس طرح جسمانی طور پر آسمانی پانی بھی زمین کے پانیوں میں جوش پیدا کرتا ہے اِسی طرح روحانی طور پر جو آسمانی پانی ہے (یعنی خدا کی وحی) وہی سفلی عقلوں کو تازگی بخشتا ہے - سو یہ زمانہ بھی اِس روحانی پانی کا محتاج تھا -

مَیں اپنے دعویٰ کی نسبت اس قدر بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مَیں عین ضرورت کے وقت خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہوں جبکہ اِس زمانہ میں بہتوں نے یہود کا رنگ پکڑا اور نہ صرف تقویٰ اور طہارت کو چھوڑا بلکہ اُن یہود کی طرح جو حضرت عیسیٰؑ کے وقت میں تھے سچائی کے دشمن ہو گئے - تب بالمقابل خدا نے میرا نام مسیح رکھ دیا - نہ صرف یہ ہے کہ مَیں اِس زمانہ کے لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہوں بلکہ خود زمانہ نے مجھے بلایا ہے[2]"

غرض اِس زمانہ کے لوگوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ کے مطابق بانیٔ سلسلۂ احمدیہ کی صداقت پر ایک گُنی بھاری

[1] ترجمان القرآن دسمبر جنوری ۴۳-۱۹۴۲ء صفحہ ۲۰۶

[2] براہین احمدیہ حصہ پنجم کی یاد داشتیں صفحہ ۱۲

خدا تعالیٰ کے سامنے یہ عذر کریں گے کہ ہم نے تو ان لوگوں کو وہی
باتیں سکھائی تھیں۔ جن کو ہم سچا سمجھتے تھے مگر ان لوگوں پر
ہمارا کوئی اختیار نہیں تھا۔ انہوں نے ہماری باتوں کو اس
لئے مانا کہ خود ان کا اپنا دل ان باتوں کو ماننا چاہتا تھا
ورنہ درحقیقت یہ ہمارے پیچھے نہیں چلے بلکہ اپنی نفسانی
خواہشات کی ہی انہوں نے تقلید کی ہے۔ (آیت ۶۳
و ۶۴)

اس کے بعد ان کے جھوٹے معبودوں کی بے چارگی
ظاہر کرنے کے لئے انہیں کہا جائیگا کہ اب اپنے معبودوں
کو بلاؤ اور انہیں کہو کہ وہ تمہیں اس عذاب سے نجات
دیں۔ وہ آوازیں دیں گے مگر اُن کا کوئی معبود انہیں جواب
نہیں دے گا۔ اُس وقت گمراہ ہونے والے حسرت اور
افسوس سے کہیں گے کہ کاش ہم ہدایت اختیار کرتے اور
اس غلط رستے پر نہ چلتے۔ (آیت ۶۵)

پھر خدا تعالیٰ اُن سے پُوچھے گا کہ بتاؤ جو رسول
مَیں نے تمہاری طرف بھیجے تھے انہیں تم نے کیا جواب
دیا تھا۔ اس پر وہ ایسے گھبرا جائیں گے کہ تمام خیالات
اُن کے دماغ سے نکل جائیں گے اور وہ ایک دوسرے
سے بھی کوئی بات پوچھنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔
ہاں وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح
کئے وہ یقیناً بامراد ہونگے (آیت ۶۶ تا ۶۸)

پھر بتایا کہ تمام تغیرات اللہ تعالیٰ کے قبضۂ
قدرت میں ہیں اور وہ جو تغیر بھی چاہتا ہے جاری کرتا
ہے۔ لیکن کفار کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اللہ
تعالیٰ اُن کے ظاہر کو بھی دیکھتا ہے اور اُن کے دل کے
مخفی رازوں سے بھی آگاہ ہے اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے
ابتداء بھی اُسی کی طرف سے ہوتی ہے اور انجام بھی اُسی کے
ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے ہر کام میں حمد کا ہی مستحق
ہوتا ہے (آیت ۶۹ تا ۷۱)

فرمایا۔ یہ لوگ شرک تو کرتے ہیں لیکن اتنا نہیں سوچتے
کہ اگر رات کو اللہ تعالیٰ قیامت تک کیلئے لمبا کر دے
تو خدا تعالیٰ کے سوا اور کون ہے جو اُن کے پاس روشنی
لائیگا۔ یا اگر دن کو قیامت تک کے لئے لمبا کر دے تو
خدا تعالیٰ کے سوا اور کون ہے جو اُن کے لئے رات کا
وقت لائے۔ خدا تعالیٰ ہی ہے جو سورج کو چڑھاتا اور غروب
کرتا ہے۔ پھر فرمایا یہ رات اور دن کا تسلسل اس لئے ہے کہ
رات میں تم سکون حاصل کرسکو اور دن میں کام کاج کے
ذریعہ اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ
کے شکر گذار بندے بنو۔ مگر مشرک لوگ اپنے مزعومہ معبودوں
کو اس کا شریک قرار دے دیتے ہیں حالانکہ کوئی مشرک نہیں
جو یہ تسلیم کرتا ہو کہ سورج کو اُس کا معبود چڑھاتا ہے یا
اُس کا غروب ہونا کسی بُت کے اشارہ سے ہوتا ہے۔
آیت ۷۲ تا ۷۴)

فرمایا۔ ایک دن آنے والا ہے جب ان مشرکوں سے
کہا جائیگا کہ آج تمہارے مزعومہ شرکاء کہاں ہیں۔ وہ
کیوں تمہاری مدد نہیں کرتے۔ اگر تمہارے پاس شرک کی تائید
میں دلائل تھے تو تمہاری وہ دلیلیں کہاں چلی گئیں۔ تب
مشرکوں پر اپنے بتوں کا جھوٹا ہونا بالکل واضح ہوجائیگا
اور وہ کہیں گے کہ سچی بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے
کہی تھی۔ اور اُن کے تمام مفتریانہ دعاوی اُن کو بھول
جائیں گے۔ (آیت ۷۵، ۷۶)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ مخالفوں کے سامنے قارون
کی مثال پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُس نے دولت کے
نشہ میں اپنی قوم پر سختی کرنی شروع کردی وہ خزانوں کا
افسر تھا جن کی کنجیاں اُٹھانا بھی ایک مضبوط جماعت
کے لئے دوبھر ہوتا تھا۔ اُس کی قوم نے اُسے سمجھایا کہ
تکبر نہ کر۔ اللہ تعالیٰ تکبّر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
مگر اُس نے کہا۔ یہ رتبہ مجھے یونہی نہیں ملا بلکہ میں نے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)۔

طٰسٓمّٓ ﴿۲﴾

طاہر (پاک) سمیع (دعائیں سننے والا) مجید (بڑی بزرگی والا خدا اِس سورۃ کو نازل کرنیوالا ہے) لہ

اپنے علم کے زور سے اسے حاصل کیا ہے۔ اُس نے یہ نہ سوچا کہ اللہ تعالیٰ اِس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو تباہ کر چکا ہے جو اس سے بھی زیادہ طاقتور تھیں۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک دن وہ بڑی شان وشوکت سے اپنی قوم کے سامنے سے گذرا اور قوم نے اُس پر رشک کیا مگر جو لوگ روحانی نگاہ رکھنے والے تھے انہوں نے کہا کہ یہ کوئی قابلِ رشک چیز نہیں۔ رشک کے قابل وہ جزا ہے جو مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ مگر یہ جزا اُنہی لوگوں کو ملا کرتی ہے جو مشکلات میں صبر سے کام لیتے ہیں۔ آخر قارون کی سزا کا وقت آ گیا اور ہم نے اُسے اور اُس کے سارے خاندان کو ایسا ذلیل کیا کہ نہ تو کوئی گروہ اُس کی مدد کے لئے نکلا اور نہ وہ خود اپنی حالت کو بدل سکا۔ اور لوگوں کو اقرار کرنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والوں کا انجام ایسا ہی ہوا کرتا ہے (آیت ۷۷ تا ۸۳)۔

اِس کے بعد بتایا کہ جو لوگ ملک میں ناجائز غلبہ کے حصول کی کوشش نہیں کرتے اور نہ فساد پھیلاتے ہیں اللہ تعالیٰ اُنہی کو ترقیات سے حصّہ دیا کرتا ہے (آیت ۸۴)

پھر نیکی اور بدی کی جزاء کے متعلق روشنی ڈالی اور بتایا کہ ہمارا یہ اصول ہے کہ نیکی کا بدلہ تو کام کی نسبت سے بہت زیادہ دیا جاتا ہے لیکن بدی کی سزا صرف اسی قدر دی جاتی ہے جسقدر قصور ہوتا ہے۔ اور پھر پیشگوئی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ گو ایک دن تیری قوم تجھے مکہ سے نکال دیگی لیکن وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہ اپنی ذات کی قسم کھا کر تجھ سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ تجھے پھر مکہ میں واپس لائیگا اور تجھے ان لوگوں پر غلبہ عطا فرمائیگا۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت لے کر آیا ہے اور کون اُسکا انکار کر کے گمراہ ہو چکا ہے۔ پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ ہدایت لانیوالا ناکام رہے اور گمراہ کامیاب ہو جائیں (آیت ۸۵ - ۸۶)

اے قرآن کے مخاطب اللہ تعالیٰ کے اِس عظیم الشان نشان کو دیکھنے کے بعد تیرا فرض ہے کہ تو کفار کا کبھی مددگار نہ بن اور کبھی شرک کے قریب مت جا اور کبھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اَور کو اپنا معبود نہ بنا۔ کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ دُنیا کی ہر چیز حتّٰی کہ ہر مزعومہ معبود بھی ہلاک ہو گا اور صرف وہی بچیں گے جن کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہو گی کیونکہ حکم بھی اللہ تعالیٰ کا ہی چلتا ہے اور سب مخلوقات نے پیش بھی اُسی کے حضور ہونا ہے۔

لہ اس سورۃ کے ابتداء میں حروف مقطعات طٰسٓمّٓ رکھے گئے ہیں۔ جو لطیف، سمیع اور مالک یا مجید کے قائم مقام ہیں۔ اور اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا لطیف ہے اور وہ لطف اور مہربانی سے کام لیتا ہے جبر اور سختی سے کام نہیں لیتا۔ وہ سَمِیع ہے۔ جب دنیا ہدایت سے محروم ہو گئی اور اُن کے دلوں میں سے خدا تعالیٰ کی طرف پکار اُٹھی کہ ہمیں ہدایت دے تو اُس نے یہ قرآن بھیج دیا۔ وہ مالک ہے مخلوق کا اسلئے وہ اپنے

ان نوٹوں میں یہ بحث کی گئی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمان اتنی جلدی کیوں خراب ہو گئے۔ باوجود اس کے کہ خدا تعالیٰ کے عظیم الشان احسانات ان پر تھے۔ اعلیٰ درجہ کا تمدن اور بہترین اقتصادی تعلیم انہیں دی گئی تھی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ گر گئے اور اُن کی حالت خراب ہو گئی۔ یہ نوٹ انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جو انگریزی لکھی ہوئی تھی وہ بائیں طرف سے دائیں طرف کو نہیں لکھی ہوئی تھی۔ بلکہ دائیں طرف سے بائیں طرف کو لکھی ہوئی تھی لیکن پھر بھی میں اُسے پڑھ رہا تھا۔ اور اُس میں سے ایک فقرہ کے الفاظ قریبًا یہ تھے کہ

THERE WERE TWO REASONS FOR IT. THEIR TEMPERAMENT BECOMING MORBID AND ANARCHICAL

یعنی وہ خرابی جو مسلمانوں میں پیدا ہوئی ہے اُس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی طبائع میں دو قسم کے نقائص پیدا ہو گئے تھے۔ ایک یہ کہ وہ مار بڈ MORBID ہو گئے تھے یعنی اَن نیچرل UN-NATURAL اور ناخوشگوار ہو گئے تھے۔ اور دوسرے اُن کی ٹنڈنسیز TENDENCIES انارکیکل ANARCHICAL ہو گئی تھیں۔ یعنی اُن میں فساد اور بغاوت کی رُوح پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ واقع میں یہ دونوں باتیں صحیح ہیں انکا مار بڈ MORBID ہونا تو اِس سے ظاہر ہے کہ انہیں جو بھی ترقیات ملیں وہ اسلام کی وجہ سے ملی تھیں۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت ملی تھیں۔ اُن کی ذاتی خوبی یا کمال کا اُن میں کوئی دخل نہیں تھا۔ مگر انہوں نے ان ترقیات کو اپنی ذاتی قابلیتوں کا نتیجہ سمجھنا شروع کر دیا حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مکہ والوں کی جو کچھ حالت تھی اُس کا اندازہ صرف اِسی بات سے ہو سکتا ہے

کہ لوگ اُن کا صرف مجاور سمجھ کر ادب کرتے تھے۔ ورنہ ذاتی طور پر اُن میں کوئی ایسی خوبی نہیں تھی جس کی وجہ سے لوگ اُن کی عزت کرنے پر مجبور ہوتے۔ اِسی طرح جب وہ غیر قوموں میں جاتے تو وہ بھی اُن کا مجاور سمجھ کر ہی اعزاز کرتیں۔ یا زیادہ سے زیادہ تاجر سمجھ کر ادب کرتی تھیں۔ وہ انہیں کوئی حکومت قرار نہیں دیتی تھیں اور پھر ان کی حیثیت اتنی کم سمجھی جاتی تھی کہ دوسری حکومتیں یہ سمجھتی تھیں کہ ہم جب چاہیں ان کو کچل سکتی ہیں جیسے یمن کے گورنر نے بیت اللہ کو گرانے کے لئے حملہ کر دیا۔ جس کا قرآن کریم نے اصحاب الفیل کے نام سے ذکر کیا ہے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت فرمایا تو تیرہ سال تک تو صرف تھوڑے سے آدمی آپ پر ایمان لائے مگر ہجرت کے آٹھویں سال بعد سارا عرب ایک نظام کے ماتحت آگیا اور اسلام کو ایسی طاقت اور قوت حاصل ہو گئی کہ بڑی بڑی حکومتیں اس سے ڈرنے لگیں۔ اُس وقت دُنیا حکومت کے لحاظ سے دو بڑے حصّوں میں منقسم تھی۔ اوّل رومی حکومت دوم ایرانی سلطنت رومی سلطنت کے ماتحت تمام مشرقی یورپ۔ ٹرکی۔ ایشیا۔ یونان۔ مصر۔ شام اور اناطولیہ تھا۔ اور ایرانی سلطنت کے ماتحت عراق۔ ایران۔ رشین ٹری ٹوری کے بہت سے علاقے۔ افغانستان۔ ہندوستان کے بعض علاقے اور چین کے بعض علاقے تھے۔ ان دونوں حکومتوں کے سامنے عرب کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی لیکن ہجرت کے آٹھویں سال بعد سارا عرب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تابع ہو گیا۔ اس کے بعد جب سرحدات پر عیسائی قبائل کی شرارت کی آپؐ کو خبریں ملنی شروع ہوئیں تو پہلے تو آپؐ خود وہاں تشریف لے گئے اور جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ کوئی شامی لشکر اس وقت جمع نہیں ہو رہا تو آپؐ بعض قبائل سے معاہدات کر کے

بغیر کسی لڑائی کے واپس آگئے۔ لیکن تھوڑے عرصے بعد ہی قبائل نے بغاوت شروع کی۔ تو آپؐ نے اُن کی سرکوبی کے لئے حضرت اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں ایک لشکر تیار کیا۔ اس لشکر نے بہت سے قبائل کو سرزنش کی اور بہتوں کو معاہدہ سے تابع کیا۔ پھر آپؐ کی وفات کے بعد اڑھائی سال کے عرصہ میں ہی یہ حکومت عرب سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بھی پھیلنی شروع ہوئی۔ فتح مکہ کے پانچ سال کے بعد ایرانی حکومت پر حملہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعض علاقوں پر قبضہ بھی کر لیا گیا تھا۔ اور چند سالوں میں رومی سلطنت اور دوسری سب حکومتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ اتنی بڑی فتح اور اتنے عظیم الشان تغیر کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ تاریخ میں صرف نپولین کی ایک مثال ملتی ہے لیکن اُس کے مقابلہ میں کوئی ایسی طاقت نہیں تھی جو تعداد اور طاقت میں اُس سے زیادہ ہو۔ جرمن کا ملک اُس وقت ۴۲ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ اور اس طرح اُس کی تمام طاقت منتشر تھی۔ چنانچہ ایک مشہور امریکن پریذیڈنٹ سے کسی نے پوچھا کہ جرمن کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے اُس نے کہا۔ ایک شیر ہے۔ دو تین لومڑ ہیں اور کچھ چوہے ہیں۔ شیر سے مراد رشیا تھا۔ لومڑ سے مراد دوسری حکومتیں تھیں۔ اور چوہوں سے مراد جرمن تھے۔ گویا جرمن اُس وقت ٹکڑے ٹکڑے تھا۔ روس ایک بڑی طاقت تھی۔ مگر وہ روس کے ساتھ ٹکرایا اور وہاں سے ناکام واپس لوٹا۔ اسی طرح انگلستان کو بھی فتح نہ کر سکا اور انجام اس کا یہ ہوا کہ وہ قید ہو گیا۔ پھر دوسرا بڑا شخص ہٹلر ہوا۔ بلکہ دو بڑے آدمی دو ملکوں میں پیدا ہوئے یعنی ہٹلر اور مسولینی۔ دونوں نے بیشک ترقیات حاصل کیں لیکن دونوں کا انجام شکست ہوا۔ مسلمانوں میں سے جس نے یکدم بڑی حکومت حاصل کی وہ تیمور تھا۔ اُس کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ بیشک دنیا کے کناروں تک گیا لیکن وہ اپنے اس مقصد کو کہ ساری دُنیا فتح کرے حاصل نہ کر سکا مثلاً وہ چین کو تابع کرنا چاہتا تھا لیکن تابع نہ کر سکا اور جب وہ مرنے لگا تو اُس نے کہا۔ میرے سامنے انسانوں کی ہڈیوں کے ڈھیر ہیں جو مجھے ملامت کر رہے ہیں۔ پس صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہی آدمؑ سے لیکر اب تک ایسے گذرے ہیں جنہوں نے فرد واحد سے ترقی کی اور تھوڑے عرصہ میں ہی سارے عرب کو تابع فرمان کر لیا۔ اور آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے ایک خلیفہ نے ایک بہت بڑی حکومت کو توڑ دیا اور باقی علاقے آپؐ کے دوسرے خلیفہ نے فتح کر لئے۔ یہ تغیر جو واقع ہوا محض خدائی نصرت کا نتیجہ تھا کسی انسان کا کام نہیں تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر مکہ میں پہنچی تو ایک مجلس میں حضرت ابوبکرؓ کے والد ابو قحافہؓ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جب پیغامبر نے کہا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں تو سب لوگوں پر غم و اندوہ کی کیفیت طاری ہو گئی اور سب نے یہی سمجھا کہ اب ملکی حالات کے ماتحت اسلام پراگندہ ہو جائیگا۔ چنانچہ انہوں نے کہا۔ اب کیا ہوگا؟ پیغامبر نے کہا۔ آپؐ کی وفات کے بعد حکومت قائم ہو گئی ہے اور ایک شخص کو خلیفہ بنا لیا گیا ہے۔ انہوں نے دریافت کیا کون خلیفہ مقرر ہوا ہے؟ پیغامبر نے کہا ابوبکرؓ۔ ابو قحافہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ کون ابوبکرؓ؟ کیونکہ وہ اپنے خاندان کی حیثیت کو خوب سمجھتے تھے اور اس حیثیت کے لحاظ سے وہ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اُن کے بیٹے کو سارا عرب بادشاہ تسلیم کرے گا۔ پیغامبر نے کہا۔ ابوبکرؓ جو فلاں قبیلہ میں سے ہیں۔ ابو قحافہ نے کہا کس خاندان میں سے ہے۔ پیغامبر نے کہا۔ فلاں خاندان میں سے۔ اس پر ابو قحافہ نے دوبارہ دریافت کیا۔ وہ کس کا بیٹا ہے؟ پیغامبر نے کہا۔ ابو قحافہ کا بیٹا۔ اس پر ابو قحافہ نے کہا

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اور پھر کہا ۔ آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی تھے ۔ ابو قحافہ پہلے صرف نام کے ہی مسلمان تھے ۔ لیکن اس واقعہ کے بعد انہوں نے سچے دل سے سمجھ لیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے دعویٰ میں راستباز تھے کیونکہ ابوبکرؓ کی خاندانی حیثیت ایسی نہ تھی کہ سارا عرب آپ کو مان لیتے ۔ پس یہ الہٰی دین تھی ۔ بعد میں مسلمانوں کی ذہنیت ایسی بگڑی کہ انہوں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ یہ فتوحات ہم نے اپنی طاقت سے حاصل کی ہیں ۔ کسی نے کہنا شروع کر دیا کہ عرب کی اصل طاقت بنو امیہ ہیں ۔ اس لئے خلافت کا حق اُن کا ہے ۔ کسی نے کہا ۔ بنو ہاشم عرب کی اصل طاقت ہیں ۔ کسی نے کہا بنو مطلب عرب کی اصل طاقت ہیں ۔ کسی نے کہا خلافت کے زیادہ حقدار انصار ہیں جنہوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھروں میں جگہ دی ۔ گویا تھوڑے ہی سالوں میں مسلمان مار بڈ MORBID ہو گئے ۔ اور اُن کے دماغ بگڑ گئے اُن میں سے ہر قبیلہ نے یہ کوشش شروع کر دی کہ وہ خلافت کو بزور حاصل کرے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت ختم ہو گئی ۔

پھر مسلمانوں کے بگڑنے کا دوسرا سبب انارکی ANARCHI ہے ۔ اسلام نے سب میں مساوات کی رُوح پیدا کی ۔ لیکن مسلمانوں نے یہ نہ سمجھا کہ مساوات پیدا کرنے کے معنے یہ ہیں کہ ایک آرگنائزیشن ہو ۔ اسکے بغیر مساوات قائم نہیں رہ سکتی ۔ اسلام آیا ہی اسی لئے تھا کہ وہ ایک آرگنائزیشن اور ڈسپلن قائم کرے اور ڈسپلن بھی ایسا جو ظالمانہ نہ ہو ۔ لیکن چند ہی سال میں مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہونا شروع ہو گیا کہ خزانے ہمارے ہیں اور اگر حکام نے اُن کے راستہ میں روک ڈالی تو انہوں نے انہیں مارنا اور قتل کرنا شروع کر دیا ۔ یہ وہ رُوح تھی جس نے مسلمانوں کو خراب کیا ۔ انہیں یہ سمجھنا چاہیئے تھا کہ یہ حکومت الٰہیہ ہے اور اسے خدا تعالیٰ نے قائم کیا ہے ۔ پس اسے خدا تعالیٰ کے ہی ہاتھ میں رہنے دیا جائے تو بہتر ہے ۔ اللہ تعالیٰ سورۂ نور میں صاف طور پر فرماتا ہے کہ خلیفے ہم بنائیں گے ۔ لیکن مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ خلیفے ہم نے بنائے ہیں ۔ اور جب انہوں نے یہ سمجھا کہ خلیفے ہم نے بنائے ہیں تو خدا تعالیٰ نے کہا ۔ اچھا اگر خلیفے تم نے بنائے ہیں تو اب تم ہی بناؤ ۔ چنانچہ ایک وقت تک تو وہ پہلوں کا مارا ہوا شکار یعنی حضرت ابو بکرؓ ۔ حضرت عمرؓ ۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا مارا ہوا شکار کھاتے رہے ۔ لیکن مرا ہوا شکار ہمیشہ کام نہیں دیتا ۔ زندہ بکرا ۔ یا زندہ بکری یا زندہ مرغا مرغی تو انہیں ہمیشہ گوشت اور انڈے کھلائیں گے لیکن ذبح کی ہوئی مرغی یا بکری زیادہ دیر تک نہیں جا سکتی کچھ وقت کے بعد خراب ہو جائیگی ۔ حضرت ابو بکرؓ ۔ حضرت عمرؓ ۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں تو مسلمان شکار کا تازہ گوشت کھاتے تھے لیکن جب انہوں نے اپنی زندگی کی رُوح کو ختم کر دیا تو تازہ شکار کی بجائے اپنے باپ دادا کا مارا ہوا شکار انہوں نے کھانا شروع کر دیا ۔ مگر یہ شکار کب تک کام دے سکتا تھا ۔ ایک ذبح شدہ بکری میں اگر بیس پچیس سیر گوشت بھی ہو ۔ تو آخر وہ ختم ہو جائیگا ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ اُن کا مارا ہوا شکار بھی ختم ہو گیا اور پھر ان کا وہی حال ہوا کہ

" ہتھ پُرانے کھوسڑے بسنتے ہوری آئے "

وہ ہر جگہ ذلیل ہونا شروع ہوئے ۔ انہیں ماریں پڑیں ۔ اور اُن کی تمام شان و شوکت جاتی رہی ۔ عیسائیوں نے تو اپنی مُردہ خلافت کو آج تک سنبھالا ہوا ہے لیکن انہوں نے اپنی زندہ خلافت کو اپنے ہاتھوں زمین میں گاڑ دیا ۔ جو محض نفسانی خواہشات ۔ دنیوی ترقیات کی تمنا اور وقتی جوشوں کا نتیجہ تھا ۔

اب چونکہ خدا تعالیٰ نے پھر اپنے فضل سے مسلمانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ

(پھر تو) کہدے کہ آسمانوں اور زمین میں جو مخلوق بھی ہے خدا کے سوا (ان میں سے کوئی) غیب کو

اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلِ

نہیں جانتی - اور ان میں سے کوئی یہ بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو کب زندہ کر کے اٹھایا جائیگا - بلکہ حقیقت یہ ہے کہ

کے ذریعہ جماعت احمدیہ میں خلافت قائم کی ہے اس لئے میں اپنی جماعت سے کہتا ہوں کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ہمیشہ اپنے آپ کو خلافت سے وابستہ رکھو - اور خلافت کے قیام کے لئے قربانیاں کرتے چلے جاؤ - اگر تم ایسا کروگے تو خلافت تم میں ہمیشہ رہے گی - خلافت تمہارے ہاتھ میں خدا تعالےٰ نے دی ہی اسی لئے ہے تا وہ کہہ سکے کہ میں نے اسے تمہارے ہاتھ میں دیا تھا - اگر تم چاہتے تو یہ چیز تم میں قائم رہتی - اگر اللہ تعالےٰ چاہتا تو اسے الہامی طور پر بھی قائم کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے یہ کہا کہ اگر تم لوگ خلافت کو قائم رکھنا چاہو گے تو میں بھی اسے قائم رکھونگا گویا اس نے تمہارے منہ سے کہلوانا ہے کہ تم خلافت چاہتے ہو یا نہیں چاہتے - اب اگر تم اپنا منہ بند کر لو - یا خلافت کے انتخاب میں اہلیت مدنظر نہ رکھو تو تم اس نعمت کو کھو بیٹھو گے - پس مسلمانوں کی تباہی کے اسباب پر غور کرو - اور اپنے آپ کو موت کا شکار ہونے سے بچاؤ - تمہاری عقلیں تیز ہونی چاہئیں - اور تمہارے حوصلے بلند ہونے چاہئیں - تم وہ چٹان نہ بنو جو دریا کے رُخ کو پھیر دیتی ہے - بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم وہ چینل CHANNEL بن جاؤ جو پانی کو آسانی سے گذارتی ہے - تم ایک ٹنل ہو جس کا کام یہ ہے کہ وہ فیضانِ الٰہی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حاصل ہوا ہے اسے آگے چلاتے چلے جاؤ - اگر تم ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے تو تم ایک ایسی قوم بن جاؤ گے جو کبھی نہیں مرے گی - اور اگر تم اس فیضان الٰہی کے رستہ میں روک بن گئے - اس کے رستہ میں پتھر بن کر کھڑے ہو گئے - تو وہ تمہاری قوم کی تباہی کا وقت ہوگا پھر تمہاری عمر کبھی لمبی نہیں ہوگی اور تم اسی طرح مر جاؤ گے جس طرح پہلی قومیں مریں -

پھر فرماتا ہے وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ - تم اس امر پر بھی غور کرو کہ آسمان اور زمین سے تمہیں کون رزق دیتا ہے ؟ کیا خدا تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود ہے جو تمہیں یہ رزق بہم پہنچا رہا ہے - اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ قوم کی مالی حالت میں جو ترقی ہوتی ہے وہ بھی الٰہی سامانوں سے ہی ہوتی ہے - کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جس میں محنت کی عادت نہ ہو - اور کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جس میں سچ کی عادت نہ ہو - اور قوم کے اندر محنت کرنے اور سچ پر قائم رہنے کا مادہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی آتا ہے پس قومی ترقیات کو کسی غیر کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا صرف ایک خدا کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اور اس کے خلاف کوئی شخص دلیل پیش نہیں کر سکتا اور اگر کریگا تو خود تاریخ اس کو رد کر دیگی -

پھر اس آیت میں بنی نوع انسان کو اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جب تمہاری جسمانی حیات کے لئے اللہ تعالیٰ تمہیں رزق مہیا کرتا ہے تو یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس نے روحانی حیات کے لئے

اِدّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۚ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

اخروی زندگی کے بارے میں ان کا علم باطل ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ وہ اس کے بارہ میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ اس کے بارہ میں بالکل اندھے ہیں ۲۹؎

۵ ع ۱

جو انسانی پیدائش کا منتہیٰ ہے کوئی انتظام نہ کیا ہو۔ اس کا انسانی جسم کی حفاظت اور اس کے بقا کے لئے رزق مہیا کرنا بتا رہا ہے کہ وہ انسانی روح کی درستی اور اس کی ترقی کے لئے بھی سامان مہیا کرتا ہے اور انبیاء و مصلحین کا وجود اس کی اس رزاقیت کا ایک کھلا ثبوت ہے۔ اگر مشرکین کا یہ دعویٰ کہ ان کے بت بھی اپنے اندر خدائی طاقتیں رکھتے ہیں درست ہے تو وہ انبیاء کے مقابلہ میں کیوں وہ مدعی پیش نہیں کرتے جو ان کے بتوں نے کھڑے کئے ہوں اور اگر وہ ایسا کوئی مدعی پیش نہیں کر سکتے تو یہ صاف طور پر اس امر کا ثبوت ہے کہ انہیں خدا تعالیٰ کا شریک قرار دینا ایک بے دلیل بات اور محض لاف زنی ہے۔

۲۹؎ **حل لغات۔** اِدّٰرَكَ اصل میں تَدَارَكَ تھا۔ ت کو دال سے ہم مخرج ہونے کی وجہ سے دال بنا کر دال میں ادغام کر دیا۔ پہلا حرف ساکن ہونے کی وجہ سے ہمزۂ وصل ابتدا میں لایا گیا۔ اور تَدَارَكَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں تَلَاحَقُوْا اَیْ لَحِقَ اٰخِرُهُمْ اَوَّلَهُمْ یعنی قوم کا آخری حصہ اوّل حصہ سے مل گیا (اقرب)

عَمُوْنَ: عَمِيٌّ کی جمع ہے اور اَلْعَمِيُّ کے معنے ہیں ذُو الْعَمٰى اندھا جس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہے (اقرب)

تفسیر:- فرماتا ہے زمین و آسمان میں سوائے خدا کے اور کوئی غیب نہیں جانتا یعنی مصفّٰی علمِ غیب صرف خدا تعالیٰ کے پاس ہی ہے۔ اور یہ لوگ جو بتوں کے پرستار ہیں یا ستاروں وغیرہ کو دیکھ کر غیب کی خبریں بتانے کے دعویدار ہیں یہ تو اپنی ترقی کا زمانہ بھی نہیں بتا سکتے اور اتنی بات بھی نہیں جانتے کہ ان کی قوم کب ترقی کرے گی یہ برابر تباہ ہوتے جا رہے ہیں مگر نہیں جانتے کہ ان کی تباہی کب دور ہو گی۔ اس کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو پہلے اکیلے تھے آج کروڑوں کے سردار بنے ہوئے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے معبود بھی اپنے اندر کوئی طاقت رکھتے یا انہیں ستاروں سے علمِ غیب حاصل ہو سکتا ہے تو کیوں یہ اپنی ترقی کا زمانہ نہیں بتا سکتے اور کیوں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی جو غیر اللہ سے علمِ غیب حاصل کرنے کے قائل نہیں روک نہیں دیتے جب یہ اپنی ترقی کا زمانہ بھی نہیں بتا سکتے تو انہوں نے اور کونسی غیب کی خبر بتانی ہے۔ پھر فرمایا کہ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنے انجام کے بارہ میں علم سے بالکل خالی ہیں بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بلکہ خود بھی اپنی ترقی کے متعلق انہیں کوئی یقین نہیں۔ صرف اندھوں کی طرح تخمینے کرتے ہیں جس طرح اندھا اِدھر اُدھر ہاتھ مارتا ہے تو کبھی اس کے ہاتھ میں لکڑی آ جاتی ہے اور کبھی لوہا۔ کبھی سیدھی سڑک پر چلنے لگتا ہے اور کبھی گڑھے میں گر جاتا ہے اسی طرح ان کو بھی کبھی کوئی ایک آدھ بات تخمینے سے درست معلوم ہو جاتی ہے اور کبھی حق سے دور باتوں کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔ بہرحال ان میں اور خدا تعالیٰ کے انبیاء

اِدّٰرَكَ

عَمُوْنَ

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا

اور کافر کہتے ہیں کہ کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادے مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر زمین سے

لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۸﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ

زندہ کرکے نکالے جائیں گے۔ ہم اور ہمارے باپ دادوں سے اِس سے پہلے ایسا ہی وعدہ

قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۹﴾ قُلْ

کیا گیا تھا۔ مگر یہ صرف پہلے لوگوں کی باتیں ہیں (جو کبھی پوری نہیں ہوتیں)۔ تو کہدے کہ

سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۷۰﴾

زمین میں پھرو اور دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیسا ہوا تھا۔ ۳۰ھ

میں ایک نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے انبیاء پر جو وحی نازل ہوتی ہے اُس میں آسمان و زمین کے غیب بیان کئے جاتے ہیں۔ مگر غیر اللہ میں سے کوئی نہیں جو آسمان و زمین کا غیب بتا سکے۔ پھر نبی تو یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اُنکی قوم اور اُن کے ماننے والے کب ترقی کریں گے لیکن معبودانِ باطلہ کا کوئی نمائندہ کبھی نہیں بتا سکتا کہ معبودانِ باطلہ کب زندہ ہونگے۔ یعنی اُن کا مشرکانہ دین کب دُنیا میں قائم ہوگا۔ اس بارہ میں اُن کا علم ختم ہو چکا ہے۔ بلکہ اب تو انہیں اپنی ترقی کے متعلق خود بھی کوئی یقین نہیں رہا۔ صرف اٹکل پچو باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ اٹکل پچو باتیں بھی الگ رہیں اصل حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس بارہ میں بالکل اندھے ہیں۔ اور وہ اپنے مستقبل کے متعلق کچھ بھی نہیں کہہ سکتے جبکہ خدا کا رسول توحید کی اشاعت اور اس کے غلبہ کی خبروں کے بعد خبریں دے رہا ہے اور دُنیا میں ایک تغیرِ عظیم پیدا ہو رہا ہے۔

۳۰ھ حل لغات اَسَاطِیْر: سَطْرٌ کی جمع اِسْطَارٌ ہے اور اِسْطَارٌ کی جمع اَسَاطِیْر ہے۔ وَقَالَ الْمُبَرِّدُ جَمْعُ اُسْطُوْرَةٍ۔ امامِ لغت مبرد نے کہا ہے کہ اَسَاطِیْر اُسْطُوْرَۃٌ کی جمع ہے اور اُسْطُوْرَۃٌ کے معنے ہیں مَا یُسْطَرُ اَیْ یُکْتَبُ۔ لکھی ہوئی تحریر (اقرب)

تفسیر:- فرماتا ہے۔ کفار کہتے ہیں کہ کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مرکر مٹی ہو جائیں گے تو اُس وقت ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائیگا۔ بیشک ہمیں اور ہمارے گذشتہ آباؤ اجداد کو بھی اِس سے پہلے ایسے ہی وعدے دیئے جاتے رہے ہیں مگر ہم تو سمجھتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اور یہ قیامت کا شور محض پُرانے لوگوں کی ایک نقل ہے۔ اِس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ اِس کے جواب میں فرماتا ہے کہ تم زمین میں پھر کر دیکھو۔ کہ مجرموں کا کیسا انجام ہُوا۔ پھر کیوں تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جو خدا اس دُنیا میں مجرموں کو اپنے کیفرِ کردار تک پہنچا سکتا ہے۔ اِس دُنیا میں انہیں قیامت کا ایک نظارہ دکھا سکتا ہے۔ اِس کیلئے انہیں دوسری قیامت کا نظارہ دکھانا کونسا مشکل امر ہے۔ تمہارا بڑا اعتراض آخر یہی ہے کہ ہزاروں سال سے کہنے والے کہتے چلے آئے

اَسَاطِیْر

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿٧١﴾

اور تو اُن پر غم نہ کھا اور اُن کی تدبیروں کی وجہ سے تنگی محسوس نہ کر۔ ۱۳۱

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٧٢﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ (عذاب کا) وعدہ کب پورا ہوگا؟ اگر تم سچے ہو تو

قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ

تو کہہ دے کہ ممکن ہے کہ وہ (عذاب) جس کے لئے تم جلدی کر رہے ہو اُس کا کچھ حصہ تمہارے پیچھے پیچھے

تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٧٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

چلا آ رہا ہو۔ اور تیرا رب لوگوں پر فضل کرنے والا ہے

ہیں مگر قیامت اب تک نہیں آئی۔ اور تمہارے نزدیک یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ قیامت کا ادّعا بالکل باطل ہے۔ لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا خدا قیامت نہیں لا سکتا؟ اگر وہ لا سکتا ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دنیا میں اس کے نظارے بھی دیکھ رہے ہو تو پھر تمہارا یہ کہنا کہ قیامت کیوں نہیں آئی ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ تم زمین میں پھرو اور دیکھو کہ مجرموں کا کیسا انجام ہوا کیا وہ سزا نہیں پاتے رہے۔ اور جب آج تک تمام مجرم سزا پاتے چلے آئے ہیں تو تم یہ کس طرح سمجھ سکتے ہو کہ ہمیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ جس طرح پہلی مجرم قوموں پر دنیا میں ہی قیامت کا آجانا اور اُن کا صفحۂ ہستی سے معدوم کر دیا جانا اخروی قیامت کا ایک ثبوت ہے اسی طرح تم پر جو دنیوی عذاب آئینگے یہ بھی اخروی قیامت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہونگے

---

۱۳۱ **تفسیر:**۔ چونکہ اوپر یہ بتایا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین اپنی سزا سے نہیں بچ سکتے۔ اور وہ بھی پہلے مجرموں کی طرح اللہ تعالےٰ کے عذاب کا شکار ہوں گے۔ اور یہ بات ایسی تھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں سخت قلق اور اضطراب پیدا کرنے والی تھی۔ کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ آپ کی قوم ہلاک ہو۔ اور وہ اللہ تعالےٰ کے غضب کا نشانہ بنے۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلّی دیتے ہوئے فرمایا کہ اے محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)! تو اِن کی تباہی پر غم نہ کر۔ کیونکہ یہ تباہی کی گھڑی اِن پر ضرور آنے والی ہے مگر چونکہ ابھی اُن کی کامل تباہی میں کچھ دیر ہے۔ اِس عرصہ میں یہ لوگ تیرے خلاف برابر منصوبے کرتے چلے جائیں گے اور تجھے مٹانے کیلئے ہر قسم کی تدابیر عمل میں لاتے رہیں گے پس تو اُنکی تدبیروں پر اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریو۔ کیونکہ آخر اُنکی تدبیریں ناکام رہینگی اور وہ کبھی کامیابی کا مُنہ نہیں دیکھ سکیں گے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ

لیکن اُن میں سے اکثر شکر نہیں کرتے ۔ اور تیرا رب اُن چیزوں کو بھی جانتا ہے

مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ

جن کو اُن کے سینے چھپا رہے ہیں اور جن کو وہ ظاہر کر رہے ہیں ۵۳۲ اور آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی

فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ

چھپی ہوئی چیز ہے ایک بیان کرنے والی کتاب میں (محفوظ) ہے ۔

هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ

یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے اکثر وہ باتیں سُناتا ہے جن میں

هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ

وہ اختلاف کر رہے ہیں اور وہ ضرور مومنوں کے لئے ہدایت

لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ

اور رحمت ہے ۔ تیرا رب اِن (یعنی بنی اسرائیل) کے درمیان اپنے حکم (یعنی قرآن) کے ساتھ (سچا) فیصلہ کرتا ہے

تُكِنُّ

۵۳۲ حل لغات: ۔ تُكِنُّ : كَنَّ سے باب اِفعال فعل مضارع معروف واحد مؤنث کا صیغہ ہے ۔ اور كَنَّ الشَّيْءَ وَاَكَنَّهٗ کے معنے ہیں سَتَرَهٗ فِيْ كِنِّهٖ وَغَطَّاهُ وَاَخْفَاهُ ۔ کسی چیز کو پردے میں چھپا دیا ۔ (اقرب)

تفسیر: ۔ فرماتا ہے ۔ یہ کفار اس قدر سرکش ہو چکے ہیں کہ بجائے اس کے کہ انہیں جو ڈھیل دی گئی ہے اُس سے یہ فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے نفس کی اصلاح کرتے اور خدا تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرتے یہ بڑی بے باکی سے پوچھتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ عذاب کا وعدہ کب پورا ہوگا ۔ تو اُن سے کہدے کہ ممکن ہے وہ عذاب جس کیلئے تم جلدی کر رہے ہو اس کا کچھ حصہ تمہارے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہو ۔ یعنی تباہی کی کامل گھڑی تو کچھ دیر میں آئیگی لیکن اس سے پہلے بعض ادنیٰ چھوٹے چھوٹے عذابوں کا جلدی آنا بھی مقدر ہو اسلئے تمہیں اپنی بیباکی سے توبہ کرنی چاہیئے کیونکہ کوئی انسان بھی خدا تعالیٰ کے عذاب کو برداشت کرنیکی طاقت نہیں رکھتا ۔ باقی رہا یہ سوال کہ بڑا عذاب جلدی کیوں نہیں آجاتا ۔ اسکا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا فضل کرنیوالا ہے یعنی وہ چاہتا ہے کہ جس طرح بھی ہو لوگوں کو ڈھیل دیکر بچا لوں ۔ مگر افسوس کہ بجائے اس کے کہ بندے اس کے شکرگذار ہوں وہ ڈھیل دیکھکر اور بھی متکبر ہو جاتے ہیں اور شرارتوں میں ترقی کر جاتے ہیں ۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ تیرا رب اُنکے مخفی ارادوں اور ظاہر باتوں سب کو جانتا ہے اور ان کی وجہ سے انہیں سزا کا مستحق سمجھتا ہے لیکن محض اپنے فضل کی وجہ سے انہیں ڈھیل دے رہا ہے ۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿٧٩﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۖ اِنَّكَ

اور وہ غالب (اور) بہت بڑے علم والا ہے۔ پس اللہ (تعالیٰ) پر توکّل کر۔ تو یقیناً

عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿٨٠﴾

باب مدلّل حق پر قائم ہے ۳۳ھ

۳۳ھ حل لغات:- غَائِبَة کے معنے ہیں۔ کُلُّ غَائِبٍ عَنِ الْحَاسَّةِ وَ عَمَّا يَغِيْبُ عَنْ عِلْمِ الْاِنْسَانِ (مفردات) یعنی ہر وہ چیز جس کا حِس سے علم نہ ہو سکے۔ یا جس کا انسان کو علم نہ ہو۔

تفسیر:- فرماتا ہے۔ آسمان اور زمین میں کوئی بھی مخفی چیز نہیں مگر اللہ تعالےٰ کے علم میں وہ پوری طرح محفوظ ہے چنانچہ اس کے ثبوت کے طور پر قرآن کریم کو دیکھ لو کہ اکثر باتیں جن میں بنی اسرائیل اختلاف رکھتے ہیں۔ اُن کو قرآن کریم خوب کھول کر بیان کر رہا ہے اور سچی بات خواہ ہزاروں پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہو اُسے نکال کر سامنے لے آتا ہے۔ اور ہر عقلمند کو ماننا پڑتا ہے۔ کہ قرآن کا بیان صحیح ہے اور بائیبل کا بیان غلط۔ مثلاً بائیبل میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کی تجلی دیکھنے کے لئے طُور پر گئے تو اُن کے پیچھے ہارون علیہ السلام مشرکوں کے ساتھ مل گئے اور انہوں نے خود اُن کے لئے سونے کا بچھڑا بنایا۔ اور پھر اُس کی پرستش شروع کر دی[1]

لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔ یہ ایک نہایت ہی گندہ اور ناپاک الزام ہے جو اُن پر لگایا جا رہا ہے۔ انہوں نے تو بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پرستش کرنے سے بڑی سختی کے ساتھ روکا تھا اور فرمایا تھا کہ يَاقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ (طٰہٰ آیت ۹۱) یعنی اے میری قوم! بچھڑے کے ذریعہ تم ایک بڑی آزمائش میں ڈالے گئے ہو۔ تمہارا ربّ تو رحمٰن خدا ہے جو پیدائش سے بھی پہلے تمہاری مدد کرتا رہا ہے اور اب بھی اُس نے اپنی ہزاروں نعمتوں سے تمہیں متمتع کیا ہوا ہے۔ اس بچھڑے نے تمہاری کیا مدد کرنی ہے کہ تم اس کے آگے اپنا سر جھکا رہے ہو۔ پھر قرآن کریم اس امر کی بھی وضاحت فرماتا ہے کہ یہ بچھڑا ایک روحانیت سے بے بہرہ شخص نے بنایا تھا۔ جس کا نام سامری تھا۔ اب دیکھو قرآن کریم دو ہزار سال کے بعد آیا اور بائیبل خود اس کے ماننے والوں کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں لکھی گئی تھی۔ مگر جو کتاب موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں لکھی گئی وہ تو ہارون علیہ السلام کو ملزم قرار دیتی ہے۔ مگر تیرہ سو سال کے بعد نازل ہونے والا قرآن ہارون علیہ السلام کو ہر قسم کے الزامات سے پاک ٹھہراتا ہے پھر اگر علم النفس کے ماتحت دیکھا جائے کہ ان دونوں روایات میں سے کونسی روایت درست ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی روایت ہی درست ہے کیونکہ بائیبل بھی حضرت ہارون علیہ السلام کو صاحب الہام تسلیم کرتی ہے۔ اور جب وہ انہیں خدا رسیدہ سمجھتی ہے تو ایک صاحب الہام کو یہ شبہ ہی کیونکر ہو سکتا ہے کہ کہ خدا بھی ہے یا نہیں۔ آخر بچھڑے کی پوجا وہی شخص کر سکتا ہے جسے خدا تعالیٰ کے وجود میں شبہ ہو۔ مگر

غَائِبَة

[1] خروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۶۔

جو خود ملہم من اللہ ہو اُسے خدا تعالیٰ کے وجود میں کس طرح شبہ ہو سکتا ہے۔ پس علم النفس کی شہادت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام پر بائیبل نے جو الزام لگایا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ اور یہ چیز ایسی ہے جو ہر عقلمند کو تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جسے انگلستان کے بڑے بڑے علماء نے مل کر مرتب کیا ہے اُس میں بھی اس امر پر بحث کرتے ہوئے تسلیم کیا گیا ہے کہ ہارون علیہ السلام کے شرک کرنے کا واقعہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ اس واقعہ سے وہ استدلال کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بائیبل میں اور بھی کئی واقعات بعد میں بڑھا دیئے گئے ہیں[۵۱]

اسی طرح بائیبل بیان کرتی ہے کہ جب بنی اسرائیل نے مصر سے ہجرت کی تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے[۵۲] مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ وَهُمْ اُلُوْفٌ[۵۳] وہ صرف ہزاروں تھے اور تاریخ سے اور بائیبل کی تفصیلات سے بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ ہزاروں ہی ہو سکتے تھے لاکھوں نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ لاکھوں آدمی اتنی جلدی مصر کے دُور دراز علاقہ سے بحیرۂ قلزم تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ نہ لاکھوں آدمیوں کے لئے سواریاں میسر آسکتی تھیں۔ آجکل مشینوں کا زمانہ ہے۔ لیکن پھر بھی اگر تیس چالیس ہزار آدمی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہیں تو ریلیں اور لاریاں اُنکے لے جانے سے عاجز ہو جاتی ہیں کجا یہ کہ گھوڑوں بیلوں اور گدھوں کا زمانہ ہو اور ایک رات میں لاکھوں آدمی کئی سو میل پر پہنچا دیئے جائیں۔

اسی طرح قرآن کریم بھی بیان کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے اپنے ایک بیٹے کو قربان کرنے کا حکم دیا اور بائیبل بھی یہی بیان کرتی ہے مگر تفصیلات کو دیکھا جائے تو بائیبل کا حکم بالکل بے معنے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کا حکم اپنے اندر بڑی بھاری حکمتیں رکھنے والا دکھائی دیتا ہے۔ بیشک قرآن اور بائیبل کا اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ بائیبل کہتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسحاقؑ کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور قرآن کریم حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام لیتا ہے لیکن ذبیح اسحاقؑ ہو یا اسماعیلؑ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا بات ایک ہی رہتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے اپنے ایک بیٹے کی قربانی کا حکم دیا اور آپ نے اُسے قبول کر لیا۔ لیکن جہاں تک اس واقعہ کے اخلاقی پہلو کا تعلق ہے قرآن کریم کا بتایا ہوا واقعہ اپنے اندر بڑی بھاری معقولیت رکھتا ہے۔ لیکن بائیبل کے بیان کردہ واقعہ میں کوئی معقولیت دکھائی نہیں دیتی۔ بائیبل کہتی ہے کہ

> "خدا نے ابراہام کو آزمایا اور اُسے کہا
> اے ابراہام! اُس نے کہا۔ مَیں حاضر ہوں۔
> تب اُس نے کہا کہ تُو اپنے بیٹے اضحاق
> کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تُو پیار کرتا ہے
> ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور
> وہاں اُسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر
> جو مَیں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے
> طور پر چڑھا۔[۵۴]"

بائیبل کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جب انہوں نے اضحاق کو باندھا

---

[۵۱] انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۴ زیر لفظ دی گولڈن کاف و جلد ۱۵ زیر لفظ موسیٰ۔
[۵۲] خروج باب ۱۲ آیت ۳۸۔
[۵۳] سورۂ بقرۃ ع ۳۲۔
[۵۴] پیدائش باب ۲۲ آیت ۱ و ۲

اور اُسے قربان گاہ پر لکڑیوں کے اوپر رکھا اور چھری لی تاکہ اپنے بیٹے کو ذبح کرے

"تب خداوند کے فرشتہ نے اُسے آسمان سے پکارا کہ اے ابرہام! اے ابرہام۔ اُس نے کہا مَیں حاضر ہوں۔ پھر اُس نے کہا کہ تُو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اُس سے کچھ کر۔ کیونکہ مَیں اب جان گیا کہ تُو خدا سے ڈرتا ہے۔ اس لئے کہ تُو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا۔ اور ابرہام نے نگاہ کی اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابرہام نے جاکر اُس مینڈھے کو پکڑا اور اپنے بیٹے کے بدلے سوختنی قربانی کے طور پر چڑھایا[1]"

گویا بائبل کے بیان کے مطابق حضرت اسحاق علیہ السلام کو کسی شکل میں بھی ذبح نہیں کیا گیا۔ نہ ظاہری رنگ میں اور نہ تشبیہی رنگ میں اور اس طرح یہ سارا واقعہ بائبل کے بیان کے مطابق ایک کھیل تھا جو نعوذ باللہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کھیلا۔ آخر اس میں کیا لطف تھا کہ پہلے تو خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تُو اسحاقؑ کو ذبح کر اور پھر انہیں منع کر دیا۔ اگر اس واقعہ سے خدا تعالیٰ کا صرف اتنا ہی منشاء تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان ظاہر ہو تو کیا خدا تعالیٰ کو پہلے معلوم نہیں تھا کہ ابراہیمؑ صادق الایمان اور راستباز انسان ہے اور اُسے جو بھی حکم دیا جائیگا وہ اُس کی تعمیل کے لئے فوراً کھڑا ہو جائیگا۔ اور جبکہ خدا تعالیٰ کو پہلے ہی سے اس بات کا علم تھا تو حضرت اسحاقؑ کو ذبح کرنیکا حکم دینا اور پھر اُس سے روک دینا ایک بالکل بے معنے بات بن جاتی ہے۔ اور اس کی تہ میں کوئی حکمت نظر نہیں آتی۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ اسمٰعیلؑ کی قربانی کا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا وہ تشبیہی زبان میں تھا۔ یہ مراد نہیں تھی کہ آپ واقعہ میں اپنے بیٹے کو چھری سے ذبح کر دیں بلکہ ذبح سے مراد اُسکو دین کی خاطر ایسی جگہ پر رکھنا تھا جہاں کھانے پینے کے سامان مہیا نہیں تھے۔ چنانچہ گو قرآن کریم کے مطابق بھی حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے سے منع کیا گیا لیکن خواب کا جو اصل مفہوم تھا یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کو ایک بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑ آنا۔ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منع نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس حکم پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے عمل کروایا چنانچہ آج تک مکّہ اسمٰعیلؑ کی نسل سے آباد ہے اور خدائے واحد کی وہاں پرستش کی جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔ پس قرآنی تشریح کے مطابق یہ قربانی ظالمانہ اور وحشیانہ نہیں تھی۔ بلکہ پُرمغز اور بامعنی قربانی تھی جس سے آج تک دُنیا فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ اور اب بھی اسمٰعیلؑ کے ذریعہ اس بے آب و گیاہ جنگل میں خدائے واحد کا نام بلند کیا جاتا ہے۔ چنانچہ لاکھوں آدمی حج کے موقعہ پر اس وادیٔ غیر ذی زرع میں جمع ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر شخص بلند آواز سے کہتا ہے کہ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ۔ یعنی اے میرے خدا میں حاضر ہوں جس طرح کہ ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ مَیں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ مَیں تیری توحید کو پھیلانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ اب اس واقعہ پر غور کرو اور سوچو کہ کیا بائبل میں بیان کیا ہوا واقعہ قرآن کریم کے

[1] پیدائش باب ۲۲ آیت ۹ تا ۱۴

بیان کردہ واقعہ سے کوئی بھی مناسبت رکھتا ہے۔ بائبل کا حکم تو ایک وحشیانہ اور ظالمانہ حکم معلوم ہوتا ہے جس میں کوئی حکمت نہیں تھی۔ اسحاقؑ کے گلے پر چھری پھیرنے سے دنیا کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا یا خود اسحاقؑ کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ مگر اسمٰعیلؑ کو مکّہ میں چھوڑنے سے اسمٰعیلؑ کو بھی فائدہ ہُوا اور دنیا کو بھی فائدہ ہُوا اسمٰعیلؑ توحید سکھانے کا ایک بہت بڑا استاذ بن گیا اور دُنیا اس کے ذریعہ خدائے واحد کی عبادت کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ مکّہ کو دنیا کے نقشہ سے الگ کر دو تو ساری دنیا میں توحید کا کوئی مرکز باقی نہیں رہتا۔ اور اسمٰعیلؑ کی قربانی کو حذف کر دو تو خدا تعالےٰ کے لئے زندگیاں وقف کرنے والا ولولہ پیدا کرنے کی کوئی صورت دنیا میں باقی نہیں رہتی۔ پس قرآن کریم ہر قسم کے گرد و غبار کو جو مرورِ زمانہ کی وجہ سے بائبل کے واقعات پر چھا گیا تھا صاف کر کے سچے اور درست واقعات دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ یعنی آسمان اور زمین کی ہر مخفی سے مخفی بات خدا تعالےٰ کے علم میں محفوظ ہے۔

پھر قرآن کریم صرف انہی حقائق پر روشنی نہیں ڈالتا جن میں مسلمانوں اور بنی اسرائیل کا باہم اختلاف ہے بلکہ وہ یہود اور نصاریٰ کے آپس کے اختلافات کو مدّنظر رکھتے ہوئے بھی دنیا کے سامنے صحیح حقیقت کو پوری طرح واضح کرتا ہے۔ مثلاً پیدائشِ مسیحؑ کے متعلق ہی تمام یہود اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی ولادت نعوذ باللہ ناجائز تھی۔ چنانچہ اُن میں سے بعض تو یہ کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ یوسف نجار کے نطفہ سے بغیر شادی کے پیدا ہوئے[1] اور بعض کہتے ہیں کہ پنتھیرا نامی ایک رومی سپاہی تھا جس نے حضرت مریم کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے اور انہی تعلقات کے نتیجہ میں حضرت مسیحؑ کی ولادت ہوئی[2]۔ اِس کے مقابلہ میں انجیل یہ بیان کرتی ہے کہ

"یسوعؑ مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اُس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو اُن کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ رُوح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی۔" (متی باب ۱ آیت ۱۸)

غرض یہود اور نصاریٰ میں ولادتِ مسیح کے مسئلہ پر ہی عظیم الشان اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہود آپ کی ولادت کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور عیسائی اس ولادت کو رُوح القدس کا کرشمہ قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم یہود اور نصاریٰ کے اس باہمی نزاع کا فیصلہ کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں اعلان فرماتا ہے کہ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ع ۶)

یعنی حضرت مریم نے اپنے تمام سوراخوں کو گناہ سے محفوظ رکھا تھا۔ پس اُن پر بدکاری کا الزام لگانا ایک شرمناک افترا ہے۔ اُن کو جو حمل ہُوا تھا وہ درحقیقت ایک پاک رُوح تھی جو ہم نے خود اس کے اندر نفخ کی تھی۔

اِسی طرح حضرت مسیحؑ کے دعویٰ مسیحیت کو لو۔ تو یہودی تو سرے سے ہی آپ کی رسالت کے منکر ہیں۔ اور عیسائی آپ کو خدا تعالیٰ کا رسول تسلیم کرنے کی بجائے خدا تعالیٰ کا بیٹا تصوّر کرتے ہیں۔ اسلام اِن دونوں نظریات کے خلاف ایک صحیح اور درست عقیدہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہود بھی غلطی پر ہیں جو حضرت مسیحؑ کے کلّی طور پر منکر ہیں۔ اور عیسائی بھی غلطی پر ہیں جو اُن کو خدا تسلیم کرتے ہیں۔

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹینکا جلد ۵ صفحہ ۱۰۲ نیز دیکھو جیوش لائف آف کرائسٹ صفحہ ۱۳

[2] جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۷ صفحہ ۱۷۰ کالم اوّل۔

سچی بات صرف یہی ہے کہ حضرت مسیحؑ بنی اسرائیل کی طرف صرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے[50]

اِسی طرح یہودی حضرت مسیحؑ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ مصلوب ہو کر لعنتی بنے۔ اور عیسائی یہ کہتے ہیں کہ وہ موت کے بعد گنہگاروں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے صرف تین دن جہنم میں رہے اور پھر دوبارہ زندہ ہو کر خدا تعالیٰ کے داہنے ہاتھ جا بیٹھے۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ حضرت مسیحؑ صلیب پر فوت نہیں ہوئے بلکہ صلیب پر لٹکائے جانے کے بعد اُن کے بے ہوش ہو جانے کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ خیال کر لیا کہ وہ صلیب پر فوت ہو گئے ہیں ورنہ وہ صلیب پر سے زندہ اُتر آئے تھے[51] اور پھر صلیب سے نجات پانے کے بعد وہ آسمان پر نہیں اُٹھائے گئے بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں کشمیر میں[52] لایا۔ اور انہوں نے ایک لمبے عرصہ تک اشاعتِ دین کے فرائض سرانجام دیئے۔ غرض قرآن کریم یہود اور نصاریٰ کے باہمی اختلافات کو بھی دُور کرتا ہے اور اُن اُمور پر بھی روشنی ڈالتا ہے جو مسلمانوں اور بنی اسرائیل میں مابہ النزاع ہیں اور اِس طرح بنی نوع انسان کے لئے ہدایت اور رحمت کا سامان مہیّا کرتا ہے۔

پھر فرماتا ہے اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے ذریعہ سے صرف بنی اسرائیل کے باہمی اختلافات کو ہی دُور نہیں کرے گا بلکہ وہ چونکہ غالب اور علم والا ہے۔ اِس لئے وہ اُنکی مختلف قوموں اور فرقوں کے درمیان فیصلہ بھی کر دیگا اور سچّوں کو غالب اور جھوٹوں کو مغلوب کر دیگا۔ چنانچہ اِس آیت کے نزول کے بعد عیسائی ہر جگہ غالب آ گئے اور یہودی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر تھے ہر جگہ مغلوب ہو گئے مگر عیسائیت کا غلبہ چونکہ اسلام کے لئے ایک مستقل خطرہ کا باعث تھا اور مسلمانوں پر اشاعتِ اسلام کی بڑی بھاری ذمہ داریاں عائد ہونے والی تھیں اِس لئے عیسائیت کے غلبہ کی خبر دیتے ہی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نصیحت فرمائی کہ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۖ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اللہ پر توکّل کرتے ہوئے اپنے دین کی اشاعت کرتے چلے جاؤ کیونکہ گو عیسائیت اور یہودیت کے باہمی نزاع میں عیسائیت حق پر ہے مگر حقِ مبین صرف اسلام کے پاس ہی ہے اس لئے تمہارا کام یہ ہے کہ تم اسلام کی اشاعت کے لئے ہر قسم کی تدابیر کام میں لاؤ اور اللہ تعالیٰ پر یقین رکھو۔ کہ وہ تمہیں ضرور کامیاب کریگا۔ اور اسلام کا جھنڈا دُنیا کے تمام جھنڈوں سے اونچا لہرائیگا۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں نے توکّل کا نہایت غلط مفہوم سمجھ لیا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ توکّل کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی تدبیر سے کام نہ لے اور اپنے تمام کاموں کی سرانجام دہی خدا تعالیٰ پر چھوڑ دے۔ لیکن تعجب ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں تو توکّل ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن دنیا کے معاملہ میں کبھی توکّل نہیں کرتے۔ کبھی کسی کا عزیز بیمار ہو جائے تو تم یہ نہیں دیکھو گے کہ وہ خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ رہے اور کہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر توکّل کرتا ہوں وہ خود اُسے اچھا کر دیگا۔ بلکہ وہ فوراً دوائی لینے کے لئے ہسپتال کی طرف دوڑے گا۔ وہ کبھی نہیں کہے گا کہ بھلا ملیریا میرا کیا بگاڑ سکتا ہے یا ہیضہ مجھے کیا کر سکتا ہے یا طاعون مجھے کیا نقصان پہنچا سکتی ہے وہ فوراً علاج کریگا۔ اور ڈاکٹروں کی فیسوں پر روپیہ بھی خرچ کریگا۔ اور اِس معاملہ میں توکّل سے کام لینے کی بجائے تدبیر سے کام لیگا اسی طرح کبھی تم نہیں دیکھو گے

---

[50] آل عمران آیت ۵۰ [51] نساء آیت ۱۵۸
[52] مومنون آیت ۵۱

کہ کوئی لڑکا سکول میں داخل ہو تو نہ کتابیں خریدے نہ پڑھائی کرے اور یہی کہتا رہے کہ اللہ مجھے پاس کر دیگا میں اس پر سچے طور پر توکّل کرتا ہوں۔ یا کسی کو اپنے لئے مکان کی ضرورت ہو تو نہ اینٹیں مہیا کرے - نہ چونا خریدے - نہ گارا بنوائے نہ مزدور اور مستری بلوائے اور کہے کہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں یہ تردّد کروں - اللہ تعالیٰ خود مکان بنا دیگا ۔ یا مثلاً کھانے کی ضرورت ہو تو بیوی کھانا تیار نہ کرے اور شام کو جب خاوند گھر آئے اور پوچھے کہ کھانا تیار ہے تو وہ کہے کہ مجھے کھانا تیار کرنے کی کیا ضرورت ہے - اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہر جاندار کو روزی پہنچانا ہے وہ خود ہی کھانا پہنچا دیگا - اب کیا تم سمجھتے ہو کہ خاوند اُس کی بات سن کر یہ کہے گا کہ میری بیوی نے بڑا توکّل کیا - وہ یقیناً اس پر ناراضگی کا اظہار کرے گا - بلکہ ایک غیر تعلیم یافتہ گنوار تو کچھ تعجب نہیں کہ دو چار سوٹیاں بھی رسید کر دے - مگر اس قسم کا توکّل لوگوں کو دین کے معاملہ میں فوراً یاد آجاتا ہے - ہم اپنی روٹی کے لئے توکّل نہیں کرتے - ہم اپنے مکان کے لئے توکّل نہیں کرتے ہم اپنی ملازمت کے لئے توکّل نہیں کرتے - ہم اپنے دوسرے کاموں کے لئے توکّل نہیں کرتے بلکہ تمام وہ تدابیر اختیار کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس عالمِ اسباب میں مقرر فرمائی ہیں - باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ موت اور حیات میرے اختیار میں ہے - ذلّت اور عزت میرے ہاتھ میں ہے - رزق کی فراخی اور تنگی میرے ہاتھ میں ہے - ہم موت سے بچنے کی بھی کوشش کرتے ہیں ہم حیات کے پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں - ہم ذلّت سے محفوظ رہنے کی بھی کوشش کرتے ہیں - ہم عزت اور ترقی کے حصول کے لئے بھی کوشش کرتے ہیں - ہم رزق بڑھانے اور آمدنی کو وسیع کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں - گویا ہم وہ ساری تدابیر اختیار کرتے ہیں جن تدابیر کا اختیار کرنا دنیوی کاموں کی سرانجام دہی کے لئے ضروری ہے - مگر جب دین کا سوال آجاتا ہے ہم نہایت بے تکلفی سے کہہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کرے گا - ہمیں اس میں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے -

میں ایک دفعہ لاہور سے آ رہا تھا - یہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے زمانے کا واقعہ ہے جس کمرہ میں میں سوار ہوا اُسی کمرہ میں ایک مشہور پیر صاحب بھی سوار ہو گئے - انہیں مجھ سے کچھ کام تھا - اور وہ مجھ سے ایک معاملہ میں مدد لینا چاہتے تھے - دورانِ گفتگو میں انہوں نے مجھے ممنون کرنے کے لئے ایک رومال نکالا جس میں کچھ میوہ بندھا ہوا تھا - اور رومال کھول کر میرے سامنے بچھا دیا اور کہا کہ کھائیے - وہ مجھ سے کسی احمدی کے پاس ایک معاملہ میں سفارش کرانا چاہتے تھے - مگر اس سے پہلے وہ پیر صاحب یہ فتویٰ بھی شائع کر چکے تھے کہ احمدیوں سے ملنا جُلنا اور گفتگو کرنا بالکل حرام ہے اور اگر کوئی ان سے ملے جُلے یا گفتگو کرے یا ان کے جلسہ میں شریک ہو تو اُس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جاتی ہے - چنانچہ مجھے یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک دفعہ جب سیالکوٹ تشریف لے گئے اور وہاں ایک جلسہ ہوا جس میں آپ نے تقریر فرمائی تو راستہ میں بڑے بڑے مولوی ان پیر صاحب کے فتویٰ کے اشتہارات اٹھائے ہوئے لوگوں کو کہہ رہے تھے کہ جو مرزا صاحب کے لیکچر میں جائیگا اُس کی بیوی کو طلاق ہو جائیگی - جو احمدیوں سے ملیگا اُس کی بیوی کو بھی طلاق ہو جائیگی اور جو اُن کے سلام کا جواب دیگا اُس کی بیوی کو بھی طلاق ہو جائیگی مجھے یاد ہے جلسہ میں جب لوگ جاتے تو باہر بڑے بڑے مولوی کھڑے ہو کر لوگوں کو روکتے کہ اندر مت جانا - ورنہ تمہارا نکاح فسخ ہو جائیگا - اس پر کئی جوش میں آجاتے اور کہتے نکاح کا کیا ہے نکاح تو سوا روپیہ دیکر پھر بھی پڑھا لیا جائیگا - مرزا صاحب نے روز روز نہیں آنا - اس لئے

اُن کا لیکچر ضرور سُنیں گے - اور یہ کہہ کر وہ جلسہ میں شامل ہو جاتے ۔ تو اُنہی پیر صاحب نے جن کا یہ فتویٰ تھا کہ احمدیوں سے ملنے اور باتیں کرنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے - باوجود یہ معلوم ہونے کے کہ مَیں بانئ سلسلہ احمدیہ کا لڑکا ہوں رومال بچھا کر میرے سامنے میوہ رکھ دیا اور کہا کھایئے - مجھے اس فتویٰ کی وجہ سے یوں بھی انقباض تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا سامان بھی پیدا کیا ہُوا تھا - اور وہ یہ کہ اُس روز مجھے کھانسی اور نزلہ کی شکایت تھی - میوہ میں کشمش بھی تھی جس کا کھانا نزلہ کی حالت میں نزلہ کو اَور زیادہ بڑھا دیتا ہے اسلئے مَیں نے معذرت کی کہ آپ مجھے معاف رکھیں مجھے نزلہ کی شکایت ہے میں میوہ نہیں کھا سکتا۔ پیر صاحب فرمانے لگے کہ نہیں کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کھائیں تو سہی - مَیں نے پھر انکار کیا کہ مجھے اس حالت میں ذراسی بد پرہیزی سے بھی بہت تکلیف ہو جاتی ہے - اِس پر وہ کہنے لگے - یہ تو باتیں ہی ہیں۔ کرنا تو سب اللہ نے ہوتا ہے اور وہی ہوتا ہے جو اللہ کرتا ہے - مَیں نے کہا - پیر صاحب آپ نے یہ بات بہت بعد میں بتائی - اگر آپ لاہور میں ہی بتا دیتے تو آپ اور مَیں ایک نقصان سے بچ جاتے - کہنے لگے وہ کیا - مَیں نے کہا غلطی یہ ہوئی کہ آپ نے بھی ریل کا ٹکٹ لے لیا اور مَیں نے بھی (وہ امرتسر آ رہے تھے اور مَیں بٹالہ آ رہا تھا) اگر اس مسئلہ کا پہلے علم ہوتا تو نہ ہم ٹانگے پر کرایہ خرچ کرتے نہ ریل کا ٹکٹ مول لیتے - جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہنچانا ہی تھا تو وہ آپ کو امرتسر پہنچا دیتا اور مجھے قادیان پہنچا دیتا ہمیں ٹکٹ پر روپیہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی - وہ کہنے لگے تدبیر بھی تو ہوتی ہے - مَیں نے کہا - بس اِسی اسباب کی رعایت کی وجہ سے مجھے بھی میوہ کھانے میں عذر تھا - تو جب انسان کا ذاتی سوال ہو تو اُس وقت اُسے ہزاروں تدبیریں یاد آجاتی ہیں مگر جب خدا تعالیٰ کے دین کا معاملہ ہو تو انسان نہایت بے تکلفی سے کہہ دیتا ہے کہ مجھے تدبیر سے کام لینے کی کیا ضرورت ہے اللہ خود کرے گا - اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ دین کا کام اللہ تعالیٰ نے ہی کرنا ہے اور ہمارے کام بھی دراصل وہی کرتا ہے - ہم ہزاروں کام جو کرتے اور کامیاب ہو جاتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا ہی نتیجہ ہے - ہماری کسی کوشش کا خالصۃً اِس میں دخل نہیں ورنہ ہمیں ہر کام میں کامیابی ہو - لیکن کامیابی ہر بات میں نہیں ہوتی - کسی بات میں ہو جاتی ہے اور کسی میں نہیں ہوتی - ہزاروں لڑکے محنت کرکے پاس ہو جاتے ہیں اور ہزاروں لڑکے محنت کرنے کے باوجود فیل ہو جاتے ہیں - ہزاروں کوشش کرتے ہیں اور انہیں عزت مل جاتی ہے اور ہزاروں عزت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ پہلے سے بھی زیادہ ذلیل ہو جاتے ہیں - تو تمام کام اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے - مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تدبیر کا تعلق ہو وہاں اگر مومن تدبیر نہیں کرتا تو خدا تعالیٰ کی طرف سے سزا نازل ہوتی ہے اور وہ اُس کی گرفت اور عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

دیکھو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک نہایت واضح مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی پیش کی ہے اللہ تعالیٰ نے اس قوم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ کنعان کی سرزمین کا انہیں وارث بنا دیا جائیگا - جیسے ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ہمیں دنیا کا حکمران اور بادشاہ بنائیگا - مگر اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ جاؤ اور جنگ کرو - اِس جنگ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تمہیں فتح دے دیگا - حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو خدا تعالیٰ کا یہ حکم سُنایا تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا ہم سے یہ وعدہ ہے کہ وہ ہمیں کنعان کی سرزمین دیگا وہ اپنے وعدہ کو آپ پورا کرے - ہم اپنی جانوں کو کیوں ہلاکت میں ڈالیں - موسیٰؑ اور اُس کا خدا دونوں جا کر دشمنوں سے لڑیں اور جب فتح ہو جائے تو ہمیں آ کر

بتادیا جائے ہم کنعان کی سرزمین میں داخل ہو جائیں گے ۔ پھر جانتے ہو اس کا کیا نتیجہ ہوا ۔ باوجود وعدہ کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے وہ زمین اُن پر چالیس سال تک حرام کر دی اور اُن پر ایسی ذلت نازل کی کہ وہ تمام لوگ جنہوں نے یہ اعتراض کیا تھا ایک ایک کرکے جنگلوں میں بھٹک کر مر گئے۔ اور پھر اُن کی نسلوں کے ذریعہ یہ الٰہی وعدہ پورا ہوا ۔ تو جہاں تدبیر کا تعلق ہو وہاں باوجود وعدہ کے ۔ باوجود الٰہی فیصلہ کے ۔ باوجود الٰہی مشیئت اور ارادہ کے اس وقت تک خدا تعالیٰ کی نصرت نازل نہیں ہوتی جب تک تمام کی تمام قوم قربانی کرنے کے لئے تیار نہیں ہو جاتی ۔ اور اگر کوئی قوم قربانی کے لئے تیار نہ ہو تو جھوٹا توکل اسے کامیاب نہیں کر سکتا۔ حدیثوں میں آتا ہے ۔ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا میں پہلے اپنے اونٹ کا گھٹنا باندھوں اور پھر توکل کروں یا اُسے آزاد رہنے دوں اور توکل کروں ۔ آپ نے فرمایا اِعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ [۵] پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھو اور پھر توکل کرو ۔ یعنی پہلے عمل کرو اور پھر خدا تعالیٰ پر نتیجہ چھوڑ دو ۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رات دن کام میں مشغول رہتے تھے ۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قدر عبادت کرتے تھے کہ کھڑے کھڑے آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے ۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ۔ یا رسول اللہ آپ اتنی عبادت کیوں کرتے ہیں ۔ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف نہیں کر دیئے ۔ آپ نے فرمایا ۔ کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں [۶]

اگر توکل کے یہ معنے ہوتے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے تو سب سے زیادہ اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل ہونا چاہیئے تھا ۔ کیونکہ آپؐ سب سے بڑھ کر متوکل تھے مگر آپ سب سے زیادہ مشغول رہتے تھے ۔ پھر ان معنوں میں سب سے زیادہ توکل تو جنت میں ہو سکتا ہے ۔ مگر قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی مشغولیت ہوگی جیسے فرمایا فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ [۷] ۔ اگر توکل کا یہی مفہوم ہوتا تو جب وہاں ہر چیز خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنی ہے تو مومنوں کو تو جنت میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا چاہیئے تھا مگر وہاں کے لئے بھی شغل کو نکرہ کے طور پر استعمال کرکے بتایا کہ وہاں بڑا عظیم الشان کام کرنا ہوگا ۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں انسان کام سے تنگ نہیں آجائیگا اور تھکیگا نہیں بلکہ خوشی محسوس کریگا اور کام کرنے کے باوجود اُس کے اندر بشاشت قائم رہے گی ۔

غرض آجکل لوگوں نے توکل کا نہایت غلط مفہوم سمجھ رکھا ہے ۔ جو کام اُن کی اپنی مرضی کے مطابق ہوتا ہے اُسے تو وہ کر لیتے ہیں ۔ اور جو کام نہیں کرنا چاہتے اُس کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ ہم توکل سے کام لے رہے ہیں ۔ اگر توکل کے یہ معنے ہوتے کہ عمل ترک کر دیا جائے ۔ تو پھر نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی ۔ صرف زبان سے ایمان کا اظہار کرنا ہی انسان کو نجات دے دیتا ۔

پس توکل کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ سامانوں سے پوری طرح کام لے اور پھر اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جائے اور اُس سے کہے کہ اے خدا! جو سامان میرے اختیار میں تھے وہ تو

---

[۵] ترمذی جلد ۲ ابواب صفۃ القیامۃ ۔

[۶] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب التحریض علی قیام اللیل

[۷] سورۃ یٰسٓ آیت ۵۶

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ

تُو ہرگز مُردوں کو نہیں سُنا سکتا۔ اور نہ بہروں کو ہی (اپنی) آواز سُنا سکتا ہے۔

اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ

خصوصًا جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔ اور تُو اندھوں کو بھی اُن کی گمراہی سے بچاکر

عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ

ہدایت نہیں دے سکتا تُو تو صرف انہی کو سُناتا ہے جو ہماری آیتوں پر ایمان

بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

لاتے ہیں۔ اور وہ (عملًا بھی) فرمانبردار ہوتے ہیں۔ ۳۴ ع

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً

اور جب اُن کی تباہی کی پیشگوئی پوری ہو جائے گی تو ہم اُن کے لئے زمین سے ایک کیڑا

تیں نے سب استعمال کر لئے ہیں اب کوئی کمی رہ گئی ہے تو تُو خود اپنے نضل سے اُسے پورا فرما اور میری کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کام کے نیک نتائج پیدا فرما۔ جب وہ ایسا کریگا تب اُسے اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہوگی اور وہ اپنے ہر کام میں کامیابی حاصل کرے گا۔ لیکن جو شخص کام نہیں کرتا اور پھر اپنے آپ کو متوکل کہتا ہے وہ توکل کے ساتھ تمسخر کرتا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنتا ہے۔

۳۴ ع تفسیر:- چونکہ اوپر یہ کہا گیا تھا کہ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ تُو ایک واضح اور روشن سچائی پر قائم ہے اس لئے اب اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ واضح سے واضح سچائی کا انکار کرنے والے بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے محض کسی ہدایت کا کامل ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ اسے سب لوگ مان لینگے

چنانچہ فرماتا ہے اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى جو مُردہ دل لوگ ہوں اور اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اُس کی محبت کے جذبات سے بالکل عاری ہوں تم ان کو خدا تعالےٰ کی باتیں نہیں منوا سکتے وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ اور نہ تم بہروں کو اپنی آواز سُنا سکتے ہو۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جائیں یعنی آواز تو وہ پہلے ہی نہیں سُن سکتے۔ پیٹھ پھیر کر چلے جانے کی وجہ سے وہ دوسروں کے اشارے دیکھنے سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اور اُن کی ہدایت کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح جو اندھا ہو اور ہنما کے پیچھے چلنے کے لئے تیار نہ ہو اُس کو بھی اُس کی گمراہی سے کوئی نہیں بچا سکتا صرف اُنہی کو سچائی سنائی اور سمجھائی جا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نشانات پر ایمان رکھتے ہوں اور ایسے ہی لوگ آخر میں مسلمان ہوتے ہیں۔

مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا

نکالیں گے جو اُن کو کاٹے گا اس وجہ سے کہ لوگ ہمارے

بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع

نشانات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ۳۵ھ

ع ۶ ۲

تُکَلِّمُهُمْ

۳۵ھ حل لغات:۔ تُكَلِّمُهُمْ۔ كَلَّمَ سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور كَلَّمَهٗ کے معنے ہیں حَدَّثَهٗ۔ بات کی۔ وَجَرَّحَهٗ اُس کو زخمی کیا۔ (اقرب) پس تُكَلِّمُهُمْ کے معنے ہوں گے اُن کو زخمی کرے گا۔

تفسیر:۔ اس میں بتایا کہ جب ان روحانی مُردوں اور بہروں اور اندھوں کے خلاف خدا تعالیٰ کا فتویٰ جاری ہو جائے گا اور آسمان سے اُن کی سزا کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ زمین میں سے ایک کیڑا نکالے گا۔ جو اُن کو کاٹے گا۔ اور یہ عذاب اُن پر اس لئے آئے گا کہ وہ لوگ ہمارے نشانات کی سچائی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

اس آیت میں دَآبَّةُ الْاَرْضِ کے خروج کی جو پیشگوئی کی گئی ہے اس کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بتا دیا فرمایا ہے کہ اس کا خروج آخری زمانہ میں ہوگا جو مسیح اور مہدی کا زمانہ ہے[۱]۔ اور پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جب آنے والے مسیح کی مخالفت بڑھ جائیگی تو فَيُرْسِلُ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِيْ رِقَابِهِمْ[۲]۔ اللہ تعالیٰ مخالفین کی گردنوں میں ایک پھوڑا پیدا کریگا جس سے اُن کی ہلاکت واقعہ ہوگی۔ ان دونوں حدیثوں کو ملا کر دیکھا جائے تو ان سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دابۃ الارض جس کے خروج کی خبر دی گئی ہے وہ درحقیقت طاعون کا ہی مرض ہے جو حضرت بانیٔ سلسلہ کے زمانہ میں پھیلا اور جس سے لاکھوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ چونکہ یہ مرض ایک کیڑے سے پیدا ہوتا ہے جو زمین سے انسان کے جسم میں داخل ہوتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی گردن یا بُن ران میں ایک خطرناک قسم کا پھوڑا بھی نکلتا ہے جو مہلک ہوتا ہے اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے دابۃ الارض بھی قرار دیا۔ اور نغف کی بیماری بھی اُس کا نام رکھا۔ اور چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دابۃ الارض کا خروج آخری زمانہ کی علامات میں سے قرار دیا ہے اس لئے لازماً وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ سے وہی لوگ مراد ہیں جو مسیح موعود کی تکذیب کرنیوالے ہونگے۔ اور جو اپنی روحانی نابینائی کی وجہ سے نہ آسمانی نشانات کو دیکھیں گے۔ نہ روحانی شنوائی کے فقدان کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے کلام کو سُنیں گے اور نہ روحانی حیات سے کلیۃً محروم ہونے کی وجہ سے نیکی کا کوئی فعل اُن سے سرزد ہوگا۔ ایسے لوگ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی گرفت میں آ جائیں گے۔ اور ایک زمینی کیڑا اُن کی ہلاکت کے لئے اُن پر مسلط کیا جائیگا۔ چونکہ وہ بھی ایک رنگ میں زمینی کیڑے بن چکے ہونگے۔ اس لئے خدا تعالےٰ بھی اُن کی سزا کے لئے ایک زمینی کیڑا ہی اُن پر مسلط کرے گا اور انہیں آیاتِ الٰہیہ پر ایمان نہ لانے کی سزا دیگا۔

غرض یہ ایک بڑی بھاری پیشگوئی ہے جو بانیٔ سلسلہ احمدیہ

[۱] تفسیر ابن کثیر بر حاشیہ فتح البیان جلد ۷ صفحہ ۲۳۱
[۲] مسلم جلد ۲ کتاب الفتن باب ذکر الدجال وصفتہ

کے زمانہ میں پوری ہوئی۔ اور جس کی طرف خود بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی پیشگوئیاں بھی بڑی وضاحت سے اشارہ کر رہی تھیں چنانچہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق رمضان کی تیرہ تاریخ کو چاند گرہن اور اٹھائیس تاریخ کو سورج گرہن ہوا تو اُس وقت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بتایا گیا کہ اگر لوگوں نے اس نشان سے فائدہ نہ اٹھایا اور مجھے قبول نہ کیا تو اُن پر ایک شدید عذاب نازل ہوگا۔ چنانچہ اس بارہ میں آپ نے اپنی کتاب "نور الحق" میں پیشگوئی کرتے ہوئے فرمایا:۔

"وَحَاصِلُ الْكَلَامِ اَنَّ الْخُسُوْفَ وَالْكُسُوْفَ اٰيَتَانِ مُخَوِّفَتَانِ وَاِذَا اجْتَمَعَا فَهُوَ تَهْدِيْدٌ شَدِيْدٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ۔ وَاِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّ الْعَذَابَ قَدْ تَقَرَّرَ وَاُكِّدَ مِنَ اللّٰهِ لِاَهْلِ الْعُدْوَانِ"

(نور الحق حصہ دوم ص۳۵)

یعنی کسوف و خسوف خدا تعالیٰ کی طرف سے دو ڈرانے والے نشان ہیں۔ اور جب یہ اس طرح جمع ہو جائیں جس طرح اَب جمع ہوئے ہیں تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک تنبیہہ ہوتی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کے لئے جو سرکشی سے باز نہ آئیں عذاب مقرر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے آپ کے دل میں تحریک کی کہ آپ ایک عام وباء کیلئے دُعا کریں چنانچہ آپ اپنے ایک عربی قصیدہ میں جو ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا فرماتے ہیں ؎

فَلَمَّا طَغَى الْفِسْقُ الْمُبِيْدُ بِسَيْلِهٖ
تَمَنَّيْتُ لَوْ كَانَ الْوَبَاءُ الْمُتَبِّرُ
فَاِنَّ هَلَاكَ النَّاسِ عِنْدَ اُولِي النُّهٰى
اَحَبُّ وَاَوْلٰى مِنْ ضَلَالٍ يُّخَسِّرُ

یعنی جب ہلاک کر دینے والا فسق ایک طوفان کی طرح بڑھ گیا تو میں نے خدا سے چاہا کہ کاش ایک وباء پڑے جو لوگوں کو ہلاک کر دے۔ کیونکہ عقلمندوں کے نزدیک لوگوں کا مرجانا اس سے زیادہ پسندیدہ اور عمدہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ تباہ کر دینے والی گمراہی میں مبتلا ہو جائیں اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں آپ نے اپنی کتاب "سراج منیر" میں لکھا کہ

"اس عاجز کو الہام ہوا ہے يَا مَسِيْحَ الْخَلْقِ عَدْوَانَا یعنی اے خلقت کے لئے مسیح! ہماری متعدی بیماریوں کیلئے توجہ کر۔"

پھر فرماتے ہیں:۔

"دیکھو یہ کس زمانے کی خبریں ہیں اور نہ معلوم کس وقت پوری ہونگی۔ ایک وہ وقت ہے جو دُعا سے مرتے ہیں اور دوسرا وہ وقت آتا ہے کہ دُعا سے زندہ ہونگے۔"

جس وقت یہ آخری پیشگوئی شائع ہوئی اُس وقت طاعون صرف بمبئی میں پڑی تھی اور ایک سال رہ کر ہٹ گئی تھی۔ اور لوگ خوش تھے کہ ڈاکٹروں نے اس کے پھیلنے کو روک دیا۔ مگر خدا تعالیٰ کی خبریں اس کے خلاف تھیں چنانچہ جب لوگ اس مرض کے حملہ کو ایک عارضی حملہ خیال کر رہے تھے اور پنجاب میں صرف ایک دو گاؤں میں ہی یہ مرض نہایت قلیل طور پر پائی جاتی تھی باقی سب علاقہ محفوظ تھا اور بمبئی کی طاعون بھی بظاہر دبی ہوئی معلوم ہوتی تھی اُس وقت آپ نے ایک اَور اعلان کیا اور اس میں بتایا کہ:۔

"ایک ضروری امر ہے جس کے لکھنے پر میری جوش ہمدردی نے مجھے آمادہ کیا ہے۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ جو لوگ روحانیت سے بے بہرہ ہیں اس کو ہنسی اور ٹھٹھے سے

سراج منیر ص۶۵ پیشگوئی نمبر ۱۸

دیکھیں گے مگر میرا فرض ہے کہ میں اس کو نوع انسان کی ہمدردی کے لئے ظاہر کروں اور وہ یہ ہے کہ آج جو ۶ر فروری ۱۸۹۸ء روز یکشنبہ ہے میں نے خواب میں دیکھا کہ خدا تعالےٰ کے ملائک پنجاب کے مختلف مقامات میں سیاہ رنگ کے پودے لگا رہے ہیں۔ اور وہ درخت نہایت بدشکل اور سیاہ رنگ اور خوفناک اور چھوٹے قد کے ہیں۔ میں نے بعض لگانے والوں سے پوچھا کہ یہ کیسے درخت ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ طاعون کے درخت ہیں جو عنقریب ملک میں پھیلنے والی ہے۔ میرے پر یہ امر مشتبہ رہا کہ اس نے یہ کہا کہ آئندہ جاڑے میں یہ مرض پھیلے گا یا یہ کہ اس کے بعد کے جاڑے میں پھیلے گا۔ لیکن نہایت خوفناک نمونہ تھا جو میں نے دیکھا۔ اور مجھے اس سے پہلے طاعون کے بارہ میں الہام بھی ہوا اور وہ یہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ اِنَّهٗ اٰوَى الْقَرْيَةَ۔ یعنی جب تک دلوں کی وبائے معصیت دُور نہ ہوگی تب تک ظاہری وبار بھی دُور نہیں ہوگی۔"

اس اشتہار کے آخر میں آپ نے چند فارسی اشعار بھی لکھے جو یہ ہیں کہ ؎

گر آں چیزے کہ مے بینم عزیزاں نیز دیدندے
ز دنیا توبہ کردندے بچشم زار و خوں بارے
خورِ تاباں سیہ گشت است از بدکاریٔ مردم
زمیں طاعوں ہمے آرد پئے تخویف و انذارے
بتشویشِ قیامت ماند ایں تشویش گر بینی
علاجے نیست بہرِ دفع آں جز حسن کردارے
من از ہمدردی ات گفتم تو خود ہم فکر کن بارے
خرد از بہرِ ایں روز است اے دانا و ہوشیارے

یعنی اگر وہ چیز جسے میں دیکھ رہا ہوں اور دوست بھی دیکھتے تو وہ دُنیا سے رو رو کر توبہ کرتے۔ لوگوں کی بدکاریوں کی وجہ سے چمکتا ہوا سورج بھی سیاہ ہو گیا ہے۔ اور زمین بھی ڈرانے اور دھمکانے کی خاطر طاعون پیدا کر رہی ہے۔ اگر تم غور سے دیکھو تو یہ معیبت قیامت کی معیبت کی طرح ہے اور اس کو دُور کرنے کا علاج سوائے نیک اعمال کے اور کچھ نہیں۔ میں نے صرف ہمدردی کی وجہ سے یہ بات کہی ہے۔ اب اے دانا اور سمجھدار انسان تو آپ بھی غور کرے۔ کیونکہ عقل اسی دن کے لئے ہُوا کرتی ہے۔
(ایام الصلح مطبوعہ ۱۸۹۹ء ص۱۲۲)

ان پیشگوئیوں سے ظاہر ہے کہ آپ نے ۱۸۹۴ء سے پہلے ایک خطرناک عذاب اور پھر کھلے لفظوں میں بار کی پیشگوئی کی۔ اور پھر جبکہ ہندوستان میں ابھی طاعون نمودار ہی ہوئی تھی کہ آپ نے خصوصیت کے ساتھ پنجاب کی تباہی کی خبر دی اور آنے والی طاعون کو قیامت کا نمونہ قرار دیا۔ اور فرمایا کہ یہ طاعون اس وقت تک نہیں جائیگی جب تک کہ لوگ دلوں کی اصلاح نہیں کرینگے اس کے بعد جو کچھ ہُوا الفاظ اُسے ادا نہیں کر سکتے۔

طاعون کی ابتداء گو بمبئی سے ہوئی تھی اور قیاس چاہتا تھا کہ وہیں اس کا دورہ سخت ہوتا۔ وہ تو پیچھے رہ گئی اور پنجاب میں طاعون نے اپنا ڈیرہ لگا لیا۔ اور اس سختی سے اُس نے حملہ کیا کہ بعض دفعہ ایک ہفتہ میں تیس تیس ہزار آدمیوں کی موت ہوئی۔ اور ایک ایک سال میں کئی کئی لاکھ آدمی مر گئے۔ سینکڑوں ڈاکٹر مقرر کئے گئے اور بیسیوں قسم کے علاج نکالے گئے مگر کچھ فائدہ نہ ہُوا ہر سال طاعون مزید شدّت اور سختی کے ساتھ حملہ آور ہوئی اور گورنمنٹ منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی اور بہت سے

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ

اور اُس دن (کو یاد کرو) جب ہر (ایک) قوم میں سے جو ہمارے نشانات کا انکار کرتی رہی ہوگی ہم ایک بڑا گروہ کھڑا

بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۴﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ

کرینگے۔ پھر اُس (گروہ) کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا جائیگا (تا خدا تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر جواب دیں) اور جب وہ اُسکے پاس پہنچینگے وہ اُن سے

اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِىْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا

کہے گا۔ کیا تم نے میرے نشانات کا اس کے باوجود انکار کیا تھا کہ تم نے علم کے ذریعہ سے اُنکی پوری واقفیت حاصل نہیں کی تھی یا یہ بتاؤ کہ

لوگوں کے دلوں نے محسوس کیا کہ یہ عذاب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انکار کی وجہ سے آیا ہے۔ چنانچہ ہزاروں نہیں لاکھوں آدمیوں نے اس قہری نشان کو دیکھ کر صداقت کو قبول کر لیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے مامور پر ایمان لائے۔ اور اُس وقت تک طاعون کے زور میں کمی نہ ہوئی جب تک اللہ تعالیٰ نے اپنے مامور کو یہ نہ بتایا کہ

"طاعون تو گئی مگر بخار رہ گیا[1]"

اس کے بعد سے طاعون کا زور ٹوٹنا شروع ہو گیا اور وہ برابر کم ہوتی چلی گئی۔

یہ پیشگوئی ایسی واضح اور مومن و کافر سے اپنی صداقت کا اقرار کرانے والی ہے کہ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص ضد کرتا ہے تو اُس کی حالت نہایت قابلِ رحم ہے۔ جس کی آنکھیں ہوں وہ دیکھ سکتا ہے کہ (۱) طاعون کی خبر ایک لمبا عرصہ پہلے دی گئی تھی۔ اور کوئی طبی طریق ایسا ایجاد نہیں ہوا جس سے اتنا لمبا عرصہ پہلے وباؤں کا پتہ دیا جا سکے۔ (۲) طاعون کے نمودار ہونے پر یہ بتایا گیا کہ یہ عارضی دورہ نہیں ہے۔ بلکہ سال بسال یہ بیماری حملہ کرتی چلی جائیگی (۳) یہ بھی قبل از وقت بتایا گیا کہ یہ بیماری پنجاب میں نہایت سخت ہوگی۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ پنجاب میں ہی یہ بیماری سب سے زیادہ پھیلی اور یہیں سب سے زیادہ موتیں ہوئیں۔ (۴) ڈاکٹروں نے متواتر اعلانات کئے کہ اب یہ بیماری قابو میں آگئی ہے۔ مگر آپ نے بتایا کہ اُس وقت تک اس کا زور ختم نہیں ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا علاج نہ ہو۔ اور ایسا ہی ہوا کہ اس کا دورہ برابر نو سال سختی سے ہوتا رہا۔ (۵) آخر میں خدا تعالیٰ نے خود رحم کر کے خود اس کے زور کو توڑ دینے کا وعدہ کیا اور آپ کو بتایا گیا کہ "طاعون تو گئی مگر بخار رہ گیا۔" چنانچہ اس الہام کے بعد طاعون کا زور ٹوٹ گیا۔ اور بخار کا شدید حملہ پنجاب میں ہوا جس سے قریباً کوئی گھر خالی نہ رہا۔ اور سرکاری رپورٹوں میں بھی تسلیم کیا گیا کہ بخار کا وہ حملہ غیر معمولی تھا۔

غرض اس آیت میں بتایا گیا تھا کہ جب لوگوں پر آسمانی نشانوں اور عقلی دلائل کے ساتھ حجت پوری ہو جائے گی تو اُس وقت روحانی مُردوں اور روحانی بہروں اور روحانی اندھوں کی سزا دہی کے لئے ایک زمینی کیڑا

[1] حاشیہ "تذکرہ" ایڈیشن دوم صفحہ ۵۱۴

كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨٥﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا

تم (اسلام کے خلاف کیا) کیا سازشیں کیا کرتے تھے ۔ اور اُن کے ظلموں کی وجہ سے اُنکے خلاف کی گئی پیشگوئی پوری

ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنْطِقُونَ ﴿٨٦﴾

ہو جائے گی ۔ اور وہ کچھ بات نہ کر سکیں گے ۔ ۳۶ھ

پیدا کیا جائے گا جو لوگوں کو کاٹے گا اور انہیں زخمی کریگا ۔ اس لئے کہ لوگ خدا تعالیٰ کے نشانوں پر ایمان نہیں لائے تھے ۔

بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے اپنی کتب میں یہ بھی لکھا ہے کہ دابۃ الارض کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے دل میں یہ ڈالا گیا ہے کہ اس سے طاعون مراد ہے[ھ] اور آپ نے اپنی کتاب "نزول المسیح"[ھ] میں مختلف قرائن کو اس کو ثابت کیا ہے ۔ گر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس دابہ کے خروج کی پیشگوئی میں صرف طاعون ہی کی خبر نہیں بلکہ خوردبین کی ایجاد کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر دنیا کو کیونکر معلوم ہو سکتا تھا کہ اس بیماری کا باعث ایک دابہ ہے ۔ پہلے لوگ تو بلغم صفراء ۔ سوداء اور دم پر ہی سب بیماریوں کے بواعث کی زنجیر کو ختم کر دیتے تھے ۔

۳۶ھ تفسیر :- فرماتا ہے ۔ اس دن کو بھی یاد کرو ۔ جبکہ ہم ہر اس قوم میں سے جو ہمارے نشانات کا انکار کرتی رہی ہو گی ایک بڑی جماعت کھڑی کریں گے اور پھر وہ گروہ جماعت در جماعت تقسیم کر دیا جائیگا ۔ یعنی آخری زمانہ میں ہر مذہب کے پیرووں میں بے دینی پھیل جائیگی ۔ اور سب قوموں میں سے ایک ایک گروہ بے دینی کی تعلیم دینے لگ جائیگا جیسا کہ اس زمانہ میں ہو رہا ہے ۔ اور یہ سلسلہ اُسوقت تک چلتا چلا جائیگا جب تک اُن کے متعلق سزا کا فتویٰ جاری نہ ہو جائے اور خدا تعالیٰ کا اُن کو یہ پیغام نہ پہنچ جائے کہ کیا تم نے میرے نشانوں کا انکار کر دیا ہے ۔ حالانکہ تم نے اُن پر پوری طرح غور بھی نہیں کیا تھا ۔ اور نہ اُن کی دلیلوں کو پرکھا تھا ۔ یا اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کرتے رہے ہو ۔ اس میں بتایا کہ جب آخری زمانہ کے موعود کے ذریعہ سے اسلام کی صداقت ظاہر کی جائیگی تو مختلف قومیں تعلیم کے نام پر دہریت پھیلانے کیلئے کھڑی ہو جائینگی اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جائینگی یعنی مختلف ایسوسی ایشنز اور یونیورسٹیاں بن جائینگی اور دینِ حقّہ کا انکار کرنے لگ جائینگی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلے زمانوں میں بھی دینِ حقّہ کا انکار کرنے والے لوگ پائے جاتے تھے مگر جہانتک منظم مخالفت اور جتھہ بندی کا سوال ہے ۔ یہ پہلے زمانوں میں نظر نہیں آتی ۔ اس زمانہ میں تو تاجروں نے بھی اپنی تنظیم قائم کی ہوئی ہے ۔ صنّاعوں نے بھی اپنی تنظیم قائم کی ہوئی ہے ۔ مزدوروں نے بھی اپنی تنظیم قائم کی ہوئی ہے ۔ اور سرمایہ داروں نے بھی اپنی تنظیم قائم کی ہوئی ہے ۔ بلکہ چوروں اور ڈاکوؤں اور عورتوں اور بچوں کو اغوا کرنے والوں کے بھی منظم گروہ پائے جاتے ہیں ۔ اسی طرح کُفر کا بھی اسلام پر ایک تنظیم کے ماتحت حملہ ہو رہا ہے ۔ مگر جہاں شیطانی لشکر اپنی تنظیم میں مشغول ہے آسمان کے

ھ نزول المسیح ص۳۸ ھ ص۳۹ تا ص۴۲

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ

کیا ان کو معلوم نہیں کہ ہم نے رات کو اس لئے بنایا ہے کہ وہ اُس میں آرام حاصل کریں اور

النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۷﴾

دن کو دیکھنے کی طاقت دینے والا بنایا۔ اِس میں یقیناً مومن قوم کے لئے بڑے نشان ہیں۔ ۸۷

فرشتے بھی خاموش نہیں اور وہ بھی تباہی کی تیاریوں میں معروف ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ۔ ایک دن یہ عذاب اُن کے گھروں تک پہنچ جائیگا اور خدا تعالیٰ کی پیشگوئیاں پوری ہو جائینگی۔ یعنی اسلام غالب آجائیگا اور کفر کی صف ہمیشہ کے لئے لپیٹ دی جائیگی تب اُن کی زبانیں بند ہو جائیں گی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دینے والے یا تو آپؐ پر درود اور سلام بھیجنے لگ جائیں گے یا تباہی اور بربادی کا شکار ہو جائیں گے۔

۸۷ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ کیا مسلمانوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ ہم جو ان پر رات یعنی نبوت سے بُعد کا زمانہ لائے تھے تو اس لئے لائے تھے کہ وہ اُس میں نئی روحانی طاقتیں حاصل کریں اور ظلمت کے مقابلہ کے لئے ہر جگہ نورانی قندیلیں روشن کریں لیکن انہوں نے ثواب کے اس عظیم الشان موقعہ سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اب ہم اُن کے لئے دن چڑھائیں گے۔ یعنی اپنا ایک مامور اُن میں مبعوث کریں گے۔ اور یہ دن اس لئے چڑھیگا تا وہ حق و باطل میں تمیز کر سکیں۔ لیکن اِس سے فائدہ صرف مومن اُٹھائیں گے جن کے دل مر چکے ہونگے وہ پھر بھی پُرانی تاریکیوں میں ہی پڑے رہیں گے۔

اسجگہ رات اور دن کے چکر کی مثال دے کر اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے متواتر کام نہیں کر سکتا۔ اگر اُسے متواتر کام پر لگا دیا جائے تو ایک وقت ایسا آئیگا کہ وہ تھک جائیگا اور پھر بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔ انسان کی اِس کمزوری کو ڈھانپنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رات بنائی ہے۔ جو اُسے دوبارہ کام کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ یہی حالت روحانی ترقیات کی بھی ہے۔ انسان پر ایسے وقت بھی آتے ہیں جب اُس کی روحانیت قبض کی حالت میں ہوتی ہے۔ اور اُس پر ایسے وقت بھی آتے ہیں جب اُس کی روحانیت پر بسط کی حالت ہوتی ہے۔ ایک معمولی درجہ کے مومن پر بھی کوئی وقت ایسا آتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے مل گیا ہے اور اُس کا خدا اس کے سامنے ہے اور وہ اپنے سارے جلال اور ساری شان و شوکت کے ساتھ اُس پر ظاہر ہو رہا ہے۔ اور دوسرے وقت میں وہی مومن اپنی نماز کو کھڑا کرنے میں مشغول ہوتا ہے۔ وہ اُسے کھڑا کرتا ہے مگر وہ گرتی ہے۔ وہ اُسے پھر کھڑا کرتا ہے اور وہ پھر گرتی ہے۔ وہ پھر کھڑا کرتا ہے۔ اور وہ پھر گرتی ہے۔ اور یہ حالت معمولی درجہ کے مومن کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ اونچے درجے کے مومن بھی اپنے اپنے مدارج کے لحاظ سے اس حالت میں سے گذرتے ہیں اور اُن پر بھی رات اور دن کی طرح قبض اور بسط کی کیفیات وارد ہوتی رہتی ہیں۔ اگر

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ

اور اُس دن (کو بھی یاد کرو) جس دن بگل میں ہوا پھونکی جائیگی جس کے نتیجہ میں آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے گھبرا اُٹھیگا۔ سوائے اس کے

فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۸﴾

جس کے متعلق اللہ (تعالیٰ) چاہیگا (کہ وہ گھبراہٹ سے محفوظ رہے) اور سب کے سب اُس (یعنی خدا) کے حضور مطیع و فرمانبردار ہو کر آئینگے ۳۸

اُس پر ہمیشہ قبض کی حالت رہے تو اس کا دل مرجائے اور وہ روحانیت سے محروم ہو جائے اور اگر اس پر ہمیشہ بسط کی حالت رہے تو وہ عادتاً عبادت کرنے لگ جائے اور اس کی نیکیوں کے پیچھے عزم و ارادہ اور خواہش باقی نہ رہے۔ پس انسانی مقام کو قائم رکھنے کے لئے اور اس لئے کہ نیکی کرتے ہوئے اس کا ارادہ اور عزم بھی قائم رہے اور اس کی توجہ بھی قائم رہے ہر مومن پر خواہ اس کا مقام بڑا ہو یا چھوٹا رات اور دن کی طرح لہروں کا زمانہ آتا رہتا ہے۔ اور ہر مومن اپنے اپنے مقام کے لحاظ سے کبھی اونچا اٹھتا ہے اور کبھی نیچے گرتا ہے مگر ہر دفعہ جب وہ اونچا اٹھتا ہے تو پہلے مقام سے اوپر چلا جاتا ہے اور جب نیچے گرتا ہے تو اس وقت بھی اُس کا قدم پہلے مقام سے اوپر چلا جاتا ہے۔ گویا قبض اور بسط کا سلسلہ اُسے ہمیشہ ترقی کی طرف ہی لے جاتا ہے۔ تنزل کی طرف نہیں لے جاتا۔ پھر یہ اتار چڑھاؤ کا سلسلہ صرف روحانی کیفیات میں ہی نہیں بلکہ قومی حالات میں بھی جاری رہتا ہے۔ بعض قوموں پر بھی کبھی قبض کی حالت آتی ہے اور کبھی بسط کی۔ کبھی قوم پر ابتلاؤں کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہوتی ہیں اور کبھی اُس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارش ہو رہی ہوتی ہے کبھی اُس پر کامیابی کا سورج طلوع ہوتا ہے اور کبھی رات کی تاریکی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ کبھی قوم کے اندر نشو و نما کا جوش ہوتا ہے اور کبھی غفلت طاری ہو جاتی اور اُس

کے اندر آرام کرنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرحال جب تک کوئی قوم اپنے مقام کی بلندی اور پستی کے درمیان چکر کھاتی رہتی ہے وہ گرتی نہیں۔ کیونکہ یہ قبض اور بسط کی حالت ہر انسان اور ہر قوم کے لئے مقدّر ہے۔ مگر جب کوئی قوم یا انسان اپنے مقام سے گر کر نچلے درجہ میں چلا جائے تو پھر اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی طرف توجہ دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کی مثال ہمارے سامنے پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم رات سے بھی فائدہ اٹھاؤ اور دن سے بھی تم پر قبض کی حالت طاری ہو تو وہ بھی تمہیں ترقی کی طرف لے جانے والی ہو اور تم پر بسط کی حالت طاری ہو تو وہ بھی تمہارے مقام کو اونچا کرنے والی ہو۔

۸۸ حل لغات :۔ فَزِعَ : فَزِعَ فَزَعًا کے معنے ہیں خَافَ وَ ذُعِرَ۔ ڈر گیا اور ہیبت زدہ ہو گیا (اقرب)

دَاخِرِيْنَ : دَخَرَ سے اسم فاعل ہے۔ اور دَخَرَ وَ دَخِرَ دُخُوْرًا وَ دَخَرًا کے معنے ہیں ذَلَّ وَ صَغُرَ۔ ذلیل اور حقیر ہوا۔ (اقرب)

تفسیر :۔ فرمایا۔ تم اُس دن کو یاد کرو جس دن صُور پھونکا جائیگا۔ اور آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے ڈر جائیگا۔ بگل چونکہ فوجوں کو جمع کرنے کے لئے بجایا جاتا ہے اس لئے یہاں تمثیلی طور پر بگل کا

فَزِعَ ۲

دَاخِرِيْنَ ۲

ذکر کیا۔ اور بتایا کہ وہ دن قریب ہے جب تمام قوموں کو ایک دوسرے کے مقابل پر کھڑا کر دیا جائیگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی رہتے ہیں سب گھبرا اُٹھیں گے۔

اِس آیت میں ہوائی جہازوں اور ایٹم بموں کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز آسمان میں اُڑتے ہیں اور ایٹم بم زمین میں پھٹ کر زمین میں رہنے والوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ اور پھر آتشین مادے کو آسمان کی طرف دھکیل دیتا ہے۔

اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ میں بتایا کہ باوجود اس کے کہ یہ تباہی عام ہوگی پھر بھی خدا تعالیٰ کے حضور دُعا کا رستہ کھلا رہے گا۔ اور جو خدا تعالیٰ کو خوش کر سکیگا وہ اس تباہی سے محفوظ رہے گا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ سائنسدانوں نے اپنی کوششوں اور تدبیروں کے ساتھ موت کے ذریعہ کو معلوم کر لیا ہے۔ مگر اسلام کو قائم کرنے والا وہ خدا ہے جس کے ہاتھ میں موت بھی ہے اور حیات بھی وہ موت کے ذریعہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا پر حاکم ہوگئے ہیں۔ حالانکہ اصل حاکم وہ ہے جس کے قبضہ میں موت اور حیات دونوں ہیں اور اس نے بتایا ہے کہ اگر لوگ دعاؤں سے کام لیتے رہیں گے تو وہ اس تباہی سے بچاؤ کا کوئی نہ کوئی سامان پیدا فرما دیگا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایٹم بم بظاہر قیامت کا ایک نشان نظر آتا ہے مگر قیامت خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے اس نے یہ قیامت نہ روس کے ہاتھ میں رکھی ہے اور نہ امریکہ کے ہاتھ میں۔ چند سال ہوئے روس کا ایک سائنسدان جو ایٹم بم سے تعلق رکھنے والی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا انچارج تھا مجھے ملا۔ میں نے اُسے یہی کہا کہ تم تو کہتے ہو کہ ہم پبلک کو فائدہ پہنچانے کے لئے کام کرتے ہیں مگر تم نے جو ایٹم بم بنایا ہے اُس کا کیا فائدہ ہے؟ اگر تم ایٹم بم گرا دو تو امریکہ تباہ ہو جائیگا اور اگر پہلے امریکہ گرا دے تو روس تباہ ہو جائیگا۔ مگر امریکہ یا روس کی تباہی سے پبلک کو کیا فائدہ۔ تمہیں تو پبلک کا فائدہ سوچنا چاہیئے۔ اور ایٹم بم کا کوئی توڑ پیش کرنا چاہیئے۔ تا دنیا اس سے محفوظ رہ سکے وہ کہنے لگا۔ اس کا کوئی توڑ نہیں نکلا اور نہ ہمارے ذہن میں اس کا کوئی توڑ آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کا توڑ خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہُوا ہے اور جب وہ لوگوں کو بچانا چاہیگا تو وہ اس کا کوئی نہ کوئی توڑ پیدا کر دیگا۔ بانی سلسلہ احمدیہ کے جو الہامات چھپے ہوئے ہیں۔ اُن میں ایک جگہ کچھ ہندسے درج ہیں (تذکرہ ص ۲۰۲) اور ساتھ ہی ایک نقشہ دیا گیا ہے۔ بعض احمدی سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اِس میں جو خول بنے ہوئے ہیں یہ بالکل وہی ہیں جو ہائیڈروجن بم میں استعمال ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ نقشہ آج سے قریباً ساٹھ سال پہلے کا ہے۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰة والسلام کو اتنا عرصہ پہلے اِس طرف توجہ دلائی گئی تھی اور انہیں بتایا گیا تھا کہ ایسی ایجاد ہونے والی ہے تو جس خدا نے اپنے بندوں کو اس ایجاد کی توفیق دی وہ لوگوں کو اس سے بچانے کا بھی کوئی نہ کوئی سامان پیدا کر دے گا۔

مجھے بھی ایک دفعہ ایک گیس کے متعلق خبر دی گئی تھی۔ چنانچہ مَیں نے رؤیا میں دیکھا کہ مَیں ایک کمرہ میں بیٹھا ہُوا ہوں کہ کسی شخص نے ایک گیس پھینکی۔ مَیں نے اُس گیس کو سونگھ کر کہا کہ اِس میں تو کلورین کی بُو آ رہی ہے اور پھر اس کا خیال کرتے ہی مَیں باہر کی طرف بھاگا۔ (آنکھ کھلنے کے بعد مَیں نے بعض سائنسدانوں سے اسکا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ بیہوش کرنیوالی گیس بھی کلورین سے ہی بنتی ہے مگر مَیں نے جو خواب میں گیس دیکھی تھی

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ط

اور تو پہاڑوں کو اس صورت میں دیکھتا ہے کہ وہ اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چل رہے ہیں ۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ط اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ

یہ اللہ (تعالیٰ) کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا ہے ۔ وہ تمہارے

بِمَا تَفْعَلُوْنَ (۸۹)

اعمال سے خوب خبردار ہے ۔ ۵۳۹

وہ عارضی بیہوش کرنے والی تھی) اس کے بعد مجھ پر سے بھی اثر جاتا رہا ۔ اور دوسرے لوگوں پر بھی کوئی اثر نہ رہا ۔ اس رؤیا سے بھی میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ایسے سامان پیدا کر دے گا کہ جن کے نتیجہ میں دشمن پر فوقیت بھی حاصل ہو جائیگی اور عام تباہی بھی نہیں آئیگی ۔ مگر اس کا ذریعہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی جائے ۔ اور دعاؤں سے اُس کی مدد اور نصرت حاصل کی جائے ۔

مَیں جب بیماری کے علاج کے سلسلہ میں یورپ گیا تو جماعت احمدیہ لنڈن کی طرف سے میرے اعزاز میں ایک دعوت کا انتظام کیا گیا ۔ جس میں لنڈن کے مسٹر۔ پاکستان کے ہائی کمشنر ۔ پارلیمنٹ کے ممبر اور کئی سربرآوردہ لوگ شامل ہوئے ۔ مَیں نے اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے یورپین باشندوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ ایٹم بم کی ایجاد کی وجہ سے آجکل لوگوں کے دلوں میں بڑی گھبراہٹ پائی جاتی ہے اور وہ حیران ہیں کہ آئندہ دنیا کی سلامتی کی کیا راہ ہوگی ۔ انہیں سوچنا چاہیئے کہ ایٹم بم کا علم آج سے بیس سال پہلے کہاں تھا ۔ اُس وقت تو کسی کو پتہ بھی نہیں تھا کہ ایسی ایجاد ہو سکتی ہے لیکن پھر علوم نے ایسی ترقی کی کہ ایٹم بم نکال لیا گیا ۔ اب جس خدا نے اپنے بندوں کو ایٹم بم بنانے کا علم دیا ہے کیا وہ اس کا توڑ پیدا نہیں کر سکتا ۔ مَیں نے کہا مَیں تو ایک مذہبی آدمی ہوں اور مذہبی آدمی ہونے کی وجہ سے اگر مجھ سے کوئی سوال کرے کہ آیا ایٹم بم کے نکلنے کے بعد کوئی اس کا توڑ بھی پیدا کر سکتا ہے یا نہیں تو میرا جواب یہی ہوگا کہ ہاں ۔ ایٹم بم کا علم خدا نے ہی اپنے بندوں کو دیا ہے اور اگر وہ کسی وقت اپنے بندوں کو اس کا توڑ بھی سمجھا دے تو اس کے فضل سے یہ کوئی بعید بات نہیں ۔ مگر اس فضل کے حصول کا یہی طریق ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کی جائے اور اس سے دعائیں مانگی جائیں اور اس امر پر یقین رکھا جائے کہ ایٹم بم کا نکالنے والا خدا اس کا کوئی نہ کوئی توڑ بھی پیدا کر دیگا اور دنیا کے امن کا سامان پیدا فرما دیگا ۔

وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِیْنَ میں بتایا کہ سب کے سب اُس کے حضور مطیع و فرمانبردار ہو کر حاضر ہونگے یعنی کافر سزا پا کر اور مومن یقین و ایمان سے مخمور ہو کر ۔

۵۳۹ تفسیر :- فرماتا ہے تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ کھڑے ہیں ۔ حالانکہ وہ اس طرح اُڑتے چلے جا رہے ہیں جس طرح بادل ۔ یہ خدا تعالیٰ کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو نہایت مضبوط بنایا ہے

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ

جو کوئی نیکی کرے گا اُس کو اُس سے بہتر بدلہ ملے گا اور ایسے لوگ

فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۹۰﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ

اُس دن کے خوف سے (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) محفوظ رہیں گے ۔ اور جو لوگ بُرے عمل لیکر خدا کی خدمت میں حاضر ہونگے

فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۭ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا

اُن کے سرداروں کو دوزخ میں اوندھا کر کے گرا دیا جائیگا ۔ اور کہا جائیگا کہ کیا تمہاری جزا

مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۱﴾

تمہارے عمل کے مطابق نہیں؟ ۴۰ھ

اور وہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے ۔

تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ سے یہ مراد نہیں کہ پہاڑ الگ چلتے ہیں اور زمین الگ چلتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمین چلتی ہے تو وہ بھی اُس کے ساتھ چلتے ہیں ۔ اور جس طرح زمین بادلوں کو اپنے ساتھ کھینچے چلی جاتی ہے ۔ اسی طرح وہ پہاڑوں کو بھی اپنے ساتھ اُٹھائے چلی جاتی ہے ۔

اِس آیت میں ظاہری طور پر تو پہاڑوں کے چلنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بادلوں کے ساتھ اُنکی مثال بہت بیان کی گئی ہے لیکن باطنی طور پر اس میں بڑی بڑی حکومتوں کی تباہی کی خبر دی گئی ہے ۔ اور بتایا گیا ہے کہ تمہیں تو اپنے زمانہ کی حکومتیں ایسی مضبوط دکھائی دیتی ہیں کہ تم سمجھتے ہو وہ صدیوں تک بھی تباہ نہیں ہو سکتیں مگر خدا تعالیٰ اسلام کی شوکت ظاہر کرنے کے لئے ان کو اِس طرح اُڑائیگا کہ ان کا نشان تک بھی نظر نہیں آئیگا ۔ چنانچہ اِس کی مثال دیتے ہوئے بتایا کہ جس طرح ہوائیں بادلوں کو اُڑا کر لے جاتی ہیں اِسی طرح جب اسلام کی تائید میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوائیں چلنی شروع ہوئیں تو کفر و شرک کے بڑے بڑے دیو قامت پیکر اس طرح اُڑیں گے کہ اُن کا نشان بھی دکھائی نہیں دیگا ۔ مگر یہ سب کچھ انسانی تدابیر سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے ہوگا ۔ اور اُس کی قدرت اور صنعت کا اس سے ظہور ہوگا ۔ آخر میں فرمایا کہ اِنَّهٗ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ یہ عظیم الشان انقلاب اِس صورت میں آ سکتا ہے جبکہ مسلمان بھی اپنے اندر انقلاب پیدا کریں ۔ اگر تم اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کروگے اور خدا تعالیٰ کی نگاہ میں ظالم ہوگے تو خدا تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ایک ظالم کو مٹا کر دوسرا ظالم اُس کی جگہ بٹھا دے۔ خدا تعالےٰ اُسی صورت میں ان پہاڑوں کو اُڑائیگا جب تم اپنے آپ کو اسلامی احکام کا نمونہ بناؤگے ۔ اور اللہ تعالےٰ کی رضا اور اُس کی خوشنودی کا مقام حاصل کر لوگے ۔

کُبَّتْ ۲

۴۰ھ حل لغات: ۔ کُبَّتْ : کَبَّ کَبًّا کے معنے ہیں قَلَبَهٗ عَلٰی رَاْسِهٖ ۔ برتن کو سر کے بل اُلٹا دیا۔ کَبَّ زَيْدًا عَلٰى وَجْهِهٖ وَ لِوَجْهِهٖ کے معنے ہیں صَرَعَهٗ زید کو پچھاڑ دیا (اقرب) پس کُبَّتْ کے معنے ہونگے

اُن کو اُلٹا یا جائیگا یا پچھاڑا جائیگا۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ تم میں سے جو شخص نیک اعمال بجا لائیگا اُسے اپنی نیکیوں سے بہت بہتر بدلہ ملیگا اور ایسے ہی لوگ اُس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن جو لوگ برائیوں میں ملوث ہونگے وہ جہنم میں اوندھے مُنہ گرا دیئے جائیں گے۔ اور اُن سے پوچھا جائیگا کہ بتاؤ کیا یہ جزا تمہارے اعمال کے مطابق ہے یا نہیں۔

اس آیت میں اسلامی تعلیم کا ایک بڑا اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ آریہ مذہب نجات کے بارہ میں یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب نیکیوں کی جزا دیتا ہے تو وہ ہر ایک روح کا کوئی نہ کوئی گناہ رکھ لیتا ہے جس کی سزا اُسے بعد میں دی جاتی ہے۔ وہ پہلے انسانی رُوح کو نجات دے دیتا ہے اور اُسے جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد پھر اس گناہ کی وجہ سے جو اُس نے کیا ہوتا ہے اور جسکی سزا ابھی اُسے نہیں ملی ہوتی پھر اُسے مختلف جونوں کے چکر میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا جاتا ہے گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ بھی ان ہندو مہاجنوں کی طرح ہے جو قرض کا ایک حصہ تو وصول کر لیتے ہیں لیکن کچھ تھوڑا سا باقی رہنے دیتے ہیں تاکہ سود کا سلسلہ جاری رہے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد وہ پھر سود سمیت ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے بھی نعوذ باللہ دنیا کا سلسلہ اسی رنگ میں جاری کیا ہوا ہے۔ کہ پہلے تو وہ نیک اعمال کی انسان کو جزا دے دیتا ہے اور پھر کسی بُرے عمل کی سزا میں اُسے دُنیا میں مختلف جونوں کی شکل میں لوٹاتا رہتا ہے۔ مگر قرآن کریم اس عقیدہ کو کلیتہً ردّ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رُوح اور مادہ کا خالق خدا جتنی روحیں اور جتنا مادہ جب چاہے صرف ایک کُن کہنے سے پیدا کر سکتا ہے۔ اُسے رُوحوں کے ساتھ آریوں کا بتایا ہوا تمسخر کرنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ گو انسان کی نیکی محدود ہے مگر اس کا ارادہ محدود نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے عمل سے بہت زیادہ بدلہ دیگا۔ اور سزا کے دن خواہ دنیا میں آئے یا آخرت میں مومنوں کو محفوظ رکھے گا۔ اور یہ نہیں دیکھے گا کہ اُن کے عمل حقیر تھے۔ بلکہ وہ اپنے فضل سے انہیں دائمی نجات عطا فرمائیگا۔ ہاں جو لوگ بدیاں کرتے تھے اُن کو آگ میں اوندھے مُنہ گرا دیا جائیگا۔ اور کہا جائیگا کہ کیا تمہارے عملوں کے مطابق تم کو جزا نہیں مل رہی؟ یعنی بدی کی جزا بہرحال عمل کے مطابق ہو گی زیادہ نہیں ہو گی۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ اس بارہ میں وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ع[19]) میری رحمت ہر چیز پر غالب ہے۔ حتّٰی کہ شدید ترین مخالف کی مخالفت اور دشمنی پر بھی غالب ہے۔ پس اس آیت کے ماتحت بد سے بدتر انسان بھی خدا تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہو جائیگا اور آخر جنت کے دروازے اُس کے لئے کھل جائیں گے۔ یہ مضمون تو اُخروی حیات کے لحاظ سے ہے۔ دنیوی نقطۂ نگاہ سے اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو افراد اسلام کے دوبارہ احیاء کے لئے قربانیاں کریں گے انہیں اپنی ان قربانیوں کا جب بدلہ ملیگا تو وہ ایسا حیرت انگیز ہوگا کہ اس کے مقابلہ میں اُن کی قربانیاں کوئی بھی حیثیت نہیں رکھینگی چنانچہ دیکھ لو بیشک حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اسلام کے لئے بڑی قربانیاں کیں۔ لیکن آج وہ دوبارہ زندہ ہو جائیں اور وہ دنیا کے گلی کوچوں میں سے گذرتے ہوئے سُنیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے یوں فرمایا ہے۔ حضرت عمرؓ نے یوں فرمایا ہے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے یوں فرمایا ہے۔ اور

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ

مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ مَیں اس شہر (یعنی مکّہ) کے رب کی جس کو اُس (یعنی اللہ) نے معزز بنا دیا ہے عبادت کروں اور ہر چیز

كُلُّ شَيْءٍ ۡ وَّ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۲﴾ وَاَنْ

اُسی کے قبضہ میں ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ مَیں فرمانبرداروں میں سے ہو جاؤں - اور یہ بھی کہ

دوسری طرف وہ یہ دیکھیں کہ کچھ لوگ اپنے ہاتھوں میں لٹھ لئے چلے جا رہے ہیں اور غصہ سے اُنکی آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں۔ اور جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا وجہ ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو فلاں شخص نے بُرا بھلا کہا ہے یا حضرت عمرؓ کو بُرا بھلا کہا ہے یا حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو بُرا بھلا کہا ہے تو مَیں سمجھتا ہوں اُن کو اپنی قربانیاں اس لازوال عزت اور شہرت کے مقابلہ میں بالکل حقیر نظر آنے لگیں گی - اور وہ خیال کرنے لگیں گے کہ ہم نے کوئی قربانی نہیں کی -

حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایک صحابیؓ شہید ہوئے۔ آپ نے انکے بیٹے کو دیکھا کہ وہ سر نیچے ڈالے ہوئے افسردگی کی حالت میں جا رہا ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے - اُس نے کہا یا رسول اللہ! میرا باپ شہید ہوگیا ہے اور پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اُن کے خیال سے میں متفکر ہوں۔ آپؐ نے فرمایا - اگر تمہیں علم ہوتا کہ تمہارے باپ سے اللہ تعالیٰ نے کیا سلوک کیا ہے تو تم اس طرح افسردہ نہ ہوتے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ کی رُوح کو اپنے سامنے حاضر کیا اور کہا۔ مَیں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم جو کچھ مانگنا چاہتے ہو مانگو - مَیں تمہاری ہر خواہش کو پورا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس پر تمہارے باپ نے کہا کہ خدایا میری صرف اتنی خواہش ہے کہ مجھے دوبارہ زندہ کرکے دنیا میں بھیجا جائے تا مَیں پھر اسلام کی خدمت کرتا ہُوا مارا جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے اپنی جان ہی کی قسم ہے کہ اگر مَیں نے یہ قانون نہ بنا دیا ہوتا کہ مَیں کسی انسان کو دوبارہ دُنیا میں واپس نہیں بھیجوں گا - تو مَیں تیری اِس خواہش کو ضرور پورا کر دیتا[1]۔

غرض یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو وقت سے پہلے قربانیاں بڑی بھاری اور گراں نظر آتی ہیں مگر جب اُن قربانیوں کا نتیجہ نکلتا ہے تو اُسے اپنی قربانیاں بالکل حقیر نظر آنے لگتی ہیں۔ ہر طالب علم جو سکول جاتا ہے وہ اپنا سکول جانا کتنی مصیبت سمجھتا ہے - لیکن تمہیں کوئی طالب علم ایسا نظر نہیں آئیگا جو اپنی گذشتہ محنت پر افسوس کا اظہار کرتا ہو - بلکہ جب اُس کی محنت کا نتیجہ نکلتا ہے اور وہ دنیا میں بڑے بڑے مراتب حاصل کرتا ہے تو اُسے اپنی محنت بالکل حقیر نظر آتی ہے -

یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ جو شخص نیک اعمال بجا لائیگا اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا بدلہ ملیگا جو اُس کی قربانیوں سے

---

[1] ترمذی جلد ۲ ابواب التفسیر زیر آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا -

اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ

مَیں قرآن پڑھ کر سُناؤں۔ پس جو اُسے سُن کر ہدایت پا جائیگا تو اُس کا ہدایت پانا صرف اُسی کی جان کے

لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

کام آئیگا۔ اور جو اُسے سُن کر گمراہ ہو جائیگا تو تو اُسے کہہ دے کہ مَیں صرف ایک ہوشیار کرنیوالا (وجود) ہوں [۴۱]

ہزاروں گُنا افضل ہوگا۔ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی اس سکیم کے راستہ میں روک بن کر کھڑا ہوگا۔ وہ اپنے مُنہ کے بل گر یگا اور ناکامی و نامرادی کا جہنم اُسے جُھلس کر رکھ دیگا اور وہ اور اُسکی آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کی برکات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گی۔

۴۱ تفسیر:- ان آیات میں بتایا کہ خدا تعالیٰ نے مختلف مقامات کو اپنی تجلیات کا مرکز بنایا ہے کبھی وہ نوحؑ کے ذریعہ جُودی سے ظاہر ہُوا۔ کبھی ابراہیمؑ کے ذریعہ مکہ مکرمہ سے ظاہر ہُوا۔ کبھی موسیٰؑ کے ذریعہ سینا سے ظاہر ہُوا۔ کبھی عیسیٰؑ کے ذریعہ جبل زیتون سے ظاہر ہُوا۔ لیکن مجھے اُس نے یہ حکم دیا ہے کہ مَیں اس شہر کے ربّ کی عبادت کروں یعنی اُس جلوہ کے پیچھے چلوں جو مکہ مکرمہ میں حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ ظاہر ہُوا تھا۔ اور جس نے اس شہر کو عزت اور حفاظت بخشی تھی۔ اور اس بات کا اعلان کروں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ کہوں کہ مجھے صرف باتیں بنانے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ میں عملاً فرمانبرداری کا نمونہ بن کر دکھاؤں۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ اسلام اُس مذہب کا نام ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم کو ملا ہے۔ اور مسلم کے نام سے وہی لوگ پکارے جاتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر ایمان لاکر آپؐ کو اپنا مقتداء اور پیشوا مانتے ہیں لیکن قرآن کریم نے محاورہ کے طور پر دوسرے انبیاء اور اُن کے سچے متبعین کو بھی مسلم کے لفظ سے یاد کیا ہے[۵]۔ یہ ظاہر ہے کہ ان سب کا مسلمان ہونا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر بعد از ظہور ایمان لانے کی وجہ سے تو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُن کے سامنے تو نہ قرآن مجید کی شکل میں کامل شریعت موجود تھی اور نہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت معرضِ وجود میں آئی تھی۔ دراصل قرآنی محاورہ کے رو سے اُن کا مسلمان قرار پانا صاف اشارہ کر رہا ہے کہ اسلام کے دو معنے ہیں ایک تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ماننے والا مسلمان ہے اور دوسرے وہ شخص بھی مسلمان کہلاتا ہے جو مطیع اور فرمانبردار ہو۔ چنانچہ مسلمان کی مؤخر الذکر حیثیت کے اعتبار سے ہی ہر وہ شخص جو مطیع و فرمانبردار تھا خواہ وہ آدمؑ کا فرمانبردار تھا یا نوحؑ کا فرمانبردار تھا یا ابراہیمؑ کا فرمانبردار تھا یا موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا فرمانبردار تھا وہ مسلمان تھا۔ لیکن مسلمانوں کو دو قسم کا اسلام حاصل ہے ایک تو اس اعتبار سے وہ مسلمان ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کا نام ہی مسلم رکھا گیا ہے۔ دوسرے اطاعت و فرمانبرداری کی اُس رُوح کے اعتبار سے بھی وہ مسلم ہیں جو ہر نبی کے متبعین کے لئے دنیا میں وجہ امتیاز بنی۔ پس تمام دوسرے انبیاء کی جماعتوں پر

[۵] دیکھو آل عمران آیت ۶۸ و یوسف آیت ۱۰۲ و بقرۃ آیت ۱۲۹ و بقرۃ آیت ۱۳۳۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ

اور یہ بھی کہدے کہ اللہ ہی سب تعریفوں کا مستحق ہے وہ تم کو اپنے نشان دکھائیگا یہاں تک کہ تم انکو پہچان لوگے

وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ ع

اور تمہارا رب تمہارے عمل سے غافل نہیں۔ ۴۲ھ

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی جماعت کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ دوہرے مسلم ہیں۔ انبیاء کی جماعتیں اطاعت و فرمانبرداری کے باعث تو مسلم ہوتی ہی ہیں لیکن اللہ تعالےٰ نے اس کے علاوہ خاص طور پر ہمارا نام بھی مسلم رکھا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جب کسی کا نام رکھتا ہے تو وہ بندوں کی طرح محض تفاول کے طور پر نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ قادر و توانا جب ارادہ کرتا ہے کہ کسی قوم کے افراد خاص خاص صفات کے حامل ہوں تبھی وہ انہیں کوئی مخصوص نام عطا کرتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ کا ہمیں مسلم کا لقب عطا فرمانا نہ صرف اس بات کا مقتضی ہے کہ ہم وہ صفات اپنے اندر پیدا کریں جنکا یہ نام متحمل ہے۔ بلکہ اس میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے اطاعت و فرمانبرداری کے اعلیٰ معیار پر قائم ہوتے ہوئے جب بھی دینی اور دنیوی اعتبار سے بڑھنے اور ترقی کرنے کی کوشش کریں گے تو خدا تعالےٰ انہیں اعلیٰ درجات سے ضرور نوازے گا۔ پس حقیقی اسلام کے یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے احکام کی کامل فرمانبرداری اور اطاعت کی روح ہمارے اندر اس طرح رچی ہوئی ہو کہ اس کی مرضی اور منشاء کے خلاف کوئی ایک قدم اٹھانا بھی ہمارے لئے ناممکن ہو تاکہ ہم محض نام کے اعتبار سے ہی مسلمان نہ کہلائیں بلکہ ہمارا عمل اور ہمارا کردار بھی اس بات کی گواہی دے کہ فی الواقع ہم اس نام کے مستحق ہیں اور ہمارا اٹھنا اور ہمارا بیٹھنا اور ہمارا چلنا اور ہمارا پھرنا غرض ہماری ہر حرکت اور ہمارا ہر سکون اس نام کے شایانِ شان ہو۔

پھر فرماتا ہے وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ میں سب لوگوں کو قرآن کریم پڑھکر سُناؤں اور انہیں اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کروں۔ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَا اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ اسکے نتیجہ میں جو شخص ہدایت پائیگا اُس کا فائدہ اُسی کو پہنچے گا اور اگر وہ گمراہ ہو جائے تو مجھے یہ کہنے کا حکم ہے کہ میں کسی پر جبر نہیں کرونگا۔ صرف خدا کا پیغام پہنچاؤں گا آگے ہر شخص آزاد ہے وہ چاہے تو مان لے اور چاہے تو انکار کردے۔

۴۲ھ تفسیر:۔ آخر میں فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کہنے کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ سب تعریف اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔ یعنی اسلام جس خدا کو پیش کرتا ہے وہ ایک زندہ اور طاقتور خدا ہے اُس نے آدمؑ کے زمانہ میں بھی اپنے نشانات دکھائے اور نوحؑ کے زمانہ میں بھی اپنے نشانات دکھائے اور ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی اپنے نشانات دکھائے اور موسیٰؑ کے زمانہ میں بھی اپنے

ع ۷
۳

لہ سورۂ حج آیت ۷۹

اپنے نشانات دکھائے۔ اور داؤدؑ اور سلیمانؑ اور صالحؑ اور لوطؑ کے زمانے میں بھی اپنے نشانات دکھائے اور عیسیٰؑ کے زمانہ میں بھی اپنے نشانات دکھائے۔ اور جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اُن کی تائید میں بھی وہ اپنے نشانات دکھاتا رہا۔ اور پھر جب مسلمانوں پر تنزّل کا دَور آیا تو اسلام کے دوبارہ احیاء کے لئے اُس نے مسیح موعودؑ کو مبعوث فرما کر پھر اپنی قدرت اور جلال کے تازہ نشانات دکھانے شروع کر دیئے۔ پس تمام تعریفوں کی مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے ہر زمانہ میں اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔ اور ہر زمانہ میں نشانات کے ذریعہ دنیا کو اپنا چہرہ دکھایا۔ اگر وہ صرف آدمؑ یا نوحؑ یا ابراہیمؑ یا موسیٰؑ یا داؤدؑ یا سلیمانؑ یا عیسیٰؑ کے زمانہ تک اپنی قدرت نمائی کو ختم کر دیتا تو ہم یہ کس طرح کہہ سکتے تھے کہ الحمد للہ! ہمارا الحمد للہ کہنا اُسی صورت میں درست ہو سکتا ہے جبکہ ہم خود بھی اپنی ذات میں خدا تعالےٰ کے چمکتے ہوئے نشانات دیکھیں۔ اور ہر زمانہ میں اُس کی قدرتوں کا ظہور ہوتا چلا جائے۔ پس فرمایا تو دُنیا کو سُنا دے کہ اسلام ایک زندہ خدا پیش کرتا ہے۔ اگر تم اُس سے تعلّق پیدا کر لوگے تو وہ تمہیں ایسے نشانات دکھائیگا جس کے نتیجہ میں تم اپنی روحانی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کو دیکھ لوگے۔ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے غافل نہیں وہ جانتا ہے کہ تم اندھیروں میں پڑے ہو اور رسموں میں جکڑے ہوئے ہو پس وہ تمہیں آزاد کرنے کیلئے خود آسمان سے اُترے گا اور ایسے نشانات دکھائیگا جو تمہارے سامنے خدا تعالیٰ کے وجود کو ننگا کر کے کھڑا کر دینگے۔

سُوْرَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ قصص ۔ یہ سورۃ مکّی ہے ۔

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ تِسْعٌ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَّتِسْعَةُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اس کی نواسی (۸۹) آیات ہیں اور نو (۹) رکوع ہیں ۔

وقتِ نزول حسنؓ اور عکرمہؓ کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی ہے ۔ ریورنڈ وہیری بھی اس سورۃ کو مکی قرار دیتے ہیں ۔ لیکن مقاتل کے نزدیک اس میں چار آیات مدنی ہیں یعنی اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ سے لیکر سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ تک (آیت ۵۲ تا ۵۶) ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ آیات مدینہ میں نہیں بلکہ مکہ اور جحفہ کے درمیان اُتری تھیں ۔ اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ مکہ اور جحفہ کے درمیان نہیں بلکہ ہجرت مدینہ کے وقت عین جحفہ کے مقام پر ان آیات کا نزول ہُوا تھا ۔ لیکن ابن سلام کہتے ہیں کہ ہجرت کے وقت جحفہ مقام میں صرف اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ والی آیت نازل ہوئی تھی ۔ باقی تمام سورۃ مکی ہے (بحر محیط) ۔ عمر ابن محمد کہتے ہیں کہ یہ سورۃ مکہ سے مدینہ کی طرف سفر کے وقت نازل ہوئی تھی ۔ اس خیال کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ سورۃ مکی ہی سمجھنی چاہیئے کیونکہ ابھی ہجرت مکمل نہیں ہوئی تھی ۔

ریورنڈ وہیری کا خیال ہے کہ عمر ابن محمد کا یہ خیال اس وجہ سے ہے کہ اس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو پھر مکہ واپس لائیگا ۔ مگر وہیری کا یہ استدلال بہت کمزور ہے ۔ صحابہؓ تو وقت نزول کی بنیاد عام طور پر کسی تاریخی گواہی پر رکھتے ہیں ۔ پادری وہیری صاحب چونکہ اس بات کے قائل نہیں کہ قرآن کریم میں کوئی سچی پیشگوئیاں ہیں اس لئے وہ اپنے عقیدہ کے مطابق خود بخود کوئی وجہ تلاش کر لیتے ہیں حالانکہ جس کتاب میں پیشگوئیاں ہوتی ہیں وہ تو بعض دفعہ سو سو سال بعد کی خبر دے دیتی ہے ۔ چنانچہ اسی سورۃ میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود کی طرح جن کو اُس نے فرعون پر غالب کر دیا تھا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو بھی مکہ والوں پر غالب کر دیگا ۔ (آیت ۶) اور یہ بات ہجرت کے آخری سالوں میں جا کر پوری ہوئی ۔ اگر مذکورہ بالا آیت سے وہ استدلال ٹھیک ہے جو کہ وہیری نے کیا ہے تو پھر فتح مکہ کے مضمون سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ یہ سورۃ فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی ہے ۔ مگر یہ دونوں استدلال غلط ہیں ۔ اصل میں یہ دونوں پیشگوئیاں ہیں جو عالم الغیب خدا نے کئی سال پہلے مکہ میں بیان کر دی تھیں ۔ اور مختلف آیات کے مضمونوں سے تنزل کا وقت نکالنا ایک ڈھکوسلہ ہے ۔ جیسا کہ پہلے بار بار بیان ہو چکا ہے صحابہؓ عام طور پر وقتِ نزول تاریخ کی گواہی کی وجہ سے مقرر کرتے تھے نہ کہ آیتوں کے مضمون کی وجہ سے ۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ایک مانی ہوئی مکی سورۃ میں لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ کا آنا بتاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تھے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے ہجرت کی خبر دی اور پھر فتح مکہ کی بھی خبر دی ۔ رَآدُّكَ کے الفاظ بتاتے تھے کہ آپؐ مکہ سے جائینگے اور اِلٰى مَعَادٍ کے الفاظ بتاتے تھے کہ آپؐ مکہ واپس آئینگے پس یہ بات

قرآن کریم کی صداقت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

تعلق و ترتیب علامہ ابن حیان لکھتے ہیں کہ سورۃ نمل کا سورۃ قصص سے یہ تعلق ہے کہ سورۃ نمل کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی حمد کرنے کا حکم دیا تھا اور پھر فرمایا تھا کہ سَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ وہ تم کو اپنے نشانات دکھائیگا۔ اور ان نشانات سے مراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزات تھے جن کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا کیونکہ معجزات ظاہر کرنے والا درحقیقت خدا تعالیٰ کا وجود ہی تھا پس اگر وہ انبیاء کے معجزات کو اپنا نشان قرار دے دے تو یہ درست ہوگا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے سورۃ نمل میں جو نشانات دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس کے ثبوت میں اُس نے سورۃ قصص نازل کی اور اُس کے شروع میں ہی فرمادیا کہ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ اس سورۃ کی آیات ایک مدلّل کتاب کی آیات ہیں۔ اور اس طرح کفار کے سامنے اُس نے اپنے وعدہ کی صداقت کے ثبوت میں قرآن کریم کے کتاب مبین ہونے کے نشان کو پیش کردیا کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام معجزات میں سے سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہی ہے۔ لیکن مجھے علامہ ابن حیان کی اس تشریح سے کچھ اختلاف ہے۔ میرے نزدیک یہ تو صحیح ہے کہ سورۃ نمل کے آخر میں نشانات دکھانے کا ذکر ہے لیکن یہ درست نہیں کہ اس کے ثبوت میں قرآن کریم کے اعجاز کو پیش کیا گیا ہے بلکہ درحقیقت اس سورۃ میں ان نشانات میں سے بعض کا ذکر کرتے ہوئے ان کی وضاحت کی گئی ہے جن کے دکھانے کا سورۃ نمل میں وعدہ کیا گیا تھا۔ مثلاً مکہ والوں کے مظالم کے نتیجہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کی خبر دی گئی ہے اور پھر بتایا گیا ہے کہ ایک دن آپ مکہ فتح کریں گے۔ اور پھر اسی شہر میں فاتحانہ طور پر داخل ہونگے جس میں سے آپ کو نکالا جائیگا۔ گویا جو وعدہ سورۃ نمل میں کیا گیا تھا۔ اُسے سورۃ قصص میں پورا کردیا گیا ہے۔ اور ان نشانات کو بیان کردیا گیا ہے جن کے ذریعہ کفار پر حجّت تمام ہوتی تھی۔

اس سورۃ کا سورۃ نمل سے دوسرا تعلق یہ ہے کہ سورۃ نمل کے آخر میں فرمایا تھا وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۔ یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہیں قرآن کریم پڑھ کر سناؤں۔ پھر جو کوئی قرآن سنکر اس سے ہدایت پائیگا۔ اُس کی ہدایت کا اُسے ہی فائدہ پہنچیگا۔ اور جو کوئی اس سے پیٹھ پھیر کر چلا جائیگا اُس پر تجھے کوئی جبر کا اختیار نہیں دیا گیا۔ بلکہ تو کفار سے کہدے کہ مجھے تو صرف ہوشیار کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے زبردستی مسلمان بنانے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔

غرض سورۃ نمل کے آخر میں قرآن کریم پڑھ کر سنانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس حکم کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ قصص نازل کی اور اس کے شروع میں ہی فرمادیا کہ طٰسٓمّٓ یعنی خدائے لطیف سمیع اور مجید نے یہ سورۃ نازل کی ہے تاکہ اس وعدے کو پورا کیا جائے جو سورۃ نمل میں کیا گیا تھا اور انہیں ایک ایسی کتاب دی جائے جو سب مضمونوں کو کھول کر بیان کرنے والی ہو تاکہ دنیا کے ہر ملک اور ہر گوشے میں اسے پڑھا جائے اور قیامت تک آنے والی نسلیں اس کی روحانی راہنمائی سے مستفیض ہوتی رہیں۔

خلاصہ مضامین اس سورۃ کے ابتداء میں حروف مقطعات طٰسٓمّٓ بیان کئے گئے ہیں جن میں خدا تعالیٰ کے لطیف سمیع اور مالک یا مجید ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور پھر خدا تعالیٰ کے لطیف اور سمیع ہونے کی مثال کے طور پر حضرت موسیٰ

اور فرعون کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جو واقعہ ہم بیان کرینگے وہی سچّا ہوگا ۔ یعنی بائیبل میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں (آیت ۱ تا ۴)

فرماتا ہے فرعون نے بہت تکبّر سے کام لیا تھا ۔ اور رعایا میں شدید اختلاف پیدا کر دیا تھا ۔ وہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ہلاک کرتا اور اُن کی لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا اور اس طرح ان کی طاقت کو کچلنا چاہتا تھا لیکن ہم نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ لوگ جو ملک میں کمزور سمجھے جاتے ہیں اُن کو دنیا کا لیڈر بنا دیں اور انہیں ویسی ہی نعمتوں کا وارث بنا دیں جیسی فرعون کو حاصل تھیں ۔ اور فرعون اور ہامان دونوں کو وہ انجام دکھا دیں جس سے وہ ڈر رہے تھے ۔ (آیت ۵ تا ۷)

پھر موسیٰؑ کی پیدائش کا واقعہ بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ہم نے اُمِّ موسیٰؑ کو وحی کی کہ اسے بیشک دودھ پلاؤ مگر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ محسوس ہو تو اُسے دریا میں ڈال دے ۔ اُمّ موسیٰؑ نے ایسا ہی کیا ۔ اور اسے ٹوکرے میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا ۔ ٹوکرا بہتے بہتے فرعون کے محلّات کے پاس سے گذرا تو فرعون کے خاندان میں سے کسی نے اُسے اُٹھا لیا ۔ اور اس خاندان کی ایک عورت نے بادشاہ سے سفارش کرتے ہوئے کہا کہ اِسے قتل نہ کریں ممکن ہے یہ بڑا ہو کر ہمیں کوئی فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنالیں (آیت ۸ تا ۱۰)

اُدھر موسیٰؑ کی والدہ کا یہ حال تھا کہ جب اُس نے اپنے بیٹے کو سمندر میں ڈال دیا تو اس کے دل پر سے فکر و غم کا بوجھ اُتر گیا اور اس کی ایسی حالت ہوگئی کہ اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا کہ وہ اس راز کو ظاہر کر دیتی ۔ موسیٰؑ کی ماں نے اُس وقت موسیٰؑ کی بہن کو بلایا ۔ اور اُسے کہا کہ تُو اِس ٹوکرے کے پیچھے پیچھے جا اور دُور سے اسے دیکھتی رہ ۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا ۔ اور دُور سے ٹوکرے کو دیکھتی رہی ۔ لیکن فرعونیوں کو اس کا کوئی پتہ نہ چلا ۔

جب موسیٰؑ شاہی محلّات میں جا پہنچے اور انہیں دودھ پلانے کا سوال پیش آیا ۔ تو موسیٰ نے الٰہی تصرف کے تحت دوسری دائیوں کا دودھ پینے سے انکار کر دیا ۔ اِس پر موسیٰ کی بہن جو ساتھ ساتھ آئی تھی کہنے لگی کہ میں تمہیں ایک گھر کا پتہ دیتی ہوں جس کے افراد اِسے بخوشی پال لیں گے ۔ اور وہ اس کی ہر طرح نگہداشت رکھیں گے ۔ چنانچہ اس الٰہی تدبیر سے موسیٰؑ پھر اپنی ماں کی گود میں واپس آگئے اور اُس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی ۔ (آیت ۱۱ تا ۱۴)

جب موسیٰؑ اپنی روحانی بلوغت کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں صحیح فیصلہ کرنے کی قوت دی اور آسمانی علوم سے نوازا ۔ ایک دفعہ ایسا ہُوا کہ رات کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں گئے تو انہوں نے دو آدمیوں کو آپس میں دست و گریبان ہوتے دیکھا ۔ ایک ان کا ہم قوم تھا اور دوسرا اُنکی دشمن قوم کا فرد تھا ۔ موسیٰؑ کو دیکھ کر اُن کے ہم قوم شخص نے انہیں اپنی مدد کے لئے آواز دی ۔ جب موسیٰ علیہ السلام آئے تو انہوں نے دوسرے شخص کو ایک گھونسہ مار دیا جس کے لگتے ہی وہ شخص گرا اور گر کر مر گیا ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُس وقت اللہ تعالیٰ سے دُعا کی ۔ کہ اے میرے ربّ ! میرے اِس فعل پر جو مَیں نے اپنی قوم کے ایک مظلوم شخص کی مدد کے لئے کیا تھا ۔ مگر نادانستہ طور پر ایک آدمی مر گیا ۔ اپنے فضل سے پردہ ڈال دے ۔ اور مجھے اس کے بُرے نتائج سے محفوظ رکھ ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ گورنمنٹ کا کوئی آدمی اُس وقت نہ آیا اور معاملہ مخفی رہا ۔ دوسری صبح وہ پھر شہر میں آئے اور انہوں نے دیکھا کہ وہی شخص جس نے کل انہیں اپنی مدد کیلئے بلایا تھا ۔ آج پھر کسی شخص سے لڑ رہا ہے موسیٰؑ کو دیکھتے ہی اُس نے پھر آپ کو آواز دی ۔ حضرت

موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ آج بھی وہی شخص دوسرے سے لڑ رہا ہے تو انہوں نے سمجھا کہ یہ شخص بھی گرم مزاج اور لڑاکا معلوم ہوتا ہے۔ اور انہوں نے اُسے ملامت کرتے ہوئے کہا کہ تُو بھی بڑا جوشیلا اور تیز مزاج ہے کہ ہر وقت لڑتا رہتا ہے۔ مگر جب انہوں نے دوسرے شخص کو پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو اُن کے ہم قوم شخص نے غلطی سے یہ سمجھا کہ شاید موسیٰؑ آج مجھے مارنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور کہنے لگا۔ اے موسٰے! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ آج مجھے بھی اسی طرح مار دے جس طرح تُو نے کل ایک شخص کو مارا ہے۔ اُس کے اِس فقرہ سے اردگرد کے سب لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کل جو شخص مرا ہے اُسے موسیٰؑ نے ہی مارا تھا۔ اور چونکہ مقتول فرعونی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ (آیت ۱۵ تا ۲۰)

اسی دوران میں اچانک ایک شخص شہر کے دوسرے حصہ سے دوڑتا ہوا آیا۔ اور اُس نے موسیٰؑ سے کہا کہ اے موسیٰ! سردارانِ قوم تجھے قتل کرنے کا مشورہ کر رہے ہیں۔ اس لئے تو فوراً اس شہر سے نکل کر کسی اور جگہ چلا جا حضرت موسیٰ علیہ السلام اُسی وقت شہر سے نکل کر مدین کی طرف چل پڑے۔ وہ چاروں طرف احتیاط کے طور پر دیکھتے بھی جاتے تھے اور دُعا بھی کرتے جاتے تھے کہ الٰہی مجھے ظالم قوم کی شرارتوں سے نجات دے۔ (آیت ۲۱ و ۲۲)

آخر چلتے چلتے وہ مدین کے چشمہ پر پہنچے وہاں انہوں نے دیکھا۔ کہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں۔ اور دو لڑکیاں اپنے جانوروں کو روک کر الگ کھڑی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے دریافت کیا کہ وہ اِس طرح کیوں کھڑی ہیں۔ انہوں نے کہا۔ کہ جب تک سب لوگ اپنے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر واپس نہ لے جائیں ہم پانی نہیں پلایا کرتیں۔ کیونکہ ان اوباشوں کے گروہ میں ملنا ہمیں پسند نہیں۔ اور ہم خود اس لئے آتی ہیں کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے۔ وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگے بڑھ کر اُن کے جانوروں کو پانی پلا دیا اور پھر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ الٰہی میرے لئے خیر و برکت کے سامان مہیا فرما۔ (آیت ۲۳ تا ۲۵)

ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ اُن میں سے ایک لڑکی شرماتی ہوئی آئی۔ اور اُس نے کہا کہ میرا باپ آپکو بلاتا ہے تاکہ آپ کو اس نیک سلوک کی جو آپ نے ہمارے ساتھ کیا ہے جزا دے۔ وہاں پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تمام سرگذشت بیان کر دی۔ لڑکیوں کے باپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دی کہ اب کوئی فکر نہ کرو۔ ظالم قوم سے تم نجات پا چکے ہو۔ اسی دوران میں اُن میں ایک لڑکی نے کہا کہ اباجان! آپ انہیں ملازم رکھ لیں۔ یہ مضبوط بھی ہیں اور دیانت دار بھی۔ لڑکیوں کا باپ بھی اپنی لڑکیوں سے یہ ذکر سُنکر آپ کی دیانت کا قائل ہو چکا تھا اُس نے فوراً یہ تجویز پیش کر دی کہ اگر آپ آٹھ سال تک خدمت کریں تو مَیں ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک آپ سے نکاح کر دونگا۔ اور اگر آپ آٹھ کی بجائے دس سال تک خدمت کریں تو یہ آپ کا احسان سمجھا جائیگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس تجویز کو قبول کر لیا اور فرمایا کہ دونوں مدتوں میں سے جو میعاد بھی مَیں پوری کر سکا میرے لئے اس کا پورا کرنا جائز ہوگا۔ (آیت ۲۶ تا ۲۹)

مقررہ میعاد پوری کرنے کے بعد حضرت موسٰے علیہ السلام اپنے اہل کے ساتھ وہاں سے چل پڑے۔ راستہ میں انہوں نے طور کی طرف ایک آگ کا شعلہ دیکھا۔ اور اپنے اہل سے کہا کہ مَیں نے ایک آگ دیکھی ہے مَیں وہاں جا کر یا تو تمہارے لئے کوئی خبر لاؤنگا۔ یا اُس آگ میں سے

کوئی انگارہ لاؤنگا - تاکہ تم سینک سکو (آیت ۳۰)

جب وہ آگ کے پاس پہنچے تو انہیں اس مبارک مقام کے دائیں طرف کے کنارہ کی طرف سے ایک درخت کی جہت سے آواز آئی کہ اے موسیٰ: مَیں رب العالمین خدا ہوں - پھر الہام ہوا کہ تُو اپنا عصا پھینک دے - انہوں نے عصا پھینکا - تو وہ انہیں ایک چھوٹے سانپ کی طرح تیزی سے حرکت کرتا ہوا نظر آیا - حضرت موسیٰ علیہ السلام اس نظارہ کو دیکھ کر وہاں سے پیٹھ پھیر کر بھاگے - اللہ تعالیٰ نے فرمایا - اے موسیٰ: ڈر نہیں - تو سلامتی پانے والوں میں سے ہے - پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال اور اپنے بازو کو ڈر کی وجہ سے اپنے جسم سے ملا لے - یہ دو نشان ہیں جو فرعون اور اس کے سرداروں کے لئے تجھے عطا کئے گئے ہیں - (آیت ۳۱ تا ۳۲)

جب موسیٰؑ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم ملا - تو انہوں نے کہا کہ خدایا میرے ہاتھ سے تو اُسکی قوم کا ایک فرد مر چکا ہے - ایسا نہ ہو کہ تیرے پیغام کے پہنچانے سے پہلے ہی میں مارا جاؤں - پھر انہوں نے کہا کہ خدایا ہارون جو میرا بھائی ہے وہ مجھ سے زیادہ فصاحت رکھتا ہے تو اس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج دے - اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کو قبول کیا اور فرمایا ہم ہارون کے ساتھ تیرے بازو کو مضبوط کرینگے - اور تم دونوں کو کھُلا کھُلا غلبہ عطا فرمائیں گے - فرعون تم دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیگا - (آیت ۳۳ تا ۳۶)

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے پاس گئے - اور آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا تو فرعون اور اُس کے سرداروں نے آپ کی شدید مخالفت کی - اور اُسے ایک سکیم کے ماتحت تیار شدہ فریب قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسی باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا سے کبھی نہیں سُنیں - پھر فرعون نے ہامان سے کہا - کہ ایک بہت بلند اور اونچی عمارت بناؤ - تاکہ مَیں اُس پر چڑھ کر موسیٰؑ کے خدا کو دیکھ سکوں - اس طرح اُس نے اور اُس کے ساتھیوں نے تکبّر سے کام لیا - مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہم نے اُسے اور اُس کے لشکر کو سمندر میں غرق کر دیا اور اب اس دنیا میں بھی اُن پر لعنت برستی چلی جائیگی اور قیامت کے دن بھی وہ ذلیل ترین لوگوں میں کھڑے کئے جائیں گے - (آیت ۳۷ تا ۴۳)

فرماتا ہے ہم نے موسیٰؑ کو ایسی کتاب دی تھی جو لوگوں کو روحانی بینائی بخشنے والی اور ہدایت اور رحمت کا سامان اپنے اندر رکھنے والی تھی - مگر انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا - جیسا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہود بھی اُس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا رہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ تورات کی اُن پیشگوئیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دی گئی تھی - اور فرماتا ہے کہ تو اُس وقت موسیٰؑ کے ساتھ نہیں تھا جب ہم نے طور کے مغربی جانب رسالت کا کام اُس کے سُپرد کیا - اور نہ تُو مدین والوں کے ساتھ رہتا تھا جبکہ ہم نے وہاں تیرے متعلق پیشگوئی کی - اگر ایسا ہوتا تو سمجھا جا سکتا تھا کہ تم دونوں نے مل کر باہم منصوبہ کر لیا ہوگا - لیکن موسیٰؑ تو تیری پیدائش سے دو ہزار سال پہلے گذر چکے تھے - پھر اس کی کتاب میں تیرے متعلق پیشگوئیوں کا پایا جانا تیری صداقت کا کیوں ثبوت نہیں - (آیت ۴۴ تا ۴۷)

پھر بتایا کہ نبیوں کی بعثت قوموں پر حجت تمام کرنے کیلئے ضروری ہوتی ہے - اگر نبی نہ آئیں تو لوگ خدا تعالیٰ کے سامنے عذر کر سکتے ہیں کہ ہماری طرف تو کوئی سمجھانے والا نہیں آیا - پھر ہمیں کیوں سزا دی جاتی ہے - مگر اب جبکہ خدا تعالیٰ نے اُنکی اصلاح کے لئے ایک نبی کو

مبعوث فرما دیا ہے وہ اس پر اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ موسیٰؑ کی طرح اِسپر یکدم اکٹھی کتاب کیوں نازل نہیں ہوئی - فرماتا ہے - اگر یہی صداقت کی دلیل ہے تو پھر موسیٰ کا کیوں انکار کیا گیا - اُس کے زمانہ میں بھی تو لوگوں نے یہی کہہ دیا تھا کہ موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں - پس تورات کا بھی انکار کیا گیا اور قرآن کا بھی انکار کیا گیا - تورات کا تو اِس لئے انکار کیا گیا کہ وہ اکٹھی کیوں نازل ہوئی ہے اور قرآن کا اس لئے انکار کیا گیا کہ یہ ٹکڑے ٹکڑے کرکے کیوں نازل ہوا - اب تم کوئی ایسی کتاب لاؤ جو کسی تیسرے طریق سے نازل ہوئی ہو - اور اُس نے دُنیا میں اِن دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت پھیلائی ہو مگر تم ایسا بھی نہیں کر سکتے (آیت ۴۸ تا ۵۰)

اِن لوگوں کے یہ اعتراضات بتا رہے ہیں کہ انہیں کسی سچائی سے غرض نہیں - بلکہ جو بھی پراگندہ خیال ان کے دل میں آتا ہے - وہ اُسے ظاہر کر دیتے ہیں اور ایسے لوگ جو پراگندہ خیالات اور نفسانی خواہشات کے پیچھے چلنے والے ہوں کبھی کامیاب نہیں ہُوا کرتے (آیت ۵۱)

فرمایا کہ ہم نے اِس وحی کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرکے نازل کیا ہے اور سارے قرآن میں ایک اعلےٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے - وہ لوگ جنہیں ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی اور جو سچے معنوں میں اہلِ کتاب ہیں وہ تورات پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کریم کی سچائی کو بھی تسلیم کرتے ہیں - ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور دوہرے اجر کے مستحق ہیں - (آیت ۵۲ تا ۵۵)

پھر اِن لوگوں کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بدی کا نیکی سے مقابلہ کرتے اور اپنی تمام طاقتوں کو خدا تعالیٰ کے رستہ میں خرچ کرتے ہیں اور ہر قسم کی لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں - اور دشمنی کرنے والوں کی بھی سلامتی چاہتے ہیں - (آیت ۵۵ - ۵۶)

پھر بتایا کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی میسّر آتی ہے - مگر اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انسان اپنے دل کو ایسا صاف رکھے کہ خدا تعالےٰ کے فضل کا ہاتھ اُسے ہدایت کی طرف کھینچ کر لے جائے - (آیت ۵۷)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم اسلام قبول کریں تو اردگرد کی قومیں ہمیں فوراً تباہ کر دیں گی - حالانکہ ان لوگوں کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ جس خدا نے ابراہیمؑ کے زمانہ سے مکہ کو حرم قرار دیا ہُوا ہے اور اس بے آب و گیاہ جنگل میں ساری دنیا کے پھل اور غلّہ لا رہا ہے وہ اس زمانہ کی ہدایت کو قبول کر لینے والوں کی کیوں حفاظت نہیں کریگا اور کیوں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیگا - مگر ان لوگوں کو خدا تعالےٰ پر ایمان نہیں اور اپنی طاقت پر گھمنڈ کرتے ہیں - ان کی آنکھوں کے سامنے وہ بستیاں موجود ہیں جو عذاب سے تباہ ہوگئیں - مگر پھر بھی یہ نصیحت حاصل نہیں کرتے - یہ تباہی ان بستیوں میں رہنے والوں پر اسی لئے آئی تھی کہ انہوں نے رسولوں کا انکار کیا - بے شک دنیوی مال و دولت بھی اچھی چیز ہے - مگر خدا تعالےٰ کی طرف سے جو ترقی ملتی ہے وہ اس تھوڑے سے دنیوی مال یا تھوڑے سے سونے چاندی سے بہت بہتر ہوتی ہے مگر ان لوگوں کی عقل ایسی کمزور ہے کہ اتنی موٹی بات بھی اِن کی سمجھ میں نہیں آتی - (آیت ۵۸ تا ۶۱)

پھر بتایا کہ جس کے پاس دنیوی دولت ہو وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتا جن سے اللہ تعالےٰ نے دائمی روحانی برکات کا وعدہ کیا ہُوا ہے - کیونکہ اچھی چیز وہی ہے جس کا انجام اچھا ہو - اور اِن لوگوں کا انجام یہ ہوگا کہ قیامت کے دن انہیں جواب دہی کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا پڑے گا - (آیت ۶۲)

اُس وقت ائمۃ الکفر جو لوگوں کو اپنے پیچھے چلاتے تھے

خدا تعالیٰ کے سامنے یہ عذر کریں گے کہ ہم نے تو اِن لوگوں کو دینی باتیں سکھائی تھیں۔ جن کو ہم سچا سمجھتے تھے مگر ان لوگوں پر ہمارا کوئی اختیار نہیں تھا۔ انہوں نے ہماری باتوں کو اس لئے مانا کہ خود ان کا اپنا دل اِن باتوں کو ماننا چاہتا تھا ورنہ درحقیقت یہ ہمارے پیچھے نہیں چلے بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کی ہی انہوں نے تقلید کی ہے۔ (آیت ۶۳ و ۶۴)

اس کے بعد ان کے جھوٹے معبودوں کی بے چارگی ظاہر کرنے کے لئے انہیں کہا جائیگا کہ اب اپنے معبودوں کو بلاؤ اور انہیں کہو کہ وہ تمہیں اس عذاب سے نجات دیں۔ وہ آوازیں دیں گے مگر اُن کا کوئی معبود انہیں جواب نہیں دے گا۔ اُسوقت گمراہ ہونے والے حسرت اور افسوس سے کہیں گے کہ کاش ہم ہدایت اختیار کرتے اور اس غلط رستے پر نہ چلتے۔ (آیت ۶۵)

پھر خدا تعالیٰ اُن سے پوچھے گا کہ بتاؤ جو رسول مَیں نے تمہاری طرف بھیجے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا۔ اِس پر وہ ایسے گھبرا جائیں گے کہ تمام خیالات اُن کے دماغ سے نکل جائیں گے اور وہ ایک دوسرے سے بھی کوئی بات پوچھنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔ ہاں وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کئے وہ یقیناً بامراد ہونگے (آیت ۶۶ تا ۶۸)

پھر بتایا کہ تمام تغیرات اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہ جو تغیر بھی چاہتا ہے جاری کرتا ہے۔ لیکن کفار کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ظاہر کو بھی دیکھتا ہے اور اُن کے دل کے مخفی رازوں سے بھی آگاہ ہے اور وہ وحدہٗ لاشریک ہے ابتداء بھی اُسی کی طرف ہوتی ہے اور انجام بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے ہر کام میں حمد کا ہی مستحق ہوتا ہے (آیت ۶۹ تا ۷۱)

فرمایا۔ یہ لوگ شرک تو کرتے ہیں لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ اگر رات کو اللہ تعالیٰ قیامت تک کیلئے لمبا کر دے تو خدا تعالیٰ کے سوا اور کون ہے جو اُن کے پاس روشنی لائیگا۔ یا اگر دن کو قیامت تک کے لئے لمبا کر دے تو خدا تعالیٰ کے سوا اَور کون ہے جو اُن کے لئے رات کا وقت لائے۔ خدا تعالیٰ ہی ہے جو سورج کو چڑھاتا اور غروب کرتا ہے۔ پھر فرمایا یہ رات اور دن کا تسلسل اس لئے ہے کہ رات میں تم سکون حاصل کر سکو اور دن میں کام کاج کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے شکرگذار بندے بنو۔ مگر مشرک لوگ اپنے مزعومہ معبودوں کو اس کا شریک قرار دے دیتے ہیں حالانکہ کوئی مشرک نہیں جو یہ تسلیم کرتا ہو کہ سورج کو اُس کا معبود چڑھاتا ہے یا اُس کا غروب ہونا کسی بُت کے اشارہ سے ہوتا ہے۔ (آیت ۷۲ تا ۷۴)

فرمایا۔ ایک دن آنے والا ہے جب ان مشرکوں سے کہا جائیگا کہ آج تمہارے مزعومہ شرکاء کہاں ہیں۔ وہ کیوں تمہاری مدد نہیں کرتے۔ اگر تمہارے پاس شرک کی تائید میں دلائل تھے تو تمہاری وہ دلیلیں کہاں چلی گئیں۔ تب مشرکوں پر اپنے بتوں کا جھوٹا ہونا بالکل واضح ہو جائیگا اور وہ کہیں گے کہ سچی بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے کہی تھی۔ اور اُن کے تمام مفتریانہ دعاوی اُن کو بھول جائیں گے۔ (آیت ۷۵ - ۷۶)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ مخالفوں کے سامنے قارون کی مثال پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُس نے دولت کے نشہ میں اپنی قوم پر سختی کرنی شروع کر دی وہ خزانوں کا افسر تھا جن کی کنجیاں اُٹھانا بھی ایک مضبوط جماعت کے لئے دوبھر ہوتا تھا۔ اُس کی قوم نے اُسے سمجھایا کہ تکبر نہ کر۔ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ مگر اُس نے کہا۔ یہ رتبہ مجھے یونہی نہیں ملا بلکہ مَیں نے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)۔

طٰسٓمٓ ﴿۲﴾

طاہر (پاک) سمیع (دُعائیں سُننے والا) مجید (بڑی بزرگی والا خدا اِس سورۃ کو نازل کرنیوالا ہے) ۵ل

اپنے علم کے زور سے اسے حاصل کیا ہے۔ اُس نے یہ نہ سوچا کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو تباہ کر چکا ہے جو اس سے بھی زیادہ طاقتور تھیں۔ پھر ایسا ہُوا کہ ایک دن وہ بڑی شان وشوکت سے اپنی قوم کے سامنے سے گذرا اور قوم نے اُس پر رشک کیا مگر جو لوگ روحانی نگاہ رکھنے والے تھے انہوں نے کہا کہ یہ کوئی قابلِ رشک چیز نہیں۔ رشک کے قابل وہ جزا ہے جو مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ مگر یہ جزا اُنہی لوگوں کو ملا کرتی ہے جو مشکلات میں صبر سے کام لیتے ہیں۔ آخر قارون کی سزا کا وقت آگیا اور ہم نے اُسے اور اُس کے سارے خاندان کو ایسا ذلیل کیا کہ نہ تو کوئی گروہ اُس کی مدد کے لئے نکلا اور نہ وہ خود اپنی حالت کو بدل سکا۔ اور لوگوں کو اقرار کرنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والوں کا انجام ایسا ہی ہُوا کرتا ہے (آیت ۷۷ تا ۸۳-)

اس کے بعد بتایا کہ جو لوگ ملک میں ناجائز غلبہ کے حصول کی کوشش نہیں کرتے اور نہ فساد پھیلاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہی کو ترقیات سے حصّہ دیا کرتا ہے (آیت ۸۴)

پھر نیکی اور بدی کی جزاء کے متعلق روشنی ڈالی اور بتایا کہ ہمارا یہ اصول ہے کہ نیکی کا بدلہ تو کام کی نسبت سے بہت زیادہ دیا جاتا ہے لیکن بدی کی سزا صرف اسی قدر دی جاتی ہے جسقدر قصور ہوتا ہے۔ اور پھر پیشگوئی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ گو ایک دن تیری قوم تجھے مکہ سے نکال دیگی لیکن وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہ اپنی ذات کی قسم کھا کر تجھ سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ تجھے پھر مکہ میں واپس لائیگا اور تجھے ان لوگوں پر غلبہ عطا فرمائیگا۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت لے کر آیا ہے اور کون اُسکا انکار کر کے گمراہ ہو چکا ہے۔ پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ ہدایت لانیوالا ناکام رہے اور گمراہ کامیاب ہو جائیں (آیت ۸۵ - ۸۶)

اے قرآن کے مخاطب اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان نشان کو دیکھنے کے بعد تیرا فرض ہے کہ تو کفار کا کبھی مددگار نہ بن اور کبھی شرک کے قریب مت جا اور کبھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اَور کو اپنا معبود نہ بنا۔ کیوں کہ حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ دُنیا کی ہر چیز حتّٰی کہ ہر مزعومہ معبود بھی ہلاک ہو گا اور صرف وہی بچیں گے جن کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہو گی کیونکہ حکم بھی اللہ تعالیٰ کا ہی چلتا ہے اور سب مخلوقات نے پیش بھی اُسی کے حضور ہونا ہے۔

۵ل اس سورۃ کے ابتداء میں حروف مقطعات طٰسٓمٓ رکھے گئے ہیں۔ جو لطیف، سمیع اور مالک یا مجید کے قائم مقام ہیں۔ اور اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا لطیف ہے اور وہ لطف اور مہربانی سے کام لیتا ہے جبر اور سختی سے کام نہیں لیتا۔ وہ سَمِیۡع ہے۔ جب دنیا ہدایت سے محروم ہوئی اور اُن کے دلوں میں سے خدا تعالیٰ کی طرف پکار اُٹھی کہ ہمیں ہدایت دے تو اُس نے یہ قرآن بھیج دیا۔ وہ مالک ہے مخلوق کا اسلئے وہ اپنے

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ○

یہ (یعنی اس سورۃ کی آیات) ایک مدلّل کتاب کی آیات ہیں۔ ۵۲

بندوں کو یونہی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یا میم مجید کا قائم مقام ہے۔ اس صورت میں اس کے یہ معنے ہیں کہ خدا بڑی بزرگی والا ہے۔ پس یہ اُس کی شان کے خلاف تھا کہ اُس کے کمزور بندے ہدایت سے محروم ہوتے۔ اور وہ ان کی خبر نہ لیتا۔ اور چونکہ انہی صفات کو سورۃ شعراء کے ابتداء میں بھی بیان کیا گیا ہے اس لئے مغزِ مضمون کے لحاظ سے ان دونوں صورتوں کا مضمون آپس میں ملتا جُلتا ہے۔

بعض لوگ قرآن کریم پر تدبر نہ کرنے کی وجہ سے کہا کرتے ہیں کہ اس کی آیتیں اور سورتیں یوں ہی بے جوڑ رکھی گئی ہیں۔ حالانکہ ایک ادنیٰ غور سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی سورتیں بھی کسی خاص مقصد کے ساتھ آگے پیچھے رکھی گئی ہیں۔ اور اس کی آیتیں بھی اپنے اندر ترتیب اور جوڑ رکھتی ہیں۔ چنانچہ سورۃ شعراء اور سورۃ قصص کو دیکھ لو۔ سورۃ شعراء سے پہلے بھی طٰسٓمٓ حروف مقطعات کے طور پر رکھے گئے ہیں۔ اور سورۃ قصص سے پہلے بھی طٰسٓمٓ حروف مقطعات کے طور پر رکھے گئے ہیں۔ اور سورۃ شعراء میں بھی ان حروف کے بعد یہ آیت ہے کہ تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ۔ اور اس سورۃ میں بھی طٰسٓمٓ کے بعد یہ آیت ہے تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حروفِ مقطعات کسی خاص غرض کے لئے ہوتے ہیں۔ اور ایک جیسے حروف مقطعات ایک ہی قسم کے مضمون پر دلالت کرتے ہیں۔

ہم نے سورۂ نمل کے تفسیری نوٹوں میں بتایا تھا کہ سورۂ نمل کو طٰسٓمٓ کی بجائے جو شعراء سے پہلے رکھے گئے ہیں صرف طٰسٓ سے شروع کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مجد اور اس کی بزرگی جتنی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وجود سے ظاہر ہوئی ہے جن کا سورۂ شعراء میں ذکر آتا ہے اتنی بزرگی موسیٰ اور سلیمان علیہم السلام کے وجود سے ظاہر نہیں ہوئی جن کا ذکر سورۂ نمل میں آتا ہے۔ اَب اس سورۃ میں پھر طٰسٓ کے بعد میم بڑھا دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سورۃ میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے خصوصاً فتح مکہ کا۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی بزرگی ظاہر ہوئی۔

۵۲ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اس سورۃ میں جو آیتیں بیان کی گئی ہیں وہ ایک کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔ یعنی اس کتاب کی جو سب مضمونوں کو کھول کر بیان کرتی ہے یا دوسرے لفظوں میں ہر مضمون کی دلیلیں دیتی ہے۔

اس آیت میں سورۂ نمل کی آخری آیت وَ مَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۔ پر وارد ہونے والے اس سوال کا بھی جواب دیدیا گیا ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو صرف منذر بنایا ہے زبردستی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ

ہم موسیٰ اور فرعون کے صحیح سوانح تیرے سامنے مومن قوم کے فائدہ کے لئے

لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ

پڑھتے ہیں۔ ۵۳ فرعون نے (اپنے) ملک میں بڑی تعلّی سے کام لیا تھا

وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً

اور اس کے رہنے والوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ وہ ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرنا

مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ

چاہتا تھا۔ (اس طرح کہ) ان کے بیٹوں کو قتل کرتا تھا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا۔

اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۵﴾ وَنُرِيْدُ اَنْ

اور وہ یقیناً فسادیوں میں سے تھا۔ اور ہم نے ارادہ کر رکھا تھا کہ

نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ

جن لوگوں کو اس نے ملک میں کمزور سمجھ رکھا تھا ان پر احسان کریں اور

نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۶﴾ وَ

ان کو سردار بنا دیں اور ان کو (تمام نعمتوں کا) وارث کر دیں۔ اور

۵۳ تفسیر:۔ فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ! خدا تعالیٰ کے لطیف اور سمیع ہونے کی مثال کے طور پر ہم تجھے موسیٰؑ کا واقعہ سناتے ہیں لیکن اس شکل میں سناتے ہیں جس شکل میں وہ ہوا تھا۔ یعنی تورات نے اس میں بہت سے انسانی خیالات ملا دئے ہیں۔ تو ان انسانی خیالات کو الگ کر کے اصل حقیقت لوگوں کے سامنے بیان کر۔

قرآن شریف کی اس آیت کی تصدیق بادری دہیری

ان پر نازل ہونے والی کتاب ہر مضمون کے دلائل پیش کرتی ہے۔ اور جس کے ساتھ مدلل کتاب ہو اور جس کے ہر دعویٰ کا ثبوت موجود ہو اسے زبردستی کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص اس کی باتوں کو سنکر سچے دل سے غور کرے گا تو آپ ہی ہدایت پا جائیگا۔ اور اگر غور نہیں کرنا چاہے گا تو اس پر زبردستی کرنا بیکار ہے کیونکہ جس کو دلیل ٹھیک نہیں کر سکتی جبر بھی اس کو ٹھیک نہیں کر سکتا۔

نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ

اُن کو ملک میں تمکنت بخشیں اور فرعون اور ہامان

وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ⑦

اور اُن کے لشکروں کو وہ کچھ دکھائیں جس کا اُن کو خوف لگا ہوا تھا۔ ۵۴

کے نوٹ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ اس جگہ لکھتے ہیں کہ یہاں محمد رسول اللہ نے موسیٰؑ کے سارے حالات بیان نہیں کئے جس سے پتہ لگتا ہے کہ انہیں یہودیوں سے نامکمل حالات پہنچے تھے۔ لیکن قرآن نے پہلے سے ہی سیل کے اِس اعتراض کو مدنظر رکھتے ہوئے بتا دیا تھا کہ سچا واقعہ وہی ہے جو ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور واقعہ تیرے پاس بیان کیا جائے تو اُس کو ہرگز سچا نہ سمجھ۔

۵۴ حل لغات :- شِيَعًا : شِيْعَةٌ کی جمع ہے اور شِيْعَةُ الرَّجُلِ کے معنے ہیں اَتْبَاعُهٗ وَ اَنْصَارُهٗ۔ کسی شخص کے پیرو کار اور مددگار۔ نیز اَلشِّيْعَةُ کے معنے ہیں اَلْفِرْقَةُ۔ گروہ (اقرب)

يَحْذَرُوْنَ : حَذِرَ سے فعل مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور حَذِرَ يَحْذَرُ حِذْرًا وَحَذَرًا وَمَحْذُوْرَةً کے معنے ہیں تَحَرَّزَ مِنْهُ۔ اس سے بوجہ خوف اجتناب کیا (اقرب) پس مَا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ کے معنے ہونگے جس کا اُن کو خوف لاحق تھا۔

تفسیر:- فرماتا ہے۔ موسیٰؑ کا واقعہ یوں ہوا کہ فرعون نے اپنی حکومت کے گھمنڈ میں تکبّر شروع کر دیا۔ اور لوگوں پر تعدی کرنی شروع کر دی۔ وہ تمام رعایا کے ساتھ ایک سا سلوک نہیں کرتا تھا۔ نہ اُن کی ترقی کی طرف توجہ کرتا تھا۔ بلکہ مختلف نسلوں اور مختلف مذہبوں سے تعلق رکھنے والوں کو آپس میں لڑواتا تھا۔ اور بعض لوگوں کو پسندیدہ اور منتخب جماعت قرار دیتا تھا۔ اور بعض کو حقیر اور حکومت کی حفاظت سے خارج قرار دیتا تھا۔ اور رعایا کے ایک طبقہ کو کمزور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور اُن کی نرینہ اولادوں کو ہلاک کر دیتا تھا اور اُن کی لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ وہ یقیناً زمین میں فساد کر رہا تھا۔ لیکن ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا (اور اس زمانہ میں بھی فیصلہ کیا ہے) کہ جن کو کمزور کیا جا رہا ہے ہم اُن پر احسان کریں اور ہم اُن کو دنیا کا سردار بنا دیں اور ہم اُن کو اُن انعامات کا وارث کر دیں جو فرعون اور اس کے قریبیوں کو حاصل تھے۔ اور ہم ان کو ملک میں طاقت بخشیں۔ اور ہم نے یہ بھی فیصلہ کر دیا تھا کہ فرعون اور اس کے ساتھی ہامان کو اور ان دونوں کے لشکروں کو وہ انجام دکھا دیں جس سے وہ ڈر رہے تھے۔ یعنی یہ خوف کہ ملک کی بعض قومیں طاقتور ہو کر اُن کو نقصان نہ پہنچا دیں۔

وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا سے ظاہر ہے کہ فرعون نے "ڈیوائیڈ اینڈ رول" کی پالیسی اختیار کی ہوئی تھی اور وہ جابر بادشاہوں کی طرح لوگوں کو ہمیشہ آپس میں لڑواتا رہتا تھا تاکہ اُن میں اتحاد اور یکجہتی پیدا نہ ہو اور اُس کے مظالم کی طرف لوگوں کی توجہ نہ پھرے۔ جس طرح جابر بادشاہ بعض قوموں کی حمایت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور بعض کو ذلیل کر دیتے ہیں اور اس طرح مستقل طور پر ایک دوسرے

شِيَعًا

يَحْذَرُوْنَ

کے خلاف تنافر اور بغض اور حسد کے جذبات بھڑکاتے ہیں
اسی طرح فرعون کی بھی یہی کوشش رہتی تھی کہ اسرائیلیوں
اور غیر اسرائیلیوں کا جھگڑا قائم رہے اور اس کی حکومت
کے ظالمانہ افعال کی طرف اُن کی توجہ نہ پھرے۔ بہرحال
قرآن مجید اس پالیسی کی شدید مذمت کرتا ہے اور اسے
فساد فی الارض کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اسلام کے نزدیک
قانون کا اطلاق غریب اور امیر اور عالم اور جاہل پر
یکساں ہونا چاہیئے اور اس بارہ میں کسی قسم کا امتیاز روا
نہ رکھنا چاہیئے۔ اور درحقیقت دنیا میں وہی حکومت
پائیدار امن قائم کرنے کا موجب ہو سکتی ہے جو اس
امتیاز کو کلیۃً دُور کر دے۔ اور قومی ملکی نسلی یا
مذہبی اختلاف کی بنا پر عدل و انصاف کے تقاضوں
کو نہ کچلے۔

فرعون چونکہ بنی اسرائیل کو کمزور کرنا چاہتا تھا
اس لئے اُس نے پہلے تو بنی اسرائیل کی نسل کو دائیوں کے
ذریعہ بند کرنا چاہا۔ مگر جب اس سکیم میں اُسے ناکامی ہوئی
اور دائیوں نے رحم سے کام لیا تو اس نے لڑکوں کو
دریا میں ڈالے جانے اور لڑکیوں کو زندہ رکھنے کا حکم
دیا۔ چنانچہ خروج باب۱ میں اُس کی تفصیل بیان کرتے
ہوئے لکھا ہے:-

"تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائیوں سے
جن میں ایک کا نام سفرہ اور دوسری کا فوعہ
تھا باتیں کیں۔ اور کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے
تم بچہ جناؤ۔ اور ان کو پتھر کی بیٹھکوں پر
بیٹھی دیکھو تو اگر بیٹا ہو تو اُسے مار ڈالنا
اور اگر بیٹی ہو تو وہ جیتی رہے۔ لیکن وہ
دائیاں خدا سے ڈرتی تھیں۔ سو انہوں نے
مصر کے بادشاہ کا حکم نہ مانا بلکہ لڑکوں کو
جیتا چھوڑ دیتی تھیں۔ پھر مصر کے بادشاہ نے
دائیوں کو بلوا کر اُن سے کہا۔ تم نے ایسا کیوں
کیا کہ لڑکوں کو جیتا رہنے دیا؟ دائیوں نے
فرعون سے کہا۔ عبرانی عورتیں مصری عورتوں
کی طرح نہیں ہیں۔ وہ ایسی مضبوط ہوتی ہیں کہ
دائیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی جن کر فارغ
ہو جاتی ہیں۔ پس خدا نے دائیوں کا بھلا کیا
اور لوگ بڑھے اور زبردست ہوگئے۔ اور
اس سبب سے کہ دائیاں خدا سے ڈریں اُس
نے اُن کے گھر آباد کر دیئے۔ اور فرعون نے
اپنی قوم کے سب لوگوں کو تاکیداً کہا۔ کہ
ان میں جو بیٹا ہو تم اُسے دریا میں ڈال دینا
اور جو بیٹی ہو اُسے جیتی چھوڑنا۔"

(خروج باب۱ آیت ۱۵ تا ۲۲)

قرآن کریم نے اس واقعہ کے متعلق يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ
کے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں اِن سے بعض لوگ
غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ فرعون بچوں کا گلا گھونٹ دیا
کرتا تھا۔ مگر یہ درست نہیں۔ ذبح کے ایک معنے
لغت میں ہلاک کر دینے کے بھی لکھے ہیں (تاج العروس)
پس يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ کے معنے یہ ہیں کہ وہ بنی اسرائیل
کے لڑکوں کو ہلاک کر دیتا تھا۔ خواہ یہ ہلاکت دریا
میں ڈبو دینے سے ہو یا کسی اور ذریعہ سے۔ اسی وجہ سے
قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ
کے الفاظ بھی استعمال فرمائے ہیں (اعراف آیت ۱۴۲)
جس سے اِن معنوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل ہونے کا
واقعہ بیان کرتے ہوئے سورۂ بقرۃ میں بھی يَذْبَحُوْنَ
کی بجائے يُذَبِّحُوْنَ کے الفاظ استعمال کئے ہیں
(بقرہ آیت ۵۰) کیونکہ عربی زبان کے قواعد کی رُو سے
يُذَبِّحُوْنَ کے معنوں میں زیادہ شدت اور سختی

پائی جاتی ہے ۔ اگر یَذْبَحُوْنَ کہا جاتا تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا کہ وہ ہلاک کرتے تھے ۔ لیکن یُذَبِّحُوْنَ کہہ کر اس قوم کے غصّہ اور کینہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ لوگ تلاش کر کر کے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ہلاک کرتے تھے ۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ ۔ میں اللہ تعالےٰ نے نُرِيْدُ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو مضارع کا صیغہ ہے جس میں استقبال کے معنے بھی پائے جاتے ہیں ۔ گویا اس کے معنے یہ ہیں کہ آئندہ بھی ہمارا یہی ارادہ ہے ۔ اس لفظ کو استعمال فرما کر اللہ تعالےٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نہ صرف موسیٰؑ کے وقت ہم نے یہ ارادہ کیا تھا بلکہ آج محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ حکومتِ مکّی جن لوگوں کو ظالمانہ طور پر کمزور کرنا چاہتی ہے اُن کو طاقت دی جائے کیونکہ وہ مظلوم ہیں ۔ اور گو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جبر کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا لیکن جس طرح الٰہی تدبیروں سے موسیٰؑ کے وقت کام لیا گیا اور فرعون کو تباہ کیا گیا اور اُس کے اور اُس کے درباریوں کے تختۂ مشق لوگوں کی مدد کی گئی اور اُنکو اونچا کیا گیا اسی طرح الٰہی تدبیروں سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت بھی کام لیا جائیگا اور مکّہ والوں کو تباہ کیا جائیگا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ کے ماننے والوں کو الٰہی تدبیروں کے ذریعہ سے اونچا کیا جائیگا ۔ اور وہ الٰہی تدبیر اُس نے شروع میں ہی بیان کر دی ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والا ایک پُر حکمت اور بادلیل کلام ہے جس کے اثر اور طاقت سے لوگوں کے دل فتح ہو جائیں گے ۔ گویا نتیجہ تو وہی نکلے گا جو موسیٰؑ کے وقت میں نکلا مگر موسیٰؑ کے وقت میں تو احکامِ الٰہی کی تعمیل کے لئے آپ کو اپنی قوم کے ساتھ سختی بھی کرنی پڑی اور پھر موسیٰؑ کی ساری قوم ایمان بھی نہ لائی صرف سیاسی طور پر موسیٰؑ کے ساتھ ہو گئی جیسا کہ بائیبل سے ظاہر ہے کہ ایک لمبے عرصہ تک موسیٰ کی قوم موسیٰؑ پر اعتراض کرتی چلی گئی ۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں چونکہ پُر حکمت اور بادلیل کلام دیا گیا ہے ۔ آپ کی قوم پورے طور پر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے گی ۔ اور موسیٰؑ کی قوم سے بھی بڑھ کر اُسکو عزت حاصل ہو گی ۔ موسیٰؑ کی قوم تو صرف فرعون کی شان و شوکت کے ایک حصّہ کی وارث ہوئی تھی لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم اس سے بہت زیادہ ترقیات پائے گی کیونکہ اُس کے ساتھ کتابِ مبین ہو گی ۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان ع ۵) یعنی اے محمد رسول اللہ! تجھے لڑائیاں تو پیش آئیں گی لیکن وہ لڑائیاں تیری زندگی کا ماحصل نہیں ہونگی بلکہ تیری زندگی کے کاموں کا ایک بہت چھوٹا سا حصّہ ہونگی ۔ ماحصل تیری زندگی کا یہ ہے کہ قرآن سے اپنی قوم کے ساتھ جنگ کر اور یہ جنگ ہی بڑی جنگ ہو گی ۔ تلوار کی جنگ اس کے مقابلہ میں چھوٹی ہو گی ۔

اب دیکھ لو یہ پیشگوئی کس شان سے پوری ہوئی مکّہ والوں کو بے شک بعض عرب قبائل سے جنگیں پیش آئیں ۔ لیکن وہ قبائل بھی چھوٹے تھے اور اُن کا نتیجہ بھی چھوٹا تھا ۔ مگر جو جنگ آپ کو قرآن کریم کے ذریعہ کرنی پڑی وہ عرب سے بھی ہوئی ایران سے بھی ہوئی اور پھر بعد میں ساری دنیا سے ہوئی اور ہو رہی ہے جس دن اس جنگ کا نتیجہ نکلیگا ساری دُنیا کے دل اسلام کے لئے فتح ہو جائیں گے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بادشاہت میدانوں اور سمندروں کو پھاندتی ہوئی دنیا کے کناروں تک پہنچ جائیگی ۔ اس کے مقابلہ میں ظاہری جنگوں کا نتیجہ بہت چھوٹا تھا مگر

تعجب ہے کہ ان کھلی آیات کی موجودگی میں مغربی لوگ اب تک یہ اعتراض کرتے چلے جا رہے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگوں کے ساتھ اپنے دشمنوں کو مغلوب کیا اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فتوحات جنگوں کے ساتھ وابستہ تھیں تو پھر قرآن کریم نے اشارۃً ان کو چھوٹا کیوں کہا اور قرآنی جنگ کو بڑا کیوں کہا۔ اُس نے یہ کیوں فرمایا کہ جَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ۔ اے محمد رسول اللہ! تیری اصل جنگ قرآن کریم کے ہتھیار سے ہے۔ تُو اس ہتھیار کے ساتھ اپنے دشمنوں سے جنگ کر۔ یہی جنگ بڑی جنگ ہوگی۔

یہ عجیب بات ہے کہ یہ آیت جس میں دو جہادوں کی خبر دی گئی ہے ایک تلوار کے جہاد کی جو چھوٹا ہوگا اور ایک دلائل اور براہین کے جہاد کی جو بڑا ہوگا یہ سورۃ فرقان کی آیت ہے جو مکّی سورۃ ہے۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکّہ میں ہی تھے۔ نہ کوئی فوج آپ کے ساتھ تھی۔ نہ کوئی ملک آپ کے ساتھ تھا کہ آپ کو خدا تعالیٰ نے بتایا کہ تجھے اپنے مخالفوں کے ساتھ لڑائیاں جس میں کچھ تلوار کی اور کچھ دلائل اور براہین کی۔ دلائل اور براہین کی لڑائیاں بڑی ہونگی اور تلوار کی چھوٹی۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس فرق کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ جہاد سے واپس آئے تو آپ نے فرمایا رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ (ردالمحتار علی الدرالمختار جلد ۳ صفحہ ۲۳۵) ہم ایک چھوٹی لڑائی سے واپس آئے ہیں تا کہ بڑی لڑائی یعنی دلائل اور براہین کی لڑائی اور اشاعتِ قرآن کی لڑائی کو شروع کریں۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی دلائل اور براہین کی لڑائی کو بڑی لڑائی اور تلوار کی لڑائی کو چھوٹی لڑائی قرار دیا ہے۔

ان آیات میں جو ہامان کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق سیل نے اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن میں اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن نے ہامان کو فرعونِ موسیٰ کا ہمعصر قرار دیدیا ہے۔ حالانکہ ہامان ایک ایرانی بادشاہ اخسویرس کے وزیر کا نام تھا۔ جو موسیٰ کے ایک لمبا عرصہ بعد ہوا اور پھر لکھتا ہے کہ گو یہ غلطی بالکل واضح ہے لیکن ایک مسلمان کو اس غلطی کا یقین دلانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ریورنڈ وہیری نے بھی اپنی کتاب "کمنٹری آن دی قرآن" میں اس اعتراض کو نقل کیا ہے۔ اسی طرح بعض اور یورپین مستشرقین نے بھی لکھا ہے کہ ہامان۔ فرعونِ موسیٰ کا کوئی وزیر یا اعلیٰ افسر نہیں تھا بلکہ پانچویں صدی قبل مسیح کے ایک ایرانی بادشاہ کا وزیر تھا۔ جس نے اخسویرس کے عہدِ حکومت میں یہودیوں کے قتلِ عام کی سازش کی مگر بالآخر بادشاہ اس سے ناراض ہوگیا اور اُس نے ہامان کو صلیب پر لٹکا دیا۔

یورپین مستشرقین کے اس اعتراض کی بنیاد بائیبل کی کتاب آستر باب ۳ تا ۷ پر ہے جس میں لکھا ہے کہ

" اخسویرس بادشاہ نے اجاجی ہمداتا کے بیٹے ہامان کو ممتاز اور سرفراز کیا اور اُسکی کرسی کو سب امراء سے جو اُس کے ساتھ تھے برتر کیا۔ اور بادشاہ کے سب ملازم جو بادشاہ کے پھاٹک پر تھے ہامان کے آگے جھک کر اُس کی تعظیم کرتے تھے کیونکہ بادشاہ نے اُسکے بارے میں ایسا ہی حکم کیا تھا۔ پر مردکی (جو ایک یہودی سردار تھا) نہ جھکتا نہ اُس کی تعظیم کرتا تھا۔ تب بادشاہ کے ملازموں نے جو بادشاہ کے پھاٹک پر تھے مردکی سے کہا تُو کیوں بادشاہ کے حکم کو توڑتا ہے جب وہ اُس سے روز کہتے رہے اور اُس نے اُن کی نہ مانی تو انہوں نے ہامان کو بتا دیا تا کہ دیکھیں

کہ مردکی کی بات چلے گی یا نہیں۔ کیونکہ اُس نے اُن سے کہہ دیا تھا کہ مَیں یہودی ہوں۔ جب ہامان نے دیکھا کہ مردکی نہ جھکتا نہ میری تعظیم کرتا ہے تو ہامان غصہ سے بھر گیا۔ لیکن فقط مردکی ہی پر ہاتھ چلانا اپنی شان سے نیچے سمجھا کیونکہ انہوں نے اُسے مردکی کی قوم بتا دی تھی اس لئے ہامان نے چاہا کہ مردکی کی قوم یعنی سب یہودیوں کو جو اخسویرس کی پوری مملکت میں رہتے تھے ہلاک کرے"

(آستر باب ۳ آیت ۱ تا ۷)

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ ہامان اپنی تدبیریں ناکام رہا اور اُس کی بیوی نے جس کا نام آستر تھا اور جو یہودن عورت تھی بادشاہ کو ہامان کے خلاف بھڑکا دیا اور بادشاہ نے اُسے قتل کروا دیا۔

آستر کی اس روایت پر انحصار رکھتے ہوئے یورپین مستشرقین نے کسی ایسے ہامان کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے جو فرعونِ موسیٰ کا ہمعصر ہو لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ کتاب جس پر اس اعتراض کی بنیاد رکھی گئی ہے خود محققین کی نگاہ میں ایک مشکوک اور ناقابلِ استناد کتاب ہے اور وہ اس کے بیان کردہ واقعات کو درست ہی تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ مارٹن لوتھر اور بعض دوسرے عیسائی علماء نے صاف طور پر لکھا ہے کہ آستر کی یہ داستان محض ایک افسانہ ہے جو مبالغہ آرائی سے پُر ہے۔ بلکہ انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح کا کوئی ایرانی بادشاہ ایسا نہیں تھا جس کا وزیر یا مصاحب اعلیٰ ھامان نامی گذرا ہو۔ اور نہ ہی اخسویرس بادشاہ کی کوئی ملکہ آستر تھی یہ سب خلافِ تاریخ واقعات ہیں جو اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں[1]۔ پس عیسائیوں نے جس کتاب کی بنا پر یہ اعتراض کیا ہے وہ تاریخی حیثیت سے ایک ناقابلِ اعتبار کتاب ہے۔ اور جب خود اس کی حیثیت مخدوش ہے تو اُس کی بنا پر اسلام پر کوئی اعتراض کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم نے ہامان کے متعلق جو امور بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں:۔

اوّل ھامان کو مصر میں فوجی اقتدار حاصل تھا۔ اور جسطرح فرعون کا لشکر تھا اُسی طرح ہامان بھی اپنے ساتھ لشکر رکھتا تھا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هٰمٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ (قصص آیت ۹) یعنی فرعون ہامان اور ان دونوں کے لشکر خطاکار اور گنہگار تھے۔ یہی مضمون آیت ۷ میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهٰمٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ۔ یعنی ہم نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ ہم فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکروں کو وہ کچھ دکھائیں گے جس کا انہیں خطرہ لاحق تھا۔

دوم۔ قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بلند و بالا عمارات اور قلعوں وغیرہ کی تعمیر کا کام ہامان کی نگرانی میں ہُوا کرتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ ایک دفعہ فرعون نے ہامان سے کہا۔ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (قصص آیت ۳۹) یعنی اے ہامان! میرے لئے ایک بہت بلند اور اونچی عمارت بناؤ۔ شاید کہ اُس پر چڑھ کر مجھے کہیں موسیٰؑ کا خدا نظر آ جائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُس نے کہا کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ مجھے موسیٰؑ کی سچائی کا کچھ یقین آ گیا ہے۔ مَیں اسے تو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کا فائدہ یہ ہوگا۔ کہ

---

[1] ہارپرز بائبل ڈکشنری از مِلر زیر لفظ آستر

اس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس کے جھوٹا ہونے کا یقین ہو جائے گا۔

اب اگر قدیم مصر کی تاریخ سے ہمیں کسی ایسی شخصیت کا پتہ لگ جائے جو فرعونِ موسیٰ کے زمانہ میں ہو اور پھر ہمیں یہ بھی پتہ لگ جائے کہ اس کے ساتھ فوجی طاقت بھی تھی اور بلند و بالا عمارات اور قلعے وغیرہ بنانے کا کام بھی اُس کے سپرد تھا تو قرآن کریم کی صداقت بالکل واضح ہو جائیگی۔ اِسی غرض کے لئے جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مصر قدیم میں بہت سے دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی اور ہر شخص کا تعلق کسی خاص دیوتا یا چند مخصوص دیوتاؤں کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ مصر کے دارالخلافہ تھیبس کے رہنے والے اپنے دیوتا کو آمان یا آمون کہا کرتے تھے۔ قدیم ایّام میں تو اس کا نام "آمانا" تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ آمن۔ آمان یا آمون نام لوگوں میں مروج ہو گیا۔ چونکہ آمن یا آمان یا آمون اُن لوگوں کا دیوتا تھا جو مصر کے پایۂ تخت میں رہتے تھے اور دارالسلطنت کا ملک کے دوسرے حصوں پر اثر پڑنا ایک لازمی امر تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ آمان نے سب دیوتاؤں پر برتری حاصل کر لی اور یہ نام ایسا مقدس سمجھا جانے لگا کہ جس طرح مسلمان اللہ تعالیٰ کے نام پر اپنے اور اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں اسی طرح مصری ناموں اور القابات میں بھی آمن یا آمون کا لفظ بکثرت استعمال ہونے لگ گیا[۱]۔ چونکہ ہر دیوتا کا الگ الگ معبد تھا اور ہر دیوتا کے الگ الگ کاہن مقرر تھے۔ اِس لئے جب آمان دیوتا کی مقبولیت بڑھی تو آمان کا کاہن بھی تمام کاہنوں کا رئیس تسلیم کیا جانے لگا۔ اور رفتہ رفتہ اُس نے اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ بے شمار املاک اور جائیدادیں جو آمان دیوتا کے لئے وقف تھیں وہ اُس کے قبضہ میں آگئیں۔ اور وہ معبدِ آمان کی متعلقہ عمارات کی تولیت پر بھی قابض ہو گیا[۱]۔

جیمز ہنری بریسٹڈ اپنی کتاب "تاریخ مصر" میں اِن امور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"مصر کے نئے دورِ حکومت میں فوجی طاقت کے ساتھ ساتھ ایک نئی مؤثر اور طاقتور تحریک جو قدیم نظامِ کہانت پر مبنی تھی ظہور پذیر ہوئی۔ درحقیقت سلطنتِ مصر میں معابد کی بے پناہ دولت کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ کہانت ایک مخصوص پیشہ کی صورت اختیار کر گئی اور جوں جوں کاہنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ویسے ویسے وہ زیادہ سے زیادہ سیاسی رسوخ اور طاقت حاصل کرتے چلے گئے معابد کی دولت و ثروت میں اضافہ کے ساتھ ہی ایک انبوہ کثیر افسرانِ معابد کا بھی پیدا ہو گیا جن کے ذمہ ان معابد کا انتظام تھا حالانکہ قدیم ایّام میں ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ آخر ملک کے تمام الگ الگ دیوتاؤں کے کلیسیائی نظام ایک عظیم الشان مقدس تنظیم کے ماتحت متحد ہو گئے۔ اس تنظیم کا رئیس اعلیٰ دارالسلطنت تھیبس کے معبد آمان کا بڑا کاہن تھا۔ اس طرح آمان کے کاہنِ اعظم کی طاقت پہلے کی نسبت کئی گنا بڑھ گئی۔ فراعنۂ مصر نے جب مفتوحہ ممالک سے دولت حاصل کی تو اس کا بیشتر حصہ معبدوں کی نذر کر دیا گیا اور معبد وسیع اور عالیشان

[۱] تاریخ مصر مصنفہ جیمز ہنری بریسٹڈ صفحہ ۶۰۔

[۱] تاریخ ملل قدیمہ مصنفہ سنیوبوسیں ترجمہ اردو سید محمود اعظم فہمی صفحہ ۳۹

محلّات کی صورت اختیار کر گئے۔ جن میں کاہنوں کے گروہ درگروہ رہتے تھے۔ آمان کا کاہنِ اعظم اس مقدس مذہبی تنظیم کا رئیسِ اعلیٰ تھا وہ ایک مقدس شہزادہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اُس کی بیوی "خداوند کی کنیزِ اعلیٰ" کے لقب سے یاد کی جاتی تھی اور اُسے ملکہ کا درجہ حاصل تھا۔"

(تاریخ مصر مصنفہ جیمز ہنری بریسٹڈ پی۔ ایچ ڈی ص۲۴۷ و ص۲۴۸)

آمان دیوتا کا یہ کاہن جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اُس کے یوں تو اور بھی بہت سے خطابات تھے۔ لیکن عرفِ عام میں اُسے "ھَمْ آمان" کہا جاتا۔ جیسا کہ مصرِ قدیم میں رَعْ دیوتا کے بڑے کاہن کو ھَمْ رَعْ اور "کا" دیوتا کے بڑے کاہن کو "ھَمْ کا" کہتے تھے۔

(" THE DWELLERS ON THE NILE"
BY SIR E.A. WALLIS BUDGE, KT.
P. 148, 163, 170)

ھَمْ کے معنے خادم یا غلام کے ہوتے ہیں۔ پس "ھم آمان" کے معنے تھے "آمان دیوتا کا خادم یا غلام" لیکن اصطلاحاً "ہم" بڑے کاہن کو کہتے تھے۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس فرعون کے گھر میں پرورش پائی تھی وہ رعمسیس دوم تھا۔ اور جو آپ کی مخالفت کی وجہ سے تباہ ہُوا وہ منفتاح تھا۔ آمان دیوتا کے بڑے کاہن کا پہلی مرتبہ انتخاب رعمسیس دوم کے زمانہ میں ہُوا تھا اور اسی زمانہ سے آمان کا کاہنِ اعظم فرعون کے نظامِ حکومت کا ممتاز ترین فرد سمجھا جانے لگا تھا۔ چنانچہ اس بارہ میں "الیگزنڈر مارٹ" اپنی کتاب "نیل اور مصر کی تہذیب" میں لکھتا ہے:۔

"رعمسیس دوم نے اپنے عہدِ حکومت کے سالِ اوّل میں "نے بُنْ نیف" کو آمان کا کاہنِ اعلیٰ منتخب کیا۔ یہ شخص اس سے قبل ھاتور دیوتا کا کاہنِ اوّل اور مصر کے سب دیوتاؤں کے کاہنوں کا سردار تھا۔ اور بادشاہ اس کی نشاندہی بھی کر چکا تھا لیکن اُسے باقاعدہ طور پر نامزد اُس وقت کیا گیا جبکہ بادشاہ نے آمان دیوتا کے حضور معبدِ کرناک میں حاضر ہو کر اپنے دربار کے تمام افسروں، تمام کاہنوں اور تمام بزرگوں کو اس عہدہ کے لئے پیش کیا۔ مگر آمان دیوتا نے سوائے "نے بُنْ نیف" کے اور کسی پر رضامندی کا اظہار نہ کیا۔ جب انتخاب عمل میں آچکا تو بادشاہ نے "نے بُنْ نیف" سے مخاطب ہو کر کہا۔ اب آپ ہی آمان کے کاہنِ اعلیٰ ہیں۔ معبدِ آمان کے دونوں خزانے اور اُس کے دوہرے غلّہ کے گودام اب آپ کی مُہر کے ماتحت ہیں۔ ھاتور دیوتا کا معبد اب آپ کے بیٹے کے عصائے حکومت کے تحت ہوگا۔ اور اسی منصب پر قائم ہوگا جو آپ کے لئے مخصوص تھا۔ تمام درباریوں اور اس کے تین ججوں نے اس انتخاب پر بادشاہ اور کاہنِ اعظم کو مبارکباد دی۔ پھر بادشاہ نے اپنی دو خاص طلائی مہریں اور سونے کا شاہی عصا نے بُنْ نیف کو نذر کیا اور اُسے مندرجہ ذیل خطابات کے ساتھ اپنے عہدہ پر فائز کیا:۔

FIRST PROPHET OF AMON

DIRECTOR OF THE DOUBLE TREASURY AND DIRECTOR OF THE SOLDIERS AND ALL THE CRAFTSMEN OF THEBES

یعنی ۱- آمان کا کاہن اعظم
۲- دوہرے خزانوں اور دوہرے گوداموں کا مدارالمہام۔
۳- سپاہ مصر کا ڈائریکٹر
۴- دارالحکومت تھیبس کے تمام کاریگروں اور صنّاعوں کا ناظم و منصرم

"THE NILE AND EGYPTIAN CIVILIZATION"

BY ALEXANDER MORET P. 334

اِس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعونِ مصر کے بعد آمان دیوتا کا بڑا کاہن سب سے زیادہ اثر رسوخ رکھتا تھا۔ اُس کا فوج میں بھی دخل تھا اور مذہبی عمارات کی تعمیر کا کام بھی اُس کے سپرد تھا۔ جیمز ہنری بریسٹڈ بھی اپنی کتاب "تاریخ مصر" میں ھَمْ آمان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

HE (RAMSES II) DIVIDED THESE TROOPS INTO FOUR DIVISION, EACH NAMED AFTER ONE OF THE GREAT GODS: AMON, RE, PTAH AND SUTEKA, AND HIMSELF TOOK THE PERSONAL COMMAND OF THE DIVISION OF AMON.

یعنی رعمسیس دوم نے فوجوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصۂ فوج کو اپنے بڑے دیوتاؤں آمان۔ رع پتاح اور ستیخ میں سے کسی ایک کے نام سے موسوم کیا۔ اِس کے بعد وہ دستۂ فوج جو آمان دیوتا کے نام پر تھا۔ اُس کی کمان اُس نے خود سنبھال لی۔
(صـ ۴۲۵)

اِن حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون مصر کے بعد دوسرے درجہ پر آمان کا کاہن سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ آمان کو تمام دیوتاؤں کا بادشاہ سمجھا جاتا۔ اس لئے آمان کے کاہن کو بھی تمام مذہبی تنظیم کا رئیس اعلیٰ قرار دے دیا گیا۔ اُسے دوہرے خزانوں اور گوداموں کا منصرم اور سپاہِ مصر کا ڈائریکٹر قرار دے دیا گیا۔ اور اُسے اسقدر عظمت حاصل ہوئی کہ فرعونِ موسیٰ کی فوج میں ایک ڈویژن کا نام ہی آمان کے نام پر رکھا گیا۔ اور پھر اس وجہ سے کہ اس کے زیر انتظام تمام مذہبی عمارات کی تعمیر ہُوا کرتی تھی اُسے صنّاعوں کے رئیس اعلیٰ کا خطاب بھی دیا گیا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مصر میں ہر جگہ عالیشان مندر۔ مقابر۔ محلات اور کئی قسم کے بُت اور مورتیاں بنائی جاتی تھیں اور یہ سب کام آمان دیوتا کے کاہن کی نگرانی میں ہی ہُوا کرتا تھا۔ اسی لئے اِسے GREAT CHIEF OF THE ARTIFICORS. یعنی صنّاعوں کے رئیس اعلیٰ کا خطاب بھی دیا گیا۔
(انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ مصر صـ ۶۰)

پس قرآن کریم نے جس شخص کو ھامان قرار دیا ہے وہ کوئی فرضی وجود نہیں بلکہ ایک اہم تاریخی شخصیت ہے جسے مصر قدیم میں ھَمْ آمان یا ھَمْ آمون کہا جاتا تھا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا

اور ہم نے موسیٰؑ کی ماں کی طرف وحی کی تھی کہ اِس کو (یعنی موسیٰ کو) دودھ پلا۔ پس جب تُو اُس (کی جان)

خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا

کے متعلق خائف ہو تو اس کو دریا میں ڈال دے اور ڈر نہیں اور نہ کسی پچھلے واقعہ کی وجہ سے

تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۸

غم کر۔ ہم اسکو تیری طرف لوٹا کے لائیں گے اور اس کو رسولوں میں سے ایک رسول بنائیں گے (چنانچہ موسیٰؑ کی ماں نے اس وحی کے مطابق عمل کیا اور موسیٰ کو دریا میں ڈال دیا)

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ

سو اس کے بعد اس (یعنی موسیٰ) کو فرعون کے خاندان میں سے ایک نے اُٹھا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن وہ اُن کیلئے دشمن ثابت ہوا اور غم کا موجب بنا۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ بائیبل نے موسیٰؑ اور فرعون کے حالات بیان کرتے ہوئے ہامان کا کہیں ذکر نہیں کیا لیکن جبکہ تاریخی شواہد نے ہمیں ایک ایسے وجود کا پتہ دے دیا ہے جو فرعونِ مصر سے دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا تھا اور جس کے نام پر اس نے ایک بڑا بھاری لشکر بھی رکھا ہوا تھا اور جس کے سپرد تمام مذہبی عمارات کی تعمیر کا بھی کام تھا تو بائیبل میں اس کا ذکر نہ آنا اس بات کا ثبوت نہیں کہ قرآن کریم نے نعوذ باللہ کوئی غلط بات کہی ہے بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بائیبل جو موسیٰؑ کے زمانہ میں لکھی گئی اور جو اس زمانہ کے صحیح واقعات بیان کرنے کی دعویدار ہے اُس نے تو ایک تاریخی غلطی کا ارتکاب کیا اور ھامان جیسی شخصیت کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن قرآن کریم نے جو تورات کے دو ہزار سال کے بعد نازل ہوا تھا اُس نے تورات کی اس غلطی کی طرف اشارہ کر دیا اور بتا دیا کہ صحیح بات وہ ہے جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ وہ بات صحیح نہیں جو بائیبل نے بیان کی ہے۔ اِسی وجہ سے قرآن کریم نے اس سورۃ کے شروع میں ہی فرما دیا تھا کہ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ۔ یہ آیات ایک ایسی کتاب کی آیات ہیں جو تمام حقائق کو روشن کرنے والی اور تمام اسرار کو کھولنے والی ہے اور پھر فرما دیا تھا کہ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ ہم بائیبل کے واقعات کو نہیں دوہرا رہے بلکہ موسیٰؑ اور فرعون کے زمانہ کے سچے واقعات بیان کر رہے ہیں۔ مگر اس سے فائدہ صرف وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو اِن باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جن کا کام صرف اعتراض کرنا ہے وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھائیں گے۔ چنانچہ دیکھ لو سیل اور وھیری نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور انہوں نے لکھ دیا کہ اسکا یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تاریخی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ انہوں نے مسیحؑ سے پانچ سو سال پہلے گذرے ہوئے ایک ایرانی بادشاہ کے وزیر ہامان کو موسیٰؑ کا ہمعصر قرار دے دیا مگر تاریخی کُتب نے ظاہر کر دیا کہ اُن کا یہ اعتراض بالکل غلط ہے اور سچی بات وہی ہے جو قرآن نے بیان کی۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹﴾

فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکر غلطی میں مبتلا تھے۔ ۵

اَلْیَمُّ

فَالْتَقَطَهٗ

۵ حل لغات:۔ اَلْیَمُّ: اَلْیَمُّ کے معنے ہیں اَلْبَحْرُ۔ سمندر۔ (اقرب)

فَالْتَقَطَهٗ: اِلْتَقَطَهٗ کے معنے ہیں عَثَرَ عَلَیْهِ مِنْ غَیْرِ تَصْدٍ وَّ لَا طَلَبٍ۔ کوئی چیز بغیر قصد اور تلاش کے مل گئی اور اس نے اُسے اُٹھا لیا۔ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ موسیٰؑ کی پیدائش پر ہم نے اُس کی والدہ کی طرف وحی نازل کی کہ کچھ مدت تک تو تُو اسے دودھ پلاتی رہ۔ مگر جب تجھے اس کی جان خطرے میں نظر آئے اور اس راز کے ظاہر ہو جانے کا ڈر ہو تو تُو اسے دریا میں ڈال دے اور ڈر نہیں اور نہ ہی غم کر۔ کیونکہ ہم اسے ایک دن تیری طرف لوٹا کر لے آئیں گے اور اس کو اپنا رسول بنا دیں گے۔ چنانچہ موسیٰؑ کی والدہ نے ایسا ہی کیا۔ اور اسے سمندر میں ڈال دیا۔ اور چونکہ موسیٰؑ کے ہم خود محافظ تھے اس لئے بجائے اس کے کہ وہ غرق ہوتا۔ فرعون کے خاندان کے بعض آدمیوں نے اُسے اُٹھا لیا تاکہ وہ اُن کا دشمن بنے اور آنیوالے دَور میں اُن کے لئے غم کا موجب ثابت ہو۔ (اسجگہ لام لامِ عاقبت ہے)

قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات بیان کرتے ہوئے سورۃ طٰهٰ میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ انہیں ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈالا جائے یونہی نہیں چنانچہ اس بارہ میں قرآنی الفاظ یہ ہیں کہ اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّیْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ (طٰهٰ آیت ۴۰) یعنی موسیٰؑ کی والدہ سے ہم نے کہا کہ اُسے تابوت میں رکھ دے اور پھر اس تابوت کو دریا میں ڈال دے۔ دریا ہمارے حکم سے اُسے ساحل کی طرف دھکیل دیگا۔ اور اُس کو وہ شخص اٹھا کر اپنے گھر لے جائیگا جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ایسا ہی کیا۔ اور بچے کو سمندر میں ڈال دیا۔

بائبل بھی اس واقعہ کو تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا لیا اور اس پر چکنی مٹی اور رال لگا کر لڑکے کو اُس میں رکھا اور اُسے دریا کے کنارے چھوڑ آئی۔ (خروج باب ۲ آیت ۳)

سرکنڈوں کا ٹوکرا اور تابوت دراصل ایک ہی چیز ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تابوت سے مراد لکڑی کا بکس ہی ہو۔ ہاں یہ ضروری تھا کہ وہ چیز جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رکھا جائے ایسی ہو جس کے اندر پانی داخل نہ ہو سکے۔ اِسی لئے بائبل بتاتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے چکنی مٹی اور رال لگا کر ٹوکرے کے سوراخوں کو بند کیا اور جب اُسے پوری طرح محفوظ کر لیا گیا تو وہ ٹوکرا نہ رہا بلکہ تابوت بن گیا۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ کی تشریح میں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے آسیہ امرأۃ فرعون مراد ہے۔ وہ اُس دن دریا پر غسل کرنے آئی تھی اُس نے جب پانی پر ایک چھوٹا سا تابوت تیرتے ہوئے دیکھا تو اُسے اٹھا لیا اور جب اُسے کھولا اور اُس میں ایک خوبصورت بچہ دکھائی دیا تو اُسے رحم آگیا اور وہ اُسے اپنے گھر لے گئی اور اُس نے بچہ کو پالنا شروع کر دیا

وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ؕ

اور فرعون کی عورت (یعنی فرعون کے خاندان کی ایک عورت) نے کہا۔ یہ تیرے لئے اور میرے لئے آنکھ کی ٹھنڈک کا موجب ہوگا

لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا

اِس کو قتل نہ کرو۔ ممکن ہے کہ ایک دن وہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اِس کو بیٹا بنالیں۔ اور

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى

اور اُن کو اصل حقیقت معلوم نہ تھی ۝ اور موسیٰؑ کی ماں کا دل (غم سے)

فٰرِغًا ۭ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا

فارغ ہوگیا۔ قریب تھا کہ اگر ہم اُس کے دل کو مومن بنانے کے لئے مضبوط نہ کرتے تو

عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقَالَتْ

وہ اس واقعہ کی سب حقیقت ظاہر کردیتی۔ اور اُس

لیکن بائیبل کا یہ بیان ہے کہ فرعون کی بیٹی دریا پر غسل کرنے آئی اور اُس نے جھاؤ میں ایک ٹوکرا پڑے ہوئے دیکھا۔ اُس نے اپنی ایک سہیلی کو بھیجا کہ وہ جا کر اُس ٹوکرے کو اُٹھا لائے۔ جب وہ ٹوکرا اُس کے پاس پہنچا۔ اور اُس نے اُسے کھولا تو اُسے ایک خوبصورت بچہ دکھائی دیا اُسے بچے کو دیکھتے ہی رحم آگیا۔ اور اُس نے موسیٰؑ کی پرورش شروع کردی۔ چونکہ قرآن کریم نے فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں جس میں صاف طور پر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اُسے فرعون کے خاندان اور قبیلہ میں سے کسی نے اٹھایا تھا۔ اس لئے یہاں آلِ فرعون سے اُس کی بیٹی ہی مراد ہے۔ بیوی مراد نہیں۔

۹ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی بیٹی اپنے گھر لے گئی تو فرعون کی بیوی نے اُس کے متعلق فرعون سے سفارش کرتے ہوئے کہا کہ یہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا۔ اور اے فرعون: تیری آنکھوں کی بھی ٹھنڈک ہوگا۔ اس لئے اسے مارو نہیں ممکن ہے یہ ہم کو نفع دے اور ایک اچھا غلام ثابت ہو۔ یا اگر بہت ہی ذہین نکلے تو ہم اسے بیٹا بنا کر پال لیں اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اس میں کیا الٰہی راز ہے اور آئندہ چل کر کیا ظاہر ہونے والا ہے۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی بیٹی نے ہی اُٹھایا تھا اور وہی انہیں اپنے گھر لے گئی تھی۔ لیکن چونکہ کوئی ماں اپنے بیٹے کو اسطرح دریا میں نہیں پھینک سکتی تھی جب تک کوئی شدید خطرہ لاحق نہ ہو اور وہ شدید خطرہ صرف بنی اسرائیل کے لوگوں کو ہی لاحق تھا جن کے بیٹے مارنے کا فرعون نے دائیوں کو حکم دیا ہوا تھا[۱] اس لئے جب وہ

[۱] خروج باب ۱ آیت ۱۶

لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ

(یعنی موسیٰؑ کی ماں) نے اُس (یعنی موسیٰؑ) کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے جا۔ پس وہ اُس کو دُور سے دیکھتی رہی اور

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ

وہ (یعنی فرعون کے لوگ) بے خبر تھے۔ اور ہم نے اُس (یعنی موسیٰؑ) پر اس سے پہلے دودھ پلانے والیوں کو حرام کر دیا

فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ

پس اُس (یعنی موسیٰؑ کی بہن) نے کہا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسے گھر والوں کی خبر دوں جو اس کو تمہارے لئے پال دیں۔

وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۳﴾ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ

اور وہ اِس کے خیر خواہ ثابت ہونگے۔ اِس طرح ہم نے اُس (یعنی موسیٰؑ) کو اُس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ

عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ

اُس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غم نہ کرے اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ ع

لیکن (منکروں میں سے) اکثر جانتے نہیں۔ ۵۵

ع ۱ / ۲

موسیٰؑ کو اٹھا کر اپنے گھر لے گئی تو فرعون نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی اسرائیلی لڑکا ہے اور وہ اُسے قتل کرنے کیلئے تیار ہو گیا۔ مگر فرعون کی بیوی نے سفارش کرتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکی جو کچھ کرتی ہے اِسے کرنے دیں اور اسے میری خاطر مت ماریں۔ ممکن ہے کہ یہ آگے چل کر ہمارے لئے نفع رساں وجود ثابت ہو یا اس کی اعلیٰ قابلیت ظاہر ہونے پر ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ آئندہ زندگی میں کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

۵۵ حل لغات:۔ اَلْفُؤَادُ۔ اَلْفُؤَادُ کے معنے ہیں اَلْقَلْبُ لِتَوَقُّدِهٖ۔ یعنی فُؤَاد دل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ جذبات کا محل ہونے کی وجہ سے بھڑکتا اور جلتا ہے۔ فُؤَادٌ فَادَ سے ہے۔ اور فَادَ اللَّحْمَ فِي النَّارِ کے معنے ہوتے ہیں شَوَاهُ گوشت کو آگ میں بھونا۔ وَقِيْلَ لِتَحَرُّكِهٖ لِاَنَّ اَصْلَ الْفَأْدِ الْحَرَكَةُ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دل کو فُؤَاد اِس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حرکت کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ فَادَ کے اصل معنے حرکت کرنے کے ہیں۔ (اقرب)

اَلْفُؤَادُ

تفسیر:۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر جب اللہ تعالیٰ کی یہ وحی نازل ہوئی اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ اب اللہ تعالیٰ اِس بچہ کی خود حفاظت

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ

اور جب وہ اپنی پختہ جوانی کو پہنچا اور اپنے اعلیٰ اخلاق پر مضبوطی سے قائم ہوگیا تو ہم نے اُسے حکم اور علم بخشا۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۵﴾

اور ہم محسنوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ ۵۸

کریگا اور فرعون اُسے قتل کرنے پر قادر نہیں ہوسکیگا تو اُس کے دل پر سے غم کا بوجھ اُٹھ گیا۔ اور اُسے اتنی خوشی ہوئی کہ اگر ہم اس کے دل کو مومن بنانے کیلئے مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا کہ وہ اس راز کو ظاہر کر دیتی۔

مفسّرین تو اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے اپنے بیٹے کو دریا میں بہا دیا تو اُن کو ہر وقت موسیٰؑ کا خیال ہی رہنے لگ گیا۔ اور کوئی بات انہیں سوجھتی ہی نہیں تھی۔ یہی فکر تھا جو آٹھوں پہر انہیں بے تاب رکھتا تھا۔ مگر یہ معنے بالکل غلط ہیں۔ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا کے صحیح معنے یہ ہیں کہ جب موسیٰؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے انہیں خوشخبری دی کہ فرعون کے حملہ سے وہ محفوظ رہیگا تو اُن کا دل مطمئن ہوگیا اور اُن کا تمام غم جاتا رہا۔ بلکہ انہیں اس بشارت سے اس قدر خوشی ہوئی کہ قریب تھا کہ وہ بول اُٹھتیں اور کہتیں کہ یہ میرا بچہ ہے جس کی حفاظت کا خدا نے وعدہ فرمایا ہے۔ لَتُبْدِىْ بِهٖ میں ضمیر موسیٰؑ کی طرف بھی جاسکتی ہے یعنی اُن کا حال بتا دیتی اور اس امر کی طرف بھی جا سکتی ہے کہ یہ واقعہ لوگوں کو سُناتی پھرتیں کہ مجھے اس طرح الہام ہوُا اور پھر میں نے اُس کی تعمیل میں اس اس طرح کیا۔ اگر اُن کو موسیٰؑ کے متعلق کوئی خطرہ لاحق ہوتا تو اُن کے بول اُٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بولنے کا خیال تو انہیں تبھی آسکتا تھا جبکہ وہ خوش ہوتیں اور موسیٰؑ کی زندگی کے متعلق وہ پوری طرح مطمئن ہوتیں۔

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ۔ پھر انہوں نے موسیٰؑ کی بہن سے کہا کہ تُو اس کے پیچھے پیچھے جا۔ چنانچہ وہ دُور سے اُس کو دیکھتی رہی اور فرعونیوں کو اس کا پتہ نہ لگا۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ۔ اور ہم نے اس سے پہلے اسپر دودھ پلانیوالیوں کو حرام کر دیا۔ اس آیت کے دونوں معنے ہوسکتے ہیں۔ یہ بھی کہ کوئی دائی اُس وقت میسر نہ آئی اور یہ بھی کہ موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے دوسری دائیوں کا دودھ پینے سے انکار کر دیا۔ اس پر موسیٰؑ کی بہن نے کہا کہ میں تمہیں ایک گھر کا پتہ دیتی ہوں جس کے افراد اس کو پال لیں گے اور وہ اس کی ہر طرح خیر خواہی کریں گے۔ اس طرح ہم نے موسیٰؑ کو اُس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اُس کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں اور وہ غم نہ کرے اور جان لے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہوتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اپنی بیوقوفی سے ان باتوں کو نہیں جانتے۔

۵۸ حل لغات:۔ اَشُدَّهٗ: محاورہ میں کہا جاتا ہے بَلَغَ فُلَانٌ اَشُدَّهٗ اور اس کے معنے ہوتے ہیں تَوَقَّدَهٗ وَهُوَ مَا بَيْنَ ثَمَانِىْ عَشَرَةَ اِلٰى ثَلَاثِيْنَ۔ یعنی فلاں اپنی جوانی کو پہنچا اور یہ زمانہ ۱۸ سے ۳۰ سال کی عمر کا ہوتا ہے۔ (اقرب)

اَشُدَّهٗ

تفسیر:۔ فرماتا ہے جب موسیٰؑ اپنی جوانی کو

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ

اور (ایک دن) وہ شہر میں ایسے وقت میں آیا کہ لوگ غفلت کی حالت میں تھے (یعنی آرام سے اپنے گھروں میں سوئے

فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۫ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا

تھے دوپہر کو یا آدھی رات کو) اُس نے اُس شہر میں دو آدمیوں کو دیکھا کہ آپس میں لڑ رہے تھے۔ ایک اُسکے دوستوں کے گروہ میں تھا اور

مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى

دوسرا اُس کے دشمنوں میں سے تھا۔ پس اُس نے جو اُس کی جماعت میں سے تھا اُس شخص کے خلاف جو

الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ

اُس کے دشمنوں میں سے تھا اُس کی مدد طلب کی۔ اِس پر موسیٰؑ نے اُس (یعنی دشمن) کو ایک گھونسا مارا۔ اور اُس (گھونسے) نے

قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ عَدُوٌّ

اُس کا کام تمام کر دیا۔ پھر موسیٰؑ نے کہا۔ یہ سب واقعہ شیطانی کرتوت سے ہُوا ہے۔ وہ (یعنی شیطان) (مومن کا) دشمن

مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ

اور اُسے امن کے راستہ سے کھُلا کھُلا بہکانے والا ہے۔ پھر (موسیٰؑ نے دُعا کی کہ) اے میرے رب میں نے اپنی جان کو تکلیف

فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷﴾

میں ڈال دیا ہے پس تو میرے اِس فعل پر پردہ ڈال دے۔ سو اُس نے اس فعل پر پردہ ڈال دیا۔ وہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے

پہنچا۔ اور وہ اپنے اعلیٰ اخلاق پر مضبوطی سے قائم ہوگیا تو ہم نے اسے حکم اور علم بخشا اور ہم محسنوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

جہاں تک لغت کا تعلق ہے بَلَغَ فُلَانٌ اَشُدَّهٗ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ ۱۸ سال سے ۳۰ سال کی عمر تک پہنچ گیا۔ (اقرب) لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ کوئی خاص عمر نبوت پر فائز ہونے کے لئے مقرر ہے انبیاء کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف زمانوں میں مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہوئے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مسیحیوں اور مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ وہ تیس سال کے تھے۔ جب خدا نے اُنکو نبی بنایا (طبری جلد ۲ صفحہ ۲۱ و لوقا باب ۳ آیت ۲۳) اسی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کی عمر تیس سال سے بھی کم تھی جب اُن کو نبوت ملی۔ (تفسیر خازن زیر آیت وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا) پس تاریخ کو مدّ نظر

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ فَلَنۡ اَکُوۡنَ ظَہِیۡرًا لِّلۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۸﴾

تب اُس (یعنی موسیٰؑ) نے عرض کی اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھ پر انعام کیا ہے مَیں بھی کبھی مجرموں کی کسی مجرم کی مدد نہیں کروں گا۔[۵۹]

رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر زمانہ کے حالات کے ماتحت ہر مامور کا زمانہ بعثت الگ الگ ہوتا ہے۔ پس بَلَغَ اَشُدَّہٗ کے زمانہ کی تعیین نہ تو لغوی طور پر ہم کر سکتے ہیں اور نہ ہی تاریخی طور پر۔

۵۹ حل لغات: ۔ وَکَزَ : وَکَزَہٗ کے معنے ہیں دَفَعَہٗ۔ اُس کو ہٹایا۔ وَکَزَ فُلَانًا کے معنے ہیں ضَرَبَہٗ بِجَمْعِ الْکَفِّ۔ مٹھی بھینچ کر اُس کو مارا۔ وَقَالَ الْکِسَائِیُّ وَکَزَہٗ لَکَمَہٗ۔ کسائی کہتے ہیں کہ وَکَزَ کے معنے ہیں مُکّا مارا۔

ظَہِیْر : اَلظَّہِیْرُ کے معنے ہیں اَلْمُعِیْنُ مددگار۔ (اقرب)

تفسیر: ۔ یہ آیات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کو بیان کرتی ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسجگہ ترتیب زمانی کا ذکر نہیں کیونکہ قرآن کریم کی دوسری آیات سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت مدین سے واپسی کے وقت ہوئی۔ لیکن یہ واقعہ جو اس آیت میں بتایا گیا ہے مدین جانے سے پہلے کا ہے۔ پس اسجگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کا بیان کرنا مقصود ہے جو آپ کی بعثت کا موجب تھا۔ نہ کہ ترتیب زمانی کا بیان کرنا مقصود ہے۔ یہ واقعہ اس طرح پر ہوا کہ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام رات کے وقت (عَلٰی حِیْنِ غَفْلَۃٍ) شہر میں داخل ہوئے اور انہوں نے دو آدمیوں کو آپس میں لڑتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک اُنکی قوم کا تھا اور ایک ان کے دشمنوں میں سے تھا۔ معلوم ہوتا ہے وہ شخص جو اُن کا ہم قوم تھا عبرانی زبان بولتا تھا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پتہ لگ گیا کہ یہ شخص میری قوم میں سے ہے اور آپ نے اُس کی مدد کرنا ضروری سمجھا۔

یہاں اَعْدَآءِہٖ کی جگہ عَدُوِّہٖ کا لفظ اسلئے رکھا گیا ہے کہ عَدُوِّہٖ سے قوم کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور قوم کی صفت مفرد بھی آسکتی ہے۔ پس ھٰذَا مِنْ عَدُوِّہٖ سے یہ مراد ہے کہ دوسرا شخص اُنکے دشمن قوم میں سے تھا۔ تب اُن کو دیکھ کر وہ شخص جو اُنکی قوم میں سے تھا اُس نے اُس شخص کے خلاف جو اُنکی دشمن قوم میں سے تھا۔ مدد کی درخواست کی اور حضرت موسیٰؑ علیہ السلام نے یہ دیکھ کر کہ اگر مَیں نے مدد نہ کی تو فرعونی قوم کا آدمی اسرائیلی کو مارنے پر تُلا ہوا ہے آگے بڑھکر اُس شخص کو ایک گھونسہ مارا۔ یا تو موقعہ کی نزاکت کی وجہ سے انہوں نے گھونسہ بہت زور سے مارا یا اُس شخص کا دل یا جگر طبعی طور پر کمزور تھا اور وہ گھونسہ اُس کے دل یا جگر کے مقام پر لگا۔ اور وہ مرگیا۔ اِس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ۔ یہ بات غصہ میں ہوگئی ہے۔ شیطان کے معنے غضب کے بھی ہوتے ہیں کیونکہ شَیْطَانٌ کا مادہ شَطَنَ بھی ہے اور شَاطَ بھی۔ اگر شَاطَ اس کا مادہ مانا جائے تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ وہ شخص جو غصہ سے آگ بگولہ ہو جائے۔ چنانچہ شَاطَ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں اِحْتَرَقَ کوئی چیز جل گئی اور اِسْتَشَاطَ غَضَبًا کے معنے ہوتے ہیں غصہ سے آگ بگولہ ہوگیا۔ پس اسجگہ شَیْطَان کا لفظ غضب کے معنوں میں ہی

وَکَزَ

ظَہِیْر

فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَۃِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا

اس کے بعد وہ شہر میں صبح کے وقت دشمنوں سے خوف کرتا ہوا اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا نکلا۔ تو

الَّذِی اسْتَنْصَرَہٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُہٗ ؕ قَالَ

کیا دیکھتا ہے کہ جس نے اُس سے کل مدد طلب کی تھی وہ پھر اُسے مدد کیلئے بُلا رہا ہے۔ اس پر موسیٰ نے

لَہٗ مُوْسٰۤی اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۹﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ

اُس سے کہا۔ تُو یقیناً ایک کھُلا کھُلا گمراہ ہے۔ پس جب اُس نے

اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ ہُوَ عَدُوٌّ لَّہُمَا ۙ

ارادہ کیا کہ اُس شخص کو پکڑلے جو اِن دونوں کا دشمن تھا تو

قَالَ یٰمُوْسٰۤی اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ کَمَا قَتَلْتَ

اُس (شخص) نے کہا کہ اے موسیٰ! کیا تُو چاہتا ہے کہ تُو مجھے قتل کردے جس طرح تو نے کل ایک اور

استعمال ہُوا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اِنَّہٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ۔ یہ غصہ انسان کا بڑا دشمن ہے اور اُسے پریشان خاطر کر دیتا ہے۔ چنانچہ ضَلَّ النَّاسِیْ کے معنے ہوتے ہیں غَابَ عَنْہُ حِفْظُ الشَّیْءِ کوئی بات یاد نہ رہی یا ذہن سے نکل گئی (اقرب) تب انہوں نے سوچا کہ اب فرعون اور اُس کی قوم تو میرے دشمن ہو جائیں گے۔ اور دُعا کی کہ اے میرے رب! اپنی قوم کے ایک آدمی کو مصیبت میں دیکھ کر میں نے اپنے نفس کو تکلیف میں ڈال دیا ہے پس میری خاطر اس مصیبت پر پردہ ڈال دے۔ غَفَرَ کے اصل معنے پردہ ڈالنے کے ہوتے ہیں۔ خواہ مصیبت پر پردہ ڈالنے کے ہوں۔ خواہ گناہ پر پردہ ڈالنے کے۔ چنانچہ غَفَرَ الشَّیْءَ غَفْرًا کے معنے ہوتے ہیں سَتَرَہٗ اُس کو ڈھانپ دیا (اقرب) اسجگہ فَاغْفِرْ لِیْ کے معنے

مصیبت پر پردہ ڈالنے کے ہی ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس مصیبت پر اس طرح پردہ ڈال دیا کہ گورنمنٹ کا کوئی آدمی اس موقعہ پر نہ آیا۔ اور پھر بعد میں بھی خدا تعالیٰ نے آپکی حفاظت فرمائی اور فرعونی حکومت آپ کو قتل کرنے کے ارادہ میں ناکام رہی اور خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی مصیبت کو دُور کرنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ اے خدا! چونکہ تُو نے مجھ پر ایک بڑا احسان کیا ہے آئندہ میں کبھی مجرم کا مددگار نہیں ہونگا۔ واقعہ سے تو ظاہر ہے کہ جس شخص کی انہوں نے مدد کی تھی وہ مجرم نہیں تھا۔ لیکن اِس آیت میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کیلئے مجرم کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے روحانی طور پر یہ اندازہ لگایا نہ کہ واقعاتی طور پر۔ انہوں نے سمجھا کہ میں نے تو نیک دلی سے اس

نَفْسًا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا

شخص کو قتل کیا تھا۔ تُو صرف یہ چاہتا ہے کہ کمزوروں کو ملک میں

فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۲۰﴾

دبا دے اور اصلاح کرنے والوں میں شامل ہونا تیری غرض نہیں۔ ؎

شخص کی مدد کی تھی۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ فرعونی قوم کا ایک آدمی مارا گیا۔ اور مَیں مصیبت میں پڑ گیا۔ پس یہ نتیجہ بتاتا ہے کہ شاید خدا تعالیٰ کی نظر میں اس شخص کا کوئی جُرم تھا۔

؎ حل لغات:۔ یَتَرَقَّبُ۔ تَرَقَّبَ سے مضارع معروف واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تَرَقَّبَہٗ کے معنے ہیں اِنْتَظَرَہٗ۔ اُس کا انتظار کیا (اقرب)

مفردات میں ہے۔ تَرَقَّبَ: اِحْتَرَزَ رَاقِبًا یعنی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اپنی حفاظت کی۔ پس یَتَرَقَّبُ کے معنے ہونگے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اپنی حفاظت کرتا ہے۔

یَسْتَصْرِخُہٗ: اِسْتَصْرَخَ سے فعل مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِسْتَصْرَخَہٗ کے معنے ہیں اِسْتَغَاثَہٗ اُسے مدد کے لئے بلایا (اقرب) پس یَسْتَصْرِخُہٗ کے معنے ہیں وہ دوسرے کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔

تفسیر:۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام صبح کے وقت پھر شہر کی گشت کے لئے نکلے۔ اور اس بات کو تاڑ رہے تھے کہ کوئی میرا پیچھا تو نہیں کرتا۔ اُسوقت انہوں نے اچانک دیکھا۔ کہ وہ شخص جو کل اُن سے مدد مانگ رہا تھا پھر اُن کو مدد کے لئے بلا رہا ہے چونکہ وہ روحانی طور پر سمجھ چکے تھے کہ غالباً پہلے دن بھی اُس کا کوئی قصور تھا۔ دوسرے انہوں نے یہ سمجھا کہ ایک ہی شخص کو ساری دنیا مارنے پر کیوں تیار ہوگئی ہے معلوم ہوتا ہے یہ شخص بھی جوشیلا ہے اور لوگوں کو بھڑکا دیتا ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ۔ اے شخص تُو بڑا فسادی معلوم ہوتا ہے۔ غَوِيٌّ غَوِیَ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کے ایک معنے فساد کے بھی ہوتے ہیں (لسان العرب) پھر جب انہوں نے یہ سمجھ کر کہ بظاہر حالات میں تو دوسرا شخص ہی ظالم ہے۔ اُس دوسرے شخص کو پکڑنے کے لئے قدم اُٹھایا تو چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مونہہ سے اپنی قوم کے آدمی کو کہا تھا کہ تُو بڑا فسادی معلوم ہوتا ہے اُس نے سمجھا کہ شاید مجھے مارنے کے لئے موسیٰؑ آگے بڑھ رہا ہے۔ اور بے سوچے سمجھے چِلّا اُٹھا کہ اے موسیٰؑ! کیا تُو یہ چاہتا ہے کہ آج مجھے مار دے جس طرح کل تُو نے ایک اور شخص کو مارا تھا۔ تُو کمزور لوگوں کو دبا کر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور اصلاح تیری نیّت نہیں۔

جَبَّار اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے اور اس کے معنے لوگوں کی حاجات پوری کرنیوالے کے ہوتے ہیں۔ لیکن جب کسی غیر اللہ کے متعلق جبّار کا لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے سرکش اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کے ہوتے ہیں (اقرب) اُس کے شور مچانے پر ارد گرد کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ موسیٰؑ ہی

یَتَرَقَّبُ

یَسْتَصْرِخُہٗ

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی ز قَالَ

اور اُس وقت ایک شخص شہر کے دُور کے حصّہ سے دوڑتا ہُوا آیا - اور کہا -

یٰمُوْسٰٓی اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ

اے موسٰیؑ! (ملک کے) رؤساء مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں -

فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۱﴾ فَخَرَجَ

پس، (میری بات مُن اور) اس شہر سے نکل جا - میں تیرے خیرخواہوں میں سے ہوں - تب وہ اُس شہر سے

مِنْهَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ ز قَالَ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ

ڈرتے ہوئے نکل گیا - اور وہ ہوشیاری سے اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا تھا - اُس وقت اُس نے دُعا کی اور کہا اے میرے ربّ:

الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾ ع

مجھے ظالم قوم سے نجات دے - ۵۱ا

۲ع ۵

پہلے دن یعنی رات کے پہلے حصّہ میں ایک شخص کو مار چکے ہیں - اور چونکہ وہ مقتول فرعونی قوم کا تھا - جس طرح آج کا حملہ آور بھی فرعونی قوم کا تھا - اس لئے یہ خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی اور فرعونیوں میں جوش پیدا ہوگیا -

۵۱ا تفسیر:- تب ایک شخص شہر کے دوسرے علاقہ سے دوڑتا ہُوا آیا - جہاں یہ خبر پہلے پہنچ گئی تھی اور اُس نے موسٰیؑ سے کہا کہ اے موسٰیؑ! سردارانِ قوم تیرے قتل کرنے کا مشورہ کر رہے ہیں - پس میں ایک خیرخواہ کے طور پر تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ شہر سے بھاگ جا - اس پر موسٰیؑ اُسی وقت شہر سے بھاگ گئے - اور چاروں طرف دیکھتے بھی جاتے تھے کہ میرا کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا - اور دُعا کرتے جاتے تھے کہ الٰہی فرعون کی قوم ظالم ہے - میں دو دفعہ دیکھ چکا ہوں کہ فرعونیوں کا آدمی ایک اسرائیلی کو قتل کرنا چاہتا ہے - پس تُو مجھے اُن کے مظالم سے نجات دے اور وہاں سے انہوں نے مدین کا رُخ کیا -

مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام تھا جو قتورہ کے بطن سے تھے - ان کا ذکر بائیبل کی کتاب پیدائش باب ۲۵ میں آتا ہے - جہاں لکھا ہے کہ :-

" ابراہام نے پھر ایک اَور بیوی کی - جس کا نام قطورہ تھا - اور اُس سے زمران اور یُقسان اور مدان اور مدیان اور اسباق اور سُوخ پیدا ہوئے - "

(آیت ۱ و ۲)

چونکہ قدیم زمانہ میں اولاد بھی اپنے باپ کے نام سے پکاری جاتی تھی اس لئے مدین سے جو نسل پیدا ہوئی

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ

اور جب وہ مدین شہر کی طرف چلا - تو اُس نے کہا۔ مجھے اُمید ہے کہ میرا رب مجھے

يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ

سیدھا راستہ دکھادیگا - اور جب وہ مدین شہر کے چشمہ کے پاس آیا -

وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۟ وَوَجَدَ

تو اُس نے اُس پر لوگوں کا ایک گروہ کھڑا دیکھا جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے - اور اُن سے

مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ

پیچھے ہٹ کر کھڑی دو عورتیں دیکھیں جو اپنے جانوروں کو ہجوم سے پرے ہٹا رہی تھیں۔ موسٰی نے اُن سے کہا تم دونوں کو کیا اہم کام

قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ

درپیش ہے۔ اسپر دونوں عورتوں نے کہا ہم پانی نہیں پلا سکتیں جب تک کہ دوسرے چرواہے چلے نہ جائیں اور ہمارا باپ بہت بوڑھا

كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ

ہے (اسلیئے ہمارے ساتھ نہیں آسکا) پس اُس نے اُن دونوں کی خاطر (جانوروں کو) پانی پلایا۔ پھر ایک سایہ کی طرف ہٹ گیا۔ پھر کہا۔

رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾

اے میرے رب! اپنی بھلائی میں سے جو کچھ تو مجھ پر نازل کرے میں اُس کا محتاج ہوں۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۫ قَالَتْ

اِس کے بعد اُن دونوں لڑکیوں میں سے ایک چلتی ہوئی آئی اور وہ شرما رہی تھی - اور اُس نے کہا۔

وہ بھی مدین ہی کہلائی اور پھر اِس قوم نے جو مرکزی شہر بنایا اُس کا نام بھی مدین ہی رکھا۔ یہ شہر خلیج عقبہ کے پاس تھا۔ یعنی بحیرہ احمر جہاں ختم ہونے لگتا ہے وہاں اُس کی ایک شاخ مصر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے اور دوسری شاخ عرب کے

ساحل کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے۔ جو شاخ عرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ جاتی ہے اُس کو خلیج عقبہ کہتے ہیں۔ مدین شہر خلیج عقبہ کے پاس عرب کی طرف سمندر کے بالکل قریب واقعہ تھا۔ عرب سے جو قافلے مصر کو جاتے تھے وہ بھی مدین کے راستے سے ہی ہو کر جاتے تھے

اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْکَ لِیَجْزِیَکَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا

میرا باپ تجھے بلاتا ہے تاکہ تجھے ہماری جگہ پر (جانوروں کو) پانی پلانے کا اجر عطا کرے۔

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫

پس جب وہ اُس (یعنی لڑکیوں کے باپ) کے پاس آیا اور اُس کے آگے (اپنا) سارا واقعہ بیان کیا تو اُس نے کہا۔ ڈر نہیں۔

نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۶﴾

تو اب ظالم قوم کے پنجہ سے نجات پا گیا ہے۔ ۱۲؎

اصل مدین شہر تو اب موجود نہیں لیکن اس نام کی کئی بستیاں چھوٹے چھوٹے قصبات کی شکل میں اب بھی وہاں ملتی ہیں۔

۱۲؎ حل لغات:۔ تَذُوْدٰنِ: ذَادَ یَذُوْدُ (ذَوْدًا و ذِیَادًا) سے مضارع تثنیہ مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور ذَادَ کے معنے ہیں طَرَدَهٗ وَ دَفَعَهٗ۔ اُسے دھتکارا اور ہٹایا۔ (اقرب) پس تَذُوْدٰنِ کے معنے ہونگے۔ وہ دونوں ہٹا رہی تھیں۔

تَذُوْدٰنِ

خَطْبُکُمَا: اَلْخَطْبُ کے معنے ہیں اَلْاَمْرُ الْعَظِیْمُ الَّذِیْ یَکْثُرُ فِیْهِ التَّخَاطُبُ (مفردات راغب) ایسا اہم معاملہ جس میں کثرت سے باہم گفت و شنید کی جائے۔

خَطْبُکُمَا

یُصْدِرُ: اَصْدَرَ سے فعل مضارع ہے۔ اور اَصْدَرَ فُلَانًا کے معنی ہیں ذَهَبَ بِهٖ۔ اُسے لے گیا۔ (اقرب) پس یُصْدِرُ کے معنے ہونگے۔ وہ لے جاتا ہے یا لے جائیگا۔

یُصْدِرُ

اَلرِّعَاءُ: اَلرَّاعِیْ کی جمع ہے۔ رَاعِیْ چرواہے کو کہتے ہیں۔ نیز اس کے معنے ہیں کُلُّ مَنْ وَلِیَ اَمْرَ قَوْمٍ۔ ہر وہ شخص جو قوم کے کسی معاملہ کا ذمہ دار ہو (اقرب) پس اَلرِّعَاءُ کے معنے ہونگے۔ چرواہے۔

اَلرِّعَاءُ

تفسیر: حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مدین کی طرف چلے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (یوسف ع۱۱ آیت ۹۵) یعنی اگر تم میرے متعلق یہ نہ کہنا شروع کردو کہ یہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے اور اِسے ہر وقت یوسف کا ہی خیال رہتا ہے۔ تو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اب یوسف کی ہوا آرہی ہے، اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی ملاقات کے دن اب دروازہ پر کھڑے ہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اُس وقت مدین کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آئی اور آپ نے فرمایا۔ عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ۔ مجھے امید ہے کہ اب میرا رب مجھے اِس منزل پر پہنچا دیگا۔ جو میرے لئے خیر اور برکت کا موجب ہوگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دُعا سُن لی اور جب وہ مدین کے چشمہ پر پہنچے تو اُس کے اردگرد انہوں نے ایک جماعت دیکھی جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہی تھی۔ اور اس جماعت سے پرے کھڑی ہوئی انہوں نے دو عورتیں دیکھیں جو اپنے جانوروں کو پانی سے ہٹا رہی تھیں تاکہ وہ لوگوں کے ہجوم میں گھس کر کہیں گم نہ ہو جائیں اِس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن عورتوں کی طرف بڑھے اور اُن سے کہا کہ مَا خَطْبُکُمَا تم دونوں کو کیا اہم کام درپیش ہے جس کا تمہیں فکر لاحق ہے۔ خَطْبٌ کے معنے خاص حالت کے بھی ہوتے ہیں اور خَطْبٌ ہر اہم امر کو

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ز اِنَّ خَيْرَ مَنِ

اِس پر اُن (دونوں لڑکیوں) میں سے ایک نے کہا۔ اے میرے باپ! اِسکو تو ملازم رکھ لے کیونکہ جن کو تو ملازم رکھے

اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۷﴾ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ

اُن میں سے بہتر شخص وہی ہوگا جو مضبوط بھی ہو اور امانت دار بھی۔ تب وہ شخص بولا (اے موسٰی) میں چاہتا ہوں

اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ

کہ اِس شرط پر اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا تجھ سے نکاح کر دوں۔ کہ تو

تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا

آٹھ سال تک میری خدمت کرے۔ پس اگر تو آٹھ کے عدد کی جگہ پر دس کے عدد سے اپنے

فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ

وعدہ کو مکمل کر دے تو یہ تیرا احسان ہوگا۔ اور میں تجھ پر کوئی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔

سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۸﴾

اگر اللہ نے چاہا تو تو مجھے نیک معاملہ کرنیوالوں میں سے پائیگا۔

بھی کہتے ہیں۔ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ (اقرب)

اُن دونوں نے کہا کہ ہماری عادت ہے کہ جب تک چرواہے پانی پلا کر اپنے جانوروں کو واپس نہ لے جائیں ہم پانی نہیں پلایا کرتیں۔ کیونکہ ان اوباشوں کے گروہ میں ملنا ہمیں پسند نہیں۔ پھر انہوں نے خیال کیا کہ ہماری اِس بات سے یہ نو وارد ہمارے باپ یا ہمارے رشتہ داروں کی نسبت بدظنی کرے گا کہ وہ آپ کیوں نہیں آتے اور لڑکیوں کو کیوں بھیجتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے جھٹ یہ فقرہ اپنی پہلی بات پر زائد کر دیا۔ کہ ہمارا صرف باپ ہے اور وہ بوڑھا ہے۔ وہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ اِس پر موسٰیؑ کو اُن لڑکیوں پر رحم آیا۔

اور انہوں نے لڑکیوں کے جانور لیکر اُس چشمہ سے اُنکو پانی پلوا دیا۔ پھر بغیر کسی مزدوری یا کسی شکریہ کی اُمید ظاہر کرنے کے ایک درخت کی طرف چلے گئے اور اُس کے سایہ میں بیٹھ گئے اور خدا تعالیٰ سے دُعا کی کہ رَبِّ اِنِّيْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ۔ یعنی اے میرے ربّ! میں تو اِس ملک میں مسافر اور اکیلا ہوں۔ اور میرے پاس کچھ نہیں تُو جو کچھ بھی بھلائی کا سامان میرے لئے کرے میں اُس کا محتاج ہوں۔ چنانچہ وہ تھوڑی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ اس کے بعد اُن دونوں بہنوں میں سے ایک، شرماتی ہوئی اُن کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرا باپ تجھے بلاتا ہے تاکہ تیرے پانی پلانے

قَالَ ذٰلِكَ بَيۡنِيۡ وَبَيۡنَكَ ؕ اَيَّمَا الۡاَجَلَيۡنِ

(اس پر موسیٰؑ نے) کہا۔ یہ بات میرے اور تیرے درمیان پختہ ہوگئی۔ اِن دونوں مدتوں میں سے جو بھی

قَضَيۡتُ فَلَا عُدۡوَانَ عَلَىَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا

مَیں پوری کردوں مجھ پر کوئی الزام نہیں ہوگا اور جو کچھ ہم

نَقُوۡلُ وَكِيۡلٌ ﴿۲۹﴾ ع

کہتے ہیں اللہ اُس پر گواہ ہے ۱۳ھ

ع ۳ / ۶

کی اُجرت تجھے دے۔

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيۡهِ الۡقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفۡ نَجَوۡتَ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ۔ جب موسیٰ علیہ السلام اُس کے باپ کے پاس آئے۔ تو باتوں باتوں میں انہوں نے اپنا سارا واقعہ سُنا ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کا واقعہ سُنکر اُن لڑکیوں کے باپ نے کہا۔ کہ اب تُو کسی بات سے مت ڈر تو ظالم قوم سے نجات پا چکا ہے۔

۱۳ھ حل لغات:۔ حِجَجٍ: حِجَجٌ، حِجَّةٌ کی جمع ہے اور اَلْحِجَّةُ کے معنے ہیں اَلسَّنَةُ۔ سال (اقرب) پس حِجَجٍ کے معنے ہونگے کئی سال۔

حِجَجٍ

تفسیر:۔ ان دونوں بہنوں میں سے ایک نے یہ خیال کرکے کہ ہمیں ہر روز چشمہ پر جانے کی وجہ سے یہاں کے اوباش آدمیوں سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ وہ قسم قسم کی بیہودہ باتیں کرتے ہیں۔ ور مذاق اور چھیڑ خانی کرتے ہیں۔ اگر ہمارا باپ اس آدمی کو نوکر رکھ لے تو ہم اس مصیبت سے نجات پا جائیں گی۔ اپنے باپ سے کہا کہ اے باپ! اسکو نوکر رکھ لیں۔ کیونکہ سب سے زیادہ نوکر رکھنے کے قابل وہی شخص ہوتا ہے جو کہ مضبوط بھی ہو اور امانتدار بھی۔ معلوم ہوتا ہے جس دلیری سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اوباش چرواہوں کو دھکے دے کر چشمہ کے پاس جانوروں کو لے گئے تھے اس سے ان لڑکیوں نے نتیجہ نکالا کہ موسیٰ مضبوط آدمی ہے اور جس طرح اس کے بعد آنکھیں جھکائے درخت کے نیچے جا بیٹھے تھے اور ان لڑکیوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اس سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص امانت دار ہے۔ باپ لڑکیوں سے واقعہ سُنکر پہلے ہی یہ نتیجہ نکال چکا تھا۔ اور چونکہ وہ بھی سکون کے لحاظ سے مالدار نہیں تھا گو کچھ جانور اُس کے پاس تھے اس لئے اُس نے فوراً تجویز پیش کردی کہ مَیں چاہتا ہوں کہ ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا تجھ سے نکاح کردوں اس شرط پر کہ تُو آٹھ سال میری خدمت کرے پھر اگر آٹھ کو بڑھا کر دس کا عدد پورا کرے تو یہ تیرا احسان ہوگا۔ اور مَیں تجھ پر سختی کرنا نہیں چاہتا۔ یعنی میں آٹھ پر ہی قائم رہونگا اور اس پر زور نہیں دونگا کہ تُو دس سال ضرور پورے کرے۔ تُو انشاء اللہ معاملہ پڑنے پر دیکھیگا کہ مَیں ہمیشہ نیک سلوک کیا کرتا ہوں۔ کبھی سختی نہیں کیا کرتا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ چلیئے میرے اور آپ کے درمیان معاہدہ ہوگیا۔ مَیں ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی پوری کروں وہ جائز ہوگی اور مجھ سے یہ اُمید نہ رکھی جائیگی کہ مَیں ضرور دس سال والی مدت پوری کردوں۔ اور چونکہ ایسے امور کے لئے گواہ کی

ضرورت ہوتی ہے۔ مَیں یہ کہتا ہوں کہ ہم دونوں اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر اپنے اس عہد کا گواہ قرار دیتے ہیں۔

انہیں آیات سے استدلال کرتے ہوئے اگر کوئی شخص مہر کے متعلق مجھ سے مشورہ لے تو مَیں اُسے یہ مشورہ دیا کرتا ہوں کہ اپنی چھ ماہ کی آمد سے ایک سال تک کی آمد بطور مہر مقرر کر دو۔ اور میرا یہ مشورہ دو وجوہ پر مبنی ہوتا ہے۔ اوّل تو اس امر پر کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے "الوصیّت" کے قوانین میں دسویں حصّہ کی شرط رکھوائی ہے گویا اسے بڑی قربانی قرار دیا ہے۔ اِس بنا پر میرا خیال ہے کہ اپنی آمدنی کا دسواں حصّہ باقی اخراجات کو پورا کرتے ہوئے مخصوص کر دینا معمولی قربانی نہیں بلکہ ایسی بڑی قربانی ہے کہ جس کے بدلہ میں ایسے شخص کو جنّت کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اس حساب سے ایک سال کی آمد جو گویا متواتر دس سال تک کی آمد کا دسواں حصہ ہوتا ہے بیوی کے مہر میں مقرر کر دینا مہر کی اغراض کو پورا کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ بلکہ میرے نزدیک انتہائی حد ہے۔ لیکن "الوصیّت" کے ارشاد کے علاوہ قرآن مجید کی اِن آیات سے بھی اِس کی تائید ملتی ہے۔ اِن آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آٹھ سال بطور مہر کام کرنے کا ذکر آتا ہے اور انہیں بڑھا کر دس سال بھی کام کرنے کی اجازت ہے۔ گویا اِس واقعہ میں بھی آٹھویں حصہ بلکہ دسویں حصّہ کی آمد کو اللہ تعالیٰ نے انتہائی قربانی سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس سے یہ مراد تو نہیں کہ اس آٹھ یا دس سال کے عرصہ تک حضرت موسیٰ علیہ السلام خود کچھ کھاتے پیتے اور پہنتے نہیں تھے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر اُن کے اور اُن کی بیوی کے اخراجات ادا کرتے ہونگے۔ ان اخراجات کو ادا کرنے کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس تنخواہ کے حضرت موسیٰ علیہ السلام حقدار تھے اس کا دسواں حصّہ بطور امانت اُن کے خسر کے پاس رہتا تھا اور اُسے انہوں نے لڑکی کا مہر قرار دیا تھا۔

بائیبل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر کا نام کہیں تو یترو بتایا ہے جیسا کہ خروج باب ۳ سے ظاہر ہے اور کہیں رعوایل بتایا ہے جیسا کہ خروج باب ۲ آیت ۱۸ سے ظاہر ہے۔ لیکن قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر کا کہیں نام نہیں بتایا۔ البتہ مسلمان مفسرین نے لکھا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ خُسر حضرت شعیب علیہ السلام تھے جو مدین قوم کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ مگر میرے نزدیک یہ درست نہیں اسلئے کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت قوم شعیبؑ کی تباہی کے بعد ہوئی تھی جیسا کہ سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ قوم شعیبؑ کی ہلاکت کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے۔ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا۔ (اعراف ع ۱۳) یعنی اس قوم کی ہلاکت کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف کھلی کھلی آیات کے ساتھ مبعوث کیا مگر انہوں نے ظلم سے کام لیا۔ پس جبکہ قرآن کریم بوضاحت بتا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت شعیبؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ہوئی تھی تو حضرت شعیب علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خسر قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْۤ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَاۤ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ۔ (ہود ع ۸) یعنی اے میری قوم دیکھنا کہیں میری دشمنی تمہیں اِس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اپنے لئے ویسی ہی مصیبت سہیڑ لو جیسی نوحؑ یا ہودؑ یا صالحؑ کی قوم پر آئی تھی۔

اور لوطؑ کی قوم تو تم سے کچھ ایسی دُور بھی نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت لوطؑ کی قوم کے قریب عرصہ بعد ہوئے ہیں۔ پس حضرت شعیبؑ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں قرار دینا اور انہیں آپ کا خُسر بتانا ان آیات کی رُو سے درست نہیں ہو سکتا پس میرے نزدیک یہ صحیح نہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام اُنکے خُسر تھے۔ آپ کے خُسر کا یترو نام ہو یا رعوایل یا کچھ اور بہرحال وہ اَور شخص ہیں اور حضرت شعیب علیہ السلام اَور شخص ہیں۔ یہ قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت تک تباہ ہو چکی تھی۔ اور آپ کے زمانہ میں صرف اُسکی نسل کا کچھ بقیہ موجود تھا۔ اُس کی اصل شان و شوکت بالکل زائل ہو چکی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعوئے نبوّت سے پہلے زندگی کے یہ حالات جو قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں اُن کے متعلق قرآن کریم نے اس سورۃ کے ابتداء میں یہ امر واضح فرما دیا تھا کہ ہم یہ واقعات بائبل کی نقل کے طور پر بیان نہیں کر رہے بلکہ موسیٰؑ کی زندگی کے صحیح واقعات بیان کر رہے ہیں اور پھر یہ واقعات صرف ایک قصّہ کے طور پر نہیں بلکہ ان واقعات میں مومن قوم کے لئے بڑے بھاری نشانات ہیں یعنی انہیں یقین رکھنا چاہیئے کہ جس طرح موسیٰؑ کی خدا تعالیٰ نے تائید فرمائی اور اُن کے ذریعہ اُس نے ایک بے کس اور مظلوم قوم کو بادشاہ بنا دیا۔ اسی طرح وہ لوگ جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے بیشک انہیں اسرائیلیوں کی طرح مارا پیٹا جائیگا۔ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں انہیں اپنی جانوں اور اموال کے علاوہ اپنی آئندہ نسلوں کی بھی قربانی کرنی پڑے گی۔ مگر جس طرح خدا تعالیٰ نے فرعون کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا تھا اور بنی اسرائیل کو اُسی قسم کی نعماء کا وارث کر دیا تھا جو فرعون اور اُسکے ساتھیوں کو میسّر تھیں اُسی طرح اللہ تعالیٰ اس زمانہ کے طاقتور بادشاہوں کو بھی جو فرعون کی طرح خدائی احکام کے سامنے اپنا سر جُھکانے کے لئے تیار نہیں ہونگے سزا دیگا اور اُن کی حکومتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کا ایک ایک ورق اس پیشگوئی کی تصدیق کر رہا ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت واضح کر رہا ہے۔

ان واقعاتِ قرآنی کا بائبل کے جن امور میں اختلاف پایا جاتا ہے وہ یہ ہیں:۔

اوّل:۔ بائبل نے اس امر کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اللہ تعالیٰ نے الہاماً یہ حکم دیا تھا کہ جب موسیٰؑ کی جان کے متعلق تمہیں خطرہ لاحق ہو تو اُسے دریا میں ڈال دینا۔ بلکہ وہ اس تدبیر کو خود امّ موسیٰؑ کی طرف منسوب کرتی ہے۔ لیکن قرآن کریم اس امر کو واضح فرماتا ہے کہ امّ موسیٰؑ کو یہ خیال خود بخود نہیں آیا۔ بلکہ ہمارے حکم سے اُس نے ایسا کیا۔ اگر امّ موسیٰؑ کا یہ ذاتی فعل ہوتا اور خدائی تائید اُسکے پیچھے کام کر رہی نہ ہوتی تو موسیٰؑ کی سلامتی اور اُس کی شاہی گھرانے میں پرورش کے جو واقعات بعد میں ظاہر ہوئے وہ کبھی نہ ہوتے۔ یہ واقعات خود اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ جو کچھ ہُوا الٰہی منشاء کے ماتحت ہُوا۔

دوم:۔ بائبل یہ بیان کرتی ہے کہ موسیٰؑ کی والدہ نے

> "سرکنڈوں کا ایک ٹوکرہ لیا۔ اور اُس پر چکنی مٹی اور رال لگا کر لڑکے کو اُس میں رکھا اور اُسے دریا کے کنارے جھاؤ میں چھوڑ آئی۔"
>
> (خروج باب ۲ آیت ۳)

گویا بائبل کے نزدیک انہیں یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ہاتھ سے انہیں دریا میں ڈال دیں۔ زیادہ سے

زیادہ انہوں نے یہ کیا کہ دریا کے کنارے ایک جھاؤ میں جاکر انہیں چھپا دیا - اور پھر بائیبل یہ بھی بیان کرتی ہے کہ فرعون کی بیٹی جب دریا پر غسل کرنے گئی اور اُس نے جھاؤ میں ایک ٹوکرا پڑا دیکھا تو اُس نے اپنی سہیلی کو بھیجا کہ وہ جاکر ٹوکرا اٹھا لائے - چنانچہ لکھا ہے :-

" فرعون کی بیٹی دریا پر غسل کرنے آئی اور اُس کی سہیلیاں دریا کے کنارے کنارے ٹہلنے لگیں - تب اُس نے جھاؤ میں وہ ٹوکرا دیکھ کر اپنی سہیلی کو بھیجا کہ اُسے اُٹھا لائے - جب اُس نے اُسے کھولا تو لڑکے کو دیکھا اور وہ بچہ رو رہا تھا - اُسے اُسپر رحم آیا اور کہنے لگی کسی عبرانی کا بچہ ہے - تب اُس کی بہن نے فرعون کی بیٹی سے کہا - کیا میں جاکر عبرانی عورتوں میں سے ایک دائی تیرے پاس بلالاؤں جو تیرے لئے اس بچہ کو دودھ پلایا کرے - فرعون کی بیٹی نے کہا - جا - وہ لڑکی جاکر بچے کی ماں کو بلالائی - فرعون کی بیٹی نے اُسے کہا - تو اِس بچے کو لے جاکر میرے لئے دودھ پلا - میں تجھے اُجرت دیا کرونگی وہ عورت اس بچے کو لے جاکر دودھ پلانے لگی جب بچہ کچھ بڑا ہُوا تو وہ اُسے فرعون کی بیٹی کے پاس لے گئی - اور وہ اُس کا بیٹا ٹھہرا - اور اُس نے اُس کا نام موسیٰ یہ کہکر رکھا کہ میں نے اسے پانی سے نکالا - "

(خروج باب ۲ آیت ۵ تا ۱۰)

لیکن تعجب ہے کہ بائیبل ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ موسیٰؑ کی والدہ نے اپنے بچے کو جھاؤ میں جاکر چھپا دیا اور یہ بھی کہتی ہے کہ فرعون کی بیٹی نے بھی اُسے جھاؤ میں سے ہی اُٹھایا - مگر دوسری طرف وہ یہ بھی بیان کر رہی ہے کہ فرعون کی بیٹی نے اُس کا نام موسےٰ یہ کہہ کر رکھا کہ " میں نے اِسے پانی سے نکالا " جب موسیٰ پانی میں ڈالا ہی نہیں گیا تھا بلکہ ایک جھاؤ میں چھپا کر رکھ دیا گیا تھا اور جب فرعون کی بیٹی نے بھی اُسے پانی سے نہیں نکالا بلکہ اسے جھاؤ میں سے اٹھایا تو اُس کا نام موسیٰ کیوں رکھا گیا - اور اُس نے یہ کیوں کہا کہ میں نے اس کا نام موسیٰ اس لئے رکھا ہے کہ میں نے اِسے پانی سے نکالا ہے - بائیبل کے اس حوالہ کا آخری فقرہ صاف بتا رہا ہے کہ موسیٰؑ پانی سے نکالا گیا تھا - جس کے دوسرے لفظوں میں یہی معنے ہیں کہ موسیٰؑ کی والدہ نے بھی انہیں دریا میں ہی ڈالا تھا - اور یہی حقیقت قرآن کریم نے بیان کی ہے پس قرآن کریم بائیبل کی اِس غلطی کو واضح کرتا ہے کہ موسیٰؑ کو انکی والدہ نے جھاؤ میں جاکر رکھ دیا تھا اور بتاتا ہے کہ انہیں جھاؤ میں جاکر نہیں رکھا گیا بلکہ ایک تابوت میں بند کرکے دریا میں بہا دیا گیا تھا -

سوم :- بائیبل حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگاتی ہے کہ انہوں نے عمدًا ایک مصری کو مار کر ریت میں چھپا دیا - چنانچہ بائیبل کہتی ہے :-

" جب موسیٰ بڑا ہُوا تو باہر اپنے بھائیوں کے پاس گیا - اور اُن کی مشقتوں پر اس کی نظر پڑی اور اُس نے دیکھا کہ ایک مصری اُس کے ایک عبرانی بھائی کو مار رہا ہے - پھر اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ کی - اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے تو اُس مصری کو جان سے مار کر اُسے ریت میں چھپا دیا - پھر دوسرے دن وہ باہر گیا اور دیکھا کہ دو عبرانی آپس میں مار پیٹ کر رہے ہیں - تب اُس نے اُسے جس کا قصور تھا کہا کہ تو اپنے ساتھی کو کیوں مارتا ہے؟ اُس نے کہا تجھے کس نے ہم پر حاکم یا منصف مقرر کیا؟ کیا جس طرح تو نے اُس مصری کو مار ڈالا

مجھے بھی مار ڈالنا چاہتا ہے؟ تب موسیٰ یہ
سوچکر ڈرا کہ بلا شک یہ بھید فاش ہو گیا۔
جب فرعون نے یہ سُنا تو چاہا کہ موسٰے
کو قتل کرے پر موسیٰ فرعون کے حضور سے
بھاگ کر ملکِ مدیان میں جا بسا۔"

(خروج باب ۲ آیت ۱۱ تا ۱۵)

بائیبل کے اِس بیان میں بعض باتیں قرآنی بیان سے مختلف دکھائی دیتی ہیں لیکن ہر شخص جو معمولی عقل و سمجھ بھی اپنے اندر رکھتا ہو دونوں بیانات پر نظر ڈالنے سے فوراً اندازہ لگا سکتا ہے کہ اِن دونوں بیانات میں سے قرآنی بیان عقلی لحاظ سے صحت اور سچائی کے زیادہ قریب ہے۔ مثلاً پہلی بات تو یہی ہے کہ بائیبل کہتی ہے جب موسیٰؑ نے ایک مصری شخص کو اپنی قوم کے ایک فرد سے لڑتے دیکھا تو موسیٰؑ نے پہلے اِدھر اُدھر جھانکا کہ کوئی پولیس مین تو نہیں کھڑا۔ اور جب تسلی ہو گئی تو آگے بڑھ کر اس مصری کو مار دیا۔ اور اُسے ریت میں چھپا دیا۔ گویا بائیبل موسیٰؑ پر قتلِ عمد کا الزام لگاتی ہے اور کہتی ہے کہ موسیٰؑ کا ارادہ ہی اُسے مار ڈالنے کا تھا۔ چنانچہ اُس نے احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا تاکہ گرفت نہ ہو سکے اور پھر اُسے قتل کر کے ریت میں چھپا دیا مگر قرآن بتاتا ہے کہ موسیٰؑ نے جب دونوں کو لڑتے دیکھا تو موسیٰؑ خود بخود آگے نہیں بڑھے بلکہ پہلے اُن کی قوم سے تعلق رکھنے والے فرد نے انہیں اپنی مدد کے لئے آواز دی۔ اِس پر موسیٰؑ بغیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے فوری طور پر اُس کی مدد کے لئے پہنچ گئے اور آپنے مصری کو ایک گھونسہ مارا اور آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ اسے قتل کریں مگر سوءِ اتفاق سے وہ کسی نازک مقام پر جا لگا اور اس کی موت واقع ہو گئی۔

پس قرآن کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتلِ عمد کے الزام سے بری ٹھہراتا ہے مگر بائیبل جو موسیٰؑ کو خدا کا نبی بھی قرار دیتی ہے وہ بڑی دلیری سے کہتی ہے کہ موسیٰؑ نے جان بُوجھ کر اُس مصری کو قتل کیا۔ پھر دوسرے دن جو واقعہ ہُوا اُس میں بھی قرآن یہ کہتا ہے کہ اُس روز پھر وہی عبرانی اور ایک اور مصری آپس میں لڑ رہے تھے مگر بائیبل کہتی ہے کہ اُس روز کسی مصری سے لڑائی نہیں ہوئی۔ بلکہ دو عبرانی آپس میں لڑ رہے تھے۔ حالانکہ اگر دونوں عبرانی تھے تو موسیٰؑ کو اُس میں دخل دینے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ موسیٰؑ کا دخل دینا بتاتا ہے کہ پھر یہ جھگڑا ایک قومی سوال بن گیا تھا جس کے لئے انہیں دخل دینا پڑا۔ اِسی طرح بائیبل کہتی ہے کہ

"تب اُس نے اُسے جس کا قصور تھا کہا کہ
تُو اپنے ساتھی کو کیوں مارتا ہے"

حالانکہ موسیٰؑ کو کس طرح پتہ لگ سکتا تھا کہ دونوں میں سے قصوروار کون ہے۔ جب دونوں اُنکی اپنی قوم کے افراد تھے اور دونوں آپس میں اُلجھ رہے تھے تو موسیٰؑ کو یہ کس طرح پتہ لگ گیا کہ قصوروار کون ہے اور انہوں نے کس بنا پر اُسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ یہ بات بتاتی ہے کہ بائیبل سے اس واقعہ کے بیان کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اصل واقعہ وہی تھا جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے کہ اُس روز بھی مصری قوم کے ایک فرد سے لڑائی ہو رہی تھی۔ مگر بائیبل جو انسانی دست بُرد کا شکار ہو چکی ہے اس میں یہ لڑائی دو عبرانیوں کی طرف منسوب کر دی گئی ہے۔ انجیل نے بھی سچا واقعہ بیان کرنے کی بجائے موسیٰؑ کو ہی ملزم قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:-

"پھر دوسرے دن وہ باہر گیا۔ اور
دیکھا کہ دو عبرانی آپس میں مار پیٹ کر رہے
ہیں۔ تب اُس نے اُسے جس کا قصور تھا
کہا کہ تُو اپنے ساتھی کو کیوں مارتا ہے؟

اُس نے کہا۔ تجھے کس نے ہم پر حاکم یا مُنصف مقرر کیا؟ کیا جس طرح تُو نے اُس مصری کو مار ڈالا مجھے بھی مار ڈالنا چاہتا ہے؟"

(خروج باب ۲ آیت ۱۳ و ۱۴)

اِسی طرح اعمال میں لکھا ہے:-

"پھر دوسرے دن وہ اُن میں سے دو لڑتے ہوؤں کے پاس آنکلا اور یہ کہہ کر انہیں صلح کرنے کی ترغیب دی کہ اے جوانو! تم تو بھائی بھائی ہو کیوں ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہو؟ لیکن جو اپنے پڑوسی پر ظلم کر رہا تھا اُس نے یہ کہہ کر اُسے ہٹا دیا کہ تجھے کس نے ہم پر حاکم اور قاضی مقرر کیا؟ کیا تُو مجھے بھی قتل کرنا چاہتا ہے جس طرح کل اُس مصری کو قتل کیا تھا؟ موسیٰؑ یہ بات سُنکر بھاگ گیا اور مدیان کے ملک میں پردیسی رہا کیا۔ اور وہاں اُس کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔"

(آیت ۲۶ تا ۲۹)

مگر جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے قرآن کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ دوسرے دن بھی ایک مصری اور عبرانی ہی لڑ رہے تھے اور پھر یہ کہ وہی عبرانی لڑ رہا تھا جس سے کل جھگڑا ہوا تھا۔ کوئی نیا عبرانی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے موسیٰؑ سے کہا کہ کیا تُو چاہتا ہے کہ جس طرح تُو نے کل اُس مصری کو مار دیا تھا اُسی طرح آج مجھے مار ڈالے۔ اگر کوئی اَور عبرانی ہوتا تو اُسے کل کے اس واقعہ کا کس طرح علم ہو سکتا تھا اور اُسے کیونکر پتہ لگ سکتا تھا کہ کل جو واقعہ ہوا تھا وہ موسیٰؑ کے ہاتھ سے ہی ہوا تھا۔ یہ الفاظ جو تورات اور انجیل دونوں میں نقل کئے گئے ہیں خود اس بات کی اندرونی شہادت ہیں کہ یہ وہی شخص تھا جس نے کل لڑائی کی تھی کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔

اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ بائبل ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ موسیٰؑ نے جس آدمی کو مارا تھا۔ اُسے اُس نے ریت میں چُھپا دیا تھا جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ معاملہ بالکل مخفی رہا۔ مگر پھر وہی بائبل یہ بیان کرنا شروع کر دیتی ہے کہ دوسرے دن ایک اَور عبرانی نے کہہ دیا کہ کیا تُو مجھے بھی اُسی طرح مارنا چاہتا ہے جس طرح تُو نے کل ایک آدمی کو مار دیا تھا۔ گویا یہ واقعہ تمام لوگوں میں مشہور ہو چکا تھا۔ حالانکہ جس شخص کو نظروں سے بچا کر ریت میں چُھپا دیا گیا ہو اُس کی موت کا دوسروں کو علم ہی کیونکر ہو سکتا ہے۔ اسکا علم تو صرف ایک شخص کو تھا۔ پس یہ فقرہ لازماً اُسی شخص کے مُنہ سے نکل سکتا تھا جس نے پہلے دن کے واقعہ کو دیکھا تھا ورنہ کوئی دوسرا شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ بائبل کے نزدیک مقتول کو ریت میں چُھپا دیا گیا تھا اور اُس کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔

چہارم:- بائبل کہتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بھاگ کر مدین پہنچے تو

"وہاں وہ ایک کنوئیں کے نزدیک بیٹھا تھا۔ اور مدیان کے کاہن کی سات بیٹیاں تھیں وہ آئیں اور پانی بھر بھر کر کٹھروں میں ڈالنے لگیں تاکہ اپنے باپ کی بھیڑ بکریوں کو پلائیں۔ اور گڈریے آکر اُن کو بھگانے لگے لیکن موسیٰ کھڑا ہو گیا اور اُس نے اُن کی مدد کی اور اُن کی بھیڑ بکریوں کو پانی پلایا۔"

(خروج باب ۲ آیت ۱۵ تا ۱۷)

د۔ گویا بائبل کہتی ہے کہ مدین کے کاہن کی سات بیٹیاں پانی لینے کے لئے آئیں۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ اُس کی صرف دو لڑکیاں اپنے جانوروں کو پانی پلانے کیلئے آئی تھیں۔ یہ فرق اس لئے ہے کہ قرآن کریم میں حضر

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ

جب موسیٰؑ نے وقت مقررہ کو پورا کر لیا اور اپنے گھر والوں کو لے کے چلا تو اُس نے

جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ

طُور کی طرف سے ایک آگ دیکھی - (اور) اپنے گھر والوں سے کہا تم یہاں ٹھہرو میں نے

اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ

ایک آگ دیکھی ہے شاید میں وہاں سے تمہارے لئے کوئی (ضروری) خبر لاؤں - یا کوئی آگ کا

مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّآ اَتٰىهَا

انگارہ لاؤں تاکہ تم سینکو - پھر جب وہ اُس (آگ) کے پاس پہنچا

نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ

تو مبارک مقام کے ایک مبارک حصّہ کی طرف سے

الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ

ایک درخت کے پاس سے اُسے پکارا گیا کہ اے موسیٰ! میں

بڑی لڑکیوں کا ذکر کیا گیا ہے. کیونکہ آگے چل کر اُنکے بیاہ کا معاملہ پیش آنے والا تھا. لیکن بائیبل نے اس کے خلاف چھوٹی بڑی سب لڑکیوں کا ذکر کر دیا۔

ب - پھر قرآن کہتا ہے کہ وہ لڑکیاں آگے نہیں بڑھیں بلکہ شرم وحیا کی وجہ سے اپنے جانوروں کو روک کر الگ کھڑی رہیں تاکہ دوسرے لوگ فارغ ہو لیں تو پھر وہ اپنے جانوروں کو پانی پلائیں۔ مگر بائیبل کہتی ہے کہ وہ پہلے سے پانی بھر رہی تھیں مگر گڈریوں نے آکر انہیں روک دیا۔ حالانکہ جب وہ کنوئیں پر اُن سے پہلے پہنچ چکی تھیں اور پانی بھی بھر رہی تھیں تو بعد میں آکر گڈریوں کا انہیں روکنا خلاف عقل بات ہے،

ج - بائیبل کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ جب گڈریوں نے اُن لڑکیوں کو بھگایا تو موسیٰؑ کھڑے ہوگئے اور انہوں نے لڑکیوں کی مدد کی۔ گویا دوسرے الفاظ میں انہوں نے گڈریوں سے لڑائی کی اور سختی کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا۔ مگر قرآن بتاتا ہے کہ اُسوقت موسیٰؑ نے کوئی مقابلہ نہیں کیا بلکہ لڑکیوں کی صرف اس رنگ میں مدد کی کہ اُن کے جانوروں کو آگے بڑھ کر پانی پلا دیا۔ اور عقل بھی قرآن کریم کے بیان کی ہی تصدیق کرتی ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام اُس وقت ایک اجنبی علاقہ میں تھے بالکل بے سروسامانی کی حالت میں تھے۔ کوئی دوست اور مددگار اُن کا نہیں تھا ایسی حالت میں وہ اُن سے لڑائی کس طرح

اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ

اللہ ہوں سب جہانوں کا رب ۔ اور یہ کہ تُو اپنا عصا پھینک دے ۔

فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ

پس جب اُس نے اُس (یعنی عصا) کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا گویا کہ وہ ایک چھوٹا سانپ ہے، وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور

لَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ

پیچھے مڑ کر نہ دیکھا ۔ (تب اُسے کہا گیا) اے موسیٰ! آگے بڑھ اور ڈر نہیں ۔ تُو

مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۲﴾ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ

سلامتی پانے والے لوگوں میں سے ہے ۔ (اور) اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال ۔

تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّ اضْمُمْ اِلَيْكَ

وہ بغیر کسی بیماری کے سفید نکلے گا ۔ اور اپنے بازو کو خوف کی وجہ سے (زور سے) کھینچ کر (اپنے جسم سے)

جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ

ملا لے ۔ یہ دو دلیلیں (علاوہ دوسری دلیلوں کے)

مول لے سکتے تھے ۔ انہوں نے صرف ہمدردی اور خدمتِ خلق کے نقطۂ نگاہ سے اُن لڑکیوں کی مدد کی اور اُن کے جانوروں کو پانی پلا دیا ۔

پھر بائبل نے یہ نہیں بتایا کہ جب لڑکیوں نے اپنے باپ سے یہ واقعہ بیان کیا اور اُن کے باپ نے کہا کہ

"تم اسے کیوں چھوڑ آئیں ۔ اُسے بلا لاؤ کہ روٹی کھائے ۔" (خروج باب۲ آیت۲۰)

تو آیا ساتوں لڑکیاں انہیں بلانے کے لئے آئی تھیں یا دو یا چار ۔ مگر قرآن کریم بتاتا ہے کہ صرف ایک لڑکی آئی تھی اور وہ بھی شرماتی ہوئی ۔ اور اُس نے اپنے باپ کا

آپ کو پیغام دیا ۔

اِسی طرح بائبل نے اس معاہدہ کا کوئی ذکر نہیں کیا جو موسیٰؑ اور اُن کے خُسر کے درمیان ہُوا تھا ۔ صرف اتنا لکھ دیا کہ

"موسیٰ اُس شخص کے ساتھ رہنے کو راضی ہو گیا ۔" (خروج باب۲ آیت۲۱)

حالانکہ بتانا یہ چاہیئے تھا کہ موسیٰؑ کا خُسر انہیں رکھنے پر راضی ہو گیا ۔ ورنہ موسیٰؑ تو چاہتے ہی تھے کہ انہیں کوئی ٹھکانہ مل جائے جہاں وہ رہائش اختیار کر سکیں ۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ موسیٰؑ اور اُن کے خُسر کے درمیان ایک معاہدہ ہُوا تھا ۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام آٹھ

مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا

جو فرعون اور اُس کے درباریوں کی طرف تیرے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہیں ۔ کیونکہ وہ

قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۳۲ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ

اطاعت سے نکلنے والے لوگ ہیں ۔ (موسیٰ نے) کہا ۔ اے میرے رب! میں نے فرعون کی قوم میں سے ایک شخص کو قتل کیا تھا

نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝۳۳ وَاَخِىْ هٰرُوْنُ

پس میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل نہ کر دیں (اور تیرا پیغام نہ پہنچ سکے) اور میرا بھائی ہارون

هُوَ اَفْصَحُ مِنِّىْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِىَ رِدْاً

بات کرنے میں مجھ سے زیادہ فصیح ہے ۔ پس اُس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج ۔

يُّصَدِّقُنِىْٓ ۡ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۝۳۴

تاکہ وہ میری تصدیق کرے ۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب نہ کریں ۔

یا دس سال تک اُس کی خدمت کرنے کو تیار ہو گئے تھے ۔ چنانچہ بائبل نے اس معاہدہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ۔ مگر اتنا اُسے بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ

"موسیٰ اپنے خسر یترو کی جو مدیان کا کاہن تھا بھیڑ بکریاں چراتا تھا ۔"

(خروج باب ۳ آیت ۱)

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ قرآن کریم نے جس معاہدہ کا ذکر کیا ہے اُسی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ کام کیا کرتے تھے ۔

غرض قرآن کریم کو یہ عظیم الشان فضیلت حاصل ہے کہ اُس نے دو ہزار سال کے بعد نازل ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے صحیح واقعات دنیا کے سامنے پیش کئے جب کہ تورات نے موسیٰ کی کتاب کہلا کر کئی واقعات کو چھوڑ دیا اور کئی واقعات کو غلط بیان کر دیا ۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے اس سورۃ کے شروع میں ہی یہ بیان فرما دیا تھا کہ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ یہ آیات ایک ایسی کتاب کی آیات ہیں جو تمام ضروری باتوں کو کھول کر بیان کرنے والی ہے یعنی بے شک تورات بھی کتاب ہے مگر انسانی دست بُرد کا شکار ہونے کی وجہ سے اب اس سے استفادہ ناممکن ہو۔ کتاب مبین جو تمام سربستہ رازوں سے پردہ اُٹھانے والی اور تمام احکام کو دلائل کے ساتھ پیش کرنے والی ہے وہ صرف قرآن کریم ہی ہے ۔ اور اسی کی اقتدا ء نوعِ انسانی کو نجات دلا سکتی ہے ۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا

فرمایا۔ ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرے بازو کو مضبوط کرینگے اور تم دونوں کے لئے

سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا مع

غلبہ کے سامان پیدا کریں گے پس وہ تم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ تم دونوں اور جو تم دونوں کے متبع ہونگے

وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۶﴾

ہماری آیات کے ذریعہ سے غالب ہونگے۔ ۱۴

۱۴ حل لغات:۔ اٰنَسَ: اٰنَسَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں اَبْصَرَہٗ۔ اُسے دیکھا۔ نیز اٰنَسَ الصَّوْتَ کے معنے ہیں سَمِعَہٗ وَاَحَسَّ بِہٖ۔ آواز کو سُنا اور محسوس کیا۔ پس اٰنَسْتُ کے معنے ہونگے۔ مَیں نے دیکھا۔

جَذْوَۃ: اَلْجَذْوَۃُ کے معنے ہیں اَلْجَمْرَۃُ الْمُلْتَهِبَۃُ۔ سُلگتا ہوا انگارہ۔

تَصْطَلُوْنَ: تَصْطَلُوْنَ اِصْطَلٰی سے فعل مضارع معروف جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور اِصْطَلٰی بِالنَّارِ اِصْطِلَاءً کے معنے ہیں اِسْتَدْفَاَ بِهَا آگ سینکی۔ (اقرب)

شَاطِئ: شَاطِئُ الْوَادِی کے معنے ہیں جَانِبُہٗ وادی کا کنارہ (مفردات)

تَهْتَزُّ: اِهْتَزَّ سے فعل مضارع معروف واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اِهْتَزَّتِ الْاِبِلُ کے معنے ہیں تَحَرَّكَتْ فِیْ سَیْرِهَا۔ یعنی اونٹ تیز رفتاری سے چلے۔ اور اِهْتَزَّ الْمَآءُ فِیْ جَرَیَانِہٖ کے معنے ہیں تَخَلْخَلَ۔ پانی خوب بہ پڑا۔ (اقرب) پس تَهْتَزُّ کے معنے ہونگے۔ وہ تیزی سے چلتا ہے۔

جَآنٌّ۔ جَنَّ سے اسم فاعل ہے اور جَآنٌّ پوشیدہ رہنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ اِسْمُ جَمْعٍ مِنَ الْجِنِّ۔ جنّ کا اسم جمع ہے۔ نیز جَآنٌّ کے معنے ہیں حَیَّۃٌ بَیْضَاءُ کَحْلَاءُ الْعَیْنِ لَا تُؤْذِیْ۔ سفید رنگ کا سانپ جس کی آنکھیں سُرمگیں ہوتی ہیں اور کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔

رِدْءًا: اَلرِّدْءُ کے معنے ہیں اَلْعَوْنُ۔ مددگار اَلنَّاصِرُ۔ مددگار۔ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے جب موسیٰؑ نے پیش کردہ مدّت پوری کرلی اور اپنے اہل کو لے کر چل پڑا۔ تو راستہ میں طُور کی طرف اُس نے ایک آگ کا شعلہ دیکھا اور اپنے اہل سے کہا کہ ذرا یہیں ٹھہرو۔ مَیں نے ایک قسم کی آگ دیکھی ہے۔ مَیں وہاں جارہا ہوں۔ ممکن ہے کہ مَیں وہاں سے تمہارے لئے کوئی خبر لاؤں۔ یا اُس آگ میں سے کوئی انگارہ لاؤں جس سے تم سینکو۔ جب وہ اُس آگ کے پاس آیا تو اُس مبارک زمین کے ایک مبارک حصہ کی طرف ایک درخت کی جہت سے آواز آئی۔ (یعنی موسیٰؑ کو الہام ہوا) کہ اے موسیٰ! مَیں اللہ ربّ العالمین ہوں۔ پھر دوسرا الہام یہ ہوا کہ اے موسیٰ! تُو اپنا عصا پھینک دے موسیٰؑ نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جب اُس نے اُسے ایک چھوٹے سانپ کی طرح تیزی سے ہلتے ہوئے دیکھا تو وہ پیٹھ پھیر کر

(حاشیہ: اٰنَسَ، رِدْءًا، جَذْوَۃ، تَصْطَلُوْنَ، شَاطِئ، تَهْتَزُّ، جَآنٌّ)

۵ طُور کی تشریح کیلئے دیکھیں تفسیر کبیر سورۃ تین جلد ۹

بھاگا۔ اور اُس نے پیچھے مڑکر بھی نہ دیکھا۔ ہم نے کہا۔ اے موسیٰ! آ اور ڈر نہیں۔ تُو سلامتی پانے والوں میں سے ہے۔ پھر ہم نے کہا کہ اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال وہ بغیر کسی بیماری کے سفید نکلے گا۔ اور اپنے بازو کو خوف کی وجہ سے اپنے جسم سے چمٹا لے۔ یہ دو دلیلیں تیرے رب کی طرف سے تجھے ملی ہیں تاکہ تو ان کو فرعون اور اُس کے سرداروں کے سامنے پیش کرے کیونکہ وہ ایک اطاعت سے نکلی ہوئی قوم ہے۔ موسیٰؑ نے کہا۔ اے میرے رب! فرعون کی قوم کا ایک آدمی میرے ہاتھ سے مارا جا چکا ہے اِس لئے مَیں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں مجھے دیکھتے ہی قتل نہ کردیں اور تیرا پیغام فرعون اور اُس کے سرداروں کو نہ پہنچ سکے۔ اور اے میرے رب! میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصاحت رکھنے والا ہے۔ اُس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر مقرر فرما دیجیئے۔ تاکہ وہ میرے دعاوی کی تصدیق کرے اور میری صداقت اور راستبازی پر گواہی دے۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ صرف میری زبان سے اس پیغام کو سُنکر وہ پُرانی عداوت کی وجہ سے فوراً ہی جھٹلانے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تیرے بھائی کو تیرے ساتھ ہی مبعوث کرکے تیری مدد کریں گے اور تمہارے لئے اپنے پاس سے دلائل مہیا کریں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فرعون اور اُس کے ساتھی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ بلکہ تم دونوں اور تمہارے اتباع ہمارے نشانوں کے ذریعہ غالب رہو گے۔

اِن آیات میں نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیِٔ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ سے یہ مُراد نہیں کہ درخت نے کہا کہ مَیں اللہ سب جہانوں کی ربوبیت کرنے والا ہوں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس جگہ حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ الہام ہُوا۔ اور انہیں یوں معلوم ہُوا جیسے الہام کی آواز درخت کی طرف سے آرہی ہے۔

وَاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ

میں بازو سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ تمہارا بنی اسرائیل کو اپنے وجود سے دُور رکھنا خطرے کا موجب ہوگا۔ پس تُو اس خوف سے کہ وہ کہیں بے دین نہ ہوجائیں انہیں ہمیشہ اپنے ساتھ چمٹائے رکھیو۔ اور اُن کی نیک تربیت کی طرف توجہ رکھیو۔

یہ واقعہ بھی ایسا ہے جس میں بائیبل اور قرآن کریم کے بیان کردہ امور میں بعض اختلافات پائے جاتے ہیں مثلاً اوّل:- بائیبل کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی مدین میں ہی تھے کہ ایک دن اپنے خُسر کی بھیڑ بکریوں کو چراتے ہوئے وہ حورب پہاڑ پر جا پہنچے اور وہاں

> "خداوند کا فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلہ میں سے اُس پر ظاہر ہُوا۔"

اور خداوند تعالیٰ نے انہیں فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا۔ اِس کے بعد لکھا ہے:-

> "موسیٰ لوٹ کر اپنے خُسر یترو کے پاس گیا اور اُسے کہا کہ مجھے ذرا اجازت دے کہ اپنے بھائیوں کے پاس جو مصر میں ہیں جاؤں اور دیکھوں کہ وہ اب تک جیتے ہیں کہ نہیں۔ یترو نے موسیٰ سے کہا سلامت جا۔ اور خداوند نے مدیان میں موسیٰ سے کہا کہ مصر کو لوٹ جا کیونکہ وہ سب جو تیری جان کے خواہاں تھے مر گئے۔ تب موسیٰ اپنی بیوی اور بیٹوں کو لے کر اور اُنکو ایک گدھے پر چڑھا کر مصر کو لوٹا۔"

(خروج باب ۴ آیت ۱۸ تا ۲۰)

لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس وقت بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے نہیں گئے تھے۔ بلکہ میعاد مقررہ پوری ہو جانے کے بعد اپنے اہل کو لیکر کسی دوسری جگہ تشریف لے جا رہے تھے کہ راستہ میں اللہ تعالیٰ اُن سے ہمکلام ہُوا۔ اور اُس نے انہیں رسالت کے مقام پر کھڑا کرکے فرعونِ مصر کی طرف جانے کا حکم دیا۔

دوّم :- بائیبل کہتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا گیا۔ تو انہوں نے بار بار انکار کیا اور کہا کہ

"مَیں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں
اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لاؤں۔"
(خروج باب ۳ آیت ۱۱)

بلکہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ

"اے خداوند! مَیں تیری منّت کرتا ہوں
کہ کسی اَور کے ہاتھ سے جسے تُو چاہے
یہ پیغام بھیج۔" (خروج باب ۴ آیت ۱۳)

جب انہوں نے بار بار انکار کیا تو بائیبل کہتی ہے کہ:-

"تب خداوند کا قہر موسیٰ پر بھڑکا۔"
(خروج باب ۴ آیت ۱۴)

گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کا وہ قہر جس کے مورد خدا اور اُس کے نبیوں کے دشمن ہُوا کرتے ہیں اُس کا پہلا نشانہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی بن گئے اور اُن پر خدا تعالیٰ کا قہر بھڑکنا شروع ہو گیا۔ لیکن قرآن کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان تمام الزامات سے بری قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ سے کہا کہ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۔ اے موسیٰ! تجھے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ تُو سلامتی پانے والوں میں سے ہے۔

پھر اُس نے نہ صرف موسیٰؑ اور ہارونؑ کو غلبہ کا وعدہ دیا بلکہ انہیں یہ بھی بشارت دی کہ وہ لوگ جو تم پر ایمان لائیں گے اللہ تعالیٰ انہیں بھی غلبہ عطا فرمائیگا غرض بائیبل نے تو موسیٰؑ کو موردِ قہر قرار دیا ہے۔ مگر قرآن کریم انہیں خدائی انعامات اور برکات کا مورد قرار دیتا ہے۔

سوم :- بائیبل کہتی ہے کہ

"پھر خداوند نے اُسے یہ بھی کہا۔ کہ
تُو اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک
لے۔ اُس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ
کر اُسے ڈھانک لیا۔ اور جب اُس نے
نکال کر دیکھا تو اُس کا ہاتھ کوڑھ سے
برف کی مانند سفید تھا۔"
(خروج باب ۴ آیت ۶)

لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال وہ بغیر کسی بیماری کے سفید نکلیگا یعنی تیرا ہاتھ سفید تو ہوگا مگر کوڑھ کی وجہ سے نہیں جیسا کہ بائیبل کہتی ہے بلکہ ایک الٰہی نشان کے طور پر اُس میں نور نظر آئیگا۔

چہارم :- بائیبل کہتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا تعالیٰ کا قہر بھڑکا تو اُس نے کہا:-

"کیا لاویوں میں سے ہارون تیرا بھائی نہیں
ہے؟ مَیں جانتا ہوں کہ وہ فصیح ہے۔ اور
وہ تیری ملاقات کو آ بھی رہا ہے۔ اور
تجھے دیکھ کر دل میں خوش ہوگا۔ سو تُو
اُسے سب کچھ بتانا اور یہ سب باتیں اُسے
سکھانا اور مَیں تیری اور اُس کی زبان کا ذمہ
لیتا ہوں اور تم کو سکھاتا رہوں گا کہ

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا

پس جب موسیٰؑ ہماری کُھلی کُھلی آیتیں لے کر آیا۔ تو فرعون کے لوگوں نے کہا۔

مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا

یہ تو ایک فریب ہے جو بنا لیا گیا ہے۔ ہم نے اپنے باپ دادوں سے

فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۷﴾ وَ قَالَ مُوْسٰی رَبِّیْٓ اَعْلَمُ

ایسی بات کبھی نہیں سُنی۔ اور موسیٰؑ نے کہا میرا رب اُس کو

تم کیا کیا کرو۔ اور وہ تیری طرف سے لوگوں سے باتیں کرے گا۔ اور وہ تیرا مُنہ بنے گا۔ اور تو اُس کے لئے گویا خدا ہوگا۔"

(خروج باب ۴ آیت ۱۴ تا ۱۶)

یہ عبارت بتاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اظہارِ ناراضگی کے طور پر موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کو بھی مبعوث کر دیا۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود یہ درخواست کی تھی کہ ہارونؑ کو میری تائید کے لئے میرے ساتھ کھڑا کیا جائے چنانچہ قرآن کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ الفاظ بیان فرماتا ہے کہ وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْٓ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ۔ یعنی اے خدا! ہارون بات کرنے کے لحاظ سے مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔ پس تو اس کو میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج دے تاکہ وہ میری تصدیق کرے۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب نہ کریں چنانچہ خدا تعالیٰ نے اُن کی اس دُعا کو قبول فرماتے ہوئے حضرت ہارونؑ کو بھی اُن کی معیت میں نبی بنا دیا۔ پس قرآن کریم حضرت ہارونؑ کی بعثت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور اُسے اپنا انعام اور احسان قرار دیتا ہے۔ لیکن بائیبل کہتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر خدا کا قہر بھڑکا تو اُس نے ہارونؑ کو بھی ساتھ لے جانے کا حکم دیدیا۔

پنجم:- بائیبل کہتی ہے کہ حضرت ہارونؑ صرف خاندانِ بنی لاوی کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کے بھائی تھے حقیقی یا مادری بھائی نہیں تھے۔ لیکن قرآن کریم حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سگا بھائی یا کم از کم ماں کی طرف سے بھائی قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے:-

"قَالَ یَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ۔" (طٰهٰ ع ۵)

یعنی حضرت ہارونؑ نے کہا۔ اے میری ماں کے بیٹے! میری ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو نہ پکڑ۔

غرض قرآن کریم نے جو اس سورۃ کے شروع میں ہی فرما دیا تھا کہ نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ اس کی صداقت بائیبل اور قرآن کے بیان کردہ واقعات کے اختلاف سے بالکل ظاہر ہو جاتی ہے۔

بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ

جو اُس کی طرف سے ہدایت لائے خوب جانتا ہے ۔ اور اُس کو بھی جس کا

عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۸﴾

انجام اچھا ہو ۔ حق یہ ہے کہ ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوتے ۱۵

۱۵ تفسیر: - فرماتا ہے ۔ جب موسٰیؑ اُن کے پاس ہماری کُھلی کُھلی آیات لے کر آیا تو بجائے اِس کے کہ فرعون اور اُس کے سردار اُن نشانات پر غور کرتے اور اُن سے فائدہ اُٹھاتے انہوں نے اُن نشانات کو سحر کہنا شروع کر دیا ۔ لُغت کے لحاظ سے سحر ہر ایسی بات کو کہا جاتا ہے جس کا ماخذ بہت دقیق ہو ۔ اِسی طرح جھوٹ کو سچ بنا کر دکھلانا بھی سحر کہلاتا ہے ۔ اور سحر کا اطلاق ہر فریب اور چالاکی پر بھی کیا جاتا ہے اور سَحَرَهٗ کے معنے ہوتے ہیں خَدَعَهٗ یعنی دوسرے کو اپنی چالاکی سے دھوکا دے دیا ۔ پس فرعون کا یہ کہنا کہ یہ تو ایک سحر ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ ایک بڑا دھوکا اور فریب ہے جو تمہیں دیا جا رہا ہے ۔ یا یہ ایک بڑا جھوٹ ہے جو سچ کی شکل میں تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے ۔ یا یہ ایک بڑی چالاکی ہے جس کے ذریعہ تمہیں ورغلانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور چونکہ یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ چالاکیاں موسٰیؑ نے کہاں سے سیکھیں اِس لئے اُس نے کہا کہ یہ تمام فریب خود موسٰیؑ کا طبع زاد ہے ۔ اُس کا یہ کہنا کہ مجھے خدا تعالےٰ نے یہ نشانات دیئے ہیں ایک افتراء ہے جس کی غرض سوائے اِس کے کچھ نہیں کہ لوگوں کو اُن کے مذہب سے منحرف کرنے کی کوشش کی جائے ۔ پھر اُس نے لوگوں کو بھڑکانے کے لئے ایک دوسرا ہتھیار استعمال کیا اور کہا کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۔ ہمارے باپ دادا کتنے عقلمند اور دانا تھے اور انہوں نے اپنی حکمت اور دانائی کے کیسے کیسے مظاہرے کئے مگر یہ شخص ہمارے اُن باپ دادا سے بھی اپنے آپ کو بڑھ کر سمجھنے لگا ہے اور ہمیں وہ رستہ بتاتا ہے جس کو ہمارے اسلاف نے کبھی اختیار نہیں کیا ۔ اگر موسٰیؑ کا بتلایا ہُوا راستہ ہی سچا راستہ ہے ۔ تو اِس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے باپ دادا سب بیوقوف اور جاہل تھے اور انہیں وہ روشنی دکھائی نہ دی جو موسٰیؑ کو نظر آگئی ۔ اِس طرح اُس نے موسٰیؑ کے خلاف وہی حربہ استعمال کیا جو ہمیشہ سے حق کے مخالف لوگوں کو اشتعال دلانے کے لئے استعمال کرتے چلے آئے ہیں ۔ حضرت موسٰی علیہ السلام نے اِس کا کیا ہی لطیف جواب دیا ہے ۔ فرمایا ۔ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ میرا رب اُس شخص کو جو اس کی طرف سے ہدایت لایا ہے خوب جانتا ہے ۔ اور اُسے بھی خوب جانتا ہے جس کا انجام اچھا ہوگا ۔ یقیناً ظالم لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے یعنی تم نے مجھے مفتری تو قرار دے دیا ہے لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا میں اپنے دعویٰ کو خدا تعالےٰ کی طرف منسوب کر رہا ہوں یا نہیں ؟ جب میں بار بار اپنا دعویٰ خدا تعالےٰ کی طرف منسوب کرتا ہوں تو مفتری ہونے کی صورت میں کیا خدا تعالےٰ نے مجھے سزا دینے کیلئے کافی نہیں

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ

اور فرعون نے کہا اے دربار یو! مجھے اپنے سوا تمہارا کوئی معبود

اِلٰهٍ غَيْرِيْ ج فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ

معلوم نہیں۔ پس اے ہامان! میرے لئے گیلی مٹی پر آگ جلا (یعنی اینٹیں بنوا)

فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى لا

پھر میرے لئے ایک قلعہ تیار کر۔ شاید میں اُس پر چڑھکر موسٰی کے خدا کو معلوم کرلوں۔

جب دُنیوی گورنمنٹیں بھی یہ برداشت نہیں کرسکتیں کہ اُن کی طرف سے کوئی جعلی افسر بن کر لوگوں کو دھوکا دے اور وہ ایسے شخص کو فوراً پکڑ کر جیل خانہ میں ڈال دیتی ہیں تو یہ کس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر میں نے افترا کیا ہے تو خدا کو اِس کا علم نہیں اور وہ مجھے سزا نہیں دیگا۔ خدا تعالےٰ اس شخص کو جو اس کی طرف سے ہدایت کا پیغام لے کر آیا ہے خوب جانتا ہے اور اُسے بھی خوب جانتا ہے جس کے لئے آخر میں فتح اور کامیابی مقدّر ہے۔ اس لئے بجائے اِس کے کہ تم مجھے جھوٹا اور مفتری کہو تم اس معاملہ کو خدا تعالےٰ کے فیصلہ پر چھوڑ دو۔ اگر میں مفتری ہُوا تو خدا تعالےٰ کا ہاتھ میری رگِ جان کو کاٹ کر رکھ دیگا۔ اور میرا انجام وہی ہوگا۔ جو ہمیشہ سے افترا کرنے والوں کا ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن اگر میں اُس کے حکم سے تمہاری طرف آیا ہوں اور اُس نے مجھے اپنی کامیابی کی بشارات دی ہیں تو تم خود سوچ لو کہ تم نے مجھے مفتری قرار دے کر کتنے بڑے جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ ویسا ہی فقرہ ہے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مقام پر اپنے مخالفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ

"دنیا مجھکو نہیں پہچانتی لیکن وہ مجھے جانتا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ یہ ان لوگوں کی غلطی ہے اور سراسر بدقسمتی ہے کہ میری تباہی چاہتے ہیں۔ میں وہ درخت ہوں جس کو مالک حقیقی نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے۔ جو شخص مجھے کاٹنا چاہتا ہے اُس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ قارون اور یہودہ اسکریوطی اور ابوجہل کے نصیب سے کچھ حصہ لینا چاہتا ہے۔

(اربعین ۳ صفحہ ۵۱)

پھر حضرت موسٰی علیہ السلام نے اس کی دلیل دیتے ہوئے فرمایا کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ یقیناً ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ یعنی میری سچائی کا معیار یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ مجھے کامیاب کرے گا اور تم نے مجھے مفتری قرار دیکر جس ظلم کا ارتکاب کیا ہے اُس کی پاداش میں تم پر عذاب نازل ہوگا۔

اِس جگہ ظالم سے مفتری علی اللہ بھی مراد ہوسکتا ہے اور وہ شخص بھی مراد ہے جو کسی سچّے مامور کا انکار کرنے والا ہو۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ (عنکبوت ع ۷) یعنی بڑے ظالم دنیا میں

وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۞۳۹ وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ

اور میں تو اُس کو جھوٹوں میں سے سمجھتا ہوں۔ اور اُس نے بھی اور اُس کے لشکروں نے

جُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا

بھی ملک میں بغیر کسی حق کے تکبر سے کام لیا۔ اور خیال کیا کہ وہ ہماری طرف

لَا يُرْجَعُوْنَ ۞۴۰ فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ

لوٹا کر نہیں لائے جائیں گے۔ پس ہم نے اُس کو بھی اور اُس کے لشکروں کو بھی پکڑ لیا۔ اور اُن کو

فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۞۴۱

سمندر میں پھینک دیا۔ پس دیکھ کہ ظالموں کا انجام کیسا ہوا! ۱۶ع

دو ہی شخص ہُوا کرتے ہیں۔ ایک وہ جو خدا تعالیٰ پر افتراء کرے اور دوسرا وہ جو کسی سچے مدّعیٔ نبوت کا انکار کرے پس اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اِس طرف توجہ دلائی کہ جہاں خدا تعالیٰ پر افتراء ایک قابلِ پاداش جرم ہے وہاں ایک سچے مدعی کا انکار بھی بڑا بھاری ظلم ہے۔ اس لئے صرف مجھے بُرا بھلا کہکر خوش نہ ہو جاؤ۔ بلکہ سوچو کہ کہیں تم ہی ایک سچے امر کا انکار کرکے ظالم تو نہیں بن رہے۔

۱۶ع **حل لغات**:۔ صَرْحًا: اَلصَّرْحُ کے معنے ہیں اَلْقَصْرُ۔ مضبوط مکان۔ وَ كُلُّ بِنَاءٍ عَالٍ۔ نیز ہر بلند عمارت کو بھی صَرْحٌ کہتے ہیں (اقرب)

تفسیر:۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی صداقت کے ثبوت میں بار بار خدا تعالیٰ کو پیش کیا۔ اور کہا کہ میرا ربّ جانتا ہے کہ میں اُس کی طرف سے آیا ہوں اور میرا ربّ مجھے حسنِ انجام اور کامیابی کی بشارات دے رہا ہے اور اُس کی تائیدات اور نشانات میری صداقت پر گواہ ہیں تو فرعون نے اپنے درباریوں کی طرف دیکھا۔ اور انہیں کہا کہ مجھے تو اپنے سوا تمہارا کوئی معبود نظر نہیں آتا۔ پھر نہ معلوم یہ کونسا خدا ہے جس کا نام موسیٰ بار بار لے رہا ہے۔ پھر اُسی جوش کی حالت میں اُس نے ہامان کو بلوایا اور اُسے حکم دیا کہ فوراً بڑے بڑے بھٹوں میں پختہ اینٹیں تیار کرواؤ۔ اور پتھیروں کو بُلا کر ایک اونچا محل بناؤ۔ شاید اُس پر چڑھ کر میں موسیٰؑ کے خدا کو دیکھ سکوں۔ اور آخر میں کہا کہ میں تو اسے بالکل جھوٹا سمجھتا ہوں یعنی کوئی یہ خیال نہ کرے کہ مجھے شبہ ہے کہ شاید جس خدا کا موسیٰؑ ذکر کرتا ہے وہ موجود ہے تبھی تو میں ایک اونچا محل اس کی تلاش کے لئے بنوانا چاہتا ہوں میرے اس حکم کی غرض شبہ نہیں بلکہ میری غرض موسیٰؑ کو جھوٹا ثابت کرکے دکھانا ہے یعنی دنیا دیکھ لیگی کہ باوجود اسکے کہ میں نے اتنا بڑا محل بنوایا پھر بھی موسیٰؑ کا خدا کہیں نظر نہیں آیا۔ دراصل قدیم اقوام میں بڑی شدت سے یہ تصوّر پایا جاتا تھا کہ بلند میناروں پر آسمانی ارواح اُترا کرتی ہیں۔ بلکہ بلند میناروں پر خود خدا تعالیٰ کے اُترنے کا تصور بھی اُن میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں

صَرْحًا

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ

اور ہم نے انکو (یعنی فرعونیوں کو) سردار بنایا تھا جو (اپنی سرداری کے غرور میں) لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے ۔ اور

الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ

قیامت کے دن اُن کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی ۔ اور اِس دُنیا میں بھی ہم نے

بائبل کا ایک حوالہ پیش کیا جاتا ہے ۔ کتاب پیدائش میں لکھا ہے :-

" اور تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی ۔ اور ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے ان کو ملک سِنعار (یعنی بیبلونیا) میں ایک میدان ملا ۔ اور وہ وہاں بس گئے ۔ اور انہوں نے آپس میں کہا آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور ان کو آگ میں خوب پکائیں ۔ سو انہوں نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا ۔ پھر وہ کہنے لگے کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک بُرج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے بنائیں اور یہاں اپنا نام کریں ۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تمام روئے زمین پر پراگندہ ہو جائیں اور خداوند اس شہر اور اس بُرج کو جسے بنی آدم بنانے لگے دیکھنے کو اُترا ۔"

(پیدائش باب ۱۱ آیت ۱ تا ۵)

غرض بلند اور اونچے میناروں پر خدا تعالیٰ کے نازل ہونے کا تصوّر چونکہ دیر سے چلا آتا تھا اس لئے فرعون نے بھی چاہا کہ موسیٰؑ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے ایک اونچا سا محل بنائے اور پھر لوگوں کو بتائے کہ موسیٰؑ کے جھوٹا ہونے کا اِس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا کہ مَیں نے اتنا اونچا محل بھی بنوایا اور پھر بھی اُسکا خدا نیچے نہ اُترا ۔

غرض موسیٰؑ کی تعلیم پر ایمان لانے کی بجائے فرعون نے بھی اور اس کے لشکروں نے بھی تکبّر سے کام لیا ۔ اور انہوں نے خیال کیا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے لئے حاضر ہونا نہیں پڑے گا ۔ آخر ایک دن اس بغاوت اور سرکشی کی سزا میں ہم نے اُسے اور اُس کے لشکروں کو پکڑ لیا ۔ اور وہ جو اونچے محل پر چڑھ کر ہمیں دیکھنے کے خواب دیکھ رہا تھا اُسے ہم نے سمندر کی تہہ میں اپنا جلوہ دکھا دیا ۔ پس دیکھو کہ ظالموں کا کیسا عبرت ناک انجام ہُوا ۔

یہی وہ انجام تھا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔ مگر انہوں نے اپنی طاقت اور حکومت کے گھمنڈ میں اِس انذار کی کوئی پرواہ نہ کی ۔ اور خیال کر لیا کہ ہمیں کون تباہ کر سکتا ہے ۔ کون ہمارا بال بھی بیکا کر سکتا ہے ۔ مگر آخر وہی ہُوا جس کی موسیٰؑ انہیں خبر دے چکے تھے ۔ موسیٰؑ کامیاب ہوئے اور فرعون نے اپنا حسرت ناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ۔

الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ
اُن پر لعنت بھیجی - اور قیامت کے دن بھی وہ بدحال
الْمَقْبُوحِيْنَ ﴿۴۳﴾
لوگوں میں سے ہوں گے۔ ۷۵

ع ۴

۷۵ حل لغات:- اَلْمَقْبُوْحِيْنَ: قَبَحَ سے اسم مفعول ہے۔ اور قَبَحَهُ اللّٰهُ عَنِ الْخَيْرِ قَبْحًا کے معنے ہیں نَحَّاهُ عَنْهُ۔ نیکی سے اُسے دُور رکھا (اقرب) پس مَقْبُوْحٌ کے معنے ہوئے۔ نیکی سے دُور رکھا ہُوا۔ بدحال۔

تفسیر:- فرماتا ہے۔ ہم نے تو اُن کو اپنی قوم کا لیڈر اور راہنما بنایا تھا۔ مگر انہوں نے لوگوں کو ہلاکت اور بربادی کی راہوں پر چلانا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دنیا میں بھی وہ خدا کی مدد سے محروم رہے اور قیامت کے دن بھی اُن کی کوئی مدد نہیں کی جائیگی اور چونکہ وہ دنیا میں لوگوں کو ایسے راستوں پر چلاتے رہے جو ہلاکت اور بربادی تک پہنچانے والے تھے اس لئے ہم نے اس دنیا میں بھی اُن پر لعنت بھیجی اور قیامت کے دن بھی وہ بدحال لوگوں میں شامل ہونگے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ تین ہزار سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا مگر موسیٰؑ پر اب تک صلوٰۃ اور سلام بھیجا جا رہا ہے اور قیامت تک اُس پر خدا تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی چلی جائیں گی۔ لیکن فرعون پر دنیا کی ہر قوم لعنت بھیجتی رہی ہے اور قیامت تک اُس پر لعنت ہی برستی چلی جائیگی

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی پر لعنت ڈالتا ہے تو وہ لعنت اُس وقت ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ چلتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ایک غزوہ پر جا رہے تھے کہ حجر شہر آپ کے راستہ میں آیا۔ اور اسجگہ پر تھوڑی دیر کے لئے آپ نے پڑاؤ کیا۔ پڑاؤ کی صورت دیکھ کر صحابہؓ نے اپنے اپنے آٹے نکالے اور گوندھ کر روٹی پکانے کی تیاری کرنے لگے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو آٹا گوندھتے اور روٹی پکانے کی فکر کرتے دیکھا تو آپ گھبرا گئے اور آپ نے اپنے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ جلدی اپنی سواریوں پر چڑھ جاؤ۔ اور اپنے آٹے پھینک دو۔ کیونکہ اسجگہ خدا کا غضب نازل ہُوا تھا۔ وہ لوگ جن پر خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہُوا تھا مر گئے۔ جس شہر پر غضب نازل ہُوا تھا اُجڑ گیا۔ سالوں کے بعد سال اور صدیوں کے بعد صدیاں گذرتی چلی گئیں مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اب بھی اس مقام پر عذاب نازل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ آپؐ نے نہ صرف صحابہؓ کو وہاں سے جلدی نکل جانے کا ارشاد کیا بلکہ ساتھ ہی مسلمانوں کی دولت کا ایک حصہ یعنی وہ آٹا جو انہوں نے روٹی پکانے کے لئے گوندھا تھا اُسے بھی آپؐ نے پھینکنے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ اسجگہ کے پانی سے گوندھا ہُوا آٹا کھانا بھی تمہارے لئے جائز نہیں ہے۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے متعلق مجھے یاد ہے کہ وہ عبدالحکیم مرتد پٹیالوی سے جب وہ احمدی تھا بہت محبت کیا کرتے تھے اور وہ بھی آپ سے بہت تعلق رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ جب اُس نے

اَلْمَقْبُوْحِيْنَ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ

اور ہم نے موسیٰؑ کو بعد اس کے کہ ہم نے پہلی قوموں کو

اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَ

ہلاک کر دیا تھا کتاب بخشی اُس کی تعلیم لوگوں کو روحانی بینائی بخشتی تھی اور

هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

وہ ہدایت اور رحمت کا موجب تھی۔ (اور اس غرض سے دی گئی تھی) کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى

اور تو (طُور کے) مغربی جانب نہیں تھا جب ہم نے موسےٰ

مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۵﴾

کے سپرد (رسالت کا) کام کیا تھا۔ اور نہ تو (اُس وقت) گواہوں میں سے ایک گواہ تھا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کی۔ تو اُس وقت بھی اُس نے یہی لکھا کہ آپ کی جماعت میں سوائے حضرت مولوی نورالدینؓ صاحب کے اور کوئی نہیں جو صحابہؓ کا نمونہ ہو۔ یہ شخص بیشک ایسا ہے جو جماعت کیلئے قابل فخر ہے عبدالحکیم پٹیالوی نے ایک تفسیر بھی لکھی تھی اور اُس میں بہت کچھ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ سے پُوچھ کر لکھا تھا۔ لیکن جب عبدالحکیم نے اپنے ارتداد کا اعلان کیا۔ تو میں نے دیکھا آپ نے گھبرا کر اپنے شاگردوں کو بلایا اور اُن سے فرمایا۔ جاؤ اور جلدی میرے کُتب خانہ میں سے عبدالحکیم کی تفسیر نکال دو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے مجھ پر خدا کی ناراضگی نازل ہو۔ حالانکہ وہ قرآن کریم کی تفسیر تھی اور اُس کی بہت سی آیات کی تفسیر اُس نے خود آپ سے پوچھ کر لکھی تھی مگر اِس وجہ سے کہ اُس پر خدا کا غضب نازل ہُوا۔ اُس کی لکھی ہوئی تفسیر کو بھی آپ نے اپنے کتب خانہ سے نکلوا دیا۔

اِسی طرح فرعون جو اپنے آپ کو مصریوں کا خدا قرار دیتا تھا اور کہتا تھا کہ معلوم نہیں یہ کونسا خدا ہے جس کو ماننے کی موسیٰؑ ہم کو تلقین کر رہا ہے۔ اُس پر جب خدا تعالیٰ کا عذاب نازل ہُوا تو باوجود اس کے کہ تین ہزار سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے اب تک فرعون پر لعنت برستی چلی جاتی ہے۔ اور ہر شخص جب اُس کا نام لیتا ہے یا قاہرہ میں اُس کی لاش دیکھتا ہے جو خدائی نشان کے طور پر اب تک محفوظ چلی آ رہی ہے تو اُس کے دل میں فرعون کے متعلق ادب اور احترام کے جذبات پیدا نہیں ہوتے بلکہ نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

یہ واقعات خدا تعالیٰ نے اہل مکّہ کے سامنے اِس لئے

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا

لیکن ہم نے بہت سی قوموں کو پیدا کیا پس اُن پر عمر لمبی ہوگئی (اور وہ اپنی پیشگوئیوں کو بھول گئے) - اور تو اہلِ مدین کے

فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۶﴾

ساتھ بھی نہیں رہتا تھا - کہ اُن کے سامنے نشان پڑھ کر سُناتا - لیکن ہم ہی رسول بھیجنے والے ہیں -

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً

اور اُس وقت بھی تو موسیٰؑ کے ساتھ نہیں تھا جبکہ طُور پر ہم نے موسیٰؑ پر وحی نازل کی لیکن جو کچھ موسیٰؑ سے کہا گیا وہ اِس لئے کہا گیا

مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ

کہ تیری آمد پر اِس قوم کو یقین ہو اور خدا تعالیٰ کی رحمت میں وہ بھی شریک ہو جائے - اور اِس لئے بھی کہ تو اِس قوم کو ہوشیار کرے جس

مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۷﴾

کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ہوشیار کرنیوالا نہیں آیا تھا - تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں - ۵۱۸

بیان کئے تھے کہ جس طرح فرعون نے موسیٰؑ کا مقابلہ کیا اُسی طرح مکہ کا ابوالحکم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر لوگوں کو بھڑکا رہا ہے - مگر یاد رکھو جس طرح فرعون اپنے لشکروں کے ساتھ ہلاک ہُوا اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بھی جو شخص اُٹھیگا وہ تباہ کر دیا جائے گا اور قیامت تک آنے والی نسلیں اُس پر اُسی طرح لعنت ڈالیں گی جس طرح فرعون پر لعنت ڈالی جاتی ہے - چنانچہ ابوجہل اور دوسرے سردارانِ مکہ جنہوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بڑی بڑی تکالیف پہنچائی تھیں اُن پر آج تک لعنت ڈالی جاتی ہے - یہاں تک کہ اُن کی نسلیں اُن کی طرف منسوب ہونا اپنے لئے ہتک کا موجب سمجھتی ہیں - مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف دنیا کے کونہ کونہ میں ہو رہی ہے اور کوئی ملک اور کوئی علاقہ ایسا نہیں جہاں آپ پر درود و سلام بھیجنے والے اور آپ پر اپنی جانیں قربان کرنے والے لوگ موجود نہ ہوں -

ثَاوِيًا

۵۱۸ حل لغات :- ثَاوِيًا : ثَوٰى سے اسم فاعل کا صیغہ ہے - اور اَلثَّوَاءُ کے معنے ہیں اَلْاِقَامَةُ مَعَ الْاِسْتِقْرَارِ - یعنی مستقل رہائش (مفردات) اور جب ثَوٰى بِالْمَكَانِ کا فقرہ استعمال کریں تو معنے ہونگے اَقَامَ یعنی وہ کسی جگہ ٹھہرا - (اقرب)

تفسیر :- فرماتا ہے قرونِ اولیٰ کی ہلاکت اور بربادی کے بعد جبکہ دنیا ایک نئی شریعت کی محتاج تھی اور وہ ہر قسم کی خیر اور برکت کے سامانوں سے محروم ہو چکی تھی ہم نے موسیٰؑ پر ایک آسمانی کتاب نازل کی جو لوگوں کو روحانی بینائی بخشنے والی تھی اور اُن کے لئے ہدایت اور رحمت کا موجب تھی - یہ کتاب انہیں اس لئے دی گئی تھی تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور اُس کی روشنی میں اپنے اندر ایک نیک اور پاک تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کریں -

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تورات کے نزول کی غرض یہی غرض نہیں تھی کہ اس زمانہ کے لوگ اُس کی تعلیم سے فائدہ اٹھائیں اور انہیں وہ روحانی بصیرت حاصل ہو جائے جس سے وہ خیر اور شر میں تمیز کر سکیں اور اپنے مخالفین پر انہیں غلبہ میسّر آجائے۔ بلکہ وہ اپنے اندر ہدایت اور رحمت کا ایک پیغام بھی رکھتی تھی۔ یعنی اُس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق بھی پیشگوئیاں پائی جاتی تھیں تاکہ جب وہ موعود آئے تو تورات کے ماننے والے اُسے قبول کرنے سے محروم نہ رہیں۔ چنانچہ اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ انہی پیشگوئیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ۔ یعنی اے محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) تو اُس وقت موسیٰؑ کے ساتھ نہیں تھا جبکہ ہم نے مغربی جانب کلام الٰہی کو لوگوں تک پہنچانے کا کام اُس کے سپرد کیا تھا۔ اور نہ تو اُس وقت اس واقعہ کے چشم دید گواہوں میں سے تھا۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نشان دہی فرمائی کہ وہ مقام جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلی دفعہ تجلّی الٰہی کو ایک آگ کی صورت میں دیکھا تھا وہ جانب غرب تھا۔ یہ جانب غرب اگر عرب سے سمجھا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ تُو اُس وقت عرب کے مغربی جانب نہیں تھا جبکہ موسیٰؑ کے سپرد ہم نے رسالت کا کام کیا۔ اور اگر اس سے دشتِ سینا مراد لیا جائے جس میں یہودیوں کے نزدیک حورب پہاڑ تھا جیسا کہ خروج باب ۱۹ آیت ۱ تا ۲ سے ظاہر ہے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ وہ مقام جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلی مرتبہ الٰہی تجلّی دیکھی وہ دشتِ سینا کے مغرب میں تھا۔ تورات نے اس بارہ میں جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

ایک دن بھیڑ بکریوں کو چراتے ہوئے
"بیابان کی پرلی طرف سے خدا کے پہاڑ
حورب کے نزدیک لے آیا اور خداوند کا فرشتہ
ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلہ میں اُس پر
ظاہر ہوا" (خروج باب ۳ آیت ۱ و ۲)

اِس حوالہ میں "بیابان کی پرلی طرف" کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں علماء بائیبل نے ان کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چراتے ہوئے بیابان یعنی دشتِ سینا کے مغرب میں خداوند کے پہاڑ حورب میں آئے تھے۔ (کلنٹ از تفسیر بائیبل صفحہ ۳۵۸) پس اسجگہ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ سے یہ مُراد بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مقام جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الٰہی انوار نازل ہوئے عرب کے مغربی جانب تھا اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ وہ مقام دشتِ سینا کی مغربی جانب تھا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اس آیت میں جو امر کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ کلام الٰہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یُوں امر کا لفظ قرآن کریم میں بعض اور معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے بعض جگہ پیدائش باذن اللہ کے معنے لئے گئے ہیں اور بعض جگہ قضاء الٰہی کا مفہوم لیا گیا ہے مگر اسجگہ امر کلام الٰہی کے معنے رکھتا ہے اور اس مفہوم میں لفظ امر کا استعمال قرآن کریم کی بعض اور آیات میں بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل کے متعلق اللہ تعالیٰ ایک مقام پر فرماتا ہے کہ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ (جاثیہ ع ۲) یعنی ہم نے انہیں کلام الٰہی کی بیّنات دی تھیں۔ اسی طرح فرماتا ہے فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِى الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ (حج ع ۹) یعنی چاہیئے کہ اس کلام کے بارہ میں لوگ تجھ سے جھگڑا نہ کریں۔ کیونکہ اس میں اُن کی ہدایت کا سامان ہے لیکن وہ چونکہ اس کلام الٰہی کی حقیقت سے ناواقف ہیں اس لئے تیرا فرض ہے کہ تو لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف بلاتا چلا جا۔ پس قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ کے یہ معنے ہیں کہ جب موسیٰؑ کے سپرد

ہم نے کلامِ الٰہی پہنچانے کا کام کیا۔

اِس جگہ موسیٰ علیہ السلام کی اُن پیشگوئیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جن میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خبر دی گئی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تُو تو اُس وقت موسیٰ کے ساتھ نہیں تھا جب ہم نے رسالت کا کام اُس کے سپرد کیا۔ اگر موسیٰ اس زمانہ کے آدمی ہوتے تو سمجھا جا سکتا تھا کہ تم دونوں نے منصوبہ کر لیا ہے۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام تو تیری پیدائش سے سینکڑوں سال پہلے بلکہ دو ہزار سال پہلے گذر چکے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ موسیٰ نے اس منصوبہ کی وجہ سے رسالت کا دعویٰ کر دیا ہو۔ تُو تو اس وقت دنیا میں تھا ہی نہیں جبکہ موسیٰؑ کے سپرد رسالت کا کام کیا گیا۔ پھر اگر موسیٰؑ کے کلام سے تیری صداقت ظاہر ہوتی ہے تو یہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ تُو خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ ورنہ تیرے اندر یہ کہاں طاقت تھی کہ تو اپنی پیدائش سے بھی دو ہزار سال پہلے موسیٰؑ کو کہتا کہ تُو نبوت کا دعویٰ کر اور پھر دعویٰ کے بعد میرے متعلق پیشگوئیاں بھی کر تاکہ لوگ مجھے مان لیں۔ اُس نے اگر دعویٰ کیا تو اِس لئے کہ خدا تعالیٰ نے اُسے رسالت کے مقام پر کھڑا کیا تھا۔ پس اُس کے کلام میں جو پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں اُن کا انکار صرف تیرا انکار نہیں بلکہ خود موسیٰؑ کا بھی انکار ہے جسے خدا نے نبوت کے مقام پر کھڑا کیا تھا۔

پھر فرماتا ہے کہ ان پیشگوئیوں کی طرف لوگوں کو اسلئے توجہ نہیں رہی کہ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَیْهِمُ الْعُمُرُ ۔ ہم نے موسیٰؑ کے بعد قوموں پر قومیں پیدا کیں اور ایک عرصۂ دراز گذر گیا۔ جس کی وجہ سے یہ قومیں اپنی تاریخ کو بھول گئیں اور انہیں یاد ہی نہ رہا کہ موسیٰؑ پر ہم نے کہاں جلوہ گری کی تھی اور اس جلوہ میں ہم نے اُس پر کیا کیا غیب ظاہر کئے تھے۔

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۔ فرماتا ہے تُو اہلِ مدین میں بھی نہیں رہتا تھا کہ اُنہیں ہماری آیات پڑھ کر سُناتا۔ بلکہ ہم نے ہی اُن کی ہدایت کیلئے رسول بھیجا تھا۔ اِس آیت سے اُن واقعات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو خروجِ مصر کے بعد موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو پیش آئے اور بتایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر نکلے تو آپ دوبارہ اہلِ مدین میں آ کر ٹھہرے تھے۔ جہاں ایک لمبا عرصہ آپ اللہ تعالیٰ کے نشانات سے لوگوں کے ایمان کو جلا بخشتے رہے۔

بائیبل کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر آئے تو آپ موآب اور مدین کے میدانوں میں ہی خیمہ زن ہوئے تھے۔ آپ کا خُسر بھی آپ کی ملاقات کے لئے آیا تھا اور اُس نے بنی اسرائیل کی تنظیم کے سلسلہ میں آپ کو بہت سے مشورے بھی دیئے تھے (خروج باب ۱۸) لیکن جب مدین کی عورتیں بنی اسرائیل کو شرک میں مبتلا کرنے لگیں (گنتی باب ۲۵) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن پر چڑھائی کی اور ساری کی ساری قوم کو تباہ کر دیا (گنتی باب ۳۱) اِسی طرح تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدین کی تباہی کے بعد اُن کے خُسر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ہی آ گئے تھے اور وہیں انہیں رہائش کے لئے زمین دے دی گئی تھی۔[1]

پس اِس آیت میں اُس زمانۂ قیام کا ذکر ہے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دوبارہ مدین تشریف لائے تھے۔ اور وہاں آپ ایک لمبے عرصہ تک ٹھہرے رہے اور جماعت کی تربیت اور اُن کی تنظیم کے کام میں مشغول رہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی مدین میں ہی تھے کہ اُن پر

[1] قدامۃ الیہود کتاب ۵ باب ۷ بحوالہ ارض القرآن جلد دوم۔

الہاماتِ الٰہیہ نازل ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اور وہیں انہوں
نے اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی پیشگوئی فرمادی تھی۔ گو
فرعون کی طرف جانے کا انہیں بعد میں حکم دیا گیا۔ پھر یہ بھی
ممکن ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور والی پیشگوئی
حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دو دفعہ اُتری ہو۔ ایک دفعہ مدین
میں اور ایک دفعہ طور پر۔ جیسا کہ قرآن کریم کی بھی کئی سورتیں
دو دفعہ اُتری ہیں۔ ایک دفعہ مکہ میں ایک دفعہ مدینہ منورہ
میں۔ بہر حال یہ کسی دوسرے نبی کا ذکر معلوم نہیں ہوتا کیونکہ
اوّل و آخر موسیٰؑ کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس
آیت میں پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت
کے ثبوت میں موسیٰؑ کے اس واقعہ کو پیش فرماتا ہے جبکہ
وہ مدین میں ٹھہرے اور لوگوں کو اِسطرف توجہ دلاتا ہے
کہ باوجود اس کے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰؑ
کے ساتھ مدین میں نہیں رہے پھر بھی جو واقعات موسیٰؑ
کو پیش آئے وہی اِس کو بھی پیش آئیں گے اور جس طرح
وہ مظفر و منصور ہوا اُسی طرح یہ بھی مظفر و منصور ہوگا
چنانچہ مدین میں موسیٰؑ کے قیام کا ذکر فرماکر اللہ تعالیٰ نے یہ
پیشگوئی فرمائی تھی کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام مصری قوم کے
مظالم سے تنگ آکر مصر سے بھاگے تو اللہ تعالیٰ نے
انہیں مدین میں پناہ دی اور وہاں کے ایک نیک دل انسان
نے اپنے گھر کے دروازے اس کے لئے کھول دیئے اور
وہ وہاں آٹھ یا دس سال رہے۔ اِسی طرح محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اُن کی قوم ایک دن مکہ سے نکال
دیگی۔ اور جس طرح موسیٰؑ کو مدین میں پناہ دی گئی اسی طرح
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ مدینہ میں لیجائیگا
اور وہاں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کھڑا کردیگا جو اُس
کے لئے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیں گے اور اُس
پر اپنی جانیں اور اپنے اموال قربان کردیں گے اور پھر جسطرح
موسیٰؑ مدین میں آٹھ یا دس سال رہے۔ اُسی طرح
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام بھی مدینہ میں اتنا
ہی ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مماثلت کو اِس رنگ
میں ظاہر فرما دیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے
آٹھویں سال مکہ فتح کیا اور مدینہ میں آپؐ کا کل قیام
دس سال ہی رہا۔ مگر اس مماثلت میں بھی حضرت موسےٰ
علیہ السلام پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ فضیلت ثابت
ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تو ہجرت کے بعد شادی
ہوئی مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی
حضرت خدیجہؓ سے شادی ہو گئی تھی۔

پھر فرماتا ہے وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ إِذْ
نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا
مَّا أَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ
اے محمد رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اُس وقت بھی طور
کے پاس نہیں تھا جب کہ ہم نے موسیٰؑ پر وحی نازل کی اور
اُسے ہم نے تیری بعثت کی خبر دی۔ ہاں یہ خبر تیرے ربّ
کی طرف سے ایک بڑی بھاری رحمت تھی تاکہ تُو اس قوم کو
ہوشیار کرے جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ہوشیار کرنے والا
نہیں آیا۔ اور تاکہ وہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ مکہ والے
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تو تھے مگر چونکہ
ایک لمبا عرصہ گذر چکا تھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی
تعلیم سے ناآشنا ہو چکے تھے اور شرک اختیار کرچکے تھے
اِس آیت میں طورِ سینا پر نازل ہونے والی جس عظیم الشان
پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ استثناء باب ۱۸
میں پائی جاتی ہے اور اُس کے الفاظ یہ ہیں کہ

"مَیں اُن کے لئے اُن ہی کے بھائیوں میں سے
تیری مانند ایک نبی برپا کرونگا اور اپنا کلام
اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ مَیں اُسے
حکم دونگا وہی وہ اُن سے کہیگا۔ اور جو
کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام

لے کر کہیگا نہ سُنے تو مَیں اُن کا حساب اُن
سے لُونگا۔ لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی
بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا مَیں
نے اُس کو حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے
کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔"

(استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ تا ۲۱)

بائبل تسلیم کرتی ہے کہ یہ خبر موسیٰ علیہ السلام کو خروجِ مصر کے بعد طور پر دی گئی تھی۔ پس یہی وہ عظیم الشان پیشگوئی ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے والوں کو توجہ دلائی ہے کہ کیا یہ اُس وقت طُور کے پاس موجود تھا جب موسیٰؑ نے اس کے آنے کی پیشگوئی کی تھی۔ یا کیا اس پیشگوئی میں موسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باہمی سمجھوتے کا دخل ہے۔ اگر یہ پیشگوئی زمین و آسمان کے خدا کی طرف سے تھی جو دو ہزار سال کے بعد ٹھیک اُسی طرح تمہاری آنکھوں کے سامنے پوری ہوئی تو تمہارا فرض تھا کہ تم دوڑتے ہوئے آتے اور اس موعود کے آگے اپنے سر جُھکا دیتے تاکہ تم بھی اُن رحمتوں اور برکتوں سے حصہ پاتے جو اُس پر ایمان لانے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مگر تم نے موسیٰؑ کی اس عظیم الشان پیشگوئی کی بھی پرواہ نہ کی اور جب وہ موعود آگیا جس کا دو ہزار برس سے انتظار کیا جا رہا تھا تو تم سب سے پہلے اُس کے منکر ہو گئے اور اُسکی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔

یہ پیشگوئی جو استثناء باب ۱۸ میں کی گئی ہے اپنی تفاصیل کے لحاظ سے اس قدر اہم ہے کہ اِس پر جتنا بھی غور کیا جائے اتنا ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا نقشہ انسان کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ اِس پیشگوئی میں سب سے پہلی بات تو یہ بتائی گئی تھی کہ یہ آنیوالا موعود بنی اسرائیل میں سے نہیں بلکہ اُن کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آئیگا۔ دوسری بات یہ بتائی گئی تھی کہ وہ موسیٰؑ کی طرح صاحبِ شریعت رسول ہوگا۔ اور اُس کے واقعاتِ زندگی موسیٰؑ کے واقعاتِ زندگی کے ساتھ ملتے جلتے ہونگے۔ اِس میں کہا گیا ہے کہ

"مَیں اُن کے لئے اُن ہی کے بھائیوں میں سے
تیری مانند ایک نبی برپا کرونگا۔"

اور یہ ظاہر ہے کہ وہ موسیٰؑ کی مانند نبی اُس وقت تک نہیں کہلا سکتا جب تک وہ موسیٰؑ کی طرح صاحبِ شریعت نہ ہو۔ اور اُس کے واقعاتِ زندگی بھی موسیٰؑ سے نہ ملتے ہوں۔ تیسری بات یہ بتائی گئی تھی کہ خدا تعالیٰ اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالیگا۔ یعنی اس کا الہام لفظی ہوگا۔ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کے حکم کو وہ اپنے الفاظ میں بیان کردے۔

چوتھی بات یہ بتائی گئی تھی کہ

"جو کچھ مَیں اُسے فرماؤنگا وہ سب اُن سے
کہے گا۔"

یعنی باوجود اس کے کہ اُس کی شدید مخالفت ہوگی اور خدا تعالےٰ کا پیغام پہنچانے پر اُسے ہر قسم کے خطرات لاحق ہونگے پھر بھی وہ ایک نڈر اور بہادر انسان کی طرح خدا تعالیٰ کا پیغام لوگوں کو پہنچاتا چلا جائیگا۔ اور اس راستہ میں کسی خطرہ کی پرواہ نہیں کرے گا۔

پانچویں بات یہ بتائی گئی تھی کہ اس پیشگوئی کا موعود نبی اپنی تعلیم کو خدا تعالیٰ کا نام لیکر دنیا کے سامنے پیش کرے گا۔ جس میں اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اس کا کلام شرک کی کامل طور پر تردید کرنے والا ہوگا۔

چھٹی بات یہ بتائی گئی تھی کہ جو لوگ اُس کی تعلیم کا انکار کرینگے وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کا مورد بنینگے۔

ساتویں بات اِس میں یہ بتائی گئی تھی کہ اگر کوئی شخص افتراء کے طور پر اس پیشگوئی کا اپنے آپ کو مصداق قرار دیگا۔ تو وہ قتل کر دیا جائیگا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ بائبل کے اردو تراجم میں اسجگہ یہ الفاظ ہیں کہ

"وہ نبی قتل کیا جائے" مگر یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ انگریزی بائیبل میں اس جگہ یہ الفاظ ہیں کہ He shall die یعنی وہ ہلاک ہوگا۔ نہ یہ کہ وہ قتل کیا جائے۔ جیسا کہ اردو بائیبل میں ہے۔

پیشگوئی کے ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشگوئی کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی شخص مصداق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ

(۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ مقدس موعود ہیں جو بنو اسحاق کے بھائیوں یعنی بنو اسمٰعیل میں پیدا ہوئے۔

(۲) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ مقدس موعود ہیں جنہوں نے موسٰیؑ کی مانند ہونے کا دعوٰی کیا اور جن کے متعلق خداوند تعالیٰ نے کہا کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا۔ (مزمل ع۱) یعنی ہم نے تمہاری طرف تم میں سے ہی ایک مقدس انسان کو اسی طرح رسول بنا کر کھڑا کیا ہے جس طرح فرعون کی طرف ہم نے موسٰیؑ کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔ چنانچہ جس طرح حضرت موسٰیؑ کو تورات دی گئی جو ایک شریعت کی کتاب تھی اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن دیا گیا۔ جو ایک کامل شرعی قانون ہے۔ پھر آپؐ کے زندگی کے واقعات بھی موسٰیؑ کے واقعات سے ملتے جلتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح موسٰیؑ کے بعد امتِ موسوی کی اصلاح اور تجدید دین کے لئے متواتر مجددین اور انبیاء آتے رہے اور آخر تیرہ سو سال کے بعد حضرت مسیح ناصریؑ کو آپ کا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا گیا اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ہر صدی میں مجددین کے ظہور کی خبر دی۔ پھر آپؐ نے یہ بھی بتایا کہ آخر میں مسیح موعود آئیگا جو اسلام کے عروج اور اُس کی نشأۃِ ثانیہ کا موجب ہوگا۔ جیسا کہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایمان ثریا پر بھی چلا گیا تو ایک فارسی الاصل انسان اُسے واپس لے آئیگا۔ (بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۃ جمعہ)

(۳) پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مقدس موعود ہیں جن کے مونہہ میں خدا تعالیٰ کا کلام ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کے متعلق فرمایا کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (نجم ع۱) یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی مرضی سے خدا تعالیٰ کے منشاء کو الفاظ کا جامہ نہیں پہناتے بلکہ صرف وہی الفاظ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں جو وحی کی شکل میں آپ پر نازل کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک نام کلام اللہ بھی رکھا گیا ہے۔ (البقرۃ ع۹) کیونکہ اس میں شروع سے لیکر آخر تک صرف کلام اللہ ہی ہے۔ لیکن باقی انبیاء کی کتب میں خدا تعالیٰ کا کلام کم اور بندوں کا کلام زیادہ پایا جاتا ہے۔

(۴) پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی وہ مقدس موعود ہیں جنہوں نے دنیا کی شدید مخالفت کے باوجود خدا تعالیٰ کا کلام بلا کم و کاست لوگوں کو پہنچا دیا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب آپؐ پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (مائدہ ع۱) آج میں نے تمہارے لئے دین اسلام کو مکمل کر دیا ہے تو آپؐ نے تمام مسلمانوں کو دوبارہ اُن کے فرائض کی طرف توجہ دلائی اور آخر میں فرمایا۔ اَللّٰهُمَّ۔ هَلْ بَلَّغْتُ یعنی اے اللہ کیا میں نے تیرا پیغام پوری طرح پہنچا دیا ہے؟ اور سب مسلمانوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو گواہ رکھ کر کہتے ہیں کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ہم سب کو پہنچا دیا ہے۔ (سیرۃ ابن ہشام)

(۵) پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی وہ مقدس موعود ہیں جن کی الہامی کتاب کا ہر باب اِس آیت سے شروع ہوتا ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ گویا ہر مسلمان جب کسی سورۃ کی تلاوت کرتا ہے تو اُس کی آنکھوں کے سامنے موسٰیؑ کی پیشگوئی آجاتی ہے

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ

اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے کسی مصیبت کے آنے پر

فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ

کہیں گے۔ اے ہمارے رب! تُو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم تیری آیتوں کے

اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۸﴾

پیچھے چلتے اور مومنوں میں سے بن جاتے (تو شاید ہم تجھے رسول بناکر نہ بھیجتے مگر کفّار پر حجّت قائم کرنا ضروری تھا) ۱۹ف

کہ اس آنے والے موعود پر جو کلام نازل ہوگا وہ اُسے خدا کا نام لے کر دنیا کے سامنے پیش کریگا

(۶) پھر کہا گیا تھا کہ جو لوگ اُسکی تعلیم کا انکار کرینگے وہ اس جرم کی پاداش میں خدا تعالیٰ سے سزا پائے بغیر نہیں رہینگے چنانچہ پیشگوئی کا یہ حصّہ بھی بڑی شان سے پورا ہوا۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کرنے والے تباہ اور برباد کردیئے گئے۔ یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ جیسے عظیم الشان بادشاہوں کی فوجیں مسلمانوں سے ٹکرائیں اور خدا تعالیٰ نے اُنکی حکومتوں کو پاش پاش کردیا۔

(۷) پھر کہا گیا تھا کہ جو شخص افترا کے طور پر اپنے آپ کو اِس پیشگوئی کا مصداق قرار دیگا۔ اللہ تعالیٰ اُسے ہلاک کردیگا۔ اور وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ پیشگوئی کا یہ حصّہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت دنیا کے سامنے واضح کررہا ہے۔ کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ کو ہلاک کرنے کے لئے دشمنوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور ہر ناجائز سے ناجائز طریق اختیار کرنے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی مگر خدا تعالیٰ نے آپؐ کی مدد فرمائی اور دشمن آپؐ کا بال تک بیکا نہ کرسکا۔

غرض، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمدؐ رسول اللہ! جب طُور پر ہم نے موسیٰؑ کو تیرے آنے کی خبر دی تھی تو کیا تُو اُس وقت موسیٰؑ کے ساتھ تھا اور کیا تُو نے اُسے اِس پیشگوئی پر آمادہ کیا تھا! یہ کام تو صرف عالم الغیب خدا کا تھا جس نے دو ہزار سال پہلے تیرے آنے کی خبر دیدی۔ مگر ان لوگوں کو کیا ہوگیا کہ یہ ان پیشگوئیوں سے بھی کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے اور تیرا انکار کرتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ اتنا لمبا زمانہ پہلے یہ پیشگوئی اِس لئے کی گئی تھی کہ بعد میں آنے والے اس نبی کو قبول کرکے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصّہ پائیں اور تاکہ اے محمدؐ رسول اللہ! تُو اس قوم کو بھی خواب غفلت سے بیدار کرے مَآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا۔ یعنی اہلِ مکّہ کو۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ کفّارِ مکّہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے تھے مگر حضرت ابراہیمؑ اُن سے صدیوں پہلے گذر چکے تھے۔ اِسی طرح حضرت اسمٰعیلؑ بھی اُس وقت مبعوث ہوئے جبکہ ابھی اُن کی نسل ملک عرب میں نہیں پھیلی تھی پس ضروری تھا کہ کوئی نیا نبی آکر ان کو خدا تعالیٰ کی طرف توجہ دلائے اور انہیں توحید حقیقی پر قائم کرے۔

۱۹ف تفسیر: — فرماتا ہے کہ اگر ہمیں یہ خیال نہ ہوتا کہ ان لوگوں کو اپنے بُرے اعمال کی وجہ سے کوئی عذاب پہنچا تو یہ فوراً کہہ دیں گے۔ کہ اے ہمارے رب! تُو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ

پس جب اُنکے پاس ہماری طرف سے حق آگیا۔ تو انہوں نے کہا کیوں اس (یعنی محمدؐ رسول اللہ) کو ویسی تعلیم نہیں ملی

مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ

جیسی کہ موسیٰؑ کو ملی تھی۔ کیا انہوں نے موسیٰؑ کی تعلیم کا اس سے پہلے انکار نہیں کیا تھا۔ انہوں نے تو کہہ دیا تھا کہ

قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۟ وَقَالُوْآ اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

یہ دو بڑے جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اور کہدیا تھا کہ ہم اِن میں سے ہر ایک کے دعویٰ کے منکر ہیں ۲۰ھ

بھیجا۔ ہم ذلیل اور خوار ہونے سے پہلے تیرے احکام کی تعمیل کرتے اور مومن بن جاتے تو ہم اُن پر رسول بھیجنے کے بغیر ہی عذاب نازل کر دیتے۔ اس آیت کی یہ جزا کہ "ہم اُن پر رسول بھیجنے کے بغیر ہی عذاب نازل کر دیتے" اسجگہ محذوف کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کے بعض اور مقامات میں بھی جزا محذوف ہے اور بتایا گیا ہے کہ اگر نبی نہ آئیں تو قوموں پر حجت تمام نہیں ہوتی اور وہ خدا تعالیٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ تُو نے ہم میں نبی نہیں بھیجا اسلئے ہم ہدایت سے محروم رہیں۔ اگر ہم میں نبی آتا تو ہم اس کے احکام کی تعمیل کرکے تیری رضا حاصل کر لیتیں اور چونکہ یہ ایک معقول عذر ہوتا اِس لئے ہم نے سلسلۂ نبوت جاری کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دُنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اگر ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی آیات کی اتباع کرنے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی بجائے ظلم اور سرکشی کا رویہ اختیار کیا تو موسیٰؑ کی پیشگوئی کے مطابق اللہ تعالےٰ کا عذاب ان پر نازل ہو جائیگا اور پھر ان کا شور مچانا بیکار ہو جائیگا۔

۲۰ھ تفسیر:۔ اِس آیت میں بتایا کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر بجائے اِس کے کہ آپؐ کی قوم آپؐ کی پاک تعلیم سے فائدہ اُٹھاتی اور آپؐ پر ایمان لاکر اللہ تعالےٰ کے انعامات کی وارث بنتی اُس نے ایک نیا اعتراض کر دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ موسیٰؑ کی طرح کی کوئی کتاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں نہیں اتاری گئی۔ یعنی جس طرح موسیٰؑ پر اکٹھی کتاب اُتری تھی اُسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کیوں نہیں اُتری۔ جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کریم نے اِس اعتراض کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ کفار یہ اعتراض کرتے ہیں کہ لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ (فرقان آیت ۳۳) اِسپر قرآن ایک دفعہ ہی کیوں نازل نہیں کر دیا گیا۔ ٹکڑے ٹکڑے کرکے کیوں اتارا گیا ہے حالانکہ اُن کی یہ بات بالکل غلط تھی کہ موسیٰ پر اکٹھی کتاب اُتری ہے۔ جتنے عرصہ میں قرآن کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترا ہے اُس سے بہت زیادہ عرصہ میں تورات موسیٰؑ پر اُتری ہے۔ چنانچہ بائیبل کے بیان کے مطابق شروع میں تو صرف دس احکام موسیٰ پر نازل ہوئے لیکن باقی تورات کئی سالوں میں مکمل ہوئی۔ اور دشتِ سینا کے مختلف مقامات میں اُس کی متعدد آیات اُتریں۔ پس یہ اعتراض تو غلط ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تمہاری یہ بات درست بھی مان لی جائے کہ اکٹھی کتاب

قُلْ فَأْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۵۰﴾

تُو کہدے کہ (اگر موسیٰؑ اور ہارونؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کی باتیں جھوٹی ہیں تو) اگر تم سچے ہو تو اللہ کے پاس سے ایک ایسی کتاب لاؤ جو ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت دیتی ہو تاکہ میں اُس کی اتباع کروں ۲۱؎

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ

پھر اگر وہ کوئی جواب نہ دیں۔ تو جان لے کہ وہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔

نازل ہوتی تو تم مان لیتے تو سوال یہ ہے کہ موسیٰؑ کو اُن کے مخاطبوں نے کب مان لیا تھا، اُس پر تو تمہارے نزدیک اکٹھی کتاب اُتری تھی۔ مگر اُس کے زمانہ کے لوگوں نے بھی یہی کہا تھا کہ سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ہارونؑ اور موسیٰؑ دو بڑے جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں اور کہہ دیا تھا کہ اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ہم موسیٰؑ کے بھی منکر ہیں۔ اور ہارونؑ کے بھی۔ یعنی گو یہ کتاب اکٹھی اُتری ہے مگر پھر بھی ہم انکار کرتے ہیں۔ پس اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اکٹھا قرآن اُترتا تو تم نے کب مان لینا تھا تم پھر بھی اعتراض کرتے چلے جاتے۔

سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا میں موسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ یعنی جب اُن کے تمام اعتراضات کو واضح طور پر رد کر دیا جاتا ہے اور اُن کا بودا پن کھل جاتا ہے تو وہ جھنجھلا کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ ہم موسیٰؑ کو بھی نہیں مانتے موسیٰؑ بھی نعوذ باللہ جھوٹا تھا اور تم بھی نعوذ باللہ جھوٹے ہو تم بار بار موسیٰؑ کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہو اور موسیٰؑ اپنی کتاب میں تمہارے متعلق پیشگوئیاں کرتا ہے۔ پس درحقیقت تم دونوں ہی جھوٹے ہو جو ایک دوسرے کی تائید کر رہے ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ جب انسان ایک سچائی کا انکار کرتا ہے تو اُسے دوسری سچائی کا بھی لازماً انکار کرنا پڑتا ہے۔ جب انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کیا تو چونکہ موسیٰؑ کے کلام میں آپؐ کے متعلق پیشگوئیاں پائی جاتی تھیں اس لئے انہیں موسیٰؑ کا بھی انکار کرنا پڑا اور انہوں نے کہہ دیا کہ یہ سب جھوٹ اور فریب کا ایک چکر ہے جو چلایا جا رہا ہے۔ اس میں ہمیں کوئی سچائی نظر نہیں آتی۔

۲۱؎ **تفسیر**:- فرماتا ہے۔ اے محمد رسول اللہ تم اپنے دشمنوں کو کہو کہ تورات کا تو اس لئے انکار ہوا کہ وہ اکٹھی نازل ہوئی تھی اور قرآن کا انکار اس لئے ہوا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہوا ہے تو اب تم کوئی ایسی کتاب لاؤ جس نے دنیا میں ان دونوں کتابوں سے زیادہ ہدایت پھیلائی ہو اور کسی تیسرے طریق پر نازل ہوئی ہو مگر تم کبھی ایسا نہیں کر سکو گے کیونکہ تم جھوٹے ہو۔ باقی رہا میں سو میں تو ہر صداقت کو ماننے کے لئے تیار ہوں۔ تم کوئی صداقت میرے سامنے لاؤ پھر دیکھو کہ میں اُسے مانتا ہوں یا نہیں مانتا۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ

اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہے جو اللہ کی ہدایت کو نظر انداز کر کے اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے۔ اللہ (تعالیٰ)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ ع ۵ ۸ وَلَقَدْ

یقیناً ظالم قوم کو کامیابی کا راستہ نہیں دکھاتا۔ ۲۲ اور ہم اُن کے

وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۲﴾

لئے پے در پے وحی اُتارتے رہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۲۳

۲۲ تفسیر:- فرماتا ہے۔ اگر وہ تیرے اِس مطالبہ کو پُورا نہ کریں۔ تو تجھے معلوم ہو جائیگا کہ یہ لوگ کسی سچائی کی تلاش میں نہیں بلکہ جو بھی پراگندہ خیال اُن کے دل میں آتا ہے اُسے ظاہر کر دیتے ہیں۔ اور پراگندہ خیالات اور خواہشوں کے پیچھے چلنے والا تو نہایت گمراہ اور ظالم ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو کبھی کامیابی کا راستہ نہیں دکھاتا۔

۲۳ تفسیر:- وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ کے دو معنے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اُن کے لئے پے در پے اپنے رسول بھیجتے رہے ہیں۔ یا پے در پے اُن کے لئے کلامِ الٰہی نازل کرتے رہے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ہم نے اِس قول یعنی قرآن کریم کو اُن کے لئے مربوط طور پر نازل کیا ہے یعنی سارے قرآن میں ایک اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

پہلے مفہوم کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یہ آیت اُس مضمون کی حامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ یا اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (مومنون ع ۳) وغیرہ آیات میں بیان فرمایا ہے۔ یعنی دنیا کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے رسول بھیجتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی قوم ایسی نہیں جس میں خدا تعالیٰ کا کوئی ہادی اور راہنما نہ گذرا ہو۔ اور جس نے انہیں نیکی اور ہدایت کے راستے پر چلانے کی کوشش نہ کی ہو۔ چنانچہ جب ہم مختلف اقوام کے متعلق تحقیق کرتے ہیں تو وہ سب کی سب اِس بات کی متفقہ طور پر قائل نظر آتی ہیں کہ اُن میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نہ کوئی مصلح ضرور آیا تھا۔ جب ہم ہندوؤں سے پُوچھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں حضرت کرشن اور رامچندر جی خدا تعالیٰ کا پیغام لے کر آئے تھے۔ ہم عیسائیوں سے پُوچھتے ہیں تو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام بتاتے ہیں۔ ہم یہودیوں سے پوچھتے ہیں تو وہ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کا نام بتاتے ہیں۔ ہم ایرانیوں سے پُوچھتے ہیں تو وہ حضرت زرتشت علیہ السلام کا نام بتاتے ہیں۔ ہم چینیوں سے پُوچھتے ہیں تو وہ حضرت کنفیوشس کا نام لیتے ہیں۔ ہم یونانیوں سے پُوچھتے ہیں تو وہ سقراط کا نام لیتے ہیں۔ غرض کوئی قوم ایسی نہیں جس کی ہدایت کا اللہ تعالیٰ نے سامان نہ کیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جیسے عرب کا خدا ہے ویسا ہی وہ ہندوستان اور چین اور شام اور مصر اور ایران اور یونان کا بھی خدا ہے۔ جب اُس نے تمام دنیا کی جسمانی ضرورتوں کو پُورا کیا ہے تو وہ اُن کی رُوحانی ضرورتوں کو کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا جبکہ رُوح کی حفاظت جسم کی حفاظت سے بھی زیادہ ضروری تھی اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں اپنے اِسی احسان کی طرف

توجہ دلائی ہے کہ ہم نے ہمیشہ اپنی مخلوق پر رحم فرمایا اور اُس کی
ہدایت کا خیال رکھا اور اُس کی طرف پے در پے اپنے رسول
بھیجے۔ پے در پے اُن کے لئے وحی نازل کی تاکہ کوئی شخص
نادانستہ طور پر ہلاک نہ ہو۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ہم نے اِس قول
یعنی قرآن کریم کو ایسا بنایا ہے کہ اُس کی ہر آیت دوسری آیت
کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اور اُس کے تمام مضامین میں نہایت
اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے
ترتیبِ قرآن کے مسئلہ کو ہی نظر انداز کر دیا اور یہ کہنا شروع
کر دیا کہ نعوذ باللہ یہ ایک بے جوڑ کلام ہے جس کا آپس میں
کوئی تعلق نہیں۔ گویا اُن کے نزدیک مسلمانوں کو یہ تو ایمان
رکھنا چاہیئے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھنا
چاہیئے کہ انسانی کلام میں جو یہ خوبی ہوتی ہے کہ اُس میں ربط
پایا جاتا ہے وہ اُس میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے
مفسرین میں سے ابن حیانؒ کے سوا کسی نے ترتیب کے مسئلہ
کی طرف توجہ نہیں کی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں
قرآن کریم کی فضیلت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اِس میں ایک
اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے۔ تاکہ لوگ اِس پر غور کر کے
نصیحت حاصل کریں۔ لیکن یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ الہامی
کتابوں کی ترتیب عام کتابوں کی ترتیب سے جداگانہ
رنگ رکھتی ہے۔ عام کتابوں میں تو یہ ہوتا ہے کہ مثلاً پہلے مسائل
وضو بیان کئے جائیں گے۔ پھر مسائل عبادت بیان کئے جائیں گے
پھر ایک باب میں مسائل نکاح بیان کئے جائیں گے اسی طرح
کسی باب میں طلاق و خلع کا اور کسی باب میں کسی اور چیز کا
ذکر ہوگا۔ مگر الہامی کتابوں میں یہ رنگ نہیں ہوتا۔ بلکہ اُن کی
ترتیب بالکل اَور قسم کی ہوتی ہے۔ جو دنیا کی ترتیب سے بالکل
نرالی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جاہل لوگ کہہ دیتے ہیں کہ
کہ اِس میں کوئی ترتیب ہے ہی نہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ الہامی کتابوں میں دُنیا
کی تمام کتابوں سے نرالی ترتیب کیوں رکھی جاتی ہے۔ اِس کا
جواب یہ ہے کہ اِس میں بھی کئی حکمتیں ہیں:-

(الف) اس ترتیب سے سارے کلام سے دلچسپی پیدا
کرنی مدنظر ہوتی ہے۔ اگر الہامی کتاب کی ترتیب اِس طرح
ہو جس طرح مثلاً ھدایۃ کی ترتیب ہے کہ وضو کے مسائل
یہ ہیں۔ نکاح کے مسائل وہ، تو عام لوگ اپنے اپنے
مذاق کے مطابق انہی حصّوں کو الگ کر کے اُن پر عمل کرنا
شروع کر دیتے اور باقی قرآن کو نہ پڑھتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے
سارے مسائل کو اِس طرح پھیلا کر رکھ دیا ہے کہ جبتک
انسان سارے قرآن کو نہ پڑھ لے مکمل علم اسے حاصل ہی
نہیں ہو سکتا۔

(باء) لوگوں کو غور و فکر کی عادت ڈالنے کے لئے
بھی اللہ تعالیٰ نے یہ ترتیب اختیار کی ہے۔ اگر عام
کتابوں کی طرح اس میں مسائل بیان کر دیئے جاتے تو لوگوں کا
ذہن اِس طرف منتقل نہ ہوتا کہ اِن مسائل کے باریک
مطالب بھی ہیں۔ وہ صرف سطحی نظر رکھتے اور غور و فکر سے
محروم رہتے۔ مگر اب اللہ تعالیٰ نے اِن مسائل کو اِس طرح
پھیلا دیا ہے اور ایک دوسرے میں داخل کر دیا ہے کہ انسان
کو اُن کے نکالنے کے لئے غور اور فکر کرنا پڑتا ہے۔ اور
اُسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک سمندر ہے۔

(ج) یہ ترتیب اس لئے بھی اختیار کی گئی ہے۔ تا
خشیتِ الٰہی پیدا ہو۔ مثلاً اگر یوں مسائل بیان ہوتے
کہ وضو یوں کرو اور کلّی اس طرح کرو۔ عبادت اِس طرح کرو
اتنی رکعتیں پڑھو تو خشیتِ الٰہی پیدا نہ ہوتی۔ جیسے
عبادت وغیرہ کے تمام مسائل قدوری اور ہدایۃ وغیرہ
میں موجود ہیں مگر قدوری اور ہدایہ پڑھ کر کوئی خشیت اللہ
پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن وہی مسئلہ جب قرآن میں آتا ہے تو
انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی خشیت سے لبریز ہو جاتا ہے،
اِس لئے کہ قرآن اِن مسائل کو خشیت اللہ کا ایک جزء بنا کر

بیان کرتا ہے۔ اور دراصل نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ مسائل کا اصل مقصد تقویٰ ہی ہے۔ پس قرآن تقویٰ کو مقدم رکھتا ہے۔ تاکہ جب انسان کو یہ کہا جائے کہ وضو کرو تو وہ وضو کرنے کیلئے پہلے ہی تیار ہو۔ اسی طرح جب کہا جائے کہ نماز پڑھو تو انسان نماز پڑھنے کیلئے پہلے ہی تیار ہو۔ اگر قرآن میں نماز کا ایک باب ہوتا تو اُسے پڑھکر خشیت اللہ پیدا نہ ہوتی۔

غرض الہامی کتاب چونکہ اصلاح کو مقدم رکھتی ہے اس لئے وہ سطحی ترتیب کو چھوڑ کر ایک نئی ترتیب اختیار کرتی ہے جو جذباتی ہوتی ہے۔ یعنی قلب میں جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں الہامی کتاب اُن کا ذکر کرتی ہے یہ نہیں کہ وہ وضو کے بعد نماز کا ذکر کرے بلکہ وہ وضو سے روحانیت طہارت اور خدا تعالیٰ کے قرب کی طرف انسان کو متوجہ کریگی۔ کیونکہ وضو سے طہارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں پھر جب نماز کا مسئلہ آئیگا تو یہ نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نماز کے مسائل بیان کرنا شروع کردے بلکہ سجدہ اور رکوع کے ذکر سے جو جذبات انسانی قلب میں پیدا ہوتے ہیں اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ اُسے اپنی طرف متوجہ کریگا۔ تاکہ جو جذبات بھی انسان کے اندر پیدا ہوں اُن سے وہ ایسا اثر لے جو اُسے خدا تعالیٰ کے قریب کردے۔

غرض ترتیب قرآن ظاہر پر مبنی نہیں بلکہ قلب کے جذبات کی لہروں پر مبنی ہے۔ اور یہ لہریں مختلف ہوتی ہیں۔ مَیں اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال دے دیتا ہوں۔ کہتے ہیں کسی مسجد کا مُلّا ایک دن جماعت کرانے لگا۔ تو اُس نے دیکھا کہ مقتدی آسودہ حال ہیں۔ اس پر نماز میں ہی اُسے خیال آیا کہ اگر یہ مجھے تحفے تحائف دیں تو میرے پاس بہت سا مال اکٹھا ہو جائیگا۔ پھر جب مال جمع ہو جائیگا تو مَیں اس سے تجارتی سامان خریدونگا۔ خوب تجارت کرونگا۔ کبھی دلّی میں اپنی اشیاء لے جاؤں گا کبھی کلکتے چیزیں لے جاؤں گا۔ غرض وہ اِس طرح خیالات دوڑاتا چلا گیا۔ پھر ہندوستان اور بخارا کے درمیان اُس نے تجارت کی سکیم بنانی شروع کردی۔ بظاہر وہ رکوع اور سجود کر رہا تھا مگر خیالات کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ ایک بزرگ بھی اُن مقتدیوں میں شامل تھے۔ اُن پر کشفی حالت طاری ہوئی اور انہیں امام کے تمام خیالات بتا دیئے گئے۔ اِس پر وہ نماز توڑ کر الگ ہو گئے۔ جب اُس مُلّا نے نماز ختم کی تو وہ اُن پر ناراض ہُوا اور کہنے لگا تمہیں معلوم نہیں کہ نماز پڑھتے ہوئے اُسے بلا وجہ توڑا نہیں کرتے۔ وہ کہنے لگے مسئلہ تو مجھے معلوم ہے مگر میری صحت کچھ کمزور ہے۔ مَیں آپ کے ساتھ چلا اور دلّی تک گیا پھر دلّی سے بخارا گیا اور مَیں تھک کر رہ گیا اور چونکہ اتنے لمبے سفر کی میں برداشت نہیں کرسکتا تھا اس لئے آپ سے الگ ہوگیا۔ اِسپر وہ شرمندہ ہوکر خاموش ہوگیا۔ اب یہ بیہودہ خیالات تھے جو اُس کے دل میں پیدا ہوئے مگر ان خیالات میں بھی وہی ترتیب تھی جو اُس کے جذباتِ قلب کی تھی۔ یہی حال نیک خیالات کا ہے اور وہ بھی اِسی رنگ میں پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً تم سجدہ میں گئے اور تم نے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کہا۔ تو اگر اُس وقت تمہارا دل بھی حاضر ہے تو اللہ تعالیٰ کی سبّوحیت کا نقشہ تمہارے سامنے آنے لگتا ہے گو اُس وقت تمہارے مونہہ سے دوسری اور تیسری دفعہ بھی سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى نکل رہا ہوتا ہے مگر تمہارا دل پہلے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کو ہی چھوڑنے کو نہیں چاہتا یا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتے ہو اور تمہارا دل اُس وقت حاضر ہوتا ہے۔ تو اُس وقت حمد کے ماتحت اللہ تعالیٰ کے احسانات تمہارے سامنے یکے بعد دیگرے آنے شروع ہو جاتے ہیں اور تم اُنہی احسانات کی یاد میں محو ہو جاتے ہو۔ اب اگر ایسی حالت میں تم کسی کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہو تو گو تم اس کی اقتدا میں کبھی سجدہ کروگے کبھی رکوع میں جاؤگے اور مونہہ سے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ وغیرہ بھی کہو گے۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۲﴾

وہ لوگ جن کو ہم نے اِس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس (قرآن) پر (دل میں) ایمان رکھتے ہیں۔

وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ

اور جب وہ (یعنی قرآن) اُن کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ ہمارے رب کی طرف سے

رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ﴿۵۳﴾ أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ

برحق کلام ہے ہم تو آج سے پہلے ہی اس (کتاب کے مضامین) کے متبع تھے (گو مخفیہ) ان لوگوں کو ان کا

أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ

بدلہ اُن کے صبر کی وجہ سے دو دفعہ ملے گا اور وہ نیکی سے

گر تمہارے دل پر حمد ہی جاری ہوگی۔ تو قلوب پر بعض روحانی واردات آتی ہیں اور وہی حقیقی نماز ہوتی ہیں۔ اُسوقت انسان گو الفاظ مونہہ سے نکال رہا ہوتا ہے مگر اُسکے جذبات روحانیت کے لحاظ سے ایک خاص راستہ پر چل رہے ہوتے ہیں۔ پس وہ واردات جو انسانی قلب پر آتی ہیں قرآن کریم کی ترتیب اُس پر مبنی ہے۔ وہ نماز کے بعد روزہ کا ذکر نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری یہ آیت پڑھنے کے بعد کیا کیا خیالات انسان کے اندر پیدا ہونگے پس وہ خیالات جو اس کے نتیجہ میں انسانی قلب میں پیدا ہو سکتے ہیں قرآن کریم اُن کو بیان کریگا۔ پس قرآن کریم کی ترتیب اُن جذبات پر ہے جو قرآن کریم پڑھتے وقت پیدا ہوتے ہیں۔ اور چونکہ خدائے عالم الغیب جانتا تھا کہ فلاں آیت یا فلاں حکم کے نتیجہ میں کس قسم کے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں اِس لئے بجائے ظاہری ترتیب کے اُس نے قرآن کریم کی ترتیب اِن جذبات پر رکھی جو قلب مومن میں پیدا ہوتے ہیں مگر اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلتا ہے کہ جو لوگ محبت اور اخلاص سے قرآن مجید کو نہیں پڑھتے انہیں یہ کتاب بے ربط سی معلوم ہوتی،

وہ کہتے ہیں یہ کیا ہُوا کہ ابھی موسٰیؑ کا ذکر تھا پھر نوحؑ کا ذکر شروع کر دیا۔ پھر شعیبؑ کے حالات بیان ہونے لگ گئے۔ ابھی سُود کا ذکر تھا کہ ساتھ نماز کا ذکر آگیا۔ اُن کے نزدیک یہ باتیں اتنی بے جوڑ ہوتی ہیں کہ وہ اِنکا آپس میں کوئی تعلق سمجھ ہی نہیں سکتے۔ مگر وہی مضمون جب کسی عالم کے پاس پہنچتا ہے تو وہ سُنتا ہے اور سر دُھنتا ہے۔ اگر کہو کہ پھر اس کا علاج کیا ہے؟ تو یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس کا پہلا علاج تو یہ ہے کہ انسان سارے کلام کو پڑھے اور بار بار پڑھے۔ یہ نہیں کہ کوئی خاص حصہ چُن لیا اور اُسے پڑھنا شروع کر دیا۔ دوم جن لوگوں کا جذبۂ محبت ہر وقت کامل رہتا ہے اُن کے لئے تو یہ کافی ہے کہ وہ صبح یا شام کا وقت تلاوت کیلئے مقرر کریں۔ مگر جن کا جذبہ محبت ایسا کامل نہ ہو وہ صبح یا شام کو تلاوت کرنے کے علاوہ خصوصیت سے اُس وقت بھی تلاوت کیا کریں جب اُن کے دل میں محبت کے جذبات اُبھر رہے ہوں چاہے دوپہر کو اُبھریں یا کسی اور وقت۔ سوم قرآن کریم کو اس یقین کے ساتھ پڑھا جائے کہ اس کے اندر غیر محدود

السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِذَا سَمِعُوا

بدی کا مقابلہ کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس کو خرچ کرتے ہیں۔ اور (یہودیوں کے جب مسلمان) کوئی لغو بات

اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

سُنتے ہیں تو اُس سے اعراض کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں (اے کافرو!) ہمارے عمل ہمارے لئے ہیں اور تمہارے

اَعْمَالُكُمْ؛ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ؛ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۶﴾

عمل تمہارے لئے ہیں۔ تم پر سلامتی نازل ہو (یعنی خدا تمہیں ایمان نصیب کرے) ہم جاہلوں کے تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے۔ ۲۴ ؎

خزانہ ہے۔ جو شخص خیال کرتا ہے کہ جو کچھ علماء مجھے اِس کا مطلب بتائیں گے یا جو کچھ پہلی تفسیروں میں لکھا ہوا ہے وہیں تک اس کے معارف ہیں اس کے لئے یہ کتاب بند رہتی ہے مگر جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ اس میں علوم اور معارف کے غیر محدود خزانے موجود ہیں۔ اس کیلئے یہ کتاب معرفت کا ایک بحر بیکراں ثابت ہوتی ہے۔ جس طرح اگر تم کسی جنگل میں سے گذر رہے ہو تو تمہارے سامنے ہزاروں درخت آئیں گے مگر تم کسی کو غور سے نہیں دیکھو گے۔ لیکن اگر محکمہ جنگلات کا کوئی افسر معائنہ کرنے کے لئے آ جائے تو وہ بیسیوں نئی باتیں معلوم کر لیتا ہے۔ اِسی طرح جو شخص اس نیت سے قرآن پڑھتا ہے کہ یہ غیر محدود خزانہ ہے اور اس کی ترتیب نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے وہ اس سے فائدہ اُٹھا لیتا ہے۔ مگر جو اس نیت سے نہیں پڑھتا وہ فائدہ اُٹھانے سے محروم رہتا ہے۔

۲۴ ؎ حل لغات:۔ يَدْرَءُوْنَ: دَرَءَ سے فعل مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور دَرَءَهٗ (دَرْءًا وَدَرْاَةً) کے معنے ہیں دَفَعَهٗ۔ اُس کو ہٹایا۔ دَ رَقِيْلَ دَفَعَهٗ شَدِيْدًا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِس کے معنے زور سے ہٹانے کے ہیں (اقرب) پس يَدْرَءُوْنَ کے معنے ہونگے وہ سختی سے ہٹاتے ہیں۔

يَدْرَءُوْنَ

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ وہ لوگ جن کو قرآن کریم سے پہلے صرف نام کے طور پر کتاب نہیں ملی بلکہ حقیقی طور پر ملی ہے اور اُس پر سچا ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن کریم کی سچائی پر بھی صدق دل سے ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ خود ان کی کتاب میں قرآن کریم کے متعلق پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں چنانچہ جب اُن کے سامنے قرآن کریم پڑھا جاتا ہے تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ یقیناً ہمارے رب کی طرف سے ایک سچی کتاب ہے اور ہم اِس سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے فرماں بردار رہے ہیں اور اب بھی اس کے فرمانبردار ہیں۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا فرماتا ہے۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ یہ نمونہ دکھائیں گے اور اِس کی وجہ سے اپنی قوم سے مختلف قسم کی تکلیفیں پائیں گے اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوہرا اجر دیا جائیگا۔ یعنی ایک تو اس بات کا اجر کہ وہ تورات پر قائم رہے اور دوسرے اِس بات کا اجر کہ انہوں نے قرآن کریم کو مان لیا یا ایک تو وہ اجر جو دُنیا میں اُن کو دیا جائیگا اور دوسرا وہ اجر جو اگلے جہان میں دیا جائیگا۔

صَبَرُوْا میں بتایا کہ اُن کو یہ دوہرا اجر اُن کے صبر کی وجہ سے دیا جائیگا۔ صَبَر کے عربی زبان میں تین

معنے ہوتے ہیں ۔ اوّل ۔ گناہ سے بچنا ۔ دوّم ۔ نیک اعمال پر
استقلال سے قائم رہنا ۔ سوّم ۔ تکالیف پر شکوہ اور
جزع فزع کے اظہار سے اجتناب کرنا ۔ پس صَبَرُوْا
کہہ کر بتایا کہ یہ لوگ اس لئے دوہرے اجر کے مستحق ہیں کہ
یہ ہمیشہ گناہوں سے بچتے رہے جس کی وجہ سے خدا تعالیٰ
نے اِن کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ انہوں نے اُس کے امور
کی آواز پر لبیک کہہ دیا ۔ دوسرے یہ لوگ اس لئے
دوہرے اجر کے مستحق ہیں کہ یہ نیک اعمال پر استقلال سے
قائم رہے ۔ اور خدا تعالیٰ کو ان کی یہ نیکی ایسی پسند آئی
کہ اُس نے انہیں اس دوسری نیکی کی بھی توفیق عطا فرمائی
کہ انہوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قبول کر
لیا ۔ تیسرے یہ لوگ اس لئے دوہرے اجر کے مستحق ہیں کہ
انہوں نے تورات کو مان کر بھی دشمنوں سے تکلیفیں سہیں
اور اب قرآن کریم کو مان کر بھی اپنی قوم کی لعن طعن کا
نشانہ بنے ہوئے ہیں ۔ مگر ان تمام تکالیف کے باوجود
ان کی زبانوں پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا ۔ بلکہ ہمیشہ یہ
اپنے ربّ کی رضاء پر راضی رہے ۔ پس یہ نیکیاں ایسی
نہیں جو ضائع ہوسکیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے نیک اعمال
کا اس جہان میں بھی بدلہ دیگا اور آخرت میں بھی انہیں
اپنی رضا کا مقام عطا فرمائیگا ۔

پھر بتایا کہ اہل کتاب میں بعض اور خوبیاں بھی ہیں
چنانچہ ایک خوبی تو یہ ہے کہ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ
السَّيِّئَةَ وہ بدی کو نیک سلوک کے ساتھ دُور کرتے ہیں
یعنی اوّل بدی کو مٹانے کے لئے وہ اپنا نیک نمونہ لوگوں کے
سامنے پیش کرتے ہیں ۔ اور اِس طرح لوگوں کو جرأت
دلاتے ہیں کہ بدیوں سے بچنا کوئی مشکل کام نہیں اگر ہم نے
بدیوں کو ترک کر دیا تو تمہارے لئے اُن پر غالب آنا
کونسا مشکل امر ہے ۔ دوّم وہ نیکی پھیلانے کے لئے
متواتر وعظ و نصیحت سے کام لیتے ہیں ۔ تاکہ برائیوں کا
لوگوں کے ذہنوں سے خود بخود استیصال ہوتا چلا جائے ۔
اور برائیوں کی شناعت اُن کے دلوں میں پیدا ہو جائے ۔
سوّم ۔ وہ بدی کو مٹانے کے لئے ایسا رویہ اختیار کرتے
ہیں ۔ جو نیک نتائج پیدا کرنے والا ہوتا ہے ۔ یعنی اگر عفو
میں اصلاح دیکھیں تو دوسرے کو معاف کر دیتے ہیں ۔ اور
اگر مجرم کی اصلاح سزا کے بغیر نہ ہوسکتی ہو تو اُسے سزا دیتے
ہیں ۔ تورات کی طرح نہ ہر موقعہ پر انتقام لینے کی کوشش کرتے
ہیں اور نہ انجیل کی طرح ہر جرم کو معاف کرنے کی کوشش
کرتے ہیں بلکہ وہ موقع اور محل کو دیکھ کر بدی کو اُس طریق
سے دُور کرتے ہیں جو اچھے نتائج پیدا کرنے والا ہو ۔
چہارم وہ ظلم کے مقابلہ میں ظلم اور بے انصافی کے مقابلہ
میں بے انصافی اور شرارت کے مقابلہ میں شرارت سے
کام نہیں لیتے بلکہ ہمیشہ سچائی اور انصاف اور خدا ترسی کو
مدنظر رکھتے ہیں ۔ اور بدی کے مقابلہ میں بھی نیکی ہی اختیار
کرتے ہیں ۔

دوسری خوبی یہ بتائی کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
يُنْفِقُوْنَ ۔ ہم نے اُن کو جو کچھ دیا ہے اُس میں سے خرچ
کرتے ہیں ۔ یعنی خدا تعالیٰ نے انہیں جو بھی نعمت عطا
فرمائی ہے وہ اسے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے
لئے صرف کرتے ہیں ۔ وہ غرباء کے لئے صرف اپنا روپیہ
ہی صرف نہیں کرتے بلکہ ہم نے اُن کو جو کچھ بھی دیا ہے
اُس کا ایک حصہ وہ دوسروں کے لئے ہمیشہ خرچ کرتے
ہیں ۔ عربی زبان میں رزق اللہ تعالیٰ کی ہر عطا کردہ چیز
کو کہا جاتا ہے ۔ چنانچہ مال بھی رزق میں شامل ہے ۔ علم
بھی رزق میں شامل ہے ۔ طاقت بھی رزق میں شامل ہے
رزق بمعنی اناج بھی رزق میں شامل ہے ۔ وقت بھی
رزق میں شامل ہے ۔ غرض ہر وہ چیز جس سے انسان کو
کسی نہ کسی رنگ میں فائدہ پہنچتا ہو وہ رزق ہے پس
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ فرما کر اسطرف توجہ دلائی گئی ہے

کہ خدا تعالیٰ انسان کو جو کچھ بھی دے ۔ اُسے لوگوں کے فائدہ کے
لئے خرچ کرنا چاہیئے ۔ اگر کوئی شخص ہنر تو جانتا ہے لیکن سرمایہ
نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ہنر سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا
تو تم اس کی سرمایہ سے مدد کرو ۔ جس کے پاس کھانے کو نہیں
ہے اُس کو تم کھانے کے لئے دو ۔ جس کے پاس پینے کو نہیں
ہے اُسے پینے کے لئے دو ۔ جس کے پاس پہننے کو نہیں
ہے ۔ اُسے پہننے کے لئے مہیا کرو ۔ اسی کے مطابق ایک
لطیفہ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ بیان فرمایا کرتے
تھے ۔ کہ ایک بزرگ قرآن کریم پڑھتا جا رہا تھا ۔ وہ مُنہ
سے بھی پڑھتا تھا ۔ آنکھوں سے بھی الفاظ کو دیکھتا تھا
اور انگلی بھی الفاظ کے ساتھ ساتھ قرآن کریم پر پھیرتا
جاتا تھا ۔ کسی نے اُسے کہا ۔ کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ اُس
نے جواب دیا کہ یہ تینوں چیزیں مجھے خدا تعالیٰ نے دی
ہوئی ہیں ۔ اگر میں صرف زبان سے قرآن کریم پڑھوں گا
تو خدا تعالیٰ کہے گا ہاتھوں اور آنکھوں سے کیوں کام
نہ لیا ۔ اگر میں زبان اور ہاتھوں کو استعمال کرونگا ۔ تو
اللہ تعالیٰ کہیگا آنکھوں کو کیوں نہ استعمال کیا ۔ اور اگر
صرف آنکھوں سے قرآن کریم پڑھونگا اور زبان اور ہاتھ
نہ ہلاؤنگا تو خدا تعالیٰ کہیگا ان سے کیوں نہ کام لیا ۔
اس لئے میں ان تینوں اعضاء کو ایک ہی وقت میں
استعمال کر لیتا ہوں ۔

غرض اللہ تعالیٰ اہل کتاب میں سے ایمان لانے
والوں کی یہ خوبی بیان فرماتا ہے کہ اُن کے دلوں میں
بنی نوع انسان کی اتنی گہری محبت ہے کہ انہیں جو کچھ
بھی ملے اس کا ایک حصہ وہ دوسروں کی فلاح و بہبود
کے لئے ضرور صرف کرتے ہیں ۔ وہ صرف روپیہ دے کر یہ
نہیں سمجھ لیتے کہ انہوں نے خدمت کا حق ادا کر دیا ہے
بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ ہر چیز میں دوسروں کو
شریک کرتے ہیں اور اس طرح اُن کے معیارِ زندگی کو
بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

میں نے اپنی تائی صاحبہ مرحومہ کو دیکھا ہے کہ
باوجود اس کے کہ اُن کی اسّی بیاسی سال کی عمر ہو گئی تھی ۔
پھر بھی وہ سارا سال روئی کاتتیں ۔ پھر اٹیاں بناتیں
پھر جولاہوں کو دے کر اُس کا کپڑا بنواتیں اور پھر رضائیاں
اور توشکیں بنوا کر غریبوں میں تقسیم کرتیں ۔ اور اس میں سے
بہت سا کام وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتیں ۔ اور جب
کہا جاتا کہ دوسروں سے کروا لیا کریں تو کہتیں اس طرح
مزا نہیں آتا ۔ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر چیز کو خدا کی راہ میں
خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے ۔ وہ لوگ جو کسی غریب کو چند پیسے دیکر سمجھ لیتے ہیں
کہ اس پر عمل ہو گیا وہ غلطی کرتے ہیں ۔ جو شخص پیسے تو خرچ کرتا ہے مگر زبان سے
تبلیغ نہیں کرتا وہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے اس حکم پر پوری طرح عمل کر لیا ہے یا جو تبلیغ بھی
کرتا ہے مگر بیواؤں اور یتیموں کی خدمت نہیں کرتا وہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس
حکم پر پوری طرح عمل کر لیا ہے ۔ اسی طرح اپنے جذبات کو بھی خدا
تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنا ضروری ہوتا ہے ۔ مثلاً کسی پر
غصہ چڑھا تو معاف کر دیا ۔ اس حکم میں خدمتِ خلق سے
تعلق رکھنے والے مختلف قسم کے کام بھی شامل ہیں جن
کی طرف ہماری جماعت کے نوجوانوں کو خصوصیت سے
توجہ کرنی چاہیئے اور مذہب و ملّت کے امتیاز کے بغیر تمام
بنی نوع انسان کی احمدی معیار کے مطابق خدمت کرنی
چاہیئے تاکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو ۔

تیسری خوبی اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی کہ وَإِذَا
سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا
وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي
الْجَاهِلِينَ ۔ جب وہ خدائے واحد کا انکار کرنیوالوں
سے کوئی بیہودہ بات سُنتے ہیں تو اُس سے اعراض کر لیتے
ہیں اور اُن سے کہتے ہیں کہ تم ہماری دشمنی کیوں کرتے ہو ۔
ہمارے اعمال کا بدلہ ہم کو ملے گا اور تمہارے اعمال کا بدلہ
تم کو ملے گا ۔ ہم تو تمہارے خیر خواہ ہی ہیں لیکن ہم کسی

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

تو جس کو پسند کرے ہدایت نہیں دے سکتا - لیکن اللہ (تعالیٰ)

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

جسے چاہے ہدایت دیتا ہے - اور وہ ہدایت پانیوالوں کو خوب جانتا ہے - ۵۲۵

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ

اور وہ کہتے ہیں اگر ہم اس ہدایت کی جو تجھ پر نازل ہوتی ہے اتباع کریں تو اپنے ملک سے

مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا

اُچک لئے جائیں گے - (تو کہدے) کیا ہم نے اُن کو محفوظ اور امن والے مقام میں جگہ نہیں دی -

جاہل مطلق غصیلے کی صحبت پسند نہیں کرتے -

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے لوگوں کی یہ خوبی بیان فرمائی ہے کہ وہ لغو سے اعراض کرتے ہیں - مگر افسوس کہ آج مسلمان بھی جن کی کتاب قرآن ہے اور یوروپین امریکن نومسلم بھی جن کا اس آیت میں ذکر ہے سینما اور تھیٹروں کی طرف جاتے ہیں - اور لغو سے اعراض کرنیکی بجائے لغو سے محبت کرتے دکھائی دیتے ہیں - حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مرد و عورت کے اختلاط کو ممنوع قرار دیا ہے - اور تھیٹر سائے کے سارے مرد و عورت کے اختلاط کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں - اگر وہ اختلاط نہ کریں اور اگر وہ مل کر ناچیں نہیں تو فلم بن ہی نہیں سکتی - فلم اسی طرح بنتی ہے کہ مرد بھی ناچتے ہیں اور عورتیں بھی ناچتی ہیں اور فلم تیار ہو جاتی ہے - اور یہ چیز اسلامی نقطۂ نگاہ سے ناجائز ہے - مگر آج کا مسلمان بھی اس لغو پر جان دے رہا ہے اور آج کا یوروپین اور امریکن نومسلم بھی اس لغو میں ملوث ہے - کاش وہ نصیحت حاصل کریں اور اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں -

---

۵۲۵ تفسیر:- فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو جس کو چاہے اُسے ہدایت نہیں دے سکتا - ہاں اللہ تعالیٰ جسے پسند کرتا ہے اُسے ہدایت دے دیتا ہے - اور خدا ہی جانتا ہے کہ کون لوگ ہدایت کے مستحق ہیں - یعنی تُو تو سب دنیا کا خیرخواہ ہے - اور چاہتا ہے کہ سب کو ہدایت میسر آ جائے - مگر تیری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی - کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سُنت ہے کہ وہ اُنہی لوگوں کے لئے ہدایت کے سامان پیدا کرتا ہے جو خود ہدایت کے جویاں ہوتے ہیں -

---

يُجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا

جس کی طرف ہر قسم کے پھل لائے جاتے ہیں - یہ ہماری طرف سے عطیّہ ہے -

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۸﴾

مگر اُن میں سے اکثر جانتے نہیں۔ ۲۶ھ

۲۶ھ حل لغات - نُتَخَطَّفْ

نُتَخَطَّفْ: تَخَطَّفَهٗ کے معنے ہیں اِنْتَزَعَهٗ - اُس کو جگہ سے ہلا دیا وَاجْتَذَبَهٗ اور اُسے کھینچا - وَاسْتَرَقَهٗ وَاسْتَلَبَهٗ وَمَرَّ بِهٖ سَرِيْعًا - اُسے اُچک لیا اور چھین کر جلدی سے چلا گیا - (اقرب) پس نُتَخَطَّفْ کے معنے ہونگے ہم اُچک لئے جائیں گے -

يُجْبٰى: يُجْبٰى: جَبٰى يَجْبِيْ (جِبَايَةً) جَبَا يَجْبُوْا (جِبْوَةً وَجِبَاوَةً) سے مضارع مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے اور جَبَا الْخِرَاجَ وَجَبَى الْمَالَ وَالْخِرَاجَ کے معنے ہیں جَمَعَهٗ - مال اور خراج اکٹھا کیا - اَلْجَابِيَةُ اَلْحَوْضُ الَّذِيْ يُجْبٰى فِيْهِ الْمَاءُ لِلْاِبِلِ - جَابِيَه اُس حوض کو کہتے ہیں جس میں اونٹوں کے لئے پانی جمع کیا جاتا ہے - (اقرب) پس يُجْبٰى کے معنے ہونگے جمع کیا جاتا ہے -

تفسیر: - فرمایا - محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دشمن اُن سے کہتے ہیں کہ اگر ہم بھی تیرے ساتھ مل کر اسلام کو مان لیں تو لوگ ہم کو اُچک کر لے جائیں - یعنی تیری تعلیم تو امن والی ہے اگر ہم بھی امن کا راستہ اختیار کر لیں تو ارد گرد کی قومیں ہمیں فوڑا تباہ کر دیں گی - اور ہمیں غلام بنا کر لے جائیں گی - اللہ تعالیٰ اُن کو جواب دیتا ہے کہ کیا ہم نے اُن کو حرم میں جگہ نہیں دی - جو محفوظ اور امن والا مقام ہے - اور جس کی طرف ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں - جو ہماری طرف سے بطور رزق اور عطیّہ کے ہیں - لیکن افسوس اُن میں سے اکثر سمجھتے نہیں اور یہ نہیں جانتے کہ جس خدا نے ابراہیمؑ کے زمانہ سے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کی حفاظت فرمائی ہے - جس نے ابرہہ کے لشکر کو تباہ کر دیا اور بیت اللہ کو محفوظ رکھا - اور جو ایک بے آب وگیاہ جنگل میں ساری دنیا کے پھل اور غلّے لا رہا ہے کیا اِس زمانہ کی آئی ہوئی ہدایت کے ماننے پر وہ اُنکی حفاظت نہیں کرے گا - اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیگا - یعنی یہ کیسی نابینائی کی علامت ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ ابراہیمؑ کے زمانہ سے خدا تعالےٰ کے اس عظیم الشان نشان کو دیکھ رہے ہیں کہ جہاں گھاس کی ایک پتّی تک نہیں پائی جاتی اور جہاں معمولی روٹی بھی انہیں کھانے کے لئے میسّر نہیں آسکتی تھی وہاں دنیا بھر کے عمدہ سے عمدہ میوے اور اعلیٰ سے اعلیٰ پھل خدا تعالےٰ نے جمع کر دیئے ہیں - پھر بھی وہ اس خیالی خطرہ کی وجہ سے کہ ارد گرد کی قومیں انہیں نوچ کر کھا جائیں گی اسلام کو قبول کرنے سے محروم ہو رہے ہیں - اور خدا تعالےٰ کا اتنا بڑا نشان دیکھنے کے باوجود وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے کبھی ضائع نہیں کرتا - اگر وہ اسلام کو قبول کر لیں تو جس خدا نے ابراہیمؑ کے زمانہ سے اُن کی تائید فرمائی ہے اور انہیں ایک بے آب وگیاہ جنگل میں اپنی نعمتیں پہنچائی ہیں - وہ

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ

اور بہت سی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کیا جو اپنی معیشت (کے افراط) کی وجہ سے متکبر ہو گئی تھیں۔

فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ

پس (دیکھ) یہ اُن کی بستیاں ہیں جن میں اُن کے بعد کوئی نہیں

اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَمَا

رہا اور ہم ہی اُن کے وارث بنے۔ ۲۷ع اور

كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ

تیرا رب جب تک (کسی بستیوں کے مجموعہ کی) مرکزی بستی میں ایسا رسول نہ بھیج دے جو اُن کے سامنے

فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ

ہماری آیتیں پڑھ کر نہ سُنائے اُن بستیوں کے مجموعہ (یعنی ملک) کو ہلاک کرنیکا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا (کیونکہ

اب بھی اُن کی حفاظت کے سامان پیدا کر دیگا اور اُن کے دشمنوں کو اُن پر غالب نہیں آنے دیگا۔

۲۷ع حل لغات :- بَطِرَتْ : بَطِرَ (يَبْطَرُ بَطَرًا) کے معنے ہیں اَخَذَتْهُ دَهْشَةٌ وَ حَيْرَةٌ عِنْدَ هُجُوْمِ النِّعْمَةِ عَنِ الْقِيَامِ بِحَقِّهَا۔ نعمت کی فراوانی پر اس کے حقوق کی ادائیگی میں لااُبالی اور بے پرواہی برتنے لگا۔ اَوْ طَغٰى بِالنِّعْمَةِ اَوْ عِنْدَهَا۔ نیز اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ نعمت کے سبب سے یا نعمت کی موجودگی میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اور سرکش بن گیا۔ نیز بَطِرَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں کَرِهَهٗ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّسْتَحِقَّ الْكَرَاهَةَ۔ یعنی ایسی چیز کو ناپسند کیا جو ناپسندیدگی کے لائق نہیں تھی۔ کہتے ہیں۔ بَطِرَ الْحَقَّ اور معنے یہ ہوتے ہیں کہ تَكَبَّرَ عَنْهُ فَلَمْ يَقْبَلْهُ۔ حق سے تکبر کیا اور اُسے قبول نہ کیا۔ وَعِنْدَ بَعْضِهِمْ لَمْ يَرَهٗ حَقًّا فَتَكَبَّرَ عَنْ قَبُوْلِهٖ اور بعض نے اس کا مفہوم یہ لیا ہے کہ اُس نے اُس چیز کو حق نہ سمجھا جس کی بنا پر اس کے قبول کرنے میں تکبر کیا اور بَطِرَ فُلَانٌ النِّعْمَةَ کے معنے ہیں اِسْتَخَفَّهَا فَكَفَرَهَا۔ نعمت کو خفیف سمجھا اور اس کی بناء پر اُس کی ناقدری کی۔ اور اَبْطَرَهُ الْمَالُ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ بَطِرًا۔ مال نے اس کو متکبر بنا دیا۔ (اقرب) پس بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا کے معنے ہیں۔ بستیاں اپنی معیشت کے افراط کی وجہ سے متکبر ہو گئیں۔

بَطِرَتْ

تفسیر :- فرمایا۔ اُنہیں اپنی اس عزت کی وجہ سے جو ابراہیمی دُعاؤں کی وجہ سے حاصل ہے مغرور نہیں ہونا چاہیئے۔ دُنیا میں بہت سی بستیاں ایسی ہیں جو اپنی معیشت کے سامانوں کے افراط کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ مگر پھر دیکھ لو تمہارے سامنے

مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ⑥⓪

ہم کسی بستیوں کے مجموعہ (یعنی ملک) کو کبھی ہلاک نہیں کرتے سوائے اس کے کہ اُن کے رہنے والے ظالم ہوجائیں ۲۸ ھ

اُن کے گھر موجود ہیں جو اُجڑ گئے۔ اور اُن کے بعد اُن میں کوئی نہ رہا۔ اور ہم ہی اُن ملکوں کے وارث ہوگئے۔ یعنی اُن کی اولادیں تک باقی نہ رہیں اور اُن کے آباد مکانات ویران اور سنسان جنگلات کی طرح بن گئے۔ پھر مکہ والے کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اور محض خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق پر کیوں اترا رہے ہیں۔ اور کیوں سچائی کو قبول نہیں کرتے جو اصل چیز ہے۔

۲۸ھ **تفسیر**:- اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ جب تک کسی ملک کے مرکزی مقام پر یعنی اس مقام پر جو خدا تعالیٰ کی نگاہ میں دین کا مرکز ہونے کے لائق ہو اللہ تعالیٰ کسی رسول کو نہ بھیج لے جو اس ملک کے لوگوں کو خدا تعالیٰ کے احکام سے آگاہ کرے اُس وقت تک خدا تعالیٰ اُس ملک پر عذاب نازل نہیں کیا کرتا۔ اور نہ خدا تعالیٰ کبھی کسی ملک کو اُس وقت تک ہلاک کرتا ہے جبکہ اس ملک کے رہنے والے انصاف پسند ہوں۔ عذاب صرف قوم کے ظالم ہوجانے کی وجہ سے یا نبی کے ردّ کرنے کی وجہ سے آتا ہے۔ اِسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ طٰہٰ میں اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى (طٰہٰ ع) یعنی اگر رسول کی بعثت سے پہلے ہم اُن پر عذاب نازل کر دیتے تو یہ ہم پر اعتراض کرتے کہ جب ہم گمراہ تھے اور ہدایت کے محتاج تھے تو تُو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیرے احکام کو قبول کر لیتے۔ اور خدا تعالیٰ اُن کے اعتراض کو صحیح تسلیم کرتا ہے اور اس کا ردّ نہیں کرتا۔ بلکہ اِس مضمون کو قرآن کریم کے متعدد مقامات پر بیان کرکے اس کی اہمیت کو ثابت فرماتا ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (انعام ع) یعنی اے جنوں اور انسانوں کی جماعتو! کیا تم میں سے ہی تمہارے پاس ہمارے رسول نہیں آئے تھے۔ جو تمہیں ہمارے احکام پڑھ پڑھ کر سُناتے اور تم پر جو یہ دن آنے والا تھا اُس سے تمہیں ڈراتے تھے وہ کہیں گے ہم اپنے خلاف آپ گواہی دیتے ہیں۔ اور درحقیقت انہیں ورلی زندگی نے دھوکا دے دیا۔ اور انہوں نے اپنے خلاف آپ گواہی دیدی کہ وہ کافر تھے۔ یہ (رسولوں کا بھیجنا اور کفار پر حجت قائم کرنا) اس لئے تھا کہ تیرا خدا شہروں کو اُس حالت میں کہ لوگ غافل تھے ظالمانہ طور پر ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا ہوشیار کردینے کے کسی قوم کی ہلاکت کا فتویٰ لگا دینا ظلم ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر کوئی قوم ہدایت کی محتاج ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اُس کے لئے ہادی نہ بھیجے لیکن قیامت کے دن اُسے سزا دے کہ تم نے کیوں احکامِ الٰہی پر عمل نہیں کیا تھا تو یہ ظلم ہوگا اور اللہ تعالیٰ ظالم نہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ اُس وقت تک کوئی عالمگیر عذاب دنیا پر نازل نہیں کرتا جب تک کہ

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا

اور جو کچھ تمہیں دیا جاتا ہے وہ تو صرف ورلی زندگی کا سامان ہے اور اُس کی زینت ہے

اس سے پہلے لوگوں کو ہوشیار کرنے کے لئے وہ اپنا کوئی رسول مبعوث نہ کردے۔ اور چونکہ اس زمانہ میں بھی دنیا پر ایسی تباہیاں اور عذاب آرہے ہیں کہ جنکی اِس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس لئے یہ عذاب اور تباہیاں بھی بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی صداقت کا ثبوت ہیں جنہیں خدا تعالےٰ نے رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور جنہوں نے دنیا کو قبل از وقت ہوشیار کرتے ہوئے فرما دیا تھا کہ

"دُنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اسکو قبول نہ کیا۔ لیکن خدا اُس کو قبول کرے گا۔ اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کر دیگا۔" (براہین احمدیہ ص۵۵۷)

چنانچہ اس الہام کے بعد خدا تعالےٰ کے حملے مختلف زلازل اور لڑائیوں اور بیماریوں اور سیلابوں کی شکل میں اِس زور سے ہوئے کہ اُن کے نتیجہ میں لاکھوں لوگ ہلاک ہو گئے۔ اور انہوں نے دنیا میں ہی قیامت کا نظارہ دیکھ لیا۔ مگر افسوس کہ اتنی شدید تباہیوں کے بعد بھی بعض لوگوں کے دل ایسے سخت ہو جاتے ہیں کہ وہ بڑی دلیری سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ اِن زلازل اور طوفانوں اور بیماریوں اور لڑائیوں کا کیا ہے۔ یہ مصائب تو ہمیشہ دنیا میں آتے رہے ہیں اور چونکہ پہلے زمانوں میں بھی ایسے لوگ گذرے ہیں جنہوں نے اپنے نبیوں کے مقابلہ میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ اور اُن کے نشانات کی تحقیر کی اس لئے اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں اس اعتراض کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ۔ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ یعنی ہم نے کبھی کوئی رسول کسی بستی کی طرف نہیں بھیجا کہ اس کے بھیجنے کے ساتھ ہی وہاں کے لوگوں کو ہم نے مالی اور بدنی مصائب میں گرفتار نہ کیا ہو۔ اور اس سے ہماری غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگ خدا تعالےٰ کے حضور عاجزی کریں۔ پھر اس کے بعد ہم اُن کی تکلیف کو سہولت سے بدل دیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ خوب ترقی کر جاتے ہیں تو یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ دُکھ اور سُکھ دونوں ہمارے باپ دادا کو بھی پہنچا کرتے تھے۔ پھر ان دکھوں میں نبیوں کی صداقت کا کیا ثبوت ہے؟ پس ہم اُن کو اچانک پکڑ لیتے ہیں اور وہ نہیں سمجھتے کہ ایسا کیوں ہُوا (اعراف ع۱۲ آیت ۹۵، ۹۶)

پس یہ ایک خطرناک خیال ہے جو حق سے دُور رہنے والے لوگوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے۔ حق یہی ہے کہ عالمگیر عذاب اُسی وقت اور اُسی زمانہ میں آتے ہیں جب پہلے کوئی رسول مبعوث ہو چکا ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا یعنی ہم کبھی عذاب نہیں بھیجا کرتے جب تک کہ اس سے پہلے رسول نہ بھیج لیا کریں۔ پس یہ عذاب اس قابل نہیں کہ ان کو معمولی سمجھا جائے بلکہ یہ اِس بات کی

ع ۶ ۹

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے کیا تم عقل نہیں کرتے۔ ۵۲۹

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ

کیا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا (یعنی اخروی زندگی کی کامیابی کا) وعدہ کیا ہو اور وہ اُسے (یقیناً) پالینے والا ہو اُس شخص کی

مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

طرح ہو سکتا ہے جس کو ہم نے صرف دنیوی زندگی کا کچھ سامان دیا ہو۔ پھر وہ قیامت کے دن (خدا کے روبرو

مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۶۲﴾

جواب دہی کے لئے) پیش کیا جانے والا ہو۔ ۵۳۰

علامت ہیں کہ اس وقت خدا تعالیٰ کا کوئی رسول مبعوث ہو چکا ہے۔

۵۲۹ تفسیر:۔ فرماتا ہے لوگ بعض دفعہ اپنی نادانی سے دنیوی سامانوں کو ہی اپنی ترقی اور کامیابی کا معیار سمجھ لیتے ہیں اور وہ اسی پر اتراتے پھرتے ہیں کہ ان کے پاس بڑا مال ہے یا انہیں بڑی عزت یا رسوخ حاصل ہے۔ حالانکہ وہ سامان بہت تھوڑے عرصہ کے لئے ان کے آرام کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن خدا تعالےٰ کے فیصلہ کے مطابق جو قوم کو ترقی ملتی ہے وہ تھوڑی سی تجارت یا تھوڑے سے سونے چاندی کا نام نہیں ہوتا بلکہ وہ اس سے بہت بہتر چیز ہے اور باقی رہنے والی ہے یعنی اقتدار اور غلبہ۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم عقل نہیں رکھتے کہ اس بات کو سمجھ سکو اور انفرادی ترقی کی بجائے محمدؐ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر قومی ترقی کے حصول کی کوشش کرو۔

---

۵۳۰ تفسیر:۔ اس آیت میں بتایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ دنیوی دولت دیتا ہے۔ وہ باوجود دنیا کی دولت پر قابض ہونے کے اُس شخص کے برابر نہیں ہو سکتا جس سے اللہ تعالےٰ آئندہ روحانی برکات کا وعدہ کرتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ مومن ہے تو وہ خدا تعالےٰ کے وعدے کو حاضر سے کم نہیں سمجھیگا۔ اور چونکہ اُس کا حاضر مادی ہے اور اس کا موعود روحانی ہے اس لئے اس کے ایمان کی علامت یہی ہو سکتی ہے کہ یہ اس موعود کو بڑا سمجھے اور اُس کے حاضر کو حقیر سمجھے۔

وَعَدْنٰهُ کے ساتھ وَعْدًا حَسَنًا کے الفاظ اس لئے بڑھائے گئے ہیں کہ عربی زبان میں وعدہ کا لفظ بعض دفعہ عذاب کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے جیسے سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ (اعراف آیت ۴۵)

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِينَ

اور (یاد کرو) جس دن وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) انکو بلائیگا پھر پوچھیگا کہ میرے مزعومہ شرکاء کہاں ہیں جنکو تم

كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿۶۳﴾ قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ

میرے مقابل پر معبود قرار دیتے تھے۔ (تب) جن پر ہمارے عذاب کی خبر پوری ہوچکی ہوگی کہیں گے۔

رَبَّنَا هَٰؤُلَآءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا ج أَغْوَيْنَٰهُمْ كَمَا

اے ہمارے رب! یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا تھا۔ ہم نے ان کو اُسی طرح بہکایا تھا جس طرح

غَوَيْنَا ج تَبَرَّأْنَآ إِلَيْكَ ز مَا كَانُوٓا إِيَّانَا

ہم خود بہک گئے تھے۔ آج ہم تیرے پاس اپنی گمراہی سے برأت ظاہر کرتے ہیں وہ لوگ ہمارے عبادت گذار نہیں تھے وبلکہ

يَعْبُدُونَ ﴿۶۴﴾ وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَآءَكُمْ

اپنے خیالوں کے پیچھے چلتے تھے) اور (جب یہ سب کچھ ہوجائیگا تو پھر اُن سے کہا جائیگا کہ (اب تو تمہیں مہلت مل چکی ہے شاید اب تم کو اپنے

فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ

مزعومہ معبودوں کو بُلانے کی طاقت ہوگئی ہو اگر ٹھیک ہے تو اب) اپنے جھوٹے معبودوں کو بلا کر دیکھ لو۔ اس پر وہ (لوگ) پھر اُن (یعنی

جھوٹے معبودوں) کو (ان) پکاریں گے مگر وہ اُن کو کوئی جواب نہیں دیں گے۔

یعنی جنتی لوگ دوزخیوں سے کہیں گے کہ ہم سے ہمارے ربّ نے جو وعدہ کیا تھا اُس کو تو ہم نے سچّا پا لیا۔ کیا تم نے بھی اُس وعدہ کو جو تمہارے ربّ نے تمہارے ساتھ کیا تھا سچّا پا لیا ہے؟ اس پر دوزخی کہیں گے۔ ہاں ہاں! پس ایک پکارنے والا اُن کے درمیان زور سے پکارے گا کہ اِن ظالموں پر خدا کی لعنت ہو۔

پس چونکہ صرف وعدہ کا لفظ بعض دفعہ وعید کے لئے بھی استعمال ہوجاتا ہے اِس لئے اللہ تعالےٰ نے وَعَدْنٰهُ کے ساتھ وَعْدًا حَسَنًا کے الفاظ بھی بڑھا دیئے یہ بتانے کے لئے کہ اسجگہ وہ وعدہ مراد ہے جو مومنوں کی اُخروی ترقی اور اُن کے روحانی انعامات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْمُحْضَرِينَ میں بتایا کہ اچھی بات تو وہی ہے جس کا انجام اچھا ہو لیکن جس کو دنیا میں مال ومتاع مل گیا اور قیامت کے دن وہ جواب طلبی کے لئے بُلایا گیا تو وہ اُس شخص کے برابر کس طرح ہوسکتا ہے جس سے نیک سلوک کا وعدہ کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ بسا اوقات بڑے وسیع مطالب صرف صیغوں کے ذریعہ ہی ادا کر دیتا ہے اسجگہ بھی مُحْضَرِيْنَ میں مجہول کا صیغہ استعمال کرکے اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ خود تو حاضر ہونا نہیں چاہیں گے لیکن جس طرح مجرموں کو ہتھکڑی لگا کر عدالت میں

وَرَاَوُا الْعَذَابَ ج لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۵﴾

اور (سارے کے سارے ملکر) خدائی عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑا دیکھ لینگے۔ کاش کہ وہ (اسکو دیکھکر ہی) ہدایت پا جاتے (مگر افسوس کہ ایسا بھی

لایا جاتا ہے۔ اس طرح انہیں بھی کشاں کشاں لایا جائیگا۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ سنایا جائیگا۔

۱۳۵ تفسیر:۔ اس آیت میں اُن شرک کرنے والے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو دنیا میں بڑے سمجھے جاتے تھے۔ اور فرماتا ہے کہ اُس دن کو بھی یاد کر دجس دن اللہ تعالیٰ مشرکوں کو بلائیگا اور کہیگا اَیْنَ شُرَکَاءِیَ الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۔ وہ میرے شریک کہاں ہیں جن کے متعلق تم بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھے۔ یعنی وہ شریک تھے تو نہیں لیکن تم اُن کو شریک قرار دیتے تھے۔

قَالَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْھِمُ الْقَوْلُ اِس پر وہ مزعومہ شریک جن کے خلاف ہمارے عذاب کی خبر پوری ہو چکی ہوگی کہیں گے کہ اے ہمارے رب! یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔ لیکن شرارتاً گمراہ نہیں کیا بلکہ ہم خود بھی گمراہ ہو چکے تھے۔ آج ہم تیرے حضور اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی ہوا و ہوس کو انہوں نے اپنا معبود بنایا ہوا تھا اس مضمون سے ظاہر ہے کہ اسجگہ ایسے معبودوں کا ذکر ہے جو دنیا میں شرارتیں کرکے لوگوں کو بہکا دیتے تھے۔ نہ کہ کسی غیر مرئی وجود کا۔ اور شریک سے مراد واقعہ میں خدا قرار دینا نہیں کیونکہ جن کو لوگ واقعہ میں خدا قرار دیتے ہیں وہ نہ تو خود گمراہ ہیں اور نہ کسی کو گمراہ کرتے ہیں بلکہ اُن کو تو یہ بھی پتہ نہیں کہ لوگ اُن کے متعلق کیا کہہ رہے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ کے متعلق آتا ہے کہ جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُن سے پوچھے گا کہ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کیا تُونے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ تعالیٰ کے سوا معبود بنا لو۔ تو حضرت مسیح علیہ السلام جہاں اور جواب دیں گے وہاں ایک یہ جواب بھی دیں گے کہ وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ وَ اَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ (سورۃ مائدہ آیت ۱۱۸) یعنی جب تک مَیں اُن میں موجود رہا مَیں اُن کا نگران رہا۔ مگر جب تُو نے میری رُوح قبض کر لی۔ اور مجھے اپنی طرف بُلا لیا تو تُو ہی اُن کا نگران تھا۔ مَیں نہ تھا۔ اور تُو ہی ہر چیز کا حقیقی نگران ہے۔ اِس آیت سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ جنہیں عیسائی خدا قرار دیتے ہیں اُن کو تو پتہ بھی نہیں کہ لوگ اُن کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں۔ مگر آیت بتا رہی ہے کہ وہ شرکاء کہیں گے کہ خدایا ہم نے اِن لوگوں کو خود گمراہ کیا تھا اور اس وجہ سے کیا تھا کہ ہم خود بھی گمراہ ہو چکے تھے۔ پس یہاں اَئِمَّۃُ الْکُفر مراد ہیں جو لوگوں کو اپنی وجاہت اور اپنے اثر اور رسوخ کی وجہ سے اپنے پیچھے چلاتے تھے۔ وہ یہ عذر پیش کریں گے کہ خدایا ہم نے اِن کو وہی باتیں سکھا دیں جن کو ہم سچا سمجھتے تھے اور یہ لوگ ان کو اس لئے مانتے تھے کہ خود اِن کا اپنا دل چاہتا تھا ورنہ ہمارا اِن پر کیا زور تھا۔

اِس کے بعد پھر دوسری قسم کے معبودوں کے متعلق سوال شروع ہوگا جن کی لوگ واقعہ میں عبادت کیا کرتے تھے اور پرستش کرنے والوں سے کہا جائیگا کہ اُن شریکوں کو اب بلاؤ اور انہیں کہو کہ وہ تمہیں اس مصیبت سے بچائیں وہ انہیں پکاریں گے مگر اُنکے معبود اُنکو کوئی جواب نہیں دینگے

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور اُس دن (کو بھی یاد کرو جب) خدا انکو پکاریگا اور کہیگا تم نے رسولوں (کے وعظ) کا کیا جواب دیا تھا۔

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۷﴾

پس اس دن ساری دلیلیں انہیں بھول جائیں گی۔ اور وہ ایک دوسرے سے کوئی سوال نہ کرسکیں گے

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى

پس جوکوئی توبہ کریگا اور ایمان لائیگا اور مناسب حال عمل کریگا قریب ہوگا کہ

اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿۶۸﴾

وہ بامراد لوگوں میں شامل ہو جائے۔ ۵۳۲

اور خدائی عذاب کی علامتیں اُن کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہو جائیں گی۔

لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ کاش یہ لوگ ہدایت کا راستہ اختیار کرتے اور شرک کا ارتکاب کرکے عذاب الٰہی کا مورد نہ بنتے۔

۵۳۲ حل لغات۔ عَمِيَتْ: عَمِيَ سے مؤنث کا صیغہ ہے اور عَمِيَ کے معنے ہیں ذَهَبَ بَصَرُهٗ كُلُّهٗ مِنْ عَيْنَيْهِ كِلْتَيْهِمَا اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ اور عَمِيَ فُلَانٌ کے معنے ہیں ذَهَبَ بَصَرُ قَلْبِهٖ وَجَهِلَ۔ اس کے دل کی بصیرت جاتی رہی۔ اور وہ جاہل رہ گیا۔ عَمِيَ عَلَيْهِ الْاَمْرُ کے معنے ہیں اِلْتَبَسَ وَاشْتَبَهَ وَمِنْهُ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ۔ یعنی ساری چیزیں اُن پر مشتبہ ہو جائیں گی اور بھول جائیں گی اور عَمِيَتِ الْاَنْبَآءُ عَنْ فُلَانٍ کہیں تو معنے ہونگے خَفِيَتْ۔ فلاں شخص سے خبریں مخفی رہ گئیں۔ (اقرب)

تفسیر:- فرمایا۔ تم اس دوسرے وقت کو بھی یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ کفار کو اپنے سامنے حاضر کرے گا اور اُن سے پوچھیگا کہ جو رسول ہم نے تمہاری ہدایت کے لئے بھیجے تھے تم نے ان کو کیا جواب دیا تھا؛ اس پر بجائے اس کے کہ وہ کوئی بات کریں جہنم کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایسے پریشان ہونگے کہ تمام خیالات اُن کے دماغ سے نکل جائیں گے اور انہیں کچھ یاد نہیں رہیگا کہ ہم کیا کچھ کرتے تھے بلکہ وہ ایسے گھبرا جائیں گے کہ ایک دوسرے سے بھی کچھ پوچھ نہیں سکینگے۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ۔ ہاں جو لوگ توبہ کی توفیق پاگئے اور ایمان لے آئے اور اس کے مطابق انہوں نے عمل بھی کئے وہ یقیناً اُس دن کامیاب ہونگے۔ عَسٰى کا لفظ گو اُمید کے معنے دیتا ہے مگر جب خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ لفظ استعمال کیا جائے تو پھر اس کے معنے یقین اور قطعیت کے ہوتے ہیں (تفسیر قرطبی جلد ۱۳ صفحہ ۳۰۴) پس عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ کے یہ معنے ہیں کہ ایسے لوگ یقیناً کامیاب ہوں گے۔

عَمِيَتْ

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ۭ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے - اور جس کو چاہتا ہے چُن لیتا ہے - اُن کو اِس بارہ میں کوئی اختیار حاصل نہیں اللہ (تعالیٰ) پاک ہے اور ان کی مشرکانہ باتوں سے بلند ہے۔

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۰﴾

اور تیرا رب اُس کو بھی جانتا ہے جس کو وہ سینہ میں چھپاتے ہیں اور اُسے بھی جسے وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۳۳

اَلْخِيَرَةُ

تُكِنُّ

۳۳ حل لغات :- اَلْخِيَرَةُ : خَارَ کا مصدر ہے اور خَارَ الرَّجُلَ عَلٰى غَيْرِهٖ کے معنے ہیں فَضَّلَهٗ اُس کو غیر پر فضیلت دی - اور جب خَارَ الشَّيْءَ کہیں تو معنے ہونگے اِنْتَقَاهُ - اُس کو چُن لیا - اور خَارَ فُلَانًا فِي الْاَمْرِ وَبَيْنَ الْاَمْرَيْنِ کے معنے ہیں فَوَّضَ اِلَيْهِ الْخِيَارَ - دو کاموں میں اُس کو اختیار دیا - پس اَلْخِيَرَةُ کے معنے ہونگے فضیلت - اختیار یا چُننا -

تُكِنُّ : اَكَنَّ سے مضارع واحد مؤنث کا صیغہ ہے اور اَكَنَّ الشَّيْءَ کے معنے ہیں سَتَرَهٗ فِيْ كِنِّهٖ وَغَطَّاهُ وَاَخْفَاهُ - ایک چیز کو تھیلی میں چھپایا - اَلْكِنُّ وِقَاءُ كُلِّ شَيْءٍ وَسِتْرُهٗ اور كِنّ اُس تھیلی وغیرہ کو کہتے ہیں جس میں چیزوں کو محفوظ کیا جائے اور انہیں چھپا کر رکھا جائے - (اقرب) پس تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ کے معنے ہونگے - وہ باتیں جن کو وہ اپنے سینوں میں چھپاتے ہیں -

تفسیر :- اس آیت میں بتایا کہ تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے - یعنی دنیا میں جس تغیر کو چاہتا ہے جاری کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اُسے دنیا کی ہدایت کے لئے کھڑا کر دیتا ہے - لیکن اِن کفار کے مزعومہ شرکاء کو اِس تغیّر و تبدل پر کچھ اختیار حاصل نہیں - یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے نقائص اور کمزوریوں سے منزّہ ہے اور وہ اِن لوگوں کے مشرکانہ اعتقادات اور خیالات سے بہت بالا ہے -

رَبُّكَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کا بھی ردّ کر دیا ہے جو رُوح اور مادہ کو ازلی سمجھتے ہیں - اور خدا تعالیٰ کو خالق الاشیاء نہیں بلکہ محض رُوح اور مادہ کو جوڑ کر نئی نئی شکلیں قائم کرنے والا قرار دیتے ہیں - اِسی طرح رَبُّكَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اُن نیچریوں کا بھی ردّ کر دیا ہے جن کا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں پیدا کر کے پھر چھوڑ دیا ہے اور اب اُس کا اُن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا - گویا اُن کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی حیثیت نعوذ باللہ ایک معمار کی سی ہے کہ جس طرح معمار مکان بنا کر اُس سے الگ ہو جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اِس جہان کو تو پیدا کیا ہے مگر پھر اُس سے الگ ہو گیا ہے - اللہ تعالیٰ نے وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ کہہ کر اِن دونوں قوموں کا ردّ کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ وہ خالق بھی ہے اور پھر وہ انسان کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیتا بلکہ اُس کی ترقیات میں اُس کی پوری پوری نگہداشت رکھتا اور ہر قدم پر اُس کی خبرگیری کرتا ہے - چنانچہ جب دنیا ہدایت کی پیاسی ہوتی ہے تو ربوبیت کی صفت کے ماتحت ہی

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِی

اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ایسی ہے کہ اُسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ ابتدائے آفرینش میں بھی وہی تعریف کا مستحق تھا اور

الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ؗ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۷۱﴾

آخرت میں بھی وہی تعریف کا مستحق ہوگا۔ سب بادشاہت اُسی کے قبضہ میں ہے اور تم سب کو اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہوگا۔ ۳۴ف

وہ اُن کی طرف اپنا رسول مبعوث کرتا ہے جو دنیا میں پھر ایک نیا تغیّر پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ مشرک بھی تو بتائیں کہ اُن کے مزعومہ شرکاء دنیا میں کیا کر رہے ہیں اور کونسے تغیرات ہیں جو اُن کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اور اگر وہ کوئی ایک تغیر بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے جو اُنکے مزعومہ شرکاء کی وجہ سے ظہور میں آیا ہو تو اُن کا دوسروں کو شریک باری ٹھہرانا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

پھر فرمایا وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ یعنی تیرا رب اُن کے سینوں کی چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے اور اُن تدبیروں کو بھی جانتا ہے جنہیں وہ ظاہر کر رہے ہیں۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ نہ اُن کے منصوبے اُن کے کسی کام آ سکتے ہیں اور نہ اُنکی تدبیریں انہیں کامیابی کا مونہہ دکھا سکتی ہیں۔ زمین و آسمان کا خدا اب فیصلہ کر چکا ہے کہ وہ اپنی توحید کو دُنیا میں پھیلائے اور شرک کو مٹا دے۔ پس اب شرک کی تائید میں ظاہری او رمخفی تدابیر انہیں کامیاب نہیں کر سکتیں۔

۳۴ف تفسیر:۔ شرک کی تردید کرنیکے بعد اللہ تعالیٰ توحید حقیقی کا مقام دنیا کے سامنے واضح کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے کہ اُس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ ابتداء میں بھی وہی تعریف کا مستحق تھا اور آخرت میں بھی وہی تعریف کا مستحق ہوگا۔ تمام بادشاہت اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور پھر تم سب کو اُسی کی طرف لوٹ کر جانا پڑیگا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی

وحدانیت کا ثبوت یہ ہے کہ ابتدا اور انجام سب اُسی کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور جہاں جہاں اُسکا ہاتھ کام کرتا دکھائی دیتا ہے وہاں تعریف کے پہلو ہی نکلتے ہیں اور پھر سب چیزیں آخر میں فنا ہو جاتی ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی باقی رہتی ہے جو اس کی احدیت کا ثبوت ہے۔

لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ میں درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات رحمانیت اور رحیمیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ رحمانیت آغاز کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اور رحیمیت انجام کے ساتھ تعلق رکھتی ہے بنی نوع انسان کے تمام تعلقات خواہ وہ خدا تعالیٰ سے ہوں یا بنی نوع انسان سے اُن میں پہلا واسطہ رحمانیت سے ہی ہوتا ہے اور اس پر جتنا بھی غور کیا جائے اللہ تعالیٰ ہی کی حمد ثابت ہوتی ہے۔ ماں بچے کو پیٹ میں رکھ کر اور پھر دودھ پلا کر بچے کی محسن سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ پیٹ میں پرورش کے سامان کس نے پیدا کئے اور چھاتیوں میں دودھ کس نے بنایا تو اللہ تعالیٰ ہی حمد کا مستحق ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح باپ بچہ کی کفالت کرتا اور اس پر خرچ کرنے کی وجہ سے اُس کا محسن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جن قوتوں سے وہ کماتا ہے اور جن سامانوں سے وہ کام لیتا ہے انہیں وہ خود نہیں بناتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہی عطیہ ہوتے ہیں۔ پس اصل تعریف اللہ تعالیٰ کی ہی ہوتی ہے اور اُسی کی طرف لوٹ کر جاتی ہے۔

دُنیا حُسن کی تعریف کرتی ہے مگر کیا کوئی شخص اپنی شکل خود بناتا ہے؟ دنیا علم کی تعریف کرتی ہے مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ علم جن چیزوں سے پیدا ہوتا ہے وہ بھی خدا تعالےٰ نے بنائی ہیں اور جس حافظہ سے یاد رکھا جاتا ہے وہ بھی خدا تعالےٰ نے بنایا ہوتا ہے۔ دُنیا ذہین اور عقلمند لوگوں کی تعریف کرتی ہے مگر ذہن اور عقل دونوں کسب سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ یہ دونوں چیزیں خدا تعالےٰ کی طرف سے ملتی ہیں۔ پس حمد کا اصل مستحق وہی ہے جس نے وہ سامان پیدا کئے۔ کم عقل انسان خیال کرتا ہے کہ دنیا میں مخلوق کی تعریف ہو رہی ہے لیکن حقیقت شناس انسان جانتا ہے کہ یہ سب عقل کا دھوکا ہے اصل تعریف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوتی ہے۔ اور وہی اس کا مستحق ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ آخرت میں بھی وہی تعریف کا مستحق ہے یعنی وہ صرف رحمٰن ہی نہیں بلکہ رحیم بھی ہے اور رحیم کے معنے بار بار رحم کرنے والے کے ہیں۔ اور بار بار رحم کا سلسلہ تبھی جاری رہ سکتا ہے جبکہ انسان کو ابدی زندگی عطا ہو۔ اور ہر انسان خواہ وہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو آخر خدا تعالےٰ کی رحمت کی آغوش میں آجائے اور اُس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں مسیحیت دنیا کے سامنے یہ عقیدہ پیش کرتی ہے کہ دوزخ ابدی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحیمیت اِس عقیدہ کو ردّ کرتی ہے۔ کیونکہ بدیاں اگر اپنی جگہ پر کھڑی رہیں اور بار بار خدا تعالیٰ کا رحم نازل ہوتا رہے اور نیکیاں ترقی کرتی چلی جائیں تو یقیناً اِس کا یہ نتیجہ نکلیگا کہ ایک دن ہر جہنمی کی نیکیاں اُس کی بدیوں سے زیادہ ہو جائینگی اور جب نیکیاں بڑھ جائیں گی تو ایسے شخص کو جہنم میں نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ یقیناً جنّت میں داخل کیا جائیگا۔ اور اِس طرح آخر میں بھی اللہ تعالیٰ ہی تعریف کا مستحق ثابت ہوگا جس نے اپنی صفتِ رحیمیت کے ماتحت دوزخیوں کی نیکیوں کو بھی بڑھایا اور اُن پر اِس طرح متواتر اور بار بار رحم نازل کیا کہ آخر وہ بھی خدا تعالیٰ کے فضل کے مستحق ہوگئے

اِسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ يَأْتِیْ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ وَ نَسِيْمُ الصَّبَاءِ تُحَرِّكُ اَبْوَابَهَا۔ (تفسیر معالم التنزیل سورۃ ہود ع) یعنی جہنم پر ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ اس میں کوئی شخص بھی نہیں ہوگا اور نسیم صبا اس کے دروازوں کو کھٹکھٹائے گی۔ اِسی وجہ سے جنتیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سورۃ یونس آیت ۱۱) یعنی وہ آخر میں یہی کہینگے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب تعریفوں کا مستحق ہے جس نے ہماری نیکیوں کو اتنا بڑھایا کہ ایک ایک نیکی کا دس دس گُنا بدلہ دیا۔ اور جس نے دوزخیوں کی نیکیوں کو بھی اتنا بڑھایا کہ آخر وہ بھی جنت میں آگئے اور خدا تعالیٰ کی رضا انہیں حاصل ہوگئی۔

غرض لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح ہر کام کے ابتداء میں اللہ تعالیٰ ہی حمد کا مستحق ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہی انسان کیلئے سامان مہیّا کرتا ہے اور اگر اس کی طرف سے سامان مہیّا نہ ہوں تو کوئی انسان کام نہیں کر سکتا۔ اِسی طرح آخر میں بھی وہی حمد کا مستحق ثابت ہوتا ہے کیونکہ نتائج کا ظہور بھی اُسی کی طرف سے ہوتا ہے اور پھر اُس کی رحیمیت تھوڑی سی نیکیوں کو بطور بیج کے قبول کرکے بڑھاتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اُس کے نبیوں کا انکار کرنے والے اور جہنم میں اپنے اعمال کی سزا بھگتنے والے بھی اُس کی رحیمیت کے نتیجہ میں آخر دوزخ سے نکل آئیں گے اور خدا تعالیٰ انہیں اپنی مغفرت کی چادر میں لپیٹ لیگا۔ غرض اللہ تعالیٰ ہی اوّل ہے اور اللہ تعالیٰ ہی آخر ہے۔ اور ایک مومن اُس کے گرد اس طرح چکر کاٹ رہا ہوتا ہے جیسے حاجی حج کے ایام میں حجرِ اسود کے گرد طواف کرتے ہیں اور جہاں سے وہ چلتے ہیں وہیں آکر اپنا چکرّ ختم کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان خدا تعالےٰ کے اردگرد چکرّ لگا رہا ہے اور وہیں سے اُس کی

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا

تُو اُن سے کہہ۔ مجھے بتاؤ تو سہی اگر اللہ (تعالیٰ) تمہارے لئے قیامت کے دن تک رات کو

اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ

لمبا کر دے تو اللہ کے سوا اور کون ہے جو تمہارے پاس

بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۲﴾

روشنی لائے گا؟ کیا تم سُنتے نہیں۔ ۳۵

ابتداء ہوتی ہے اور وہیں آخر میں جاکر گرتا ہے جیسے نہریں دریا سے نکلتی ہیں اور پھر دریا میں ہی جا پڑتی ہیں یا جیسے رہٹ ایک طرف سے کنوئیں سے پانی نکالتا جاتا ہے اور دوسری طرف پھر کنوئیں میں ڈوبنا شروع ہو جاتا ہے یہی حال مومن کا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ سے نکلتا اور پھر خدا تعالیٰ کی طرف واپس چلا جاتا ہے اور ہر حالت میں اُس کی زبان پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور اُس کی تعریف ہی جاری ہوتی ہے۔

اِسی طرح لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ میں ایک یہ بھی خبر دی گئی ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی خدا تعالیٰ کی تعریف ہوگی اور آخری زمانہ میں بھی جبکہ یاجوج و ماجوج نکلیں گے اور اُن کو زیر کیا جائیگا خدا تعالیٰ کی تعریف ہوگی۔ اور اُس کی بادشاہت دنیا میں قائم کردی جائے گی۔

۳۵ حل لغات:۔ سَرْمَدًا: اَلسَّرْمَدُ کے معنے ہیں اَلدَّائِمُ۔ دائمی۔ اَلطَّوِيْلُ مِنَ اللَّيَالِيْ يُقَالُ لَيْلٌ سَرْمَدٌ۔ طویل یعنی لمبی رات۔ اَلسَّرْمَدِيُّ مَالَا اَوَّلَ لَهٗ وَلَا اٰخِرَ۔ سرمدی اس کو کہتے ہیں جس کی ابتداء اور انتہا نہ ہو۔ (اقرب)

تفسیر:۔ فرمایا۔ اے محمد رسول اللہ تُو اِن مشرکین سے کہہ دے کہ رات بے شک ایک فائدہ بخش چیز ہے لیکن اگر رات کو خدا تعالیٰ قیامت تک کیلئے لمبا کر دے تو خدا تعالیٰ کے سوا اور کون ہے جو تمہارے لئے سورج چڑھا سکتا ہے۔ تمہارے سارے معبود مل کر بھی رات کی تاریکی کو دن کی روشنی میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمایا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مباحثہ میں یہ کہا کہ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ (سورہ بقرہ آیت ۲۵۹) اللہ تعالیٰ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے تُو اِسے مغرب کی طرف سے لے آ۔ تو فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ وہ کافر جو آپ سے بحث کر رہا تھا مبہوت ہو کر رہ گیا اور اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ کیونکہ کوئی مشرک نہیں ہے جو یہ مانتا ہو کہ سورج کو اُس کا معبود چڑھاتا ہے۔ اگر وہ کہتا کہ تیرا خدا سورج کو مشرق سے نہیں چڑھاتا بلکہ میں چڑھاتا ہوں تو خود اُس کی قوم جو ستارہ پرست تھی اُس کی مخالف ہو جاتی اور کہتی کہ کیا تُو اپنے آپ کو سورج دیوتا سے بھی بڑا قرار دیتا ہے جو ایسا دعویٰ کر رہا ہے۔ پس اُس کیلئے سوائے خاموشی کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔

سَرْمَدًا

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا

تو کہدے مجھے بتاؤ تو سہی کہ اگر اللہ (تعالیٰ) دن کو قیامت کے دن تک تمہارے لئے

اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ

لمبا کردے تو اللہ (تعالیٰ) کے سوا کونسا معبود ہے جو تمہارے پاس رات کو لے آئے۔

تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ

جس میں تم سکون پاؤ۔ کیا تم دیکھتے نہیں ۳۶؎ اور یہ اُس کی رحمت ہے کہ اُس نے

لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا

تمہارے لئے رات اور دن بنائے ہیں کہ اُس (یعنی رات) میں تم سکون حاصل کرو اور اُس (یعنی دن) میں تم

مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

اُس کا فضل تلاش کرو تاکہ تم شکر گذار ہو۔ ۳۷؎

۳۶؎ تفسیر:۔ پھر فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ قیامت تک کے لئے دن کو لمبا کردے تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون ہے جو تمہارے لئے رات کا وقت لائیگا جس میں تم آرام حاصل کرسکو۔ یہ دلیل بھی مشرکین پر اتمام حجت کرنیوالی ہے۔ مشرک لوگ سورج کے ڈوبنے کو بھی کسی بُت یا کسی معبود باطلہ کی طرف منسوب نہیں کرتے۔

ان آیات میں رات کیلئے اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ اور دن کے لئے اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کے الفاظ اس حکمت کے ماتحت رکھے گئے ہیں کہ رات کو انسان زیادہ تر آنکھوں کی بجائے کانوں سے کام لیتا ہے اور دن کو کانوں کی بجائے آنکھوں سے کام لیتا ہے۔

۳۷؎ تفسیر:۔ اس آیت میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے رحم سے کام لیتے ہوئے تمہارے لئے رات اور دن بنائے ہیں تاکہ رات کو سو کر تم آرام اور سکون حاصل کرو اور دن میں دولت کما کر اللہ تعالیٰ کے فضل کو حاصل کرو۔ اور پھر یہ رات اور دن کا سلسلہ اس لئے بھی جاری کیا گیا کہ تم ہمیشہ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہو۔ رات کے آنے پر بھی تمہارے اندر جذبۂ شکر گذاری پیدا ہو اور دن کے آنے پر بھی تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے شکر سے تر ہو۔ پھر جس طرح مادی عالم میں اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کا سلسلہ جاری کیا ہوا ہے۔ اسی طرح روحانی عالم میں بھی ایک وقت انسان پر ایسا آتا ہے کہ جب اُس پر قبض کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب اُس پر بسط کی حالت ہوتی ہے اور یہ قبض اور بسط کا سلسلہ بھی رات اور دن کے سلسلہ کی طرح انسانی ترقی کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ اگر روحانی واردات میں بھی اتار چڑھاؤ کا سلسلہ جاری نہ ہو تو اُس کی ترقی رُک جائے اور

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ

اور جسدن وہ اُن کو پکارے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں وہ میرے مزعومہ شرکاء جن کو تم (معبود)

تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا

خیال کرتے تھے۔ اور (اُسوقت) ہم ہر ایک (مشرک) امت میں سے (ایسے) گواہ کھڑے کریںگے جنکو یہ لوگ معزز سمجھتے تھے)

فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ

پھر ہم (اُن سے) کہیں گے کہ اپنی (وہ) دلیلیں لاؤ (جن سے تم شرک کو جائز قرار دیتے تھے) تب وہ جان لیں گے کہ کامل حق اللہ تعالیٰ

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۷۶﴾ ع

ہی کے پاس ہے۔ اور اُن کا سب افتراء اُن سے کھویا جائیگا۔ ۳۸ ع ۱۰

وہ اپنے پہلے مقام کو بھی کھو بیٹھے۔ حدیثوں میں آتا ہے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابیؓ آئے اور کہنے لگے۔ یا رسول اللہ! میں تو منافق ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ تمہیں کس طرح پتہ لگا کہ تم منافق ہو۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ جب میں آپؐ کی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میرے ایک طرف جنّت ہے اور دوسری طرف دوزخ۔ لیکن جب میں آپؐ کی مجلس سے واپس چلا جاتا ہوں تو یہ کیفیت نہیں رہتی۔ آپؐ نے فرمایا۔ اگر تم پر ہر وقت ایک ہی حالت رہے تو تم زندہ ہی نہ رہو۔ غرض جس طرح رات کو اللہ تعالیٰ نے سکون کے لئے اور دن کو سامانِ معیشت کی فراہمی کے لئے بنایا ہے اور دانا انسان وہی ہوتا ہے جو رات سے بھی فائدہ اٹھائے اور دن سے بھی۔ رات کو سوکر اپنے اندر نئی طاقتیں پیدا کرے۔ اور دن کو کام کرکے پہلے سے بھی زیادہ ترقی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قبض اور بسط کا سلسلہ انسان کی روحانی ترقی کے لئے جاری کیا ہے تاکہ ہر حالتِ قبض کے بعد وہ پہلے سے بھی زیادہ آسمانِ روحانی کی طرف پرواز کرے اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکرگذاری کا زیادہ سے زیادہ مادہ اُس کے اندر پیدا ہو۔

۳۸ تفسیر:۔ فرمایا۔ تم اُس وقت کو بھی یاد کرو جب اللہ تعالیٰ مشرکین سے کہیگا کہ وہ میرے مزعومہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم معبود خیال کرتے تھے؟ اُس وقت ہم ہر قوم میں سے گواہ کھڑے کرینگے اور پھر ہم اُن سے کہینگے کہ لاؤ اپنی اپنی دلیلیں پیش کرو۔ تب مشرک جان لیں گے کہ حق بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے کہی تھی۔ اور سب افتراء اُنکو بھول جائیں گے۔

اس آیت میں نَزَعْنَا اور فَقُلْنَا دونوں جگہ "نا" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو جمع کا صیغہ ہے۔ یہ کلام الملوک کہلاتا ہے۔ یعنی بادشاہوں کا طریق کلام۔ بادشاہ اپنی طاقت کے اظہار کے لئے "ہم" کا لفظ استعمال کیا کرتے ہیں کیونکہ بادشاہوں کے احکام کے جاری کرنے میں اور لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔

نَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا میں شہید سے مراد ہر قوم کا نبی ہے۔ جیسے حضرت مسیح ناصریؑ قیامت کے دن

اللہ تعالیٰ کے حضور کہیں گے کہ کُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ
فِیْھِمْ (مائدہ ع۱۶) یعنی جب تک اُن میں رہا اُن کا شہید یعنی نگران
رہا۔ اِسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالےٰ
نے فرمایا ہے کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاھِدًا عَلَیْکُمْ
(مزمل ع۱) یعنی ہم نے تمہاری طرف ایک ایسا رسول بھیجا ہے جو تم پر نگران ہے
لُغت میں بھی شہید کے ایک معنے الشَّاھِدُ یعنی نگرانی کے کئے گئے ہیں پس اِس جگہ
شہید سے مراد قوم کا نبی ہے جسے مشرکوں کے خلاف بطور گواہ کے کھڑا کیا
جائیگا اور اِس کے نمونہ کو پیش کرکے مشرکوں کو شرمندہ کیا جائیگا
کہ دیکھو تم نے اپنے نبیوں کی تعلیم کے خلاف کیسا غلط راستہ
اختیار کرلیا۔ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے رات دن
شرک کے خلاف تعلیم دی۔ مگر تم نے اُن کی تعلیم کو بھُلا دیا
اور تم خدائے واحد کو چھوڑ کر بُتوں کے آستانہ پر جاگرے۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے دُنیا میں ہر چیز
کے لئے کوئی نہ کوئی نمونہ مقرر کیا ہوا ہے جب ہم اُس
نمونہ کی نقل کرلیتے ہیں تو ہم اپنے کام میں کامیاب سمجھے
جاتے ہیں ورنہ نہیں۔ مثلاً ہمارے ملک میں روزانہ لین دین
کے معاملات میں لڑائیاں ہوتی ہیں۔ ایک شخص دوسرے سے
کہتا ہے کہ یہ سو روپے لو اور اُس کے عوض مجھے گندم دیدو۔
جب گندم والا اُسے گندم بھجواتا ہے تو وہ کہتا ہے مَیں نے
تو ایسی گندم بھجوانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ مَیں نے تو اور قسم
کی گندم کا مطالبہ کیا تھا۔ یورپین قوموں نے اِنہی جھگڑوں کو
دیکھتے ہوئے ہر قسم کے نمونے اپنے پاس رکھے ہوئے ہوتے
ہیں اور اِنہی نمونوں کے مطابق وہ اجناس کی خرید و فروخت
کرتے ہیں۔ اچھی گندم۔ اچھی کپاس۔ اچھی جوار اور اچھے
چاولوں وغیرہ کے نمونے انہوں نے شیشے کے بڑے بڑے
مرتبانوں میں بند کرکے رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور اُن کے
اوپر لیبل لگا کر لکھ دیتے ہیں کہ گندم یا کپاس فلاں قسم
کی ہے یا یہ خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے اور جب وہ
اس قسم کی جنس کہیں سے خریدنا چاہتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں
یہ نمونہ موجود ہے ہمیں ایسی گندم یا کپاس چاہیئے۔ اور اگر
کوئی تاجر گندم یا کپاس بھجوائے تو ماہرین فن نمونہ کو سامنے
رکھ کر دیکھتے ہیں کہ آیا یہ گندم یا کپاس نمونہ کے مطابق ہے
یا نہیں اور اگر نہ ہو تو گورنمنٹ اُس مال کو ردّ کردیتی ہے
غرض یقینی طور پر کسی چیز کے اعلیٰ ہونے کا بھی فیصلہ کیا
جاسکتا ہے جب ہمارے پاس کوئی نمونہ موجود ہو۔ اور
اُسے دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ آیا مطلوبہ جنس نمونہ
کے مطابق ہے یا نہیں۔

جس طرح دنیا کی اور چیزوں کے متعلق نمونہ کی ضرورت تسلیم
کی گئی ہے اِسی طرح اخلاقی اور روحانی امور میں بھی کسی نمونہ کی
ضرورت ہوتی ہے اور یہ نمونہ ہمیشہ ہی انبیاء کی صورت میں اللہ
تعالیٰ کی طرف سے بھیجا جاتا ہے۔ جو شخص اس نمونہ کے مطابق
اپنے آپ کو بنالیتا ہے اُسے قبول کرلیا جاتا ہے۔ اور جو اس نمونہ
کے مطابق نہ ہو اُسے ردّ کردیا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی زمانہ میں
اُس نے آدمؑ کو بھیجکر یہ اعلان کرا دیا کہ جو شخص آدمؑ کے نمونہ
کے مطابق ہوگا اُسے قبول کرلیا جائیگا اور جو آدمؑ کے مطابق
نہیں ہوگا اُسے قبول نہیں کیا جائیگا۔ اور کسی زمانہ میں اُس
نے نوحؑ کو لوگوں کے لئے نمونہ بناکر بھیجدیا۔ اِسی طرح کسی
زمانہ میں اُس نے ابراہیمؑ کو نمونہ بناکر بھیجدیا۔ کسی زمانہ میں
اُس نے کرشنؑ کو اور رامچندرجی کو نمونہ بناکر بھیجدیا۔ کسی
زمانہ میں زردشتؑ کو نمونہ بناکر بھیجدیا۔ کسی زمانہ میں ایوبؑ
کو نمونہ بناکر بھیجدیا۔ کسی زمانہ میں داؤدؑ اور سلیمانؑ کو نمونہ
بناکر بھیجدیا۔ کسی زمانہ میں مسیح ناصریؑ کو نمونہ بناکر بھیجدیا
اور جب آخری زمانہ آیا تو اُس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث فرماکر اعلان فرما دیا کہ اب قیامت
تک صرف یہی ہمارا نمونہ ہے۔ اگر تم اپنی زندگیاں محمدؐ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ کے مطابق بناؤ گے تو
میں تمہیں قبول کرلونگا ورنہ نہیں۔ اسی امر کی طرف اللہ تعالیٰ
نے زیر تفسیر آیت میں اشارہ فرمایا ہے کہ قیامت کے دن

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ

قارون (دراصل) موسیٰ کی قوم میں سے تھا۔ مگر وہ اُنہی کے خلاف ظلم پر آمادہ ہوگیا

وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ

اور ہم نے اُس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ جن کی کنجیاں ایک مضبوط جماعت

بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ

کے لئے بھی اُٹھانا مشکل تھیں۔ (یاد کر) جب اُس کی قوم نے اُسے کہا کہ (اتنا) فخر مت کر۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ﴿٧٧﴾

اللہ (تعالیٰ) فخر کرنے والوں کو یقیناً پسند نہیں کرتا۔ ۳۹

ہم ہر امت کے سامنے اُن کے نبی کو جسے نمونہ کے طور پر بھیجا گیا تھا پیش کرینگے اور کہیں گے کہ ہم نے یہ نمونہ تمہاری طرف بھیجا تھا۔ اب تم جو کہتے ہو کہ ہمیں جنّت میں داخل کیا جائے تو تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے آپ کو کہاں تک اس نمونہ کے مطابق بنایا۔

ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ میں بتایا کہ وہ لوگ جو دُنیا میں بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھے قیامت کے دن اُن کے سب دعاوی غائب ہو جائیں گے یعنی وہ تمام افتراء جو ذاتِ باری کے متعلق کیا کرتے تھے اُس روز اُن کے ذہن سے ایسے نکل جائیں گے کہ انہیں یاد ہی نہیں رہے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اُن کے وہ تمام اعمال جن کی افتراء پر بنیاد رکھی رائیگاں چلے جائیں گے اور اُن عبادتوں اور ریاضتوں کا جو وہ اپنے بتوں اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے کرتے تھے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

۳۹ حل لغات: اَلْكُنُوزُ: كَنْزٌ کی جمع ہے اور اَلْكَنْزُ کے معنے ہیں اَلْمَالُ الْمَدْفُونُ فِي الْأَرْضِ۔ زمین میں دفن کیا ہوا مال۔ وَقِيلَ اِسْمٌ لِلْمَالِ إِذَا أُحْرِزَ فِي وِعَاءٍ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کَنْزٌ اُس مال کا نام ہے جسے کسی حفاظت کے سامان میں محفوظ کر لیا جائے۔ اَلذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ۔ سونا اور چاندی۔ مَا يُحْرَزُ فِيهِ الْمَالُ كَالْمَخْزَنِ وَالصُّنْدُوقِ۔ وہ چیز جس میں مال سنبھال کر رکھا جائے جیسے خزانہ اور صندوق۔ (اقرب)

مَفَاتِح: مَفَاتِحُ مِفْتَحٌ و مِفْتَاحٌ کی جمع بھی ہو سکتی ہے اور مَفْتَحٌ کی بھی۔ مِفْتَحٌ اور مِفْتَاحٌ کے معنے ہیں چابی۔ اور مَفْتَح کے معنے ہیں اَلْخِزَانَةُ۔ خزانہ۔ اَلْكَنْزُ۔ محفوظ کیا ہوا مال۔ اَلْمَخْزَنُ۔ خزانہ گاہ (اقرب)

تَنُوْء: تَنُوْءُ: نَاءَ سے مضارع مؤنث کا صیغہ ہے اور نَاءَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں نَهَضَ بِجَهْدٍ وَمَشَقَّةٍ۔ کوئی شخص محنت و مشقت سے اُٹھا۔ اور نَاءَ بِالْحِمْلِ کے معنے ہیں نَهَضَ بِهِ مُثْقَلًا۔ بھاری بوجھ کو مشکل سے لیکر اُٹھا۔ اور جب نَاءَ بِهِ الْحِمْلُ کہیں تو معنے ہونگے أَثْقَلَهُ وَأَمَالَهُ۔ اُسے بوجھل بنا دیا اور

جھکا دیا۔ (اقرب) پس تَنُوْٓاُ کے معنے ہونگے جنہیں مشکل سے اُٹھایا جاتا تھا۔

اَلْعُصْبَةُ

اَلْعُصْبَةُ: (دیکھئے تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۳۶۸)

تفسیر: — قارون کا نام بائیبل میں قورح آتا ہے اور اُس کا ذکر گنتی باب ۱۶ میں اِس طرح کیا گیا ہے کہ

"وہ اور بنی اسرائیل میں سے اڑھائی سو اور اشخاص جو جماعت کے سردار اور چیدہ اور مشہور آدمی تھے موسیٰ کے مقابلہ میں اُٹھے اور وہ موسیٰ اور ہارون کے خلاف اکٹھے ہو کر اُن سے کہنے لگے تمہارے تو بڑے دعوے ہو چلے۔ کیونکہ جماعت کا ایک ایک آدمی مقدس ہے اور خداوند اُن کے بیچ رہتا ہے۔ سو تم اپنے آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا کیونکر ٹھہراتے ہو۔ موسیٰ یہ سنکر منہ کے بل گرا۔ پھر اُس نے قورح اور اُس کے کل فریق سے کہا کہ کل صبح خداوند دکھا دیگا کہ کون اُسکا ہے اور مقدس ہے۔ اور وہ اُس کو اپنے نزدیک آنے دیگا کیونکہ جسے وہ خود چُنینگا اُسے وہ اپنی قربت بھی دیگا۔ سوائے قورح اور اُسکے فریق کے لوگو! تم یوں کرو کہ اپنا اپنا بخوردان لو اور اُس میں آگ بھرو۔ اور خداوند کے حضور کل اُن میں بخور جلاؤ۔ تب جس شخص کو خداوند چُن لے وہی مقدس ٹھہریگا۔ اے لاوی کے بیٹو! بڑے بڑے دعوے تو تمہارے ہیں۔ پھر موسیٰ نے قورح کی طرف مخاطب ہو کر کہا اے بنی لاوی سُنو۔ کیا یہ تم کو چھوٹی بات دکھائی دیتی ہے کہ اسرائیل کے خدا نے تم کو بنی اسرائیل کی جماعت میں سے چن کر الگ کیا تاکہ تم کو وہ اپنی قربت بخشے اور تم خداوند کے مسکن کی خدمت کرو۔ اور جماعت کے آگے کھڑے ہو کر اُسکی بھی خدمت بجا لاؤ اور تجھے اور تیرے سب بھائیوں کو جو بنی لاوی ہیں اپنے نزدیک آنے دیا سو کیا اب تم کہانت کو بھی چاہتے ہو۔ اِس لئے تُو اور تیرے فریق کے لوگ یہ سب کے سب خداوند کے خلاف اکٹھے ہوئے ہیں اور ہارون کون ہے جو اُس کی تم شکایت کرتے ہو۔ پھر موسیٰ نے داتن اور ابیرام کو جو الیاب کے بیٹے تھے بلوا بھیجا۔ انہوں نے کہا۔ ہم نہیں آتے کیا یہ چھوٹی بات ہے کہ تو ہم کو ایک ایسے ملک سے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے نکال لایا ہے کہ ہم کو بیابان میں ہلاک کرے۔ اور اِس پر بھی یہ طرّہ ہے کہ اب تو سردار بن کر ہم پر حکومت جتاتا ہے۔ ماسوا اِس کے تُو نے ہم کو اُس ملک میں بھی نہیں پہنچایا جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے۔ اور نہ ہم کو کھیتوں اور تاکستانوں کا وارث بنایا۔ کیا تو اِن لوگوں کی آنکھیں نکال ڈالے گا۔ ہم تو نہیں آنے کے۔ تب موسیٰ نہایت طیش میں آکر خداوند سے کہنے لگا۔ تُو اِن کے ہدیہ کی طرف توجہ مت کر۔ میں نے اِن سے ایک گدھا بھی نہیں لیا۔ نہ اِن میں سے کسی کو نقصان پہنچایا ہے۔ پھر موسیٰ نے قورح سے کہا۔ کل تُو اپنے سارے فریق کے لوگوں کو لے کر خداوند کے آگے حاضر ہو۔ تُو بھی ہو اور وہ بھی ہوں۔ اور ہارون بھی ہو۔ تم میں سے ہر شخص اپنے بخوردان کو جو شمار میں اڑھائی سو ہونگے خداوند کے حضور لاؤ۔ اور تُو بھی اپنے بخوردان لانا اور ہارون بھی لائے۔ سو انہوں نے اپنا اپنا بخوردان لے کر اور اُن میں آگ رکھ کر اُسپر بخور ڈالا۔

اور خیمۂ اجتماع کے دروازہ پر موسیٰ اور ہارون کے ساتھ آکھڑے ہوئے۔ اور قورح نے ساری جماعت کو اُن کے خلاف خیمۂ اجتماع کے دروازہ پر جمع کر لیا تھا۔ تب خداوند کا جلال ساری جماعت کے سامنے نمایاں ہُوا۔

اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا۔ کہ تم اپنے آپ کو اس جماعت سے بالکل الگ کر لو۔ تاکہ مَیں انکو ایک پل میں بھسم کر دوں۔ تب وہ مُنہ کے بل گر کر کہنے لگے۔ اے خدا! سب بشر کی رُوحوں کے خدا! کیا ایک آدمی کے گناہ کے سبب سے تیرا قہر ساری جماعت پر ہو گا۔ تب خداوند نے موسیٰ سے کہا۔ تو جماعت سے کہہ کہ تم قورح اور داتن اور ابیرام کے خیموں کے آس پاس سے دُور ہٹ جاؤ۔ اور موسیٰ اُٹھ کر داتن اور ابیرام کی طرف گیا اور بنی اسرائیل کے بزرگ اُس کے پیچھے پیچھے گئے۔ اور اُس نے جماعت سے کہا۔ اِن شریر آدمیوں کے خیموں سے نکل جاؤ۔ اور اِن کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤ تا ایسا نہ ہو تم بھی اِن کے گناہوں کے سبب سے نیست ہو جاؤ۔ سو وہ لوگ قورح اور داتن اور ابیرام کے خیموں کے آس پاس سے دُور ہٹ گئے اور داتن اور ابیرام اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور بال بچوں سمیت نکل کر اپنے خیموں کے دروازوں پر کھڑے ہوئے۔ تب موسیٰ نے کہا۔ اس سے تم جان لو گے کہ خداوند نے مجھے بھیجا ہے کہ یہ سب کام کروں۔ کیونکہ مَیں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔ اگر یہ آدمی ویسی ہی موت سے مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے۔ یا ان پر ویسے ہی حادثے گذریں جو سب پر گذرتے ہیں تو مَیں خداوند کا بھیجا ہُوا نہیں ہوں۔ پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھائے اور زمین اپنا مُنہ کھول دے اور ان کو اور ان کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ اِن لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے۔ اُس نے یہ باتیں ختم ہی کی تھیں کہ زمین اُن کے پاؤں تلے پھٹ گئی اور زمین نے اپنا مُنہ کھول دیا۔ اور اُن کو اور اُن کے گھر بار کو اور قورح کے ہاں کے سب آدمیوں کو اور اُن کے سارے مال و اسباب کو نگل گئی۔ سو وہ اور اُن کا سارا گھر بار جیتے جی پاتال میں سما گئے اور زمین اُن کے اوپر برابر ہو گئی اور وہ جماعت میں سے نابود ہو گئے اور سب اسرائیل جو اُن کے آس پاس تھے اُن کا چلّانا سُنکر یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ کہیں زمین ہم کو بھی نگل نہ لے۔ اور خداوند کے حضور سے آگ نکلی اور اُن اڑھائی سو آدمیوں کو جنہوں نے بخور گذرانا تھا بھسم کر ڈالا۔"

(گنتی باب ۱۶ آیت ۲ تا ۳۵)

بائبل کے ان بیان کردہ واقعات سے ظاہر ہے کہ فرعونِ مصر کی تباہی کے بعد دشتِ سینا میں قارون اور اُس کے بعض ساتھیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ایک بہت بڑا فتنہ کھڑا کیا۔ اور انہوں نے آپ پر قسم قسم کے اعتراضات کرنے شروع کر دیئے۔ اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ موسیٰؑ کا کیا حق ہے کہ وہ اپنے آپکو ہم سے بڑا سمجھے اور ہم پر اپنی حکومت جتلائے۔ اس جماعت کا ایک ایک فرد مقدس ہے اور پھر انہوں نے یہ بھی پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ موسیٰ ہمیں ایک ایسے ملک سے نکال [illegible] دودھ اور شہد کی نہریں

وَابْتَغِ فِيمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ

اور جو کچھ تجھے اللہ (تعالیٰ) نے دیا ہے اُس سے اُخروی زندگی کے گھر کی تلاش کر - اور

بہتی تھیں لیکن پھر اُس نے ہمیں ایک جنگل میں لاکر ڈال دیا اور کنعان کی حکومت دلانے کا وعدہ بھی اس نے پورا نہیں کیا بائیبل بتاتی ہے کہ قارون کے ساتھ اس فتنہ انگیزی میں اڑھائی سو آدمی ملوّث ہو گئے تھے۔ آخر موسیٰؑ نے دونوں گروہوں کو الگ الگ کھڑا کر دیا - اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی جس کے نتیجہ میں زمین پھٹی اور قارون اور اس کے ساتھیوں کو نگل گئی - اگر بائیبل کا یہ بیان درست ہو تو اس کے معنے یہ ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون کے ساتھ مباہلہ کیا تھا - جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک ہو گیا لیکن قرآن کریم نے قارون اور فرعون اور ہامان کا اکٹھا ذکر کیا ہے (سورۂ عنکبوت آیت ۴۰) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت کے بعد کا نہیں بلکہ اس سے پہلے کا ہے - اور قارون جو اسرائیل قوم کا ہی ایک فرد تھا فرعون کا افسرِ خزانہ تھا اور بہت مالدار شخص تھا لیکن دولت کے نشہ میں اُس نے اپنی قوم پر ہی سختی شروع کر دی اور یہ خیال کر لیا کہ میں اپنی قوم پر جتنا بھی ظلم کرونگا فرعون مجھ پر اتنا ہی خوش ہو گا اور اتنا ہی میرا اعزاز بڑھائے گا -

ہم نے اُس کے افسرِ خزانہ ہونے کا استنباط اس سے کیا ہے کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ قارون اپنی قوم پر ہی ظلم کرنے لگ گیا تھا - ورنہ محض مالدار ہونا کوئی ایسی وجہ نہیں جس کی بنا پر کوئی شخص اپنی قوم پر ظلم کرنے لگ جائے ہاں سرکاری عہدیدار ہونے کی وجہ سے بیشک کوئی شخص ظلم کر سکتا ہے - پھر قرآن کریم کا اٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ کہنا بھی بتاتا ہے کہ یہ اُس کے ذاتی خزانے نہیں تھے بلکہ سرکاری خزانے تھے جو اُس کی تحویل میں رہتے تھے -

وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ میں بتایا کہ ہم نے اُسکو اتنے خزانے دیئے تھے کہ اُس کی کنجیاں اُٹھانا ایک مضبوط جماعت پر بھی دوبھر ہوتا تھا - اصل بات یہ ہے کہ پرانے زمانہ میں لکڑی کے تالے ہوا کرتے تھے بلکہ آج سے چالیس سال پہلے تک مکّہ مکرمہ میں بھی لکڑی کے تالے ہی استعمال ہوتے تھے - اگر لوہے کے تالے بھی ہوں تو چونکہ اُس وقت تک صنعتِ قفل سازی ابھی ابتدائی مراحل میں تھی - بڑے بڑے موٹے تالے اور بڑی بڑی موٹی کنجیاں بنائی جاتی تھیں - اور بادشاہ جب سفر کرتا تھا تو خزانے کے بہت سے صندوق ساتھ رکھتا تھا - تاکہ مزدوروں کو تنخواہیں دی جاسکیں اور فوج کے لئے رسد خریدی جاسکے پس اُن سینکڑوں ہزاروں صندوقوں کے ہزارہا تالوں کی موٹی موٹی کنجیوں کو اٹھانا جن کا مجموعی طور پر کئی من وزن ہو جاتا تھا ایک مضبوط جماعت کیلئے بھی مشکل ہوتا تھا - خصوصاً جب کہ انہوں نے لگاتار لمبا سفر کرنا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کنجیوں کو صندوقوں میں بند کر کے اونٹوں پر لادا جاتا ہو - کیونکہ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ [illegible] اُن کنجیوں کو [illegible] اُٹھاتے تھے بلکہ یہ کہا کہ اگر آدمی اُٹھانے کو [illegible] ایک مضبوط جماعت کے لئے بھی اُن کا اٹھانا بارگراں بن جاتا - یعنی دس بارہ مضبوط آدمی بھی بمشکل اُن کو اُٹھا سکتے -

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ - جب یہ شخص فرعون کا افسرِ خزانہ ہونے کی وجہ سے خود بھی مالدار ہو کر متکبّر ہو گیا اور بنی اسرائیل پر ہی جو اُسکی اپنی قوم تھی محض فرعون کی خوشنودی کیلئے ظلم کرنے لگ گیا

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ

دنیوی زندگی سے تجھے جو حصہ ملا ہے اُسے بھی بھول نہیں اور (ہم تجھے ایک حد تک دنیا کی آسائشوں کے

اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي

استعمال سے نہیں روکتے) اور جس طرح اللہ (تعالیٰ) نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی لوگوں پر احسان کر۔ اور ملک میں فساد پھیلانے کی

الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۸﴾

کوشش نہ کر۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۵۴۰

تو اُس کی قوم نے اُسے کہا کہ تکبّر نہ کر۔ اللہ تعالیٰ تکبّر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

۵۴۰ تفسیر:- اُس کی قوم نے اُسے یہ بھی کہا۔ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھے دولت بخشی ہے اُس سے اپنے اُخروی گھر کو زیادہ سے زیادہ اچھا بنانے کی کوشش کر۔ ہاں دنیا میں سے بھی اپنا حصہ نہ چھوڑ کیونکہ سچا مذہب میانہ روی کو پسند کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ انسان دنیا کو بالکل ہی چھوڑ دے۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ انسان دنیا بھی کمائے اور دینی کاموں میں بھی حصّہ لے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ایک صوفی کا یہ قول بہت پسند ہے کہ

"دست درکار و دل با یار"

یعنی اصل طریق یہی ہے کہ انسان دنیا کے کام بھی کرے اور خدا تعالیٰ کو بھی یاد رکھے۔ لیکن پرانے لوگوں میں سے بعض نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ دست درکار نہیں ہونا چاہیئے جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی زندگی کو ضائع کر دیا اور بعض نے یہ سمجھ لیا کہ دل با یار نہیں ہونا چاہیئے صرف دست درکار ہونا کافی ہے۔ گویا دنیا میں دو کیمپ بن گئے۔ ایک کیمپ والے دین کو بیکار سمجھنے لگ گئے اور دوسرے کیمپ والے دنیا کو بے کار سمجھنے لگ گئے حالانکہ صداقت ان دونوں کے درمیان تھی۔ صداقت یہ تھی کہ دین کے ساتھ دنیا کی طرف بھی توجہ رکھی جائے اور دنیا سے بالکل ہی مُنہ نہ موڑ لیا جائے۔ لیکن ہُوا یہ کہ ایک فریق تو خالص دنیا ساتھ لے گیا۔ اور ایک فریق نے خالص دین لے لیا اور انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ اگر خالص دین کی طرف ہی توجہ رکھنی ضروری ہوتی تو خدا تعالیٰ یہ کیوں فرماتا کہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (سورۃ آل عمران آیت ۹۸) کہ جو لوگ استطاعت رکھیں اُن پر حجِ بیت اللہ کرنا فرض ہے۔ پھر زکوٰۃ کے متعلق اسلام یہ کیوں ہدایت دیتا کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ آیت ۱۰۳) یعنی اے رسول! اِن کے مالوں میں سے صدقہ لے تاکہ تو انہیں پاک کرے اور ان کی ترقی کے سامان مہیّا کرے۔ پھر اگر خدا تعالیٰ یہ چاہتا کہ صرف دین ہی اختیار کیا جائے اور دنیا سے مونہہ موڑ لیا جائے تو وہ یہ کیوں فرماتا کہ اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اُن میں سے ایک کو ڈھیروں ڈھیر سونا بھی دے چکے ہو تو اُس سے واپس مت لو (نساء آیت ۲۱) اگر

مال اپنے پاس رکھنا ہی نہیں تو حج کس طرح کیا جا سکتا ہے زکوٰۃ کس طرح دی جا سکتی ہے اور اپنی بیوی کو ڈھیر ڈھیر سونا کس طرح دیا جا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں خدا تعالیٰ نے لوگوں کے لئے نمونہ کے طور پر پیدا کیا ہوتا ہے۔ مَیں نے خود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سُنا ہے۔ کہ کسی نے ایک بزرگ سے سوال کیا کہ کتنے روپوں پر زکوٰۃ فرض ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے لئے یہ مسئلہ ہے کہ تم چالیس روپے میں سے ایک روپیہ زکوٰۃ دو۔ اُس نے کہا۔ "تمہارے لئے" کا کیا مطلب ہے۔ کیا زکوٰۃ کا مسئلہ بدلتا رہتا ہے؟ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ تمہارے پاس چالیس روپے ہوں تو اُن میں سے ایک روپیہ زکوٰۃ دینا تمہارے لئے ضروری ہے۔ لیکن اگر میرے پاس چالیس روپے ہوں تو مجھ پر اکتالیس روپے دینے لازمی ہیں کیونکہ تمہارا مقام ایسا ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم کماؤ اور کھاؤ۔ لیکن مجھے وہ مقام دیا ہے کہ میرے اخراجات کا وہ آپ کفیل ہے اگر بیوقوفی سے میں چالیس روپے جمع کر لوں تو مَیں وہ چالیس روپے بھی دونگا اور ایک روپیہ جرمانہ بھی دونگا۔

غرض بعض لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ صرف دین کی طرف اپنی توجہ رکھیں۔ لیکن باقی دنیا کا صرف یہی مقام ہے کہ وہ دنیا کمائیں اور اپنے مال اور وقت کا کچھ حصّہ مناسب نسبت کے ساتھ عبادت اور دین کے کاموں میں بھی لگائیں۔ وہ ذکر الٰہی کریں۔ وظائف کریں۔ تہجد پڑھیں اور استغفار اور دُعاؤں سے کام لیں۔ قارون کو بھی اُس کی قوم کے نیک افراد نے بھی یہی نصیحت کی کہ ہم تمہیں یہ نہیں کہتے کہ تم اپنی تمام دولت خدا تعالیٰ کے لئے خرچ کر دو بلکہ ہماری نصیحت یہ ہے کہ تمہارا اصل مقصد تو دارِ آخرت ہونا چاہیئے۔ اور اسی کے لئے تمہیں اپنے اموال خرچ کرنے چاہئیں۔ لیکن اُس کے ساتھ ساتھ اپنی اور اپنے خاندان کی ترقی کے لئے بھی بیشک کوشش کرو۔ اور اپنے اموال کا ایک حصہ اس کے لئے مخصوص کر لو۔ یہ ناجائز امر نہیں۔ ناجائز امر یہ ہے کہ تم خدا کو بھول جاؤ۔ اور صرف دنیا کو ہی اپنا مطلوب قرار دے دو۔

پھر انہوں نے کہا۔ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ تو لوگوں سے نیک سلوک کر۔ اور ان کو اپنے مال اور اپنے علم اور اپنے رسوخ میں شریک کر۔ کیونکہ تجھ پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا ہے یعنی جن قوتوں اور طاقتوں سے تو نے کمایا ہے اور جن چیزوں کے ذریعہ سے تُو نے عزت اور شہرت حاصل کی ہے وہ سب کی سب اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔ اور تجھے بطور احسان ملی ہیں۔ پس جس طرح تجھ پر احسان کیا گیا ہے۔ تیرا بھی فرض ہے کہ تُو لوگوں سے احسان کے ساتھ پیش آ۔ اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش نہ کر۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ اللہ تعالیٰ شریر اور مفسد لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ آخر یہ سیدھی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا خالق اور اس کا ربّ ہے۔ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں فساد برپا کرنے کی کوشش کریگا تو اُس مخلوق کا خالق اور ربّ فساد کرنے والے سے کس طرح محبّت کرے گا؟ اگر کسی بچہ سے انسان کو نفرت ہو تو اُس کی ماں کبھی نفرت کرنے والے سے پیار نہیں کر سکتی۔ جب تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ جو شخص فساد ڈلواتا ہے اور لوگوں کی آپس میں لڑائیاں کرواتا رہتا ہے خدا تعالیٰ اُسے کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ انگریزی میں ایک حکایت مشہور ہے کہ کسی شخص کو ایک عورت سے عشق ہو گیا۔ وہ عورت بیوہ تھی اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر یورپین طریق کے مطابق خالی پیغام سے شادی نہیں

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ

اُس (یعنی قارون) نے کہا - یہ سب رُتبہ مجھے ایک ایسے علم کی وجہ سے ملا ہے جو صرف مجھے حاصل ہے - کیا وہ جانتا نہیں تھا کہ

قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ

اِس سے پہلے اللہ (تعالیٰ) نے بہت سی نسلوں کو جو اُس سے زیادہ طاقت ور اور اُس سے زیادہ مالدار تھیں ہلاک کر

اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۷۹

دیا تھا اور مجرموں کو (جب عذاب دیا جاتا ہے تو) اُنکے گناہوں کے متعلق اُن سے پُوچھ گچھ نہیں کی جاتی - ؁۴۱

ہوسکتی تھی - ضروری تھا کہ پہلے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا جائے۔ کیونکہ یورپ کے لوگوں میں مرد عورت کی دوستی کے بعد شادی ہوتی ہے پہلے نہیں - وہ اُسے اپنی طرف راغب کرنیکی بڑی کوشش کرتا مگر اُسے کامیابی حاصل نہ ہوتی - آخر اُس نے اپنے کسی دوست سے ذکر کیا کہ مجھے اِس اِس طرح فلاں عورت سے محبت ہے اور مَیں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر وہ میری طرف توجہ ہی نہیں کرتی - اُس نے کہا - عورت کا کوئی بچہ ہے یا نہیں - اُس نے کہا بچّہ تو ہے - اُس نے کہا تو پھر محبت میں کونسی مشکل ہے - بچّہ کو اُٹھا کر اُس سے چند دن پیار کرو - عورت تم سے خود بخود بے تکلّف ہو جائیگی - تو جس سے کسی کو محبّت ہو اُس سے نفرت رکھنے سے کبھی اُس شخص کی محبّت حاصل نہیں کی جاسکتی - اِسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ

"غلامِ نثارِ کوچۂ آلِ محمّد است"

اب آلِ محمدؐ میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی - مگر اِس وجہ سے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے حصول کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ انسان اُن سے محبّت کرے - یہ خیال کرنا کہ آلِ محمدؐ سے بے شک محبّت نہ ہو لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبّت مجھے حاصل ہو جائیگی غلط ہے -

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اِس امر کی طرف توجّہ دلائی ہے کہ اگر تم فساد کروگے تو تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تم سے محبت نہیں کریگا - کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے پیارے ہیں - جو اُن سے محبت نہ کرے اور اُن کا بدخواہ ہو اللہ تعالےٰ اُس سے کبھی محبت نہیں کرسکتا -

؁۴۱ **تفسیر**:- قارون کو جب اُس کی قوم نے یہ نصیحت کی تو اُس احمق نے تکبّر میں آکر کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ مال مجھے یونہی مِل گیا ہے - یہ مال مجھے ذاتی علم اور ذہانت اور محنت کی وجہ سے مِلا ہے - اُس نادان نے یہ نہ سوچا کہ جس دماغ سے وہ کام لے رہا ہے وہ اُس کا پیدا کردہ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے - جن ذرائع اور اسباب سے اُس نے دولت حاصل کی ہے وہ ذرائع اور اسباب بھی اللہ تعالےٰ نے ہی پیدا کئے ہیں - اُس نے خود پیدا نہیں کئے - وہ خدا تعالیٰ کو بھول گیا اور اُس نے اپنی تمام ترقی کو اپنی طرف منسوب کرلیا - یہ ایسی ہی بات ہے جیسے انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ گندھک خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے - وہ بھول جاتا ہے کہ سنکھیا خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے -

وہ بھول جاتا ہے کہ پارہ خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ مَیں نے آتشک کا ٹیکہ ایجاد کیا ہے۔ حالانکہ یہ ٹیکے بعض چیزوں کے مرکب ہیں اور وہ چیزیں خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہیں۔ پھر تارکول خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے اور اُس سے عام استعمال میں آنے والی آدھی سنتھیٹک دوائیں بنتی ہیں لیکن انسان بڑے غرور سے کہتا ہے کہ یہ دوا مَیں نے ایجاد کی ہے یا فلاں نے ایجاد کی ہے اور وہ بالکل بھول جاتا ہے کہ جن چیزوں سے اُس نے یہ دوا بنائی ہے وہ خدا تعالیٰ کی ہی پیدا کردہ ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ تو اُس پر احسان کرتا ہے مگر وہ اس احسان کی قدر کرنے کی بجائے یہ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ مَیں بڑا لائق تھا۔ مَیں بڑا قابل تھا مَیں نے یہ جدوجہد کی اور یہ ترقی حاصل کر لی۔ حالانکہ نہ صرف ہر کام میں کامیابی حاصل کرنے کے سامان اور ذرائع خدا تعالیٰ مہیا کرتا ہے بلکہ ہر کام کا نتیجہ بھی خدا تعالیٰ ہی پیدا کرتا ہے۔ آخر ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ایک شخص سارا سال لوہارے کا کام سیکھتا ہے لیکن وہ سیکھ نہیں سکتا۔ پھر ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ایک کاریگر ہوتا ہے لیکن اُسے کوئی کام نہیں ملتا۔ پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ روپیہ مل جائے تو کوئی ڈاکو اُس کا سارا روپیہ چھین لے پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کما کر اپنے گھر روپیہ لے آئے۔ لیکن گھر میں آتے ہی اُس کے پیٹ میں درد اُٹھے اور وہ جانبر ہی نہ ہو سکے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُسے ایسی جلدی بیماری پیدا ہو جائے کہ وہ کپڑا نہ پہن سکے پس جو کچھ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی محنت سے بھی روزی کمائے تب بھی اُسے جو کچھ ملتا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی ملتا ہے۔ اور اُس کا فرض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے جتنا بڑا بنائے اتنا ہی وہ جھکتا چلا جائے۔ دیکھو جس پر بوجھ زیادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کی نسبت زیادہ جھکا ہوا ہوتا ہے۔ اِسی طرح کسی کو دولت کا مل جانا ایسا ہی ہے جیسے کسی کے سر پر بوجھل گٹھڑی رکھی ہوئی ہو ایسی حالت میں اُس کے اندر زیادہ فروتنی اور زیادہ انکسار پایا جانا چاہیئے نہ یہ کہ وہ متکبر ہو جائے اور دوسروں کو ذلیل سمجھنے لگے۔ بہرحال جو شخص دولت و ثروت اور عزت کو خدا تعالیٰ کا انعام سمجھے گا وہ دوسروں کی نسبت زیادہ جھکیگا اور جو اس کو اپنا ذاتی کمال قرار دیگا وہ تکبر میں مبتلا ہوگا اور آخر خدا تعالیٰ سے دُور چلا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تکبر کو شدید طور پر ناپسند کیا ہے اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم اپنی ترقیات کے لئے کوشش نہ کرو۔ تم اپنی ترقیات کے لئے جتنی بھی کوشش کرو، جائز ہے مگر اس کے بعد تمہیں جتنی بھی ترقی ملے اتنا ہی اپنے آپ کو متواضع بناؤ۔ ورنہ اگر تم متکبر ہو گئے تو خدا تعالیٰ تم سے خوش نہیں ہوگا بلکہ ناراض ہوگا اور وہ ترقی تمہارے لئے رحمت کا موجب نہیں بلکہ ابتلاء کا موجب ہو گی اور تم آئندہ کے لئے انوارِ سماوی سے محروم ہو جاؤ گے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک شخص آیا اور اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ! مجھے سخت مالی تنگی ہے۔ آپ دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کشائشِ رزق کے سامان پیدا فرمائے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دُعا کی اور آخر آپ کی دُعا کی برکت سے وہ اِس قدر امیر ہو گیا کہ ساری وادی اُس کے جانوروں سے بھر جاتی تھی شہروں میں رہنے والے شائد اس امر کو نہ سمجھ سکیں کہ ایک شخص کے پاس اتنے جانور کہاں سے آ سکتے ہیں۔ مگر گاؤں کے رہنے والے جانتے ہیں کہ ایک ایک آدمی کے پاس کسقدر جانور ہوتے ہیں۔ مَیں ایک دفعہ سلسلہ کی زمینوں کے معائنہ کے لئے سندھ گیا۔ تو ایک جگہ میں نے تین چار سو جانور دیکھے۔ مَیں نے ان جانوروں کو دیکھ کر پوچھا کہ کیا یہ اِس گاؤں کے جانور ہیں؟ اِس پر

وہاں کا منیجر ہنسا اور کہنے لگا کہ یہ تو صرف ایک آدمی کے جانور ہیں۔ لیکن شہریوں کے لئے ایک گائے یا ایک بھینس کا رکھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ تو اُس کے پاس اس قدر جانور ہو گئے کہ اُن سے وادی بھر جاتی۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا آدمی اس کے پاس بھجوایا اور کہا کہ اُس سے زکوٰۃ لاؤ۔ جب اس نے زکوٰۃ مانگی تو وہ کہنے لگا کہ کیا مصیبت ہے جانوروں کو کھلانے کے لئے ہمارے پاس رقم نہیں ہوتی اور ان کو ہر وقت چندوں کی سوجھتی رہتی ہے۔ انہیں ہمارے بوجھوں کا کوئی فکر ہی نہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچی۔ تو آپؐ نے فرمایا۔ اِسے چھوڑ دو۔ ہم اس سے زکوٰۃ نہیں لیں گے۔ بعد میں اُسے کسی نے کہا کہ کمبخت تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے دُعا کروا کروا کے امیر بنا تھا اور اب تُو نے زکوٰۃ دینے سے ہی انکار کر دیا۔ اِس پر اُسے ندامت پیدا ہوئی اور وہ زکوٰۃ لے کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب تم سے زکوٰۃ نہیں لی جائیگی۔ اِس پر وہ روتا ہوا واپس چلا گیا۔ دوسرے سال پھر وہ زکوٰۃ کا مال لے کر آیا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ فرمایا۔ غرض اسی طرح ہر سال وہ زکوٰۃ کا مال لاتا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ردّ فرما دیتے یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس مالِ زکوٰۃ لایا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس شخص کا مال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں فرمایا مَیں بھی اُس کا مال قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ چونکہ اس کے دل میں نیکی تھی اس لئے وہ ہر سال باقاعدگی کے ساتھ زکوٰۃ لاتا مگر اُس کی زکوٰۃ قبول نہ کی جاتی۔ اسی طرح بعض لوگ امتحان شدہ رہے ہوتے ہیں دیکھتے ہیں کہ لڑکے امتحان میں کامیاب ہو جائیں۔ اور کسی اعلیٰ عہدہ پر لگ جائیں۔ جب امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور عہدہ مل جاتا ہے تو پھر لگتے ہیں احمدیوں سے بھاگنے۔ کبھی کہتے ہیں کہ احمدیوں کی سوسائٹی ادنیٰ ہوتی ہے۔ کبھی کہتے ہیں احمدی مالدار نہیں ہوتے۔ کبھی کہتے ہیں احمدیوں کے گھر صاف نہیں ہوتے۔ وہ بھول جاتے ہیں اس بات کو کہ پہلے ہم سے دُعائیں کروایا کرتے تھے اور پھر وہ ہمیں سے بھاگتے ہیں۔ یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ ایسے آدمیوں کے دلوں میں ایمان نہیں ہوتا۔ اگر ایمان ہوتا تو وہ دین کی خدمت کرتے۔ دینداروں کی خدمت کرتے۔ جماعت کی خدمت کرتے اور تکبّر میں مبتلا نہ ہوتے۔

میں نے دیکھا ہے غریبوں میں تواضع اور انکسار زیادہ پایا جاتا ہے۔ اِسی لئے انبیاء کی جماعتوں میں عموماً غریب ہی شامل ہوتے ہیں۔ اِس کے یہ معنے نہیں کہ خدا انہیں غریب رکھنا چاہتا ہے۔ بلکہ خدا ان غریبوں کو اِس لئے دین کی خدمت کا موقعہ دیتا ہے کہ اُن میں حرص نہیں ہوتی۔ اور شکر کا مادہ اُن میں زیادہ ہوتا ہے۔ بے شک وہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو امراء ہیں اور مخلص ہیں۔ اور وہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن پر دباؤ ڈالا جائے تو مان جاتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو چندوں سے کھسکتے رہتے ہیں۔ اور پھر جہاں بیٹھیں گے کہیں گے کہ یہ کیا مصیبت ہے ہر وقت چندہ ہی چندہ مانگا جاتا ہے۔ ... غریب آدمی جو پچیس۵ روپے کا چندہ دے رہا ہوتا ہے وہ حیران ہوتا ہے کہ یہ [illegible] ہزار روپیہ لیکر بھی کیوں چندہ نہیں دے سکتا۔ اِن نقائص اور خرابیوں سے بچنے کا واحد ذریعہ یہی ہوتا ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے انعامات کی قدر کرے اور اُن کے احسانوں کو یاد رکھے لیکن جب وہ کہتا ہے اِنَّمَا اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ تو مجھے

جو کچھ ملا ہے اپنی کوشش اور علم کی وجہ سے ملا ہے۔ یا جب وہ کہتا ہے کہ ہم تو پہلے ہی مر رہے ہیں۔ ہم دین کے لئے روپیہ کہاں سے دیں۔ یا کہتا ہے بڑی مصیبت آگئی ہر وقت چندے ہی چندے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ تو اُس وقت وہ خدائی برکات سے محروم ہو جاتا ہے۔ خدائی برکات سے وہ اُسی وقت حصّہ لے سکتا ہے جب اُسے ایک پیسہ بھی ملتا ہے تو وہ اُسے خدائی انعام سمجھتا ہے۔ یا پندرہ کی بجائے اُسے بیس روپے ملتے ہیں تو وہ اُن پانچ روپوں کی زیادتی کو خدا تعالیٰ کا انعام سمجھتا ہے۔ پھر اُسے سو روپیہ ملتا ہے تو وہ سو کو خدا تعالیٰ کا احسان سمجھتا ہے۔ ہزار روپیہ ملتا ہے تو وہ ہزار کو خدا تعالیٰ کا احسان سمجھتا ہے۔ پندرہ سو روپیہ ملتا ہے تو وہ ان پندرہ سو کو خدا تعالیٰ کا احسان سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کے واہمہ اور گمان میں بھی نہیں آ سکتا کہ اگر مجھ سے دین کی خدمت کے لئے کسی چندے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو یہ ایک مصیبت ہے جو مجھ پر آگئی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے اُسی کا ہے میرا اپنا کچھ نہیں۔ جب تمہارے پاس کوئی شخص امانت رکھتا ہے اور پھر وہ تم سے مانگنے آ جاتا ہے۔ تو کیا تم اس امانت کی واپسی کو مصیبت سمجھتے ہو؟ اسی طرح خدا تعالیٰ کی طرف سے جو روپیہ تمہیں ملتا ہے اگر تم اس کے متعلق اپنے دلوں میں یہ یقین اور ایمان پیدا کر دو کہ وہ خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے تمہیں دیا ہے تو تم خدا کے لئے اس روپیہ کو خرچ کرنے میں کبھی دریغ نہ کرو۔ کیونکہ تم سمجھو کہ یہ میری چیز نہیں تھی بلکہ اُسی کی تھی۔ جیسے انسان بعض دفعہ سفر پر جاتا ہے تو وہ اپنی بھینس ہمسایہ کو دے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ دس دن اس کا دودھ پئیں۔ سفر سے واپس آ کر میں لے لونگا۔ اب کوئی کمینہ اور ذلیل انسان ہی ہوگا جو اس کے مانگنے پر اپنے دل میں کہے کہ یہ مر کیوں نہ گیا بھینس میرے قبضہ میں ہی رہتی۔ ورنہ جو شریف انسان ہوگا۔ وہ کہیگا کہ میں آپ کا بڑا ممنون ہوں۔ آپ کی بھینس سے میں نے بڑا فائدہ اُٹھایا ہے۔

مگر دنیا میں تو امانت رکھنے والے اپنی ساری امانت واپس لے لیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی امانت میں سے ہمیشہ ایک حصّہ مانگتا ہے سارا نہیں مانگتا۔ پس وہ تو امانت داری نئی قسم کا ہے۔ اُس کے مانگنے پر جو شخص ناراض ہوتا ہے وہ بڑا ہی ذلیل اور رذیل قسم کا انسان ہے۔ اُس نے رات دن خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھایا۔ پھر کسی موقعہ پر اگر اُس نے ایک آدھ چیز مانگ لی تو اُس نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مجھ پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ حقیقتاً یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی ناقدری اور ناشکری سے پیدا ہوتی ہیں اسلئے خدا تعالیٰ نے بار بار کہا ہے کہ میری نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ اور میرے احسانات کو یاد رکھو۔ جب انسان ہر چیز کو خدا تعالیٰ کا انعام سمجھتا اور اُس کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے تو اُسے سارا دین مل جاتا ہے۔

قارون کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّأَكْثَرُ جَمْعًا

کیا یہ جواب دیتے وقت اُس نے یہ نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ نے اِس سے پہلے کئی ایسی بستیوں کو اجاڑا ہے جو اس سے زیادہ طاقتور تھیں اور اس کے جتھہ سے ان کے پاس زیادہ جتھہ تھا۔

یہ آیت بھی بتاتی ہے کہ اُس کی دولت ذاتی نہیں تھی۔ کیونکہ اگر اُس کی ذاتی دولت ہوتی تو اللہ تعالیٰ فرماتا کہ ہم اُس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے مالدار لوگوں کو تباہ کر چکے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں قارون کے مقابلہ میں پہلی ہلاک شدہ قوموں کی دولت اور

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ

(ایک دن ایسا ہوا کہ) وہ اپنی زینت (یعنی اپنے باڈی گارڈ) کے ساتھ نکلا - اسپر وہ لوگ جو کہ دُنیا کی زندگی کا سامان

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ

چاہتے تھے بول اُٹھے - اے کاش! ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو

قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۸۰﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ

دیا گیا - اس کو تو (دنیا کا ایک) بہت بڑا حصہ ملا ہے - اور جن لوگوں کو

اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ

علم دیا گیا تھا وہ بولے - تمہارا ستیاناس! اللہ کی طرف سے ملنے والی جزاء مومن اور ایمان کے

اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

مناسب حال عمل کرنے والے کے لئے بہت اچھی ہوتی ہے - اور یہ (جزاء) فقط صبر کرنے والوں کا گروہ ہی پاتا ہے -

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ

پھر ہم نے اُس کو اور اُس کے قبیلہ کو مکروہات میں مبتلا کر دیا - اور کوئی جماعت ایسی نہ نکلی جو

فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۲﴾

اللہ کے سوا اُس کی مدد کرتی - اور کسی تدبیر سے بھی وہ (اپنے دشمن سے) بچ نہ سکا -

اور اُن کی طاقت کو پیش کیا ہے - پس یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قارون کے قبضہ میں بھی قومی دولت تھی یعنی وہ حکومتِ مصر کا ایک بڑا افسر تھا - اُس کی ذاتی دولت و ثروت کا اسجگہ ذکر نہیں کیا گیا -

وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ

میں بتایا کہ مجرم اپنے اعمال سے آپ پہچانا جاتا ہے اس کے متعلق کسی جستجو اور پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں ہوتی - کیونکہ اس کے متعلق اللہ تعالٰے کی طرف سے

جو سزا آتی ہے وہ طبعی ہوتی ہے اور طبعی سزا آپ ہی بتا دیتی ہے کہ مجرم اس کا مستحق تھا - مثلاً اگر کوئی شخص آنکھوں سے کام نہ لینے کی وجہ سے نابینا ہو جائے یا ہاتھ پاؤں سے کام نہ لینے کی وجہ سے چلنے پھرنے کی طاقت سے محروم ہو جائے یا دماغ سے کام نہ لینے کی وجہ سے سوچنے اور سمجھنے کی قوت سے محروم ہو جائے یا نیک تعلیموں کا انکار کرنے کی وجہ سے ہدیت سے محروم ہو جائے تو ہر شخص سمجھ جائیگا کہ اس کی سزا

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ

اور وہ لوگ جو کل تک اُس کے مقام پر ہونے کی تمنّا کرتے تھے کہنے لگ گئے

وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ

تجھ پر ہلاکت ہو اللہ (تعالیٰ) ہی یقیناً اپنے بندوں میں سے جس کیلئے چاہتا ہے رزق میں فراخی

عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا

دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کرتا ہے۔ اگر ہم پر اللہ (تعالیٰ) نے احسان نہ کیا ہوتا

لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

تو ہمیں بھی مصیبتوں کا شکار کر دیتا۔ تجھ پر ہلاکت ہو (بات یہی ہے کہ) کافر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ۴۲

ع ۸ ۱۱

وَيْكَ

اُس کے اعمال کے عین مطابق ہے۔ اور وہ اُس سزا پر کوئی اعتراض نہیں کر سکیگا۔

۴۲ حل لغات:۔ وَيْكَ: وَیْ تعجب کا کلمہ ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں وَیْ لِزَيْدٍ یعنی زید پر تعجب کرو نیز وَیْکَنّٰی بِھَا عَنِ الْوَيْلِ کبھی اس لفظ سے ہلاکت مُراد لی جاتی ہے۔ جیسے کہتے ہیں وَيْكَ اِسْتَمِعْ قَوْلِيْ۔ تُو ہلاک ہو۔ میری بات سُن۔ کبھی کبھی وَیْ کے ساتھ کَاَنَّ یا کَاَنَّ بھی داخل کر دیتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر:۔ خَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ کے یہ معنے ہیں کہ ایک دن وہ بڑی شان و شوکت سے اپنے تمام اہلکاروں اور باڈی گارڈز وغیرہ کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے سے گذرا۔ اور اُس نے اپنے شاہانہ اقتدار کی نمائش کی اور انہیں دکھایا کہ میری کتنی بڑی عزت ہے اور کس طرح یہ سب لوگ میری رضاء اور خوشنودی کے حصول کے لئے میرے آگے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں اور مجھے سلام کرتے اور میرے سامنے دب کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اُس کا اپنی قوم کے سامنے اس شاہانہ کرّوفر سے گذرنا درحقیقت اپنی قوم کی تذلیل کے لئے تھا۔ اور وہ انہیں کھانا چاہتا تھا کہ کامیابی کا اصل راز فرعون کی اطاعت میں ہی ہے۔ اِس میں کوئی شُبہ نہیں کہ بحیثیت قوم فرعون بنی اسرائیل کا دشمن تھا اور وہ اُن کی طاقت کو کچلنا چاہتا تھا۔ مگر اُن کی طاقت کو کچلنے کے لئے اُس نے جو ذرائع اختیار کئے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اُس نے بنی اسرائیل میں سے ہی قارون کو سرکاری افسر بنا دیا تاکہ ایک طرف تو وہ یہ ظاہر کرے کہ میں بنی اسرائیل کے قابل افراد کی قدر کرتا ہوں اور دوسری طرف جب وہ اپنے ہی ہم قوم افراد پر ظلم کرے تو وہ ظلم فرعون کی طرف منسوب ہونے کی بجائے قارون کی طرف منسوب ہو جائے اور لوگ یہ کہیں کہ اس میں فرعون کا کیا قصور ہے یہ ظلم تو قارون نے کیا ہے۔ انگریز نے بھی اپنے زمانۂ اقتدار میں ایسا ہی کیا تھا۔ اور اُس نے بھی ہندوستان پر حکومت کرنے کے زمانہ میں بعض ماتحت افسر خود ہندوستانیوں میں سے مقرر کئے ہوئے تھے اور وہ انگریز کی خوشنودی کے لئے حاکم قوم کے افراد سے بھی زیادہ ظلم کرتے تھے۔

قارونؔ بھی ایسے ہی ظالم افسروں میں سے تھا جن کے پیشِ نظر ہمیشہ بنی اسرائیل کی تذلیل رہتی تھی۔ چنانچہ اسی پروگرام کے تحت اُس نے ایک دن اپنا شاہانہ جلوس نکالا اور بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ سب جمع ہوں اور اس نظارہ کو دیکھیں اور اپنی ذلّت اور بیچارگی پر آنسو بہائیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ لا اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ۔ چونکہ ہر قوم میں بعض کمزور افراد بھی ہوتے ہیں جو دین اور تقوٰی اور خدا ترسی کی بجائے دنیوی شان و شوکت اور ظاہری مال و دولت کو زیادہ اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے بنی اسرائیل میں سے کمزور افراد نے قارون کے اِس شاہانہ کرّ و فر کو دیکھ کر اُس پر رشک کیا۔ اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ کاش ہم بھی قارون کی طرح ہوتے۔ یہ تو بڑا خوش نصیب ہے جس نے اِتنا بڑا اقتدار حاصل کر لیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا۔ جب اِن باتوں کا چرچا ہُوا اور قوم کے بعض کمزور افراد نے قارون کی تعریف کرنی شروع کر دی بلکہ اس بات پر آہیں بھرنی شروع کر دیں کہ انہیں بھی یہ مقام کیوں حاصل نہیں ہُوا تو حقیقتِ حال کا علم رکھنے والوں یعنی علماء اور ربّانی لوگوں نے انہیں سمجھایا۔ کہ تم اس چند روزہ زندگی پر کیوں مرتے ہو یہ تو آج نہیں تو کل ختم ہو جائیگی۔ دائمی زندگی تو وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہونے والی ہے اور اس زندگی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان لانے والوں اور اُس ایمان کے مطابق عمل کرنے والوں کو جو جزائے نیک ملے گی اُسکے مقابلہ میں اس چند روزہ زندگی کا مال و متاع کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ اگر سو سال بھی تم نے عیش سے گذار لئے لیکن اگلی زندگی میں جو غیر محدود ہے تمہارے لئے کوئی سُکھ کا سامان نہ ہُوا تو تمہیں یہ آرام کیا فائدہ دے گا؟ تم دائمی سُکھ اور آرام حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اور اس دنیا سے اپنا دل مت لگاؤ۔

وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۔ میں بتایا کہ جس طرح اگلے جہان کی جزائے نیک ایک غیر معمولی انعام ہے اِسی طرح اس انعام کا مستحق بننا بھی ایک بڑی قربانی چاہتا ہے اور یہ مقام ایسے ہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو صبر سے کام لیا کرتے ہیں۔ صبر کے معنے صرف جزع فزع سے بچنے کے ہی نہیں ہوتے بلکہ بُرے خیالات کا اثر قبول کرنے سے رُکنے۔ اُن کا مقابلہ کرنے اور نیکیوں پر ثابت قدم رہنے کے بھی ہوتے ہیں۔ پس انہوں نے دین کو دنیا پر مقدم کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے، اس طرف بھی توجہ دلائی کہ یہ مقام تمہیں اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ تم اُن بداثرات کا مقابلہ کرو۔ جو قارون اور اُس جیسے دوسرے افراد کی دنیوی شان و شوکت کو دیکھ کر تمہارے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر قارون کی طرح ظلم پر کمربستہ ہونے کی بجائے ہمیشہ بدیوں سے بچتے رہو اور نیکیوں پر پورے ثبات اور استقلال کے ساتھ قائم رہو۔ اگر تم ایسا کرو گے۔ تو تمہاری رُوحانی آنکھیں کھل جائینگی۔ اور تمہیں نظر آنے لگ جائیگا کہ یہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں بالکل حقیر اور ذلیل چیز ہے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ میں بتایا کہ کہ آخر قارون کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور خدائی عذاب اُس پر نازل ہو گیا۔ بنی اسرائیل پر اُس کے تمام مظالم اُس طاقت اور عزّت کی وجہ سے تھے جو فرعون کی خوشنودی کی وجہ سے اُسے حاصل تھی۔ مگر جب خدا تعالےٰ نے اُسے تباہ کرنا چاہا تو ایسا انقلاب پیدا ہُوا کہ قارونؔ بھی اور اُس کا تمام خاندان بھی ذلیل کر دیا گیا۔ بائیبل میں لکھا ہے کہ زمین پھٹی اور قارونؔ اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ غرق ہو گیا (گنتی ۱۶: ۳۰ ، ۳۲)۔ گویا اُس کی تباہی ایک زلزلہ کی وجہ سے

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي

یہ (جو) اخروی زندگی (ہے) ہم اسے اُنہی کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں جو ملک میں ناجائز غلبہ

الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور فساد نہیں چاہتے۔ اور انجام متقیوں کا ہی (اچھا) ہوتا ہے۔ ۴۳

ہوئی۔ اور خَسَفَ کے لفظی معنے زمین میں دھنسنے کے بھی ہیں۔ لیکن خَسَفَ فُلَانًا کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اُسے ذلیل کر دیا۔ اور اُس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جسے وہ ناپسند کرتا تھا۔ اسجگہ خَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ سے یہی مراد ہے کہ ہم نے اُس کو اور اُس کے سارے خاندان کو دنیا بھر میں ذلیل کر دیا۔

فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے یہ معنے ہیں کہ وہ ایسا ذلیل ہُوا کہ ملک بھر میں کوئی اُس کا نام نہ لیتا تھا۔ اور کوئی گروہ اُس کی مدد کرنے کے لئے نہ نکلا۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ۔ اور نہ وہ خود اپنی حالت بدل سکا۔ اِنْتَصَرَ کے معنے ہوتے ہیں اِمْتَنَعَ مِنْ عَدُوِّهٖ (اقرب) اپنے دشمن سے بچ گیا۔ پس اِس کے معنے یہ ہیں کہ نہ وہ بیرونی تدبیر سے اپنی اس ذلت کو مٹا سکا اور نہ وہ اپنے علم سے کام لے کر جس پر اُسے بڑا ناز تھا اپنے آپ کو اس تباہی سے بچا سکا۔

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

جب قارون خدائی عذاب کی گرفت میں آگیا تو وہ لوگ جو کل تک اُس پر رشک کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کاش ہمیں بھی قارون جیسا مقام میسر آتا۔ اُن کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ اور کہنے لگے کہ تعجب کی بات ہے کہ اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وافر رزق عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اُسے تنگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہم پر احسان نہ کرتا اور ہماری اِس کوتاہی کو معاف نہ کرتا کہ ہم نے قارون کو ایک بڑا آدمی سمجھ کر یہ خواہش کرنی شروع کر دی تھی کہ کاش ہم بھی ایک دوسرے قارون بن جائیں تو آج ہم کو بھی وہ بے نام و نشان کر دیتا اور وہی عذاب جو اُس پر مسلط کیا گیا اُس میں ہم بھی شریک ہوتے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ مجرموں کی تائید کرنا یا اُن کی پیٹھ ٹھونکنا یا اُن کے ظالمانہ افعال کی حمایت کرنا یا مجرموں کے مقابلہ میں آواز بلند کرنے والوں کی مخالفت کرنا بھی انسان کو سزا کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اور اگر وہ توبہ اور استغفار سے کام نہ لیں اور اپنے رویّہ کو ترک نہ کریں تو خطرہ ہوتا ہے کہ وہ بھی عذاب کی لپیٹ میں آ جائیں۔

وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ میں بتایا کہ انبیاء کے مخالفین کو دنیا میں عارضی کامیابیاں تو حاصل ہو سکتی ہیں مگر فلاح جو اپنے مقاصد میں بامراد ہونیکا نام ہے انہیں کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اور وہ نبیوں کے مقابلہ میں ضرور تباہ ہوتے ہیں۔

۴۳ تفسیر:۔ اِس میں بتایا کہ اُخروی زندگی کے انعامات ہم نے انہی لوگوں کے لئے مخصوص کئے ہوئے ہیں جو نہیں چاہتے کہ لوگوں کو ذلیل کر کے آپ بڑے بن جائیں اور نہ فساد اور فتنہ انگیزی کی رُوح اپنے اندر

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ

جو شخص پسندیدہ عمل کرے اُسے اُس سے بہتر بدلہ ملے گا اور جو کوئی

بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ

بُرا عمل کرے گا تو بُرے اعمال کرنے والوں کو اُن کے اپنے عمل

اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

کے برابر جزاء دی جائیگی - سے ۴۴

رکھتے ہیں - اور گو ابتداء میں یہی سمجھتی ہے کہ امن پسندی سے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی - کامیابی اور عزت حاصل کرنے کا یہی ذریعہ ہے کہ دوسروں کو گرایا جائے اور ملک میں شورش پیدا کی جائے. لیکن بڑائی کے آخر وہی مستحق ہوتے ہیں جو متقی ہوں اور انجام ہمیشہ امن پسند اور نیک لوگوں کا ہی اچھا ہوتا ہے - اور وہی کامیاب ہوتے ہیں فتنہ و فساد پھیلانیوالے خواہ کچھ عارضی کامیابی حاصل بھی کریں پھر بھی ان کا انجام حسرتناک ہوتا ہے اور وہ اپنے اعمال کی اس دنیا میں بھی سزا پاتے ہیں اور آخرت میں بھی ذلیل اور رسوا ہونگے۔

سے ۴۴ تفسیر :- نیکی اور بدی کی جزاء کے متعلق اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں اپنا قانون بیان فرمایا ہے اور بتایا، کہ جو شخص کوئی نیک کام بجا لائے اُسے اپنے کام سے بہت زیادہ بدلہ ملتا ہے اور جو شخص کوئی بُرا کام کرے - اسے صرف اپنے عمل کے مطابق بدلہ ملتا ہے -

یوں تو دنیا میں جو بھی نیک کام کیا جائے اللہ تعالےٰ کی عطا کردہ طاقتوں سے ہی کیا جاتا ہے اور اس نقطۂ نگاہ سے اگر عملِ نیک کی کوئی بھی جزاء نہ دی جاتی تو کوئی قابلِ اعتراض امر نہ تھا کیونکہ جن سامانوں سے کام لے کر نیک کام کئے جاتے ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ اگر ہاتھ سے کوئی شخص نیکی کا کام کرتا ہے تو ہاتھ اُسکے بنائے ہوئے نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کے بنائے ہوئے ہیں - ہاتھ کے اندر جو کام کرنے کی طاقت پائی جاتی ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کی ہی پیدا کی ہوئی ہوتی ہے اس کی اپنی نہیں پھر اگر ہاتھ سے اس نے کسی پیاسے کو پانی پلایا ہے تو پانی بھی خدا تعالےٰ کا پیدا کردہ ہے. گلاس جس دھات سے بنایا جاتا ہے وہ بھی خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور پھر وہ دماغ جس کے اندر نیکی کا یہ جذبہ پیدا ہوا وہ بھی خدا تعالیٰ کا ہی پیدا کردہ ہے - پس جب شروع سے لیکر آخر تک ہر چیز خدا تعالیٰ ہی کی ہے اور اُس کی دی ہوئی طاقتوں سے کام لے کر عملِ نیک کیا جاتا ہے تو اگر وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے تو بوجہ اس کے کہ اللہ تعالےٰ انسان کا خالق ہے اور اُس کی مملوکہ اشیاء کا بھی مالک ہے انسان اپنے اعمال کے بدلہ میں کسی انعام کا مستحق نہیں ہو سکتا - جیساکہ غالب نے کہا ہے ؎

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

یعنی اگر جان بھی انسان خدا تعالیٰ کی راہ میں دے دے تو اُس کا یہ فعل کوئی قربانی نہیں کہلا سکتا - کیونکہ جان خدا تعالےٰ نے ہی دی تھی - اگر کسی کی چیز انسان نے اُس کو واپس کر دی اور وہ بھی سالہا سال کے استعمال کے بعد تو

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ

وہ خدا جس نے تجھ پر یہ قرآن فرض کیا ہے اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ وہ تجھے اُس

مَعَادٍ ۚ قُلْ رَّبِّي أَعْلَمُ مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَ

مقام کی طرف لوٹا کر لائیگا جس کی طرف لوگ لوٹ لوٹ کر آتے ہیں۔ تو کہدے میرا رب اُس کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت پر

مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨٦﴾

قائم ہوتا ہے اور (اُسکو بھی) جو کھلی گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے۔ ۴۵ھ

اس صورت میں بھی وہ خدا تعالیٰ کا ہی ممنونِ احسان ہوتا ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے کوئی کام کیا ہے لیکن باوجود اِس کے کہ تمام نیک اعمال خدا تعالیٰ کی دی ہوئی طاقتوں سے عمل میں لائے جاتے ہیں اور اگر ان اعمال کا کوئی بھی بدلہ نہ ملے تب بھی درست ہے لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی ملکیت کا اِس رنگ میں اظہار نہیں کیا کہ وہ انسان کے اعمال کو بدلہ سے محروم کر دے بلکہ اس رنگ میں کیا ہے کہ وہ انسانی اعمال کا اُن کے مناسب معاوضہ سے زیادہ بدلہ دیتے۔ اور باوجود اِس کے کہ سب اعمالِ حسنہ اُسی کی دی ہوئی توفیق سے انسان بجا لاتا ہے پھر بھی اللہ تعالیٰ ایسا ہی قرار دیتا ہے کہ گویا انسان نے وہ نیک عمل اپنی طاقت اور اپنے سامانوں سے کئے ہیں اور نہ صرف یہ کہ اس کے عمل کا پورا بدلہ دیتا بلکہ اپنے پاس سے زائد انعامیں بھی عطا فرماتا ہے۔ لیکن اِس کے مقابلہ میں جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو اوّل تو اگر وہ توبہ کرے تو اُسے معاف کر دیتا ہے اور اگر کوئی شخص توبہ نہ کرے تو پھر وہ گناہ کی سزا تو دیتا ہے لیکن اُسی قدر جتنا کہ گناہ ہو۔ گویا نیک لوگوں کے ساتھ تو وہ احسان کا معاملہ کرتا ہے۔ اور گنہگاروں کے ساتھ انصاف کا سلوک روا رکھتا ہے اور اُن کی بدیوں کے برابر ہی اُنکو سزا دیتا ہے اس سے بڑھکر کسی صورت میں سزا نہیں دی جاتی۔

۴۵ھ **تفسیر**:- اب اللہ تعالیٰ اِس بات کے ثبوت میں کہ انبیاء کا مقابلہ کرنے والے خواہ کتنی بڑی طاقت رکھتے ہوں تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔ اور انجام کار مومن ہی کامیاب اور مظفر و منصور ہوتے ہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک اہم ترین واقعہ کو بطور پیشگوئی بیان کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ۔ یعنی وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن نازل کیا اور اُس کی اطاعت فرض کی ہے وہ اپنی ذات ہی کی قسم کھاکر کہتا ہے کہ تو بہرحال اُس مقام کی طرف پھر واپس لوٹایا جائیگا جس کی طرف لوگ بار بار اور بار بار آتے ہیں۔ بار بار لوگ کس طرف آتے تھے؟ اُسی مقام کی طرف جس کے متعلق خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ ہم نے اُسے مَثَابَةً لِّلنَّاسِ بنایا ہے (سورۃ بقرۃ آیت ۱۲۶) اگر یہاں مَعَادٍ کی جگہ مَثَابَة کا لفظ رکھا جاتا تو اِخفاء نہ رہتا۔ اِس لئے مَثَابَة کا ہم معنے لفظ مَعَادٍ رکھ دیا تاکہ پیشگوئی بھی ہو جائے اور اخفاء بھی رہے۔ فرماتا ہے ہم اپنی ذات ہی کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔ کہ ہم تجھے پھر اس مقام یعنی مکہ مکرمہ کی طرف واپس لائیں گے جس کی طرف لوگ بہ نیتِ حج اور حصولِ ثواب کیلئے بار بار آتے ہیں۔ اور یہ سیدھی بات ہے کہ واپس اُسی کو لاتے ہیں جو گیا ہو اور جو گیا ہی نہ ہو

اُس کے واپس آنے کا سوال ہی کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ پس اس آیت میں دو عظیم الشان پیشگوئیاں کی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے ہجرت کرنی پڑیگی اور دوسری یہ کہ ہجرت کے بعد آپ پھر ایک فاتح کی صورت میں مکہ مکرمہ میں داخل ہونگے۔

یہ آیت قرونِ اولیٰ میں اتنی دوہرائی جاتی تھی اور اتنی اہم سمجھی جاتی تھی کہ بعض بیوقوفوں کو اس سے بڑے بڑے دھوکے بھی لگ گئے۔ چنانچہ عبداللہ بن سبا جو اُس موومنٹ کا بانی تھا جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا جس نے اسلام میں ایک بہت بڑا فتنہ برپا کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑائیاں کیں۔ وہ اسی آیت کو پیش کرکے کہا کرتا تھا کہ اسلام تناسخ کا قائل ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ میں مَعَاد سے مراد دُنیا ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ دوبارہ دُنیا میں آئیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انبیاء کی تمثیلیں دنیا میں آتی رہتی ہیں۔ اگر انبیاء کی تمثیلیں نہ آئیں تو دوسروں کی تمثیلوں سے کیا فائدہ؟ دنیا میں اگر یہ ایک سچی حقیقت ہے جو انگریزی زبان میں بیان کی جاتی ہے کہ

HISTORY REPEATS ITSELF

تاریخ اپنے آپ کو بار بار دوہراتی ہے" تو یقیناً انبیاء بھی بار بار تمثیلی طور پر دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہوتے رہیں گے۔ اور درحقیقت اگر کوئی چیز دوبارہ واپس لانے کے قابل ہوتی ہے تو اچھی چیز ہی ہوتی ہے لیکن اس آیت میں کسی تناسخ کا ذکر نہیں اور نہ معاد سے مراد دنیا ہے۔ بلکہ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ میں درحقیقت پیشگوئی کی گئی تھی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کرینگے اور پھر اسی شہر میں واپس آئیں گے جس کو عبادت کا مرکز بنایا گیا ہے۔ اور جس کی طرف بار بار دنیا حج اور عمرہ کیلئے آتی ہے۔ گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خبر دی کہ ایک دن کفار تجھے اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دینگے۔ مگر وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن نازل کیا اور اُس کی اطاعت فرض کی ہے تجھ سے قسم کھا کر وعدہ کرتا ہے کہ جب دشمن تجھے تیرے وطن سے نکال دیگا تو ہم پھر تجھے تیرے وطن میں لے آئیں گے۔ غور کرو اور سوچو کہ اس آیت میں آپ کی مکہ سے ہجرت کی خبر کس لطیف پیرایہ میں دی گئی ہے۔ بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ ایک دن تجھے ہجرت کرنی پڑے گی اور اس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حسّاس دل کو صدمہ پہنچتا اُس نے پہلے ہی آپ کو واپس آنے کی خوشخبری دے دی۔ اور چونکہ واپس وہی آ سکتا ہے جو گیا ہو اس لئے ضمنی طور پر اس میں یہ بھی بتا دیا کہ ایک دفعہ آپ کو مکہ سے ہجرت کرنی پڑے گی۔ اور موسیٰؑ کے ساتھ آپ کی مماثلت ظاہر ہو جائیگی

سورۂ قصص کے مکی ہونے کے متعلق مسلمان علماء تو متفق ہی ہیں لیکن عیسائی مصنفین بھی اسے مکی تسلیم کرتے ہیں۔ (کمنٹری آن دی قرآن مصنفہ وہیری جلد ۳ ص ۲۵۱) اور اس طرح وہ اپنے ہاتھوں اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سچے ہیں۔ کیونکہ اگر یہ سورۃ مکی ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے پتہ لگ گیا تھا کہ میں مکہ سے ہجرت کرونگا اور اس کے بعد میں ایک فاتح کی حیثیت سے دوبارہ اس شہر میں داخل ہونگا۔ اگر باوجود اس کے کہ آپ کو اپنے مستقبل کے متعلق کوئی علم نہیں تھا آپ پیشگوئی فرماتے ہیں اور پھر وہ پوری بھی ہو جاتی ہے۔ تو یہ آپ کی صداقت کی ایک واضح دلیل ہے۔ پس عیسائی مستشرق اس سورۃ کو مکی کہہ کر خود پھنس گئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ثابت کر گئے

اگر وہ لکھ دیتے کہ یہ سورۃ مدنی ہے تو کہا جا سکتا تھا کہ مدینہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طاقت حاصل ہو گئی تھی اِس لئے اِس قسم کی پیشگوئی کرنا آپ کے لئے کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے اس سورۃ کو مکّی قرار دیا اور اِس طرح اپنی تحقیق سے خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صداقت کا اظہار کر دیا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہمارے مفسرین کہتے ہیں کہ اِس سورۃ میں بعض آیات مدنی بھی ہیں۔ لیکن عیسائی مصنفین اسے خالص مکّی سورۃ قرار دیتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے ہاتھ سے اسلام کی صداقت کا ثبوت مہیّا کرتے ہیں۔ بعض عیسائی مصنّف لکھا کرتے ہیں کہ ہمیں سورتوں کے سٹائل سے ہی پتہ لگ جاتا ہے کہ اِس سورۃ کی فلاں آیت مدنی ہے اور فلاں مکّی۔ حالانکہ اگر یہ بات درست ہے کہ انہیں قرآن کریم کے سٹائل سے ہی پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کی فلاں آیت مکّی ہے اور فلاں مدنی تو یہ قرآن کریم کا کتنا بڑا کمال ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس سورۃ کو جس میں ہجرت کی پیشگوئی تھی اس سٹائل میں اُتارا جس کی وجہ سے عیسائیوں نے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ یہ سورۃ مکّی ہے اور اس کی وجہ سے انہیں اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ مکّی زندگی میں ہجرت اور فتح مکّہ کے متعلق جو پیشگوئی قرآن کریم نے کی تھی وہ سچی نکلی۔ ورنہ اگر یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی کتاب ہوتی تو اُسے اِس بات کا کیسے علم ہو سکتا تھا کہ آج سے اتنے سالوں کے بعد وھیری نولڈکے اور دوسرے مستشرقین نے کسی سورۃ کے سٹائل کی وجہ سے اُسے مکّی یا مدنی کہنا ہے۔ اس لئے اس کا سٹائل ایسا رکھو کہ اس سورۃ کے پڑھتے ہی ہر شخص یہ معلوم کر لے کہ یہ مکّی ہے۔ پھر کیا یہ عجیب بات نہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کے نازل کرنے والی ہستی کو ان اعتراضات کا علم تھا جو بیسویں صدی کے عیسائی مصنفین نے کرنے تھے۔ لیکن ان عیسائیوں کو خود بیسویں صدی میں بھی یہ علم نہیں کہ ہم نے ان آیتوں کی کیا تفسیر کرنی ہے۔ وہ ایک آیت پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن اس آیت کی جب ہم تفسیر کرتے ہیں تو اُن کا اعتراض ردّ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح قرآن کریم کی فضیلت اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت دنیا پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ کلام کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ عالم الغیب خدا کا اُتارا ہوا ہے۔ اور اس کثرت سے اس میں علم غیب بھرا ہوا ہے کہ ہر آیت سے کوئی نہ کوئی نیا نکتہ نکل آتا ہے۔ گویا جیسے پنجابی میں کہتے ہیں کہ اینٹ اینٹ کے نیچے فلاں چیز موجود ہے اسی طرح تم کوئی آیت اٹھاؤ اُس کے نیچے ایک معجزہ نکل آتا ہے اور اس طرح قرآن کریم سارے کا سارا معجزوں سے بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی طرف اِس آیت میں ہی خبر نہیں دی گئی بلکہ بعض اور بھی مکّی آیات میں یہ خبر واضح طور پر دے دی گئی تھی۔ چنانچہ سورۃ بلد جو مکّی سورۃ ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ یعنی میں اس بات کے ثبوت میں کہ کفار اپنے دعووں میں جھوٹے ہیں مکّہ شہر کو پیش کرتا ہوں اور اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ اے محمد رسول اللہ تُو ایک دن پھر اس شہر میں کامیاب طور پر واپس آنے والا ہے۔ پھر آپ کی ہجرت اور مکّہ مکرمہ میں کامیاب واپسی کی اِس آیت میں بھی خبر دی گئی تھی کہ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (سورۃ بنی اسرائیل ع ۹) یعنی اے میرے ربّ! مجھے مکّہ میں داخل ہونے کا بھی بابرکت موقعہ دیجیو اور مجھے مکّہ سے نکلنے کا بھی بابرکت موقعہ دیجیو۔ یعنی میرا مکّہ میں واپس آنا بھی میری کامیابی کا موجب ہو اور ایسا نشان ہو جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہو۔ اور میرا

مکہ سے نکلنا بھی میری کامیابی کا موجب ہو - اور ایسا نشان ہو جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہو اور اپنے پاس سے مجھے غلبہ عطا فرمائیو - وہ غلبہ جو مجھے کامیاب کر دے - اور میرے دشمنوں کو مغلوب کر دے - بعض لوگ اس آیت پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے داخل ہونے کا پہلے کیوں ذکر کیا ہے حالانکہ آپ نکلے پہلے اور داخل بعد میں ہوئے - کہنا یہ چاہیئے تھا کہ رَبِّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ مگر کہا یہ گیا ہے کہ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ یعنی اے ربّ مجھے اچھے طور سے داخل کیجیو اور مجھے اچھے طور سے نکالیو - صدق کا لفظ جب عربی زبان میں کسی چیز کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ایسی چیز جو ہمیشہ یادگار رہے - پس محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے یہ دعا سکھاتا ہے کہ اے میرے ربّ تو میرا داخلہ ایسا کیجیو جو دنیا میں ہمیشہ یادگار رہے اور مجھے نکالیو بھی ایسی شان سے کہ قیامت تک یادگار رہے - یہ سوال کہ اَدْخِلْنِیْ پہلے کیوں رکھا گیا ہے اور اَخْرِجْنِیْ کو بعد میں کیوں رکھا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے نبیوں کو ڈرایا نہیں کرتا - بلکہ امید اور یقین کا پہلو ہمیشہ اُن کے سامنے روشن رکھتا ہے - اگر پہلے ہی یہ الہام ہوتا کہ رَبِّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دل گھبرا جاتا کہ یہ کیا ہونے والا ہے اور دل میں خیال پیدا ہوتا کہ نہ معلوم یہ نکلنا عارضی ہے یا مستقل - اس لئے بجائے نکلنے کا پہلے ذکر کرنے کے اللہ تعالےٰ نے داخل ہونے کا پہلے ذکر کر دیا تاکہ آپ کا دل مطمئن رہے اور آپ سمجھیں کہ یہ نکلنا محض عارضی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ ہم پھر مکہ میں داخل ہونگے - چنانچہ دیکھ لو رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ کی دُعا کس شان کے ساتھ پوری ہوئی - آپؐ نکلے تو کس شان کے ساتھ نکلے اور آئے تو کس شان کے ساتھ آئے - گھر سے نکلے تو اس وقت کفار نے آپ کے گھر کے اردگرد پہرہ لگایا ہوا تھا - مگر آپ اُن کی آنکھوں کے سامنے نہایت دلیری اور جرأت کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئے - انہوں نے آپؐ کو دیکھا بھی مگر خیال کیا کہ یہ کوئی اور شخص ہوگا - اِس طرح آپ کفار کی صفوں میں سے نکل گئے اور اُن کا ذہن اِس طرف مائل ہی نہیں ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جا رہے ہیں بلکہ انہوں نے سمجھا کہ یہ کوئی اور شخص ہے - پھر وہ ساری رات دروازہ کی دراڑوں میں سے جھانک جھانک کر آپ کو دیکھتے رہے - اور چونکہ حضرت علیؓ آپؐ کے بستر پر سوئے ہوئے تھے انہیں کوئی شبہ نہ پڑا بلکہ انہوں نے سمجھا کہ آپؐ ہی سوئے ہوئے ہیں اتنے میں صبح ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ بجائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت علیؓ اندر سے نکل آئے ہیں - یہ بھی ایک بہت بڑا نشان تھا جو اللہ تعالےٰ نے ظاہر کیا - پھر آپ غارِ ثور میں جا کر چھپ رہے جو مکہ سے تین چار میل پرے ایک غار ہے - مَیں بھی وہاں گیا ہوں لیکن میرے دل میں کچھ ایسی کمزوری ہے کہ مَیں پہاڑ پر نہیں چڑھ سکتا - ارادہ تو تھا کہ جاؤں اور غارِ ثور دیکھوں مگر سو دو سو گز تک جا کر رہ گیا - اس پر مَیں نے اپنے ایک ساتھی کو بھیجدیا - اُس نے جو کیفیت بتائی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کئی گز کی جگہ ہے اور اُس کا خوب کھلا اور چوڑا مونہہ ہے گویا کئی گز چوڑا اور کئی گز لمبا ایک کمرہ ہے - آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ گئے اور اُس غار میں جا کر بیٹھ رہے - جب صبح ہوئی اور مکہ والوں نے دیکھا کہ آپ کہیں چلے گئے ہیں تو انہوں نے مشورہ کیا کہ آپؐ کا پیچھا کیا جائے - اِدھر انہوں نے اعلان کر دیا کہ جو شخص آپؐ کو پکڑ کر لائیگا اُسے سو اونٹ انعام دیا جائیگا - اس کے بعد انہوں نے کھوجی کو

اپنے ساتھ لیا اور آپؐ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کھوجی پاؤں کے نشانات کو دیکھتے دیکھتے اُن سب کو غارِ ثور کے مونہہ پر لے کر پہنچ گیا۔ اور اُس نے کہا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تو یہاں ہیں اور یا پھر آسمان پر چلے گئے ہیں۔ اب باوجود اس کے کہ مکّہ والوں کو کھوجیوں پر بڑا اعتبار ہوا کرتا تھا۔ اُن کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ آگے بڑھیں اور غارِ ثور کو اندر سے دیکھ لیں۔ حالانکہ وہ کئی گز لمبی اور کئی گز چوڑی جگہ تھی اور اُس کا مُنہ بہت کھلا تھا۔ یہ کیسا زبردست نشان ہے جو اللہ تعالیٰ نے ظاہر کیا۔ وہ اُس کی بات کو سُن کر ہنسنے لگ گئے اور کہنے لگے یہ محض بکواس ہے، ہم تمہاری بات پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ وہ اس وقت اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھبرائے کہ ایسا نہ ہو یہ ہمیں دیکھ لیں اور انہوں نے آہستگی سے اس خطرہ کا اظہار بھی کر دیا۔ اِس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ اگر یہ ہمارے سر پر بھی کھڑے ہیں تو کیا ہُوا۔ خدا ہمارے ساتھ ہے بھلا یہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے اپنی جان کا فکر نہیں کیونکہ مَیں تو ایک معمولی انسان ہوں۔ اگر مَیں مارا بھی جاؤں تو صرف ایک فرد مارا جائیگا۔ لیکن آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو سارا جہان مر جائیگا۔ غرض کفار چند منٹ تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر واپس مکّہ میں آگئے۔ تیسرے دن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُس غار میں سے نکلے اور مدینہ تشریف لے گئے۔ اب دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکّہ میں سے نکلنا کِس شان کے ساتھ ہُوا۔ یہ اِسی دُعا کی برکت تھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو سکھائی گئی تھی اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ مجھے مکّہ میں سے نکالیو تو اِس شان کے ساتھ کہ میرا نکلنا قیامت تک یادگار رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا۔ کیا کوئی شخص اِس واقعہ کو بُھلا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو مارنے کے لئے آتے ہیں جو گھر کے اِرد گرد بیٹھے ہوتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہی کی صفوں میں سے گذر جاتے ہیں اور انہیں پتہ تک نہیں لگتا۔ پھر کھوجی ساتھ جاتا ہے وہ نشان بتاتا ہے اور بڑے یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا تو یہیں کہیں ہیں اور یا پھر آسمان پر چلے گئے ہیں۔ مگر وہ اپنے کھوجی پر اعتبار رکھنے کے باوجود اُس کی بات کو تسلیم نہیں کرتے آپؐ کی اِدھر اُدھر تلاش نہیں کرتے بلکہ ہنستے ہوئے واپس آجاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہمارے کھوجی کی عقل ماری گئی ہے۔ پھر اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ والی دُعا بھی کس شان کے ساتھ پوری ہوئی۔ مکّہ والوں کی کتنی بڑی طاقت تھی اُن کو کتنا بڑا اقتدار حاصل تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُنکی ساری طاقت کو توڑ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکّہ میں فاتحانہ طور پر داخل کیا اور اس شان کے ساتھ داخل کیا کہ بڑے بڑے دشمن آپ کی غلامی میں شامل ہوگئے ہندہ جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ کٹوایا اور مُثلہ کیا تھا اور جو اسلام کی شدید ترین دشمن تھی اُس کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم تھا کہ اِسے قتل کر دیا جائے۔ مگر جب عورتوں کی بیعت ہونے لگی تو وہ بھی چُھپ کر اُن عورتوں کے ساتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیعت کرنے کے لئے آگئی۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لیتے ہوئے عورتوں سے کہا کہ کہو ہم شرک نہیں کرینگی تو ہندہ سے نہ رہا گیا۔ اور اُس نے کہا یا رسول اللہ کیا اب بھی ہم شرک کرینگی۔ ہم مالدار تھے اور آپ غریب تھے۔ ہمارا جتھہ تھا۔ اور آپ اکیلے تھے اگر بتوں کی کوئی بھی حیثیت ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ آپ ہمارے مقابلہ میں جیت جاتے۔ جب آپ ہمارے مال اور ہماری طاقت اور ہماری شوکت اور ہمارے جتھے اور ہمارے اثر اور ہمارے

اقتدار کے باوجود جیت گئے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے بتوں میں کوئی طاقت نہیں۔ یہ وہ عظیم الشان نشان تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فتح مکہ کے وقت ظاہر ہُوا۔ اور جس کی لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ میں خبر دی گئی تھی۔

پھر جب ہم کتب سابقہ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اُن میں بھی یہ پیشگوئی نظر آتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک دن اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑے گی۔ اور پھر دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آپ فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہونگے۔ چنانچہ آپ کی ہجرت کی خبر یسعیاہ باب ۲۱ میں پائی جاتی ہے جہاں لکھا ہے:-

"عرب کی بابت الہامی کلام

عرب کے صحرا میں تم رات کاٹوگے۔ اے ددانیوں کے قافلو! پانی لے کر پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کر بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے۔ ننگی تلوار سے اور کھچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ٹھیک ایک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے۔ اور خداوند اسرائیل کے خدا نے یُوں فرمایا۔"

(یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۱۳ تا ۱۷)

اس پیشگوئی میں ددانیوں کے قافلوں اور تیما کی زمین کے باشندوں سے خطاب کرتے ہوئے انکو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم روٹی اور پانی لیکر اُن لوگوں کا استقبال کرنے کیلئے آگے بڑھو جو مخالفین کے جور و ستم اور اُنکی ننگی تلواروں اور کھچی ہوئی کمانوں کا ایک لمبے عرصے تک نشانہ بنے رہے۔ اور جواب بھاگ کر تمہارے ملک میں پناہ لینے کیلئے آرہے ہیں۔

ددآن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک پوتے کا نام ہے جو آپ کی تیسری بیوی قطورہ کے بطن سے پیدا ہونے والے لڑکے یُقسان کی اولاد میں سے تھا (پیدائش باب ۲۵ آیت ۱ اور ۳)

تیما حضرت اسماعیل علیہ السلام کے نویں بیٹے کا نام تھا۔ (پیدائش باب ۲۵ آیت ۱۶) اور قیدار حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دوسرے بیٹے کا نام ہے۔ پیدائش باب ۲۵ آیت ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسماعیل اور بنی قطورا دونوں ارض مشرق یعنی عرب میں آباد ہوئے۔ چنانچہ ددآن کی اولاد پہلے یمن میں آباد ہوئی۔ مگر پھر اُس کے قبائل عرب میں چاروں طرف پھیل گئے۔ اوس اور خزرج بھی اسی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح تیما کی اولاد مدینہ کے نواح میں آباد ہوئی۔ لیکن قیدار کی اولاد مکہ کے نواح میں بسی۔ قریش مکہ اُسی کی نسل سے تھے۔ حضرت یسعیاہ نے ددآن اور تیما کی نسلوں کو جو نواح مدینہ میں آباد تھیں بتایا کہ ایک زمانہ میں قریش کے مظالم اور اُن کی شب و روز کی جنگ کے نتیجہ میں آخر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑے گی۔ تمہارا فرض ہے کہ تم ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھو۔ اور اپنی آنکھوں کو فرش راہ کرو۔ اور روٹی اور پانی لے کر اُن کے ملنے کو نکلو یعنی اپنے گھروں کے دروازے اُن کے لئے کھول دو۔ اور اُنکی خدمت کو اپنے لئے برکت اور رحمت کا باعث سمجھو۔ چنانچہ اس پیشگوئی کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لیکر مکہ سے نکلے اور ایسی حالت میں نکلے جب کہ ننگی تلواروں کے ساتھ دشمن نے آپ کے مکان کا محاصرہ کیا ہُوا تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ آپ کا خاتمہ کردے مگر اللہ تعالیٰ نے ایسی قدرت نمائی فرمائی کہ رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے سامنے سے نکل آئے اور انہیں خبر تک نہ ہوئی ۔

پھر اس پیشگوئی میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس ہجرت کے ٹھیک ایک سال بعد آپؐ کے اور آپؐ کے دشمنوں کے درمیان ایک جنگ ہوگی جس میں دشمن شکست کھائیگا۔ قریش کا تمام رُعب دبدبہ خاک میں مل جائیگا۔ چنانچہ عین ایک سال کے بعد جنگ بدر ہوئی جس میں اسلام کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی اور قریشِ مکّہ اپنے کمانڈر اور جرنیلوں کی لاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر ہی بھاگ کھڑے ہوئے ۔

پھر یہ تو ہجرت کی خبر تھی۔ فتح مکّہ کی خبر حضرت موسیٰؑ علیہ السلام نے ان الفاظ میں دی کہ

" خداوند سینا سے آیا۔ شعیر سے اُن پر طلوع ہوا اور فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا ۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا ۔ اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کے لئے تھی "

(استثناء باب ۳۳ آیت ۱و۲)

اس آیت میں فاران سے ظاہر ہونے والے جس موعود کی پیشگوئی کی گئی تھی وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور بتایا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دس ہزار صحابہؓ کے لشکر کے ساتھ مکّہ میں اس طرح داخل ہونگے کہ اُن کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ہوگی آتشی شریعت سے مراد دلوں کو صاف کرنیوالی شریعت بھی ہوسکتی ہے اور اس موقعہ کے مناسب اسکے معنے تلوار کے بھی ہو سکتے ہیں کہ جب مکّہ والے قرآن کی حکومت کو جو رحمت کا پیغام تھا قبول نہیں کرینگے بلکہ اُسے مٹانے کی کوشش کرینگے تو اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک آتشی شریعت یعنی تلوار دیگا اور آخر مکّہ کے لوگ تلوار کے آگے اپنا سر جھکا دیں گے ۔

یہ پیشگوئی جو بائیبل میں پائی جاتی ہے اس کی طرف یہود کے اہل علم طبقہ کی نگاہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی اُٹھ چکی تھی ۔ چنانچہ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر پہلی دفعہ وحی نازل ہوئی تو آپ گھبرا گئے اور آپنے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ذکر کیا ۔ وہ آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو صحفِ انبیاء سے خوب واقف تھا اور کہا کہ ان کے پاس اپنی کیفیت کا ذکر کریں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں باتیں بتائیں کہ کس طرح اُن پر وحی نازل ہوئی ہے تو ورقہ بن نوفل نے کہا۔ کاش میں اُس وقت جوان ہوتا اِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ ۔ جب تیری قوم تجھے مکّہ سے نکال دیگی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحفِ سابقہ کی یہ پیشگوئیاں ان کے ذہن میں تھیں کہ عرب میں ایک عظیم الشان نبی پیدا ہوگا جسے اس کی قوم کے لوگ اپنے شہر میں سے نکال دیں گے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بات سُنی تو آپؐ سخت حیران ہوئے کیونکہ اُسوقت تک ابھی آپ نے کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا اور سارا عرب آپ کو راستباز اور امین سمجھتا اور آپ کو عزت کے مقام پر بٹھاتا تھا۔ اسی حیرت کے عالم میں آپؐ نے ورقہ بن نوفل سے کہا ۔ اَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ کیا میری قوم مجھے نکال دیگی؟ انہوں نے کہا ۔ ہاں ! ضرور نکال دیگی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشگوئی کی طرف پہلے ہی واقف لوگوں کے ذہن منتقل ہو چکے تھے کہ عرب میں ایک عظیم الشان نبی آئیگا جو موسیٰؑ کا مثیل ہوگا ۔ اس کی قوم کے لوگ اُسے اپنے شہر سے نکال دیں گے۔ پھر وہ کسی اور مقام میں پناہ لیگا اور وہاں سے طاقت حاصل کرکے مکّہ فتح کریگا ۔ چنانچہ جب اس پیشگوئی کے ظہور کا وقت آیا تو ابھی آپ مکّہ میں ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ اِنَّ الَّذِیْ

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً

اور تُو کوئی امید نہیں رکھتا تھا کہ تجھ پر ایک مکمل کتاب نازل کی جائیگی - مگر تیرے رب کی طرف سے

مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَا

رحمت کے طور پر ایسا ہوا - پس تُو کافروں کا مددگار کبھی نہ بنیو - اور تجھے کوئی شخص

يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ

اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں تجھ پر اتاری گئیں اُن سے روکنے والا نہ بنے -

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۸﴾

اور تُو اپنے رب کی طرف (لوگوں کو) بلا اور مشرکوں میں شامل نہ ہو - ۴۶ع

فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ یعنی وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن کی اطاعت فرض کی ہے اپنی ذات کی قسم کھاکر کہتا ہے کہ خدا تجھے پھر اس شہر کی طرف واپس لائیگا جس کی طرف لوگ بار بار لوٹ کر آتے ہیں یعنی اب تیری ہجرت کا زمانہ قریب آچکا ہے اور تجھے مکہ سے نکال کر دشمن خوش ہوگا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا مگر تیرا خدا ہجرت سے بھی پہلے خوشخبری دیتا ہے کہ وہ پھر تجھے اس مقام میں واپس لائیگا اور دشمنوں کی جھوٹی خوشیوں کو پامال کردیگا -

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ - فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ تُو ان لوگوں سے کہہ دے کہ جو ہدایت لاتا ہے اُسکو بھی اور جو گمراہی میں پڑا ہوا ہے اُس کو بھی اللہ تعالےٰ خوب جانتا ہے پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہدایت لانیوالا ناکام رہے اور گمراہ لوگ کامیاب ہو جائیں - آخری فیصلہ بہرحال اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے اس لئے ضروری ہے کہ جو ہدایت لیکر آیا ہے وہ کامیاب ہو اور اُس کے دشمن ہلاک ہوں -

۴۶ع **تفسیر** - فرمایا - اے محمد رسول اللہ تیرے واہمہ میں بھی یہ بات کب آسکتی تھی کہ تجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کامل کتاب نازل ہوگی یہ صرف تیرے رب کی رحمت کا ہی تقاضا تھا کہ موسیٰ کی پیشگوئی کے مطابق تجھ پر وہ کتاب نازل کی جاتی جو دنیا کے تمام دکھوں کا درمان ہوتی اور جو قیامت تک آنے والی تمام نسلوں کے لئے اپنے اندر ہدایت اور راہنمائی کا سامان رکھتی - پس اب جبکہ ایسی کامل کتاب ہم نے دنیا میں نازل کردی ہے - اے محمد رسول اللہ کی پیروی کا دم بھرنے والے تُو کبھی کافروں کا مددگار نہ بن -

الکتٰب کا ترجمہ ہم نے کامل کتاب " اسلئے کیا ہے کہ عربی زبان میں جس چیز پر الف لام داخل ہو - اس کے ایک معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ چیز اپنی ذات میں کامل ہے - جیسے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے ایک معنے یہ ہیں کہ حمد اپنے سارے کمال کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے پس یہاں الکتاب کے معنے ہیں جو تمام روحانی ضرورتوں کے سامان اپنے اندر رکھتی ہے -

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ قف

اور (اے مخاطب) اللہ (تعالیٰ) کے سوا کسی معبود کو مت پکار - اُس کے سوا کوئی معبود نہیں -

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ

ہر ایک چیز ہلاک ہونیوالی ہے سوائے اس کے جس کی طرف اُس (یعنی خدا تعالیٰ) کی توجہ ہو - حکم اُسی کے اختیار میں ہے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں بظاہر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا گیا ہے مگر قرآن کریم کا یہ طریق ہے کہ وہ کئی مقامات پر مخاطب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کرتا ہے مگر مراد آپؐ کی امت کے افراد ہوتے ہیں - اسجگہ بھی فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ میں امتِ محمدیہ کے افراد سے خطاب کیا گیا ہے - ورنہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق تو اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ -

(انعام آیت ۱۶۳)

یعنی تو ان لوگوں سے کہدے کہ میری عبادتیں اور میری قربانیاں اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں - جو تمام جہانوں کا ربّ ہے اور اُس کا کوئی شریک نہیں - اور مجھے اسی امر کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوں -

پس اس جگہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادتیں بھی اور آپؐ کی قربانیاں بھی بلکہ آپؐ کی زندگی بھی اور آپؐ کی موت بھی سب خدا کے لئے تھی - اور آپ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کے مصداق تھے - اور نہ نبوت سے پہلے آپؐ نے کبھی شرک کیا اور نہ نبوت کے بعد - تو یہ تصوّر بھی کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آپ کسی وقت کفار کی مدد کرنے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے -

پس فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ کے مخاطب امت محمدیہ کے افراد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اب جب کہ میں نے ایک کامل کتاب نازل فرما کر تمام دنیا کے لئے خیر اور برکت کا سامان مہیا کر دیا ہے اور قیامت تک اب کسی اور شریعت کی ضرورت نہیں رہی تو تمہارے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ تم اس کتاب کے علوم سے غفلت اختیار کرو - اور اس پر عمل کرنے میں تساہل سے کام لو - کیونکہ اگر تم ایسا کروگے تو تم دنیا میں گمراہی پھیلانے کا موجب بن جاؤگے اور اپنے عمل سے کفار کے مددگار ہو جاؤ گے - کیونکہ مومن اور کافر دو مختلف راستوں پر جا رہے ہیں - مومن اس کتاب کو اپنے ہاتھ میں لے کر نکلے گا اور کافر اس کتاب کو مٹانے کی کوشش کریگا - لیکن اگر کسی وقت اس کتاب پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرنے والا ہی اس کتاب کو پس پُشت پھینک دیگا تو وہ کفار کا مددگار ہو جائیگا - پس اے مسلمانو! تم ہمیشہ اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور کبھی کفار کے ان ارادوں میں جو وہ اپنے دلوں میں خدا اور اُس کے رسول کے نام کو مٹانے کے لئے رکھتے ہیں مددگار مت بنو بلکہ ہمیشہ اسکی تعلیم کو پھیلاتے چلے جاؤ -

وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۹﴾ ع

اور (تم سب) اُسی کی طرف لوٹ کر لے جائے جاؤ گے ۵۴۷؎

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ۔ دوسری نصیحت اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ قرآن کریم گو ایک کامل کتاب ہے جس کے بعد کوئی شریعت نہیں مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ نزولِ قرآن کے بعد آیاتِ الٰہیہ کا بھی نزول نہیں ہوگا۔ آیاتِ الٰہیہ کا ہر زمانہ میں مختلف شکلوں میں نزول ہوتا چلا جائیگا کبھی مجددین کی شکل میں۔ کبھی مامورین کی شکل میں اور کبھی معجزات و نشانات اور آسمانی تائیدات کی شکل میں۔ اس لئے جب بھی تم پر خدا تعالیٰ کی آیات نازل ہوں یعنی تمہارے زمانہ میں تمہاری ترقی اور بہتری کے لئے خدا تعالیٰ مختلف نشانات کے آئینہ میں اپنی شکل دکھائے تو اُن پر ایمان لانے کے سلسلہ میں کوئی روک تمہارے راستہ میں حائل نہیں ہونی چاہیئے۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آخری زمانہ میں مسیح موعود آئے اور تمہارے کانوں میں اس کی آواز پہنچے تو تم فوراً اُس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اُس کی طرف دوڑ پڑو۔ خواہ تمہیں گھٹنوں کے بل چل کر ہی اُس کے پاس کیوں نہ جانا پڑے۔

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اور پھر ایمان لانے کے بعد تمہارا کام یہ ہے کہ تم دوسرے لوگوں کو بھی اس نعمت میں شریک کرو۔ اور انہیں خدا تعالیٰ کے مامور پر ایمان لانے کی تحریک کرو۔ اور تبلیغ کے سلسلہ کو وسیع کرو۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اور مشرکوں میں شامل نہ ہو۔ اس جگہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہیں بلکہ آپؐ کی امت سے خطاب کیا گیا ہے۔ ورنہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تو نہ نبوت سے پہلے کبھی شرک کیا تھا اور نہ نبوت کے بعد آپ نے کبھی شرک کیا۔ پس اس آیت کی مخاطب آپ کی جماعت ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ آیاتِ الٰہیہ کا انکار اور تبلیغ میں کوتاہی بھی اپنے اندر شرک کا ہی ایک رنگ رکھتی ہے۔ کیونکہ آیاتِ الٰہیہ کا انکار وہی شخص کرتا ہے جو ڈرتا ہے کہ اگر مَیں نے اپنے ایمان کا اظہار کیا تو لوگ میری مخالفت کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔ اسی طرح تبلیغ سے بھی وہی شخص بھاگتا ہے جو لوگوں کی مخالفت اور ان کی ایذاء رسانی سے گھبراتا ہے اور یہ دونوں چیزیں اپنے اندر شرک کا ایک رنگ رکھتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے نصیحت فرمائی کہ تم مشرکوں میں سے مت بنو۔ دلیری سے آیاتِ الٰہیہ پر ایمان لاؤ۔ اور پھر دلیری سے اُن کی دنیا میں اشاعت کرو۔ اور اپنی نگاہیں ہمیشہ آسمان کی طرف بلند رکھو۔ زمینی لوگوں سے مت ڈرو کہ یہ بھی ایک مخفی شرک ہے۔

۵۴۷ تفسیر:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایک اور اہم نصیحت کرتا ہے۔ فرماتا ہے۔ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ۔ اے مسلمانو! تم اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو اپنا معبود سمجھ کر مت پکارو کیونکہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ چونکہ گذشتہ آیات میں مسلمانوں کو اشاعت اسلام کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور اسلام کے ساتھ سب سے زیادہ ٹکر اور سب سے لمبی ٹکر عیسائیت نے لینی تھی اس لئے قرآن کریم میں عیسائیت کے غلط عقائد کی تردید پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اور مسلمانوں کو بار بار توجہ دلائی گئی ہے کہ تمہیں سب سے بڑا مقابلہ عیسائیت کے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ جو تین خداؤں کی قائل ہے۔ اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم عیسائیت کے مقابلہ میں

مضبوطی سے ڈٹے رہو۔ اور کبھی خدائے واحد کی توحید کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ خدا تعالےٰ کا کوئی شریک نہیں۔ وہ اپنی ذات میں احد یعنی اکیلا ہے۔ اور غیر منقسم ہے۔ اس لئے نہ وہ کسی بیٹے کا محتاج ہے اور نہ روح القدس کا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ بیمار تھے اور ہم آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے آنکھ کھولی اور فرمایا۔ مجھے ابھی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے معنے سمجھائے گئے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے کہ اِس کے یہ معنے ہیں کہ صرف اللہ کی ذات ہی مفرد ہے باقی سب چیزیں مرکب ہیں۔ پس رُوح اور مادہ کے ازلی ہونے کی بحث بالکل لغو ہے۔ رُوح اور مادہ ہرگز مفرد نہیں بلکہ یہ بھی مرکب ہیں۔ اور ان پر خدا تعالےٰ کا ہرگز قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ فنا سے صرف اللہ تعالےٰ کی ذات ہی پاک ہے۔ کیونکہ مفرد پر فنا نہیں آتی۔ فنا ہمیشہ مرکب پر آتی ہے۔ کیونکہ فنا کے معنے ہیں مرکب اجزاء کا الگ الگ ہو جانا۔ اور مفرد کے اجزاء ہی نہیں ہوتے۔ اس لئے اُن کے کسی وقت الگ الگ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ یہی دلیل اللہ تعالیٰ نے اِس آیت کے اگلے ٹکڑے میں بیان کی ہے اور فرمایا ہے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔ دُنیا کی ہر چیز بلکہ ہر مزعومہ معبود بھی ہلاک ہونے والا ہے اور یہ ہلاکت ثابت کرتی ہے کہ کوئی چیز اپنی ذات میں قائم نہیں بلکہ کوئی اور وجود اُسے قائم رکھ رہا ہے

اِس آیت میں ضمنی طور پر وحدتِ وجود والوں کا بھی ردّ کر دیا گیا ہے۔ یہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ دُنیا میں خدا کے سوا اَور کچھ نہیں جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ خدا تعالےٰ کا ہی جلوہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر وہ چیز جو پیدا ہوتی ہے، وہ ہلاک ہوتی ہے اگر یہ سب کچھ خدا ہی خدا ہے تو دنیا کی کوئی چیز تغیّر پذیر نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر اُس کا تغیّر پذیر ہونا بتاتا ہے کہ یہ چیزیں خدا کا حصّہ نہیں ورنہ اگر کسی چیز کے ایک حصّہ میں تغیّر ہو سکتا ہے۔ تو پھر کُل میں بھی تغیّر تسلیم کرنا پڑیگا۔

اِلَّا وَجْهَهٗ میں بتایا کہ صرف وہی بچیں گے جن کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہوگی۔ یہ استثناء اللہ تعالیٰ نے اِس لئے کیا کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ سے یہ شبہ پڑ سکتا تھا کہ شاید جنّت بھی ایک دن فنا ہو جائیگی۔ یا وہ روحانی علوم جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعہ دنیا میں نازل کئے ہیں وہ بھی تباہ ہو جائینگے یا اللہ تعالےٰ کے مقرب بندے بھی ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے۔ اِس شبہ کے ازالہ کے لئے اللہ تعالےٰ نے اِلَّا وَجْهَهٗ کے الفاظ بڑھا دیئے۔ اور بتا دیا کہ کچھ چیزیں اِس ہلاکت سے محفوظ بھی رہیں گی۔ مگر وہ وہی ہونگی جن کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہوگی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کے لئے موت لازمی ہے اور انسانوں میں سے بھی کوئی اس موت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ہاں وہ وہ لوگ جو وَجْهُ اللّٰهِ میں محو ہو کر ایک نئی زندگی حاصل کر لیتے ہیں وہ جسمانی موت سے تو نہیں بچ سکتے لیکن اُن کی رُوحیں ہمیشہ کے لئے زندہ رکھی جائیں گی۔ کیونکہ اُن کی اَرواح کا خدا تعالیٰ کی ذات سے اتصال ہو جاتا ہے۔ اور دُنیا میں ہی خدا نما وجود بن جاتے ہیں۔ جیسے حدیثوں میں آتا ہے کہ بندہ میرے قرب میں اِتنا بڑھتا ہے کہ آخر مَیں اُس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اُس کے پاؤں ہو جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ اور اُس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔ جو اُس پر حملہ کرتا ہے وہ اُس پر نہیں بلکہ خدا پر

حملہ کرتا ہے۔ اور جو اُس کو عزت دیتا ہے۔ وہ اُس کو نہیں بلکہ خدا کو عزت دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ؎

سر سے میرے پاؤں تک وہ یار مجھ میں ہے نہاں
اے میرے بدخواہ کرنا ہوش کرکے مجھ پہ وار

یعنی تم مجھے دیکھتے ہو تو یہ خیال کرتے ہو کہ یہ مرزا غلام احمد ہے۔ اگر ہم نے اس پر حملہ کرلیا تو کیا ہُوا حالانکہ اگر تم حملہ کرتے ہو تو تمہارا حملہ مرزا غلام احمد پر نہیں بلکہ خدا پر ہوتا ہے کیونکہ خدا نے میرے وجود کو اپنا لیا ہے۔

پُرانے زمانہ میں طریق تھا کہ بادشاہ ایک بکرا لے کر اُسے کُھلا چھوڑ دیتے تھے۔ کہ جو اس پر حملہ کریگا وہ ہم پر حملہ کرنے والا سمجھا جائیگا۔ وہ تمام ملک میں آزاد پھرتا تھا اور کوئی اُس کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اور اگر کسی علاقہ میں وہ مارا جاتا تو بادشاہ اُس پر چڑھائی کر دیتا تھا۔ اِسی طرح اللہ تعالےٰ کے بعض بندے اُس کے اِتنے پیارے اور محبوب ہوتے ہیں کہ خدا تعالےٰ اُن پر حملہ اپنی ذات پر حملہ سمجھتا ہے۔ قرآن کریم میں اِسی قسم کا ایک واقعہ حضرت صالح علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی اونٹنی کے متعلق لوگوں میں اعلان کر دیا کہ دیکھنا اِس کو نہ چھیڑنا۔ ورنہ تم اللہ تعالےٰ کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ اِس کا مطلب درحقیقت یہی تھا کہ جس طرح حضرت صالحؑ خدا کے ہو گئے تھے اسی طرح خدا صالحؑ کا ہو گیا تھا جس طرح حضرت صالحؑ کے بغیر خدا ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ اِسی طرح اونٹنی کے بغیر صالحؑ بھی تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ پس جو اونٹنی کو مارتا تھا وہ اس لئے نہیں مارتا تھا کہ وہ ایک اونٹنی ہے بلکہ اِس لئے مارتا تھا کہ صالحؑ تبلیغ نہ کرے۔ اور جو صالحؑ کو مارتا تھا وہ اِس لئے نہیں مارتا تھا کہ صالحؑ اَور افراد کی طرح ایک فرد ہے بلکہ اس لئے مارتا تھا کہ صالحؑ کے ذریعہ خدا تعالیٰ کا چہرہ دنیا پر ظاہر نہ ہو۔ اس لئے جن لوگوں نے اونٹنی پر حملہ کیا۔ انہوں نے اونٹنی پر نہیں بلکہ صالحؑ پر حملہ کیا۔ اور خدا نے انہیں اپنے غضب کا نشانہ بنا دیا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے کہا کہ تم نے اونٹنی کو مار کر صالحؑ کو مارا۔ اور صالحؑ کو مار کر مجھے مارا۔ پس ایسے وجود چونکہ خدا تعالیٰ کے وجود میں ہی شامل ہوتے ہیں۔ اِس لئے اِلَّا وَجْهَهٗ فرما کر ان کا استثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ اور انہیں دائمی حیات کا وارث قرار دے دیا گیا ہے۔

پھر كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ جس چیز میں اللہ تعالیٰ کا وجہہ نظر آتا رہے یعنی وہ اپنی غرضِ پیدائش کو پورا کرتی رہے وہ محفوظ رہتی ہے۔ ورنہ ہلاک ہو جاتی ہے۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ وجودِ باری کو ظاہر کرنے والا ہے اور اس میں خدا تعالیٰ کا چہرہ نظر آتا ہے۔ کسی میں رحمت کا اور کسی میں غضب کا اور کسی میں ربوبیت کا اور کسی میں حفاظت کا اور کسی میں قضا و انصاف کا۔ اگر کہو کہ کیا گندی چیزوں میں بھی خدا کا چہرہ نظر آتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ چہرہ سے مراد ظہورِ صفات ہے ورنہ یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ کا کوئی حقیقی چہرہ ہے۔ اور اِس میں کیا شبہ ہے کہ گندی اور پاک دونوں چیزوں سے خدا تعالیٰ کی صفات کا ظہور ہو رہا ہے۔ صرف ظہور مختلف قسم کا ہے۔ ہاں انسان ایک وقت میں صرف ایک ہی صفت کو نمایاں طور پر ظاہر کر سکتا ہے یا چند صفات ظاہر کر سکتا ہے لیکن اللہ تعالےٰ

ایک ہی وقت میں غضب اور رحم اور باقی سب صفات ظاہر کر رہا ہوتا ہے۔ پس یہ کوئی اعتراض نہیں کہ ایک ہی وقت میں اُس کا چہرہ مختلف آثار کیونکر ظاہر کر رہا ہے۔

پھر فرماتا ہے لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کہاں جا سکتے ہو بادشاہت بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور پھر تم سب نے مر کر پیش بھی اُسی کے حضور ہونا ہے۔ اور جب یہ حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز نے فنا ہونا ہے۔ صرف وہی چیز باقی رہیگی جس کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہوگی اور تمام بادشاہت بھی اُسی کے قبضہ میں ہے تو پھر مشرکوں سے ڈرنے کا کیا فائدہ، جب فنا ہونا ہے تو پھر اُس ذات کے ساتھ انسان کیوں تعلق پیدا نہ کرے جسکی توجہ سے انسان کو دائمی اور ابدی زندگی مل سکتی ہے اور مرنے کے بعد انسان ہمیشہ کا سُکھ پا سکتا ہے۔

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ عنکبوت - یہ سورۃ مکّی ہے

وَهِيَ مَعَ الْبَسْمَلَةِ سَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعَةُ رُكُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ سمیت اِس کی ستّر (۷۰) آیتیں ہیں اور سات رکوع ہیں -

وقتِ تنزیل :— حضرت ابن عباسؓ - ابن زبیرؓ حسن، عکرمہ، عطاء اور جابر بن زید کے نزدیک یہ تمام سورۃ مکّی ہے - یحییٰ بن سلام کے نزدیک اس کی صرف بارہ ابتدائی آیات مدنی ہیں - باقی ساری سورۃ اُن کے نزدیک بھی مکّی ہے - لیکن قتادہ اِسے مدنی قرار دیتے ہیں اور حضرت علیؓ کے نزدیک یہ سورۃ مکّہ اور مدینہ کے درمیان نازل ہوئی تھی - یوروپین مستشرقین میں سے نولڈکے اور وہیری دونوں اسے مکّی قرار دیتے ہیں - البتہ وہ اِس کی ابتدائی دس آیات اور آیت ۴۵ کو مدنی قرار دیتے ہیں -

تعلّق اور ترتیب سورۃ قصص کے آخر میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا تھا کہ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ یعنی اے محمدؐ رسول اللہ کے ساتھیو! ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم رہو - اور دنیا میں اس کی اشاعت کرتے رہو - اور اس بات سے نہ ڈرو کہ مشرکوں کا ملک ہے وہ تم کو تکالیف پہنچائیں گے - اللہ تعالےٰ کے سوا ہر چیز نے فنا ہونا ہے - صرف وہی چیز باقی رہے گی جس کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہوگی - اس لئے مشرکوں سے ڈرنے کا کیا فائدہ - تمہیں اپنا اصل تعلق اللہ تعالےٰ سے رکھنا چاہیئے اور اُسی کی رضا اور خوشنودی کی جستجو کرنی چاہیئے - اب سورۂ عنکبوت کو بھی اِسی مضمون کے تسلسل میں جاری رکھا گیا ہے اور فرماتا ہے کہ بے شک تم چاروں طرف سے مشرکوں میں گھرے ہوئے ہو اور تمہاری مثال اِس وقت ایسی ہے جیسے تیس دانتوں میں زبان ہوتی ہے - مگر تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ایمان کی شان بھی اُسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب دشمنوں کی مخالفت اپنے انتہا کو پہنچ چکی ہو - اگر تم یہ سمجھو کہ تمہیں پھولوں کی سیج پر چلتے ہوئے کامیابی حاصل ہو جائیگی تو یہ تمہاری غلطی ہے - تم نے بیشک اپنی زبانوں سے اپنے ایمانوں کا اظہار کر دیا ہے - لیکن اللہ تعالےٰ چاہتا ہے کہ تمہارا عمل بھی اس ایمان کی شہادت دے اور تم اپنے خون کے نقوش سے اس ہدایت کے اقرار کا ایک عملی ثبوت قیامت تک آنے والے لوگوں کیلئے مہیا کر دو اور یہ مت سمجھو کہ اس قربانی کا صرف تم سے ہی مطالبہ کیا گیا ہے بلکہ پہلے لوگوں سے بھی ایسا ہی مطالبہ کیا گیا تھا - کیونکہ سنّت اللہ یہی ہے کہ اللہ تعالےٰ صرف منہ کے اقرار سے کسی قوم کو انعامات کا حقدار قرار نہیں دیتا بلکہ وہ انہیں آزمائشوں اور امتحانات کی بھٹی میں ڈالتا ہے اور انہیں صبر آزما مصائب کے ایک ہولناک دور میں سے گذارتا ہے تاکہ ان کے ایمانوں کا صدق یا کذب بھی لوگوں پر ظاہر ہو جائے اور لوگوں کو یہ بھی پتہ لگ جائے کہ کس پایہ کا ایمان اللہ تعالےٰ کے حضور مقبول ہوا کرتا ہے -

خلاصۂ مضامین فرماتا ہے - کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف منہ سے اپنے آپ کو مومن کہہ دینے سے اُن کو اللہ تعالےٰ چھوڑ دے گا - وہ اُن کے ایمان کا امتحان لے کر اُن کی حقیقت کو

دنیا پر ظاہر نہیں کرے گا۔ (آیت ۲)

مومنوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اُن سے پہلے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے امتحان میں ڈالا۔ پس اس زمانہ کے مومنوں کو بھی اللہ تعالیٰ ممتاز کرکے چھوڑے گا۔ اور دُنیا پر ظاہر کردیگا کہ وہ صادق ہیں یا جھوٹے۔ (آیت ۴)

پھر فرماتا ہے کہ کیا وہ لوگ جو بدیاں کرتے ہیں یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اُن کو سزا نہیں دیں گے۔ یا وہ کسی نہ کسی طرح ہماری سزا سے بچ جائیں گے۔ اُن کا یہ خیال بالکل باطل ہے۔ ہماری سزا سے بچنے کا طریق یہی ہے کہ انسان توبہ کرے اور ہماری طرف رجوع کرے (آیت ۵)

اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا وقت تو ضرور آئیگا۔ ہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ نیکی کرنا انسان کے اپنے فائدے کیلئے ہوتا ہے خدا کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ جو نیکی کرے گا وہ اپنے فائدہ کے لئے کریگا۔ اور جو بدی کرے گا اس کا نقصان اُسے خود پہنچیگا۔ اللہ تعالیٰ انسان کے اعمال سے بے نیاز ہے۔ (آیت ۶ و ۷)

ہاں بدی اور نیکی کی جزا میں ایک فرق ہے ہم چونکہ رحیم و کریم ہیں۔ اگر کوئی نیکی کرے تو ہم اُس کی نیکیوں کا اعلیٰ سے اعلیٰ بدلہ دیتے ہیں۔ اور اگر لوگوں سے کوئی غلطیاں ہو جائیں تو ہم اُن پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ (آیت ۸)

پھر فرماتا ہے۔ ہم نے انسان کو اپنے والدین سے نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ ہاں اگر وہ توحید کے خلاف کوئی بات کریں تو نہ مانے کیونکہ آخر معاملہ خدا سے پڑنا ہے ماں باپ سے نہیں پڑنا۔ اس لئے جو بات خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہے اُس کو خدا تعالیٰ پر چھوڑے۔ اس میں ماں باپ کی بات نہ مانے۔ (آیت ۹)

پھر بتایا کہ مومنوں کو مرنے کے بعد اعلیٰ مقامات ملیں گے اور اُن کو ہم نیک لوگوں کی جماعت میں داخل کرینگے (آیت ۱۰)

پھر اس سورۃ کی پہلی آیت کے تسلسل میں بتایا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کی وجہ سے اُن کو تکلیف دی جاتی ہے تو وہ انسانوں کی تکلیفوں کو اتنا ہی بُرا سمجھتے ہیں جتنا خدا کے عذاب کو۔ وہ خدا کی رحمت کے دروازہ تک پہنچکر پھر لوٹ جاتے ہیں۔ مومن کو ایسا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ہمت اور استقلال کے ساتھ نیکی پر قائم رہنا چاہیئے۔

پھر فرماتا ہے۔ بُزدل لوگ بُزدلی کی وجہ سے منافق بھی بن گئے ہیں۔ اگر مومنوں کو خدا کی مدد آجائے تو کہتے ہیں ہم بھی تمہارے ساتھ تھے لیکن وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ایمان کا انعام تو خدا نے دینا ہے محمد رسول اللہ نے نہیں دینا۔ اور خدا تو دل کی باتوں کو جانتا ہے۔ محمد رسول اللہ تو نہیں جانتے۔ پس آرام اور ترقی کے راستے کھلے دیکھ کر اپنے متعلق مومنوں کے ساتھ ہونے کا دعویٰ کرنے کا کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ضرور آزمائش میں ڈالے گا۔ یہاں تک کہ دُنیا پر ظاہر ہو جائیگا کہ مومن کونسے ہیں اور منافق کونسے۔ اور اللہ تعالیٰ کا علم قدیم علم واقعہ سے بدل جائیگا۔ تاکہ اس علم کے مطابق اللہ تعالیٰ جو سزا یا جزاء دے اُس پر کسی کو اعتراض کا موقعہ نہ رہے (آیت ۱۱ و ۱۲)

پھر فرماتا ہے کہ کفر انسان کے دل پر ایسا زنگ لگا دیتا ہے کہ خلافِ عقل باتیں کافر کے مُنہ سے نکلنی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کافر کہنے لگ جاتے ہیں کہ اگر تم ہمارے پیچھے چلو تو ہم تمہارے گناہ اُٹھا لیں گے۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے۔ وہ اپنا بوجھ بھی اُٹھائیں گے اور اس قسم کی دھوکا بازی کے بدلہ میں اَور بھی بوجھ اُن پر ڈالا جائیگا کیونکہ انہوں نے یہ بات کہہ کر اَور بھی گناہ کیا ہے۔ (آیت ۱۳ و ۱۴)

اِس کے بعد حضرت نوحؑ کا ذکر شروع کیا ہے۔

جن کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ آئے تھے اور جن کے سلسلہ میں آگے حضرت موسیٰؑ آئے ۔ فرماتا ہے انہوں نے ایک لمبے عرصہ تک دُنیا میں تبلیغ کی لیکن لوگوں نے نہ مانا ۔ آخر خدا تعالےٰ کو انہیں ایک طوفان کے ذریعہ سے تباہ کرنا پڑا ۔ لیکن نوحؑ اور اس کے ساتھیوں کو خدا تعالےٰ نے بچا لیا اور آنے والوں کے لئے ایک نشان بنا دیا ۔ (آیت ۱۵ و ۱۶)

پھر ابراہیمؑ کا ذکر فرماتا ہے اور بتاتا ہے کہ نوحؑ کے واقعہ سے ابراہیمؑ کے زمانہ کے لوگوں نے فائدہ نہ اُٹھایا چنانچہ فرماتا ہے کہ ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی لوگوں نے شرک کرنا شروع کر دیا ۔ اور ابراہیمؑ نے اپنے زمانہ کے لوگوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور خدا تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو ۔ اگر تمہیں کچھ بھی علم ہو تو اس نصیحت پر عمل کرنا تمہارے لئے بہت بہتر ہوگا ۔ تم اتنا تو سوچو کہ تم خدا کو چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہو اور خدا تعالیٰ پر اُن کے بارہ میں افترا باندھتے ہو اور یہ نہیں سمجھتے کہ تم تو اپنی زندگی کے لئے رزق کے محتاج ہو اور تمہارے معبود رزق دینے کی طاقت نہیں رکھتے ۔ رزق اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے جو آسمان سے پانی اُتارتا ہے اور زمین سے غلّہ اُگاتا ہے ۔ پس جو رزق دیتا ہے اُسی کی طرف توجہ کرو اور اُس کی عبادت کرو کیونکہ آخر تم نے اُسی کے پاس جانا ہے ۔

اگر تم اس بات کو نہیں مانو گے تو یاد رکھو کہ پہلی قومیں بھی شرک کرتی آئی ہیں اور تمہیں پتہ ہے کہ اُن کے شرک کا کیا نتیجہ نکلا ۔ میں تو رسول کی حیثیت میں صرف بات پہنچانے کا ذمہ دار ہوں ۔ جبراً کسی کو ایمان دینا میرا کام نہیں ۔ (آیت ۱۷ تا ۱۹)

پھر فرماتا ہے لوگ اتنا غور نہیں کرتے کہ خدائی نظام بھی ایک عرصہ کے بعد لوگوں کے بدلنے کی وجہ سے بدل جاتا ہے ۔ پھر لوگ کس طرح سمجھتے ہیں کہ اُن کے زبردستی ٹھونسے ہوئے نظام ہمیشہ قائم رہیں گے ۔ اور جس نظام یا عقیدہ نے ایک دن بدل ہی جانا ہے اُس کو زبردستی ٹھونسنے کی کیا وجہ ہے ؟ (آیت ۲۰ و ۲۱)

پھر فرماتا ہے ۔ عذاب الٰہی بھی انہی لوگوں پر آتا ہے جو خدا تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق عذاب کے مستحق ہوتے ہیں ۔ اور رحم بھی انہی پر نازل ہوتا ہے جو خدائی تقدیر کے ماتحت رحم کے مستحق ہوتے ہیں ۔ (آیت ۲۲)

پھر فرماتا ہے کہ خدائی تقدیر کا مقابلہ انسان نہیں کر سکتا ۔ اگر خدا کسی قوم کو اونچا کرنا چاہتا ہے تو وہ ضرور اُونچی ہو کر رہے گی ۔ اور اگر کسی کو نیچا کرنا چاہے تو وہ ضرور نیچی ہو کر رہے گی ۔ (آیت ۲۳)

پھر بتایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نشانات اور اُس کی لقاء کے منکر ہوتے ہیں اُن کے اس انکار کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں ۔ اور آخر یہی مایوسی انہیں بڑے بڑے گناہوں پر دلیر کر دیتی ہے ۔ چنانچہ دیکھ لو جب ابراہیمؑ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو خدا تعالےٰ سے تعلق پیدا کرنے کی نصیحت کی ۔ تو اُن لوگوں نے جو خدا تعالیٰ کی لقاء سے مایوس ہونے کی وجہ سے گناہوں پر دلیر ہو چکے تھے ایک دوسرے سے کہا کہ اِسے قتل کر دو ۔ یا آگ میں ڈال کر جلا دو ۔ مگر اللہ تعالےٰ نے ابراہیمؑ کو معجزانہ رنگ میں آگ سے نجات دے دی ۔ (آیت ۲۴ و ۲۵)

اِس کے بعد بتایا کہ بُت پرستی کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں بلکہ صرف اس لئے بُتوں کی پرستش کی جاتی ہے کہ تمام بُت پرستوں کا ایک نقطۂ مرکزی قائم ہو جائے اور اُن کا ایک جتھہ بن جائے ۔ مگر یہ تمام دوستیاں اور تعلقات صرف دنیا کی زندگی تک محدود ہیں آخرت میں یہ لوگ ایک دوسرے پر لعنتیں ڈالیں گے اور اُن کے مزعومہ معبودوں میں سے کوئی اُن کی مدد نہیں کر سکیگا ۔ (آیت ۲۶)

پھر بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جو لوگ ایمان لائے اُن میں سے ایک حضرت لُوطؑ بھی تھے ۔ مگر چونکہ آپکی قوم اُن کی شدید دشمن تھی اِس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اعلان کر دیا کہ مَیں اب اس ملک سے ہجرت کرنے والا ہوں ۔ اور چونکہ انہوں نے خدا کے لئے اپنے وطن کو چھوڑا اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے مُنہ موڑا ۔ اسلئے خدا نے اس اخلاص کو دیکھ کر انہیں اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا کئے یعنی بیٹا بھی ایسا لائق بخشا جو خدا تعالیٰ کا نبی بنا اور پھر پوتا بھی ایسا دیا جو نبوت کے مقام پر فائز ہُوا ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اخلاص کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر دیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہی ہوں اور اسطرح خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں بڑا اجر دیا ۔ اور آخرت میں بھی وہ بڑے درجات حاصل کرے گا (آیت ۲۷ و ۲۸)

پھر لُوطؑ کا ذکر کیا جو ایک ایسی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جو خلاف وضع فطرت افعال کی عادی تھی اور ڈاکے ڈالتی تھی اور پبلک مقامات میں بھی فواحش کے ارتکاب سے احتراز نہیں کرتی تھی ۔ حضرت لُوط علیہ السلام کے سمجھانے پر اُن کی قوم نے یہی کہا کہ اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لاؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو ۔ حضرت لُوطؑ نے خدا تعالیٰ سے دُعا کی کہ خدایا مجھے اس مفسد قوم کے مقابلہ میں اپنی مدد سے سرفراز فرما ۔ (آیت ۲۹ تا ۳۱)

اللہ تعالیٰ نے اِس دُعا کو قبول فرمایا اور قوم لُوطؑ کی تباہی کا فیصلہ کر دیا ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر اس علاقے کے بعض برگزیدہ بندوں کو دی اور وہ لوگ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس انہیں حضرت اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی ولادت کی خوشخبری دینے آئے اور پھر بتایا کہ اللہ تعالیٰ حضرت لُوطؑ کی قوم پر عذاب نازل کرنا چاہتا ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سنکر گھبرا گئے اور فرمانے لگے کہ اُس بستی میں تو لُوطؑ بھی رہتا ہے جو خدا تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ ہے ۔ انہوں نے کہا کہ لُوطؑ اور اُس کے تمام لواحقین اس عذاب سے محفوظ رہیں گے ۔ صرف اُس کی بیوی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ بھی عذاب کا شکار ہوگی ۔ (آیت ۳۲ تا ۳۳)

پھر خدا تعالیٰ کے یہ برگزیدہ بندے حضرت لُوطؑ کے پاس پہنچے ۔ چونکہ انہیں قوم نے بڑی سختی سے غیر قوموں کے افراد سے تعلق رکھنے اور انہیں اپنے ہاں ٹھہرانے اور اُن کی مہمان نوازی کرنے سے منع کیا ہُوا تھا اس لئے جب یہ لوگ آپ کے پاس پہنچے تو حضرت لُوطؑ نے پیش آمدہ مخالفت کا تصوّر کرتے ہوئے تکلیف محسوس کی ۔ انہوں نے کہا کہ اب کسی خوف کی ضرورت نہیں ۔ اللہ تعالیٰ اِس قوم کی تباہی کا فیصلہ کر چکا ہے ۔ چنانچہ عذاب آیا اور وہ لوگ تباہ ہو گئے ۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک عبرت کا نشان قائم کر گئے ۔ (آیت ۳۴ و ۳۵)

اِس کے بعد ہم نے مدین کی طرف شُعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا ۔ مگر اُس قوم نے بھی قومِ لُوطؑ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حضرت شعیب علیہ السلام کا انکار کر دیا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک دل ہلا دینے والے عذاب نے اُن کو پکڑ لیا ۔ اِسی طرح عاد اور ثمود بھی ہلاک کئے گئے ۔ اور قارون اور فرعون اور ہامان بھی موسیٰؑ کی مخالفت کی وجہ سے تباہ ہوئے مگر ان میں سے ہر قوم صرف اپنی ہی نافرمانیوں کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہے ۔ خدا نے اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا ۔ (آیت ۳۶ تا ۴۱)

پھر بتایا کہ مشرک لوگ جو معبودانِ باطلہ کو اپنی جائے پناہ سمجھتے ہیں اُن کی یہ پناہ گاہیں مکڑی کے گھر سے بھی زیادہ کمزور ہوتی ہیں ۔ اور وقت آنے پر اُن کا تمام تار پود بکھر جاتا ہے ۔ کاش! یہ لوگ

اِس حقیقت کو سمجھتے۔ (آیت ۴۲)

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ مشرکین اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے کن کن لوگوں کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں۔ اور انہیں اپنی مدد پر آمادہ کر رہے ہیں۔ مگر اِن کی یہ تدبیریں انہیں کامیاب نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ خدا بڑا غالب اور حکیم ہے۔ (آیت ۴۳)

اور ہم نے اِن واقعات اور امثال کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ لوگ نصیحت حاصل کریں مگر خدا تعالےٰ کی خشیت رکھنے والوں کے سوا اَور کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتا۔ (آیت ۴۴)

اِن لوگوں کو چاہیئے تھا کہ یہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے اور سوچتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک عظیم الشان مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور اس میں مومنوں کے لئے ایک بڑا بھاری نشان ہے یعنی وہ جانتے ہیں کہ جس طرح جسمانی عالم میں یہ زمین و آسمان ضروری ہیں اسی طرح رُوحانی عالم میں بھی عقل کے ساتھ الہام کا وجود ضروری ہے۔ (آیت ۴۵)

فرماتا ہے اے محمدؐ رسول اللہ! لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ یہ ہے کہ تُو قرآن کریم لوگوں کو سُنا اور نماز باجماعت کو دنیا میں قائم کر۔ اِس سے ہر قسم کی بُری اور ناپسندیدہ باتوں کا استیصال ہو جائے گا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اِس ذریعہ سے لوگوں کو ذکرِ الٰہی کا موقعہ ملتا رہے گا۔ جو اپنی ذات میں تمام مقاصد میں سے بڑا مقصد ہے۔ اور اگر اہلِ کتاب سے کبھی بحث کی نوبت آجائے تو اُس وقت قرآنی دلائل کو مدّنظر رکھا کرو۔ اٹکل پچو باتیں نہ کیا کرو۔ ہاں جو اِن میں سے شریر اور ظالم طبع لوگ ہوں۔ انہیں تم الزامی جواب بھی دے سکتے ہو۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اس طرف بھی توجہ دلاتے رہو کہ آپس میں جھگڑنے کا کیا فائدہ؟ تم بھی موحد ہو اور ہم بھی موحد ہیں۔ آؤ ہم دونوں فریق مِل کر خدائے واحد کی توحید دنیا میں پھیلائیں اور شرک کو مٹانے کی کوشش کریں۔ (آیت ۴۶، ۴۷)

پھر بتایا کہ جس طرح موسیٰؑ پر تورات نازل ہوئی تھی۔ اِسی طرح اَب تجھ پر قرآن نازل کیا گیا ہے۔ اور مسلمان اُس کی صداقت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ بلکہ یہودیوں میں سے بھی سعادت مند لوگ اس پر ایمان لا رہے ہیں۔ لیکن جو لوگ ناشکری پر مصر ہیں وہ قرآن کریم کے بیان کردہ مسائل کا انکار کرتے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِس میں تورات اور انجیل کے قصے دوہرائے گئے ہیں۔ حالانکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نزولِ قرآن سے پہلے کسی آسمانی کتاب کی تلاوت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کتابوں کو نقل بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر یہ کسطرح کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے پہلوں کی کہانیاں بیان کر دی ہیں۔ یہ کہانیاں نہیں بلکہ آیاتِ بیّنات ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جن کو قرآنی علم دیا گیا ہے اُن کے سینوں سے اُس کے معارف کے دریا بہہ رہے ہیں۔ مگر ظالم لوگ پھر بھی انکار کرتے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِس پر آسمانی نشانات کیوں نازل نہیں ہوئے؟ فرماتا ہے۔ تمہارا منشاء تو نشان سے عذاب مانگنا ہی ہے اور خدا تعالیٰ ایک دن یہ عذاب بھی لے آئیگا مگر کیا اِن لوگوں کے لئے یہ نشان کافی نہیں کہ تجھ پر ایک کامل کتاب نازل کر دی گئی ہے جو دنیا کے تمام مفاسد کا علاج اور اقوامِ عالم کے لئے رحمت کا پیغام ہے۔ اور مومنوں کے لئے نصیحت کا بڑا بھاری سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ (آیت ۴۸ تا ۵۲)

فرماتا ہے اگر اِس دلیل سے بھی ان کا اطمینان نہ ہو تو تُو انہیں کہدے کہ اب میں اس جھگڑے کا فیصلہ اپنے خدا پر ہی چھوڑتا ہوں۔ وہ زمین و آسمان کے

تمام رازوں کو جانتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ سچّا ہار جائے اور جھوٹا کامیاب ہو جائے ۔ ہلاکت اور بربادی اُنہی لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جو جھوٹ پر ایمان لاتے اور خدا اور اُس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں ۔ (آیت ۵۳)

فرماتا ہے ۔ یہ لوگ تو چاہتے ہیں کہ انکی تباہی کے متعلق جو پہلے خبریں دی گئی ہیں وہ فوراً پوری ہو جائیں لیکن اللہ تعالیٰ غضب میں دھیما ہے ۔ وہ اُن لوگوں کو کچھ ڈھیل دینا چاہتا ہے ۔ مگر انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیوی عذاب جب بھی آیا اچانک آئیگا اور ایک عذاب ایسا بھی آئیگا جو تمام منکرینِ اسلام کا احاطہ کر لیگا ۔ اُسوقت یہ عذاب اُنہیں اوپر سے بھی ڈھانک لیگا اور نیچے سے بھی ۔ نہ اُن کے لیڈر اُن کے کچھ کام آئیں گے اور نہ عوام اپنے لیڈروں کے کام آئیں گے اور اُنہیں کہا جائیگا کہ اب اپنے عملوں کا مزہ چکھو ۔ (آیت ۵۴ تا ۵۶)

پھر فرمایا کہ اے مومنو! اگر کفّار تمہیں دُکھ پہنچاتے ہیں تو تم غیر ممالک میں نکل جاؤ ۔ اور میری عبادت کو دُنیا میں قائم کرو ۔ اور مت ڈرو کہ اگر باہر نکلے تو تم موت کا شکار ہو جاؤ گے ۔ موت سے تو کوئی متنفّس بھی نہیں بچ سکتا ۔ لیکن اگر تم خدا کے لئے مرو گے تو چونکہ تم نے ہمارے پاس ہی آنا ہے ہم تمہیں بہترین انعامات دینگے اور بلند و بالا مکانات عطا کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی ۔ (آیت ۵۷ تا ۵۹)

پھر بتایا کہ اس راہ میں صبر اور توکّل سے کام لینا ضروری ہے ۔ اِس بات سے کبھی نہ گھبراؤ کہ اگر تم نے خدا کے لئے اپنی زندگیاں وقف کیں تو تم کھاؤ گے کہاں سے ؟ تم جانوروں کو دیکھو کیا وہ اپنا رزق اپنے ساتھ اُٹھائے پھرتے ہیں ۔ پھر کس طرح خدا اُن کو رات دن کھلاتا اور ان کی ضروریات کو پوری کرتا ہے پس اگر تم خدا کے ہو جاؤ گے تو وہ تمہیں بھی رزق دیگا ۔ کیونکہ خدا تعالیٰ دعاؤں کو سُننے والا اور اپنے بندوں کے حالات کو خوب جاننے والا ہے ۔ (آیت ۶۰ - ۶۱)

اِس کے بعد بتایا کہ جب تم لوگ توحید کی اشاعت کے لئے نکلو ۔ اور مشرک قوموں سے تمہارا مقابلہ ہو تو تم اُن سے پُوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو بغیر مزدوری کے کس نے بنی نوعِ انسان کی خدمت پر لگا رکھا ہے ۔ کیا تمہارے مزعومہ معبودوں میں سے کسی معبود کا یہ کارنامہ ہے ؟ وہ اسکے جواب میں سوائے اِس کے کچھ نہیں کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہی پیدا کردہ ہے ۔ اب دیکھو کہ وہ اِس اقرار کے باوجود کس طرف کو بہکے جا رہے ہیں ۔

پھر رزق کی فراوانی اور تنگی بھی ایک قانون کے ساتھ وابستہ ہے جس میں کسی غیر معبود کا کوئی دخل نہیں ۔ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے کشائش عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تنگی میں مبتلا کر دیتا ہے ۔ اور یہ رزق کی کمی بیشی بڑی حکمتوں پر مبنی ہے اور اِس کے پیچھے ایک علیم ہستی کا ہاتھ کام کر رہا ہے ۔ (آیت ۶۲ - ۶۳)

پھر فرمایا ۔ اگر ان مشرک لوگوں سے پُوچھو کہ آسمان سے کس نے پانی اُتارا اور کس نے ایک مُردہ زمین کو پھر زندہ کر دیا ہے ۔ کیا یہ طاقت تمہارے کسی معبود میں بھی تھی ۔ تو وہ اِس کے جواب میں کہیں گے کہ اللہ ہی نے ایسا کیا ہے ۔ تو کہدے کہ پھر اس سے ثابت ہُوا کہ اللہ ہی تمام تعریفوں کا مستحق ہے اور جب ہر تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے تو یہ جھوٹے معبود کہاں سے آ گئے جن کا تم ذکر کر رہے ہو ۔ (آیت ۶۴)

پھر بتایا کہ علمی رنگ میں تو ان پر حجت تمام ہو چکی ہے ۔ مگر اس کے باوجود جو انہیں اپنے غلط عقائد پر اصرار ہے تو صرف اِس لئے کہ خدا کو مان کر دُنیا چھوڑنی پڑتی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۱﴾

(مَیں اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

الٓـمّٓ ﴿۲﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ

مَیں اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ کیا اس زمانہ کے لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُن کا یہ کہہ دینا کہ ہم

یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۳﴾ وَ لَقَدۡ فَتَنَّا

ایمان لے آئے ہیں (کافی ہوگا) اور وہ چھوڑ دیے جائینگے اور اُن کو آزمایا نہ جائیگا، حالانکہ جو لوگ اِن سے پہلے

الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ

گذر چکے ہیں اُن کو ہم نے آزمایا تھا (اور اب بھی وہ ایسا ہی کریگا) سو اللہ (تعالیٰ) ظاہر کر دیگا اُنکو بھی جنہوں نے

ہے۔ اور دنیا چھوڑنے کے لئے اُن کا دل نہیں چاہتا حالانکہ یہ دنیوی زندگی لہو اور لعب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ اصل زندگی وہی ہے جو اگلے جہان میں حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور وہ کشتی بھنور میں پھنس جاتی ہے۔ تو انہیں اپنے تمام دیوتا بھول جاتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی عقیدت کو مخصوص کرتے ہوئے وہ اُسے پورے درد اور سوز کے ساتھ پکارتے ہیں۔ لیکن جب کشتی بھنور میں سے نکل جاتی ہے تو پھر شرک کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اور ہمارے انعامات کا انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن ایک دن ایسا ضرور آئیگا جبکہ وہ اپنے اعمال کی جزاء اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور انہیں معلوم ہو جائیگا کہ انہوں نے توحید کا انکار کر کے کتنی بڑی غلطی کی۔ (آیت ۶۵ تا ۶۷)

پھر فرمایا۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے مکہ مکرمہ کو کیسی پُر امن بستی بنایا ہے۔ اس کے اردگرد کے علاقہ میں قتل و خونریزی اور فساد کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ مگر مکہ کے رہنے والوں پر کوئی انگلی تک نہیں اُٹھاتا۔ پھر کیوں یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے احسان کو دیکھنے کے بعد بھی باطل کی طرف جھکتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا انکار کرتے ہیں جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صورت میں انہیں عطا کی گئی ہے۔

انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں بڑے ظالم دو ہی شخص ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو خدا پر افتراء کرے اور دوسرا وہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے رسول کی تکذیب کرے اور یہ دونوں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مگر وہ لوگ جو ہمارے قرب کی اپنے دلوں میں سچی خواہش رکھتے ہیں اور اس کے لئے متواتر جد و جہد اور قربانی اور ایثار سے کام لیتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب کی غیر متناہی راہوں کی طرف بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کنارِ عاطفت میں آجاتے ہیں یہی سلوک اب بھی ہوگا۔ اور محسنوں کو اللہ تعالیٰ کی

صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴﴾

سچ بولا اور اُن کو بھی جنہوں نے جھوٹ بولا۔ ۵؎

معیّت نصیب ہوگی۔ اور کفّار ناکامی و نامرادی کی آگ میں جلتے رہیں گے۔ (آیت ۶۸ تا ۷۰)

۵؎ **تفسیر**:۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں لکھا جا چکا ہے کہ الٓمّٓ تین حروفِ مقطعات سے مرکب ہے۔ اَلِف اَنَا کا قائم مقام ہے لَ اللّٰہ کا اور مَ اَعْلَمُ کا۔ اور اِن حروف کے معنے یہ ہیں کہ مَیں اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے حروفِ مقطعات درحقیقت سوٗر کے آنے والے مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اسجگہ بھی فرمایا گیا ہے کہ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف اُن کے مُنہ کے اِن دعووں کی وجہ سے کہ وہ ایمان لے آئے ہیں اُن کو آزاد چھوڑ دیا جائیگا اور اُنکی آزمائش نہیں کی جائیگی۔ اب بظاہر یہ آیت الٓمّٓ کے مضمون کے خلاف معلوم ہوتی ہے کیونکہ الٓمّٓ کے معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے۔ اور یہ آیت بتاتی ہے کہ جب تک آزمائش میں ڈال کر مومنوں کے ایمان کی حقیقت نہ کھولی جائے۔ صرف مونہہ سے یہ کہہ دینا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں کافی نہیں ہوتا۔ گویا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو آزمائشوں میں ڈال کر اُن کے ایمان کے متعلق صحیح علم حاصل کرے۔ لیکن درحقیقت اگر غور کیا جائے۔ تو اِن دونوں معنوں میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں کیونکہ گو اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے لیکن نہ کافر اس بات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ کمزور مومن کہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے۔ خدا تعالیٰ چونکہ وراء الوراء ہے اور اس کا علم بھی وراء الوراء ہے جب تک ظاہری آثار ظاہر نہ ہوں۔ لوگوں کو اس بات پر یقین نہیں آتا۔ اِسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ گو ہم تو جانتے ہیں لیکن ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ بنی نوع انسان کی بھی تسلی ہو اور اُن کو بھی معلوم ہو کہ کون مومن ہے اور کون غیر مومن۔ اِس لئے اگر کوئی شخص منہ سے ایمان کا دعویٰ کرے تو ہم اس پر خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ بار بار ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کی آزمائش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ سب دنیا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ گروہِ مومنین جس کو خدا تعالیٰ نے چنا تھا واقعہ میں مومن ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۔ پھر مثال دیتا ہے کہ یہ طریق ہم نے آج ہی اختیار نہیں کیا بلکہ پہلے زمانہ کے لوگوں کو بھی مختلف قسم کی آزمائشوں میں ڈالا گیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ لوگوں کے دلوں کے مخفی یقین اور ایمان کو دوسروں پر ظاہر کرے۔

اسجگہ عِلْم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور اِس کے ظاہری معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آزمائش کے ذریعہ جان لے گا۔ کہ کون مومن ہے اور کون منافق۔ اِس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تو ازلی ہے اور وہ ہمیشہ سے ہر واقعہ کو جانتا ہے خواہ وہ آدمؑ کے وقت ہوا ہو یا قیامت کے دن ہونے والا ہو۔ پھر ایسا کیوں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آزمائش کے ذریعہ سے جان لے گا کہ کون مومن ہے اور کون منافق۔ سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ علمِ الٰہی دو قسم کا ہے۔ ایک کسی چیز کے واقعہ ہونے سے پہلے کا اور ایک واقعہ ہونے کے بعد کا

جو وقوعہ سے پہلے کا علم ہے وہ بھی سچا ہے لیکن مجرم کو اُس کی بناء پر سزا دی جائے یا اچھا کام کرنے والے کو انعام دیا جائے تو اُس کی تسلّی نہیں ہوتی۔ اُس کو شک رہتا ہے کہ میری سزا یا انعام ٹھیک تھا یا غلط۔ لیکن وقوعہ کے بعد کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اور اس کو سزا یا جزاء کے حق ہونے کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

قرآن کریم نے اس آیت میں جو لَیَعْلَمَنَّ فرمایا ہے اس کے یہی معنے ہیں کہ ہم اپنے علمِ قدیم کو علمِ واقعہ سے بدل دیں گے۔ یعنی مومنوں کو ایسے حالات میں سے گذرنے دیں گے کہ اُن پر بھی اور اُن کے ساتھیوں پر بھی یہ بات کھل جائیگی کہ وہ سچے مومن تھے۔ اور کفار کو بھی اِس اعتراض کا موقعہ نہیں ملیگا کہ اِن کو یونہی انعام مِل گیا ہے یہ اس کے مستحق نہ تھے۔ پس درحقیقت لَیَعْلَمَنَّ کے معنے ظاہر کر دینے کے ہیں۔ یعنی صادق مومنوں کا جب صدق ظاہر ہو جائے گا اور باوجود ابتلاؤں کے وہ ثابت قدم رہیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے علمِ ازلی کو علمِ واقعہ سے بدل دے گا۔ کیونکہ علمِ ازلی تو خدا کو ہے مگر بندے تو نہیں جانتے کہ ایسا ہو گا۔ بندے اس وقت جانتے ہیں جب کوئی بات وقوع میں آجائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے جانتا ہے کہ زید فلاں مہینہ میں فلاں دن مریگا لیکن بندوں کو تو معلوم نہیں اور نہ خدا تعالیٰ کے مخفی علم کی وجہ سے اُن کو اس علم پر تسلّی ہو سکتی ہے۔ ہاں جب خدا تعالیٰ کا ازلی علم واقعہ میں بھی ظاہر ہو جائے اور مقررہ مہینہ کے مقررہ دن وہ شخص مر جائے تو پھر دنیا کے لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ واقعہ میں وہ مر گیا ہے اِسی کی طرف لَیَعْلَمَنَّ کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ تو ہمیشہ سے جانتا ہے کہ کون مومن ہے اور کون نہیں مگر بندے نہیں جانتے اور جب تک اللہ تعالےٰ کا ازلی علم وقوعہ سے نہ بدل جائے وہ شک میں رہتے ہیں۔ پس اللہ تعالےٰ طرح طرح کے فتنوں میں ڈال کر جب کہ مومن اپنے ایمان پر قائم رہتے ہیں دنیا کو یہ یقین دلا دیتا ہے کہ یہ سچے مومن ہیں۔ اور اگر ابتلاء کے موقعہ پر کوئی پھسل جائے تو خدا تعالیٰ کا ازلی علم جو اُس کے جھوٹے ہونے کے متعلق تھا علمِ وقوعہ میں بدل کر دوسرے انسانوں کو بھی یقین دلا دیتا ہے کہ وہ کمزور ایمان والا تھا اور اس طرح خدا تعالےٰ کے سلوک پر کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے قاعدۂ کلیہ کے طور پر یہ امر بیان فرمایا ہے کہ دعویٰ ایمان اور ابتلاء و آزمائش لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ مومنوں کو صرف ان کے دعویٰ ایمان کی وجہ سے ہی کامل مومن سمجھ لیا جائے اور انہیں آزمائشوں اور ابتلاؤں کی بھٹی میں نہ ڈالا جائے۔ اِس طرح نہ پہلے کبھی ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو گا۔ چنانچہ دیکھ لو جن لوگوں نے کسی زمانہ میں بھی سچا دین قبول کیا اُن کے لئے فوراً ہی آرام اور سُکھ کا راستہ نہیں کھولا گیا۔ بلکہ پہلے پہل تو یہی ہوا کہ جو کچھ اُن کے پاس تھا وہ بھی انہیں دینا پڑا۔ اگر کچے گھروں والے تھے تو دین قبول کرنے کے بعد بجائے اِس کے کہ اُن کے محل بن جاتے وہ گھر بھی انہیں چھوڑنے پڑے۔ اگر قوموں میں معزز تھے تو دین قبول کرنے کے بعد بجائے اِس کے کہ بادشاہ اور حکمران بن جاتے انہیں پہلی عزتیں بھی چھوڑنی پڑیں۔ اگر مالدار تھے تو دین قبول کرنے کے بعد بجائے اِس کے کہ اُن کا مال دُگنا۔ چوگنا۔ بیس گنا اور ہزار گنا ہو جاتا انہیں اپنا پہلا مال بھی ترک کرنا پڑا۔ اگر لوگوں سے تعلقات تھے تو دین قبول کرنے کے بعد بجائے اِس کے کہ اُن کے تعلقات وسیع ہو جاتے وہ بھی کٹ گئے۔ غرض جو راحت۔ آرام۔ عزت۔ دولت۔ طاقت اور رسوخ انہیں پہلے حاصل تھا۔

وہ بھی جاتا رہا۔ اور بجائے فوراً سکھ ملنے کے بظاہر انہیں دُکھ ملا۔ یہاں تک کہ خدا کے لئے انہیں اپنے وطنوں کو بھی چھوڑنا پڑا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے رہنے والے تھے۔ مگر انہیں لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے فلسطین جانا پڑا۔ حضرت نوح علیہ السلام آئے تو انہیں بھی اپنا مقام چھوڑنا پڑا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تو انہیں بھی اپنے گھر بار سے جُدا ہونا پڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو اُن کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ اس کے بعد ہمارے نزدیک تو وہ صلیبی موت سے بچ کر کشمیر کی طرف چلے گئے۔ اور غیر احمدیوں کے نزدیک آسمان پر چلے گئے۔ پھر اُن کی جماعت پر مظالم ہوئے۔ تو وہ جزیرہ سائپرس میں چلے گئے پھر مظالم ہوئے تو وہ روما چلے گئے۔ پھر بھاگے تو مصر میں آئے۔ مصر میں مظالم ہوئے تو پھر روما بھاگ گئے۔ پھر روما میں مظالم ہوئے تو صقلیہ میں آگئے۔ اِس طرح متواتر تین سو سال تک اس جماعت کو اپنے مرکز بدلنے پڑے۔ اِسی طرح بنی اسرائیل پر بخت نصر کے حملہ کے موقعہ پر اتنی عظیم الشان تباہی آئی کہ اُن کے تمام مقدس مقامات گرا دیئے گئے۔ شہر مٹا دیئے گئے۔ اور ساری قوم کو پکڑ کر غلام بنا دیا گیا۔ یہ کتنا بڑا ابتلاء ہے کہ کوئی شخص بھی آزاد اور حریت یافتہ نہ رہا۔ قوم غلام بن گئی۔ معبد گرا دیا گیا متبرک مقامات مٹا دیئے گئے۔ شہروں کو آگ لگا دی گئی۔ اور تمام فلسطین اور شام کے حصے ویرانہ بن کر رہ گئے۔ مگر اِس کے باوجود اُن کی کوشش اور جد وجہد برابر جاری رہی۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی اِس کا ذکر آتا ہے[1] جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک نبی ایک مُردہ بستی کے پاس سے گذرا اور اُس نے کہا کہ خدایا یہ مُردہ بستی دوبارہ کس طرح زندہ ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں کشف میں سو سال کا نظارہ دکھایا اور بتایا کہ سو سال کے بعد میں پھر اسے زندہ کر دوں گا۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی یہ شبہ دُور کرنے کے لئے کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں۔ کہ میں واقعہ میں سو سال سوتا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا دیکھ لو تمہارا گدھا بھی زندہ ہے اور کھانا بھی سلامت ہے۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ ایک کشفی نظارہ ہے جو تمہیں دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ جس طرح رؤیا میں بتایا گیا تھا عین سو سال کے بعد فارس اور میدیا کا بادشاہ جس کا نام سائرس تھا بابل پر حملہ آور ہوا اور چونکہ اندر کے قلعوں تک پہنچنا اُس کے لئے مشکل تھا۔ اُس نے پیغام رسانی کی اور یہود کو اپنے ساتھ ملانا چاہا۔ اُس وقت کے انبیاء نے یہود کو اُس بادشاہ کے ساتھ ملنے کی اجازت دے دی۔ اِس کا بھی قرآن کریم میں ذکر آتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا گذرا ہے جس میں بعض انبیاء کے حکم کے ماتحت یہودیوں نے خفیہ سوسائٹیاں بنائیں جن میں صرف مرد شامل کئے جاتے تھے عورتیں شامل نہیں کی جاتی تھیں[2] یہ اُس زمانہ کا واقعہ ہے جس میں انبیاء نے یہ فیصلہ دیا کہ یہود بادشاہ کے ساتھ مل جائیں چنانچہ انہوں نے خفیہ کوششیں کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب فارس اور میدیا کا بادشاہ حملہ آور ہوا تو اندر سے یہود نے بغاوت کر دی اور اُن کی مدد سے بادشاہ کو فتح حاصل ہوئی۔ اور اُس نے اعلان کر دیا کہ یہود کو اپنے شہروں میں بسنے اور پھر دوبارہ اپنے معابد اور مقدس مقامات وغیرہ بنانے کی اجازت ہے۔ بلکہ اُس نے یہ بھی کہا کہ اس پر جس قدر روپیہ خرچ ہو وہ سرکاری خزانہ میں سے دیا جائے[3] یہ وہی واقعہ ہے

[1] دیکھو سورہ بقرہ آیت ۲۶۰ -

[2] دیکھو سورہ بقرہ آیت ۱۰۳

[3] ہسٹورینز ہسٹری آف دا ورلڈ جلد ۲ صفحہ ۱۲۶

جوآیت مَاکَفَرَ سُلَیْمَانُ کے دوسرے حصہ میں بیان ہُوا ہے۔ پہلے حصہ میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ یہودی لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بھی مخفی کارروائیاں کرتے ہیں۔ اور اُن کا خیال ہے کہ جیسے مید اور فارس کے بادشاہ کے ساتھ مل کر انہوں نے نینوہ کی حکومت کو تباہ کر دیا تھا اِسی طرح اب بھی وہ کسریٰ کے ساتھ مل کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تباہ کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ تم نے دو دفعہ خفیہ سوسائٹیاں بنائی ہیں ایک دفعہ حضرت سلیمان کے زمانہ میں اور دوسری دفعہ نجمی اور زکریاہ کے زمانہ میں۔ پہلی دفعہ جب تم نے خفیہ سوسائٹی بنائی تو خدا کا نبی تمہارے مقابلہ میں تھا اور تم اُس کے مخالف تھے۔ اور دوسرے موقعہ پر اللہ تعالےٰ کے انبیاء ہاروت اور ماروت تمہارے ساتھ تھے۔ یہ درحقیقت اُن انبیاء کے صفاتی نام ہیں جو بنی اسرائیل کی جلاوطنی کے زمانہ میں اُن کو واپس لانے پر مقرر ہوئے تھے۔ ھاروت ھرت سے نکلا ہے جس کے معنے پھاڑنے کے ہیں۔ اور ماروت مرت سے نکلا ہے جس کے معنے توڑ دینے کے ہیں (تاج العروس) گویا اُن کا کام حکومت کو پھاڑنا اور طاغوتی طاقتوں کو توڑنا تھا۔ اِن دو مثالوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ایک نبی کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے تو تم ہارے اور جب انبیاء تمہارے ساتھ رہے اُسوقت تم اپنے مخفی منصوبوں میں کامیاب ہوئے۔ اب تمہیں غور کرنا چاہیئے کہ تمہارے مقابلہ میں مدعی نبوت ہے یا تمہارے ساتھ مدعیٔ نبوت ہے۔ اگر تو وہ تمہارے مقابلہ میں ہے تو تمہاری کوششیں ایسی ہی ہیں جیسی تم نے سلیمانؑ کے وقت میں کیں اور اگر یہ مدعیٔ نبوت تمہارے ساتھ ہے تو پھر بے شک تمہاری مثال ایسی ہو سکتی ہے جیسے خورس کے حملہ کے وقت ہاروت اور ماروت کے زمانہ میں کوششیں کی گئیں۔ اور چونکہ اِس وقت خدا تعالیٰ کا نبی تمہارے مقابلہ میں ہے اِس لئے تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ تمہارے ساتھ وہ واقعہ گذرے گا جو سلیمان کے وقت ہُوا۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں یہود بالکل تباہ ہو گئے۔

غرض اُس وقت بنی اسرائیل پر ایسی تباہی آئی تھی کہ انبیاءُ تک بھی حیران تھے کہ اب یہ قوم دوبارہ کس طرح زندہ ہو گی۔ چنانچہ حزقیل نبی نے یہی کہا تھا کہ خدایا تُو اِس کو کِس طرح زندہ کریگا؟ اِس پر اللہ تعالےٰ نے بتایا کہ سَو سال کے بعد یہ قوم پھر زندہ ہو جائیگی۔ تو اللہ تعالےٰ کے انبیاء کی جماعتوں پر یہ اوقات ہمیشہ آئے اور درحقیقت یہی اوقات اس کے دعویٰ ایمان کے صدق اور کمال پر دلالت کرتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو بھی سالہا سال تک ایسی تکالیف میں سے گذرنا پڑا جو انتہائی درد انگیز تھیں۔ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دس صحابہؓ کی ایک جماعت ایک جگہ بھیجی مگر ان لوگوں نے جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے دھوکہ دے کر اُن پر حملہ کر دیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ لوگ اب اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔ تو انہوں نے کہا خدا کی قسم ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے تم نیچے اُتر آؤ۔ (وہ اُس وقت ایک پہاڑی ٹیلے پر چڑھے ہوئے تھے) اُن کے لیڈر نے کہا۔ مَیں اِن کی باتوں پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ جھوٹے اور دھوکا باز ہیں۔ اِن کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ چنانچہ وہ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ مگر باقیوں نے سمجھا کہ جب یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے ہیں کہ ہم کچھ نہیں کہیں گے تو ہمیں اِن پر اعتبار کرتے ہوئے نیچے اُتر آنا چاہیئے۔ جب وہ نیچے اُترے تو انہوں نے رسّیاں باندھ کر انہیں گھسیٹنا شروع کر دیا۔ اِس پر اُن لوگوں نے پھر مقابلہ کیا مگر وہ کیا کر سکتے تھے باقیوں کو تو انہوں نے مار دیا لیکن دو کو پکڑ کر مکّہ لے گئے اور ان لوگوں کے ہاتھ میں

انہیں بیچ دیا جن کے بعض آدمی مسلمانوں سے مارے گئے تھے اُن میں سے ایک کو قتل کرنے سے پہلے مکّہ کے لوگوں نے پُوچھا کہ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اِس وقت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تمہاری جگہ پر یہاں ہوتے اور تم اپنے بیوی بچوں میں مدینہ میں آرام سے بیٹھے ہوئے ہوتے۔ اُس نے جواب دیا خدا کی قسم تم تو یہ کہتے ہو کہ مَیں مدینہ میں آرام سے بیٹھا ہُوا ہوتا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہاں میری جگہ ہوتے۔ مَیں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آرام سے بیٹھے ہوں اور آپ کے پاؤں میں کانٹا تک چبھے۔

پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک قبیلہ کا رئیس آیا۔ اور اُس نے کہا میری قوم اسلام لانے کے لئے تیار ہے۔ آپ میرے ساتھ کچھ آدمی بھجوا دیں۔ وہ تو اپنی اس بات میں سچا تھا اور بعد میں ایمان بھی لے آیا مگر اُس کی قوم نے غدّاری کی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس پر اعتبار کرتے ہوئے ستّر حفّاظ کا قافلہ اُس کی قوم کی طرف روانہ کر دیا۔ جب وہ اس قبیلہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے اُس رئیس کے بھتیجے کے پاس ایک آدمی کے ذریعہ پیغام بھجوا دیا کہ ہم لوگ آگئے ہیں۔ اب ہمیں بتایا جائے کہ ہمارا کیا کام ہو گا۔ اُس نے اُن کے سردار کو بلوایا۔ اور جب وہ اُن سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس رئیس نے ایک شخص کو اشارہ کیا جس نے پیچھے سے اس صحابیؓ کی گردن میں نیزہ مارا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ جب اُسے نیزہ لگا۔ تو تاریخ میں لکھا ہے کہ اُس نے نعرہ لگایا اور کہا فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَةِ۔ کعبہ کے ربّ کی قسم میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا پھر وہ اکٹھے ہو کر تمام صحابہؓ پر ٹوٹ پڑے۔ انہی لوگوں میں حضرت ابوبکرؓ کا وہ غلام بھی تھا جو ہجرت کے وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ جب ہزاروں آدمیوں کے ہجوم نے اُن ستّر صحابہؓ پر حملہ کر دیا تو یہ لازمی بات تھی کہ انہوں نے مارا جانا تھا۔ چنانچہ وہ سارے کے سارے وہیں قتل ہو گئے۔ اور اُن میں سے کسی نے بھی ہتھیار نہ ڈالا۔ یکے بعد دیگرے جب وہ لوگ مرتے یا کسی کو خنجر لگتا یا تلوار سے کسی کا سر کٹتا تو یہی الفاظ اُنکی زبان پر ہوتے کہ فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَةِ خدائے کعبہ کی قسم میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ایک شخص کہتا ہے کہ مَیں اسلام سے واقف نہیں تھا۔ مَیں باہر سے آیا تھا۔ اور قبیلہ والوں کے ساتھ مل کر لڑائی میں شامل ہو گیا تھا مَیں نے جب دیکھا کہ یہ لوگ مرتے وقت بجائے یہ کہنے کے کہ ہائے اماں یا ہائے ابّا یہ کہتے ہیں کہ فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَةِ۔ کعبہ کے ربّ کی قسم مَیں کامیاب ہو گیا تو مجھے حیرت آئی کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ کیا موت میں کامیابی ہُوا کرتی ہے؟ آخر مَیں نے ایک شخص سے اِس بارہ میں پوچھا۔ اُس نے کہا تم مسلمانوں کو نہیں جانتے یہ ایسے ہی پاگل ہیں۔ اِن کا خیال ہے کہ جو شخص خدا کی راہ میں مارا جاتا ہے وہ سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے دل میں نیکی تھی وہ کہتا ہے مَیں نے جب یہ بات سُنی تو سمجھا کہ اِس میں ضرور کوئی راز ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ مَیں نے اسلام کی تحقیق کی۔ اور مَیں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا۔ غرض یکے بعد دیگرے ان لوگوں نے موت کو قبول کیا اور موت میں ہی اپنی ساری کامیابی سمجھی۔ یہی چیز تھی جس کی وجہ سے وہ قلیل ترین عرصہ میں ساری دُنیا پر غالب آگئے اور ایسی شان سے غالب آئے کہ اِس کی مثال پہلی کسی قوم میں نہیں ملتی۔ پھر دیکھو مصائب کا یہ سلسلہ جلدی ختم نہیں ہو گیا بلکہ ایک لمبے عرصے تک جاری رہا۔ خلافت قائم ہوئی تو حضرت عمرؓ شہید ہوئے۔ حضرت عثمانؓ شہید ہوئے۔ حضرت علیؓ شہید ہوئے اور کربلا کے

میدان میں تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا قریباً سارا خاندان ہی شہید ہو گیا۔ بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ابتلاء صرف ابتدائی زمانہ میں آتے ہیں۔ ترقی کے زمانہ میں ابتلاؤں کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔ مگر یہ درست نہیں انبیاء کی جماعتوں کی ترقی اور ابتلاء یہ دو توام بھائی ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ ابتدائی سے ابتدائی زمانہ میں بھی ابتلاء آتے ہیں۔ اور ترقی کے انتہائی زمانہ میں بھی ابتلاء آتے ہیں۔ اس طرح ابتداء سے انتہا تک ابتلاؤں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب نبی ایک منفرد وجود ہوتا ہے اور اُس پر صرف ایک یا دو آدمی ایمان لانے والے ہوتے ہیں۔ اُسوقت بھی ابتلاء آتے ہیں اور انتہائی عروج کے وقت جب سلسلہ کو ترقی پر ترقی حاصل ہو رہی ہوتی ہے اُسوقت بھی ابتلاء آتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پہلے دن بھی مصائب ومشکلات میں سے گذرنا پڑا اور آپؐ کو اور آپؐ پر ایمان لانے والوں کو مختلف قسم کے ابتلاء پیش آئے اور اس کے بعد جب ترقیات کا زمانہ آیا اُس وقت بھی ان ابتلاؤں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ نہیں ہوا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں کسی دن اس خیال کے ساتھ سوئے ہوں کہ اب تمام مشکلات پر قابو پا لیا گیا ہے۔ اور وہ تمام مسائل جو مسلمانوں کی ترقی کے ساتھ تعلق رکھتے تھے حل ہو چکے ہیں۔ نہ حضرت ابوبکرؓ نے کبھی ایسا خیال کیا۔ نہ حضرت عمرؓ نے کبھی ایسا خیال کیا۔ نہ حضرت عثمانؓ نے کبھی ایسا خیال کیا۔ اور نہ ہماری جماعت کو کبھی ایسا خیال کرنا چاہیئے۔ یہ چیزیں الٰہی سلسلوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور کبھی کوئی روحانی جماعت ان کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ان قربانیوں کی نوعیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ یعنی ہم ضرور تم کو کسی قدر خوف اور بھوک اور اموال اور جانوں اور پھلوں کے نقصان کے ذریعہ آزمائیں گے اور اے ہمارے رسول تُو ان لوگوں کو جو ان ابتلاؤں کے اوقات میں اپنے راستہ سے ہٹیں نہیں اور مضبوطی سے دین کی راہ میں قربانیاں کرتے چلے جائیں ہماری طرف سے بشارت اور خوشخبری دے دے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ غرض جب تک کوئی قوم مرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ وہ زندہ نہیں ہو سکتی کیونکہ زندگی موت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ جبتک دانہ مٹی میں نہیں ملتا شگوفہ نہیں نکلتا۔ بچہ پیدا نہیں ہوتا جب تک رحم کی تاریکیوں میں سے نہیں گذرتا۔ اسی طرح کوئی قوم بھی ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ ایک موت اختیار نہ کرے۔

ہماری جماعت میں سے بھی بعض لوگ اس سلسلہ میں داخل ہونے کی وجہ سے کابل میں شہید کئے گئے اور بعض کو اپنے وطن چھوڑنے پڑے لیکن انہوں نے صداقت کو نہ چھپایا اور ایسا تو شاید ہی کوئی انسان ہو جس کو کسی قسم کا بھی دُکھ نہ دیا گیا ہو۔ اگر اور کچھ نہیں تو فتوئے کفر کے ذریعہ ہی اُسے ڈرانے کی ضرور کوشش کی گئی۔ بہر حال اللہ تعالےٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو پہلے ابتلاؤں کے دریاؤں میں سے گذارتا ہے تب انہیں اپنے قرب سے مشرف کرتا ہے۔ یہ بزدلوں اور منافقوں کا کام ہوتا ہے کہ وہ مصائب کے آنے پر گھبرا جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے سورۂ بقرہ کے ابتداء میں ہی منافق کی یہ علامت بیان فرمائی ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ ٹھہر جاتا ہے اور جب آرام اور راحت کا وقت آتا ہے تو چل پڑتا ہے۔ مومن وہ ہوتا ہے جو مصائب کے وقت اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے

چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقعہ پر جب مسلمانوں سے کہا گیا کہ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اور وہ تمہیں مارنے کی فکر میں ہیں۔ تو انہوں نے کہا۔ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (احزاب آیت ۲۳) یعنی یہ تو وہی لشکر ہیں جن کا اللہ اور اُس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ ان لشکروں سے ہمارے ایمان متزلزل کیوں ہونگے۔ وہ تو اَور بھی بڑھینگے اور ترقی کرینگے۔ پس ایسے امور سے مومنوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے مدارج کو بلند کرنے کے سامان پیدا کر رہا ہے ہم میں سے کون ہے جس نے ایک دن مرنا نہیں مگر ایک موت کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ طبعی موت ہوتی ہے۔ اور دوسری موت کے متعلق فرماتا ہے کہ ایسے مرنے والے ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں۔ بلکہ فرماتا ہے۔ تم ان کو مُردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو رزق مل رہا ہے یعنی اُن کی روحانی ترقیات کے سامان متواتر ہوتے چلے جائیں گے۔ دشمن تو یہی چاہتا ہے کہ وہ مومنوں کو مٹا دے اور انہیں غمگین بنا دے مگر جب وہ دیکھتا ہے کہ انہیں مارا جاتا ہے تو یہ اَور بھی زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں خدا نے ہماری ترقی کے کیسے سامان پیدا کئے ہیں۔ تو اس کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جب سیالکوٹ تشریف لے گئے تو مولویوں نے یہ فتویٰ دیدیا کہ جو شخص مرزا صاحب کے پاس جائیگا یا اُن کی تقریروں میں شامل ہوگا۔ اُس کا نکاح ٹوٹ جائیگا۔ یہ کافر اور دجال ہیں ان سے بولنا ان کی باتیں سُننا اور انکی کتب میں پڑھنا بالکل حرام ہے۔ بلکہ ان کو مارنا اور قتل کرنا ثواب کا موجب ہے مگر آپ کی موجودگی میں انہیں فساد کی جرأت نہ ہوئی۔ کیونکہ چاروں طرف سے احمدی جمع تھے۔ انہوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ ان کے جانے کے بعد فساد کیا جائے۔ میں بھی اُس وقت آپ کے ساتھ تھا۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام وہاں سے روانہ ہوئے اور گاڑی میں سوار ہوئے تو دُور تک آدمی کھڑے تھے جنہوں نے پتھر مارنے شروع کر دئے۔ مگر چلتی گاڑی پر پتھر کس طرح لگ سکتے تھے۔ شاذ و نادر ہی ہماری گاڑی کو کوئی پتھر لگتا۔

وہ مارتے ہم کو تھے اور لگتا اُن کے کسی اپنے آدمی کو تھا۔ پس اُن کا یہ منصوبہ تو پورا نہ ہو سکا۔ باقی احمدی جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وجہ سے وہاں جمع تھے اُن میں سے کچھ تو ارد گرد کے دیہات کے رہنے والے تھے جو آپ کی واپسی کے بعد اِدھر اُدھر پھیل گئے اور جو تھوڑے سے مقامی احمدی رہ گئے یا باہر کی جماعتوں کے مہمان تھے اُن پر مخالفین نے اسٹیشن پر ہی حملے شروع کر دیئے۔ اُن لوگوں میں سے جن پر حملہ ہوا ایک مولوی برہان الدین صاحبؓ بھی تھے۔ مخالفوں نے ان کا تعاقب کیا۔ پتھر مارے اور بُرا بھلا کہا۔ اور آخر ایک دوکان میں انہیں گرا لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ گوبر لاؤ ہم اس کے مونہہ میں ڈالیں۔ چنانچہ وہ گوبر لائے اور انہوں نے مولوی برہان الدین صاحبؓ کا مُنہ کھول کر اُس میں ڈال دیا۔ جب وہ انہیں مار رہے تھے اور گوبر اُن کے مُونہہ میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے تو بجائے اس کے کہ مولوی صاحب انہیں گالیاں دیتے یا شور مچاتے جنہوں نے وہ نظارہ دیکھا ہے بیان کرتے ہیں کہ وہ بڑے اطمینان اور خوشی سے یہ کہتے جاتے تھے کہ سبحان اللہ! یہ دن کسے نصیب ہوتا ہے۔ یہ دن تو اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے آنے پر ہی نصیب ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے جس نے مجھے یہ دن دکھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں ہی جو لوگ حملہ کر رہے تھے اُنکے نفس نے انہیں ملامت کی اور وہ شرمندگی اور ذلّت سے آپکو چھوڑ کر چلے گئے۔ تو بات یہ ہے کہ جب دشمن دیکھتا ہے کہ یہ لوگ موت سے ڈرتے ہیں تو کہتا ہے آؤ ہم انہیں ڈرائیں۔ اللہ تعالیٰ

قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ شیطان اپنے اولیاء کو ڈراتا ہے پس جب کوئی شخص ڈرتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ شیطانی آدمی ہے لیکن اگر وہ ڈرتا نہیں بلکہ ان حملوں اور تکالیف کو خدا تعالیٰ کا انعام سمجھتا ہے اور کہتا ہے خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے یہ عزت کا مقام عطا فرمایا ہے اور اُس نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ میں اُس کی خاطر مار کھا رہا ہوں تو دشمن مرعوب ہو جاتا ہے اور آخر اُس کے دل میں ندامت پیدا ہو جاتی ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے متواتر بتایا کہ جماعت احمدیہ کو بھی ویسی ہی قربانیاں کرنی پڑیں گی جیسی پہلے انبیاء کی جماعتوں کو کرنی پڑیں۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے رؤیا میں دیکھا کہ میں نظام الدین کے گھر میں داخل ہوا ہوں۔ نظام الدین کے معنے ہیں "دین کا نظام" اور اس رؤیا کا مطلب یہ ہے کہ آخر احمدیہ جماعت ایک دن نظام دین بن جائیگی۔ اور دنیا کے اور تمام نظاموں پر غالب آجائیگی۔ مگر یہ غلبہ کس طرح ہوگا۔ اس کے متعلق رؤیا میں آپ فرماتے ہیں ہم اس گھر میں کچھ حسنی طریق پر داخل ہونگے اور کچھ حسینی طریق پر داخل ہونگے (تذکرہ ایڈیشن دوم صفحہ ۴۸۶) یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ حضرت حسنؓ نے جو کامیابی حاصل کی وہ صلح سے کی اور حضرت حسینؓ نے جو کامیابی حاصل کی وہ شہادت سے حاصل کی۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بتایا گیا کہ نظام الدین کے مقام پر جماعت پہنچیگی تو سہی مگر کچھ صلح محبت اور پیار سے اور کچھ شہادتوں اور قربانیوں کے ذریعہ۔ اگر ہم میں سے کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ بغیر صلح اور محبت اور پیار کے یہ سلسلہ ترقی کرے گا تو وہ بھی غلطی کرتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ بغیر قربانیوں اور شہادتوں کے یہ سلسلہ ترقی کریگا تو وہ بھی غلطی کرتا ہے۔ ہمیں کبھی صلح اور آشتی کی طرف جانا پڑے گا اور کبھی حسینی طریق اختیار کرنا پڑیگا جس کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے دشمن کے سامنے مر جانا ہے مگر اس کی بات نہیں ماننی۔ یہ دونوں طریق ہمارے لئے مقدر ہیں نہ خالی مسیحیت والا سلوک ہمارے لئے مقدر ہے نہ خالی مہدویت والا سلوک ہمارے لئے مقدر ہے۔ ایک درمیانی راستہ ہے جس پر ہمیں چلنا پڑیگا۔ ایک غلبہ ہوگا صلح اور محبت اور پیار کے ساتھ اور ایک غلبہ ہوگا قربانیوں کے ساتھ۔ اس کے بعد جماعت نظام الدین کے گھر میں داخل ہوگی اور اُسے کامیابی حاصل ہوگی۔

یہی پیغام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتاب "انوار الاسلام" میں بھی دیا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"مجھے اسکی عزت اور جلال کی قسم ہے کہ مجھے دنیا و آخرت میں اس سے زیادہ کوئی چیز بھی پیاری نہیں کہ اُس کے دین کی عظمت ظاہر ہو۔ اُس کا جلال چمکے اور اُس کا بول بالا ہو۔ کسی ابتلاء سے اُس کے فضل کے ساتھ مجھے خوف نہیں اگرچہ ایک ابتلاء نہیں کروڑ ابتلاء ہو ابتلاؤں کے میدان میں اور دُکھوں کے جنگل میں مجھے طاقت دی گئی ہے ؎

من نہ آنستم کہ روز جنگ بینی پشت من
آن منم کاندر میان خاک و خوں بینی سرے

پس اگر کوئی میرے قدم پر چلنا نہیں چاہتا تو مجھ سے الگ ہو جائے۔ مجھے کیا معلوم کہ ابھی کون کون سے ہولناک جنگل اور پُر خار بادیہ درپیش ہیں جن کو میں نے طے کرنا ہے پس جن لوگوں کے نازک پیر ہیں وہ کیوں میرے ساتھ مصیبت اُٹھاتے ہیں۔ جو میرے ہیں وہ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتے نہ مصیبتوں سے نہ لوگوں کے سبّ و شتم سے۔ نہ آسمانی ابتلاؤں اور آزمائشوں سے اور جو میرے نہیں وہ عبث دوستی کا دم مارتے ہیں کیونکہ

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا ؕ

کیا جو لوگ بدیاں کرتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہماری سزا سے بچ جائیں گے؛

وہ عنقریب الگ کئے جائیں گے اور اُن کا
پچھلا حال اُن کے پہلے حال سے بدتر ہوگا۔"
(انوار الاسلام صفحہ ۲۲)

غرض قومی ترقی کا ایک ہی گُر ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کے لئے اپنے آپ کو فنا کر دینا۔ اور اس راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہ کرنا۔

اب میں یہ بتاتا ہوں کہ ابتلاء کیوں آتے ہیں ؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اوّل تو ابتلاء عموماً اس لئے آتے ہیں کہ انسان کا ایمان مضبوط ہو۔ لیکن اس لئے نہیں کہ خدا تعالیٰ کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس لئے کہ خود انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ میرے ایمان کی کیا حالت ہے۔ چنانچہ ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک عورت کی لڑکی سخت بیمار تھی۔ وہ روزانہ دُعا کیا کرتی تھی کہ اس کی بیماری مجھے لگ جائے اور میں مر جاؤں۔ ایک رات اس کی گائے کا مُنہ ایک تنگ برتن میں پھنس گیا۔ اور وہ اُسے برتن سے نکال نہ سکی۔ اور گھبرا کر اُس نے اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کر دیا۔ اُس عورت کی آنکھ کھل گئی اور ایک عجیب قسم کی شکل اپنے سامنے دیکھ کر اُس نے سمجھا کہ ملک الموت میری جان نکالنے کے لئے آگیا ہے۔ اُس عورت کا نام مہستی تھا وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگی ؎

ملک الموت من نہ مہستی ام
من یکے پیرزالِ محنتی ام

یعنی اے ملک الموت میں مہستی نہیں ہوں۔ میں تو ایک غریب محنت کش بڑھیا ہوں اور اپنی لڑکی کی طرف اشارہ کرکے کہا مہستی وہ لیٹی ہوئی ہے اُس کی جان نکال لے۔ اب دیکھو وہ عورت خیال کرتی تھی کہ اُسے اپنی لڑکی سے بے انتہا محبت ہے لیکن جب اُس نے سمجھا کہ جان نکالنے والا فرشتہ آگیا ہے تو معلوم ہو گیا کہ اُسے اتنی محبت نہ تھی کہ وہ اُس کے بدلہ میں جان دے دیتی۔ یہ ہے تو ایک حکایت لیکن یہ بات کثرت سے پائی جاتی ہے کہ انسان بسا اوقات اپنے خیالات کا بھی اچھی طرح اندازہ نہیں لگا سکتا اور جب اُس پر ابتلاء آتے ہیں تب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کسی چیز سے محبت یا نفرت کا دعویٰ کہاں تک صادق تھا۔

اسی طرح ابتلاء میں اس لئے بھی ڈالا جاتا ہے تا لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں کا ایمان کیسا ہے ورنہ یوں دوسروں کو کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں کا ایمان پختہ ہے یا نہیں۔ اسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی انسان جتنا بڑا ہو اُس پر اُتنے ہی بڑے ابتلاء آتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ ابتلاء نبیوں کو آتے ہیں جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے متعلق فرمایا کہ

کربلائیست سیر ہر آنم
صد حسینؓ است در گریبانم

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ہتک کی ہے لیکن وہ نہیں جانتے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس جگہ اپنے ابتلاؤں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ تو ایک بار مارے گئے لیکن دشمن مجھے ہر وقت مارنے کے درپے رہتے اور ایذائیں دیتے ہیں۔ اور میں ہر وقت کربلا کا نظارہ دیکھتا رہتا ہوں۔ سُولی پر ایک دفعہ چڑھ کر مرنا اتنی بڑی بات نہیں جتنی کہ ہر وقت ابتلاؤں میں پڑے رہنا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ یسوع مسیح چونکہ سُولی پر چڑھ کر مر گئے

سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ۞

اُن کا فیصلہ بہت بُرا ہے ۲ہ

اِس لئے اُن کو خدا کا بیٹا مان لو۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ بات درست ہے تو پھر جو لوگ ہر وقت سُولی پر چڑھائے جاتے ہیں اُن کو کیا ماننا چاہیئے۔ سب انبیاء کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اور جب انہیں متواتر تکالیف دی جاتی ہیں تو لوگ دیکھ لیتے ہیں کہ اُن کا کیسا پختہ ایمان ہے۔ کہتے ہیں اَلْاِسْتِقَامَۃُ فَوْقَ الْکَرَامَۃِ اور سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ دشمن بھی خوبی کو مان لے اور اسکا انکار نہ کر سکے۔ پس اخلاق اور روحانیت کی پختگی کے لئے ابتلاؤں کا آنا اور اُن کے آنے پر صبر و رضا کا مقام اختیار کرنا ایمان کی تکمیل کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے۔

۲ہ تفسیر:- فرمایا وہ لوگ جو ناروا افعال میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے ہماری سزا سے بچ جائیں گے اُنکا یہ خیال بالکل باطل ہے۔ دنیا میں کوئی شخص دھوکا سے خدا تعالیٰ کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ دوسرے لوگوں کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا تو الگ رہا انسان خود اپنی ذات کے متعلق بھی صحیح فیصلہ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ چنانچہ بعض دفعہ وہ ہوتا بد ہے لیکن سمجھتا اپنے آپ کو نیک ہے اور خیال کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جائیگا۔ حالانکہ اسکا یہ فیصلہ جھوٹا ہوتا ہے۔ اور وہ عذاب میں پکڑا جاتا ہے اور اُس دن اُسے پتہ لگتا ہے کہ میں اپنے آپ کو غلط طور پر مومن سمجھتا رہا ہوں۔ یہ مقام خاص خاص مومنوں کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے اپنے ایمان کی پختگی کے واقف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ۔ (احزاب آیت ۲۴) یعنی صحابہؓ میں سے بعض تو ایسے ہیں جنہوں نے اپنے دعوئے ایمان کو ثابت کر دیا ہے۔ اور بعض اُس موقعہ کے منتظر ہیں جب وہ اپنے دعوئے ایمان کو ثابت کر دیں گے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت مالکؓ بن انسؓ ایک انصاری صحابی جو غلطی کی وجہ سے جنگ بدر میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔ جب انہوں نے بدری صحابہؓ سے بدر کی جنگ کے کارنامے سُنے تو جوش سے اُٹھ کر ٹہلنے لگ گئے اور کہنے لگے یہ کیا بات ہے جب مجھے موقعہ ملا تو میں بتاؤں گا کہ مومن کیسی قربانیاں کرتا ہے۔ چنانچہ اُحد کی لڑائی میں وہ شامل ہوئے اور جب پیچھے کی طرف سے یک دم حملہ کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ اور وہ میدان جنگ سے ہٹ کر کچھ فاصلے تک آگئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے رہ گئے اور کفار کے پتھراؤ کی وجہ سے زخمی ہو کر دوسرے زخمیوں کے جسموں پر گر گئے اور اتنے میں کچھ اور لوگ زخمی ہو کر آپؐ پر گر گئے۔ اور چند منٹ کے بعد لوگوں نے آپ کو غائب دیکھ کر سمجھ لیا کہ آپؐ شہید ہو گئے ہیں تو بعض لوگوں نے دوڑ کر مدینہ میں جو اُحد کے قریب ہی تھا یہ مشہور کر دیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ یہ خبر اُن لوگوں پر بھی جو میدان جنگ سے صرف تھوڑے فاصلہ پر پیچھے تھے بجلی کی طرح گری۔ اُن میں حضرت عمرؓ بھی تھے۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے رو رہے تھے۔ کہ مالکؓ بن انسؓ جنہوں نے جنگ سے پہلے کھانا نہیں کھایا تھا۔ دو تین کھجوریں کھاتے ہوئے اُن کے پاس گذرے۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ

جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی اُمید رکھتا ہے (اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ) (اللہ تعالیٰ) کا مقرر کردہ وقت ضرور آنیوالا ہے۔

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶﴾

اور وہ بہت سُننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔ ۳ہ

اور چونکہ وہ اُسوقت میدانِ جنگ سے آئے تھے جبکہ مسلمان فاتح ہو چکے تھے اور کفار شکست کھا چکے تھے اور حضرت عمرؓ اُسوقت میدانِ جنگ سے آئے تھے جبکہ پیچھے کی طرف سے دشمن نے دوبارہ حملہ کیا تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو کر گر گئے تھے اور بعض صحابہؓ نے سمجھ لیا تھا کہ آپ شہید ہو گئے ہیں اس لئے آپ رو رہے تھے اور مالکؓ خوش تھے کہ ہم کو فتح نصیب ہو چکی ہے پس اُن کا رونا مالکؓ کو عجیب معلوم ہُوا اور وہ حیرت سے حضرت عمرؓ کو دیکھنے لگے اور کہنے لگے۔ عمرؓ! یہ خوشی کا موقعہ ہے یا رونے کا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی ہے ہمیں تو خوشی منانی چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے سر اُٹھا کر اُنکی طرف دیکھا اور کہا مالکؓ! شاید تمہیں معلوم نہیں کہ بعد میں جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ دشمن نے پہاڑی کے پیچھے سے آکر دوبارہ حملہ کر دیا اور اچانک حملہ کی تاب نہ لا کر اسلامی لشکر بکھر گیا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ اُس وقت مالکؓ کے ہاتھ میں آخری کھجور تھی۔ انہوں نے کھجور اُٹھا کر زمین پر پھینک دی اور کہا میرے اور میرے محبوب کے درمیان سوائے اس کھجور کے اور کیا حائل ہے۔ پھر حضرت عمرؓ کو دیکھا اور کہا جو کچھ تم کہتے ہو اگر وہ سچ ہے تو پھر بھی رونے کا موقعہ نہیں ہمیں بھی اُدھر جانے کی تیاری کرنی چاہیئے جدھر ہمارا محبوب گیا ہے۔ یہ کہکر تلوار میان سے نکال لی اور دشمن کے جمِ غفیر پر جا پڑے اکیلا آدمی سینکڑوں آدمیوں کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُن کا جسم زمین پر بکھر گیا۔ اور جب خدا تعالیٰ نے پھر مسلمانوں کو غلبہ دیا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مالکؓ بن نضرؓ کو تلاش کرو۔ وہ کہاں ہیں تو لوگوں نے آکر خبر دی کہ اُن کا تو کہیں پتہ نہیں لگتا آپؐ نے پھر اُن کی تلاش کا حکم دیا۔ اتنے میں اُنکی بہن مدینہ سے یہ وحشتناک خبر سُنکر کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں دوڑتی ہوئی میدانِ جنگ میں پہنچی اور آخر ایک جگہ پر اُس نے ایک لاش کے ٹکڑے دیکھے جن ٹکڑوں میں سے ایک انگلی کے ذریعہ اُس نے پہچان لیا کہ یہ میرے بھائی مالکؓ کی نعش ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی۔ مفسرین کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیت کہ مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ انہی کے متعلق تھی۔ مَیں وجوہِ تنزیل کا اتنا قائل نہیں لیکن مالک بن انسؓ کا واقعہ تاریخوں اور حدیثوں میں اتنے تکرار سے آیا ہے اور قرآنی الفاظ اتنے واضح ہیں کہ ماننا پڑتا ہے کہ اور کہیں ہو یا نہ ہو اس جگہ وجہ تنزیل صحیح ہے۔ پس جس طرح بعض کفار آخر تک سمجھتے چلے جاتے ہیں کہ ہم عذاب سے بچ رہینگے اور ہمارے کام اچھے ہیں لیکن جب سزا آتی ہے تو پھر انہیں پتہ لگتا ہے کہ اُنکے اعمال اچھے نہیں اسی طرح بعض مومن سمجھتے ہیں کہ ہم سچے ہیں اور واقعات ثابت کر دیتے ہیں کہ انکا خیال ٹھیک ہے جیسا کہ مَیں نے اوپر ایک واقعہ بیان کیا ہے چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے +

۳ہ تفسیر:۔ فرمایا جو کوئی اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی امید رکھتا ہے وہ یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدۂ ملاقات بالکل سچا ہے اور پورا ہو کر رہے گا اور خدا تعالیٰ بہت دُعائیں سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

چونکہ اوپر کی آیات میں اُن ابتلاؤں کا ذکر ہے جو انبیاء کی جماعتوں پر آتے ہیں اِس لئے یہاں بقائے الٰہی سے مُراد اللہ تعالیٰ کی تائید اور اُس کی نصرت کا نزول ہے اور مومنوں کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ دشمنوں کی شرارتوں کو دیکھ کر تمہارے دلوں میں مایوسی نہیں آنی چاہیئے - اور تمہیں کبھی یہ تصوّر بھی نہیں کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ تمہیں اکیلا چھوڑ دے گا اور دشمن تمہیں تباہ کرنے میں کامیاب ہو جائیگا. وہ ابتلاؤں کے ذریعہ صرف تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے ورنہ وہ تمہارے ساتھ ہے اور اُس کے فرشتے تمہاری تائید میں کام کر رہے ہیں. پس دشمن خواہ تمہیں کتنی ستائے اور تم پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوشش کرے تمہیں اس بات پر کامل یقین رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے جو تم سے ترقی کے وعدے کئے ہوئے ہیں وہ پورے ہو کر رہیں گے اور وہ تمہاری مدد کے لئے دوڑتا چلا آئیگا - اگر تم ابتلاؤ میں ثابت قدمی دکھاؤ گے اور خدا تعالےٰ پر کبھی بدظنی نہیں کرو گے بلکہ امید رکھو گے کہ خدا تعالیٰ آسمان سے اُتریگا اور تمہارے دشمنوں کی گردنیں مروڑ دیگا تو تمہارا خدا تم سے ایسا ہی سلوک کریگا - اور وہ تمہارے لئے ایسی غیرت دکھائیگا جس کی مثال اور کہیں نظر نہیں آئیگی -

اِس زمانہ میں مسلمانوں کے تنزل کی سب سے بڑی وجہ یہی ہوئی کہ اُن کا ایک زندہ خدا پر ایمان نہ رہا - اور معجزات اور خوارق کے متعلق انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ یہ صرف پہلے زمانہ کے لوگوں کے لئے دکھائے جاتے تھے اب خدا نعوذ باللہ اُن نشانات کے دکھانے کی طاقت نہیں رکھتا - اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن کے دلوں میں خدا تعالےٰ سے تعلق پیدا کرنے کا کوئی ولولہ نہ رہا اور وہ مایوسی کا شکار ہو گئے - اسلام اس نظریّہ کو غلط قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ جو لوگ اپنے محبوب کی ملاقات یعنی اُسکی نصرت اور تائید پر کامل یقین رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی مدد کے لئے آسمان سے اُتر آتا ہے اور وہ اُسی طرح اُنکی تائید کرتا ہے جس طرح پہلے انبیاء کی جماعتوں کی اُس نے تائید کی - مگر ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے - ابتلاؤں کا بھی ایک دَور ہوتا ہے اور کامیابیوں اور فتوحات کا بھی ایک دَور ہوتا ہے اور مومن کامل وہی ہوتا ہے جو مصائب اور آفات میں اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ رکھتا ہے جب اُس کا یقین اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ کا اُسے مژدہ سُنایا جاتا ہے اور اللہ تعالےٰ اُس کے دشمن کو تباہ کر دیتا ہے - اسی کی طرف آیت کے آخری حصّہ میں یہ کہکر اشارہ فرمایا کہ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ - اللہ تعالیٰ مومنوں کی دُعاؤں کو سُننے والا اور اُن کے حالات کو جاننے والا ہے - یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اُن کی دُعاؤں کو قبول نہ کرے اور دشمن کے ظالمانہ رویّہ کو روکتے ہوئے اُسے سزا نہ دے -

ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ روس کا بادشاہ پیٹر ایک دفعہ کسی ضروری امر پر غور کرنے کے لئے اپنے بالاخانہ پر بیٹھ گیا - اور اُس نے حکم دے دیا کہ کسی شخص کو اندر آنے کی اجازت نہ دی جائے - پُرانے زمانہ میں دروازے نہیں ہوتے تھے - صرف پردے لٹکائے جاتے تھے - اور عربی کتابوں سے پتہ لگتا ہے کہ مسلمانوں کے مکانوں میں بھی دروازے نہیں ہوتے تھے - اسی لئے حکم تھا کہ جب آؤ تو اجازت لے کر آؤ - بہرحال اُس نے ڈیوڑھی پر ٹالسٹائے کو جو اُس کا چپڑاسی تھا بٹھا دیا اور اُسے کہہ دیا کہ کسی کو اندر نہ آنے دینا - میں ایک ضروری امر کے متعلق غور کر رہا ہوں - اتفاقاً کوئی شہزادہ آگیا - اُس نے بادشاہ کے پاس کسی کام کے لئے جانا چاہا روس کے شاہی قانون کے مطابق شہزادہ کو کوئی شخص روک نہیں سکتا - شہزادوں کو یہ اجازت تھی کہ وہ بادشاہ کے پاس جب چاہیں چلے جائیں - انہیں کسی اجازت کی ضرورت نہیں

پھر یہ بھی روسی قانون تھا کہ کوئی غیر فوجی آدمی کسی فوجی کو نہیں مار سکتا - کسی بڑے افسر کو چھوٹا افسر نہیں مار سکتا اور کسی شہزادہ کو کوئی غیر شہزادہ نہیں مار سکتا یا کسی نواب کو کوئی غیر نواب نہیں مار سکتا۔ پس چونکہ قانون اجازت دیتا تھا کہ شہزادے بغیر کسی روک کے بادشاہ کے پاس چلے جایا کریں اِس لئے شہزادے نے اندر داخل ہونا چاہا مگر جونہی وہ اندر داخل ہونے لگا۔ ٹالسٹائے نے آگے بڑھ کر کہا حضور شہزادہ صاحب بادشاہ کا حکم ہے کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ اُس نے کہا ٹھیک ہے مگر تمہیں پتہ ہے مَیں شہزادہ ہوں۔ اور شہزادوں کے متعلق یہ قانون ہے کہ وہ بغیر کسی روک کے بادشاہ کے پاس جا سکتے ہیں۔ اُس نے کہا پتہ ہے۔ اِس پر شہزادے کو غصہ آیا اور اُس نے اُسے دو چار کوڑے لگائے اور کہا باوجود اِس قانون کے معلوم ہونے کے تم یہ جرأت کرتے ہو کہ مجھے اندر داخل ہونے نہیں دیتے۔ اُس نے مار کھائی اور شہزادے نے بھی دو چار ہنٹر مارنے کے بعد سمجھ لیا کہ اِسے اب سبق آگیا ہوگا۔ چنانچہ وہ پھر اندر داخل ہونے کیلئے آگے بڑھا۔ مگر ٹالسٹائے نے پھر اُسے روک لیا اور کہا حضور بادشاہ نے اندر جانے سے منع فرمایا ہے۔ اِس پر اُس نے پہلے سے بھی زیادہ اُسے مارا۔ اور خیال کیا کہ اب اِسے سمجھ آگئی ہوگی۔ مگر جب اُس نے پھر محل میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ تو ٹالسٹائے نے پھر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور کہا حضور بادشاہ کا حکم ہے کہ کوئی شخص اندر نہ آئے۔ اِس پر شہزادے نے پھر اُسے تیسری بار مارا۔ شہزادہ کے بار بار مارنے اور پھر غصہ سے اُس کی آواز کے بلند ہونے کی وجہ سے جب شور پیدا ہوا تو قدرتی طور پر بادشاہ بھی اِس طرف متوجہ ہوگیا اور وہ تمام نظارہ اوپر سے دیکھتا رہا۔ جب شہزادہ اُسے تیسری دفعہ مار چکا تو بادشاہ نے غصہ والی آواز بنا کر کہا ٹالسٹائے! اِدھر آؤ۔ ٹالسٹائے دوڑ کر اندر گیا۔ ساتھ ہی شہزادہ بھی جوش کی حالت میں داخل ہوگیا۔ اور اُس نے چاہا کہ وہ بادشاہ سے شکایت کرے۔ جب ٹالسٹائے پہنچا تو بادشاہ نے کہا۔ ٹالسٹائے یہ کیسا شور تھا؟ اُس نے کہا حضور شہزادہ صاحب تشریف لائے تھے اور اندر آنا چاہتے تھے مگر مجھے چونکہ حضور کا حکم تھا کہ کسی کو اندر نہیں آنے دینا اس لئے مَیں نے عرض کر دیا کہ آپ کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ اور جب یہ زبردستی اندر داخل ہونے لگے تو مَیں نے اُن کو روکا۔ بادشاہ نے کہا۔ پھر۔ اُس نے کہا پھر انہوں نے مجھے مارا۔ بادشاہ نے شہزادہ سے پوچھا۔ کیا یہ ٹھیک ہے۔ اُس نے کہا۔ ٹھیک ہے لیکن روس کا قانون یہ اجازت نہیں دیتا کہ شہزادہ کو اندر داخل ہونے سے روکا جائے۔ بادشاہ نے کہا یہ درست ہے کہ روس کا قانون یہ اجازت نہیں دیتا کہ شہزادہ کو اندر آنے سے روکا جائے لیکن کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ بادشاہ پر اپنے ملک کی کئی قسم کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن کے لئے بسا اوقات اُسے غور اور فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور غور و فکر کے لئے علیحدگی ضروری ہوتی ہے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ حکومت کی ذمہ داریاں تو ادا ہوں یا نہ ہوں لیکن قانون کے محض الفاظ پورے ہوتے چلے جائیں میرے سامنے اِسوقت ایک بہت بڑی مہم تھی جو حکومت سے تعلق رکھتی تھی اور مَیں چاہتا تھا کہ مجھے کچھ وقت ملے تو مَیں اِس کے متعلق سکیم سوچوں اور غور کروں کہ کس طرح اپنے ملک کو خطرہ سے بچایا جا سکتا ہے۔ کیا اِن حالات میں میرا یہ حق نہ تھا کہ مَیں حکم دے دیتا کہ کوئی شخص اندر نہ آئے اور میری توجہ کو کسی اور طرف نہ پھیرے۔ ٹالسٹائے نے عقلمندی اور ادب سے کام لیا اور اُس نے میرے حکم کی فرمانبرداری کی۔ مگر تم نے میرا بیٹا ہوتے ہوئے میرے حکم کی نافرمانی کی۔ اور تم نے جو اِس کو مارا تو اُس کے کسی جرم کی وجہ سے نہیں مارا بلکہ اسلئے مارا کہ اُس نے میری فرمانبرداری کیوں کی۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اور جو شخص خدا (تعالیٰ) کے لئے کوشش کرتا ہے درحقیقت وہ اپنی جان ہی کے لئے کرتا ہے۔ اللہ (تعالیٰ)

لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۷

تمام جہانوں سے بے نیاز ہے (اور اُن کی عبادت کا محتاج نہیں) ۵۴

اس کے بعد بادشاہ نے ٹالسٹائے کے ہاتھ میں کوڑا دیکر کہا۔ ٹالسٹائے اُٹھو اور اس کوڑے سے شہزادے کو مارو۔ شہزادے نے کہا۔ روس کا قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی غیر فوجی کسی فوجی آدمی کو مارے۔ میں فوجی ہوں اور یہ غیر فوجی ہے اس لئے یہ مجھے مار نہیں سکتا۔ بادشاہ نے کہا۔ ٹالسٹائے میں تم کو فوجی عہدہ دیتا ہوں تم اسے مارو۔ گویا بادشاہ نے بتایا کہ اگر روس کا قانون یہ ہے کہ کوئی غیر فوجی کسی فوجی کو نہیں مار سکتا تو فوجی عہدے دینا بھی تو میرے اختیار میں ہے۔ میں ٹالسٹائے کو فوجی عہدہ دے دیتا ہوں۔ اس پر پھر شہزادے نے کہا۔ میں فوج میں کرنیل یا جرنیل ہوں۔ مجھے میرے برابر کا آدمی ہی مار سکتا ہے چھوٹا نہیں۔ بادشاہ نے کہا ٹالسٹائے میں تم کو بھی وہی عہدہ دیتا ہوں۔ اس پر شہزادہ نے کہا روس کا قانون یہ ہے کہ کسی نواب کو کوئی غیر نواب سزا دینے پر مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ بادشاہ نے کہا۔ نواب بنانا بھی میرے اختیار میں ہے اے نواب ٹالسٹائے میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم اس شہزادہ کو مارو۔ اور اسطرح بادشاہ نے شہزادہ کے ہر عذر کو توڑا اور آخر ٹالسٹائے سے اُس کو پٹوایا۔ کیونکہ ٹالسٹائے نے بادشاہ کی خاطر مار کھائی تھی۔ اسی طرح جو شخص اس لئے پیٹا جائیگا کہ وہ خدا کی بات پر ایمان لایا۔ یا خدا کی آواز پر اُس نے لبیک کہا۔ دنیا کا چھوٹا ہو یا بڑا جو اُس کو مارے گا اور سزا دیگا خدا اُسے نہیں چھوڑے گا جب تک اُسے سزا نہ دے لے خدا تعالیٰ کے کوڑے کے مقابلہ میں کسی انسان کا کوڑا نہیں چل سکتا۔ لوگ اپنی کثرت پر گھمنڈ کرتے ہیں۔ لوگ اپنے جتھے پر گھمنڈ کرتے ہیں۔ لوگ اپنی حکومتوں پر گھمنڈ کرتے ہیں مگر ہمارے خدا کی حکومت دُنیا کی حکومتوں سے بہت بڑی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق نبیوں نے کہا کہ وہ کونے کا پتھر ہوگا۔ جس پر وہ گرے گا وہ بھی چکنا چُور ہو جائیگا اور جو کوئی اُس پر گرے گا وہ بھی چکنا چُور ہو جائیگا۔ یعنی خواہ وہ کسی پر حملہ آور ہو یا کوئی اُس پر حملہ آور ہو دونوں صورتوں میں وہ سزا پائے بغیر نہیں رہے گا۔ اسی طرح آپ کے متبع بھی ظلی رنگ میں کونے کے پتھر ہیں۔ پس جو لوگ خدا پر توکل رکھتے ہیں خدا اُنکے دشمنوں کو سزا دیئے بغیر نہیں رہتا۔

۵۴ تفسیر:۔ اس آیت میں مومنوں کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تمہاری تمام نیک کوششیں تمہارے اپنے لئے فائدہ بخش ہیں۔ خدا تعالیٰ کو ان سے کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ لوگوں کی عبادت یا اُن کی قربانیوں سے بے نیاز ہے۔

پس قربانیاں کرتے وقت تم کبھی یہ خیال نہ کرو کہ تم خدا اور اُس کے رسول پر کوئی احسان کر رہے ہو۔ خدا تعالیٰ قربانیوں کا محتاج نہیں بلکہ تم اُس کے فضل کے محتاج ہو اور اگر تمہیں کسی نیکی کی توفیق ملتی ہے تو تم خدا پر یا اُس کے سلسلہ پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ خود اپنی جان پر احسان کرتے ہو۔ جو لوگ اس نکتہ کو نہیں سمجھتے وہ بعض دفعہ نیکیاں کرتے کرتے جنت کے دروازہ تک پہنچ جاتے ہیں اور اُن کا غرور اُن کے راستہ میں دیوار بن کر حائل ہو جاتا ہے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ

اور جو لوگ ایمان لائے اور ایمان کے مطابق انہوں نے عمل کئے ہم اُن کی بدیوں کو اُن سے دُور

سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑧

کردیں گے اور جو کام وہ کرتے تھے اُس کے مطابق جو بہترین جزا اُن کو مل سکتی ہوگی وہ ہم اُنکو دیں گے۔ ۵

اور وہ دوزخ میں جاگرتے ہیں۔ پس نیکیوں کے بعد کبریا خودپسندی کے جذبات کی بجائے ہمیشہ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے جس نے ایمان کی توفیق دی۔ اور مصائب و آفات میں ثبات قدم عطا فرمایا۔

۵ حل لغات:۔ لَنُكَفِّرَنَّ : كَفَّرَ سے جمع متکلم مؤکد بہ نونِ ثقیلہ کا صیغہ ہے اور كَفَّرَ اللّٰهُ لَهُ الذَّنْبَ کے معنے ہیں مَحَاهُ یعنی گناہ کے اثر اور اُس کے نشان کو مٹا دیا۔ (اقرب) اِسی طرح كَفَّرَ کے معنے بدلہ دینے کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ (المائدہ آیت ۹۰) جب تم قسم کھا کر اُسے توڑ دو تو اُسکا بدلہ وہ ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے وَالتَّكْفِيْرُ سَتْرُهٗ وَتَغْطِيَتُهٗ حَتّٰى يَصِيْرَ بِمَنْزِلَةِ مَا لَمْ يَعْمَلْ۔ اور تکفیر (جو كَفَّرَ کا مصدر ہے جس سے کفارہ بنا ہے) کے معنے کسی عمل کو اس حد تک چھپا دینے اور ڈھانپ دینے کے ہوتے ہیں کہ گویا اُس کا وجود ہی نہ تھا اور اس کے کرنے والے نے وہ عمل کیا ہی نہ تھا۔ وَيَصِحُّ اَنْ يَّكُوْنَ اَصْلُهٗ اِزَالَةُ الْكُفْرِ وَالْكُفْرَانِ نَحْوَ التَّمْرِيْضِ فِيْ كَوْنِهٖ اِزَالَةً لِلْمَرَضِ وَتَقْذِيَةِ الْعَيْنِ فِيْ اِزَالَةِ الْقَذٰى عَنْهُ (مفردات) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کی بنیاد بابِ تفعیل کے اِس خاصہ پر ہو کہ وہ اصل مادہ کے معنوں کو دُور کرنے پر دلالت کرتا ہے اور كَفَّرَ کے معنے ہوں کفر یا کفرانِ نعمت کو دُور کرنا۔ جیسے عربی زبان میں تَمْرِيْض کے معنے مرض پیدا کرنے کے نہیں بلکہ مرض کے دُور کرنے کے ہوتے ہیں۔ اِسی طرح تَقْذِيَةُ الْعَيْنِ کے معنے آنکھ میں قَذٰى یعنی تنکا ڈالنے کے نہیں ہوتے بلکہ آنکھ سے تنکا دُور کرنے کے ہوتے ہیں۔

اوپر کے لغات کے حوالوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کفّارہ کے معنے مٹا دینے کے بھی ہیں جس میں تین باتیں شامل ہیں (۱) گناہ کی خواہش اور عادت کو مٹا دینا (۲) گناہ کی سزا اور نتیجہ کو مٹا دینا (۳) گناہ کی شہرت اور بدنامی کو مٹا دینا اِسی طرح کفّارہ کے معنے بدلہ دینے یا گناہ کو دُور کر دینے کے بھی ہیں۔

تفسیر: اِس آیت میں جزائے نیک کے بارہ میں اسلام کا یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص سچی توبہ کرتا ہے تو خدا تعالیٰ صرف گناہ کو ہی معاف نہیں کرتا بلکہ گناہ کی یاد بھی مٹا دیتا ہے۔ یعنی جو لوگ گناہ سے واقف ہوتے ہیں۔ مثلاً خود گناہ گار کا اپنا وجود ہے اللہ تعالیٰ اُس کے اور دوسروں کے ذہن سے اُس گناہ کی یاد کو مٹا دیتا ہے اور بدی کے نقش کو یا تو دھندلا کر دیتا ہے یا اُسے بالکل محو کر دیتا ہے تا نفس میں شرمندگی نہ رہے اور نیکی کا جذبہ غالب آجائے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ یعنی وہ لوگ جو سچّا ایمان لائے ہیں اور اپنے ایمان کے مطابق انہوں نے عمل کئے ہیں ہم اُن کے گناہوں کو مٹا دیں گے اور اُن کے اعمال میں سے بہترین اعمال کے مطابق اُن سے سلوک کرینگے

لَنُكَفِّرَنَّ

اِس جگہ مٹا دینے سے مراد اُن کا فراموش کر دینا ہے، کیونکہ
جب عملِ صالح کرنیوالے اور کامل ایمان والوں کا ذکر ہو۔ تو
مٹا دینے کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ گناہ کی عادت چھٹ
جائیگی۔ کیونکہ ایسا شخص عمل نیک تو پہلے ہی کرنے لگ گیا
ہے۔ پس اسجگہ مٹانے سے مُراد اُن کا فراموش کر دینا ہی ہے
تاکہ اُن کی عزت پر کوئی حرف باقی نہ رہے۔

لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ
سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی اعمال کی جزا دیتے
وقت اُس کی کمزوریوں پر انعام کی بنیاد نہیں رکھیگا بلکہ
اُس کی اعلےٰ سے اعلیٰ حالت پر اُس کی بنیاد رکھے گا۔ اِس
دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بدلہ دیتے وقت انسان کی کمزوریوں
کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یعنی یہ دیکھا جاتا ہے کہ عام
طور پر اُس سے کس قسم کے اعمال کا ظہور ہوُا ہے۔ جسے
قاعدۂ اوسط کہا جاتا ہے۔ دنیا کی تمام جزاء اس اوسط
کے قاعدہ پر مبنی ہے۔ حتّٰی کہ حکومتیں پنشن دیتے وقت بھی
قاعدۂ اوسط سے کام لیتی ہیں اور یہ دیکھتی ہیں کہ تین سال
کی تنخواہ کا اوسط کیا ہے پھر اُس اوسط کے مطابق پنشن
دیتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص پنشن کے وقت سے تین سال
پہلے تین سو روپیہ تنخواہ لیتا تھا۔ دو سال پہلے چار سو
روپیہ اور آخری سال میں پانچسو تو وہ اُسے دو سو
پنشن دیگی جو چار سو کا نصف بنتا ہے نہ کہ اڑھائی سو
جو اُس کی آخری تنخواہ کا نصف ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ
چونکہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے۔ اس کے انعام سے دوسروں
کا حق نہیں مارا جاتا اور وہ جو کچھ دیتا ہے اپنی ملکیت
سے دیتا ہے اُس نے جزاءِ نیک کے بارہ میں دنیا کے
اِس قاعدہ کے خلاف یہ قاعدہ مقرر کر رکھا ہے کہ جو شخص مرتے ہوئے نیک
ہو اور ایمان پر جان دے اُسکا درجہ وہ نہیں سمجھا جائیگا جو موت کے
وقت اُسے حاصل تھا بلکہ اُسکا وہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ سمجھا جائیگا جو اُسکی
زندگی میں کبھی بھی اُسے حاصل ہوُا ہو۔ مثلاً فرض کرو نیکی کے دس درجے ہیں۔
اور ایک شخص مرتے ہوئے ساتویں درجہ پر تھا لیکن
دو چار سال پہلے اُسے آٹھواں یا نواں درجہ حاصل تھا
پھر کسی جسمانی یا دماغی کمزوری کی وجہ سے اُس کی نیکی
کا درجہ گر گیا۔ اور دین کی خدمت کا اُسے اسقدر موقعہ
نہ ملا جو اس سے پہلے ملا کرتا تھا تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ
موت کے وقت کے درجہ پر فائز نہ کریگا بلکہ اسے اس درجہ
میں رکھے گا جو اُسے پہلے حاصل تھا اور جو سب سے
اعلیٰ تھا۔ غرض انسان کو جزاء دیتے وقت اس امر کا
خیال رکھا جائیگا کہ اپنی زندگی میں کس اعلیٰ سے اعلیٰ
مقام کو یہ پہنچ چکا ہے۔ اور بعد کے تغیرات کو نظرانداز
کرکے اس اعلیٰ درجہ کے مطابق اس سے سلوک کیا جائیگا۔

اِس بارہ میں قرآن کریم کی متعدد آیات ہیں جن میں
سے ایک یہ آیت بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس آیت کے
یہ معنے تو ہو نہیں سکتے کہ جو اچھے سے اچھا عمل ہو گا
اس کا بدلہ مل جائیگا اور دوسرے چھوڑ دیئے جائیں گے
کیونکہ اس سے تو بندوں کا فائدہ نہیں نقصان ہے
کیونکہ چھوٹے اعمال بڑے عملوں سے مل کر بدلہ کو بڑھا دیتے ہیں کم
نہیں کرتے۔ اور خالی بڑا عمل چھوٹے عملوں سے علیحدہ رہ کر
بڑا نہیں چھوٹا ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن سے الگ ہو کر
اُس کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ دس کا عدد چھ اور
سات سے بڑا ہے لیکن ۱۰ + ۶ + ۷ سے بڑا نہیں
جمع کی صورت میں دس کو اگر چھ اور سات سے الگ کر
دیا جائے تو یہ چھوٹا ہو جائیگا۔ پس اللہ تعالیٰ کا
یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارے ادنیٰ اعمال کو
ہم بغیر بدلہ کے چھوڑ دیں گے اور صرف بڑے عمل کا بدلہ
دیں گے۔ لازماً ماننا پڑتا ہے کہ اسجگہ عام جزا کا
ذکر نہیں بلکہ خاص قسم کی جزاء کا ذکر ہے۔ عام جزا میں
تو بے شک چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی ضائع نہیں
کیا جائیگا۔ جیسا کہ فرماتا ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور (کہا ہے کہ) اگر وہ دونوں تجھ سے

لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ

اس بات میں بحث کریں کہ تو کسی کو میرا شریک قرار دے حالانکہ اُسکا تجھے کوئی علم نہیں تو تو اُن دونوں کی فرمانبرداری

اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ⑨

نہ کر کیونکہ تم سب نے میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے اور میں تمہارے عمل (کی نیکی بدی) سے تم کو واقف کرونگا۔ ۶ے

مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۔ لیکن اسجگہ جس قسم کی جزاء کا ذکر ہے اُس میں صرف بڑے عمل کو الگ کر لینے سے انسان کا فائدہ زیادہ ہوتا ہے اور دوسرے اعمال کے ساتھ شامل کر دینے سے بڑے عمل کی طاقت بھی کم ہو جاتی ہے ۔ جیسے ایک مصوّر ہزاروں تصویریں بناتا ہے لیکن اس کی سب تصویریں یکساں نہیں ہوتیں ۔ اس کی بہت سی تصویروں میں سے کوئی بہت اعلیٰ ہوتی ہے اور کوئی درمیانی اور کوئی ادنیٰ ۔ اعلیٰ تصویر جو اس کے کام کا منتہا کہلاتی ہے اور جسے انگریزی محاورہ میں "ماسٹر پیس" کہتے ہیں اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ انسان کی آخری تصویر ہی ہو ۔ کبھی وہ ابتدائی زمانہ کی تصویر ہوتی ہے کبھی درمیانی زمانہ کی اور کبھی آخری زمانہ کی ۔ اب اگر اُس مصوّر کو ایک نئی زندگی دی جائے اور اُس کی لیاقت کی اوسط نکال کر یا اس کی آخری عمر کی حالت کے مطابق اُسے اُس کی نئی زندگی میں ذہانتِ مصوّری بخشی جائے تو یقیناً اس کا نقطۂ مسابقت ادنیٰ ہو گا لیکن اگر اس کے ذہن کو اس سطح پر رکھ دیا جائے جو اُسے اپنی چوٹی کی تصویر بناتے وقت میسّر تھا تو اُسکا نقطۂ مسابقت یقیناً بہت اعلیٰ درجہ کا ہو گا ۔ گویا ذہن کی عام قابلیت اگر اعلیٰ سے اعلیٰ کام کے مطابق رکھی جائے تو وہ یقیناً اعلیٰ ہو گی ۔ بہ نسبت تمام کام کی اوسط نکال کر اُس کے مطابق رکھنے کے ۔ کیونکہ انسانی زندگی میں قبض اور بسط کے دَور آتے رہتے ہیں اور اُن دونوں کی اوسط گو قبض کی گھڑیوں سے اعلیٰ ہوتی ہے لیکن بسط کی اعلیٰ گھڑیوں سے بہت ادنیٰ ہوتی ہے ۔ اِسی قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دوسری زندگی میں ہم جو قوتِ عمل انسان کو بخشیں گے وہ اس کی پہلی زندگی کی ترقیات کی اوسط کے مطابق نہ ہو گی بلکہ اُس کی پہلی زندگی کی اُن گھڑیوں کے مطابق ہو گی جن میں انسان نے اپنا انتہائی کمال ظاہر کیا ہو گا خواہ وہ کمال زندگی کے کسی دَور میں ظاہر ہُوا ہو اور اِس سطح ہم اُسے ایک ایسا اعلیٰ نقطۂ مسابقت بخشیں گے جس پر کھڑے ہو کر وہ اعلیٰ مقامات کو بہت سرعت سے حاصل کر سکیگا ۔ اور اِن معنوں کے رو سے اعلیٰ سے اعلیٰ عمل کے مطابق جزاء کا ملنا ایک انعام ہے اور انعام بھی وہ جس کا خیال کر کے بھی دل خوشی سے اُچھل پڑتا ہے ۔

تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ۔

۶ے تفسیر :- فرماتا ہے ۔ ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق بڑی تاکید کی ہے کہ اُن سے نیک سلوک کیا جائے ۔ ہاں اگر وہ تم سے اس بات کے لئے جھگڑیں کہ تم کسی کو میرا شریک قرار دے دو ۔

جس کا تمہیں کوئی علم نہیں تو پھر اُن کی بات نہ مانو - یعنی مؤمن کو جب اس کے ماں باپ سے اچھا معاملہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ مومن خدا تعالیٰ سے جو ماں باپ سے بھی زیادہ محسن ہے اچھا معاملہ نہ کرے - اور جب ماں باپ خدا تعالیٰ کے خلاف کوئی بات کہیں تو اُن کی بات کو ردّ نہ کرے - بہرحال اس استثناء کے سوا ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرے اور اُن کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے - مجھے افسوس ہے کہ اِس زمانہ میں بہت سے نوجوان ایسے دکھائی دیتے ہیں جو اپنے ماں باپ کا مناسب احترام نہیں کرتے اور نہ اُنکے حقوق کا خیال رکھتے ہیں بلکہ اولاد میں سے کسی کو اگر کوئی اچھا عہدہ مل جائے تو وہ اپنے غریب والدین سے ملنے میں بھی شرم محسوس کرتا ہے - حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سُنایا کرتے تھے کہ کسی ہندو نے بڑی تکلیف برداشت کر کے اپنے لڑکے کو بی۔اے یا ایم۔اے کرایا اور اس ڈگری کو حاصل کرنے کے بعد وہ ڈپٹی ہو گیا - آجکل ڈپٹی ہونا کوئی بڑا اعزاز نہیں سمجھا جاتا - لیکن پہلے وقتوں میں ڈپٹی ہونا بھی بڑی بات تھی - اُس کے باپ کو خیال آیا کہ میرا لڑکا ڈپٹی ہو گیا ہے - مَیں بھی اُس سے مل آؤں - چنانچہ جس وقت وہ ہندو اپنے بیٹے کو ملنے کے لئے مجلس میں پہنچا تو اس وقت اُس کے پاس وکیل اور بیرسٹر وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے - یہ بھی اپنی غلیظ دھوتی کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گیا - باتیں ہوتی رہیں کسی شخص کو اُس غلیظ آدمی کا بیٹھنا بُرا محسوس ہُوا اور اُس نے پوچھا کہ ہماری مجلس میں یہ کون آکے بیٹھا ہے - ڈپٹی صاحب اسکی یہ بات سُنکر کچھ جھینپ سے گئے اور شرمندگی سے بچنے کے لئے کہنے لگے یہ ہمارے ٹہلیا ہیں - باپ اپنے بیٹے کی یہ بات سُن کر غصّے کے ساتھ جل گیا - اور اپنی چادر سنبھالتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہُوا - اور کہنے لگا - جناب مَیں اِن کا ٹہلیا نہیں اِن کی ماں کا ٹہلیا ہوں - ساتھ والوں کو جب معلوم ہُوا کہ یہ ڈپٹی صاحب کے والد ہیں تو انہوں نے اُس کو بہت لعن طعن کی اور کہا کہ اگر آپ ہمیں بتاتے تو ہم اُنکی مناسب تعظیم و تکریم کرتے - اور ادب کے ساتھ اُنکو بٹھاتے - بہرحال اس قسم کے نظارے روزانہ دیکھنے میں آتے ہیں کہ لوگ رشتہ داروں کے ساتھ ملنے سے جی چُراتے ہیں تاکہ اُن کی اعلیٰ پوزیشن میں کوئی کمی واقع نہ ہو جائے - گویا ماں باپ کا نام روشن کرنا تو الگ رہا اُن کے نام کو بٹہ لگانے والے بن جاتے ہیں - اور سوائے ان لوگوں کے جو اس نقطۂ نگاہ سے والدین کی عزت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ والدین کی عزت کرو - دنیا داروں میں سے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو والدین کی پورے طور پر عزت کرتے ہیں - اور زمینداروں اور تعلیم یافتہ طبقہ دونوں میں یہی حالات نظر آتے ہیں - اِسی طرح بعض نوجوان اپنی ماؤں کی خبر گیری ترک کر دیتے ہیں اور جب پُوچھا جاتا ہے تو اُن کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اماں جی کی طبیعت تیز ہے اور میری بیوی سے اُن کی بنتی نہیں - حالانکہ بیوی کو ماں سے کیا نسبت - بیوی نے اس کے فائدے کیلئے کیا کیا ہوتا ہے - وہ نوجوانی کی حالت میں اُس کی خدمت کرتی ہے لیکن ماں جس نے اپنی چھاتیوں سے دودھ پلایا ہوتا ہے، اور جس نے اپنا خون دودھ کی شکل میں تبدیل کر کے اُسکی پرورش کی ہوتی ہے اور محنت و مشقت کر کے پڑھایا ہوتا ہے اس سے اس لئے اعراض کر لیا جاتا ہے کہ بیوی سے اُس کی بنتی نہیں - پس اس خطرناک نقص کو دُور کرو - اور اپنے والدین کی خدمت بجا لاؤ - ورنہ تم اس جنّت سے محروم ہو جاؤ گے - جو تمہارے ماں باپ کے قدموں کے نیچے رکھی گئی ہے۔

آخر میں فرمایا اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ - آخر تم نے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ⑩

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اُس کے مطابق اُنہوں نے عمل بھی کیا ہو ہم اُن کو اچھے بندوں میں داخل کریں گے۔ ۷

خدا تعالیٰ کی طرف ہی لوٹنا ہے اور تمام اعمال کا نتیجہ اُسی نے ظاہر کرنا ہے اِس لئے تمہارا کام یہی ہے کہ جب شرک کا سوال آئے تو اپنے ماں باپ کی اطاعت کرنے سے انکار کر دو۔ مگر اس استثناء کے علاوہ تمام دنیوی معاملات میں اُن کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اور اُن کی کامل فرمانبرداری کرو۔

احادیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک لڑکی کے پاس جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیوی کی بہن تھیں اُن کی والدہ آئیں۔ اُنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میری ماں آئی ہے اور چاہتی ہے کہ میں اس سے کچھ سلوک کروں مگر وہ کافرہ ہے۔ کیا میں اُس سے حسنِ سلوک کر سکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں بیشک کرو۔ یہ دنیوی معاملہ ہے اِس میں کوئی حرج نہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ایک دفعہ ایک جبّہ دیا جو ریشمی تھا۔ اُنہوں نے عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک دفعہ آپؐ کو ایک ریشمی جبّہ پیش کیا تھا۔ مگر آپؐ نے اُس کو پسند نہ فرمایا۔ اب آپ مجھے خود ریشمی جبّہ دے رہے ہیں۔ کیا میں اِس کو پہن لوں۔ آپؐ نے فرمایا۔ میں نے پہننے کے لئے نہیں دیا کسی کو تحفۃً دے دو یا بیچ ڈالو۔ اِس پر اُنہوں نے اپنے بھائی کو جو مکّہ میں رہتا تھا اور کافر تھا دے دیا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اختلاف کی وجہ سے تعلقات منقطع نہیں ہو جاتے بلکہ مومن کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ہر حالت میں اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کا احترام کرے اور ہمیشہ اُن سے حسنِ سلوک کرتا رہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ابتلاؤں کے ذکر میں ماں باپ سے حسنِ سلوک کی تاکید اس لئے کی گئی ہے کہ نبیوں کے آنے پر بسا اوقات نوجوان طبقہ تو پُرانے خیالات سے آزاد ہونے کی وجہ سے صداقت کو قبول کر لیتا ہے لیکن اُن کے والدین اپنے پُرانے عقائد پر ہی قائم رہتے ہیں اور چونکہ مذہبی عقائد کا اختلاف ماں باپ اور اُن کی اولاد میں ایک وسیع خلیج حائل کر دیتا ہے اِس لئے بعض دفعہ والدین ایسی سختی پر اُتر آتے ہیں کہ وہ اپنے بیٹوں کو اپنے گھروں سے نکال دیتے یا انہیں اپنی جائیدادوں سے بے دخل کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کو توجہ دلاتا ہے کہ بیشک تمہارا صداقت قبول کرنا ایک بڑی بھاری نیکی ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ تم ان سختیوں کی وجہ سے اپنے ماں باپ سے حسنِ سلوک ترک کر دو۔ تمہارا کام یہی ہے کہ تم ہمیشہ اُنکے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ اور دنیوی معاملات میں اُن سے محبت کے ساتھ پیش آؤ۔ ہاں اگر وہ تمہیں کبھی خدا اور اُس کے رسول سے برگشتہ کرنے کی کوشش کریں تو تم فوراً کہہ دو کہ اس معاملہ میں ہم آپ کی اطاعت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

۷ تفسیر:۔ اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سچے دل سے ایمان لائے ہیں اور پھر اس ایمان کے مطابق اُنہوں نے اعمالِ صالحہ بھی کئے ہیں ہم انہیں یقیناً صالحین میں داخل کرینگے یعنی اُن صادق اور راستباز لوگوں میں شامل کرینگے جن کے متعلق زبور میں[۵] ہم نے وعدہ کیا تھا کہ انہیں فلسطین کی بادشاہت دی جائیگی گویا وہ وعدہ

[۵] زبور باب ۳۷ آیت ۲۹

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ

اور لوگوں میں سے (بعض ایسے بھی ہوتے ہیں) جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ (تعالیٰ) پر ایمان لے آئے ہیں پھر جب اللہ (تعالیٰ) کی وجہ سے انکو تکلیف

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ

دی جاتی ہے وہ لوگوں کے عذاب کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیتے ہیں اور اگر تیرے رب کی طرف سے مدد آتی ہے

لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ

تو وہ کہتے ہیں (درحقیقت) ہم بھی تمہارے ساتھ تھے۔ کیا دُنیا جہان کے لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اُس کو

صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ⑪ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اللہ (تعالیٰ) اچھی طرح نہیں جانتا؟ اور اللہ (تعالیٰ) ضرور ظاہر کردیگا اُن کو بھی جو ایمان لائے

وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ⑫

اور اُن کو بھی جو منافق ہیں۔ ۵۸

جو بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا اب مسلمانوں کے ایمان اور عمل صالح کرنے کی وجہ سے اُن کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ چنانچہ جب تک مسلمان صالح رہے فلسطین مسلمانوں کے پاس رہا۔ اور جب اُن میں بگاڑ پیدا ہو گیا فلسطین بھی اُن سے چھن گیا۔ مگر جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات سے ظاہر ہے یہ فلسطین کا چھننا عارضی ہے ایک دن اللہ تعالیٰ انکو پھر اس ملک میں لائیگا اور انکی موجودہ پسپائی فتح سے بدل جائے گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔ امریکن قوم بڑی ہوشیار ہے مگر اس موقعہ پر اُس نے سخت غلطی کی ہے اور ایک ایسی قوم کی حمایت کے لئے کھڑی ہوگئی ہے جس کو بائبل بھی ملزم قرار دیتی ہے اور قرآن کریم بھی ملزم قرار دیتا ہے۔ یہودی اگر فلسطین میں مستقل طور پر رہنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ وہ صالحین میں شامل ہو جائیں۔ خدا تعالیٰ کو اُن سے کوئی دشمنی نہیں۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد

میں سے ہیں۔ اگر وہ صالح بن جائیں تو وہ اس ملک میں رہ سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ صالح کی تشریح میں فرماتا ہے کہ جو لوگ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں وہ صالح اور شہید اور صدیق وغیرہ کا مقام پائیں گے۔ پس صالح بننے کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی پیروی ضروری ہے۔ اگر یہود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں۔ تو اللہ تعالیٰ انکو اس ملک میں قائم رکھیگا اور وہ اُسی طرح مسلمانوں کے بھائی ہونگے جس طرح اسحاقؑ اسمٰعیلؑ کا بھائی تھا۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہمت کرکے خدا تعالیٰ کے قانون کو اپنی تائید میں نہ بنائیں۔

۵۸ تفسیر: ۔ اس آیت میں بتایا کہ جو لوگ صرف مُنہ کے ایمان پر بھروسہ کرتے ہیں اُن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اُن کو

کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لوگوں کے عذاب دینے کو وہ اللہ کے
عذاب دینے کے برابر سمجھ لیتے ہیں۔ اور جب کبھی تیرے رب کی
طرف سے نصرت آجائے تو پھر اپنی اصل حالت کو چھپانے
کے لئے مسلمانوں کے پاس آآکر کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ
تھے۔ حالانکہ وہ صرف مُنہ سے ساتھ تھے دل سے ساتھ
نہیں تھے۔ مومنوں کو اس قسم کے بُزدلانہ رویہ سے بچنا چاہیئے
اور صداقت پر پوری مضبوطی سے قائم رہنا چاہیئے۔

آج سب سے بڑی مصیبت سچ کی اشاعت میں
یہی ہے کہ لوگ قوم اور ملک کی رسوم کا مقابلہ نہیں کرسکتے
یورپ میں سے لاکھوں آدمی ایسے ہیں جن کے دلوں پر
اسلام کی سچائی نے اثر کر لیا ہے مگر وہ ملک کی اور قوم
کی رسوم کا مقابلہ کرنے اور اپنے ہمسائیوں کے تمسخر سے گھبراتے
ہیں۔ اگر وہ دلیر ہوجائیں تو نہ صرف اُنکو سچائی قبول کرنے
کا موقعہ ملے بلکہ اُنکو دیکھ کر ہزاروں اور آدمی آگے آجائیں
اور سچائی دنوں میں اتنی پھیل جائے جو پچھلی صدیوں میں نہیں
پھیلی تھی۔ کیونکہ اس زمانہ کی تمام خرابیوں کے باوجود اس
میں اتنی خوبی موجود ہے کہ علوم کے خزانے باہر آگئے ہیں اور
ہر علم کے متعلق اتنی کتابیں موجود ہیں کہ انسان آسانی سے
ان علوم کو حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بات پہلے لوگوں کو میسّر
نہ تھی پس مبارک ہے وہ جو اس سامان سے فائدہ اُٹھاتا ہے
اور سچے مذہب کے قائم کرنے میں اپنی نیک مثال سے مدد
دیتا ہے۔ یقیناً اللہ تعالےٰ کے فضل اُس پر نازل ہونگے۔
اور آنے والی نسلیں اُن کو دُعائیں دیں گی۔ ہم انتظار کرتے
ہیں کہ یورپ اور امریکہ میں سے کون کون سے لوگ اس
مقام کو حاصل کرتے ہیں۔

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ سے معلوم ہوتا
ہے کہ ابتلاء اور عذاب میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے مگر
لوگ اپنی نادانی سے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے اور خدا تعالیٰ
کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو وہ اپنی تباہی کا موجب
سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اُن کی ترقی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔

ابتلاء اور عذاب میں فرق یہ ہے کہ (۱) عذاب کا نتیجہ ہلاکت
اور تباہی ہوتی ہے مگر ابتلاء کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا۔ تکلیفیں تو
دونوں طرح ہی آتی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق
ہی دیکھ لو۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ آپ دشمن کے نرغے میں
اکیلے پھنس گئے۔ مگر پھر اللہ تعالےٰ نے آپ کو بچا لیا مگر
ابوجہل ایک ہی دفعہ فوجوں سمیت پکڑا گیا اور ہلاک ہوگیا

(۲) عذاب کے نتیجہ میں نقصان کی زیادتی ہوتی ہے
اور ابتلاء میں نفع کی زیادتی ہوتی ہے۔ ابتلاء کی مثال تو
ایسی ہوتی ہے جیسے ربڑ کے گیند کو جتنے زور سے پھینکا
جائے وہ اتنا ہی اُچھلتا ہے۔ مگر عذاب میں گِر کر انسان
اوپر نہیں اُٹھ سکتا۔

(۳) عذاب جس انسان پر نازل کیا جاتا ہے اُس کے
دل میں مایوسی اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ مگر جس پر ابتلاء نازل
ہوتا ہے اُس کے دل میں اطمینان اور تسلی ہوتی ہے جب
عذاب نازل ہوتا ہے تو مغضوب کہتا ہے۔ ہائے میں ہلاک
ہوگیا۔ یا اگر وہ اس سے گھبراتا نہیں تو اُس کے دل میں
کبر اور خود پسندی کے جذبات جوش مارنے لگتے ہیں اور
وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کون ہلاک کرسکتا ہے۔ لیکن جب
ابتلاء آتا ہے تو انسان کہتا ہے کوئی پرواہ نہیں میں کمزور
اور بے کس ہوں لیکن میرا بچانے والا طاقت ور ہے اور
وہ خدا تعالیٰ پر یقین میں اور بھی ترقی کر جاتا ہے اور خدا
تعالےٰ پر اُس کی حسن ظنی بہت بڑھ جاتی ہے۔

(۴) عذاب کے دُور کرنے کی انسان جب کوشش
کرتا ہے تو ٹھوکریں کھاتا ہے۔ مگر جس پر ابتلاء آتا ہے اُس
کا فہم رسا ہوجاتا ہے اور وہ بات کو خوب سمجھنے لگ جاتا
ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیکھ لو۔ کفار آپ کا
کھوج لگاتے لگاتے غارِ ثور تک پہنچ گئے اور وہاں جا
کر کھوجی نے کہہ دیا کہ یا تو وہ آسمان پر چلا گیا ہے اور

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَ

اور کافر مومنوں سے کہتے ہیں۔ تم ہمارے پیچھے چلو۔

لْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ

ہم تمہارے گناہ اُٹھائیں گے۔ حالانکہ وہ اُن کے گناہ (بالکل) نہیں اُٹھا

یا نہیں ہے۔ اُن میں کھوجی کی بات کا بڑا لحاظ کیا جاتا تھا
اِس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان اُس وقت سخت
خطرہ میں تھی۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا بھی
گھبراہٹ نہ ہوئی۔ بلکہ آپؐ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ
کو بھی تسلی دینی شروع کر دی اور فرمایا کہ لَا تَحْزَنْ
اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ غم نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ
ہے۔ اِسی طرح ایک دفعہ آپؐ سوئے ہوئے تھے کہ ایک
کافر نے آپؐ کی تلوار اُٹھالی اور آپ کو قتل کرنا چاہا۔
لیکن آپ ذرا بھی نہ گھبرائے۔ اور اُس کے اس سوال پر
کہ اب آپؐ کو کون بچا سکتا ہے آپؐ نے نہایت تسلی
سے جواب دیا کہ "اللہ"۔ اِس غیر معمولی حالتِ اطمینان
کو دیکھ کر اُس کافر پر اسقدر دہشت طاری ہوئی کہ
اُس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی۔

(۵) پانچواں فرق یہ ہے کہ ابتلاء میں انسان کو
احساسِ بلاء نہیں ہوتا جب ابتلاء آتا ہے تو انسان اُن
تکالیف کو حقیر سمجھتا ہے اور اِن میں لذت محسوس کرتا ہے
کیونکہ اُس کے دل میں یقین ہوتا ہے کہ میں ادنیٰ چیز کو اعلیٰ
پر قربان کر رہا ہوں۔ مثلاً اُس کا مال جاتا ہے تو کہتا ہے
خدا کے لئے ہی گیا ہے اس لئے کیا پرواہ ہے۔ یا اگر اُس
کا بیٹا مرجاتا ہے تو کہتا ہے خدا نے ہی دیا تھا اگر اُس
نے واپس لے لیا ہے تو کیا غم ہے۔ حضرت مسیح موعود
علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی واقعہ ہے۔ مبارک احمد سے
آپ کو بڑی محبت تھی اور اُس کی بیماری میں آپ نے
بڑی تیمارداری کی۔ اِس سے حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ
تک کو بھی یہ خیال تھا کہ اگر مبارک احمد فوت ہو گیا تو
حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بڑا صدمہ ہوگا۔ آخری وقت
حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ اُس کی نبض دیکھ رہے تھے
کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو انہوں نے کہا مُشک لائیں
اور چونکہ اُس کی نبض بند ہو رہی تھی۔ آپ پر اس خیال کا
کہ اس کی وفات سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بہت
صدمہ ہوگا اس قدر اثر ہوا کہ آپ کھڑے کھڑے زمین پر
گر گئے۔ مگر جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو معلوم ہوا
کہ مبارک احمد فوت ہو گیا ہے۔ تو اُسی وقت نہایت
صبر کے ساتھ دوستوں کو خط لکھنے لگ گئے کہ مبارک احمد
فوت ہو گیا ہے۔ مگر اس امر پر گھبرانا نہیں چاہیئے یہ
اللہ تعالیٰ کی ایک مشیئت تھی جس پر ہمیں صبر کرنا چاہیئے
اور پھر باہر آکر مسکرا مسکرا کر تقریر کرنے لگ گئے کہ
مبارک احمد کے متعلق خدا تعالیٰ کا جو الہام تھا وہ پورا
ہو گیا۔ چنانچہ آپ کا ایک شعر بھی ہے کہ ؎

بُلانے والا ہے سب سے پیارا اُسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

غرض ابتلاء میں دُکھ کا اثر قلب پر ہمت شکن نہیں
ہوتا کیونکہ انسان سمجھتا ہے کہ میں ادنیٰ کو اعلیٰ پر قربان
کر رہا ہوں۔ بعض اوقات سخت عذاب میں بھی احساسِ
تکلیف مِٹ جاتا ہے۔ مگر یہ اختلالِ حواس کی وجہ سے
ہوتا ہے۔ ایک دفعہ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ نے
ایک عورت دکھائی اور اُس سے پوچھا تمہارے فلاں

مِّنْ شَيْءٍ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ

سکتے۔ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے

وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اور اپنے بوجھوں کے سوا اور لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں گے (جن کو وہ دھوکا دیتے ہیں) اور قیامت کے دن اُن سے اُن کے

عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۴﴾

اس افتراؤں کے بارہ میں سوال کیا جائیگا۔ ۵۹

ع ۱ ۱۳

رشتہ دار کا کیا حال ہے؟ اُس نے ہنس کر بتایا کہ وہ تو مرگیا ہے۔ اِسی طرح ایک دو اور رشتہ داروں کے متعلق پوچھا اور وہ ہنس ہنس کر بتاتی رہی۔ اب وہ معرفت کے لحاظ سے اِس طرح نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اُس کو بیماری تھی اور اُس میں غم محسوس کرنے کی حس ہی باقی نہیں رہی تھی۔

(۶) چھٹا فرق یہ ہے کہ عذاب میں روحانیت کم ہو جاتی ہے مگر ابتلاء میں زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ عذاب میں خدا تعالیٰ سے دُوری ہو جاتی ہے مگر ابتلاء میں خدا تعالیٰ کی طرف اور زیادہ توجہ ہو جاتی ہے۔

ابتلاء اور عذاب میں یہ چھ موٹے موٹے فرق ہیں جن کو یاد رکھنا چاہیئے۔

اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ میں بتایا کہ وہ بزدل لوگ جو مشکلات کے دَور میں مومنوں کا ساتھ نہیں دیتے لیکن جب مصائب کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور فتوحات کا دَور آجاتا ہے تو مومنوں کو آآکر کہتے ہیں کہ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں ہمیں بھی انعامات میں شریک کیا جائے۔ کیا انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ ایمان کا انعام تو خدا نے دینا ہے مسلمانوں نے نہیں دینا اگر انہیں دنیوی مال و دولت یا حکومتی عہدوں میں سے کوئی عہدہ مل بھی گیا تو کیا ہوا اصل انعام تو خدا تعالیٰ نے دینا ہے اور وہ تمہاری اس دھوکا بازی کو خوب جانتا ہے اس لئے یہ چالاکیاں تمہارے کسی کام نہیں آسکتیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دُنیا میں بھی ابھی کئی جھٹکے ایسے لگیں گے جن سے تمہاری اس منافقت کا پردہ چاک ہو جائیگا۔ چنانچہ فرمایا وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ متواتر ایسے ابتلاء پیدا کرتا چلا جائیگا جن سے دنیا پر بھی ظاہر ہو جائیگا کہ کون سچا مومن تھا اور کون منافق۔ اور خود اُن منافقوں پر بھی اپنے دعوئے ایمان کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔

۵۹ تفسیر:۔ فرمایا۔ ایسے موقعہ پر کفار مسلمانوں سے مایوس ہوکر کا فر کہہ دیا کرتے ہیں کہ تم ہمارے رستہ پر چلو ہم تمہارے بوجھ اٹھالیں گے۔ حالانکہ وہ اپنے مخاطبین کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں اُٹھا سکتے وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ہاں اُن کی اس بے ہودہ گوئی کا نتیجہ یہ ضرور نکلے گا کہ وہ اپنے بوجھ بھی اُٹھائیں گے اور اسکے علاوہ مزید سزا بھی حاصل کریں گے اور قیامت کے دن اُن سے پوچھا جائیگا کہ تم اتنا جھوٹ کیوں بولتے رہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ کفر انسان کی عقل پر ایسا پردہ ڈال دیتا ہے کہ بڑے بڑے عقلمند کہلانے والے

آدمی بھی ایسی باتیں کہنے لگ جاتے ہیں جو ایک بچہ کے نزدیک بھی
قابلِ ہنسی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف اس طبعی طریق کو دیکھو
جو قرآن کریم نے اوپر کی آیات میں بیان فرمایا ہے کہ گناہوں
سے بچنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ انسان توبہ کرے۔ لقاءِ الٰہی
کے حصول کی کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کر
کام لے اور دوسری طرف اس غیر طبعی طریق کو دیکھو جس کا
دعویٰ کفار کیا کرتے تھے بلکہ اب بھی کرتے ہیں تو معلوم
ہو جائیگا کہ قرآن کریم کی باتیں نہایت سچی اور صحیح ہیں اور
اس کے مخالفوں کی باتیں نہایت بودی اور کچی ہیں۔ کفار کا
یہ دعویٰ کہ اگر مومن اُن کی بات مان کر کافر ہو جائیں تو
وہ اُن کا بوجھ اُٹھالیں گے بالکل خلافِ عقل ہے حقیقت
یہ ہے کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ نہ مومن کافر کا
نہ کافر مومن کا۔ بوجھ تو اللہ تعالیٰ معاف کرکے اُٹھاتا ہے
اور اسی کے حقیقی ذریعہ کا نام توبہ ہے۔

غرض اسلام جو ایک فطرتی مذہب ہے، وہ گنہگار کے
لئے توبہ کا دروازہ کھولتا ہے اور اسے لقاءِ الٰہی کی اُمید
دلاتا ہے مگر غیر مذاہب اس فطری طریق کے خلاف قدم
اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً عیسائیت لوگوں کو یہ ترغیب دیتی ہے کہ
اگر وہ یسوع مسیح پر ایمان لے آئیں تو محض اس ایمان کی
برکت سے ہی اُن کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔

عیسائیت اس بارے میں یہ نظریہ پیش کرتی ہے کہ
شیطان نے آدمؑ اور اس کی بیوی حوّا کو ورغلایا اور گنہگار
کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہر شخص جو دنیا میں پیدا ہوتا
ہے وہ گناہ کا ورثہ لے کر آتا ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ عادل ہے
اور اس کے عدل کا تقاضا ہے کہ ہر گنہگار کو سزا دے اس
لئے آدمؑ و حوّا کے گناہ کی وجہ سے دنیا کا ہر شخص سزا کا
مستحق ہے۔ مگر دوسری طرف خدا تعالیٰ کا رحم تقاضا کرتا
ہے کہ وہ گنہگاروں کو معاف کر دے سو اس مشکل کے حل
کے لئے اُس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ
بے گناہ ہو کر صلیب پر لٹکایا جائے، اور سچا ہو کر جھوٹا قرار
پائے۔ چنانچہ وہ مسیح کی شکل میں دنیا میں ظاہر ہوا اور
یہود نے اُسے بلا کسی گناہ کے صلیب پر لٹکا دیا اور وہ
تمام ایمان لانے والوں کے گناہ اُٹھا کر اُن کی نجات
کا موجب ہوا۔ یہ نظریہ جو عیسائیت پیش کرتی ہے۔
اِس قدر خلافِ عقل ہے کہ اس پر جتنا بھی غور کیا جائے
اتنا ہی انسان حیران ہو جاتا ہے اور اسے تعجب آتا ہے کہ
یہ گناہوں کی معافی کی کونسی صورت ہے۔ اگر گنہگار کے
گناہ کو معاف کرنا عدل کے خلاف ہے تو بے گناہ کو
سزا دینا بھی تو عدل کے خلاف ہے۔ پھر یہ کس طرح ہوا
کہ خدا کے بیٹے نے دوسروں کے گناہ اپنے سر پر لے لئے
اور خدا نے اس بے گناہ کو پکڑ کر سزا دے دی؟ پھر
عقلاً بھی یہ بالکل غلط بات ہے کہ باپ جو کچھ کرے بیٹے
کو اُس کا ضرور ورثہ ملتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جاہل ماں باپ
کے لڑکے ہمیشہ جاہل رہتے اور عالموں کے عالم۔ مسلول
ماں باپ کے بچے ہمیشہ مسلول نہیں ہوتے نہ کوڑھیوں کے
بچے ہمیشہ کوڑھی ہوتے ہیں۔ بعض باتوں میں ورثہ ہے
اور بعض میں نہیں۔ اور جہاں ورثہ ہے وہاں بھی خدا تعالیٰ
نے ورثہ سے بچنے کے سامان پیدا کئے ہیں۔ اگر ورثہ سے
بچنے کے سامان نہ ہوتے تو تبلیغ اور تعلیم کا مقصد کیا رہ
جاتا۔ کافروں کے بچوں کا ایمان لے آنا بتاتا ہے کہ ایمان
کے معاملہ میں خدا تعالیٰ نے ورثہ کا قانون جاری نہیں کیا
اگر اس میں بھی ورثہ کا قانون جاری ہوتا تو مسیح کی آمد بھی
بے کار ہو جاتی۔ اسلام کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان
کو نیک طاقتیں دے کر پیدا کیا ہے۔ پھر بعض انسان ان
طاقتوں کو ترقی دیتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور
بعض ان کو پاؤں تلے روند دیتے ہیں اور نامراد ہو جاتے
ہیں۔ قانونِ شریعت بے شک سب کا سب قابلِ عمل ہے
لیکن نجات کی بنیاد عمل پر نہیں بلکہ ایمان پر ہے جو نفس کو

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ پس وہ اُن میں نو سو پچاس سال تک

خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۵﴾

رہا۔ سو اُس کی قوم کے لوگوں کو طوفان نے آلیا اور وہ ظالم تھے۔ ؎

جذب کرتا ہے عمل اُس کی تکمیل کا ذریعہ ہے اور نہایت ضروری ہے لیکن پھر بھی وہ تکمیل کا ذریعہ ہے اور ذریعہ کی کمی سے چیز کا نقصان نہیں ہوتا۔ بیج سے درخت پیدا ہوتا ہے لیکن پانی سے وہ بڑھتا ہے۔ ایمان بیج ہے اور عمل پانی جو اسے اوپر اُٹھاتا ہے۔ خالی پانی سے درخت نہیں اُگ سکتا لیکن بیج ناقص ہو اور پانی میں کسی قدر کمی ہو جائے تب بھی کسی قدر درخت اُگ آتا ہے۔ کسان ہمیشہ پانی دینے میں غلطیاں کر جاتے ہیں لیکن اس سے کھیت مارے نہیں جاتے جب تک بہت زیادہ غلطی نہ ہو جائے۔ انسانی عمل ایمان کو تازہ کرتا ہے۔ اور اُس کی کمی اُس میں نقص پیدا کرتی ہے۔ لیکن اس کی ایسی کمی جو شرارت اور بغاوت کا رنگ نہ رکھتی ہو اور حد سے بڑھنے والی نہ ہو ایمان کی کھیتی کو تباہ نہیں کرسکتی اور اگر شرارت اور بغاوت بھی ہو تو خدا کا عدل توبہ کے راستہ میں روک نہیں۔ عدل اس کو نہیں کہتے کہ ضرور سزا دی جائے بلکہ اس کو کہتے ہیں کہ بے گناہ کو سزا نہ دی جائے۔ پس گنہگار کو رحم کرکے بخشنا اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کے مخالف نہیں بلکہ عین مطابق ہے۔ اگر عدل کے معنے یہ ہوں کہ ہر عمل کی عمل کے برابر جزا ملے تو بخشش اور نجات کے معنے کیا ہوئے؟ کیونکہ عدل کے معنے برابر کے ہیں اور اگر یہ صحیح ہو تو کسی شخص کو اس کی عمر کے برابر ایام کے لئے ہی نجات دی جاسکتی ہے اور وہ بھی اس کے اعمال کے وزن کے برابر۔ مگر اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ پھر نہ معلوم خدا تعالیٰ کی رحمت کو اس مسئلہ سے کیوں محدود کیا جاتا ہے۔ اسلام بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ مالک ہے اور مالک کے لئے انعام اور بخشش میں کوئی حد بندی نہیں۔ وہ بے شک وزن کرتا ہے لیکن اُس کا وزن اس لئے ہوتا ہے کہ کسی کو اُس کے حق سے کم نہ ملے۔ نہ اس لئے کہ اُس کے حق سے زیادہ نہ ملے

مسیح بے شک بے گناہ انسان اور خدا کا رسول تھا۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ وہ دوسروں کا بوجھ اُٹھائیگا۔ قیامت کے دن ہر شخص کو اپنی صلیب خود ہی اُٹھانی ہوگی۔ اور جو خود اپنی صلیب نہ اُٹھا سکیگا وہ نجات بھی نہ پاسکیگا۔ سوائے اس کے کہ خدا کے فضل کے ماتحت اُس کی بخشش ہو اور خدا تعالیٰ خود کسی کا بوجھ اُٹھالے۔

حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں یہی نظریہ پیش کیا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں:-

"جو کوئی اپنی صلیب اُٹھا کر میرے پیچھے نہیں آتا میرے لائق نہیں ہے۔"

(متی باب ۱۰ آیت ۳۸)

حضرت مسیحؑ کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ عیسائیوں کا یہ کہنا کہ مسیح نے گناہگاروں کا بوجھ اُٹھا لیا ہے بالکل غلط ہے۔ ہر شخص کو اپنا بوجھ خود اُٹھانا پڑیگا اور اپنی صلیب آپ اُٹھانی پڑیگی۔

؎ **تفسیر**:- اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے حالانکہ پہلی آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا کوئی ذکر نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کا ذکر ہے اور کہا گیا ہے کہ کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ اُنکو کسی فتنہ میں نہیں ڈالا جائیگا

فَأَنجَيْنَـٰهُ وَأَصْحَـٰبَ ٱلسَّفِينَةِ وَجَعَلْنَـٰهَآ ءَايَةً لِّلْعَـٰلَمِينَ ﴿١٦﴾

پس ہم نے اُس کو اور اُس کی کشتی میں بیٹھنے والے ساتھیوں کو نجات دی اور ہم نے اِس واقعہ کو تمام جہان کے لوگوں کیلئے ایک نشان بنا دیا۔ ۱۱

وَإِبْرَٰهِيمَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ وَٱتَّقُوهُ ۖ ذَٰلِكُمْ

اور ہم نے ابراہیم (کو بھی رسول بناکر بھیجا تھا) جب اُس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ (تعالیٰ) کی عبادت کرو اور اُسکا تقویٰ اختیار کرو۔ اگر تم

خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٧﴾

جانتے ہو تو یہ تمہارے لئے بہت اچھا ہے۔ ۱۲

اور یُوں ہی چھوڑ دیا جائیگا۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا ذکر کرنیکے بعد نُوحؑ کا ذکر کیوں کیا گیا۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ نوحؑ کی قوم کا اِس لئے ذکر شروع کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ فتنہ میں ڈالنے کا طریق قدیم سے چلا آتا ہے۔ اور نوحؑ شرعی نبیوں میں سے سب سے پہلے نبی ہیں یا کم سے کم حضرت آدمؑ کے بعد دوسرے۔ پس اس وقت سے لیکر اگر بعد کے چند نبیوں کا ذکر ہو جائے تو مومنوں کو آزمائش میں ڈالنے کا جو ذکر تھا اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پس نوحؑ کے ذکر سے مومنوں کے ابتلاؤں کی کڑی کا ذکر کیا گیا ہے۔

اِس آیت میں جو یہ ذکر آتا ہے کہ لَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا نوحؑ اپنی قوم میں ساڑھے نوسو سال رہے اس کے یہ معنے نہیں کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نوسو سال تھی۔ بلکہ اس رہنے کے معنے روحانی رہنے کے ہیں۔ یعنی نوحؑ کی تعلیم اپنی قوم میں ساڑھے نوسو سال تک رہی پھر مٹ گئی۔

۱۱ **تفسیر:**۔ اسجگہ اُن ابتلاؤں کا ذکر ہے جو حضرت نوحؑ علیہ السلام کی جماعت کو پیش آئے۔ اور بتایا گیا ہے کہ نوحؑ اور اُس کے ماننے والوں کو لوگوں نے بڑی تکلیف دی۔ یہاں تک کہ اُن سب کو ایک کشتی کے ذریعہ اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ اور وہ کشتی آئندہ آنیوالی نسلوں کے لئے خدا تعالیٰ کا ایک نشان قرار پائی۔ چنانچہ آج تک اُس کشتی پر بحث ہو رہی ہے۔ اور محکمہ آثارِ قدیمہ کے لوگ کبھی اُس کشتی کے آثار آرمینیا میں دیکھتے ہیں۔ اور کبھی روس میں۔ حالانکہ بالکل ممکن ہے کہ چونکہ ہر رسول کو دوسرے رسول کا قائمقام قرار دیا جاتا ہے۔ بہت سے نبیوں کے مخالفین پر نوحؑ کے زمانہ کے سے عذاب آئے ہوں اور کئی نبیوں کو کشتی کے ذریعہ سے بچنا پڑا ہو جیسا کہ حضرت یُونسؑ کا مشہور واقعہ ہے۔ پس ممکن ہے ایک کشتی نہ ہو بلکہ بہت سی کشتیاں ہوں جو اپنے اپنے زمانہ میں خدا تعالیٰ کا نشان بنی ہوں۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی مصر چھوڑنا پڑا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی مکہ چھوڑنا پڑا۔ اِسی طرح معلوم ہوتا ہے مختلف ملک اور مختلف قومیں تھیں جن پر نوحؑ کے زمانہ کے سے عذاب آئے۔ مگر بعد کے لوگوں نے غلطی سے سب کو ایک سمجھ لیا۔

۱۲ **تفسیر:**۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرماتا ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی حضرت نوح علیہ السلام کی امت میں سے ہی تھے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ ایک دوسرے مقام پر اِس حقیقت کا اِن الفاظ میں اظہار فرماتا ہے کہ

إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ أَوْثَانًا وَّتَخْلُقُونَ

تم اللہ (تعالیٰ) کے سوا (دوسری ہستیوں کی) عبادت کرتے ہو۔ اور مذہب کے بارے میں جھوٹی

إِفْكًا ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُونَ

باتیں بناتے ہو۔ وہ (ہستیاں) جن کی تم اللہ (تعالیٰ) کے سوا پرستش کرتے ہو تمہیں رزق

لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ

نہیں دے سکتیں۔ پس اللہ (تعالیٰ) سے اپنا رزق مانگو۔ اور اُس کی عبادت کرو۔

وَاشْكُرُوا لَهُ ۖ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۱۸﴾

اور اُس کا شکر ادا کرو۔ تم کو اُسی کی طرف لوٹا کرلے جایا جائیگا ۱۳؎

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ (الصّٰفّٰت ع ۳ آیت ۸۴) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے متبعین میں سے تھے۔ پس اس مناسبت کی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک ممتد ہوا۔ پس حضرت نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال کی عمر سے یہ مراد نہیں کہ اُن کو ساڑھے نو سو سال کی جسمانی زندگی ملی۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ساڑھے نو سو سال تک جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ تک ممتد ہونے تھے حضرت نوحؑ کی تعلیم اور تلقین لوگوں کے لئے مشعلِ راہ بنی رہی اور اِس طرح وہ روحانی رنگ میں ساڑھے نو سو سال تک زندہ رہے۔

۱۳؎ تفسیر:۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس زمانہ میں مبعوث ہوئے اس زمانہ کے لوگوں میں بھی شرک پایا جاتا تھا جس کو مٹانے کے لئے آپ کو بہت بڑا جہاد کرنا پڑا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں بھی شرک پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن چونکہ وہ دَور صفاتِ الٰہیہ کے احساس کا ابتدائی دَور تھا اس لئے شرک بھی صرف بسیط شکل میں تھا۔ یعنی بعض لوگ اپنے بزرگوں کے مجسمے پوجنے لگ گئے تھے یا بعض نے کوئی اور سادہ قسم کا شرک اختیار کر لیا تھا۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں شرک ایک فلسفیانہ مضمون بن گیا تھا۔ اور اب عقلوں پر فلسفہ کا غلبہ شروع ہو گیا تھا اور اُس کے ساتھ ہی توحید کی باریک راہیں بھی نکل آئی تھیں جن پر عمل کرنا صرف توحید کے موٹے موٹے مسائل پر عمل کرنے سے بہت مشکل تھا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے بُت پرستی دنیا میں آج بھی موجود ہے مگر آج جب بت پرستوں کو کہا جاتا ہے کہ تم کیوں بُت پرستی کرتے ہو تو وہ کہتے ہیں ہم تو کوئی بُت پرستی نہیں کرتے ہم تو صرف اپنی توجہ کے اجتماع کے لئے ایک بُت سامنے رکھ لیتے ہیں۔ گویا شرک تو وہی ہے جو پہلے تھا مگر اب شرک کو ایک نیا رنگ دے دیا گیا ہے۔ اِسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں شرک کو ایک نیا رنگ دے دیا گیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو صرف یہی نصیحت نہیں فرمائی کہ اِنَّمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡثَانًا وَّ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡكًا کہ تم خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے ہو اور خدا تعالیٰ پر اُن کے بارہ میں افتراء کرتے ہو۔ بلکہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اِنَّ الَّذِيۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا يَمۡلِكُوۡنَ لَـكُمۡ رِزۡقًا فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰهِ الرِّزۡقَ وَاعۡبُدُوۡهُ وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ۔ یعنی وہ ہستیاں جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش کرتے ہو تمہیں رزق نہیں دے سکتیں۔ پس اللہ تعالیٰ سے اپنا رزق مانگو۔ اور اُس کی عبادت کرو اور اُس کا شکر ادا کرو۔ تم کو اُسی کی طرف لوٹا کر لے جایا جائیگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں پانچ امور کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اوّل اس امر کی طرف کہ معبودانِ باطلہ جن کی تم پرستش کرتے ہو اُن کے متعلق تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ تمہاری حاجت روائی کرتے یا مشکلات میں تمہارے کام آتے ہیں۔ ان میں نہ تو کسی کو ایک ذرّہ بھر نفع پہنچانے کی طاقت ہے اور نہ وہ کسی کو ایک ذرّہ بھر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

دوم۔ ہر قسم کا رزق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس لئے تم اُسی سے مانگو جو تمام خیر و برکت کا منبع ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں تمام نعمتوں کے ذخائر ہیں۔

سوم۔ عبادت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی بجا لاؤ کسی اَور کو قابلِ پرستش نہ سمجھو۔

چہارم۔ اُن نعمتوں پر جو خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہیں عطا کی گئی ہیں اُس کا شکر بجالاؤ اور اُن کی قدر و قیمت کا احساس اپنے اندر پیدا کرو۔

پنجم:۔ تم مرنے کے بعد پھر زندہ ہو کر خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہونے والے ہو اس لئے ایسے اعمال بجا لاؤ جو تمہیں خدا تعالیٰ کی خوشنودی کا مستحق بنا سکیں۔

یہ امور بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں صرف بتوں کی پرستش سے نہیں روکا بلکہ اُس فلسفہ کا بھی ردّ کیا ہے جو اس بُت پرستی کے پیچھے اُس زمانہ میں کام کر رہا تھا۔ اور انہیں بتایا ہے کہ پتھر کے بے جان بتوں نے تمہیں کیا دینا ہے۔ تم اگر کچھ لینا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ سے مانگو جو اپنے اندر تمام طاقتیں رکھتا ہے۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو صرف یہ نصیحت ہی نہیں کی کہ فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰهِ الرِّزۡقَ بلکہ آپ نے اپنا عملی نمونہ ان کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ جب آپ کو خدا تعالیٰ نے کہا کہ جا اور اپنے بچے اسمٰعیلؑ اور اُسکی ماں ہاجرہؑ کو ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ آ تو انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہاں اُن کے کھانے پینے اور رہنے کا کیا انتظام ہوگا۔ بلکہ وہ گئے اور ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو ایک بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑ کر چلے آئے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ جو خدا انہیں گھر پر رزق دیتا رہا ہے وہ انہیں اس جنگل میں بھی رزق عطا فرمائیگا۔

پھر فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰهِ الرِّزۡقَ فرما کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں سامان عطا کئے ہوئے ہیں اُن سے کام لو پھر تم دیکھو گے کہ کس طرح تمہاری تمام ضرورتیں پوری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان کچھ دولتیں کماتا ہے اور کچھ دولتیں انسان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ جو دولتیں انسان دنیا میں کماتا ہے وہ کسی انسان کے پاس زیادہ ہوتی ہیں کسی کے پاس کم ہوتی ہیں اور کسی کے پاس ہوتی ہی نہیں۔ مثلاً زمین بھی دولت ہے لیکن دنیا کے سب لوگ زمیندار نہیں کسی کے پاس زمین بہت زیادہ ہے کسی کے پاس بہت کم زمین ہے اور کسی کے پاس

زمین ہے ہی نہیں۔ تجارتیں ہیں اُن کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی پھیری کرکے گذارہ کرتا ہے اور کوئی بڑے بڑے کارخانوں کا مالک ہے۔ بینکنگ کا بھی یہی حال ہے۔ مالی لحاظ سے کسی کے پاس پانچ سات روپے ہوتے ہیں تو وہ اپنے آپکو مالدار سمجھتا ہے اور کسی کے پاس کروڑوں روپے ہوتے ہیں اور پھر بھی وہ اور مال حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے امریکہ میں بعض لوگوں کی سالانہ آمد کروڑوں ڈالر ہے اُنکو بھی مالدار کہتے ہیں۔ اور غرباء کے علاقہ میں اگر کسی کے پاس سو دوسو روپیہ آجاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں یہ شخص بہت مالدار ہے۔ غرض وہ دولت جو انسان کماتا ہے اور جو ظاہر میں نظر آتی ہے سب کو یکساں طور پر نہیں ملی۔ کیونکہ اُس کے لئے محنت اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اور اسی وجہ سے انسانوں میں بہت بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔ یہ تفاوت کبھی قانون کے طور پر ہوتا ہے جیسے جو شخص زیادہ محنت کرتا ہے زیادہ کما لیتا ہے۔ اور کبھی استثناء کے طور پر ہوتا ہے۔ جیسے ماں باپ مالدار ہوں تو اُن کا بیٹا بغیر کسی محنت کے مالدار بن جاتا ہے لیکن ایک دوسری قسم کی دولت بھی انسان کو ملتی ہے۔ جو حقیقتاً بہت زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ انسان اس کی قدر نہیں کرتے۔ حالانکہ وہی دولت اصل دولت ہے اور پھر وہ ایسی دولت ہے جو تمام انسانوں کو یکساں طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی ہے اور وہ دولت ہے حافظہ کی۔ فکر کی۔ ذہانت کی۔ عقل کی۔ تدبّر کی۔ یہ دولت ہر ایک انسان کو ملی ہے سوائے پاگل اور فاتر العقل کے اور یہ چیز بطور استثناء کے ہے ورنہ جو انسان بھی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خزانہ دے کر بھیجا جاتا ہے۔ اُسے پیدائش کے ساتھ ہی حافظہ اور ذہانت اور فکر اور تدبّر کی قوتیں عطا کی جاتی ہیں۔ اگر بعد میں وہ اُن کی ناقدری کرتا ہے تو یہ قوتیں کلّی طور پر یا جزوی طور پر ضائع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اگر وہ آنکھوں کو استعمال نہیں کرتا تو وہ اندھا ہو جاتا ہے پاؤں سے نہیں چلتا تو پاؤں شل ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ سے کام نہیں لیتا تو ہاتھ شل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ جسم کے دوسرے اعضاء کو استعمال نہیں کرتا تو اُسکی جسمانی طاقتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اور جو شخص ان کی قدر کرتا ہے اُس کی قوتیں بڑھ جاتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص محنت کرتا ہے اور اپنے اسباق کو یاد کرتا ہے تو اُس کا حافظہ تیز ہو جاتا ہے۔ اور جو محنت نہیں کرتا اور اپنے اسباق کو یاد نہیں کرتا اُس کا حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔
پھر جو لوگ بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اُن کی استنباط کی قوت بڑھ جاتی ہے اور جو لوگ بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اُن کی استنباط کی قوت جاتی رہتی ہے جو لوگ اپنے اردگرد کے ماحول پر غور کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں اُن کی قوتِ فکر بڑھ جاتی ہے اور جنہیں اپنے ماحول پر غور کرنے کی عادت نہیں ہوتی اُن کی قوتِ فکر جاتی رہتی ہے پھر جو لوگ اپنے مختلف جذبات کو اپنی اپنی حد کے اندر قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اُن کی عقل ترقی کرتی ہے اور جو ایسا نہیں کرتے۔ اُن کی عقل ماری جاتی ہے۔ جو لوگ خدا داد سامانوں کو صحیح طور پر اور مناسب موقعہ پر استعمال کرنے کی سکیم بنا لیتے ہیں اُن کی قوتِ مدبّرہ ترقی کرتی ہے اور جو اس قسم کی سکیم نہیں بناتے اُن کی قوتِ مدبّرہ جاتی رہتی ہے۔ لیکن پیدائش کے وقت یہ سب قوتیں ہر انسان کو ملتی اور قریباً برابر ملتی ہیں۔ بعد میں ناقدری کی وجہ سے یہ قوتیں کم ہو جائیں تو یہ اَور بات ہے۔ یا ماں باپ نے جس قسم کا معاملہ کیا ہو اُس کے مطابق یہ قوتیں کم یا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایّامِ طفولیّت میں اگر ماں باپنے بچہ کی صحیح نگرانی نہیں کی۔ یا ماں نے حمل کے دوران میں پوری احتیاط نہیں کی تو اُس سے بچہ کی قوتوں پر اثر پڑ سکتا ہے۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ

اور اگر تم میری بات کو جھوٹا قرار دو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) تم سے پہلی قوموں نے بھی (اپنے رسولوں کو) جھٹلایا تھا۔

لیکن اس امر کو مستثنیٰ کرتے ہوئے اگر انسانوں کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو کروڑوں کروڑ لوگ ایسے نکلیں گے جو ان خداداد قوتوں سے مالا مال ہونگے۔ لیکن ظاہری لحاظ سے یہ صورت نہیں۔ اگر تمام انسانوں کی مالی حالت کا اندازہ لگایا جائے تو ظاہری مالدار اس دنیا میں دس پندرہ لاکھ سے زیادہ نہ ہونگے۔ اسوقت دنیا کی آبادی اڑھائی ارب ہے اگر ظاہری دولت رکھنے والے پندرہ لاکھ ہوں اور دُنیا کی آبادی پندرہ کروڑ ہوتی تو اُن کی نسبت کروڑ میں سے ایک لاکھ ہوتی۔ لیکن دنیا کی آبادی اڑھائی ارب ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ قریباً سترہ سو (۱۷۰۰) میں سے ایک شخص ایسا ہے جس کے پاس ظاہری دولت ہے۔ لیکن حافظہ ذہانت تدبّر اور فکر کی دولت ۱۷۰۰ میں سے ۱۶۸۰ کے پاس ہوگی صرف بیس[۲۰] اشخاص ایسے نکلیں گے جن کی یہ طاقتیں ماؤف ہونگی۔ باقی سب لوگوں کے پاس یہ دولت موجود ہوگی۔ ہاں عدم استعمال کی وجہ سے ان پر زنگ لگ جائے تو اور بات ہے۔ جیسے اگر کوئی چاقو بارش میں پھینک دیا جائے تو اُس پر زنگ لگ جائیگا۔ لیکن اگر اُسے پانی میں سے اُٹھا کر صاف کیا جائے تو وہ ویسا ہی صاف نکل آئیگا جیسے پہلے تھا۔ لیکن سب سے زیادہ بے قدری اُسی دولت کی کی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر انسان کو عطا کی گئی ہے اگر کسی شخص سے دریافت کیا جائے کہ تمہارے پاس کیا کیا مال ہے تو وہ کہے گا۔ میرے پاس اتنی زمین ہے۔ مکان ہے۔ بھینس ہے۔ گھوڑا ہے لیکن وہ دولت جو سب سے بڑی ہے یعنی ہوا ہے۔ پانی ہے جو اُسے نہ ملے تو مر جائے اُس کا ذکر تک نہیں کرے گا۔ بھینس اور گھوڑا ضائع ہو جائے تو انسان نہیں مرے گا۔ کپڑوں کا ایک حصّہ ضائع ہو جائے تو وہ موسم کی برداشت کر لیگا۔ لیکن اگر ہوا نہ ملے تو چند منٹ میں ہی مر جائے اگر پانی نہ ملے تو وہ ایک دن یا اس سے کچھ زائد عرصہ میں مر جائیگا۔ غرض انسان سب سے بڑی دولت کو گنتا ہی نہیں حالانکہ اگر یہ دولت اُسے نہ ملے تو اُس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ وہ کبھی آنکھوں کانوں ناک اور زبان کا نام نہیں لیگا۔ حالانکہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اگر وہ کہتا ہے کہ میرے پاس گڑ ہے تو وہ گڑ کس کام کا جب زبان نہ ہوگی۔ اگر زبان گڑ کو نہ چکھتی تو انسان کے نزدیک گڑ اور پھیکا برابر ہوتا یا مثلاً وہ کہتا ہے میری بیوی اور بچّے خوبصورت ہیں لیکن اُس کو یہ خیال نہیں آئیگا کہ اگر اُس کی آنکھیں ہی نہ ہوں تو اُسے وہ خوبصورت کیسے معلوم ہوں۔ غرض دولت کے جو حقیقی خزانے ہیں انسان اُن کی قدر نہیں کرتا اور جو دولتیں نسبتی ہیں اور بالواسطہ ملتی ہیں اُن کے پیچھے ہر وقت پڑا رہتا ہے۔ مثلاً کپڑا ہے۔ اگر کپڑا میرے جسم کو نرم اور ملائم معلوم ہوتا ہے تو اُس کی قیمت ہے لیکن اگر میرا جسم کپڑے کی ملائمت محسوس نہیں کرتا تو اُس کی کوئی قیمت نہیں۔ پھر اگر اس کی کوئی قیمت ہے تو اس لئے کہ میرے ملنے والے دوستوں کو اچھا لگے۔ اور انہیں لذّت محسوس ہو۔ اگر میرے دوست کی آنکھیں ہی نہ ہوں اور میری حِسّ موجود نہ ہو تو چاہے وہ کپڑا لاکھ روپے گز کا ہو یا چند آنے کا مجھے اس کا کیا فائدہ۔ پھر زبان اور معدہ ہیں۔ یہ دونوں مل کر کھانے کی قیمت بناتے ہیں اگر کوئی دودھ پیئے۔ مکھن کھائے۔ لسّی پیئے یا پلاؤ اور زردہ کھائے۔ لیکن اُس کی زبان نہ ہو تو یہ چیزیں کچھ بھی نہیں۔ غرض ہمارے سب کپڑوں اور کھانوں کی قدر

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۞۱۹

اور رسول کا کام تو کھول کھول پہنچانا ہوتا ہے (زبردستی منوانا نہیں ہوتا) ۱۹

ان نعمتوں کی وجہ سے ہے جو خدا تعالیٰ نے عطا کی ہیں۔ اگر تم اپنی آنکھیں نکال دو۔ یا جسمانی حس مار دو تو خوبصورت اور ردّی کپڑوں میں تمہیں کوئی فرق معلوم نہیں ہوگا۔ چاہے کپڑا لاکھ روپے گز ہو یا چار آنہ گز۔ تمہارے لئے دونوں برابر ہونگے۔ پس اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں دی ہیں وہ بہت زیادہ قیمتی ہیں مگر افسوس ہے کہ لوگ اُن سے کام نہیں لیتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو اسی طرف توجہ دلائی ہے کہ تم اپنی طاقتوں کو کیوں ضائع کرتے ہو۔ تم خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرو اور اُن سے فائدہ اٹھاؤ اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق رزق حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ان معنوں کے لحاظ سے یہاں عِنْدَ اللّٰهِ کے الفاظ کا استعمال ویسا ہی ہے جیسے سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ بدکاری کا الزام لگانے کے بعد چار عینی گواہ نہ لائیں فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (سورۂ نور آیت ۱۴) وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق جھوٹے ہیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا کہ تم سارا دن بُتوں کے آگے کیوں پڑے رہتے ہو۔ تمہیں خدا تعالیٰ نے ہاتھ پاؤں دیئے ہیں تم اُن سے کام لو اور اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق رزق حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ یہ مضحکہ انگیز روش جو تم نے اختیار کر رکھی ہے اس کا کچھ فائدہ نہیں۔

۱۹ **تفسیر** :۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان اور بھی بہت سے نبی گذرے ہیں اور اُن سب نبیوں کی اُمتوں کو اپنے اپنے زمانہ کے کفّار سے تکلیفیں پہنچیں۔ مگر انہوں نے ہر قسم کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور آخر خدا تعالیٰ نے انہیں کامیاب کر دیا۔

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تلوار کی بجائے تبلیغ سے کام لینا ہی ایک دیرینہ اصول ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اسی اصول کو اختیار کیا تھا۔ اور اُن کے زمانہ کے لوگوں کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے یہی ارشاد ہوا تھا کہ ہمارے اس رسول کا کام صرف بات پہنچا دینا ہے تلوار سے منوانا نہیں اور یہی سارے قرآن کا خلاصہ ہے کہ دلیل کے ساتھ بات منوانا مذہبی لوگوں کا کام ہوتا ہے جبر سے منوانا مذہبی لوگوں کا کام نہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب تک دنیا اس مسئلہ کو نہیں سمجھی بلکہ خود مسلمانوں میں بھی قتل مرتد کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ کسی کا عقیدہ جھوٹا ہو یا سچ عقیدہ رکھنے والا اُسے بہرحال ویسا ہی سچا سمجھتا ہے جیسے ایک مسلمان اپنے مذہب کو سچا سمجھتا ہے۔ عیسائیت جھوٹی سہی مگر سوال تو یہ ہے کہ دنیا کا اکثر عیسائی عیسائیت کو کیا سمجھتا ہے وہ یقیناً اُسے سچا سمجھتا ہے۔ ہندو مذہب جھوٹا ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ دنیا کا اکثر ہندو اپنے مذہب کو کیا سمجھتا ہے وہ یقیناً اُسے سچا سمجھتا ہے۔ یہودی مذہب یقیناً اس وقت سچا نہیں۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہودیوں کا اکثر حصہ یہودیت کو کیا سمجھتا ہے وہ یقیناً اُسے سچا سمجھتا ہے۔ پس اگر اس بات پر کسی کو قتل کرنا جائز ہے کہ میں سمجھتا ہوں میرا مذہب سچا ہے دوسرے کا نہیں تو پھر ایک عیسائی کو یہ کیوں حق حاصل نہیں کہ وہ جس مسلمان کو چاہے قتل کر دے۔ ایک ہندو کو کیوں حق حاصل نہیں کہ وہ جبراً دوسروں کو ہندو بنائے یا انہیں مار ڈالے۔ چین میں کنفیوشس مذہب کے پیروؤں کو

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ إِنَّ

کیا اُن کو معلوم نہیں کہ اللہ (تعالےٰ) پیدائش عالم کو کس طرح پہلی دفعہ شروع کرتا ہے پھر اُس کو بار بار لوٹاتا جاتا ہے۔

ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٢٠﴾ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا

یہ کام اللہ کے لئے بالکل آسان ہے۔ تو کہہ ملک میں چاروں طرف پھرو۔ پھر دیکھو کہ

كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ۚ ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ

اللہ (تعالیٰ) نے مخلوق کی پیدائش کس طرح شروع کی تھی پھر مرنے کے بعد انکو دوبارہ زندہ کرتا چلا گیا۔

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢١﴾

اللہ (تعالیٰ) ہر ایک چیز پر قادر ہے۔ ۱۵ہ

یہ کیوں حق نہیں کہ وہ زبردستی لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل کریں۔ فلپائن میں جہاں اب بھی پندرہ بیس ہزار مسلمان ہے عیسائیوں کو کیوں حق حاصل نہیں کہ وہ مسلمانو کو جبرًا عیسائی بنالیں۔ امریکہ کو کیوں حق حاصل نہیں کہ وہ جبرًا اُن مسلمانوں کو جو اُس کے ملک میں رہتے ہیں عیسائی بنالے۔ روس کو کیوں حق حاصل نہیں کہ وہ جبرًا سب کو عیسائی بنالے یا جبرًا سب کو کمیونسٹ بنالے۔ اگر مسلمان دوسروں کو جبرًا اپنے عقیدہ پر لا سکتے ہیں تو ویسا ہی حق عقلاً دوسروں کو بھی حاصل ہے لیکن کیا اس حق کو جاری کرکے دنیا میں کبھی امن قائم رہ سکتا ہے۔ کیا اس حق کو جاری کرکے تم اپنے بیٹے کو بھی کہہ سکتے ہو کہ یہ مسئلہ ٹھیک ہے یا بیوی کو بھی کہہ سکتے ہو کہ یہ مسئلہ ٹھیک ہے کہ عیسائیوں کا حق ہے کہ وہ مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنالیں۔ مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ عیسائیوں کو زبردستی مسلمان بنالیں۔ ایران والوں کا حق ہے کہ وہ سب حنفیوں کو زبردستی شیعہ بنالیں اور حنفیوں کا حق ہے کہ وہ سب کو زبردستی سُنّی بنالیں۔ غرض یہ ایسی عقل کے خلاف بات ہے کہ کوئی انسان اِس کو ایک منٹ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

گذشتہ انبیاء کی قوموں نے جب بھی خدائی ہدایت کو ماننے سے انکار کیا تو خدا تعالےٰ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے یہی فرمایا کہ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ (ہود ع۳) یعنی اگر تم خود ہدایت لینا پسند نہیں کرتے تو ہم جبرًا تمہیں ہدایت نہیں دے سکتے لیکن افسوس کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں اس اصل کا انکار کرنے والے لوگ بھی موجود ہیں۔ اگر دنیا اس مسئلہ کو سمجھ جائے تو یقیناً ظلم اور تعدّی مذہبی اور سیاسی امور میں بند ہو جائے۔ نہ لوگ اپنے عقیدے لوگوں پر جبرًا ٹھونسیں اور نہ اپنے سیاسی نظام دوسرے ملکوں میں جبرًا جاری کرنے کی کوشش کریں۔

۱۵ہ تفسیر:- اِن آیات میں وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ کی دلیل پیش کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا اِن کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح پچھلے نبیوں کے ذریعہ سے ایک رُوحانی

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۲﴾

وہ جسکو چاہتاہے عذاب دیتاہے اور جس پر چاہتاہے رحم کرتاہے اور اُسی کی طرف تم کو لوٹا کر لایا جائیگا۔ ۱۶

جماعت قائم کرتا رہا ہے۔ پھر جب ان نبیوں کا رُوحانی اثر جاتا رہا اور پھر وہ کسی نئے نبی کے ذریعہ سے روحانی جماعتوں کو قائم کرتا رہا۔ تو یہ بات اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔ چنانچہ تم زمین میں پھرو اور دیکھو کہ کیا نبی کے بعد نبی نہیں آتا رہا اور جماعت کے بعد جماعت نہیں قائم ہوتی رہی۔ بعینہٖ اسی رنگ میں اب اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پھر ایک جماعت قائم کرے گا اور وہ اِس بات پر قادر ہے۔ تمہاری مخالفانہ کوششیں اللہ تعالیٰ کے اس ارادہ میں مزاحم نہیں ہوسکتیں۔

يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ سے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں آخرت کا ذکر کیا گیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ اِسجگہ آخرت کا نہیں بلکہ اِسی دُنیا کا ذکر ہے اور چونکہ اس دُنیا میں مُردے زندہ نہیں ہوتے اِس لئے پیدائش اوّل سے مُراد قوموں کو تمکنت بخشنا اور پیدائش ثانی سے مراد غالب قوموں کے زوال کے بعد پھر دوبارہ اُن میں بیداری پیدا کرنا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ اُخروی زندگی ہے ہی نہیں بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ اِس آیت میں اِس دُنیا میں قوموں کے اُتار چڑھاؤ کا ذکر ہے۔ جیساکہ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ کے الفاظ سے اور اِن الفاظ سے ظاہر ہے۔ دُنیا پر غور کرو کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلی دفعہ پیدائش کا کام شروع کیا اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی دینی شروع کی۔

فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ میں اللہ تعالیٰ نے علم بدءِ عالم کا بھی ذکر کر دیا ہے جسے اصطلاحًا ایتھنالوجی کہتے ہیں۔ یعنی اس بات کا پتہ لگانا کہ پیدائش عالم کس طرح ہوئی ہے۔ فرماتا ہے تم زمین میں پھر کر دیکھو پھر تمہیں پتہ لگے گا کہ پیدائش عالم کس طرح ہوئی تھی یعنی اگر تم نے تاریخ عالم کا صحیح پتہ لگانا ہو۔ تو یہ پتہ تمہیں کسی ایک ملک سے نہیں لگ سکتا بلکہ مختلف ملکوں کے دیکھنے سے اِس کا پتہ لگیگا۔ کیونکہ مختلف اوقات میں مختلف تہذیبیں عروج پر رہی ہیں۔ اگر تم اقوام عالم کی صحیح تاریخ معلوم کرنا چاہتے ہو تو تم ساری دنیا میں پھرو کیونکہ کسی صدی میں ہندوستان میں تہذیب پھیلی تھی تو کسی صدی میں ایران میں تہذیب پھیلی۔ کسی صدی میں رُوم میں تہذیب پھیلی تھی تو کسی صدی میں عرب میں پھیلی۔ اِسی طرح کسی صدی میں شام میں تہذیب پھیلی تھی تو کسی صدی میں مصر میں پھیلی۔ غرض ایتھنالوجی کے علم کے لئے ضروری ہے کہ دُنیا کے مختلف ملکوں کی سیر کرو اور اِن میں مختلف اقوام کے جو آثار پائے جاتے ہیں اُن سے تاریخ عالم کا پتہ لگاؤ پھر تم کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکو گے۔

۱۶ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ وہ جس پر چاہتا ہے عذاب نازل کرتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم کرتا ہے اِس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اندھا دُھند عذاب نازل کرتا ہے اور اندھا دُھند رحم کرتا ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ قرآن کریم میں صاف لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں پر رحم کرتا ہے جو ایک دوسرے کو نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور بُرائیوں سے بچنے کی نصیحت کرتے ہیں اور نماز باجماعت قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے اور خدا اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ

اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ سَیَرْحَمُہُمُ اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ (توبہ آیت ۷۱) یعنی مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ضرور ان پر رحم کرے گا۔ اللہ تعالیٰ غالب اور بڑی حکمت والا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَکْتُبُہَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ہُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ۔ (اعراف آیت ۱۵۷) یعنی مَیں اپنا عذاب جس کو چاہتا ہوں پہنچاتا ہوں۔ اور میری رحمت ہر ایک چیز پر حاوی ہے۔ پس مَیں ضرور اُسکو اُن لوگوں کے لئے لکھونگا جو تقویٰ اختیار کرتے اور زکوٰۃ دیتے اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اندھا دھند رحم نہیں کرتا بلکہ جو لوگ اپنے اعمال کی وجہ سے اُس کے رحم کے مستحق ہوتے ہیں صرف اُنہی پر رحم کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اللہ تعالےٰ نے عذاب کے بارہ میں بھی یہ اصول بیان فرمادیا ہے کہ وہ کسی کو اندھا دھند عذاب نہیں دیگا بلکہ صرف ایسے ہی لوگ عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے جنہوں نے خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کی تکذیب کی ہوگی۔ چنانچہ فرماتا ہے :- فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْہِمْ اُجُوْرَہُمْ وَیَزِیْدُہُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْتَنْکَفُوْا وَاسْتَکْبَرُوْا فَیُعَذِّبُہُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا۔ (نساء آیت ۱۷۴) یعنی وہ لوگ جو مومن ہونگے اور انہوں نے نیک اور مناسب حال اعمال کئے ہونگے۔ وہ انہیں اُن کے اعمال کے پورے پورے بدلے دیگا اور اپنے فضل سے انہیں زائد انعامات سے بھی سرفراز فرمائیگا۔ لیکن جن لوگوں نے خدائی ہدایات سُن کر بُرا منایا ہوگا اور تکبّر سے کام لیا ہوگا وہ انہیں دردناک عذاب دیگا۔ اسی طرح سورۃ غاشیہ میں فرماتا ہے :- لَسْتَ عَلَیْہِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۙ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَکَفَرَ ۙ فَیُعَذِّبُہُ اللّٰہُ الْعَذَابَ الْاَکْبَرَ۔ (غاشیہ آیت ۲۲ تا ۲۵) یعنی اے محمد رسول اللہ! تو ان لوگوں پر داروغہ کے طور پر مقرر نہیں۔ ہاں جس نے پیٹھ پھیرلی اور کُفر کا مرتکب ہُوا اللہ تعالیٰ اس کُفر کے نتیجہ میں اُسے بہت بڑا عذاب دیگا۔ اسی طرح فرماتا ہے :- فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَہُمْ فِیْہَا زَفِیْرٌ وَّشَہِیْقٌ ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ ؕ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّۃِ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ۔ (سورۃ ھود آیت ۱۰۷ تا ۱۰۹) یعنی جو بدبخت ثابت ہونگے وہ آگ میں داخل ہونگے۔ اُس میں کسی وقت تو اُن کے درد سے لمبے لمبے سانس نکل رہے ہونگے۔ اور کسی وقت ہچکی کی حالت کے مشابہ سانس نکل رہے ہونگے۔ وہ اُس میں اُسوقت تک رہتے چلے جائیں گے جب تک کہ آسمان و زمین قائم ہیں سوائے اس عرصہ کے جو تیرا ربّ چاہے۔ تیرا رب جو چاہتا ہے اُسے کرکے رہتا ہے۔ اور جو خوش نصیب ثابت ہونگے۔ وہ جنّت میں ہونگے۔ وہ اُس میں اُسوقت تک رہتے چلے جائیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں سوائے اُسوقت کے جو تیرا ربّ چاہے۔ یہ ایسی عطاء ہے جو کبھی کاٹی نہیں جائیگی۔ سورۃ فرقان میں بھی فرماتا ہے :- وَیَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْہِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا۔ یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا۔ (آیت ۲۸، ۲۹) اُس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور کہے گا۔ اے کاش! مَیں رسول کے ساتھ چل پڑتا۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ز

اور تم نہ زمین میں نہ آسمان میں خدا (تعالےٰ) کو اُس کی مرضی کے خلاف مجبور کر سکو گے۔

وائے بدبختی! مَیں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔ غرض قرآن کریم نے صرف یہی نہیں بتایا کہ وہ کن لوگوں پر رحم کریگا بلکہ اُس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ کن لوگوں کو عذاب دیگا۔ ایسی صورت میں کسی پر اندھا دھند رحم کرنے یا کسی کو اندھا دھند سزا دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

پھر اگر وہ اندھا دھند سزا دے تو یہ ظلم ہوگا اور اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ چنانچہ فرماتا ہے:- وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۗ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ۔ (سورۃ الانبیاء آیت ۴۸) یعنی ہم قیامت کے دن ایسے تول کے سامان پیدا کریں گے کہ جن کی وجہ سے کسی جان پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کیا جائیگا۔ اور اگر ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی عمل ہوگا تو ہم اُس کو موجود کر دیں گے اور ہم حساب لینے میں کافی ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ۣالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (اعراف آیت ۹ و ۱۰) یعنی اُس دن تمام اعمال کا وزن کرنا ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس کے وزن بھاری ہوئے وہ لوگ بامراد لوگوں میں شامل ہوں گے اور جن کے وزن ہلکے ہوئے تو سمجھ لو کہ ایسے لوگ اپنی جانوں کے معاملہ میں خسارہ پانے والے ہیں۔ یہ اس لئے ہُوا کہ وہ ہماری آیتوں کے معاملہ میں ظلم سے کام لیتے تھے۔

پھر فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (نساء آیت ۴۱) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ایک ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (یونس آیت ۴۵) یعنی اللہ تعالیٰ کی شان یقیناً ایسی ہے کہ وہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا۔ ہاں لوگ اپنی جانوں پر آپ ہی ظلم کرتے ہیں۔

پھر یہ سوال اس لئے بھی باطل ہے کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں یہ اصول بیان فرما دیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ جو کچھ سلوک ہوگا اس کے عمل کے مطابق ہوگا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۪ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۙ (سورۃ النجم آیت ۴۰ تا ۴۲) کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور انسان ایک دن اپنی کوشش کا نتیجہ ضرور دیکھ لے گا اور اُس کو اپنے اعمال کی پوری پوری جزا مل جائیگی۔ پھر فرماتا ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۔ (سورۃ الزلزال آیت ۸ و ۹) یعنی جس نے ایک ذرہ کے برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اُس کے نتیجہ کو دیکھ لے گا اور جس نے ایک ذرہ کے برابر بھی بدی کی ہوگی وہ اُس کے نتیجہ کو دیکھ لے گا۔ اسی طرح فرماتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔ (سورۃ الشمس آیت ۱۰ و ۱۱) یعنی جس نے اپنے نفس کو پاک کیا سمجھو کہ اپنے مقصود کو پا گیا۔ اور جس نے اُسے مٹی میں گاڑ دیا سمجھ لو کہ وہ نامراد ہو گیا۔

ان اصول کی موجودگی میں کسی کو اندھا دھند عذاب دینے یا کسی پر اندھا دھند رحم کرنیکا کوئی سوال ہی پیدا نہیں

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۳﴾ ع ۲ ۱۴

اور خدا (تعالیٰ) کے سوا نہ کوئی تمہارا دوست ہے نہ مددگار۔ ۷۵ کے

ہوسکتا۔ پس جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے بخشتا ہے کے یہ معنے نہیں کہ وہ اندھا دھند ایسا کرتا ہے بلکہ جیسا کہ اوپر کی آیات سے ثابت ہے جو لوگ اپنے اندر خدا تعالیٰ کی محبت کی قابلیت پیدا کرتے ہیں اُن پر وہ رحم کرتا ہے اور جو لوگ اپنے نفسوں میں گند پیدا کرتے ہیں اُن پر عذاب نازل کرتا ہے۔

پس اِس آیت میں جو مَنْ يَّشَآءُ فرمایا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ کا عذاب یا رحم بغیر کسی اصول کے نازل ہوتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ حالات کے مطابق سلوک کرتا ہے۔ پس "چاہتا ہے" سے یہ مُراد ہے کہ حالات کے مطابق چاہتا ہے نہ کہ اندھا دُھند باقی رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے مشیئت کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے۔ اور کیوں یہ نہیں کہا کہ جو نیک ہوگا اُسے بخشیگا اور بد کو سزا دیگا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی مشیئت اور مقتضائے انصاف ایک ہی شئے ہے۔ انسان پر چونکہ سچائیاں حاکم ہوتی ہیں۔ اس کے اعمال کا اندازہ اُس کے نفس پر نہیں بلکہ سچائیوں پر کیا جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ سچائیوں کا منبع ہے اور وہ اُسی میں سے نکل رہی ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سچائیوں کے مطابق عمل کریگا بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مشیئت پر عمل کریگا۔ کیونکہ اُس کی مشیئت ہی سچائیوں کا منبع ہے۔ وہ حسن کی کان ہے۔ ہر سچائی اُس کی مشیئت کا ایک بیرونی پرتو ہے۔ اُس کے حسن کی جھلک ہے۔ اُس کے ارادہ کی ایک تصویر ہے۔ پس اُس کی مشیئت کو سچائی کا تابع کہنا ایسا ہی بیہودہ ہے جس طرح ایک بیٹے کو اپنے باپ کا باپ قرار دینا۔

یہ نکتہ ایسا ہے کہ اُس کے ذریعہ سے اِس قسم کی تمام آیات حل ہوجاتی ہیں۔

۷۵ کے تفسیر:۔ اِس میں بتایا کہ اے کفّار! خواہ تم زمینی تدبیریں کرو یا آسمانی۔ یعنی خواہ اسلام کے خلاف تم دنیوی تدابیر عمل میں لاؤ یا دُعاؤں سے آسمانی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ دونوں صورتوں میں تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ترقی کو نہیں روک سکتے۔ کیونکہ زمینی سامان بھی اس کی مدد کے لئے تیار رہیں گے اور آسمانی مدد بھی اس کے لئے تیار رہے گی۔ ہاں اُلٹا تم تباہ ہوگے اور اللہ تعالیٰ کے سوا تمہیں کوئی دوست اور مددگار نہیں ملے گا۔

اِس آیت میں زمینی اور آسمانی دونوں تدبیروں کو بروئے کار لانے کا اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر مومنوں کو بھی اشاعتِ اسلام کے لئے انہی دونوں تدبیروں کے استعمال کرنے کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (الانعام آیت ۳۶) یعنی اے ہمارے رسول یا اے قرآن کے پڑھنے والے! اگر مخالفین کا اعراض کرنا تمہیں بُری بات معلوم ہوتی ہے اور تم سمجھتے ہو کہ اُن کی مخالفت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب اِن کی اصلاح مشکل ہے تو اے انسان تُو کبھی اس وہم میں مبتلا نہ ہو۔ یعنی دشمن کے انکار اور اُس کی مخالفت کو کبھی ایسا نہ سمجھنا

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ

وہ لوگ جو اللہ (تعالیٰ) کے نشانوں کا اور اس سے ملاقات ہونیکا انکار کرتے ہیں وہ لوگ ایسے ہیں جو

کہ اُس کی اصلاح ناممکن ہوگئی ہے بلکہ اگر تمہیں طاقت ہو کہ تم زمین میں کوئی سُرنگ لگاؤ یا تمہیں طاقت ہو کہ تم آسمان کے لئے کوئی سیڑھی تیار کرو اور اُن کے لئے کوئی نشان لے آؤ تو ایسا کرو۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ جو چیزیں یہاں بیان کی گئی ہیں وہ ایسی نہیں جو ممکن نہ ہوں۔ دنیا میں بھی انسان جب جنگوں میں کسی قلعہ کو فتح کرنا چاہتا ہے تو دو ذرائع ہی اختیار کرتا ہے۔ یعنی کبھی تو سُرنگ لگا کر قلعہ کو اُڑا دیتا اور اُسکو فتح کرلیتا ہے اور کبھی سیڑھیوں سے اُس کے اوپر چڑھتا اور اندر اُتر جاتا ہے۔ گویا دنیا میں یا تو قلعوں کی دیواریں اُڑائی جاتی ہیں یا دیواریں مغلوب کرلی جاتی ہیں۔ یہ دونوں باتیں ناممکن نہیں۔ پس یہاں وہ ذرائع بتائے گئے ہیں جن کو دنیا ہمیشہ استعمال کرتی چلی آئی ہے اور یہی دو ذرائع فتوحات حاصل کرنے کے ہیں۔ یعنی یا تو سُرنگ لگا کر یا دوسرے ذرائع سے دیواریں توڑ دی جاتی ہیں یا سیڑھیوں پر چڑھ کر قلعوں کو فتح کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روحانی طور پر بھی یہی دو ذرائع خدا تعالیٰ نے تمہاری کامیابی کے لئے مقرر کئے ہیں۔ یعنی جب تم سمجھو کہ دشمن کی مخالفت بہت بڑھ گئی ہے تو ایک طرف جسقدر دنیوی سامان ہیں سب اُن کی ہدایت کے لئے استعمال کرو۔ اور دوسری طرف آسمان سے سیڑھی لگاؤ اور اُس کے اوپر چڑھنا شروع کردو۔ یہ سیڑھی کونسی ہوسکتی ہے معمولی عقل رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ سیڑھی دُعا کی سیڑھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جس طرح دنیا کے قلعے فتح ہوتے ہیں اسی طرح تم رُوحانی قلعے فتح کرو۔ وہ دیواروں کو یا اُڑا دیتے ہیں یا اُن کو پھاند کر اندر داخل ہو جاتے ہیں اور یہی دو ذریعے ایسے ہیں جن پر عمل کرکے رُوحانی جنگ میں بھی کامیابی حاصل ہوسکتی ہے یعنی ایک طرف اُن کو سمجھانے کے لئے پوری کوشش اور جدوجہد سے کام لیا جائے اور دوسری طرف اُن کی ہدایت کے لئے دُعائیں کی جائیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص میں ذرّہ بھر بھی سنجیدگی ہوگی اُس کے کفر کی عمارت گرنی شروع ہو جائے گی۔

پھر فرماتا ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ اے مومن تو مایوس نہ ہو۔ اگر خدا چاہے تو اِن کافروں کو بھی ہدایت دے دے۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ پس تو اِس نکتہ کو بھولیو نہیں۔ کیونکہ جب انہیں ہدایت دینا خدا تعالیٰ کی طاقت میں ہے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ مایوسی ہمیشہ اُس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان کو اپنی تدابیر میں رخنے ہی رخنے نظر آتے ہوں۔ لیکن جب وہ یہ سمجھ لے کہ ایک کیا خدا تعالیٰ ساروں کو ہدایت دے سکتا ہے تو اُسوقت وہ کبھی مایوس نہیں ہوسکتا۔ پس فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ کے یہ معنے ہیں کہ اِس نکتہ سے غافل نہ رہو کہ تمہارے خدا میں بہت بڑی طاقت ہے۔ اور وہ ایک کیا ساری دنیا کو ہدایت دے سکتا ہے۔

غرض چونکہ مومنوں کو کامیابی کا یہ طریق بتایا گیا تھا کہ جب دشمن کی مخالفت اپنی انتہاء کو پہنچ جائے تو تم بھی اپنی تدابیر کو انتہا تک پہنچا دو اور اُن تدابیر کے دو حصّے کرو۔ ایک حصّہ تو یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں سُرنگ لگاؤ اور تبلیغ کو اپنے کمال تک پہنچا دو۔ اور دوسرا طریق یہ ہے کہ آسمان کی طرف سیڑھی لگاؤ یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور کثرت سے دُعائیں کرو اور اُس سے مدد مانگو۔

يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۴﴾ فَمَا

میری رحمت سے مایوس ہو گئے اور وہی ہیں جن کو دردناک عذاب ملیگا - ؎۱۸ پس اُس کی

كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ

(یعنی ابراہیمؑ کی) قوم کا جواب اسکے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ اس کو قتل کردو یا اس کو جلا دو -

فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

(چنانچہ انہوں نے اسکو آگ میں ڈال دیا) مگر اللہ (تعالیٰ) نے اُس کو آگ سے بچا لیا - اِس میں یقیناً

لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۵﴾

مومن قوم کے لئے بڑے نشان ہیں - ؎۱۹

اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انہی دونوں طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کفار کو توجہ دلائی ہے کہ مومنوں کی ان کوششوں کے مقابلہ میں اگر تم بھی یہی طریق اختیار کرلو تو یاد رکھو تم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ تم خواہ تمام دنیوی ذرائع اختیار کرلو اور خواہ دعاؤں اور گریہ زاری سے کام لو۔ دونوں صورتوں میں تمہارے لئے ناکامی ہی مقدر ہے کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ وہ اور اُن کی قوم جیتیں گے اور ان کا دشمن جو جبر سے کام لیتا ہے وہ ہارے گا۔ اور اس فیصلہ کو اب دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی۔

؎۱۸ تفسیر:- فرمایا جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نشانوں کے منکر ہوتے ہیں اور اُس کی ملاقات کی امید نہیں رکھتے درحقیقت اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ میری رحمت سے مایوس ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں ضرور عذاب ملیگا اس لئے ہمیں موت سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور یہ موت نبی اور اس کے ساتھیوں پر ڈالنی چاہیئے تاکہ مرنے کے بعد کی باتیں نہ ہم اُن سے سُنیں اور نہ گھبراہٹ پیدا ہو - چنانچہ وہ نبیوں اور اُن کی جماعتوں پر حملہ شروع کردیتے ہیں اور انہیں ہلاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں - جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجاتے ہیں - اور چونکہ انہوں نے نبیوں اور اُن کی جماعتوں پر دردناک مظالم کئے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کردیتا ہے -

؎۱۹ تفسیر:- فرماتا ہے جب ابراہیمؑ سے اُس زمانہ کے لوگوں نے یہ باتیں سُنیں کہ بتوں کی پرستش ترک کردو اور خدائے واحد کی عبادت کرو - تو انہوں نے ایک دوسرے کو آپ کے خلاف اُکسانا شروع کردیا اور کہا کہ آؤ اور اس کو قتل کردو یا اس کو آگ میں ڈال کر جلا دو - مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے بچا لیا - دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طریق کا ذکر کرتے ہوئے جس سے کام لے کر آپ کو بچا لیا گیا تھا - اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ (انبیاء ع ۵) یعنی ہم نے اُس وقت آگ سے کہا - کہ

اے جسمانی آگ تیرے اندر ایک روحانی آگ داخل ہو رہی ہے۔ اب تیرا کام یہ ہے کہ اس آگ کے مقابلہ میں سرد ہو جا۔ ابراہیمؑ کے دل میں میری محبت کی آگ بھڑک رہی ہے اور میرے عشق کی آگ کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس طرح سورج کے مقابل پر شمعیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ اسی طرح میری محبت کی آگ کے مقابلہ میں تیری آگ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ پس ابراہیمؑ کے لئے تو سرد ہو جا جس طرح انگارہ کے مقابلہ میں کسی اور گرم چیز کی گرمی کم محسوس ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ ایسی شدید ہے کہ دوسری تمام آگیں اس کے مقابلہ میں سرد پڑ جاتی ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی ایک دفعہ الہام ہوا کہ

"آگ سے ہمیں مت ڈرا آگ ہماری
غلام بلکہ غلاموں کی غلام ہے۔"

اس کا بھی یہی مفہوم ہے کہ ہمارے دل میں عشقِ الٰہی کی آگ شعلہ زن ہے۔ اس آگ کے مقابلہ میں ظاہری آگ کی کیا حیثیت ہے۔ ایک گرم توا انسان کے ہاتھ کو تو جلا دیتا ہے مگر انگارے کو نہیں جلا سکتا۔ اسی طرح آگ اُس شخص کو نہیں جلا سکتی جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ بھڑک رہی ہو۔ چنانچہ اُسی وقت بادل آیا اور برسا اور وہ آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ اور یہ معجزہ دیکھ کر اُس کی قوم کے بعض لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا ہو گیا اور اس کے لئے سلامتی کے سامان پیدا ہو گئے۔

حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ ابتداء میں اِس آیت کے یہ معنے کیا کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے اُن کی مخالفت کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے ۱۹۰۳ء میں جب ایک شخص عبدالغفور نے جو اسلام سے مرتد ہو کر آریہ ہو گیا تھا اور اُس نے اپنا نام دھرم پال رکھ لیا تھا "ترکِ اسلام" نامی کتاب لکھی۔ تو حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ نے اُس کا جواب لکھا۔ جو "نورالدین" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کتاب روزانہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سُنائی جاتی تھی۔ جب دھرم پال کا یہ اعتراض آیا کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ ٹھنڈی ہوئی تھی تو دوسروں کے لئے کیوں نہیں ہوتی۔ اور اِس پر حضرت خلیفۂ اوّلؓ کا یہ جواب سُنایا گیا کہ اس جگہ "نار" سے ظاہری آگ مُراد نہیں بلکہ مخالفت کی آگ مراد ہے تو حضرت مسیح موعودؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اس تاویل کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے بھی خدا تعالیٰ نے ابراہیم کہا ہے اگر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کس طرح ٹھنڈی ہوئی تو وہ مجھے آگ میں ڈال کر دیکھ لیں کہ آیا مَیں اس آگ میں سے سلامتی کے ساتھ نکل آتا ہوں یا نہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اِس ارشاد کی وجہ سے حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب "نورالدین" میں یہی جواب لکھا اور تحریر فرمایا کہ

"تم ہمارے امام کو آگ میں ڈال کر دیکھ لو۔ یقیناً خدا تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق اسے اس آگ سے اُسی طرح محفوظ رکھے گا جس طرح اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو محفوظ رکھا تھا۔"

(نورالدین صفحہ ۱۴۶)

اور پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اِس تحریر کی وجہ سے ہی مَیں نے جہاں کہیں قرآن کریم کی اِس آیت کی تفسیر کی ہے مَیں نے یہ نہیں لکھا کہ خدا تعالیٰ نے مخالفت کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا تھا بلکہ یہی لکھا ہے کہ مخالفوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا تھا

لیکن وہ آگ ٹھنڈی ہوگئی اور چونکہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اسباب سے ہی کام لیا کرتا ہے۔ اِس لئے ممکن ہے اس وقت بادل آ گیا ہو۔ اور بارش ہوگئی ہو جس کی وجہ سے آگ بُجھ گئی ہو۔ بہرحال ہمارا ایمان یہی ہے کہ دشمنوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے واقعہ میں آگ جلائی لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کئے کہ جن کی وجہ سے اُن کی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور آپ آگ سے محفوظ رہے۔

یہ مضمون حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتابوں اور ڈائریوں میں بھی بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک دوست کا خط حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پیش ہُوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جو آگ ٹھنڈی ہوگئی تھی آیا وہ فی الواقعہ آتشِ ہیزم تھی یا فتنہ و فساد کی آگ تھی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:-

"فتنہ و فساد کی آگ تو ہر نبی کے مقابل میں ہوتی ہے اور وہی ہمیشہ کوئی ایسا رنگ اختیار کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک معجزہ نما طاقت اپنے نبی کی تائید میں اس کے بالمقابل دکھاتا ہے۔ ظاہری آتش کا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر سرد کردینا خدا تعالیٰ کے آگے کوئی مشکل امر نہیں اور ایسے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اِن واقعات کی اب بہت تحقیقات کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ہزاروں سالوں کی بات ہے۔ ہم خود اس زمانہ میں ایسے واقعات دیکھ رہے ہیں اور اپنے اوپر تجربہ کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے جبکہ میں سیالکوٹ میں تھا تو ایک دن بارش ہو رہی تھی جس کمرہ کے اندر مَیں بیٹھا ہُوا تھا اُس میں بجلی آئی۔ سارا کمرہ دُھوئیں کی طرح بھر گیا اور گندھک کی سی بُو آتی تھی لیکن ہمیں کچھ ضرر نہ پہنچا۔ اُسی وقت وہ بجلی ایک مندر میں گری جو کہ تیجا سنگھ کا مندر تھا اور اُس میں ہندوؤں کی رسم کے مطابق طواف کے واسطے پیچ در پیچ اردگرد دیوار بنی ہوئی تھی اور وہ اندر بیٹھا ہُوا تھا۔ بجلی ان تمام چکروں میں سے ہو کر اندر جا کر اُس پر گری اور وہ جل کر کوئلہ کی طرح سیاہ ہوگیا دیکھو وہی بجلی کی آگ تھی جس نے اُس کو جلا دیا۔ مگر ہم کو کچھ ضرر نہیں دے سکی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے ہماری حفاظت کی۔ ایسا ہی سیالکوٹ کا ایک اَور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رات کو میں ایک مکان کی دوسری منزل پر سویا ہُوا تھا اور اسی کمرہ میں میرے ساتھ پندرہ سولہ اَور آدمی بھی تھے۔ رات کے وقت شہتیر میں ٹک ٹک کی آواز آئی۔ مَیں نے آدمیوں کو جگایا کہ شہتیر خوفناک معلوم ہوتا ہے یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کوئی چوہا ہوگا۔ کچھ خوف کی بات نہیں اور یہ کہکر پھر سو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ویسی ہی آواز سُنی۔ تب مَیں نے اُن کو دوبارہ جگایا۔ مگر پھر بھی انہوں نے کچھ پرواہ نہ کی۔ پھر تیسری بار شہتیر سے آواز آئی۔ تب مَیں نے اُن کو سختی سے اُٹھایا۔ اور سب کو مکان سے باہر نکالا اور جب سب نکل گئے تو خود بھی وہاں سے نکلا ابھی مَیں دوسرے زینہ پر تھا کہ وہ چھت نیچے گری اور دوسری چھت کو بھی ساتھ لے کر نیچے جا پڑی اور چارپائیاں ریزہ ریزہ ہوگئیں اور ہم سب بچ گئے۔ یہ خدا تعالیٰ کی معجزہ نما حفاظت ہے جبتک

کہ ہم وہاں سے نکل نہ آئے شہتیر گرنے سے محفوظ رہا
ایسا ہی ایک دفعہ ایک بچھو میرے بستر کے
اندر لحاف کے ساتھ مرا ہوا پایا گیا اور دوسری
دفعہ ایک بچھو لحاف کے اندر چلتا ہوا پکڑا گیا۔
مگر ہر دو بار اللہ تعالیٰ نے مجھے اُس کے ضرر سے
محفوظ رکھا۔ ایک دفعہ میرے دامن کو آگ
لگ گئی تھی مجھے خبر بھی نہ ہوئی ایک اور شخص نے
دیکھا اور بتلایا اور اُس آگ کو بجھا دیا۔ خدا تعالےٰ
کے پاس کسی کے بچانے کی ایک راہ نہیں بلکہ
بہت راہیں ہیں۔ آگ کی گرمی اور سوزش کے
واسطے بھی کئی ایک اسباب ہیں اور بعض اسباب
مخفی در مخفی ہیں جن کی لوگوں کو خبر نہیں اور خدا تعالےٰ
نے وہ اسباب اب تک دنیا پر ظاہر نہیں کئے۔
جن سے اس کی سوزش کی تاثیر جاتی رہے پس
اس میں کون سے تعجب کی بات ہے کہ حضرت ابراہیمؑ
پر آگ ٹھنڈی ہوگئی۔"

("الحکم" ۱۰ رجون ۱۹۰۷ء)

اسی طرح براہین احمدیہ میں تحریر فرماتے ہیں:—

"برہمو سماج والوں کی یہی بھاری غلطی ہے
کہ وہ خدا تعالیٰ کی غیر متناہی قدرتوں اور ربوبیتوں
کو اپنے تنگ اور منقبض تجارب کے دائرہ میں گھسیڑنا
چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ جو امور ایک قانون
مشخص مقرر کے نیچے آجائیں اُن کا مفہوم محدود
ہونے کو لازم پڑا ہوا ہے اور جو حکمتیں اور قدرتیں
ذاتِ غیر محدود میں پائی جاتی ہیں ان کا غیر محدود
ہونا واجب ہے۔ کیا کوئی دانا کہہ سکتا ہے کہ اس
ذاتِ قادرِ مطلق کو اس اس طور پر بنانا یاد ہے اور اس
سے زیادہ نہیں۔ کیا اُس کی غیر متناہی قدرتیں
انسانی قیاس کے پیمانہ سے وزن کی جا سکتی ہیں؟
یا اس کی قادرانہ اور غیر متناہی حکمتیں تصرف فی العالم
سے کسی وقت عاجز ہو سکتی ہیں۔ بلاشبہ اس
کا پُرزور ہاتھ ذرّہ ذرّہ پر قابض ہے۔ اور کسی
مخلوق کا قیام اور بقا اپنی مستحکم پیدائش کے
موجب سے نہیں بلکہ اُسی کے سہارے اور آسرے
سے ہے اور اُس کی ربّانی طاقتوں کے آگے بیشمار
میدان قدرتوں کے پڑے ہیں۔ نہ اندرونی طور پر
کسی جگہ انتہا ہے اور نہ بیرونی طور پر کوئی کنارہ
ہے جس طرح یہ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ ایک مشتعل
آگ کی تیزی فرو کرنے کے لئے خارج میں کوئی
ایسے اسباب پیدا کرے جن سے اُس آگ کی
تیزی جاتی رہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ
خدا تعالیٰ اس آگ کی خاصیت احراق دُور کرنے
کے لئے اُسی کے وجود میں کوئی ایسے اسباب
پیدا کر دے جن سے خاصیت احراق دُور ہو جائے
کیونکہ اُس کی غیر متناہی حکمتوں اور قدرتوں کے
آگے کوئی بات اَن ہونی نہیں۔ اور جب ہم اُس
کی حکمتوں اور قدرتوں کو غیر متناہی مان چکے
تو ہم پر یہ بھی فرض ہے کہ ہم اس بات کو بھی
مان لیں کہ اُس کی تمام حکمتوں اور قدرتوں پر
ہم کو علم حاصل ہونا ممتنع اور محال ہے۔ سو ہم
اُس کی ناپیدا کنار حکمتوں اور قدرتوں کے لئے
کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ اور جس چیز کی حدود
ہمیں معلوم ہی نہیں اُس کی پیمائش کرنے سے
ہم عاجز ہیں۔ ہم بنی آدم کی دنیا کا نہایت
ہی تنگ اور چھوٹا سا دائرہ ہے اور پھر اس
دائرہ کا بھی پورا پورا ہمیں علم حاصل نہیں
پس اس صورت میں ہماری نہایت ہی کم ظرفی
اور سفاہت ہے کہ ہم اس اقل قلیل پیمانہ سے

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا

اُس (یعنی ابراہیمؑ) نے کہا تم نے اللہ (تعالیٰ) کے سوا بُتوں سے تعلق قائم کر چھوڑا ہے (اور تمہارا یہ فعل محض

مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

دُنیلی زندگی میں دوسرے مشرکوں سے محبت بڑھانے کے لئے (ہے) پھر قیامت کے دن تم میں سے

يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ز

بعض بعض کا انکار کریں گے اور تم میں سے بعض بعض پر لعنت ڈالیں گے

خدا تعالیٰ کی غیر محدود حکمتوں اور قدرتوں کو ناپنے لگیں۔"

(براہین احمدیہ حصہ چہارم حاشیہ نمبر ۴ صفحہ ۴۰۹ ایڈیشن اوّل)

پھر یہی مضمون "برکات الدعا" میں بھی آپ نے بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اسجگہ ایک اور سرّ یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ اولیاء سے جو خوارق کبھی اس قسم کے ظہور میں آتے ہیں کہ پانی اُنکو ڈبو نہیں سکتا اور آگ اُن کو نقصان نہیں پہنچا سکتی اس میں بھی دراصل یہی بھید ہے کہ حکیم مطلق جس کے بیئے انتہا اسرار پر انسان حاوی نہیں ہو سکتا اپنے دوستوں اور مقربوں کی توجہ کے وقت کبھی یہ کرشمۂ قدرت دکھلاتا ہے کہ وہ توجہ عالم میں تصرف کرتی ہے اور جن ایسے مخفی اسباب کے جمع ہونے سے مثلاً آگ کی حرارت اپنے اثر سے رُک سکتی ہے خواہ وہ اسباب اجرام علوی کی تاثیریں ہوں یا خود مثلاً آگ کی کوئی مخفی خاصیت یا اپنے بدن کی ہی کوئی مخفی خاصیت یا اُن تمام خاصیتوں کا مجموعہ ہو وہ اسباب اُس توجہ اور اُس دُعا سے حرکت میں آتے ہیں

تب ایک امر خارق عادت ظاہر ہوتا ہے مگر اس سے حقائق اشیاء کا اعتبار نہیں اُٹھتا اور نہ عُلوم ضائع ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ تو عُلوم الٰہیہ میں سے خود ایک علم ہے اور یہ اپنے مقام پر ہے اور مثلاً آگ کا محرق بالخاصیت ہونا اپنے مقام پر بلکہ یُوں سمجھ لیجئے کہ یہ رُوحانی مواد ہیں جو آگ پر غالب آکر اپنا اثر دکھاتے ہیں اور اپنے وقت اور محل سے خاص ہیں۔ اس دقیقہ کو دنیا کی عقل نہیں سمجھ سکتی کہ انسان کامل خدا تعالےٰ کی رُوح کا جلوہ گاہ ہوتا ہے اور جب کبھی انسان کامل پر ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ وہ اُس جلوہ کا عین وقت ہوتا ہے تو اُس وقت ہر ایک چیز اُس سے ایسی ڈرتی ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ سے۔ اُسوقت اُس کو درندہ کے آگے ڈالدو۔ آگ میں ڈالدو وہ اُس سے کچھ بھی نقصان نہیں اُٹھائیگا۔ کیونکہ اُس وقت خدا تعالیٰ کی رُوح اُسپر ہوتی ہے اور ہر ایک چیز کا عہد ہے کہ اُس سے ڈرے یہ معرفت کا ایک آخری بھید ہے جو بغیر صحبت کاملین سمجھ میں نہیں آسکتا۔ چونکہ

وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۶﴾ فَاٰمَنَ لَهٗ

اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور جن کو تم مددگار سمجھتے ہو اُن میں سے کوئی تمہاری مدد کو نہ آئیگا۔ ۲۰ اِس (نصیحت) کے بعد

لُوْطٌ ۘ وَ قَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ

لوطؑ اُس پر ایمان لے آئے اور (ابراہیمؑ نے) کہا۔ مَیں تو اپنے ربّ کی طرف ہجرت کرکے جانیوالا ہوں۔ وہ یقیناً غالب (اور)

الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾ وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا

بڑی حکمت والا ہے۔ اور ہم نے اُسے اسحاقؑ اور یعقوبؑ بخشے اور اُس کی

یہ نہایت دقیق اور پھر نہایت درجہ نادر الوقوع ہے اس لئے ہر ایک فہم اس فلاسفی سے آگاہ نہیں مگر یاد رکھو کہ ہر یک چیز خدا تعالےٰ کی آواز سنتی ہے۔ ہر یک چیز پر خدا تعالیٰ کا تصرّف ہے اور ہر یک چیز کی تمام ڈوریاں خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اُس کی حکمت ایک بے انتہا حکمت ہے جو ہر یک ذرّہ کی جڑھ تک پہنچی ہوئی ہے اور ہر یک چیز میں اتنی ہی خاصیتیں ہیں جتنی اُسکی قدرتیں ہیں۔ جو شخص اس بات پر ایمان نہیں لاتا وہ اُس گروہ میں داخل ہے جو مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ کے مصداق ہیں۔ اور چونکہ انسان کامل مظہر اتم تمام عالم کا ہوتا ہے اس لئے تمام عالم اُس کی طرف وقتاً فوقتاً کھینچا جاتا ہے۔ وہ رُوحانی عالم کا ایک عنکبوت ہوتا ہے اور تمام عالم اُس کی تاریں ہوتی ہیں اور خوارق کا یہی سِرّ ہے۔"
(برکات الدعاء حاشیہ صفحہ ۲۶، ۲۷ ایڈیشن اوّل)

۲۰ تفسیر:۔ اِس میں بتایا کہ باوجود اِسکے کہ ابراہیمؑ کو اُس کی قوم نے آگ میں ڈال دیا تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے اُسے معجزانہ رنگ میں نجات دی پھر بھی ابراہیمؑ توحید کا ایسا عاشق تھا کہ آگ سے نجات پاتے ہی اُس نے اپنی قوم کو پھر سمجھانا شروع کر دیا اور کہا کہ تم نے تو بُتوں کو اس لئے خدا بنا لیا ہے تاکہ اِس دُنیا میں وہ تمہارے درمیان محبت پیدا کرنے کا موجب ہوں یعنی ایک مرکزی نقطہ بن جائے۔ اور تم سب ایک بُت کے پجاری اپنے آپ کو بھائی بھائی کہنے لگ جاؤ لیکن یہ بُت اس دُنیا تک ہی ہیں۔ اگلے جہان میں یہ تم کو کوئی فائدہ نہیں دینگے بلکہ اگلے جہان میں پجاری بُتوں کے تعلق سے اور بُت پجاریوں کے تعلق سے انکار کرنے لگیں گے۔ اور آپس میں ایک دوسرے پر لعنت ڈالیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کافر آگ میں داخل کئے جائیں گے اور کوئی اُن کی مدد نہیں کر سکیگا۔

اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ شرک کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں بلکہ صرف قوم کے لوگوں کو خوش کرنے اور اُن کی تعریف حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ لیکن سچا دین ہمیشہ دلیل پر قائم ہوتا ہے اور سچے دین کے پیرو لوگوں کو خوش کرنے کی بجائے خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو مقدم رکھتے ہیں۔ گویا مشرک تو دنیا کو دین پر مقدم کرتا ہے لیکن مومن دین کو دنیا پر مقدم کرتا ہے۔ مشرک لوگوں سے ڈرتا ہے اور اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے

فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ

ذریّت کے ساتھ نبوت اور کتاب مخصوص کردی اور ہم نے اُس کو دنیا میں بھی اس کا اجر

فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۸﴾

بخشا - اور آخرت میں بھی وہ نیک بندوں میں شامل کیا جائیگا۔ ۲۱ع

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۫

اور لُوطؑ کو بھی (ہم نے رسول بنا کر بھیجا) جبکہ اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک ایسی بدی کرتے ہو جس کا ارتکاب

مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾

دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔

لیکن مومن صرف خدا سے ڈرتا اور اُسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا میں بتایا کہ کُفر کی دوستی ایسی ناپائیدار ہوتی ہے کہ دنیا میں بھی وہ لوگ جن کو خوش کرنے کے لئے خدا اور اُس کے رسول کی مخالفت کی جاتی ہے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اگلے جہان میں بھی یہ دوستیاں انسان کے کسی کام نہیں آ سکتیں۔

۲۱ع تفسیر:- حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے زندہ نکل آنے کا معجزہ دیکھ کر جو لوگ آپ کی طرف راغب ہوئے تھے اُن میں سے ایک حضرت لُوطؑ بھی تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی حاران کے بیٹے تھے۔ (پیدائش باب ۱۱ آیت ۵) چنانچہ فرماتا ہے کہ اس نظارہ کو دیکھنے کے بعد لُوطؑ ابراہیمؑ پر ایمان لے آیا اور پھر ابراہیمؑ نے لوگوں میں اپنی ہجرت کا اعلان کر دیا۔ اور کہا کہ میں خدا تعالیٰ کی خاطر اب اپنا وطن بھی چھوڑ رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میرا خدا جو غالب ہے اور جس کے تمام کام حکمتوں پر مبنی ہیں مجھے بھی غلبہ عطا فرمائیگا اور میری اس ہجرت کو رائیگاں نہیں جانے دیگا۔ بلکہ اس کے اعلیٰ نتائج عطا فرمائے گا پھر فرماتا ہے۔ جب ابراہیمؑ نے خدا کے لئے اپنے وطن اور عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا تو وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ۔ ہم نے اس کے اخلاص کو دیکھ کر اُسے اسحاقؑ جیسا بیٹا اور یعقوبؑ جیسا پوتا عطا کیا۔ اور اُس کی ذریّت میں نبوت اور کتاب رکھدی۔

تاریخ سے ثابت ہے اور بائیبل بھی اس امر پر گواہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے غیر قوموں میں بھی نبی آتے رہے ہیں پس جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ کے صرف یہ معنے ہیں کہ ابراہیمؑ کی ذریّت میں سے نبی آتے رہے اور اُن کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ یہ معنے نہیں کہ دوسری قوموں میں نبی نہیں آئے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ع۳) یعنی دنیا کی کوئی قوم نہیں جس میں ہماری طرف سے کوئی نبی مبعوث نہ ہوا ہو۔ اِسی طرح فرماتا ہے وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد ع۱) دنیا کی ہر قوم کی طرف ہادی اور راہنما آتے رہے ہیں۔

أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ ۙ وَ

کیا تم (عورتوں کو چھوڑ کر) مردوں کے پاس آتے ہو اور ڈاکے مارتے ہو۔ اور اپنی

تَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنْكَرَ ۖ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ

مجالس میں ناپسندیدہ حرکتیں کرتے ہو۔ اِس پر اُس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا

إِلَّا أَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللَّهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ

کہ انہوں نے کہہ دیا کہ اگر تُو سچے لوگوں میں سے ہے تو اللہ (تعالےٰ) کا عذاب ہم پر

الصَّادِقِينَ ﴿۳۰﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ﴿۳۱﴾ ع

نازل کردے۔ اِس پر لُوطؑ نے کہا۔ اے میرے ربّ! مفسد قوم کے خلاف میری مدد کر۔ ۲۲ع

۳ ع ۱۵

اور اللہ تعالیٰ اِس کو کسی زمانہ سے مخصوص نہیں کرتا۔ پس اِس آیت کے یہ معنے نہیں کئے جاسکتے کہ نبوت اور کتاب کو اِن معنوں میں آپ کی ذرّیت سے مخصوص کر دیا گیا کہ کسی غیر قوم میں نبی نہیں آئیگا۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ ابراہیمؑ کے اخلاص کو دیکھکر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اَلنَّبِیُّ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن کی خبر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دی تھی اور جن کو ایک آتشی شریعت دی جانے والی تھی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہوں۔ اور چونکہ اُن کے بعد کوئی نبوّت تامہ مستقلہ نہیں آئیگی بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظلّی اور بروزی نبوّت آئیگی اس لئے قیامت تک آپ کے ذریعہ سے اب نبوت ابراہیمؑ کے خاندان کے ساتھ چسپاں ہوگئی۔ مادی لحاظ سے بھی اور اس لحاظ سے بھی کہ کوئی شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک مہرِ تاباں یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روشنی لئے بغیر بارگاہِ الٰہی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔

وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ آخرت میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑے درجات حاصل ہونگے اور وہ منعم علیہ گروہ میں شامل کئے جائینگے مگر اس کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ آخری زمانہ میں بھی ابراہیمؑ کو لوگ بہت نیک قرار دیں گے۔ چنانچہ اس آخری زمانہ میں بھی جو اُمتیں قائم ہیں وہ ساری کی ساری حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتی ہیں۔ یعنی مسلمان بھی۔ یہودی بھی عیسائی بھی۔

اِسی طرح اس کے تیسرے معنے یہ ہیں کہ ساعتِ آخرت میں جو بروزِ ابراہیمؑ ظاہر ہو گا وہ بھی خدا کے نزدیک اپنے کام کا اہل ہوگا۔ اور اُس پر اعتراض کرنے والے غلطی کرینگے۔

۲۲ع تفسیر: - فرماتا ہے۔ ہم نے لُوطؑ کو بھی رسول بنا کر بھیجا اور اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک خاص بدی میں مبتلا ہو جو تم سے پہلے کسی اور قوم میں نہیں پائی گئی۔ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس آتے ہو اور ڈاکے ڈالتے ہو۔ اور اپنی مجالس میں بے حیائی کی باتیں کرتے ہو اور خدا تعالےٰ کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔

تَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنْكَرَ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آجکل یورپ اور امریکہ میں بے حیائی پائی جاتی ہے

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا

اور جب ہمارے رسول ابراہیمؑ کے پاس بشارت لائے ۔ تو انہوں نے کہا ۔ ہم

مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۳۲﴾

اِس بستی کو ہلاک کرنے والے ہیں ۔ کیونکہ اِس کے باشندے ظالم ہیں ۔

قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ۤ

(ابراہیمؑ نے جواب میں) کہا کہ اس (بستی) میں تو لُوطؑ بھی رہتا ہے ۔ انہوں نے کہا ہم اس (بستی) میں رہنے والوں کو خوب جانتے ہیں

لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڭ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

ہم اس (یعنی لوطؑ) کو اور اُسکے گھر والوں کو سوائے اُس کی بیوی کے جو پیچھے رہنے والوں میں شامل ہو جائیگی نجات دینگے۔ ۲۳؎

اور پبلک میں عورتوں کو چمٹانا اور انہیں پیار کرنا یا پارکوں میں زنا کاری کرنا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا ۔ اسی طرح اُس زمانہ میں بھی تمدّن بہت بڑھ گیا تھا ۔ اور وہ مجالس میں ایک دوسرے کے سامنے اس قسم کی فواحش کا دلیری سے ارتکاب کر لیا کرتے تھے اور کوئی شخص بُرا نہیں مناتا تھا ۔

حضرت لُوط علیہ السلام کی قوم اس نصیحت کے باوجود اپنی حرکات سے باز نہ آئی بلکہ اُس نے لُوطؑ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی نشان لاؤ اور ہم پر عذاب نازل کرو ۔ آخر لُوطؑ نے تنگ آکر اپنے ربّ سے دُعا کی کہ خدایا مجھے مفسد قوم کے خلاف مدد دے ۔

۲۳؎ **تفسیر**:- فرمایا جب ہمارے پیغامبر (یعنی علاقہ کے بعض ملہم جن کو خدا تعالیٰ نے حضرت لُوط علیہ السلام کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے اور اُنکا رہبر بننے کیلئے بھجوایا تھا) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لائے ۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم اس بستی یعنی لُوطؑ کی بستی کو ہلاک کرنے کے لئے بھجوائے گئے ہیں ۔

رُسُلُنَا سے مفسرین نے فرشتے مراد لئے ہیں لیکن میرے نزدیک اسجگہ رسولوں سے اُس علاقہ کے بعض اولیاء مُراد ہیں جو خدا تعالےٰ سے وحی پاکر پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور پھر حضرت لوط علیہ السلام کو عذاب کی خبر دینے کے لئے چلے گئے ۔ اِن رُسُل کے انسان ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب یہ لوگ آئے تو آپ فوراً اپنے گھر تشریف لے گئے اور اُن کے کھانے کے لئے ایک بچھڑا ذبح کر دیا (سورۃ ہود آیت ۷۰) اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھتے کہ یہ فرشتے ہیں تو آپ اُن کے لئے کھانے کا کیوں انتظام فرماتے ۔ پھر جب انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیال گذرا کہ مہمان نوازی میں کوئی سقم نہ رہ گیا ہو جس کی وجہ سے یہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے تو انہوں نے کہا کہ لَا تَخَفْ اِنَّا اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۔ یعنی آپ تسلّی رکھیں ۔ آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ ۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم اِس وقت ایک عذاب کی خبر دینے کے لئے جا رہے ہیں اس لئے کھانا کھانے سے معذور ہیں ۔ اُن کا یہ جواب بھی

بتاتا ہے کہ وہ فرشتے نہیں تھے ورنہ وہ یہ جواب دے سکتے تھے کہ ہم تو فرشتے ہیں اور ہم نے کبھی کھانا کھایا ہی نہیں اسلئے آپ کا کھانا بھی ہم نہیں کھا سکتے۔

پھر وہ لوگ جب حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے بھی دیکھکر یہ نہیں کہا کہ خدا کے فرشتے آگئے ہیں۔ بلکہ انہوں نے بھی یہی کہا کہ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (حجر ع۴) یعنی آپ لوگ تو اس علاقہ میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ گویا اُن کا ذہن بھی فرشتوں کی طرف نہیں گیا بلکہ انہوں نے بھی اُن کو انسان ہی سمجھا۔ پھر اِن رُسُل کے انسان ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل آیت ۹۶) یعنی تُو انہیں کہہ کہ اگر زمین پر فرشتے بس رہے ہوتے جو زمین پر اطمینان سے چلتے پھرتے تو اس صورت میں ہم ضرور ان پر آسمان سے کسی فرشتہ کو ہی رسول بنا کر اُتارتے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے رسول ہو کر صرف نیک لوگوں کے لئے آتے ہیں۔ بدکاروں کے لئے نہیں آتے۔ مگر یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اُن فرشتوں کو سدوم کے تمام لوگوں نے دیکھا۔ اور اُن کے آنے پر حضرت لوطؑ کو لوگوں نے بُرا بھلا کہا۔ پس اُن کا ایسے لوگوں کے سامنے جسمانی رنگ میں ظاہر ہونا جن پر عذاب نازل ہونے والا تھا اس آیت کے خلاف ہے۔ پس اسجگہ رُسُل سے مُراد اردگرد کے علاقہ کے بعض ملہم ہیں جن کو اللہ تعالےٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس اس لئے بھیجا کہ وہ عذاب کے وقت اپنے آپ کو بے یار و مددگار نہ پائیں اور حضرت لوطؑ کو کسی امن کی جگہ پہنچا دیں۔

بائیبل جو ہر قسم کے رطب ویابس سے بھری ہوئی ہے اُس نے اِن رُسُل کو کبھی تو انسان قرار دیا ہے اور کبھی فرشتے۔ چنانچہ پیدائش باب ۱۸ آیت ۱و۲ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے:۔

"وہ دن کو گرمی کے وقت اپنے خیمہ کے دروازہ پر بیٹھا تھا اور اُس نے اپنی آنکھیں اُٹھا کر نظر کی۔ اور کیا دیکھتا ہے کہ تین مرد اُس کے سامنے کھڑے ہیں۔"

اسی طرح پیدائش باب ۱۸ آیت ۱۶ میں لکھا ہے:۔

"تب وہ مرد وہاں سے اُٹھے اور انہوں نے سدوم کا رُخ کیا۔"

مگر پیدائش باب ۱۹ آیت ۱ میں لکھا ہے:۔

"وہ دونوں فرشتے شام کو سدوم میں آئے اور لوط سدوم کے پھاٹک پر بیٹھا تھا"

گویا بائیبل کبھی تو انہیں انسان قرار دیتی ہے اور کبھی فرشتے اور کبھی تین مرد قرار دیتی ہے اور کبھی دو فرشتے۔ مگر فرشتہ کہنے کے ساتھ ہی بائیبل یہ بھی کہتی ہے کہ حضرت لوطؑ نے

"اُن کے لئے ضیافت تیار کی اور بے خمیری روٹی پکائی اور انہوں نے کھایا۔"

(پیدائش باب ۱۹ آیت ۳)

حالانکہ اگر وہ فرشتے تھے تو اُن کے روٹی کھانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ پس یہ رُسُل فرشتے نہیں تھے بلکہ انسانوں میں سے ہی بعض نیک لوگ تھے جو اُن کی طرف بھجوائے گئے تھے۔

یہ سوال کہ وہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس کیوں آئے اور کیوں نہ سیدھے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس چلے گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں سے تھے اور اس لحاظ سے وہ ایک تابع نبی کی حیثیت رکھتے تھے جس طرح حضرت اسحٰقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ بھی تابع نبی تھے یا حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے تابع تھے گو اُن میں سے اُمتی نبی کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ اُس زمانہ میں نبوّت

براہِ راست ہوا کرتی تھی۔ کسی سابق نبی کے فیض سے نبوت حاصل نہیں ہوتی تھی۔ پس چونکہ حضرت لوط علیہ السلام نبوت سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے اور آپ کے ساتھ ہی ہجرت کر کے وہ شام میں آئے تھے اس لئے اُنکی قوم کی تباہی کی خبر بھی پہلے اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہی دی۔ مگر اللہ تعالےٰ نے اس عذاب کی خبر سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک خوشخبری بھی پہنچا دی جس کا ذکر وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى میں کیا گیا ہے۔ یہ بشارت حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کی خبر تھی جس کا ذکر سورۂ ہود آیت ۷۲، سورۃ الحجر آیت ۵۴ اور سورۃ الذاریات آیت ۲۹ میں کیا گیا ہے۔ علامہ ابوحیانؒ نے بھی بُشْرٰی سے حضرت اسحٰق علیہ السلام اور پھر اُن کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کی ولادت کی خبر مراد لی ہے (بحر محیط جلد ۷ صفحہ ۱۵۰) گویا خدا تعالیٰ نے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک نیک نسل کی پیدائش کی خوشخبری دی اور پھر قوم لوطؑ کی ہلاکت کی خبر دی تاکہ آپ کا صدمہ کم ہو جائے۔

اگر کوئی کہے کہ اگر یہ رسول انسان تھے اور الہام کے ذریعہ سے خبر پاکر لوطؑ کو بتانے آئے تھے تو خدا تعالیٰ نے براہِ راست حضرت لوطؑ پر کیوں نہ الہام نازل کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ بائبل سے ظاہر ہے حضرت لوطؑ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اُور سے جو عراق کے علاقہ کا ایک قصبہ تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہی ہجرت کر کے کنعان یعنی فلسطین کی طرف چلے آئے تھے یہاں پہنچکر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے الگ ہو کر سدوم نامی بستی میں رہنے لگے (پیدائش باب ۱۲ آیت ۴، ۵)

اور طالمود جو یہود کی روایات اور تاریخ کی کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ سدوم اور عمورہ کے لوگ مسافروں کو لوٹ لینے کے عادی تھے (جیوش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ سدوم) اسی کی طرف قرآن کریم نے بھی وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ کے الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ اور جو قوم ہمسایوں کو اس طرح دُکھ دینے کی عادی ہو لازماً وہ اپنے ہمسایوں سے خائف بھی رہے گی کہ شاید وہ کسی وقت اُسے نقصان پہنچا دیں۔ اور سدوم والوں سے اُن کے ہمسایوں کی عملاً لڑائی بھی رہتی تھی۔ بلکہ بائبل بتاتی ہے کہ ایک دفعہ سدوم اور عمورہ کے بادشاہوں پر اردگرد کے بادشاہوں نے ملکر حملہ کر دیا اور وہ سدوم اور عمورہ کا سب مال اور وہاں کا سب اناج لیکر چلے گئے۔ بلکہ لکھا ہے کہ وہ حضرت لوطؑ کو بھی قیدی بناکر اپنے ساتھ لے گئے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بات کا علم ہُوا تو انہوں نے تین سو اٹھارہ بہادروں کے ساتھ اُن کا تعاقب کیا اور وہ حضرت لوطؑ کو اور سدوم اور عمورہ کے باقی سب مردوں اور عورتوں کو جنہیں وہ پکڑ کر لے گئے تھے چھڑا کر لے آئے اور مال بھی انہوں نے واپس لے لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مہم سے کامیاب واپس آئے تو سدوم کے بادشاہ نے آپ کا استقبال کیا اور ملک صدق جو سالم کا بادشاہ تھا اُس نے بھی آپ کی دعوت کی اور سدوم کے بادشاہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ مجھے صرف آدمی دے دیئے جائیں۔ اور مال خود رکھ لیں مگر حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ میں جوتی کا ایک تسمہ بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گا اور سب چیزیں آپ نے انہیں دیدیں (پیدائش باب ۱۴)

پس چونکہ حضرت لوط علیہ السلام اس علاقہ سے پوری طرح واقف نہیں تھے بلکہ اُس ملک میں سدوم والوں کے دشمن بھی موجود تھے۔ اگر براہ راست اُن پر الہام ہوتا کہ یہاں سے نکل جاؤ تو وہ گھبراتے کہ جائیں کہاں۔ سو اللہ تعالیٰ نے اُن کی تسلی کے لئے یہ تدبیر کی کہ اردگرد کے بعض نیک لوگوں کو الہام کیا کہ لوطؑ کے پاس جاؤ اور اُن کو بتادو کہ اُن کی قوم پر عذاب آنے والا ہے اور انہیں حفاظت کے ساتھ کسی محفوظ مقام تک پہنچا دو۔ کیونکہ وہ اِس علاقہ کے واقف نہیں۔

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَ

اور جب ہمارے رسول لوطؑ کے پاس آئے تو اُن کی وجہ سے اُسے دُکھ پہنچا - اور نیز

ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ قف

اُن کی وجہ سے اُس کا دل تنگ ہو گیا اور (اُس کی اِس حالت کو دیکھ کر) اُن پیغام لانے والوں نے کہا کہ کسی (آئندہ) بات کا خوف نہ کر

اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ

اور نہ کسی گذشتہ واقعہ پر افسوس کر - ہم تجھ کو اور تیرے گھر والوں کو سوائے تیری بیوی کے جو پیچھے رہنے والوں میں شامل

مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ

ہو جائیگی نجات دینے کے لئے آئے ہیں - ہم اِس بستی پر اُن کی نافرمانی کی وجہ سے

الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۵﴾

عذاب نازل کرنیوالے ہیں

اِس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے کہ نبی کو تو پتہ نہ لگا ہو کہ میری قوم ہلاک ہونے والی ہے لیکن دوسروں کو علم ہو گیا ہو - اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال قلّتِ تدبّر کا نتیجہ ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اپنی قوم کو پہلے سے عذاب کی خبر دے چکے تھے - چنانچہ سورۂ حجر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب وہ رسول آپ کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ (سورۂ حجر آیت ۶۴) ہم آپ کے پاس اُس عذاب کی خبر لے کر آئے ہیں جس کے بارہ میں یہ لوگ شک کر رہے ہیں - گویا وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عذاب کی خبر حضرت لوط علیہ السلام پہلے ہی دے چکے تھے - مگر چونکہ یہ عذاب اب بالکل قریب آ پہنچا تھا - اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اُس علاقہ کے چند نیک لوگوں کو اِس لئے آپ کے پاس بھیجا کہ وہ حضرت لوط علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیں - اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے ماتحت یہ انتظام نہ فرماتا تو حضرت لوط علیہ السلام کو بڑی پریشانی ہوتی کہ اب جب اِس شہر پر عذاب آنے والا ہے تو میں کہاں جاؤں - جبکہ باقی علاقہ میں میری واقفیت بھی کوئی نہیں - اور پھر ارد گرد سب سدوم کے دشمن آباد ہیں -

اسلام میں بھی اِس قسم کی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ بعض اہم معاملات کی دوسرے مسلمانوں کو خبر دی گئی - مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت عبداللہ بن زیدؓ ایک صحابی تھے - اللہ تعالیٰ نے اُن کو رؤیا کے ذریعہ سے اذان سکھائی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کی رؤیا پر انحصار کرتے ہوئے مسلمانوں میں اذان کا رواج ڈالا - بعد میں قرآنی وحی نے بھی اس کی تصدیق کر دی - حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے بھی خدا تعالیٰ نے بھی اذان سکھائی تھی - مگر بیس دن تک میں خاموش رہا

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۳۶

اور ہم نے اس بستی کے (واقعہ کے) ذریعہ سے ایک کھلی عبرت کا سامان عقل والے لوگوں کے لئے پیچھے چھوڑا ہے۔ ۲۴؎

اِس خیال سے کہ ایک اور شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات بیان کرچکا ہے (سنن ابی داؤد جزو اوّل مطبوعہ مصر ص۱۸۰ و سنن ابن ماجہ جزو اوّل ص۲۴۰ تا ۲۴۱ مطبوعہ مصر) اِس کی طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ یَرٰی اَوْ یُرٰی لَہٗ یعنی مومن کو کبھی تو براہِ راست خبر دی جاتی ہے اور کبھی دوسروں کی معرفت اُسے خبر پہنچائی جاتی ہے۔ پس حضرت لوط علیہ السلام کو بعض دوسرے لوگوں کے ذریعہ عذاب کے بالکل قریب آجانے کی خبر پہنچانا کوئی قابلِ اعتراض امر نہیں۔

اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ سے یہ مراد نہیں کہ اُن کو کوئی خاص طاقت حاصل تھی بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے الہام کے ماتحت ہم اس بستی کی ہلاکت کی خبر دینے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ کیونکہ اس بستی کے لوگ ظالم ہیں۔ اگر بالفرض اُن کو فرشتے بھی سمجھ لیا جائے جیسا کہ مفسرین کہتے ہیں۔ تب بھی فرشتے خود عذاب نہیں دیا کرتے بلکہ خدا تعالیٰ کے عذاب کی خبر دیا کرتے ہیں۔ پس اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ سے عذاب کی خبر دینا مراد ہے نہ کہ خود عذاب نازل کرنا۔

قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ خبر سُنکر کہا کہ اُس بستی میں تو لوط بھی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کا برگزیدہ ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہم اُس بستی میں رہنے والوں کو خوب جانتے ہیں۔ ہم اُس کو اور اُسکے اہل کو سوائے اُس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے نجات دینگے۔ یعنی انہیں کسی محفوظ مقام میں پہنچا دینگے۔ کیونکہ اُن لوگوں کو حضرت لوط کی آئندہ رہائش کے انتظام کے لئے ہی بھیجا گیا تھا۔

۲۴؎ **تفسیر**۔ فرماتا ہے جب وہ لوگ وہاں سے چل کر ہمارے رسول حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے تو اُنکو دیکھ کر اُسے بڑی تکلیف ہوئی اور اُس کا دل تنگ ہوگیا کیونکہ اُس کی قوم کے لوگوں نے غیر قوموں کے آدمیوں کی مہمان نوازی سے اُسے منع کیا ہوا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت لوطؑ کے مخالفین نے اُن سے کہا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (حجر ع۵) کہ اے لوطؑ! کیا ہم نے تجھے غیر معلوم مسافروں کو گھر میں لانے سے نہیں روکا ہوا؟ اُس زمانہ میں شہر چھوٹے چھوٹے اور دُور دُور ہوتے تھے۔ اور غیر معلوم مسافروں کے لانے سے ڈر ہوتا تھا کہ کہیں ڈاکہ نہ پڑے اور چونکہ سدوم کے باشندے خود بھی ڈاکو تھے وہ دوسروں کو بھی اپنے جیسا سمجھتے تھے اور غیر معروف مسافروں کو شہر میں نہیں آنے دیتے تھے تا ایسا نہ ہو کہ رات کو وہ شہر کے دروازے کھول دیں اور دشمن غفلت کی حالت میں آکر حملہ کردے۔ حضرت لوطؑ چونکہ مہمان نواز تھے وہ مسافروں کو لے آتے اور سمجھتے کہ اگر وہ باہر رہ گئے تو لوٹے جائیں گے۔ اور یہ لوگ اُن کو اس سے منع کیا کرتے تھے۔ اِس دفعہ جب پھر حضرت لوطؑ اُن لوگوں کو ساتھ لے آئے تو یہ لوگ غصہ سے بھر گئے اور حضرت لوطؑ کے پاس دوڑتے ہوئے آئے۔ حضرت لوطؑ کو بہت دُکھ پہنچا۔ اور آپ ڈرے کہ کہیں یہ لوگ مہمانوں کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مگر انہوں نے کہا کہ ڈر نہیں اور غم نہ کر۔ یعنی اب تجھے کسی آئندہ خطرہ سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ اُن کی تباہی کا فیصلہ کرچکا ہے۔ مگر چونکہ قوم کی تباہی کی خبر سے حضرت لوط علیہ السلام کا غمگین ہونا ایک طبعی امر تھا۔ اِس لئے

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوْمِ

اور مدین کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔ (جب وہ آیا) تو اُس نے کہا۔ اے میری قوم!

اعْبُدُوا اللّٰہَ وَارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا

اللہ کی عبادت کرو اور اُخروی زندگی کے وقت کو یاد رکھو اور ایسے مفسدانہ

فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۳۷﴾ فَکَذَّبُوْہُ فَاَخَذَتْھُمُ

کام نہ کرو کہ ملک میں تمہارے کاموں کی وجہ سے فساد پھیل جائے۔ اِس پر انہوں نے اُسکو جھٹلا دیا اور ایک ہلا دینے والے عذاب نے

انہوں نے ساتھ ہی آپ کو تسلّی دی کہ لَا تَحْزَنْ آپ ان کی تباہی پر غم بھی نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نیکی کے بیج کو ضائع نہیں کریگا بلکہ وہ آپ کو اور آپ کے تمام اہل کو سوائے آپ کی بیوی کے اس عذاب سے محفوظ رکھیگا اور اسطرح اُن کے ذریعہ پھر دنیا میں نیکی اور تقوٰی کی کھیتی سرسبز ہونی شروع ہو جائیگی۔

اِنَّا مُنَجُّوْکَ میں انہوں نے اس نجات کو اپنی طرف اِس لئے منسوب کیا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اِسی غرض کے لئے بھجوائے گئے تھے کہ لوطؑ اور اُن کے اہل کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیں۔

باقی رہا اُن رسولوں کا اِس تباہی کو اپنی طرف منسوب کرنا اور یہ کہنا کہ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓی اَھْلِ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فرشتہ نے حضرت مریم سے کہا کہ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا (مریم ع آیت ۲۰) یعنی میں تیرے رب کا ایک پیغامبر ہوں تاکہ میں تجھے ایک پاک لڑکا دوں۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ لڑکا خدا دیا کرتا ہے۔ فرشتہ نہیں دیا کرتا۔ پس جس طرح لِاَھَبَ لَکِ سے مراد صرف لڑکے کی پیدائش کی خبر دینا ہے نہ کہ لڑکا دینا۔ اِسی طرح اِنَّا مُھْلِکُوْٓا اَھْلِ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ اور اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمٍ مُّجْرِمِیْنَ ۙ لِنُرْسِلَ عَلَیْھِمْ حِجَارَۃً مِّنْ طِیْنٍ ۙ مُّسَوَّمَۃً عِنْدَ رَبِّکَ لِلْمُسْرِفِیْنَ یا اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓی اَھْلِ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ سے یہ مراد نہیں کہ اُن رسولوں نے عذاب نازل کرنا تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی خبر کے ماتحت یہ اطلاع دیتے ہیں کہ لوطؑ اور اُس کے اکثر اہلبیت بچ جائیں گے۔ اور مخالف تباہ ہو جائیں گے۔ ورنہ عذاب تو خدا تعالیٰ نے ہی نازل کیا تھا۔ جیسے سورۂ ہود میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَھَا سَافِلَھَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْھَا حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۙ مُّسَوَّمَۃً عِنْدَ رَبِّکَ (ہود آیت ۸۳ و ۸۴) یعنی جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اُس بستی کے اوپر والے حصّہ کو نیچے والا حصّہ بنا دیا۔ اور اُس پر سوکھی مٹی کے بنے ہوئے پتھروں کی یکے بعد دیگرے بارش برسائی جو تیرے رب کی تقدیر میں اُن کے لئے ہی مقدّر اور نامزد کئے گئے تھے۔

اِس جگہ بھی وَلَقَدْ تَّرَکْنَا مِنْھَآ اٰیَۃًۢ بَیِّنَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اِس عذاب کو

الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَعَادًا

اُن کو پکڑ لیا - جس کے نتیجہ میں وہ اپنے گھروں میں (زمین سے) چمٹے کے چمٹے رہ گئے - ۲۵ء اور عاد کو بھی

وَّثَمُوْدَاۡ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ

اور ثمود کو بھی (ہماری طرف سے ایک ہلا دینے والے عذاب نے پکڑ لیا) اور (اے اہل مکہ) تم پر اُن کی بستیوں کا حال ظاہر ہے -

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ

اور شیطان نے اُن کو ان کے عمل اچھے کرکے دکھائے - اور اُس نے (یعنی شیطان نے) اُن کو

اپنی طرف منسوب کیا ہے - اور بتایا ہے کہ ہم نے اس ذریعہ سے عقل رکھنے والے لوگوں کے لئے ایک بڑی عبرت کا سامان پیچھے چھوڑا

یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ عذاب خدا تعالیٰ نے اُتارا تھا - اُن رسولوں نے نہیں اُتارا تھا - وہ صرف خبر دینے آئے تھے - اگر ان رسولوں نے عذاب اُتارا ہوتا تو خدا تعالےٰ یہ کیوں کہتا کہ ہم نے اس عذاب کے ذریعہ سے ایک کھلا نشان پیچھے چھوڑ دیا کیونکہ اگر رسولوں نے عذاب اُتارا تھا تو نشان انہوں نے چھوڑا نہ کہ خدا تعالےٰ نے - پس اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰۤى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ یا اسی قسم کی بعض دوسری آیات سے یہ مُراد نہیں کہ وہ عذاب اُن رسولوں نے نازل کیا تھا - بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم اس بستی کے باشندوں پر خدائی عذاب کے نازل ہونے کی خبر دیتے ہیں - ورنہ عذاب تو خدا تعالیٰ نے ہی نازل کرنا تھا -

۲۵ء تفسیر:- فرمایا - ہم نے لُوطؑ کے بعد مدین کی طرف اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا تھا اور انہوں نے بھی اپنی قوم کو یہی کہا تھا کہ ایک خدا کی پرستش کرو - اور یوم آخرت پر ایمان رکھو - اور دنیا میں فساد مت پیدا کرو -

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ڈاکہ زنی اور قتل و غارت کی خوگر تھی - چونکہ مدین قوم کا مرکزی شہر جس کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے عرب. شام اور مصر کے راستوں پر واقع تھا اور وہاں سے قافلے گذرا کرتے تھے اس لئے یہ لوگ مسافروں کو لوٹ لینے کے عادی تھے - اس قیاس کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ مدین قوم کے قبضہ میں قریب ہی ایک بڑا بھاری جنگل تھا جس میں رہنے والوں کا قرآن کریم نے "اصحاب الایکہ" نام رکھا ہے - اور یہ لوگ بھی حضرت شعیب علیہ السلام کے مخاطبین میں ہی شامل تھے اور ہر شخص جانتا ہے کہ جنگل میں ڈاکے ڈالنے زیادہ آسان ہوتے ہیں کیونکہ انسان اُس میں بڑی آسانی سے چھُپ سکتا ہے پس یہ لوگ ڈاکہ زنی اور قتل و غارت کے ارتکاب سے بھی فساد پیدا کر رہے تھے اور بیع و شرا کرتے وقت تول اور ماپ میں بھی کمی بیشی کر کے فساد پیدا کر رہے تھے - حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں بہت سمجھایا مگر اُن کی قوم نے ان نصائح کی کوئی پرواہ نہ کی اور انہوں نے آپ کو جھٹلا دیا - آخر اُن پر ایک شدید زلزلہ آیا جس کے نتیجہ میں وہ اپنے گھروں میں دو زانو بیٹھے ہوئے رہ گئے - حضرت شعیب چونکہ

عَنِ السَّبِیْلِ وَکَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ ﴿۳۹﴾ وَقَارُوْنَ

(اللہ تعالیٰ) کے راستہ سے روکا - حالانکہ وہ خوب سمجھتے تھے ۲۶ اور قارون

وَفِرْعَوْنَ وَھَامٰنَ ۚ وَلَقَدْ جَآءَھُمْ مُّوْسٰی

اور فرعون اور ہامان کو بھی (ہم نے عذاب میں گرفتار کیا) - اور موسیٰؑ اُن کے پاس

بِالْبَیِّنٰتِ فَاسْتَکْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَمَا کَانُوْا

کھُلے کھُلے نشان لے کر آئے تھے - پھر بھی (وہ نہ مانے بلکہ) انہوں نے تکبّر سے کام لیا اور (ہمارے عذاب سے)

سٰبِقِیْنَ ﴿۴۰﴾ فَکُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِہٖ ۚ فَمِنْھُمْ

بھاگ کر بچ نہ سکے - پس ہم نے اِن میں سے ہر ایک کو اُس کے گناہ کی وجہ سے پکڑ لیا - سو اِن میں سے کوئی تو

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے گذرے ہیں اسلئے اُن کے ذکر سے خدا تعالیٰ نے نوحؑ سے لیکر موسیٰؑ تک نبیوں کے آنے اور اُن کے ماننے والوں کے امتحان میں پڑنے کا ذکر فرما دیا۔

۲۶ تفسیر:۔ اِس میں بتایا کہ عاد اور ثمود میں بھی بڑے بڑے بھاری نشانات ہیں - کیونکہ یہ دونوں قومیں اپنے عروج کے زمانے میں دنیا کی معلّم اور اُستاد تھیں اور فنِ تعمیر میں بھی بڑی بھاری دسترس رکھتی تھیں۔ چنانچہ قوم عاد کے نبی حضرت ہودؑ نے انہیں نصیحت فرمائی تھی کہ اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ (سورۂ شعراء آیت ۱۲۹، ۱۳۰) یعنی تم نے یہ کیا طریق اختیار کیا ہُوا ہے کہ تم ہر اونچی جگہ پر نشان کھڑے کرتے ہو - اور بڑے بڑے محلّات تعمیر کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اِس طرح تمہارا نام ہمیشہ کیلئے قائم رہے گا - مَیں نے خود عدن میں بعض پُرانی عمارتیں دیکھی ہیں جو عادِ اولیٰ کے آثار میں سے ہیں اور وہاں کے مقامی لوگوں میں یہ روائتیں پائی جاتی ہیں کہ یہ عاد کی عمارتیں ہیں -

اِسی طرح ثمود جو عاد ہی کی ایک شاخ تھے انکے متعلق بھی قرآن کریم بتاتا ہے کہ وہ میدانوں میں بڑے بڑے قلعے بناتے اور پہاڑوں کو کھود کھود کر رہائشی مکانات تیار کرتے تھے (سورۂ اعراف آیت ۷۵) مگر جب انہوں نے خدا تعالیٰ کے نبیوں کا مقابلہ کیا اور اپنے ناشائستہ افعال کو اچھا قرار دیا - تو خدا تعالیٰ نے اُنکو تباہ کر دیا اور آج سوائے اُن ٹوٹے پھوٹے آثار کے جو عرب میں دکھائی دیتے ہیں اُن کی طاقت اور شوکت کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا۔

زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ سے ظاہر ہے کہ اُن کے اعمال تو شیطانی تھے مگر تواتر اور تسلسل سے بُرے اعمال بجا لانے کا یہ نتیجہ ہُوا کہ انہیں اپنا رُوحانی کوڑھ بھی خوبصورت نظر آنے لگ گیا - گویا اُنکی آنکھیں بھی ماری گئیں اور احساسات بھی کُند ہو گئے - نہ اپنے اعمال کی شناعت انہیں دکھائی دی اور نہ اُن کی مضرتوں کا انہیں احساس رہا -

کَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ سے ظاہر ہے کہ اُن پر یہ امر اچھی طرح واضح ہو چکا تھا کہ اُن کی اِن حرکات

مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ

ایسا تھا کہ ہم نے اُسپر پتھروں کا مینہہ برسایا - اور کوئی ایسا تھا کہ اُس کو کسی اور سخت

الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ

عذاب نے پکڑ لیا - اور کوئی ایسا تھا کہ ہم نے اُس کو ملک میں ذلیل کر دیا - اور

مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ

کوئی ایسا تھا کہ ہم نے اُسے غرق کر دیا - اور اللہ (تعالےٰ) اُن پر ظلم کرنے والا نہیں تھا۔

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۱﴾

بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے - ۲۷

کا نتیجہ اچھا نہیں مگر طاقت نے اُن کو مغرور کر دیا۔ اور آخر اُس کا جو نتیجہ نکلا وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے - چند ٹوٹے پھوٹے قلعے اور مکینوں سے خالی عمارات دیکھنے والوں کے لئے عبرت کا سامان ہمیا کر رہی ہیں -

اسی طرح کَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ کہہ کر اللہ تعالےٰ نے اِس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ شیطان کے گمراہ کرنے سے انسان معذور نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ اُس کے لئے حقیقت معلوم کرنے کا راستہ خدا تعالےٰ نے کھلا رکھا ہے جیسے ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۙ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ (سورۂ بلد آیت ۹ تا ۱۱) یعنی کیا ہم نے اُسکی دو آنکھیں نہیں پیدا کیں اور کیا ہم نے اُسے زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور کیا ہم نے اُسے ہدایت اور گمراہی کے دونوں راستے نہیں بتا دیئے؟ یعنی جبکہ ہم نے اپنے انبیاء کے ذریعے اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور گمراہی کیا ہے تو اُس کے بعد بھی اگر وہ گمراہی کی طرف جاتا ہے تو اُس کا اپنا قصور ہے ورنہ خدا تعالےٰ نے اُسکو اندرونی اور بیرونی دونوں آنکھیں دی ہوئی ہیں اور اگر آنکھوں سے کوئی چیز نظر نہ آئے تو وہ زبان اور ہونٹوں کو استعمال کر کے علماء سے اپنے شبہات کو دُور کرا سکتا ہے لیکن اگر ان تمام ذرائع کی موجودگی میں بھی کوئی شخص ہدایت کا راستہ اختیار نہیں کرتا تو وہ اپنی تباہی کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے۔

۲۷ تفسیر: - قارون اور فرعون اور ہامان عاد کے بہت بعد ہوئے ہیں - مگر چونکہ ثمود فرعونِ موسیٰ کے زمانہ میں مدین کے علاقہ میں بس گئے تھے اور ثمود عاد کی ہی ایک شاخ تھے اِس لئے عاد اور ثمود کے ذکر کے ساتھ ہامان اور فرعون کا بھی ذکر کر دیا - یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بھاگ کر مدین میں ہی آئے تھے - کیونکہ وہاں عرب آباد تھے - اسی طرح قارون کا بھی ذکر کر دیا جو موسیٰؑ کی قوم میں سے تھا - فرماتا ہے اِن سب کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام نشانات لیکر آئے لیکن انہوں نے زمین میں بڑے تکبر سے کام لیا -

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ

اُن لوگوں کا حال جنہوں نے اللہ (تعالےٰ) کو چھوڑ کر اور دوست بنالئے

كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَاِنَّ

مکڑی کا سا حال ہے - جس نے (اپنے لئے) ایک گھر تو بنایا لیکن

اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا

گھروں میں سے سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہی ہوتا ہے - کاش! کہ

وقف لازم

يَعْلَمُوْنَ ۝۴۲ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ

یہ لوگ جانتے - اللہ (تعالےٰ) ہر اس چیز کو جس کو یہ لوگ اس کے سوا

اور موسیٰؑ کا انکار کردیا۔ مگر جب ہمارا عذاب آیا تو ان کا تمام تکبر دھرے کا دھرا رہ گیا اور وہ ہمارے عذاب سے نہ بچ سکے - ان قوموں میں سے ہر ایک کو ہم نے اُس کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا۔ چنانچہ بعض پر تو ہم نے پتھروں کا مینہہ برسایا جیسے قوم لوطؑ کے متعلق فرماتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ (قمر آیت ۳۵) یعنی ہم نے اُن کے تباہ کرنے کے لئے کنکروں سے بھری ہوئی ہوا چلائی جس نے آلِ لوطؑ کے سوا سب کو تباہ کردیا۔ اسی طرح سورۂ ہود میں فرماتا ہے - وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (آیت ۸۳) ہم نے اُن پر سوکھی مٹی کے بنے ہوئے پتھروں کی یکے بعد دیگرے بارش برسائی - یعنی شدید زلزلہ سے اُن کی زمین باقی زمین سے کٹ کر اوپر اٹھ گئی اور پھر گر گئی اور وہ سب کے سب اُس کے نیچے دفن ہوگئے -

پھر فرماتا ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ کوئی قوم ایسی تھی جو زلزلہ سے ہلاک ہوئی۔ جیسے قوم ثمود کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ۝ (سورۃ القمر آیت ۳۲) یعنی ہم نے اُن پر ایک ہی دفعہ عذاب نازل کیا اور وہ ایک باڑ بنانے والے کے درختوں سے گرائے ہوئے پتوں کے چورے یا روندے ہوئے بھُس کی طرح ہوگئے - اسی طرح سورۂ ہود میں فرماتا ہے - وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ (آیت ۶۸) یعنی جنہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا تھا انہیں صیحہ نے پکڑ لیا اور وہ اپنے گھروں میں زمین سے چمٹے ہوئے رہ گئے - یعنی زلزلے کی وجہ سے اُن کے مکانوں کی چھتیں اُن کے اوپر آگریں اور وہ اُسی حالت میں مرگئے -

پھر فرماتا ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ بعض ایسے تھے کہ اُن کو ہم نے سب میں ذلیل کردیا جیسے قارون کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ (سورۃ قصص آیت ۸۲) ہم نے اُسے اور اُس کے قبیلہ کو مکروہات میں مبتلا کردیا اور وہ ذلیل ہوکر رہ گئے -

مِنْ شَيْءٍ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۳﴾ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ

پکارتے ہیں جانتا ہے - اور وہ غالب (اور) حکمت والا ہے - اور یہ مثالیں ہیں -

نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں - لیکن عالموں کے سوا کوئی ان کو اپنے پلے نہیں باندھتا ۲۸ھ

وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا - اور بعض ایسے تھے جنکو اللہ تعالیٰ نے پانی میں غرق کر دیا - جیسے نوحؑ کی قوم بھی پانی میں غرق کی گئی اور فرعون بھی سمندر میں غرق ہوا - وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ میں بتایا کہ ان میں سے کوئی قوم بھی ظلماً ہلاک نہیں ہوئی بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ ان سب قوموں نے اپنی تباہی کے خود سامان پیدا کئے تھے خدا تعالیٰ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا تھا -

۲۸ھ تفسیر - گذشتہ قوموں کی ہلاکت اور بربادی کا ذکر کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ ان کی ہلاکت کے اسباب کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ ان کی تباہی اس لئے ہوئی کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے لئے بعض اور پناہ گاہیں تجویز کر لی تھیں - کسی نے کہا ہامان بڑا معزز ہے لاکھوں افراد پر اس کی حکومت ہے اگر ہم نے ہامان کو خوش کر لیا تو سمجھو کہ ہم کامیاب ہو گئے - کسی نے کہا ہمیں قارون سے اپنے تعلقات بڑھانے چاہئیں - مال و دولت تو اُس کے قبضہ میں ہے - اگر ہم نے اُسے خوش نہ کیا تو ہم تو بھوکے مر جائیں گے - ایک اور شخص کے دل میں خیال آیا کہ قارون اور ہامان بھی بیشک بڑے ہیں لیکن اصل طاقت تو فرعون کی ہے کیوں نہ فرعون کی غلامی اختیار کی جائے اور اُس کے اشاروں پر چلنے کی کوشش کی جائے - اگر فرعون خوش ہوا تو ہامان اور قارون کی بھی مجال نہیں کہ وہ ہمیں کوئی دکھ پہنچا سکیں - یہی حال عاد اور ثمود کے وقت ہوا - ہودؑ اور صالحؑ کو لوگ دیکھتے تو سمجھتے کہ ان لوگوں کے پاس تو نہ کوئی طاقت ہے نہ جتھہ نہ مال ہے نہ دولت - ہم نے ان کی بات مان لی اور ایک خدا پر ایمان لے آئے تو ہمیں کونسا سُرخاب کا پر لگ جائیگا - ہمیں تو عاد کے بادشاہوں کے ساتھ اپنے تعلقات رکھنے چاہئیں تاکہ ہم اپنی دنیوی زندگی کو بہتر بنا سکیں - اور آنے والی آفات سے محفوظ رہ سکیں - قوم ثمود نے بھی یہی نظریہ اختیار کیا اور اپنی قوم کے صنادید کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا - غرض ہر ایک نے خدا کو چھوڑ کر بعض خیالی پناہ گاہیں تجویز کر لیں مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ اُن کی یہ پناہ گاہیں مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہیں اور وقت آنے پر اُن کا تمام تار و پود بکھر جائے گا - اور نہ فرعون اُن کے کام آئیگا اور نہ ہامان اور قارون اُنہیں خدائی عذاب سے بچا سکیں گے - چنانچہ جب فرعون اپنے لشکر سمیت غرق ہوا تو اُسوقت اُن کا مجازی خدا کہاں گیا اور اُس نے کیوں اپنے لشکر کو غرق ہونے سے نہ بچا لیا؟ بلکہ اُس نے کسی اور کو کیا بچانا تھا خود بھی سمندر میں غرق ہو گیا - اور اُسے اپنی پناہ سمجھنے والے بھی غرق ہو گئے اور دُنیا پر ثابت ہو گیا کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنی پناہ گاہ سمجھتے ہیں وہ ویسے ہی تباہی کے قریب جا رہے ہوتے ہیں جس طرح مکڑی اپنے جالے میں بیٹھ کر یہ سمجھتی ہے کہ وہ حوادثِ زمانہ سے محفوظ رہے گی - قرآن کریم نے بار بار مسلمانوں کو اس اہم نکتہ

کی طرف توجہ دلائی ہے اور بار بار کہا ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰہَ۔ اے مسلمانو! تم خدا کو اپنی ڈھال بناؤ۔ یعنی اُسے اپنے بچاؤ کا ذریعہ سمجھو۔ بیشک تم اسباب سے بھی کام لو۔ کیونکہ اسباب سے کام لینا خود خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ سامانوں سے کام لینا ہے مگر کبھی یہ خیال نہ کرو کہ وہ اسباب اور ذرائع ہی حقیقی چیز ہیں۔ اصل مدد خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور اگر اُس کی مدد شامل حال نہ ہو تو کوئی سامان فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ آخر سوچو کہ کیا عاد اور ثمود کے پاس کم سامان تھے۔ کیا قارون اور فرعون اور ہامان کم طاقتیں رکھتے تھے۔ پھر کیا اُن کی یہ طاقتیں انہیں خدائی عذاب سے بچا سکیں۔ پس اسباب پر انحصار رکھنا اور انہی کو اپنی نجات کا موجب سمجھنا بڑی نادانی ہے مومن کا اصل مقام وہی ہے جو اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی عبادت بھی سچّے دل سے خدا تعالیٰ کی ہی کی جائے اور مدد بھی اُسی سے حاصل کی جائے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی احتیاج عبادت بھی ہے لیکن بندوں کی احتیاج ذلّت ہے۔ اگر کوئی شخص کامیابی کے اس ایک ہی دروازہ کو اپنے اوپر بند کر لیتا ہے تو اُس کی ہلاکت اس کے سَر پر منڈلانا شروع کر دیتی ہے۔ اور آخر اسے انتہائی حسرت کے ساتھ ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔

پھر بیت العنکبوت کی مثال دے کر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ جس طرح گھر کہہ دینے سے عنکبوت کا گھر گھر کا کام نہیں دے سکتا۔ اسی طرح محض مذہب کا لبادہ اوڑھ لینے اور اُس کے نام کا لیبل اپنے اوپر چپکا لینے سے وہ مذہب انسان کی نجات کا موجب نہیں بن سکتا۔ نجات کا موجب وہ صرف اُسی صورت میں بن سکتا ہے جب انسان کے اندر وہ رُوح بھی پیدا ہو جائے جو مذہب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہ رُوح پیدا نہیں ہوتی تو اُس کا محض ایک نام اختیار کر کے تسلّی پا جانا اور عملی رنگ میں اللہ تعالیٰ کی بجائے غیر اللہ کی طرف جھکے رہنا ایسی ہی کم عقلی کی بات ہے۔ جیسے عنکبوت کا اپنے گھر کو گھر سمجھ لینا۔

حقیقت یہ ہے کہ گو اِس دنیا میں ہزاروں مذاہب پائے جاتے ہیں اور ہر مذہب کا پیرو دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے شدید اختلاف رکھتا ہے لیکن سینکڑوں اختلافات کے باوجود دُنیا کے تمام مذاہب کے پیرو اس امر پر متفق ہیں کہ مذہب کی حقیقی غرض اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا ہے۔ اور جب مذہب کی اصل غرض یہی ہے تو ایک دیانت دار انسان کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت اپنے اعمال کا جائزہ لیتا رہے اور یہ دیکھتا رہے کہ اُس نے کہاں تک اُن پھلوں کو حاصل کیا ہے جو سچّے مذہب پر چلنے کے نتیجہ میں حاصل ہُوا کرتے ہیں۔

حضرت مسیح ناصری علیہ السلام نے اِسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ مگر اس کا یہ مفہوم نہیں کہ اگر درخت کو پھل نہ لگا ہو تو درخت پہچانا نہیں جا سکتا۔ معمولی زمیندار بھی چاہے وہ باغبان نہ ہو درختوں کو بغیر پھل کے پہچان لیتے ہیں۔ کیونکہ درختوں کی شاخیں اور پتّے الگ الگ قسم کے ہوتے ہیں۔ آم کا پتّہ الگ قسم کا ہوتا ہے۔ انار کا پتہ الگ قسم کا ہوتا ہے۔ شہتوت کا پتہ الگ قسم کا ہوتا ہے لیچی کا پتّہ الگ قسم کا ہوتا ہے۔ مالٹے کا پتہ الگ قسم کا ہوتا ہے۔ سیب کا پتّہ الگ قسم کا ہوتا ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ ایک پنجاب کا رہنے والا آدمی افغانستان یا کشمیر کے درختوں کو نہ پہچان سکے لیکن عام درخت جو اس کے علاقہ میں پائے جاتے ہیں اُنکو وہ پہچان لیتا ہے خواہ اُن درختوں کو پھل نہ لگا ہُوا ہو پس حضرت مسیح ناصریؑ کے اِس قول کے یہ معنے نہیں کہ جب تک درخت پر پھل نہ لگے وہ پہچانا نہیں جاتا بلکہ

اِس کے معنے یہ ہیں کہ درخت کی اصل قیمت اُس وقت معلوم ہوتی ہے جب اُسے پھل لگا ہُوا ہو۔ چنانچہ دیکھ لو ہر آم کے درخت کو آم سمجھتے ہیں لیکن بعض آم اِس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ کھانے کے کام نہیں آتے بلکہ لوگ اُن کا اچار ڈال لیتے ہیں۔ اور بعض ایسے رَدّی ہوتے ہیں کہ اچار کے کام بھی نہیں آتے۔ اور بعض آم ایسے ہوتے ہیں جو سو دو دو سو روپے سینکڑہ بکتے ہیں۔ اب نام تو سب کا آم ہی ہوتا ہے لیکن بعض درختوں کا پھل بہت مہنگا بکتا ہے اور باغبان اُن کی خاص طور پر حفاظت کرتا ہے اور بعض درختوں کے ردّی پھل کو دیکھ کر باغبان کاٹ ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ اِن کی جگہ میں کوئی اور پودہ لگاؤں گا۔

اِسی طرح مذہب بھی اپنے ساتھ بعض پھل رکھتا ہے۔ اگر وہ پھل کسی شخص میں پائے جائیں تو اُس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سچے مذہب کا پیرو ہے۔ لیکن اگر وہ پھل نہ پائے جائیں تو محض زبان سے کسی مذہب کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنا اُسے نجات نہیں دے سکتا۔ خود حضرت مسیح ناصریؑ کا ایک حواری ایسا تھا جس نے تیس درہم یعنی ساڑھے سات روپے میں حضرت مسیح علیہ السلام کو بیچ دیا۔ بیچنے کا لفظ اِس لئے بولا جاتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو پولیس تلاش کرتی رہتی تھی لیکن آپ اُن کے ہاتھ نہیں آتے تھے۔ آپ کو پولیس کی آمد کا علم ہو جاتا تھا اور آپ وہاں سے روپوش ہو جاتے تھے۔ ایک شخص جو کہ کئی سال تک دھڑلے سے اپنی تبلیغ دنیا کو پہنچاتا رہا اور لوگوں کے سامنے تقریریں کرتا رہا اُس کے متعلق ہم یہ تو نہیں سمجھ سکتے کہ پولیس اُسے پہچان نہ سکتی تھی۔ پولیس آپ کو پہچانتی تو تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے مسیح علیہ السلام ایسے طور پر رہتے تھے کہ لوگوں کو آپ کا علم نہ ہوتا۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ سے ہجرت کرتے ہوئے اپنے ارد گرد ایسے طور پر چادر لپیٹ لی کہ کوئی آپ کو پہچان نہ سکے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ یہ آپ کے ساتھ کون ہے تو آپؓ نے فرمایا۔ یہ میرا ہادی ہے۔ ھَادِیْ کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ یہ میرا آقا ہے اور یہ بھی کہ یہ مجھے راستہ دکھانے والا ہے۔ اُس شخص نے سمجھا کہ یہ شخص راستہ دکھانے والا ہے۔ اور وہ خاموشی سے چلا گیا۔ یہ سچ کا سچ تھا اور بات کا پتہ بھی نہ لگ سکا۔ اِسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام لباس وغیرہ تبدیل کر لیتے تھے اور جگہ بدل لیتے تھے اور پہچانے نہ جاتے تھے۔ آخر پولیس نے یہ تجویز کی کہ مسیحؑ کے حواریوں میں سے کسی کو اپنے ساتھ ملایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے یہودا اسکریوطی کو تیس درہم دے کر اپنے ساتھ ملایا۔ اُس نے کہا کہ مجلس میں میں جس کے ہاتھ پر بوسہ دوں وہی مسیح ہوگا۔ چنانچہ وہ مجلس میں آیا اور اُس نے آتے ہی اے استاد کہہ کر حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ کو چوم لیا۔ اِس پر پولیس نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ اب وہ شخص بھی بظاہر مومن کہلاتا تھا اور حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں میں اپنے آپ کو شامل کرتا تھا۔ مگر اپنی بدبختی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا موجب بن گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو پکڑوانے سے پہلے وہ آپ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ آپ نے الہام کے ذریعہ خبر پاکر بتایا کہ جو شخص میرے پکڑوانے کا موجب ہوگا اُس کا اور میرا ہاتھ اِس وقت پیالے میں اکٹھا پڑ رہا ہے۔ اُس وقت یہودا اسکریوطی آپ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا وہ سمجھ گیا کہ یہ میرے متعلق ہے اور اُس نے کہا کہ اے اُستاد! یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ مسیح علیہ السلام نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہے جو پوری ہو کر رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ اور اُس

شخص نے ساڑھے سات روپے لیکر حضرت مسیح علیہ السلام کو بیچ دیا۔ ذلیل سے ذلیل چوروں کے سامنے بھی گورنمنٹ بعض دفعہ پانچ پانچ دس دس ہزار روپے پیش کرتی ہے کہ اپنے ساتھیوں کو پکڑوا دو۔ لیکن وہ نہیں پکڑواتے مگر اُس نے ساڑھے سات روپے لے کر اپنے راہبر کو پکڑوا دیا۔ تو درحقیقت صرف مذہب کا لبادہ اوڑھ لینا اور مذہب کے نام پر خوش ہو جانا انسان کے کسی کام نہیں آسکتا۔ جس طرح عنکبوت کا گھر بظاہر گھر ہی کہلاتا ہے لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں گھر کی خصوصیات بھی موجود ہیں اسی طرح صرف سچے مذہب میں شامل ہونا انسان کی نجات کا باعث نہیں بن سکتا نجات کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انسان غیر اللہ سے کامل انقطاع کرکے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے اور اُسی سے اپنا تعلق قائم رکھے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ بیت العنکبوت میں اپنا سر چھپاتا ہے۔

درحقیقت اگر سوچا جائے تو مذہب جس پر دنیا کا اکثر حصّہ فریفتہ ہے وہ اپنے اندر ایک ہی خصوصیت رکھتا ہے۔ اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اور بندہ کے درمیان تعلق پیدا کیا جائے۔ دُنیا میں کئی قسم کی نیکیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اگر مذہب نہ بھی ہو تو بھی لوگ وہ کام کرتے ہیں اور دوسروں سے کرواتے ہیں۔ مثلاً ماں باپ سے محبت کرنا۔ ایک دہریہ بھی اپنے ماں باپ سے محبت کرتا ہے۔ ایک فلسفی بھی اپنے ماں باپ سے محبت رکھتا ہے۔ ایک حریص اور لالچی انسان جو دوسروں کا مال لوٹ کر اپنا گھر بھرنا چاہتا ہے وہ بھی جب ماں باپ کے سامنے آتا ہے تو اُس کی آنکھوں میں محبت کی جھلک آجاتی ہے۔ ایک ڈاکو اور قاتل انسان بھی ماں باپ سے محبت کرتا ہے اور بسا اوقات وہ قاتل اور ڈاکو بنتا ہی اِس لئے ہے کہ کسی نے اُس کے ماں باپ، بہن بھائی یا کسی اَور رشتہ دار پر ظلم کیا ہوتا ہے اور وہ اس کا بدلہ لینے کے لئے ڈاکو بن جاتا ہے۔ اور مذہب بھی یہی کہتا ہے کہ ماں باپ سے محبت کا سلوک کرو اور اُن کا احترام کرو۔ پھر مذہب کہتا ہے بیوی سے محبت کرو۔ اور اس کا احترام کرو۔ مذہب کہتا ہے عورت اپنے خاوند سے محبت کرے اور اُس کا احترام کرے لیکن اگر مذہب نہ بھی ہو تو بھی لوگ اپنی بیویوں سے محبت کرینگے۔ اگر مذہب نہ بھی ہو تو بھی عورتیں اپنے خاوندوں سے محبت کرینگی اور اُن کا احترام کرینگی۔ پھر مذہب کہتا ہے جھوٹ نہ بولو۔ اب اِس کے لئے کسی مذہب کی ضرورت نہیں۔ جن قوموں میں کوئی مذہب نہیں پایا جاتا مثلاً پُرانے حبشی قبائل ہیں جو خدا اور اس کے رسول اور کتاب پر ایمان نہیں رکھتے انہیں دیکھ لو وہ بھی شریف انسان کی یہی تعریف کرینگے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ حالانکہ وہ کسی مذہب کے متبع نہیں۔ اُن کا رسول اور کتاب پر ایمان نہیں ہوتا۔ لیکن شرافت کے ساتھ سچ کا تعلق وہ بھی مانتے ہیں۔ پھر چوری کے ساتھ بھی مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ مذہب بے شک یہ کہتا ہے کہ چوری نہ کرو۔ لیکن جہاں مذہب نہیں وہاں بھی شرافت یہ کہتی ہے کہ چوری کرنا بُرا ہے۔ پھر لڑائی جھگڑا دنگا فساد۔ غیبت اور دوسرے سے بُغض اور کینہ رکھنا ہے۔ مذہب اُن سے منع کرتا ہے۔ لیکن اگر مذہب نہ بھی ہو تو بھی ایک شریف انسان اِن بُرائیوں سے اجتناب کرے گا۔ پس یہ تمام چیزیں ایسی ہیں کہ جہاں مذہب نہیں وہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور جہاں مذہب ہے وہاں بھی یہ سب موجود ہیں۔ اگر کوئی چیز ایسی ہے کہ جہاں مذہب ہے وہاں تو وہ موجود ہے لیکن جہاں مذہب نہیں وہاں وہ موجود نہیں۔ تو وہ خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا خیال ہے۔ اگر مذہب نہیں تو انسان خدا تعالیٰ سے تعلق

پیدا کرنے کا خیال نہیں رکھتا۔ وہ کہیگا مجھے خدا تعالیٰ سے
تعلق پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے یا وہ سرے سے خدا تعالیٰ
کا ہی انکار کر دے گا۔ لیکن ایک مذہب کا پابند انسان
خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا محتاج ہوتا ہے۔ ہر مذہب
کا ماننے والا کہیگا کہ مجھے خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے
کی ضرورت ہے۔ لیکن اس امتیازی شان کو کس حد تک
اختیار کیا جاتا ہے۔ کہنے کو تو ہر مذہب والا یہی کہتا
ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے
لیکن کتنے لوگ ہیں جن میں تعلق باللہ پیدا کرنے کا احساس
اس شدت سے پایا جاتا ہے جس شدت سے وہ پایا جانا
چاہیئے۔ سَو میں سے ننانوے ۹۹ نہیں۔ ہزار میں سے
نو سو ننانوے نہیں بلکہ ایک لاکھ میں سے ننانوے ہزار
نو سو ننانوے اور شائد اس سے بھی کم وہ لوگ نکلیں گے
جن میں مذہب کا خیال تو ہے لیکن خدا تعالیٰ کی محبت
نہیں اور صرف یہی نہیں کہ انہیں خدا تعالیٰ سے محبت
نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے محبت پیدا کرنے کا خیال بھی اُن
میں نہیں پایا جاتا۔ ایسی صورت میں کون خیال کر سکتا
ہے کہ انہوں نے سچے دل سے کسی مذہب کو اختیار کیا
ہُوا ہے۔ تم اگر عرق گاؤ زبان کی بوتل پر رُوح کیوڑہ
لکھ دو تو کیا وہ رُوح کیوڑہ بن جائیگا؟ پانی پر اگر
رُوح گلاب لکھ لیا جائے تو اس سے کیا بنتا ہے جب
اندر رُوح گلاب نہ ہو۔ یہ تو دھوکا ہوگا۔ دھوکہ باز
عطّار اسی طرح کرتے ہیں۔ علاقہ میں وباء شروع ہوتی
ہے مثلاً ملیریا شروع ہوتا ہے اور حکیم لکھنا شروع
کر دیتے ہیں کہ مریض کو عرق مکو اور عرق گاؤ زبان پلاؤ
تو ایک دیانت دار عطّار بعض دفعہ کہہ دیگا کہ میرے
پاس عرق مکو اور عرق گاؤ زبان تیار نہیں۔ لیکن بددیانت
عطّار کہیگا۔ میرے پاس دونوں چیزیں موجود ہیں۔ وہ
پانی لیگا بوتل میں بھرے گا اور کہیگا۔ یہ عرق مکو ہے
یہ عرق کاسنی ہے۔ یہ عرق گلاب ہے۔ تم جو عرق
بھی مانگو گے وہ اُس کے پاس موجود ہوگا۔ اسی طرح
تم کوئی نام رکھ لو۔ تم مٹی کا نام سونا رکھ لو تو مٹی
سونا نہیں بنے گی۔ تم دنیاداری کا نام مذہب رکھ لیتے
ہو تو تمہیں مذہب کوئی فائدہ نہیں دیگا۔ مذہب اُسوقت تک کوئی
فائدہ نہیں دیتا جب تک کہ تعلق باللہ پیدا نہ ہو۔ اور اگر تعلق باللہ
کے بغیر کوئی شخص کسی مذہب کو اختیار کر کے یہ سمجھتا ہے کہ وہ
محفوظ ہوگیا ہے تو وہ ایسا ہی نادان ہے جیسے مکڑی
کے گھر کو گھر سمجھنے والا۔

پھر فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ۔ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن ہستیوں
پر یہ لوگ انحصار رکھتے ہیں۔ اُن کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ
خوب جانتا ہے یہ لوگ تو فانی اور کمزور انسانوں کو
اپنی پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ پتھر کے بے جان
بتوں کے آگے اپنے سر جھکا دیتے ہیں اور بعض دفعہ
مُردوں کی قبروں پر کھڑے ہو کر اُن سے دُعائیں کرتے
اور انہیں اپنی مدد کے لئے پکارتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ
جانتا ہے کہ ان ہستیوں کی کیا حقیقت ہے۔ بڑے سے
بڑا زبردست بادشاہ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک
مچھر کے پر جتنی حقیقت بھی نہیں رکھتا۔ چلتے چلتے
اگر کسی کا ہارٹ فیل ہوجائے تو خواہ دنیا کا بڑے
سے بڑا بادشاہ بھی اُس کا دوست ہو وہ دنیا کی ساری
دولت خرچ کرنے کے باوجود اُسے زندہ نہیں کر سکتا۔
کسی پر بجلی آگرے یا وہ دریا میں غرق ہو جائے یا آگ
میں جل جائے یا ہوائی جہاز کے حادثہ میں ہلاک ہوجائے
یا ریل اور موٹر کی ٹکر کے نتیجہ میں مر جائے تو کون ہے
جو اُسے بچا سکے۔ دنیا کے ڈاکٹر امراض کے علاج میں
بڑی بھاری مہارت رکھتے ہیں مگر جب خدا تعالیٰ کی
طرف سے موت کا پیغام آجاتا ہے تو بڑے بڑے ڈاکٹر

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ
اللہ (تعالےٰ) نے آسمانوں اور زمین کو خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔

فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۵﴾ ع
اِس میں مومنوں کے لئے ایک بڑا نشان ہے۔ ۲۹ے

۴
ع
۱۶

مُنہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اور انسانی رُوح نفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے۔ پھر ایسی بے حقیقت پناہ گاہوں پر انحصار رکھنا اور خدا تعالےٰ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف اپنی مدد کے لئے ہاتھ پھیلانا کتنی بڑی نادانی ہے۔

پھر وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ انسان کو کامیابی اُسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب وہ ایک غالب ہستی سے تعلق رکھے جیسے کسی نے کہا ہے ؎

"یارِ غالب شو کہ تا غالب شوی"

اور غالب ہستی سوائے خدا تعالیٰ کے اَور کوئی نہیں۔ مگر محض غلبہ کے نتیجہ میں چونکہ یہ ڈر بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگ نا انصافی کا شکار نہ ہو جائیں اس لئے خدا تعالےٰ صرف عزیز ہی نہیں بلکہ وہ حکیم بھی ہے یعنی اُسکے تمام کام اور تمام حکم حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اُن میں کسی ظلم یا حق تلفی کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ پس انسان کی سلامتی کی یہی راہ ہے کہ وہ عنکبوت کی سی خیالی پناہ گاہوں کو چھوڑ کر عزیز اور حکیم خدا سے اپنا تعلق پیدا کرے۔

آخر میں وَمَا یَعْقِلُھَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ کہہ کر بتایا کہ ہم نے قارون اور فرعون اور ہامان وغیرہ کے واقعات تو بیان کر دیئے ہیں۔ مگر اُن سے فائدہ صرف وہی لوگ اُٹھائیں گے جو اپنے اندر خدا تعالیٰ کی خشیت کا مادہ رکھیں گے باقی لوگ فرعون اور ہامان وغیرہ کے نقشِ قدم پر انبیاء کا انکار کرتے چلے جائیں گے۔

اس جگہ عالِم سے دنیوی علوم کے ماہر مراد نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن کے دلوں میں خدا تعالےٰ کی خشیت پائی جاتی ہے۔ اور جن کے متعلق قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ صراحت فرما دی ہے کہ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (سورۂ فاطر آیت ۲۹) یعنی اللہ تعالےٰ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی صفات کو سمجھتے ہیں۔

۲۹ے تفسیر:- اب اللہ تعالیٰ اپنے عزیز اور حکیم ہونے کے ثبوت میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کو پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر بڑی بڑی طاقتور قوموں اور حکومتوں کی تباہی دیکھ کر بھی تمہیں خدا تعالیٰ کے عزیز اور حکیم ہونے کا ثبوت نظر نہیں آتا تو تم آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر غور کرو۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ اللہ تعالےٰ نے آسمانوں اور زمین کو ایک نہایت پختہ اور اٹل قانون کے ماتحت بنایا ہے۔ یعنی ان میں ایسے قوانین جاری کئے ہیں جن کو کوئی شخص بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایک دہریہ اپنی زبان سے خدا تعالےٰ کا انکار تو کر سکتا ہے لیکن وہ خدائے عزیز کے قانون کو بدل کر کانوں سے بولنے اور زبان سے سُننے کا کام نہیں لے سکتا۔ اسی طرح اگر وہ چاہے کہ آگ انسانی جسم کو نہ جلائے یا ٹھنڈا پانی اس کے جسم کو ٹھنڈا نہ کرے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ یا اگر وہ سورج اور چاند اور ستاروں کے افعال میں کوئی تغیر پیدا کرنا چاہے۔ تو

نہیں کرسکتا۔ وہ اگر تیز مرچ استعمال کرے گا تو خدائے عزیز کا قانون اُسے پیچش کی صورت میں اُس کے اِس جُرم کی ضرور سزا دے گا اور اگر وہ اُسے دُور کرنا چاہے گا تو پھر بھی اُسے خدا تعالیٰ کے ایک دوسرے قانون کی طرف جانا پڑے گا یعنی ایسی اشیاء استعمال کرنی پڑیں گی جو اُن مرچوں کے اثر کو باطل کردیں بہرحال خدا تعالیٰ کا قانون اُس پر غالب ہے اور پھر آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے خدا تعالیٰ کا حکیم ہونا بھی ظاہر ہے کیونکہ دنیا کے تمام علوم کی بنیادیں اشیاء کے غیر متبدل خواص اور قدرت کے اٹل قوانین پر ہیں۔ اگر آگ کبھی جلاتی اور کبھی نہ جلاتی یا پانی کبھی پیاس بجھاتا اور کبھی آگ لگا دیتا تو سائنس کبھی ترقی نہ کرسکتی۔ پس جہاں انبیاء کے مخالفین کی تباہی خدا تعالیٰ کے غالب اور حکیم ہونے کا ثبوت ہے۔ وہاں زمین و آسمان کا اٹل قوانین پر مبنی ہونا بھی بتا رہا ہے کہ خدا تعالیٰ ہی سب پر غالب ہے۔

پھر زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اتنے بڑے کارخانہ پر غور کرکے تم سمجھ سکتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیفائدہ پیدا نہیں کیا۔ اگر یہ تمام نظام صرف اسلئے ہوتا کہ انسان اِس پر چند دن زندگی گذارے اور پھر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے تو یقیناً یہ تمام کام عبث ٹھہرتا۔ پس آسمان اور زمین کی پیدائش خود اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان ایک بہت بڑے مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور موت صرف جسم اور رُوح کے جُدا ہو جانے کا نام ہے ورنہ زندگی غیر محدود ہے۔ اور ہر انسان اپنے اعمال کے مطابق آئندہ ترقی یا تنزل کے راستہ پر چلنے والا ہے۔ اِسی طرح زمین و آسمان کی پیدائش کا ذکر کرکے دشمنانِ انبیاء کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح زمین آسمانوں کے بغیر اپنی طاقت اور قابلیت کا اظہار نہیں کرسکتی اِسی طرح جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں آسمانی ہدایت کی ضرورت نہیں صرف اپنی عقل اور دماغ سے کام لیکر وہ ترقی کرسکتے ہیں وہ بھی اپنی تباہی کا اپنے ہاتھوں سامان کرتے ہیں کیونکہ زمین اُسی صورت میں کام کے قابل ہوسکتی ہے جب اُس پر آسمان ہو۔ اِسی طرح کوئی عقل انسانی راہنمائی کے لئے کافی نہیں جب تک آسمان سے الہام کا پانی نازل نہ ہو۔ اگر وہ آسمانِ روحانی سے قطع تعلق کرلیں گے تو ایک مردہ زمین کی طرح ہر قسم کے منافع سے محروم ہو جائیں گے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ کہہ کر بتایا کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں بڑا بھاری نشان تو ہے مگر اس سے فائدہ صرف مومن اٹھاتے ہیں دوسرے لوگ اتنا بڑا نشان دیکھنے کے باوجود کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے حالانکہ انسان اگر سوچے تو ہماری یہ زمین عالم شمسی کے مقابلہ میں بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے باغ میں کوئی مالٹا رکھا ہوا ہو۔ مثلاً شالامار باغ میں کوئی مالٹا یا بیر پڑا ہو تو اس بیر یا مالٹے کی جو حیثیت شالامار کے مقابلہ میں ہے اِس زمین کی عالم شمسی کے سامنے اتنی حیثیت بھی نہیں۔ پھر عالم شمسی یعنی سورج کے ساتھ جو سیارے وغیرہ ہیں اُن کی حیثیت قطب ستارے کے نظام کے مقابلہ میں اتنی بھی نہیں جتنی ایک بیر کی حیثیت باغ کے مقابلہ میں۔ یا ایک مکھی کی حیثیت شہر کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ پھر قطب ستارے کے ساتھ جو دنیا ہے اس کی حیثیت معلومہ دنیا کے مقابلہ میں اتنی بھی نہیں جتنی ایک مکھی کی شہر کے مقابلہ میں۔ اگر انسان اس کا اندازہ لگانا شروع کردے کہ عالم خلق کے مقابلہ میں مکھی کی کیا

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ

اس کتاب (یعنی قرآن) میں سے جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اُسے پڑھ اور لوگوں کو پڑھکر سُنا) اور نماز کو (اسکی سب

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ

شرائط کے ساتھ) ادا کر۔ یقیناً نماز سب بُری اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) کی

اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

یاد یقیناً (اور سب کاموں سے) بڑی ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ) تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔ ۵۳۰

حیثیت ہے، اور پھر سوچے کہ عالم خلق کے مقابلہ میں انسان جو ایک خوردبینی ذرّے کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ وہ اس کے مقابلہ میں ایک خوردبینی ذرّے کے اربویں حصہ کو کیا اُسکے اربویں حصہ کے اربویں حصہ کی حیثیت رکھتا ہے اس انسان کو پیدا کرنے کا خیال خدا تعالیٰ کو کیوں آیا۔ تو یقیناً اُسے اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا خیال آ سکتا ہے اور وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کی حیثیت کتنی کمزور ہے اور اُس کا غرور کتنا احمقانہ ہے۔ وہ انسان جو کہتا ہے کہ مکّہ ماروں تو تمہارے دانت نکال دوں۔ فرشتوں کے نزدیک اس کی حیثیت ایک چیونٹی کے پنجے کی طرح ہے جس طرح چیونٹی (اگر اُسے زبان مل جائے) کہے کہ میں لات مار کر امریکہ کو اُڑا دوں تو تمہیں کتنی ہنسی آئیگی۔ اسی طرح جب انسان کہتا ہے کہ میں مُکّا مار کر تمہارے دانت نکال دوں گا تو فرشتوں کے نزدیک اس کی حیثیت چیونٹی کے پنجے کی سی بلکہ اُس سے بھی کم ہوتی ہے۔ گویا عالم مخلوق کے مقابلہ میں انسان کی کچھ بھی حیثیت نہیں۔ وہی بادشاہ جن کے اعلانوں سے دنیا میں کھلبلی مچ جاتی ہے اُن کے جسم میں ایک باریک خوردبینی کیڑا دق۔ سل یا ہیضہ کا چلا جاتا ہے تو وہ تڑپنے لگ جاتے ہیں اور ایک معمولی ڈاکٹر کے سامنے چلّاتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب خدا کیلئے میرا علاج کریں۔ مجھے سخت تکلیف ہے۔ یا تو وہ

اپنے سامنے کسی دوسرے کو سمجھتے ہی کچھ نہیں اور یا وہ دو چار سو روپیہ پانے والے ایک ڈاکٹر کے سامنے تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر جس کے دل میں اُنکی تندرستی کے دنوں میں اگر انہیں ملنے کی خواہش ہو تو وہ انہیں مل بھی نہ سکے وہ بیماری میں اُس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ پس انسان کو سوچنا چاہیئے کہ آخر اس کی پیدائش کی کیا غرض ہے۔ اُس کی پیدائش کی کوئی نہ کوئی غرض تو ہو گی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے کوئی چیز بے فائدہ اور عبث پیدا نہیں کی اور جب کوئی چیز بھی بے فائدہ نہیں تو ہر انسان کو اپنی پیدائش کے مقصد پر غور کرنا چاہیئے اور سوچنا چاہیئے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے کس لئے پیدا کیا ہے؟ اور اگر وہ اس بات پر غور نہیں کرتا تو وہ یقیناً اپنی زندگی کو ضائع کرتا ہے۔

۵۳۰ تفسیر:۔ فرماتا ہے چونکہ مومنوں کے لئے آسمان اور زمین کی پیدائش میں ایک بہت بڑا نشان ہے مگر کافر اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اس لئے اب یہی علاج باقی ہے کہ تو قرآن کریم لوگوں کو سنا۔ تاکہ اُس کی مدد سے لوگ حقیقت کو سمجھیں اور انہیں بھی اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کی طرف

وجہ پیدا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا تمام دارومدار قرآن کریم پر ہی ہے اور ان کے تنزل کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا ہے۔ نہ وہ خود قرآن کریم پر عمل کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو قرآن کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کی زندگی کا دارومدار ہی قرآن کریم پر ہے۔ یہ ایک روحانی غذا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے تیار کی ہے۔ لیکن جس طرح غذا کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ مثلاً آٹے سے کبھی پراٹھے تیار کئے جاتے ہیں کبھی پھلکے اور کبھی تنور کی روٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کی غذا بھی کئی شکلوں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ کہیں یہ غذا نماز کی شکل اختیار کر گئی ہے کہیں روزہ کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ کہیں حج کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ کہیں زکوٰۃ کی شکل اختیار کر گئی ہے گویا کہیں یہ پراٹھا بن گئی ہے کہیں ہنجیری بن گئی ہے۔ کہیں گلگلے بن گئی ہے۔ مگر ہے وہی چیز۔ لیکن ان چیزوں کا ضرف بن جانا کافی نہیں جب تک ہم انہیں چبائیں نہیں۔ انہیں نگلیں نہیں۔ جب تک یہ غذا معدہ اور انتڑیوں کے دور سے نہ نکلے اس سے فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا اسی لئے میں نے "ذہنی جگالی" کی ایک اصطلاح بنائی ہوئی ہے۔ یعنی بغیر ذہنی جگالی کے روحانی غذا ہضم نہیں ہوتی۔ ایک جانور معدہ سے چارہ نکالتا ہے اور پھر اُسے چباتا ہے۔ کیونکہ اُس کے معدہ میں اتنا سامان نہیں ہوتا کہ وہ چارہ کو ہضم کرے۔ اور چونکہ معدہ اُس غذا کو ہضم نہیں کرتا اس لئے وہ پہلے جلدی جلدی چارہ کھا لیتا ہے اور جب کھُرلی پر بیٹھتا ہے تو وہ جگالی کرتا ہے۔ چونکہ ایک جانور چوبیس گھنٹہ تک خوراک جنگل میں نہیں کھا سکتا۔ اس لئے وہ جلدی جلدی خوراک کھاتا جاتا ہے لیکن جب کھُرلی پر آتا ہے تو پہلے ایک لقمہ نکالتا ہے اور جگالی کرتا ہے اور اُسے خوب چباتا ہے

پھر ایک اور لقمہ نکالتا ہے اور اُسے چباتا ہے۔ پھر ایک اور لقمہ نکالتا ہے اور اُسے چباتا ہے۔ اسی طرح روحانی جگالی کی کیفیت ہوتی ہے۔ جو شخص قرآن کریم پڑھ لیتا ہے یا اس کی تلاوت کر لیتا ہے قرآن کریم اُسے ہضم نہیں ہوتا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ایک جانور گھاس کھا لیتا ہے یا انسان کوئی لقمہ منہ میں ڈال لیتا ہے۔ لیکن اگر تم لقمے نگلتے جاؤ اور انہیں چباؤ نہیں تو تمہاری انتڑیوں میں سوزش پیدا ہو جائیگی۔ دست آنے لگ جائیں گے یا قے آ جائیگی اور روٹی باہر نکل آئے گی۔ یہی حال روحانی غذا کا ہے۔ جو لوگ جگالی نہیں کرتے۔ وہ اس غذا سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یہودیوں کی مثال اس گدھے سے دی ہے جس کی پیٹھ پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ جو لوگ ذہنی جگالی نہیں کرتے وہ کتاب تو پڑھ لیتے ہیں لیکن اُس پر غور و فکر نہیں کرتے اور اس وجہ سے اُس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ قرآن کریم سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ اُسے ان مراتب میں سے گذارا جائے جس سے اُس کے مضامین ہضم ہو جائیں۔ جب تک اسے ان مراتب میں سے گذارا نہیں جائیگا وہ ہضم نہیں ہوگا۔ پس قرآن کریم پڑھنے کے بعد سوچنے کی عادت ڈالو۔ اور سوچنے کے بعد اس پر عمل کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم ایک زندہ اور فعّال قوم نظر آنے لگ جاؤ گے اور دنیا تمہیں دیکھ کر حیران رہ جائیگی۔ لوہے کو دیکھ لو۔ یورپ اس سے انجن بناتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں اس سے محض ہتھوڑے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ قینچیاں بنا لیتے ہیں۔ پُرانے زمانہ میں عورتیں سیر سیر سونا کانوں میں ڈال لیتی تھیں۔ اُن کے کان لٹک جاتے تھے۔ اُن میں بڑے بڑے سوراخ ہو جاتے تھے اور وہ سمجھتی تھیں ہم بڑی مالدار ہیں۔ لیکن اُسی سونے سے یورپ کے ممالک نے

بعض اشیاء تیار کیں ۔ اور اُن کے ذریعے دوسرے ممالک سے کئی گنا زیادہ مال لے آئے ۔ پس کسی چیز کا موجود ہونا کافی نہیں ۔ تم اس بات پر فخر نہ کرو کہ تمہارے پاس قرآن کریم موجود ہے ۔ اگر تمہارے پاس قرآن کریم موجود ہے تو سوال یہ ہے کہ تم نے اس سے کیا فائدہ اٹھایا ؟ اگر تم قرآن کریم پڑھ کر اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہو تو تم سے بڑھ کر خوش قسمت اور کوئی نہیں ۔ اور اگر تم اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے تو تم سے بڑھ کر بدقسمت بھی اور کوئی نہیں ۔ کیونکہ تمہاری جیبوں میں سونا بھرا ہے مگر تم اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے ۔

میرے پاس ایک دفعہ دیوبند کے دو طالب علم آئے ۔ انہوں نے کہیں سے یہ سُن لیا تھا کہ میں نے کسی مدرسہ میں تعلیم حاصل نہیں کی ۔ میرے پاس کچھ اور دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے ۔ وہ دونوں طالب علم بھی آکر بیٹھ گئے ۔ اور اُن میں سے ایک جو زیادہ تیز معلوم ہوتا تھا اُس نے کہا ۔ آپ کہاں تک پڑھے ہوئے ہیں ۔ میں سمجھ گیا کہ وہ گستاخ ہے ۔ میں نے کہا میں نے کچھ نہیں پڑھا ۔ اس نے کہا ۔ پھر بھی آپ کس مدرسے میں پڑھے ہیں ۔ میں نے کہا ۔ اگر میں پڑھا ہوتا تو میں پہلے ہی بتا دیتا ۔ وہ کہنے لگا ۔ کیا آپ ہندوستان یا پنجاب کے کسی سکول کے فارغ التحصیل نہیں ہیں ؟ میں نے کہا کہ میں نے ایک دفعہ واضح کر دیا ہے کہ جس چیز کو آپ پڑھائی خیال کرتے ہیں ۔ وہ میں نے کہیں سے بھی حاصل نہیں کی ۔ جس وقت میں نے یہ کہا تو اُس کے دوسرے ساتھی نے جو ذرا ہوشیار معلوم ہوتا تھا اُس کے گھٹنے کو چھو کر چُپ کرانے کی کوشش کی ۔ لیکن چونکہ وہ جوش میں تھا چُپ نہ ہوا ۔ اُس نے کہا ۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ بالکل اَن پڑھ ہیں ۔ میں نے کہا ۔ آپ کی گفتگو کی بنیاد اِس بات پر تھی کہ میں کس مدرسے میں پڑھا ہوا ہوں اور کس نصاب کو میں نے پاس کیا ہے ۔ سو میں نے کوئی سکول کا نصاب پاس نہیں کیا ۔ میں نے اُسی کتاب سے تعلیم حاصل کی ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ملی اور آپؐ نے اپنے متبعین کو دی اور وہ قرآن کریم ہے ۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ کیا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم (نعوذ باللہ) ہر قسم کے علوم سے ناواقف تھے یا عالم ؟ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ساری دنیا کو آپؐ نے عالم بنا دیا ۔ بے شک جو درجہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے وہ بہت بلند ہے ۔ مگر ہم دونوں ایک ہی کتاب پڑھنے والے ہیں ۔ چنانچہ میرے اس جواب پر وہ خاموش ہو گیا ۔

غرض لوگوں کے نزدیک جب تک کسی نے سُلّم شمس بازغہ ۔ شروح کافیہ ۔ شروح شافیہ اور ہدایہ وغیرہ کتب نہ پڑھی ہوں وہ عالم نہیں کہلا سکتا حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں نہ منطق تھی نہ فلسفہ صرف قرآن ہی قرآن تھا ۔ لیکن لوگ چاہتے ہیں کہ وہ خدا تعالےٰ سے ہٹ کر بندوں کی طرف مائل ہو جائیں ۔ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ میں فلاں کتاب پڑھا ہوا ہوں جو مصنفہ خدا تعالیٰ ہے تو یہ بات انہیں تسلّی نہیں دیتی ۔ انہیں یہ بات تسلّی دیتی ہے کہ کسی نے وہ کتاب جو مصنفہ میبذی ہے پڑھی ہو مصنفہ خدا تعالیٰ اُن کے نزدیک کوئی چیز نہیں ۔ حالانکہ تمام علوم کا سرچشمہ صرف قرآن کریم ہی ہے ۔

پھر اُتْلُ کہہ کر اللہ تعالےٰ نے صرف قرآن کریم کے پڑھنے اور اُس پر عمل کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دلائی بلکہ اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ تم قرآن کریم کی تعلیم دنیا کے تمام غیر مذاہب کے سامنے پیش کرو اور انہیں بھی اسلام میں شامل کرنے کی کوشش کرو ۔ گویا تبلیغ میں دوسری چیزوں پر زیادہ زور نہ دو ۔ بلکہ

قرآن کریم کے ذریعہ سے ہی تبلیغ کیا کرو ۔ یہ حکم بھی ایسا ہے جس کی طرف سے مسلمانوں نے اپنی توجہ کو کُلّیتہً ہٹا رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے :-
وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
یعنی تم میں سے ہمیشہ ایک ایسی امت ہونی چاہیئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بُلائے اور انہیں نیکی کا حکم دے اور بُرائی سے منع کرے ۔ اور امّت کے معنے ایک ایسی جماعت کے ہیں جو اپنے اندر نظم رکھتی ہو اور وہ کسی مرکزی نقطہ کے گرد چکر کھا رہی ہو ۔ پس اس آیت میں مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے یہ حکم دیا گیا تھا کہ ان میں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں جو مقصدِ تبلیغ کو لیکر کھڑے ہوں اور اُن کا عمر بھر یہی کام ہو کہ وہ ایک نظام کے ماتحت رہیں اور اسلام پھیلائیں ۔

اسلام کی گذشتہ تاریخ میں جہاں مسلمانوں سے بعض بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں وہاں ایک اہم غلطی اُن سے یہ بھی ہوئی کہ تبلیغ کو انفرادی فرض سمجھ لیا گیا ۔ بیشک مسلمانوں میں مبلّغ رہے بلکہ گذشتہ صدیاں تو الگ رہیں قریب کے زمانہ تک بھی مسلمانوں میں مبلّغ رہے ۔ لیکن اجتماعی رنگ میں تبلیغ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد ہی قریباً مفقود ہو گئی کیونکہ خلفاء اُن جنگوں میں جو عیسائیوں اور زرتشتیوں کے خلاف لڑی گئیں اسقدر اُلجھ گئے کہ اُس وقت جہاد اور تبلیغ دونوں کو ایک سمجھ لیا گیا اور خلفاء کے بعد مسلمانوں پر جمود طاری ہو گیا اور اسلام کی اشاعت بند ہو گئی ۔ وہ دنیوی شان و شوکت اور ترقیات کو ہی اپنا منتہائے مقصود سمجھ بیٹھے اور انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑ کر دوسرے علوم کو اختیار کر لیا اور تبلیغ کے جوش اور اسکے نتائج سے محروم رہ گئے ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائی غالب آ گئے جو تبلیغ میں لگے ہوئے تھے اور مسلمان کمزور ہو گئے جو جہاد کے خیال میں پڑے رہے ۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر بھی فرماتا ہے کہ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۔ یعنی اے مسلمانو : تم اِس قرآن کے ذریعہ دشمنوں سے جہاد کرو کہ یہی جہادِ کبیر ہے ۔ پس بڑا جہاد وہی ہے جو قرآن کریم کے ذریعہ سے کیا جائے اور تبلیغِ اسلام پر زور دیا جائے جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتابوں میں قرآن کریم کو پیش کر کے اسلام کی فضیلت اور اُسکی برتری ثابت کی ہے ۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان کو توجہ دلائی ہے کہ تم قرآن کریم ہاتھ میں لو اور دُنیا میں نکل جاؤ ۔ اور خود بھی قرآن پڑھو اور اُس پر عمل کرو اور دوسروں کو بھی قرآن سُناؤ اور اُن سے عمل کرواؤ اور پھر جو لوگ اسلام کی خوبیوں سے روشناس نہیں اُن کو بھی قرآن کریم کے ذریعہ اسلامی انوار اور برکات سے آگاہ کرو اور کوشش کرو کہ دنیا میں ہر جگہ قرآن کی حکومت ہو اسلام کی حکومت ہو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت ہو ۔

میں سمجھتا ہوں مسلمانوں کے لئے یہ بھی ایک بہت بڑا امتحان تھا کہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہُوا تاکہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھے کہ وہ اسے ہر جگہ پہنچاتے ہیں یا نہیں پہنچاتے لیکن بدقسمتی سے خود مسلمانوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کریم کا ترجمہ کرنا کفر ہے ۔ گویا دوسرے لفظوں میں انہوں نے یہ کہا کہ ہر جگہ قرآن کریم کا پہنچانا کفر ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل ہمیں سمجھ دی کہ قرآن کریم کا ترجمہ کرنا کفر نہیں بلکہ ضروری ہے ۔ اور اگر قرآن کریم کا ترجمہ نہیں کیا جائیگا تو لوگ کس طرح سمجھیں گے کہ خدا تعالیٰ نے اُن سے کیا کہا ہے ۔ دنیا میں اِسوقت تیرہ ۱۳۰۰ سَو زبانیں بولی جاتی ہیں ۔

اور تیرہ سو زبانوں میں ہی قرآن کریم کا ترجمہ ہونا ضروری ہے کیونکہ قرآن کریم تمام انسانوں کے لئے نازل ہوا ہے اور دنیا کا کوئی فرد ایسا نہیں جسے قرآن کریم مخاطب نہیں کرتا۔ پس دنیا کا کوئی فرد ایسا نہیں ہونا چاہیئے جس کی زبان میں ہم اس کا ترجمہ نہ کردیں۔ تاکہ کوئی فرد یہ نہ کہہ سکے کہ اے اللہ! تُو نے مجھے فلاں زبان بولنے والے لوگوں میں پیدا کیا تھا اور قرآن کریم تو عربی زبان میں ہے پھر میں قرآن کریم کس سے سیکھتا؟

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ قرآن کریم کے پڑھنے اور پڑھانے اور سُننے اور سُنانے اور قرآن کریم کے ذریعہ تمام دنیا کو ہدایت اور راستی کی راہوں کی طرف بلانے کی نصیحت کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ صرف قرآن کریم سُنانا بھی کافی نہیں۔ اس کے علاوہ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ تو خود اُن کے لئے نمونہ بنے اور اُن کے لئے دُعائیں کرتا رہے۔ پس تو نماز باجماعت کو دنیا میں قائم کر اور نماز میں تمام مومنوں اور غیر مومنوں کے لئے دُعائیں کیا کر کہ اللہ تعالیٰ اُن کی آنکھیں کھولے

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ نماز یقیناً بُری اور ناپسندیدہ باتوں سے لوگوں کو روکتی ہے۔ اُن بُری باتوں سے بھی جو انسان کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن سے بھی جو سوسائٹی پر گراں گذرتی ہیں۔ کیونکہ نماز باجماعت مسلمانوں میں پانچ وقت کی مقرر ہے۔ اگر نماز باجماعت اُن میں قائم ہو جائیگی تو اُن کا بہت سا وقت خدا تعالیٰ کی عبادت میں لگ جائیگا۔ اور نماز میں خرچ ہونے والا وقت اُنکو بے حیائیوں اور بدکاریوں سے بچاتا رہے گا۔ اسی طرح نماز میں جب دُعائیں ہوتی رہیں گی۔ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی تو وہ دُعائیں خدا تعالیٰ کا فضل کھینچ کر اُن کی اپنی اصلاح کا بھی موجب ہونگی۔ اور دوسروں کی اصلاح اور ترقی کا موجب بھی بن جائیں گی۔

اسی طرح نماز میں جو قرآن کریم کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تسبیح و تحمید کی کثرت ہوتی ہے اس کا دل پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ انسان گناہوں سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔

غرض اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ کے معًا بعد اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اور اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ کا ذکر فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ بغیر دعاؤں کے پاکیزگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تلاوت قرآن سے تم دنیا کے خیالات بے شک تبدیل کر سکتے ہو۔ لیکن دنیا میں پاکیزگی بغیر فضلِ الٰہی کے نہیں ہو سکتی اور یہ فضل دعاؤں سے ہی حاصل ہو گا۔ پس نمازیں پڑھو اور دُعائیں مانگو۔ تاکہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کیلئے تمہیں کھڑا کیا ہے اُس میں تمہیں کامیابی حاصل ہو۔ انجیل میں حضرت مسیحؑ نے بھی ایک مقام پر فرمایا ہے کہ

"یہ جنس سوائے دُعا اور روزہ کے کسی اَور طرح سے نکل نہیں سکتی۔"

(مرقس باب ۹ آیت ۲۹)

مگر انجیل کی ایک تعلیم کے اچھا ہونے کے یہ معنے نہیں کہ عیسائی مذہب اچھا ہے۔ کیونکہ اُس میں تو صرف ایک بات اچھی ہے اور قرآن میں ساری باتیں اچھی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ عبادت کی غرض اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے جذباتِ شکر کا اظہار کرنا ہوتا ہے کیونکہ انسان فطرتاً اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ جُبِلَتِ الْقُلُوْبُ عَلٰى حُبِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَيْهَا۔ انسانی دل کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ وہ اپنے محسن سے محبت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ پس نماز کی ایک بہت بڑی غرض تو یہ ہوتی ہے کہ انسان اپنے ربّ کے سامنے اُس کے احسانوں کا اپنی زبان سے اقرار کرتا رہے۔ مگر اسکے علاوہ

عبادت کی ایک اَور بھی غرض ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے اور وہ گناہوں اور بدیوں سے پاک کرنا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ انسانی عبادتوں کا محتاج نہیں۔ بلکہ جس قدر احکام اُس نے انسان کو دیئے ہیں اُن میں اصل غرض اس کے دل کو پاک کرنا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ پاک ہے اور وہ ناپاک سے تعلق نہیں رکھ سکتا۔ پس تمام عبادات میں یہ مدّنظر رکھا گیا ہے کہ اُن سے نفسِ انسانی بدیوں سے پاک ہو اور ان کے ذریعہ اُسے ایسی طاقت مل جائے کہ وہ مختلف قسم کی ہوا و ہوس کو چھوڑنے کے قابل ہو جائے۔ اور ایک طرف اللہ تعالےٰ سے اُس کے تعلقات درست ہو جائیں اور دوسری طرف مخلوقِ الٰہی سے بھی اُس کے معاملات بالکل ٹھیک ہوں۔ چنانچہ اسلام نے مذہب کی تعریف ہی یہی کی ہے کہ وہ بندے کے خدا تعالےٰ سے تعلقات کو مضبوط کرتا ہو اور بندوں کے تعلقات کو قائم کرتا ہو۔ اور اگر کوئی مذہب اِن دونوں باتوں میں سے کسی ایک کے پورا کرنے سے قاصر ہو تو وہ مذہب نہیں کہلا سکتا کیونکہ اس سے مذہب کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ پس جسقدر عبادات مقرر کی جاتی ہیں اُنکی اصل غرض یہی ہوتی ہے کہ بندہ کو خدا تعالےٰ کے نزدیک کر دیا جائے اور اُن میں گناہوں سے بچنے کی طاقت پیدا کی جائے اور جو عبادت اِن دونوں باتوں کے حصول کے ذرائع پیدا کرے وہی عبادت مفید سمجھی جا سکتی ہے۔ ورنہ اس میں مشغول ہونا اپنے وقت کو ضائع کرنیوالی بات ہو گی۔ قرآن کریم نے اس مضمون کو یُوں ادا کیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ نماز بدیوں اور گناہوں سے روکتی ہے۔ گویا نماز فرضِ عبودیت کا اقرار نہیں۔ بلکہ قلبِ انسانی کو جِلا دینے والی شے بھی ہے اور اس کی مدد سے انسان بدیوں اور بدکرداریوں سے بچتا ہے اور اس کا وجود بنی نوع انسان کیلئے مفید ہو جاتا ہے۔ اب جبکہ یہ معلوم ہو گیا کہ نماز کی اصل غرض اللہ تعالےٰ سے تعلق قائم کرنا اور اس کا شکر ادا کرنا اور نفس کی اصلاح کرنا ہے تو جس طریقِ عبادت سے یہ دونوں باتیں حاصل ہوتی ہوں وہی عبادت سچی عبادت سمجھی جائیگی اور اسی عبادت کی طرف ہدایت کرنے والا مذہب سچا مذہب ہو گا۔ اسلام نے اپنے پیرؤوں کے لئے جو طریقِ عبادت رکھا ہے اُس میں اِن اغراض کو پورا کرنے کے لئے جو ذرائع استعمال کئے ہیں وہ اَور کسی مذہب نے نہیں کئے۔ اور ہر ایک انسان معمولی غور سے کام لے کر بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہی ذرائع اِس قابل ہیں کہ عبادت کی غرض کو پورا کر سکیں۔ اور وہ ذرائع یہ ہیں:-

اَوّل:- انسانی جسم اور رُوح کا ایسا گہرا تعلق ہے کہ ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے۔ جس طرح غم کی خبر سُنکر جسم ایسا متأثر ہوتا ہے کہ اُس پر اداسی کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اِسی طرح جسم کو جب کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو رُوح بھی غمگین ہو جاتی ہے۔ اور یہی حال خوشی کا ہے۔ پس قلب کو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے کا ایک یہ بھی طریق ہے کہ عبادت کے وقت جسم کو بھی کسی ایسی حالت میں رکھا جائے جس سے تذلّل پیدا ہو اور اُس کا اثر رُوح پر پڑکر دل میں بھی رِقّت اور نرمی پیدا ہو جائے۔ اور انسان خدا تعالیٰ کی طرف ایک جوش کے ساتھ متوجہ ہو جائے۔ تذلّل کے اظہار کے لئے دُنیا میں مختلف صورتوں کو اختیار کیا گیا ہے کسی ملک کے لوگ جُھک جاتے ہیں۔ کسی ملک میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا تذلّل کا نشان قرار دیا گیا ہے۔ کسی ملک میں گھٹنوں کے بل گرنے کو کسی میں سجدہ کرنے کو۔ اسلام چونکہ خالقِ فطرت کی طرف سے ہے اُس نے تمام فطرتوں اور عادتوں کا خیال رکھتے ہوئے نماز میں

ان سب نشانات کو جمع کر دیا ہے۔ اور مختلف المذاق
لوگ جس جس حالت میں بھی تذلل کا اظہار کرتے ہیں نماز
اُن کے مذاق کے مطابق ہے۔ اور ان مختلف اشکالِ تذلل
کے اثر سے انسانی قلب جوش سے بھر جاتا ہے اور
وہ خدا تعالیٰ کے حضور جھک جاتا ہے۔ درحقیقت وہ
ایک قابلِ دید نظارہ ہوتا ہے جب ایک مسلمان اپنے
رب العالمین خدا کے حضور کبھی ہاتھ باندھے کھڑا
ہوتا ہے کبھی جھک جاتا ہے۔ کبھی ہاتھ کھول کر کھڑا
ہو جاتا ہے کبھی سجدہ میں گر جاتا ہے کبھی گھٹنوں کے
بل بیٹھ جاتا ہے اور اس کا دل اس محبت سے پُر ہوتا
ہے جو ایک مخلوق کو خالق سے ہو سکتی ہے۔ اور وہ زبانِ
حال سے اقرار کرتا ہے کہ دنیا کی مختلف اقوام جس جس
طریق میں بھی اپنی عبودیت کا اظہار کرتی ہیں اے خدا
میں تیرے سامنے مجموعی طور پر ان سب طریقوں سے
اپنی عبودیت کا اقرار کرتا ہوں۔ یہ نظارہ نماز ادا
کرنے والے کو ہی نہیں بلکہ اُس کے دیکھنے والے کے
دل کو بھی متأثر کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دیتا ہے

دوسرا اصل اسلام نے نماز کی غایت کو حاصل
کرنے کا یہ تجویز کیا ہے کہ دُعا کو نماز کا مغز قرار دیا
ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ
دُعا نماز کا مغز ہے اور دُعا اپنے اندر ایک ایسا مقناطیسی
اثر رکھتی ہے کہ ایک طرف تو بندے کو اللہ تعالیٰ کے
قریب کر دیتی ہے اور دوسری طرف اس کے لئے ایسی
آسانیاں بہم پہنچا دیتی ہے کہ جن سے وہ گناہوں سے
محفوظ رہ سکے۔ جب ہماری استدعاؤں اور التجاؤں کو
والدین اور حکامِ دنیا بھی قبول کرتے ہیں تو کیونکر خیال
کیا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ جو سب مہربانوں سے زیادہ
مہربان ہے اپنے بندوں کی دعاؤں کو ردّ کر دے گا
پس نماز کیا ہے؟ دُعاؤں کا ایک مجموعہ ہے جس سے
ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے
اور دوسری طرف دُعائیں قبولیت کا درجہ حاصل کر کے
انسان کی ہدایت اور نیکیوں میں ترقی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

تیسرا طریق اسلام نے یہ بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ
کی طاقتوں کا معائنہ کیا جائے۔ کیونکہ جب تک کسی چیز
کا کامل علم انسان کو نہ ہو اُس سے تعلق مکمل نہیں ہو
سکتا۔ مثلاً جس انسان کو علم کی خوبی معلوم نہیں وہ
اُس کے حصول کی کوشش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو شخص
زہر کے اثر سے ناواقف ہے وہ زہر سے نہیں ڈر سکتا
پس اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے اور بدیوں سے بچنے
کے لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ خدا تعالیٰ کی
کامل معرفت ہو جس کے لئے اسلام نے نماز میں ایسی
عبارتوں کا پڑھنا ضروری رکھا ہے جن سے انسان پر
اللہ تعالیٰ کا پُر جلال اور قابلِ محبت ہونا ظاہر ہوتا ہے
اور وہ بے اختیار اُس کے حضور گر جاتا ہے۔ اور اس
کا دل محبت اور خوف سے بھر جاتا ہے۔ کیونکہ جب اُس
کے سامنے ایک ہی وقت میں اللہ تعالیٰ کے احسانات
پیش کئے جاتے ہیں اور نافرمانی اور قطع تعلق کے نتائج
سے آگاہی کی جاتی ہے تو اُس پر ایک ایسی انقطاعی
حالت طاری ہوتی ہے کہ وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کے
قریب ہو جاتا ہے۔ اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ادنیٰ درجہ
کی نماز یہ ہے کہ تُو یہ سمجھے کہ خدا مجھے دیکھ رہا ہے
اور اعلیٰ درجہ کی نماز یہ ہے کہ تُو یہ سمجھے کہ تُو اپنی
آنکھوں سے خدا کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ صرف نماز اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں نماز کی
اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ عملی زندگی میں وہ انسان کو
فحشاء اور منکر سے روکے۔ گویا اصل مقصود یہ
ہُوا کہ انسان فحشاء اور منکر سے رُکے۔ اور

روحانی لحاظ سے نماز کی غرض یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کے سامنے آجائے اور وہ یہ سمجھے کہ وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے ۔ اب یہ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تُو یہ سمجھے کہ تُو خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اگر تجھے یہ مقام حاصل نہیں تو تُو یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ تجھے دیکھ رہا ہے اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تو ہر انسان کو ہر حالت میں دیکھ رہا ہے ۔ کیا اسلام کے رُو سے یہ کہنا جائز ہوگا کہ خدا فلاں کو دیکھ رہا ہے اور فلاں کو نہیں دیکھ رہا ۔ یا خدا عیسائیوں کو نہیں دیکھ رہا ۔ ہندوؤں کو نہیں دیکھ رہا ۔ سکھوں کو نہیں دیکھ رہا لیکن مسلمانوں کو دیکھ رہا ہے ۔ یا زید نماز نہ پڑھنے والے کو خدا نہیں دیکھ رہا اور زید نماز پڑھنے والے کو خدا تعالیٰ دیکھ رہا ہے ۔ اگر ایسا ہوتا کہ جب بندہ نماز کے لئے کھڑا ہوتا تبھی خدا اُسے دیکھتا تو کئی لوگ جان بُوجھ کر نماز چھوڑ دیتے اور سمجھتے کہ نہ ہم نماز پڑھیں گے اور نہ خدا ہمیں دیکھے گا ۔ پس جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ نماز کا ادنیٰ مقام یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے تو اس کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ انسان یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ نماز پڑھنے والے کو تو دیکھتا ہے اور جو نماز نہیں پڑھتا اُسے نہیں دیکھتا کیونکہ اس صورت میں کمزور لوگ نماز نہ پڑھنے کو اپنے لئے زیادہ برکت کا موجب سمجھتے اور وہ خیال کرتے کہ نہ ہم نماز پڑھیں گے اور نہ ہمیں خدا دیکھے گا ۔ پھر اَور معنے بھی اس کے لئے جا سکتے ہیں اور وہ یہ کہ فی الواقعہ تو خدا تعالیٰ انسان کو نہیں دیکھ رہا لیکن تم یہ سمجھو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے ۔ اگر یہ معنے لئے جائیں تو یہ جھوٹ بن جاتا ہے ۔ اگر خدا ہمیں نہیں دیکھ رہا اور ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے تو ہم اپنے نفس کو دھوکا دیتے ہیں ۔ اور ایک جھوٹا تصوّر اپنے ذہن میں پیدا کرتے ہیں ۔ پس یہ دونوں معنے نہیں لئے جا سکتے ۔ نہ یہ معنے لئے جا سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہم کو عام طور پر نہیں دیکھتا لیکن جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں دیکھتا ہے ۔ اور نہ یہ معنے لئے جا سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہم کو حقیقتاً نہیں دیکھ رہا لیکن ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے جب یہ دونوں معنے غلط ہیں تو لازماً ہمیں اس کے کوئی اَور معنے لینے پڑیں گے جو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہوں۔ اور وہ معنے یہی ہیں کہ اسجگہ سمجھ لو کے معنے یقین کر لینے کے ہیں ۔ گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ تم سمجھ لو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے اِس کے معنے یہ ہیں کہ تمہیں یقینی طور پر اس بات کو محسوس کرنا چاہیئے کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے اور یقینی علم اَور محض خیال اور وہم میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ ایک آدمی صرف خیال کرتا ہے کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے ۔ اور ایک آدمی اس یقینِ کامل پر قائم ہوتا ہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے ۔ بظاہر دونوں یہی سمجھتے ہیں کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے لیکن ایک کا تصوّر محض وہم پر مبنی ہوتا ہے جو جھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور دوسرا یقین کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوتا ہے ۔ ایک کو بڑی آسانی کے ساتھ متزلزل کیا جا سکتا ہے اور دوسرا شخص جو اپنے اللہ کامل یقین پیدا کئے ہوئے ہوتا ہے اُسے دُنیا کی کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکتی ۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشاد کا یہ مطلب نہیں کہ گو یہ واقعہ تو نہیں کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے مگر تم نماز پڑھتے وقت یہ تصوّر کر لیا کرو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے ۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ نماز کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان اس یقینِ کامل پر قائم ہو جائے کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے ۔ یہاں دیکھنے کے عام معنے تو

ہو نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ کافر کو بھی دیکھ رہا ہے اور مومن کو بھی دیکھ رہا ہے عیسائی کو بھی دیکھ رہا ہے اور ہندو کو بھی دیکھ رہا ہے۔ نماز پڑھنے والے کو بھی دیکھ رہا ہے اور نماز نہ پڑھنے والے کو بھی دیکھ رہا ہے۔ ایسی صورت میں ایک نماز پڑھنے والا بھی اگر یہ سمجھ لیتا ہے کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے تو اس میں اُسے کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خدا جس طرح اُسے دیکھ رہا ہے اُسی طرح ایک کافر اور منافق کو بھی دیکھ رہا ہے خصوصیت اُسے تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب دیکھنے والے کے بھی اَور معنے لئے جائیں اور وہ معنے حفاظت اور مدد کرنے کیلئے اُس کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت فرماتا ہے کہ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ (پ۲۷ سورۃ طور ع۲) یعنی تُو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ پس چاہیئے کہ جب تُو نماز کے لئے کھڑا ہو تو ہماری تسبیح کیا کر۔ اب آنکھوں کے سامنے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو خدا تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے تھے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دشمن خدا تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے نہیں تھا۔ بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ تُو ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اب ہم تیرا خاص خیال رکھتے ہیں کوئی تجھ کو چھیڑ نہیں سکتا۔ کوئی تجھ پر حملہ نہیں کر سکتا کوئی تجھے ذلیل اور رُسوا نہیں کر سکتا۔ جیسے حفاظت کے لئے اگر کسی کی ڈیوٹی مقرر ہو تو وہ حملہ آور کو دیکھ کر چُپ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح ہمارا تیرے ساتھ ایسا تعلق قائم ہو چکا ہے کہ اب ہم تجھ پر حملہ ہوتے دیکھ کر چُپ نہیں رہ سکتے۔ دنیا میں بھی انسان جب کسی معاملہ میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا تو آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ اور جب دخل دینا چاہتا ہے تو کہتا ہے۔ "میں دیکھ رہا ہوں"۔ بہرحال جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ نماز کا یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے تو اس کے معنے یہی ہیں کہ اُسے یہ یقین کامل حاصل ہونا چاہیئے کہ میری نماز اتنی درست ہے کہ اب میرے ساتھ کوئی شخص ایسا سلوک نہیں کر سکتا جسے خدا نظر انداز کر دے۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے الہاماً فرمایا کہ اِنِّیْ مُعِیْنٌ مَّنْ اَرَادَ اِعَانَتَكَ وَاِنِّیْ مُهِیْنٌ مَّنْ اَرَادَ اِهَانَتَكَ کہ جو شخص تیری مدد کا ارادہ کریگا میں اُس کی مدد کرونگا۔ اور جو شخص تیری اہانت کا ارادہ کریگا میں اُس کی اہانت کرونگا۔ گویا اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکی اور بدی دونوں کا ردّعمل ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ اپنے بندے سے نیکی کرنے والے کی نیکی کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اور نہ اپنے بندے کے ساتھ بُرائی کرنے والے کی بُرائی کو نظر انداز کرتا ہے۔ اگر کوئی اُس سے نیکی کرتا ہے تو وہ اس سے بڑھ کر اُس کے ساتھ نیک سلوک کرتا ہے اور اگر کوئی اس کے ساتھ بدی کرتا ہے تو وہ اُس سے بڑھ کر اُس کے ساتھ بُرا سلوک کرتا ہے اور یہ ادنیٰ درجہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہر مومن کو حاصل ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نماز کے اعلیٰ درجہ کی طرف مومنوں کو توجہ دلاتے ہیں اور فرماتے ہیں اصل مقام یہ ہے کہ تُو نماز پڑھتے وقت یہ سمجھے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ یہاں بھی کَاَنَّكَ تَرَاهُ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اب اس کے بھی یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ تُو فرض کرے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں۔

کیونکہ یہ جھوٹ بن جاتا ہے۔ اوّل تو جو چیز ہے ہی نہیں اُس کے متعلق کسی نے سمجھنا ہی کیا ہے۔ اگر کوئی ایسا کمزور دل ہو جو اپنے دل پر بار بار اثر ڈالنے کی کوشش کرے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں تو اُس کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے۔ پس کَاَنَّكَ تَرَاہُ کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ تُو یہ فرض کرلے کہ تُو خدا کو دیکھ رہا ہے۔ درحقیقت اِس کے معنے یہ ہیں کہ پہلا مقام حاصل ہو جانے کے بعد مومن ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نشانات کی حقیقت اس پر واضح ہو جاتی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے سلوک اور اُس کے رحم و کرم کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتا ہے۔ پس نماز کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ انسان جب نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو تو اُسے یہ یقین کامل ہو کہ وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اِس کے یہ معنے نہیں کہ جیسے ہندو کہتے ہیں کہ انسان عبادت کے وقت یہ سوچنا شروع کر دے کہ ایک بُت جو اُس کے سامنے ہے وہ خدا ہے اِسی طرح وہ مسلمان بھی یہ سوچنا شروع کر دے۔ کیونکہ اسلام وہم نہیں سکھاتا۔ اسلام کوئی جھوٹا تصور انسانی ذہن میں پیدا نہیں کرتا۔ اسلام یہ سکھاتا ہے کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمہیں اس امر کی معرفت حاصل ہو کہ تم سے نیک سلوک کرنے والے سے خدا تعالیٰ نیک سلوک کرتا ہے اور تم سے بُرا سلوک کرنے والے سے خدا تعالیٰ بُرا سلوک کرتا ہے اگر تم کو بھی یہ نظر آ جائے اور تم کو بھی یہ محسوس ہونے لگ جائے کہ جس نے تمہارے ساتھ نیک سلوک کیا تھا اُس کے ساتھ خدا تعالیٰ نے نیک سلوک کیا اور جس نے تمہارے ساتھ بُرا سلوک کیا تھا اُس کے ساتھ خدا تعالیٰ نے بُرا سلوک کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری محبتِ الٰہی کامل ہو جائیگی اور تمہاری نماز اپنی ذات میں مکمل ہو جائیگی۔ غرض اسلام واہمہ کی تعلیم نہیں دیتا۔ اسلام ہمیں یقین اور معرفت کے مقام پر پہنچانا چاہتا ہے۔ اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنی نمازوں کو اِس طرح سنوار کر ادا کریں اور انہیں اتنا اچھا اور اعلیٰ درجہ کا بنائیں کہ ایک طرف تو خدا تعالیٰ ہم سے اِتنا تعلق رکھے کہ ہمارے ساتھ حسن سلوک کرنے والے سے وہ حسن سلوک کرے اور ہمارے ساتھ بُرا سلوک کرنیوالے سے وہ بُرا سلوک کرے اور دوسری طرف ہماری اپنی آنکھیں اِتنی روشن ہوں اور ہمارے دل میں اِتنا نُور بھرا ہو کہ ہم کو خود بھی نظر آ جائے کہ خدا تعالیٰ ہماری تائید میں اپنے نشانات ظاہر کرتا ہے۔ جب یہ مقام کسی کو حاصل ہو جائے تو وہ ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بالا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے روشن نشانات اُس کی تائید میں ظاہر ہونے لگتے ہیں اور وہ اس یقین سے لبریز ہو جاتا ہے کہ خدا اُسے ضائع نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے نشانات کو دیکھ رہا ہوتا ہے وہ اُس کے حسن سلوک اور انعامات کا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے اور وہ اس یقین پر مضبوطی سے قائم ہوتا ہے کہ دُنیا اُسے چھوڑ دے مگر خدا اُسے نہیں چھوڑے گا۔ نادان اس کو نہیں سمجھ سکتا مگر وہ جس نے خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو وہ ایسی مضبوط چٹان پر قائم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے عزم کو متزلزل نہیں کر سکتی۔

افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں میں ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جو نماز نہیں پڑھتا اس لئے نہیں کہ وہ نماز کا قائل نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم ہے اگر ہم نماز نہیں پڑھینگے تو وہ ہمیں بخش دے گا۔ آخر اُس نے گنہگاروں کو ہی بخشنا ہے۔ اگر گناہ کرنے والے نہ ہوئے تو وہ بخشیگا کن کو؟ یہ جواب غلط ہے یا صحیح اِس کے متعلق

بحث نہیں۔ بہر حال یہ ایک جواب ہے جو انہوں نے سوچا ہؤا ہے۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو سمجھتا ہے کہ یہ احکام پُرانے زمانہ میں محض عربوں کی اصلاح کے لئے دئے گئے تھے۔ عرب لوگ بالکل وحشی تھے۔ اور وہ گندے اور غلیظ رہتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دے دیا کہ تم اپنے کپڑوں اور بدن کو صاف رکھا کرو۔ اسی طرح اُن میں کوئی تنظیم نہیں تھی۔ وہ بالکل پراگندہ حالت میں تھے۔ اسلام نے اُن کو حکم دے دیا کہ وہ پانچ وقت مسجد میں اکٹھے ہو جایا کریں۔ اِس طرح گو بظاہر نماز کا حکم دیا گیا مگر دراصل یہ غرض تھی کہ وہ خدا تعالےٰ کے ڈر کے مارے جب مسجد میں آئینگے اور انہیں قوم اور ملک کے حالات بتائے جائیں گے۔ تو اُن میں سیاسی بیداری پیدا ہو جائیگی اور وہ دُنیا پر غالب آنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے یاد ہے۔ مَیں بچہ تھا کہ مَیں نے ایک اخبار میں ایک دفعہ اِسی کے متعلق ایک مضمون پڑھا۔ ایک صاحب جو مسلمانوں کے مبلغ سمجھے جاتے تھے اور جاپان اور امریکہ میں تبلیغ کرکے آئے تھے انہوں نے واپس آنے پر علی گڑھ میں ایک لیکچر دیا جو اخبار میں شائع ہؤا۔ اور مَیں نے بھی پڑھا اُس لیکچر میں انہوں نے بیان کیا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ نماز بڑی ضروری چیز ہے اور پانچ وقت مسجد میں باجماعت ادا ہونی چاہیئے دراصل ایسا کہنے والے حقیقت پر کبھی غور نہیں کرتے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ پُرانے زمانہ کے لحاظ سے اس کے احکام اور رنگ رکھتے تھے اور اِس زمانہ کے لحاظ سے اس کے احکام اور رنگ رکھتے ہیں۔ بے شک احکام وہی رہیں گے مگر حالات کے لحاظ سے اُن کی ہیئت بدلتی چلی جائے گی۔ عرب لوگ جاہل تھے وہ ننگے پاؤں رہتے تھے۔ کپڑے اُن کے پاس بہت کم ہؤا کرتے تھے۔ اِس لئے اُنکو سجدہ اور رکوع کا حکم دے دیا گیا۔ مگر اب وہ زمانہ ہے کہ اگر سجدہ کیا جائے یا رکوع کے لئے جُھکا جائے تو پتلونوں کی کریزیں بالکل خراب ہو جائیں۔ اِس زمانہ میں اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو وہ یقیناً اس حکم میں ترمیم کرتے اور یقیناً وہ یہی کہتے کہ بنچ پر بیٹھے بیٹھے اگر سر جھکا لیا جائے تو اتنا ہی کافی ہے رکوع اور سجدہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح روزہ ہے۔ یہ روزہ اُن لوگوں کے لئے ہے جو بہت کھا جاتے ہیں۔ عرب لوگ وحشی تھے اور وہ اپنے معدوں کا خیال نہیں رکھتے تھے اس لئے اسلام نے انہیں روزوں کا حکم دے دیا۔ مگر اب تہذیب کا نقد دورہ ہے۔ اَب لوگ اپنے معدہ کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ اَب اگر صبح و شام صرف ناشتہ کر لیا جائے اور کیک بسکٹ کھائے جائیں لیکن دن بھر کچھ نہ کھایا جائے تو روزہ کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔ غرض مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اِن عبادات کے متعلق سمجھتے ہیں کہ یہ آؤٹ آف ڈیٹ out of date ہیں۔ موجودہ زمانہ میں اِنکی ضرورت نہیں۔ اور ایک طبقہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ نماز تو دل کی ہی نماز ہے ظاہری حرکات کی کیا ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز ظاہر کی بھی ہے اور دل کی بھی۔ اور اِن دونوں چیزوں کا مجموعہ انسان کے لئے برکت کا موجب ہوتا ہے۔ اگر ہم دل میں خدا خدا کرتے ہیں مگر ظاہر میں نماز نہیں پڑھتے تو ہمارا دل سے خدا خدا کہنا محض دھوکا اور فریب ہوگا۔ کیونکہ محبوب کی بات مانا کرتے ہیں۔ ردّ نہیں کیا کرتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم خدا تعالےٰ سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری طرف ہم اپنی محبت کا کوئی ثبوت پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اُس نے کہا ہے سجدہ کرو۔ مگر ہم سجدہ کرنے کے لئے تیار بھی نہیں ہوتے۔ یا ظاہر میں تو نماز پڑھی جائے مگر

دل خدا کی طرف متوجہ نہ ہو۔ تو یہ بھی کوئی نماز نہیں ہوگی بلکہ محض ایک ورزش کہلائیگی۔ جیسے ورزش سے سپاہی کا جسم مضبوط ہوتا ہے۔ اسی طرح نماز سے اس کا جسم بھی مضبوط ہوگا۔ مگر اُس کے دل میں نورِ ایمان پیدا نہیں ہوگا۔ کچھ عرصہ کی بات ہے۔ میں سندھ گیا تو ایک ہندو مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ پارٹیشن کے موقعہ پر وہ وہاں سے بھاگا نہیں تھا۔ کیونکہ اُس کے مسلمانوں سے تعلقات تھے میں نے اُس سے کہا کہ تمہارے مسلمانوں سے دیرینہ تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ کبھی تم نے اُن کے دین پر بھی غور کیا۔ وہ کہنے لگا۔ سب مذاہب اچھی باتیں کہتے ہیں۔ ہمارا مذہب بھی اچھا ہے اور آپ کا مذہب بھی اچھا ہے۔ میں نے کہا۔ اگر سب میں ایک جیسی اچھی باتیں ہیں تو پھر تم مسلمانوں کے ساتھ مل کیوں نہیں جاتے۔ آخر کوئی نہ کوئی فرق ہی ہے جس کی وجہ سے تم ہندو ہو اور ہم مسلمان۔ اگر ان دونوں مذاہب میں ایک جیسی باتیں پائی جاتی ہیں تو یا تم مسلمان بن جاتے یا ہم ہندو بن جاتے۔ بہرحال کوئی نہ کوئی فرق ضرور تسلیم کرنا پڑے گا جس کی وجہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنا علیحدہ وجود قائم رکھنا چاہیئے۔ پھر میں نے اُس سے کہا کہ کبھی تم نے نماز اور دیگر عبادات کا اپنے مذہب کی عبادات سے مقابلہ کیا۔ اور یہ دیکھا کہ ان میں سے کونسی عبادت زیادہ بہتر ہے۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ کعبہ اور دَیر تو دونوں دل میں ہیں۔ کسی ظاہری نماز کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ فرمایئے۔ آپ شادی شدہ ہیں۔ اُس نے کہا۔ ہاں میں نے کہا۔ بچے بھی ہیں۔ اُس نے جواب دیا کہ بچے بھی ہیں میں نے کہا۔ آپ نے کبھی بیوی بچوں کو پیار بھی کیا ہے اُس نے کہا۔ کیوں نہیں کیا۔ میں نے کہا اصل پیار تو دل میں ہوتا ہے پھر آپ ظاہر میں پیار کیوں کرتے ہیں اسی لئے کہ آپ سمجھتے ہیں اُس پیار کی کوئی ظاہری علامت بھی ہونی چاہیئے۔ اگر بیوی سے پیار کرنے کیلئے آپ صرف دل کا پیار کافی نہیں سمجھتے۔ بچوں سے پیار کرنے کے لئے صرف دل کا پیار کافی نہیں سمجھتے۔ بلکہ انہیں بوسہ بھی دیتے ہیں۔ تو خدا کے پیار کے معاملہ میں یہ آپ کیوں کہتے ہیں کہ کعبہ اور دَیر تو دونوں دل میں ہیں کسی ظاہری عبادت کی ضرورت نہیں۔

بات یہ ہے کہ ظاہر اور باطن دونوں چیزیں مل کر انسان کو کامل بناتی ہیں۔ اگر یہ دونوں چیزیں طائی نہ جائیں تو کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ اگر اچھی سے اچھی چیز آپ لوگ ایسے برتن میں ڈالینگے جو غلیظ ہوگا تو وہ چیز بھی غلیظ ہو جائیگی۔ اور اگر بغیر برتن کے اُس چیز کو لے لیں گے تو وہ گر جائیگی۔ گویا برتن کی بھی ضرورت ہے اور پھر اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ وہ برتن اچھا ہو۔ اور اس کے اندر کوئی اچھی چیز ہو اسی طرح نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ اور دوسری عبادتوں کا حال ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اِدھر یہ فرمایا ہے کہ قربانی کرو۔ مگر اُدھر یہ بھی فرما دیا ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ قربانی کا گوشت اور خون خدا کو پہنچتا ہے۔ خدا کو صرف دل کا اخلاص پہنچتا ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ قربانی کا گوشت اور خون خدا تعالیٰ تک نہیں پہنچتا۔ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ قربانی نہ کرو بلکہ کہا ہے کہ قربانی تو کرو مگر یہ سمجھتے ہوئے کرو کہ میں خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اپنے محبوب کی بات پوری کرنے کے لئے اور اُن مقاصد کی تکمیل کے لئے جو خدا تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں قربانی کر رہا ہوں۔ مثلاً وہ غریب آدمی جو فاقے کرتا ہے یا وہ غریب آدمی جو ہمیشہ دال روٹی کھاتا ہے اِس ذریعہ سے اُسے بھی گوشت مل جاتا ہے گویا دل بھی صاف ہوتا ہے۔ ہمسایوں اور غرباء کیلئے محبت کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کا حکم بھی پورا ہو جاتا ہے۔ پس مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نماز باجماعت کا پابند بنانے کی کوشش کریں۔

جو شخص اپنے محبوب کو بھول جاتا ہے اور اُس کی یاد اپنے دل میں تازہ نہیں رکھتا۔ وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مجھے اپنے محبوب سے محبت ہے۔ سچی محبت ہمیشہ اپنے ساتھ بعض ظاہری علامات بھی رکھتی ہے اور محبت کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ انسان اُٹھتے بیٹھتے اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے اور اُس کی یاد اپنے دل میں تازہ رکھتا ہے جب کوئی شخص اپنے کسی عزیز کو یاد کر لیتا ہے تو اُس کی محبت دل میں تازہ ہو جاتی ہے۔ اور اس کی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اسی لئے کہتے ہیں اَلْمَکْتُوْبُ نِصْفُ الْمُلَاقَاتِ یعنی جب انسان اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو خط لکھتا ہے تو گویا وہ اُس سے نصف ملاقات کر لیتا ہے۔ جب وہ السلام علیکم لکھتا ہے اور پھر وہ اپنے حالات بتاتا ہے اور اس کے حالات دریافت کرتا ہے۔ تو ایک رنگ میں وہ ایک دوسرے کے سامنے ہو جاتے ہیں اور اُنکی محبت تازہ ہو جاتی ہے۔ گویا جس طرح ملاقات سے آپس کے تعلقات بڑھتے ہیں اسی طرح خط لکھنے سے بھی آپس کے تعلقات بڑھتے ہیں۔ اور خط لکھنا ملاقات کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ نماز بھی خدا تعالیٰ کی ملاقات کا ایک ذریعہ ہے اور چونکہ نماز خدا تعالیٰ کی ملاقات کا ایک ذریعہ ہے اس لئے اسلام نے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ انسان تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد خدا تعالیٰ کا نام لے اور نماز کے لئے کھڑا ہو جائے۔ خواہ جنگ ہو رہی ہو۔ دشمن گولیاں برسا رہا ہو۔ پانی کی طرح خون بہہ رہا ہو۔ پھر بھی اسلام یہ فرض قرار دیتا ہے کہ جب نماز کا وقت آجائے تو اگر ممکن ہو مومن اُسی وقت اللہ تعالیٰ کے حضور جُھک جائے۔ (نہایت خطرناک حملہ کی صورت میں وہ نمازیں جو جمع نہیں کی جا سکتیں اُنکو بھی جمع کرنیکا حکم ہے خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر چار نمازیں جمع کی ہیں) بیشک جنگ کی وجہ سے نماز کی ظاہری شکل بدل جائیگی لیکن یہ جائز نہیں ہوگا کہ نماز میں ناغہ کیا جائے۔ مگر آجکل مسلمانوں میں جہاں اور بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں وہاں ان میں ایک نقص یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ریل میں آرام سے بیٹھے سفر کر رہے ہونگے مگر نماز نہیں پڑھیں گے اور جب پوچھا جائے کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے ہو تو کہیں گے سفر میں کپڑوں کے پاک ہونے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اس لئے ہم نماز نہیں پڑھتے۔ حالانکہ سفر تو الگ رہا۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر سر سے پیر تک کسی شخص کے کپڑے پیشاب میں ڈوبے ہوئے ہوں اور اُس کے پاس اور کپڑے نہ ہوں جن کو بدل سکے اور نماز کا وقت آجائے تو وہ انہی پیشاب آلودہ کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھ لے۔ یا اگر پردہ ہے تو کپڑے اتار کر ننگے جسم کے ساتھ نماز پڑھ لے اور یہ پرواہ نہ کرے کہ اُس کے کپڑے پاک نہیں یا جسم پر کوئی کپڑا نہیں۔ کیونکہ نماز کی اصل غرض یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد خدا تعالیٰ کا نام لیا جائے اور اس طرح اُس کی یاد اپنے دل میں تازہ کی جائے جس طرح گرمی کے موسم میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد انسان ایک ایک دو دو گھونٹ پانی پیتا رہتا ہے تاکہ اُس کا گلا تر رہے اور اس کے جسم کو طراوت پہنچتی رہے۔ اسی طرح کفر اور بے ایمانی کی گرمی میں انسانی رُوح کو حلاوت اور تر و تازگی پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد نماز مقرر کی ہے۔ تاکہ وہ گرمی اُس کی رُوح کو جُھلس نہ دے اور اُس کی روحانی طاقتوں کو مضمحل نہ کر دے۔ خدا تعالیٰ کا نام لینے سے اُس کی محبت تازہ ہو جاتی ہے فرشتے قریب آتے ہیں اور شیطان دُور بھاگتا ہے۔ بیشک حکم یہی ہے کہ کپڑے پاک رکھو۔ لیکن فرض کرو کسی کے پاس اور کپڑے نہیں تو بھی اس کے لئے یہ اجازت نہیں ہوگی کہ وہ نماز نہ پڑھے بلکہ اُسے یہی کہا جائیگا کہ خواہ تمہارے کپڑے گندے اور ناپاک ہیں پھر بھی تم انہی گندے اور ناپاک کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھ لو۔ مثلاً کسی شخص

کے پاس صرف ایک ہی تہ بند ہے اور اُسے شبہ ہے کہ وہ تہ بند پاک نہیں رہا تو اس کے متعلق شریعت کا یہ حکم نہیں ہوگا کہ وہ نماز نہ پڑھے۔ بلکہ اُس کے متعلق حکم یہ ہوگا کہ وہ اسی تہ بند کے ساتھ نماز پڑھ لے۔ کیونکہ کپڑوں کی پاکیزگی سے دل کی پاکیزگی بہرحال مقدم ہے مگر ہمارے ملک میں لوگ کپڑوں کا تو خیال رکھتے ہیں اور اپنے دل کو ناپاک ہونے دیتے ہیں۔ اگر ہم کپڑے کی ناپاکی کا خیال کرکے نماز چھوڑ دیتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم کپڑے کے پاک کرنیکا خیال تو کرتے ہیں لیکن اپنے دل کو پاک کرنیکا خیال نہیں کرتے اور یہ سراسر حماقت ہے۔ پس اسوقت جو کپڑا میسّر ہو اسی کے ساتھ نماز پڑھ لینا جائز ہوگا مگر یہ جائز نہیں ہوگا کہ کپڑے کی ناپاکی کے خیال سے اپنے دل کو ناپاک کر لیا جائے اور نماز کو چھوڑ دیا جائے۔

نماز روحانی جسم کی اصلاح کا ایک ذریعہ ہے جس طرح ایک بیمار جسم محض یہ کہکر موت سے بچ نہیں سکتا کہ وہ بیمار ہے اور بیمار ہونے کی وجہ سے وہ روٹی نہیں کھا سکتا اسی طرح ایک روحانی جسم بھی یہ کہکر موت سے نہیں بچ سکتا کہ وہ بیمار ہے اور نماز نہیں پڑھ سکتا۔ باوجود اس کے کہ ایک شخص بیمار ہے اور کھانا نہیں کھا سکتا۔ مثلاً اُس کے گلے میں ورم ہو گیا ہے۔ یا جبڑا اتر گیا ہے۔ یا معدہ غذا کو اپنے اندر رکھ نہیں سکتا۔ یا غذا کو انتڑیوں کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ یا منہ کی طرف سے باہر پھینک دیتا ہے۔ یا کوئی رسولی پیدا ہو گئی ہے۔ یا سرطان ہو گیا ہے۔ اور غذا معدہ میں ٹھہرتی نہیں بلکہ قے ہو جاتی ہے۔ یا غذا معدہ کے اندر جاتی نہیں۔ یا انتڑیوں میں کوئی بیماری لاحق ہے اس لئے انتڑیوں میں غذا ٹھہرتی نہیں یا پچتی نہیں۔ پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مریگا نہیں اسلئے کہ روٹی کے بغیر انسانی جسم بچ نہیں سکتا۔ اسی طرح باوجود اس کے کہ ایک شخص کسی عذر کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتا وہ مریگا۔ بعض لوگ عدم فراست کی وجہ سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ چونکہ وجہ جائز ہے اس لئے نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ حالانکہ اُن کا یہ خیال درست نہیں۔ وجہ جائز ہو یا ناجائز نتیجہ ضرور نکلے گا۔ تم اپنے سر پر اپنی کمائی سے خریدا ہوا تیل لگاؤ یا چوری سے حاصل کیا ہوا تیل لگاؤ سر ضرور چکنا ہوگا۔ یہ نہیں کہ اپنی کمائی سے حاصل کردہ تیل سے سر چکنا ہو جاتا ہے اور چوری کے تیل سے سر سوکھا رہ جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ اپنی کمائی سے حاصل کئے ہوئے کپڑے سے تمہارا جسم ڈھک جائے اور چوری کئے ہوئے کپڑے سے جسم نہ ڈھکے۔ کپڑا چاہے چوری کا ہو یا اپنی کمائی سے خریدا ہوا اُس سے جسم ڈھک جائیگا۔ جیسے اپنی کمائی سے خریدے ہوئے کپڑے سے جسم ڈھک جاتا ہے اسی طرح چوری سے حاصل کئے ہوئے کپڑے سے بھی جسم ڈھک جاتا ہے۔ نتیجے دونوں کے ایک سے ہونگے۔ روٹی کا نہ کھانا تو انسان پھر بھی برداشت کر سکتا ہے۔ مثلاً وہ خیال کر سکتا ہے کہ اگر وہ مرجائیگا تو کیا ہوگا اُسے اگلے جہان میں تو زندگی مل جائیگی۔ یعنی اسے موت کے بعد اگلے جہان کی زندگی مل جاتی ہے۔ لیکن روحانی موت کا کوئی قائم مقام نہیں۔ جسمانی موت کے متعلق تم کہہ دوگے کہ سارے لوگ مرتے ہیں ہمیں موت آجائیگی تو کیا ہوا۔ اگلے جہان میں ہمیں زندگی مل جائیگی۔ لیکن اگر تمہیں روحانی موت آجائے تو تم کیا کروگے۔ روحانی موت کا تو کوئی قائم مقام نہیں۔

پس نماز باجماعت کی عادت ڈالو اور اپنے بچوں کو بھی اس کا پابند بناؤ۔ کیونکہ بچوں کے اخلاق اور عادات کی درستی اور اصلاح کے لئے میرے نزدیک سب سے زیادہ ضروری امر نماز باجماعت ہی ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں اتنے لوگوں سے ملنے اور مختلف حالات کی جانچ پڑتال کا موقع ملا ہے اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ نے میری طبیعت کو ایسا حساس بنایا ہے کہ سو سال کی عمر پانے والے بھی اپنی

عمر کے تجربوں کے بعد دنیا کی اونچ نیچ اور اچھے بُرے کو اتنا محسوس نہیں کر سکتے جتنا میں محسوس کرتا ہوں۔ اور مَیں نے اپنے تجربہ میں نمازِ باجماعت سے بڑھ کر اور کوئی چیز نیکی کے لئے ایسی مؤثر نہیں دیکھی۔ سب سے بڑھ کر نیکی کا اثر کرنے والی نماز باجماعت ہی ہے۔ اگر مَیں اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ کی پوری پوری تشریح نہ کر سکوں تو مَیں اپنا قصور سمجھونگا۔ ورنہ میرے نزدیک نماز باجماعت کا پابند خواہ اپنی بدیوں میں ترقی کرتے کرتے ابلیس سے بھی آگے نکل جائے پھر بھی میرے نزدیک اس کی اصلاح کا موقعہ ہاتھ سے نہیں گیا۔ ایک شمّہ بھر اور ایک رائی کے برابر بھی میرے خیال میں نہیں آتا کہ کوئی شخص نماز باجماعت کا پابند ہو اور پھر اس کی اصلاح کا کوئی موقعہ نہ رہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بدیوں میں مبتلا کیوں نہ ہو گیا ہو۔ نیکی کے متعلق نماز کے مؤثر ہونے کا مجھے اتنا کامل یقین ہے کہ مَیں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر بھی کہہ سکتا ہوں کہ نمازِ باجماعت کا پابند خواہ کتنا ہی بداعمال کیوں نہ ہو گیا ہو اُس کی ضرور اصلاح ہو سکتی ہے اور وہ ضائع نہیں ہوتا۔ اور مَیں شرح صدر سے کہہ سکتا ہوں کہ آخری وقت تک اُس کے لئے اصلاح کا موقعہ ہے مگر وہ نماز باجماعت کا پابند اس رنگ میں ہو کہ اُس کو اُس میں لذت اور سرور حاصل ہو۔

مجھے اپنا واقعہ یاد ہے۔ ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کچھ بیمار تھے اس لئے جمعہ کے لئے مسجد میں نہ جا سکے۔ مَیں اُس وقت بالغ نہیں تھا کہ بلوغت والے احکام مجھ پر جاری ہوں۔ تاہم مَیں جمعہ کے لئے مسجد کو جا رہا تھا کہ ایک دوست مجھے ملے اُس وقت کی عمر کے لحاظ سے تو اُن کی شکل اِس وقت تک یاد نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر اس واقعہ کا اثر مجھ پر ایسا ہُوا کہ اب تک مجھے اُن کی صورت یاد ہے۔ محمد بخش اُن کا نام تھا۔ مَیں نے اُن سے پُوچھا۔ آپ واپس آرہے ہیں کیا نماز ہو گئی ہے؟ انہوں نے کہا۔ آدمی بہت ہیں مسجد میں جگہ نہیں تھی اس لئے مَیں واپس آگیا ہوں۔ مَیں بھی یہ جواب سُنکر واپس آگیا۔ اور گھر میں آکر نماز پڑھ لی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ دیکھکر مجھ سے پوچھا مسجد میں نماز پڑھنے کیوں نہیں گئے۔ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ مَیں بچپن سے ہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ادب اُن کے نبی ہونے کی حیثیت سے کرتا تھا۔ مَیں نے دیکھا۔ آپ کے پوچھنے میں ایک سختی تھی اور آپکے چہرہ سے غصّہ ظاہر ہوتا تھا۔ آپ کے اس رنگ میں پُوچھنے کا مجھ پر بہت ہی اثر ہُوا۔ جواب میں مَیں نے کہا۔ مَیں گیا تو تھا لیکن جگہ نہ ہونے کی وجہ سے واپس آگیا۔ آپ یہ سُنکر خاموش ہو گئے۔ لیکن جس وقت جمعہ پڑھ کر مولوی عبدالکریم صاحب آپ کی طبیعت کا حال پوچھنے کے لئے آئے تو سب سے پہلی بات جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ سے دریافت کی وہ یہ تھی کہ کیا آج لوگ مسجد میں زیادہ تھے۔ اُس وقت میرے دل میں سخت گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ کیونکہ مَیں خود تو مسجد میں گیا نہیں تھا معلوم نہیں بتانے والے کو غلطی لگی یا میری سمجھ میں غلط مفہوم آیا دونوں صورتوں میں الزام مجھ پر آئیگا کہ مَیں نے جھوٹ بولا۔ مولوی عبدالکریم صاحب نے جواب دیا۔ ہاں حضور! آج واقعہ میں بہت لوگ تھے۔ مَیں اب بھی نہیں جانتا کہ اصلیت کیا تھی۔ خدا نے میری بریت کے لئے یہ سامان کر دیا کہ مولوی صاحب کی زبان سے بھی اس کی تصدیق کرا دی یا فی الواقعہ اس دن غیر معمولی طور پر زیادہ لوگ آئے تھے بہرحال یہ ایک واقعہ ہُوا جس کا آج تک میرے قلب پر ایک گہرا اثر ہے۔ اِس سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نماز باجماعت کا کتنا خیال رہتا تھا۔ بڑا آدمی اگر خود نماز باجماعت

نہیں پڑھتا تو وہ منافق ہے۔ مگر وہ لوگ جو اپنے بچوں کو نمازِ باجماعت ادا کرنے کی عادت نہیں ڈالتے وہ اُن کے خونی اور قاتل ہیں۔ اگر ماں باپ بچوں کو نمازِ باجماعت کی عادت ڈالیں تو کبھی اُن پر ایسا وقت نہیں آسکتا کہ یہ کہا جاسکے کہ اُن کی اصلاح ناممکن ہے اور وہ قابلِ علاج نہیں رہے۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ آجکل مسلمان مساجد میں جاکر نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور پھر مسجد سے نکل کر کسی قسم کے گناہ سے بھی اُن کو پرہیز نہیں ہوتا۔ جھوٹ وہ بولتے ہیں رشوت وہ لیتے ہیں۔ فریب وہ کرتے ہیں۔ خیانت سے اُن کو پرہیز نہیں۔ تجارتی دھوکوں سے وہ مجتنب نہیں غرض ہزاروں قسم کے گناہوں میں مبتلا ہیں۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نماز کو اُن شرائط کے ساتھ ادا نہیں کرتے جو اسلام نے مقرر کی ہیں۔ اگر وہ اُن شرائط کے ساتھ نماز ادا کرتے تو اُن کے قلوب پاک ہو جاتے اور گناہوں کی میل دُور ہو جاتی اور ہر قسم کے گناہوں اور بدیوں سے وہ محفوظ ہو جاتے۔ کیونکہ نماز کو سنوار کر پڑھنے والا اور ان شرائط کو ملحوظ رکھنے والا جو اللہ تعالےٰ نے ادائے نماز کے لئے مقرر فرمائی ہیں اپنے اندر فوراً ایک تبدیلی پاتا ہے اور زیادہ دن نہیں گذرتے کہ اس کے اندر ایک خاص ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے اسے بدیوں کی شناخت ہو جاتی ہے اور پوشیدہ در پوشیدہ بدیوں پر اُسے اطلاع دی جاتی ہے اور مخفی در مخفی گناہوں کا علم جو دوسروں کو نہیں ہوتا اسے دیا جاتا ہے اور ملائکہ اُسے ہر موقعہ پر ہوشیار کر دیتے ہیں کہ دیکھنا یہ گناہ ہے ہوشیار ہو جانا۔ اور اُسے شیطان کے مقابلہ کی مقدرت عطا ہوتی ہے۔ کیونکہ نمازی اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تحمید کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کسی کا احسان نہیں رکھتا بلکہ اپنے بندہ کو اس کے اعمال کا اعلیٰ سے اعلیٰ بدلہ دیتا ہے۔ جب نماز میں کمال تذلّل اور خشوع اور خضوع کے ساتھ انسان خدا تعالےٰ کے حضور میں گِر جاتا ہے اور وہ تمام تذلّل کے طریق جن کو کسی ملک کے باشندوں نے اظہارِ عبودیت کے لئے تجویز کیا ہے استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اُٹھاتا ہے اور جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے خدا تعالیٰ ملائکہ کو فرماتا ہے کہ دیکھو میرے اس بندہ نے میری پاکیزگی کا اقرار کیا ہے تم اِسے پاک کر دو۔ اور اُس نے میری حمد کی ہے تم اس کی حمد کو دنیا میں پھیلاؤ۔ اور اس نے میرے حضور میں کمال تذلّل اور انکسار کا اظہار کیا ہے تم اسکو عزّت و رفعت دو۔

غرض جوں جوں انسان نمازیں پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی اور حمد اور عظمت کا اقرار کرتا ہے خدا تعالیٰ اُس کے اعمالِ حسنہ کے ترازو کو بوجھل کرتا جاتا ہے اور انسان کا رفع ہوتا جاتا ہے۔ اور چونکہ گناہ نتیجہ ہے مادیت کے تعلّق کا۔ جب انسان اس عالم سے بلند ہوتا جاتا ہے تو اُس کا تعلّق مادیت سے کم ہوتا جاتا ہے اور وہ گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

پھر فرماتا ہے وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ بُری اور ناپسندیدہ باتوں سے رُکنا بھی ایک بڑا مقصد ہے مگر نماز میں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے یہ اُس سے بھی بڑا مقصد ہے۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے خوب واقف ہے۔ اس لئے جب تم اللہ تعالیٰ کو یاد کروگے تو وہ بھی تمہیں یاد کریگا۔ تمہیں اپنے قرب اور الہام سے عزّت بخشیگا اور تمہاری اور تمہاری قوم کی اصلاح کے سامان پیدا فرمائیگا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دوسرے خطبہ میں جو کلمات پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے اُس کے کچھ الفاظ یہ بھی ہیں کہ اُذْكُرُوا اللّٰهَ يَذْكُرْكُمْ یعنی اللہ کو یاد کرو جس کے نتیجہ میں وہ تمہیں یاد کرے گا۔ اِسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے کہ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (بقرہ ۱۹ع) یعنی چاہیئے کہ تم مجھے یاد کرو اِس کے نتیجہ میں

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ

اور اہلِ کتاب سے کبھی بحث نہ کرو مگر اعلیٰ اور مضبوط دلیل کے ساتھ ۔ سوائے اُن لوگوں کے جو اُن میں سے

ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ

ظلم کرنیوالے ہوں (انکو الزامی جواب دے سکتے ہو) اور اُن سے کہو کہ جو ہم پر نازل ہُوا ہے ہم اُس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور جو تم پر نازل ہوا ہے

وَاِلٰـهُنَا وَاِلٰـهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

اُس پر بھی ۔ اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہے ۔ اور ہم اُس کے فرمانبردار ہیں ۔ ۳۱

میں بھی تمہیں یاد کرونگا یعنی تمہیں اپنے قرب میں جگہ دوں گا اور تمہاری ہر تکلیف اور مصیبت میں تمہاری مدد کرونگا اور ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے گا وہ بہت سی بدیوں سے بچ جائیگا ۔ اور خدا تعالیٰ کا معاملہ بھی اُس سے محبت اور پیار کا ہو جائیگا ۔ اِسی وجہ سے اِسلام نے تمام اجتماعات میں ذکرِ الٰہی اور عبادت پر بڑا زور دیا ہے ۔ چنانچہ دیکھ لو ہم حج کے لئے جاتے ہیں ۔ تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے ۔ عیدین میں جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے ۔ شادی اور بیاہ کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے ۔ جنازہ کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی ذکرِ الٰہی ہوتا ہے ۔ گویا ہمارے سب اجتماعوں کو بابرکت بنانے کا نسخہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بیان فرمایا ہے کہ ان میں ذکرِ الٰہی اور عبادت زیادہ کی جائے ۔ اِسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس مجلس میں خدا تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے فرشتے اُس میں اُتر آتے ہیں ۔ پس مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے اوقات کو اس طرح صرف کرے کہ ذکرِ الٰہی اس کی زبان پر جاری ہو اور نمازوں میں اُسے شغف اور رغبت ہو ۔ ذکرِ الٰہی کرنا گویا سوئچ آن switch on کرنا ہے سوئچ آن switch on کردیا جائے تو روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر سوئچ آن switch on نہ کیا جائے تو پھر اندھیرا ہی رہتا ہے ۔ اِسی طرح اگر ذکرِ الٰہی نہ کیا جائے تو طبیعت روشن نہیں ہوتی ۔ پس اپنے اندر ذکرِ الٰہی کی عادت پیدا کرو تا خدا سے تمہارا تعلق بڑھ جائے ۔ تمہارے اندر ہمّت پیدا ہو جائے تمہاری نظروں میں تاثیر پیدا ہو جائے اور دشمن کے دلوں میں بھی تمہارا رعب بیٹھ جائے ۔ اور دشمن خود بول اُٹھے کہ یہ لوگ واقعی روحانیت کے پتلے ہیں ۔

۳۱ تفسیر: ۔ چونکہ قرآنی تبلیغ کے بڑے مخاطب یہود اور عیسائی ہی ہو سکتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ کا حکم دینے کے بعد اہلِ کتاب کا خصوصیت سے ذکر کیا اور فرمایا کہ جب تم قرآن اُن کے سامنے پیش کروگے تو لازماً تورات اور انجیل کے ساتھ قرآن کا مقابلہ ہو جائیگا اور تمہاری اُن سے بحثیں شروع ہو جائینگی ۔ ایسی صورت میں ہم تمہیں یہ ہدایت دیتے ہیں ۔ کہ جب کبھی اہلِ کتاب سے بحث پیش آئے تو ایسی بات پیش کیا کرو جو مضبوط ہو اور خوبصورت نظر آنے والی ہو ۔ کیونکہ اُن کے پاس خدا کی کتاب موجود ہے خواہ وہ محرّف ومبدّل ہی کیوں نہ ہو ۔ مگر بہرحال اُس میں کچھ نہ کچھ کلام تو خدا کا ہے ۔ پس

اُن کے ساتھ بحث کرتے ہوئے قرآن کریم کو مدنظر رکھا کرو کیونکہ قرآنی دلیلیں بہت زبردست ہیں۔ اس کے مقابلہ میں بائیبل کی دلیلیں نہیں چل سکتیں۔ اسجگہ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ سے قرآنی دلائل کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر وضاحتاً فرماتا ہے کہ اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَابًا مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْہُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُھُمْ وَقُلُوْبُھُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (الزمر آیت ۲۴) یعنی ہم ایک قانون جاری کررہے ہیں۔ مگر وہ کوئی جبری قانون نہیں وہ محض اپنی بادشاہت منوانے کے لئے نہیں بلکہ بہتر سے بہتر بات جو کہی جا سکتی ہے خواہ دینی رنگ میں یا دنیوی رنگ میں خواہ عقل سے خواہ نقل سے خواہ روایت سے خواہ درایت سے خواہ چھوٹوں کے لئے خواہ بڑوں کیلئے خواہ مردوں کے لئے خواہ عورتوں کے لئے ان تمام بہترین باتوں کو اس قانون میں جمع کر دیا گیا ہے اور اب قیامت تک یہ قانون منسوخ نہیں ہو سکتا۔ دنیوی حکومتیں بعض دفعہ بڑی سوچ بچار کے بعد قانون بناتی ہیں۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد ہی انہیں اپنا قانون اپنے ہاتھوں سے منسوخ کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ نے بڑا زور لگایا کہ وہ کسی طرح شراب کے استعمال کو روک دے اور اُس نے اس پر قانونی پابندیاں بھی لگائیں مگر تھوڑے عرصہ کے بعد ہی امریکہ کو شراب نوشی کی پھر اجازت دینی پڑی اور شراب کی ممانعت کا قانون اُسے منسوخ کرنا پڑا۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ہم جس قانون کے نفاذ کا اعلان کر رہے ہیں وہ اَحْسَنُ الْحَدِیْث پر مشتمل ہے۔ ہر بہتر سے بہتر بات اُس میں موجود ہے اور وہ انتہائی طور پر پاک اور بے لوث قانون ہے جس میں بنی نوع انسان کی تمام ضرورتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وہ ایسا قانون نہیں جو آج سے سو یا ہزار سال کے بعد منسوخ ہو سکے یا جس میں ردّ و بدل کی کوئی گنجائش نکل سکے۔ پس اسجگہ اَحْسَن سے مراد قرآنی دلائل ہی ہیں۔ یعنی اہل کتاب سے بحث کرتے وقت قرآنی دلائل کو مدنظر رکھا کرو۔ اٹکل پچو باتیں نہ کیا کرو۔

اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ اس میں بتایا کہ ہماری اصولی ہدایت تو یہی ہے کہ بحث میں کبھی سختی سے کام نہ لو اور صرف دلائل تک اس گفتگو کو محدود رکھو۔ لیکن چونکہ دنیا میں بعض ایسے ظالم لوگ بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کے بزرگوں اور اُن کے مقدس نبیوں پر بھی گند اُچھالنے سے باز نہیں آتے اس لئے کبھی ایسے گندہ دہن دشمنوں سے تمہیں مقابلہ پیش آجائے تو تم انہیں الزامی جواب بھی دے سکتے ہو۔

جیسا کہ موجودہ زمانہ میں جب عیسائی پادریوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہایت گندے اور ناپاک اعتراضات کرنے شروع کر دیئے اور انہوں نے اپنی بدزبانی کے تیروں سے کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کر دیا اور آپؐ کو (نعوذ باللہ) دجّال اور کذّاب کہنا شروع کر دیا اور "امّہات المومنین" وغیرہ کتب لکھ کر اپنے اُس بغض اور کینہ کو انتہا تک پہنچا دیا جو انہیں اسلام اور بانیٔ اسلام سے تھا تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انجیل کی رُو سے انہیں الزامی رنگ میں بتایا کہ تم جس مسیح کو خدا قرار دے رہے ہو اُس کی اپنی کیا حیثیت تھی اور اُس کی پاکیزگی اور اخلاق کے متعلق تمہارے دعوے کہاں تک حق بجانب ہیں۔ آپ کے اِس جواب پر عیسائی پادریوں کا شور مچانا تو ایک طبعی امر تھا۔ مگر بدقسمتی سے بعض مسلمانوں نے بھی اس کی حکمت کو نہ سمجھتے ہوئے یہ اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ آپ نے (نعوذ باللہ) حضرت مسیحؑ کی ہتک کی ہے۔ حالانکہ آپؑ کے یہ جوابات قرآن کریم کی اِسی آیت کی

روشنی میں تھے جس میں خدا تعالیٰ نے گندہ دہن مخالفین کا استثناء کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تم ہمیشہ نرمی اور محبت کے ساتھ دلائل پیش کرو۔ لیکن اگر کبھی کسی ایسے مخالف سے بحث پیش آجائے جو گالیوں اور بدزبانی پر اُتر آئے اور اسلام اور اُس کے بزرگوں پر حملے شروع کر دے تو تم بھی مناسب رنگ میں اسے الزامی جواب دے کر خاموش کرا سکتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بھی بعض مقامات پر اسی طریق سے کام لیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں صاف طور پر ذکر آتا ہے کہ مخالف یہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ کیسا نبی ہے یہ تو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہے اور قرآن کریم اس کا الزامی رنگ میں یہ جواب دیتا ہے کہ پہلے نبی بھی کھاتے پیتے تھے اور پہلے نبیوں کے بھی بیوی بچے تھے۔ اسی طرح گذشتہ زمانوں میں اسلامی بزرگ بھی اس طریق سے کام لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ ایک دفعہ روم کے بادشاہ نے ایک مسلمان بادشاہ کو لکھا کہ آپ اپنا کوئی عالم ہمارے پاس بھجوائیں ہم مذہب کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مسلمان بادشاہ نے ایک عالم کو بھجوا دیا۔ عیسائیوں نے پہلے ہی منصوبہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے خیال کیا کہ مسلمان عالم کو آتے ہی ہم شرمندہ کریں گے۔ چنانچہ جب دربار لگ گیا تو ایک پادری اُٹھا اور کہنے لگا۔ مولوی صاحب! آپ کے رسولؐ کی بیوی عائشہؓ پر الزام لگایا گیا تھا۔ اور الزام لگانے والے بھی آپ کی قوم ہی میں سے تھے۔ اس لئے یہ اعتراض کچھ مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ مسلمان عالم جو غالباً امام ابن تیمیہ یا اُن کے کوئی دوست تھے۔ بڑے ہوشیار تھے۔ کہنے لگے۔ پادری صاحب! دنیا میں دو عورتیں گذری ہیں۔ ایک کا خاوند تھا۔ خبیث لوگوں نے اس پر الزام لگایا۔ مگر ساری عمر اس کے کوئی بچہ نہیں ہوا۔ لیکن ایک اور عورت (یعنی حضرت مریمؑ) تھی۔ جس کا خاوند بھی نہیں تھا۔ اُس پر دشمنوں نے الزام لگایا اور اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہو گیا۔ اب آپ بتائیے کہ الزام کس عورت پر لگتا ہے۔ اس پر پادری سخت شرمندہ اور لاجواب ہو گیا اور کہنے لگا کہ مولوی صاحب آپ نے تو سختی شروع کر دی۔ وہ بات تو ہم نے یونہی کہی تھی۔

خود میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ گذرا ہے۔ ایک دفعہ میرے پاس ایک انگریز آیا اور اُس نے کہا میں آپ سے اسلام کے متعلق کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کوئی الزامی جواب نہ دیں۔ میں نے کہا اگر تم اسلام پر حملہ نہیں کرو گے تو میں بھی الزامی جواب نہیں دوں گا۔ لیکن جب باتیں شروع ہوئیں تو تھوڑی دیر کے بعد ہی اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے جواب میں حضرت عیسیٰؑ پر حملہ کر دیا اس سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور کہنے لگا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف کوئی بات نہیں سُن سکتا۔ میں نے کہا۔ دیکھو میرا تم سے وعدہ تھا کہ اگر تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر حملہ نہیں کرو گے تو میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حملہ نہیں کروں گا۔ چنانچہ میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ لیکن تم نے اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا ہے۔ اگر تم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے غیرت ہے تو کیا میں ہی اتنا بے غیرت ہوں کہ مجھے اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عزت پر حملہ دیکھ کر غیرت نہ آئے۔ اگر تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک حملہ کرو گے تو میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تائید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بیس حملے کروں گا۔ چنانچہ وہ اُسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا میں عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا

عیسائیوں کو الزامی جواب دینا ہرگز قابلِ اعتراض امر نہیں تھا اور نہ آپ کے بعض سخت الفاظ کے مخاطب تمام اقوام کے نیک اور مہذب اور سنجیدہ لوگ تھے۔ بلکہ صرف ایسے ہی لوگ آپ کے مخاطب تھے جنہوں نے شرافت سے کام نہ لیا اور اسلام پر گند اچھالنا شروع کر دیا چنانچہ آپ اس بارہ میں وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

"ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ہم نیک علماء کی ہتک اور مہذب شرفاء کی عیب چینی کریں۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا مسیحی ہوں یا ہندو ہوں بلکہ ہم اُن اقوام میں سے جو بیوقوف ہیں اُن کے لئے بھی سخت کلامی نہیں کرتے۔ ہم صرف اُن کے متعلق سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں جو بیہودہ گوئی میں مشہور ہیں اور بدکلامی کی اشاعت جن کا کام ہے۔ لیکن وہ جو ان باتوں سے پاک ہیں اور اُن کی زبان گند سے آلودہ نہیں۔ ہم ایسے لوگوں کا ذکر ہمیشہ نیکی سے کرتے ہیں اور اُنکی عزت کرتے ہیں اور اُن کو بلند درجہ پر بٹھاتے ہیں اور اُن سے اپنے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔" (لجّۃ النّور صفحہ ۶۷)

پھر لکھا ہے:—

"ہماری اس کتاب میں اور رسالہ "فریادِ درد" میں وہ نیک چلن پادری اور دوسرے عیسائی مخاطب نہیں ہیں جو اپنی شرافت ذاتی کی وجہ سے فضول گوئی اور بدگوئی سے کنارہ کرتے ہیں اور دل دُکھانے والے لفظوں سے ہم کو دُکھ نہیں دیتے اور نہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہیں اور نہ اُن کی کتابیں سخت گوئی اور توہین سے بھری ہوئی ہیں۔ ایسے لوگوں کو بلا شبہ ہم عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور وہ ہماری کسی تحریر کے مخاطب نہیں بلکہ صرف وہی لوگ ہمارے مخاطب ہیں خواہ وہ بگفتن مسلمان کہلاتے ہیں یا عیسائی۔ جو حدِ اعتدال سے بڑھ گئے ہیں اور ہماری ذاتیات پر بدگوئی سے حملہ کرتے یا ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ بزرگ میں توہین اور ہتک آمیز باتیں مُنہ پر لاتے اور اپنی کتابوں میں شائع کرتے ہیں سو ہماری اس کتاب اور دوسری کتابوں میں کوئی لفظ یا کوئی اشارہ ایسے معزز لوگوں کی طرف نہیں ہے جو بدزبانی اور کمینگی کے طریق کو اختیار نہیں کرتے۔"

(ٹائیٹل پیج "ایام الصلح")

یہ تشریح جو اوپر بیان کی گئی ہے اس کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اسجگہ اِلَّا کو استثناء متصل قرار دیا جائیگا۔ اور یہی نقطۂ نگاہ مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ لیکن علامہ ابوالبقاءؒ نے لکھا ہے کہ اِلَّا کو استثناء منقطع بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُس صورت میں اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ کے یہ معنے ہونگے کہ ایسے ظالموں سے جھگڑو ہی نہیں بلکہ یہ کہہ دو کہ تم بھی خدا کی کتاب کے ماننے والے ہو اور ہم بھی۔ اور ہمارا تمہارا خدا ایک ہی ہے۔ پھر لڑنے سے کیا فائدہ؟ ہم تم سے بحث ہی نہیں کرنا چاہتے۔ گویا اگر وہ بدزبانی کریں تب بھی اُن سے سختی کے ساتھ پیش نہ آؤ بلکہ عفو سے کام لو اور اُن سے اعراض اختیار کرو۔

پھر فرمایا ہم تمہیں ایک اور نصیحت یہ کرتے ہیں۔ کہ جب اہلِ کتاب سے تمہیں مقابلہ پیش آئے تو قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ تم انہیں

یہ کہا کرو کہ ہم تو اس کلام کو بھی مانتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا اور اُس کلام پر بھی اصولی رنگ میں ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل ہوا۔ اور تمہارا معبود اور ہمارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اُسی کے فرمانبردار ہیں پس آپس میں جھگڑنے سے کیا فائدہ ہم لوگوں کو مل کر خدائے واحد کی تبلیغ کرنی چاہیئے۔ چنانچہ دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ اس طریق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ يَٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران ع) اے اہل کتاب! کم سے کم ایک ایسی بات کی طرف تو آجاؤ۔ جو ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اُسکا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو ربّ کا درجہ دیا کریں۔ پھر اگر وہ پھر جائیں تو اُن سے کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم تو خدا کے فرمانبردار ہیں۔

یہ ایک مختصر سی آیت ہے۔ لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو اِس میں اسلام کی حقیقت پسندی کا ایک نہایت ہی زبردست مظاہرہ کیا گیا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہوا ہے جانتے ہیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو مسلمانوں کا بدترین دشمن قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا ۚ (سورۂ مائدہ آیت ۸۳) یعنی تُو مومنوں سے عداوت رکھنے میں یقیناً یہودیوں کو اور اُن لوگوں کو جو مشرک ہیں سب سے زیادہ سخت پائیگا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ہر قسم کے نیک سلوک کے باوجود یہود بڑی بے شرمی اور بے حیائی سے آپ کی ہر قسم کی مخالفتیں کرتے رہے۔ اکثر جنگیں یہود کے اُکسانے پر ہی ہوئیں بلکہ کسریٰ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کروانے پر بھی انہوں نے ہی اُکسایا تھا گو خدا نے اُن کا مونہہ کالا کیا۔ مگر انہوں نے اپنے خبثِ باطن کا اظہار کر دیا۔ غزوۂ احزاب کی لیڈری بھی یہود ہی کے ہاتھ میں تھی۔ سارا عرب اِس سے قبل کبھی اکٹھا نہیں ہوا تھا۔ دراصل مکہ والوں میں ایسی قوتِ نظام تھی ہی نہیں۔ یہ مدینہ سے جلاوطن شدہ یہودی قبائل کا ہی کارنامہ تھا کہ انہوں نے قریش اور غطفان اور بنو سلیم اور بنو اسد اور بنو سعد اور عرب کے دوسرے زبردست قبائل کو اکٹھا کرکے مدینہ کے سامنے لا ڈالا۔ خدا نے اُس وقت بھی اُن کا مُنہ کالا کیا۔ مگر یہود نے اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل دشمن مکہ والے تھے۔ مگر مکہ والوں نے کبھی دھوکا سے آپؐ کی جان لینے کی کوشش نہیں کی۔ آپؐ جب طائف گئے اور ملک کے قانون کے مطابق مکہ کے شہری حقوق سے آپؐ دستبردار ہو گئے مگر پھر آپؐ کو لوٹ کر مکہ میں آنا پڑا تو اُس وقت مکہ کا ایک شدید ترین دشمن آپؐ کی امداد کے لئے آگے آیا۔ اور مکہ میں اُس نے اعلان کر دیا کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہریت کے حقوق دیتا ہوں۔ وہ اپنے پانچوں بیٹوں سمیت آپ کے ساتھ ساتھ مکہ میں داخل ہوا اور اُس نے اپنے بیٹوں سے کہا۔ کہ محمدؐ ہمارا دشمن ہی سہی پر آج عرب کی شرافت کا تقاضا ہے کہ جب وہ ہماری امداد سے شہر میں داخل ہونا چاہتا ہے تو ہم اُس کے مطالبہ کو پورا کریں۔ ورنہ ہماری عزّت باقی نہیں رہے گی اور اُس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ اگر کوئی دشمن آپ پر حملہ کرنا چاہے تو تم میں سے ہر ایک کو اِس سے پہلے مرجانا چاہیئے کہ وہ آپ تک پہنچ سکے۔ یہ تھا عرب کا شریف دشمن۔ اس کے مقابلہ میں بدبخت یہودی جن کو قرآن کریم

مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتا ہے ۔ اُس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر بُلایا اور صلح کے دھوکا میں چکی کا پاٹ مکان کی چھت پر سے پھینک کر آپ کو مارنا چاہا ۔ خدا تعالےٰ نے آپؐ کو اس کے منصوبہ کی خبر دے دی ۔ اور آپؐ سلامتی سے وہاں سے نکل آئے ۔ اِسی طرح یہودی قوم کی ایک عورت نے آپؐ کی دعوت کی اور زہر ملا ہُوا کھانا آپؐ کو کھلایا ۔ آپؐ کو خدا تعالےٰ نے اِس موقعہ پر بھی بچا لیا ۔ مگر یہودی قوم نے اپنا اندرونہ ظاہر کر دیا ۔ ظاہر ہے کہ ایسی بدترین دشمن قوم سے کسی تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا ۔ مگر اتنے اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی قرآن کریم یہود کو دعوتِ اتحاد دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اے ہمارے رسول یہودیوں کو جو تیرے اتنے دشمن ہیں اور عیسائیوں کو جو تجھے جھوٹا اور کذّاب سمجھتے ہیں کہو کہ تم مجھے جھوٹا کہو مگر تم میرے خدا کو تو مانتے ہو ۔ آؤ ہم اُس خدا کی وحدانیت قائم کرنے کے لئے اکٹھے مشن کھولیں اور توحید کو دُنیا میں پھیلائیں ۔ لیکن اگر اِس دعوتِ اتحاد کے باوجود وہ پھر بھی اکٹھے نہ ہوں تو تُو انہیں کہہ دے کہ ہم تو خدا کے اِس حکم کی تعمیل کریں گے ۔

زیرِ تفسیر آیت میں بھی اسی امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر اہلِ کتاب سے بحث ہو ہی جائے ۔ تو قرآنی دلائل کو کام میں لایا کرو ۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ اُنکو اِدھر توجہ دلاتے رہو کہ بے ہودہ باتوں سے کیا فائدہ ہم بھی موحد ہیں اور تم بھی موحد ہو ۔ ہم بھی خدا کے کلام پر ایمان لاتے ہیں اور تم بھی خدا کے کلام پر ایمان لاتے ہو ۔ بلکہ ہم تم سے بڑھ کر ہیں کہ تم پر نازل ہونیوالے کلام پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اپنے اوپر نازل ہونے والے کلام پر بھی ایمان لاتے ہیں ۔ پس بحثوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ ۔ آؤ ہم مل کر اُن لوگوں میں خدائے واحد کی تبلیغ کریں جو خدائے واحد کو نہیں مانتے ۔ افسوس ہے کہ باوجود اس کے کہ تیرہ سو سال سے یہ تعلیم قرآن میں موجود ہے ۔ آج تک عیسائیوں اور یہودیوں نے اِس طرف توجہ نہیں کی ۔ مَیں ۵۵ء میں بیماری کے علاج کے لئے یورپ گیا تو ایک کالج کے منتظمین نے مجھے لیکچر کی دعوت دی اور اور بہت سے گریجوایٹ وغیرہ لیکچر سُننے کے لئے آئے ۔ انہوں نے مجھے انگریزی میں تقریر کرنے کے لئے کہا جس کی مجھے عادت نہ تھی ۔ مگر اُن کے اصرار پر مَیں نے اُن کی بات مان لی ۔ چونکہ طالبعلم مختلف قوموں کے تھے کچھ جرمن سمجھتے تھے کچھ فرانسیسی کچھ روسی کچھ اٹالین ۔ کچھ یہودی ۔ اس لئے انہوں نے یو۔این۔او کی طرح یہ انتظام کیا ہُوا تھا کہ میری انگریزی تقریر ریڈیو کے ذریعہ مختلف کمروں میں جاتی ۔ جہاں مختلف قوموں کے علماء بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ترجمہ کر کے فوراً اس زبان میں اُسے ریلے کر دیتے تھے ۔ ہر زبان کے جاننے والے نے اپنا آلہ اپنے کانوں کو لگایا ہُوا تھا جس کے ذریعہ سے وہ ساتھ ساتھ میری انگریزی کی تقریر کو اپنی زبان میں سُنتا جاتا تھا ۔ میری تقریر کے بعد بہت سے سوالات ہوئے ۔ جن میں سے ایک سوال یہ تھا ۔ کہ آپ نے جو اسلام کی باتیں بتائی ہیں ۔ یہ تو وہی ہیں جو عیسائیت اور یہودیت پیش کرتی ہے ۔ پھر یہ کیا جھگڑا نظر آتا ہے کہ مسلمان عیسائیوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں اور عیسائی مسلمانوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں ۔ یہودی عیسائیوں اور مسلمانوں کو بُرا سمجھتے ہیں اور عیسائی اور مسلمان یہودیوں کو بُرا سمجھتے ہیں ۔ گویا دُنیا نہ موسیٰؑ کے خدا کو مانتی ہے نہ عیسیٰؑ کے خدا کو مانتی ہے ۔ اور نہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خدا کو مانتی ہے ایسی صورت میں اِن جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے سب مل کر یہ کیوں نہیں طے کر لیتے کہ سب لوگ ایک خدا کو مانیں اُس کی سچّے دل سے عبادت کریں ۔ اور اپنے اپنے مذہب پر

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ

اور اسی طرح (پہلی کتابوں کی مصدق بناکر) ہم نے تجھ پر یہ مکمل کتاب (یعنی قرآن کریم) اُتاری ہے۔ پس وہ لوگ جن کو ہم نے

الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ

یہ کتاب دی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ان لوگوں سے (یعنی اہل کتاب میں) سے بھی بعض اس پر ایمان لاتے ہیں۔

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا

اور ہماری آیتوں کا ضد کے ساتھ انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔ ۵۳۲ اور اس (یعنی قرآن) کے نازل

مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا

ہونے سے پہلے تو کوئی کتاب نہ پڑھتا تھا۔ نہ لوگوں کو سُناتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔

قائم رہیں۔ میں نے کہا۔ مجھے یہ سوال سن کر بڑی خوشی ہوئی کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آج سے تیرہ سو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے ان جھگڑوں کے تصفیہ کا بھی طریق بتایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـــًٔـا (اٰل عمران ع ۷) یعنی اے اہل کتاب آؤ میں تمہیں ایک کلمہ پر جمع ہونے کا طریق بتاؤں۔ جو تمہارے نزدیک بھی مسلّمہ ہے اور ہمارے نزدیک بھی مسلّمہ ہے۔ وہ طریق یہ ہے کہ ہم سب ایک خدا کی عبادت کریں اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیں۔ تیرہ سو سال ہوئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ علاج بتایا تھا اور تمام اہل کتاب کو اس اصل کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ مگر تمہارے باپ دادا نے قرآن کریم کی اس دعوت کو قبول نہ کیا۔ پس بجائے ہم سے سوال کرنے کے تم اپنے باپ دادا کا شکوہ کرو۔ اور اپنے بزرگوں سے کہو کہ جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اتنی اچھی تعلیم پیش کی تھی تو تم نے اُسے قبول کیوں نہ کیا اور اپنا منہ کیوں پھیر لیا۔ بہرحال اس اتحاد کے نہ ہونے کا الزام اگر آتا ہے۔ تو تمہارے باپ دادا پر آتا ہے۔ ورنہ تیرہ سو سال سے قرآن کریم میں یہ بات موجود ہے اب اگر تمہیں کوئی شکوہ ہے تو اپنے باپ دادا سے شکوہ ہونا چاہیئے۔ ہم سے نہیں ہونا چاہیئے۔

۵۳۲ تفسیر:- فرمایا جس طرح موسیٰؑ پر تورات نازل ہوئی تھی۔ اسی طرح اب ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی ہے۔ گویا اس زمانہ میں تیرا وجود موسیٰؑ کا وہ طُور ہے۔ جہاں خدا بول رہا ہے۔ پس وہ خوش قسمت لوگ جن کو ہم نے یہ کتاب عطا فرمائی ہے یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیرو۔ وہ تو اس کتاب کے ایک ایک حرف کی صداقت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اور اُس کی سچائی کے ثبوت میں اپنی جانیں تک قربان کر رہے ہیں بلکہ اہل کتاب میں سے بھی بعض (کیونکہ مِنْ بعضیہ بھی ہوتا ہے) ایسے ہیں جو اس قرآن کو موسیٰؑ کی پیشگوئیوں کا مصداق سمجھتے ہوئے اُس پر ایمان لے آئے ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو یہود کے ایک بہت بڑے عالم تھے لیکن ایسے لوگ

لَارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۹﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ

اگر ایسا ہوتا تو جھٹلانے والے شُبہ میں پڑ جاتے۔ مگر یہ (قرآن) تو کھلی کھلی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے

صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ

دلوں میں جن کو علم دیا گیا ہے اور ہمارے نشانات

بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

کا ظالموں کے سوا کوئی انکار نہیں کرتا ۵۳۳

بھی ہیں جو جانتے بُوجھتے ہوئے محض ضد اور تعصب کی وجہ سے اس کا انکار کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اوّل درجہ کے ناشکر گذار ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کتاب نے دنیا میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے اور مُردہ دنیا میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے نشان کو دیکھنے کے باوجود انہوں نے صداقت کو قبول کرنے کی جرأت نہیں کی۔ پس یہ لوگ درحقیقت کافرِ نعمت ہیں اور ایسے ہی لوگ ہمارے روشن نشانات کی تکذیب کیا کرتے ہیں۔

۵۳۳ تفسیر:۔ اس آیت کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہاں صرف تلاوت کی نفی مقصود نہیں بلکہ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً[1] کی تشریح کی گئی ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ آپ نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے یعنی ظاہری علوم سے آپ قطعی طور پر ناواقف تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انکار کرنے والے شبہ میں پڑ سکتے تھے کہ شاید دوسری کتابوں سے اس نے علم حاصل کر لیا ہے۔ مگر اب تو اُن کے لیے اس قسم کے شبہ کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ تلاوت درحقیقت دو طرح ہوتی ہے۔ ایک کتاب کو دیکھ کر اور دوسرے کسی بات کو دہرانے سے خواہ وہ دہرانے والا نابینا یا اَن پڑھ ہی کیوں نہ ہو اگر ایک اَن پڑھ آدمی جس نے قرآن کریم کا کچھ حصہ زبانی یاد کیا ہوا ہو۔ قرآن کریم پڑھے تو وہ بھی تلاوت کہلاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی نابینا شخص قرآن کریم یاد کر لے اور پھر قرآن کریم پڑھے۔ تب بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن کریم کی تلاوت کی۔ چنانچہ امامُ الصلوٰۃ جو روزانہ نمازوں میں تلاوت کرتے ہیں۔ وہ قرآن کریم کو دیکھ کر تلاوت نہیں کرتے۔ بلکہ جو کچھ انہیں یاد ہوتا ہے اُسے پڑھ دیتے ہیں۔ پس مِنْ كِتٰبٍ کہہ کر دونوں طرح کی تلاوت کی نفی کر دی گئی ہے اس تلاوت کی بھی جو کتاب کو دیکھ کر کی جاتی ہے اور اس تلاوت کی بھی جو زبانی کی جاتی ہے۔

کتاب کا لفظ قرآن کریم میں صرف ایک جگہ خط کیلئے استعمال ہوا ہے۔ ورنہ عام کتابوں کے لئے قرآن کریم میں کتاب کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا۔ کتاب کے لفظ کا استعمال ہمیشہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتابوں کے متعلق ہی کیا جاتا ہے۔ پس

---

[1] سورۃ بیّنہ آیت ۳

مِنْ کِتَابٍ سے مراد مِنَ الْکُتُبِ السَّمَاوِیَّۃِ ہے۔ یعنی کُتبِ سماویہ میں سے آپ نے کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی یہ ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے مخالفین کہہ دیا کرتے تھے کہ آپ تورات اور انجیل کی باتیں دوہرا دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ مجھے یہ الہام ہوا ہے۔ بلکہ اب تک عیسائی بھی یہی اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ اُن کے اِس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ منکرین کہتے ہیں هِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلًا۔ اسے صبح شام لوگ تورات کی آیتیں سُناتے ہیں۔ جنہیں یہ دوہرا دیتا ہے۔ یعنی ہماری کتابوں سے چُرا چُرا کر یہ باتیں بیان کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہمارا یہ رسول اُمیّوں میں رہتا ہے اور اُن سے سارا دن باتیں کرتا رہتا ہے مگر شام تک تو یہ تورات اور انجیل کے کسی واقعہ کا ذکر نہیں کرتا۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ صبح کو اُٹھتا ہے تو اِن کتابوں کے واقعات دوہرانا شروع کر دیتا ہے اور دوہراتا بھی اِس شان سے ہے کہ تورات اور انجیل کے تمام غلط واقعات کی تصحیح کرتا چلا جاتا ہے۔ اور جن واقعات کو بائبل نے ترک کر دیا ہے اُن کو بیان کر دیتا ہے۔ گویا وہ تورات کی نقل نہیں کرتا بلکہ تورات کی خامیوں کی اصلاح کرتا اور پھر اس گرد و غبار کو بھی دُور کرتا ہے جو مرورِ زمانہ کی وجہ سے یہود اور نصاریٰ کے ہاتھوں انبیاء کے مقدّس چہروں پر پڑ گئی تھی۔ پھر بعض مسائل تورات کے ایسے بھی تھے جن کو اُس وقت خود یہودی بھی نہیں جانتے تھے۔ مثلاً احادیث میں لکھا ہے کہ مدینہ کے یہودی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک آدمی کو لے کر آئے جس پر زنا کا الزام تھا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن سے پُوچھا کہ تورات میں زانی کے لئے کیا سزا ہے؛ وہ کہنے لگے ہمارے ہاں تو اس کا کوئی ذکر نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ نکالو تورات۔ انہوں نے تورات کھولی۔ تو اتفاق کی بات ہے کہ وہی صفحہ نکلا جس میں زانی کے لئے رجم کا حکم تھا۔ ایک یہودی نے جلدی سے اسجگہ اپنا ہاتھ رکھدیا۔ لیکن حضرت عبد اللہ بن سلام نے دیکھ لیا اور انہوں نے اُس سے کہا کہ اپنا ہاتھ اُٹھاؤ اُس نے ہاتھ اُٹھایا تو نیچے زانی کے لئے رجم کا حکم موجود تھا۔ جب اس قسم کے موٹے موٹے مسائل سے بھی اکثر یہود ناواقف تھے تو اُن کے متعلق یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ باریک مسائل کے متعلق علم رکھتے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ علوم اُن سے حاصل کرتے تھے۔ بلکہ حدیثوں سے تو یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تورات پڑھنی شروع کی تو آپؐ سخت ناراض ہوئے (مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) ایسی صورت میں یہ خیال بھی کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آپؐ یہودی علماء سے تورات کی باتیں معلوم کیا کرتے تھے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دشمنوں کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور فرمایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ لوگ جھوٹا الزام لگاتے ہیں کہ آپؐ نے تورات اور انجیل پڑھ کر یہ باتیں معلوم کر لی ہیں آپؐ کے لئے تو تورات اور انجیل پڑھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آپؐ اُمّی اور اَن پڑھ تھے۔ اور اگر بالفرض آپؐ نے وہ کتابیں پڑھی ہوتیں تو اُن کے واقعات کے متعلق ضروری تھا کہ آپؐ دوسروں سے باتیں بھی کرتے۔ آخر جب کوئی شخص علم حاصل کرتا ہے تو وہ ایک دو دن میں ہی اُس کے تمام مسائل سے واقف نہیں ہو جاتا بلکہ وہ سال دو سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک پڑھنے کے بعد اس کے مسائل کے متعلق واقفیت حاصل کرتا ہے۔

اور پھر جو علم وہ حاصل کرتا ہے اُس کے متعلق دوسرے لوگوں سے گفتگو بھی کرتا ہے۔ لیکن تم جانتے ہو ہمارے اِس رسولؐ نے اِس سے پہلے کسی سے اس قسم کی باتیں نہیں کیں پھر اب جو یکدم اس قسم کی باتیں کرنے لگ گیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ باتیں اُسے کسی ایسی ہستی نے بتائی ہیں جو تمام دنیا کے عالموں سے زیادہ علم رکھنے والی ہے۔ ورنہ ہمارا یہ رسولؐ تو اپنی زبان میں لکھی ہوئی کتاب بھی نہیں پڑھ سکتا۔ کسی دوسری زبان میں لکھی ہوئی کتاب کس طرح پڑھ سکتا ہے۔

پس یہاں مِنْ کِتٰبٍ سے مراد کتبِ سماویہ ہیں اور خدا تعالیٰ مخالفینِ اسلام کو اِس طرف توجہ دلاتا ہے کہ ہمارا یہ رسول تم میں ہی رہتا ہے کیا اس کو کبھی کسی نے تورات یا انجیل کے متعلق باتیں کرتے دیکھا۔ اگر نہیں تو پھر کس طرح ایک ہی رات میں اُس نے اِن کتابوں کو پڑھ لیا۔ اور ایک ہی رات میں غیر زبان سیکھ لی۔ اور اِن کتابوں کے سارے مضامین ازبر کر لئے۔ اگر ایسا ہوا ہے تو یہ بھی تو ایک معجزہ ہے۔ مگر یہ تو اِن کتابوں سے بالکل ناواقف تھا۔ اُس نے کبھی ان کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کی۔ پھر سوچنے والی بات یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تورات پڑھنی کس سے تھی۔ مکہ میں صرف ایک ہی شخص ورقہ بن نوفل تھے جو تورات کے بعض حصے عبرانی سے عربی میں نقل کیا کرتے تھے۔ مگر ساری تورات وہ بھی نہیں جانتے تھے۔ دعویٰ کرنے کے بعد جب آپؐ نے دیکھا کہ بعض لوگ تورات پڑھتے ہیں تو آپؐ نے اُنکو منع فرما دیا تاکہ اُن پر قرآن کریم اور تورات کے مسائل مختلط نہ ہو جائیں۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ کوئی مسئلہ تورات میں ہو اور وہ اُس کے متعلق یہ خیال کرلیں کہ یہ قرآن کریم میں ہے۔ یا کوئی مسئلہ قرآن کریم میں ہو اور وہ اس کے متعلق یہ سمجھیں کہ یہ تورات میں ہے۔ اس لئے آپ نے تورات کے پڑھنے سے منع فرما دیا۔ اِسی طرح حدیثوں کے لکھنے سے بھی منع فرما دیا۔ کیوں کہ اُسوقت قرآن کریم اُتر رہا تھا۔ اور خطرہ تھا کہ دوسری باتیں اِس میں مخلوط نہ ہو جائیں۔

وَلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِکَ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ جس کتاب کی تلاوت کی نفی کی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُسے لکھا بھی نہیں کرتے تھے۔ یہ نفی بھی عام ہے۔ یعنی کُتبِ سماویہ میں سے کوئی کتاب آپ لکھا بھی نہیں کرتے تھے۔ یہ نفی اِس لئے بھی ضروری تھی کہ ممکن تھا کوئی شخص یہ خیال کر لیتا کہ ورقہ بن نوفل نے جسقدر تورات کا ترجمہ کیا تھا شاید اُسی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل کر لیا ہو۔ کیونکہ بعض دفعہ انسان گو مضمون نہیں سمجھتا مگر نقل کرتا جاتا ہے۔ جیسے کاپی نویس بعض دفعہ مضمون نہیں سمجھتے مگر نقل کر لیتے ہیں۔ اور جو شخص اس طرح نقل کرے وہ کچھ نہ کچھ حروف سمجھ بھی جاتا ہے۔ مثلاً مجھے عبرانی نہیں آتی لیکن بعض الفاظ جو عربی سے ملتے جلتے ہیں سمجھ آجاتے ہیں۔ جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کا قول ہے۔ "ایلی ایلی لما سبقتانی" یہ عبرانی زبان کے الفاظ ہیں مگر عربی کے ساتھ ملتے ہیں اور ان کا عربی زبان میں یہ مفہوم ہے کہ اِلٰھِیْ اِلٰھِیْ لِمَ تَرَکْتَنِیْ خَلْفًا وَذَھَبْتَ اَمَامًا۔ سَبَقَ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ کوئی شخص آگے نکل جائے اور اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ جائے گویا سَبَقْتَنِیْ کے معنے تَرَکْتَنِیْ کے ہیں۔ اب گو میں عبرانی نہیں جانتا لیکن چونکہ میں عربی جانتا ہوں۔ اِس لئے ایسے الفاظ کو آسانی سے سمجھ سکتا ہوں۔ تو اللہ تعالےٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق تنزل کے طور پر فرمایا کہ تُو تو اِن کتابوں کو نقل بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اِس طرح تجھے کچھ نہ کچھ معلوم ہو جاتا۔ تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِکَ سے ایسا ہی لکھنا مراد ہے جیسے کاتب بے سوچے سمجھے لکھ دیتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا

اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی نشانات نہیں اُترے۔ کہو کہ نشانات تو خدا کے

الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۱﴾ اَوَلَمْ

پاس ہیں (جب وہ فائدہ دیکھتا ہے اُتارتا ہے) اور میں تو ایک کھلا کھلا ہوشیار کرنے والا ہوں۔ کیا اُنکے لئے

يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ

(یہ نشان) کافی نہ تھا کہ ہم نے تجھ پر ایک کمل کتاب (یعنی قرآن) کو نازل کیا جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ ع

اِس امر میں مومنوں کے لئے تو بڑی رحمت اور نصیحت کے سامان ہیں۔ ۵۳۴

ع ۵ / ۱

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ میں بتایا کہ اس قرآن میں ایسی تعلیم ہے کہ آسمانی علم والے لوگ فوراً اسے اپنے دلوں میں محسوس کرنے لگتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ صرف ظالم ہی اس کا انکار کرتے ہیں۔ یعنی اگر یہ خدائی کلام نہ ہوتا تو خشیۃ اللہ رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں اس کے ذریعہ سے علم و عرفان کے چشمے کیوں پھوٹ پڑتے۔ یہ بات تو صرف الٰہی تائید سے ہوتی ہے اور تائید الٰہی اُسی کلام کو حاصل ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے ہو۔ غرض اس آیت میں اس اعتراض کا ردّ کیا گیا ہے جو بالعموم دشمنانِ اسلام کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات اور انجیل کو پڑھ پڑھ کر یا لوگوں سے سُن سُن کر یہ باتیں قرآن میں درج کرلی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن کریم میں تو ایسے علوم ہیں جو پہلی کتابوں میں ہیں ہی نہیں۔ اور جب وہ ان علوم سے خالی ہیں تو نقل کیسے ہوگئی۔ مخالفین کا فرض ہے کہ وہ پہلے یہ ثابت کریں کہ اُن کی کتابوں میں یہ مضمون موجود تھے لیکن جب اُن کی کتابیں ان تمام حقائق و معارف سے خالی ہیں جو قرآن کریم نے بیان کئے ہیں تو یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری کتابوں سے یہ باتیں اخذ کی ہیں سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

۵۳۴ تفسیر: فرمایا۔ ظالم لوگ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشان کیوں نہیں اُترے۔ اے محمد رسول اللہ! تو ان سے کہدے کہ تمہارے نزدیک تو نشان سے مراد نشانِ عذاب ہی ہوتا ہے اور ایسے نشان بھی خدا کے پاس موجود ہیں۔ مگر میرا کام تو صرف ہوشیار کرنا ہے۔ اور پھر سوال یہ ہے کہ کیا اِن لوگوں کے لئے یہ نشان کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر ایک مکمل کتاب اُتاری ہے جو ان کے لئے اپنے اندر رحمت کا بڑا بھاری سامانِ ہدایت رکھتی ہے۔

فرماتا ہے اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ ارے اب بھی ان کو کسی اور جگہ جانے کی ضرورت ہے جبکہ ہم نے انہیں اتنی بڑی

چیز دے دی ہے جس کی اور کہیں مثال ہی نہیں ملتی یعنی ہم نے ایک کامل کتاب اتار دی ہے اور وہ ایسی کتاب ہے کہ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۔ سمندر کے پاس تو لوگ جاتے ہیں۔ مگر یہ سمندر ایسا ہے کہ آپ تمہارے پاس چل کر آ گیا ہے۔ پھر دُنیا میں تو لوگ اُستادوں کے پاس جاتے اور اُن سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں بتایا جائے کہ فلاں بات کس طرح ہے۔ مگر یہاں وہ اُستاد بھیجا گیا ہے کہ جسے خدا کی طرف سے یہ حکم ہے کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (مائدہ ع۱۰) تم خود لوگوں کے پاس جاؤ اور انہیں یہ تمام باتیں پہنچاؤ۔ اور یاد رکھو کہ اگر تم نے اِن میں سے ایک بات بھی نہ پہنچائی تو ہم کہیں گے کہ تم نے کچھ بھی نہیں پہنچایا۔ گویا ہمارا اُستاد اور ہمارا آقا خود ہمارے گھروں پر چل کر آ گیا ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً ۔ اگر تم سوچو تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے اپنے رسولؐ کو جو یہ حکم دیا ہے یہ تم پر ہمارا اتنا عظیم الشان انعام ہے جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نام بھی قرآن کریم میں رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ رکھا گیا۔ گویا پنجابی کی وہی مثال یہاں صادق آ رہی ہے کہ "چوپڑیاں تے دو دو" یعنی روٹیاں گھی سے چپڑی ہوئی بھی ہوں اور پھر ملیں بھی دو دو۔ تو کیا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے کہ ہم تمہیں ایک تو چپڑی ہوئی روٹیاں دے رہے ہیں اور پھر دو دو دے رہے ہیں۔ ایک تو ہم نے وہ کتاب دی جو ہر طرح کامل اور مکمل ہے اور جس کی نظیر کسی اور الہامی کتاب میں نہیں مل سکتی اور پھر اپنے رسول کو یہ حکم دے دیا ہے کہ جاؤ اور ہماری کتاب خود لوگوں کے گھر پہنچ کر انہیں سُناؤ۔ اور اس کی تعلیموں سے انہیں آگاہ کرو۔

وَ ذِكْرٰى ۔ ایک نعمت تو یہ تھی کہ اتنی عظیم الشان نعمت گھر بیٹھے مل گئی۔ اور دوسری نعمت یہ ہے کہ جو اس کتاب کو مان لیں گے دنیا میں اُن کی عزت قائم کر دی جائیگی بعض لوگ اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں نصیحت کی باتیں ہیں۔ یہ معنے بھی درست ہیں مگر اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ جو لوگ اس کتاب پر سچے دل سے ایمان لائینگے اُن کا ذکر نیک دنیا میں جاری رہے گا۔ اور کہا جائیگا کہ فلاں نے یہ خدمت کی اور فلاں نے وہ خدمت کی۔ گویا یہ کتاب نہ صرف ذاتی کمالات کے لحاظ سے ایک شرف اور عظمت رکھتی ہے بلکہ جو لوگ اس پر صدق دل سے ایمان لائیں گے وہ بھی دنیا میں معزز اور مکرم ہو جائینگے اور چونکہ یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے کس طرح کافی ہو سکتا ہے جبکہ ہر زمانہ اپنے ساتھ نئی ضروریات لاتا اور نئے تغیرات پیدا کرتا ہے۔ اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرما دیا کہ قرآن کریم کے سات بطن ہیں۔ عام طور پر لوگوں نے اس حدیث کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مختلف زمانوں کے تغیرات کے مطابق قرآن کریم کی آیات کے معنے کھلتے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے لوگوں کو قرآن کریم کی کئی آیات کے وہ معنے نظر نہ آئے جو بعد میں تغیر آنے والے زمانہ کے لوگوں کو نظر آئے۔ اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کریم کے جو نکات اور معارف نکالے وہ قرآن کریم میں نئی آیات داخل کر کے نہیں نکالے آیات وہی تھیں ہاں آپ پر اس زمانہ کے مطابق اُن کا بطن ظاہر ہوا۔ چونکہ زمانہ کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اور موجودہ زمانہ مذہب کے متعلق امن اور صلح کا زمانہ تھا اس لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے قرآن کریم سے امن کے احکام اور صلح کی تعلیم پیش فرمائی اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۔ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۔ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ۔

یعنی تجھے اِس لئے نہیں بھیجا گیا کہ تُو لوگوں سے جبری طور اپنا مذہب منوائے ۔ نہ ہم نے اُن پر جبر کرنے کے لئے بھیجا ہے جو مُنہ پھیر لیتے ہیں اور کفر اختیار کرتے ہیں۔ اِن لوگوں کو سزا دینا خدا کا کام ہے تیرا کام نہیں۔ کیونکہ خدا دلوں کے حالات کو جانتا ہے تو نہیں جانتا۔

یہ دوسرا بطن تھا جو اس زمانہ کے حالات کے مطابق آپ پر کھولا گیا۔ اور اسلام کی تائید میں تلوار اٹھانے سے منع کیا گیا۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ قرآن کریم کے سات بطن ہیں اس کے ایک معنے یہ ہیں کہ دُنیا میں سات بڑے بڑے تغیرات آئیں گے اور ہر تغیّر کے زمانہ میں لوگوں کے ذہن بدل جائیں گے۔ اُسوقت خدا تعالیٰ قرآن کریم کے ایسے معنے کھول دیگا جو لوگوں کے اُس وقت کے ذہنوں اور قلوب کو تسلّی دینے والے ہونگے۔ اِس زمانہ میں بیسیوں مسائل ایسے رنگ میں کھلے ہیں کہ پہلے اُن کی ضرورت اور اہمیت محسوس نہیں کی جا سکتی تھی۔ مثلاً آیات قرآنی کے نسخ کا مسئلہ ہے۔ پہلے ایسے وقت میں نسخ کا سوال پیدا ہوا کہ اُسوقت کے لوگوں کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ کیونکہ اُن کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل تھا۔ پس باوجود نسخ کے عقیدہ کے یہ بات قرآن کریم کی سچائی کے معلوم کرنے میں روک نہ بن سکتی تھی۔ لیکن جب ایسا زمانہ آیا کہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے دُور ہوئے اور دُنیا کے ذہنی اور علمی تغیّر کے مطابق قرآن کریم کی آیات کے معنے نہ کر سکے تو کہنے لگے یہ آیت بھی منسوخ ہے اور وہ آیت بھی منسوخ ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کھڑا کیا اور آپ نے ثابت کیا کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ان معنوں میں منسوخ نہیں ہے کہ اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اور جن آیات کو منسوخ قرار دیا جاتا تھا اُن کے ایسے معنے بیان فرمائے جنہیں لوگوں کی عقلیں بآسانی قبول کر سکتی ہیں۔ یہ اِن آیات کا دوسرا بطن تھا جو خدا تعالیٰ نے آپ پر کھولا۔

تو قرآن کریم کے سات بطن سے مُراد سات عظیم الشان ذہنی اور عقلی اور علمی تغیرات ہو سکتے ہیں اور اِس میں بتایا گیا ہے کہ ہر ایسے تغیّر میں قرآن کریم قائم رہیگا اور کوئی یہ نہیں کہہ سکیگا کہ ہمارے زمانہ کی ضروریات کو قرآن پورا نہیں کرتا۔ باقی الہامی کتابیں تو ایسی ہیں کہ جن کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب زمانہ بدلا اور دنیا میں تغیّر آیا تو اِن کُتب میں جو کلام تھا اس کے وہ معنے نہ نکلے جو اُس زمانہ کے ذہنوں کے مطابق ہوتے۔ اس لئے وہ قابلِ عمل نہ رہیں مگر قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جُوں جُوں دُنیا میں تغیّر آتے جائیں گے اور لوگ قرآن پڑھیں گے اُس زمانہ کی ضروریات کو پورا کرنے والا مفہوم اِس میں سے نکلتا آئیگا اور لوگ تسلیم کریں گے کہ ہاں قرآن کریم ہی اِس زمانہ کیلئے بھی کافی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اِس زمانہ کے لئے بھی رسول ہیں۔

پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ قرآن کے سات بطن ہیں اس سے ضروری نہیں کہ یہی مُراد ہو کہ سات ہی بطن ہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ دس۔ بیس پچاس سو ہزار دو ہزار بطن ہوں۔ کیونکہ عربی زبان میں سات کا عدد کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کے معنے یہی ہیں کہ خدا تعالےٰ نے انسانی ترقیات کے لئے ہزاروں بلندیاں پیدا کی ہیں۔ غرض فرمایا کہ قرآن کریم کو ہم نے ایسا بنایا ہے کہ یہ ہر زمانہ کے لئے کافی ہوگا۔ اِس میں ہر زمانہ کے خیالات پر بحث موجود ہوگی۔ اگر اس زمانہ کے لوگوں کے خیالات غلط ہونگے تو اُن کی تردید کی جائے گی اور اگر صحیح ہونگے تو تائید کی جائے گی۔

درحقیقت قرآن کریم میں یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ جب وہ کوئی مضمون لیتا ہے تو اس کے تمام متعلقہ مضامین کو اُس کے نیچے تہ بہ تہ جمع کر دیتا ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح

زمین کے طبقات ہوتے ہیں - اوپر کے طبقہ میں اور قسم کی مٹی ہوتی ہے - دوسرے طبقہ میں اور قسم کی مٹی ہوتی ہے - تیسرے طبقہ میں اور قسم کی مٹی ہوتی ہے - اور جب ہم کسی زمین کو دیکھتے ہیں تو اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ زمین اچھی پیداوار دینے والی ہے - یا بُری پیداوار دینے والی ہے - یہ کنکریلی زمین ہے یا اُس میں عمدہ لیسدار مٹی پائی جاتی ہے اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس میں فصل اچھی ہو گی یا خراب ہو گی. مکان اچھے تعمیر ہونگے یا خراب ہونگے - بنیادیں گہری کھودنی پڑیں گی یا تھوڑی - عمارت کئی منزلوں کی بن سکیگی یا یہ زمین زیادہ بوجھ برداشت نہیں کر سکیگی - لیکن ایک ماہرِ فن اِس زمین کو کھودے گا تو کہہ دیگا کہ اِتنے گز زمین کھودنے کے بعد پتہ لگتا ہے کہ اتنے ہزار سال پہلے اسجگہ پانی ہوتا تھا اور وہ اپنے اندر فلاں قسم کے جانور اور حیوانات رکھتا تھا - پھر وہ چند گز اور مٹی کھودے گا اور اس زمین سے جسکو سرسری طور پر دیکھ کر ہم نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ اِس میں فصل زیادہ ہو گی یا کم - عمارت کئی منزلوں والی بن سکے گی یا نہیں - وہ ماہرِ فن یہ نتیجہ نکالے گا کہ فلاں فلاں وقت میں اِس زمین میں یہ یہ تبدیلیاں اندرونی آگ یا گرمی کی وجہ سے پیدا ہوئیں یا دھاتوں نے پگھل پگھل کر اس کے اندر یہ یہ تغیرات پیدا کر دیئے - اِسی طرح وہ نیچے چلتا چلا جائیگا اور تاریخ کے مختلف زمانے بیان کرتا چلا جائیگا - وہ شخص اس زمین کو دیکھ کر دو دو تین تین ہزار تک کے واقعات بیان کر دے گا اور یہ سب چیزیں زمین کے اندر مخفی ہونگی - یہی حال قرآن کریم کا ہے - اس کے مطالب بھی الفاظ کی تہوں کے نیچے چھپے ہوئے ہوتے ہیں - اگر زمین کی سب چیزوں کو باہر نکال کر پھیلا دیا جائے تو انسان کا زمین پر چلنا پھرنا مشکل ہو جائیگا - لیکن چونکہ وہ سب چیزیں زمین کے اندر تہ بہ تہ رکھی ہوئی ہیں اس لئے ہم اُس کے اوپر چلتے پھرتے ہیں - لیکن جب اُسے کھودتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

مثلاً اُس کے اندر چونے کی چٹانیں ہیں - اگر وہ چونے کی چٹانیں باہر نکال کر سطح پر پھیلا دی جائیں تو کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ یہاں آبادی ہو سکتی تھی - یہ جگہ بجائے آدمیوں کے چٹانوں سے بھری ہوئی ہوتی - اِسی طرح وہ سب مطالب جو قرآنی الفاظ کی تہوں میں چھپے ہوئے ہیں اگر باہر نکال لئے جاتے اور ظاہری الفاظ میں انہیں بیان کیا جاتا تو جیسے اس زمین کی اندر کی چیزیں اگر باہر آ جائیں تو وہ چیزیں پھیل کر سینکڑوں میل کا علاقہ رُک جاتا - اِسی طرح قرآن کریم بھی اِتنا پھیل جاتا کہ کوئی انسان اسے پڑھ نہ سکتا - اور یہ کتاب نہ رہتی بلکہ ایک عظیم الشان لائبریری ہو جاتی اور اس میں ہزاروں کُتب رکھی ہوئی ہوتیں - ایک نسلِ انسانی کہہ دیتی کہ ہم نے اس کے پانچسو صفحات پڑھے ہیں - دوسری کہتی ہم نے اس کے ایک ہزار صفحات پڑھے ہیں - لیکن اب قرآن کریم ایک چھوٹی سی کتاب کی شکل میں ہے اور زمین کی طرح اُسکی ایک تہ کے نیچے ایک مضمون ہے - دوسری تہ کے نیچے دوسرا مضمون ہے - تیسری تہ کے نیچے تیسرا مضمون ہے اور اس طرح تھوڑے سے الفاظ میں ہزاروں مضامین بیان کر دیئے گئے ہیں - حفظ کرنے والے اِسے آسانی سے حفظ کر سکتے ہیں اور پڑھنے والے اِسے جلدی جلدی پڑھ لیتے ہیں - اِسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ یعنی اس کے اندر تمام ایسی تعلیمیں پائی جاتی ہیں جو قیامت تک کام آنے والی ہیں - اور کوئی ایسی تعلیم جو دائمی ہو اس سے باہر نہیں رہی - اِسی شان اور عظمت کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا ایک نام قرآن مجید بھی رکھا اور دنیا میں یہ اعلان فرما دیا کہ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (لقمن ع ۳) یعنی زمین میں جس قدر درخت دکھائی دیتے ہیں اگر ان تمام کو کاٹ کاٹ کر

قلمیں بنا لیا جائے اور سمندر سیاہی بنا دیا جائے اور پھر
دو سات سمندروں کا پانی بھی سیاہی بنا دیا جائے اور ان
قلموں اور سیاہی سے اللہ تعالیٰ کے کلمات لکھے جائیں
تو دنیا بھر کے درختوں اور باغات کے درختوں کی قلمیں ٹوٹ
جائیں گی اور ساتوں سمندروں کی سیاہی ختم ہو جائے گی
مگر قرآنی سمندر پھر بھی بھرا ہوا ہی دکھائی دیگا اور اس کے
معارف کبھی ختم ہونے میں نہیں آئیں گے۔ کیونکہ جس طرح
خدا مجید ہے اسی طرح یہ قرآن بھی مجید ہے (البروج ۲۲)
اور بڑی شان اور عظمت کا کلام ہے۔ دنیا پر کوئی زمانہ
ایسا نہیں آ سکتا جس میں قرآن مجید لوگوں کی راہنمائی کرنے
سے قاصر ہو۔ وہ ہر زمانہ میں ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا
اور مخالفینِ اسلام کی آنکھوں کو اپنی چمک سے خیرہ کر دیتا
ہے۔ وہ تورات اور ژند اوستا اور وید کی طرح ایک
مُردہ کتاب نہیں جو ہر زمانہ کی مشکلات کا حل پیش کرنے سے قاصر
ہو بلکہ وہ ایک زندہ کتاب ہے جس سے ہر زمانہ میں
زندگی کا تازہ سامان لوگوں کو میسر آ سکتا ہے اور وہ
معارف اور حقائق کا ایک ایسا خزانہ ہے جو کبھی ختم ہونے
میں نہیں آ سکتا۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں میں جہاں اور بہت
سی خرابیاں پیدا ہوئیں وہاں انہوں نے اس قرآنی حسن سے
بھی اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ تفسیر
بیضاوی اور جلالین وغیرہ میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے
اب اس سے زیادہ کوئی بات بیان کرنا حرام ہے۔ انہوں
نے یہ نہ سمجھا کہ یہ کلام ایک مجید خدا کا نازل کردہ ہے
جو خود بھی بڑی شان اور بزرگی کا حامل ہے اور جس طرح
قانونِ قدرت کے خزانے کبھی ختم نہیں ہوتے اسی طرح
کلام الٰہی کے خزانے بھی کبھی ختم نہیں ہوتے۔ دنیا میں کوئی
زمانہ ایسا نہیں گذرا جب ایجادیں ختم ہو گئی ہوں۔ ریل
نکلی تو کہا گیا اب کوئی چیز اس سے زیادہ کیا نکلے گی۔
اُس وقت ریل پندرہ میل فی گھنٹہ چلتی تھی۔ پھر
تیس میل فی گھنٹہ چلنی شروع ہو گئی۔ پھر ۳۵ میل فی گھنٹہ
چلنی شروع ہو گئی۔ پھر چالیس میل فی گھنٹہ چلنی شروع ہو
گئی۔ پھر پچاس میل فی گھنٹہ چلنی شروع ہو گئی۔ پھر
ساٹھ میل فی گھنٹہ چلنی شروع ہو گئی۔ حتّٰی کہ اب ۷۵ میل
فی گھنٹہ تک ریل چل سکتی ہے۔ اس کے بعد موٹر نکل آئی۔
پہلے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ وہ سمجھتے
تھے کہ ریل تو لوہے کی پٹڑی پر دوڑتی ہے مگر موٹر کیسے
دوڑے گی۔ پھر ریل کے انجن میں کوئلہ ڈالا جاتا ہے۔ پانی
ڈالا جاتا ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مزید کوئلہ اور
پانی ڈالا جاتا ہے اور اس کوئلے اور پانی سے بھاپ بنتی ہے
جس سے ریل چلتی ہے لیکن یہ موٹر کیسے چلے گی لیکن موٹریں
ایجاد ہوئیں اور لوگوں نے خیال کیا کہ اس سے بڑھ کر اور
کیا چیز ہو گی؟ پھر کاریں آ گئیں۔ تو لوگوں نے خیال کیا
یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ پہلے پہل جو کار آئی تھی وہ بڑی
اونچی اور بے ڈول سی تھی اُس سے بڑی آواز پیدا ہوتی
تھی اور جھٹکے لگتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ کار نیچی ہونی شروع
ہوئی۔ پھر جھٹکے کم لگنے شروع ہوئے۔ پھر سلنڈر بڑھنے
شروع ہوئے تو آواز کم ہونے لگی اور آہستہ آہستہ آواز
اتنی کم ہو گئی کہ اب کار پاس سے گذرے تو معلوم بھی
نہیں ہوتا۔ صرف سڑک کے ساتھ لگنے سے جو آواز پیدا
ہوتی ہے وہی آتی ہے۔ پھر لوگوں نے خیال کیا کہ اس سے
بڑھ کر اور کیا ایجاد ہو گی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہوائی جہاز
نکل آئے۔ پہلے ایسے ہوائی جہاز نکلے جو صرف پچاس ساٹھ
میل چل کر پرواز ختم کر دیتے تھے۔ پھر سو ڈیڑھ سو میل
تک چلنے والے جہاز نکلے۔ جب پہلی جنگ عظیم ہوئی تو
سو ڈیڑھ سو میل کی رفتار پر بھی لوگ حیران ہوئے تھے لیکن
اب ایسے جہاز نکل آئے ہیں جو چھ چھ سو میل فی گھنٹہ کی
رفتار سے اُڑان کرتے ہیں بعض ایسے ہیں جو ایک ہی دفعہ
پٹرول لے کر چھ چھ ہزار میل چلے جاتے ہیں۔ پھر گویا

نکل آئیں ۔ پہلے بندوقیں ایجاد ہوئیں جن میں ایک ایک گولی بھری جا سکتی تھی ۔ لیکن بعد میں رائفلیں ایجاد ہوئیں جن میں سات سات دس دس گولیاں بھری جاتی ہیں ۔ پھر مشین گنیں نکل آئیں جن کی چرخی پر سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو گولیاں چڑھا دی جاتی ہیں ۔ پھر برین گنیں نکل آئیں جو تین تین میل تک گولی پھینکتی ہیں ۔ اور ایک منٹ میں تین تین سو چار چار سو فائر کر دیتی ہیں ۔ پھر ایسی توپیں نکل آئیں جو چلتے ہوئے ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کو بھی تباہ کر سکتی ہیں ۔ پھر بم نکلا اور بم پھینکنے سے صرف قریب کے لوگوں کو نقصان پہنچایا جا سکتا تھا لیکن بعد میں ایسی رائفلیں نکل آئیں جن کے ساتھ وہی بم دُور تک پھینکا جا سکتا تھا ۔ پھر توپوں کے ساتھ پھینکنے والے بم ایجاد ہوئے پھر ایٹم بم نکلا جو حجم کے لحاظ سے چھوٹے سائز کا ہوتا ہے ۔ لیکن نقصان پہنچانے میں دوسرے بموں کو مات کر گیا ہے ۔ اور میلوں تک اثر کرتا ہے ۔ اب H بم نکلا ہے اور کوبلٹ بم کے متعلق بھی معلوم کر لیا گیا ہے کہ وہ تیار کیا جا سکتا ہے ۔ پھر پہلے کوئی آدمی خندق میں چھپ جاتا تھا تو وہ بم کے اثرات سے بچ سکتا تھا ۔ لیکن اب ایسے ذرائع معلوم کر لئے گئے ہیں کہ جن کی وجہ سے بموں کی گرمی اور اثر سال سال تک باقی رہتا ہے ۔ اور خندق میں چھپا ہوا آدمی جب بھی نکلے گا موت کا شکار ہو جائیگا ۔ غرض دنیا میں نت نئی ایجادیں ہوتی چلی جاتی ہیں پھر کیا خدا کا کلام ہی اتنا کمزور تھا کہ اس میں سے نئی چیزیں نہ نکل سکتیں ۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آکر لوگوں کو بتایا کہ کلامِ الٰہی کے خزانے ختم نہیں ہو گئے بلکہ جس طرح قانونِ قدرت کے خزانے ختم نہیں ہوتے اسی طرح کلامِ الٰہی کے خزانے بھی ختم نہیں ہوتے ۔ اور یہ خیال کر لینا سخت حماقت ہے کہ کوئی شخص اس کے نئے مطالب بیان نہیں کر سکتا ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق اس کے نئے نئے معانی اور مطالب نکلتے آئیں گے کیونکہ یہ مجید خدا کا نازل کردہ کلام ہے جو كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کا مصداق ہے ۔ جب نئے معنوں میں یہ چیزیں پائی جاتی ہوں کہ قرآنی آیات اُن کی مصدق ہوں ۔ فطرتِ انسانی اُن کی تصدیق کرے اور پھر لغتِ عرب بھی اُن کے خلاف نہ ہو تو وہ ٹھیک ہونگے ۔ اگر اُن کو غلط کہا جائے تو یہ ایسی ہی بات ہو گی جیسے کسی بیوقوف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جنگ میں زخمی ہو گیا وہ بزدل تھا اُسے باوجود زخمی ہونے اور خون دیکھنے کے یہ شک تھا کہ شاید زخم نہیں ہوا ۔ وہ بھاگتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ یا اللہ یہ خواب ہی ہو ۔ یا اللہ ! یہ خواب ہی ہو ۔ اب یہ کتنی حماقت کی بات ہے کہ زخم ہو چکا ہے اور اس سے خون بہ رہا ہے ۔ مگر وہ کہتا جاتا ہے کہ یہ خواب ہی ہو ۔ اسی طرح قرآن کریم نے ہمیں چودہ سو سال پہلے سے بتا دیا ہے کہ قرآنی آیات کے نئے نئے معانی زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے نکلتے رہیں گے ۔ اگر وہ معنے لغتِ عرب کے مطابق ہیں اور دوسری قرآنی آیات اس کی مصدق ہیں یا کم از کم اُس کو رد نہیں کرتیں تو وہ غلط کیسے ہو سکتے ہیں ۔ ہم نے تو یہ دیکھنا ہے کہ آیا وہ معیار پر ٹھیک اُترتے ہیں یا نہیں ۔ مثلاً کیا وہ عقل کے خلاف تو نہیں ۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے خود فرماتا ہے کہ میں نے ہی عقل کو پیدا کیا ہے اور ایک ہی منبع سے نکلنے والی دو چیزیں متضاد نہیں ہو سکتیں ۔ پھر ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ وہ معنے دوسری قرآنی آیات کے خلاف نہ ہوں کیونکہ کلامِ الٰہی میں اختلاف نہیں ہو سکتا ۔ پھر یہ دیکھنا ہے کہ عربی لغت اُن کی تائید کرتی ہو ۔ کیونکہ قرآن کریم نے خود یہ بیان کیا ہے کہ وہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے پس لغتِ عربی اور دوسری آیات جن معنوں کی تائید کرتی ہوں وہ غلط نہیں ہو سکتے ۔ ورنہ اپنے طور پر قیاس

کر لینے سے تو اندھیر آجاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب "مِنَنُ الرَّحْمٰن" کتاب لکھی اور ثابت کیا کہ عربی زبان تمام زبانوں کی ماں ہے۔ تو یہ بات سُنکر بعض لوگ اِسی بات میں لگ گئے کہ وہ ہر لفظ کو قرآن کریم سے نکلا ہُوا ثابت کریں۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک دوست سے کسی نے پوچھا کہ کیا قرآن میں مرچوں کا ذکر بھی ہے۔ انہوں نے کہا۔ کیوں نہیں اَللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ میں مرجان مرچیں ہی تو ہیں۔ پھر ان دنوں ساؤتھ افریقہ میں لڑائی ہو رہی تھی۔ کسی نے پُوچھا کہ اس لڑائی کا قرآن کریم میں کہیں ذکر ہے تو انہوں نے کہا۔ قَوْمًا بُوْرًا میں یہی لوگ مُراد ہیں کیونکہ ساؤتھ افریقہ والوں کو بوئر کہتے ہیں۔ اِس قسم کے معنے کرنا جائز نہیں اگر اِس قسم کے معنے بیان کرنے شروع کر دیئے جائیں تو تباہی آجائے۔ لیکن جو معنے لُغتِ عربی کے مطابق ہوں۔ عقل اُن کی تائید کرتی ہو۔ اور باقی قرآنی آیات بھی ان کی مخالف نہ ہوں۔ وہ آج نکلیں یا آج سے چار پانچ سو سال بعد نکلیں وہ درست ہونگے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ اگر ایک ایک آیت کے سو سو۔ دو دو سو۔ معنے بھی کئے جائیں تو وہ درست ہونگے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعے علوم کا ایک خزانہ ہمیں عطا فرمایا ہے اور اپنی مجد اور شان کے اظہار کے لئے اسے ایک گواہ بنایا ہے۔

اِس زمانہ میں صرف بہائیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآنی شریعت منسوخ ہو چکی ہے۔ مگر ان کا یہ دعویٰ تب سچا سمجھا جا سکتا تھا جب بہائی لوگ اس میں سے پندرہ بیس باتیں ایسی نکال کر پیش کرتے جن پر عمل نہ ہو سکتا۔ یا بہائیت کی تعلیم میں سے پندرہ بیس باتیں ایسی دکھاتے جو قرآن کریم میں موجود نہ ہوتیں اور اس کی تعلیم سے بہتر ہوتیں۔ مگر وہ آج تک کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکے۔

پس قرآن کریم نہ فیل ہُوا نہ آئندہ کبھی فیل ہوگا۔ بلکہ یہ قیامت تک فیل نہیں ہوگا۔ زمین بدل سکتی ہے۔ آسمان بدل سکتا ہے۔ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم آ سکتی ہے ایک حکومت مٹے تو اس کی جگہ دوسری حکومت آ سکتی ہے۔ زبانیں مٹ سکتی ہیں لیکن قرآن کریم کبھی فیل نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا تعالیٰ کا نازل کردہ آخری قانون ہے جو ہمیشہ قائم رہیگا۔ اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ فیل ہو گیا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے اور ہم اب بھی اُسے چیلنج کرتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کے چند ایسے احکام پیش کرے جو ناقابلِ عمل ہوں یا وہ کچھ باتیں ایسی پیش کرے جو نہایت مفید اور اعلیٰ درجہ کی تعلیمات پر مشتمل ہوں اور بہائیت میں ہوں قرآن کریم میں نہ ہوں۔ رنگون سے ایک دفعہ ایک بہائی نے ایک کتاب شائع کی جس میں اُس نے ذکر کیا کہ بہائیت نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیمات پر مشتمل ہے بہائیت کہتی ہے کہ عورت سے نیک سلوک کرو۔ لڑکیوں کو تعلیم دو۔ ظلم نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ جھوٹ نہ بولو۔ مَیں نے اس کے جواب میں لکھا کہ تم کوئی ایک ہی مذہب ایسا بتا دو۔ جو کہتا ہو کہ عورت سے نیک سلوک نہ کرو لڑکیوں کو تعلیم نہ دو۔ ظلم کرو۔ چوری کرو۔ جھوٹ بولو دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس قسم کی تعلیم دیتا ہو۔

دراصل بات یہ ہے کہ بہائیوں نے قرآن کریم کی تعلیم میں سے بعض پوائنٹ لے کر انہیں ایک علیحدہ تعلیم کے رنگ میں پیش کر دیا ہے۔ ورنہ ہر سچائی قرآن کریم میں موجود ہے۔ اور پھر ان لوگوں کی اپنی حالت یہ ہے کہ جب عباس آفندی امریکہ سے واپس آیا تو اُس نے لکھا کہ میں سب سے پہلے بہاء اللہ کی قبر پر نماز پڑھنے گیا اور مَیں نے وہاں سجدہ کیا۔ اس قدر شرک میں ملوّث ہوتے ہوئے یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم فیل ہو گیا ہے اور اُس کی جگہ بہائیت نے لے لی ہے۔ حالانکہ قرآن کریم وہ کتاب ہے

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِى

تو کہدے میرے اور تمہارے درمیان بطور گواہ فیصلہ کرنے والا اللہ ہی کافی ہے۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا

اور زمین میں ہے اُسے وہ جانتا ہے۔ اور جو لوگ باطل پر عمل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام

بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ

کا انکار کرتے ہیں وہی گھاٹے میں پڑنے والے ہیں ۳۵ اور وہ تجھ سے عذاب کے جلدی لانے کی خواہش کرتے ہیں۔

وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاۗءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ وَ

اور اگر ایک مقرر وقت نہ ہوتا تو عذاب اُن کے پاس آ جاتا۔ اور اب بھی

لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۴﴾

وہ اُن کے پاس ضرور (آئیگا اور) اچانک آئیگا اس حالت میں کہ وہ جانتے بھی نہ ہونگے۔ ۳۶

جس نے دنیا سے بُت پرستی کا قلع قمع کر دیا تھا۔ لیکن بہائیوں نے دوبارہ بُت پرستی شروع کر دی ہے۔ کون عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ قبر کی مٹی پر سجدہ کرنا کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اور کیا ایسا مذہب اسلام کے آگے ٹھہر سکتا ہے جس نے عرب سے شرک کو کلی طور پر مٹا دیا تھا اور جس کے بانی نے مرض الموت میں بار بار کہا کہ اللہ تعالیٰ یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ ایسے عظیم الشان مذہب کے متعلق بہائیوں کا یہ کہنا کہ اسلام فیل ہو گیا ہے نہایت احمقانہ بات ہے۔

۳۵ تفسیر:۔ اس آیت میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے تو تمہارے سامنے قرآن کریم کے ذریعہ ایک بہت بڑا نشان رحمت ظاہر کر چکا ہے۔ لیکن اگر تم عذاب کا نشان ہی دیکھنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔ وہ عذاب کا نشان بھی تمہیں دکھا دیگا اور جھوٹا فنا ہو جائیگا اور سچا فتح پا جائے گا۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والا امتیازی نشان جھوٹا نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی ہر بات کو جانتا ہے۔ پس اس کے عذاب سے وہی لوگ تباہ ہو سکتے ہیں جو جھوٹ پر ایمان لاتے ہیں اور اُس کے نشانات کا انکار کرتے ہیں۔

۳۶ تفسیر:۔ فرمایا۔ یہ لوگ جو عذاب کے آنے کی جلدی کر رہے ہیں۔ اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ عذاب دینے میں دھیما ہے۔ اگر اُس نے ایک وقت مقرر نہ کیا ہوتا تو عذاب ابھی آ جاتا۔ اب بھی آئیگا تو سہی مگر اچانک آئیگا اور ایسی حالت میں آئیگا کہ وہ جانتے بھی نہ ہونگے۔ جیسے فتح مکہ ایسی اچانک ہوئی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا لشکر مکہ کے پاس بھی پہنچ گیا۔ اور مکہ والوں کو خبر تک نہ ہوئی۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۚ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ

(اور) وہ تجھ سے عذاب کے جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور جہنم کافروں کو یقیناً تباہ کرنے والی

بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۵﴾ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ

ہے۔ ۳۷ (جس دن کہ جہنم کا عذاب کافروں کو گھیر کر تباہ کر دیگا) یہ وہ دن ہوگا کہ خدائی عذاب اُنکے اوپر سے بھی انہیں

وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۶﴾

ڈھانک لیگا اور اُنکے پاؤں کے نیچے سے نکل کر بھی اُنکو گھیر لیگا۔ اور (خدا) کہیگا اپنے عملوں کا نتیجہ چکھو۔ ۳۸

تاریخ میں لکھا ہے کہ جب اسلامی لشکر رات کو مکّہ کے قریب پہنچا اور ہر سپاہی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے ماتحت اپنے اپنے کھانے کے لئے علیحدہ علیحدہ آگ جلائی تو ابوسفیان اور اس کے بعض ساتھی جو مکہ والوں کی طرف سے پہرہ پر مقرر تھے انہوں نے دُور سے اتنی بڑی روشنی دیکھی تو وہ گھبرا گئے اور اسی گھبراہٹ میں ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہ کس کا لشکر ہے؟ اس پر پہلے تو اُن کا خزاعہ کی طرف خیال گیا کہ شاید خزاعہ کے آدمی ہونگے جو اپنا بدلہ لینے کے لئے آئے ہیں۔ لیکن ابوسفیان نے کہا۔ خدا کا خوف کرو خزاعہ تو اس کا دسواں حصہ بھی نہیں۔ یہ اتنا بڑا لشکر ہے کہ خزاعہ کی اس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں۔ انہوں نے کہا پھر فلاں قبیلہ ہوگا۔ کہنے لگا۔ آخر وہ کیوں آتا اور پھر اُن کی تعداد بھی اتنی نہیں۔ غرض اسی طرح وہ پانچ سات قبائل کے نام لیتے چلے گئے کہ فلاں ہوگا۔ فلاں ہوگا اور ہر بار ابوسفیان نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ آخر انہوں نے کہا۔ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا لشکر ہوگا اور کس کا ہوگا۔ کہنے لگا بالکل جھوٹ ہے۔ میں تو انہیں مدینہ میں آرام سے بیٹھا چھوڑ کر آیا ہوں۔ اُنکی تو لڑائی کی کوئی تیاری ہی نہیں تھی۔ یہ باتیں ابھی ہو ہی رہی تھیں کہ اسلامی لشکر کے چند سپاہی جو پہرہ پر متعین تھے وہ پہرہ دیتے ہوئے قریب پہنچ گئے اور انہوں نے ابوسفیان کی آواز سنی۔ اُن میں حضرت عباسؓ بھی تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور ابوسفیان کے بڑے گہرے دوست تھے۔ اُس وقت وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خچر پر سوار تھے۔ انہوں نے آواز سنی تو کہنے لگے ابوسفیان! ابوسفیان نے کہا عباسؓ! تم کہاں؟ حضرت عباسؓ نے کہا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار کا لشکر لے کر آ گئے ہیں۔ تو جلدی سے میرے پیچھے بیٹھ اور خدا کے نام پر اُنکی منتیں کر اور اپنی اور اپنی قوم کی معافی کے لئے درخواست کر ورنہ تباہی آ جائیگی۔ پھر خود ہی انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور خچر کے پیچھے بٹھا کر اُسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ غرض فتح مکہ ایسی اچانک ہوئی کہ کفار ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اسلامی لشکر اُنکے صحنوں میں اُتر گیا۔

۳۷ **تفسیر:**۔ فرمایا۔ یہ لوگ عذاب کے متعلق جلدی تو کر رہے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ جب وہ عذاب آئیگا تو وہ سب منکرین اسلام کا احاطہ کر لیگا۔ متواتر ایک مطالبہ کو آگے پیچھے بیان کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ ایک مطالبہ دنیوی عذاب کے متعلق ہے اور دوسرا مطالبہ اُخروی عذاب کے متعلق ہے۔ ایک مطالبہ سے یہ مُراد ہے کہ ہم پر تیری پیشگوئیوں کے مطابق دنیا میں عذاب کیوں نہیں آ جاتا اور دوسرے مطالبہ سے یہ مراد ہے کہ کیوں ہم تیری مخالفت کی وجہ سے مر نہیں جاتے اور جہنم

۳۸ **تفسیر:**۔ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۷﴾

اے میرے مومن بندو! میری زمین وسیع ہے۔ پس تم میری ہی عبادت کرو۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

ہر جاندار موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ پھر ہماری طرف ہی تم (سب) کو لوٹایا جائیگا۔ ۳۹ف

وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ جب وہ عذاب آئیگا تو اوپر سے بھی آجائیگا اور نیچے سے بھی آجائیگا۔ یعنی سرداران مکہ بھی مکہ والوں کو چھوڑ دینگے جیسا کہ عمرو بن العاصؓ اور خالدؓ بن ولیدؓ نے چھوڑ دیا اور عوام الناس بھی اپنے سرداروں کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور اللہ تعالےٰ کہیگا کہ اب اپنے اپنے اعمال کی سزا بھگتو۔

اسی طرح مِنْ فَوْقِهِمْ میں ہر قسم کا آسمانی عذاب۔ بیرونی حملے۔ حکومتِ وقت کی گرفت۔ بالا افسروں یا مذہبی پیشواؤں کی ناراضگی اور خاندان کے اکابر کا مختلف قسم کی مشکلات اور تکالیف میں مبتلا ہونا بھی شامل ہے اور مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ میں ہر قسم کے زمینی عذاب شامل ہیں۔ خواہ وہ ماتحت ملازمین کی طرف سے پیدا ہوں یا ماتحت افسروں کی طرف سے۔ اسی طرح فساد بغاوت اور تدابیر کا اُلٹ جانا بھی ایسے ہی عذاب ہیں جو خود انسان کے پاؤں کے نیچے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

۵۳۹ **تفسیر**:۔ اس آیت میں بتایا کہ کفار پر عذاب تو ضرور آئیگا۔ لیکن اس وقت انہیں اپنی طاقت اور جتھے پر غرور ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو اپنے زور بازو سے کچل سکتے ہیں۔ سو ہم مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر تمہارا ملک تمہیں امن دینے کے لئے تیار نہیں تو تم غیر ممالک میں نکل جاؤ۔ اور گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں پھر کر خدائے واحد کی عبادت قائم کرو اور اگر دیکھو کہ کسی جگہ تمہاری تبلیغ میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں تو گھبراؤ نہیں۔ زمین کو خدا تعالےٰ نے بڑا وسیع بنایا ہے تم اس علاقہ کے ساتھ ملتے ہوئے دوسرے علاقوں میں تبلیغ شروع کردو۔ اور اس بات سے مت ڈرو کہ اگر ہم نے تبلیغ کی تو دنیا ہماری دشمن ہو جائیگی۔ اور وہ ہمیں جانی اور مالی مشکلات میں مبتلا کردے گی۔ تمہاری جانیں آخر کب تک سلامت رہیں گی۔ ہر انسان نے ایک دن مرکر اللہ تعالےٰ کے حضور حاضر ہونا ہے۔ پس اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے مرگئے تو کیا فائدہ؟ جاؤ اور دنیا کے کناروں میں پھیل جاؤ اور اسلام اور قرآن کی تبلیغ کرو۔ اس جہاد کے دوران میں اگر تمہیں موت بھی آگئی تو وہ بڑی مبارک موت ہوگی۔ تم شہادت کا مرتبہ حاصل کروگے اور خدا تعالیٰ کی جنت کے وارث ہوگے۔

آج تک دنیا میں جتنی بھی فاتح قومیں گذری ہیں انہوں نے پہلے اپنے وطنوں کو چھوڑا اور اس کے بعد انہیں فتوحات نصیب ہوئیں۔ عربوں نے اپنے وطن کو چھوڑا۔ ترکوں نے چھوڑا۔ یہودیوں نے چھوڑا۔ آرین نسل کے لوگوں نے چھوڑا۔ اور وہ دُور دُور ملکوں میں پھیل گئے۔ اگر وہ اپنے وطنوں کو نہ چھوڑتے تو انہیں فتوحات بھی نصیب نہ ہوتیں اور وہ نئے نئے ملکوں کے وارث نہ بنتے۔ پس اگر مومنوں کو بھی خدا کے دین کی اشاعت کے لئے اپنے وطن چھوڑنے پڑیں تو اس میں کوئی بڑی بات نہیں

گر یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک ہجرت قومی ہوتی ہے اور ایک فردی ہوتی ہے۔ بیشک بعض افراد کی ہجرت قوم کے معیار کو بلند کر دیتی ہے لیکن قومی زندگی اُسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب قوم کا ہر فرد خدا تعالیٰ کے دین کے لئے اپنے وطن کو چھوڑنے اور خدا تعالیٰ کی خاطر غیر ممالک میں نکل جانے کے لئے تیار ہو۔ اِسی امر کی طرف زیر تفسیر آیت میں توجہ دلائی گئی ہے۔ اور یہی حقیقت ایک دفعہ مجھے رؤیا میں بھی بتائی گئی۔ میں نے دیکھا۔ کہ میں اپنے گھر سے نکلا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں اپنے لئے کوئی مکان تلاش کروں۔ جب میں باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ ماسٹر محمد ابراہیم صاحب جمونی کھڑے ہیں اور لوگ اُن کے پاس مکانوں کے لئے آتے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس مکان ہیں انہوں نے وہ مکان انتظام کے لئے اُن کے سپرد کئے ہوئے ہیں اور وہ آگے دوسروں کو دیتے ہیں۔ میں نے بھی اُن سے ذکر کیا کہ مجھے اپنے لئے مکان کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مجھے ایک مکان دکھایا جس کے چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں مگر اُن کمروں پر چھت نہیں اور کمروں کی دیواروں پر چھوٹے چھوٹے کپڑے لٹکے ہوئے ہیں۔ میں نے اُن سے پُوچھا کہ یہ کپڑے کیسے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ ان کمروں پر چھت نہیں اس لئے دھوپ کے وقت انہیں اوپر ڈال لیا جاتا ہے۔ میں اُس وقت اپنے دل میں خیال کرتا ہوں کہ یہ کمرے بیشک چھوٹے ہیں لیکن ہمارے کمرے تو اس سے بھی چھوٹے تھے۔ اُس وقت مجھے ربوہ کے وہ کچے مکان یاد آتے ہیں جن میں ہم پہلے رہائش رکھتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی میں کہتا ہوں کہ وہ کمرے روشن زیادہ تھے۔ پھر میں کہتا ہوں۔ وہ کمرے اِس لئے روشن تھے کہ اُن پر گیری کا سُرخ رنگ لگا کر انہیں خوب چمکایا گیا تھا اور اندر سفیدی کی گئی تھی۔ جب ان پر بھی رنگ کیا جائیگا اور اندر سفیدی ہو جائیگی تو یہ بھی روشن ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میں نے کسی کو یہ کہتے سُنا کہ

"جو قوم ہجرت کیلئے تیار رہتی ہے اور نو آبادی کا شدّت سے اشتیاق رکھتی ہے وہ کبھی تباہ نہیں ہوتی۔"

جب میں نے یہ سُنا تو مجھے خیال آیا کہ ہجرت کے لئے تیار رہنے کے یہ معنے نہیں کہ وہ ہجرت پر خوش ہوتے ہیں۔ یا ہجرت کی اپنے دلوں میں خواہش رکھتے ہیں۔ چنانچہ خواب میں ہی مجھے صحابہؓ کا خیال آیا کہ انہیں بھی ہجرت کرنی پڑی تھی۔ مگر حدیثوں میں آتا ہے کہ مدینہ آکر بعض صحابہؓ مکّہ کی یاد میں رویا کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خوشی سے نہیں بلکہ حالات کی مجبوری کی وجہ سے ہجرت کی تھی۔ پس جب اُس نے یہ کہا کہ جو قوم ہجرت کیلئے تیار رہتی ہے اور نو آبادی کا شدّت سے اشتیاق رکھتی ہے وہ کبھی تباہ نہیں ہوتی تو میں خواب میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ

"ہجرت تو وہ مجبوری سے کرتے ہیں مگر بعد میں ہجرت پر وہ رضاء بالقضاء کا جو نمونہ دکھاتے ہیں وہ بتاتا ہے کہ وہ ہجرت کے لئے تیار تھے۔ پس تیاری کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہجرت ہو۔ بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ اگر ہجرت کا وقت آئے تو وہ رضاء بالقضاء کا نمونہ دکھاتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو فوراً دوسری جگہ آباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

شہد کی مکھیوں کو دیکھو وہ شہد بناتی ہیں اور بناتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن انسان انہیں کھانے نہیں دیتا۔ وہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ

اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور اُس کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں ہم اُن کو جنّت میں بالا خانوں میں جگہ

غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ

دیں گے (ایسی جنت میں) کہ اُسکے (سایوں) تلے نہریں بہتی ہونگی۔ وہ (یعنی مومن) اُن جنتوں میں ہمیشہ کیلئے رہتے چلے جائینگے اور

الْعٰمِلِيْنَ ۝۵۹ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۶۰

اچھے عمل کرنیوالوں کا اجر بہت اچھا ہوتا ہے۔ اُن (مومنوں) کا جو (اپنے عقیدہ اور عمل پر) جمے رہتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ ۵۴۰

اُن کے نیچے دھوآں رکھ کر گرم پانی پھینک کر یا کوئی اور ذریعہ اختیار کر کے اُن کا چھ ماہ کا بنایا ہُوا شہد اُڑا کر لے جاتا ہے وہ مکھیاں دو منٹ کا بھی انتظار نہیں کرتیں۔ وہ اُس جگہ کے چھوڑ دینے کے معًا بعد دوسری جگہ تلاش کر لیتی ہیں اور دوبارہ شہد بنانا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد اگر انہیں آکر دیکھو تو وہ قریب ہی کسی دوسری جگہ شہد بنانے میں مشغول ہونگی۔ بعض دفعہ اُن سے سالہا سال تک ایسا کیا جاتا ہے۔ مثلاً پالتو مکھیاں ہوتی ہیں۔ وہ جب بھی شہد بناتی ہیں شہد اُڑا لیا جاتا ہے اور انہیں اپنا بنایا ہُوا شہد کھانے کا موقعہ نہیں ملتا۔ وہ شہد بناتی ہیں اور لوگ شہد لے جاتے ہیں۔ اگر ایک مکھی شہد بناتی ہے اس لئے کہ لوگ لے جائیں اور اُس سے بیمار یا تندرست ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ (النحل آیت ۷۰) اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔ یا پھر ایک مکھی شہد بناتی ہے اور بناتی چلی جاتی ہے اور لوگ اُس کے پاس شہد نہیں رہنے دیتے وہ ہمیشہ اڑا لے جاتے ہیں اور وہ مکھی پھر بھی شہد بنانا نہیں چھوڑتی۔ تو کیا انسان ہی ایسا ضعیف ہے کہ وہ اس طرح مایوس ہو جائے جو شخص اپنی کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد ہمّت چھوڑ بیٹھتا ہے وہ آدمی نہیں بلکہ وہ مکھیوں سے بھی بدتر ہے۔

دنیا کی فتح کوئی معمولی چیز نہیں۔ اس کیلئے بڑی بھاری قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا۔ چنانچہ جب آپؐ نے دیکھا کہ مکہ میں رہنا ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو آپؐ نے صحابہؓ کو جمع کیا اور فرمایا تم کسی اور جگہ چلے جاؤ جہاں دین کے بارہ میں ظلم نہ ہو اور تم امن سے خدا تعالیٰ کا نام لے سکو۔ صحابہؓ نے آپؐ سے پوچھا۔ یا رسول اللہ وہ کونسی جگہ ہے۔ آپؐ نے حبشہ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا۔ وہاں عیسائیوں کی حکومت ہے اگر تم وہاں چلے جاؤ تو تم پر دین کے بارہ میں کوئی سختی نہیں ہوگی۔

پس مومن کا فرض ہے کہ جہاں وہ خدا کے لئے اپنے وطنوں کو خیرباد کہنے کے لئے ہمیشہ تیار رہا کریں وہاں باہر جا کر روحانی نوآبادی قائم کرنے کے اشتیاق کا بھی پورا پورا مظاہرہ کریں تاکہ اُن کا وجود ایک امت کی طرح ہو اور وہ ایک دو کو نہیں بلکہ امت کی امت کو اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں داخل کریں۔

۵۴۰ تفسیر:- اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ جو لوگ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر سچے دل سے ایمان لاتے ہوئے اسلام کی اشاعت کیلئے مناسب حال

اعمال بجا لائیں گے۔ یعنی اگر انہیں خدا کے لئے اپنا وطن چھوڑنا پڑا تو وطن چھوڑ دیں گے اور اگر جان قربان کرنی پڑی تو جان قربان کر دیں گے۔ ہم اپنی ذات ہی کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جس طرح انہوں نے اسلام اور قرآن کو اونچا کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح ہم بھی دُنیا اور آخرت میں اُن کو بلند درجات عطا کرینگے اور بہتر سے بہتر مقامات اُنکو رہائش کیلئے عطا کرینگے اور یہ عزت دنیوی عزتوں کی طرح عارضی یا فانی نہیں ہوگی بلکہ ایک غیر معلوم عرصہ تک جاری رہنے والی عزت ہوگی۔ اور یقیناً خدا تعالےٰ کی راہ میں قربانی کرنے والے کبھی ضائع نہیں کئے جاتے۔

اسجگہ اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے کہ اِن جنتیوں کو جو بالاخانے عطا کئے جائیں گے اُن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے جنّت کے باغات کے متعلق بھی فرمایا ہے کہ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (بقرہ آیت ۲۶) اِن باغوں کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور تیسری جگہ مومنوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ (سورۃ اعراف آیت ۴۴) یعنی ہم جنتیوں کے سینہ میں سے ایک دوسرے کے متعلق ہر قسم کی کدورت نکال دیں گے اور نہریں اُن کے نیچے بہتی ہونگی اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسی نہریں ہیں کہ باغ ہیں تو اُن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور مکان ہیں تو ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور آدمی ہیں تو اُنکے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ نہریں عام نہریں نہیں ہوسکتیں بلکہ کچھ اور ہی شئے ہیں کہ مکانوں کے نیچے بھی بہتی ہیں باغوں کے نیچے بھی بہتی ہیں اور آدمیوں کے نیچے بھی۔ پس جب نهر کے اصل معنے یہاں چسپاں نہیں ہوسکتے تو لازماً ہمیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہاں استعارۃً یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور نہر کے کچھ اور معنے ہیں۔

اس غرض کے لئے جب ہم قرآن کریم پر غور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ پانی کی اِس میں کیا خصوصیات بیان کی گئی ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اس کی دو خصوصیات بیان کی ہیں۔ اوّل میل کچیل دُور کرنا اور جسم کو پاک کرنا۔ جیسے فرمایا وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا (سورۃ فرقان آیت ۴۹) ہم نے بادلوں سے پاک وصاف کرنے والا پانی اتارا ہے۔ اور دوسرے زندگی بخشنا۔ جیسے فرمایا۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (سورۃ انبیاء آیت ۳۱) ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا ہے۔ پس اِن آیتوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے یہ معنے ہوں گے کہ انہیں پاک وصاف رکھنے اور ہمیشہ کے لئے زندگی بخشنے کے سامان بڑی کثرت سے ملیں گے۔ کیونکہ اسجگہ صرف پانی نہیں بلکہ نهر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ قرآن کریم میں جنّت کی زندگی کی بھی دو ہی بڑی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ اوّل دائمی زندگی جو انسانوں کو بھی عطا ہوگی۔ باغوں کو بھی عطا ہوگی اور غُرَف کو بھی عطا ہوگی۔ انسانوں کی دائمی حیات کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ خَالِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا (سورۃ نساء آیت ۱۲۲) اور جنتی باغوں کے دوام کے متعلق فرماتا ہے کہ جَنّٰتُ عَدْنٍ (سورۃ رعد آیت ۲۴) اسی طرح فرماتا ہے۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (سورۃ رعد آیت ۳۶) اور غُرَف کے دائمی ہونے کی طرف سورۃ زمر کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ لٰكِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِیَّةٌ ۙ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِیْعَادَ ۝ (سورۃ زمر آیت ۲۱) یعنی وہ لوگ جو اپنے ربّ کا تقوٰی اختیار کرتے ہیں اُن کو کئی منزل والے مکان عطا ہونگے جن کے اوپر اور منزلیں مضبوطی کے ساتھ بنی ہونگی۔ اُن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی یہ اللہ تعالےٰ کا ایک پختہ عہد ہے اور اللہ تعالےٰ اپنے وعدوں کو توڑا نہیں کرتا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ

اِس دنیا میں بہت سے جانور بھی ہیں جو اپنے ساتھ (انسانوں کی طرح) اپنا رزق نہیں اُٹھائے پھرتے ۔ اللہ ہی

يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾

اُنکو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی ۔ اور وہ بہت دُعائیں سُننے والا (اور) حالات سے خوب آگاہ ہے ۱۴۱ھ

ابجاء مَبْنِيَّةٌ کے معنے ہمیشہ رہنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں ۔ جیسے کہتے ہیں اُس کی جڑیں گاڑ دی گئی ہیں ۔ ورنہ یُوں تو ہر غرفہ کی ہی بنیاد ہوتی ہے ۔ غرض تینوں چیزوں کو قرآن کریم نے قائم رہنے والا بتایا ہے ۔ نہ مکان ٹوٹیں گے نہ باغ اُجڑیں گے نہ ساکن و منتفع مریں گے ۔ دوسری طرف اِن تینوں چیزوں کی نسبت فرمایا کہ اِن کے نیچے نہریں ہونگی ۔ پس جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ کی آیت کے مطابق نہروں سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بکثرت ایسے سامان پیدا کئے جائیں گے جن کی وجہ سے نہ باغ سوکھیں گے نہ مکان ٹوٹیں گے نہ آدمی مریں گے ۔

پانی کی دوسری غرض جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے مَیل کچیل سے صاف رکھنا ہوتی ہے ۔ یہ خوبی بھی جنت میں پورے طور پر پائی جائیگی ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۙ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۙ (سورۃ الواقعہ آیت ۲۶-۲۷) یعنی مومن جنتوں میں نہ تو کوئی لغو بات سُنیں گے اور نہ گناہ کی کوئی بات اُن کے کانوں میں پڑے گی ۔ وہ صرف ایسی ہی باتیں سُنیں گے جو سلامتی کی دعاؤں پر مشتمل ہونگی ۔ گویا ہر روحانی گند اور مَیل کچیل سے انہیں دُور رکھا جائیگا ۔ اِسی طرح احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ انسان جنت میں کھائے پیئے گا تو کیا پاخانہ پیشاب نہ ہو گا ؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ کھایا پیا صرف ہوا کی صورت میں نکلیگا جس میں مُشک کی خوشبو ہوگی ۔ پس

جب باغ سڑیگا نہیں اور پاخانہ پیشاب بھی نہ ہو گا تو جنت بھی پاک رہے گی اور اسی طرح مکان بھی کیونکہ اندر رہنے والے کو جب مَیل سے صاف رکھا جائیگا تو مکان کو صاف رکھ کر ہی ایسا کیا جا سکتا ہے ۔

پس تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ کے معنے قرآن سے صاف رکھنے اور قائم رکھنے کے ثابت ہو گئے اور یہی معنے یہاں چسپاں ہوتے ہیں ۔ ورنہ آدمیوں اور مکانوں کے نیچے نہروں کے معنے ظاہری رنگ میں چسپاں نہیں ہو سکتے ۔ سوائے اِس کے کہ یوں معنے کئے جائیں کہ نہریں اُن کے قبضہ و تصرف میں ہونگی مگر اس صورت میں تینوں کے لئے الگ الگ کہنے کی ضرورت نہ تھی ۔

پھر اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۔ کہہ کر بتایا کہ یہ جزائے نیک اُن کو اس لئے ملے گی کہ وہ ہر قسم کی مشکلات اور دشمنوں کی مخالفت کے باوجود اپنے عقائد پر مضبوطی سے قائم رہے اور انہوں نے اپنے رب پر سچا توکّل رکھا ۔

۱۴۱ھ تفسیر :- ایک اور مشکل جو بسا اوقات کمزور انسان کے قدم کو ڈگمگا دیتی اور اسے اپنے آپ کو قربانیوں کی آگ میں جھونکنے سے روکتی ہے وہ مالی مشکلات ہیں ۔ ایک طرف دنیا اپنے پورے حُسن کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑی ہوتی ہے اور دوسری طرف خدا تعالیٰ کا دین اُسے آواز دے رہا ہوتا ہے کہ آؤ اور میری مدد کرو ۔ وہ دُنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہ اُسے مال و دولت

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ

اور اگر تو اِن لوگوں سے پُوچھے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور سورج اور چاند کو (بغیر مزدوری کے)

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾

کس نے انسانوں کی خدمت میں لگایا ہُوا ہے؟ تو وہ کہیں گے اللہ نے۔ (پھر جب وہ یہ بات جانتے ہیں) تو کس طرف کو بہکے جا رہے ہیں۔ ۵۴۲

اور زیب و زینت کے ساتھ آراستہ و پیراستہ نظر آتی ہے۔ اور دین کی طرف دیکھتا ہے تو وہاں اُسے روپیوں کی جھنکار سُنائی نہیں دیتی۔ یہ دیکھکر ایک کمزور انسان کا دِل دہل جاتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے میں خدا کے لئے اپنی زندگی کو کس طرح وقف کردوں۔ میں نے خدا کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا تو میں بھوکا مر جاؤنگا۔ میری بیوی بچے کیا کھائیں گے۔ ہم اپنا معیارِ زندگی کس طرح قائم رکھ سکینگے۔ اور اگر یہ لالچ اُس کے دل میں غالب آجاتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے دین کی خدمت سے محروم ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم اشرف المخلوق ہو کر زمین و آسمان کے خدا پر کتنی بدظنی کر رہے ہو۔ تم زمین کے چرندوں اور جنگل کے درندوں اور ہوا کے پرندوں کو دیکھو۔ کیا تم اُن کے لئے رزق مہیّا کرتے ہو یا خدا اُن کو رزق بہم پہنچا رہا ہے۔ اگر تم کائناتِ عالم کے اربوں ارب کیڑے مکوڑوں اور جانداروں کے سامانِ معیشت پر ہی غور کرو تو تمہاری عقل دنگ رہ جائے اور تم پر علم و معرفت کا ایک نیا باب کھل جائے۔ دُنیا علمی لحاظ سے بڑی بھاری ترقی کر چکی ہے مگر ابھی تک وہ یہ نہیں معلوم کر سکی کہ اِن اَن گنت جانوروں کے لئے کس طرح غذا مہیّا ہوتی ہے۔ ایک موٹی تقسیم تو یہی ہے کہ کھیتی میں دانے پیدا ہوتے ہیں تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے لئے بھوسہ بھی پیدا کر دیا ہے۔ اِسی طرح کانٹے دار جھاڑیاں اور درخت اونٹوں وغیرہ کی غذا ہیں تو نجاست بھیڑوں کے کام آجاتی ہے۔ مگر کروڑوں کروڑ جانور جو سمندروں اور دریاؤں میں رہتے ہیں یا غاروں میں بستے ہیں یا درختوں کی چوٹیوں پر بسیرا کرتے ہیں یا ہواؤں میں اڑتے ہیں یا خون کے ایک ایک قطرہ میں خوردبین سے دکھائی دیتے ہیں ان سب کو کون رزق دے رہا ہے۔ کونسی سوسائٹی یا انجمن یا حکومت ہے جو اُن کا بجٹ تیار کرتی اور انہیں تنخواہیں تقسیم کرتی ہے۔ یہ خدا ہی ہے جو اتنا بڑا کارخانہ چلا رہا ہے اور ان اربوں ارب جانوروں کو رزق مہیّا کر رہا ہے۔ پھر انسان کیسا نادان ہے کہ جب اُسے کہا جاتا ہے کہ آؤ اور خدا تعالیٰ کے دین کی اشاعت کے لئے اپنے آپکو وقف کرو تو وہ کہتا ہے میں آؤں تو سہی مگر میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں آگیا تو کھاؤنگا کہاں سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میں کائناتِ عالم کی اتنی بڑی مخلوق کو رزق پہنچا رہا ہوں۔ تو اگر تم میری آواز پر لبیک کہتے ہوئے آگئے تو کیا میں تمہیں بھوکا مرنے دونگا۔ فرمایا۔ اس بدظنی کو اپنے دل سے نکال دو۔ تمہارا خدا سمیع اور علیم ہے اگر تم سچے دل سے خدا تعالیٰ کو پکارو گے تو اس وجہ سے کہ وہ تمہارے حالات کو جانتا ہے وہ تمہاری دعاؤں کو قبول کرے گا اور تمہیں ہر قسم کی مشکلات سے نجات دیگا۔ پس ایسے وساوس میں اپنی زندگی مت بسر کرو۔ بلکہ نڈر اور بہادر بن کر خدا تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لئے آگے بڑھو۔

۵۴۲۔ تفسیر:۔ اشاعتِ اسلام کے رستہ میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پھر اُن مذہبی مباحثات کی طرف لوٹتا ہے جن کا ذکر

گذشتہ رکوع سے شروع ہے اور فرماتا ہے کہ جب تم باہر نکلو گے اور دنیا میں اسلام کی اشاعت کے لئے اپنے وطنوں کی بھی قربانی کرو گے - اپنی جانوں کی بھی قربانی کرو گے - اپنے مالوں کی بھی قربانی کرو گے اور صبر و استقامت اور توکّل علی اللہ کا نمونہ دکھاتے ہوئے اسلام اور قرآن کی تبلیغ کرو گے تو تمہیں سب سے بڑا مقابلہ اُن اقوام سے پیش آئیگا جو کسی نہ کسی رنگ میں خدا تعالیٰ کی توحید کی منکر ہیں - اس لئے تمہیں چاہیئے کہ جب اُن سے مذہبی گفتگو شروع ہو تو اُن سے پُوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ اور سورج اور چاند کو بے مزد خدمت پر کس نے لگا رکھا ہے؟ وہ اس کے جواب میں سوائے اِس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تمام کارخانۂ عالم اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے - پھر اُن سے کہو کہ جب خدا تعالیٰ نے اتنا بڑا کارخانہ پیدا کر دیا ہے - اور اُسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ڈور ہے تو تم خدا کو چھوڑ کر اور معبودوں کی طرف کیوں بہکے جا رہے ہو -

پھر وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کہہ کر اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ جب تم توحید کی مخالف اقوام کے سامنے اسلام اور قرآن کا پیغام پیش کرو گے تو وہ اپنی طاقت اور سامانوں کی فراوانی کی وجہ سے تمہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور کہیں گے تم کس طرح غالب آسکتے ہو تم تو کینیوٹ کی طرح سمندر کو پیچھے دھکیلنے کے خواب دیکھ رہے ہو - کنیوٹ ایک انگریز بادشاہ تھا جس کو خدا تعالےٰ نے بہت اقبال دیا تھا - ایک دن وہ سمندر کے کنارے بیٹھا تھا کہ اُس کے درباریوں نے خوشامد کے طور پر کہنا شروع کیا کہ آپ کی حکومت تو زمین اور سمندر بھی مانتے ہیں وہ دانا بادشاہ تھا - اُس نے اپنی کرسی سمندر کے کنارے بچھائی اور وہاں بیٹھ گیا - وہ وقت مد کا تھا جس وقت سمندر میں جوش آتا ہے وہ میل میل خشکی پر چڑھ جاتا ہے - لہریں اُٹھنے لگیں اور پانی کرسی کے گرد اونچا ہونے لگا کینیوٹ ظاہر میں غصہ کی شکل بنا کر لہروں کو حکم دیتا کہ پیچھے ہٹ جاؤ - مگر پانی بڑھتا چلا گیا - یہاں تک کہ بادشاہ کے ساتھیوں کو جان کا خطرہ پیدا ہو گیا - اُس وقت بادشاہ اُٹھ کر خشکی کی طرف آیا اور درباریوں سے کہا کہ دیکھا تم کسقدر جھوٹ کہتے تھے - جس طرح کنیوٹ بادشاہ کے حکم سے باوجود اُس کے اقتدار کے سمندر پیچھے نہیں ہٹتا تھا اُسی طرح یورپ کو ایشیائی طریق کا مسلمان بنانا مشکل نظر آئیگا - مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم اُن سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور کس نے سورج اور چاند اور ستاروں کو ایسی طرز پر کام میں لگا رکھا ہے کہ لاکھوں سال کا زمانہ گذرنے کے باوجود وہ برابر اپنا کام کرتے چلے جا رہے ہیں اور آسمانی اور زمینی نظام میں کوئی خلل واقعہ نہیں ہوتا - وہ اس کے جواب میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ہی لیا کیا ہے - پھر اُن سے کہو کہ جس خدا نے بغیر ظاہری سامانوں کے بڑے بڑے وزنی سیارے اور ستارے آسمان میں قائم کر رکھے ہیں وہ خدا جب کسی قوم کو غالب کرنا چاہے تو اُسے مادی سامانوں کی ضرورت نہیں ہوتی - وہ ایسے باریک اور غیر مرئی سامانوں سے کام لیتا ہے جن کو انسانی آنکھ دیکھ بھی نہیں سکتی اور غالب مغلوب اور مفتوح فاتح بن جاتے ہیں - اسلام کی بھی اس وقت یہی حالت ہے اُس کی چھتیں ستونوں سے خالی دکھائی دیتی ہیں اور اس کی زمین بنجر اور سنگلاخ نظر آتی ہے لیکن زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کرنے والا دماغ اس نکتہ کو فراموش نہیں کر سکتا کہ تمام طاقت خدا تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے اور جب وہ کسی کو غالب کرنا چاہے تو بغیر مادی سامانوں کے بھی غالب کر دیتا ہے - دیکھو ٹائن بی جو اس وقت سب سے بڑا مؤرخ مانا جاتا ہے اور قریباً گبن کی پوزیشن اس کو ملنے لگ گئی ہے بلکہ بعض تو

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ

اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے رزق پھیلاتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ

يَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

کر دیتا ہے۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہے ۵۴۳

اُسے گبن سے بھی بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دُنیا میں ایسا مورخ کبھی نہیں گذرا۔ اُس نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ دُنیا میں جو تغیر آیا کرتے ہیں وہ اخلاقی اقدار کی وجہ سے آتے ہیں۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کوئی جبری طاقت ہو تو اس کی وجہ سے تغیرات پیدا ہوتے ہیں یہ غلط بات ہے۔ پھر اُس نے لکھا ہے کہ عیسائیت کے ساتھ اب اسلام کی ٹکر ہوگی جس کے سامان نظر آ رہے ہیں اور مسلمانوں میں سے احمدیوں میں مجھے آئندہ لڑائی والی جھلک نظر آ رہی ہے۔ اِس ٹکر کے بعد یہ فیصلہ ہو گا کہ آئندہ تہذیب کی بنیاد اگلی صدیوں میں اسلام پر قائم ہوگی یا عیسائیت پر قائم ہوگی۔ پھر اس نے ایک مثال دی ہے کہتا ہے ہم تو گھوڑ دوڑ کے شوقین ہیں۔ ہمارے ہاں عام گھوڑ دوڑ ہوتی ہے۔ ہم گھوڑ دوڑ والے جانتے ہیں کہ بسا اوقات جو گھوڑا سب سے پیچھے سمجھا جاتا ہے وہ آگے نکل جاتا ہے۔ پس یہ مت خیال کرو کہ احمدی اِس وقت کمزور ہیں۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ پچھلا گھوڑا آگے نکل جاتا ہے۔ اِسی طرح اب تم کو یہ کمزور نظر آتے ہیں لیکن مجھے ان میں وہ ترقی کا بیج نظر آ رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی وقت عیسائیت کے ساتھ ٹکر لیں گے اور شائد یہی جیت جائیں۔

دیکھو اتنا بڑا شخص جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں سب سے بڑا مؤرخ ہے اُس کو بھی ماننا پڑا کہ احمدیت کے اندر وہ بیج موجود ہے جس نے عیسائیت سے ٹکر لینی ہے اور پھر ممکن ہے یہی جیت جائیں۔ وہ آخر مخالف ہے اُس نے ممکن ہی کہنا تھا۔ یہ تو نہیں کہنا تھا کہ یقینی امر ہے کہ جیت جائیں۔ مگر اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ اسلام کا عیسائیت پر غالب آنا ایک یقینی امر ہے۔ وہ پہلے آسمان اور زمین کو بدل کر ایک نیا آسمان اور نئی زمین پیدا کر دیگا اور ایک نیا نظام روحانی دُنیا میں جاری ہو جائیگا۔

۵۴۳ تفسیر:۔ اِس آیت میں مخالفینِ اسلام کو انتباہ کیا گیا ہے کہ تم دنیا کی دولتوں اور حکومتوں پر کیوں فریفتہ ہو۔ تمام ترقیات اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اور وہ کمزوروں کو طاقتور اور ناداروں کو امیر اور بادشاہوں کو فقیر بنانے کی طاقت رکھتا ہے۔ بیشک آج تمہیں اسلام ایک کمزور مذہب دکھائی دیتا ہے اور اس مذہب کے پیروؤں کو تم ذلیل سمجھتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ عنقریب تم سے یہ نعمتیں چھین کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متبعین کو دے دیگا۔ اور اس طرح تمہارا وافر رزق تمہارے لئے تنگ ہو جائیگا اور مسلمانوں کی تنگی اُن کی فراخی میں بدل جائیگی۔ پہلے زمانہ میں بھی ایسا ہی ہُوا اور اب بھی ایسا ہی ہو گا۔ اسلام زندہ ہوگا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ماننے والے ترقی کریں گے۔ اور یورپ اور امریکہ اپنی ہر قسم کی ترقی کے باوجود اسلام سے شکست کھائیں گے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا

اور اگر تو اُن سے پُوچھے کہ بادل سے کس نے پانی اتارا ہے؟ اور پھر اُس کے ذریعہ سے

بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ

زمین کو اُس کے مرنے کے بعد زندہ کیا ہے؟ تو وہ کہیں گے۔ یقیناً اللہ نے۔ تُو کہہ دے

الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۶۴

کہ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے۔ لیکن اِن (یعنی انسانوں) میں سے اکثر سمجھتے نہیں۔ ۶۴

۶ ع ۲

إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مسلمانوں میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں اور کفر اپنے آخری سانس لے رہا ہے اور جبکہ دونوں میں ترقی اور تنزل کی علامات ظاہر ہیں تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمان ترقی نہ کریں اور کافر مغلوب نہ ہوں۔

۶۴ تفسیر:۔ اس میں بتایا کہ وہ اقوام جن سے تمہارا مقابلہ ہوگا وہ وحی و الہام کی بھی منکر ہونگی اس لئے تم اُن سے پُوچھو کہ آسمان سے کون پانی نازل کرتا اور مُردہ زمین کو زندہ کرتا ہے؟ وہ اس کے جواب میں بے ساختہ یہی کہیں گے کہ اللہ۔ تم کہو کہ الحمد للہ جو خدا ہمیشہ مُردہ زمین کو آسمانی بارش سے زندہ کرتا چلا آیا ہے۔ اُس نے اب بھی دنیا کی پکار سُنی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی نجات کے لئے بھیج دیا۔ یہ کتنے بڑے شکر کا مقام ہے کہ تاریک دنیا کو روشن کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے ایک سورج چڑھا دیا۔ مُردہ زمین کو زندہ کرنے کے لئے اُس نے ایک بہت بڑا رحمت کا بادل بھجوا دیا جو اتنی شان سے برسا کہ پیاسی دنیا سیراب ہوگئی اور مُردہ زمین نے بھی روئیدگی پیدا کرنی شروع کر دی۔ خدا تعالیٰ کے اتنے بڑے انعام اور احسان کو دیکھتے ہوئے ان لوگوں کو چاہیئے تھا کہ دوڑتے ہوئے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچتے اور آپ کو قبول کرکے آسمانی بارش سے فیضیاب ہوتے اور اپنے حوضوں اور تالابوں کو بھر لیتے مگر انہوں نے عقل سے کام نہ لیا۔ مُردار دُنیا پر گر کر رہ گئے۔ اور دنیوی مال و متاع انہیں اس دولت سے زیادہ اچھا دکھائی دینے لگا۔ گویا ٹھیکریوں کو تو انہوں نے لیا اور ہیروں اور جواہرات کو پھینک دیا۔

آسمان سے بارش نازل ہونے کی مثال دے کر کفار کو اس امر کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے کہ جب آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے تو زمین اپنی ہر قسم کی روئیدگی کو ظاہر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ مگر یہ روئیدگی یکساں نہیں ہوتی۔ کئی گھاس اور پودے صرف نصف انچ یا ایک انچ تک ہی رہ جاتے ہیں۔ اور کئی چھوٹی چھوٹی سبزیاں ترقی کرکے اتنا بڑا درخت بن جاتی ہیں کہ سینکڑوں آدمی اُس کے سایہ کے نیچے آرام کر سکتے ہیں۔ ابتدائی حالت میں وہ بالکل یکساں ہوتی ہیں لیکن انتہائی حالت میں وہ بالکل مختلف ہو جاتی ہیں۔ کوئی روئیدگی ایسی ہوتی ہے کہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں ہی اس کا سارا جوش ختم ہو جاتا ہے۔ اور کوئی سبزہ ایک مضبوط درخت بن جاتا ہے یا ایک چھوٹا سا پودا سینکڑوں سال کی عمر

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ

اور یہ دنیا کی زندگی صرف ایک غفلت اور کھیل کا سامان ہے اور اُخروی زندگی

الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۵﴾

کا گھر ہی درحقیقت اصلی زندگی کا گھر کہلا سکتا ہے - کاش کہ وہ لوگ جانتے - ۴۵ھ

تک چلا جاتا ہے - بعض پھول ایک یا دو دن میں سوکھ جاتے ہیں - لیکن انگور کا درخت ہزار سال تک کی عمر بھی پا لیتا ہے - بڑ کا درخت سینکڑوں سال تک چلا جاتا ہے - اسی طرح جب آسمان سے روحانی بارش نازل ہوتی ہے تو کفر کی زمین بھی اپنی روئیدگیاں ظاہر کرنا شروع کر دیتی ہے اور ایمان کی زمین بھی پھل اور پھول پیدا کرنا شروع کر دیتی ہے - لیکن کفر کا سبزہ صرف چند دن بہار دکھانے کے بعد سوکھ جاتا ہے اور کوڑا کرکٹ بن جاتا ہے لیکن ایمان کا درخت اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ کا مصداق بن جاتا ہے - اُس کی جڑیں پاتال تک چلی جاتی ہیں اور اُس کی شاخیں آسمان تک پھیل جاتی ہیں -

پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ کفار کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ پر تمہارے اندر جو ایک غیر معمولی حرکت پیدا ہوئی ہے اور تمہاری قوموں میں اُبھار شروع ہُوا ہے یہ اسی روحانی بارش کا نتیجہ ہے جو ہماری طرف سے نازل ہوئی ہے کیونکہ بارش کے نتیجہ میں جس طرح اعلیٰ درجہ کا آم اور انگور ترقی کرتا ہے اُسی طرح حنظل اور آک بھی ترقی کرتا ہے - مگر یہ مت سمجھو کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاؤ گے - کیونکہ تمہاری مثال اُن گھاس کی سی ہے جو چند دنوں کے بعد ہی گل سڑ جاتا ہے اور پھر اس میں اتنی سڑاند پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا رنگ بھی چھوڑ دیتا ہے اور مختلف قسم کی بیماریوں اور وباؤں کا موجب بن جاتا ہے - پس قانونِ قدرت کے اس نظارہ کو دیکھتے ہوئے تمہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں جلدی کرنی چاہیئے تاکہ تم ایک پھلدار درخت بنو اور دنیا تمہارے وجود سے فائدہ اُٹھائے - تھوہر یا آک یا حنظل کا درخت مت بنو -

۴۵ھ **تفسیر**:- اس آیت میں دنیوی اور اُخروی زندگی کا مقابلہ کرتے ہوئے منکرینِ اسلام کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر تم سوچو اور غور سے کام لو تو تمہیں معلوم ہو کہ یہ دنیا لَہْو اور لَعِب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی - یعنی دنیوی کاموں کی اگر تقسیم کی جائے تو اُن کا ایک حصّہ تو لہو قرار پائیگا اور دوسرا لَعِب - لَہْو سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو غفلت پیدا کرنے والی ہیں - اور لَعِب سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو اپنے اندر کھیل کود کا رنگ رکھتی ہیں - اور درحقیقت انسانی زندگی انہی دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے - یعنی زندگی حرکت اور سکون کے ایک دَور کا نام ہے جو یکے بعد دیگرے آتا چلا جاتا ہے - اور یہ دونوں چیزیں جسمانی قوتوں کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں - گویا لَعِب حرکت کا وہ زمانہ ہے جس میں انسان مختلف طریق پر اپنی قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے - اور لَہْو انسان کی وہ حالت ہے جس میں وہ آرام اور سکون حاصل کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے - یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کا ہر انسان محتاج ہے خواہ وہ روحانیت کے بڑے سے بڑے مقام پر بھی کیوں نہ پہنچا ہُوا ہو - کیونکہ انسانی زندگی

اگر ایک فرد حرکت کے ساتھ قائم ہے خواہ یہ حرکت پیر کے ذریعہ ہو یا چلنے پھرنے کے ذریعے یا دنیوی مشاغل اور کاروبار میں حصہ لینے سے تو دوسری طرف کوئی انسان نہیں جو آرام اور سکون کا محتاج نہ ہو۔ اگر نیند کے ذریعے دماغی اور اعصابی سکون حاصل نہ ہو یا خوشگوار مناظر اور خوشگوار آب ہوا اس کیلئے سکون اور لذت کا موجب نہ ہوں تو وہ اپنی زندگی کو کسی صورت میں بھی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ غرض لہو اور لعب کے ساتھ ہی یہ دنیوی زندگی قائم ہے اگر ان دونوں کو انسانی زندگی میں سے نکال دو تو ساتھ ہی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر فرمایا کہ اس لہو اور لعب کا اصل مقصد یہ ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی محبت کے حصول کی کوشش کرو۔ گویا یوں سمجھ لو کہ تمہارے مقصدِ حیات کے مقابلہ میں جو اُخروی زندگی ہے اس دنیا کا مقام صرف لہو اور لعب کا سا ہے جس طرح ایک طالب علم کے لئے کھیل کود ضروری ہے اسی طرح تمہارے لئے بھی دنیوی مشاغل ضروری ہیں۔ کیونکہ اسلام بدھ مذہب کی طرح اپنے پیرؤوں کو یہ نہیں کہتا کہ دنیا چھوڑ دو اور رات دن کسی جنگل میں بیٹھ کر خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے رہو بلکہ وہ لَھْو اور لَعِب کو بھی ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ اگر ہر وقت آخرت کا خوف ہی انسان کے ساتھ لگا رہے تو وہ ہلاک ہو جائے۔ مگر لہو اور لعب میں ہر وقت مستغرق رہنا بھی انسان کے اصل مقصد کو تباہ کر دیتا ہے جس طرح کھیل تو ایک طالب علم کے لئے ضروری ہے لیکن اگر وہ ہر وقت کھیل کود میں مشغول رہے تو وہ اپنی تعلیم کو نقصان پہنچائیگا اور کوئی بھی اُس کے اِس فعل کو مستحسن قرار نہیں دیگا۔ اِسی طرح اسلام دنیوی لذّات سے متمتع ہونے کی اجازت تو دیتا ہے۔ مگر وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ انسان دنیا میں ہی مشغول ہو جائے اور آخرت کو نظر انداز کر دے۔

پس وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ فرما کر اللہ تعالیٰ نے منکرین اسلام کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ہم نے تو اس دنیا کو آخرت کے لئے ایک سیڑھی کے طور پر بنایا تھا اور چاہا تھا کہ تم اس دنیا کا اتنا ہی مقام سمجھو۔ جتنا ایک طالب علم کھیل کا مقام سمجھتا ہے۔ مگر تم نے اپنی نادانی سے دنیا کو ہی اپنا منتہیٰ سمجھ لیا اور اُسی کے لئے تم نے اپنی تمام مساعی وقف کر دیں۔ حالانکہ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ اصل زندگی تو دارِ آخرت کی زندگی ہی ہے۔ اس جگہ حَيَوَان کا لفظ حَيٰوة کے مبالغہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے کہتے ہیں زَيْدٌ عَدْلٌ یعنی زید کا انصاف کے ساتھ اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ زید ہی مجسّم انصاف ہے تو یہ بالکل جائز ہو گا اسی طرح فرمایا کہ گو اس جہان میں بھی نہیں ایک زندگی حاصل ہے لیکن چونکہ انسان حقیقی طور پر دارِ آخرت میں ہی زندہ ہوگا اور اصل زندگی وہی ہے جو اگلے جہان میں حاصل ہوگی۔ اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ دارِ آخرت ہی حقیقی زندگی ہے تو یہ بالکل جائز ہے۔

بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اسجگہ محض اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کی تنقیص کی گئی ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ وہ زندگی جو خود خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ اور جو تمام انبیاءؑ و اولیاءؒ اور صلحاءؒ کو حاصل ہوتی ہے وہ بیہودہ اور فضول کس طرح ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو بار بار فرماتا ہے کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کر دیا ہے اور تم ہمارے پاس نہیں آؤ گے۔ اسی طرح وہ زمین و آسمان کی پیدائش کو بھی بڑی حکمتوں پر مبنی قرار دیتا ہے۔ پھر انسانی زندگی جو اسی پیدائش کا ایک حصہ ہے بے کار کس طرح ہو گئی۔ اگر یہ زندگی بے کار ہوتی تو اللہ تعالیٰ بار بار اپنے احسانات کیوں گنواتا۔ اور کیوں فرماتا کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ اپنے رب کی نعمتوں کو یاد کرو اور اُن کا شکر ادا کرو۔ پس وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ فرما کر اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی کی مذمت نہیں کی بلکہ اسے اُخروی حیات کا ایک ضروری حصہ اور اُس کا ابتدائی زینہ

فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

اور جب وہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اپنی عقیدت کو خالصۃً اللہ (تعالیٰ) کیلئے کرکے اُس سے دُعا مانگتے ہیں۔

فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۶﴾ لِيَكْفُرُوْا

مگر جب وہ اُنکو خشکی کی طرف نجات دیکر پہنچا دیتا ہے تو اچانک پھر شرک کرنے لگ جاتے ہیں۔ تاکہ ہم نے جو کچھ اُنہیں دیا ہے اس کا انکار کردیں (اور اس

بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ۚۛ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۛ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

انعام کو خدا کے سوا دوسرے شریکوں کی طرف منسوب کردیں) اور اس (عارضی توبہ) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (اللہ تعالیٰ اُنکو چھوڑ دیتا ہے اور) وہ ایک عرصہ تک دنیوی سامانوں

قرار دیا ہے جس پر قدم رکھے بغیر اُخروی حیات کی صلاحیتیں انسانی رُوح میں پیدا نہیں ہوتیں۔

اس دنیوی زندگی کو لہو ولعب قرار دیکر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو توکل کا بھی شاندار سبق دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے سامان درحقیقت ایک کھیل کی سی حیثیت رکھتے ہیں جس طرح کھیل میں خواہ بادشاہ بن جاؤ یا فقیر دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ بادشاہ بن کر انسان متکبر ہو جاتا ہے نہ فقیر بن کر رونے لگتا ہے اس طرح مومن سمجھتا ہے کہ میری اصل زندگی تو میرے خدا کے پاس اگلے جہان میں ہے۔ یہ دنیوی زندگی تو محض ایک کھیل ہے اور جب اس کا یہ نقطۂ نگاہ ہو جاتا ہے تو پھر اگر اُسے کروڑوں روپے بھی مل جائیں تو مال کی ناجائز محبت اُس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی اور اگر اُسے فاقے بھی کرنے پڑیں تب بھی اُسے خدا تعالیٰ کے متعلق کوئی شکوہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بالمقابل چونکہ کافر دنیا کو ہی اصل چیز سمجھتے ہیں۔ اس لئے اگر انہیں کروڑوں مل جائیں تو وہ سرتا پا دنیا کے کیڑے بن جاتے ہیں اور اگر مال و دولت چھینی جائے تو ان پر موت آجاتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق شکوہ و شکایت کا باب کھول دیتے ہیں۔ گویا وہ کسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا پر مطمئن نہیں ہوتے اگر انہیں اموال اور جائدادیں مل جائیں تو بجائے اس کے کہ اُن کی خدا تعالیٰ کی طرف نظر اُٹھے وہ انہیں اپنی لیاقت اور قابلیت کا نتیجہ قرار دے دیتے ہیں اور اگر اُن سے مال چھن جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق شکوہ و شکایت کرنے اور اُسے (نعوذ باللہ) ظالم قرار دینے لگ جاتے ہیں غرض کافر کسی حالت میں بھی مطمئن نہیں ہوتا اور مومن کو ہر حالت میں اطمینانِ قلب نصیب ہوتا اور وہ رضاء بالقضاء کا نمونہ ہوتا ہے۔

اوپر چونکہ کفار کو مخاطب کیا گیا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پھر انہیں اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر تم سمجھتے کہ دنیا دارِ آخرت کی تیاری کے لئے رکھی گئی ہے اور اس کی حیثیت لہو و لعب کی سی ہے تو تم دنیا پر لات مار کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کر لیتے اور سمجھتے کہ مادی ترقیات روحانی ترقیات کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ مگر تم نے تو دارِ آخرت پر دنیوی زندگی کو ترجیح دے دی اور چند کھوٹے پیسوں کے لئے آسمانی دولت کو رد کر دیا۔

۴۶ تفسیر:۔ اس میں بتایا کہ لوگ دنیا سے اپنا دل تو لگاتے ہیں۔ لیکن انہیں اپنی زندگیوں میں ہی ایسے کئی حوادث اور واقعات پیش آجاتے ہیں جن کے نتیجہ میں

انہیں خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔ مگر بدقسمت انسان جب مشکلات سے نجات پا جاتا ہے تو وہ پھر خدا تعالیٰ کو بھول جاتا ہے اور یہ چکر اسی طرح چلتا چلا جاتا ہے۔ درحقیقت اگر ہم غور سے کام لیں تو انسان پر دنیا میں کبھی تو ایسی حالت آتی ہے کہ وہ اپنی ساری ضرورتیں خود پوری کر لیتا ہے۔ اُس وقت اُس کی توجہ اپنی طاقت اور قوت کی طرف جاتی ہے اور وہ اپنی کوشش پر گھمنڈ کرتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا اور اپنی مدد کے لئے اپنے عزیزوں دوستوں اور رشتہ داروں کا محتاج ہوتا ہے اُس وقت اُس کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ رشتہ داری بھی اچھی چیز ہے۔ پھر ایک وقت اس کے اہل و عیال اور متعلقین بھی اُس کے کام نہیں آ سکتے اور اس کے ملنے والے اور دوست اُس کی مدد کر سکتے ہیں۔ ایسے وقت میں اُس کی نظر اپنے دوستوں پر پڑتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ دوست احباب بھی دُنیا میں بہت مفید ہوتے ہیں جو آڑے وقت کام آتے ہیں۔ پھر کبھی ایسا زمانہ اُس پر آتا ہے کہ دوست بھی اُس کا ساتھ نہیں دے سکتے ایسے اوقات میں وہ بعض دفعہ بعض نظاموں کی طرف توجہ کرتا ہے اور وہ سلسلہ یا جماعت جس سے وہ تعلق رکھتا ہے اُسکی مدد کرتی ہے۔ اس طرح جب اس کا کام بن جاتا ہے۔ تو اُس کے دل میں خیال آتا ہے کہ نظام سے تعلق اچھی بات ہے اور سلسلہ یا جماعت سے اُس کی وابستگی بڑھ جاتی ہے۔ پھر کوئی وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اُسکی اہل و عیال رشتہ دار۔ دوست احباب کوئی بھی اس کی مدد نہیں کر سکتے بلکہ نظام بھی اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اُسوقت حکومت جس کے ساتھ وہ تعلق رکھتا ہے اُس کی مدد کرتی ہے۔ تب وہ محسوس کرتا ہے کہ حکومت بھی اچھی چیز ہے۔ پھر کوئی وقت ایسا بھی آتا ہے کہ حکومت بھی انسان کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ایسے وقت میں عام انسانی ہمدردی اس کے کام آتی ہے تب اُس کی نظر تمام دنیا پر پڑتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسانوں میں کیسا عجیب رشتہ قائم کیا ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کے اہل و عیال۔ دوست احباب۔ قوم یا نظام بلکہ حکومت اور انسانی ہمدردی کی مدد سے بھی اُسے کامیابی ناممکن نظر آتی ہے۔ ایسی صورت میں کامیاب ہونے پر وہ سمجھتا ہے۔ میری کامیابی میں کچھ حصّہ غیبی امداد کا بھی ہے اور جس حد تک اُسے غیبی امداد کا یقین ہوتا ہے وہ خیال کرتا ہے کہ یہ کام خدا تعالیٰ نے کر دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو کام اُس نے خود کیا۔ رشتہ داروں اور دوستوں نے کیا۔ نظام نے کیا۔ قوم یا حکومت نے کیا یا عام انسانی ہمدردی نے کیا وہ بھی سب خدا تعالیٰ نے ہی کیا تھا۔ لیکن اُن میں چونکہ ظاہری ذرائع موجود تھے خدا تعالیٰ کی طرف اُسکی نظر نہیں اُٹھی تھی۔ لیکن جب اُسے کچھ غیبی امداد کا خیال ہُوا۔ اُس وقت اُسے خدا تعالیٰ کا خیال آیا۔ بہر حال انسانی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام انسانی تدابیر اس کے لئے باطل ہو جاتی ہیں اور صرف خدا تعالیٰ ہی اس کے سامنے رہ جاتا ہے۔ زیرِ تفسیر آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہی مضمون بیان فرمایا ہے کہ ایسے وقت مشرک اور دہریہ بھی بے اختیار ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اِس کی مثال دی ہے۔ کہ جب طوفان پیدا ہوتا ہے تو مشرک بھی کہہ اُٹھتے ہیں کہ اِسوقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں۔ اسوقت انسان کا قلب اور احساسات پورے طور پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی بچانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ ۱۹۰۵ء کا زلزلہ جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئی کے مطابق آیا

اُس وقت لاہور میڈیکل کالج میں ایک طالب علم تھا جو روزانہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق بحث کیا کرتا تھا۔ جب زلزلہ آیا اور اُس نے محسوس کیا کہ اب چھت گر کے ہی رہے گی تو وہ بے اختیار رام رام کہتے ہوئے کمرہ سے بھاگ کر باہر آگیا۔ اگلے دن اُس کے دوستوں نے اُس سے پُوچھا کہ تمہیں اُس وقت کیا ہو گیا تھا اور تم نے کیوں رام رام کہنا شروع کر دیا تھا۔ اُس نے کہا۔ معلوم نہیں اُس وقت کچھ عقل ہی ماری گئی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت اُس نے صحیح عقل سے کام لیا۔ جب بچانے والے دنیوی اسباب اُس کی نظر سے پوشیدہ ہو گئے تو اُسے ذاتِ باری کے سوا کوئی مددگار دکھائی نہ دیا۔ دراصل جب تک ایسے انسان کو دوسرے ذرائع نظر آتے رہیں وہ اُدھر متوجہ رہتا ہے۔ لیکن جب کوئی اَور ذریعہ نظر نہ آئے تو اُس وقت صرف اللہ تعالےٰ کی طرف ہی اُس کی نظر اٹھتی ہے

۱۹۱۸ء میں جب جرمنی نے اپنی ساری طاقت جمع کرکے اتحادی افواج پر حملہ کر دیا تو انگریزی فوج پر ایک وقت ایسا آیا کہ کوئی صورت اُس کے بچاؤ کی نہ رہی۔ سات میل لمبی [illegible] تہ و بالا ہو گئی۔ کچھ حصہ فوج کا ایک طرف سمٹ گیا اور کچھ حصہ دوسری طرف اور درمیان میں اتنا خلا پیدا ہو گیا کہ جرمنی کی افواج وہاں سے گذر کر پیچھے سے حملہ کرکے تمام فوج کو تباہ کر سکتی تھیں۔ اُس وقت جرنیل نے کمانڈر انچیف کو اطلاع دی کہ یہ حالت ہے اور میرے پاس سپاہی اتنے نہیں کہ اس صف کو درست کیا جا سکے۔ یہ ایسی حالت تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ آج ہماری تمام فوج تباہ ہو جائیگی اور انگلستان اور فرانس کا نام و نشان دنیا سے مٹ جائیگا انگریزی کمانڈر انچیف نے اُس وقت وزارت کو تار دیا کہ یہ وقت انتہائی بے بسی کا ہے۔ ہماری صف ٹوٹ چکی ہے اور ہر لحظہ تباہی کا خطرہ [illegible] ہے۔ جب [illegible] پہنچا تو وزیر اعظم دوسرے وزراء کے ساتھ مل کر کوئی مشورہ کر رہا تھا۔ اُس وقت مادہ پرست یورپ جس کی نگاہ کبھی خدا تعالےٰ کی طرف نہیں اُٹھتی اُس کی ایک زبردست مادہ پرست حکومت کا سب سے بڑا سردار جو اپنی طاقت و قوت اور شان و شوکت کے گھمنڈ میں مست رہتا تھا اُس نے بھی محسوس کیا کہ اسوقت کوئی ظاہری مدد نہیں جو ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا سکے۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ آؤ خدا سے دُعا کریں کہ وہ ہماری مدد کرے۔ چنانچہ وہ سارے کے سارے گھٹنوں کے بل جھک گئے اور انہوں نے خدا تعالےٰ سے دعا کی۔ اسکے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان کر دیئے۔ کہ جرمن سپاہیوں کو خبر تک نہ ہو سکی کہ اُن کے سامنے فوج کی صف ٹوٹ چکی ہے۔ اُسوقت کمانڈر انچیف نے اپنے سٹاف کے ایک افسر کو بلایا اور اُسے کہا کہ اسوقت یہ حالت ہے اور سوائے تمہارے مجھے کوئی ایسا افسر نظر نہیں آتا جو اس کا انتظام کر سکے۔ بس تم جاؤ۔ اور مجھ سے دوسرا سوال نہ کرو۔ ایسے موقعہ پر وہ کہہ سکتا تھا کہ عجیب مصیبت ہے۔ فوج تو دی نہیں جاتی مگر کہا جاتا ہے دشمن کا مقابلہ کرو۔ مگر وہ افسر بھی سمجھ گیا کہ اس وقت فوج کا مہیا ہونا ناممکن ہے۔ اُس نے موٹر لی اور سیدھا اُس مقام پر پہنچا جہاں باورچی۔ نانبائی دھوبی۔ موچی۔ درزی اور مہتر وغیرہ تھے اور انہیں کہا کہ تمہارے دلوں میں حسرت پیدا ہوتی ہو گی کہ ہمیں ملک کے لئے لڑنے کا موقعہ کبھی نہیں دیا گیا۔ لیکن آج تمہارے لئے ایک موقعہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہماری صف ٹوٹ چکی ہے اور ملک کی نگاہ اس وقت تم پر پڑ رہی ہے کہ تم آگے بڑھو اور صف بندی کر دو۔ اس پر جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا لیکر چل پڑا اور جا کر صف بندی کر دی اور یہ نظر آنے لگا کہ فوج کھڑی ہے اس طرح چوبیس گھنٹے تک مقابلہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ دوسرے مقاموں سے فوج سمیٹ کر وہاں جمع کر دی گئی۔ یہ [illegible] کا ایک نظارہ ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ

کیا انہیں معلوم نہیں کہ ہم نے حرم (یعنی مکہ) کو امن کی جگہ بنا دیا ہے۔ اور ان لوگوں کے اردگرد سے (یعنی مکہ کے باہر سے) لوگ اُچک

حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿۶۸﴾

لئے جاتے ہیں تو کیا وہ جھوٹ پر تو ایمان لاتے ہیں اور اللہ (تعالیٰ) کی نعمت کا انکار کرتے ہیں؟ ۷۴ـہ

جب خدا کے سوا انہیں کوئی مدد کرنے والا نظر نہیں آتا تو اُس وقت وہ بھی خدا کے قائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں۔ اور اس کامیابی کو اپنی تدبیر اور زور بازو کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یا اسے بعض دیوتاؤں کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یہ لوگ آخر کب تک ایسا کرتے چلے جائیں گے۔ بیشک ہم انہیں ایک عرصہ تک توبہ کا موقعہ دیتے ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں وہ دنیوی سامانوں سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ لیکن ایک دن وہ ان مواقع سے بھی محروم ہو جائیں گے اور پھر دیکھ لیں گے کہ ان کا کوئی جھوٹا معبود اُن کی مدد نہیں کر سکیگا اور وہ عذاب کی طوفانی موجوں سے رہائی کی کوئی صورت نہیں پائینگے۔

۷۴ـہ تفسیر:۔ توحید باری تعالیٰ کے ثبوت میں اللہ تعالیٰ نے پہلے تو فطرتِ انسانی کی شہادت کو پیش کی تھا اور بتایا تھا کہ مشرک لوگ خدا تعالیٰ کا انکار تو کرتے ہیں مگر جب مصیبت آتی ہے اور اُن کے دل اور دماغ پر سے وہ پردے دُور ہوتے ہیں جو قومی تعصب یا جہالت وغیرہ کے نتیجہ میں پڑ جاتے ہیں تو وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر جھک جاتے اور اُس کو خلوص کے ساتھ پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کی یہ فطرتی پکار اِس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ اُن کے دل خدا تعالیٰ کی عظمت اور اُس کی کبریائی کو محسوس کرتے ہیں ورنہ مصیبت کے وقت اُن کی فطرت اس طرح عُریان ہو کر خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرنے پر کیوں مجبور ہوتی۔ اب اللہ تعالیٰ اس توحید کے ثبوت کے لئے خانہ کعبہ کے وجود کو پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ عرب میں چاروں طرف لوٹ گھسوٹ اور قتل و غارت کا بازار گرم رہتا ہے۔ اور کسی کی جان اور عزت و آبرو محفوظ نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن مکہ والوں کو حدود حرم میں رہنے کی وجہ سے اتنا بڑا امن حاصل ہے کہ کوئی اُن پر انگلی تک نہیں اٹھا سکتا یہ عظیم الشان انعام آخر مکہ والوں کو کیوں حاصل ہوا؟ کیا اس میں اُن کی کسی ذاتی قابلیت کا دخل ہے۔ یا اس کے پیچھے صرف وہ دعائے ابراہیمی کام کر رہی ہے جو بیت اللہ کی بنیادیں اُٹھاتے وقت انہوں نے کی اور اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ رنگ میں التجا کی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۷) یعنی اے میرے رب! اس جگہ کو ایک پُرامن شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں انہیں ہر قسم کے پھل عطا فرما۔ پھر جبکہ دعائے ابراہیمی کی وجہ سے ہی انہیں امن میسر آیا اور دعائے ابراہیمؑ کی وجہ سے ہی انہیں رزق ملا اور دعائے ابراہیمی کی وجہ سے ہی انہیں عزت اور شہرت نصیب ہوئی تو انہیں سوچنا چاہیئے کہ ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کیا اس لئے کی تھی کہ یہاں خدائے واحد کی بجائے تین سو ساٹھ بُت رکھ دیئے

جائیں اور انسان اپنی جبینِ نیاز رب العالمین کی بجائے پتھر کے بےجان بتوں کے آگے جھکا دے یا اس لئے کی تھی کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو حکم دیا تھا کہ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۶) یعنی میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں۔ اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے ہمیشہ پاک و صاف رکھو جب اس گھر کی تعمیر ہی خدائے واحد کی عبادت کا ایک مرکز بنانے کے لئے کی گئی تھی اور جبکہ انہی دعاؤں اور کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے مکہ والوں کو تمام عرب میں ایک نمایاں اعزاز حاصل ہوا تو یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا اتنا عظیم الشان نشان اُنکی آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور بیت اللہ کی ایک ایک اینٹ انہیں خدائے واحد کی عبادت کی طرف متوجہ کر رہی ہے پھر بھی اُن کی خطا کار پیشانی ہمیشہ باطل کے سامنے جھکتی ہے اور وہ اپنے عمل سے احسان ناشناسی کا بدترین مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔

یہ معنے تو صرف مکہ والوں کی مناسبت کے لحاظ سے کئے گئے ہیں لیکن ایک دوسرے نقطۂ نگاہ سے اس آیت کو دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں بیت اللہ کو جو توحید کا مرکز ہے امن عالم کے قیام کا ایک زبردست ذریعہ قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا کو حقیقی امن صرف اسی صورت میں میسر آسکتا ہے جب وہ توحید کے اس مرکز سے تعلق رکھے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت اتنے مذاہب پائے جاتے ہیں اور ان مذاہب کی تعلیمیں آپس میں اس قدر مختلف ہیں اور ان مختلف مذاہب کے پیرو اپنے خیالات میں اتنا اختلاف رکھتے ہیں کہ بظاہر دنیا میں کبھی اتحاد پیدا ہونا ناممکن دکھائی دیتا ہے صرف ایک ہی نقطہ مرکزی ہے جس پر تمام مذاہب کا اتحاد ہو سکتا ہے اور وہ توحید باری تعالیٰ کا نقطہ ہے۔ جس طرح بھائی بھائی کا آپس میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن باپ پر سب کا اتحاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مذاہب کا آپس میں ہزار اختلاف ہو لیکن توحید باری تعالیٰ ایک ایسا عقیدہ ہے جس سے دنیا کا کوئی مذہب اختلاف نہیں کر سکتا اور یہی حقیقی مواخات پیدا کرنے کا ایک زبردست ذریعہ ہے جب تک دنیا یہ نہ سمجھے کہ زید اور بکر اور عمر اور خالد سب ایک ہی رب کی مخلوق ہیں اور انہیں بھی اُسی خدا نے پیدا کیا ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اُس وقت تک ایک دوسرے کی تحقیر اور عناد کا جذبہ دلوں سے مٹ نہیں سکتا۔ اسلام نے امن عالم کے قیام کے لئے سب سے پہلے اسی نقطۂ مرکزی کو لیا۔ اور توحید باری تعالیٰ کو دنیا میں قائم کیا اور انسانی قلوب میں یہ امر راسخ کیا کہ اسلام کا خدا رَبُّ الْعَالَمِیْن ہے۔ یعنی وہ اُسی طرح مسلمانوں کا خدا ہے جس طرح ہندوؤں اور عیسائیوں اور یہودیوں اور زرتشتیوں وغیرہ کا خدا ہے۔ جب ایک عیسائی اور یہودی بھی ہمارے خدا کا ویسا ہی بندہ ہے جیسے ایک مسلمان تو ایک سچے مسلمان کے دل میں کسی ہندو یا عیسائی یا یہودی یا زرتشتی کا بغض کبھی پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ان سب کو اپنا بھائی تصور کرے گا اور اس کی محبت کا ہاتھ اُن سب کی طرف اُسی شوق کے ساتھ بڑھے گا جس شوق کے ساتھ ایک مسلمان کی طرف بڑھتا ہے۔

پس اسلام نے امن عالم کے قیام کے لئے توحید کا سبق پیش کیا اور پھر اس سبق کو ہمیشہ کے لئے ذہنوں میں راسخ کرنے کے لئے اُس نے مسلمانوں کو بیت اللہ کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ (سورۃ آل عمران آیت ۹۷) یعنی سب سے پہلا گھر جو تمام دنیا کے

فائدہ کے لئے بنایا گیا تھا وہ ہے جو مکّہ میں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسا گھر جو تمام دنیا کے اتحاد کا نقطۂ مرکزی تھا اُسے وہ مذاہب نہیں بنا سکتے تھے جن کی نگاہ کبھی قومی حد بندیوں سے آگے نہیں گئی۔ ایسا گھر صرف خدا تعالےٰ کے الہام اور اُسی کے منشا کے مطابق تعمیر ہو سکتا تھا۔ سو خدا نے تمام دنیا کو ایک نقطۂ مرکزی پر جمع کرنے کے لئے خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی اور زمانۂ ابراہیمیؑ میں اِس عمارت کی تجدید ہوئی اور دنیا کے سامنے پہلی دفعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ اعلان کیا کہ یہ گھر اس لئے بنایا گیا ہے کہ یہاں لوگ آئیں۔ اس مقدس گھر کا طواف کریں۔ اس میں عبادت اور ذکرِ الٰہی کریں اور دین کے لئے اپنی زندگیاں وقف کریں۔

اللہ تعالےٰ اپنے اس احسان کی طرف زیرِ تفسیر آیت میں توجہ دلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ ہم نے بیت اللہ کے ذریعے امنِ عالم کے قیام کی کتنی زبردست تدبیر کی ہے اور کس طرح ہم نے عربی اور غیر عربی مشرقی اور مغربی۔ گورے اور کالے۔ سُرخ اور زرد سب کو ایک مرکز پر جمع کر دیا ہے اور پھر اس گھر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایسی پُر امن تعلیم عطا فرمائی ہے جس پر عمل کرنے والے کا نہ اپنا امن برباد ہوتا ہے نہ اُس کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کا امن برباد ہوتا ہے۔ بلکہ اسلامی تعلیم کے ماتحت بیت اللہ سے سچا تعلق رکھنے والا وہی سمجھا جا سکتا ہے جس کے ہاتھ اور جس کی زبان کے شر سے دنیا کا ہر شخص محفوظ ہو۔ گویا بیت اللہ کے ذریعہ نہ صرف ایک مدرسۂ امن کھول دیا گیا ہے بلکہ جو لوگ اس مدرسہ میں تعلیم پاتے ہیں۔ وہ بھی دنیا میں امن کے علمبردار بن جاتے ہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ بدظنی نہیں کرتے۔ وہ ظلم نہیں کرتے۔ وہ بے جا غضب سے کام نہیں لیتے۔ وہ لالچ میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اور یہی چیزیں دنیا کا امن برباد کرنے والی ہوتی ہیں۔ پھر خدا تعالےٰ کے ساتھ ایک سچّا تعلّق قائم ہو جانے کی وجہ سے انہیں اطمینانِ قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ جبکہ باقی دنیا لالچ اور حرص کی آگ میں جل رہی ہوتی ہے۔ اور لوگوں کو نہ اپنے قلوب میں اطمینان نظر آتا ہے۔ اور نہ اُن کے ساتھ تعلّق رکھنے والے اپنے آپ کو مطمئن پاتے ہیں۔ اِسی امر کی طرف وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ کعبۃ اللہ سے تعلّق رکھنے والوں نے تو خدائے واحد کی تعلیم پر عمل کر کے ہمیشہ کا امن حاصل کر لیا۔ لیکن اُن کے ارد گرد جو اقوام بس رہی ہیں وہ اسلامی تعلیم کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے بدامنی کا شکار ہو رہی ہیں۔ ان میں لڑائیاں بھی ہوتی ہیں۔ اُن میں جھگڑے اور فسادات بھی ہوتے ہیں اُن کے مال و اسباب بھی لُوٹے جاتے ہیں۔ غرض امن صرف انہی لوگوں کو میسر ہے۔ جو خدائے واحد پر ایمان لا کر بیت اللہ کے ساتھ سچّا تعلّق رکھتے ہیں۔ باقی سب دُنیا میں بدامنی ہی بدامنی پائی جاتی ہے اور ہر دل بے چینی اور اضطراب کا شکار ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس نمایاں امتیاز کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب بیت اللہ کے ذریعے دنیا میں اتنا بڑا انقلاب پیدا ہو چکا ہے تو کیا اِس کے بعد بھی انہیں اپنی باطل سکیموں کی کامیابی پر یقین ہے اور وہ خدا تعالےٰ کے اِس عظیم الشان انعام کی ناقدری کرتے ہیں جو خدا تعالےٰ نے اُن کی بے چینی اور خلش کو دُور کرنے کے لئے خود آسمان سے نازل فرمایا ہے اگر وہ عالمگیر امن قائم کرنے کے خواہشمند ہیں تو اس کا طریق یہی ہے کہ وہ خدائے واحد پر ایمان لا کر بیت اللہ سے تعلّق رکھنے والے گروہ میں شامل ہو جائیں۔ کیونکہ سچّا امن کبھی بھی روحانیت کے درست ہوئے بغیر دنیا میں قائم نہیں ہو سکتا۔

دنیا کوشش کر رہی ہے کہ ہتھیاروں کے ساتھ صلح کو قائم رکھے۔ قانون کے ساتھ صلح کو قائم رکھے یا عقل کے ساتھ

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا أَوْ

اور جو شخص اللہ (تعالیٰ) پر جھوٹ باندھ کر افترا کرتا ہے اُس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے؟ یا (اس سے) جو

كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ أَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ

سچی بات کو اُس وقت جھٹلاتا ہے جب وہ اُس کے پاس آجاتی ہے۔ کیا ایسے کافروں کی جگہ

مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۹﴾

جہنم میں نہیں ہونی چاہیئے؟ ۶۸

صلح کو قائم رکھے۔ لیکن یہ تینوں چیزیں ناقص ہیں گو اپنے اپنے دائرہ میں ضروری بھی ہیں۔ یہ تینوں چیزیں جب تک روحانیت کے ساتھ نہ ہوں اُس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا۔ ہتھیاروں کے ساتھ اس لئے امن قائم نہیں رکھا جا سکتا کہ ہتھیاروں کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے اور پھر یہ عادت ایسی پڑ جاتی ہے کہ صلح کے بعد بھی صلح کرانے والی قومیں ہتھیار جمع کرتی چلی جاتی ہیں۔ جس طرح ایک مالدار بھرے ہوئے بٹوے کے بغیر سفر نہیں کر سکتا حالانکہ غریب آدمی چند پیسوں کے ساتھ سفر پر نکل کھڑا ہوتا ہے، اسی طرح ہتھیار جمع کرنے والی قومیں ہتھیاروں کی ضرورت کے ختم ہونے کے بعد بھی ہتھیار جمع کرتی چلی جاتی ہیں کیونکہ اپنے ہمسایہ سے ڈرنے کی عادت انہیں پڑ جاتی ہے اور کافی ہتھیاروں کے بغیر اُن کے دل اطمینان نہیں پاتے۔

قانون اس لئے امن قائم نہیں کر سکتا کہ قانون ظاہر پر حکومت کرتا ہے باطن پر نہیں۔ اور عقل اس لئے امن قائم نہیں کر سکتی کہ عقل اخلاق کے تابع نہیں ہوتی وہ یہ دیکھتی ہے کہ میرا یا میرے دوست کا فائدہ کس بات میں ہے وہ یہ نہیں دیکھتی کہ بعض ظاہری فائدے باطنی نقصان کا موجب ہوتے ہیں اور قریب کی دوستی بعید کو خراب کر دیتی ہے۔ لیکن روحانیت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو دائمی طور پر نیکی کی طرف مائل رکھتی ہے کیونکہ روحانیت نام ہے جذبات کے اخلاقی رنگ میں ڈھل جانے کا۔ اور جب جذبات اخلاقی رنگ میں ڈھل جائیں تو لازماً عقل بھی اُن کے ساتھ ہوتی ہے اور ایک ایسا دوام پیدا ہو جاتا ہے جس کو کوئی لالچ یا کوئی حرص یا کوئی خوف اپنے مقام سے ہلا نہیں سکتا۔

۶۸ تفسیر: فرمایا۔ اُس شخص سے بڑھ کر اَور کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر افترا کرتا اور اُس افترا کی جھوٹ پر بنیاد رکھتا ہے۔ اسی طرح اُس شخص سے بڑھ کر اَور کون ظالم ہو سکتا ہے جو کسی سچائی کو اُس وقت جھٹلاتا ہے جب وہ اُس کے پاس آجاتی ہے۔

اِفْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک تو وہ شخص ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ پر افترا تو کرتا ہے۔ مگر وہی بات اس کی طرف منسوب کرتا ہے جو اُس کے الہام میں موجود ہوتی ہے گو اُسے نہیں کہی جاتی۔ اور ایک اور شخص ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف ایک بات غلط طور پر منسوب کرتا ہے اور خدا تعالیٰ نے وہ بات کسی کتاب میں بھی نہیں کہی ہوتی۔ پس یہ شخص افترا بھی کرتا ہے اور اس افترا کی بنیاد بھی جھوٹ پر ہوتی ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ منکرینِ اسلام کو اس امر کی طرف

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

اور وہ (لوگ) جو ہم سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اُن کو ضرور اپنے رستوں کی طرف آنے کی توفیق بخشیں گے۔

توجہ دلاتا ہے کہ تم میں دو عیب پائے جاتے ہیں جو انتہائی طور پر خطرناک ہیں۔ ایک یہ کہ تم خدا تعالیٰ پر افترا کرتے ہو۔ اور افتراء بھی ایسا جس کی بنیاد کسی الہام پر نہیں بلکہ جھوٹ پر ہے۔ مثلاً تم کہتے ہو کہ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے حالانکہ یہ خدا تعالیٰ پر سراسر افترا ہے اور اُس کی بنیاد بھی کذب پر ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں کفار کے اس عقیدہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (سورۃ الکہف آیت ۶) یعنی انہیں اس بارہ میں کچھ بھی علم نہیں اور نہ ان کے باپ دادوں کو اس بارہ میں کوئی علم تھا۔ یہ ایک انتہائی خطرناک بات ہے جو ان کے مُنہ سے نکل رہی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ محض جھوٹ بول رہے ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (سورۃ اعراف آیت ۲۹) یعنی جب وہ کوئی بُرا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر چلتے دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد وہ ایک اور قدم آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے ہی ان کاموں کا حکم دیا ہے۔ تو کہدے۔ اللہ تعالیٰ کبھی بُری باتوں کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے متعلق جھوٹے طور پر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تم کچھ بھی نہیں جانتے۔

سورۂ انعام میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ (سورۂ انعام آیت ۱۰۱) یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنّوں میں سے کچھ شریک مقرر کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اُسی نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اور انہوں نے اس کیلئے جھوٹے طور پر بغیر کسی یقینی علم کے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کرلی ہیں۔ خدا تعالیٰ اِن تمام نقائص اور عیوب سے منزہ ہے اور جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں اُس سے وہ بہت بلند اور ارفع ہے۔

غرض مشرک قوموں میں ایک خرابی تو یہ پائی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر افتراء کرتے ہوئے محض جھوٹے طور پر اُس کی طرف بیٹے یا بیٹیاں یا بعض اور شریک منسوب کر دیتے ہیں۔ اور دوسری خرابی یہ پائی جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت اُن کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو وہ اُس کا انکار کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ جو ایک طرف تو خدا تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہوئے نہ شرمائیں اور دوسری طرف سچائی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں وہ اگر اپنی کامیابی کا تصوّر کریں تو یہ محض اُن کی خوش فہمی ہے۔ کامیابی کا گُر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا کیا جائے اور اس کی طرف سے آنیوالی ہدایت کو قبول کیا جائے۔ اور چونکہ یہ دونوں خوبیاں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے اب یہی فیصلہ مسلمانوں کے حق میں صادر ہونیوالا ہے اور کفر کیلئے ناکامی کی موت کے سوا اور کچھ مقدر نہیں۔

ع ۷ / ۳

وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۝

اور اللہ (تعالیٰ) یقیناً محسنوں کے ساتھ ہے۔ ۷۹

۷۹ تفسیر: کفار کی ناکامی اور کفر و شرک کی تباہی کی پیشگوئی کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے حسنِ انجام کا ذکر فرماتا ہے جنہوں نے اُس کی خاطر ہر قسم کے ابتلاؤں کو برداشت کیا۔ مگر اُن کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔ اور وہ خدا اور اُس کے رسول کے لئے متواتر قربانیاں کرتے چلے گئے۔ فرماتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا وہ لوگ جو ہماری محبت میں محو ہو کر ہمارے قرب کے حصول کے لئے کوشش کرتے ہیں اور ہمارے دروازہ پر ہر وقت گرے رہتے ہیں لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ہمارا سلوک اُن سے یہ ہوتا ہے کہ ہم انہیں یکے بعد دیگرے کامیابی اور عروج کے غیر متناہی راستوں کی طرف بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ گویا دشمن تو چاہتا ہے کہ اُن پر ہر قسم کی ترقیات کے دروازے بند کر دے۔ مگر خدا تعالیٰ کا سلوک اُن سے یہ ہوتا ہے کہ دشمن اگر ایک دروازہ بند کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اُن کے لئے سو دروازے کھول دیتا ہے اور اس طرح نہ صرف انہیں اپنے دنیوی مقاصد میں کامیابی ہوتی ہے بلکہ وہ خدا تعالیٰ کے قرب میں بھی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور اُن کا ہر قدم انہیں زیادہ سے زیادہ خدائی برکات اور انوار کا مورد بنا دیتا ہے۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو ایک ایسا امید افزا پیغام دیا ہے جو اُن کے مُردہ قلوب میں بھی زندگی کی لہر پیدا کرنے والا اور انہیں فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دینے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سی ناکامیاں اس مایوسی کی وجہ سے ہوتی ہیں کہ انسان سمجھتا ہے میرے لئے اب ترقی کا کوئی امکان نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یہ بات غلط ہے جو لوگ ہماری محبت اور ہمارے وصال کے حصول کے لئے جد و جہد کرتے ہیں انہیں ہم متواتر اُن راستوں کا پتہ بتاتے چلے جاتے ہیں جو ہم تک پہنچنے والے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ یہ جد و جہد اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق نہ ہو بلکہ ہمارے بتائے ہوئے اصول کے مطابق ہو جس پر فِيْنَا کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔

پھر یہ آیت نہ صرف مسلمانوں کے لئے ایک عظیم الشان مژدہ کی حامل ہے بلکہ اس میں غیر مسلم دنیا کے لئے بھی ایک بہت بڑا زندگی بخش پیغام ہے۔ بلکہ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے وجود پر بھی ایمان نہیں رکھتے انہیں بھی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کا خدا جو رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے اُس نے اپنی محبت کے دروازے دنیا کے تمام انسانوں کے لئے کھول رکھے ہیں پس اُن کے لئے بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر اُن کے دلوں میں سچائی کی تڑپ پائی جاتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اگر اس دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ہے تو انہیں بھی اس کا پتہ لگ جائے۔ اور وہ بھی شکوک و شبہات سے رہائی حاصل کر سکیں تو اس کا طریق یہ ہے کہ وہ سچے دل سے یہ دُعائیں کریں کہ اے خدا! اگر تُو ہے اور جس طرح تیرے ماننے والے کہتے ہیں تو غیر محدود طاقتوں کا مالک ہے تو تُو ہم پر رحم فرما اور ہمیں بھی اپنی طرف ہدایت دے اور ہمارے دل میں بھی یقین اور ایمان ڈال دے تاکہ ہم تیری محبت سے محروم نہ رہیں۔ اور تیرے وجود کے قائل ہو جائیں۔ اگر اس طرح سچے دل سے کوئی شخص دُعا کرے اور کم سے کم چالیس دن تک لگاتار کرتا چلا جائے

توخواہ اس کے دل پر کتنے بھی تاریک پردے پڑ چکے ہوں اور خواہ وہ کسی ملک کا باشندہ ہو رَبُّ الْعٰلَمِیْن خدا اُس کو ضرور ہدایت دیگا۔ اور وہ جلد دیکھ لے گا کہ اللہ تعالیٰ اُس پر ایسے رنگ میں اپنا وجود ظاہر کرے گا کہ اس کے دل سے شکوک و شبہات کی تاریکی بالکل دُور ہو جائیگی اور اُس کی رُوح خدا تعالیٰ کے آستانہ پر ناصیہ فرسا ہو جائے گی۔

پھر اس آیت کے ذریعہ تمام غیر مذاہب کے پیروؤں کو بھی یہ مژدہ سُنایا گیا ہے کہ اگر مذاہب کے اختلاف کو دیکھ کر اُن کے دلوں میں سچے مذہب کی جستجو کا احساس پیدا ہو اور وہ خدا تعالیٰ کے حضور دعاؤں اور گریہ وزاری سے کام لیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ اُن کی ہدایت کے سامان پیدا کر دیگا اور کسی نہ کسی رنگ میں اُن پر سچائی کے راستہ کا انکشاف فرما دیگا۔

مَیں نے دیکھا ہے ہر سال کبھی کم اور کبھی زیادہ لیکن بہر حال اوسطاً آٹھ دس ایسے غیر احمدیوں کی چٹھیاں مجھے ضرور آجاتی ہیں جو لکھتے ہیں کہ ہم پہلے احمدیت کے شدید مخالف تھے مگر اللہ تعالیٰ نے رؤیا کے ذریعہ ہمیں بتایا کہ احمدیت سچی ہے۔ اِس لئے ہم توبہ کرتے ہوئے احمدیت میں داخل ہوتے ہیں۔ پس جو شخص بھی سچے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اللہ تعالیٰ اُس کی ہدایت کے سامان پیدا فرما دیتا ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ اُس میں سنجیدگی پائی جائے اور اس کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول ہو۔ اور اگر وہ ایسا کرے تو خدا تعالیٰ کسی نہ کسی رنگ میں اس کے لئے ہدایت کا راستہ ضرور کھول دیتا ہے۔

پھر اس آیت میں مومنوں کو بھی یہ عظیم الشان بشارت دی گئی ہے کہ اگر وہ سچے دل سے کوشش کرتے رہیں کہ انہیں خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے قرب کے غیر متناہی راستوں پر چلاتا چلا جائیگا اور اُن کے دامن کو گوہرِ مقصود سے بھر دے گا اور انہیں اپنے الہام اور کلام سے مشرف فرمائیگا۔ اِسی امر کی طرف میری ایک رؤیا بھی اشارہ کرتی ہے۔ جو کچھ عرصہ ہُوا مَیں نے دیکھی۔ مَیں نے رؤیا میں دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے لوگ بیٹھے ہیں اور مَیں انہیں مخاطب کرکے کہتا ہوں کہ مختلف مذاہب میں جو اللہ تعالیٰ کا تصوّر پایا جاتا ہے وہ مَیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ چنانچہ پہلے مَیں نے بدھ مذہب میں جو خدا تعالیٰ کا تصوّر پایا جاتا ہے وہ اُن کے سامنے بیان کیا اور اِس پر ایک تقریر کی۔ صبح کے وقت جب مَیں نے اس رؤیا پر غور کیا تو مجھے معلوم ہُوا کہ خدا تعالیٰ کے تصوّر کے الفاظ اختصاراً بولے گئے ہیں۔ ورنہ اس سے مراد خدا تعالیٰ سے ملنے کا تصوّر تھا چنانچہ مَیں نے اُن کے سامنے جو تقریر کی وہ یہ تھی کہ دیکھو مچھلی پانی میں رہتی ہے لیکن اس پانی پر جو سورج کی شعاعیں گرتی ہیں یا دریا میں بہنے والی ریت کے ذرّات سے جو چمک پیدا ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ مچھلی پر ایسا اثر ڈالتی ہے کہ اُس پر چانے پڑ جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ چانے اس لئے ہوتے ہیں کہ دیر تک اُس پر ریت کی چمک اور سورج کی شعاعوں کا اثر ہوتا رہتا ہے اور آخر اُس کے جسم پر بھی ویسی ہی چمک آجاتی ہے۔ اگر سنہری ریت ہو تو یہ چانے سنہری بن جاتے ہیں۔ چنانچہ کئی مچھلیوں پر مَیں نے خود سنہری رنگ کے چانے دیکھے ہیں بلکہ بعض دفعہ اُن پر سات سات آٹھ آٹھ رنگ کے چانے ہوتے ہیں اور بعض دفعہ تو ایسے نیلے رنگ کا چانہ ہوتا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فیروزہ رکھا ہے۔ پھر مَیں کہتا ہوں کہ دیکھو جسم جو ایک کثیف چیز ہے اگر اِس اتصال کے نتیجہ میں دوسری چیزوں کا اثر قبول کر لیتا ہے تو رُوح جو ایک نہایت ہی لطیف چیز ہے وہ کیوں

اثر قبول نہیں کرے گی۔ پھر میں دوسرے مذاہب پر اسلام کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ دیکھو بُدھ مذہب نے صرف یہ بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ سے اتصال پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر اتصال پیدا کرنے کا طریق اُس نے نہیں بتایا۔ اور جو بتایا ہے وہ اتنا لمبا ہے کہ انسان کے لئے اس پر عمل ممکن نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بُدھ ساٹھ سال تک اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے لئے ایک جنگل میں بانس کے درخت کے نیچے بیٹھا اور خدا تعالیٰ کی عبادت اور ذکرِ الٰہی میں اتنا محو ہوا کہ اُس کے نیچے سے ایک درخت نکلا جو اُس کے جسم کو چیرتا ہوا سر سے نکل گیا۔ اور اُسے پتہ تک نہ لگا۔ اب یہ ایک لاتعنی سی بات ہے۔ جسے عقل قبول نہیں کر سکتی۔ لیکن اسلام نے نہ صرف وصالِ الٰہی کا تصور بیان کیا ہے بلکہ وہ راستہ بھی بتایا ہے جس پر چل کر انسان خدا تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً بُدھ مذہب نے دُعا کی قبولیت پر کوئی زور نہیں دیا۔ صرف نروانا پر زور دیا ہے۔ یعنی اُس نے کہا ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے نفس کی تمام خواہشات کو نکال دے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کے قرب کی خواہش بھی تو ایک خواہش ہی ہے اگر وہ سب خواہشات کو نکالے گا تو یہ خواہش کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ پس بُدھ نے متضاد بات کہی ہے۔ لیکن اسلام کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے وصال کے لئے کسی لمبے چوڑے مجاہدے کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جائے اور وہ ہمہ تن التجا بن کر دُعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اُسے اپنے قرب سے نوازے اور اُس کے لئے اپنی برکتوں کے دروازے کھولے تو اللہ تعالیٰ اُسے اپنا قرب عطا کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (بقرہ آیت) جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارے تو میں اُس کی دُعا کو

ضرور قبول کرتا ہوں۔ اب کُجا یہ طریق کہ بُدھ بانس کے درخت کے نیچے ساٹھ سال بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ اُس کے نیچے سے ایک درخت نکلا جو اُس کے سر کے پار ہو گیا۔ اور کُجا یہ آسان طریق کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور وہ جھٹ مل گیا۔

غرض اسلام میں اللہ تعالیٰ نے وصالِ الٰہی کا راستہ ایسا آسان کر دیا ہے کہ اگر مومن کے دل میں ذرا بھی محبت ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کو پا سکتا ہے۔ اسی طرح مَیں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ میں لکھنؤ میں ہوں اور کچھ رؤساءِ شہر مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہیں اور ایک کمرہ میں جس میں قالینوں کا فرش بچھا ہوا تھا بیٹھ گئے۔ اُس وقت ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ رُوح کے زندہ رکھنے کی کیا صورت ہے۔ مَیں نے انہیں جواب میں کہا کہ زندہ رہنے والی دو چیزیں ہوتی ہیں۔ جسم اور روح۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو نہ بول سکتا ہے نہ چل سکتا ہے نہ خود کوئی کام کر سکتا ہے۔ اُسے زندہ رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کیا سامان پیدا کیا ہے؟ یہی کہ اُس کے اندر رونے کی طاقت پیدا کر دی ہے۔ اُس کی ماں ہر وقت تو اُس کے پاس نہیں رہتی۔ کبھی کھانا پکا رہی ہوتی ہے کبھی کپڑے دھو رہی ہوتی ہے کبھی برتن مانجھ رہی ہوتی ہے۔ کبھی اپنی سہیلیوں سے باتوں میں مشغول ہوتی ہے اور کبھی اپنے خاوند سے چونچلے کر رہی ہوتی ہے۔ اُس وقت کبھی بچہ کو کوئی مرض ستاتا ہے۔ کبھی بھوک لگتی ہے۔ کبھی کوئی اور خطرہ پیش آتا ہے تو وہ زور سے چلّاتا ہے اور روتا ہے تو اُس کی ماں دوڑ کر اُس کے پاس آ جاتی ہے۔ یہ طریق خدا تعالیٰ نے جسم کو زندہ رکھنے کے لئے تجویز کیا ہے۔ بعینہٖ ایسا ہی طریق رُوح کے زندہ رکھنے کے لئے اُس نے تجویز کیا ہے۔ جب رُوح کمزور ہو اور اُس پر مُردنی طاری ہونے لگے۔

انسان سجدہ میں گر جاتا ہے۔ اور بچہ کی طرح خدا تعالیٰ
کو رو رو کر پکارتا ہے۔ تب خدا تعالیٰ بھی اُس کی
طرف دوڑ کر آتا ہے اور اُس کی ضرورت کو پورا کرتا
ہے۔ اُس وقت میری تقریر میں جوش پیدا ہو گیا اور
آواز بلند ہو گئی اور مَیں نے اُنگلی اُٹھا کر اور اُسے
اُلٹا کر کے قالین پر مارا۔ اور کہا۔ یُوں مصلّٰی پر سر رکھ
کر جب رُوح کا بچہ روتا ہے اور وہاں اُس کے آنسو
گرتے ہیں تو اسی طرح خدا تعالیٰ بھی اُس کی تکلیف کو
دُور کرنے کے لئے اُس کے پاس آتا ہے جس طرح ماں
بچہ کے پاس آجاتی ہے۔ غرض رونا اور آنسو ہی جسم
کو بچاتے ہیں اور رونا اور آنسو ہی رُوح کو بچاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا
میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ جیسے ایک محبت
کرنے والی ماں اپنے بچہ کی آواز پر دوڑتی ہے۔ اسی
طرح خدا تعالیٰ بھی اپنے بندے کی محبت کا جواب محبت
میں دینے کے لئے دوڑتا ہے۔ اور اگر ان محبت کے
تعلقات میں کبھی کوئی کوتاہی ہوتی ہے تو بندے کی
طرف سے ہوتی ہے ورنہ خدا تعالیٰ ایک محبت کرنے
والی ماں سے بھی بڑھ کر چاہتا ہے کہ اپنے بندوں سے
پیار کرے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے بندوں سے محبت کا
سلوک کرے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ بندے کو اپنی محبت
بھری گود میں اُٹھا کر اُسے تسلّی دے لیکن انسان وہ
انسان جو مصائب میں مبتلا ہوتا ہے وہ انسان جو آلام
کے بوجھ تلے دبا ہوتا ہے وہ انسان جو ہر وقت محتاج
ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس کی مدد کرے اور اُسے اِن
مصائب و آلام سے نجات بخشے اور وہ انسان جو ہر
وقت محتاج ہوتا ہے اِس بات کا کہ کوئی اُس کا سہارا
بنے اور اُسے تسلّی دے وہ محتاج اور کمزور انسان مستغنی
بنا رہتا ہے مگر وہ مستغنی خدا عرش پر بے تاب رہتا ہے
اِس بات کے لئے کہ اُس کا بندہ اُس کی طرف آئے اور
وہ اُسے اپنے قرب میں جگہ دے۔

پھر اِس آیت میں دُعاؤں کی قبولیت کی طرف
بھی اشارہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جو لوگ ہم
میں ہو کر اور ہم سے مدد مانگتے اور دُعائیں کرتے ہوئے
اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔
ہم اُن کے مقاصد کے حصول کے دروازے اُن پر کھول
دیتے ہیں اور ناممکن دکھائی دینے والی باتیں بھی اُن کے
لئے ممکن ہو جاتی ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ اُن کی
طرف سرکاری سمن آیا جس میں یہ لکھا تھا کہ آپ پر بعض
لوگوں کی طرف سے ایک الزام لگایا گیا ہے اِس کی
جواب دہی کے لئے آپ فوراً حکومت کے سامنے حاضر
ہوں۔ وہ یہ سُنکر حیران رہ گئے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ
ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے مگر چونکہ سرکاری سمن تھا
وہ چل پڑے۔ دس بیس میل گئے ہونگے کہ آندھی آئی۔
اندھیرا چھا گیا۔ آسمان پر بادل اُمڈ آئے اور بارش شروع
ہو گئی۔ وہ اُس وقت ایک جنگل میں سے گذر رہے تھے
جس میں دُور دُور تک آبادی کا کوئی نشان تک نہ تھا۔
صرف چند جھونپڑیاں اس جنگل میں نظر آئیں۔ وہ ایک
جھونپڑی کے قریب پہنچے اور آواز دی کہ اگر اجازت ہو
تو اندر آجاؤں۔ اندر سے آواز آئی کہ آجائیے۔ انہوں
نے گھوڑا باہر باندھا اور اندر چلے گئے۔ دیکھا تو ایک
اپاہج شخص چارپائی پر پڑا ہے۔ اُس نے محبت اور پیار
کے ساتھ انہیں اپنے پاس بٹھا لیا اور پوچھا کہ آپ کا
نام کیا ہے اور آپ کس جگہ سے تشریف لا رہے ہیں۔
انہوں نے اپنا نام بتایا اور ساتھ ہی کہا کہ بادشاہ کی طرف
سے مجھے ایک سمن پہنچا ہے جس کی تعمیل کے لئے جا رہا ہوں۔
اور حیران ہوں کہ مجھے یہ سمن کیوں آیا۔ کیونکہ مَیں نے کبھی

دنیوی جھگڑوں میں دخل نہیں دیا - وہ یہ واقعہ سُن کر
کہنے لگا کہ آپ گھبرائیں نہیں - یہ سامان اللہ تعالیٰ نے
آپ کو میرے پاس پہنچانے کے لئے کیا ہے - میں اپاہج
ہوں رات دن چارپائی پر پڑا رہتا ہوں مجھ میں چلنے کی
طاقت نہیں - لیکن میں نے اپنے دوستوں سے آپ کا کئی بار
ذکر سُنا - اور آپ کی بزرگی کی شہرت میرے کانوں تک
پہنچی - میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعائیں کیا کرتا تھا
کہ یا اللہ قسمت والے تو وہاں چلے جاتے ہیں میں غریب
مسکین اور عاجز انسان اس بزرگ کے قدموں تک کس
طرح پہنچ سکتا ہوں تُو اپنے فضل سے ایسے سامان پیدا
فرما کہ میری اُن سے ملاقات ہو جائے - میں سمجھتا ہوں
اس سمن کے بہانے اللہ تعالیٰ آپ کو محض میرے لئے یہاں
لایا ہے - ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر سے آواز
آئی - بارش ہو رہی ہے اگر اجازت ہو تو اندر آ جاؤں -
انہوں نے دروازہ کھولا اور ایک شخص اندر آیا - یہ سرکاری
پیادہ تھا - انہوں نے اُس سے پوچھا کہ آپ اس وقت
کہاں جا رہے ہیں - وہ کہنے لگا - بادشاہ کی طرف سے
مجھے حکم ملا ہے کہ فلاں بزرگ کے پاس جاؤں اور اُن سے
کہوں کہ آپ کو بُلانے میں غلطی ہو گئی ہے دراصل وہ کسی
اَور کے نام سمن جاری ہونا چاہیئے تھا مگر نام کی مشابہت
کی وجہ سے وہ آپ کے نام جاری ہو گیا - اس لئے آپ کے
آنے کی ضرورت نہیں - یہ بات سُنکر وہ اپاہج مسکرایا
اور اُس نے کہا - دیکھا - میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ کو
اللہ تعالیٰ محض میرے لئے یہاں لایا ہے سمن محض ایک
ذریعہ تھا جس کی وجہ سے آپ میرے پاس پہنچے - یہی
بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ
وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا -
پھر وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ
سُبُلَنَا میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ صرف
اسلام کو قبول کر لینا اور مُنہ سے اپنے آپ کو مومن کہہ
لینا کافی نہیں - علم و عرفان اور قربِ الٰہی کے راستے صرف
ایسے ہی لوگوں پر کھولے جاتے ہیں جو سچی محبت اور
تڑپ سے کام لیتے اور اُس کے لئے دیوانہ وار جدوجہد
کرتے ہیں - اسی لئے قرآن کریم نے یہ تو کہا ہے کہ جو ہماری
طرف آتے ہیں ہم اُن کی مدد کرتے ہیں لیکن اُس نے یہ کہیں
نہیں کہا کہ جو ہم سے بھاگتے ہیں ہم اُن کو پکڑ کر واپس
لاتے ہیں - جو ہم سے مُنہ پھیرتے ہیں ہم اُن کو اپنی تائید
سے نوازتے ہیں - جو بیٹھنا چاہتے ہیں ہم اُن کو جبرًا کھڑا
کرتے ہیں - جو گرنا چاہتے ہیں ہم اُن کو زبردستی اُٹھا لیتے
ہیں - جو بے ایمان ہونا چاہتے ہیں ہم اُنکو مجبور کر کے ایماندار
بناتے ہیں - قرآن یہی کہتا ہے کہ جو بے ایمان ہونا چاہتا
ہے ہم اُسے بے ایمان بنا دیتے ہیں - اور جو ایماندار ہونا
چاہتا ہے ہم اُسے ایماندار بنا دیتے ہیں - بہرحال انسانی
زندگی کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے اندر ایک
پختہ عزم پیدا کرے اور اچھی چیز کو پکڑ کر اسطرح بیٹھ
جائے جیسے شکاری کُتا اپنے شکار کو پکڑ کر بیٹھ جاتا
ہے - اُس کے دانت ٹوٹ جائیں تو ٹوٹ جائیں مگر وہ
اپنے شکار کو نہیں چھوڑتا - جب انسان اس نیت اور
ارادہ کے ساتھ ایک راستہ کو اختیار کر لیتا ہے - اور
اچھی چیز کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے تو پھر نیکیوں کی طرف
اُس کا قدم اُٹھنا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ کوئی نیکی نہیں
جو اُس سے اگلی نیکی کی توفیق نہیں دیتی - اگر کوئی انسان
سچے دل سے صدقہ دیتا ہے تو ضرور ہے کہ اُسے نماز
کی بھی توفیق ملے اور زکوٰۃ کی بھی توفیق ملے اور روزہ
کی بھی توفیق ملے اور اگر کوئی اخلاص کے ساتھ روزے
رکھتا ہے تو ضرور ہے کہ اس نیکی کے نتیجہ میں اُسے نماز
اور زکوٰۃ اور حج کی توفیق ملے - کیونکہ ہر نیکی دوسری نیکی
کی طرف لے جاتی ہے - بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے

کہ ایک شخص جو کسی غریب سے ہمدردی کرتا ہے اُس سے محبت اور پیار کا سلوک کرتا ہے اور دنیاداری کے خیالات کے ماتحت نہیں بلکہ سچے دل سے اسے کھانا کھلاتا ہے ایسے شخص کے پاس اگر امانت رکھی جائے تو وہ کھا جائیگا۔ یہ قطعاً ناممکن بات ہے جس شخص کے دل میں دوسروں کا اتنا درد ہے اور جو اُن کے لئے ہر وقت قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے کس طرح ممکن ہے کہ وہ دوسروں کے مال میں خیانت کرے۔ اگر سب لوگ مل کر بھی کہیں گے کہ اس نے دوسروں کا مال کھایا ہے تو ہم کہیں گے وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ کیونکہ جس کے دل میں اپنا مال قربان کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ وہ دوسروں کے مال کو کبھی کھا نہیں سکتا۔ اسی طرح جس شخص کے دل میں خواہش پائی جاتی ہے کہ وہ خدا کے لئے بھوکا رہے کس طرح مانا جا سکتا ہے کہ وہ نماز نہیں پڑھیگا۔ وہ ایک دن نماز نہیں پڑھے گا دو دن نماز نہیں پڑھے گا تین دن نماز نہیں پڑھے گا مگر آخر اُس کا نفس اُسے کہیگا کہ احمق تُو خدا کے لئے بھوکا رہتا ہے اور پھر اس کی عبادت نہیں کرتا اور وہ مجبور ہوگا کہ نماز پڑھے اور جب وہ نماز پڑھنے لگ گیا۔ تو پھر اُسے کوئی ہٹانا بھی چاہے تو وہ نہیں ہٹ سکتا۔ اُسے قید کر دو تو وہ قید میں ہی نماز پڑھنے لگ جائے گا۔ چارپائی پر باندھ دو تو لیٹے لیٹے نماز پڑھتا رہے گا۔ کیونکہ ایک نیکی دوسری نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔ پس اصل گُر انسانی ترقی کا یہی ہے کہ جو چیز اُسے اچھی نظر آئے اُسے مضبوطی سے پکڑ لے۔ پہلے وہ اپنے دل میں فیصلہ کر لے کہ میں نے اچھی چیز کو لینا ہے اور پھر اُسے چھوڑنا نہیں۔ اِس فیصلہ کے بعد اُسے جو چیز بھی اچھی نظر آتی ہو اُسے اِس نیت کے ساتھ پکڑ لے کہ اب میں نے اِسے چھوڑنا نہیں۔ جب انسان اِس مقام پر آ جاتا ہے تو وہ ساری دنیا سے سبق حاصل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ایک بچے سے بھی سبق لے لیتا ہے، ایک بوڑھے سے بھی سبق لے لیتا ہے۔ ایک پاگل سے بھی سبق لے لیتا ہے۔ غرض دنیا کی ہر چیز سے وہ فائدہ حاصل کر لیتا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ آپ تو بہت بڑے آدمی ہیں اور ساری دنیا آپ سے سبق لیتی ہے۔ کیا آپ نے بھی کسی سے سبق لیا ہے۔ انہوں نے کہا۔ بہت دفعہ لیا ہے اور سب سے بڑا سبق میں نے ایک چھوٹے سے بچے سے لیا ہے۔ اُس نے کہا۔ کس طرح؟ انہوں نے کہا۔ وہ اِس طرح کہ میں ایک دفعہ باہر جا رہا تھا۔ بارش ہو رہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ایک سات آٹھ سال کا بچہ گذر رہا ہے اور تیز تیز قدم اٹھا رہا ہے۔ میں نے اُسے تیز قدم اٹھاتے دیکھ کر کہا۔ بچے ذرا سنبھل کر چلو۔ کیچڑ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم پھسل جاؤ۔ اُس لڑکے نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ امام صاحبؒ میرے پھسلنے کا فکر نہ کیجیئے۔ آپ اپنا فکر کیجیئے۔ اگر میں پھسلا تو صرف میں پھسلوں گا۔ لیکن اگر آپ پھسلے تو ساری دنیا پھسل جائیگی۔ کیونکہ جب امام غلطی کرتا ہے تو اُس کے ماننے والے بھی وہی غلطی کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لڑکا تو یہ بات کہکر چلا گیا مگر میں دیر تک کھڑا اس وعظ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ساری عمر میں نے ایسی کارگر اور مؤثر نصیحت کسی سے نہیں سُنی۔ تو سیکھنے والا ایک بچے سے بھی سبق سیکھ لیتا ہے۔ بلکہ اگر انسان سیکھنے کی نیّت رکھے اور سوچنے کی عادت ڈالے تو زمین کی اینٹیں اور پہاڑوں کے درخت اور جنگلوں کی جھاڑیاں بھی انسان کے لئے قرآن اور حدیث کی تفسیر بن جاتی ہیں اور اگر وہ سمجھنے کا ارادہ نہ کرے تو ایسے بدبخت انسان کو نہ قرآن فائدہ دیتا ہے نہ حدیث فائدہ دیتی ہے اور نہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فائدہ دیتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا
میں اطمینانِ قلب کے حصول کا نسخہ بھی بتا دیا گیا ہے جس کے لئے آج ساری دنیا مضطرب ہے۔ اور ہر شخص یہ سوال کرتا دکھائی دیتا ہے کہ ہمیں دل کا اطمینان کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اطمینانِ قلب درحقیقت دو ہی طرح حاصل ہو سکتا ہے (۱) یا تو اِس طرح کہ جو خواہش دل میں پیدا ہو پوری ہو جائے (۲) یا اس طرح کہ تمام فضول اور لغو خواہشوں سے دل ہٹ جائے اور صرف ایسی خواہشات رہ جائیں جو اچھی بھی ہوں اور حاصل بھی ہو سکیں۔ جب کوئی اس مقام پر پہنچ جائے تو اُسے اطمینانِ قلب حاصل ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرے۔ اور پھر فرماتا ہے کہ جو لوگ اس مقصد کے لئے سچی کوشش کریں ہم ذمہ وار ہیں کہ اُن کو یہ مقصد حاصل ہو جائیگا۔ گویا قرآن کریم اطمینانِ قلب کی ذمہ واری لیتا ہے۔

پہلی آیت میں تو وہ یہ ہدایت دیتا ہے کہ انسان کو یہ مدِّ نظر رکھنا چاہیئے کہ اِس دنیا میں میری پیدائش کسی اعلیٰ مقصد کے لئے ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کو میں اپنے اندر پیدا کروں۔ یا دوسرے لفظوں میں خدا تعالیٰ کے لئے آئینہ بن جاؤں جس میں اُس کی صورت نظر آئے۔ اور دوسری آیت میں یہ بتایا ہے کہ اِس مقصد کے حاصل کرنے میں اگر سچی نیّت سے کوئی شخص کوشش کرے گا تو مَیں اُس کو ضرور کامیاب کر دوں گا۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص یہ بات سمجھ جائے کہ مَیں فانی نہیں ہوں۔ اِس لئے مجھے فانی چیزوں کی خواہش اتنی نہیں کرنی چاہیئے۔ صرف میرا جسم فانی ہے اس کے لئے مَیں کچھ فانی چیزوں کیلئے کوشش کروں تو کروں۔ میری رُوح فانی نہیں ہے اِس کے لئے مَیں غیر فانی اخلاق کی جستجو کروں گا۔ اور پھر خدا کی مدد سے اُس کی یہ جستجو پوری بھی ہو جائے تو چونکہ اُس کی تمنّا پوری ہو جائے گی تُسے اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو جائیگا۔ لیکن اگر وہ بندر کی طرح درخت کی شاخوں پر ناچتا پھرے گا اور اپنی لا فانی ہستی کو بھُول کر فانی جسم کے لئے فانی لذتوں کی تلاش میں لگا رہے گا۔ تو اتنی چیزوں کی خواہش اُسے پیدا ہو جائیگی کہ وہ اُسے پورا کرنے کے قابل نہیں ہو سکیگا۔ اور اِن چیزوں کی تلاش میں خدا تعالیٰ کی مدد بھی اُسے حاصل نہیں ہوگی۔ اس لئے اُس کی ناکامیوں کی تعداد کامیابیوں سے بڑھ جائے گی اور اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہو سکیگا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کیطرف سے دلی یکسوئی CONCENTRATION OF MIND کا بڑا حصہ پاتے ہیں۔ وہ لوگ کبھی کوئی سیاسی مقصد اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں۔ کبھی تعلیمی مقصد اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں۔ کبھی تمدنی مقصد اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں اور متواتر کوششوں سے کچھ کامیابیاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو بھی ظاہری طور پر اطمینانِ قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اطمینانِ قلب ایسا ہی ہوتا ہے جیسے بچّہ کو کھلونا مل جانے سے ہوتا ہے۔ ان کے اطمینانِ قلب کی وجہ مقاصدِ عالیہ کا پورا ہونا نہیں ہوتا بلکہ مقاصدِ عالیہ کو بھُلا دینا ہوتا ہے۔ وہ فکری افیون کا شکار ہوتے ہیں۔ اُن کا دماغ انہیں فکری افیون کھلا دیتا ہے اور وہ درد کی موجودگی میں اس کے احساس سے محروم ہو جاتے ہیں۔

سُبُلَنَا کے متعلق بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (سورۃ الانعام آیت ۱۵۴) یعنی یقیناً یہ میرا سیدھا راستہ ہے،

پس اِس کی اتباع کرو - اور مختلف راستوں کے پیچھے نہ پڑو - ورنہ وہ تمہیں خدا تعالےٰ کے راستہ سے اِدھر اُدھر لے جائیں گے - گویا خدا تعالیٰ کا ایک ہی راستہ ہے اور شیطان کے کئی راستے ہیں - مگر سُبُلَنَا میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالےٰ کے بھی کئی راستے ہیں - سو اِس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ اِن دونوں آیتوں میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں - بلکہ جہاں ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ کہا گیا ہے - وہاں یہ مراد ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لئے مختلف مذاہب کے قبول کرنے کی ضرورت نہیں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے اور سُبُلَنَا سے یہ مُراد ہے کہ روحانی ترقیات کے غیر محدود راستے ہیں اور ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا راستہ آجاتا ہے - جب مومن خدا تعالےٰ تک پہنچانے والے ایک راستہ پر چلتے ہیں تو انہیں قرب کے اور راستے بتلائے جاتے ہیں اور جب وہ اُن پر بھی چلنا شروع کر دیتے ہیں تو اللہ تعالےٰ اُن کی ترقی کے اور مواقع پیدا کر دیتا ہے - اس طرح قدم بقدم وہ نیکی اور عرفان کے میدان میں بڑھتے چلے جاتے ہیں -

بعض لوگ اس آیت سے یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور آپؐ کے احکام پر عمل کرنا ضروری نہیں بلکہ ہندو عیسائی سکھ اور پارسی وغیرہ اپنے اپنے طریق پر چل کر بھی نجات حاصل کر سکتے ہیں - مگر یہ درست نہیں - کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ صراحتًا فرماتا ہے کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی اے محمد رسول اللہ! تُو لوگوں سے کہدے کہ اگر تم اللہ تعالےٰ کے محبوب بننا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالےٰ بھی تم سے محبت کرنے لگ جائیگا - پس یہ ہرگز درست نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے بغیر بھی خدا مل سکتا ہے اِس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ جب کوئی شخص سچے دل سے کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ اُسے ہدایت کا راستہ بتا دیتا ہے اور وہ ہدایت اِس طرح ملتی ہے کہ یا تو رؤیا اور کشوف کے ذریعہ ایسے شخص پر اسلام کی صداقت کھول دی جاتی ہے اور یا پھر اُس کے دل میں اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبّت پیدا کر دی جاتی ہے اور وہ آپؐ کو قبول کر کے اور آپؐ کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کر کے اللہ تعالےٰ کی محبّت حاصل کر لیتا ہے - ورنہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور اسلام کی متابعت کے بغیر کبھی نجات حاصل نہیں ہو سکتی -

آخر میں وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ - فرما کر اللہ تعالےٰ نے ان تمام ابتلاؤں اور آفات کی طرف اشارہ فرما دیا جن کا اس سورۃ کے شروع سے ذکر چلا آ رہا ہے اور بتایا ہے کہ تم پھونکوں سے ہنڈیا نہیں پکا سکتے - تم خلال سے پہاڑ نہیں کھود سکتے - تم تنکے پر بیٹھ کر دریا پار نہیں کر سکتے - تم اگر اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں ہر قسم کے امتحانوں میں ثابت قدم رہنا پڑے گا اور قربانیوں کی آگ میں متواتر اپنے آپ کو جھونکنا پڑے گا - اگر ایسا کر لوگے تو اللہ تعالےٰ تمہیں ہر میدان میں کامیابی عطا فرمائیگا - اور وہ تمہارے لئے ایسی غیرت دکھائیگا کہ کوئی ماں اپنے بچّے کے لئے بھی ایسی غیرت نہیں دکھا سکتی - ضرورت صرف اِس امر کی ہے کہ تم خدا تعالےٰ پر سچّا ایمان رکھو اور اُس کے دین کی خاطر کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرو -

مُحْسِن کے معنے عربی زبان میں اُس شخص کے ہوتے ہیں جو حکم کو اُس کی تمام شرائط کے ساتھ پُورا کرے

پس اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اِس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو لوگ اِس پہلی بات پر پوری طرح عمل کریں گے جو ہم نے کہی ہے یعنی وہ پوری طرح جہاد کریں گے اور ہماری رضا کے حصول کی کوشش کریں گے ہم اُن کے ساتھ ہونگے - اور ہر میدان میں اُن کو کامیابی بخشیں گے - پس جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش تو کریں مگر اُن کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلے انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کوئی نہ کوئی غلطی کر رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ خدائی قرب اور اُس کی نصرت سے محروم ہیں۔ گویا بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ پر الزام لگایا جائے اور کہا جائے کہ اُس نے ہماری طرف توجہ نہیں کی ہمیں اپنی ذات پر الزام لگانا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم محسنوں والا کام نہیں کر رہے - ورنہ خدا جھوٹا نہیں ہو سکتا - وہ اپنے وعدوں میں سچا ہے اور وہ جو بات بھی کہتا ہے اُسے پورا کر کے رہتا ہے - جھوٹے ہم ہی ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کی محبت کا تو دعویٰ کرتے ہیں مگر اُس کے مطابق اپنے اندر کوئی تغیر پیدا نہیں کرتے - احادیث میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اُس نے کہا - یا رسول اللہ! میرے بھائی کو دست آ رہے ہیں - چونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شہد میں شفاء ہے (نحل ع۹) اِس لئے آپؐ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کو شہد پلاؤ - حالانکہ طبّی طور پر شہد دست لاتا ہے انہیں بند نہیں کرتا وہ گیا اور اُس نے جا کر شہد پلا دیا مگر اُس کے بھائی کے دست اَور بھی بڑھ گئے - وہ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ یا رسول اللہ! میرے بھائی کے دست تو اَور زیادہ ہو گئے ہیں - آپؐ نے فرمایا جاؤ اور شہد پلاؤ - وہ گیا اور پھر اُس نے شہد پلا دیا - جس پر اُس کے اسہال اور بھی بڑھ گئے - وہ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا - اور اُس نے کہا یا رسول اللہ اُس کو تو اور زیادہ دست آنے لگ گئے ہیں - آپؐ نے فرمایا کہ تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے اور خدا سچا ہے - جاؤ اُسکو اور شہد پلاؤ - چنانچہ اُس نے پھر شہد پلایا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے اندر سے ایک بڑا سا سُدّہ نکلا اور اُس کے اسہال جاتے رہے - اسی طرح اگر ہماری کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلے تو ہم اپنے متعلق کہیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں اور ہم نے وہ شرطیں پوری نہیں کیں جن کے پورا کرنے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکتا تھا ورنہ خدا سچا ہے - اگر ہم اُس کی بیان کردہ شرائط کو پورا کریں اور ابتلاؤں کے طوفانوں میں ایمان کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اپنی جانی اور مالی قربانیوں کے ذریعہ اخلاص اور فدائیت کا نمونہ پیش کریں تو اللہ تعالیٰ یقیناً ہماری مدد کے لئے آسمان سے اُترے گا اور وہ ہمیں ایک پیارے بچے کی طرح اپنی گود میں اُٹھا لے گا -

کلیدِ مضامین

جلد ہفتم

اشاریہ

○

مرتبہ

سید عبدالحی

اشاریہ

کلیدِ مضامین

جلد ہفتم

ا

اسلام

حقیقت

ماضی۔ حال۔ مستقبل

تعلیم

اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ

ذات

ہستی باری تعالیٰ

توحید

لقاءِ الٰہی

وصالِ الٰہی

صفات

الہام

ب

پ

ت

تبلیغ

ج

ح

تربیت

جن

جنت

جنگ

جنگِ یرموک

جنگ واٹرلو

ژ

ک

کائنات

گ

م

ن

اسماء

خصوصی نقطۂ نظر

سفر

متفرق

ظہور کی پیشگوئی

بعثت کی غرض

صداقت

الہامات ۔ رؤیا ۔ کشوف

پیشگوئیاں

قرآن کریم کے علوم کا بیان

علوم

اقوال

اشعار

واقعات کا بیان

م

واقعاتِ زندگی

مقام

دوسرے انبیاء سے موازنہ

عشقِ الٰہی

خصوصیات

اخلاقِ عالیہ

رسالت

مقام

اخلاق

نشانات ومعجزات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپؑ کی پیشگوئی

آپؑ کی اُمت

بائبل اور موسیٰ علیہ السّلام

مخالفت

و

مقامات

گ

ل

ن

حلّ اللّغات

انڈیکس کی تیاری میں معاونت

۱۔ فضل کریم صاحب تبسم شاہد

۲۔ طاہر محمود احمد صاحب شاہد

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفسیر

تفسیر ابن کثیر ۳۶۶، ۴۴۴

تفسیر بحر محیط ۳۴۸، ۴۵۹، ۶۲۳

تفسیر جلالین ۲۳۱

تفسیر خازن ۴۸۲

تفسیر در منثور ۱۸۷، ۲۳۱

تفسیر روح المعانی ۲۰۰، ۲۸۱، ۳۷۴

فتح البیان ۹۶، ۱۱۳، ۱۵۰، ۱۶۰

تفسیر قرطبی ۳۴۸، ۵۳۳

تفسیر کبیر رازی ۲۸۱

تفسیر الکشاف ۱۵۰، ۳۴۰

تفسیر حسینی ۳۶۶

کمنٹری آن دی قرآن ریورنڈ وہیری ۴۷۲، ۵۵۷

ترجمۃ القرآن از پادری سیل ۲۰۲، ۴۷۳

حدیث

جامع صحیح بخاری ۴۶، ۹۸، ۱۱۱، ۱۶۲، ۲۶۷، ۲۸۱، ۵۴۱

صحیح مسلم ۴۴، ۶۳، ۴۴۴

ترمذی ۲۲، ۲۵، ۱۱۳، ۴۴۲، ۴۵۵

سنن ابن ماجہ ۶۲۵

سنن ابی داؤد ۶۲۵

مشکوٰۃ المصابیح ۴۴۲، ۶۶۲

مسند احمد بن حنبل ۲۹۱

کنز العمال ۹

الجامع الصغیر ۳۶۵

ریاض الصالحین ۳۲

موضوعات کبیر ۲۰

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام و خلفاء سلسلہ

اربعین ۵۰۴

سیرت و تاریخ

اسلامیات

کتب اہلِ کتاب

کتب ہندومت

متفرق

لغت

اخبارات و رسائل

ٹ